یہ دِل یہ سودائی

سعدیہ عزیز آفریدی

یہ دل یہ سودائی.........سعدیہ عزیز آفریدی

وہ اس وقت بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

ایک نئے پروجیکٹ پر بحث جاری تھی۔پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ اور بزنس مارکیٹنگ سیل کی رپورٹس اور اس نئے پروجیکٹ سے میل کھاتے اور اسے پروڈکشن دینے والے نکات زیر بحث آرہے تھے،مگر وہ پھر بھی غیر متعلق بیٹھا رائٹنگ پیڈ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

""شہریار عبدالرحمٰن!مجھے لگتا ہے آپ اس وقت میٹنگ میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہے۔""بہت ساری باتوں اور آوازوں میں سے ایک سخت تنبیہی آواز اُبھری تو اُس نے جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ایم ڈی کی کرسی پر بیٹھے مسٹر عبدالرحمٰن ابھی تک اُسے ہی گھور رہے تھے۔اُسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا اور وہ پھر بولے تھے۔

""مسٹر شہریار!کیا آپ بتا سکتے ہیں،آپ نے زیر بحث آنے والے کتنے پوائنٹس پر ٹِک مارک کیا ہے؟""سوال ہنوز قائم تھا اور جواب سوچا نہیں جا رہا تھا۔

دراصل اُس کا دماغ کل رات کے اپنے ہونے والے ایکسیڈنٹ میں اٹکا ہوا تھا مگر اس ایکسیڈنٹ کی ساری سنگینی وہ ہضم کر چکا تھا۔چوٹوں میں تکلیف کی شدت باقی تھی مگر اس کی خبر بھی صرف اُسے ہی تھی۔اُس نے کسی اور کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا،(ہمیشہ کی طرح)اُس کا خیال تھا کہ یہ اُس کا ذاتی معاملہ تھا۔لیکن مسٹر عبدالرحمٰن.......وہ ان لوگوں میں سے تھے،جنہیں بے دلی سے یا غیر منظم انداز میں کیا ہوا کام قطعاً پسند نہیں تھا۔یہ بھی تھا کہ انہوں نے کبھی اپنے بچوں سے بلند آواز میں بات نہیں کی تھی لیکن وہ جس بات پر خفا ہوتے تھے،پھر اس پر کوئی صفائی،کوئی معذرت نہیں سنتے تھے۔یہ باتیں ہمیشہ اُن کا غصہ اور بڑھا دیا کرتی تھیں۔اس لئے اُن کی کہی بات ہمیشہ حرفِ آخر ہوتی تھی اور اُن کی نظرِ عتاب کا شکار فرد کوشش کرتا تھا کہ یہ غصہ جلد سے جلد ختم ہوتا کہ وہ پُرسکون ہو کر زندگی کی طرف نظر کر سکے،سو یہی صورتِ حال اس وقت بھی درپیش تھی۔

""مسٹر شہریار!اگر آپ اس وقت کمپوز نہیں ہیں تو اپنے چیمبر میں ریلیکس کر سکتے ہیں۔""حسبِ توقع لہجہ دوستانہ تھا لیکن شہریار عبدالرحمٰن جانتا تھا،اس لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔معذرت غیر ضروری تھی اس لئے وہ خاموشی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! مجھے واقعی ریلیکس کرنا چاہئے۔" مؤدبانہ کہتا ہوا وہ میٹنگ روم سے باہر آ گیا۔
اس وقت اُس کا موڈ اپنے چیمبر میں جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ رات کے بائیک حادثے کے بعد سے ہاتھ اور داہنی ٹانگ میں اب بھی رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں مگر اُس نے گھر میں پڑے رہ کر بور ہونے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ دفتر کا ہی قصد کر لے۔
گھر میں اور تو کوئی نہ تھا، جو اُس کی حاضری کو نوٹ کرتا لیکن دانیا عبدالرحمٰن اور جازی عبدالرحمٰن کالج سے آ کر اُس کی ناک میں ضرور دم کر دیتے۔ کوئی اور ہوتا تو اس توجہ پر مر مٹتا مگر وہ شہریار عبدالرحمٰن تھا، اس لئے اُن دونوں کی توجہ سے چڑ رہتا۔ اُس کا خیال تھا ہر ایک کی طرح اُن دونوں کو بھی چاہئے کہ وہ بھی اُسے اپنی زندگی کی لسٹ سے باہر نکال دیں...... اور پھر کبھی پلٹ کر بھی نہ پوچھیں کہ اکیلے پھرتے ہو، اکیلے رہتے ہو تو تمہارے اندر کی تنہائی تمہیں زندگی کے ساتھ کیسے باندھتی ہے......؟
کیا کبھی تمہارے حصے میں تم بھی آئے یا سارے کے سارے دکھ اور خاموشی کے دامن میں خیرات ہو گئے؟
وہ پلٹ کر کبھی نہ پوچھیں تا کہ وہ ایک بار ہی خود کو مر جانے کا پرسہ دے سکے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ہر دُکھ، ہر ٹیس پر اُسے وہی یاد آتے تھے۔
دانیا عبدالرحمٰن اور جازی عبدالرحمٰن جن کا صرف ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا نام اُس کا تھا، یا رگوں میں خون بن کر دوڑنے والا رشتہ، رضاعت اس کی گواہی تھا اور یہی رشتہ تھا، جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا سب کچھ مانتا تھا۔
خون کے رشتے بھلے حقیقت ہوں مگر دل کی بے دیاری میں ایک در کو اپنا کہنے اور اس دیار میں رہنے والوں کو اپنا سمجھنے کے رشتے بھی تو مکمل خواب یا فریب نہیں ہوتے۔
وہ سوچے جا رہا تھا حالانکہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ ویٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھا ہوا وہ ارد گرد سے بالکل بے خبر تھا، جب ایک مترنم سی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"سر! کیا آپ بتا سکتے ہیں، مسٹر عبدالرحمٰن کا چیمبر کون سا ہے؟"
اُس نے بند آنکھوں کو کھول کر دیکھا۔ آواز کے معاملے میں اُس کا چہرہ بہت عام سا تھا مگر آواز میں تمام لینے کی صلاحیت تھی۔ گرتے ہوئے وجود کی تھکن ایک ہی سانس میں پی کر تازگی سمو دینے کی قوت تھی۔ وہ اُسے دیکھتا گیا۔

متناسب آنکھیں، چھوٹی سی ناک، گلابی لپ اسٹک سے گلو کرتے ہونٹ، متناسب فگر، گندمی رنگ، بوٹا سا قد، لائٹ پرپل جارجٹ کا سوٹ، بال کھینچ کر بنایا ہوا جوڑا، وہ دُور سے صرف ورکر لگتی تھی۔ فیشن دفاتر میں کام کرنے والی کوئی ایک بھی عادت اس میں موجود نہیں تھی اور شہریار عبدالرحمٰن کو لگتا، اگر وہ یہاں کسی سفارش پر یا مسٹر عبدالرحمٰن کی ہمدردانہ فطرت پر نوکری کے خیال سے آئی ہے تو وہ جی جان کر کوشش بھی کر لے، تب بھی شو آف پر سنائی نہیں بن سکتی۔ کوئی ایسی خوبی نہیں تھی اس میں، جو اپنی طرف متوجہ کرتی۔ اور یہ دفتر، یہاں تو صرف خوب صورتی کا مارجن زیادہ تھا۔

وہ ایک بین الاقوامی ڈریس کلیکشن سے متعلق لوگ تھے۔ بہترین ڈریس ڈیزائنرز، بہترین بوتیک چین، وہ کپڑے نہ صرف اپنے بوتیکس کے لئے بناتے تھے بلکہ اگر کوئی اور انہیں اپروچ کرتا تھا تو وہ ان کے لئے بھی ڈیزائن کرتے اور بہترین کپڑے کی فراہمی سے لے کر مارکیٹ میں کلیکشن رائج کرنے کی سہولت بھی مہیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی، کئی افراد اس فیلڈ میں اُن کی اسی خاص مہربانی سے آج نام کمائے بیٹھے تھے۔ وہ کبھی بھی بزنس سیاست کا شکار نہیں ہوئے تھے اس لئے ان کے کام کی ایک ساکھ تھی اور لوگ ان کی محبت، خلوص اور مہربانی کا دم بھرتے تھے۔ اپنے کلائنٹ کی نظر میں وہ بہترین چوائس تھے۔

فیشن اینڈ اسٹائل کی ایک دوسری شاخ ایڈورٹائزنگ زون تھا، جس کا مجموعی کام ایڈ بنانے کا تھا لیکن اگر کوئی کلائنٹ چاہتا تو وہ اُن کی کمپنی سے یہ خصوصی مراعات بہترین کارکردگی کے ساتھ بُک کر لیتا تھا۔ اسٹائل وژن، خود میں ہمہ جہت کامیابی اور کارکردگی سنبھالے بیٹھا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن اسٹائل وژن ہی کے مارکیٹنگ کے شعبے میں جز وقتی ملازم تھا وگرنہ زیادہ تر سالار عبدالرحمٰن اس معاملے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

سالار عبدالرحمٰن مسٹر عبدالرحمٰن کے ٹوئنز بیٹوں میں سے ایک تھے۔ سالار عبدالرحمٰن کے دوسرے بھائی عدیل عبدالرحمٰن ان تمام کاموں سے جان چراتے تھے، اس لئے انہوں نے پولیس جوائن کر لی تھی۔ وہ شادی شدہ تھے۔ اُن کا ٹرانسفر آج کل لاہور میں تھا مگر اس وقت مسئلہ یہ نہیں تھا۔ یہ سب باتیں تو شاید اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آ گئی تھیں۔

وہ اس لڑکی کو اس دفتر میں سیٹ کرنے کے چکر میں اپنے اردگرد کا پورا چکر لگا آیا تھا۔ وگرنہ اسے تو مہینوں خود کو تلاش کرنا یاد نہیں رہتا تھا۔ وہ اب اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

کیا بات ہے؟ اس لڑکی میں جو یہ مجھے ماضی کی طرف کھینچ لئے جا رہی تھی؟ وہ تولنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ سہم کر کچھ اور خود میں سمٹے جا رہی تھی۔

”آپ مسٹر عبدالرحمٰن سے کس سلسلے میں ملنا چاہ رہی تھیں؟“

یہ سوال اُسے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا لیکن وہ اپنے اردگرد سے ایسے غافل ہوا کہ اسے یہ سوال کرنا ہی یاد نہیں رہا۔ مگر اب وہ اس ٹرانس سے باہر آ چکا تھا۔

”جی! میں ایک ہسپتال کی طرف سے یہاں آئی تھی۔ میری کل مسٹر عبدالرحمٰن سے بات ہوئی تھی۔ ہم ہسپتال کے چیریٹی زون سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ہر سال کچھ پروگرام ترتیب دیتے ہیں جن میں آپ جیسے متمول افراد کی شرکت سے ان مریضوں کے لئے فنڈ ریزنگ کی جاتی ہے، جو مہنگے علاج معالجے کی استطاعت نہیں رکھتے۔“

”چیریٹی شو؟“ وہ مسکرانے لگا۔ پتہ نہیں اُسے اس طرح کے کام کرنے والوں سے کیوں چڑ سی ہوتی تھی۔ خوامخواہ کا ڈرامہ........ عزتِ نفس کی پامالی...... یہ سب چیریٹی ہے۔

اُس کی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح زہریلی ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا تھا، اُس کی مسکراہٹ میں زہر ہے یا زہر میں لسی ہلکی سی مسکراہٹ کسی نے دل جلانے کے لئے گھول دی ہے......

وہ لڑکی اب عجیب گومگو حالت میں اُسے تکنے لگی تھی۔

”کیا آپ مجھے مسٹر عبدالرحمٰن کا چیمبر بتا سکتے ہیں؟“ دوٹوک لہجہ...... اُسے حیرت ہوئی۔ اتنی جلدی رویہ بدلنے پر تو وہ خود کو یدطولیٰ سمجھتا تھا، لیکن یہ لڑکی......

”آپ فرسٹ فلور کے سیکنڈ روم میں جا سکتی ہیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن وہیں ہوتے ہیں اور آپ جیسے لوگوں کے لئے خوشخبری ہے کہ چیریٹی کرنا اُن کی ہابی ہے، وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔“

”آپ کا نام...... کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

وہ چلتے چلتے مڑا۔ ایک تیکھی ہوئی نظر اُس پر ڈالی، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔ ”شاید یہ آپ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ میرا کیا نام ہے، کیونکہ مجھے چیریٹی کرنا یا چیریٹی کے کام پر شہرت کمانے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔“

لڑکی نے اُسے تیز نظروں سے گھورا تھا۔ یہ شہریار عبدالرحمٰن کا ذاتی خیال تھا۔ کیونکہ وہ اپنی بات کہہ کر رُکا نہیں تھا، بس اُسے اپنی پشت پر غصے سے جلتی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تھی مگر ان نگاہوں کی اُسے کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اب کچھ بھی غیر معمولی نہیں لگتا تھا۔

وہ دفتر سے نکل کر اب متناسب قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ لاٹ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک تیز خنجر کی طرح کاٹتی چیز اُس کے بازو کو زخمی کرتی دوسری کار کی فرنٹ ونڈو کو توڑتی چلی گئی۔

”بلٹ......“ وہ بجلی کی تیزی سے نیچے جھک گیا اور یہی حرکت اُسے بچا گئی۔ کیونکہ پہلی کوشش ناکام دیکھتے ہی دوسری گولی چلائی گئی تھی۔

تیسری گولی کی آواز......

سارے دفاتر کی کھڑکیاں کھلنے، بند ہونے لگی تھیں۔ اُس کی کار کا اس بار برا حشر ہو گیا تھا۔ مجرم نے دوسری اور تیسری گولی کے بعد تین فائر اور کیے تھے۔

وہ بہ مشکل بچ پایا تھا۔ اچھل کود سے کل رات کا تھکا ہوا زخمی جسم بری طرح بھونچال میں آ گیا تھا۔ دفتر کے کسی فرد نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ علاقہ چونکہ کمرشل تھا، اس لئے سائرن فوراً ہی سنائی دینے لگے تھے۔ وہ اب اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

مسٹر عبدالرحمٰن، سالار عبدالرحمٰن اور ساتھی ورکرز باہر آ چکے تھے۔ ابھی تک تو یہ معاملہ نجانے کس بے چارے کا تھا مگر سامنے شہریار عبدالرحمٰن کو دیکھ کر مسٹر عبدالرحمٰن کانپ گئے تھے۔

''یہ سب کیا تھا؟......وہ کون تھا، جس نے تم پر گولیاں چلائیں؟''

حیرت ایک ایک لفظ میں تھی۔ وہ چونک کر مڑا تھا۔ اندر تک جواپنے ہونے کی بے یقینی سی پیدا ہو گئی تھی، اس جملے میں ہلکی سی تحریک اُٹھی تھی۔ اگر یہ حملہ کامیاب ہو جاتا تو وہ اس وقت یا تو آپریشن ٹیبل پر ہوتا یا ڈیڈ باڈی بن کر یہاں پڑا ہوتا۔ ''ہے'' جو وجود کا لاحقہ ہے، وہ ''تھا'' بن کر کچھ دنوں تک باتوں میں چکراتا رہتا، پھر وہ لفظ بھی گم ہو جاتے اور شہریار عبدالرحمٰن بھی ایسا قصہ پارینہ بن جاتا، جسے کوئی یاد نہیں کرنا چاہتا۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں کچھ......شہریار! یہ سب کیا تھا؟ کون تھے وہ لوگ؟''

اُس نے سانس بحال کی، پھر سر جھکا کر بولا۔ ''پتہ نہیں پاپا! میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ حملہ قطعاً غیر متوقع تھا۔''

''تو کیا تمہیں کسی قسم کے حملے کی توقع تھی پہلے سے؟''

مسٹر عبدالرحمٰن بہت شارپ ذہن کے مالک تھے، وہ جانتا تھا۔ لیکن اتنی جلدی اُس کی کہی بات سے مطلب اخذ کر لیں گے، وہ توقع نہیں کر پا رہا تھا۔

''پاپا! اس کے کندھے سے خون بہہ رہا ہے۔'' سالار عبدالرحمٰن کی نگاہوں نے اُسے اپنے حصار میں لیا تو وہ موقع سے بھاگنے کے راستے ڈھونڈنے لگا۔

''میں ڈاکٹر شاہ کے کلینک چلا جاؤں گا، پاپا! ڈریسنگ کروا لوں گا......بہت نارمل زخم ہے۔''

پاپا کچھ نہیں بولے۔ تمبیھرتا لئے اُسے دیکھتے رہے۔

دفتر کے ورکرز اپنے اپنے کاموں کو پلٹ گئے تھے۔ پولیس آچکی تھی۔ جائے وقوعہ کا معائنہ جاری تھا۔ گولی چلنے کا زاویہ نوٹ کیا جا رہا تھا۔ کار میں پیوست گولیاں اور اُن کے خول اُٹھائے جا رہے تھے۔ سو شہریار عبدالرحمٰن کا اب نکلنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن نے ڈاکٹر شاہ کو دفتر پہنچنے کا پیغام دے دیا تھا۔ وہ مسٹر عبدالرحمٰن کے چیمبر میں آ چکے تھے۔ شہریار عبدالرحمٰن نے دفتر میں داخل ہوتے ہی کسی کو ڈھونڈنا چاہا تھا، مگر دفتر خالی پڑا تھا۔

پولیس انسپکٹر اُس سے حادثے کے متعلق مختلف سوالات کر رہا تھا، جس سے وہ بخوبی نمٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ انسپکٹر سوالات سمیٹ کر بولا۔

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا ہے۔ آپ کو کسی پر شک بھی نہیں ہے۔ نہ ہی آپ کی اس طرح کی کسی شے دشمنی ہے کہ بات قاتلانہ حملے پر جا کر رُکے۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے مسٹر حسن!“ فرمانبرداری سے جواب دے کر وہ اُسے کاغذ سمیٹتے دیکھتا رہا۔ بیان پر وہ دستخط کر چکا تھا۔ ایف آئی آر کی کاپی دفتر کے لیگل ایڈوائزر سرمد احمد کو دی جا چکی تھی۔

یہ سب کچھ ایک گھنٹے کی کارروائی تھی۔ نام کی بدولت تھانے جانے کی ہر صعوبت سے بچاؤ ہو گیا تھا۔ انسپکٹر اپنے اہلکاروں کے ساتھ جا چکا تھا اور اب کمرے میں صرف وہ بیٹھا تھا، یا مسٹر عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ اُسے یقین تھا، اب وہ پھٹ پڑیں گے۔ صبح کی میٹنگ میں عدم دلچسپی اور یہ واقعہ........ لامحالہ اُن کا پیمانہ لبریز ہونا ہی تھا۔ وہ اب متوازن قدم رکھتے اُس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”تم صبح سے کیا اسی قسم کے کسی حملے یا واقعے کے منتظر تھے؟ یا پہلے ہونے والے کسی واقعے کی وجہ سے تمہاری توجہ اور تم خود غائب ہو رہے تھے؟“

مسٹر عبدالرحمٰن بہت ذہین تھے۔ پھر ایس پی عدیل عبدالرحمٰن کے باپ تھے۔ وہ جواب سوچنے لگا تھا کہ اچانک دروازہ ناک ہوا۔

”آ جاؤ سالار!“ مسٹر عبدالرحمٰن نے دستک سے بیٹے کو پہچان لیا اور وہ سر جھکا گیا۔ وہ ایسے ہی تھے۔ بہت زیادہ حساس، بہت زیادہ خیال رکھنے والے۔ بس کبھی کبھی خلافِ مرضی کام سے بپھر جاتے تھے۔ پھر اُن کا غصہ، الامان الامان........

وہ دروازے سے داخل ہونے والے سالار عبدالرحمٰن کو دیکھ رہا تھا، مگر اُن کی پشت کے پیچھے کھڑی لڑکی........

تو یہ ابھی تک یہاں ہے؟ اُس کی توجہ لامحالہ اُس کی طرف ہو گئی۔ تبھی سالار کی آواز اُبھری۔

”میں نے پچاس ہزار کا چیک اکاؤنٹنٹ سے مس شافیہ کے حوالے کر دیا ہے پاپا! اور کل کے چیریٹی شو کی بیس سیٹوں کے ٹکٹ بھی لے لئے ہیں۔ اور کوئی حکم؟“
مسٹر عبدالرحمٰن مسکرانے لگے۔ ”نہیں، بس یہی کافی ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا! ہم جس قدر آپ کا ساتھ دے سکتے تھے میرے خیال میں ہم دے چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، میں نے آپ کو مایوس نہیں کیا ہے؟“
شافیہ کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ ”نو سر! آپ نے ہمیں جس قدر عزت دی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ لیکن ہماری عزت افزائی ہوگی، اگر آپ 24 اکتوبر کو ہمارا شو دیکھنے کے لئے اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر آ سکیں۔“
”میں کوشش کروں گا، شافیہ!“ مسٹر عبدالرحمٰن نے حوصلہ افزا جواب دیا اور وہ اسی زہریلے لہجے کو یاد کر کے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈارک براؤن کوٹ کی آستین خون سے بھر گئی تھی۔ اُسے عجیب سی تکلیف ہونے لگی تھی۔
”آپ اب کیسے ہیں سر؟“
”ٹھیک ہوں۔“ سپاٹ لہجے میں کہہ کر وہ کوٹ اُتارنے لگا تھا۔
شافیہ سہیل نے سراسیمگی سے اُس کی بلیک شرٹ کو دیکھا تھا۔
وہ ایک خوش جمال شخص تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ذہانت اور تحمل ساتھ ساتھ گھلی ملی تھی۔ گندمی رنگت، ستواں ناک اور کلین شیو کے ساتھ وہ ایک پُرکشش شخصیت رکھتا تھا۔ وہ ایک ہی نظر میں جانچ کر مڑ گئی تھی۔ حالانکہ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً سے پیشتر اُس کے زخمی بازو کی ڈریسنگ کروا لے۔ یہ اُس کا فرض بھی تھا اور ٹریننگ کا حصہ بھی........ لیکن یہاں وہ مجبور تھی، سو کمرے سے تیزی سے نکلتی چلی گئی۔
مگر جب وہ خارجی دروازے سے نکل رہی تھی، تب اُس نے مسٹر شاہ ہمدانی کی کار کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سکون کا سانس لیا تھا۔
مسٹر شاہ ہمدانی، میڈیکل فیلڈ میں ایک جانے مانے ڈاکٹر تھے۔ مشکل سے مشکل سرجری کیس، وہ اس قدر آسانی سے کر ڈالتے تھے کہ لوگ اُنہیں جادوگر کہتے تھے۔ وہ ایک اچھے ڈاکٹر، سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے، اس لئے سب اسٹاف اور عام لوگوں میں اُنہیں اس قدر افزائی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کے ہسپتال کے چیریٹی زون کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ بھی تھے اور کئی دوسرے پرائیویٹ ہسپتالوں کے لئے اعزازی اور فلاحی خدمات سرانجام دینے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شافیہ سہیل اُنہیں اپنا آئیڈیل گردانتی تھی اور اُس کا خیال تھا، جہاں مسٹر شاہ

صمدانی ہوں، وہاں سے تکلیف یوں بھاگتی ہے، یوں.......

بس یہی وجہ تھی کہ وہ پُرسکون ہو کر باہر سڑک پر آ گئی تھی۔ اپنی روٹ کی بس کا انتظار اُسے یہیں کھڑے ہو کر کرنا تھا۔



"یہ معاملہ کیا ہے عبدالرحمن؟"

اُس کی شرٹ اُتاری جا چکی تھی۔ ڈاکٹر شاہ صمدانی اُس کے زخم کی ڈریسنگ کر چکے تھے، سو اطمینان ملتے ہی اُن کا پہلا سوال یہی تھا، جسے وہ خود شہریار سے پوچھنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سوال اُن سے کیا گیا تھا اور وہ خود شہریار کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر جواب ہنوز خاموشی کی صورت پا کر گلا کھنکھار کر بولے۔

"میں اس سلسلے میں اتنا ہی اندھیرے میں ہوں، صمدانی! جتنا کہ تم اس وقت خود کو محسوس کر رہے ہو۔ رہے شہریار تو یہ ابھی تک اس سلسلے میں حقیقت بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔"

مسٹر عبدالرحمن ہمیشہ غصے میں بہت زیادہ آپ، جناب، سے بات کرتے تھے۔ نام تک پورا لیتے تھے۔ وہ جانتا تھا، وہ بہت خفا ہیں لیکن وہ حقیقت بتا کر معاملے کی سنگینی کو بڑھانے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ اس بات کی سنگینی خود اُس پر گولی چلنے سے پہلے تک نہیں کھلی تھی۔ کل کا بائیک ایکسیڈنٹ، جسے وہ اتفاقی حادثہ سمجھا تھا، یہ سب معاملات آپس میں گہرا تعلق رکھتے تھے۔

"کیا بات ہے شیری! تم آج کل بہت چپ چپ رہنے لگے ہو....... نہ ہنستے ہو، نہ بات کرتے ہو۔" ڈاکٹر صمدانی نے خیر سگالی دکھانے کی کوشش کی۔

اس جملے پر اُس کے ہونٹوں کو پھر زہریلی مسکراہٹ نے چھوا، مگر نظر میں احترام برقرار تھا۔ وہ اب پھر سے شرٹ پہن کر کوٹ پہن رہا تھا۔ اپنا کام نمٹا چکا تو ہولے سے جواباً بولا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے انکل! بس زندگی اتنی بُری ہو چکی ہے کہ ہنسنا یاد نہیں رہتا۔ ہاں ضرورتاً اور مارکیٹنگ کے اصولوں پر ہنستا، یہاں تک کہ قہقہے لگانا بھی مجبوری ہے میری۔ بس کہہ سکتے ہیں آپ کہ مجھے ہنسنے کی عادت نہیں ہو سکی۔ رہا بات چیت کرنا تو تنہائی سے بہت اچھی نبھ رہی ہے آج کل۔"

شاہ صمدانی اُسے حیرت سے دیکھے گئے۔ وہ بد دماغ اور روڈ تو شروع سے تھا، لیکن آج حد سے زیادہ بیزار لگ رہا تھا۔

"تم زندگی سے اُکتا کیوں گئے ہو؟" وہ اپنا میڈیکل بکس بند کرتے ہوئے مکرر بولے اور وہ کم فہمی سے اُنہیں دیکھنے لگا۔

بات سمجھ آ رہی تھی لیکن اس بات کی وضاحت میں وہ جو جملہ استعمال کرتا، وہ مزید سوالات کو جنم دیتا اور وہ اس وقت صرف خاموشی اور سکون چاہتا تھا۔ جواب کے لئے اُس نے ہنوز کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنی کار کی چابی اُٹھانے لگا۔

''تم........ مجھے لگتا ہے تم لوگوں سے، رشتوں سے فرار چاہتے ہو۔''

وہ تیزی سے مڑا۔ سامنے مسٹر عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ ڈاکٹر شاہ صمدانی اور اُن کی رائے فیڈ آؤٹ ہوگئی تھی۔ تب اُس کی زبان کو ایک نئی طرح سے پرانی تلخی نے ذائقہ بخشا۔

''مجھے لوگ اور رشتے، دنیا، سب پسند ہو سکتے ہیں لیکن جب سے میں نے یہ جانا ہے کہ رشتے، دنیا اور لوگوں کی پسندیدگی کی لسٹ پر میں جان مار کر بھی پورا نہیں اُتر سکا، تب سے میں نے یہ ہیڈک ہی چھوڑ دی ہے۔ میں زندہ ہوں، اس لئے نہیں کہ زندگی مجھے راس ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے شاید موت بھی قبول کرنے میں ایک بار ضرور ہچکچائے گی۔''

وہ اب نی بار رُکا نہیں تھا اور مسٹر عبدالرحمٰن آدھے وجود کے ساتھ کرسی پر گر سے گئے تھے۔

''یہ ابھی تک وجاہت نہیں بھولا ہے صمدانی! وجاہت، جسے گزرے ہوئے پانچ برس گزر چکے ہیں۔''

ڈاکٹر شاہ صمدانی دوسری کرسی پر بیٹھ گئے، پھر بے چارگی سے بولے۔

''جانانہ کے معاملے میں ہم سب نے اسے اتنا الزام دیا ہے عبدالرحمٰن! کہ وہ اپنے رویے میں حق بجانب ہے۔ وہ شروع سے تم سے اور گھر سے جتنا چڑتا تھا، بچپن کے جس معاملے پر اُسے در پردہ تیز کیا جاتا تھا، اس نے اُس کی شخصیت کو ویسے ہی توڑ پھوڑ دیا ہے۔ رہی سہی کسر جانانہ کے ساتھ مل کر ہم نے اور پوری کردی۔ وہ اس وقت اپنے آپ سے ناراض ہوگیا ہے اور تم جانتے ہو، وہ کتنا ضدی، کتنا خودسر ہے۔ جب تک خود سے نہ چاہے، کوئی اُس کے دل کی تھاہ نہیں لے سکتا اور وہ اس کی اجازت بھی کسی کو نہیں دے گا۔''

مسٹر عبدالرحمٰن تاسف سے اُنہیں دیکھ کر خاموش رہ گئے اور وہ وقت کچھ اور لمحوں کو لے کر آگے کی کہانی بننے چل پڑا۔



وہ دفتر سے نکل تو آیا تھا، لیکن اس وقت اُس کا اندر تک ہل گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اُس نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا اور ڈر گیا تھا۔ اُسے زندگی سے کبھی بھی محبت نہیں رہی تھی لیکن وہ خوف زدہ تھا

کہ اگر اس وقت واقعی جازی عبدالرحمٰن اپنے پروگرام کے مطابق دفتر سے اُسے لینے آگیا ہوتا؟ اگر اس وقت پارکنگ لاٹ میں اس کے ساتھ وہ بھی ہوتا تو؟
بس یہیں آ کر اُس کے اندر اضطراب سا ہو جاتا۔ موت انسان کا اپنے لئے ڈر بہت کم رکھتی ہے۔ وہ لوگ جو محبت سے، زندگی سے پیار کرتے ہیں، صرف وہ لوگ موت سے ڈر سکتے ہیں اور اس جیسے زندگی سے اُکتائے ہوئے لوگ...... وہ صرف اپنوں کی موت سے ڈر کر موت سے ڈرتے ہیں۔
بظاہر آپ زندگی سے کتنا بھی چڑتے ہوں، محبت آپ کے اندر چور دروازہ کھوج نکالتی ہی ہے...... اور بس...... پھر یہ اپنوں سے محبت کے رنگ میں، آپ کو بے رنگ ہونے کے باوجود زندگی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیے رکھتی ہے۔
بظاہر بغیر کسی سکیورٹی کے اس طرح اُس کا سفر کرنا قطعاً غیر محفوظ تھا لیکن اس وقت چونکہ وہ اکیلا تھا اس لئے اطمینان تھا۔
موت بھیانک ہو کر نہیں مل سکتی...... اکیلے مر جانے میں جو سکون ہے، وہ بہت سے لوگوں کے درمیان اکیلے رہنے، جینے سے کہیں بہتر تھا۔
اُس کا دماغ اس وقت معاملے کے تانے بانے کو مربوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اُس نے بظاہر مجرم کو نہیں دیکھا تھا لیکن ایک ہفتہ پہلے والی لڑائی اُس کے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ لڑائی ذہن میں تازہ ہوئی تو خود بخود وہ لڑکی ذہن میں آئی، جس کی حفاظت کا اُس نے وعدہ کیا تھا۔
ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل کو بائیں ہاتھ سے اُٹھا کر اُس نے نمبر ملایا۔ لیفٹی تھا، اس لئے یہ بات اُس کے لئے مشکل نہیں تھی۔ فون بیپ کے دس سیکنڈ بعد کال ریسیو کی گئی تھی۔
”ہیلو، جی فرمائیے...... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“
”میں شہریار بات کر رہا ہوں، ایلیا! میں آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔ تم اپنا کچھ ضروری سامان پیک کر کے رکھنا، میں تمہیں کہیں اور محفوظ جگہ پر بھیجنا چاہتا ہوں۔“
”مگر شہریار صاحب! آخر آپ ایسا کب تک کرتے رہیں گے؟“ دوسری طرف سے جھنجھلائی ہوئی آواز گونجی اور وہ روڈ لہجے میں بولا۔
”میں جب تک تمہارا کوئی پکا بندوبست نہیں کر لیتا، یہ دردِ سر تو باقی رہے گا۔“
لائن ڈس کنکٹ کی جا چکی تھی، اس لئے اُس کا رُخ اپنے فلیٹ کی جانب تھا۔ یہ ایک لگژری فلیٹ تھا، جسے وہ ملک سے باہر کی پارٹیز کے لئے ہمیشہ آرگنائز رکھتا تھا یا پھر دوستوں کی گیدرنگ کے لئے یہ فلیٹ

ہمیشہ ریڈی رہا کرتا۔ یہ ایک پوش علاقے کی ایک بہترین عمارت تھی، جس کے اردگرد باؤنڈری وال تھی۔ الگ سکیورٹی سسٹم تھا۔ پانچ کمروں، ڈائننگ، ڈرائنگ روم کے ساتھ یہ ایک بہترین لوکیشن تھی۔

وہ کار پارک کرچکا تھا، اب اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

کچھ ساعت گزریں، اُس نے بیل دے کر دروازہ کھلنے کا انتظار کیا۔ قدموں کی آواز سنائی دی اور کچھ لمحوں بعد ایک خوب صورت لڑکی دکھائی دینے لگی۔ وہ اُس کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایلیا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''تم نے فون کیا تھا، شیری! ہم کہاں جانے والے ہیں؟''

وہ حیرت سے مڑا، پھر رُکھائی سے بولا۔ ''کیا ہم میں ایسی بے تکلفی ہے ایلیا؟'' اُس نے ہاتھ چھڑایا اور وہ غیر متوقع رونے لگی۔

''تم...... اب تم مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو شیری! تم نے ہی تو کہا تھا تم مجھے ایک محفوظ گھر دو گے۔''

''ہاں...... آں......'' وہ گڑبڑا گیا تھا لڑکیوں کا رونا، تمام تر سردمہری کے باوجود وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ سو اُس کو دلاسہ دینے کے لئے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا، پھر مدھم ہو کر بولا۔

''تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہیں ایک محفوظ گھر دوں گا، لیکن جو تم کہنا چاہتی ہو، میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔''

''پھر کیا تھا تمہارا مطلب؟''

بہت غیر متوقع تھی اُس کے لئے یہ آواز...... اُس نے چھٹی حس کے تحت ایلیا کو اپنی پشت کے پیچھے کرلیا تھا۔ سامنے ایک نہایت خوبرو اور وجیہہ شخص ایستادہ تھا۔ چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ خطرناک لوگوں کی لسٹ میں شامل سمجھا جاتا۔ لیکن شہریار جانتا تھا، وہ اپنے بے ضرر گیٹ اپ میں مخلوقِ خدا کے لئے کتنا بڑا خطرہ تھا۔

وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ پارٹی ہیں کی وجہ سے آج کل پاور میں تھا۔ وہ درحقیقت سیاست میں کبھی خود حصہ نہیں لیتا تھا بلکہ سیاسی گیلپ سروے اور یورپی اخبارات میں چھپنے والے اعداد و شمار اور آرٹیکلز میں بہت زیادہ ہائی لائٹ ہونے والی پارٹی پر بے دھڑک پیسہ لگاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دور میں اُس کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ وہ کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتا تھا، اور وہ اُس کا ہی بیٹا تھا۔ کبھی نقصان کا سودا وہ بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اگر ہار کا شک ہونے لگے تو وہ ساری گیم ہی اُلٹ دیا کرتا تھا۔ اُس کے اشارے پر ہونے والے قتل اتنے ضرور تھے کہ انگلیوں پر گننے کے لئے بھی کتنی

بار بار کرنی پڑتی تھی۔ سو اُس کا شک واضح یقین ہو گیا تھا کہ اُس پر بار بار کرائے جانے والے قاتلانہ حملے کس کی ایما پر ہو رہے تھے۔
ایک ماہ پہلے، جو طاقت کی جنگ شروع ہوئی تھی، یہ اُس کا ڈراپ سین تھا شاید۔
اس وقت وہ پوری طرح چوکس تھا، لیکن بغیر ہتھیار کے وہ اُس کے اور اُس کے تین باڈی گارڈز کے سامنے چارے کی طرح تھا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا کہ وہ اس ہنگامی صورتِ حال میں کیا چال چل کر اُسے مات دے سکتا ہے کہ اُس کی ساری سوچیں بھک سے اُڑ گئیں۔
وہ، جو ایک لڑکی تھی........
دنیا جہان کی مظلوم لڑکی........!
جسے اُس نے حفاظت کے لئے اپنی پشت پر کر کے اُس کے دفاع کا بیڑا اُٹھایا تھا، وہ لڑکی اُس کے سامنے کھڑی دکھائی دینے لگی تھی........
سوچوں کے سفر پر وہ ہاتھ چھڑا کر کیسے اُس سے جا ملی؟ وہ حیران ہونے کی خواہش کے باوجود حیران نہیں ہوا۔
"اچھا ہوا، زوار تم آ گئے۔ یہ شخص مجھے پورے مہینے سے ہیرس کر رہا تھا کہ میں کسی طرح تمہیں چھوڑ کر اسے اپنا لوں۔ لیکن یہ نہیں جانتا، ہمارے تعلقات اتنے کمزور نہیں۔"
شہریار عبدالرحمٰن سکتے کی حالت میں وہیں کا وہیں رہ گیا۔ ایک ماہ پہلے ہی کی تو بات تھی، جب ایک کاک ٹیل پارٹی میں اُس نے اُس لڑکی کی چیخیں سنی تھیں اور ہاتھ سے گلاس رکھ کر وہ اوروں کے مقابلے میں زیادہ حساسیت سے اس وائرے کی طرف بڑھا، جو محفل میں شامل رنگین طبیعت افراد کے جمع ہونے سے ترتیب پا گیا تھا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے ماموں؟"
اُسے بہت اچانک بہت ڈھیر سارا غصہ آ گیا تھا۔ زوار حسن کچھ اس طرح ہی آؤٹ ہو گیا تھا۔ لڑکی بری طرح ڈری ہوئی تھی۔
"ایلیا پلیز، ایک راؤنڈ! تمہیں ہماری، تمہاری محبت کی قسم۔"
"زوار! یہ سب کیا ہے؟ قابو نہیں رکھ سکتے تو پیتے کیوں ہو؟"

وہ بآہستگی لڑکی کا ہاتھ چھڑاتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولا تو اُس کا دوست مامون اُس کے قریب آ گیا۔
"شیری! یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ رہنے دو تم۔ زوار اور یہ لڑکی بہت اچھی طرح ایک دوسرے کو مینج کر لیں گے۔"
اُس نے مڑ کے دیکھا اور وہ لڑکی رونے لگی۔
"پلیز سر! میری مدد کیجئے۔"
اُس نے پھر سے مامون کو دیکھا۔
"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ پتہ نہیں کون بے چاری ہے۔"
مامون اُسے کھینچ کر آگے لے گیا۔ سارے مجمع سے الگ۔ پھر خار کھانے والے لہجے میں بولا۔
"مجھے تیری سمجھ نہیں آتی۔ جہاں لڑکی نے چار آنسو بہائے، وہیں تیرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ کہنے کو پتھر مشہور ہے، لیکن بہت آسانی سے مار گرایا جا سکتا ہے اپنی اسی ہمدرد پالیسی کے سبب۔"
"کیا بکواس ہے مامون! تُو جانتا ہے ناں، میں یہ سب کسی طرح کے لغیر کرتا ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی عورتوں کی تذلیل...... چاہے وہ کوئی بھی کرے۔ کسی بھی نوعیت کی ہو۔"
وہ ہاتھ چھڑا کر جانے کو ہوا، تب مامون کو اپنا غصہ دبا رکھنا دُشوار ہو گیا اور وہ پھٹ پڑا۔ پھر خفگی سے لفظ چبا چبا کر بولا۔
"عورتوں کی تذلیل...... عورتوں کی تذلیل سے تیرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ پتہ نہیں، تُو بھول کیسے جاتا ہے اپنی ہی تذلیل...... جس میں عورت ہی پیش پیش تھی۔"
"یہاں اُس عورت کا ذکر کیا...... یہ لڑکی جانا نہ سے بہت مختلف لڑکی ہے۔ اس کے چہرے پر تقدس لکھا ہے، جو کہتا ہے میری حفاظت کرو، مجھے پناہ دو۔"
وہ اب رُکا نہیں تھا اور مامون ساتھ چلتے ہوئے بھنا کر بولا تھا۔
"ہاں، ہاں...... جتنا مرضی آئے، کر لو سوشل ورک...... مگر سوچ لو، اس عورت ذات کے پیچھے جو خوار ہوا، وہ بس خوار ہی ہوا ہے۔"
اُس نے سنی ان سنی کر دی۔ اب وہ اس بڑے سے گھر کے کافی بڑے سے ڈانسنگ فلور کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ وہ لڑکی مارے باندھے زوار حسن کے ساتھ ڈانسنگ فلور پر گھسٹتی پھر رہی تھی۔ ردھم اور ڈانس

میں کوئی تال میل نہیں تھا۔

مامون دروازے پر کھڑا تھا۔اُس نے ہاتھ اپنے بغلی ہولسٹر پر رکھ لیا تھا۔وہ کرائم برانچ کا ایک ذہین دماغ تھا۔حکومت کی طرف سے اُسے کچھ خاص مراعات بھی حاصل تھیں،اس لئے وہ ہائی الرٹ تھا۔
شہریار کے سیڑھیاں چڑھتے ہی اُس نے کسی بھی ممکنہ صورتِ حال کے لئے اپنی فورس کے کچھ خاص ارکان کو اپنے کاشن کا منتظر رہنے کو کہہ کر الرٹ کر دیا تھا مگر یہاں شہریار عبدالرحمن بہت آہستگی سے فلور کی سیڑھیاں چڑھا اور کپلو کائی کی طرح چھٹتے چلے گئے۔

''پلیز شہریار میری پارٹی کو برباد مت کرو۔میری ساکھ کا سوال ہے۔'' مسٹر ہمدانی لجاجت سے بولے۔وہ ساری صورتِ حال میں ماہی بے آب بنے رہے تھے اور اب مکمل طور پر صبر کھو چکے تھے۔
شہریار نے اُنہیں ہراساں دیکھا تو اُن کے کندھے پر دھارس سے ہاتھ رکھا، پھر مدھم ہو کر بولا۔'' آپ بے فکر رہیے مسٹر ہمدانی! ہم آپ کی پارٹی کو خراب کئے بغیر معاملہ طے کر لیں گے۔''
پھر شہریار نے زوار حسن کا ہاتھ پکڑا۔لڑکی مدد ملتے ہی پچھر سے کھل سی گئی تھی۔زوار حسن ڈرنک کی وجہ سے آؤٹ آف کنٹرول تھا۔یہی وجہ تھی کہ اُس کا اُس کے سامنے زیادہ دیر کھڑا رہنا دشوار تھا۔شہریار نے لڑکی کو اپنی کسٹڈی میں لیا۔
زوار حسن نے مدہوش انداز میں دیکھا، کچھ احتجاج کی طرح کا جذبہ بھی بے قابو ہونے کو بے تاب ہوا مگر وہ اپنے ہی جذبے کا بوجھ نہیں سہار سکا۔اُس کے باڈی گارڈ آگے بڑھے مگر مامون عبدالکریم کی تنبیہی نظر کے باعث اپنے باس کو سنبھالتے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔
مامون عبدالکریم شہریار کو محتاط رہنے کا کہہ کر گاڑی تک چھوڑنے آیا، پھر وہ کار پھاٹک سے باہر نکال چکا تھا جب اس لڑکی کے رونے پر وہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔
''اب کیوں رو رہی ہو؟'' بے ارادہ ہی لہجہ رُوڈ ہو گیا تھا اس لئے لڑکی کی ہچکیاں تیز ہو گئی تھیں۔اُس نے گاڑی ایک جگہ سڑک سے سائیڈ پر روکی، پھر ٹشو دیتے ہوئے بولا۔
''تم لڑکیاں روتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتی ہو کہ تمہیں بلاوجہ کی اُمیدیں ہی رُلاتی ہیں۔ہمیشہ آنسو پونچھنے کے لئے ٹشو پیپر بڑھانے والا کوئی مل جائے ضروری نہیں...... اپنے اوپر انحصار کرنے کی عادت تم لوگوں میں کبھی نہیں آسکتی۔پہلے سہارے ڈھونڈتی ہو، پھر اس سہارے کے جدا ہونے پر زمین آسمان ایک کر دیتی ہو...... سنو لڑکی! آنسو بہانے والوں کو یہاں لوگ ایک ٹھوکر مار کر اپنی زندگی سے باہر نکال دیتے ہیں، تامل نہیں کرتے۔ٹشو پیپر دیکھا ہے، گھر سے نکلی ہوئی لڑکی اُسی کی طرح ہوتی ہے، ارزاں...... مصرف کے بعد بے کار......''

وہ اچھی خاصی تقریر کر چکا تھا سو اب اثر دیکھنے کو کچھ دیر کے لئے چپ ہوا تھا۔ لڑکی اب اُس کو خاموش، سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اُس نے لہجے کا اثر زائل کرنے کو اس بار نرمی سے پوچھا۔

"ایلیا......ایلیا رحیم۔" مدھم لہجے میں اُس نے جواب دیا۔

"گھر جانا چاہتی ہو؟" مزید نرم لہجے میں اگلا سوال۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کیوں؟......گھر میں کوئی پرابلم ہے؟" کار دوبارہ اسٹارٹ کر کے سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں پھر نمی اُتر آئی۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ میری مامی مجھ پر بہت ظلم ڈھاتی ہیں اس لئے میں نے گھر چھوڑ دیا۔"

اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اُبھری۔

"مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ کیا میں یہ نہیں جانتا، یہ کہانی کتنی گھسی پٹی کہانی ہے؟ اگر تم کہتیں تم شرمندگی اور نظر نہ ملانے کی وجہ سے گھر نہیں جانا چاہتیں تو میں سمجھتا تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ لیکن خیر، تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے تو تمہارے اچھے برے ہونے سے زیادہ مجھے اپنی اچھائی پر کانسنٹریٹ کرنا پڑے گا۔"

ایلیا رحیم کا اس قدر رسچائی سے اپنے بارے میں رائے سن کر منہ بگڑ گیا تھا۔ لیکن ایلیا رحیم کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ جھکا دینے کا عزم......

پھر باقی کے دن اس عزم کو پورا کرنے میں صرف ہو گئے تھے، مگر شہریار اس ٹائپ کا بندہ ہی نہیں تھا۔ محبت کرنا چاہتا تھا کبھی......لیکن اب اس جذبے سے ہی چڑ گیا تھا اور آج......آج اپنے حُسن کے جال اور اپنے جھکا دینے کے عزم کی چال میں ناکامی پر ایلیا رحیم نے نئی چال چلی تھی۔ سارا الزام شہریار عبدالرحمٰن پر دھر دیا تھا۔ وہ گزرنے والے واقعے سے حال میں لوٹ آیا تھا لیکن ماضی ایک بار پھر اُس پر انگشت نمائی کر رہا تھا۔

گزرنے والی باتیں گزر جاتی ہیں لیکن ہماری زندگی اُن کے درمیان کہیں رُک کر، اٹک کر رہ جاتی ہے۔ ہم آگے، کچھ قدم آگے آ جاتے ہیں مگر سوچتے ہیں تو زندگی کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ ہمیں سوچتی ہوئی،

ہمیں کھوجتی ہوئی......اور ہم وہم سی زندگی کو کہیں اور، کسی اور مقام پر دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ہم کیا جیتے رہے......اور کیا بھول گئے۔لیکن یہاں......وقت خود کو بھولنے ہی نہیں دے رہا تھا۔وہ ایک بار پھر مجرم بنا کھڑا تھا لیکن مجرم کے سامنے خود مجرم بن کر کھڑے ہونا حماقت کے سوا کیا تھا۔

یکدم اُسے لگا،اندر پھر سے ایک مقابلہ اور جیت لینے کی لہر اُٹھی تھی۔وہ دوبدو سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اگر تم سمجھتے ہو،تم ان باڈی گارڈز کے ساتھ مجھے دھمکا سکتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔اس لڑکی کا بیان میرے وکیل کے پاس محفوظ ہے اور میرا بیان وہ آتھ ہے تمہارے لئے......میں جانتا تھا،معاملہ تم سے ہے تو تم سے لڑنے کا انداز بھی کچھ تگڑا ہونا چاہئے،سمجھے! مجھے یا اُس لڑکی کو اگر کچھ ہوا تو میرا وکیل تمہیں اگلے ہی سیکنڈ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے گا۔"

زوار حسن کے چہرے پر شرارت اُبھری اور وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا تم ابھی تک یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ لڑکی میرے پاس میرے خوف کی وجہ لوٹ رہی ہے۔شہریار عبدالرحمٰن! تم ابھی بچے ہو۔جو ڈراوا مجھے دے رہے ہو،وہ میں حقیقت بنا سکتا ہوں۔اگر فرض کرو،یہ لڑکی خود جا کر تمہاری ہیرسمنٹ کی داستان سنا دے تو تمہارا کیس اپنے آپ مرجائے گا اور میں تمہیں بدنام کرنے کے لئے ایسا ہی کروں گا......ایسا ہی کروں گا تا کہ تمہیں پتہ چلے،دوسروں کی محبتیں چھیننے والوں کا انجام بخیر نہیں ہوا کرتا۔میں تمہیں بتا دوں گا کہ بدنامی کیا ہوتی ہے۔

"نہیں،پلیز زوار!تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔"

ایک نئی مگر بہت سنی ہوئی آواز سنائی دی۔پہلے صرف حیرت تھی آنکھوں میں لیکن اب کرب آ گیا تھا۔سالار عبدالرحمٰن اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"مسٹر سالار! میں آپ کی شخصیت کا معترف ہوں لیکن میں اپنی دشمنی بھول جانا اپنی انا کی توہین سمجھتا ہوں۔"

سالار عبدالرحمٰن کھڑے تھے اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔کچھ کہنے،اپنی ذات کی صفائی دینے کی ساری صلاحیتیں بھک سے اُڑ گئی تھیں۔سالار عبدالرحمٰن اور اُس کے درمیان ایک عرصے سے Conflict چلتا رہا تھا۔سالار عبدالرحمٰن کا گھر بچانے کے چکر میں اُس نے بہت سے الزامات اپنے سر لئے تھے مگر یہ الزام......

اُس کی آواز کہیں اندر سے مر گئی تھی۔بس سالار عبدالرحمٰن اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"تمہیں دوسروں کی محبتیں چرانے کا کتنا شوق ہے شہریار! آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟" وہ غصے سے پھنکارے اور اس کے اندر مر جانے والی آواز نے آخری سانس بھرا۔

"سنی بھائی! آپ اس بار بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" بابزار وقت لفظ مجتمع کیے مگر وہ اُس کی طرف سے ہمیشہ کی طرح کمر موڑ کر زوار حسن سے مخاطب ہوئے۔

"زوار! ایک بات پر تو تم متفق ہو گا؟"

"کس بات پر مسٹر سالار؟" اُس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے جواباً کہا۔

"یہی بات کہ مسٹر زوار حسن! کسی ایک فرد کی غلطی کی سزا سارے خاندان کو نہیں ملنی چاہیے۔ دیکھیے، میں اچھی طرح جانتا ہوں، میرے بھائی کی عادتیں ناقابلِ برداشت ہیں۔ ہم بھی ان عادتوں اور اس سے تنگ ہیں۔ لیکن پلیز! بہتر ہے، آپ بھی ہماری طرح انہیں نظر انداز کر دیں۔ دیکھیں، بزنس کمیونٹی میں ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے، ہم ہی ایک دوسرے کا خیال نہ کریں تو کون کرے گا؟"

زوار حسن نے اُنہیں ڈھیلے اعصاب سے دیکھا۔

"جیسے آپ کی مرضی مسٹر سالار! ویسے خوشگوار احساس ہے میرے لیے کہ عبدالرحمٰن فیملی میں آپ جیسے معاملہ فہم لوگ بھی موجود ہیں ورنہ مسٹر شہریار نے تو آپ کی فیملی کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

برداشت...... یہ سب برداشت سے باہر تھا۔ وہ ذرا سا آگے ہوا۔

"سنی بھائی! آپ کو میرے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمی ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ تمہارے بارے میں مجھے ہی نہیں، اور بھی بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہے۔ لیکن یہ صرف میں جانتا ہوں کہ تم کیا ہو۔"

سالار عبدالرحمٰن نے ایک الزام کی بات نئے الزام سے برابر کر دی۔ وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ خاموشی اُس کے اردگرد ہی نہیں، خود اُس کے اندر بھی بھرتی چلی گئی تھی۔ اُس کا اندر جو بہت خالی تھا، درون ذات خالی ہتھیلی سے زیادہ کچھ نہیں تھا وہ۔

اور پھر یہ بھی تو طے ہے، جب کہیں کسی دل میں آپ رد کر دیئے گئے ہوں، کوئی آپ سے نفرت کرنے کی حد تک ناپسندیدگی اختیار کر لے تو شخصیت کا زور باقی کہاں رہتا ہے۔

دل کی طرح سب کچھ لوٹ جایا کرتا ہے......اور لوگوں کو آپ کی ہر درست بات بھی غلط لگنے لگتی ہے۔معمولی سا بھی معمول سے ہٹا ہوا عمل قابلِ تعزیر جرم ہو جایا کرتا ہے......اور یہ بات وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔گھر میں جازی عبدالرحمٰن کالج بوائے اور دانیا عبدالرحمٰن کالج لیکچرار کے سوا کون تھا جو اُس کی کہی ہر بات پر آمنا صدقنا کرتا تھا۔یہی دو تو تھے اُس کی زندگی کی کلید......جن کی خوشیاں صرف اُس کی ذات میں پنہاں تھیں۔جن کے لئے وہ خود بھی شاید مرجانے کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا اور مرجانے کو ترجیح دیتا۔لیکن سالار عبدالرحمٰن......

وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تھا، اس لئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھا۔وہ جانتا تھا، آج رات کے کھانے میں کون سی بات اسٹوری کورہوا چاہتی تھی، کسے مورد الزام ٹھہرایا جانا تھا اور کسے پھانسی لگنی تھی، وہ جانتا تھا۔اور یہ جان لینا ہی تو عذاب ہے۔آگہی کبھی انسان کو خوشی نہیں دیتی۔خود فراموشی ایک جنت ہے۔

وہ سوچ جا رہا تھا جب اُس کے موبائل پر بیل ہوئی۔اُس نے دھیان کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر بے دھیانی کو حسرت سے تکا اور موبائل آن کر لیا، یہ جانے بغیر کہ دوسری طرف کون ہے۔اور ایسا ہوتا ہے، جب آپ کی ذات، ذاتی ملکیت جیسی ہو جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پہلا پتھر کون اُٹھاتا ہے یا ذات کے بخیے اُدھیڑنے کے لئے پہلا ٹانکا کون اُدھیڑتا ہے؟

"ہیلو......!"

تھکن اُس کے لہجے سے ہی نہیں، ہر انداز سے پھوٹ رہی تھی۔منزل کا گمان ہو تو چلنے کی تھکن تھکاتی نہیں ہے اور آگے بڑھنے کی لگن جوش بھر دیتی ہے۔لیکن اگر منزل سراب ہو کر ملنے کا یقین ہو تو، انسان یونہی تھک جاتا ہے۔

"ہیلو!......کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف کی خاموشی سے جھلا کر اُس نے اس بار تلخی سے پوچھا تو دوسری طرف کھلکھلاتی ہنسی ابھری وہ چونک گیا۔

"کون بول رہا ہے؟" تجسس اُس کے لہجے سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔تب بہت حیرت سے پوچھا گیا تھا۔

"یہ کیا شیری! اتنی جلدی بھول گئے مجھے؟ اپنی سب سے پیاری گرل فرینڈ کو؟"

ناز، ادا، چبھن، سب اُس کے لہجے میں در آیا تھا اور شہریار عبدالرحمٰن......اُس کے چہرے سے لگتا تھا، اگر اُس کا بس چلتا، وہ کب کا اُس چہرے کو مٹا چکا ہوتا۔اُس چہرے کو، جس نے اُسے مٹا دیا تھا......

”جانانہ! تم........ تمہیں فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ کیا زندگی میں کوئی ٹف ٹائم آگیا ہے یا کوئی ساتھ دینے والا نہیں رہا؟“

لفظ چبا چبا کر وہ اس طرح بول رہا تھا، جیسے جانانہ بھی کوئی لفظ تھی۔ مگر وہ لفظ نہیں، انسان تھی۔ اس لئے اسی ادا سے بولی تھی۔

”پتہ نہیں شیری! تم یہ کب تک سمجھ سکو گے کہ ساتھ دینے، ساتھ رہنے والے لوگ دنیا میں کم نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کا والٹ خالی نہیں ہے، دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اور رہا ٹف ٹائم تو یہ ہیڈک ہمیشہ میں نے دوسروں کے نام کی ہے۔ مجھ جیسی پری جمال کہاں اس کا بار اٹھا سکتی ہے۔ ہے ناں؟“

وہ پھر کھلکھلانے لگی تھی اور شہریار جانتا تھا، اس کی بات کا ابھی مقصد پورا نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا، وہ ہمیشہ کسی دل دکھانے کی اطلاع پر بھی اسی طرح کھلکھلا کر ہنسا کرتی تھی اور جب تک وہ راز اگل نہ دیتی، تب تک اسے فون کرتی رہتی۔ موبائل آف ہوتا تو گھر کا فون، دفتر کا فون ہوتا اور گھنٹیاں بجتی ہی رہتیں اور لامحالہ سب کی نظریں اس پر آکر اٹک جاتیں۔ وہ نظریں، جن میں حیرت، خفگی، ناپسندیدگی ہوتی۔ یہی وجہ تھی، وہ اب اس معاملے میں کافی محتاط ہو گیا تھا۔

وہ منتظر تھا، تبھی جھنکار ہوئی، چوڑیاں چھنکیں اور اس نے کہا۔

”تم نے اپنا موبائل آف نہیں کیا، میری خاموشی کے باوجود؟ شیری! تم مجھے کتنا جاننے لگے ہو ناں؟ ویسے بھی مجھے لگتا ہے، کہیں تم واقعی مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے؟ سنا ہے محبت میں ہی دلوں پر الہام اترا کرتے ہیں۔“

”پلیز جانانہ! میں فضول باتوں کو سننے کے لئے کبھی فارغ نہیں ہوتا۔“

اس نے موبائل دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور دوسری طرف لبھاتی ٹھنڈی سانس بھر کر کہا گیا۔

”ہائے........ کاش میں واقعی تمہارے دل کی جانانہ ہوتی۔ لیکن خیر، اب بھی مجھے چاہنے، پسند کرنے والے کم تو نہیں۔“

”کیا تم نے صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے؟“ وہ تپ کر، بھنا کر چیخا اور وہ ہنسی۔

”چہ، چہ........ شیری! تمہیں اتنا لاؤڈ بولنا سوٹ نہیں کرتا۔ تمہاری شخصیت پر تو صرف روڈ لہجہ جچتا ہے۔ ویسے تمہیں صرف ایک بات ریمائنڈ کروائی تھی۔ شاید تمہیں یاد ہو، کچھ ماہ پہلے تم نے مجھ سے کہا تھا،

اب حالات بہت مختلف ہیں جاناں۔ اب تم مجھ پر پہلے کی طرح اٹیک نہیں کر سکتیں کیونکہ اب مجھے اپنی شخصیت کے کسی پہلو کی دھجیاں اُڑنے کا خوف نہیں۔ میں سب گنوا چکا ہوں...... لیکن تم غلط تھے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم اب بھی اپنے سے ہر منسوب رشتے کے لئے اتنے ہی حساس ہو۔ تم ابھی تک، بچھڑنے کے باوجود ہر رشتے کے بچھڑنے سے خوف زدہ ہو...... اور تمہیں معلوم ہے ناں، خوف زدہ انسان کو ڈرانے میں کتنا مزہ ملتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" وہ چونکا تھا۔

"ایلیا...... میں ایلیا رحیم اور زوار حسن کی بات کر رہی ہوں شیری! تم پر مجھے ترس آتا ہے کیونکہ تم پرانی کہانی پر آج پھر سے نئے طریقے پر ٹریپ ہوئے ہو...... اور میں جب چاہوں، جتنی بار چاہوں، تمہیں کسی بھی کہانی میں لائم لائٹ کریکٹر بنا سکتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں، میرے ہاتھوں میں بلا کا جادو ہے۔ تمہیں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہوگا...... ہے ناں؟"

وہ کچھ کہے بغیر فون آف کر چکا تھا۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُس نے صرف ایک پرانا حساب، نئے حساب سے جوڑا تھا لیکن وہ خسارے کا اندازہ کر سکتا تھا۔

اُس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ خالی تھے۔ اُس میں گھر جانے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ پھر بھی اُٹھا تھا، باہر آیا تو زخم چیخ چیخ کر آرام کی تلقین کر رہا تھا۔ بخار سے بدن پھنک رہا تھا مگر وہ پھر بھی گاڑی میں آ گیا تھا۔ گاڑی باہر نکالی تو ارادہ گھر جانے کا کیا تھا، لیکن قدم کسی اور راستے کی سمت اُٹھنے پر بے قرار تھے۔

اس راستے پر پہلے وہ کبھی کتنا چلا تھا۔ اُس نے اندازہ کیا اور جانا کہ شاید وہ یہاں آنکھیں بند کر کے بھی آ سکتا تھا۔ سامنے سفید ماربل کی عمارت کھڑی تھی۔ سوچنے میں آدھے گھنٹے کا راستہ سمٹ کر سیکنڈوں میں در آیا تھا۔ اُس نے سوچا، کبھی یہاں سے گھر تک کا فاصلہ کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ صدیوں قرنوں تک کا...... اور وہ کیسا چل چل کر ہانپ گیا تھا۔ نہ سایہ تھا، نہ کوئی دلاسہ...... بس وہ تھا اور وقت کی اُلٹی گنتی۔ سانس بخار کی حدت سے اس وقت بھی تیز تھی مگر آج اُس کے پاس کھونے کے لئے تھا ہی کیا۔ ہر تعلق، ہر رشتہ تو وہ بہت سال پہلے کھو چکا تھا۔ آج وہ یہاں تھا تو صرف اُس کی ذات اُس کی اپنی تھی۔ سو بے کار چیزیں، جن کے ہونے کا نہ دلاسہ ہو، نہ کھونے کا دُکھ، اُن کو گنوا دینے پر کیا پچھتاوا......

وہ کار کا ہارن بجا رہا تھا۔ باوردی گارڈ نے دروازہ کھولا تھا۔

"آپ مسٹر شہریار عبدالرحمٰن ہیں سر؟" شائستہ لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

تو اُسے یقین تھا، میں یہاں آؤں گا...... اُس نے بے دلی سے سوچا۔ ایک خیال آیا، کار بیک کر کے واپس موڑ لے مگر انٹر کام کی تیز آواز میں وہ کھنکتے لہجے میں پکاری تھی۔

''شہریار! ناراضگی اپنی جگہ، مگر جس بات کو کہنے کے لئے یہاں آئے ہو، وہ تو کہہ ہی سکتے ہو۔ میں بری میزبان نہیں ہوں، تم جانتے ہو۔''

تب وہ گاڑی اندر لے گیا تھا۔ پھر اندر کی رہنمائی کون سی مشکل تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو حیران نہیں ہوا تھا۔ مزوار حسن، ایلیا رحیم بھی ساتھ ساتھ تھے اور بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

''مجھے بہت افسوس ہے شیری! تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا زوار نے۔''

اُس نے گلاس اُس کی سمت بڑھایا مگر وہ کھڑا رہا۔ پھر دونوں کو نظروں کے حصار میں لے کر پکارا۔

''تم دونوں نے جو کچھ کیا، میں بھولا نہیں ہوں۔ اور جانا نہ! تم جانتی ہو، میں اپنا اُدھار بھی کسی پر نہیں رکھتا۔''

جانا نہ کی ہنسی، دلکش نقرئی گھنٹیوں کی طرح اردگرد گنگنا اُٹھی۔ ایک لمحے کو اُس کے دل کو کچھ ہوا مگر وہ سنبھل گیا۔ سامنے جو کچھ بھی تھا محض بھرم تھا، دھوکا تھا۔

''اتنا حیران کیوں ہو شیری! لگتا ہے، تم مجھے بھول گئے تھے؟'' اُس نے ادا سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ کرنٹ لگنے جیسی کیفیت سے دوچار ہو کر اُسے گھورنے لگا لفظ کہیں اندر سرسراتے پھر رہے تھے۔ ایسے جیسے رنگ برنگے سانپ۔ کتنا زہر بھرا تھا ان لفظوں میں، وہی جانتا تھا۔ کسی کا وجود نیلا پڑتا ہے، اُس کی تو روح نیلی پڑ گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، پھر سے اُس کے سامنے آ گیا تھا۔ خود بخود اُس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا جانا نہ! اور تمہیں بھولنا، وہ تو ایسے ہے، جیسے میں اپنے ہر زخم، ہر درد کو بھول جاؤں۔ میں تمہیں یاد رکھتا ہوں، تبھی تو مجھے وہ نفرت یاد رہتی ہے، جو کبھی میں نے تم سے کی تھی، میری فیملی نے مجھ سے روا رکھی اور خود میں نے تنہائی میں بار بار اپنے آپ سے محسوس کی...... جانا نہ! میں تمہیں نہیں بھول سکتا، جس طرح تم مجھے نہیں بھول سکتیں۔''

جانا نہ نے پھر سے گلاس اُس کی طرف بڑھایا، یوں جیسے وہ مدتوں بعد ملے ہوں اور ان میں کبھی کوئی بدگمانی تک نہ رہی ہو۔

شہریار نے اُس کے اطمینان کو دیکھا تھا۔ ایلیا رحیم اور زوار حسن کی دلچسپ نظروں کو اپنے اندر کھبتے محسوس کیا تھا۔ تبھی اُس نے فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے بیٹھ گیا تھا۔ گلاس اب اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عادی بلا نوش نہیں تھا مگر کبھی کبھی بزنس پارٹیز میں یا ٹینشن دور کرنے کے لئے ایک دو پیگ لے لیا کرتا تھا۔ یہاں پر وہ محض جانا نہ کو یہ دکھانے کے لئے پی رہا تھا کہ وہ اُس کی کسی بھی بات سے ڈسٹرب نہیں ہوا تھا۔

"آج بھی تم Neat ہی لیتے ہو۔ تمہاری عادتیں نہیں بدلیں شیری! تم پہلے ہی کی طرح ہاٹ اینڈ کول ہو۔" لہجے میں ترغیب تھی، مگر وہ مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔

"اگر تمہیں لگتا ہے تم مجھے بے وقوف بنا سکتی ہو تو یہ بھول ہے تمہاری...... تمہیں پتہ ہے، میں عام مردوں کی طرح تم جیسی عورتوں کے چکر میں نہیں آیا کرتا۔ یہ میرا ڈیپارٹمنٹ ہے ہی نہیں۔"

"تم کتنے سنگ دل ہو شیری! او خوب صورت لڑکیوں کے سامنے اُن کی خوب صورتی کے جادو سے انکار کر رہے ہو۔ دیکھو، یہ سراسر ناانصافی ہے۔"

شہریار نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور ایلیا اُس کے دونوں کاندھوں پر دباؤ ڈالنے لگی۔ لمس میں شدت تھی اور انداز میں خود سپردگی...... اُس نے سر اُٹھا کر اُس کا چہرہ دیکھا۔

"یہ چہرہ کتنا معصوم ہے، کتنا زیادہ معصوم کہ انسان اس کے آنچل کی پاکیزگی کی قسم اُٹھانے میں ایک پل نہ ہچکچائے، مگر اس کا عمل......

اُس نے ہولے سے اُس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیئے۔ "تمہیں اپنی شکست پر افسوس ہوگا ایلیا! اور میں لڑکیوں کے دل کو توڑنے یا ٹوٹ جانے کی تکلیف دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر مدھم بولا۔ "مجھے بھی اپنی پاکبازی کا دعویٰ نہیں رہا۔ میں بہت آئیڈیل انسان نہیں رہا، نہ ہی ماڈرن کا کوئی دیوتا ہونے کا ڈھونگ کیا ہے میں نے...... ہاں، مگر ایک عام انسان کی جتنی بھی خامیاں مجھ میں ہیں، ان میں سے عورت کی تذلیل، خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو، قطعاً میرے کردار میں جگہ نہیں پا سکی ہیں۔ اس لئے شاید میں تمہارے لحاظ سے قطعاً بے کار شخص ہوں۔"

ایلیا نے نیا گلاس اُسے سرو کیا اور زوار حسن اُسے دیکھنے لگا۔

"کم آن شیری! ڈرنک کرتے ہو اور چیونگم چبانے والی عمر کی باتیں لے بیٹھے۔ یہ وقت صرف عیش کرنے کا ہے۔ یہ زندگی اور جوانی، یہ بہت کم مدت کی ہیں۔ جتنا خود کو کیش کروا لوگے، اُتنا ہی زندگی میں لطف اور تھرل رہے گا۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے اُسے یوں دیکھا، جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی نا سمجھی پر فہمائش سے دیکھے، لیکن اُس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ بہر حال جانتا تھا، زندگی کا کوئی بھی روٹ ہو، ایک بار کوئی انسان چل پڑے تو وہ ون وے روٹ بن کر رہتا ہے، کبھی دل واپس پلٹنے میں ساتھ نہیں دیتا۔ کبھی وقت اور حالات دھوکا دیتے ہیں اور سفر...... سفر کسی بھی طرح کا ہو، بالآخر طے ہو کر رہتا ہے۔ چاہے منزل ملے یا منزل کی شکل میں دھوکا...... یا چاہے منزل ملنے کی حسرت میں لٹی موت...... انجام کچھ بھی ہو، انجام وراثت کی طرح ضرور تقسیم ہوتا ہے...... اور وہ چاہے کیسا ہی سہی، آج تک اُس رب کی کسی بھی تقسیم پر اُس نے احتجاج نہیں کیا تھا، سو یہاں بھی اُس نے خاموشی اختیار کی تھی۔ پھر اس سے بھی زیادہ خاموشی سے چابیاں اُٹھائی تھیں۔ لیکن جب کھڑا ہوا تو لامحالہ چکر آ گیا تھا۔ زوار حسن اور جانا نہ ویسے

ہی بیٹھے رہے۔ بس ایلیا کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اُسے سنبھالنا چاہتی تھی مگر وہ خود کو اس وقت تک سنبھال چکا تھا۔ وہ اُس سے صرف پانچ قدم دُور کھڑی تھی جب اُس نے کہا۔

"انسان اگر اکیلا چلے تو وہ گرتا نہیں ہے۔ گراتے تو سہارے ہیں یا سہارے کا دھوکا۔ تم کہیں سے بھی چلی ہو، اکیلی چلی تھیں، پھر گرنے کی حسرت میں سہارے کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟ گرنا ہی جب مقدر ہو تو کسی سہارے کا بھی کیا احسان لینا...... تم اچھی نہیں ہو، یہ تم سمجھتی ہو۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم بری بھی نہیں ہو۔"

ایلیا کے اندر سنسناہٹ سی ہوئی۔ پتہ نہیں کون سا لفظ، کون سی کمزوری پر ضرب بن گیا۔ اندر کچھ پگھلنے لگا تھا۔ مگر وہ جہاں تک آ چکی تھی، وہاں سے واپسی ممکن ہی کب تھی، اس لئے وہ خالی آنکھیں، سپاٹ چہرہ لئے اُسے پھر سے تکنے لگی۔

شہریار نے ایک لمحے کو دیکھا اور پھر پشت موڑ لی۔ قدم ایک کے بعد ایک اُٹھنے لگے تو اُٹھتے ہی چلے گئے۔ مگر کار تک پہنچا تو مصنوعی قسم کی ہمت منہ کے بل زمین پر آ گری۔ تکلیف، تھکن، تذلیل، بخار کی حدت اور ڈبل پیگ، سب نے مل کر اُسے پچھاڑ دیا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا خود پر ہنس رہا تھا۔ رسٹ واچ میں دو بج رہے تھے اور وہ اپنی کار میں تنہا بیٹھا تھا۔

"میں کہاں ہوں، کوئی نہیں جانتا...... مجھے کہاں جانا ہے، میں نہیں جانتا...... مجھے کہاں ہونا چاہئے، زندگی لاعلم ہے۔ اور میں حسرت بنا یہاں بیٹھا ہوں۔ مجھے کس کی تلاش ہے؟ میرا کیا کھو گیا ہے؟ وقت نے مجھے کہاں گنوا دیا ہے؟ سب کچھ لاعلمی کی چادر میں گم ہے۔ میرا انتظار کہاں ہو رہا ہے اور میں کہاں کے لئے چلتا جاتا ہوں؟ سوچنا ہی عبث ہے۔

اُس کے دل میں جتنی جلدی معکوس سوچیں پیدا ہوئی تھیں، اُس نے اتنی ہی جلدی اُنہیں سر سے جھٹک دیا تھا۔ کار کے اگنیشن میں چابی گھما کر اُس نے کار اسٹارٹ کر کے بیک کرنی شروع کر دی تھی۔ واچ مین گیٹ کھول کر واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

شہریار کار کوٹھی سے نکالتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا تھا۔ طویل سڑک طویل زندگی کی طرح خالی پڑی تھی مگر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اُسے چلنا تھا۔

کار سبک رفتاری سے چل رہی تھی۔ اُس نے کار میں FM لگا لیا تھا۔ اندر کا شور بڑھ جائے تو باہر کے شور سے اُسے بھرنے کی ناکام سی کوشش ہر کوئی کرتا ہے اور اس لمحے بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ سامعین اور پریزنٹر کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ کوئی لڑکا اپنی چھوٹی بہن کو برتھ ڈے وِش کر رہا تھا۔

15 جولائی...... یکدم اُس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ آج تو رانیا کا بھی برتھ ڈے تھا۔

افوہ،اس لئے جازی مجھے دفتر سے پک کرنے آنا چاہتا تھا۔کوئی سرپرائز پارٹی رکھی تھی دونوں نے اور میں.......

اُس نے رسٹ واچ دیکھی۔ڈھائی بج رہے تھے۔کوٹ کی جیب میں موبائل ٹٹولا مگر شاید فلیٹ میں رہ گیا تھا۔وہ تیزی سے ڈرائیونگ کرتا فلیٹ پہنچا۔دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اندھیرے فلیٹ میں موبائل کی آواز خاصی پراسرار لگ رہی تھی۔حالت ایسی تھی کہ دل ودماغ اندھیرے میں ڈوب جانے کو بے قرار تھے۔سڑک پر بھی اُس نے گاڑی بہت غیر ذمہ داری سے چلائی تھی۔اگر رش ہوتا تو ایکسیڈنٹ لازمی تھا مگر خیر ہوئی کہ وہ بہ عافیت گھر پہنچ گیا تھا۔پھر وہ گلاس ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا، جہاں موبائل کی بیپ اور جگنو جیسی روشنی ایک ساتھ چمکی۔اُس نے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے موبائل اُٹھا لیا۔کوشش یہی تھی موبائل آف ہو جائے یا کرنے والا تھک جائے کیونکہ وہ جانتا تھا، اس وقت شہر میں اگر اس کے لئے کوئی پریشان ہوگا تو جازی عبدالرحمٰن یا دانیا عبدالرحمٰن کے سوا کوئی اور نہیں ہوگا اور اس لمحے ڈرنک کر لینے کی وجہ سے وہ ان دونوں میں سے کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔گھر میں سب جانتے تھے، وہ پیتا ہے، لیکن جازی اور دانیا ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتے تھے۔

''ہمارے شیری بھائی ایسے نہیں ہو سکتے۔''

اور آج وہ اُن کا یہ بھرم ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔موبائل آف ہو چکا تھا۔وہ ابھی اسے رکھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر سے بجنے لگا۔ریسیو کرنا مجبوری تھی۔

''ہیلو،شہریار۔''

لہجے میں تھکن سی تھکن تھی اور دوسری طرف بلا کا حساس جازی عبدالرحمٰن........

''بھائی! کہاں ہیں آپ؟........میں گیارہ بجے سے آپ کا موبائل ٹرائی کر رہا ہوں۔پاپا نے بتایا تھا، دفتر میں آپ پر اٹیک ہوا تھا۔آپ کا زخم........آپ کا زخم کیسا ہے بھائی! بتائیں ناں، آپ کیسے ہیں؟''

موبائل کان سے لگا تھا مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا۔

کبھی کبھی ہوتا ہے ناں، آپ کہیں کسی سمت بھاگے جا رہے ہوں تو اکیلا ہونے پر بھی تھکن آپ کو جیتنے پر نہیں آ کساتی۔دراصل آپ جانتے ہیں، آپ اس کی مہمانداری کر ہی نہیں سکتے۔لیکن اگر کوئی بازو کھولے آپ کے سامنے آ کھڑا ہو تو پھر........پھر آپ کو لگتا ہے، دو قدم بھی چلنا شاید ممکن نہیں ہے۔بس اس لمحے بھی یہی ہوا تھا۔وہ جازی عبدالرحمٰن کی آواز کی بانہوں میں اپنی سماعت دے کر صوفے پر ڈھے سا گیا تھا۔لفظ، کوشش، ہمت سب جواب دے گئی تھیں اور دوسری طرف کی بے قراری........

"بھائی! کہاں ہو آپ؟...... اپنے فارم ہاؤس میں؟" وہ مختلف لوکیشنز دوہرا رہا تھا اور جواب میں اُس کی زبان صرف نہیں کا لفظ ادا کر پا رہی تھی۔
کیا میں مرجانے والا ہوں؟...... گھٹن سے سانس کہیں اٹکنے لگی تھی۔ اُس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی، کوٹ وہ کب کا اُتار کر پھینک چکا تھا۔ ڈرائنگ رُوم میں اے سی کی کولنگ تھی لیکن اُس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔
"جازی!" جانے کیسے اُس کے حلق سے 'نہیں' کے بعد یہ پہلا لفظ نکلا۔
"شیری بھائی! کیا ہوا؟...... آپ ٹھیک تو ہیں؟" جذبات کا اُبال وہاں نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا اور تبھی کسی نے موبائل چھین لیا۔
"شیری بھائی! آپ بتاتے کیوں نہیں، آپ کہاں ہو؟ کس حالت میں ہو؟"
اُس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ جس حالت میں تھا، اس میں کسی کی توجہ، کسی اپنے پن کی شدید طلب تھی۔
"دانیا! آج تمہاری سالگرہ تھی۔"
"آپ کہاں ہو؟" دانیا کی گھبراہٹ زدہ آواز اُبھری۔
اور بس، یہ وہ آخری احساس تھا، جس نے اُس کے وجود کو چھوا۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اُس نے موبائل اُٹھانے کے لئے جھکنے کی کوشش کی اور بس، پھر وہ خود بھی گرتا چلا گیا۔ خود کو روکنے کی کوشش میں ٹیبل پر ہاتھ رکھا۔ فلاور واز بھی چھناکے سے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ موبائل میں سے جازی اور دانیا کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں، لیکن اُس کی حسیات اندھیرے کی چادر میں گم ہو چکی تھیں۔
"کیا کہہ رہے تھے بھائی؟ دانیا بجو! آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟" جازی نے دانیا کو کاندھے سے ہلا کر رکھ دیا۔ موبائل وہ چھین چکا تھا۔ رابطہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ سو وہ پھر سے چیخنے لگا۔ "شیری بھائی!...... شیری بھائی!"
دانیا نے اُس کی طرف خالی نظروں سے دیکھا۔ "پتہ نہیں شہریار بھائی......" وہ کچھ کہنے سے پہلے ہونٹ چبانے لگی۔ اتنا کہ اُس کے اُوپری ہونٹ سے خون نکلنے لگا۔ انہونی کو وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اور جازی، وہ اس سے کہیں زیادہ پاگل تھا۔ تبھی گھر کے نمبرز سے شہریار کے دوستوں سے اُن کے متعلق پوچھنے لگا، مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

''جازی! ایک نمبر رہ گیا ہے، جہاں ہمیں پہلے ہی فون کرلینا چاہیے تھا۔'' لہجے میں عجیب کرب تھا۔

''آپ جانانہ کی بات تو نہیں کررہیں؟''

دانیا نے یوں سر جھکالیا، جیسے کوئی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہوجائے۔

''آپ نے ایسا کیوں سوچا کہ شیری بھائی ابھی تک جانانہ سے رابطے میں ہیں؟''

دانیا کچھ نہیں بولی، تیزی سے ایک نمبر پریس کرنے لگی۔

کتنی دیر تک بیل ہوتی رہی، پھر کسی کی چہکتی آواز سنائی دی۔ ''افوہ! اتنی جلدی تم سے دوبارہ بات ہونے والی ہے...... مجھے اندازہ نہیں تھا۔ شیری! تم مجھے اب بھی مس کرتے ہو ناں؟''

''ہیلو، میں دانیا بول رہی ہوں۔'' ہونٹ بھینچ کر اُس نے مخاطب کیا اور دوسری طرف چند ساعت خاموشی چھاگئی، جیسے کوئی طرزِ تخاطب سنبھال لینے پر کمربستہ ہو۔ گلا کھنکھارا گیا تھا، پھر وہی سریلی آواز سنائی دی تھی۔

''دانیا کون؟ کیا شہریار کی بہن بول رہی ہو تم؟''

''جی ہاں! میں شہریار عبدالرحمٰن کی بہن بول رہی ہوں۔ پلیز، کیا آپ بتاسکتی ہیں، شہریار بھائی سے کیا آج آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟''

لہجے میں التجا تھی کہ وہ اس سوال کا جواب نفی میں دے مگر آج ہر بات میں اُسے شکست ہورہی تھی۔ جانانہ نمک مرچ لگا کر اُس کی آمد اور یہاں سے چلے جانے کا پوری تفصیل سے منظرنامہ بیان کررہی تھی۔

دانیا سنتی رہی، پھر ریسیور رکھ کر مڑی۔

''جازی! میرے ساتھ چلو...... میں شاید اب جان چکی ہوں، شیری بھائی کہاں ہوں گے۔''

جازی عبدالرحمٰن بائیک کی چابی لے کر اُس کے ہمراہ کمرے سے نکلا۔ وہ بہت زیادہ خاموش تھا۔ یوں، جیسے کوئی کم سن بچہ اچانک چند لمحوں میں کسی حادثے، کسی واقعے سے ڈس ہارٹ ہوکر بڑا ہوجائے۔ دانی نے پُرسوچ نظروں سے بس اُسے ایک بار دیکھا تھا، پھر خاموشی سے اُس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ کر اُسے راستہ سمجھانے لگی تھی۔ وہ بے حد خاموشی سے مختلف سڑکوں پہ بائیک دوڑا رہا تھا جب بہت

اچانک وانیا نے کہا۔

''ہو سکتا ہے، جانانہ نے ہمیں پھر سے شیری بھائی سے بدگمان کرنے کی کوشش کی ہو۔ کیا پتہ، وہ وہاں گئے ہی نہیں ہوں اور بس وہ ہمارے دلوں میں اُن کی طرف سے فاصلے بڑھانا چاہتی ہو۔''

''یہ آپ کب سے جانتی ہیں بجو! کہ بھائی اب بھی جانانہ سے ملتے رہتے ہیں؟''

شاکڈ لہجہ، خالی آنکھیں...... وانیا کو لگا، اُس سے کوئی بہت بڑی بھول ہوگئی ہے۔ جازی، شہریار کے متعلق جتنا حساس تھا، اس کے پیشِ نظر اُسے یہ سچ اتنی جلدی اُگلنا نہیں چاہئے تھا۔ لیکن اس لمحے بات سنبھالنی مشکل ہوئی جاتی تھی مگر اُسے یہ کرنا تھا۔ جازی عبدالرحمٰن کو منتشر خیالی سے بچانے کے لئے یہ لازمی تھا۔

''سنو! اگر تم نے میری کسی بات سے کوئی غلط مطلب لیا ہے تو پلیز اُسے جھٹک دو۔ تم تو جانتے ہو، جانانہ پانچ سال پہلے جس طرح بھائی کو برباد کر چکی ہے، آج بھی اُس کے دل کی یہ پرخاش ختم نہیں ہوئی ہے۔ وہ اب بھی انہیں نئے نئے الزامات کے لیبل لگا لگا کر بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔''

''بجو پلیز! آپ کی محنت قطعاً کارگر نہیں رہے گی۔ شیری بھائی کے متعلق میری بہت سی غلط فہمیاں آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی ہیں۔ انسان اچھا ہو تو کوئی ایک تو اس کی گواہی دیتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا صرف کسی ایک انسان ہی کو بدنام کرنے پر تُل جائے؟...... آپ بھول سکتی ہیں، بڑے بھیا کے کرتوت، اُن کے سو کالڈ آفیشل فلیٹ کی رنگینیاں...... مگر مجھے پتہ نہیں، کیوں لگنے لگا ہے، ہم آج تک ایک غلط انسان پر اپنی محبتیں لٹاتے آ رہے ہیں۔''

وانیا کے ہاتھوں نے اُس کے کاندھوں کو بے یقینی کے دباؤ سے چھوا۔

''جازی! مجھے حیرت ہوتی ہے تم بھائی سے اتنی جلدی بدگمان ہو سکتے ہو۔''

''اتنی جلدی؟...... بجو! پورے سترہ سال سے میں اُن کی حمایت کر رہا ہوں۔ اور خود آپ تو اس سے بھی زیادہ سالوں سے ان کی حمایت کی پاداش بھگت رہی ہیں۔ آپ کی زندگی کی اولین خوشی بھائی نے چھین لی لیکن پھر بھی آپ اُن کے ہاتھوں کو عقیدت سے چوم رہی ہیں۔ آپ کو اپنی تمناؤں کا خون ان کے ہاتھوں پر کیوں نظر نہیں آتا؟ سالار بھیا کے دل کا درد کیوں نہیں دکھتا آپ کو؟...... ماما کی خاموش آنکھوں میں ہلکورے لیتا کرب کیوں آپ کے دل کی سیڑھیاں نہیں اُترتا؟ اور میرا...... میرا درد...... میں نے بھائی کو کتنا اونچا اور بلند انسان سمجھا تھا، لیکن بھائی...... آج کے بعد میں کبھی آئیڈیل نہیں

بناؤں گا۔ سارے خاکے، ساری اچھائیاں، نیک نامی میری نظر میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"
دانیا کو لگا تھا، وہ شاید ہولے ہولے روئے گا بھی، مگر وہ یکدم بائیک روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"جازی! کیا ہوا؟" اُس نے اُس کا شانہ چھوا اور وہ سترہ سالہ کالج اسٹوڈنٹ بچوں کی طرح رونے لگا۔
"جازی! کیا ہوا میری جان؟...... تم تو بہت بہادر بچے ہو بیٹا!"
"بجو! ہم اُن کے فلیٹ نہیں جاتے ہیں۔ کیا پتہ، وہاں ہمیں کیا دیکھنے کو ملے؟"
جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہنے سے خود کو روک رہا تھا۔ دانیا نے اُسے تاسف سے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔
"کیا پتہ جازی! بھائی بالکل ویسے نہ ہوں، جیسا تم سمجھنے لگے ہو...... ہو سکتا ہے اس وقت انہیں ہماری سخت ضرورت ہو۔ چل کر ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو تسلی رہے گی۔ پھر فلیٹ صرف دس منٹ کی دُوری پر ہی تو ہے۔ اتنے قریب آ کر یونہی واپس چلے جانا تو صرف حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"
جازی عبدالرحمٰن نے اثبات میں سر ہلایا۔ دانیا نے اپنے پلّو سے اُس کے آنسو صاف کیے، اُسے حوصلے کی تلقین کی اپنی پیاری مسکراہٹ سے...... ہاں، بس اس مسکراہٹ میں ہلکا سا دردھی تھا، جو پہلی ساعت ہی میں دل میں کھب جاتا تھا۔

جازی بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ پھر پہلے کی طرح سڑک پر رواں دواں تھا۔ دس منٹ بعد وہ گرین ٹاؤن گروپ آف کنسٹرکشن کے لگژری فلیٹس کے سامنے تھے۔
صبح کے چار بج رہے تھے۔ سکیورٹی گارڈ اونگھ رہا تھا۔ جازی عبدالرحمٰن نے اُسے جگا کر صورتِ حال بتائی۔ اُس نے انٹرکام پر اندر کے سکیورٹی روم میں پیغام دیا، تب خودکار گیٹ کھلتا چلا گیا۔ باقاعدہ اندراج رجسٹر میں اُن کا اندراج کیا گیا، سکیورٹی لحاظ سے چھان بین کی گئی، تب اُنہیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ جازی کا موڈ سخت خراب تھا۔ تبھی سکیورٹی آفیسر راحیل اقبال نے معذرتی لہجے میں الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے افسوس ہے سر! لیکن حالات آج کل اتنے خراب ہیں کہ کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے آپ صرف فارمیلٹی چیکنگ سمجھ کر درگزر کر دیجیے گا۔"

جازی نے بے دلی سے سر ہلایا اور شہریار کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اُس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''بیل دو بجو!'' وہ دانستہ اس معاملے کے ہر پہلو سے بچنا چاہتا تھا۔

دانیا نے سر ہلا کر بیل دی۔ مگر چھ سات بیلز پر بھی دروازہ ہنوز بند تھا۔

''اب کیا کریں؟''

دانیا نے خفت سے اُسے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ''ڈپلی کیٹ چابی لے کر آؤ۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔''

جازی خاموشی سے نیچے چلا گیا۔ پھر فلیٹ کی انتظامیہ کے ایک فرد کے ساتھ وہ واپس لوٹا۔

''آپ ڈپلی کیٹ چابی ہی کیوں چاہتی ہیں میم! ہو سکتا ہے، اندر جو صاحب ہیں، وہ بہت گہری نیند سو رہے ہوں یا......'' ایک خالی جگہ چھوڑ کر اُس نے پھر اُن دونوں کو شرمندگی کے سمندر میں ڈال دیا۔

''سنیئے، شہریار عبدالرحمن میرے بھائی ہوتے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے، وہ اس وقت کسی پرابلم کا شکار ہیں...... اُن کا موبائل ابھی تک آن ہے لیکن اُن کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔''

''اوہ، سوری میم! لیکن یہاں پر یہ نارمل بات ہے۔ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے، آپ کے بھائی کسی وجہ سے موبائل آف کرنا بھول گئے ہوں یا پھر......''

''یا پھر کیا؟'' دانیا عبدالرحمن کی آواز خود بخود تیز ہو گئی۔

سامنے کھڑا منتظم سراسیمہ ہو گیا۔ پھر گردن ڈال کر مدھم لہجے میں بولا۔ ''یا پھر میم! ہو سکتا ہے، انہوں نے اوور ڈرنک کر لی ہو، اس لئے بے ہوش ہو گئے ہوں۔''

جازی نے دانیا کو مزید بولنے سے روکا اس لئے اُس کے ہونٹ کھلے مگر بند ہو گئے۔ جازی اب چابی لے چکا تھا۔

''آپ جائیے مسٹر ظفر! ہم یہ چابی واپسی پر آپ کو دیتے ہوئے جائیں گے۔''

وہ نہیں چاہتا تھا، جس سرپرائز سچویشن سے وہ گزر رہیں، اس کا گواہ کوئی اور بھی بنے۔ اُس کی اتنی دیر بحث کی وجہ بھی وہ جان گیا تھا۔ یہ ایک پوش ایریا فلیٹس تھے، جہاں بہت کم ہی فیملیز رہتی تھیں۔ زیادہ تر بزنس نقطہ نظر سے ہی فلیٹ خریدے گئے تھے اور یہ انتظامیہ کی ذمہ داری تھی کہ یہاں رہنے والوں کی پرائیویسی خراب نہ ہونے پائے۔ سو اتنی دیر سے وہ یہی کام سرانجام دے رہا تھا۔ اگر جازی اُسے بھیج نہ

دیتا تو شاید وہ کچھ اور دیر ان کے کام میں مداخلت کرتا رہتا۔

دانیا چابی لے کر کی ہول میں اُسے گھما چکی تھی۔ دروازہ کلک کی آواز کے ساتھ کھل چکا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

سارا فلیٹ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جازی اور وہ اُس کے بیڈ روم کے سامنے کھڑے تھے۔ دانیا کی جگہ جازی نے دروازہ ناک کیا، پھر جواب نہ پا کر کھول دیا۔ لائٹ آن کی تو کمرے کو خالی پایا۔ پھر وہ ہر کمرے کو دیکھتے ہوئے ڈرائنگ رُوم کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ یہ ڈرائنگ رُوم بلیک گلاس سے مزین کیا گیا تھا۔ اے سی کولنگ کی وجہ سے ہر طرف سے کورڈ تھا۔ جازی نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دروازہ باہر کھینچا، دروازہ روانی سے کھلتا چلا گیا۔ جازی نے سوئچ بورڈ ڈھونڈ کر ٹیوب لائٹ آن کی اور پھر دونوں کے دل جہاں تھے، وہیں تھمنے لگے۔

"شیری بھائی......!" وہ، جو سارے راستے اُسے برا بھلا کہتا آ رہا تھا، چیخنے لگا تھا۔ دانیا کا چہرہ بھی سفید ہونے لگا تھا۔

شہریار عبدالرحمٰن گلاس ٹیبل کے پاس بے ہوش پڑا تھا اور اُس کے داہنے بازو سے خون نکل کر براؤن کارپٹ پر جذب ہو رہا تھا۔ دانیا نے اُسے سیدھا کیا تھا اور جازی اُس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ہمیں انہیں فوراً ہسپتال لے کر جانا ہوگا۔ قریبی ہسپتال کون سا ہے؟"

پھر اُسے بازوؤں کے سہارے لے کر وہ دونوں باہر آ گئے۔ سکیورٹی کا بندہ جو اُس کے سامنے چلا گیا تھا، ان کی لفٹ اچانک اُن کے سامنے آ گیا۔ پھر اُسے جس حالت میں دیکھا، وہ بھی گھبرا گیا تھا۔ "سر! آپ ایمبولینس کیوں نہیں منگوا لیتے؟" اُس نے مشورہ دیا لیکن جازی نے پکارا۔

"بیجو! بھائی کی کار کی چابیاں اُٹھا کر لائیں، جلدی۔" دانیا اندر دوڑ گئی اور جازی اُس کی طرف مڑا۔ "میں یہاں ایمبولینس آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ بھائی کی حالت مجھے کافی خراب لگتی ہے۔"

دانیا دروازہ لاک کر چکی تھی۔ وہ بمشکل اُسے سنبھالتے کار تک لائے۔ جازی پیچھے شہریار کے ساتھ بیٹھا اور دانیا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اپنی اس وقت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے لگی۔

"میری بائیک یہیں ہے مسٹر ظفر! میں دوبارہ آ کر لے جاؤں گا۔ پلیز! آپ اسے پورچ میں اسٹینڈ کروا دیجئے گا۔" جازی نے چابی اُس کی طرف اچھالی اور گاڑی برق رفتاری سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

ایمرجنسی میں اُسے فوراً لے لیا گیا تھا۔ جازی اپنے فیملی ڈاکٹر شاہ صمدانی کو فون کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُس کا دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ فون ڈاکٹر صمدانی نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ اس وقت فجر کی نماز پڑھ کر واک پر نکلے ہوئے تھے، تبھی اُس کی آواز سن کر حیران ہو کر بولے۔

''کیابات ہے ینگ مین! یہ ساڑھے پانچ بجے تمہیں اپنے انکل کی کیوں یاد ستانے لگی؟ خیریت تو ہے؟ عبدالرحمٰن تو ٹھیک ہے ناں؟''

اُن کی تان مسٹر عبدالرحمٰن پر آ کر ٹوٹی، جو بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک بھگت چکے تھے، اس لئے لامحالہ اُن کا خیال اُن کی طرف ہی گیا تھا۔ مگر شہریار کا سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ پھر انہوں نے ہسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''میرے خیال میں زخم اتنا گہرا تو نہیں تھا، پھر یہ بلیڈنگ کیوں ہوئی؟'' وہ لمحے بھر کو رُکے، پھر غصے سے بولے۔ ''میں جانتا ہوں، اس نے قطعاً آرام نہیں کیا ہوگا، اس لئے زخم پھر سے کھل گیا ہوگا اور بے ہوشی ان دونوں معاملوں کی نقاہت کا شاخسانہ ہے۔ تم گھبراؤ نہیں، میں اس کا کیس ہینڈل کرنے والے اسٹاف سے مل کر آتا ہوں۔''

وہ چلتے ہوئے ان دونوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ وہ کس کمرے میں گئے تھے، وہ نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ہراساں سے ویٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا تھا، جب ڈاکٹر صمدانی اُن دونوں کے لئے چائے اور سینڈوچ لئے اُن کے پاس پہنچے۔ چہرے کا اطمینان دل کو تسلی دے رہا تھا لیکن وہ تسلی دینے میں کتاہی کرنے والوں میں سے تھے ہی نہیں، اس لئے جازی کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔

''گھبراؤ مت۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وجوہات وہی تھیں، اس لئے بہت جلدی کور کر لیا ہے اُس نے۔'' پھر وہ وانیا کی طرف مڑے، اشارہ کیا اور آگے کوریڈور میں چلنے لگے۔

وانیا اُن کے پیچھے بڑھی مگر جازی ساری رات کی تھکن اور غصے سے اتنا نڈھال ہو رہا تھا کہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر اُس نے اپنے اعصاب ڈھیلے ڈال دیئے۔ اور وانیا، اُس کے اعصاب اچانک ڈاکٹر صمدانی کے سوال پر ہراساں ہو گئے تھے۔

''شیری کب سے ڈرنک کر رہا ہے؟''

وہ چلتے چلتے رک گئی تھی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی، کیا جواب دے کہ وہ پھر سے پکارے۔

''وہ اسموکنگ بھی بہت عرصے سے کر رہا ہے ناں وانیا؟''

''جی انکل!'' اُس نے سر جھکا لیا تھا۔

ڈاکٹر صمدانی کی آنکھیں بہت کچھ سوچنے لگی تھیں۔ وانیا نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اُسے ان آنکھوں میں تشویش صرف نظر آ رہی تھی۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں انکل!"

ڈاکٹر صمدانی نے گہرا سانس لیا، پھر گلا کھنکھار کر بولے۔"یہ بات مجھے تم سے کہنی نہیں چاہیے کیونکہ تم بہت حساس ہو اور جذباتی بھی...... لیکن جتنی تم شہریار سے قریب ہو، اتنا کوئی بھی نہیں۔ اس لئے پلیز تم اُسے ایڈوائز دو، اُسے کسی بھی طرح ڈرنک اور اسموکنگ سے دُور کر دو۔ تم نہیں جانتیں، صرف 30 سال میں اُس کا بلڈ پریشر اتنا شوٹ کر چکا ہے کہ میں بنا اُس کے ٹیسٹ لئے یہ نہیں جان سکتا کہ اس خاموش قاتل نے اُسے کتنا نقصان پہنچا دیا ہے۔ ہر وقت پریشانی، افسردگی اپنی ذات کی جنگ لڑتے رہنے سے اُس کے اعصاب اتنے تھک چکے ہیں کہ اس لمحے جب اُسے ہسپتال لایا گیا تھا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ زخم اتنا کاری نہیں تھا، جتنا بلڈ پریشر کی شدت اور مایوسی نے مل کر اُسے اس طرح زندگی کی طرف سے منہ موڑنے پر اُکسایا تھا۔ اگر اس وقت وہ بے ہوش نہیں ہوتا تو شاید مر چکا ہوتا۔ اُس کا ای سی جی خراب آیا ہے۔ ابھی تک وہ انڈر آبزرویشن ہے وانیا!"

"بھائی...... بھائی ٹھیک تو ہو جائیں گے ناں، انکل؟" وانیا کی کٹورا سی آنکھیں لبالب بھرنے لگیں۔

ڈاکٹر صمدانی نے ہولے سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔"جس بھائی کے پاس تم جیسی اچھی بہن ہو، اُسے کچھ ہو بھی سکتا ہے؟ نہیں ناں، پلیز چیئر اپ۔"

وانیا نے دوپٹے سے آنسو صاف کئے، پھر ملتجی لہجے میں پکاری۔"میں بھائی سے مل سکتی ہوں؟ پلیز انکل! میں انہیں تنگ نہیں کروں گی۔ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہوں گی آئی پرامس یو۔"

وانیا کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہولے سے سر ہلا کر ڈاکٹرز روم کی طرف بڑھ گئے۔ کیونکہ یہ تو طے تھا، مکمل حالت بحال ہونے سے پہلے وہ اس عاقبت نا اندیش شخص کو چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے تھے۔ بے شک وہ اور بچوں کی طرح اُن سے فری نہیں تھا لیکن ادب احترام کے ساتھ لئے دیئے رہنے والا اُس کا یہ انداز انہیں ہمیشہ اُس سے قریب کئے رکھتا تھا۔

وانیا انہیں جاتا دیکھتی رہی تھی۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی جازی کے پاس آ کر رُک گئی۔

"جازی! بھائی کو دیکھنے میرے ساتھ چلو گے؟"

جازی نے مندی مندی آنکھوں سے اُسے دیکھا، جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن آنکھوں میں اتنی واضح خفگی تھی کہ وہ یکدم مڑ گئی۔

”تو تم نہیں ملنا چاہتے بھائی سے۔“ ایک قدم اُٹھایا، مگر دوسرے قدم پر اُس کا ہاتھ جازی کے ہاتھ میں تھا۔

”بجو! آپ جانا نہ کی طرح یہ بھی پہلے سے جانتی تھیں ناں کہ بھائی ڈرنک بھی کرتے ہیں؟“ وہ نظریں چرانے لگی اور وہ اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”آپ کو کیسے پتہ تھا، جانا نہ سے اب بھی بھائی کا رابطہ ہے؟“ لہجہ قطعیت لئے ہوئے تھا۔

تبھی وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ”دو ایک بار بھائی کے موبائل پر اُس کا میسج آیا تھا۔ کافی بار اُس کی مس کالز میں نے بھائی کے موبائل پر دیکھی تھیں۔ لیکن جب بھی میں بھائی سے اس سلسلے میں کچھ پوچھتی، بھائی کہتے، پاگل لڑکی ہے۔ وہ اور یہ کہ بھائی کا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔“

”بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔“ جازی کے چہرے پہ ناپسندیدگی اور غصہ ساتھ ساتھ تھا۔ دانیا اُس کا ہاتھ تھامنا چاہتی تھی لیکن وہ اُس سے دو قدم دُور چلا گیا تھا۔ پھر بڑبڑانے والے لہجے میں بولا تھا۔ ”واقعی بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ لڑکی پاگل ہی ہے، جو بھائی کے پیچھے اپنا گولڈ پیریڈ ضائع کر رہی ہے۔ بھلا انہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون اور کتنا ان میں انوالو ہے، کتنی چاہت رکھتا ہے ان کی، کتنی پروا کرتا ہے۔ انہیں کیا...... واقعی محبت کرنے والے پاگل ہوتے ہیں۔ میں، آپ اور وہ جانا نہ......“ وہ سانس لینے کو رُکا پھر کھردرے لہجے میں پکارا۔ ”یہاں صمدانی انکل ہیں ناں، میں کچھ دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ گاڑی ہی میں رہوں گا۔ کسی کام کے سلسلے میں ضرورت ہو تو بلا لیجئے گا۔“

دانیا نے اُسے جانے دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس موڈ میں شہریار کے سامنے جائے۔ اگر غصے میں اُس نے اُسے کچھ برا بھلا کہہ دیا تو اُس کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے اور بگڑ جاتی تھی۔ دانیا کو جازی کو یہ سب بتا کر کول ڈاؤن کرنا تھا لیکن یہاں موقع اور موڈ سازگار نہیں تھے۔ اس لئے اُس نے یہ کام پھر کسی وقت کے لئے اُٹھا رکھا اور متوازن قدم اُٹھاتی اُس کے پرائیویٹ روم کے سامنے آ گئی۔ کچھ ساعت اپنا حلیہ درست کیا، پھر اندر داخل ہوئی۔

شہریار کی آنکھیں بند تھیں اور نرس ابھی بھی اُس کی نبض تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”بھائی اب کیسے ہیں؟“ گو اُس نے بہت مدھم پوچھا تھا مگر اُس کے وجود میں کسمساہٹ ہوئی تھی۔

”پہلے کے مقابلے میں تو ٹھیک ہیں لیکن بلڈ پریشر نارمل نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹر صمدانی نے جو انجکشن تجویز کیا تھا، وہ بھی دیا ہے لیکن سر کسی بھی طرح کا رسپانس نہیں دے رہے۔“

وانیا کتنی دیر تک اُس کا چہرہ تکتی رہی۔ گندمی رنگت کتنی جلدی کملا گئی تھی۔ وہ ہولے سے نرس کی چھوڑی گئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ای سی جی مانیٹر ابھی تک آن تھا۔ کبھی اُس کی دھڑکن تیز ہو جاتی، کبھی نارمل...... وہ بہت ہراساں ہو رہی تھی۔ جتنی دُعائیں اُسے یاد تھیں، اُس نے ساری اُس پر پڑھ کر پھونک دی تھیں۔ اُس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے، جب کراہ کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مندی مندی آنکھوں سے اُس نے دیکھا اور تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر وانیا نے اُسے روک دیا۔

"آپ لیٹے رہیے۔ ڈاکٹرز نے آپ کو آرام کرنے کو کہا ہے بھائی!"

اُس نے خالی الذہنی کی حالت میں اُسے دیکھا۔ زخم میں ٹیس اب بھی اُٹھ رہی تھی مگر بے ہوشی کی حالت اور تھی۔ ہوش مندی میں اُسے اپنی تکلیف کی نمائش کرنا قطعاً ناپسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے ڈاکٹرز کے پینل کے سامنے خود کو بہت فریش ظاہر کیا تھا، مگر جب ڈاکٹر صمدانی کمرے میں داخل ہوئے تو اُس کے چہرے پر ایک تناؤ سا آ گیا۔

"انکل صمدانی! آپ یہاں؟" اُس نے کف فولڈ کرتے ہوئے انجکشن کے لئے خود کو تیار کیا۔

ڈاکٹر انجکشن لگا چکا تو مسکرا کر بولا۔ "مسٹر صمدانی کسی زمانے میں ہمارے استاد رہ چکے ہیں اس لئے ان کے یہاں آنے پر حیران نہ ہوں۔ مسٹر شہریار ویسے اگر یہ ٹھیک ڈیسیشن نہیں لیتے تو آپ کا کیس ہم نہیں سنبھال سکتے تھے۔ بہت ڈینجر زون میں چلے گئے تھے آپ۔" اُس نے کسی بھی قسم کی تشویش کا تاثر نہیں دیا۔

وہ اب بھی خاموشی سے ڈاکٹر صمدانی کو دیکھ رہا تھا، جو چار بجے سے اب تک کی اُس کی ای سی جی اور بلڈ پریشر رپورٹ پڑھ رہے تھے۔

"میں اس وقت بالکل ٹھیک ہوں...... کیا میں گھر جا سکتا ہوں انکل؟"

"گھر؟ ...... وہاں جا کر تم کیا کرو گے؟ میں نے گھر کو ہسپتال میں بلوا لیا ہے۔ تمہاری گھر سے مراد گھر والے ہیں ناں؟"

انہوں نے پھر سے اُسے بھڑاس نکالنے کے لئے پن کیا مگر وہ بھی گھاگ تھا، بغیر تاثر کے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم نے کچھ کہا نہیں، تمہیں میرا یہ فیصلہ کیسا لگا؟"

اُس نے انہیں دیکھا، پھر ہنس کر بولا۔ "گھر اور گھر والے شاید ان دونوں کا مطلب کسی زبان میں ایک ہوتا ہوگا لیکن میرے لئے یہ صرف میرا کمرہ ہے۔ میرا کمرہ...... خالی اور میری طرح اکیلا......

ڈاکٹر صمدانی اُس کے قریب آ گئے پھر محبت سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''آخر تم اتنے زیادہ مایوس کیوں ہو؟........ تمہیں کیوں لگتا ہے، کسی کو تم سے محبت نہیں ہے؟''

اُس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو نمی اتری، مگر دوسرے پل اُس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ شفاف مگر بے تاثر........ ڈاکٹر صمدانی نے اُسے پھر سے چھیڑا، تب اُس نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔

''جوبات میں جانتا ہوں، وہ بات آپ کچھ دیر بعد جان جائیں گے۔ پھر آپ کو پتہ چل جائے گا، محبت کیوں میرے لئے نہیں ہے، میں کیوں سمجھتا ہوں، یہ مجھے سیراب کرنے کے لئے نہیں بنائی گئی۔''

کمرے میں اس وقت وہ دونوں ہی تھے۔ وانیا باہر تھی۔ ڈاکٹرز کے چیک اپ کرنے کی درخواست پر وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی لیکن دس منٹ بعد جب سب ڈاکٹرز باہر آ گئے تو وہ ڈاکٹر صمدانی کی موجودگی کو بے تکلف خیال کر کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اُلجھا ہوا پایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صمدانی نے اچانک اُس سے پوچھا۔

''تمہارا بی پی اور تمہارا ای سی جی جو گڑ بڑ بتا رہا ہے شہر یار! کیا واقعی تمہیں کبھی انجائنا کی تکلیف ہوئی ہے؟''

شہر یار نے گھبرا کر وانیا کو دیکھا۔ ڈاکٹر صمدانی کی اُس کی طرف پشت تھی اس لئے وہ اُس کی طرف سے بے خبر تھے۔ مگر یہ خبر........ وانیا اُس کے پاس تیز قدمی سے پہنچی تھی۔

''انکل! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟........ بھائی! آپ کو یہ تکلیف کب ہوئی، آپ نے مجھے تو کبھی نہیں بتایا۔''

شہر یار انکار کر دینا چاہتا تھا کیونکہ سینے میں اُٹھنے والا درد اتنا جان لیوا نہیں ہوتا، جتنی تکلیف وانیا کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ اُس کی سراسیمگی دیکھ کر اُس نے ڈاکٹر صمدانی کو شکوے سے دیکھا تھا مگر آج ڈاکٹر صمدانی قطعاً درگزر کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''وانیا! تم اس کی گاڑی سے اس کی دوائیں لے کر آؤ۔ میں بھی تو دیکھوں، اس نے اپنے معاملات کس حد تک بگاڑ لئے ہیں۔''

وانیا کی شکوہ کناں نگاہیں اُس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی مگر اُسے لگ رہا تھا، وہ اب بھی اُمید و بیم کی کیفیت میں اُس کے سامنے کھڑی ہے۔

''آپ کو یہ بات اتنی جلدی آؤٹ نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اگر آپ جان بھی گئے تھے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سنسنی خیز خبر بنا کر پیش کیا جاتا۔''

ڈاکٹر صمدانی کچھ نہیں بولے اور وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔

''میں اب یہاں سے چلنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے، مجھے اب مزید کسی ٹریٹمنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بیڈ سے کھڑا ہوا مگر یکدم چکرا گیا۔

"تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے شہریار! تم کیوں اپنے دشمن بنے ہوئے ہو؟"

اُس نے اُن کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹایا، پھر تلخی سے بولا۔ "ساری دنیا میرے خلاف ہے، میری دشمن ہے، تو کیا فرق پڑتا ہے اگر میں بھی یہ سلوک خود سے روا رکھتا ہوں۔"

جواب لاجواب کرنے والا تھا مگر دانیا کی آمد سے ڈاکٹر صمدانی کو حوصلہ ہوا تھا۔ ایک اس لڑکی کے سامنے ہی تو یہ شخص قابو میں آجاتا تھا۔ دانیا کے ہاتھ خالی تھے۔

"انکل! مجھے بھائی کی گاڑی میں کوئی دوا نہیں ملی۔"

شہریار کے چہرے پر سکون اُتر آیا۔ اُسے اب یاد آنے لگا تھا کہ کل اُس کو دوا کی ضرورت پڑی تھی تو وہ دوا اُس نے استعمال کے بعد اپنے اسی کوٹ میں ڈال دی تھی، جو فلیٹ میں کسی کونے کھدرے میں پڑا تھا۔

"مجھے لگتا ہے۔" اُس نے موقع اور حالات سازگار دیکھ کر تمہید باندھی، پھر متوازن بولا۔ "مجھے لگتا ہے، انکل صمدانی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے دانیا! بھلا مجھے کیسا انجانا پرابلم ہوسکتی ہے؟" اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مطمئن انداز میں دیکھا، پھر رو رو کر سرخ ہونے والی اُس کی ناک کو زور سے دبا کر بولا۔ "پور گرل! تمہیں تو پریشان ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دینا گوارا ہی نہیں ہوتا۔ اِدھر انہوں نے اطلاع دی اور اُدھر تمہارے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔"

مگر ڈاکٹر صمدانی خاموشی سے جس طرح اُس کا جائزہ لے رہے تھے، اس سے اُسے اُلجھن ہونے لگی تھی۔

"اب کیا آپ مجھے بیمار کر کے ہی چھوڑیں گے؟"

بولتے بولتے اُسے لگا، کہیں کوئی ٹیس اٹھی تھی۔ ڈاکٹر صمدانی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اس لئے اس درد کی لہر اور اس کی تکلیف انہوں نے واضح اس کی آنکھوں میں پڑھ لی تھی۔

"شہریار! تم اس وقت کہیں نہیں جا رہے ہو۔ دانیا! تم ڈاکٹر سہیل کو بلاؤ اور جازی کو اس کے فلیٹ بھیج کر اس کی دوائیں کلیکٹ کرواؤ۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں انکل!"

"بکواس بند کرو اور لیٹ جاؤ تم۔" انہوں نے اس بار اُسے زبردستی لٹا دیا اور ای سی جی مانیٹر دوبارہ آن کر دیا گیا تھا۔ اُس کی شرٹ کے بٹن پھر سے کھول دیئے گئے تھے اور دانیا کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں کیونکہ اب شہریار عبدالرحمٰن کو سانس لینے میں وقت ہونے لگی تھی۔

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی باہر گئی تھی اور کار کا دروازہ پوری شدت سے ناک کیا تھا۔ جازی نے پانچ چھ دستکوں پر دروازہ کھولا تھا، پھر اُس کا چہرہ ہونق دیکھا تو گھبرا گیا۔

''کیا ہوا، خیریت تو ہے؟ آپ تھوڑی دیر پہلے تو کہہ رہی تھیں، بھائی بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔''

دانیا اُس کو بس دیکھے جا رہی تھی۔

''بجو! کیا ہو گیا ہے اب؟ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ بھائی تو ٹھیک ہیں؟'' ساری خفگی ہوا ہونے لگی تھی۔ اس بار اُس کی آواز تیز تھی۔ تبھی دانیا نے بے قراری سے کہا۔

''تم فوراً بھائی کے فلیٹ جاؤ۔ اُن کی کچھ دوائیں ہوں گی، ڈھونڈ کر لاؤ۔ اور دیکھو، کہیں نہ ملیں تو اُن کا کوٹ ضرور دیکھ لینا۔''

''دوائیں، بھائی کی؟......مگر بھائی کون سی دوائیں استعمال کرتے ہیں؟......ہم نے تو انہیں کبھی ہلکا سا بخار بھی ہوتے نہیں دیکھا۔''

دانیا کو اس کا وقت برباد کرنا برا لگ رہا تھا لیکن معاملے کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لئے اُسے بتانا ہی پڑا۔

''بھائی انجائنا پیشنٹ ہیں۔ تم سمجھتے ہو ناں، اس کا کیا مطلب ہے؟''

جازی کی آنکھیں، چہرہ سب دھواں دھواں ہو گیا۔ اسٹیئرنگ پر اُس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ ''میں دس منٹ میں آتا ہوں بجو! آپ بھائی کے پاس جاؤ۔''

''گاڑی احتیاط سے چلانا جازی!''

اُس نے سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر دی اور وہ گیٹ سے نکلتے ہوئے اُسے دیکھے بغیر واپس اندر چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں کمرے کے باہر ایمرجنسی لگ گئی تھی۔ اُس نے دروازہ ناک کیا۔ ڈاکٹر صمدانی، ڈاکٹر سہیل کے ساتھ مشورہ کرنے میں مصروف تھے اور شہریار کو ٹریٹمنٹ دی جا رہی تھی۔

''جازی کہاں ہے؟'' ڈاکٹر صمدانی نے اُسے دیکھ کر سوال کیا۔

''وہ بھائی کی دوا لینے گیا ہے۔'' اُس نے شہریار کے قریب ہونے کی سعی کی اور ڈاکٹر صمدانی تشویش سے بولے۔

''میں نے شہریار سے اس کی دواؤں کے نام اُگلوا لئے ہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسی حساب سے ٹریٹمنٹ دے رہا ہوں۔'' لمحے بھر کو رُکے، پھر تاسف سے بولے۔ ''اس لڑکے نے اپنا کیس

بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ دانیا! بس دُعا کرو، میری مسیحائی کام آجائے، ورنہ......"

"ورنہ کیا انکل؟" وہ رونے کو اسٹارٹ لینے والی تھی، جب اُنہوں نے اُس کی توجہ بٹانے کو پوچھا۔

"یہ عبدالرحمٰن تمہاری ماما اور گھر کا کوئی بھی فرد ابھی تک ہسپتال نہیں آیا فون کیے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ تم پتہ کرو، کیا بات ہے؟"

"وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی ڈاکٹرز روم کے ٹیلی فون سے گھر پر رابطہ کیا۔

"کہاں سے بول رہی ہو تم؟" فون مما نے اُٹھایا تھا۔

"میں لائف کیئر ہسپتال سے بول رہی ہوں مما! یہاں شیری بھائی ایڈمٹ ہیں۔"

"تم گھر کب تک آجاؤ گی؟" مما نے بنا کسی تشویش کے صرف اُس کے آنے کے لئے پرواہ دکھائی۔

اُسے عجیب سا لگا لیکن دل کڑا کر کے بولی۔ "پاپا یا سالار بھائی، کیا کوئی بھی ہسپتال کے لئے روانہ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ تمہارے پاپا سو رہے ہیں۔ رات کو کافی دیر تک اُنہوں نے شہریار کا انتظار کیا تھا، اس لئے میں نے اُنہیں جلوہ دے کر سلا دیا۔ وہ ابھی تک اُٹھے نہیں ہیں۔ رہا سالار تو تم جانتی ہو، اُسے، مجھے یا فیملی میں سے کسی بھی فرد کو شہریار کی سرگرمیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا، کسی کے کاندھے سے سر ٹکا کر روئے مگر یہاں جس کے کاندھے سے سر ٹکا کر رو سکتی تھی، وہ خود بستر پر نیم مدہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ یکدم اپنے غم سے ہٹ کر وہ پھر سے شہریار کی طرف مڑ گئی تو وہ واپس کمرے کی طرف تیز قدمی سے بڑھی۔

اس وقت ڈاکٹر صمدانی کے چہرے پر پہلے کے مقابلے میں کم تشویش تھی مگر معاملہ ہنوز اُلجھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے شہریار کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

شہریار نے دانیا کے ہاتھ کو چھوتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔ "پاگل لڑکی! زندہ ہوں۔ کیا اس بات پر اتنی افسردہ شکل بنا کر بیٹھی ہو؟"

"شیری بھائی! آپ......آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ناں۔"

''میں بالکل ٹھیک ہو سویٹو! یہ تو بس انکل صمدانی ہیں، کہیں اور ڈاکٹری نہیں چلی تو مجھے ہی تختۂ مشق بنالیا ہے انہوں نے۔''

''آپ اتنی خاموشی سے اتنی بڑی بیماری سنبھالے رہے اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ ہم بہت کیئرلیس ہیں بھائی! بہت زیادہ......'' وہ اُس کے ہاتھ پر سر رکھ کر رونے لگی۔

شہریار نے بائیں ہاتھ سے اُس کے بالوں کو ہولے سے چھوا پھر بکھری ہوئی چھوٹی سی لٹ کھینچ کر پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔

''پاگل لڑکی! شہریار تمہاری اور جازی کی محبت ہی میں تو زندہ ہے۔ میں کہیں بھی ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے، تم اور جازی میرا انتظار ضرور کررہے ہوگے۔ اس بھرے پرے شہر میں اکیلے دل کے لئے یہ سہارے کم تو نہیں وانیا! مائی سویٹ سسٹر! تم جانتی ہی نہیں ہو تم اور جازی میرے لئے کیا ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جس دن تم دونوں بھی مجھ سے بدل گئے، میں شہریار دنیا جلادوں گا لیکن آئی پرامس یو! جس دن ایسا ہوا تم مجھے اُس دن کے بعد زندہ نہیں دیکھو گی۔''

''چھن، چھناک......'' تیز آواز پر اُس نے سر موڑ کر دیکھا، جازی خالی ہاتھ کھڑا تھا۔ اُس کے قدموں میں دوا کی بوتل ٹوٹی پڑی تھی۔ سفید ماربل کے فرش پر رنگ برنگی گولیاں عجیب تاثر دے رہی تھیں۔

''لو آگئے ایک اور شہنشاہِ غم۔ اب مجھے ان کا دماغ بھی درست کرنا پڑے گا۔'' لفظ ادا کرتے کرتے اُس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔ ''انکل صمدانی......!'' وہ تکلیف سے پکارا۔

ڈاکٹر صمدانی جو کرسی پر بیٹھے اُس کی ایمرجنسی میں لی گئی رپورٹس دیکھ رہے تھے، اُس کی آواز پر گھبرا کر اُٹھے۔

''کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو؟''

اُس نے کچھ نہیں کہا۔ وانیا اور جازی کی طرف دیکھا اور اُس کا ای سی جی مانیٹر شور کرنے لگا۔ وہ دونوں ہونق ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ڈاکٹر سہیل اور ڈاکٹر صمدانی نے انجکشن سے اُس کی دل کی دھڑکن کو متوازن کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہو گئے تھے فوری طور پر اُسے آکسیجن دے دی گئی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ وانیا اور جازی ایک کونے میں کھڑے اُسے جان کنی سے دیکھے جارہے تھے۔

''بجو! یہ بھائی کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ہمیشہ سے اسٹرونگ مین تھے۔ انہیں تو ہلکی سی کھانسی بھی نہیں ہوئی، پھر یہ......؟''

وانیا نے اُس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے تھپتھپایا۔ ''بی بریو! بھائی کو کچھ نہیں ہوگا۔''

وہ موبائل لے کر باہر نکل گئی تھی۔ پھر اُس نے نمبر ڈائل کیا تھا۔ موبائل آف رسپونس دے رہا تھا۔ اُس نے گھر کا نمبر ڈائل کیا مگر وہاں سے بھی کسی نے نہیں اُٹھایا۔ دس بارہ دفعہ نمبر ملا کر ڈس کنکٹ کر کے

جب اُس نے پھر ملایا تو ماما نے فون انگیج ٹون پر کردیا۔ اُس نے غصے سے پھر موبائل ٹرائی کیا، پاپا کا، پھر آف جواب آیا۔ تب اُس نے سالار بھائی کا موبائل ٹرائی کیا۔ آواز سالار بھائی ہی کی تھی، اُس نے پہچان کر ملتجی لہجے میں پکارا۔

”بڑے بھیا! پلیز، ناراضگی اپنی جگہ، لیکن آپ پاپا کو کہیے، میرا فون اٹینڈ کریں۔ میں اس وقت ہسپتال سے بول رہی ہوں۔“

”ہسپتال میں؟...... تم وہاں کیا کررہی ہو؟ ڈھائی بجے تک تو تم گھر میں تھیں۔ میں نے سونے سے پہلے تک تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی دیکھی تھی۔“

وہ کیسے نہ کیسے کرکے مختصر بتانے لگی۔ جانتی تھی، سالار بھائی کا اس میں کوئی انٹرسٹ نہ ہوگا لیکن وہ جانتی تھی، سالار بھائی مخالفت میں ماما کی طرح انتہا پسند نہیں تھے اور یہ بات کچھ دیر بعد ثابت بھی ہوگئی، جب آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں پاپا اپنی گاڑی میں ہسپتال پہنچے۔ سالار بھائی اور اُن کی بیوی عائشہ ساتھ تھیں۔ لیکن ماما اب بھی نہیں آئی تھیں۔ سالار بھائی خفگی سے گاڑی میں بیٹھے رہے تھے، صرف پاپا اور عائشہ بھابی وانیا تک پہنچے تھے۔

”شہریار اب کیسا ہے وانیا؟“ پاپا نے کپکپاتے انداز میں پوچھا۔

اُس نے صرف اُس کی معمولی طبیعت کا بہانہ بنایا تھا لیکن اگر اُنہیں پتہ چل جاتا، وہ اس وقت کس کنڈیشن میں ہے تو...... اس نے اُنہیں بلا تو لیا تھا مگر شہریار کے کمرے تک لے جاتے ہوئے کترا رہی تھی۔

”شیری بھائی کس کمرے میں ہیں وانیا؟“ عائشہ بھابی نے فکرمندی سے پوچھا۔ اب کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ سو وہ اُنہیں شہریار عبدالرحمٰن کے کمرے تک لے آئی۔

”بھائی کی طبیعت تھوڑی سی زیادہ خراب ہے اور پاپا! آپ کو دیکھ کر وہ بالکل ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ لیکن پلیز! آپ کسی بھی معاملے میں فی الحال باز پرس مت کیجئے گا۔“ وانیا نے سوالیہ انداز میں تشویش بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور دروازہ ناک کیا۔ دروازہ کھولنے والے ڈاکٹر صمدانی تھے۔

”او ینگ مین! میں تمہارا کب سے انتظار کررہا تھا۔ اوہو، شاید میں غلط کہہ رہا ہوں، کیونکہ مجھ سے کہیں زیادہ تمہارا بیٹا تمہارا انتظار کررہا ہے۔“

پاپا اور عائشہ بھابی تیزی سے کمرے میں آئے۔ اُنہیں دیکھ کر جازی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ شہریار عبدالرحمٰن کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی مگر وہ ابھی تک سخت قسم کی آبزرویشن میں تھا۔

”شیری!“ ہولے سے اُس کے رخسار کو سہلا کر پاپا نے اُسے پکارا تو اُس نے بہ ہزار وقت آنکھیں کھولیں۔

”پاپا......!“ اس نے اُٹھنے کی کوشش کرنی چاہی مگر جازی نے اُس کے کاندھے پر دباؤ ڈال کر اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

”لیٹے رہیے آپ...... کتنی مشکل سے تو آپ کی دھڑکن معمول پر آئی ہے اور آپ ہیں کہ پھر سے......؟“ لہجہ روٹھا ہو گیا۔

شہریار نے اُس کی محبت سے حظ لیتے ہوئے ہنسنے کی کوشش کی مگر کراہنے لگا۔

”مت ہنسیے......دم خم نہیں ہے اب آپ میں......“ جازی نے چڑانے کو کہا۔

وہ اُسے ستانے کو پھر سے ہنسا، پھر کچھ ساعت بعد بولا۔ ”میرا سارا دم خم تو صرف تم سے ہے یار!“

وہ بظاہر دل میں تو خفا تھا لیکن طبیعت کے پیش نظر جذباتی وابستگی کے تحت مصلحت آمیز خاموشی میں لپٹا کھڑا رہ گیا تھا۔

پاپا اُس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ اُس نے پاپا کو بس ایک نظر دیکھا، پھر عائشہ بھابی کو اکیلا پا کر اُس کے چہرے کی مایوسی سوا ہو گئی۔

”تو سنی بھائی اب بھی نہیں آئے۔ وہ اب بھی مجھ سے خفا ہیں۔“

ڈاکٹر صمدانی تیزی سے اُس کے قریب آ گئے۔ ”مسٹر لاڈلے! تم اپنی شخصیت کو وائٹ کالر ثابت کرنے کے لئے کب تک دوسروں کی طرف دیکھتے رہو گے؟ تمہیں معلوم ہے، ایک چیز ہوتی ہے ضمیر...... اگر وہ اندر سے مطمئن ہے تو میرے خیال میں تمہیں اسٹریس لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

پاپا نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تائیدی انداز میں سر ہلایا، جیسے وہ ڈاکٹر صمدانی کی ایک ایک بات پر متفق ہوں۔ اُن کے انداز میں خفگی نہیں تھی، ایک باپ کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھیں اور بس اُسے لگا، اُس کے لئے یہی کافی تھا۔ یہ دو مضبوط ہاتھ اور یہ دو روشن آنکھیں، یہی تو اُسے عبدالرحمن ہاؤس میں لے کر گئی تھیں۔ ان آنکھوں میں اگر اعتبار باقی تھا تو دل کو تسلی تھی، اُسے کوئی دھتکار کر اس گھر سے نہیں نکالے گا۔

انسان ہو یا کوئی اور ذی روح، گھر کی پناہ بہت بڑی پناہ ہوتی ہے۔ انسان محنت سے، دولت سے، بڑے سے بڑے عالیشان سے عالیشان گھر بنا سکتا ہے لیکن اگر اس کی دہلیز پر کوئی محبت سے آپ کا انتظار کرنے والا ہی نہ ہو تو کیسا گھر، کیسی زندگی۔ زندگی تو رشتوں سے ہوتی ہے۔ تعلق تو دل کے ہی سجتے ہیں...... ہاں، یہ ضرور تھا، اس کے معاملے میں یہ تعلق، یہ رشتے کچھ کمزور تھے لیکن وہ تہی داماں تو نہیں

تھاناں.......اُسے لگنے لگا تھا، اگر پاپا کا تعلق ٹوٹ رہا ہے تو پھر باقی رشتے پالینا اور انہیں جیتنا کچھ ایسا دُشوار بھی نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" پاپا نے چھت پر نظریں گاڑیں اُسے خاموش دیکھا تو پھر سے متوجہ کیا اور پھیکی سی ہنسی سے اُنہیں دیکھنے لگا۔

"سنی بھائی ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"وہ تو آئے ہیں ناں۔" ایک دم عائشہ بھابی کی زبان پھسلی اور پاپا نے تاسف سے دیکھا۔ عائشہ سالار بہت کم دماغ کا استعمال کرتی تھیں۔ مصلحت آمیز جھوٹ ہو یا مصلحت، اُنہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہت بولنے کی عادت ہمیشہ اُن کا کام خراب کرتی تھی اور اُن کی وجہ سے باقی گھر والوں کا بھی.......

عائشہ بھابی نے پاپا کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ وانیا اُن کے قریب کھڑی تھی۔ شہریار نے وانیا کو اُن کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے اور عائشہ بھابی کو صم بکم ہوتے دیکھ لیا تھا، تبھی پاپا نے گلا کھنکارا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔

"وہ آیا تو تھا لیکن دفتر میں اُس کی بہت اہم میٹنگ ہے اس لیے وہ ہمیں باہر سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

تائیداً عائشہ بھابی کو پاپا نے دیکھا تو وہ بولیں۔ "پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ صبح بہت جلدی میں تھے، لیکن شام کو ہسپتال آنے کا کہہ گئے تھے۔"

شہریار نے گہری سانس لی۔ اُسے سالار بھائی کی طبیعت اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ کسی سے ایک بار تعلق منقطع کر لیتے تو پھر کبھی پلٹ کر پوچھتے بھی نہیں تھے۔ پچھلے پانچ سال سے انہوں نے اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ خود اسے ہی انہیں مخاطب کرنا پڑتا تھا اور اس وقت پاپا کہہ رہے تھے، وہ آئے ہیں اور عائشہ بھابی کہہ رہی تھیں، وہ شام کو آنے کا کہہ گئے ہیں.......

یکدم اُسے اپنی حرماں نصیبی پر ہنسی آنے لگی۔ لوگ تو اُس سے کنارہ کشی کے لئے بہانہ ڈھونڈنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے....... اس نے پاپا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، پھر کرب چھپا کر مسکراہٹ ہونٹوں پر چسپاں کر کے بولا۔

"آپ بہت معصوم ہیں پاپا! جو سمجھتے ہیں، میں بہلاؤوں میں آ سکتا ہوں.......اور آپ عائشہ بھابی! مجھے یقین ہے، آپ کو تو ساری زندگی ڈھنگ سے جھوٹ بولنا بھی نہیں آئے گا۔"

عائشہ سالار شرمندہ ہو گئیں۔ وانیا کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ کوئی کتنی تلخی سے اپنے آپ کو اکیلا ہونے کا طعنہ دے سکتا ہے، شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ خود کو خود میں جتنی اذیت سے تنہائی کا پرسہ دے سکتا

جس دن یہ دامن چھوٹتے، پھر وہ سوچتا بھی کہ اور زندگی کرتا ہے یا زندگی کو ایک ہی ٹھوکر سے موت کی سنگلاخ چٹانوں سے نیچے دھکیل کر فنا کر ڈالتا ہے......

تھا اس نے دے لیا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس لمحے اُس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب بھی نہیں ہوئی تھی۔ پاپا، وانیا، جازی ابھی صبر کے دامن کی طرح اُس کی مٹھی میں تھے۔

وہ سوچ رہا تھا اور پاپا اُسے پریشانی سے دیکھے جا رہے تھے۔ وہ کتنا کم بولتا تھا اور اسی کم بولنے نے تو اُسے اس حال کو پہنچایا تھا۔

وہ چاروں اُس کے دل کی حالت سے بے پروا اُس سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف سالار عبدالرحمٰن تھے، جو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگے تھے۔

آخر معاملہ کیا ہے؟ اُسے دیکھنے گئے ہیں یا وہیں قیام کا ارادہ کر لیا ہے؟...... جھنجلا کر سوچا اور گاڑی سے باہر آ کر مسلسل بیٹھے رہنے سے قدرے سن اعضاء کو حرکت دینے لگے۔ کچھ اطمینان محسوس کیا تو اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔

اُن کی پشت کار کے فرنٹ ڈور سے ٹکی ہوئی تھی اس لئے اُنہیں احساس نہیں ہوا مگر پوائزن کی تیز خوشبو ناک کے ذریعے اُن کے اندر پہنچی تو کہیں اندر ہلچل محسوس ہوئی۔ بظاہر تو یہ خوشبو کوئی بھی لگا سکتا تھا لیکن جس طرح اُن کے دل کی دھڑکن نے اپنی تال بدلی تھی، اُس نے اُنہیں اینڈی کیٹر دیا تھا کہ وہ دُشمن جاں کہیں قریب ہی ہے......

اُنہوں نے دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھا اور وہ کوشش کے بعد نظر آ ہی گئی۔ بلیو جینز اور ڈارک بلیو شرٹ پہنے شگی کٹ بالوں کو جھلاتی وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور بس پھر اُنہیں خود پر اختیار رہتا، یہ کیسے ممکن تھا؟ اُسے دیکھ کر وہ وقت، حالات، اپنی شخصیت سب کچھ بھول جایا کرتے تھے۔ تو تقریباً دوڑنے والے انداز میں اُس کے پیچھے بھاگے تھے۔ لیکن اُس کے قریب ہونے والے تھے کہ بجلی کے کوندے کی طرح اُن کے دل میں خیال آیا شہریار ہسپتال میں تھا اور جانا نہ یہاں موجود تھی...... تو کیا آج بھی شہریار کے لئے وہ اسی طرح جذباتی لگاؤ سے سوچتی ہے......؟ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اُسے دیکھنے آئی ہے۔ اُسے...... شہریار عبدالرحمٰن کو؟



یکدم پانچ سالہ پرانی رقابت پھر سے چنگاری کی طرح راکھ میں سے اُبھری اور اُن کے خرمن دل کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ مگر اس کے باوجود اُسے قریب سے دیکھنے کی تمنا میں وہ بڑھتے چلے گئے۔ یہ اور بات کہ وہ جانتے تھے، پبلک پلیس میں جانا نہ سے گفتگو کے خاطر خواہ جواب کا مطلب ہے اپنی شخصیت کا تماشہ بنوا لینا۔ سو وہ اُسے قریب سے محسوس کرنا چاہتے تھے لیکن اُس سے اُن کا ٹکراؤ بھی ہو، اس

خواہش کو انہوں نے دبا لیا تھا۔

وہ واپس چلتی، سیڑھیاں چڑھتی، شہریار کے رُوم والی کوریڈور میں چلنے لگی۔ مگر وہ رُوم نمبر 15 کے بجائے رُوم نمبر 17 کے آگے جا کر رُک گئی تھی۔

اس رُوم میں کون ہو سکتا ہے......؟

وہ کھوج میں لگ گئے۔ جانا نہ سے متعلق کوئی جستجو آمیز پہلو ہوتو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دفتری مصروفیات کو اہمیت دیتے؟ وہ وہیں رُک کر کسی نرس کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر اُنہیں اس کمرے میں فرائض ادا کرنے والی نرس کا پتہ چل گیا۔ وہ نارمل انداز میں اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس وقت وہ اپنی ساتھی نرس کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھے۔

''جی فرمایئے سر! ہم آپ کے لئے کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں؟''

سالار عبدالرحمٰن نے سر سے پیر تک اُنہیں تولا، پھر مدھم بولے۔

''یہ وی آئی پی رومز کو لک آفٹر کرنے والے صاحب کون ہوتے ہیں؟''

اُنہوں نے ذہن پر یوں زور دیا جیسے اچانک وہ نام بھول گئے ہوں۔ دونوں لڑکیاں اُنہیں حیرت سے دیکھتی رہیں، پھر وہ لڑکی جو رُوم نمبر 17 سے نکلی تھی، ہمدردی کے خیال سے فوراً بولی۔

''شاید آپ مسٹر اکرم رانجھا کا نام یاد کر رہے ہیں۔ جی ہاں سر! ان وی آئی پی رُومز کو وہی لک آفٹر کرتے ہیں۔''

سالار عبدالرحمٰن سر ہلا کر یوں دیکھنے لگے، جیسے وہ واقعی اسی جواب کے منتظر تھے مگر ابھی ان کی پشت ہوتے ہی ان دونوں نے اپنے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ پھر سے مڑے۔

''کیا آپ رُوم نمبر 17 میرے دوست کے لئے مہیا کر سکتی ہیں؟......دراصل وہ ڈپریشن کا مریض ہے، اس لئے وہ کچھ دن ہر طرف سے منہ موڑ کر آرام کرنا چاہتا ہے۔''

''آرام......اور ڈپریشن میں؟''

''کیوں، کیا ہوا مس ارما! آپ حیران ہو رہی ہیں؟'' اُنہوں نے یہ کوشش نام اُگلوانے کے لئے کی تھی کہ وہ رُوم نمبر 17 میں ٹھہرے مریض کی شخصیت جان جائیں، لیکن نرس ارما ڈپریشن اور آرام کا کمبی نیشن ڈھونڈنے لگی تھی۔ اُنہیں کوفت ہونے لگی تھی، جب اُس نے ناصحانہ کہا۔

”کبھی کبھی ڈپریشن میں آرام ضروری ہوتا ہے اگر یہ ڈپریشن کام کی زیادتی سے پیدا ہو۔ وگرنہ ضروری ہے کہ ڈپریشن میں انسان جتنا مصروف ہو سکتا ہے، مصروف رہے۔ آپ کے خیال میں آپ کے دوست ڈپریشن کی کس کیٹگری سے تعلق رکھتے ہیں؟“

لڑکی بہت باتونی تھی، لیکن یہ اُس کی عمر کا تقاضا تھا۔ ابھی وہ مشکل سے اُنیس سال کی تھی اور اس عمر میں انسان تو یوں بھی ہواؤں سے، چاند تاروں سے باتیں کرنے کا اتنا شوقین ہو جاتا ہے کہ پھر جہاں ایک جملے سے بات ختم ہو سکتی ہے، وہاں پوری لن ترانی ناکافی لگتی ہے۔

”آپ نے رُوم نمبر 17 کے متعلق نہیں بتایا۔ کیا وہ رُوم میرے دوست کو مل سکتا ہے؟“ انہوں نے جھنجلا کر اُسے پھر سے اپنے مطلب کی بات کی طرف لانے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہی اور دوسری نرس آسیہ عظیم رسانیت سے مخاطب ہوئی۔

”ہمیں رُوم نمبر 17 آپ کو دینے میں کوئی تامل نہیں تھا سر! لیکن یہ رُوم پہلے سے ہی کسی کے پاس موجود ہے۔“

”پہلے سے ہی کسی کے پاس موجود ہے...... لیکن کیا میں جان سکتا ہوں، وہ کون صاحب ہیں؟“

”سوری سر! یہ ہمارے رولز کے خلاف ہے۔ آپ خود سوچئے! اگر کوئی شخص یہاں آپ کے دوست کی طرح اپنا ڈپریشن ریلیز کرنے آئے اور ہم ہر کسی کو اُس کی بابت بتاتے پھریں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں، ہمارے کلائنٹس ہمارے متعلق کیا رائے رکھیں گے۔“

انہوں نے واضح ناپسندیدگی کا تاثر دیا۔ یہاں وہ اپنے جذبات کو چھپا نہیں پائے تھے۔ وہ واقعی بہت جذباتی تھے۔

تبھی ارمانے کاروباری انداز میں انہیں پھر سے مخاطب کیا۔ ”مگر آپ چاہیں سر! تو رُوم نمبر 13 ابھی بھی خالی ہے۔ ہم یہ رُوم آپ کے دوست کے لئے بک کر سکتے ہیں۔“

”نو نو...... اُسے 13 نمبر کا ہندسہ قطعاً پسند نہیں۔ اچھا خیر، آپ سے خوب ملاقات رہی۔ میں اب چلتا ہوں۔“ انہوں نے کاؤنٹر پر رکھی اپنی کار کی چابیاں اُٹھائیں اور متناسب قدموں سے چلتے ہوئے رُوم نمبر 15 پر جا کر رُک گئے تھے۔

”مجھے اندر نہیں جانا ہے......“ انہوں نے خود کو تنبیہ کی۔ حالانکہ ساتھ رہنے کا اُنس چیخ چیخ کر انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ ایک نظر ہی سہی، شہریار کو دیکھتے ہوئے چلیں۔ کتنی بھی خفگی سہی، جیسے مرنے کے خواہ

جتنے بھی ناطے توڑے گئے ہیں، کیا ہوا اگر وہ یہاں تک آ گئے ہیں تو شہریار عبدالرحمٰن سے بھی مل لیں۔
وہ مٹھیاں کھولتے، بند کرتے رہے مگر دماغ سے دل نہیں جیت سکا۔ تب انہوں نے موبائل پر پاپا کا نمبر ڈائل کیا تھا۔
کمرے کے اندر بیٹھے پاپا نے کوٹ کی جیب میں بجتا موبائل ہاتھ میں لیا۔ شہریار اُن کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اس لئے بیل کے بعد نام پڑھ کر جو تاثر پاپا کے چہرے پر بکھرا اس نے اُسے یہ باور کروانے میں تامل نہیں کیا کہ دوسری طرف سالار عبدالرحمٰن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔
''پاپا! مجھے دیں گے اپنا موبائل؟'' اُس نے ہاتھ پھیلایا۔ پاپا نے گومگو کی حالت میں اُسے دیکھا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ ''بے فکر رہیں، کوئی جھگڑا نہیں کروں گا ان سے۔ بس ایویں خیریت پوچھوں گا۔''
پاپا نے اُس کی پھیلی ہتھیلی میں سیل فون دے دیا۔ تب تک موبائل بج بج کر بند ہو گیا تھا۔ شہریار نے سالار عبدالرحمٰن کا نمبر پش کیا۔ دوسری طرف تیسری بیل ہی پر انہوں نے کال ریسیو کر لی اور چھوٹتے ہی بولے۔
''کیا ہے پاپا! آپ نے میری کال کیوں نہیں ریسیو کی؟ بتائیے، آپ کا دفتر کا ارادہ ہے یا سارا دن ہمیں وقت ضائع کریں گے؟''
شہریار کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا، پھر اُس نے کھنکھار کے کہا۔
''آپ بے فکر رہئے۔ پاپا کا قیمتی وقت میں قطعاً ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن یہ تو بتائیے، آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟'' اُس نے دوستانہ انداز اپنایا تھا مگر انہیں اُس کی آواز سن کر ہی پتنگے لگ گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا اُس نے صرف کل کے معاملے کو دبانے کے لئے ہسپتال نوردی کی راہ لی تھی۔ اُن کا خیال تھا، وہ اگلی بھلا چنگا ہے اور بس خود کو کیش کروانے کی لت اُس کی جان نہیں چھوڑ رہی۔
''کیا ہوا بھائی! کہاں گم ہیں؟ کہیں مجھ پر پیپر تو نہیں پڑھنے والے؟'' شہریار نے دوبارہ اُکسایا تو وہ کھردرے لہجے میں پکارے۔
''میرے پاس فرصت بہت کم ہوتی ہے شہریار! پلیز، فون پاپا کو دو۔ مجھے تم سے بات کرنے کا کبھی بھی گریز نہیں رہا۔ تم میرے لئے صرف ایک متروک لفظ ہو اور کچھ نہیں۔''
شہریار نے گہری سانس لے کر سیل فون پاپا کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ گفتگو کا اختتام بہت برے موڑ پر ہوا ہے۔
عائشہ بھابی اپنے شوہر کا مزاج جانتی تھیں اور ان دونوں کے درمیان کا جھگڑا بھی۔ سو تاثر زائل کرنے کو بولے سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ممتا بھرے انداز میں بولیں۔ ''تم اپنے بھیا کا مزاج جانتے ہونا۔ پھر اُن کی باتوں کو دل پر کیوں لیتے ہو؟''

"ارے کہاں بھابی! مجھے کیا ضرورت ہے دل پر بار لینے کی؟...... اگر نہیں جانتا ہوتا کہ وہ مجھ سے دل ہی دل میں کتنی محبت کرتے ہیں تو یقیناً دل افسردہ کرتا۔ یہ تو بس یونہی جوکنگ ہے۔ اگر ایسا موڈ نہ بناتا تو آپ کے چہرے پر مما طرح کی ممتا اتنی آسانی سے دیکھنے کو ملتی؟"

وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ ایک دوبار مانیٹر نے شور بھی کیا، برملا اُسے ایکسپوز کرنے کے لئے مگر پھر بہت جلد اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

پاپا اور عائشہ بھابی اُسے خدا حافظ کہہ کر جا چکے تھے۔ دانیا کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر بہت گمبھیرتا تھی۔ اُس نے اُس کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے دیکھا۔

"پلیز دانیا! کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ ایسی شکل بنا کر رکھو گی تو ٹھیک ہونے کو میرا دل ہی نہیں چاہے گا۔ بنسولڑکی! تمہاری مسکراہٹ تو ہر غم کے سامنے سیاہ ہے۔ کیا تم مجھے مارتے دیکھنا چاہتی ہو؟" اُس نے پھیکی ہنسی سے اُسے دیکھا۔

جازی نے اُس کی طبیعت سنبھلتے دیکھی تو گھر جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ شہریار نے کچھ دیر تو اُس کا خاموشی سے جائزہ لیا، پھر ہنس پڑا۔

"تم بھی گئے ہاتھ سے میرے۔ تمہیں چھو کر پہلے صرف گمان تھا مگر اب تمہاری آنکھیں پڑھ کر آگہی ہونے لگی ہے کہ دھوپ بہت تیز ہے میرے سر پر۔"

"نہیں تو بھائی جان! آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

شہریار نے جان کر اپنی بات پر زور نہیں دیا، پھر تنہائی کے خوف سے دل کانپتے دیکھا مگر جی کڑا کر کے بولا۔ "دانیا! تمہیں آج کالج کے لئے دیر ہو گئی ہے۔ تم گھر جاؤ۔ یونیورسٹی جانے کی تیاری بھی تو کرنا ہے۔"

"نہیں بھائی! آج مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں دو تین دن کی چھٹی کر لوں گی۔ آپ کے پاس بھی تو کسی کو ہونا چاہئے ناں۔"

اُس نے اُس کی صلاح مسترد کر دی تو وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، کالج نہیں جانا تو ٹھیک ہے، گھر جا کر آرام کرو۔ ساری رات سے جاگ رہی ہو۔ مجھے پہلے یہ خیال نہیں آیا۔ سوری گڑیا! تم جازی کے ساتھ گھر جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر بھی اگر کسی قسم کی ضرورت ہوگی تو انکل صمدانی تو ہیں ناں یہاں۔ تم شام کو پھر آ جانا۔"

وہ یہ بات بالکل ماننا نہیں چاہتی تھی مگر اُس نے اتنا زور دیا تھا کہ اُسے اور جازی کو گھر کے لئے روانہ ہونا ہی پڑا۔

کار دانیا ڈرائیو کر رہی تھی اور جازی اُس کے برابر میں بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ بہت خاموشی سے کٹ رہا تھا اُن کا سفر کہ اُس نے دانیا کو مخاطب کیا۔

''بجو! کیا آپ بھائی سے پھر راضی ہو گئی ہیں؟''

دانیا نے پُر سوچ انداز میں اُسے دیکھا، کچھ نہیں بولی اور وہ ڈھونڈ نظر آنے لگا۔

''بھائی جان بیمار نہ ہو جاتے ناں تو میں بتاتا میں اُن سے کتنا خفا ہوں۔ مگر فی الحال تو مجبوری ہے۔''

دانیا نے اُسے پھر سے دیکھا اور سوچا...... محبت اختیاری جذبہ ہے ہی کب۔ یہ تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی...... مجبوری کی کوئی زنجیر محبت کو نہیں باندھتی۔ دل مجبوری کو مانتا ہی کب ہے۔ لیکن شہریار عبدالرحمٰن کے معاملے میں ساری خفگی، ناراضگی کے باوجود وہ اپنا رویہ محبت آمیز رکھنے پر مجبور تھی۔ لیکن کیا وہ بہت عرصے تک اُس کی اس مجبوری سے لاعلم رہ سکتا تھا؟...... اُس کے دل پر تو الہام اُترتے تھے۔ پھر وہ کیونکر نہیں پہچان سکتا تھا کہ اُس کے سہاروں کا آخری سہارا دانیا عبدالرحمٰن بھی اُس سے چھوٹ چکی ہے......

کار سبک رفتاری سے گھر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ تھکن سے کہیں زیادہ محبت کی حرماں نصیبی اُس پر بھاری بوجھ کی طرح بیٹھتی جا رہی تھی، جیسے وہ خاموش سمندر تھی اور محبت بھاری پتھر کی طرح اُس کی گہرائی میں اترنے کو بے قرار تھی۔ لیکن گھر میں داخل ہوئی تو جس سے سابقہ پڑا، اُس نے اُس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دیں۔ وہ چاہتی تھی، ماما اُسے نہ دیکھیں اور وہ چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر ساری تھکن خود پر سے اُتار پھینکے مگر بہت سی دُعائیں پوری کب ہوتی ہیں۔ ماما نے بس ہلکی سی جھلک دیکھی اور اُسے پکار لیا۔

کہتے ہیں، جنگل ہو یا ویران راستہ، پیچھے سے تمہارا نام لے کر کوئی پکارے تو کبھی پلٹنا نہیں چاہیے، انسان پتھر ہو جاتا ہے۔ مگر اُسے زندگی کے اس ویران راستے پر پکار لیا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کر کے مڑی تاکہ دل یکبارگی ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ سامنے حمزہ عابد کھڑا تھا۔ وہی حمزہ عابد، جو بہت پہلے بہت کچھ تھا اُس کا...... اُس کی ہتھیلی پر لکھی گئی سب سے انمٹ سرخوشی۔ مگر اب......

''تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو، میں تمہارے لئے چائے بھیجتی ہوں۔''

ماما ہمیشہ کی طرح ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر کچن میں چائے کا حکم دیتی، اپنے کمرے کی سمت بڑھتی چلی گئیں۔ اُسے ماما کی اس معصوم خوشی چرانے کی تمنا نے کتنی دیر تک اندر ہی اندر ہنستے رہنے پر مجبور کئے رکھا مگر ہنسنے کے بعد خاموشی نے اُس کی آنکھوں، اُس کے ہونٹوں کو چھوا تو نمی اور حسرت بھری آہ کے سوا یہ ہنسی کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا، پھر کتنی دیر بعد بولا۔

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو...... خیریت؟"

اُسے لگا تھا، وہ پوچھے گا، آج غیر متوقع طور پر وہ کالج کے بجائے گھر میں کیوں ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ جہاندیدہ تھا، ضمنی سوالوں میں اُلجھنے کے بجائے ڈائریکٹ اصل بات کی طرف لوٹ آیا تھا۔

وہ چپ رہی تھی۔ ابھی تک جواب ہنوز حل طلب تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اُس نے پہلے سوال سے نیا سوال تراشا۔

وہ پھیکی ہنسی سے بدقت بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک ہے۔ وہ بس کل اچانک شیری بھائی کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔"

حمزہ عابد کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی، جیسے قطعی نامعقول ہستی کا ذکر ہو۔ وانیا عبدالرحمٰن بھلے خود بھی اُس سے ناراض تھی مگر کسی اور کا اس طرح اُس کے بارے میں جذباتی اظہار کرنا تک اُسے برا لگتا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟" اُس نے نرمی سے پوچھا۔

اُس نے چپ سے اُسے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "تم جانتے ہو، شیری بھائی کے لئے کسی کا بھی غلط انداز یا بدکلامی ہو یا تاثراتی، مجھے پسند نہیں آتا۔"

"تم!" وہ اُسے چبھتے ہوئے انداز میں دیکھتا رہا، پھر یکدم کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر کو اُسے تیز نظروں سے گھورتا رہا، پھر تیز آواز میں بولا۔ "میں سمجھتا تھا، ان پانچ سالوں میں تمہیں شہریار کی خودغرضی اور اپنا خالی پن اتنی اچھی طرح سمجھ آ چکا ہوگا کہ مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور تم برملا میرا ساتھ دینے اُٹھ کھڑی ہوگی۔ مگر اب بھی...... اب بھی تمہیں شہریار عبدالرحمٰن کی ذات عزیز ہے۔ آخر تمہاری پرابلم کیا ہے؟ جب آنٹی انکل راضی ہیں، میں راضی ہوں تو تم خوشی بن کر میرے گھر کیوں نہیں آنا چاہتیں؟"

بات وہیں آ کر رک گئی تھی، جہاں وہ چاہتی تھیں کہ اب کبھی نہ آئے لیکن جواب لازمی تھا۔ سو وہ جی کڑا کر کے صوفے سے اُٹھ گئی، پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"کسی کو اعتراض نہیں، نہ سہی۔ لیکن کسی کے گھر خوشی بن کر جانے کے لئے خوشیوں بھرا سواگت، دعا ہوتے، دعا بنتے لمحے بھی تو درکار ہوتے ہیں...... میں کیسے ماریہ کی افسردہ آنکھوں میں خوشی کے استحقاق سے دیکھوں گی؟ جمیلہ آنٹی کو جب جب مجھ سے کلام کرنا پڑے گا، اُنہیں لگے گا، کسی ناتمام دعا سے اُن کا گلا چھل گیا ہے لیکن مستجابی کسی اور کی جھولی میں ڈال دی گئی ہے۔ میں کسی کے دُکھ سے خوشی

مٹھیوں میں سمیٹنا نہیں چاہتی حمزہ! بس سمجھ لو! ہم یہاں تک ہی کے ساتھی تھے۔"

حمزہ عابد تنتناتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ چائے کے لئے رُکا نہیں تھا۔ ماما نے کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم کا چکر لگایا تو اُسے مجسمے کی حالت میں یونہی بیٹھا دیکھا۔

"کوئی بات بنی دانیا؟"

وہ، جو کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے اُسے تنہا کرتی تھیں، وہ آج ہمیشہ کی طرح اپنے سوال کے بعد اس کی خاموشی سے افسوس کے پھول چن رہی تھیں۔ افسوس کے پھول...... زرد، بے حد زرد......

اُس میں ماما کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی اور ماما شہریار عبدالرحمٰن کو بے نقط سنا رہی تھیں۔

"نہ جانے کون سا منحوس لمحہ تھا، جب وہ اس گھر میں آیا۔ یہ گھر اُس کی نحوست سے اُجڑ گیا ہے، برباد ہو رہا ہے، مگر تمہارے پاپا کی آنکھوں پر اُس کی محبت کی جو پٹی بندھ گئی ہے، وہ اُترتی ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں، کیا پڑھ کر پھونکا ہے اُس نے اُن پر۔ میرے کہنے میں تو آتے ہی نہیں۔ اور تم...... تم بھی اپنے نام کی ایک ہو۔ دوسروں کی خوشیوں کے لئے اپنی زندگی برباد کرنے میں بھی تمہیں کوئی عار نہیں۔"

وہ کیا کہتی، کان دبا کر سنتی رہی۔ یہ اور بات کہ جب رات گئے شہریار عبدالرحمٰن نے تنہائی سے گھبرا کر اُس کے سیل پر فون کیا تو وہ خود کو اُس سے بات کرنے کے لئے راضی نہیں کر سکی۔ مصلحت اندیشی کے تحت اُس نے ہسپتال جانے کے لئے شام کو تیاری بھی کی تھی مگر پھر سوپ اور کھانا اُس نے ڈرائیور کے ہاتھ ہسپتال بھجوا کر کمرہ بند کر لیا تھا۔

جازی بھی پہلے جیسے موڈ میں واپس آ چکا تھا اس لئے اُس نے بھی ہسپتال کی طرف رُخ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ رہے پاپا تو وہ دفتر سے اتنی رات گئے فارغ ہوتے تھے کہ صرف ہیلو ہائے کر کے گھر چلے آتے تھے۔ وہ رُکنا چاہتے تھے، مگر شہریار عبدالرحمٰن نے اُنہیں زبردستی گھر بھیج دیا تھا۔ لیکن اس لمحے وہ رات کے ڈیڑھ بجے دانیا کو فون کرنے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔

"میں اس لمحے آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے لگتا ہے، اگر آج میں نے اس لمحے آپ سے بات کرنے کی کوشش کی تو شاید ساری زندگی آپ بات کرنے، بولنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے......"

وہ بڑبڑاتی رہی مگر وہ جتنی شدت سے بار بار اُس کا نمبر پریس کر رہا تھا اس سے اُسے اُلجھن ہونے لگی تھی۔ کتنی دیر تک اُس نے انتظار کیا وہ تھک جائے، مگر وہ جس ڈھٹائی سے مصروف ہی رہا تو اُس نے موبائل آف کر دیا۔

آج کی رات وہ صرف خود سے ملنا چاہتی تھی، خود سے...... جہاں صرف وہ ہوتی...... وہ اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ وہ بظاہر سونا چاہتی تھی، لیکن اندر کی دانیا مچلتے ہوئے بچے کی طرح اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر پانچ برس پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ کالج اسٹوڈنٹ ہوا کرتی تھی۔

کتنے خوب صورت دن تھے۔ وہ، شہریار، ارماحمزہ عابد، سلامہ ارسلان اور عارف بیگ، جن میں دنیا جہاں کی انقلابیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ بنا کسی کے کہے، بزعم خود لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اردگرد شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ ماضی اُس کے سامنے فلم کی طرح چل رہا تھا۔



دانیا عبدالرحمٰن صبح کے چھ بجے اُٹھ گئی تھی۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ وہ فجر کی نماز کے لئے روز اُٹھا کرتی تھی۔ پھر نماز کے بعد کالج کا کوئی کام ہوتا تو وہ کرتی، نہیں ہوتا تو روز ایک رکوع ضرور پڑھتی اور ساڑھے پانچ بجے اُس کے قدم انیکسی کی طرف اُٹھتے چلے جاتے۔ گارڈن کی نرم نرم گھاس پر وہ ننگے پیر چلنے کی خواہش میں بیڈروم سلیپر پہننے کی زحمت بھی نہیں کرتی تھی۔ پازیب کی جھنکار اُس کی آمد کا اعلان کرتی جاتی اور وہ صبح خیزی کے مزے اُڑاتی جب انیکسی پہنچتی تو ماتھوں پسینہ آجاتا۔ ہو ہر روز کی طرح آج بھی وہ باہر کھڑی دستک دے رہی تھی، مگر جواب ہنوز ندارد تھا۔

''شیری بھائی! دروازہ کھولیں ناں!'' اُس نے تنگ آ کر کھڑکی سے چیخ کر پکارا۔ تب کہیں دروازہ کھولا گیا مگر یہ شیری عبدالرحمٰن نہیں، سلامہ ارسلان آنکھیں ملتا کھڑا تھا۔ اُس نے دوپٹہ درست کیا اور حیرت سے سوال داغا۔

''سلامہ! یہ تم یہاں کیسے پائے جاتے ہو؟''

اور بس سلامہ ارسلان کو خدا موقع دے بات کرنے کا۔ جھٹ سے صوفے پر پاؤں پسار کر بولا۔ ''وہ دانی سسٹر! کیا ہے کہ ہم رات کو کمبائن اسٹڈی کر رہے تھے ناں، اس لئے کب آنکھ لگی، پتہ ہی نہیں چلا۔ بس جہاں بیٹھے پڑھ رہے تھے، وہیں سو گیا۔''

دانیا عبدالرحمٰن نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ سلامہ ارسلان ہو یا عاطف بیگ، دونوں تعلیم سے یوں بھاگتے تھے جیسے الیکشن کے بعد عوام سے امیدوار...... سو حیرت ہونا لازمی تھی۔ اُس کی آنکھیں اب بھی اُس پر جمی ہوئی تھیں، اس لئے وہ کسمسایا تھا۔

''کیا ہے دانیا سسٹر! تم تو یوں گھور رہی ہو، جیسے انویسٹی گیشن آفیسر ہو۔''

اُس نے دو قدم اندر رکھا اور مہک سے اُس کا دم اُلٹنے لگا۔ سارا کمرہ سگریٹ کے دُھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ باہر کی طرف ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں مگر بہر حال، سگریٹ کی مخصوص بدبو اتنے آرام

سے کمرے سے نہیں نکل سکتی تھی۔ دوسرا معرکہ...... اُس نے اچانک شہریار کا دروازہ کھولا اور شہریار ہونق بن کر اُسے دیکھنے لگا۔ ایئر فریشنر اسپرے ہاتھ میں بلند کیے وہ اپنی چوری چھپانا چاہتا تھا مگر موقع پر چھاپہ پڑا تھا۔

"وانیا! یہ کیا ہے بھئی؟ تم کب سے اِل مینرڈ ہوگئی ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے، کسی کے رُوم میں جانے سے پہلے دروازہ ناک کیا جاتا ہے۔"

"ہاں، شاید اس طرح چوری پکڑنے میں ناکامی جو ہوسکتی ہے۔" اُس نے سختی سے اُسے دیکھا، پھر اُس کے سینے پر ہاتھ مار کر اُسے دیوار سے لگاتی ہوئی غصے سے پھنکاری۔ "شیری بھائی! یہ کمبائن اسٹڈی ہے یا سگریٹ نوشی کا مقابلہ؟...... یہ دو ایش ٹرے بھری پڑی ہیں۔ کوئی خوفِ خدا ہے آپ کو، کہ اتنا نکوٹین کہاں گیا ہوگا؟"

اُس نے مسکین شکل بنائی اور یہ طے تھا کہ وہ جب نرم ہوتی تو اُس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا اور اس کا مزاج گرم دیکھتا تو مسکین صورت بنا کر اُس کی ہمدردی سمیٹنے کی کوشش کرتا۔ شاید وہ اس حربے میں کامیاب بھی ہو جاتا مگر برا ہو وانیا عبدالرحمٰن کی تیز نظری کا کہ اُس نے ٹی وی اور انگلش موویز کی سی ڈیز سمیت وی سی ڈی کو بھی مارک کرلیا تھا۔

"اوہ اچھا...... اچھا تو کمبائن اسٹڈی ہو رہی تھی۔ کافی زوروں پر تھا تعلیم کا حصول۔"

شہریار نے گھور کے سلامہ ارسلان کو دیکھا۔ یہ سب اُس کی ہی تو کارستانی تھی ورنہ یہ معصوم چوریاں تو وہ کب سے کر رہا تھا، لیکن آج تک نہیں پکڑا گیا تھا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر سی ڈیز وہ دراز میں لاک کر دیا کرتا تھا۔ سگریٹ نوشی بھی ہمیشہ باہر ہی کرتا تھا لیکن کل بس اچانک سلامہ ارسلان نے اُسے احساس دلایا، وہ آخر کو تھرڈ ایئر میں آگیا ہے۔ بقول اُس کے جوان ہوگیا ہے، اس لئے اتنی سی من مانی کرنے کی چھوٹ تو ملنی ہی چاہئے۔ لیکن یہ کل کی ہمت، اُس کی آج کی ثابت قدمی کو سبوتاژ کر رہی تھی۔

"بھائی! آپ بول کیوں نہیں رہے؟ تو یہ خفیہ مشاغل ہیں آپ کے۔"

پولیس افسرانہ انداز تھا اُس کا۔ وہ اس بدپرہیزی کو درگزر کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، اس لئے اُس نے فوراً اُسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا، پھر لجاجت سے بولا۔

"وانیا یار! وہ بس، کبھی کبھی ہو جاتی ہے ناں غلطی۔"

"غلطی...... تو آپ اسے غلطی سمجھتے ہیں؟ یعنی آپ اسے پھر کبھی نہیں دہرائیں گے؟"

واضح اشارہ سگریٹ نوشی کی طرف تھا اور شہریار جان کنی میں اٹک گیا۔ کہنے کو تو وہ جھوٹا وعدہ بھی کر سکتا تھا، لیکن بس ضمیر کا ایسا پکا تھا کہ سارے وعدے وفا کرنے کی نیت سے کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بہت کم وعدے کرتا تھا۔

دانیا اُسے سوالیہ دیکھ رہی تھی۔ تب اُس نے گلا کھنکھار کے کہا۔ ''تم جانتی ہو دانیا! میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' مجبوری بتا کر سر جھکا لیا۔

سلامہ ارسلان چڑ کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، پھر بے پروائی سے بولا۔ ''دانیا! کیوں تم سمجھتی ہو کہ شہریار کے ہر اچھے برے کی ذمہ داری تم پر ہے؟ کم آن سسٹر! ہم اب بڑے ہو چکے ہیں۔ کیا برا ہے پھر اگر تھوڑی سی اپنی مرضی کر لیتے ہیں؟''

''آپ کے لئے نہیں ہوگا لیکن میں شہریار بھائی کو تباہی کی طرف نہیں جاتا دیکھ سکتی۔''

''پلیز دانیا! یہ بہت زیادہ ہے۔ دیکھو تم بہت زیادہ رعب ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ حالانکہ عمر میں، میں تم سے بڑا ہوں۔''

''عمر میں بڑے ہونے کا کیا مطلب ہے، کیا آپ کو کھلی چھٹی مل گئی؟ جتنی مرضی آئے اسموکنگ کریں؟'' وہ غصے سے تلملا کر بولی اور وہ موڈ آف کیے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے تاثرات کسی حد تک اپنے خلاف دیکھے تو سلامہ ارسلان پر چڑھ دوڑی۔

''آپ بہت برے ہو سلامہ بھائی! آخر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ اسموکنگ کیے بغیر آپ کی سیاسی سرگرمیاں پھل پھول نہیں سکتیں؟''

سلامہ جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ وہ پھر سے شہریار کے موڈ کو داغ دے کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''آپ اسٹوڈنٹ ہیں...... سیاست میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، کس کس کا مشورہ اپلائی کریں گے؟ اگر کل کسی نے کہا، اسموکنگ سے بھی آپ ڈیشنگ نہیں لگ رہے تو پھر نئی کیا لت لگائیں گے؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ اُس نے صحیح تجزیہ کیا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے جہاں بھی وہ شریک ہوتا، وہیں مشورہ ملتا، شکل سے بچے لگتے ہو۔ قد کاٹھ کسی کام کا نہیں ہے۔ اگر بندہ اسموکنگ نہ کرے، تمہیں معلوم نہیں ہے، سگریٹ نوشی ہی سے تو مرد کی شان ہوتی ہے لڑکیاں مرتی ہیں ایسے بندے پر...... اور بس یوں اُس نے اور سلامہ ارسلان اور عاطق نے اسموکنگ شروع کر دی تھی۔ ایسے کہ آج

دو سال بعد تک وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔

دانیا دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی دیر تک...... پھر اُس نے بھرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے صبح فجر کی نماز پڑھی تھی بھائی؟ میں نے ٹھیک وقت پر آپ کے موبائل پر الارم دیا تھا۔"

جھکی گردن کچھ اور جھک گئی۔

"وہ...... رات کو دیر تک جاگتے رہے، اس لئے نماز قضا ہو گئی دانیا!"

دانیا نے سنا تو پیر پٹختی ہوئی انیکسی سے نکلتی چلی گئی۔

شہریار بے کل سا ہو گیا۔ بڑے ہونے کا رُعب صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ صوفے پر دھنس گیا۔ سلامہ ارسلان اُسے دیکھتا رہا۔ برداشت نہ ہو سکا تو پکارا۔

"کیا ہے یار! یہ منہ کیوں اُتر گیا ہے تیرا؟"

شہریار نے اُسے دیکھا، پھر تاسف سے بولا۔ "یار! دانیا روٹھ گئی ہے۔ یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ میں نے آج تک اُسے کبھی ناراض ہونے کا چانس نہیں دیا۔"

وہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "پاگل ہو گیا ہے۔ اُس کے ناراض ہونے سے ایسا مرجھا گیا ہے۔ ارے یار! یہ بہنیں بھی کوئی ناراض ہوتی ہیں؟ اُن کے دل اتنے سے ہوتے ہیں، چڑیا کے برابر۔ نازک اور رحم سے بھرے ہوئے...... ذرا سی منہ پر مسکینی لے آؤ، منہ بسور لو، فوراً راضی ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ایسا کرنا۔ وعدے وعید کی بارگیننگ کرنا چاہے تو کر لینا۔ وہ کون سا تیرے پیچھے پیچھے گھومے گی۔"

اُس نے تفصیل سے اُسے بریف کیا اور حلیہ درست کرتا انیکسی کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

یہ دروازہ اُس نے پاپا سے ضد کر کے بنوایا تھا تا کہ گھر میں بڑے گیٹ سے داخل ہوتے دیکھ کر کوئی یہ نہ جان سکے کہ وہ درحقیقت رات کو کتنے بجے گھر آیا تھا۔ عموماً وہ بہت زیرک فہمی سے گھر سے غائب ہوتا تھا۔ کبھی ٹی وی آن کر دیتا، کبھی اپنی آواز میں ریکارڈ کیسٹ لگا دیتا، جس میں وہ تندہی سے پڑھائی میں مصروف ہوتا۔ پاپا باہر سے سن کر ہی مطمئن ہو کر واپس لوٹ جاتے۔ لیکن دانیا چونکہ اُن کے ساتھ ہی کالج میں تھی اس لئے اُن کی پلاننگ سے آگاہ ہو ہی جاتی تھی اور یوں اُس کی یہ کبھی کبھی کی چوری پکڑی جاتی تھی۔ وہ ہر چوری پکڑے جانے پر منہ بسور کر بہن کو دیکھتا اور وہ اُس کی مسکین صورت دیکھ کر ہنس پڑتی۔ اُسے اپنا غصہ بحال رکھنا ہی دُشوار لگتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ اُس کے زیادہ قریب رہی تھی۔ دونوں بڑے بھائی اُس سے چھ سال بڑے تھے، پھر یہ شہریار تھا اور وہ شہریار سے پورے دو سال چھوٹی تھی۔ بظاہر اُس کا اور شہریار کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر سالار اور عدیل بھائی کے تین سال بعد جو بہن دنیا میں آئی تھی انہی دنوں پاپا اُسے گھر لے آئے تھے۔

وہ محض تین دن کا تھا اور پاپا بھی تین دن بعد گھر آئے تھے۔ بظاہر ماما کے لئے اُس کا وجود ناپسندیدہ تھا لیکن پاپا کی درخواست اور خود اندرونی ممتا کے پیشِ نظر، وہ وقتی طور پر اُس کے وجود کے وقوع ہونے کا سوال بھول گئیں اور یوں وہ اور عینا ایک ساتھ مما کا دودھ اور توجہ شیئر کرنے لگے۔

پھر وہ دو سال کا تھا، جب اچانک عینا ٹائیفائیڈ کے بگڑ جانے کی وجہ سے دنیا سے واپس چلی گئی۔ پھر جو سوال وقتی طور پر اُٹھنے سے رہ گیا تھا، مما کی اپنی اولاد کے اُٹھ جانے کی وجہ سے شدت پکڑتا چلا گیا۔ وہ مما کا معتوب ٹھہرا۔ پھر وہ خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرتا تھا۔ جب دانیا دُنیا میں چلی آئی، ماما کی توجہ بیٹی کی طرف واپس مڑ گئی۔ ایک بیٹی کے چلے جانے سے وہ اپنا مزاج بھول گئی تھیں۔ دوبارہ بیٹی کے ملتے ہی وہ اپنے میں مگن ہوگئیں۔ اب وہ نہ اُس سے ممتا اختیار رکھتیں، نہ اُس کی جان کے درپے ہوتیں۔ بس نیوٹرل رویہ تھا اُن کا...... اور بس یہیں سے وہ اور شہریار دوست بنتے چلے گئے۔

پھر ساری دنیا آتی جاتی رہی لیکن شہریار کے لئے دانیا عبدالرحمٰن اور دانیا عبدالرحمٰن کے لئے شہریار عبدالرحمٰن جزو لازمی ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ سلامہ ارسلان کے اس قدر سمجھانے پر بھی آزردہ بیٹھا تھا۔

”آپ ابھی تک نہا دھو کر تیار نہیں ہوئے؟“ یکدم اس خاموشی میں اسی آواز کا جلترنگ بجا، جس آواز کو وہ ساری زندگی اسی استحقاق اور مان سے سنتے رہنے کا تمنائی تھا۔

”اب ناشتہ کرنے کے لئے کیا دعوت نامہ ارسال کرنا پڑے گا؟“ اُس نے دانیا کا چہرہ دیکھا، جو قطعی نیوٹرل تھا۔ اُس کے چہرے سے اُس کی ناراضگی کا گراف بنانا بہت مشکل تھا۔

”دانیا! تم مجھ سے ناراض ہو کیا؟“

دانیا نے جواب نہیں دیا۔ اُس کے لئے بریڈ پر مکھن لگاتی رہی۔

”دانیا کی بچی! اب ستاؤ مت نا۔“

اُس نے پھر سے گھور کے دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ حوصلہ افزا جواب دیتی، حشمت بیگم کی تیز اور کرخت آواز اُن کے درمیان گونجی۔

”اچھا تو یہ اِس کے نازنخرے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ میں بھی کہوں، اچانک تمہیں ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ کرنے میں کیا اُلجھن ہونے لگی ہے۔“

"نانو، پلیز!" وانیا نے ہلکا سا احتجاج کیا۔
شہریار کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ نارضگی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ کھانا پینا ہی الگ کر لیتی۔ شروع سے وہ کھانا، ناشتہ، ڈنر ایک ساتھ کرنے کے اتنے عادی تھے کہ ایک دوسرے کے بغیر نوالہ حلق سے اُترنا مشکل ہی لگتا تھا۔ اس وقت کا احتجاج بھی اس لئے کیا گیا تھا کہ نانو نے غصے میں اُس کی اس کمزوری کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔
"اے لڑکے! تمھیں یہ دیر سے اُٹھنے کی عادت کب سے پڑ گئی؟" انھوں نے چشمے سے گھورتی آنکھیں اُس پر جما دیں۔
وہ اُس سے بریڈ لے کر مطمئن انداز سے ناشتہ کرنے لگا۔
نانو کی اور اُس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ نانو نے اُس سے کبھی نرم لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ اُس میں اور گھریلو ملازمین میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی تھیں، بالکل اسی طرح وہ مما کے علاوہ اُنھیں غیر ضروری مخاطب کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی، دونوں کے تعلق ہمیشہ ٹکراؤ کا سبب رہتے۔ اس وقت بھی وہ غصے میں بھڑک کر ان کے قریب آ گئی تھیں۔
"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"
"نانو! سمپل سی بات ہے، رات دیر تک میں پڑھائی کرتا رہا تھا، اس لئے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔"
"میرے سامنے زیادہ پڑھا کو مت بننا۔ میں تمھیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لئے کیا تم، کیا تمہاری پڑھائی...... تمھیں کاہے کی پروا۔ اماں باوا کا پیسہ ہوتا تو اُڑاتے ہوئے دل بھی دُکھتا۔ یہاں تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ اور آپ جناب ہیں کہ گل چھرے اُڑا رہے ہیں یا سیاست میں پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ تمہاری صورت میں جانے کون سے کرموں کی سزا ملی ہے میری بچی کو۔"
اُس نے ذرا پروا نہیں کی۔ شروع شروع میں یہ باتیں دل کو لگتی تھیں۔ وہ دو دو وقت بھوکا بھی رہ لیتا تھا۔ لیکن اب اُس کے لئے یہ طنزیہ گفتگو ایسے تھی، جیسے کوئی اُس کے کوٹ سے مٹی جھاڑ دے۔ اس لئے ناشتہ کرتے ہاتھوں اور بریڈ پیس چباتے دانتوں میں ویسی ہی روانی تھی۔
وانیا خاموشی سے اس سارے معاملے میں تماشائی بنی رہی تھی، اس لئے نانو نے جو اس پر بمباری کا خاص اثر نہ ہوتے دیکھا تو چائے کا کپ اُس کے لئے تیسری دفعہ لبریز کرتے دیکھ کر اُنھیں پتنگے لگ گئے۔
"خدا کا خوف کرو لڑکی! چینی، پتی، دودھ مفت میں آتا ہے کیا، جو اس لڑکے پر ضائع کرتی رہتی ہو؟ میں کہے دیتی ہوں وانیا! اس لڑکے کے مزاجوں کو تم نے ہی آسمان پر چڑھایا ہے۔ پتہ نہیں، کیا سمجھنے لگا

ہے خود کو۔ یوں اکڑتا پھرتا ہے، جیسے راجہ اندر ہو۔ اور یہ کالج کی لڑکیاں........ یوں اس پر بھن بھن کرتی ہیں، جیسے........“

وہ تشبیہ ڈھونڈنے کو رُکیں اور اُس نے اُٹھ کر ناول اسٹینڈ سے ناول اُٹھایا اور عام سے لہجے میں تلخی بھر کر بولا۔

”شاید آپ کہنا چاہتی ہیں، لڑکیاں مجھ پر ایسے بھن بھن کرتی ہیں، جیسے کچرے کے ڈھیر پر مکھیاں........“ لمحہ بھر کو رُکا، پھر مزید تلخی سے بولا۔ ”آپ مجھ سے اتنی نفرت شو کرنا چاہتی ہیں، ایک بار ہی کیوں نہیں کر لیتیں مانو! تاکہ بعد کو آپ بھی سکون سے رہیں اور میں بھی........ مانو! آپ صبح شام یہ نہ بھی کہیں، تب بھی میں یہ بات ایک لمحے کے لئے نہیں بھول سکتا کہ پاپا نے مجھے کن حالات میں اپنا نام دیا۔ پاپا اور مما کی اس خیرات کو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ ہر لمحہ آپ کی اس احسان مندی سے میرا سر جھکا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو مجھ سے شکایتیں ہیں۔ میں کیسے دُور کر سکتا ہوں ان شکایتوں کو؟“

”چلے جاؤ تم یہاں سے۔ چلے کیوں نہیں جاتے؟ اب اچھے بھلے جوان ہو، اپنا نیا جہان خود ڈھونڈو۔ کب تک عبدالرحمٰن کے ٹکڑوں پر پلتے رہو گے؟“

دانیا کب سے خاموش کھڑی تھی۔ شہریار عبدالرحمٰن کا دل کر لایا۔ اُسے اب تک تو ماتو کے کسی جملے سے ہرٹ ہو کر اُس کی ڈھارس بن جانا چاہئے تھا، مگر وہ خاموش کھڑی رہی۔ اُس نے شکوہ بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور شاور کے لئے رُوم کی طرف بڑھ گیا۔ ماتو، جو اتنی دیر سے ان اسٹاپ کہے جا رہی تھیں، بس اچانک اُس کی خاموشی پر حیران رہ گئی تھیں۔ بہت کم ہوتا تھا، وہ اُن کی بات کا جواب نہ دے۔ لیکن آج ایسا ہوا تھا۔ وہ جا چکی تھیں اور دانیا بھی کالج کے لئے تیار ہونے چل دی تھی۔ لیکن جب باہر آ کر اُس نے شہریار کو ڈھونڈا تو ندارد پایا۔

”ماما! آپ نے شیری بھائی کو کہیں دیکھا ہے؟“ وہ سوال کرتی اندر واپس پلٹی۔

”مجھے اس لڑکے کے شب و روز سے کوئی سروکار نہیں۔ کب آتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کیوں آتا ہے، آئی ڈونٹ کیئر۔“ ماما کا ناگواری جیسا انداز تھا۔

وہ دل گرفتہ ہو گئی۔

اپنے سب بھائیوں میں اُسے شہریار عبدالرحمٰن سے خاص اُنس تھا۔ بچپن سارا اُس کی گود میں گزرا تھا۔ اُس کے ہر اچھے بُرے کی ذمے داری خود بخود اُس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ ماما سے اُسے اس معاملے میں بھی سخت سست سننے کو ملتیں مگر وہ کہاں ٹلتا تھا۔ دانیا کی اسکولنگ، اُس کی پڑھائی، اُسے ٹیوٹ سے لانا، لے جانا، یہ سب خود بخود وہی دیکھتا۔ وہی اُس کی پڑھائی میں مدد کرتا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر امتحانات میں اُس کو تیاری کرواتا۔ گیس پیپرز (GuessPapers) خود بناتا اور بہت زیادہ اُس کا گیس درست ہی نکلتا........ اور مما ہر کامیابی پر ہونے والی پارٹی میں اپنی سارٹنی کی فال درست

کرتے ہوئے ادا سے کہتیں۔

"یہ تو میری سمجھداری ہے، جو میں نے ہزاروں ٹیوٹرز کا انٹرویو کیا، سر کھپایا، تب کہیں مسٹر شہاب کو اس نوکری پر رکھا۔ وہ تھے تو اتنیلی جینٹ لیکن اچھا مشاہرہ دیکھ کر ہر کوئی پھیل جاتا ہے۔ سر پر کھڑے رہ رہ کر بے بی کی پڑھائی پر توجہ دی ہے، تب کہیں یہ دن دیکھنے کو ملا۔ بچوں کی پڑھائی واقعی بہت بڑا دردِ سر ہے۔"

وہ ماما کی بڑھکیں سنتا اور اُن کی فرینڈز کی ستائشی باؤ ہو اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر دانیا کو پارٹی میں فیری لینڈ کی پری بن کے گھومتے دیکھ کر خوش ہوتا اور وہ پارٹی کے بعد اپنی پاکٹ منی سے خریدا گیا کوئی تحفہ اُسے ضرور دیتی۔ وہ نہ نہ کرتا رہ جاتا مگر کبھی گھڑی، کبھی شرٹ، جیز یا کوئی اچھی کتاب......

وہ ہمیشہ اُس کے لئے الرٹ رہتا تھا۔ کالج، کالج سے باہر اُس کے بھرپور تحفظ کی خاموش یقین دہانی ہی تھی کہ وہ بہت پُر اعتماد تھی۔ لیکن اُس نے محسوس کیا تھا، وہ بہت کم اس کی طرف توجہ دے پاتی تھی۔ گھر میں چھوٹی تھی، پھر لڑکی، وہ بھی سب بڑوں کے سامنے دبو...... سو بہت کم وہ اُس کی سائیڈ لے پاتی۔ منمناتی سی آواز بلند بھی نہ ہونے پاتی کہ اپنی موت آپ مرجاتی۔ پھر یہ بھی تھا، اُس نے جب بھی اُس کی حمایت کرنے کی غلطی کی تھی، گھر میں ان ہی دنوں شہریار عبدالرحمن پر زندگی تنگ ہو جاتی۔

دونوں بھائیوں میں سے صرف عدیل بھائی کچھ نرم رویہ رکھتے تھے۔ سالار بھائی، نانو، مما اور اُن کے منہ چڑھے ملازم اُس کی حیثیت دو کوڑی کی کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اُس کی حمایت سے اجتناب کرتی تھی۔ لیکن آج صبح جس طرح اُس کی شکوہ کرتی آنکھیں اُس پر آ ٹکی تھیں، وہ اُسے احساسِ جرم میں مبتلا کئے دے رہی تھیں اور اُس کا خیال تھا، بائیک پر اُس کے ساتھ جاتے ہوئے، وہ اپنی پوزیشن واضح کر کے اُسے منالے گی۔ لیکن اُس نے اُسے یہ موقع نہیں دیا تھا۔

وہ کھڑی تھی۔ کالج کا وقت بہت اَپ سیٹ ہو گیا تھا اس لئے اُس نے کالج جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ پھر وہ لنچ پر اُس کا انتظار کرتی رہی۔ شہریار کی پروا کرنے والے واحد ملازم اکبر بابا سے پتہ چل گیا تھا، وہ خفا خفا سا کالج چلا گیا تھا۔ اکبر بابا نے دانیا کے ساتھ نہ جانے کی وجہ پوچھی تو ترخ کر بولا تھا۔

"اُسے کالج لے جانے والے بہت ہیں۔ اس گھر میں کیا ساری میری ہی ذمے داری ہے؟ مجھے دیر ہو رہی ہے، اُسے کہئے گا، عدیل بھائی یا سالار بھائی کے ساتھ کالج آ جائے۔"

وہ فراٹے بھرتا گیٹ سے باہر نکل گیا تھا اور وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

انتظار تو نانو بھی اُس کا کر رہی تھیں۔ اُس کی دلداری کے لئے نہیں، بلکہ اس دو ٹوک لہجے پر۔ اُن کا خیال تھا، اور یہ وہی پرانا خیال تھا۔ پتہ نہیں، نانو اس خیال سے باہر کیوں نہیں نکلتی تھیں۔ لیکن بہر حال اُن کا خیال تھا کہ وہ گھر آنے پر اُس کی لفظی گوشمالی ضرور کریں گی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تین وقت کھانا کھاتا ہے، جیب خرچ کو پیسہ لیتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے، اور بس نہیں ہوتا تو اُس سے اس گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹانے کا کام نہیں ہوتا۔ آخر کیا ہے وہ اُن کے داماد کے نام کے بغیر...... لوگ تو ملازم بھی نام نسب دیکھ کر رکھتے ہیں۔ اگر وہ اُس کے سر سے ہاتھ اُٹھا لیں تو کوئی ایک بھی نہیں ہوگا، جو اُس کے قریب پھٹکنے کی کوشش کرے گا......

بس یہی زعم اور اس کی طرف کی بدگمانی تھی، جس نے نانو کو کبھی دل سے اُس کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن وہ تو پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھی۔ لیکن وہ شام تک نہیں آیا تو وہ لنچ اُٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس نے دھڑکتے دل سے فون ٹرائی کیا مگر اُس کا موبائل آف آ رہا تھا۔ دل میں عجیب عجیب طرح کے خیال آ رہے تھے، تبھی اُس نے سلامہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون سلامہ کی امی نے اُٹھایا۔ اُس نے جلدی جلدی ان سے سلام دعا کیا اور سلامہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اس وقت شاور لے رہا تھا، اس لئے اُسے کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑا۔ پھر اُسے سلامہ کی چہکتی آواز سنائی دی۔

"ہاں بھئی، کہاں ہو لڑکی! نہ آج تم کالج آئیں، نہ وہ صاحب بہادر تمہارے برادر صاحب...... آج تم دونوں نے مل کر کتنا بور کیا ہے یار۔ ویسے کل تک تو تم دونوں کا پورا پروگرام تھا کالج آنے کا۔"

وہ اس نئی اطلاع پر ساکت ہو گئی۔ وہ تو اب تک یہی سمجھ رہی تھی، وہ صرف عارضی ناراضگی پر کالج سے ہی دوستوں کی طرف چلا گیا ہے، لیکن یہاں......

اُس نے گھبرائے دل کو سنبھالا، پھر صبح کے ناشتے کی ساری بات کھل کر اس سے کر دی۔ سلامہ، وہ اور شہریار باقی دوستوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے، اس لئے اُن کے درمیان کسی بھی بات کا حجاب نہیں تھا۔ وہ شہریار سے گھر بھر کی ناپسندیدگی اور اس کی حساسیت سمیت محبت رکھتا تھا۔ اُس کا ایک ہی خیال تھا۔

"مجھے اُس سے کیا، تمہارے والدین کیا تھے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں، تم کیا ہو۔ اتنے پیارے، اتنے آورشی، اتنے ہمدرد، ملنسار...... اور بس یہی بات مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ ورنہ تم جانو، میں مزدور پارٹی یونین کا کتنا متحرک کارکن ہوں۔"

یہ بات وہ ہنس کر کہتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ پارٹی کے خلاف لکھتا تھا۔ اُن کے خلاف ہر طرح کی سورس کا استعمال غلط نہیں گردانتا تھا۔ ہاں، بس مسٹر عبدالرحمٰن کی نیک نامی اور شہریار کی زندگی کا چلن اُسے اُن سے قلبی طور پر برگشتہ نہیں کر پایا تھا۔ یہی وجہ تھی، دانیا کا فون آتے ہی بظاہر اُس نے بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن پریشان ہو کر اپنے ہیلتھ کلب جانے کا پروگرام ملتوی کر کے اُسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

ساحلِ سمندر، جم، کلب، اُس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ، ہر جگہ ڈھونڈا مگر رات آٹھ بجے تک وہ بالکل ناکام ہو کر دانیا کے سامنے کھڑا تھا۔

''پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے یہ لڑکا...... مجھے تو ہول اُٹھ رہے ہیں۔ اگر جذباتی طور پر کوئی غلط قدم اُٹھا بیٹھا تو......''

دانیا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اُس نے ہونٹوں کو کچلتے ہوئے اُسے دیکھا، پھر گھبرا کر بولی۔ ''آپ ہی بتائیے ناں سلامہ بھائی! بھائی آخر کہاں جاسکتے ہیں؟'' وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر روہانسی ہو کر مزید بولی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا، وہ میری اتنی چھوٹی سی کوتاہی پر اتنا بڑا شاک دیں گے۔ شیری بھائی تو کبھی ڈھنگ سے خفا بھی نہیں ہوئے مجھ سے...... اس لئے اُنہیں کیسے منایا جائے، یہ گر بھی نہیں سیکھا ہے میں نے۔''

''گھر کام آئے گا تو اُسی وقت ناں، جب وہ سامنے ہوگا۔ پتہ نہیں، کیا منتر پڑھ کر غائب ہوا ہے۔'' سلامہ ارسلان بھی ہراساں ہو رہا تھا، جب عاطف بیگ کو اُس نے فون کیا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

عاطف کو بولنے کا موقع خدا دیتا، جھٹ سے بولا۔ ''کیا کہوں، میں کہاں ہوں۔ لیکن بس سمجھو، بہت مزے میں ہوں۔''

''شہریار ہے تیرے پاس؟'' سلامہ نے در گزر کر کے اگلا سوال پوچھا۔

''خدا کا خوف کرو، کیوں مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے؟'' وہ لمحہ بھر کو تھما، پھر بولا۔ ''جہاں شہریار عبدالرحمٰن ہو، وہاں بندہ ریلیکس ہو سکتا ہے؟ اُس کی فلاسفی الاماں، الاماں...... لیکن تمہیں یہ کیوں شبہ ہوا کہ وہ کہیں فرار ہو گیا ہے؟''

سلامہ ارسلان نے سمجھ لیا، وہ محض بکواس کرنے کے موڈ میں ہے، اس لئے اُس نے خدا حافظ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

دانیا اب اور پریشان ہو چکی تھی۔ وہ صوفے پر کچھ دیر تو بیٹھی رہی، پھر بس اچانک اُٹھی۔ سلامہ اُس کے پیچھے لپکا۔ وہ انیکسی کی طرف جا رہی تھی۔ پھر اُس نے موبائل ملایا اور بہت غیر متوقع اُس کا موبائل مل گیا۔ بیل جا رہی تھی۔ سلامہ ارسلان اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں کیونکہ آواز انیکسی سے آ رہی تھی۔ سارا شہر کھنگال لیا، سارے کنوؤں میں بانس ڈال دیئے اور گمشدہ یہیں بازو میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔

دانیا کو پورا یقین تھا، اُس کا مزاج ضرور برہم ہے لیکن وہ بھی اس سے ناراض نہیں ہو سکتا، یہی سوچ کر اُس نے اُس کے کمرے پر ناک کیا مگر جواب ندارد......

''یہ شیری بھائی دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟'' اُس کی آواز کانپ گئی۔

سلامہ ارسلان ہنسنے لگا۔ ”بس، بس۔ اب زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں ہے، ایویں موڈ خراب ہوگا، اس لئے نہیں کھول رہا۔ تم ڈپلی کیٹ چابی لاؤ۔“
وہ واپس پلٹ گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی۔ سلامہ نے دروازہ کھولا، وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ کمرہ سگریٹ کی مخصوص بو سے رچا ہوا تھا اور وہ کارپٹ پہ کشن ڈالے کروٹ کئے لیٹا تھا۔
”شیری بھائی........!“
وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔ سلامہ ارسلان ساتھ تھا۔ لائٹ آن ہوچکی تھی لیکن ابھی تک اُس نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔
”شہریار کے بچے! یہ کیا بوتھا بنا کر لیٹا ہے؟ اور یہ اسموکنگ پورے مہینے کی ایک دن ہی کیوں کرلی؟ تم بہت فضول خرچ ہوگئے ہو یا روودست مرگئے تھے؟ ہمارے حصے پہ ڈاکا ڈالا ہے تم نے، اسٹوپڈ لڑکے!“
وہ لہجے کو خاص طور پہ ہلکا پھلکا بنا کر بولا تھا، لیکن جواب ندارد........ یعنی بہت سخت ناراض ہے........ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رائے دی اور ایک ساتھ اُس پہ ہلہ بول دیا۔
”شیری بھائی! بہت ہوگیا، اب یہ ناراضگی کا چیپٹر کلوز کردیجئے، ورنہ میں رو دوں گی۔“ سلامہ ارسلان نے بال مٹھی میں پکڑ کر کھینچے، تب وہ سی سی کرتا اُٹھا اور غصہ، الاماں الاماں!
”اے لڑکی! یہ تم مجھے اپنے رونے کا ڈراوا مت دینا آج کے بعد۔ کیونکہ میں نے تمہیں اپنی دوستی کی لسٹ سے آج ہی آج نکالا ہے۔ سلامہ کی وجہ سے تم سے بات بھی کر رہا ہوں کیونکہ تم اس کے ساتھ آئی ہو۔“
دانیا عبدالرحمٰن کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ حق دق اُسے دیکھتی رہ گئی۔ اُسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن بھی اُس سے اس لہجے میں ایسی بات بھی کرسکتا ہے۔ مگر وہ ہنوز اپنے اس بیان کے بعد ایک لفظ نہیں بولا اور سلامہ سے رات کے پروگرام کی بابت تبادلہ خیال کرنے لگا۔ وہ کونے میں بیٹھی اُسے خاموشی سے دیکھنے لگی۔ آج رات اُن کی سیاسی میٹنگ تھی اور آج کل کے حالات...... یکدم وہ آگے بڑھ آئی، پھر التجائیہ پکاری۔
”شیری بھائی! آج آپ کہیں نہیں جارہے، بس حالات بہت خراب ہیں، حکومت ہمیشہ مارشل لاء میں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔“
وہ پھر بھی مگن رہا تو وہ روہانسی ہوگئی۔ ”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں ناں بھائی!“
”لیکن کیا میں نے کسی بھی بات میں تمہاری رائے لی ہے؟“
”بس یہ وہ لمحہ تھا جب اُس کا صبر جواب دے گیا۔ وہ بس روئے جارہی تھی۔ شہریار نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا مگر پھر بھی کمزوری نہیں دکھائی اور سلامہ کے ساتھ اسی حلیے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دانیا اُسے جاتا

دیکھتی رہی، پھر غصے میں بھری ہوئی اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

''آپ چاہے کتنی منتیں کرلیں، نہیں مانوں گی۔ آخر سمجھتے کیا ہیں خود کو؟''

ساری رات غصے میں تپتی رہی۔ رات کی نماز بھی اسی غصے کی نذر ہوگئی۔ کیونکہ غصہ کھاتے کھاتے وہ جانے کب سوگئی تھی۔ آنکھ کھلی تو 3 بج رہے تھے۔

''شہریار بھائی آگئے ہوں گے......'' اُس نے سوچا اور یہ جانتے ہوئے، وہ ناراض ہے، بات کا جواب ہوسکتا ہے نہ دے، پھر بھی اپنا زعم بھلائے اُس کا موبائل ملانے لگی۔ آٹھ دس بیلز ہوئیں مگر جواب ندارد...... اُس نے کچھ سیکنڈ بعد پھر نمبر ملایا، تب کسی کی درشت آواز گونجی۔

''ہیلو! کون بول رہے ہو تسی؟''

وہ گنگ رہ گئی۔ یہ طرزِ تخاطب تو شہریار کے کسی فرینڈ کا نہیں ہوسکتا۔ شہریار کہاں گیا؟ سیل فون اُن کا ہے تو ریسیو بھی تو اُسی کو کرنا چاہیے۔

''میں شیری بھیا سے بات کرنا چاہتی ہوں، آپ کون بول رہے ہیں؟''

دوسری طرف بس قہقہہ گونجتا رہا، پھر کھرکھراتی آواز گونجی۔ ''ہم وہ ہیں بچے! جن کا لہجہ کبھی دیا نہیں جاسکتا۔ بہرحال میں ہماری پانچوں گھی میں رہتی ہیں۔''

''کون؟...... کون بول رہے ہیں آپ؟'' اُس نے فون ہی کو سوالیہ دیکھا۔ سامنے ہستی موجود جو نہیں تھی لیکن اُس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی، حوصلہ کھوئے دے رہی تھی۔ کیونکہ سامنے والا کچھا گلنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ تبھی زوردار سلیوٹ کی آواز سن کر اُس کی سٹی گم ہوگئی۔

''انسپکٹر صاحب...... بول رہے ہیں آپ؟'' اُس نے انسپکٹر صاحب کہہ کر تھوڑا فاصلہ دے کر بات کی اور دوسری طرف سب انسپکٹر کھل اُٹھا۔

''آپ کی زبان مبارک ہو جی۔ لیکن آپ کون ہو شہریار صاحب کی؟''

''میں جی...... اُن کی سسٹر ہوں...... کیا میری اُن سے بات ہوسکتی ہے؟''

دوسری طرف سے مثبت جواب سن کر وہ دوسری آواز شہریار کی سننے والی تھی، مگر یہ کیا...... اُس نے موبائل آف کردیا تھا۔ وہ ہونق بنی سوچ رہی تھی، جب باہر جیپ آکر رکی۔ اُس نے کھڑکی سے دیکھا،

عدیل عبدالرحمن جیپ کی پچھلی نشست سے اُتر رہے تھے۔ڈرائیور نے جیپ روک کر تیزی سے اُتر کر اُن کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا تھا۔یہ جیپ اُن کی ذاتی تھی۔وہ ایک بہت ایمان دار اور بہت اچھے آفیسر تھے۔یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ اُس کے بھائی تھے، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ واقعی اپنے عہدے کی لاج رکھنے والے انسان تھے۔وگرنہ سی ایس ایس کر کے کسی بڑی پوسٹ کے بجائے وہ پولیس میں یہ جاب نہ کر رہے ہوتے۔

مگر شہریار بھائی.......!

یکدم اُس کے ذہن میں یہ نام پھر سے اسپارک ہوا اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی گراؤنڈ فلور پر پہنچی۔اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔عدیل عبدالرحمن نے اس طرح اُسے جاگتے پایا تو حیران ہو گئے، پھر گال تھپتھپا کر بولے۔

''خیریت گڑیا! تم اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہو؟ تمہیں پتہ ہے ناں، اچھے بچوں کو رات کو جلدی سو جانا چاہیے۔''

''اچھے بچوں کو.......؟''اُس نے دانتوں تلے زبان دبالی۔جانتی جو تھی، شہریار کے متعلق سوال کرتے ہی وہ اپ سیٹ ہو جاتے۔

''کیا بات ہے، کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟''اُسے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر وہ اُس کے قریب آ گئے، پھر ہنس کر بولے۔''گھبراؤ نہیں، شیری بالکل ٹھیک ہے۔بس تھوڑی سی فارمیلیٹی کے لئے اُسے حوالات کی نذر کیا گیا ہے۔شام تک وہ گھر آ جائے گا۔''

''لیکن اُنہوں نے کیا، کیا ہے؟''اگلا سوال ڈرتے ڈرتے کیا۔

وہ ستون سے ٹیک لگا کر اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھنے لگے، جو اُن کی ماں جائی تھی اور بہت حساس بھی تھی۔ہر ایک کے لئے، جس کی زبان دُعائیں کرتے کرتے نہیں تھکتی تھی اور جو سب بھائیوں میں شہریار کو سب سے زیادہ محبت کرتی تھی۔پھر اُس کی طرف سے ملنے والی پریشانی اُسے ایسا ہی خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے گڑیا! بس نقصِ امن کے تحت جلسے جلوس پر پابندی لگائی گئی ہے۔شہریار صاحب ٹھہرے جوشیلے۔نوٹیفکیشن پڑھ کر بھی اپنی سیاسی میٹنگ کرنے پہنچ گئے، سو اوپر کے حکم پر ہمیں اُن کے دفتر سے اُنہیں گرفتار کرنا پڑا۔چیدہ چیدہ رکن گرفتار کر کے صرف کل کے جلسے کا کورم اور پروگرام کینسل کرنا مقصود تھا۔شام تک سب کو ریلیز کر دیا جائے گا۔''

اُسے سن کر تسلی ہوئی۔ پھر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے کافی بناؤں؟''

''ہوں...... اگر تمہارا اپنا پینے کا ارادہ ہو تو ضرور بناؤ۔ محض میرے لئے یہ محنت مت کرنا بچے! ویسے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔''

عدیل بھائی ایسے ہی تھے، ہر ایک کی پروا کرنے والے، دھیمے لہجے، دھیمے انداز میں بات کرنے والے...... پچھتر فیصد ہی نہیں، پورے ننانوے فیصد پاپا پر گئے تھے۔ اُن کی ہی طرح کا غصہ، اُن کی طرح کا پیار...... اُن کی طرح ہی توجہ اور اُن کی طرح ہی ہر معاملے پر چیک...... بہت خاموشی سے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں آپ کے ارد گرد کے ماحول، دوست بلکہ رنگ سب پر نظر رکھتے ہوئے آپ کی پشت پر رہتے تھے۔ اُسے کبھی اُن کے اس رویے سے پرابلم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن شہریار عبدالرحمٰن ہمیشہ اُن کے اس رویے سے خار کھاتا تھا۔

وہ کاریڈور میں چلتے چلتے سوچ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی، جب کچن میں پہنچی تو عدیل بھائی اُس سے پہلے وہاں موجود تھے۔

''آپ...... بیٹھئے نا بھائی! میں بنا لیتی ہوں کافی۔''

''کافی خاک بناؤ گی، پہلے خیالات کی کھچڑی تو پکا لو۔ دیکھو! میں تم سے بنا ریس لگائے کچن میں موجود ہوں اور تم اب کاریڈور کا سفر طے کر کے پہنچی ہو۔'' عدیل بھائی کہنے لگے۔

''وہ بھائی...... بس ویسے ہی کچھ سوچ رہی تھی۔''

وہ چینی کا تناسب رکھ کر دودھ کے خالی ڈبے کو ڈسٹ بن کی نذر کر کے ادھوری خاموشی میں لپٹ گئی۔ عدیل بھائی کپ میں کافی پھینٹنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔

''گڑیا! اگر تم نہ بھی بتاتیں، تب بھی پتہ چل جاتا تمہاری غرقابی سے...... یقیناً سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہیں محترمہ۔ ویسے تو میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور اس وقت کس کس کا خیال تم پر غالب ہے؟''

وہ آنچ دھیمی کر کے کچن کاؤنٹر پر قلندرانہ انداز میں بیٹھ گئے اور وہ ریک سے کافی کے مگ اُتار کر کاؤنٹر پر رکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

''مجھے معلوم ہے، آپ اتنی گہرائی سے ہمیں سمجھتے ہیں کہ کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ پاپا اور شیری بھائی کے بعد آپ کو میری زندگی پر پورا اختیار حاصل ہے۔''

انہوں نے کچھ نہیں کہا، نہ اس بات پر شکوہ کیا کہ ان کا نمبر شہریار کے بعد کیوں رکھا۔ سالار عبدالرحمٰن ہوتے تو اس پر بھی فضیتا اُٹھا دیتے۔

''سالار بہت اچھا انسان ہے گڑیا!......بس بہت سارا جذباتی ہے، اس لئے مسائل کری ایٹ کرتا رہتا ہے۔''

''آپ کو کیسے پتہ، میں کیا سوچ رہی تھی؟'' اُس نے حیرت چھپا کر سوال کیا۔

وہ ہنسنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔''ایک لڑکی ہے بہت اکیلی، سمجھو اکلوتی۔ دُنیا اُس کی ماں، باپ، بھائیوں پر مشتمل ہے، دوست وہ بناتی نہیں، پھر بھلا اندازہ لگانا کیا مشکل ہے کہ اُس لڑکی کا زیادہ تر وقت بھائیوں کی عادت و انداز کا تقابلی جائزہ لیتے گزر جاتا ہوگا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ عدیل بھائی کا جولی موڈ اتنی رات میں شہریار کی ناراضگی کے باوجود مزہ دے رہا تھا۔

وہ کافی لے کر ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ پھر باتیں کرتے کرتے کب فجر کی اذان ہوئی؟ اُنہیں پتہ ہی نہ چلا۔ عدیل بھائی مندی مندی آنکھوں سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئے تھے اور وہ نماز پڑھنے کے خیال سے اپنے بیڈروم میں آ گئی تھی۔

وہ نماز پڑھ کر بستر پر لیٹی تو ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں کو چھو چھو کر گزر رہی تھی، جیسے سمندر کی لہریں کنارے کو چھو کر گزر جائیں......وہ آج تک نہیں جان سکی تھی، کنارہ زیادہ اسرار رکھتا ہے یا سمندر......لیکن یہ طے تھا، وہ اکیلی سی لڑکی جو دوست بنانے سے چڑتی تھی، بہت خاموشی سے حمزہ عابد کی باتوں کی دھیرے دھیرے عادی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے رابطے، محبت کا نامحسوس حصار خود بخود قائم ہوتا جا رہا تھا۔

پتہ نہیں، یہ محبت تھی بھی یا محض اس عمر میں عموماً ہونے والا دھوکا......لیکن وہ جب بھی حمزہ عابد کو دیکھتی تو اُسے لگتا، آج کا دن ضائع نہیں گیا۔ اور جس دن وہ نہیں دکھائی دیتا، اُسے لگتا، آج کا دن سورج کی کرنوں میں صرف نااُمیدی بھر کے لے گیا ہے۔

چاند نگر کی چاہ کرنے، محبت کو اوڑھنا بچھونا کرنے والے، اُن کے حصے میں سورج کی کرنیں نااُمیدی جھولی بھر بھر کر کیوں ڈالتی ہیں......؟

کہتے ہیں، وقت وہی لوٹاتا ہے، جو اسے دیا جائے......لیکن کبھی کبھی دنیا میں دوسروں کی لٹائی گئی چیزیں آپ کے حصے میں آ جاتی ہیں، جیسے نا تمام کوئی تمنا......جیسے محبت......یا محبت کی حسرت......یا ناراضگی میں لپٹی محبت کو پا لینے ہی کی ہمک......

وہ پتہ نہیں، کس قطار میں تھی؟ وہ اندازہ کرتی رہی لیکن اُسے نیند نے بہت جلد اس چکر سے نکال لیا تھا۔

صبح وہ دو کلاسیں بنک کر کے کالج پہنچی تھی، حالانکہ اُسے شہریار سے ملنے عدیل بھائی کے دفتر جانا تھا لیکن بس یونہی دماغ ہی سنک گیا تھا۔

'ناراضگی دکھانا صرف اُن کا مشغلہ نہیں، یہ میرا بھی تو حق ہے۔' وہ دل کو تسلی دے کر کلاسیں لیتی رہی۔ پھر آف پر اُسے اچانک عاطف بیگ ٹکرا گیا۔ اُسے دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔ اس کی چیچ، چیچ جانے کب تک چلی رہتی، اُسی نے اُس کے منہ میں چکن رول ڈال کر بند کیا جو بہت بھوک کی وجہ سے اُس نے گاڑی کے انتظار کے لئے خریدے تھے۔ عاطف بیگ رول کھاتے کھاتے اُس کے ہاتھ میں پکڑے رول کو ندیدی نظروں سے دیکھنے لگا تو اُسے کہنا ہی پڑا۔

"اتنا لالچ اچھا نہیں ہوتا...... ویسے بھی سیاست میں آ گئے ہو تو اس کے طور طریقے سیکھو۔"

وہ بھی کہاں ماننے والا تھا، جھٹ بولا۔ "مسٹر! وہی تو کر رہا ہوں۔ کامیاب سیاست دان وہی ہے، جو اپنی پلیٹ چھوڑ کر دوسرے کی پلیٹ پر نظر رکھے اور اپنا اثاثہ بڑھانے کی کاوشیں کرے۔ ویسے ایک بات تو طے ہے، میں سیاست دان بنوں نہ بنوں، تم ایک مکمل سیاست دان کی بہن بن گئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے رول سے انصاف کرتے کرتے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور وہ مسکرا کر بولا۔

"مطلب سیدھا سا ہے، جو منہ آپ پر کھلے، گوہر افشانیاں کرنے کو پر تولے، وہیں اُس کے منہ میں تر نوالہ ٹھونس دو، وہیں احتجاج، انقلاب دم توڑ دے گا...... لیکن مسٹر! ایک بات کا سچا قلق ہے مجھے۔"

"کس بات کا قلق ہے آپ کو؟" اس نے ٹشو سے ہاتھ صاف کر کے سنجیدگی سے دیکھا اور وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

"شیری کو اس وقت تمہاری جتنی ضرورت ہوگی، اس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن تم ہو کہ اس کی خیریت دریافت کرنے کے بجائے کالج چلی آئیں اور موج مستی کرتی پھر رہی ہو۔"

"تو تمہارا کیا مطلب ہے، میں فلمی بہنوں کی طرح آنچل میں منہ دے کر روتی رہوں گی؟ جبکہ میں جانتی ہوں، میرا بھائی نہایت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اور پھر منافق، تم خود بھی تو یونیورسٹی میں آ کر حسین چہروں سے آنکھیں سینکنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے، مجھے الزام دے رہے ہو۔ ہونہہ!"

اُس نے پورا پورا حساب بے باق کر دیا۔ کچھ اُس کا موڈ اس لئے بھی خراب تھا کہ حمزہ عابد سے ٹاکرا کہیں نہیں ہوا تھا، دوسرے اُس کا خیال تھا، شہریار بہت سادہ لوح لڑکا تھا، جسے سلامہ ارسلان اور عاطف بیگ دونوں نے سیاست کی لت لگائی تھی۔

عاطف بیگ اُس کے چہرے کے تاثرات بہت سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا، اس لئے فوراً بولا۔ ''مسٹر! موڈ تو تمہارا ویسے ہی شاندار رہتا تھا، لیکن نئی بات کیا ہوئی؟''

اُس نے چھیڑا......اور وہ پھٹ پڑی۔

''تم بہت برے ہو عاطف! ایسی دوستی ہوتی ہے کہ دوست کو سُولی پر دھکیل کر خود آزاد گھوم رہے ہو؟ حقِ دوستی تو تب تھا کہ شیری بھائی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے۔''

وہ ہنس کر درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، پھر رسان سے بولا۔

''ہر کام کا ایک وقت اور ایک طریقہ ہوتا ہے مسٹر! میرا کام پمفلٹ بانٹنا اور بینرز لکھنا تھا، سو میں اس میں ہی مصروف تھا۔ سلامہ اور شہریار ورکرز میں کل کی حکمتِ عملی طے کر رہے تھے، اس لئے وہ نشانہ بنے۔''

''بکومت سلامہ! تم اور شیری بھائی ہمیشہ ہائی لائٹ رہتے ہو، اگر وہاں نہیں تھے تو کیا پھر آ کر گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ ہونہہ، جھوٹے!''

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس وقت وہ اُس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی اُس کا کام ادھورا تھا۔ شہریار نے خود ہی اُسے ہراول دستے کے طور پر بچا کر رکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلسہ نہ ہو، تب بھی اُن کی آواز اونچے ایوانوں میں سنی جائے۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا تھا جب وہ اپنا کوئی نمائندہ باہر رہنے دیتا۔ سو وہ تین دن سے اپنے گھر ہی نہیں گیا تھا۔ وہ ایک اسٹوڈنٹس کے ساتھ مل کر وہ آرٹیکلز کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے، سو وہ خاموشی سے اُٹھ گیا۔



دانیا عبدالرحمٰن نے اُس کی اس شرافت کو حیرت سے دیکھا تھا اور پھر کندھے اُچکا کر وہ اپنی گاڑی کا انتظار کرنے لگی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اُس کے بعد حمزہ عابد کی گاڑی آن رُکی۔

''کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ کہاں جانا ہے؟''

وہ گومگو کی حالت میں اُس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بظاہر حمزہ عابد اُن کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا لیکن ابھی اُس سے اتنا فرینک نہیں ہوا تھا۔

وہ کیا جواب دے......دل کا مطلوب سامنے کھڑا تھا، لیکن فطری شرم و حیا مانع ہو رہی تھی لیکن کچھ نہ کچھ تو بہرحال کہنا ہی تھا......اُس نے سوچا اور جو جملہ برآمد ہوا، وہ انتہائی احمقانہ تھا۔

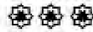
''کیا بات ہے، آج آپ کے ساتھ ماریہ نظر نہیں آ رہی؟''

وہ جواب کے بجائے اُس کے سوال پر مسکرایا پھر مصنوعی خفگی سے بولا۔
"مس دانیا! ماریہ کے نہ ہونے پر بھی میں خاصا شریف آدمی ہوں۔ مجھے اپنی حدود وقیود یاد ہیں۔ ماریہ بہن اپنی جگہ لیکن کچھ اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کے دل میں خاصے احترام سے دیکھے جاتے ہیں، جن کی پروا کرنا کسی کو اچھا لگتا ہے۔"
اُس کے چہرے نے یکدم بلش کیا تھا۔ ہاں، یہ تھا وہ خاموشی سے اُس کی کار میں بیٹھ گئی تھی۔ موبائل پر اُس نے ڈرائیور کو یونیورسٹی آنے سے منع کر دیا تھا۔
گاڑی سبک رفتاری سے جارہی تھی اور وہ مکمل خاموشی میں لپٹی ہوئی دل کی بات کے سامنے بیٹھی تھی۔
دل سامنے ہو تو دل کو جھانکنے سے روکنا کارِ دشوار ہوا کرتا ہے...... خواب خود بخود پلکوں پر آ کر ٹھہرنے لگتے ہیں، جیسے کوئی شام کا پنچھی تھک جائے، کوئی گھونسلہ ڈھونڈے...... بظاہر اُس کی زندگی نے ابھی وقت سے بازی لگا کر پہلا قدم اُٹھایا تھا، لیکن یہ محبت......!
یہ کم بخت عام سی محبت نے خاص طرح سے اُس کے دل کو چھو لیا تھا......
وہ مسلسل باہر دیکھ رہی تھی، جب حمزہ عابد نے اُسے بولنے پر اُکسایا۔
"کیا تم اتنا ہی کم بولتی ہو دانیا؟ یا صرف دوستوں میں ہی رج کے بولنے کو دل کرتا ہے؟"
اُس کا دل چاہا، وہ کہہ دے، وہ بھی تو دشمنوں میں سے نہیں...... لیکن وہ نہیں کہہ پائی۔ صرف ٹھنڈی سانس لینے کے سوا...... اور حمزہ عابد تھا تنگ میں۔ اُسے آئس کریم پارلر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر کے پوچھنے لگا۔
"تمہیں میرے ساتھ آئس کریم کھانے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"
"نہیں...... لیکن بہتر تھا، ہمارے ساتھ ماریہ ہوتی یا شیری بھائی ہوتے۔ اچھا نہیں لگتا یوں اکیلے......"
"کیا یوں اکیلے؟ تمہیں میرے اخلاص پر کوئی شک ہے کیا؟ اور پھر کیا ضروری ہے تم ہمیشہ سہاروں کے سہارے چلو؟ اتنا تو اعتماد ہونا چاہیے کہ اکیلے بھی کوئی کام کر گزرو۔"

اُس نے چونک کر اُسے دیکھا مگر وہاں صرف وہی جذبہ تھا، جس سے وہ بچنا چاہ رہی تھی۔
"پلیز حمزہ! آپ آئس کریم کپ لے کر چلنے کی کریں۔ میں ہمیشہ اپنے مخصوص وقت پر گھر پہنچنے کی عادی ہوں۔"
حمزہ عابد نے تیوری پر بل ڈال کر اُسے دیکھا پھر چہرے کے زاویے درست کرتے ہوئے آئس کریم لے کر کار واپس سڑک کے سیلِ رواں میں بہا لایا۔
وانیا سر جھکائے یوں آئس کریم کھا رہی تھی، جیسے اس سے بڑھ کر کوئی اور کام ضروری نہیں تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی، اُس کے گرد ہمیشہ سے ایسے ہی رشتے تھے، جن کے ساتھ رہ کر اُس نے تحفظ کا احساس پایا تھا۔
شہریار کے تمام دوست بھی اُسے بہن کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے، لیکن حمزہ عابد کے ساتھ کی یاں کی اُسے بہت ڈسٹرب کرنے لگی تھی۔
گاڑی سبک رفتاری سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ گھر کب آیا، اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔ کار رکی تو اُس نے چونک کر حمزہ عابد کو دیکھا، یوں حسرت سے، جیسے سفر ابھی کچھ اور طویل ہوتا تو لمحے اُس پر رشک کرتے...... اُس کے دل کے لئے خوشبو خواب چراتے ہوئے وہ لمحے کس قدر مختصر ثابت ہوئے تھے۔
کاش! یہ ساتھ ہمیشہ کے لئے اُس کا ہوتا...... اُس نے سوچا اور آواز متوازن کر کے بولی۔ "پلیز حمزہ! گھر میں چلئے۔ میری مما اور نانو آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"
حمزہ عابد نے چند سیکنڈ لئے اور یوں باہر آ گیا، جیسے وہ خود بھی اس ہم سفری کی مخمور لذت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔
مما اور نانو نے اُسے بہت محبت سے خوش آمدید کہا تھا اور وانیا عبدالرحمن اُس کے لئے خصوصی طور پر ریفریشمنٹ کی تیاریوں کے لئے خود کچن میں چلی گئی تھیں۔
ایک بہت اچھا وقت تھا، جو اُس کے گھر میں آ کر ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اُس نے حمزہ عابد کے کپ میں اور چائے اُنڈیلی اور باتیں کرتے کرتے پہلی بار اُس نے کوئی نماز قضا کی تھی۔
کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا تھا؟
ایک سوال اندر در آیا اور وہ حمزہ عابد کے جانے کے کتنی دیر تک اُس کے ہونے کے احساس میں گم بیٹھی رہی۔ یوں لگتا تھا، جیسے حمزہ عابد باہر نہیں، کہیں اندر گہرا اُتر گیا تھا۔ اتنا گہرا...... کہ اپنی ذات اُس کی ذات کا حصہ محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس نے اُٹھ کر پہلی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔
وہی ہر روز جیسا ملیح چہرہ، لیکن آنکھیں......

کوئی چور نگاہ سے باہر جھانکنے لگا تھا......

اُس کی آنکھوں میں اُس کا دل آن بیٹھا تھا اور دل کا تخت...... اُس پر وہ کب براجمان ہوگیا، پتہ ہی نہیں چلا۔



"تم بہت زیرک انسان ہو...... مجھے تم اسی لئے پسند ہو کہ تمہاری اور میری عادتیں ایک ایسی ہیں۔"

ہال میں ڈائننگ ٹیبل پر پلیٹ میں چمچ چلاتی ایک بہت سریلی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی کہ سماعت کچھ دیر کے لئے اپنے اوپر رشک ضرور کرتی۔

ماحول کی ساری تابنا کی جیسے اس چہرے ہی پر آ کر ٹھہر گئی تھی، جیسے آدھی صبح، آدھی شام کی گلابی...... سامنے بیٹھا خوبرو نوجوان اس چہرے کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے وہ چہرہ ہی اُس کی زندگی کا حاصل، ماحاصل، سب ہی کچھ ہو......

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو حمزہ......؟"

آواز میں واضح غرور تھا۔ وہ جانتی تھی، اُس کی ذات میں ایسا سحر تھا کہ نگاہ ٹھہرے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی اور سامنے بیٹھا خوبرو نوجوان، وہ ایک عام سا مرد تھا۔ ایک بہت عام سا مرد...... جس کے لئے کبھی کبھی خوب صورت چہرہ بھی اتنا ضروری نہیں ہوتا جتنا جذبات سے پگھلتا ہوا وہ وجود، جس کا نام عورت ہے...... اور پھر اس عورت کا کوئی نام ہو یا نہ ہو، اس سے اس جیسے عام مرد کو کوئی سروکار نہیں ہوتا...... اور وہ یہی کمزوری بہت اچھے طریقے سے کیش کرنا جانتی تھی۔

وہ ہنوز مسکرا رہی تھی اور وہ پلک جھپکائے بنا اُسے دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ خاموشی میں سے لفظوں نے ہلکا سا سر اُبھارا۔

"تم جانتے ہو، وہ لڑکی عام نہیں ہے۔"

اُس نے شرارت سے اُسے دیکھا اور شوخی سے بولا۔ "میرے لئے کوئی بھی لڑکی عام لڑکی نہیں ہوتی۔ میں لڑکیوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔"

"قدر کرنا، عزت کرنے سے بہتر ہے۔"

عجیب فلسفہ تھا، اُسے اعراض ہوا بھی، مگر جیتے عشق کی آب جو میں بہنا یاد رہا تھا، پھر سب کچھ بھول گیا تھا۔ ہوش آیا تو وہ ایک نیا وعدہ کر رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا، تمہیں دانیا عبدالرحمٰن سے کیا کلیش ہے۔ لیکن تمہارے لئے میں اُسے ضرور فتح کروں گا۔ پھر چاہے تم اُسے کسی بھی طرح کا سزاوار ٹھہراؤ۔ ویسے لڑکی وہ بھی کم حسین نہیں اور تم جانتی ہو، حُسن میرے سر چڑھ کے بولتا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ میں اپنے ہوتے ہوئے کسی اور کا چراغ نہیں جلنے دے سکتی۔''

''چراغ تمہارے آگے جلے گا کب، وہ خود شرما جائے گا تمہاری تابنا کی سے...... ویسے سچ کہنا نیل! تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو ناں؟''

ایک نقرئی قہقہہ اُس کی سماعت کی بانہوں میں بانہہ ڈال کر بیٹھنے لگا اور وہ گم اُسے دیکھے گیا، تب خاموشی نے سوال کیا۔

''تم...... کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو حمزہ؟''

حمزہ عابد پزل ہو گیا۔ ہر ہفتے نئی محبت کرنا اُس کا مشغلہ تھا۔ زندگی موج مستی کے سوا کچھ اور نہیں تھی۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی سچی محبت کرنے کا در بھی پالے گا۔ لیکن پوچھنے والے ہونٹ اتنے دلربا تھے کہ زندگی میں ایک دلفریب جھوٹ بولنے کی گنجائش تو نکالی ہی جا سکتی تھی۔ اُس نے خود کو تھپکی دی تھی اور اُس کے دونوں ہاتھ تھام کے کہا تھا۔

''محبت میرے لئے تمہارے سوا کچھ اور نہیں۔''

اُس نے شرارت سے حمزہ عابد کو دیکھا، پھر ادا سے بولی۔ ''زندگی میں یہ جو کچھ اور ہونے کا باقی رہ جانے والا احساس ہے ناں، یہ بہت ضروری ہے۔ زندگی کے نئے دروازے کھولنے کا تجسس اور کچھ پانے کی لگن، یہی زندگی ہے۔ اسے کھونے مت دینا۔ تمہیں نہیں معلوم لیکن زندگی کی رات بہت بھیانک ہوا کرتی ہے۔''

''مگر میں نے تو زندگی کی شام سنی تھی، کافی رومانٹک ہوتی ہے۔''

اُس نے اس لئے بغیر شوخی سے نیلم کے لئے نیا فقرہ ڈالا مگر اس بار وہ ایک لفظ نہیں بولی، خاموشی سے کھانا کھاتی رہی، پھر اتنی ہی خاموشی سے اُٹھ گئی۔

حمزہ عابد بہت دل گرفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ سفید ماربل کی عمارت کے سامنے وہ اُس کے ہاتھ، ہاتھوں میں لئے خاموش کھڑا تھا۔ پھر اُس نے اُسے دیکھ کر حسرت سے کہا۔

”کیا کبھی ایسا دن ہوگا کہ میں تمہیں تمہاری مرضی سے پاسکوں گا؟.......کیا کوئی دن ہوگا، جب تم مجھے خود اپنی اس سفید ماربل کی عمارت میں داخل ہونے کا سندیسہ دوگی؟...میں کب اس طرح تم سے ملوں گا کہ میری ذات اور تمہاری ذات الگ الگ ہونے کا احساس کھودیں.......ایک.......؟“

نیلم نے اُسے اتنی ہی تپش سے دیکھا، جتنی تپش سے اس کے اندر کا موم پگھل سکتا تھا.......مرد کی محبت موم ہی تو ہے، ایک نگاہ کی تپش نہیں سہہ پاتی اور بار بار پگھل کر بہہ جاتی ہے.......

عورت کی محبت لوہے کے ٹکڑے کی طرح ہے، بھٹی میں تپتی رہے، تب کہیں کسی ایک چوٹ پر اپنی وضع بدلتی ہے.......اور پھر وہ شکل مدتوں برقرار رہتی ہے.......کبھی کبھی اس شکل سے ہٹ کر کچھ ڈھالنا چاہو تو وہ ٹکڑا بھی نہیں رہتا، غیر واضح ہوکر ادھر اُدھر پھیل کر اپنا آپ ختم کرلیتا ہے۔

لیکن وہ جانتی تھی، وہ ایسی عورت نہیں ہے اور سامنے ایسا مرد نہیں ہے، جس کے لئے ایک محبت کافی ہوجائے، سو اس نے اُس کی طرح کا جھوٹ گھڑا۔

”بہت جلد، ہم اس طرح بہت جلد ملیں گے۔لیکن اس کے لئے تمہیں دانیا عبدالرحمن کا مان، بھرم، غرور، سب میرے قدموں میں لاکر ڈالنا ہوگا.......میں چاہتی ہوں، وہ تمہاری محبت میں اتنی پاگل ہوجائے کہ اُسے نہ تم سے پہلے کچھ یاد رہے، نہ تمہارے بعد۔پھر جب وہ تمہارے قدموں میں سر جھکادے، تمہیں مانگے تو تم اُسے ٹھکرادو۔اتنی شدت سے کہ اُس کے پندار اور انا کا شیشہ کرچی کرچی ہوجائے.......اور پھر تمام عمر وہ ان ہی کرچیوں پر چلتی رہے، چلتی رہے.......اُس کا درد ختم ہو، نہ اُس کے درد کا احساس۔“

”نیل! تمہیں اُس سے اس طرح کانٹے کی نفرت کیوں ہے؟“

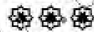
”بس یونہی۔کبھی کبھی پرانے حساب نئے طریقے سے جوڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔اور پھر اُس لڑکی کو یہ بہت زعم ہے کہ وہ عام لڑکی نہیں ہے، کچھ بہت خاص ہے اس میں۔“

”وہ اور خاص لڑکی.......؟“

قہقہے سے قہقہہ ملا۔وہ ایک نئے طرح سے اس معصوم کی سادگی پر ہنسے اور حمزہ عابد نے کار ریورس کرکے واپس سڑک پر ڈال دی۔

اُس کے انداز میں کامیابی کا خمار بولتا تھا اور ہاتھ اُس پری پیکر کے لمس سے جل رہے تھے۔وہ پیاس بڑھا کر پھر چھوڑ گئی تھی، جیسے جام ہونٹوں تک آتے آتے کوئی اوراچک لے...یہی وجہ تھی کہ اُس نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔اُس کی سمت اپنے دوست کی کوٹھی تھی، جوان سب کی عیاشیوں کے لئے ایک عمدہ ٹھکانہ رہی تھی اب تک۔

واچ مین نے اُسے دیکھ کر دروازہ کھولا تھا۔ وہ کار اندر لیتا چلا گیا تھا۔ پھر اُس نے چابی لگی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور اندرونی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ واچ مین نے اُس کی کار کو آگے لے جا کر گیراج میں پارک کر دیا تھا۔ پھر جب وہ چابی واپس لوٹانے ڈرائنگ روم میں پہنچا، اس وقت تک حمزہ عابد نے فریج سے اپنے ریفریشمنٹ کا سامان جمع کر لیا تھا۔ وائن، سوڈا، جام اور اس سب سے بھی پہلے بیٹ پوجا کے لئے بیف سینڈوچ جو کک تازہ تازہ اُس کے حکم پر کچن میں تیار کر رہا تھا۔ سو وہ موبائل ہاتھ میں لئے آج کی شام کے لئے ساتھی ڈھونڈنے لگا تھا۔ کئی نمبر ٹریس کیے تب کہیں زرش اُسے دستیاب ہوئی تھی۔
وہ اور زرش پچھلے دو سال سے بہت اچھی شاموں کے لطف اُٹھانے والوں میں سے ایک تھے۔ اور آج کی یہ تنہائی صرف زرش جیسی گرم جوش پارٹنر ہی دُور کر سکتی تھی۔ بار بار اُس کے ہاتھوں میں نیلم کے ہاتھوں کا لمس لوہنے لگتا تو جی میں حدت بڑھنے لگتی۔ وہ کنکل بھاگنا چاہتا بھی تھا اس کیفیت سے اور اس حالت میں سکون بھی محسوس کرتا تھا۔
پھر کتنی ساعتیں گزریں، تب زرش اُس کے سامنے آن بیٹھی۔ سینڈوچز، وائن اور زرش کا حُسن...... وہ آدھے گھنٹے ہی میں آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ حُسن کے سامنے سر جھکائے دو زانو تھا اور کہیں دلفریب محبت تھی کہ اس دھوکے پر خوب ہنستی تھی۔ اتنا زیادہ...... کہ جب وہ ہنستے ہنستے رُکی تو اُس کی آنکھیں گیلی تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا، یہ گیلی آنکھیں کس کا نصیب بنی تھیں۔



”میں تو ہوں ہی بے مروت، لیکن لڑکی! تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ آج سارے رشتے، ہر تعلق کو جیسے بے موت مار دیا ہے تم نے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔“
شہریار عبدالرحمٰن، وانیا عبدالرحمٰن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی ریلیز ہوا تھا۔ لیکن وانیا عبدالرحمٰن جیسے اُسے کوئی توجہ دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ آخر کو اُس نے جی بھر کر جو ستایا تھا۔ پھر کچھ اُسے ستانے کا حق بھی تو حاصل تھا ہی۔
سلامہ ارسلان، عاطف بیگ تینوں کچھ دیر پہلے ہی عدیل عبدالرحمٰن کی کلاس لے کر باہر آئے تھے اور عاطف بیگ باہر نکل کر بھی ان دونوں کو رگید رہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے آج وہ شہادت کے رُتبے پر فائز ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو عدیل عبدالرحمٰن کا، جو وہ بے قدموں سے شہریار عبدالرحمٰن کی عاقبت نا اندیشیوں سے مصافحہ کرتے پھر رہے تھے، ورنہ اُنہیں پتہ بھی نہ چلتا اور ایک جلتا بھنتا موضوع آرٹیکل کی صورت اخبار کی زینت بن کر ان تینوں کے لئے موت کا پروانہ ثابت ہوتا۔ نیم مارشل لاء میں ہلکی سی بات بھی بہت وزن رکھتی ہے، اوپر سے نیچے تک سارا سسٹم ہل کر رہ جاتا ہے۔ بظاہر کچھ نہیں، کچھ نہیں کے باوجود درپردہ بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اور شہریار عبدالرحمٰن کی ٹیم نے اسی خطرہ کو چھو لیا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے اس آرٹیکل کو حکومتی ورکر کے طور پر روکا تھا اور یہی بات وہ اُنہیں

سمجھا رہے تھے کہ ”میرے یار، ذرا سنبھل کے۔“ بظاہر وہ اُن کی بات سے متفق ہو کر نکلے تھے، لیکن کہیں نہ کہیں بغاوت جیسی کوئی چنگاری آنکھوں میں کوندرہی تھی۔

عاطف بیگ اور سلامہ ارسلان جا چکے تھے۔ وہ اُن تینوں کو اپنے تئیں اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ چکی تھی۔ دوپہر کی یادگار ملاقات پھر سے ذہن میں جھلملا رہی تھی۔ اوپر سے نانو اور مما کے درمیان ہونے والی گفتگو خود بخود مسکرائے جانے پر آمادہ کر رہی تھی۔

محبت دستک اگر تھی تو اُس نے اُس کے دل پر دستک دے کر خاموش انتظار سوغات کر دیا تھا۔ وہ ”برزخ“ پڑھ رہی تھی، جب شہریار عبدالرحمٰن پھر سے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کتاب پر نظر پڑی تو کھنک سے بولا۔

”کسے برزخ میں لٹکا رکھا ہے؟“ شرارت سے کہہ کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ دھر کر مگر بولا۔ ”محبت ہے اس برزخ میں یا بے چاری سی معصوم انا........؟“

”آپ سے مطلب؟“ اُس نے اُس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصہ دکھایا اور وہ ہنسنے لگا۔ ”اچھا تو ناراضگی ناراضگی کا پروگرام ہے بی بنو کا۔“

”ہاں، ہے۔ تو پھر؟“ وہ ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی۔ اُسے وہ ساری تکلیف یاد آ گئی تھی، جو اُس نے اُس سے ناراضگی جتانے میں اپنائی تھی۔ لمحہ بھر میں کیسا پرایا سا کر دیا تھا اور اب منانے کی ضد تھی تو اُسے آزمانے کی ہٹ........ دیکھوں تو کتنا چاہتے ہیں بہن کو، کتنی دیر تک منانے کا حوصلہ ہے........

”کیا ہے لڑکی! پکوڑا سی ناک غصے سے اور پکوڑا ہو گئی ہے۔ آخر کیا ارادہ ہے؟“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

دانیا نے دانستہ نظر اُس پر سے ہٹائی۔ وہ اس وقت کسی بھی قسم کی کمزوری نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

”تو تم نہیں مانو گی۔“ اُس نے تیور دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

اُس نے جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور پھر بس شہریار عبدالرحمٰن اُٹھ کھڑا ہوا۔

”ہونہہ........ بہت زیادہ مت تنگ کیا کرو۔ تم جانتی ہو، میں ایک ہی بار سارے بدلے لے لیا کرتا ہوں۔ واقعی ناراض ہو گیا ناں تو مانوں گا نہیں کبھی۔“

”مت مانیں۔ مجھے کیا، آپ راضی ہیں یا ناراض........ آخر کو میں ہوں ہی کون آپ کی؟........ بقول خود آپ کے، آپ نے مجھے اپنی دوستی کی لسٹ سے تازہ تازہ نکال دیا ہے۔ رہا بہن ہونے کا مارجن تو اس

میں مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔"
دھمکی کے جواب میں بے پروائی دکھائی اور شہریار عبدالرحمٰن پشت موڑ کر اُس کے کمرے سے نکل گیا۔
وہ تنی ہوئی بیٹھی رہی مگر دروازہ بند ہوتے ہی تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اُسے غصہ آ رہا تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن کو صرف ناراض ہونا آتا تھا، منانا نہیں...... کیا تھا جو کچھ دیر اور رُک کر منتیں کر لیتا۔ وہ ماننے ہی تو والی تھی، اُس کے لئے اُس نے سرپرائز آئس کریم پیک منگوا کر رکھا تھا مگر......"
اُسے یکدم جازی عبدالرحمٰن اس وقت بہت یاد آیا تھا۔ وہ کانونٹ میں زیرِ تعلیم تھا اور بہت کم کم گھر آیا کرتا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی، شہریار عبدالرحمٰن کے لئے جازی عبدالرحمٰن جان کی طرح تھا۔ وہ اُس کی کوئی ضد، اُس کی کہی کوئی بات ٹالنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ لیکن اُس کے نہ ہونے سے کتنا کچھ فرق پڑ گیا تھا۔
وہ بہت اُلجھن میں اُٹھی، کرسی سے بے ساختہ ٹکرا گئی۔ سنبھلی ہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ سلامہ ارسلان کو دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔
"آپ گئے نہیں تھے؟ میں سمجھی، آپ جا چکے ہیں۔" عجیب مخمصے سے بھرپور سوال تھا۔ اُسے سوال کی ترتیب خود عجیب لگی، جیسے سامنے والے پر کوئی چھپکے سے جتا جائے کہ "ارے تم یہاں؟ تم گئے کیوں نہیں؟ ہم تم سے ملنا نہیں چاہتے۔" مگر سامنے سلامہ ارسلان تھا، اس لئے برا مانے بغیر مسکرایا۔
"وہ شہریار نے فون کیا تھا کہ وہ کسی پرابلم میں ہے...... ویسے کہیں وہ پرابلم تم تو نہیں ہو؟"
وہ ایک کائیاں تھا، فوراً تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس کا خیال تھا، وہ دانیا عبدالرحمٰن کے کمرے ہی میں پایا جائے گا۔ لیکن یہاں نہیں تھا تو ماحول لازمی کشیدہ تھا۔
"کیا بات ہے گڑیا! کیا ابھی تک ناراض ہو وہ ڈر رہا ہے؟"
وہ کمرے میں آ کر نئے سرے سے سوال کرنے لگا تھا اور اُس نے خفگی سے کندھے اچکا کر کہا۔
"میں کون ہوتی ہوں، جو اُن سے ناراض ہونے کی جسارت کر سکوں؟ آخر کو آپ مستقبل کے ایم این اے جو ٹھہرے۔"
"اہم...... پارہ بہت زیادہ ہائی ہے۔ لیکن سسٹر! تمہارے بنا ہماری ہر کامیابی ادھوری ہے۔"

اُس نے طرح دی اور اُس کے ہونٹوں پر بغاوت کرتی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ اُس نے یکدم پشت کرلی، مبادا پول کھل جائے۔

"تمہارا غصہ آہستہ آہستہ کرکے اُتر رہا ہے ناں؟"

مانو غصہ نہ ہو، بخار ہو، تھرمامیٹر کے بغیر ہی....... سلامہ ارسلان نے ہنر آزمایا اور کچھ کہنے کے بجائے یکدم دروازہ کھول دیا۔

اور پھر بغاوت کرتی ہنسی، وہ کب رُکنی تھی۔ دنیا کے لئے امیزنگ مین فولاد کی طرح سخت بندہ چور کی طرح پکڑا گیا تھا۔

محبت کسی بھی طرح کی ہو، کسی بھی رشتے میں ہو، بڑا ذلیل کرواتی ہے....... شہریار عبدالرحمٰن نے دل میں سوچا اور روانیا عبدالرحمٰن نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر کھینچ لیا، پھر اترا کر بولی۔

"اب کہیے، آئندہ کبھی اس طرح ناراض ہونے کا دھچکا دیں گے؟"

شہریار نے نفی میں سر ہلا کر منہ بسورا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پورے دل سے....... پھر دونوں کو بٹھا کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ آئس کریم پیک اور چمچے لے کر وہ کمرے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ملازم نے پیزا کا ڈبہ تھما دیا۔

"شہریار صاحب نے آرڈر کیا تھا، چھوٹی صاحبہ.......!"

"ہاں، آ، ٹھیک ہے....... لاؤ، مجھے دے دو۔" اُس نے دونوں ڈبے ہاتھوں میں بمشکل سنبھالے اور کمرے میں آگئی۔

"لیجیے سلامہ بھائی! میری طرف سے پیزا اور آئس کریم کھائیے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے، کس سخی سے پالا پڑا تھا۔"

شہریار نے منہ کھولا مگر پھر مسکرا کر چپ رہ گیا۔

پیزا کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے آئس کریم بھی کھائی اور یوں ایک ناراضگی محبت سے گلے مل کر رخصت ہوتی چلی گئی۔



زندگی پہلے جیسی ڈگر پر چل رہی تھی۔ آج بھی شہریار عبدالرحمٰن اور عاطف بیگ ایک پارٹی کی کنونشن میں شریک تھے۔ دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں کہ اچانک پولیس سائرن سے بھگدڑ مچ گئی۔ شہر

کے حالات کے پیشِ نظر دفعہ 144 لگی ہوئی تھی، اس لئے جس کے سینگ جہاں سمائے، وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ عاطف بیگ اور شہریار بھی دوڑے لیکن برا ہو اُس کی بائیک کا، عین موقع پر دغا دے گئی۔
'عدیل بھیا بہت سخت خفا ہوں گے۔' اُس نے پہلی بار سوچا۔ بائیک چھوڑ کر بھاگنے سے بھی معاملہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ نئی سوجھ نہیں رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ یہ سوچنے کا جتن کرگزرتا، رہے سہے اوسان بھی خطا ہو کر رہ گئے۔ جیپ سے عدیل بھائی اُتر رہے تھے۔
''بہت برے پھنسے یار! آج تو اچھی خاصی طبیعت صاف ہو کر رہ جائے گی۔'' وہ کراہا۔
عاطف بیگ نے مسکینی سی شکل بنالی، پھر دھڑلے سے بولا۔ ''میں نہیں ہوں تیرے ساتھ، تم مجھے زبردستی لے کر آئے ہو، سمجھے؟''
عاطف بیگ طوطا چشم تو تھا ہی مکر تا ہو سکتا تھا، اُس پر آج کھلا تھا۔ وہ اور دو تین ورکرز کے ساتھ دھر لیا گیا تھا۔ عدیل بھائی نے بہت سنجیدگی سے اُسے جیپ میں بٹھانے کے آرڈر دیئے تھے۔ وہ خاموشی سے کسی پولیس اہلکار کی کارروائی سے پہلے سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔
پھر تھانے میں وہ اکیلا تھا یا عاطف بیگ یا عدیل بھائی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ٹہل ٹہل کر اپنے غصے کا گراف کم کر رہے تھے، یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ اُس سے سوال جواب کر سکیں۔
اُس نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا۔ کسے پتہ کہ پھر موقع بھی ملتا ہے یا نہیں؟...... مگر وہ موقع دیتے ہوئے بھی دامن بچائے کھڑے تھے۔
''شہریار عبدالرحمٰن! آپ آخر کب تک اس دردسری کا بہانہ بنے رہیں گے؟''
ذہن میں کچھ تھا ہی نہیں تو کیا کہتا۔ خاموش کھڑا رہا اور عدیل عبدالرحمٰن اس خاموشی کو خودسری سمجھ کر بھنا گئے۔
''آخر آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟''
''انسان!...... یا پھر شہریار عبدالرحمٰن!'' دل نے جواب دیا، زبان قاصر رہی۔ یہاں تک کہ عدیل بھائی بالکل آؤٹ ہو گئے۔ عاطف بیگ نے صورتِ حال دیکھی تو کھنک سے بولا۔
''شیری کی خاموشی خودسری نہیں ہے بھائی جان! یہ تو بس آپ کے سامنے گھبرا کر چپ ہو گیا ہے، ورنہ ہماری پارٹی کا نہایت بہترین ڈیبیٹر ہے۔''
''جی ہاں، ملاحظہ کر چکا ہوں ان کی کارکردگی۔'' وہ لمحہ بھر کو رُکے، پھر رسان سے بولے۔ ''آخر تم اپنے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو؟ یہ سیاست ویاست میں کچھ نہیں رکھا۔ تعلیم کو اوّلیت دو۔ یہ پارٹیاں، یہ

سیاست دان، یہ تم جیسے نوجوانوں کو ایسے ہی دھوکا دے کر تمہاری جوانی تمہارے آدرش، تمہارے ایمپی شنز سے کھیلتے ہیں۔ حوصلہ، طاقت تمہاری ہوتی ہے، کرسی کسی اور کی رہتی ہے۔ خون تمہارا بہتا ہے، تمغہ اُن کی پارٹی لگالیتی ہے۔ آخر تم اتنے سمجھ دار بچے ہو کر اس جال میں کیسے پھنس گئے ہو؟“

اُس نے ناگواری سے دیکھا، کچھ نہیں کہا۔ عاطف بیگ نے بھی اس لمحے اُس سے اتفاق کیا۔ عدیل بھائی نے یہ رویہ دیکھا تو پھر سے دونوں کو ورکرز کے ساتھ بند کروادیا۔ یہاں تک کہ چھ بجے اُنہیں پھر سے باہر نکلوایا گیا۔

”عدیل بھائی ناں......!“ اُس نے بور ہو کر سوچا مگر کرسی پر کسی اور کو بیٹھا دیکھ کر وہ کچھ فق سا ہو گیا۔ دوست داری اپنی جگہ، مگر قانون کی خطرناکی، اُسے کئی طرح کے واقعات یاد آ کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ عاطف بیگ کی طرف دیکھتا عدیل بھائی کی صورت دکھائی دی۔ وہ اپنے وکیل کے ساتھ کھڑے تھے۔ ساتھ میں سالار بھائی بھی تھے۔

”میں جانتا ہوں، میرا بھائی کچھ اوورکانفیڈنٹ ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، اس عمر میں بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

تمہیدی بیان سن کر وہ سالار بھائی پر سو جان سے فدا ہو گیا تھا، مگر جب ضمانت کے کاغذات دے کر صرف اُسے ریلیز کرنے لگے تو وہ رُک سا گیا۔

”عاطف بھی میرے ساتھ جائے گا بھائی!“ اُس نے ہولے سے سالار بھائی کے ہاتھ کے دباؤ سے اپنی کلائی چھڑوالی اور ہٹ دھرمی سے بولا۔

عدیل بھائی کاغذات پر دستخط کر چکے تھے، اس لیے نرمی سے پکارے۔

”عاطف بیگ کو کل تک ریلیز کر دیا جائے گا شیری! آج یہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔“

”آخر کیوں ممکن نہیں ہے؟ جب میں جا سکتا ہوں تو عاطف بھی ضرور جائے گا، ورنہ ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

عدیل بھائی اُسے دیکھتے رہے، پھر کندھے اُچکا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے، تمہاری ضد ہے تو پھر ضد ہی سہی۔ مگر عاطف بیگ کسی صورت ریلیز نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کچھ سنجیدہ نوعیت کے چارجز ہیں۔“

شہریار عبدالرحمٰن کو پہلی بار لگا، سیاست اچھی چیز نہیں ہے۔ وہ کون سا سنجیدہ تھے اس میدان میں۔ صرف واہ واہ، کچھ کر دکھانے کا تھرل انہیں اس میدان میں لے کر آیا تھا۔ اُسے کہاں معلوم تھا، یونیورسٹی بنیادوں کی سیاست اُنہیں اس مقام پر بھی لا کھڑا کر سکتی ہے۔ ایجی ٹیشن کیا ہوتا ہے، وہ ابھی کہاں سیکھ پائے تھے۔ صرف نعرے لگانے، آگے بڑھ کر پارٹیز پر کوئی بیان داغ دینا یا کوئی جلتا بھنتا آرٹیکل

چھپوانے کو بھی وہ خبروں میں اِن رہنے کی ایک معصوم کوشش محسوس کرتے تھے۔لیکن یہ سنجیدہ نوعیت کے چارجز........

''آپ جائیے بھائی! میں عاطف کے ساتھ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے صاف منع کر دیا۔

سالار بھائی بھنا کر چلے گئے۔عدیل بھائی کوشش کے باوجود اُسے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

اور دوسرا دن.......وہ حیرت نا کی سمیٹے اُس تک پہنچا تھا۔عاطف بیگ اور اُس پر دل کھول کر ہرزہ سرائی کی گئی تھی۔جو صحافی اُس کے کہنے پر مخالف پارٹیز کے لئے کالم لکھتے تھے،انہوں نے اُس کی ذات کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔کرپٹ کردار، کرپٹ سیاسی کیریئر.......اُس کی سیاست کو مسٹر عبدالرحمٰن کی بزنس میں منفعت حاصل کرنے کی سستی کوشش گردانا گیا تھا۔عاطف بیگ پر فراڈ کا کیس بنایا گیا تھا۔ایجی ٹیشن میں ملکی املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش پر ایف آئی آر کا فی جمع کرائی گئی تھی اور شہریار عبدالرحمٰن پر رسوخ کے غلط استعمال اور لوگوں کو ہراساں کرنے کا کیس دائر کیا گیا تھا۔

وہ اخبار پڑھ کر گم صم تھا اور عاطف حیران کھڑا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا، ہم اب اس جیل سے باہر نکل سکتے ہیں۔شیری! تو نے بھی کمال کر دیا۔کل باہر چلا جاتا تو آج اس ساری خرافات کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

شہریار عبدالرحمٰن نے خالی الذہنی سے اُسے دیکھا، پھر بڑبڑایا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا، ہماری گرفتاری کے پیچھے یہ طوفان چھپا ہے۔مجھے تو لگا تھا، عام سی کارروائی ہے۔''

عاطف بیگ اُسے دیکھنے لگا، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔''شیری! کہیں ہم استعمال تو نہیں کئے جا رہے؟''

''مطلب؟'' اُس نے حیرت سے دیکھا۔اُس کا دماغ تو پاپا کے بیان سے ہی اُڑ چکا تھا۔برسوں کی ساکھ اور عزت اُس کی وجہ سے مشکوک ہو رہی تھی، سو دماغ کا خالی ہو جانا فطری عمل تھا۔

عاطف بیگ اُس کی کیفیت سے قطع نظر اُس کے قریب اُٹھ آیا پھر سنجیدگی سے بولا۔''یوسفی صاحب کا بیان تم نے پڑھا ہے؟''

''ہاں، انہوں نے ہمیں سپورٹ کیا ہے کہ اگر ہمیں کچھ ہوا تو وہ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔'' شہریار نے سادگی سے جواب دیا۔

عاطف طنز سے ہنسا، پھر مکر ر بولا۔

''تم.......شیری کے بچے!.......تمہیں سیاست میں آنے کی کس نے اجازت دی تھی؟ اتنی معصوم سوچیں لے کر صرف پڑھائی کرتے ناں۔'' کچھ لمحے کو رکا، پھر بولا۔''شہریار عبدالرحمٰن! تم اور ہم ٹریپ

کیے گئے ہیں۔ ہماری پارٹی کو ان ہونے کے لئے کوئی بیس چاہیے، کوئی تازہ لہو...... تم سمجھتے ہو ناں، اس بات کا مطلب؟"

اس نے چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ پھر اور کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اُنہیں عدیل عبدالرحمن کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ عدیل بھائی اُسے تیز نظروں سے ہی گھور رہے تھے۔ پھر اخبار ٹیبل پر ڈال کر وہ سختی سے بولے۔

"دیکھ لیا، کیا ہو گیا ہے تمہاری حماقت سے...... میں جانتا تھا، اندرونِ خانہ یہ کارروائی ہونے والی ہے، اس لئے ہی سالار کی منت کر کے میں نے عدالت کے آف ہونے کے باوجود اس کے دوست کے ابو کے ذریعے تمہارے کاغذاتِ ضمانت تیار کروائے تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن تم......"

"آئی ایم سوری بھائی!...... میں جانتا ہوں کہ......"

"تم کچھ نہیں جانتے۔" یکدم اُنہوں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ پھر سانس متوازن کر کے بولے۔ "تم کچھ نہیں جانتے۔ بس دل پشوری کرنے کے لئے اس میدانِ کارزار میں کود پڑے ہو۔ یہ سیاست کا میدان ہے، اسکول کالج کا پلے گراؤنڈ نہیں۔ تمہیں پتہ ہے، تمہارے یوسفی صاحب اندرونِ خانہ تمہاری شخصیت پر کیا داؤ کھیلنا چاہتے ہیں؟"

پھر کچھ وقفہ آیا بات میں۔ اور وہ پھر رُک کر بولے۔

"وہ تمہارے خون سے اپنی سیاست چمکانا چاہتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم کوئی بہت معرکے کے پولیٹیشن ہو گئے ہو؟ بہت مشہور شخصیت ہو کہ اخبار تمہاری خبروں سے بھرے پڑے ہیں؟...... بے وقوف لڑکے! وہ صرف تمہیں خود کو ہائی لائٹ کر کے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ گیم کھیل رہے تھے۔ پاپا کے نام کو کیش کرنے کے لئے اُنہوں نے تمہیں ٹریپ کیا۔ تم ایک صنعت کار کے بیٹے ہو، تمہیں اگر کچھ ہوتا ہے تو ساری صنعت کار برادری حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہو گی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟"

عاطف بیگ نے اُس کا ہاتھ پکڑا، پھر مدھم ہو کر عدیل بھائی سے بولا۔ "کیا ایسا ممکن نہیں، کل کی تاریخوں میں آپ شیری کو ریلیز کروا دیں؟"

"ایسا صرف کل تک ممکن تھا، اب یہ ممکن نہیں ہے عاطف!" عدیل بھائی نے تاسف سے کہا۔

پولیس کے کچھ لوگ پانچ منٹ بعد ہی تھانے آنے والے تھے، پر معاملہ ہاتھ سے جیسے نکل گیا تھا۔ عاطف بیگ خاموش کھڑا تھا، شہریار کے ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان تھا۔ سراسیمگی اس وقت اور

بڑھ گئی تھی کہ پاپا یہاں آنے والے ہیں، پریس کے سامنے وہ اپنا نقطہ نظر بھی بتانا چاہتے ہیں۔

''شیری!...... انکل اس معاملے کو ویسے ہی ہینڈل کر رہے ہیں، جیسے ہماری پارٹی چاہتی ہے۔ انکل کو چاہئے، کوئی رائے نہ دیں۔'' عاطف بیگ نے مشورہ دیا۔

سلامہ ارسلان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی۔

''تم گھبراؤ نہیں تم دونوں کے لئے میں ایسا کام کر آیا ہوں کہ تمہیں حکومتی پارٹی تو ویسے ہی ریلیز کرنے کی کوشش میں ہے، مخالف پارٹی یعنی ہماری پارٹی بھی روڑے اٹکانے کی کوشش ترک کر دے گی۔ تم گھبراؤ نہیں، بس آج کی رات، کل تم لوگ چھوٹ جاؤ گے۔''

عدیل بھائی دونوں کی رائے سے متفق نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے اور شہریار عبدالرحمٰن خود کو اوّل درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا۔ دھواں دھار تقریریں کرنا، جلسے کو چیخ لائن دینا، چلے کارڈز پر کاپی رائٹ ٹائپ کر کے سلوگن دینا، یہ سب ذہانت مگر یہ طے تھا وہ اس میدان کے لئے نہیں بنا۔

یہاں سے نکلتے ہی میں سیاست کو دو حرف کہنے کی جسارت کروں گا، اور تم......؟'' اُس نے عاطف بیگ کی طرف دیکھا اور وہ خباثت سے ہنسنے لگا۔

''مجھے کچھ نہیں آتا۔ بس گڈ بک میں رہنے کے علاوہ۔ سو میں تو یہیں رہوں گا۔ ہاں، بس جوشیلا شیر جوان بننے سے ذرا احتیاط برتوں گا۔ تم تو جانتے ہو، پڑھے لکھے پریس سیکرٹری ہو یا ایڈوائزر، دونوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔ اور اگر وہ مجھ جیسا زیرک ہو یعنی ہوا دیکھ کر راستہ بدلنے والا تو سمجھو، حکومت کسی کی بھی ہو، حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں رہتی ہے۔ وزیر سے لے کر وزیر اعظم اور بہت زیادہ پڑھ کر بننے والے بیوروکریٹ، ان سب کو انگلیوں پر نچانا بہت آسان ہے۔ بس ''سب اچھا ہے'' کا ٹیپ چلاتے رہو، کام نکالتے رہو۔''

شہریار عبدالرحمٰن اُسے گھور کر دیکھتا چلا گیا، پھر سکتے سے نکلا تو خفگی سے بولا۔ ''مجھے پہلے ہی تیری ایمانداری پر شک تھا۔ ہر موقع پر پیچھے سے غائب ہو جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا، تو ہم سے بھی سیاست کرتا ہے۔ ویسے پلان تیرا برا نہیں ہے، کسی کام کا ہو گیا تو بہت کام نکلواؤں گا میں اپنے۔ پرمٹ، این او سی لینے کے لئے کیس تیری عدالت میں ہی جانا ہے پہلے۔''

عاطف بیگ کھلکھلانے لگا، زور زور سے، پھر شرارت سے بولا۔ ''کام نکالوں گا تیرے۔ لیکن دیکھ! بزنس میں یاری نہیں چلے گی۔''

شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کے بال کھینچ لئے، پھر اُسی کے سے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں، ایک نمبر کا خبیث ہے تو۔ ایویں تو تُو اپنا بخار بھی کسی کو نہ دے۔''

عاطف بیگ نے اپنے کالریوں اکڑائے جیسے شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہوں۔
وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے، جب پریس کے سامنے اُنھیں ریلیز کیے جانے کی چھوٹی سی تقریب رکھی گئی۔ ایسا لگتا تھا، وہ اچانک کوئی بہت بڑے لیڈر بن گئے ہوں۔ پاپا باہر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے پریس کانفرنس سے مخاطب ہونے کا ارادہ عدیل بھائی کی ایماء اور نقطۂ نظر سمجھانے پر ترک کر دیا تھا۔ بالآخر دو گھنٹے بعد وہ دفتری کارروائی کے بعد پاپا کی گاڑی میں آکر بیٹھ سکا۔
پاپا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اُنھیں یہ سیاست اور وقت کا زیاں قطعاً پسند نہیں تھا۔ ہمیشہ اگر وہ چپ رہ جاتے تھے تو صرف اس لئے کہ اس عمر میں بچے غیر نصابی سرگرمیاں اختیار کرتے ہی ہیں۔ لیکن یہ سرگرمیاں یہاں تک اور اس نوعیت کی ہو جائیں گی، اُنھیں توقع نہیں تھی۔
گاڑی میں بالکل خاموشی تھی، جب پاپا نے ناگواری سے پوچھا۔ "تم نے اسموکنگ کی ہے شیری؟"
اُسے اس اچانک سوال پر پھندا سا لگ گیا۔ تین دن سے وہ جی بھر کے اسموکنگ ہی تو کر رہا تھا اور پاپا کی ناک اتنی حساس تھی کہ اُس کی شرٹ میں بسی ہوئی خوشبو کو وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتے تھے۔
"تمہیں لگتا ہے، کسی اور طریقے سے سمجھانا پڑے گا۔" اُس کی خاموشی سے پاپا کو غصہ آ گیا اور وہ منمنانے لگا۔ بہت سی غیر ضروری اور ضروری باتوں اور ٹینشن کو اس اسموکنگ کا مورد الزام ٹھہرا کر وہ صاف بچ نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن برا ہوا اُس کی کم عقلی کا...... اگر وہ اچھا وکیل ہوتا تو خوامخواہ کیوں کا مرس پڑ رہا ہوتا؟!
وہ کامرس کو کوستے ہوئے پاپا کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگا رہا، مگر گھر آنے تک وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔
پھر گھر میں داخل ہوئے تو ہنگامے اُس کے منتظر تھے۔ نانو نے اُس کی اچھی طرح گوشمالی کر دی۔ دانیا نے الگ اُس کو عاطف بیگ اور سیاست کو ملا جلا کر اتنی سنائی تھیں کہ الگ سے کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اُس کے ہر جملے کا اختتام اس جملے پر ہوتا۔ "اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟"
اور وہ اس جملے میں چھپی محبت اور اُس کی آنکھ میں آنے والے آنسوؤں کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ پاپا اور عدیل بھائی کا غصہ الگ تھا۔ وہ یہ سب کچھ برداشت کر جانے کے موڈ میں تھا لیکن پہلے وہ سلامہ ارسلان عرف راجہ مور سے ملنے کا تمنائی تھا تا کہ وہ جان سکے، یہ معاملہ اُس نے اتنے آرام سے کیسے ہینڈل کر لیا۔
بمشکل وہ دانیا کی عدالت سے چھوٹا ہی تھا کہ اُس کا موبائل بجنے لگا۔ کوریڈور میں تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ بج بج کر خاموش ہو جانے والا موبائل پھر بجنے لگا۔ اُس نے اجنبی نمبر

دیکھ کر لائن ڈس کنکٹ کر دی۔ مگر کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی تو لامحالہ اُسے ریسیو کرنا ہی پڑا مگر سب کی ڈانٹ اُس نے بے ساختہ سامنے والے کو سنا دی مگر جب رُکا تو ''شیری بھائی!'' کی پکار پر اُس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''جازی عبدالرحمٰن......!''

وہ شرمندہ ہو گیا اور منمنائے جا رہا تھا۔ دانیا کی طرح اُس کی بھی یہی ٹون تھی، ''آپ ٹھیک تو ہیں؟ عدیل بھائی نے تختی تو نہیں کی؟ آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں؟'' اور وہ اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن وہ جازی عبدالرحمٰن ہی کیا جو اُس کی بات پر یقین کر لے۔ سو اچر ڈے کی فلائٹ سے گھر آنے کی اطلاع دے کر اُس کی جان چھوڑی۔

اُس نے بائیں ہاتھ سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے سلامہ کے گھر سے دو فرلانگ تک دوری اس فون کو اختتام پذیر کیا، سو گھر میں داخل ہوا تو بہت فریش تھا۔

ایک انسان ہو، محبت سے بھرا۔ اگر جواب میں صرف ایک دل کی محبت بھی پاس ہو تو جیسے کوئل کو کنے لگتا ہے...... جب کوئی ہو، جو احساس دے تو تمہارے مرنے سے زندگی میں زندگی کم، تلخی زیادہ ہو جائے گی تو پھر یہ احساس پورے وجود میں محبت کی شیرینی سی گھول دیتا ہے...... اُس کے اندر بھی جلترنگ بج رہا تھا۔ دانیا عبدالرحمٰن، جازی عبدالرحمٰن، سلامہ ارسلان، یہ سب محبت کرنے کے حسین سہارے تھے۔

وہ ترنگ میں گھر میں داخل ہوا۔ سلامہ کی امی، شاکرہ بانو، جنہیں سلامہ سمیت وہ بھی پیار سے ماں جی کہتا تھا، تخت پر ہی فروکش نظر آئیں۔ دل ایک دم باغ باغ ہو گیا۔ گھر میں ماما کے سرد رویے کی وجہ سے مرجانے والی محبت کو وہ یہیں تو آکر نئے سرے سے جلا دیتا تھا۔

''السلام علیکم اماں جی!'' وہ اُن کے تخت پر چھلانگ مار کر بیٹھتے ہوئے فرض نبھا رہا تھا۔

شاکرہ بانو نے سلام کا جواب محبت سے دیا اور اُن کی ممتا سے بھری آنکھیں اُسے دیکھ کر جگمگانے لگیں۔ سلامہ ارسلان اُن کا ایک ہی بیٹا تھا۔ تین بیٹیوں کے بعد اللہ نے اس نعمت سے سرفراز کیا تھا اُنہیں لگتا تھا، وہ جتنا سلامہ سے محبت کرتی ہیں، اتنی شاید دنیا میں کسی سے نہیں کر سکتیں۔ مگر تین سال پہلے جب پہلی بار وہ سلامہ کے ساتھ گھر آیا تو شاکرہ بانو کو لگا، وہ اب تک غلط سوچتی رہی تھیں۔ محبت تو دل کی پٹاری میں رکھا ایسا خزانہ ہے کہ جتنا آپ اسے دوسروں کو دان کرتے جاتے ہیں اور آپ کو لگتا ہے، آپ کے اندر یہ ختم ہو چکا ہوگا، تبھی دل کی پٹاری پھر سے بھری لگتی ہے...... تب آپ سمجھتے ہیں، یہ تو کوئی

دُعا ہے، جو آپ کی رُوح کو لگ گئی ہے، یہ خزانہ خالی ہونے والا نہیں۔

محبت اوپر کا ہاتھ ہے...... دینے والا ہاتھ...... اور اسے ہاتھ جھکا کر لینا معیوب سا لگتا تھا۔

اسے وضع دار، سولی بھی کہہ سکتے ہیں اور صابر دل بھی......

محبت وضع دار اور صابر ہو تو خوب رونق لگاتی ہے...... اتھلی اور بے صبری ہو تو خود بھی روتی ہے، دوسروں کو بھی آنسو رُلاتی ہے...... رنگ چاٹ لیتی ہے، بے رنگ کر دیتی ہے......

مگر شاکر ماہ نو کا خیال تھا، وہ جس شہریار عبدالرحمٰن پر محبت نچھاور کرتی ہیں، وہ خود بھی وضع دار ہے اور محبت کی وضع داری کو بھی سمجھ لینے والا ہے، سو اُن کا سلوک اُس کے ساتھ ہر روز پہلے سے زیادہ میٹھا ہوتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو سلامہ ارسلان بھی جیلس ہو جاتا۔

''میری ماں کو چپکے چپکے چرا رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تیری چالاکی۔''

وہ سنتا تو ہنس کے معصوم بن جاتا، پھر شرارت سے کہتا۔ ''اوئے پاگل! غلط فہمی ہوئی ہے تجھے۔ تیری ماں میری تو ہیں۔ میں کون سا چرا کر انہیں گھر لے جاتا ہوں۔ ہاں، بس تھوڑی محبت کی مٹھاس ہے جو دل چرانے سے نہیں چوکتا۔ اور تو جانتا ہے، دل بے چارے کے سو خون معاف، یہ تو معمولی سی چوری ہے۔''

سلامہ کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا۔ ''بس، بس...... لفظوں سے نہ کھیل، تجھے تو رائٹر ہونا چاہیے یا صحافی۔''

وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا۔ ''نہ بابا! نہ۔ مجھے دونوں میں سے کچھ نہیں بننا۔ سیدھا سادہ کامرس پڑھوں گا، ایم بی اے کے بعد پاپا کا بزنس سنبھالوں گا اور......''

''...... اور عیش کروں گا......'' سلامہ اُسے طرح دیتا تو وہ ہنسنے لگتا۔

پاپا کے دفتر میں کام کرنے والی بیشتر ماڈرن کم ورکرز اُس کی آنکھوں میں چمک بھر دیتیں مگر وہ جھٹ سے بی بابچہ بن جاتا...... بالکل ایسے ہی، جیسے ابھی ماں جی کے زانو پر سر دھر کر آرام سے لیٹا اُن کے پان دان سے بھنی ہوئی سونف نکال نکال کر پھانکتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔

اُس نے اتنی دیر سے سلامہ کا نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ یہاں صرف اسی سے ملنے آیا تھا۔ لیکن اس گھر کا ماحول اُسے ایسے ہی مسمرائز کر دیا کرتا تھا کہ سوچا، سمجھا سب بھول جایا کرتا تھا۔

شاکرہ بانو اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ وہ بھی آنے کی وجہ نہیں جاننا چاہتی تھیں، نہ ہی سوال کر کے اُس کا موڈ غارت کرنا چاہتی تھیں کہ اُسے لگے، اُسے اپنے گھر آنے کے لئے بھی وجہ کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ اُن کے گھر کے دروازے اُن کے دل کے دروازے کی طرح پاٹوں پاٹ کھلے تھے اور شہریار عبدالرحمٰن اس گھر میں مکین کی طرح حق سے رہتا تھا۔

''آج تین دن سے تم کہاں تھے؟ بالکل پہلی تاریخ کا چاند ہو گئے ہو۔''

''وہ......بس......ویسے ہی، کچھ مصروف تھا۔'' اُس نے بات بنائی۔

ماں جی ٹی وی اور اخبار سے الرجک تھیں کہ دونوں گھبرانے والی خبریں دیتے تھے، جس سے اُن کا بی پی لو ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی، اُس کی غیر موجودگی کی اصل وجہ قابل ہضم لگی تھی اُنہیں۔ مگر برا ہو زہرہ کا، جو آج کل بچوں کی چھٹیوں کی وجہ سے گھر آئی ہوئی تھی، سو فوری انٹری دینا اُس کی پہلی کمال ہنرمندی تھی۔ وہ شاکرہ بانو کے قریب آ گئی پھر اُس کے بال مٹھی میں لے کر مصنوعی غصے سے بولی۔

''آپ کو معلوم بھی ہے امی! آپ کا یہ لاڈلا تین دن کہاں گزار کر آ رہا ہے؟''

اُس نے لاکھ گھورا، منت بھی ایک آنکھ کے کونے میں چمکائی مگر زہرہ کہاں ماننے والی تھی، پوری روداد سنانے بیٹھ گئی۔

شاکرہ بانو نے سنا تو کلیجہ تھام لیا، پھر دیکھتے بھالتے ہوئے بھی کہ اچھا بھلا ہے، پھر سے پوچھنے لگیں۔ ''کوئی غلط رویہ تو نہیں اپنایا پولیس نے؟''

''غلط رویہ......امی جان! پولیس، بھائی کے گھر کی ہے۔ ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتی تو بھائی کے بھائی آنکھ نہ نکال دیتے......''

''زہرہ بجو!......خدا کا واسطہ ہے، کیوں پیچھے پڑ گئی ہو میرے؟'' وہ زہرہ کی زبان کی طراری سے گھبرا کر فوراً اُٹھ بیٹھا، پھر مسکین بن کر بولا۔ ''ماں جی! ایسا کچھ نہیں ہے، جیسا زہرہ بجو نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ وہ بس کچھ غلط فہمیاں تھیں اپنے بارے میں، بس وہ طے ہوگئیں کہ سیاست کا کھیل اپنے بس کا نہیں ہے۔ اب آپ بے فکر رہیں، آپ کا بیٹا بڑا اچھا بچہ بن گیا ہے۔ ویسے صاحب بہادر کہاں ہیں؟ اُس سے ذرا مذاکرہ کرنا تھا۔'' اب اُس نے شاکرہ بانو کی چھالیہ کی کلیہ میں ہاتھ مارا تھا۔

شاکرہ بانو، سلامہ ارسلان کی نارمل مصروفیت کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ شاید آدھے گھنٹے میں وہ گھر آنے والا تھا، سو وقت گزاری کے لئے اُس نے ٹی وی کھول لیا، پھر بزنس کی خبریں چل رہی تھیں کہ چاے اور سلامہ ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

”اوئے ہیرو!......تم دونوں تو وزیروں، سفیروں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ سارا میڈیا ہلا کر رکھ دیا۔“

”بکواس نہیں کرو۔“ اُس نے شرمندگی سے اُس کے منہ پر کشن کھینچ کر مارا، پھر چائے زہرہ کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھی، پھر بایاں ہاتھ بڑھا کر سلامہ کو اپنے قریب کھینچ کر بولا۔ ”اب بتا، کیا جادو کیا تھا تُو نے؟ قسم سے، مجھے تو لگتا تھا، میری اور عاطف کی سیاسی موت لکھی جا چکی ہے۔“

سلامہ، شہریار کے لہجے کی گھبراہٹ کا لطف لیتے ہوئے ہنسنے لگا، پھر مدھم ہو کر بولا۔

”سیدھی سی بات ہے، یوسف صاحب نے جو گیم تمہیں لائم لائٹ میں لانے کے لئے کھیلی تھی، میں نے وہی گیم اُن پر اُلٹا دی۔ بھئی کچھ اپنے رسوخ بھی ہیں، بھائی کا بھی بھرم ہے۔ دو چار صحافی تو اپنی بھی جیب میں رہتے ہیں، سو میں نے اپنی پارٹی کی مخالفت میں دو تین آرٹیکل چھپوا دیئے کہ یہ پارٹی کس طرح گیم کھیل کر دو افراد کو سیاسی بھینٹ چڑھانا چاہتی ہے۔ سارے بڑے اخباروں میں یہ آرٹیکل لگے تھے، سو حکومت کو تو تمہیں چھوڑنا ہی تھا لیکن اپنی پارٹی جو چاہتی تھی، اس سے اُسے باز آنا پڑا۔ ساکھ کی بات تھی یار! انہیں تو یہ فیصلہ لینا ہی تھا، وگرنہ پہلی والی صورتِ حال میں تو کچھ رقم دے کر کام ایسے ہو جاتا کہ عدیل بھائی تک کو خبر نہیں ہوتی۔ قانون کی ناک کے نیچے جرم کیسے ہو جاتا ہے، میرے خیال میں اب تمہارے لئے یہ مبہم سوال نہیں ہوگا۔ ویسے آپس کی بات ہے، سیاست کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے اب؟“ سلامہ نے بغور اُسے دیکھا۔

شہریار نے کانوں کو ہاتھ لگائے، پھر مسمسی صورت بنا کر بولا۔ ”بھئی، یہ سیاست تو جس کا بندر، وہی نچائے والی بات ہے۔ میری تو توبہ، جو پھر ان خرافات میں پڑوں۔ اماں یار! پاپا کا بزنس کیا بُرا ہے، ہزاروں پر حکم چلاؤ، آرام سے عیش کرو اور بس۔ یہ جی کا جنجال تو نہیں ہوتا۔ زندہ رہو تو نامراد، مر جاؤ تو حرام موت۔ کوئی بیٹھ کے دو آنسو بھی نہ بہائے۔ سو سمجھ لو خیر سے بدھو گھر کو آ گئے ہیں۔“

سلامہ اُس کی باتوں پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور زہرہ یکدم درمیان میں آ دھمکی۔ ”ایک منٹ، اگر یہ کوئی خوشی والی بات پر ہنسا ہنسانا ہے تو میرے خیال میں شیری کو ہمیں ٹریٹ دینی پڑے گی۔“

شہریار نے محبت سے زہرہ کو دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”آہو جی، میری پیاری بجو! اگر یہ ہنسنا اپنی حالت پر طنز سے ہنسنا ہوتا تو بھی تمہاری ٹریٹ پکی تھی۔ چلو، تیار ہو جاؤ، آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔“

”شیری! صرف آئس کریم؟“

زہرہ جنید نے منہ بسورا تو ہنس پڑا، پھر شرارت سے بولا۔

”بجو جی! اگر آپ دو بچوں کی والدہ محترمہ ہو کر بھی فن لینڈ گھومنے کا شوق رکھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

زہرہ جنید نے بسکٹ پلیٹ سے اُٹھایا، پھر خوش گواریت سے بولا۔ ”دو بچے اپنے ابا کے پاس ہیں، اُن کا جو دل چاہتا ہے، اپنے ابا سے فرمائش کر کے گزر رتے ہیں، اور ہم........ ہم اپنے بھائی کے گھر میں فی الحال۔ سو بھائیوں پر اتنا تو حق ہے کہ کچھ خرچہ کروایا جائے۔“

شہریار نے سر جھکا کر موؤبانہ لک دی، پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔ بھائیوں کے لئے اعزاز سے کم نہیں یہ عنایت۔ چلئے، ہی وی و چلتے ہیں۔ شام کی چائے اور آئس کریم کھاتے ہوئے نو دس بجے گھر آجائیں گے۔ آپ برا نہ منائیں تو رات کا کھانا بھی میری طرف سے ہو جائے گا۔ اور کچھ خدمت؟“

”بس اتنا ہی کافی ہے، باقی پھر کسی دن ڈاکہ ڈالوں گی۔“ زہرہ جنید کہتے ہوئے اُٹھ گئیں۔

شہریار ہنسنے لگا اور سلامہ پُر سوچ ہو کر بولا۔ ”نائمہ کو ہمارا یہ پروگرام پتہ چلا تو وہ بہت خفا ہوگی۔ کیا خیال ہے، راستے میں سے اُسے اُس کے انسٹی ٹیوٹ سے لیتے ہوئے نہ چلیں؟“

شہریار نے سلامہ کا پروگرام سنا تو فوراً بولا۔ ”ارے، دانیا بھی تو ہے۔ ٹھیک ہے، میں اُسے میسج کر دیتا ہوں، ہی وی و پر وہ بھی آجائے گی تو وقت اچھا کٹ جائے گا۔“

سلامہ نے اُس کے پروگرام کو فائنل کر دیا۔ سو وہ تینوں باہر آگئے۔ گاڑی سلامہ چلا رہا تھا، اس لئے شہریار آرام سے میسج کرتا رہا۔



جب وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچے تو ایک حیرت اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

”نائمہ کہاں ہے؟“

”انسی ٹیوٹ کے کسی فرینڈ کے ساتھ گئی ہوگی۔“

سلامہ نے سوال کیا، شہریار نے جواب دیا اور زہرہ جنید نے کسی انہونی کو دروازے سے اندر جھانکتے دیکھا۔

اندر سے آنکھ باہر دیکھے تو نظارہ کہلاتی ہے، باہر سے آنکھ اندر جھانکے تو نری رسوائی بنا تماشا رہ جاتا ہے۔ کیا وہ کسی تماشے کا حصہ بننے والے تھے؟........ تینوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔

سلامہ ارسلان کا گھرانہ روشن خیال تو تھا لیکن کچھ حد تک حدود و قیود کا قائل تھا۔ لڑکوں کے ساتھ لکھنا پڑھنا، تعلیمی سرگرمیاں برقرار رکھنا، سب کچھ ٹھیک لیکن پرسنل قسم کے ٹرمز...... سلامہ اُس کے سخت خلاف تھا۔ وہ واچ مین سے معلومات لے رہا تھا۔ نائمہ انسٹی ٹیوٹ خود ہی آیا جایا کرتی تھی۔ کبھی اُس نے کسی معاملے میں روک ٹوک نہیں کی تھی۔ لیکن آج اُس کی دی گئی آزادی اُس پر طعنہ زن ہو گئی تھی۔ وہ بھائی ہو کر باپ کی سی محبت سے دیکھ بھال میں مگن تھا اور یہاں...... وہ یہاں سے اکثر کسی کی گاڑی میں روز آدھے گھنٹے کے لئے جایا کرتی تھی۔ کہاں؟ واچ مین خود لاعلم تھا۔ سلامہ نے اُسے زیادہ کریدا نہیں تھا لیکن واچ مین کی آنکھوں میں جتنا طنز، جتنی تضحیک اُن دونوں کے لئے تھی، اس نے اس کا دماغ گھما ڈالا تھا۔ وہ دونوں واپس لوٹے تھے۔ گاڑی کے باہر کھڑی زہرہ جنید نے انہیں اکیلے آتے دیکھا تو ٹھنڈے یخ ہاتھ سے سلامہ کا ہاتھ تھام کر بے قراری سے پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا، نائمہ کہاں ہے؟"

شہریار جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھا، اُن کے لہجے پر چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ زہرہ ہلدی کی طرح پیلی ہو رہی تھیں۔ شہریار نے آنکھ کے اشارے سے سلامہ کو متوجہ کیا۔ سلامہ نے فوراً سے پیشتر ہاتھ پر تسلی کا دباؤ ڈالا۔

"پلیز بجو! پریشان نہ ہوں...... واچ مین کہہ رہا تھا، وہ اپنی کسی دوست کی امی کی اچانک طبیعت کی خرابی کا سن کر اس کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہیں۔ ہم اُس کا گھر میں ویٹ کر لیتے ہیں۔ شہریار کی ٹریٹ پھر کسی دن پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ کیوں شہریار؟" سلامہ نے شہریار کو دیکھا۔

"کیوں نہیں ٹریٹ پھر کسی دن سہی۔ لیکن بجو! آپ پریشان نہ ہوں، نائمہ کچھ دیر میں آ جائے گی۔"

جھوٹی تسلی پتہ نہیں زہرہ کو دی یا خود کو...... سلامہ واپس گھر چلا گیا تھا اور شہریار نے سی ویو کی راہ لی تھی کیونکہ اُس نے دانیا کو رکشہ پکڑ کر سی ویو آنے کا عندیہ دیا تھا۔ واپسی ظاہر ہے، اس کے ساتھ ہی ہونی تھی۔ سو یقیناً وہ وہیں کہیں کھڑی تپ رہی ہوگی۔ وہ بظاہر گاڑی چلا رہا تھا لیکن دماغ نائمہ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ذرائع کے مطابق وہ بہت کم انسٹی ٹیوٹ آیا کرتی تھی۔ سلامہ اور شہریار نے یہ باتیں سن کر ہضم کر لی تھیں اور واچ مین سے اس دوسرے فرد کی بابت پوچھتے رہے، جو اس سارے معاملے میں مورد الزام تھا۔ شہریار نے زہرہ کی وجہ سے گاڑی لے جانے کا بھی کہا تھا لیکن وہ اپنی جھونک میں زہرہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا تھا۔ بقول اُس کے، بس یا رکشہ کا سفر اُن کے لئے عام بات تھی، مگر یہ سفر شہریار کے لئے قطعی غیر دلچسپ سفر ہوتا۔ سو اُس کی پیشکش کو مسکراہٹ میں رکھ کر وہ اُسے واپس کر گیا تھا۔

شہریار پندرہ منٹ میں ہی وہ پہنچ گیا تھا۔وانیا حسب توقع پاپ کارن لئے ایک بینچ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ سوموڈ کے برخلاف صرف اُس کی محبت کی وجہ سے مائرہ والے معاملے کی ٹینشن دُور کر کے سرائے لہجے میں اُس کے کان کے قریب پکارا۔

''ہیلو ڈول! مجھے معلوم تھا، تم ندیدی لڑکی گھر رک ہی نہیں سکتیں۔دعوت کا سن کر تو تمہارے منہ میں پانی آ ہی جاتا ہے۔'' اُس نے سر پہ چپت لگا کر ریمارک پاس کیا تو وہ حسب توقع اُسے گھورنے لگی۔وہ بینچ پر چھلانگ لگا کر بیٹھ گیا، پھر شرارت سے بولا۔

''تم اس طرح گھورتی ہوناتو بالکل نانو لگتی ہو۔اور تمہیں پتہ ہے، مجھے نانو پر کتنا پیار آتا ہے۔''

''جانتی ہوں میں، آپ نانو کے کتنے بیسٹ فرینڈ ہیں۔'' وانیا نے چڑایا اور وہ ہنستے ہوئے اُسے ساتھ لے کر اُٹھا۔

''چلو، آئس کریم کھالو۔ڈنر کا موڈ نہیں رہا، دعوت تم پر اُدھار رہی۔''

''مجھ پر اُدھار رہی؟'' اُس نے لفظوں کو ترتیب دینے کی کوشش کی تو وہ شرارت سے ہنسنے لگا، پھر ہار مان کر بولا۔

''اوکے، بھائی کی جان! تمہاری دعوت مجھ پر اُدھار رہی۔پھر کبھی سہی۔'' اُس نے قریب کے آئس کریم پارلر کی طرف گاڑی موڑ دی۔اندر داخل ہوئے، پھر آرڈر دے ہی رہے تھے کہ وانیا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''یہ مائرہ کس کے ساتھ بیٹھی ہے بھائی؟''

اس نے وانیا کی آنکھوں کا تعاقب کیا اور وانیا سے کہیں زیادہ حیرت زدہ رہ گیا۔یہ چہرہ وہ کیسے بھول سکتا تھا۔اس چہرے نے اُس کی زندگی میں ترتیب کو قطعاً بے ترتیب کر دیا تھا۔

''آپ جانتے ہیں اُسے؟'' وانیا نے اُس کی آنکھوں میں شناسائی پڑھ لی۔

''نہیں تو۔مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔'' وہ مُکر گیا۔پتہ نہیں، اُسے کیوں لگنے لگا تھا کہ وہ یکدم ایک بھونچال میں آ کر گھر گیا تھا۔پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سچویشن سے بھاگنے میں کامیاب ہوتا، زلزلہ خود اُس کو نظر میں رکھ کر مسکرانے لگا۔

ہر دفعہ قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ اور اس کی قسمت...... اُس نے اللہ سے خوب شکوہ کیا مگر بات شکوے سے آگے نکل گئی تھی...... سو وہ بھونچال خراماں اُس کے ٹیبل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ہیلو شیری! کیسے ہو؟"

دانیا آئس کریم کھاتے کھاتے چونک کر اُس پری تمثال کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں سوال تھا۔ شہریار نے سوال سے جان بچائی تو اُس نے کھٹاک سے پوچھ لیا۔ "آپ کی تعریف، بڑے بھائی!"

"شہریار سے کیا پوچھتی ہو، میری تعریف میں اس کی زبان کب سے رطب اللسان ہے۔ لیکن یہ مانتا ہی نہیں ہے، ویسے مجھے جانا نہ، کہتے ہیں۔"

"جانا نہ......!" اُس نے زیر لب دہرایا اور ساری نظر شہریار پہ جھک گئی۔ وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی، لیکن شہریار کی نظر میں یہ بات قطعی غیر اہم تھی، سو وہ زیادہ اہم بات کی طرف لوٹ آیا۔

"تمہارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے جانا نہ؟" لہجے میں خاص شیرینی تھی اور اُس کا نقرئی قہقہہ...... دانیا کو ماننا پڑا، اُس کی آواز میں بہت رس ہے۔ مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے اسے خاص محنت کی ضرورت نہیں تھی...... اور وہ اپنی اس صلاحیت سے خود بھی آگاہ تھی، سو تیسری کرسی پہ بیٹھ کر تانے لگی۔

"ایک مڈل کلاس گھر کی لڑکی ہے۔ بے وقوف لڑکی۔ کم وقت میں زیادہ آسائشیں حاصل کرنا چاہتی ہے...... پتہ نہیں، یہ مڈل کلاس کے لوگ شارٹ کٹ کیوں مارنا چاہتے ہیں؟"

"شارٹ کٹ مارنے کی خواہش کسی کلاس سے مختص نہیں، یہ تو خواہش کے پیچھے دوڑنے والوں کا ورثہ ہے۔ عجیب خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر رہتا۔ سمندر مٹھی میں لینے کی تمنا تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

دانیا کو بہت برا لگا، اس طرح ریمارکس دیا جانا...... خود اُس کے اکثر فرینڈز مڈل کلاس سے تھے اور بہت اچھے، بہت وضع دار تھے۔ پھر یہ لڑکی صرف مڈل کلاس کو کیوں رگید رہی تھی۔ جانا نہ نے لہجے کی تیزی دیکھی تو شہریار کے قریب جھک کر بولی۔

"تمہاری بہن تو غصے کی بہت تیز لگتی ہے، کہیں ہری مرچیں تو نہیں کھاتی؟"

اتنا صاف اٹیک...... وہ بھنا گئی۔ آخر یہ محترمہ تھیں کون؟ اور اچانک رنگ میں بھنگ ڈالنے کیوں چلی آئیں؟ شہریار کی عادت تھی، چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دانیا سے کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ پھر اتنا بڑا چیپٹر اُس کی زندگی کی کتاب میں اضافی طور پر شامل ہو گیا تھا اور اُس نے اس کی خبر نہیں کی تھی اُسے...... شہریار دانستہ دانیا کی آنکھوں سے نظر ہٹا کر واپس نائمہ کے معاملے کی طرف آ گیا تھا۔

"تم اس لڑکی کی کیا مدد کر سکتی ہو؟ تم کوئی ویمن بینک کی چیئر پرسن تو ہو نہیں۔"

''ہاہاہا......'' ایک اور قہقہہ...... اس نے نشیلی آنکھوں سے اُسے احاطۂ نظر میں لیا۔ دانیا امپریس فیل کرنے لگی تھی۔ بد اشہریار کو بھی کم نہیں لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی، سو ضبط کر بولا۔
''اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں نے کوئی احمقانہ ریمارک دیا تھا؟''
ادا سے اس نے اسے دیکھا، پھر مخمور لہجے میں بولی۔ ''یقیناً، میری سورس پر تم جب بھی سوچو گے، تمہیں شکست ہوگی۔ تمہاری پرواز خیال میرے خیال کی حد کو چھو بھی نہیں سکتی۔ جہاں سے تمہاری سورس ختم ہوتی ہے، وہاں سے میرے رسوخ شروع ہوتے ہیں۔ ایک کیا، یہ سارے بینک میری مٹھی میں ہیں۔ رہی اس لڑکی کی بات تو یہ خوب صورت ہے، کم عمر ہے، ایسے چہرے کامیابی کی کچھ سیڑھیاں تو ایک ہی سانس میں چڑھ جاتے ہیں اور جہاں سانس پھولتی ہے تو وہاں تعلقات، کہ ہمارے سیڑھیاں چڑھنے میں اچھے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بے چاری لڑکی اداکاری کا شوق رکھتی ہے، لیکن میں اس سے ماڈلنگ کراؤں گی اور پھر کیسے، کب یہ میری ڈگر پر چل پڑے گی، اُسے معلوم بھی نہیں ہوگا۔''
دانیا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ یہ شہریار کیسے لوگوں کو دوست بنانے لگا ہے۔ جس قسم کا وہ مائنس مین تھا، اس سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ایسی لڑکی سے محبت کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔
''بھائی! گھر نہ چلیں؟'' اس نے شہریار کی آنکھوں کا اور جاناں کی آنکھوں کے درمیان کا مسمریزم جملے سے توڑنے کی سعی کی۔ اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ کیا پتہ سیاست کی طرح یہ بھی اس کا کوئی غلط فیصلہ ہو۔
وہ باہر نکل آئے تو دانیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''ہم نائمہ کو ساتھ لے کر کیوں نہیں جا رہے بھائی؟ آخر وہ سلامہ بھائی کی سسٹر ہے۔''
''ہم اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ جاناں کے ساتھ ہے۔ تم نہیں جانتیں، جاناں کون ہے؟'' اس نے کھڑے کھڑے سلامہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ آئس کریم پارلر کا پتہ بتا کر وہ وہیں کھڑا رہا، یہاں تک کہ سلامہ نے اُسے آ لیا۔
''نائمہ کس کے ساتھ ہے؟'' سلامہ کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی تھی۔ شہریار نے ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔
''وہ جاناں کے ساتھ ہے، اور یہ سب سے بیڈ نیوز ہے۔''
سلامہ ارسلان نے تنتے ہوئے اعصاب سے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ پھر وہ اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا، جب اُس نے جاناں کے تفریحی لہجے کو بر فاب محسوس کیا۔ وہ نائمہ کا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا

کر استہزاء سے ہنسی تھی۔

''تم اسے لے جانا چاہتے ہو، لے جاؤ۔ لیکن یاد رکھو! اب یہ تمہاری نہیں ہو سکتی۔ جس کے دماغ میں گھس جاؤں، وہ میرے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ یہ تمہارے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔ تم اسے بی بی بنا کر گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ بڑی بڑی چادریں پہنا دینے سے، صبح شام بانو قدسیہ کے فلسفے سے نچڑے ہوئے افسانے سنا کر تم اسے ساٹھ کی دہائی کی لڑکی نہیں بنا سکتے...... یہ سوچتی ہے، اسے کامیابی اٹریکٹ کرتی ہے اور کامیابی دروازوں کے اندر بیٹھ کر کبھی نہیں ملتی۔ اس کے لئے دروازے پاٹوں پاٹ کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔''

''ہونہہ، دروازے اور گھر...... تم کیا جانو، یہ کس عافیت کے استعارے ہیں۔ تم جیسی لڑکیاں......''

سلامہ ارسلان نے اپنی طبیعت کی نفاست کے تحت سخت جملہ کہتے کہتے خود کو روکا۔ اگر اکیلا ہوتا تو شاید وہ کوئی ریمارک ضرور دے دیتا لیکن بہن کا ہاتھ تھامے ہوئے بھائی کی زبان تھم سی گئی تھی۔ نائمہ کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا لیکن وہاں اپنی کسی غلطی کا احساس مفقود تھا۔

''آئی ایم سوری میم! میرے بھائی آپ کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''نائمہ! چلو۔'' سلامہ نے اُسے زور سے اپنے ساتھ گھسیٹا اور پہلے سے روکی ہوئی ٹیکسی میں بٹھا کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جانانہ نے ارد گرد بھیڑ دیکھی اور کسی شرمندگی کے بجائے شوخی سے بولی۔ ''یہ دنیا...... یہ مجھے کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ دنیا کی سوچ ساری عمر مجھے باندھتی رہے گی اور میری سوچ پورا چکر لگا کر پھر سے نئے سفر کی کھوج کرنے نکل کھڑی ہوگی۔ یہ بورد نیا اور اس کی سو کالڈ عام سوچیں......''

وہ لہرا لہرا کر سیڑھیاں اُترتی چلی گئی۔ شہریار نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور کار میں فرنٹ سیٹ پر براجمان وانیا نے تیز نظروں سے اپنے اُونچے، لانبے بھائی کو گھور کے دیکھتے ہوئے خفگی سے پکارا۔

''آج آپ کا ارادہ گھر جانے کا ہے یا یہیں جانانہ صاحبہ کے جلوؤں کے ساتھ کھڑے کھڑے صبح کریں گے؟''

اُس نے عجیب بے بسی سے اُسے دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دیگر گاڑیوں کے سیلِ رواں میں بہنے لگا۔

گھر پہنچا تو نئی اُفتاد اُس کی منتظر تھی۔ سالار بھائی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ وہ ہر چیز کو اُٹھا اُٹھا کر پٹخ رہے تھے۔

”آخر یہ نئی افتاد کیا ہوئی۔ مزاج تیز تو ہے، مگر اب کس بات پر موڈ بگڑا ہوا ہے۔ دفتر سے تو اچھا بھلا آیا تھا۔“ ماما، نانو سے ڈسکشن کرنے سے زیادہ اُن کے کمرے کے باہر کھڑی ہول رہی تھیں۔

”کہیں عائشہ نے تو فون پر کوئی اُلٹی سیدھی بات نہیں کردی؟“ نانو نے خیال ظاہر کیا اور ماما نے فوراً سے پیشتر رد کردیا۔

”کہاں امی! عائشہ ایسی بچی ہے کہاں؟ سیدھی سادی، اللہ میاں کی گائے ہے وہ تو۔“

”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ مگر سنا ہے، گائے بھی کبھی کبھی ٹکر مار ہی دیتی ہے۔“

ماما ہنسنے لگیں۔ یہ اتنی ٹینشن میں ہنسنا عجیب ہی، لیکن سالار بھائی کا مزاج تو چوبیس گھنٹے ایسا ہی رہتا تھا، سو انہیں عادت ہوگئی تھی۔ اب وہ پریشان ہونے کے بجائے ریلیکس رہ کر حل ڈھونڈا کرتی تھیں، اس لئے صبح سے لے کر اب تک کی باتیں دہرائے جارہی تھیں، جن میں سے کسی ماہرِ نفسیات کی طرح اس برہمی کی وجہ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی جاتی تھی، لیکن ہنوز روزِ اول تھا، یہاں تک کہ دانیا نے اُن کے درمیان آکر سوال کر ہی ڈالا۔

”سالار بھائی کے اتنے شاندار موڈ کی وجہ؟“

شہریار اُسے گھر چھوڑ کر واپس سلامہ کی طرف چلا گیا تھا۔ ماما، پاپا، نانو کو اُس کے آنے یا جانے سے غرض ہی کہاں تھی، سو انہوں نے اُسے نظر انداز کرکے دانیا کو سالار عبدالرحمٰن کے مزاج کی گرمی کی وجہ ڈھونڈنے کا نیا کام سونپ دیا۔

”میں اندر جاؤں؟“ اُس نے سر پہ کفن باندھنے کی پیشکش کی، نانو منع کرتی رہیں، مگر ماما نے اُسے اندر دھکیل دیا۔

سالار بھائی کے ہاتھ میں وار تھا، جسے وہ اُٹھا کر دروازے پہ مارنے ہی والے تھے، اچانک اُسے سامنے دیکھا تو ہاتھ روک لیا۔

”تم......فرصت مل گئی شہریار عبدالرحمٰن کی کمپنی سے؟“

ایک نیا مسئلہ...... غصے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو، یہ طے تھا کہ اس وقت اُن کی رو شہریار کی طرف مڑ گئی تھی۔ وہ سدا سے اُس کے بیری تھے، اُنہیں بس بدگمانی تھی کہ شہریار عبدالرحمٰن کو پاپا اور دانیا جتنا پیار کرتے ہیں، وہ ان کے حصے کی محبت میں ڈنڈی مارنے کے لئے کافی ہے۔ ان کے خیال میں وہ اُن کی اکلوتی بہن تھی، اس لئے سب سے زیادہ حق اُن کا تھا یا عدیل کا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کی زیادہ شہریار سے بنتی تھی۔

اب دل پر زور نہیں، محبت سب سے تھی اُسے مگر ماں کو جیسے کوئی ایک بچہ زیادہ عزیز ہوتا ہی ہے، اسی طرح اسے شہریار عبدالرحمٰن جیسا فرد لگتا تھا اور یہ بات سالار عبدالرحمٰن سے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وانیا نے سوچتے دماغ کو قابو کیا اور دھیرے دھیرے بیڈ پر بیٹھے بے یار ومددگار جیسی شکل بنائے، سالار عبدالرحمٰن کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس وقت ایک ماں ہی کی طرح اُس کا دل بھائی کی محبت سے بھر گیا تھا۔

''سالار بھائی! کیا ہوا؟...... کوئی پرابلم ہے؟'' وہ اُن کے قدموں میں بیٹھ کر اُن کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر لجاجت سے بولی اور سالار بھائی تھے کہ جانے کون سی حساسیت کو چھو گئی یہ جذباتی تسلی...... فوراً پلکوں پر آنسو آن رُکے، اُس کی تو جان ہی نکل گئی۔ سالار بھائی آنسوؤں کو، جذبات کو حماقت سمجھتے تھے اور آج یہ اتنے دل گرفتہ سے......

''کیا ہو گیا ہے بھائی بزنس میں کوئی پرابلم ہے یا عائشہ بھابی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟''

اُس نے امکانات گنوائے۔ دو ماہ پہلے ہونے والے نکاح کے تحت ایک لڑکی کو اپنانے کے لئے اچھا سا خطاب دے کر سوال کیا مگر وہ کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے اب چہرے کے تاثرات یوں کور ڈ کر لئے تھے، جیسے جذباتی کمزوری کا لمحہ آ کر گزر گیا تھا۔

''کچھ نہیں گڑیا!...... کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ بس ویسے ہی بزنس میں تھوڑی پرابلم تھی، جس نے فرسٹریٹ کر دیا تھا۔'' وہ صاف مکر گئے۔

وہ جانتی تھی، وہ صاف جھوٹ بول رہے ہیں، لیکن یہ طے تھا، اُن کی مرضی کے بغیر ان سے کچھ اُگلوانے کی کوشش عبث ہی تھی۔

''میں ماما سے کہہ کر آپ دونوں کی خوشی خوشی رخصت کروانے کا ٹائم پیریڈ سیٹ کرواتی ہوں۔'' اُس نے ماحول کو ہلکا کرنے کے لئے اُن کی اور عدیل کی شادی کی بات چھیڑی لیکن سالار بھائی پر اُس کا اثر بہت حیرت انگیز ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''عائشہ......!'' وہ عائشہ کا نام زیرِ لب دہرا کر یوں خاموش ہو گئے، جیسے کوئی غلطی کر کے اُسے چھپانے کی کوشش کرے۔

''وانیا بیٹا! کیا تم میرا کمرہ ٹھیک کر دو گی؟ میں دراصل کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔''

وہ بیڈ سے کھڑے ہو کر سوالیہ بولے تو اُس نے دوسرا لفظ کہے بغیر اُس کے کمرے کی بے ترتیبی کو ترتیب دینے کی سعی شروع کر دی۔ ٹوٹی ہوئی چیزوں کو کمرے کے ڈسٹ بن کی نذر کر کے وہ بیڈ کی چادر درست کر رہی تھی، پھر تکیہ اُٹھا کر اس کا غلاف ٹھیک کرنے کے خیال سے اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ سالار بھائی نے تیزی سے اُسے اگلے قدم سے روک دیا تھا۔

''اسے رہنے دو گڑیا! میں خود ٹھیک کرلوں گا۔''

''ایز یو وِش بھائی!'' وہ کندھے اچکا کر دوپٹہ درست کرتی باہر نکلتی چلی گئی۔

اُس کے باہر نکلتے ہی سالار عبدالرحمن واپس اپنے بیڈ پر آن بیٹھے۔ تکیے کے نیچے رکھی تصویر ایک بار پھر سے اُن کی اُنگلیوں کے لمس سے جیسے زندہ ہو اُٹھی تھی۔ پتہ نہیں، یہ محبت تھی یا اٹریکشن، لیکن اُنہیں اس لڑکی کے لئے اپنے اندر بھنور پڑتے محسوس ہوتے تھے.... اُنہیں اچانک اپنی وہ بزنس پارٹی یاد آ گئی تھی، جس میں وہ پاپا کی جگہ دھکیل دیئے گئے تھے۔ اُن کا موڈ پارٹیز سے ہمیشہ اوب جایا کرتا تھا، اس لئے یہاں آ کر بھی وہ تعارف کے بعد ایک صوفے پر بیٹھے کافی سے لطف لے رہے تھے۔ آنکھیں محفل میں شریک لوگوں سے معانقہ کر کے لوٹ رہی تھیں کہ کوئی اُن کے بہت قریب آن کر بولا۔

''ہیلو! کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اُنھوں نے چونک کر دیکھا اور دل، دل اُن کے اختیار میں کہاں رہا تھا۔ پتہ نہیں، حُسن کی کوئی مثال ہوتی بھی تھی یا نہیں، لیکن اُنہیں لگنے لگا تھا، جیسے حُسن اپنا حوالہ دیتا خود اُن کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ پنک کلر کی مہین ساڑھی، سلیولیس بلاؤز، شیگی کٹ بال...گویا گلاب کا مہکتا پھول.......

خوشبو اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے، پہلے وہ خوشبو کو محسوس کرتے تھے، لیکن آج خوشبو اُن کی دید کے لئے منتظر کھڑی تھی۔

''اگر آپ نے میرا ٹھیک ٹھاک جائزہ لے لیا ہے تو کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اتنا بے باک لہجہ...... اُنہیں تھوڑا سا عجیب لگا ہوا، لیکن حُسن کسی بھی لہجے میں بولے، حسین لگتا ہے۔ اُنھوں نے خوشی سے اس لہجے کے لئے اپنے صوفے پر جگہ بنائی۔ وہ ڈرنک کا گلاس لئے اُن کے برابر آن بیٹھی پھر سالار عبدالرحمن کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا ہے مسٹر سالار! آپ اتنی اچھی پارٹی کا مزہ خراب کرنے کے لئے یہ کیا کافی لے کر بیٹھ گئے ہیں؟''

سالار عبدالرحمن نے کافی کا کپ ایک لمحے میں گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ اُن کے اتنے بے ساختہ ردِ عمل پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سالار عبدالرحمن اُس کی ہنسی میں کھو سے گئے۔

''آپ کا نام؟'' یکدم اُنھوں نے تعارف چاہنے کی شدید خواہش کو دبانا نامناسب سمجھا اور وہ حُسنِ مجسم مسکرا کر اُنہیں دیکھنے لگا۔

''جانانہ...... مجھے جانانہ کہتے ہیں۔ ویسے لوگ جو بہت بے تکلف ہوں، اُن کے لبوں سے مجھے صرف جان سننا بھی اچھا لگتا ہے۔''

”جاناں؟.......واقعی آپ ہیں اتنی خوب صورت کہ اگر جاناں آپ جیسی ہو تو کون کافر جینا نہ چاہے گا؟“

”ہاہاہا.......“ ایک نقرئی قہقہہ.......وہ لمحے بھر کو رکی، پھر بولی۔ ”آپ مجھے تو کہیں سے بھی بزنس مین نہیں لگتے۔ یہ خشک پھیکی تقریبیں مجھے قطعاً اچھی نہیں لگتیں۔ مگر دوستوں کا اصرار ہو تو پھر مجبوراً آنا پڑتا ہے۔ مگر میں نے طارق سے پہلے کہہ دیا تھا، مجھے تمہارے خشک ذہن پارٹنرز سے گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوگا۔ اگر مجھے بلانا ہو تو کوئی اچھی گفتگو کرنے والا ممبر بھی بلا کر رکھنا، سو اُس نے ہی آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میری دل بستگی کی گفتگو صرف آپ سے ہو سکتی ہے، سو میں نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا اور چلی آئی۔ ویسے ٹوسٹ کرنے کے لئے اگر آپ بھی کوئی ڈرنک گلاس لے لیتے تو.......“ اُس نے کمال مہارت سے اُکسایا تھا، مگر ظاہر یہ کیا کہ فیصلے کا اختیار سالار عبدالرحمٰن کے پاس ہی ہے اور یہ چال بری نہیں رہی تھی۔ انہوں نے قریب سے گزرتے ویٹر کو ڈرنک سرو کرنے کا عندیہ دیا، پھر پانچ سیکنڈ بعد وہ شیری کا گلاس تھامے ہوئے تھے۔ وہ کوئی عادی پینے والے نہیں تھے۔ بس کبھی کبھار پارٹیز میں ایسا سب کچھ کرنا اُن کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی مگر وہ شیری سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بقول اُن کے دوستوں کے، وہ قطعاً خواتینی نشہ کرنے کی عادی ہیں۔ شیری بھی کہیں اُن جیسے بندے کو سوٹ کرتی ہے؟ مگر وہ لاکھ ملامت کرنے پر بھی اُس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انہوں نے پہلا سِپ لیا تھا، پھر جاناں کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کوئی خاص بات ہے؟“ سالار عبدالرحمٰن نے اُس کی دلچسپ نظروں کا تعاقب سوال سے کیا اور وہ شیری کے گلاس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مجھے لگتا ہے، آپ عادی نہیں ہیں ان چیزوں کے.......کیا آپ کو لگتا ہے، ڈرنک کرنا آپ کے بس کی بات نہیں جو شیری لے رہے ہیں؟“

سالار عبدالرحمٰن ایک لڑکی کے سامنے سبکی ہونے کے خیال سے مسکرا کر بولے۔ ”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں کہ میں ڈرنک کر کے آؤٹ ہو جاؤں گا۔ بس مجھے اس لائف اسٹائل کی عادت ہی نہیں۔ بزنس کے نقطہ نظر سے کچھ نہ کچھ ردوبدل کر لیتا ہوں۔ مگر ہمیشگی پینا پلانا.......مجھے کچھ اتنا خاص نہیں لگتا۔“

جاناں نا سٹائل سے پہلو بدل کر انہیں دیکھنے لگی۔ سالار عبدالرحمٰن اُسے ہی دیکھ رہے تھے، اس لئے فوراً نظر نیچی کر کے بے وقت بولے۔

”جاناں! آپ کو معلوم ہے، آپ کتنی خوب صورت ہیں؟“

جاناں نے نقرئی لہجے سے اُن کے اس جملے کا استقبال کیا، پھر اترا کر بولی۔ ”کیا آپ کو لگتا ہے مسٹر سالار! پھول خود اپنی خوشبو سے، اس کی تاثیر سے آگاہ نہ ہو؟“

"پھر آپ اس طرح کی خالص مردانہ پارٹیز میں کیوں آگئی ہیں؟" وہ کہنا نہیں چاہتے تھے مگر سادگی میں کہہ گئے تھے، تبھی اُن کے دوست آفندی نے اُن کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔
"کیا بکتے ہو سالار! بدفالیں تو مت نکالو۔ جانا نہ اگر ہماری پارٹیوں میں آنا چھوڑ دے تو ہم پارٹی دینے والے کا کھڑاگ کیوں پھیلائیں؟ اماں یار! اسی سے تو ہماری محفل سجتی ہے، یہ تو واقعی اسم با مسمّی ہے۔ بس تم ٹیپیکل ہو کر مت سوچا کرو کہ حسن ہو تو کواڑ کے پیچھے رہے۔ بھئی، میں کہتا ہوں، حسن ہو تو سب کے سامنے ہو، سب پر ظاہر ہو، جیسے ماہِ کامل کی روشنی چھپائے نہیں چھپتی، اسی طرح حسین عورت کے چرچے، اُس سے ملنے، ملتے رہنے کی ہمک، وہ کب مرتی ہے۔"
سالار عبدالرحمٰن کے چہرے پر ناگواری آگئی۔ جس قسم کے ماحول میں وہ رہ رہے تھے، اس میں کسی عورت کے متعلق اتنی عامیانہ گفتگو کب ہوا کرتی تھی؟ سو انہیں یہ سب کچھ عجیب لگا تھا، لیکن صرف شروع میں....... پھر وہ پارٹیز میں جانے کے، جانا نہ سے ملنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ انہیں ایسی پارٹیز کے طور طریقے بھی ازبر ہو گئے تھے اور ایسی پارٹیز میں جانے کے ڈھنگ بھی آگئے تھے۔
جانا نہ اُن سے ایسی ہر پارٹی میں بہت فرینک ہو کر ملتی تھی اور وہ جان گئے تھے، جانا نہ کس ماحول، کس جگہ کی پروردہ ہے اُسے بھول کر صرف جانا نہ کے نام کی مالا جپتے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا۔ اُن کی دوستی نما محبت، جانا نہ کی نارسائی ملی قربت، محبت کی حدت سب کچھ متوازن تھا کہ اچانک اُن کی زندگی میں رقیب چلا آیا۔ وہ پہلے تو جان ہی نہیں پائے، اُن کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ جانا نہ کی محبت کو بھی اپنی محبت کا حق سمجھ رہے تھے، اس محبت کو دونوں ہاتھوں سے وصول کر رہے تھے کہ بساط لپیٹ دی گئی۔ وہ سفید ماربل کی عمارت کے دن میں کتنی ہی مرتبہ چکر لگا ڈالتے، مگر جانا نہ کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس جاتے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ زورحماقت سفید ماربل کی عمارت میں داخل ہو گئے۔
سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا۔ اور جو شخص جانا نہ کے ساتھ بیٹھا تھا، وہ اس سے بھی بڑا دھچکا تھا اُن کے لئے.......
"شہریار عبدالرحمٰن.......!" تمام عمر انہوں نے اس شخص سے جتنی نفرت کی تھی، انہیں لگ رہا تھا کہ اتنے سالوں کی ساری نفرت میں اس ایک لمحے کی نفرت ملا دی جاتی، تب بھی سالار عبدالرحمٰن کے اندر کی نفرت اپنا حق ادا نہ کر سکتی۔
"تم نے مجھ سے چیٹنگ کی ہے۔" انہوں نے شہریار کو ایک طرف کر کے صرف جانا نہ سے شکوہ کیا۔
وہ مسکرانے لگی، پھر عام سے لہجے میں بولی۔ "تمہیں تو معلوم ہے سالار! میں محبت کو میڈل کی طرح گلے کی زینت نہیں بنا سکتی۔ تم مجھے متلون مزاج بھی کہہ سکتے ہو۔ ایک انسان کے ساتھ مسلسل ملتے رہنا،

ملتے رہنا میرے اندر کے نئے پن کو کھار رہا تھا، سو جب شیری نے مجھے اپروچ کیا تو میں نے سوچا، اس محبت کا بھی مزہ چکھ لوں۔ آخر کو ہے تو تمہارا ہی بھائی...... مگر دیکھو! تمہاری خوب صورتی کے باوجود مجھے اُس کے سانولے رنگ نے ڈس لیا ہے۔ یہ حسین نہ سہی مگر ہے بہت چارمنگ۔" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ "رہی بات چیٹنگ کی، تو تم نے بھی تو مجھے چیٹ کیا ہے۔ محبت کا دم بھرتے رہے، گھر میں بسانے کے لارے بھی دیئے، مگر نکاح کرنے کے باوجود اس بات سے کبھی مجھے آگاہ نہیں کیا۔ ایک طرح سے تم پہلے سے شادی شدہ تھے، مگر پھر بھی تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟ تمہیں پتہ ہے، مجھے جھوٹ بولنے والے کتنے برے لگتے ہیں۔ اگر تم مجھ سے ایسا نہیں کرتے تو ہماری دوستی تا ابد قائم رہتی۔ پھر شہریار عبدالرحمٰن بھی ہمارے درمیان کبھی نہیں آسکتا تھا۔"

سالار عبدالرحمٰن، شہریار کو دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔ پھر پشت موڑ کر بولے۔

"مجھے تم سے اتنی نفرت ہے شہریار! کہ اگر نفرت خود مجسم ہو کر بھی آجائے تو میرے دل کی نفرت کے احساس سے اس کا کلیجہ بھی پھٹ جائے گا۔"

شہریار عبدالرحمٰن انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ عائشہ بھابی کی کراہٹ نے اُس کے قدم روک لئے تھے۔

"کیا میں وواع ہوئے بغیر طلاق کا لیبل لگا کر زندہ رہ سکتی ہوں شیری؟ تمہیں میں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کے جیسا سمجھا ہے تو کیا تم اپنی بہن کا گھر بسنے سے پہلے اُجڑتا دیکھ سکتے ہو؟"

بس یہ وہ لفظ تھے، جنہوں نے شہریار عبدالرحمٰن کو سالار عبدالرحمٰن کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

پھر ایسے کئی مواقع آئے تھے اور آج جب کسی پرانی پارٹی کے تذکرے میں دوستوں نے کئی طرح سے جانا نہ اور شہریار کا ذکر کیا تو وہ گھر آ کر بھی اپنے اندر کا غصہ فوری طور پر نکال نہیں پائے تھے۔ اُن کا دل چاہتا تھا کہ شہریار اُن کے سامنے ہو تو وہ پہلی فرصت میں اُسے گولی ماردیں۔

شہریار نے ہمیشہ اُن کی زندگی کو اپ سیٹ ہی رکھا تھا۔ پاپا ہر معاملے میں سالار کے مقابلے میں شہریار کو فوقیت دیتے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن کو یہ سب برا نہیں لگتا تھا، لیکن جب سے انہیں نانو نے بتایا تھا کہ وہ اُن کا سگا بھائی نہیں ہے، بلکہ پاپا اُسے کہیں سے اُٹھا کر لائے تھے اور وہ اُن کی زندگی میں زبردستی شامل ہوا ہے، تب سے اُن کی جیلسی نے نفرت کا روپ دھار لیا تھا۔ بقول نانو کے...... وہ اُن کے گھر میں نقب لگانے آیا ہے۔ پتہ نہیں کس کی اولاد ہے؟

نانو کے اس جملے کے بعد ایک لمبا گیپ آتا تھا اور سالار عبدالرحمٰن بڑی سے بڑی بات اور برے سے برے واقعے سے اس گیپ کو بھرتے چلے جاتے۔ وہ شہریار سے اتنے الرجک ہو چکے تھے کہ اگر وہ اُن کے

برابر بھی آن بیٹھتا تو وہ فوراً اُٹھ کر کہیں اور چلے جاتے۔ وہ اُنہیں آوازیں دیتا، کبھی اسکول کے ہوم ورم میں اُن کی مدد لینا چاہتا تو وہ حقارت سے اُس کی کتابیں اپنی رائٹنگ ٹیبل سے اُٹھا کر پھینک دیتے۔
کبھی شہریار عبدالرحمٰن اُن کا یہ رویہ ہنس کر ٹال دیتا، کبھی اُس کی آنکھیں گیلی ہو جاتیں۔ اس نئے سیٹ اپ میں اُنہیں لگا شہریار عبدالرحمٰن نے اپنے سارے بدلے چکا لئے تھے۔
''مجھے تم سے نفرت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے، موت آئے، بھلے کسی کے نام کی بھی۔ اور میں موت کو چیٹ کر کے تمہیں اسے سونپ دوں۔ تم مر جاؤ تو شاید مجھے اپنے دل کے زیاں کا احساس کمتر لگے گا مگر جب تک تم زندہ ہو، مجھے زندگی سے بھی نفرت رہے گی۔ پھول، خوشبو، رات اور چاند، سب میری شاعرانہ فطرت کے استعارے ہیں مگر آج کے بعد یہ سب مجھ پر حرام ہیں، قطعی حرام ہیں۔''
انہوں نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا، پھر دل قابو میں آیا تھا تو وہ منہ دھونے واش رُوم میں چلے گئے۔ واپس لوٹے تو دانیا کو چائے کی ٹرے لئے کھڑے دیکھا۔
''موڈ ٹھیک ہو گیا بڑے بھیا؟''
''ہاں، آں....... مجھے کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے صاف انکار کیا۔
دانیا کچھ دیر تو اُنہیں دیکھتی رہی، پھر آہستگی سے بولی۔
''کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے شیئر ضرور کیجئے گا۔ آپ کو تو معلوم ہے، میں کتنی اچھی رازداں ہوں۔''
سالار عبدالرحمٰن نے چائے کا کپ ٹرے سے اُٹھایا، پھر آہستگی سے بولے۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے کوئی پرابلم ہوئی تو مجھے تمہارے علاوہ اتنا اچھا رازداں کہاں ملے گا؟''
اُس نے تعریف سے بچنے کے لئے ہنس کر کہا۔ ''ہاں، یہ تو ہے لیکن مجھ سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ اچھے رازداں تو شیری بھائی ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ان سے کوئی بات پوچھ نہیں سکتا اور راز تو کوئی بھی نہیں اُگلوا سکتا۔ وہ بڑے پکے ہیں اس بارے میں۔''
سالار عبدالرحمٰن جو بمشکل کمپوز ہوئے تھے، اس نام پر پھر سے بے ترتیب ہونے لگے تھے۔ ''پلیز گڑیا! مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''
''جیسے آپ کی مرضی بھائی!'' وہ آہستگی سے کہتی باہر نکلتی چلی گئی۔ لیکن اس لمحے دانیا عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ فہم بات چکراتی محسوس کی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اَن کہی کیا تھی۔ مگر اس کے لئے کچھ انتظار کرنا باقی تھا، اس لئے اُس نے ماما کے کمرے کی راہ لی تھی، پھر مکمل امن کی خوشخبری دے کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی، یہ اَن کہی صرف شہریار جیسا زیرک شخص ڈھونڈ سکتا ہے،

سوائے شہریار کے نہ ہونے کا قلق ہونے لگا۔اُس کا موبائل نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے سوئچ آف جواب آیا۔وہ بور ہو کر اسٹڈی کے لئے اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی مگر ان کی کتاب کے ہر لفظ میں تیرتی پھر رہی تھی۔



شہریار، سلامہ کے گھر میں داخل ہوا تو شاکرہ بانو کو نائمہ پر خفا ہوتے دیکھا۔سلامہ تخت پر خاموش، دل گرفتہ سا بیٹھا تھا۔وہ اُس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔ہولے سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی کی کمک پہنچانے کی کوشش کی، مگر سلامہ ارسلان کے اندر کی شکست......وہ بہت ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔کچھ گھنٹوں میں لگتا تھا، سالوں کا سفر اُس کے کندھوں پر آن پڑا تھا اور یہ عمر کا بوجھ اُس کے کندھے جھکائے دے رہا تھا۔

''آخر تمہیں بتائے بغیر کسی لڑکی کے ساتھ بھی جانے کی کیا ضرورت تھی۔اچھی بیٹیوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا، وہ اعتماد کو یوں ٹھیس نہیں پہنچاتیں۔اگر تم مجھ سے اجازت لے کر کسی سہیلی کے ہاں یا اُس کے ساتھ جانے کی خواہش کرتیں تو کیا میں تمہیں منع کرتی؟ کیا میں نے کبھی تم بچوں کو جابر اور سخت گیر ماں کی طرح پالا ہے، جو تم نے مجھ سے غلط بیانی کی؟''

نائمہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھی رہی، بالکل مٹی کے مادھو کی طرح......شاکرہ نے اُس کا کندھا ہلایا، پھر کڑک کر بولیں۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں تم نے گھر سے بالکل الگ چلن کیوں اپنایا؟''

نائمہ کا جھکا ہوا سر یکدم اُٹھا۔شہریار نے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں لحاظ، مروت اور ادب دُور دُور تک نہیں تھا۔اُن کی آنکھوں میں شرارے سے تھے۔پتہ نہیں، یہ خفگی تھی یا غصہ......وہ جان نہیں پایا۔سلامہ نے اُس کی طرف دیکھا۔ابہام اُس کی آنکھوں میں جل بجھ رہا تھا، لیکن نائمہ اب کوئی ابہام نہیں رکھنا چاہتی تھی، سو بغیر کسی کمزوری کے بولی۔

''مجھے شناخت چاہئے امی! میں عام لڑکیوں کی طرح چولہا نہیں جھونکنا چاہتی۔''

''شناخت کا کیا یہ طریقہ ہے کہ اعتماد کو سب سے پہلے ٹھوکر پر رکھو۔اور یہ چولہا جھونکنے کی بات کا کیا مطلب؟ تم لڑکی ہو تم اس کے علاوہ اور کیا کرو گی؟ یہی طرزِ معاشرت ہے۔زہرہ بھی تو ہے، گائنی اسپیشلسٹ ہے لیکن پھر بھی باورچی خانے سے اُس کی ناراضگی نہیں ہے۔''

''نہ ہوگی۔ وہ زہرہ پھو ہیں۔ اُن کا اور میرا لائف اسٹائل ایک جیسا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ کی ہر بات زہرہ پھو، عارفہ اور سلامہ بھائی سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہونے کا نام ہے۔ مگر میں اب چاہتی ہوں کہ بہت سارے لوگوں کی باتوں کا آغاز اور انجام میرے نام سے ہو۔''

سلامہ کے جسم میں غصے سے تحریک پیدا ہوئی مگر شہریار نے اُسے روک لیا تھا۔ ''ماں کو بات کرنے دو۔ بیٹیوں سے صرف ماں طریقے سے بات کر سکتی ہیں، ہم نہیں۔''

سلامہ نے بمشکل خود پر قابو پایا اور شاکرہ بانو نے نرمی اپنالی۔ بیٹی کا لہجہ باغی ہو رہا تھا اور بغاوت کو نرمی سے ہی دبایا جا سکتا تھا، سو انہوں نے نئی حکمتِ عملی اپنائی تھی۔ بیٹی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا تھا، پھر چمکار کر بولی تھی۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میری بچی! میرے لئے عارفہ، زہرہ اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زہرہ نے میری آدھی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اُٹھالی تھیں۔ چھوٹی سی عمر سے تمہارے بابا کے انتقال کے بعد وہ کیسے کیسے جتن کر کے گھر کی ذمہ داری کو سنبھالتی رہی ہے۔ سلامہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں اُس نے جان ماردی۔ لامحالہ میرا دل اُس کے اس احسان کے بعد ممتا سے بھر گیا۔ وہ میری بچی ہی تو ہے، اور بچہ سرگرم میں ساتھ ہو تو دل سے اس کے لئے دُعا اور محبت پھوٹ ہی نکلتی ہے...... عارفہ تم سے چھوٹی ہے، ابھی سکول میں پڑھتی ہے، بچپن ہے، باپ سر پر نہیں تھا اُس کے، کم عمری میں یتیمی اُٹھائی ہے اُس نے، اس لئے تمہارے بابا کے حصے کی محبت بھی اُسے دینے کی کوشش کی تھی میں نے...... رہی تم تو نظر انداز تو تمہیں بھی کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ جتنی دعائیں اُن سب کے لئے مانگی ہیں، تمہارے حصے میں اُتنا ہی خلوص ڈالا ہے، تمہاری بھی اتنی ہی پروا کی ہے۔ بس یہ ہے کہ تمہیں باقی بچوں کی طرح میرے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے، میرے شب و روز سے کچھ اتنا علاقہ نہیں رہا۔ کالج، پھر انسٹی ٹیوٹ...... شام کو برتن دھونے، کھانا کھانے میں جتنی باتیں ہو سکتی ہیں، صرف اتنے ہی لفظ تم نے مجھ سے بانٹے ہیں۔ لگاوٹ کا اظہار تو دونوں طرف سے ہوتا ہے بچے! اکیلی ماں کب تک محبت بانٹتی رہے؟''

''ماں ہو تو سب کچھ کر سکتی ہے، صرف آپ ہی کے کوئی بچے خاص نہیں ہیں۔''

''نائمہ! یہ بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟'' سلامہ یکدم تیز لہجے میں کھڑا ہو گیا۔

نائمہ کے صبیح چہرے پر طنز چھلکنے لگا۔

''بس ہو گیا اب بھائی ہونے کا زعم...... ایک تو آپ لوگ نا، ہر رشتے میں ہماری صنف کا استعمال ہی کرنا جانتے ہیں۔ حکمرانی صرف حکمرانی کا زعم...... ہنہ۔''

نائمہ کے لہجے میں حقارت بھی درآئی تو شاکرہ بانو نے حیرت سے بیٹی کو دیکھا۔
یہ انداز...... یہ انداز آج کل کے تو نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا، کسی نے بہت محنت سے اسے تیار کیا ہے اور بہت خاموشی سے اس پر محنت کی ہے۔
''آخر کون ہے وہ، جس نے تمہارے اندر اتنا زہر بھر دیا ہے؟'' زہرہ جو ہر ایک کا اندازہ غلط پڑتے دیکھ رہی تھیں، یکدم سامنے آکر تنتنا کر بولیں۔ اور یہی ٹھیک بھی تھا۔ وہ دوٹوک لہجے میں بول رہی تھی تو کچھ لُپٹی رکھنا اب اُن پر بھی کہاں فرض رہا تھا۔ سو زہرہ جنید نے شاکرہ بانو کو منظر سے ہٹا دیا تھا۔ اب بہن کے سامنے بہن کھڑی تھی۔ بڑی بہن ماں جیسی ہی تھی۔ نائمہ کی آنکھ میں کسی بھی رشتے سے کوئی بھی حرارت نہیں پھوٹ رہی تھی۔ شناخت کا بحران ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا، اس لیے زہرہ نے بات کا سرا یہیں سے پکڑا تھا۔
''تمہیں کیسی شناخت چاہیے؟'' سوال کیا گیا اور اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
''مجھے ایسی شناخت چاہیے کہ پھر مجھے کسی اور کے حوالے کی ضرورت نہ ہے۔ ایسی شناخت چاہیے کہ پھر میرے نام کے ساتھ بابا کا نام نہ بھی ہو، تب بھی لوگ مجھے ایک مکمل شخصیت تسلیم کرتے ہوں۔''
''آر یو میڈ؟'' زہرہ جنید، بہن کی اس گوہرافشانی پر حیران رہ گئی۔ ''تم پاگل ہو گئی ہو۔ ہنس کی چال چلنے میں کہیں اپنی چال تو نہیں بھول رہی ہو؟ جس معاشرے پر تم چلنا چاہتی ہو، اب وہاں کے لوگ بھی اس سے اوب گئے ہیں۔ وہاں شناخت کا بحران اس نوعیت کا ہے، جس نوعیت اور بندھن سے تم پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔ بچے کے لئے ماں باپ ہی اُس کی پہلی شناخت ہوتے ہیں۔''
زہرہ نے سمجھانے کی کوشش سی کی تھی۔ جانتی تھیں، یہ سب کچھ کارگر نہیں ہوگا لیکن وہ ہار نہیں ماننا چاہتی تھی اور ہار تو وہ بھی ماننا نہیں چاہتی تھی، سو کھنک سے بولی۔
''میں یہی کہہ رہی ہوں، جب ہم عمر کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں تو پھر پہلی شناخت کو ہی گلے سے کیوں لگا کر رکھا جائے؟...... میں اگر ایک نیا راستہ ڈھونڈنا چاہتی ہوں، جس پر کچھ پیچھے کے آنے والے چل سکیں تو آپ کیوں جیلس ہو رہی ہیں؟''
''جیلس...... میں تم سے جیلس ہوں گی؟'' زہرہ کو دھچکا لگا۔ اُس کی زبان کی روانی میں تو کانٹے ہی کانٹے تھے۔ ''تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری ذات کے حوالے سے جیلس ہو سکتی ہوں؟'' انہیں دُکھ ہو رہا تھا، جو کہہ کہہ کر کم نہیں ہو سکتا تھا۔
اور وہ اس دُکھ سے بے پروا کر بولی۔ ''سیدھی سی بات ہے بجو! میں بہت کم عرصے میں آپ کی تعلیم سے کم تعلیم یافتہ ہو کر آپ کے سال کے برابر کی تنخواہ جتنی اماؤنٹ کچھ مہینوں میں کما لوں گی۔ دیگر

آسائشات الگ خودبخود میرے قدموں میں ڈھیر ہوں گی تو آپ سے یہ سب برداشت کیونکر ہوگا؟"
"نائمہ! تم اپنی حد پھلانگ رہی ہو۔" یکدم سلامہ نے ہاتھ اُٹھایا مگر شہریار نے بازو پکڑ کر اُسے روک لیا، پھر مدھم ہوکر بولا۔
"تم پیسہ کیوں کمانا چاہتی ہو؟" شہریار نے نئے سرے سے ٹرن دیا مذاکرات کو تو وہ استہزاء سے ہنسی۔
"آپ...... آپ کیا جانیں شہریار بھائی! لوگ پیسہ کیوں کمانا چاہتے ہیں۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے لوگ مجبوری یا غربت کی ہجے کب کرسکتے ہیں؟"
شہریار کو اُس کی مثال پر ہنسی آنے لگی۔ اُس نے اس جیسے شناخت کی بھیک سنبھالے انسان کو تو تمر بنا کر طنز کیا تھا حالانکہ زندگی خود اُس پر سب سے بڑا طنز تھی لیکن اس وقت وہ اماں کے بغیر اُس کے قریب جا پہنچا تھا، پھر لاڈ سے بولا تھا۔
"میری گڑیا! تمہیں آخر کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"
"بہت سارے روپے...... لیکن مجھے وہ بھیک میں نہیں چاہئیں، اپنی محنت سے کمانا چاہتی ہوں میں...... میں ساری دنیا کمانا چاہتی ہوں۔"
"یہ ضرورت نہیں، ہوس ہے۔" اُس نے بات کو نیا پہلو دیا اور وہ طنز سے ہنسی۔
"آپ...... یہاں کون ہے، جسے آپ ضرورت کی چادر میں سمٹا ہوا پائیں گے؟ یہاں ہر ایک کے پیر اپنی چادر سے باہر ہیں اور غربت کی چادر میں پیر ڈھکو تو سر کھلتا ہے۔ اور میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ کیا ضروری ہے، جو باپ زندگی گزارے، اولاد بھی ویسی سسکتی سی زندگی گزار کر مرجائے؟...... شیری بھائی! ساری زندگی صبر کے سوا اس گھر میں، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اتنی محنت کے بعد بھی سلامہ بھائی اتنا کما پاتے ہیں کہ ہم صرف تین وقت کا کھانا ہی کھا پاتے ہیں۔"
"کیا تمہیں معلوم ہے، اس شہر میں کل کتنے لوگ ہیں، جو تین وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتے ہوں گے؟" امی نے اُس کی بات سے نئی بات اُٹھائی مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھی چیخ کر بولی۔
"پلیز! آپ مجھے کسی بین الاقوامی سروے کے اعداد وشمار مت بتانے بیٹھ جایئے گا۔ مجھے خودترسی کی عادت نہیں ہے۔ میں اپنی قسمت خود بنانا چاہتی ہوں۔"
وہ اُن کی موجودگی سے بے نیاز تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ شہریار نے گھبرا کر سا کر ماؤں کی طرف دیکھا، وہ ستے ہوئے چہرے اور نم آنکھوں سے اُس کی طرف تک رہی تھیں۔

شہریار تیزی سے اُن کی طرف آیا، پھر لجاجت سے بولا۔ ”ماں جی! پلیز، آپ اس طرح دل گرفتہ تو نہ ہوئیے۔ نائمہ ابھی بچی ہے، کچھ دنوں میں یہ بخار اُتر جائے گا اس کا۔ ابھی بس وہ جذباتی ہو رہی ہے۔“
شاکرہ بانو کچھ نہیں بولیں اور کمرے میں بیٹھی باہر کی جنگ سے ہراساں عارفہ باہر آ کر سلامہ سے مخاطب ہوئی۔
”بابا اسی دن کے لئے کہتے تھے بھائی! کہ دوستی ہمیشہ اپنے جیسے لوگوں میں رکھنی چاہئے۔ نائمہ آپا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اچھی گاڑی، اچھے سے اچھے کپڑے پہنے وانیا بجو کو دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اس جیسی زندگی گزارنے کی آرزو کر سکتی ہے۔ نائمہ آپا شروع سے امپیچور رہیں، پھر وہ کیسے یہ فرق سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگ جان مار کر بھی شیری بھائی جیسی زندگی نہیں گزار سکتے۔“
”عارفہ......“
شاکرہ بانو نے اُس کے چہرے کا رنگ اُڑتے دیکھ کر بیٹی کو سرزنش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ بُری کب تھی، نائمہ کی طرح واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔ شہریار حق دق شاکرہ بانو کے پاس تخت پر بیٹھ گیا تھا۔
زہرہ نے، سلامہ نے لاکھ اُسے اس فیز سے نکالنے کی کوشش کی مگر جانے لفظ کی انی کہاں جا کر لگی تھی کہ ٹیس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔
”بی لیوی ماں!...... میں نے یا وانیا نے کبھی اوور اسمارٹ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تو ویسے ہی دِکھنا چاہتے تھے، جیسے آپ ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر یہ ہماری غلط فہمی ہے تو میں......“ شہریار کے لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔
تبھی شاکرہ بانو نے اُسے سینے سے لگا لیا، پھر مدھم ہو کر بولیں۔
”قصور تمہارا نہیں ہے، میری ہی تربیت میں کوئی کوتاہی رہ گئی، جو وہ ذات سے زیادہ شناخت کے خفقان میں مبتلا ہوئی۔ میری اپنی تربیت میں کھوٹ ہے شہریار! ورنہ وہ باقی بچوں کی طرح انسان سے محبت کرنے کا ہنر سیکھتی، نہ کہ انسان کی دولت امارت سے آنکھیں سینکتی۔ کمی اُس میں ہے تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔“
مگر اُس کے اندر اطمینان ہو کر نہیں دیا۔ وہ کھڑا ہوا، پھر تاسف اور بے بسی سے بولا۔
”پتہ نہیں، میری خاک میں اور میرے نصیب میں کیا بیر ہے۔ ہمیشہ اچھا کرنے کی کوشش میں برا کر دیتا ہوں۔ چاہتا ہوں، لوگ محبت سے یاد کریں مگر میری یاد اُن کی آنکھوں میں نمی بن جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ لیکن مجھے تمام عمر خود سے یہ شکایت رہے گی۔“ پھر وہ رُکا نہیں تھا، تیز قدموں سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

پھر تیسرا دن تھا، جب اچانک سلامہ نے اُس کو اُس کے گھر آ لیا۔

"کیا ہو گیا ہے، اب گھر ہی نہیں آتا، یونیورسٹی میں بھی کترا جاتا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں دوست؟....... مشکل میں ہاتھ چھڑا کر الگ ہو گئے۔"

وہ شرمندہ ہو گیا۔ جانتا تو سلامہ بھی تھا کہ کترانے کی وجہ دوستی سے آنکھ چرانا نہیں تھا، اس لئے پہلی ڈگر پر لانے کے لئے سلامہ نے ہی پیش قدمی کرنی تھی۔ مگر نائمہ کے معاملہ سے اُسے ایسی چپ لگی تھی کہ ہونٹوں پر ہنسی آنا بھول گئی تھی۔

وہ اس وقت بھی سنجیدہ بیٹھا ہوا کتابیں پڑھنے کا لُک دے رہا تھا ورنہ دماغ ابھی تک سلامہ کے گھر ہی میں اٹکا ہوا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے، ان تین دنوں میں ماں جی نے تمہیں کتنا یاد کیا ہے۔ وہ عارفہ کے جملوں کی وجہ سے بہت ڈپریس رہی۔ انہیں لگتا ہے، اُن کا لاڈلا بیٹا کہیں خفا ہی تو نہیں ہو گیا ہے۔"

"یار! ماں جی سے کہو، میں ناراض نہیں ہوں۔ بس ویسے ہی قدم آتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں۔" اُس نے توجیہہ دی ورنہ وہ خفا نظر آنے لگا۔

"تم بھی شیری کے بچے! فضول باتوں میں اُلجھنے لگے ہو۔"

اُس نے نفی میں سر ہلایا، پھر مدھم ہو کر بولا۔ "نہیں سلامہ! عارفہ بچی ہے لیکن میں نے جائزہ لیا تو اندازہ ہوا، اُن کا تجزیہ اتنا بھی غلط نہیں ہے۔"

"کیا سمجھوں میں اس بات سے، کیا ہماری تمہاری دوستی ختم؟" اُس نے جان کنی سے پوچھا اور اُس نے ہاتھ تھام لیا، پھر عاجزی سے بولا۔

"نہیں، ہماری دوستی ختم ہونے جیسی نہیں۔ لیکن یار! گھر آنے کی ضدمت کر۔ اب کوئی نیا الزام برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے بات تیرے دل کو لگ گئی ہے۔" سلامہ نے اُداسی سے اُسے دیکھا اور پھر اُس کا جواب سنے بغیر اُس کے گھر سے نکلتا چلا گیا۔ دانیا جو دونوں کے لئے چائے اور سینڈوچ لائی تھی، حیران رہ گئی۔

"خیریت، یہ آج سلامہ بھائی اتنی جلدی میں کیسے تھے؟ اتنی جلدی تو وہ کبھی جان نہیں چھوڑتے۔ شیری بھائی! کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا ناں آپ کا؟" اُس نے شہریار عبدالرحمٰن کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

بظاہر اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن بہن کی محبت کے پیش نظر اُس نے کپ پکڑ لیا تھا۔ اندر کی سوچیں باہر تک چہرے پر جال بُن رہی تھیں۔

"آپ نائمہ کی وجہ سے تو پریشان نہیں ہیں بھائی؟"

ضرب ٹھیک چوٹ پر کی گئی تھی، یکدم کپ سے چائے چھلک گئی تھی۔ بظاہر منہ گرم چائے سے جلا تھا، لیکن محسوس ہوتا تھا، رُوح پر چھالا پڑ گیا ہو۔

''آخر یہ نائمہ کو ہوا کیا ہے؟ ماڈلنگ، شوبز....... یہ سب اُسے سوٹ تو نہیں کرتا۔ وہ تو اچھی بھلی پری انجینئرنگ پڑھ رہی تھی۔''

''ہاں، بس کم عمری میں ٹریپ ہو گئی ہے۔'' اُس نے تفصیل دینے کے بجائے بات گول کر دی۔

پھر وہ ایک ہفتے تک سلامہ ارسلان سے نہیں مل سکا تھا۔ کچھ مصروفیات تھیں تو کچھ مصنوعی مصروفیات کا دھوکا...... وہ ہفتے کے روز عاطف بیگ کی طرف نکل گیا تھا مگر وہاں جا کر سلامہ کے بارے میں جو سنا، اس نے اُسے ہراساں کر دیا تھا۔ وہ گھر سے سیدھا ہسپتال پہنچا تھا۔

''کیا ہو گیا تمھیں اسٹوپڈ نروس بریک ڈاؤن تم جیسے اسٹرانگ بندے کے مصرف کی چیز تو نہیں۔ یہ تو ہم جیسے اندر سے کھوکھلے لوگوں کا آخری سہارا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ زہرہ جنید اُسے باہر لے گئی، پھر سرسراتے لہجے میں بولی۔

''نائمہ چار دن پہلے بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہے۔ میں، جنید اور سلامہ اُسے ہر جگہ ڈھونڈ چکے ہیں لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ لوگوں کی باتیں، طنزیہ جملے...... سلامہ نے یہی بات دل پر لے لی ہے۔''

شہریار کے چہرے کا رنگ پھر زرد ہو گیا۔ نائمہ سے اُسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

''اُس نے یہ قدم کیوں اُٹھایا؟ اتنا انتہائی قدم...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا، ہم کوئی درمیانی راستہ نکال لیتے؟'' وہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا اور جانے کیا کہہ رہا تھا، لیکن اتنا پتہ تھا، رات کی ایک ایک بات اُس کے اندر تعزیر بنی جا رہی تھی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا، وہ نائمہ کی بے وقوفی پر اتنی زور سے اُسے ڈانٹے کہ اندر کی ساری گھٹن باہر بہہ نکلے۔ مگر وہ تھی کہاں...... ایک بڑا سوالیہ نشان......

وہ کھڑے سے بیٹھ گیا تھا۔ پھر زہرہ جنید کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہوا کیا تھا؟''

پرانے سوال کو نئی طرح سے کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار عبدالرحمٰن کو لگ رہا تھا، وہ ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ انسان اپنی غلطیاں اپنے کندھے پر اُٹھا سکتا ہے، مگر جب کسی اور کی غلطی بھی آپ کے کندھے پر ناکردہ عمل کی طرح لاد دی جائے تو روح ایسے ہی ہانپنے لگتی ہے۔ وہ بظاہر سوال کر رہا تھا، لیکن درحقیقت وہ چاہتا تھا، زہرہ جنید اُسے اس سارے معاملے سے بے داغ بری کر دیں......

شک کا فائدہ دے کر......

رحم کھا کر......

یا نائمہ کو اپنی ناسمجھی کا حوالہ دے کر...... کچھ بھی سہی، وہ بری کر دیا جائے۔

زہرہ جنید خاموشی سے شہریار عبدالرحمن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اُس کے اندر کی کشمکش کا اندازہ کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے نائمہ کے واقعے سے توجہ ہٹانے کے لئے اُس کی تعلیمی پروگریس پر بات چھیڑ دی، مگر وہی تھا کہ بات گھوم کر پھر سلامہ...... اور سلامہ سے اُلٹ پلٹ کر نائمہ تک آ پہنچی تھی۔ سو شہریار عبدالرحمن نے اندر کی جنگ سے تھک کر زہرہ جنید کا ہاتھ تھام کر بے کسی سے پھر سے پوچھا۔

"ہوا کیا تھا؟...... معاملہ اتنا تو نہیں بگڑا تھا؟"

زہرہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر ہولے سے بولیں۔ "سلامہ کا خیال تھا، اگر اس کی شادی کر دی جائے تو شاید اُس کے دماغ سے خناس نکل جائے۔ تم تو جانتے ہو، ہمارے معاشرے میں ہر مسئلے کا حل شادی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت یہی لگا تھا کہ شاید اپنے گھر کی خواہش میں، وہ یہ بھول جائے گی۔ میں نے اپنے گھر میں جنید کے کزن جس کے لئے لڑکیاں ڈھونڈی جا رہی تھیں، کے سلسلے میں جنید سے بات کی۔ جنید ایک لمحہ لگائے بغیر راضی ہو گئے۔ مگر نائمہ، یہ اطلاع ملتے ہی بہانا کر جانے رات کے کس پہر گھر سے نکل گئی۔ ہمیں تو صبح پتہ چلا تھا۔ رُسوائی گھر کا دروازہ پھلانگ آئی تھی۔ اندر آنکھیں جھک گئی تھیں اور باہر کی آنکھیں پھیل کر رُسوائی کا سمندر بن گئی تھیں...... جس میں میرے بابا کی عزت، سلامہ کی ہمت، ماں کی معصوم انا، سب کچھ ڈوب گیا۔ یہ لڑکیاں گھر میں دہلیز پار کرتے وقت دہلیز کے اس طرف رہنے والوں کی بے کسی کا امتحان کیوں لینا چاہتی ہیں؟...... عمر بھر کی محبت کا صلہ یہ پتھر، رُسوائی، لفظوں کے تیر...... شیری! تمہیں نہیں معلوم، جنید کی سمجھداری کے باوجود میرے گھر میں میری حیثیت کتنی آکورڈ ہو گئی ہے۔ اور سلامہ، وہ تو بالکل ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہاں سلامت کون ہے؟"

جانے اُس نے ہوا سے کہا تھا، زہرہ جنید سے کہا تھا یا خود سے، لیکن اُس کے شکستہ قدم کمرے کی طرف اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ بے وقت کمرے میں داخل ہوا مگر سلامہ کو دیکھ کر لگا، جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہارنے لگا تھا۔ جب ہراول دستے کا کوئی سپاہی دشمن کی فوج سے جا ملے تو کون ہے جو جنگ جیت سکے...... جنگ حوصلے سے لڑ کر جیتنے کی بات ہے اور حوصلہ، وہ کوئی دبے قدموں چرا کر لے گیا تھا،

جیتنے کی بات ان کہی ہوگئی تھی اور ان کہی، ہر ایک کے لئے قابلِ فہم کب ہوا کرتی ہے........

شہر یار عبدالرحمٰن نے پوری طرح اُسے اپنی آنکھوں کے حصار میں لے لیا تھا، حوصلے سے اُس کا ہاتھ تھاما تھا، مگر سلامہ ارسلان کے سینے سے محبت، تشکر کے نام پر صرف آہ کے سوا کچھ نہ نکلا تھا، وہ رو پڑا تھا۔

''پلیز سلامہ! خود کو سنبھالو یار، تم تو ہمارا حوصلہ ہو اور حوصلہ کھونے کا کام تم کرو گے تو ہم کم حوصلہ لوگوں کی ہمت کون بڑھائے گا؟''

''پتہ نہیں، لیکن یہ طے ہے شیری! میں بابا کی ذمہ داری اچھی طرح نہیں نبھا پایا۔ میں قطعی ناکام ہو گیا ہوں۔ قطعی ناکام.......'' سلامہ نے بولتے بولتے خاموشی کا اسپیس لیا۔ شہر یار نے کم فہمی سے اُسے دیکھا مگر وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ ایک خاموش ان کہی ان دونوں کے درمیان چپ کھڑی تھی۔

پھر تیسرے دن وہ اور روانیا اُس سے ملنے آئے تھے کہ اچانک زہرہ جنید نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''کچھ پیو گے تم دونوں؟''

شہر یار نے غیر متوقع استقبال پر تحیر سے زہرہ کو دیکھا، پھر ہولے سے بولا۔ ''خیریت تو ہے زہرہ پھپھو! سلامہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، آں.......'' زہرہ جنید نے یوں چونک کر اُسے دیکھا، جیسے جواب کے لئے مناسب لفظ تلاش کرنے میں بہت دُور نکل گئی ہوں۔ اُس نے چپ گہری دیکھی تو بے قراری سے پوچھا۔

''پھپھو! بتایئے ناں، سلامہ تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، وہ ٹھیک ہے۔ پہلے سے کافی امپروو کر رہا ہے۔ لیکن اُسے ٹریٹ کرنے والے ڈاکٹر کا خیال ہے، سلامہ اسی وقت صحت یاب ہو سکتا ہے، جب تک اسے بیمار کرنے والے حالات میں شامل ان افراد سے دُور رکھا جائے، جنہیں دیکھ کر اسے پھر سے سارے حالات یاد آجاتے ہوں۔''

شہر یار عبدالرحمٰن فق چہرے سے اُنہیں دیکھے گیا۔

کیا ایک دوستی کا عنصر تھا، جو اُس کی زندگی میں، اس میں بھی زہر مل گیا تھا.......

یہ جذبہ مرجاتا ہے، لیکن محبت اس قدر جلدی آخری سانس بھر سکتی ہے.......

انسان کی شخصیت ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں کے مجموعے سے مکمل ہوتی ہے۔ماں باپ اخلاق دیتے ہیں، بہن بھائی اچھے برے حالات میں اپنے ہونے کا احساس، ساتھ اور حوصلہ دیتے ہیں اور دوست چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ بھرنے والے کردار......

"کیا سلامہ بھی یہی چاہتا ہے، میں اُس سے ابھی نہ ملوں؟" شہریار کے لہجے میں حسرت تھی۔ابھی کچھ دن پہلے یہی بات در پردہ اُس نے سنی تھی مگر اُس کا دل اس طرح نہیں کانپا تھا،شاید اس یقین کی وجہ سے کہ وہ جب چاہے گا، اُس سے مل لے گا۔لیکن آج بالکل الگ طرح سے اسے جھٹک دیا گیا تھا تو اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔زہرہ جنید خاموش رہی تھیں۔

دانیا نے شہریار عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔بہر حال اپنے بھائی سے اُسے بھی ہر چیز، ہر انسان سے زیادہ محبت تھی،اس لئے اس طرح رو کے جانے پر اُسے بھائی کی انسلٹ فیل ہوئی تھی۔

"چلیں شیری بھائی! مما گھر میں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

وہ جانتی تھی، وہ ایک دل فریب جھوٹ بول رہی تھی کہ ماں شہریار کا انتظار کر رہی ہوں گی،لیکن اُسے لگا، یہ جھوٹ اس سچ سے بہتر تھا۔کم از کم وہاں کوئی اُس کا ہاتھ اس طرح جھٹکتا نہیں۔

شہریار نے دانیا کے کہنے سے قدم موڑ لئے تھے۔سلامہ کے لئے لایا گیا گلدستہ دانیا کے ہاتھ میں تھا،سو وہ گلدستہ زہرہ جنید کی طرف بڑھا کر بولی۔"آئی ایم سوری!ہم نے آپ کا بہت سارا وقت ضائع کیا۔"

زہرہ نے اُس کے ہاتھ سے گلدستہ لے لیا تھا۔پھر ہولے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلگیر لہجے میں بولیں۔"شیری بہت پیارا بچہ ہے۔مجھے یا ماں کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔جو کچھ ہوں، یہ ہماری قسمت میں لکھا تھا۔لیکن جس طرح تمہیں اپنے بھائی کی انسلٹ برداشت نہیں ہوئی، اس طرح مجھے بھی ہر بات سے زیادہ اپنے بھائی کی زندگی سے محبت ہے۔پلیز دانیا! کوشش کرنا شہریار اب سلامہ سے کبھی نہ ملے۔اس حادثے کو بھولنے کے لئے حادثے کا محرک بھولنا ضروری ہے۔تم سمجھ رہی ہو ناں۔"

دانیا نے کچھ نہیں کہا،سر ہلا کر پلٹ گئی۔لیکن یہ پلٹنا ہی غضب تھا۔شہریار جو آہستہ روی سے آگے بڑھ گیا تھا، جانے باتوں کے دوران کب واپس اُسے لینے پلٹ آیا تھا۔اُس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں تھا،بالکل سادہ، ہر تاثر سے بے پروا........

"شیری بھائی!" دانیا نے اُس کا ہاتھ تھاما تو لگا، کسی برف کو چھو لیا ہو.......وہ کچھ نہیں بولا،اُس کے تھامے ہوئے ہاتھ پر اپنا دباؤ بڑھا کر بولا۔

"گھر چلو دانیا!میں نے کچھ بہت ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

زہرہ جنید نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر کچھ کہے بغیر لب بھینچ لئے۔ ضروری نہیں تھا، کسی کے مرنے پر خود اس کو پرسہ دیا جاتا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کاریڈور کے موڑ پر آ کر گم ہو گئے۔
زہرہ جنید خالی کاریڈور کو دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ نظر واپس پلٹی تو اس میں نمی کے سوا کچھ نہیں تھا۔
شہریار گھر آ گیا تھا لیکن مسکراہٹ پہلی بار اُس کے ہونٹوں سے غائب ہوئی تھی۔
دانیا مسلسل اُسے ہینڈل کر رہی تھی لیکن وہ پہلی بار ریلیننگ فیس اُس سے ٹکرا رہا تھا۔
وہ اُسے دیکھ دیکھ کر ہراساں ہو رہی تھی۔ اتنی سادہ کہ جانے والے ایشو پر بھی کوئی بات کرنی بھول گئی تھی۔ اور شہریار عبدالرحمن تھا کہ سلامہ والے واقعے کے بعد سے کچھ زیادہ ہی باہر وقت گزارنے لگا تھا۔
آخر وہ کہاں جاتے ہیں؟ اُس کے دل میں خیال آیا، وہ پوچھے مگر اُس نے اس قدر سنجیدگی اوڑھ لی تھی کہ وہ اُس سے بات کرتے کرتے ہچکچانے لگی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی اب اُس کا انداز لئے دیئے ہوتا۔
کوئی نیا گروپ اُن سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سب تو خیر سگالی ٹیم بن جاتے اور وہ صرف دھیرے سے کہتا۔
”سوری، میں نے دوست بنانے چھوڑ دیئے ہیں۔ اور ویسے بھی میں دوست صرف اپنی کلاس میں بنانے کا قائل ہوں۔“ دانیا اور عاطف اُس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ایک واقعے نے اُسے اتنا کھردرا کر دیا تھا۔
”بہت مغرور ہو گئے ہو شیری!“ بالآخر ایک دن عاطف نے اُس کی کلاس لے ڈالی تو وہ کچھ کہے بغیر سامنے رکھی کتاب میں مگن نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔
”اسموکنگ کرتا ہے اب؟“
شہریار نے گھور کے دیکھا تو تپانے کو بولا۔
”میں نے کہا، پوچھ لو، بھائی نے دوستی کے معیار بدل لئے تو کیا پتا اسموکنگ جیسا چیپ نشہ چھوڑ کر کوئی ہائی فائی کلاس نشہ اختیار کر لیا ہو۔“
شہریار اب بھی نہیں بولا۔ خاموشی سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ عاطف بیگ نے دونوں چیزیں لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا تو چونک کر سر اُٹھایا۔ ”کیا ہوا ہے؟......اب لے کیوں نہیں رہے ہو؟“ سوال کیا۔
عاطف قریب بیٹھ گیا، پھر چڑانے کو بولا۔ ”لے تو لوں، مگر اپنا یار بدل گیا ہے۔ سو کیا پتہ، دوستی کو استعمال کرنے کی فردِ جرم عائد کر دے مجھ پر۔ مڈل کلاس کا بندہ ہوں، اس لئے ایسا الزام اچھا نہیں لگے گا۔“

شہریار عبدالرحمٰن نے سگریٹ اور لائٹر دونوں جیب میں واپس رکھ لئے، پھر روڈ لہجے میں بولا۔ ''بہتر ہے، تم کسی مڈل کلاس کو ڈھونڈ لو۔ شاید ہم بہت زیادہ ساتھ نہ چل سکیں۔'' عاطف کو اچنبھا ہوا۔ اُس کا خیال تھا، ایسے بات جملوں پر وہ اپنے اندر کا غصہ باہر نکال کر پُرسکون ہو جائے گا۔ لیکن اُس نے اس کے خلاف توقع عمل دہرایا تھا۔

''کیا واقعی تمہیں لگتا ہے ہماری دوستی میں کلاس بہت بڑا ایشو ہو گیا ہے؟''

عاطف بیگ نے نئے سرے سے اُسے تلاش کیا۔ وانیا نے سنجیدگی سے عاطف بیگ کو اُس کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ شہریار بھی یہ بات جانتا تھا، لیکن بہرحال جو خلا اندر ہو گیا تھا اس کا فوری تدارک ناممکن سی بات تھی۔ وہ خاموشی سے اب بھی خلاء میں دیکھ رہا تھا۔ سلامہ صحت یاب ہو گیا تھا۔ اُس نے یونیورسٹی چھوڑ کر مکمل طور پر بابا کا جنرل اسٹور چلانا شروع کر دیا تھا۔ اور شہریار عبدالرحمٰن تھا، اُسے یہ بات نہیں بھولتی تھی کہ وہ کبھی بہت اچھے دوست تھے۔ ادھر عاطف بیگ تھا، وہ اُسے اس فیز سے نکالنا چاہتا تھا۔

زندگی تھی بندھی سی ہو کر گزر رہی تھی کہ حمزہ عابد کا ایشو شہریار کی زندگی میں در آیا تھا۔ حمزہ عابد، مادیہ، اُس کے ممی پاپا اکثر گھر آنے جانے لگے تھے۔ تب شہریار نے پہلی بار وانیا عبدالرحمٰن کو غور سے دیکھا۔ وہ چھوٹی سی بچی یکدم بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ مگر سلامہ کے بعد وانیا سے چھوٹ جانے کا خیال نہایت روح فرسا تھا۔ وہ اُس کے دائیں بائیں پھر رہا تھا۔ آج نئے سرے سے حمزہ عابد کی فیملی گھر میں آئی تھی اور وانیا خود بہ خود بہ نفس نفیس کچن میں ملازمین کی مدد کے ساتھ ریفریشمنٹ کی چیزیں تیار کرنے میں اتنی مگن تھی کہ شہریار بھی اُس کی نظر سے محو ہو گیا تھا۔ تب وہ جان کنی میں اٹک گیا تھا۔ کبھی باقی بھائیوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھتا، کبھی خاموشی سے اُٹھ کر، کچن کا دروازہ کھول کر کچن میں جا گھستا۔ کچھ کہنے کے لئے لب کھولتا مگر وانیا عبدالرحمٰن کے چہرے پر نظر پڑتی تو لفظ کہیں اندر ہی رُک رُک جاتے۔ یہ محبت تھی یا محض دوستی...... وہ اُس کے چہرے سے جانچ نہیں پا رہا تھا۔ رنگ تو تھے مگر یہ رنگ کس جذبے سے کھل رہے تھے، وہ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن وقت، تنہائی اور وانیا دونوں میسر نہیں تھے۔ یہاں تک کہ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا کر خود اس کو ڈھونڈتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی۔ چھٹی والے دن اُس کا قیام یہیں ہوتا تھا۔

''شیری بھائی! آپ کو پاپا اور عدیل بھائی ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔''

شہریار عبدالرحمٰن ٹیرس سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ یکدم اُس کی آواز سن کر اُس نے سگریٹ بجھائے بغیر ٹیرس سے نیچے پھینک کر پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وانیا کی حس شامہ بہت تیز تھی۔ وہ اُسے گھورنے لگی۔

''آپ نے پھر اسموکنگ کی ہے ناں؟'' اسموکنگ کی بُو اُس کے کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ ابھی کے ابھی چار سگریٹ پھونک چکا تھا اس لئے جھوٹ بولنا بے سود ہوتا۔ اُس نے سر جھکا لیا تھا۔

''وہ بس ویسے ہی، کچھ اکیلا پن محسوس کررہا تھا۔''
دانیا اُسے دیکھنے لگی۔ ایک نئے انداز سے........ شہریار کی آنکھوں میں جو بے چینی تھی، وہ اس کا محرک جانتی تھی۔ شاید اُس نے سوچا بھی تھا کہ اس گھر میں اس کے جانے پر سب ہی افسردہ ہوتے تھے لیکن شہریار شاید وہ واحد انسان ہوتا، جس کی زندگی اُس کی وجہ سے کچھ ڈسٹرب ہو جاتی۔ اُس نے ایک اندازہ لگایا تھا لیکن اُس کی ڈسٹربنس تو اُس کے اندازے سے بھی کہیں زیادہ تھی۔
''آپ کچھ پریشان لگتے ہیں بھائی!'' اُس نے جان کر چھیڑا تا کہ اندر کا اُبال نکل جائے اور کچھ فطری شوق بھی تھا کہ جان سکے اس کا بھائی اس کی کمی کس حد تک محسوس کرے گا اور وہ صمٌ بکمٌ کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔
''ابھی تو تم پڑھ رہی ہو ناں دانیا........؟'' اُس نے بہت دیر کے بعد مناسب لفظوں کا انتخاب کیا۔ دانیا کو اپنے بھائی کے اس حساسیت بھرے جملے پر ترس بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔
''پڑھ تو میں واقعی رہی ہوں، لیکن آپ کو اچانک میری تعلیم کی اتنی فکر کیوں ہوگئی ہے؟'' وہ بیڈ سے کمر ٹکا کر اُس کے برابر کھڑے ہو کر پوچھنے لگی۔
''کیا مطلب، تمہاری تعلیم اور تمہاری فکر میں نے کب نہیں کی؟''
اُس نے اُلٹا سوال داغ دیا تو وہ مسکرانے لگی، پھر جذبۂ محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یقین سے بولی۔
''آپ کی توجہ اور فکر ہی سے تو ہمیشہ میرے لئے زندگی کے راستے آسان رہے ہیں۔ اس پر میری رائے ساری زندگی نہیں بدل سکتی۔ ہاں، مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں، میرے شیری بھائی ایسی کون سی بات پر ہراساں ہیں کہ ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ تک غائب ہوگئی ہے۔''
شہریار عبدالرحمٰن نے ایک لمحے کے لئے اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''حمزہ کسی خاص نوعیت کی بات کرنے آئے ہیں۔''
''آئے ہیں؟...... حمزہ صرف ایک ہے شیری بھائی! اس لئے آیا ہے، کہئے۔ اگر عزت دینے کا شوق چرایا ہے تو اور بات ہے۔ رہی خاص نوعیت...... تو یہ ابھی مجھ پر بھی روشن نہیں۔'' دانیا رُکی، پھر یکدم موڈ بدل کر مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''اس لئے تو کہہ رہی تھی، ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھئے۔ اگر کوئی خطرناک ایشو پاس ہو تو تفصیلات تو ظاہر ہو سکیں۔ آپ تو جانتے ہیں، باقی گھر کے افراد کتنے پکے ہیں۔ ہر بات ہضم کر جائیں گے۔''
شہریار نے اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھا، پھر اُس کی پونی ٹیل پکڑ کر شرارت سے بولا۔ ''پگلی لڑکی! مجھے بنا رہی ہو........ ہاں؟''

"نہیں تو بھائی! آپ خوامخواہ مجھ پر اور میرے خلوص پر شک کر رہے ہیں۔" دانیا پونی ٹیل چھڑانے کی کوشش میں منہ بسورنے لگی۔

شہریار پونی ٹیل چھوڑ کر مدھم لہجے میں بولا۔ "تمہیں پسند ہے وہ؟"

دانیا کو یکدم لگا، کوشش کے باوجود چوری پکڑی گئی ہے۔

"نہیں تو بھائی! وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ایسے ہی جیسے عاطف، ماریہ یا دوسرے یونیورسٹی فیلو۔"

شہریار نے بے یقینی سے اُسے دیکھا، پھر ہولے سے اُس کی ٹھوڑی چھو کر بولا۔ "حمزہ اچھا لڑکا ہے، مجھے برا نہیں لگا۔ لیکن کیا کروں، تمہیں اس گھر سے بھیجنے کے خیال سے ہی سانس رکنے لگتی ہے۔ تمہارے اور جازی کے علاوہ اس گھر میں آئینہ ہی مجھے جانتا ہے۔ اور میں ابھی اتنی جلدی تنہائی سے مرنا نہیں چاہتا۔"

دانیا نے کچھ نہیں کہا۔ بعض دفعہ کچھ کہنا اتنا ضروری بھی کہاں ہوتا ہے...... اُس نے ہولے سے اُس کے ہاتھ پر ڈھارس سے ہاتھ رکھ کر اپنی اس طرح کی اٹینشن ظاہر کی، جس کی شہریار عبدالرحمٰن کو توقع تھی اور ضرورت بھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یونیورسٹی کے بارے میں تازہ ترین معاملات پر گفتگو جاری تھی کہ اچانک سالار بھائی کی خشمگیں آنکھیں ان دونوں پر آ جمیں۔

"دانیا! تمہیں شیری کو بلانے کے لئے بھیجا تھا یا خود بھی اس کی بکواس میں مگن ہونے کا کہا تھا؟ وہاں سب کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ شیری کی آمد اتنی اہم نہیں، جتنی تمہاری۔ نو اور مما دونوں اس معاملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، تمہیں اس کی اہمیت کا احساس ہے؟"

شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "جاؤ لٹل ڈول! سُنی بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میری آمد کہیں بھی ضروری نہیں۔"

دانیا نے کرب جمی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اس کی نمی میں پھر سے پگھلنے لگا۔

"اچھا گڑیا! تم چلو، میں آتا ہوں۔ دراصل شرٹ بہت شکن آلود ہے، اسے چینج کرنا ضروری ہے ناں۔"

دانیا، سالار عبدالرحمٰن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ دونوں کو جاتا دیکھ کر نئے سرے سے سگریٹ سلگانے لگا۔ پھر ڈرائنگ روم میں جس وقت پہنچا، اس وقت وہ سب جانے سے پہلے کے رسمی جملے ادا کر رہے تھے۔

"کبھی آپ بھی آئیے یہاں۔ اتنے چکر لگا لئے ہم نے۔ سچ بتایئے بھابی! کیا واقعی آپ کا دل ہمارے گھر آنے کو نہیں کرتا؟" بیگم عابد نے محبت سے مما کا ہاتھ تھام کر لگاوٹ سے کہا اور مما، انہیں مصنوعی لگاوٹ دکھاوا بہت اٹریکٹ کرتا تھا۔ دراصل جس قسم کی گیدرنگز میں وہ اُٹھتی بیٹھتی تھیں، وہاں ویسے ہی روپے نوٹ کیے جاتے تھے۔ کس نے کتنی مرتبہ آپ کو توجہ سے دیکھا، کس کی پراپرٹی لسٹ کس سے زیادہ ہے، کس کے تعلقات کہاں سے کہاں تک ہیں اور کس کس جگہ آزمائے جا سکتے ہیں......کام نکلوانے کا دوسرا نام اپر کلاس ریلیشن شپ این کیٹ تھا......

شہریار مما کی اس عادت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا۔ پاپا نے ایک نظر اُسے خفگی سے دیکھا اور پھر بہت غیر متوقع اُسے آواز دی۔

"ان سے ملئے......یہ شہریار ہے میرا ذرا عام ڈگر سے ہٹا ہوا بیٹا......دوسروں سے کچھ الگ سوچتا ہے۔ اور سچ پوچھئے مجھے اس کی یہی عادتیں اچھی لگتی ہیں۔ محبت اور کیئر کا دوسرا نام شہریار عبدالرحمن ہے۔"

پاپا نے ہاتھ کھول کر اس کے لئے ایسی وارفتگی دکھائی کہ ایک لمحے پہلے کا سالار بھائی کا مس بی ہیوا سے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ان کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

اُسے دیکھ کر جہاں بیگم عابد اور مسٹر عابد سمیت ماریہ کی آنکھوں میں رونق آئی تھی، وہیں سالار بھائی کے تیور بگڑ گئے تھے۔ انو نے اُس کے چہرے سے نظر ہٹا کر ڈرائنگ روم میں رکھے کرسٹل کے واز پر ٹکا دی تھی اور رہی مما تو وہ ہمیشہ ہی کی طرح نیوٹرل کھڑی تھیں۔ وہ اُسے پسند کرتی تھیں، نہ ہی ناپسند......ہاں، کبھی کبھی اپنے سب بچوں کی کارکردگی سے اس کی کچھ زیادہ بہتر کارکردگی دیکھتیں تو چڑ کر ملازمین کی ڈانٹ میں در پردہ کچھ نہ کچھ رکھ کر اس کی طرف بھی جھڑکی پارسل کرتی رہتیں، سو وہ بور ہو کر مہمانوں کو دیکھ رہا تھا۔ حمزہ عابد اُس کی وجہ سے پھر سے بیٹھ گیا تھا۔ عدیل بھائی نے وانیا کو، ماریہ کو اپنا کمرہ دکھانے کی فرمائش کر دی تھی، اس لئے وہ مہمان جو جانے کے لئے رسمی جملے ادا کر رہے تھے، پھر سے بیٹھ گئے تھے۔ مسٹر عابد اور بیگم عابد اس سے پچھلے دنوں ہونے والی سیاست میں قلابازی کی بابت دریافت کر رہے تھے۔ عدیل بھائی ہنس ہنس کر کم سے کم لفظوں میں اس کارکردگی کی وضاحت کر رہے تھے اور وہ عدیل بھائی کی جانفشانی کی داد دے رہا تھا۔ اتنا بولنا وہ کبھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت اچھا تو نہیں بولتا تھا لیکن بہرحال کم لفظوں میں بات کہنے کی کوشش کیا کرتا تھا، اس لئے باتونی لوگوں پر اُس کو ہمیشہ رشک آتا تھا۔

عدیل بھائی، مسٹر عابد سے مصروفِ گفتگو تھے۔ مما اور انو بیگم عابد کو بور نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔ رہ گئے پاپا تو وہ معذرت کر کے کچھ فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھے اپنے موبائل کے ذریعے اپنے ایک کلائنٹ کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں تھے۔

کمرے کا سارا منظر آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ لفظ یہاں سے وہاں تیرتے پھر رہے تھے، یوں جیسے مجسمے بیٹھے ہوں اور الگ سے کوئی ٹیپ چل رہی ہو۔ کسی کے چہرے پر اطمینان نہیں تھا۔ سب نے خود کو

مصنوعی مصروفیت سے ہم آغوش کر رکھا تھا۔
کوئی لفظ، کوئی جذبہ دل سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو یہ اسٹیج ہوتا دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے اُٹھ کر واپس اوپری منزل کی ٹیرس کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہاں پاپا کی چھوٹی سی لائبریری تھی، جس میں وہ اکثر گم ہونے کی کوشش کرتا یا کبھی کوئی تیز نظر یا سخت لفظ سنے بغیر بابا سے محبت بٹورنے کا دل کرتا تو چپکے سے یہاں آ کر پاپا کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس کمرے میں شہریار عبدالرحمن، وانیا اور جازی کے سوا کسی کو آنے کی ہمت تھی نہ اجازت۔ کیونکہ پاپا ہر کام پوری یکسوئی سے کرنے کے عادی تھے لیکن ان تینوں کے لئے کچھ الگ سا سافٹ کارنر ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ عدیل بھائی تو یہ محبت مانتے تھے، سمجھتے بھی تھے لیکن سالار بھائی اس بات میں ہمیشہ اختلافی پہلو نکال کر ماحول کو کبھی کبھار گرما دیا کرتے تھے۔ مگر وہ اس گرما گرمی کی پرواہ بہت کم کرتا تھا۔
سیڑھیاں طے ہو چکی تھیں مگر وہاں اُسے کسی کے ہونے کی اُمید کم تھی۔ وہ تو وانیا کے کمرے میں اس خیال سے نہیں گیا تھا کہ وہاں وانیا اور ماریہ محو گفتگو ہوں گی۔ لڑکیوں کی باتوں میں دخل در معقولات کرنا سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ مگر یہاں بالکل غیر متوقع ماریہ کو اکیلے دیکھ کر اُسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔
"ہیلو! کیسی ہو ماریہ؟" اُس نے گلا کھنکھار کے اپنی آمد کا اعلان کیا اور ماریہ عابد جو گنگنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، چونک کر مڑی۔
ماریہ کے چہرے پر شہریار کے لئے بلا کی دلچسپی تھی۔
"ارے آپ......؟" وہ فقط کہہ کر ماریہ کی باتوں میں خاموشی کا وقفہ آیا۔ یونیورسٹی میں بھی بہرحال دونوں کی بات چیت صرف ہیلو ہائے سے زیادہ نہیں تھی، اس لئے ہلکی سی اجنبیت ہمراہ کھڑی تھی۔
"وانیا کہاں ہے؟" بہت دیر بعد اُسے معقول سوال سوجھا تو ماریہ مسکرا کر بولی۔
"کافی بنانے کچن میں گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، وہ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔"
"واقعی، اس میں کیا شک، وہ واقعی بہت اچھی کافی بناتی ہے۔" شہریار کے لہجے میں بہن کے لئے حد درجہ پیار چھلکتا تھا۔
ماریہ اُسے مسمرائز ہو کر دیکھنے لگی، پھر مسکرا کر مکرر بولی۔ "مجھے لگتا ہے، آپ کو وانیا سے بہت محبت ہے۔"
"ویسے تو یہ انتہائی پرسنل سوال ہے، لیکن بہرحال دوستی کی وجہ سے کوئی قباحت نہیں یہ کہنے میں کہ مجھے اپنی بہن سے دنیا کے ہر بھائی سے زیادہ محبت ہے اور یہ نہیں کہ یہ میری حساسیت کی وجہ سے ہے، جو

مجھے رشتوں سے فطری ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ہی اتنی پیاری ہے کہ اُس سے کوئی بھی محبت کرنے میں خود کو مجبور پاتا ہے۔ اگر کوئی بہن رات کے دو بجے صرف ایک جملے پلیز! مجھے کافی بنا دیا مجھے کھانا لا دو، بہت بھوک لگی ہے، سن کر اپنے بستر سے آنکھ بند کر کے اُٹھ جائے تو پھر میرا دل کیوں نہ چاہے کہ میں اُس کی پروا کروں، محبت دوں۔"

"واقعی، دانیا بہت لکی ہے، اُسے اتنی ڈھیر ساری محبتیں ملی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ جیسا بھائی ہے اُس کے پاس۔" ماریہ نے رشک سے کہا تو وہ کہنے لگا۔

"پلیز، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ یہ تو فطری تقاضہ ہے، آپ سے جو محبت کرے، آپ اس سے محبت کریں۔ لیکن ہاں، یہ اضافی ہے کہ میں ان سے بھی محبت کرتا ہوں، جنہیں مجھ سے محبت نہیں ہوتی۔"

"وہ خوش قسمت ہوتے ہیں، جنہیں آپ محبت کرتے ہیں۔"

شہریار نے چونک کر ماریہ عابد کو دیکھا، یہ کسی بھی طرح کا اضافی جملہ نہیں تھا بلکہ اس جملے سے سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھوں میں کچھ جگمگایا تھا...... کوئی حسرت نما امید...... یا خوش گمان سی کوئی ان کہی......

وہ آدمی تھا اور آدمی ان باتوں پر بہت کم توجہ دیا کرتے ہیں۔ ان میں یہ اضافی خوبیاں آہی جاتی ہیں۔ سو اُس نے فوری طور پر فضا کو بدلنے کے لئے یونیورسٹی اور پڑھائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ پھر وہ کرسیوں پر بیٹھے دھواں دھار بحث کر رہے تھے جب اچانک دانیا ٹرے میں تین کپ لئے چلتی چلی آئی۔ شہریار نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتہ، تیسرے کپ کا اضافہ ہو جانا چاہئے؟"

دانیا مسکرا کر بولی۔ "اس طرح، جب آپ کسی بے وقوف لڑکی کا ذکر کر رہے تھے، میں اُس وقت دو کپ لے کر آئی تھی، پھر بھائی کو اتنا محبت کے سمندر میں گئے گوڈے سمیت اُترے دیکھا تو پلٹ جانا پڑا۔ اب ماریہ سے آپ ایویں جھوٹ موٹ کا دو بجے کا محبت کا تذکرہ کر رہے تھے تو کچھ تو آپ کی سچائی دکھانے کے لئے عمل کرنا تھا نا مجھے۔"

"یہ سب جھوٹ تھا؟" ماریہ، شہریار کی طرف حیرت سے پلٹی اور شہریار ہنسنے لگا۔

"بکواس کر رہی ہیں۔ دراصل یہ نیک کام کر کے ان کو شو آف کرنے سے کتراتی ہیں۔"

دانیا نے آنکھیں دکھا کر اُس کے کندھے پر چٹکی بھری اور ماریہ ہنسنے لگی۔ شہریار کی شکل ہی کچھ ایسی مسکین ہو گئی تھی۔

"پلیز دانی! بھائی پر اتنا ظلم نہیں کرتے۔"

”اچھا، پھر کتنا ظلم کرنا چاہیے؟“ وانیا نے جواباً مسکرا کر پوچھا۔

”ظلم اتنا کرو کہ بے چارہ بھائی برداشت کر سکے۔“ شہریار منمنایا۔

وانیا نے فرمانبرداری سے سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔“

پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید باتیں کرتے، عدیل بھائی اُنہیں بلانے آ گئے۔ ”چلو بچے! آپ کے پاپا آپ کو بلا رہے ہیں۔“

ماریہ دوپٹہ درست کرتی نیچے اتری۔ شہریار اور وانیا ساتھ تھے۔ عدیل بھائی، شہریار کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں، اُنہیں کیا سوجھی، اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دل میں مچلتا سوال کوڈ کیا۔ شہریار نے ”توبہ بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔“ کہہ کر جان چھڑائی۔ عدیل بھائی مسکراتے رہے۔ یوں، جیسے اُنہیں اُس کی بات پر آدھا یقین آیا ہو، آدھا نہیں۔۔۔۔۔۔

اور گھر سے نکلتے ہوئے حمزہ عابد، وانیا کی ممی کے ڈھکے چھپے لفظوں میں چھپی پسندیدگی کو پورے یقین میں سمیٹ کر گھر سے جا رہا تھا۔ پھر بابا اور مما باتیں کر رہے تھے اور مما نے بہت ستائش سے کہا تھا۔

”عبدالرحمن صاحب! مجھے حمزہ سے اچھا لڑکا اپنی وانیا کے لئے پھر نہیں ملے گا۔ آخر آپ کو اس معاملے میں کیا پرابلم ہے؟“

مسٹر عبدالرحمن نے آہستگی سے بیگم کی طرف دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔

”کوئی شک نہیں کہ حمزہ عابد ایک آئیڈیل پرسنالٹی ہے۔ لیکن پتہ نہیں، میری چھٹی حس کسی خطرے کا اعلان کرتے نہیں تھک رہی۔“ بیگم کے تیور چڑھتے دیکھے تو مسکرا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے بھئی، کچھ وقت سمجھنے کے لئے دو تو۔ تم تو ہتھیلی پر ہی سرسوں جمانے لگی ہو۔“

مما نے آدھی ہاں پر سکون کا سانس لیا اور شہریار دبے قدموں واپس وانیا کو تنگ کرنے کے خیال سے اُس کے کمرے کی طرف چلتا چلا گیا۔



حمزہ عابد، فیملی کو گھر چھوڑ کر گاڑی واپس موڑ گیا تھا۔ راستے میں اُس کے موبائل پر میسج ٹون آئی تھی اور اب وہ تیزی سے ہوا میں اُڑا جا رہا تھا۔ اُس کا رُخ درمیانے درجے کے ہوٹل کی طرف تھا۔

یہ ان دونوں کا خیال تھا کہ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے اُنہیں اپنی کلاس کے اُٹھنے بیٹھنے کی جگہوں میں قطعاً نہیں ملنا چاہیے، جب تک وہ اپنے وعدے پر پورا نہ اُتر جائے۔ وہ گرمجوشی

سی دل میں اُبھری تھی کہ اُسے اس جذبے کو نام دینا دُشوار لگ رہا تھا۔ اُس کے فرینڈز کی فہرست بہت طویل تھی۔ سب کے ساتھ بہت اچھا وقت بھی گزرا تھا لیکن نیلم کے متعلق وہ تنہائی میں جب بھی سوچتا، ایک نئے لطف سے آشنا ہوتا تھا اور اس وقت وہ اُسی کے پیغام پر سر کے بل دوڑا جا رہا تھا۔

پھر آدھے گھنٹے کا راستہ وہ بیس منٹ میں طے کر کے ہوٹل رونق پر پہنچا تو ویٹر کی رہنمائی میں کپل کیبن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سامنے پردہ سرکا کر اندر داخل ہوا تو آنکھوں کی روشنی کئی گنا بڑھتی چلی گئی تھی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ، وہ تو لگتا تھا وہ لبوں پر چپک ہی گئی ہے۔

"تم میری نیلم! تم نے جیسے ہی پیغام دیا، میں نے ایک سانس بھی زیادہ نہیں لیا۔ پیغام کی رفتار سے دوڑا چلا آیا ہوں۔"

سامنے خوب صورت وجود میں ہنسی کی لہر پھوٹ پڑی۔ نقرئی ہنسی نے جیسے اُس کی سماعتوں کو مٹھاس سے بھر دیا تھا۔

اُس نے بے ساختہ اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر جذب سے بولا تھا۔

"تم سے جب ملتا ہوں نیلم! سوچتا رہتا ہوں، تم سے بات کروں، تمہیں دیکھوں یا تمہاری ہنسی میں ڈوب جاؤں۔"

"ڈوب جاؤ تو بہتر ہے، ورنہ اس سمندر سے اُبھر سکے تو سدا پیاسے ہی رہ جاؤ گے۔ پھر مت کہنا، یہ صحرا میرا نصیب کیوں ہوا۔" نیلم نے ادائے بے نیازی سے کہا اور وہ مخمور لہجے میں پکارا۔

"تمہاری چاہت میں صحرا بھی نصیب ہو جائے تو خوش قسمتی ہے میری۔ مگر وہ لمحہ تو آنے دو۔ ڈوب جانے کا اشارہ تو کرو۔ جو انکار کرے، وہ کافر۔"

ایک نیا قہقہہ پہلی نکھری ہنسی سے گلے ملنے لگا تھا۔ حمزہ عابد نے موقع دیکھ کر بے تکلف ہونے کی راہ پہ پہلا قدم رکھا تھا کہ اچانک نیلم کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھا گئی۔ "تمہیں جو کام کہا ہے، وہ تم ابھی تک کر تو نہیں پائے ہو۔ پھر میں کیسے تمہاری خواہش پوری کروں؟"

حمزہ عابد کے چہرے پر پہلے سے زیادہ خمار آ گیا اور وہ مسکرا کر بولا۔ "صرف باقاعدہ منگنی کا فنکشن ہونے کی دیر ہے، اس کے بعد تم جانتی ہو، میں کتنا شارپ ہوں۔"

"مجھے تمہاری شارپنس سے کیا سروکار، جب تک میں اُس لڑکی کا سر جھکتے نہ دیکھ لوں۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو میری روح پر بارش کی پہلی پھوار کی طرح ہیں......... تم......... تم نہیں جانتے، امارت، دولت کے باوجود وہ اپنے وجود کے ساتھ ایک سوال ہو جائے گی تو میں کسی سے ایک سوال ضرور پوچھوں گی۔"

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں، وہ کیا سوال ہوگا؟“

”ہاں، کیوں نہیں۔“ اُس نے فراخ دلی سے اُسے دیکھا اور کہا۔ ”مجھے کسی سے پوچھنا ہے، اچھی تربیت، اعلیٰ تعلیم کے باوجود غلط راستے کی راہی کیوں بنی؟ میں اس محبت کا مذاق جو کسی نے ماضی میں کسی پر اُنڈیلا تھا اور پھر ماضی نے خود کو دہرایا تھا تو کیوں؟ بس سفاکی کے اسی زہر کو اُس پر واپس اُنڈیلنا چاہتی ہوں۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں، وہ کون تھا......کیا شہریار......؟“

وہ یوں ہنسنے لگی، جیسے کسی کی بچگانہ بات پر ہنسنے کو دل چاہے۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”شہریار! اُس کا حسب کا گوشوارہ اور ہے میری جان! بس تم یہ دردسری مت پالو۔ جو کہہ دیا ہے، وہ کرو تو پھر میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے تم پر کھل جائیں گے۔“

حمزہ عابد کی آنکھوں میں اطمینان یوں ہلکورے لینے لگا، جیسے وہ گھر اُس کے لئے کھل جا سم سم کی طرح فینٹسی سمیٹے کھڑا تھا۔ حمزہ عابد کھانے کا آرڈر دے رہا تھا۔ پھر اُن دونوں نے کھانے کے بعد کافی پی تھی۔ باہر نکلے تھے کہ اچانک اُسے اچنبھا ہوا تھا۔ اُس کی جان پہچان والا یہاں کون آ گیا تھا۔ وہ کتراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اُف یہ مڈل کلاس کی بے تکلفی کی عادت......“ اُس نے چڑ کر سر موڑا اور چہرے کے تاثرات تیزی سے بدل ڈالے۔

سامنے عاطف بیگ دانت نکالے کھڑا تھا۔ شہریار سے بنا کر رکھنے کے لئے اُس کے دوستوں سے بگاڑنا دانش مندی نہیں تھی۔

”ارے یار! تم یہاں......ہمارے علاقے میں؟“ دوستانہ لہجہ پھیکا اور بے تکلف ہو گیا تو اُسے زبردستی مسکرانا پڑا۔ بات مسکراہٹ سے نہ چلی تو اُس نے گلا کھنکھار کے کہا۔

”بس یار! یونہی یہاں سے گزر رہا تھا تو کافی کی اتنی طلب ہوئی کہ میں اندر چلا آیا۔ یہاں پتہ چلا، واقعی اس ہوٹل کی کافی بہت مزے کی ہوتی ہے۔“

”کافی......اماں یار! یہاں کا کھانا بہت بیسٹ ہوتا ہے۔ تم کبھی وہ بھی ٹرائی کرو۔ کم پیسوں میں اتنا اچھا لنچ اور ڈنر کہیں اور نہیں مل سکتا۔“

”اچھا......لیکن آج میں نے صرف کافی ہی ٹرائی کی ہے۔“

وہ کہہ کر تھما ہی تھا کہ چور کی طرح پکڑا گیا۔ کیونکہ ویٹر کھانے کا بل پلیٹ میں رکھ کر اُس کے سامنے لے آیا تھا۔ عاطف بیگ کو خدا ایسے مواقع روز دیتا۔ فوراً جناتی قہقہہ لگا کر بولا۔

”بوچیچڑ ......جھوٹ بولتے ہو۔“ پھرہنس کر بولا ”اچھا، اچھا......تم کلاس کانشس ہو رہے ہو گے۔لوگ جانیں گے تم نے یہاں کا ہائی جینک فوڈ کھالیا ہے تو شاید ماسک لگا کر تم سے معانقہ کریں۔“
لحہ بھر کو خاموش رہا، پھر زور سے ہاتھ تھام کر مکر بولا۔”یار جانی! یہ کلاس کا ختّاس فضولیات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے، میں پکا مسلمان کمیونسٹ ہوں۔“
”کمیونسٹ ہو یا مسلمان؟........دونوں چیزیں ایک جگہ نہیں مل سکتیں۔“ اُس نے ویٹر کی پلیٹ میں بل کے پیسے رکھ کر کہا۔
اور وہ ہنس کر بولا۔”انصاف پسندی، ہر انسان کو ضرورت کی ہر چیز مساوات سے تقسیم ہو، سب اللہ کے ورکر ہوں، کوئی حاکم نہ ہو، سوائے خدائے بزرگ و برتر کے، یہ اسلام کا ماخذ ہے۔ بس بدلیس والوں نے چرا لیا، انقلاب لے آئے۔ اور ہم ٹھہرے مسلمان۔ سو ابھی تک اس کے لئے شور کر رہے ہیں تا کہ بتا سکیں، خاموشی کتنی بڑی نعمت ہے۔“
حمزہ عابد کو اس کا فلسفہ سمجھ نہیں آیا، سو وہ کندھے اچکا کر ہوٹل سے نکلتا چلا گیا۔ لیکن شہریار سے ملاقات ہوئی تو سب سے پہلے عاطف بیگ نے یہی پوچھا۔
”شیری ڈیئر! یہ تمہارے ہونے والے بہنوئی صاحب آج کل رونق جیسے ہوٹل میں پائے جانے لگے ہیں۔ پتہ کرواؤ کہ اتنا کلاس کانشس بندہ مڈل کلاس کی گلیوں کی خاک کیوں چھان رہا ہے۔“
شہریار جو نیا سگریٹ سلگانے میں ساری توجہ صرف کر رہا تھا، چونک گیا۔ سامنے کی بات تھی، وہ حمزہ علی جو عاطف بیگ اور سلامہ سے صرف دور کی سلام دعا رکھنے کا قائل تھا، گروپ فرینڈ شپ کے باوجود شہریار کی وجہ سے یہ رشتہ نبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ شخص رونق ہوٹل میں دکھائی دے جائے تو یہ بات عام تو نہیں تھی۔
”تم نے اُسے کب دیکھا تھا؟“
”کل........کل یار! ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پہ۔ اور........“
اس نے کچھ کہنے سے پہلے خاموشی کا وقفہ لیا۔ شہریار کو اس کی یہ بات بہت کھلی تھی۔ زور سے کمر پر دھمو کا جڑ کر بولا۔
”تمہاری یہ سسپنس کی عادت! کسی دن قتل ہو جاؤ گے۔ چھوڑو اس نامعقول عادت کو اور جلدی سے بتاؤ اس ’اور‘ کے آگے کون سی کہانی چھپی ہے؟“
”دراصل شیری! میں ابھی کچھ شک جیسی کیفیت کا شکار ہوں، سو سوچتا ہوں، پہلے واقعی معاملہ سمجھ لوں تو تمہارے آگے کھولوں۔“
شہریار نے آنکھیں دکھائیں، پھر بھی نہیں مانا تو غصے سے بولا۔”کوئی بات چھپانے کا کیا مطلب ہے یار! تجھے معلوم ہے، یہ میری دنیا کی زندگی اور خوشی کا سوال ہے۔“

عاطف بیگ نے سنا تو گلا کھنکھار کے مدھم کہنے کی کوشش کی۔
''اسی لئے تو کچھ کہنے سے کتراتا ہوں۔ ویسے یہ بات میں نے دو ایک اور فرینڈز سے سنی ہے کہ وہ اکثر کسی پری تمثال کے ساتھ گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے بھی کل شک سا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ پری تمثال اُس کے ساتھ یہیں کسی کیبن سے نکلی تھی۔ میں نے اُسے آواز دی تو لڑکی نے شارپ نس سے حمزہ عابد سے لاتعلقی اختیار کر لی اور اس سے آگے گزرتی چلی گئی۔ مگر شیری! کیا کلاس کی لڑکی تھی۔''
شہریار اُسے خالی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی اُس نے اُس کے ذہن میں ایک سوال ڈالا۔ ''عدیل بھائی پولیس فورس میں ہیں۔ تم تو آسانی سے اُن کا فیملی بیک گراؤنڈ جان سکتے ہو، وہ کون ہیں، معاشرے میں اُن کا کیا مقام ہے؟''
شہریار نے سر ہلایا۔ سامنے کی بات تھی حمزہ عابد کو وہ سب اتنا ہی جانتے تھے، جتنا یونیورسٹی میں شو آف کرتا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا سمبل بنا وہ عیش سے گھومتا۔ اُس کے پاپا کیا کرتے ہیں؟ وہ کون ہیں؟ آج تک وہ ان کے گھر تو گئے نہیں تھے کہ وے آف لائف کا اندازہ ہو سکتا۔ سوال ضرور اُبھرا تھا اُس کے ذہن میں، لیکن وہ اس سلسلے میں عدیل بھائی کو انوالو کر کے معاملے کو سنگین نہیں کرنا چاہتا تھا، سو اُس نے سوچوں کو بریک دے کر عاطف بیگ کا ہاتھ تھاما۔
''یہ کام تم کرو گے۔ اب کبھی وہ کہیں نظر آئے تو مجھے فوراً کال کرنا اور فیملی بیک گراؤنڈ جاننا تیرے لئے کوئی مشکل کام نہیں، میں جانتا ہوں۔''
عاطف بیگ نے مصنوعی خفگی سے اُسے دیکھا، پھر روٹھے پن سے بولا۔ ''تجھے کیا میں شادی دفتر والا لگتا ہوں، یا خالہ صغریٰ؟''
''دونوں میری جان! یہ تیری اور میری بہن کے مستقبل کا سوال ہے۔ اور میں جانتا ہوں، مجھ سے زیادہ وہ تجھے عزیز ہے دانیہ۔''
عاطف بیگ کے کندھے فوراً جھک گئے مگر اُس نے پھر بھی کسمسا کر کہا ضرور۔ ''تم بہت شارپ ہو، فوراً جذباتی غنڈہ گردی دکھا جاتے ہو۔ ویسے اموشنل بلیک میلنگ کا اُردو ترجمہ یہی ہوگا ناں؟''
ستانے کو بات کو طول دیا اور شہریار نے کندھے سے تھام کر محبت سے کہا۔ ''میری جان! ابھی کام نکلوانا ہے تجھ سے۔ اس لئے اُردو کی لغت کی اور انگلش ڈکشنری کی جو بھی ڈیفینیشن دے گا، درست ہوگا۔''
''اچھا جی!'' اُس نے کان پکڑ کر مروڑا۔ شہریار نے قہقہہ لگایا مگر پتہ نہیں کیوں، قہقہے کا سانس آدھا ہی رُک گیا تھا۔ سلامہ بظاہر اُن کی زندگی سے نکلا تھا، دل سے تو نہیں۔ اور دل کی ہر خوشی میں وہ اُسے بہت یاد آیا کرتا تھا۔

”سلامہ کو مس کر رہا ہے ناں؟“ عاطف بیگ نے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر ٹھیک اندازہ لگایا۔ سو اُس نے سر جھکا لیا پھر مدھم ہو کر بولا۔

”پتہ نہیں سلامہ اب کیسا ہوگا۔ تیری بھی تو اُس سے علیک سلیک نہیں رہی۔ میں نہیں ہوں، تمہیں تو اپنا ساتھ اُس کے ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔“

عاطف بیگ نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا پھر پشت موڑ کر بولا۔

”میں نے اُس دن تم سے جھوٹ بولا تھا شیری!...... دراصل سلامہ نے ہی مجھ سے مس بی ہیو کیا تھا۔ اُس کا خیال ہے، میں بہت لاأبالی انسان ہوں، جو زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور اسے اب وقت ضائع نہیں کرنا ہے۔ شہریار! وہ پورا کا پورا بدل گیا ہے سائمہ کے بعد سے اُس نے دنیا کو دنیا کی طرح دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اُس نے اس علاقے سے گھر بدل لیا ہے۔ کہیں فلیٹ میں رہتا ہے۔ رات کو پڑھ بھی رہا ہے، کالم بھی لکھنے لگا ہے۔ بہت اچھے لوگوں کے ساتھ اثر و رسوخ بڑھا چکا ہے۔ اُس نے اپنا قلم فار سیل کر رکھا ہے۔ کبھی کسی سیاسی بندے پر کوئی جلتا بھنتا کالم لکھ ڈالتا ہے۔ وہاں سے اعتراض ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کالک کو دھونے کے لئے اچھے الفاظ کی پیشکش کر دیتا ہے۔ معاملہ طے پا جاتا ہے تو نیک نام سے اسی اخبار کو کالم بھیج دیتا ہے۔ شیری! وہ بہت بدل گیا ہے۔ کہتا ہے، دنیا میں صرف دولت کی عزت ہے اور کوئی سوچ، معیار یا اخلاقی اقدار کی بات کرتا ہے تو مجھے اب ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ دنیا میں ان چیزوں کی کہیں ضرورت نہیں ہے۔ وہ مشین بن گیا ہے۔ اُس نے تو میری مذاق میں کہی پلاننگ کو مطمع نظر بنا لیا ہے۔“

شہریار نے تاسف سے اُس کی باتوں کو سنا تھا۔ دماغی رو پھر سے سائمہ کی طرف چلی گئی تو وہ ملاقات بھی یاد آ گئی، جو دوسرے ہی دن اُس نے جا کر اُس سے کی تھی۔ وہ بہت تپا ہوا اُس تک گیا تھا۔ لیکن اُس کا جواب تھا۔ ”یہ کراچی ہے۔ یہاں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے بہت سے ٹھکانے ہیں اور تم جانتے ہی ہو ان سب لڑکیوں کے نام اور کہانیاں یاد رکھنا فرض نہیں ہیں۔“

”لیکن وہ تمہارے بہکاوے پر ہی گھر سے گئی تھی۔“ اُس نے پھر سے سوال داغا تھا۔

تب اُس کی ہنسی کانوں میں چبھنے لگی تھی۔ ہنسی رکی تو اُس نے اگلا تیر چھوڑا۔ ”وہ کم سن بچی نہیں تھی کہ بہکائی جائے۔ وہ بالغ لڑکی تھی۔ اُس نے زندگی کو اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب رہی یا ناکام، میں نہیں جانتی۔ رہی ماڈلنگ تو تم جانتے ہو، وہ اتنی خوب صورت بھی نہیں تھی کہ ماڈلنگ میں سروائیو کر سکتی۔ اب گھر سے نکل کر اُس نے کیا ذریعہ معاش اپنایا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ رہی سوالات کی بھرمار تو تم جانتے ہو، مجھے سوالات کے جوابات دینے کی عادت نہیں۔ اب تک تمہاری باتوں کے جواب بھی اس لئے دیئے ہیں کہ مجھے تم سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔“

''محبت........ تمہیں معلوم ہے، محبت کیا ہوتی ہے؟''

''نہیں........ لیکن تم تو جانتے ہو۔ بس یہی میرے لئے کافی ہے۔''

شہریار اُسے دیکھتا رہ گیا۔ گھر بچانے کے چکر میں اُس نے آگ اپنے دامن میں بھر لی تھی اور اُس نے اپنے آپ کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔ کسی ایک کی موت اگر بہت سوں کی خوش و خرم زندگی کا عندیہ دے سکتی تھی تو........ تو وہ ایسا ہی تھا کہ اس موت کو جائز سمجھتا۔

اور یہ موت اُس نے قبول کر لی تھی۔

اس کی آنکھیں اُس کے چہرے پر تھیں، جب جانانہ نے اترا کر کہا۔

''مجھے معلوم ہے، میں بہت خوب صورت ہوں۔ مگر جب تم اپنی ساحر آنکھیں مجھ پر ڈالتے ہو تو مجھے لگتا ہے، میری خوب صورتی کا سب سے خوب صورت اعتراف میرے سامنے ہے۔''

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ دیر وہاں وقت گزاری کرتے سفید ماربل کی عمارت سے نکلتا چلا گیا تھا اور آج........ تین ماہ بعد ایک بار پھر سے مائدہ کا کپ اُسے اندر تک شرمندہ کر گیا تھا۔

عاطف بیگ نے اُسے کہیں دُور نکلتا دیکھا تو فوراً ہاتھ تھام کر واپس بلا لیا۔ اس نے اُس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کیا تو گہری سانس لے کر حال میں لوٹ آیا۔ پھر تاسف سے بولا۔

''پتہ نہیں، وہ بے وقوف لڑکی کہاں ہوگی۔ میں نے اپنی سی کوشش کر لی مگر کہیں نہیں مل سکی وہ۔ رہی جانانہ، تو تم تو جانتے ہو، اُس کے رسوخ کتنے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوں، تب بھی اس کے ساتھ تعلق نبھانا میری مجبوری ہے۔ ابھی اس سے اپنا کام نکلوانا ہے، اس لئے سختی بھی نہیں کر سکتا۔''

''ہاں، وہ معاملہ کس کل بیٹھا، تو نے بتایا ہی نہیں پھر۔'' اُس نے کچھ یاد آنے پر اُسے نئے سرے سے متوجہ کیا۔

شہریار نے اُسے دیکھ کر گہری سانس کھینچی، پھر بے بسی سے اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میری پوری کوشش تو یہی ہے، کسی طرح سالار بھائی اپنا روٹ بدل لیں۔ لیکن یار، یہ جو جانانہ ہے ناں، یہ ایسی ساحرہ ہے کہ سنی بھائی اس کے روپ کے جال سے نکل ہی نہیں پا رہے۔ انہیں تو اس بات کا بھی ڈر نہیں ہے، ان کی ملاقاتوں کا حال کوئی جان بھی سکتا ہے۔ ہائی سوسائٹی میں وہ اُس کے ساتھ موو کرتے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح اُس پر بہاتے ہیں۔ پاپا تک معاملہ ابھی تک پہنچا نہیں ہے۔ کچھ فرینڈز نے اُنہیں دبی دبی زبان میں کہنے کی کوشش بھی کی مگر پاپا بزنس میں گھر میں اتنا مصروف رہتے ہیں کہ وضاحت کی

تہہ تک پہنچتے ہی نہیں، یا شاید وہ جان کر اگنور کر رہے ہیں۔ اُدھر عائشہ بھابی ہیں، ہر روز اُن کا رونا دھونا فون آجاتا ہے۔ میں سخت قسم کی ٹینشن میں ہوں، سمجھ نہیں آتا، کون سی جادو کی چھڑی گھماؤں کہ سب کچھ بدل جائے، اپنی مرضی کا ہو جائے۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ وہ ان تین ماہ میں شہریار کے جتنا قریب آگیا تھا، اس کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ بہت کم کو بہت زیادہ سمجھے۔ سو وہ معاملہ فہمی سے سر ہلا کر اُسے دیکھنے لگا، پھر کچھ ساعت بعد بولا۔ "آج گھر نہیں جانا تم نے؟ اور یہ دانیا، یہ ابھی تک لائبریری سے نکلی کیوں نہیں ہے؟"

شہریار نے پھیکی مسکراہٹ سے اُسے دیکھ کر کہا۔ "پڑھاکو بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے تمہارے جیسے نکمے لوگ بس کلیئر ہی ہو جاتے ہیں، وہی بہت ہے۔"

عاطف بیگ نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ پڑھاکو بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ساری محنت، جو اپنی بجائے تم ان پر کر گزرتے ہو، وہ محنت ایسی بھی گئی گزری نہیں کہ اسے سراہا نہ جائے۔ سچ پوچھو تو دانیا کی پڑھائی میں ننانوے فیصد تمہاری کارکردگی کا ہاتھ ہے۔"

"بس، اب بکواس نہیں۔ اگر وہ ذہین نہ ہو تو میں لاکھ سر مار کر بھی اُسے کچھ پڑھا نہیں سکتا۔" ہنس کے اُس نے بات ختم کی۔

وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، یہاں تک کہ آدھے گھنٹے بعد شہریار نے اُس کے موبائل پر مسڈ کال دی۔ لیکن مسڈ کال کے باوجود وہ مزید ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آسکی تھی۔ عاطف بیگ اُسے دیکھ کر منہ بسورنے لگا تھا۔

"سویٹ سسٹر! تم ہوا کھا کر بھی جی سکتی ہو، لیکن ہم زمینی لوگ ہیں، ہمیں بھوک پیاس سب ستاتی ہے۔ کیوں بھول جاتی ہو یہ بات؟"

دانیا عبدالرحمٰن ہنسنے لگی، پھر للچانے کو بولی۔ "سب خطائیں معاف کر دیجئے۔ آج لنچ آپ دونوں کا میرے بی ہاف پر، پزا ہٹ میں......کیسا؟"

شہریار نمرہ اور سالار والے معاملے کی وجہ سے سنجیدہ تھا، اس لئے دونوں کی باتوں میں حصہ لئے بغیر جیبیں ٹٹولنے لگا۔ دانیا نے بے چینی بھانپ لی پھر آگے بڑھ کر بولی۔ "آپ اسموکنگ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے آپ کو ہم سے الگ ہونا پڑے گا۔ بقول آپ کے، بری عادت میں بھی ایک حجاب لازم ہے۔" لمحے بھر کو رکی، پھر محبت سے بولی۔ "آپ اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے کہ اسموکنگ کے دھوئیں سے بھی مجھے تکلیف نہ پہنچے، اس خیال سے اسموکنگ کرتے وقت تنہائی چاہتے ہیں۔ پھر یوں کیوں نہیں ہو سکتا کہ آپ اس بری عادت ہی کو ترک کر دیں۔ اسموکنگ چھوڑنا مشکل ضرور ہے، مگر

ناممکن تو نہیں ہے۔"

عاطف بیگ نے تاسف سے دانیا کو دیکھا۔ دانیا کے دل ٹوٹنے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ ضرور بتاتا کہ شہریار اسموکنگ ہی نہیں، ڈرنک بھی کرنے لگا ہے۔ کچھ دفتری مجبوریوں کی وجہ سے، کچھ جانا نہ پرائی دھاک بٹھانے کے لئے اور کچھ نئے حالات سے ٹینس سچویشن میں خود پر دباؤ کم محسوس کرنے کے لئے...... اُس کا خیال تھا، بے خبری میں جو مزہ ہے، وہ ہوش میں نہیں...... عاطف بیگ اُسے کتنی مرتبہ سمجھا چکا تھا۔ کتنی مرتبہ اُس کی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ شہریار کو چھوڑنے کا ارادہ بھی کر چکا تھا۔ لیکن جب اُس کی خالی زندگی کی طرف نظر کرتا تو اُسے لگتا، سانس لینے کے لئے دوستی کا یہ روزن کھلا رکھنا ہی اس کی مجبوری ہے۔ سلامہ کی طرح اگر وہ بھی اسے چھوڑ گیا تو تنہائی سے اس پاگل شخص کا دل پھٹ جائے گا۔ کوئی کندھا تو ہونا ہی چاہئے، جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے۔

عاطف کی آنکھیں شہریار پر ہی مرکوز تھیں، جب شہریار سے بات ختم کر کے دانیا عبدالرحمٰن نے اُس کا کندھا ہلا کر اُسے ہوش و خرد میں واپس آنے پر مجبور کیا۔ وہ چونک کر دانیا کو دیکھ رہا تھا، جب اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ آپ کیا سوچنے لگے تھے؟ کہیں میرے لیکچر سے آپ بدک تو نہیں رہے کہ شیری بھائی کے ساتھ آپ کو بھی اسموکنگ چھوڑنی پڑے گی؟ ویسے اگر آپ ایسا سوچتے ہیں تو غلط نہیں سمجھتے۔"

عاطف بیگ ہنسنے لگا، پھر رسان سے بولا۔

"ڈونٹ وری سسٹر! مجھے اسموکنگ کی عادت لت کی طرح نہیں ہے۔ میں شہریار کی طرح چین اسموکر بھی نہیں ہوں۔ دن میں دو تین سگریٹ سے زیادہ نہیں لیتا۔ یہ نہیں ہے کہ میں افورڈ نہیں کر سکتا، بلکہ بات صرف اتنی سی ہے، مجھے اپنی ماں سے ذرا کچھ محبت سی ہے۔ سو......"

شہریار جو دانیا کے جملوں سے پگھل گیا تھا، یکدم اُس کے اندر دھواں بھرنے لگا۔ ماں...... یہ اُس کا سب سے دُکھتا ہوا موضوع تھا۔ لیکن عاطف ابھی اُسے اتنا نہیں جانتا تھا، نہ ہی سلامہ کی طرح اُس نے کبھی عاطف سے اپنا آپ ڈسکس کیا تھا۔ یہ تو بس سلامہ کے زندگی سے نکل جانے پر اچانک ہی عاطف اُس کی زندگی میں اتنا دخیل ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال مما کے متعلق وہ پھر بھی زباں بندی کے مقولے پر کاربند تھا۔

"گھر چلیں دانیا؟" اُس نے بائیک کی طرف قدم بڑھائے۔ دانیا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ عاطف بیگ نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر اُسے کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"تکلف نہیں سسٹر! بے فکر رہو، آج کا لنچ تم پر اُدھار ہے اور تم جانتی ہو، میں دعوت کھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔"

دانیا عبدالرحمٰن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ کچھ نہیں بولی، لیکن اُس کے بات سنبھالنے کے اضافی ہنر پر تشکر سے دیکھ کر وہ شہریار کی طرف بڑھ گئی، جہاں وہ بائیک پر بیٹھا اُسی کا انتظار کر رہا تھا۔



وسیع و عریض ہال کمرے میں اس وقت مسٹر عابد اور مزید عابد بیٹھے تھے اور دونوں کے درمیان کچھ دنوں سے ہونے والی بات چیت ایک بار پھر سے دہرائی جا رہی تھی، مگر لگتا تھا، دونوں ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے تھے، کیونکہ بیگم عابد کے چہرے کے تاثرات اچھے نہیں تھے۔ مسٹر عابد کچھ دیر تو اُن کے چہرے کا زاویہ دیکھتے رہے، پھر معاملہ ہنوز برقرار رہا تو اُنہوں نے لگاوٹ سے پوچھا۔

"جمیلہ! کیا ہو گیا ہے؟......کیا واقعی ناراض ہو گئی ہو؟"

بیگم عابد نے شوہر کی لگاوٹ پر دل میں خوش ہوتے ہوئے مگر بظاہر خفگی کا مظاہرہ برقرار رکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "ناراض نہ ہوں تو کیا کروں، آپ کو میری ہر بات ہی ناقابلِ عمل لگتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اگر شہریار اچھا لڑکا ہے تو کیا برائی ہے اپنی ماریہ کے لئے اُس کا ہاتھ مانگنے میں؟"

"کوئی حرج نہیں ہے، لیکن ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے، وہ لوگ اس میں دلچسپی رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ عموماً لوگ وٹے سٹے سے گھبراتے ہیں۔"

"لیکن اگر ہم اُنہیں دباؤ کے تحت اس فیصلے کی طرف لے آئیں تو......" بیگم عابد کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاطرانہ چالوں میں وہ ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ مسٹر عابد تو اُن کے حکم کے غلام تھے، سو اُن کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر اُنہوں نے نیم رضامندی سے بیگم کو دیکھا، پھر کسمسا کر بولے۔

"جمیلہ! تمہیں کیا لگتا ہے، کیا ہم اس مقام پر ہیں کہ مسٹر عبدالرحمٰن کی فیملی پر کوئی دباؤ ڈال سکیں؟"

بیگم عابد فوراً مسکرا کر بولیں۔ "کیوں نہیں۔ ہم ایسے مقام پر ہیں کہ مسٹر عبدالرحمٰن قطعاً انکار نہیں کر سکتے۔ تمہیں نہیں پتہ، حمزہ میرا بیٹا ہے، اس کی ساری عادتیں مجھ پر گئی ہیں اور میں جانتی ہوں، میرا بیٹا صرف محبت کے لئے شادی کی خرافات میں نہیں پڑ سکتا۔ زندگی انجوائے کرنے کی دُھن اُس میں آپ جیسی ہے، اس لئے کسی ایک لڑکی کا ہو کر رہنے کا سودا وہ صرف کسی بڑے منافع کے طور پر تو قبول کر سکتا ہے صرف محبت کے لئے نہیں......اور میرا بیٹا جانتا ہے لڑکیوں کو محبت کے خواب کیسے دکھائے جاتے ہیں۔"

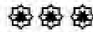
"ہاں، وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن مسٹر سلیم بہت جلد پاکستان آنے والے ہیں۔ اُن کا خیال پاکستان میں مستقل قیام کا ہے۔ دراصل اُن کی دونوں بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ میں اس لئے ابھی اس معاملے میں نہیں

بڑنا چاہتا تھا۔بظاہر میں نے کچھ نہ کچھ تو کما لیا ہے، لیکن بہر حال وہ مسٹر عبدالرحمٰن فیملی کے حساب سے نا کافی ہے۔حمزہ نے ایک بزنس شروع تو کیا ہے، لیکن وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔"
بیگم نے یہ سوچ کر انہیں دیکھا، پھر ایک منٹ سے بھی کم مدت میں بولیں۔"وہ انگلینڈ کا جواد حسن، وہ کس کام آئے گا؟ آخر ہماری اُلٹ پھیر کی وجہ سے کما کھا رہا ہے۔اگر ہم مسٹر سلیم کے سامنے اُس کی ایمانداری، وفاداری کا پرچار نہ کرتے، جو اُس میں بالکل نہیں ہے تو مسٹر سلیم اُسے انگلینڈ اپنے منیجر کے طور پر کبھی نہ لے جاتے۔آپ کے پاس اُس کی کچھ کمزوریاں ہیں، آپ اُس سے کہیں، وہ مسٹر سلیم کو ابھی کچھ اور سال اُلجھا کر رکھے۔کم از کم پانچ سال تو ضرور ہی......تاکہ ہم اپنا گھر، اپنا بزنس اچھی طرح سیٹ کر لیں۔پھر اگر مسٹر سلیم پر آپ کی کرپشن کا عقدہ کھلتا بھی ہے تو تب تک ہماری پوزیشن اتنی سٹرونگ ہو چکی ہوگی کہ وہ مسٹر عبدالرحمٰن کے سمدھی ہونے کی وجہ سے دس دفعہ ہم پر چارج لگاتے ہوئے سوچیں گے۔"
مسٹر عابد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔پھر لاؤنج کی آواز میں بھرتا چلا گیا۔انہوں نے بیگم کو دیکھ کر شوخی سے کہا۔"لوگ ٹھیک کہتے ہیں، ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ضرور ہوتی ہے۔میں جب چھوٹا تھا تو سمجھتا تھا، وہ عورت میری ماں ہے۔لیکن جب ماں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کیا تو پتہ چلا، میں کانٹوں پر چلنے لگا ہوں۔ہر شخص یہی کہتا تھا تم کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو۔ایمانداری سے صرف دو وقت کھانا کھایا جا سکتا ہے۔اور کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔میں نے یہی بات ماں سے کہی تو انہوں نے مجھے دنیا کے حوالے کر دیا۔شاید تھوڑی سی غلط بیانی کر رہا ہوں میں یہاں۔انہوں نے نہیں، میں نے خود ہی خود کو دنیا کے سپرد کر دیا، تاکہ میں دنیا کی طرح جی سکوں۔تب تم ملیں اور تمہارے ملتے ہی جس طرح مجھ پر زندگی مہربان ہوئی ہے، اس پر میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں، ہر آدمی کے پیچھے جو کامیاب عورت ہوا کرتی ہے، میری زندگی کی وہ عورت تم ہو۔"
بیگم شرمانے لگیں اور تب ہی حمزہ نے انٹری دی۔وہ خاموشی سے پیچھے کھڑا پہلے سے اُن کی گفتگو سن رہا تھا۔انہیں خاموش ہوتے دیکھ کر باپ کو آنکھ مار کر دھیمی آواز میں بولا۔
"اوہو......تو رومانس ہو رہا ہے۔میں بھی سوچتا تھا، اتنا رومانس مجھ میں کہاں سے آیا۔اب معلوم ہوا، یہ وراثتی جراثیم ہیں۔"
بیگم عابد آنکھیں نکال کر بیٹے کو دیکھنے لگیں، پھر اُس کے کندھے پر لاڈ سے تھپڑ مار کر بولیں۔"بہت خراب ہو گئی ہے تمہاری صحبت۔پتہ نہیں چلتا ماں باپ سے بات کر رہے ہو یا دوست سے......ہم تو ایسی کسی بات کو کہنے کے لئے سوچ کر ہی پانی پانی ہو جاتے تھے اور تم کہہ گزرتے ہو۔"
مسٹر عابد نے بیٹے کو محبت سے دیکھ کر جواباً کہا۔"سیدھی سی بات ہے بیگم! بیٹا جوان ہو جائے تو باپ کے جوتوں کی طرح وہ باپ کی ہر چیز میں ایسا ہی دخیل ہو جاتا ہے، جیسے کوئی پرانا یار۔پھر میرا بیٹا کوئی

ہماری طرح کے سخت ماحول میں تھوڑی پلا بڑھا ہے، جو کنفیوژ رہے گا۔ اُسے اپنی زندگی کی سمت بھی معلوم ہے اور منزل پر بھی اُس کی نظر ہے۔"

حمزہ عابد نے چونک کر باپ کو دیکھا، پھر صوفے کی بیک سے چھلانگ لگا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈ! آپ بھی ناں......" وہ کچھ کہتے کہتے رکا، پھر شوخی سے بولا۔ "پہلے مجھے لگتا تھا میرے اندر بلا وجہ کی کرپشن بھری ہوئی ہے، لیکن اب لگتا ہے، یہ سب آپ کی نظر کا کرشمہ ہے۔ ویسے جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں، میری گاڑی اس ٹریک پر مناسب رفتار سے دوڑ رہی ہے۔"

مسٹر عابد نے بیٹے کو پہلے جیسی شفقت سے دیکھا اور وقت مسکراتا اُن کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔



عاطف بیگ کو شہریار نے جس کام میں لگایا تھا، اُس نے ایک مہینے کے اندر اندر رپورٹ شہریار کے سامنے پیش کر دی تھی۔ شہریار خاموش بیٹھا تھا اور عاطف بیگ اُسے تک رہا تھا۔ کتنی خاموش ساعتیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزر گئیں۔ تب عاطف بیگ نے کہا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے، وہ مسٹر عابد جیسے کرپٹ آدمی کا بیٹا ہے، سو کیونکر وفادار ہو سکتا ہے۔ وہ شخص، جس کا اپنا گھر تک نہیں ہے، وہ دانیا کا ہاتھ کیسے تھام سکتا ہے؟ تم انکل کو اعتماد میں لے کر بتا سکتے ہو کہ حمزہ عابد کسی بھی طرح دانیا کے لیے موزوں نہیں ہے۔ گواہی کے لئے مجھے بلا لینا۔"

شہریار اُسے پُرسوچ نظروں سے دیکھتا رہا، پھر آہستگی سے بولا۔ "وہ لڑکی کون تھی؟ تم نے اندازہ لگایا حمزہ عابد کے ساتھ کیا پری تمثال کا شہرہ ہے؟"

عاطف بیگ نے نفی میں سر ہلایا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ لیکن دیکھو، کیا علم میں آتا ہے۔ ویسے تیرا اسائنمنٹ کہاں تک پہنچا ہے؟"

شہریار نے ایک نظر اُسے دیکھا، پھر بے بسی سے بولا۔ "بہت برا پھنس گیا ہوں میں۔ جتنا جانانہ کے معاملے میں اُتر گیا ہوں، مجھے لگتا ہے، میری واپسی کی کوئی راہ نہیں بچی ہے۔ جانانہ کے ساتھ سالار بھائی نے مجھے میری ہی مرضی کی وجہ سے، بہت دفعہ دیکھ لیا ہے۔ اُن کا غصا لگ ہے۔ وہ پھٹ پڑنے کے منتظر ہیں۔ مگر جانے کون سی بات انہیں روکے ہوئے ہے۔ تمہیں معلوم ہے، بھائی نے کئی ہفتوں سے مجھ سے پرسنلی تو کیا، آفیشلی بات بھی کرنا چھوڑ رکھی ہے۔ میں پاپا کے سامنے اس معاملے کو دبانے کی جتنی کوشش کرتا ہوں، مجھے لگتا ہے، اتنا ہی سالار بھائی اس معاملے میں توجہ کری ایٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... میں دو اطراف میں بٹ گیا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا، کس جگہ توجہ زیادہ خرچ کروں۔ سالار بھائی کی زندگی بھی کم تر حیثیت نہیں رکھتی، اور دانیا کی خوشیوں بھری زندگی تو میری زندگی کا ہی

اعادہ ہے۔ سمجھ نہیں آتا، کس طرح اس سچ کا سامنا کروں کہ حمزہ عابد کتنا بڑا کرپٹ ہے۔ اُس کے فلرٹ کی داستان دانیا کے سامنے آنے کا مطلب ہے کہ دانیا کا آبگینے کی طرح کا دل ٹوٹ جائے۔ حمزہ عابد کو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے صرف میری بہن زندہ ہوتے ہوئے مرجائے گی۔ جتنی شدت سے میں نے اُسے محبت کے شعر گنگناتے دیکھا ہے، میں اندازہ لگا سکتا ہوں محبتوں کے لئے ایسی حساس لڑکی اگر ٹوٹی تو کتنی شدت سے ٹوٹے گی۔"

عاطف بیگ نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"پتہ نہیں، میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی سکوں گا یا اپنی بہن کو ایسے ہی ٹوٹتے دیکھوں گا۔ دیکھو، کیا ہوتا لکھا ہے اور کون سی ان کہی دروازے پر کھڑی ہے۔" کہتے کہتے تھما، پھر آہستگی سے بولا۔ "حمزہ پر تم کبھی یہ ظاہر مت ہونے دینا کہ ہم اس کی اصلیت جان چکے ہیں۔ اُس سے اسی دوستانہ طریقے سے ملنا، مگر اُسے مسلسل نظر میں رکھو اور پتہ کرو وہ لڑکی کون ہے، جس کے ہوتے ہوئے وہ دانیا کی ہنستی بستی محبت سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

عاطف بیگ نے سر ہلا کر اُس کی بات پر عمل کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اور یہ ایک ہفتے بعد کی بات تھی، جب بہت اچانک عاطف بیگ کا فون اُس کے سیل فون پر آیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے اُس کے بتائے ہوئے کیفے نوبہار پر پہنچا۔ یہ بھی درمیانے درجے کا ایک بہت مقبول قسم کا ہوٹل تھا۔

"کہاں ہے حمزہ؟" شہریار کے چہرے کی ساری رگیں تنی ہوئی تھیں۔ اُس کی آواز خود عاطف کو بھی بہت اجنبی لگ رہی تھی۔

"پہلے تم وعدہ کرو کہ غصے میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہیں کرو گے۔" عاطف بیگ نے اُس کا ہاتھ تھام کر ٹھہرے لہجے میں سوال کیا۔ شہریار نے پتھریلی آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔

"میں نہیں جانتا، میں حمزہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کروں گا، لیکن یہ طے ہے، میرا اُسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

عاطف بیگ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں صرف غصے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکا، پھر یہ تسلی بھی تھی کہ وہ خود اس کے ساتھ ہے۔

"کہاں ہیں دونوں؟" اُس نے نظر دوڑاتے ہوئے ناکامی کے بعد خفگی سے سوال کیا۔ تب اُس نے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دونوں وہاں اس کیبن میں ہیں۔"

سو شہریار نپے تلے قدم اُٹھاتا ہوا اس کیبن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُس کا خیال تھا لڑکی جو کوئی بھی تھی، شریف النفس ہوئی تو اس کی آمد پر گھبرا جائے گی۔ اگر سوسائٹی پرسنالٹی ہوئی، تب بھی اس طرح کے معاملات میں لڑکیاں عموماً کنی کترا کر گزر جاتی ہیں۔ رہا حمزہ تو شاید وہ اس طرح چوری پکڑے جانے پر شاید اس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے تائب ہونے کی اداکاری کے لئے کچھ نہ کچھ تو کر ہی گزرتا...... لیکن اس سے پہلے کہ شہریار کیبن کا پردہ اُٹھاتا، حمزہ عابد خود کیبن سے نکلتا دکھائی دیا۔ شہریار نے غصیلی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ شہریار نے تیزی سے پشت کر لی تھی۔

"یہ ہے تمہاری سیکرٹ سروس؟" وہ آہستہ سے بڑبڑا رہا تھا۔

خود عاطف نے بھی ٹرن لیا تھا، پھر کھسیا کر ہنسنے لگا تھا۔ شہریار نے کچھ نہیں کہا اور دونوں اپنے راستے پر ہو لئے اور یہ سیدھا اسٹڈی ویو کو جاتا تھا۔ وہ جب ٹینس ہوتا، یہیں آیا کرتا تھا اور آج وہ ہر روز سے کہیں زیادہ ٹینس تھا۔

"تمہیں پتہ ہے، اس سچائی کا بوجھ سنبھالے سنبھالے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی ہیں۔ میرا بلڈ پریشر ایک ہفتے سے شوٹ کر گیا ہے۔ دوا لیتا ہوں، پھر بھی فرق نہیں پڑتا۔ سیدھی سی بات ہے، مسئلہ اندر ہے تو بیرونی امداد خواہ وہ دوا کی صورت ہی کیوں نہ ہو، اثر کیسے کرے گی۔"

عاطف بیگ نے پریشانی سے اُسے دیکھا، پھر خفگی سے بولا۔ "تمہیں اپنی پروا کرنی چاہئے شیری! اپنے لئے نہیں تو دانیا کے لئے، انکل کے لئے، بھائیوں کے لئے، آنٹی کے لئے، اُن کے رویے کی سرد مزاجی میں نہیں جان سکتا، لیکن تمہیں دیکھ کر انکل کی آنکھ میں ہلکی سی چمک ضرور آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، ان کی آنکھوں کی یہ چمک ہمیشہ برقرار رہے۔"

"چمک، مجھے دیکھ کر...... ہاہاہا......"

وہ زہریلا قہقہہ لگا کر سمندر کو دیکھنے لگا۔ اس سمندر کی قسمت اور اُس کی قسمت کتنی ملتی جلتی تھی۔ اس سمندر کی طرح اُسے بھی ظرف آزماتا تھا، پیاس بجھاتی بھی تھی، پیاسا بھی رہنا تھا۔ لہروں کی صورت ساحل سے ٹکرانا بھی تھا اور نامعلوم موت اوڑھ کر ریت کے ذروں میں جذب ہو کر مرجانا بھی تھا۔ سمندر کے پانی کی طرح وہ بھی زندگی دینا چاہتا تھا، لیکن شدت سے پیاسے ہونٹ بھی اُس کی محبت کو کھارے پانی کی طرح تھوک دیا کرتے تھے۔

کھارا سمندر...... کھاری محبت......

واقعی، محبت آنسو کے سوا کچھ نہیں، اس لئے اس کا مزہ تمام عمر وے کر بھی کھارا رہتا ہے۔ کتنی مٹھاس ڈالو، کتنی ہی توجہ دو، کھارے پانی اور خالی شور کے سوا ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

خاموشی بہت گہری ہوگئی تھی، جب عاطف بیگ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسے سے کہا تھا۔ ''میں نہیں جانتا، تمہاری اصل پرابلم کیا ہے، لیکن تمہاری کوئی بھی ان کہی ہماری تمہاری دوستی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ رہی ٹینشن تو اگر یہ حمزہ کی وجہ سے ہے تو جان لو ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔''

شہریار نے اُس کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے، میں اس معاملے میں کچھ نہ کر پاؤں گا۔ وانیا کی مسکراتی، خواب دیکھتی آنکھیں ہیں ایک طرف تو دوسری طرف عدیل بھائی اور مما ہیں، پاپا کی خوشی ہیں۔ آج کل تو نانو جیسی سخت مزاج خاتون بھی بات بے بات مسکرانے لگی ہیں۔ اُن کی ہر بات کا رُخ وانیا کی شادی پر جا رُکتا ہے۔ ماما اور پاپا بھی اس بات کے حق میں ہیں۔''

''اور سالار بھائی کا اپنی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' عاطف بیگ نے سوال اُٹھایا۔

''سالار بھائی...... وہ تو لگتا ہے، پھولوں سے کانٹوں پہ کھینچ لئے گئے ہیں۔ بظاہر لگتا یہی ہے کہ انہیں کسی کے دل ٹوٹنے یا ثابت رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مگر وہ ابھی تک ہمت جمع نہیں کر پائے ہیں کہ یکدم کہہ سکیں کہ عائشہ سے شادی کرنے کا خیال اُن کی زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ پھر میں ہوں، انہیں اتنا زیادہ ٹف ٹائم دینا پڑ رہا ہے کہ تنہائی میں مجھے خود پر غصہ آتا ہے۔ جانا نہ کے ساتھ کہیں باہر نکلتا ہوں تو جان کر انہیں جتاتا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں، کتنا وقت اُن کی محبت کے ساتھ گزارنے والا ہوں اور وہ فون پر گم صم سنتے رہتے ہیں۔ کبھی جو سامنا ہو جائے تو اُن کی آنکھوں میں اتنی بے چارگی، اتنی نمی ہوتی ہے کہ مجھے اپنی شکل دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے، میں ان کے بن روئے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر کے ڈوب رہا ہوں اور یہ کھار مجھے آہستہ آہستہ گلا دے گی۔''

عاطف بیگ نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر فکرمندی سے بولا۔ ''تجھے محسوس ہو رہا ہے یا نہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں، تجھے بات کرنے میں بہت دقت ہونے لگی ہے۔ اتنی سانس کیوں چڑھ آئی ہے تیری؟ سچ بتا، صرف بلڈ پریشر ہے ناں؟ یا کوئی اور گل کھل رہا ہے؟''

شہریار نے بس نظر بھر کر دیکھا، جیب میں رکھی شیشی سے گولیاں نکالیں اور ہاتھ میں پکڑی منرل واٹر کی بوتل سے نگل لیں۔ عاطف بیگ نے دیکھا تو بوتل چھین لی، پھر تپ کر بولا۔ ''تم اتنے اسٹوپڈ کب سے ہو گئے؟ یہ دوائیں زکریا بھائی لیتے ہیں۔ اور وہ انجائنا کے مریض ہیں۔''

شہریار نے پھیکی ہنسی کے ساتھ اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''بس ایویں شو نہ کر، جیسے پتہ نہیں کتنی بڑی بیماری ہوگئی ہے۔ اماں یار میرے لئے یہ نارمل ہے۔ دل دھڑکتا ہے تو خبر نہیں ہوتی زندہ ہوں یا

نہیں۔درد ہوتا ہے تو احساس رہتا ہے، ابھی زندگی کی قطار میں کھڑا ہوں اور جینے کے امتحان اور بھی ہیں۔"

عاطف بیگ کے تاثرات پھر بھی نہ بدلے تو وہ دوبارہ بولا۔

"میری جان! دو سال سے اس بیماری کی ناز برداری کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو زندہ ہوں، تُو نے تو ایسے تاثرات دینے شروع کر دیئے جیسے میرا آخری دیدار کرنے کا وقت قریب ہو۔"

"بکواس مت کر۔ عجیب آدمی ہے تُو۔ کسی بات سے پریشان نہیں ہوتا۔ اپنے اوپر کچھ بھی گزر جائے، سب برداشت کر لیتا ہے۔ فکر رہتی ہے تو گھر والوں کی، اُن لوگوں کی، جو بہت کم تیری پروا کرتے ہیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "کیا دانیا جانتی ہے تیری بیماری؟"

شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کی حق دق حالت دیکھی تو اُسے کندھوں سے تھام کر بولا۔ "کیا یار عاطف! تُو تو مجھے اموشنل ہیرو بنانے پر تلا ہوا ہے۔ میرے سامنے ہی میرے گھر والوں کی کم توجہ پر مجھے پرسہ دے رہا ہے۔ ارے یار! ہر انسان اپنی زندگی کے معمولات پہلے سے طے کروا کے لاتا ہے، کتنا جینا ہے، کتنا رونا ہے، کتنا ہنسنا ہے، زندگی میں آخری بار مرنے سے پہلے کتنی بار مرنا ہے، سب کچھ۔ پھر میں کس بات کا شکوہ کروں؟......رہی میری بیماری......تو خدا کا خوف کرو عاطف! مجھے کوئی اتنی شدید نوعیت کا انجائنا نہیں ہے۔ بس بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے تو کچھ پرابلم کری ایٹ ہو جاتی ہیں، ورنہ طبیعت نارمل ہی رہتی ہے۔ رہی دانیا کی باخبری، تو میرے بھائی! یہ کوئی پرانی قسم کے ناول کی چویشن نہیں ہے، جس میں ہر آدمی ہیرو کی بیماری کا راز دوسرے کو دے کر اس بات کو راز رکھنے کی قسم لیتا ہے اور آخری صفحات تک ناول کے سارے کردار چھپ چھپ کے رو دھو کر مریض کو مرنے سے پہلے ہی شرمندہ کر کے مار دیتے ہیں۔ بھئی، میرا تو خیال ہے، انسان کو تو بتا کر مرنا بھی نہیں چاہئے۔ بقول غالب، نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا والا مصرعہ ہو تو زندگی مزے میں گزر جاتی ہے۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا تھا اور وہ دونوں اپنی اپنی راہ کے مسافر ہوئے تھے۔ شہریار نے اُسے باہر سے ہی چھوڑ دیا تھا۔ سائرہ کے بعد سے اب وہ بہت کم دوستوں کے گھروں کے اندر کی زندگی کو جینے کی حسرت کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی عاطف ضد کرتا بھی تو مہمان خانے سے آگے کا راستہ طے کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ عاطف اُس کی لاجک سمجھتا تھا، اس لئے اعتراض نہیں کرتا تھا۔ سو اس وقت بھی وہ اُسے باہر سے چھوڑ کر گھر کے لئے راستہ طے کر رہا تھا۔ پھر اُس نے کمرے میں قدم رکھ کر کوٹ اُتار کر دُور پھینکا ہی تھا کہ اُسے اپنی پشت پر کسی کی جلتی نگاہیں گھستی محسوس ہوئیں۔

"سالار بھائی......" اُس کی چھٹی حس نے الارم دیا مگر وہ پلٹا نہیں۔ وہ جان کر اُن کے چہرے کی کیفیت سے بچنا چاہتا تھا، مگر سالار عبدالرحمٰن اُس کی سوچ کے برخلاف اُس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

''سنی بھائی! آپ.......'' بمشکل اُس نے جملہ جوڑا اور سالار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
''تم.......آخر تم کو کیا ملے گا، میری محبت غبن کرنے میں؟.......تم جانتے ہو، میں جاناں سے کس قدر ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں، پھر بھی تم میری راہ میں آ رہے ہو؟ تم جانتے ہو، میں محبت میں اتنا کِھسکی ہوں کہ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''
''آپ مجھے جان سے نہیں مار سکتے، اتنا میں جانتا ہوں۔'' وہ طبیعت کے برخلاف استہزائیہ ہنسا۔
سالار عبدالرحمٰن نے اُس کا شانہ مٹھی میں بھینچ لیا، پھر غصے سے پھنکارے۔''تم اگر ایسا سمجھتے ہو تو تم غلطی پہ ہو۔ میں محبت میں مار دینے اور مر جانے پہ یقین رکھتا ہوں۔ اور پھر تم.......تم کون سے میرے سگے بھائی ہو کہ تمہیں مارتے ہوئے میرا دل کانپے۔''
شہریار عبدالرحمٰن نے کوشش کی وہ اُن کے جملے پہ پُرسکون رہے، مگر کوشش کے باوجود اُس کے اندر جذبات کا اُبال اُٹھنے لگا تھا۔
''آپ مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ آپ کا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں؟''
سالار عبدالرحمٰن نے وہی سفاکی سے بھرپور لہجہ رکھا۔''ہاں.......میں تم سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں کہ میرے اختیار میں ہو تو کسی اور کے نام کی موت کو تمہارا پتہ دے دوں اور کہوں، دنیا میں اگر کسی کو جینے کا حق نہیں ہونا چاہیے تو وہ صرف شہریار عبدالرحمٰن ہے.......شہریار عبدالرحمٰن.......جس کے لئے کسی کے دل، کسی کی محبت اور کسی کی زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔''
اُس نے کھڑکی سے ٹیک لگا کر اتنی ہی تلخی سے سنا تھا، جتنی سفاکی سے کہا گیا تھا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنیں.......اُس نے دل میں ہوک لگائی۔ عائشہ بھابی! کاش آپ کو معلوم ہوتا، آپ سے وعدے کی پاداش میں مجھ پر زندگی کتنی سفاکی سے رائے زنی کرتی ہے.......ہر لمحہ، ہر ساعت.......اور میں اُف کرنے کی جسارت نہیں کر پاتا.......
''کیوں خاموش ہو؟.......اب بولو ناں، کیوں ہو تم اتنے ظالم؟.......اتنے ظالم کہ مجھے تمہاری زندگی کو بد دُعا دینی پڑتی ہے؟''
اُس نے کچھ کہے بغیر کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ پتہ نہیں، ظالم وقت تھا یا شہریار عبدالرحمٰن.......محبت تھی.......یا پھر جاناں.......کچھ واضح نہیں تھا۔ سو وہ نیا لیبل لگوا کر باہر کی خاموشی سے اپنے اندر کے شور کو کم کرنے کی سعی کرنے لگا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن کچھ دیر تو اُسے ایسے ہی دیکھتے رہے، پھر جس طرح تن فن کرتے آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی شہریار نے لائٹ آف کرکے کمرہ لاک کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا، سالار عبدالرحمٰن کو اُس کے کمرے کی طرف آتا دیکھ کر یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ دانیا ادھر کا رخ نہ کرتی۔ پھر شام کی چائے کا بھی وقت ہو چلا تھا، سو لازمی وہ اُس کو بلانے آتی اور اس وقت وہ اتنا ہراساں ہو گیا تھا اپنے آپ سے کہ اگر کسی کا ہلکا سا بھی آسرا ملتا تو شاید تڑپ کر روئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ سر تک چادر تان کر سلیپنگ پلز لے کر وہ سونے کی سعی کرنا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں، نیند آدھی موت ہوتی ہے اور وہ اس آدھی ادھوری زندگی کی تلخی کو آدھی موت سے پاٹنا چاہتا تھا۔ کیا پتہ، پوری مدت کب اُس پر مہربان ہو جاتی.......

دانیا کافی دیر تک اُس کا دروازہ ناک کرتی رہی۔ پھر حیران ہو کر واپس سالار عبدالرحمٰن کو ڈھونڈنے کے مشن پر جت گئی مگر غیر متوقع عدیل عبدالرحمٰن سے ٹکراؤ ہو گیا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے ہراساں دیکھا تو فوراً کلائی تھام کر پکارے۔

"کیا بات ہے گڑیا جی! کس بات پر مزاج برہم ہیں؟ ویسے آج کل گھر میں زیادہ تر لوگوں کے مزاج کو کچھ نظر سی لگ گئی ہے۔" پھر اُسے سوالیہ دیکھا تو صوفے پر دھکیل کر بٹھاتے ہوئے بولے۔ "نہیں سمجھیں تو میں سمجھاتا ہوں۔" تھوڑا توقف کیا، پھر آہستگی سے بولے۔ "اپنے حمزہ صاحب ہیں ناں......اُن کی ایک سسٹر ہوتی ہیں ماریہ۔ مسٹر عابد چاہتے ہیں، شہریار سے اُن کی بیٹی کی بات بھی طے ہو جائے تو وہ اس خوشی کو دھوم دھام سے منالیں۔ تمہاری بات ٹھہر تو گئی ہے مگر پھر بھی سوسائٹی کے پیش نظر مسٹر عابد اور مسز عابد ایک بڑا فنکشن کرنے کے متمنی ہیں۔ مگر ماما، وہ حق میں نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے، وہ شہریار جیسے لاابالی اور احمق انسان پر........ مجھے مت گھورو، یہ میرے نہیں، ماما کے کمنٹ ہیں تو ہاں، وہ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ شہریار پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتیں کہ تمہارا وٹہ سٹہ رشتہ طے کر دیں۔ اُن کا خیال ہے، جس طرح شہریار لاابالی ہے، اگر اسکا موڈ بگڑا یا وہ ماریہ سے نباہ نہیں کر سکا تو تم پر خواہ مخواہ آنچ آئے گی۔ رہے پاپا تو اُن کا مزاج اس لئے خراب ہے کہ بقول اُن کے ماما نے اُن کے سب سے چہیتے بچے کو حد درجہ ڈی گریڈ کیا ہے۔ ویسے تو یوں بھی ہمیشہ خراب مزاج کے ساتھ نمبرون کی پوزیشن پر رہتی ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان سب کے برخلاف آج کل اپنے اموشنل ہائی وڈ سلیبریٹی سالار عبدالرحمٰن کا مزاج کیوں برہم رہنے لگا ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے حد درجہ گلابی رنگت کے مالک سالار عبدالرحمٰن کو پوائنٹ آؤٹ کیا۔ کچھ وہ خوب صورت بھی تھے اور کچھ اس بات سے خود آگاہ بھی کہ وہ چلتے ہیں تو زمانہ چلتا ہے، وہ رُکتے ہیں تو زمانے کی سانس بھی رُک جاتی ہے۔ سو عموماً تو وہ اپنی ذات سے باہر نکلتے نہیں تھے اور اگر خود پسندی سے باہر نکل کر دیکھتے بھی تو بہت کم معمولات میں اپنی رائے دیتے، یا خفا ہوتے۔ اس لئے اگر ان کا مزاج

برہم تھا تو کوئی خاص بات ہی ہوئی تھی۔"

دانیا اُنہیں پُرسوچ نظروں سے دیکھنے لگی، بتائے یا نہ بتائے۔ اور عدیل عبدالرحمٰن ایک نمبر کے زیرک انسان تھے، فوراً معاملے کو بھانپ کر بولے۔

"سنی کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟ کیا پھر کسی بات پر شہریار سے دوبدو تو نہیں ہوگئی شیر جوان کی؟"

دانیا نے شانے اچکا کر بے بسی سے بھائی کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "معاملہ ہمیشہ کی طرح شہریار بھائی اور سنی بھائی ہی کا لگتا ہے۔ کیونکہ میں نے اُنہیں شہریار بھائی کے کمرے کی طرف جاتے اور پھر غصے سے بھنا کر واپس آتے دیکھا ہے۔ سنی بھائی کے مزاج کی وجہ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ غصہ کس بات پر کیا گیا ہے۔ سوچا تھا، شیری بھائی سے تفصیل جان لوں گی، مگر اُن کے رُوم کی طرف گئی تو اُن کے کمرے کی لائٹ آف ہے اور وہ ہزار دستک پر بھی دروازہ نہیں کھول رہے۔"

"آہم...... معاملہ تو گمبھیر لگتا ہے۔ آخر ایسا کیا ہو گیا ہے، جو شیری نے تمہاری آواز پر لبیک نہیں کہا؟"

"فضول نہ بولیں بڑے بھیا! آپ...... آپ تو بندے کو شرمندہ ہی کر دیتے ہیں، عزت دے کر۔"

عدیل عبدالرحمٰن مسکرا کر اُسے دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔ "بھئی اگر میں اتنے مفکروں کے گھر میں شوخی کا رنگ نہ انڈیلوں تو مجھے لگتا ہے تم لوگ سنجیدہ ہی مر جاؤ گے۔ اتنی ٹیڑھی میڑھی شکلیں بنا کر جینے سے بہتر ہے، بندہ اپنے اوپر ہنسنا سیکھ لے۔"

دانیا نے منہ بسور کر اُسے واپس معاملے پر لانے کی کوشش کی، مگر عدیل عبدالرحمٰن ہاتھ آ کر نہیں دیئے۔ دراصل وہ سنجیدگی سے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ لاابالی انداز ہی اپناتے تھے، تا کہ اردگرد کا ماحول ڈسٹرب ہوئے بغیر اُن کے مطلب کا رزلٹ آسانی سے نکل آئے۔ سو اس وقت اُنہوں نے جان کر دانیا کے سامنے ایسا ظاہر نہیں کیا تھا کہ پریشان کن بات کوئی نہیں ہے، تا کہ وہ لڑکی مزید ہراساں نہ ہوتی رہے۔ مگر گھر سے نکلتے ہی اُنہوں نے دو ایک ضروری کالز کی تھیں، سالار عبدالرحمٰن کی روٹین کا حساب کیا تھا، پھر دو دن بعد وہ شہریار کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ جانا نہ کا کیا معاملہ ہے؟"

شہریار کے ہاتھ میں کافی کا مگ کانپ گیا تھا۔ "آپ کو کس نے اس سلسلے میں اپروچ کیا؟" اُس نے سوال داغا اور وہ مسکرا کر بولے۔

"میری محبت نے مجھے اپروچ کیا کہ میں دو پاگل افراد میں بیٹھ کر ذرا عقل مندی سے اُن کی حماقت کے کان کھینچ سکوں۔ سچ بتاؤ، یہ سالار اور تمہارے بیچ لڑکی کیوں آئی؟ اور وہ لڑکی بھی کون...... جانا نہ دی گریٹ، سوسائٹی پرسنالٹی۔"

شہریار کو سمجھ نہیں آیا، وہ کس طرح وفاع کرے۔ عدیل عبدالرحمٰن کی انویسٹی گیشن کو روکنا بھی تو آسان نہیں تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن اس پر مرتکز تھے، تبھی اُس نے گلا کھنکھار کے کہا۔

"عدیل بھائی! محبت کے لئے ذات پات کی قید نہیں ہے، پھر یہ کیا کہ وہ کون ہے۔ سیدھی سی بات ہے، مجھے محبت اس سے پہلے ہوئی تھی، وہ کون ہے، یہ تو بہت بعد کو پتہ چلا تھا۔ پھر جب سمندر میں اُتر گیا تو پانی گہرا ہے یا اتھلا...... پاؤں بھیگیں گے کہ سر تک ڈوب جاؤں، اس کا ہوش کب رہتا ہے۔ محبت سمندر بھی ہے، دلدل بھی۔ دونوں میں موت مقدر ہے۔ سو جینے کی تمنا نہ رکھنے والوں کے لئے تو یہ جانفزا پیغام ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھتے رہے، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ "کیا تمہیں معلوم ہے، دانیا کی بات ٹھہرنے کے بعد گھر میں کیا کھچڑی پک رہی تھی؟"

شہریار نے سر ہلایا، پھر آہستگی سے بولا۔ "سننے میں آرہا تھا کہ میری بات ماریہ سے طے کیے جانے کی پینگیں ڈالی جارہی ہیں۔ مگر دیکھئے بڑے بھائی! میں جس محبت کے جھولے میں جھول رہا ہوں، اس سے اُتار جانا میں ہرگز گوارا نہیں کروں گا۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے اُس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی، پھر مسکرا کر بولے۔ "میرے بیٹے! کیا تمہیں لگتا ہے، تمہاری جانا سے شادی ہو جانا آسان کام ہے؟ سالار کا معاملہ نہ بھی ہو، تب بھی گھر میں کوئی بھی اس سلسلے میں تمہاری حمایت نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے...... مگر مجھے یقین ہے، آپ میرا ساتھ دیں گے۔ حالانکہ ہم میں کبھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی کہ میں ایسا سوچنے کی جسارت کروں۔ مگر پھر بھی آپ کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوتا ہے، جیسے آپ پاپا کے وجود ہی کا پرتو ہیں۔ پاپا کی طرح ہی دل ہی دل میں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

"اچھا جناب اب ترکیب نمبر چار سو بیس استعمال کی جارہی ہے...... اموشنل بلیک میل کیا جارہا ہے، مجھ معصوم کو۔" شہریار ہنسنے لگا۔ مگر اُس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ اچانک سالار بھائی نے انٹری دی تھی۔

"تمہیں پاپا بلا رہے ہیں۔"

وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا تھا، جیسے سالار بھائی کے حکم سے سرتابی سب سے عظیم گناہ تھا۔ وہ اُس کے اس انداز پر اور چڑ گئے تھے۔ اس لئے جتنی تیزی سے آئے تھے، اتنی ہی تیزی سے واپس مڑ گئے تھے۔
عدیل عبدالرحمٰن نے اُن کی پشت کو دیکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔ "بھائی بہت غصے میں ہے آج کل۔ اگر بھسم کرنے کی صلاحیت ہوتی نا تو وہ تمہیں دیکھ کر سیکنڈوں میں راکھ کر چکا ہوتا۔ ویسے احتیاط سے جانا، پاپا کے دربار میں حاضری بھی بغیر کسی مطلب کے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، ماریہ کے سلسلے میں تمہاری رائے لی جانی ہو گی۔"
"پھر کیا کہوں گا میں؟" اُس نے بے چینی سے دیکھا۔
تب عدیل عبدالرحمٰن نے نرم لہجے میں کہا۔ "جو دل میں ہے، وہ کہہ گزرو...... آمد کرنے کا ٹھیکہ میرا ہے۔"
شہریار نے شرارت سے دیکھا، پھر جتانے کو بولا۔ "ہاں...... آپ کی ذمہ داری کا بھروسہ کچھ اتنا مضبوط بھی نہیں ہے۔ اگر دم خم ہوتا تو رابعہ بھابی کا معاملہ حل نہ کر چکے ہوتے آپ۔"
"رابعہ کا...... معاملہ......؟" انہوں نے تھوڑی کھجائی، پھر مسکرا کر بولے۔ "ماما سے بات کر لی ہے میں نے۔ عائشہ کے ساتھ رابعہ کا معاملہ بھی طے پا چکا ہے۔ ہم دونوں کی شادی ایک ساتھ ہی ہو گی۔"
"آہا...... اندر ہی اندر اتنے بڑے بڑے فیصلے ہو گئے اور ہمیں خبر تک نہ لگنے دی گئی۔ بڑی بات بڑے بھیا!"
اچانک آخری جملے دانیا نے اُچک لئے تو وہ ہنسنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔ "میرے پاس تو اور بھی بہت ساری اطلاعات ہیں۔ اگر فرصت میں ملو تو بتاؤں بھی۔"
دانیا تیزی سے اُن کے پاس صوفے پر آن بیٹھی، پھر بولی۔ "بتائیے نا، کیا کیا خبریں ہیں آپ کے پاس؟"
عدیل عبدالرحمٰن نے شہریار کو دیکھا، پھر شوخی سے بولے۔ "اپنے یہ شہریار کو ہی لے لو...... آج کل تمہیں معلوم ہے، محبت کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں اور کہتے ہیں.."
دانیا کھلکھلا کر ہنسنے لگی، پھر درمیان سے بات اچک کر بولی۔
"مجھے معلوم ہے شیری بھائی کی محبت کا قصہ۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ ماریہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔"
عدیل عبدالرحمٰن منہ کھولے دانیا کو دیکھتے رہ گئے۔ شہریار نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا مگر پھر بھی عدیل عبدالرحمٰن گلا کھنکھار کے بولے۔
"آپ کو یہ کس نے اطلاع دی ہے کہ شہریار، ماریہ سے محبت کرتے ہیں؟"

”سالار بھائی کہہ رہے تھے۔ اور پھر حمزہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اس رشتے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سالار بھائی نے ہی تو محبت کی اس کہانی کو موڑ دیا ہے۔ انہوں نے ہی تو پاپا کو، ماما اور نانو کو فورس کیا ہے۔ شیری بھائی کی چپکے چپکے محبت کے بارے میں لکھی ڈائری تک انہوں نے پاپا کو پڑھا دی ہے۔ حالانکہ یہ کچھ زیادہ تھا، مگر بڑے ہیں، میں انہیں منع نہیں کر سکی۔ مگر...... مگر آپ نے ایسا کیوں کہا کہ شیری بھائی جیسے کسی اور سے محبت کرتے ہوں گے؟“

عدیل عبدالرحمن اُسے دیکھتے رہے، پھر شہریار سے نظر بچا کر محبت سے بہن کو مخاطب کر کے بات سنبھالتے ہوئے بولے۔ ”سیدھی سی بات ہے یار! یہ بات اتنی سیکرٹ تھی کہ اس کا وقت سے پہلے لیک آؤٹ ہونا حیران کرتا ہی ہے۔ اب بھی دیکھ لو، سنی نے کتنی ان میچرڈ حرکت کی ہے، کسی کی ذاتی ڈائری اس طرح سرعام لانا کوئی اچھی بات ہے؟“

دانیا عبدالرحمن متفق نظر آنے لگی تھی، مگر اس سے پہلے کہ کچھ کہتی، نانو کی آواز نے اُسے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔

بہن کے جاتے ہی عدیل عبدالرحمن کا رُخ پھر سے شہریار کی طرف ہو گیا تھا۔

”اب بتاؤ بیٹا! کیسے نمٹو گے اس مسئلے سے؟ سالار تو گیم کھیل گیا۔ کتنے باقاعدہ طریقے سے اُس نے تمہیں گھر سے باہر کیا ہے۔ ویسے قطع نظر اس چالاکی کے، یہ تو بتاؤ یہ ڈائری میں ماریہ کے نام سے محبت کیوں درج کر رکھی تھی اگر جانا نہ پر جان چھڑکتے ہو تو؟“

شہریار نے پھیکے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو صرف محبت پر خیال آرائی کی تھی، اپنے حصے کی محبت کی کھوج میں لفظ لکھے تھے، گمشدہ محبت کو پانے کی ہُمک لکھی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا، سالار بھائی میری اس محبت کی کہانی میں ایسا ٹوئسٹ لگائیں گے۔“

عدیل عبدالرحمن نے اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھا، پھر کہا۔ ”جو بھی ہے، اس کا مقابلہ کرو۔ بے فکر رہو۔ شادی کے سلسلے میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔“

”آپ ایسا سوچتے ہیں، مگر دانیا کے چہرے پر پھیکے رنگ...... میں ان سے کس طرح نظر چراؤں؟“

وہ سچ کہنا بھی چاہتا تھا اور سچ کہنے سے بہت سے معاملے بگڑ جانے تھے۔ اس لئے کہنے کی خواہش کے مطابق کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خاموشی سے جائزہ لینا ہی اُس کے اختیار میں تھا۔ سو وہ پاپا کے کمرے میں پوری طرح کمپوز ہو کر جا سکا تھا۔ پاپا نے صورت دیکھی تو حیرت سے بولے۔

”اتنی دیر، بیٹا! میں نے آپ کو کتنا پہلے بلایا تھا؟“ خفگی لہجے کے ادب آداب سے ظاہر ہو گئی تھی۔

ماما کے چہرے پر بھی ناگواری تھی، ماٹو بھی خفگی سے تنے ہوئے اعصاب سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ سو اُس نے گہرا سانس لے کر بمشکل عدیل بھائی سے ضروری بات کرنے میں دیر ہونے کا بہانہ کر کے دامن بچایا۔ پاپا کے چہرے کی خفگی کم ہو گئی تھی، سو انہوں نے فوراً ہی قریب بٹھا کر محبت سے پوچھا تھا۔

”شیری! ہم سب کا خیال ہے، جس طرح عدیل اور سالار کی ایک گھر سے شادی طے پائی ہے، اسی طرح تمہاری اور دانیا کی بات کر دی جائے۔ سنی کہہ رہا تھا تم دونوں بہت اچھے یونیورسٹی فیلو بھی ہو اور شاید ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتے ہو تو میں نے سوچا کہ میں تمہاری رائے لے کر ایک ہی فنکشن میں دونوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ شادی تو بہرحال تمہارے عملی پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد ہی کی جائے گی، فی الحال ہم اور مسٹر عابد کی فیملی منگنی کرنا چاہتی ہے۔“ تفصیل سے کہہ کر وہ اُسے دیکھنے لگے۔

کچھ چیزیں جس طرح بدل جانے کے لئے ہوتی ہیں، اسی طرح کچھ چیزیں اور عادتیں ہمیشہ قائم رہنے کے لئے فطرت میں شامل رہتی ہیں۔ انہیں آپ جان مار کر بھی نہیں بدل سکتے۔

اس کی گہری سوچ اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ پاپا نے گومگو کی حالت دیکھی تو محبت سے بولے۔

”مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ دینا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ فیصلہ ہمارے حق سے میل کھاتا ہوا بھی ہو۔ اگر تمہارا جواب انکار میں ہو، تب بھی میں تم سے خفا نہیں ہوں گا۔ یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے، اس لئے اس کا اختیار بھی تمہارے پاس ہے۔ میں تو اتنا چاہتا ہوں، اگر کوئی شرم حائل ہے تو بھی اس کا تدارک کر دیا جائے۔ اگر وٹے سٹے کے معاملے کو لے کر کوئی اُلجھن ہے تو اس کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے۔“

مسٹر عبدالرحمٰن نے ڈاری کی بات ہضم کر لی تھی۔ مبہم لہجے میں رائے لینے کی کوشش کی تھی اور وہ سر ہلاتا ہوا فیصلے کی گھڑی سے بچتا ہوا اُٹھ گیا تھا۔ ماٹو نے اُس کی پشت کو دیکھا تو ہنکارا بھرا اور پھر اُس کو سنانے کو بولیں۔

”عجیب ہو عبدالرحمٰن! تم بھی۔ تمام عمر تمہارے ٹکڑوں پر پلا ہے، کیا اتنا بھی حق نہیں ہے تمہارا کہ اپنی مرضی سے اس کا بیاہ کر سکو؟ اور پھر سیٹھ عابد کوئی ایسے گئے گزرے انسان بھی نہیں ہیں کہ اس کی لٹیا ڈوب جائے گی۔ اچھے خاصے دولت مند ہیں۔ میں تو کہتی ہوں، اس نکمے انسان کی زندگی بن جائے گی۔ نہ کام کا، نہ دھام کا، اور روپیہ یوں اُڑاتا پھرتا ہے، جیسے روپیہ درختوں پر لگا ہوا ہے۔“

مسز عبدالرحمٰن نے اپنی ساس کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کی عزت میں کوئی فرق نہ آئے۔ انہیں ان کے کسی عمل سے یہ نہ لگے کہ وہ اپنے نہیں، بیٹی کے گھر میں براجمان ہیں۔ کیونکہ بہر حال بزرگوں کا احترام اُن کی تربیت میں شامل تھا، اس لئے اس بار بھی وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے ملحق اسٹڈی رُوم میں چلے گئے تھے اور ماما، نانو کے سامنے منمنائی تھیں۔

"مجھے اس لڑکے پر ایک لمحے کا بھی اعتبار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں، کیسی کیسی بری عادتوں میں پڑا ہوا ہے۔ یار دوست، رات گئے گھر سے غائب رہنا، سگریٹ پینا، کوئی بھی عادت ایسی نہیں ہے کہ پسندیدہ کہلائے۔ اماں! مجھے ڈر لگتا ہے، اگر یہ ماریہ کو خوش نہ رکھ سکا تو میری دانیا کو اس کی غلطی کے کانٹے اپنی پلکوں سے اُٹھانے پڑیں گے۔ میری ایک ہی بچی ہے، میں اس کے حق میں برا نہیں چاہتی مگر مسز عابد، پتہ نہیں اُنہیں بھی ضد کیوں ہو گئی ہے کہ دونوں طرف اللہ بدلہ ہی کیا جائے۔ پہلے اچھی بھلی دانیا کی بات مکمل ہو گئی تھی، مگر اب......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

شہریار کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیسے اس چوکھی سے نمٹے۔ جانا نہ کی تلوار سر پر پہلے سے لٹکی تھی، اوپر سے حمزہ عابد کی مشکوک سرگرمیاں..... وہ کیسے ایسے فلرٹ انسان کو اپنی اتنی پیاری بہن سونپ دے۔

شہریار دروازے سے ٹیک لگائے سنتے سنتے یکدم گلا کھنکھارنے سے چونکا تھا۔ عدیل بھائی اُس کے سر پر کھڑے تھے۔ اُس کی کلائی تھام کر اپنے کمرے میں لے گئے تھے، پھر شرارت سے بولے تھے۔

"بری بات بچے! ایسے کسی کے کمرے سے کان لگا کر باتیں نہیں سنتے، گناہ ہوتا ہے۔" اُس کے چہرے کی سنجیدگی کم نہ ہوئی تو انہوں نے اُس کی طرف نرمی سے دیکھ کر کہا۔ "تم کمزور پڑ رہے ہو تو کہو، میں پاپا سے بات کرتا ہوں، تمہارا کیس لڑنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

شہریار نے اُن کی طرف توجہ سے دیکھا، پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔ "نہیں، رہنے دیں بڑے بھیا! میں خود اپنا معاملہ سیٹل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اُس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا، مگر اُسے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ عاطف بیگ بھی اُس کے لئے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ ایسے کسی بھی عمل سے بچنا چاہتا تھا، جس سے اس کے گھر کا نقصان کسی بھی صورت میں نکلنے کا امکان ہوتا۔ سو ہر خیال پس پشت ڈال کر وہ جانا نہ کے دل میں زیادہ سے زیادہ گھر کر کے سالار عبدالرحمٰن کا دل جانا نہ کی طرف سے اچاٹ کرنے کے مشن پر جتا ہوا تھا۔ محبت کی زیادہ سے زیادہ شیرینی گھولتا رہتا تھا۔ جان جان کر جلانے کا موقع سالار عبدالرحمٰن کی زندگی میں در آتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن اچانک اُس کے سر پر بم پھٹ پڑا۔ وہ سفید ماربل کی عمارت میں جانا نہ کے ہاتھ سے سروکی گئی ڈرنک کا دوسرا پیگ لے رہا تھا کہ اُس کے سامنے ہال کے کمرے میں جو وجود داخل ہوا، وہ اُس کی جان آنکھوں میں کھینچ لینے کے لئے کافی تھا۔

''شہریار! مجھے آپ سے ایسی توقع تو نہیں تھی۔''

اُس نے خالی آنکھوں سے مسٹر عبدالرحمٰن کو دیکھا۔ سالار عبدالرحمٰن استہزائیہ سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اور عین اُس وقت جانانہ، جس مہین لباس میں سامنے سے موتیوں کی لڑی کا پردہ چھلاتی داخل ہوئی، وہ شہریار عبدالرحمٰن کے تابوت میں آخری کیل کے لئے کافی بڑا مارجن تھا۔

زندگی نے بہت برے طریقے سے اُس سے دشمنی نبھائی تھی۔ گلاس اُس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور لال ڈوراسی آنکھوں سے پاپا کو فوکس کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسٹر عبدالرحمٰن کی تیز نظر ابھی تک اُس کے وجود میں کھب رہی تھی، بلکہ اُن کی نظر میں سرد مزاجی کا عنصر بھی ایسا گھل مل گیا تھا کہ اُس کے اندر سے زندہ رہنے کی خواہش تک موت کی دہلیز کو چھونے لگی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرے۔

''پاپا! آپ مس گائیڈ ہو رہے ہیں۔'' اُس کی زبان نے پہلا دفاعی جملہ کہا۔

وہ صوفے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ پاپا قدم قدم کرتے اُس کے پاس آ گئے تھے۔ پھر اُنہوں نے اُسے کاندھے سے تھام کر کہا تھا۔

''واقعی، میں بہت عرصے سے مس گائیڈ ہو رہا ہوں۔ تمہارے متعلق میں نے سوچ کا ایک زاویہ بنا رکھا تھا، جس کے تحت تمہیں دیکھتا تھا، سمجھتا تھا۔ مگر اب لگنے لگا ہے، میں بہت بڑی بھول کر رہا تھا۔ اولاد جب آپ کے قد کے برابر ہو جائے تو وہ اپنے فیصلے خود لینے لگتی ہے، اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہے۔'' اُنہوں نے پچھلا توقف کیا، پھر بے چارگی سے بولے۔ ''مگر شہریار عبدالرحمٰن! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں، جوڑ یک میں نے آپ کی زندگی کے لئے ترتیب دیا تھا، اس میں کیا غلطی تھی؟ اگر میں نے چاہا کہ آپ بہت بلند کردار بنیں، بہت اونچے آدرش رکھیں تو یہ کس زاویے سے غلط ہے؟...... میں سمجھتا تھا، اگر کسی میں میری ذات کی جھلک ہے تو وہ صرف آپ ہو۔ مگر آج یہاں، اس جگہ اور اس پوزیشن میں آپ کو دیکھ کر مجھے کہنا پڑتا ہے، میں غلط تھا۔ بہت زیادہ غلط......''

''پاپا پلیز! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔'' پاپا کے لہجے کا درد اُس کے سینے میں مچلنے لگا تھا۔ اُس نے آخری سی کوشش کی تھی، مگر جانتا تھا، وہ جس طرح، جس پوزیشن میں پاپا کو ملا ہے، وہ اُس کی ہر قسم، ہر بات کو رد کر دینے کے لئے کافی تھا۔

اُس نے پاپا کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی، مگر اُنہوں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، پھر خفگی سے بولے تھے۔ ''شہریار! آپ یہ حق کھو چکے ہیں۔ میری محبت کا حق، میرے سینے سے لگنے کا حق، میری توجہ کا

حق۔ آج میں نے آپ کو اپنی زندگی کے ہر موسم سے بے دخل کر دیا ہے۔"

ایک اسپیس آیا اُن کی بات میں، پھر اُنہوں نے مکرر کہا۔ "پتہ نہیں، میری محبت میں کہاں کمی رہ گئی کہ آپ کو ہماری محبت سے زیادہ اس محبت میں اٹریکشن دکھائی دیا...... اس محبت میں، جو ہر آن، ہر لمحہ بدلنے کے لئے تیار رہتی ہے۔"

جانانہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یکدم اُس نے پاپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پھر نخوت سے بولی۔

"آپ کی سو کالڈ محبت کی دنیا اور اس کی کرپشن مجھے ازبر ہے، مسٹر عبدالرحمٰن! آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھ پر ہی طعنہ زنی کریں۔ میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔"

شہریار نے پاپا کے چہرے کے رنگ کو پھیکا ہوتے دیکھا تو فوراً تڑپ کر بولا۔ "جانانہ پلیز! یہ میرے پاپا ہیں۔"

جانانہ نے وہی لہجہ برقرار رکھا اور جواباً بولی۔ "میں بھی انہیں یہی جتانا چاہتی ہوں کہ انہیں یاد رہے، وہ تمہارے پاپا ہیں، مجھ پر رعب ڈالنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

پاپا نے سالار عبدالرحمٰن کا ہاتھ تھاما، پھر نہایت رنجیدگی سے بولے۔ "شہریار! مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں نے کبھی آپ کو بہت محبت دی تھی، مگر آپ...... آپ تو میری بے نیازی کے قابل بھی نہیں تھے۔ آج بہت دل دُکھا ہے میرا، بہت زیادہ۔ شاید ساری زندگی اس کا تدارک نہ ہو سکے۔"

اُنہوں نے واپسی کے لئے قدم موڑ لئے۔ شہریار پاپا کے پیچھے بے قراری سے دوڑا بھی تھا، مگر وہ دامن چھڑاتے کار میں بیٹھ چکے تھے۔ جانانہ اُس کی پشت پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی، پھر اُس کی کلائی تھام کر بولی تھی۔

"یو راولڈ مین۔ اتنی بڑی اولاد کو بھی اُنگلی تھام کر چلانا چاہتا ہے۔"

شہریار نے زخمی نظروں سے اُسے دیکھا، کچھ نہیں بولا۔ بولنے سے جو زندگی میں ترتیب رہ گئی تھی، وہ بھی جاتی رہتی، سو وہ خاموش رہا تھا۔ مگر جانانہ کے پاس ٹھہرنے کا ارادہ ترک کر کے اُس نے گھر کی راہ لی تھی۔

راستے بھر اُسے لگا تھا، جیسے وہ کسی قبر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ بار بار گہرے سانس لے کر اندر کا حبس باہر نکالنے کی سعی کرتا تھا، مگر دھواں کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔ سالار بھائی نے رقابت میں کتنا بڑا نقصان کر دیا تھا اُس کا...... اُسے لگنے لگا تھا، وہ چلچلاتی دھوپ میں بغیر سائبان کے کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس سزا کا کوئی اختتام بھی نہیں ہے۔

وہ چپکے سے اپنے رُوم میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ موبائل تک اُس نے آف کر دیا تھا۔ مگر ساری رات اُسے لگا تھا، وہ کانٹوں میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ آج پاپا کی آنکھوں

میں پہلی بار اُس نے آنسو دیکھے تھے اور یہ آنسو اُس کے نام کے تھے، اُس کی وجہ سے تھے......

وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں، رات کا کون سا پہر تھا، جب وہ اُٹھا تھا۔ پاپا سے بچ کہنے کی ہمک اُٹھی تھی، مگر پاپا کے کمرے کے سامنے پہنچا تو اُس کے قدموں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ اتنی شدت سے پاپا رو ئے تھے کہ کمرے کے باہر ماما کا دلاسہ اور پاپا کا تاسف دونوں چکراتے ہوئے اُس کے گرد دائرہ کھینچتے چلے گئے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آتا، میرا شہریار اتنا زیادہ بگڑ سکتا ہے۔ وہ ڈرنک کرنے لگا ہے اور سوسائٹی گرل ٹائپ لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اُس نے ماریہ کو دھوکا دیا ہے۔ ڈائری میں اُس کا نام لکھتا ہے اور محبت کسی اور سے نبھاتا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم، آج میں اندر سے کتنا شکستہ ہو گیا ہوں۔ مجھے میری سب سے پیاری اولاد نے توڑ دیا ہے۔ عالیہ! مجھے لگتا ہے، جیسے اس غم سے میرا سینہ پھٹ جائے گا۔''

''حوصلہ کریں۔ پلیز عبدالرحمٰن! اپنے لئے نہ سہی، میرے لئے حوصلہ کریں۔ بھولنے کی کوشش کریں۔ جو سہا ہے، کبھی یاد آئے بھی تو سمجھا لیجئے گا اپنے دل کو کہ شاید یہ فساد اس کی رگوں میں دوڑتے خون کا ہے۔ تربیت اور دودھ کی خصلت کبھی کبھی خون کے آگے ماند پڑ ہی جاتی ہے۔''

شہریار نے ہونٹ بھینچ کر یہ اذیت سہی۔ پاپا ہمیشہ نانو کے اس قسم کے جملوں پر اس کا دفاع کرنے میں کسی لیت ولعل سے کام نہیں لیتے تھے، مگر آج پاپا نے ماما کی زبان سے یہ تلخی سن کر بھی خاموشی اختیار کر لی تھی تو کیا پاپا بھی یہی سمجھتے ہیں، میرا خون خراب ہے، کون ہوں میں؟...... کس کے وجود کا ٹکڑا ہوں؟...... کون ہو گی وہ عورت، جس کے حصے کی سزا اس کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی...... جو خود ٹھکرائی گئی تھی تو اپنی اولاد میں اپنی وراثت منتقل کر کے آج بھی ٹھکرائے جانے کا مزہ چکھ رہی ہے۔

وہ پشت موڑ کر اپنے رُوم کی طرف واپس لوٹ آیا تھا۔ حالانکہ قدم چلنے سے انکاری تھے اور سینے کا درد ایسا تھا کہ حشر اُٹھے تو قرار پائے...... مگر اس نے پھر بھی صرف پہلو لے کر درد کو بہلا لیا تھا۔

پھر سوچتے، اذیت سہتے کب نیند آئی، پتہ نہیں چلا۔

آنکھ کھلی تو دانیا کو اپنے کمرے میں پایا۔

''آج ناشتہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ ''جلدی سے تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جائیے۔ میرے پیٹ میں بہت چوہے دوڑ رہے ہیں۔''

وہ اُسے منع کر دینا چاہتا تھا۔ وہ پاپا کا چہرہ سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا خود میں، مگر دانیا نے اتنے اصرار سے کہا تھا کہ وہ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

پاپا کے چہرے میں اُسے دیکھ کر تناؤ آ گیا تھا۔ سالار بھائی کی آنکھوں میں غصے سے سرخی بھر گئی تھی۔ ماما کا انداز بھی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ لیا دیا تھا۔ عدیل بھائی دفتر جا چکے تھے اس لئے وہ قطعی دانیا کے رحم و کرم پر تھا۔

دانیا کا انداز پہلے جیسا تھا۔ شاید وہ ابھی تک کل کے واقعے سے لاعلم تھی۔ اُس نے سکون کا گہرا سانس لیا اور نجی مصروفیات سے وقت نکال کر پاپا کے دفتر چلا گیا۔ دفتر میں بھی پاپا مصروفیت پوز کر کے اسے جان جان کر اگنور کر رہے تھے۔ وہ اُنہیں دیکھ کر کبھی کڑھتا، کبھی خود بھی اپنے گرد مصروفیت کی بھیڑ لگا لیتا۔

پھر پاپا کے موڈ کی خرابی کے باوجود وہ زندگی سے ایڈجسٹ کرنے پر راضی ہو ہی رہا تھا کہ ایک ہفتے بعد اچانک عاطف نے اُسے بہت پہلے کی طرح ایک ہوٹل میں پہنچنے کا کاشن دیا۔ شہریار حمزہ عابد کا نام سن کر ہی دوڑا گیا تھا۔ ہوٹل کے کونے میں ایک کپل بیٹھا تھا۔ لڑکی کی شہریار کی طرف پشت تھی، مگر حمزہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ستون کی آڑ سے بخوبی ماحول کا جائزہ لے سکتے تھے۔ حمزہ عابد آرڈر پلیس کروا رہا تھا۔ پھر ویٹر کے جاتے ہی اُس نے بہت محبت پاش نظروں سے سامنے بیٹھی لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جن نظروں سے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا، شہریار کا خیال تھا، ان نظروں کی محبت کا حق صرف اُس کی دانیا کے سوا کسی کو نہیں تھا۔

''میں ابھی کے ابھی اس لڑکے کا دماغ درست کر دوں گا۔''

وہ غصے میں بھنا کر آگے بڑھا، لیکن عاطف بیگ نے اُس کا ہاتھ ہولے سے تھام لیا، پھر ملائمت سے بولا۔

''بہتر یہ ہے کہ معاملات کو احسن طور پر ہینڈل کر لیا جائے۔ زیادہ سختی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔''

شہریار نے سنا، پھر وہ پہلی سیڑھی پر تھا کہ اُس نے حمزہ عابد کو کرسی چھوڑ کے کھڑا ہوتے دیکھا۔ وہ اس لڑکی سے بہتر طور پر بات کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔ قدرت نے اُسے خود موقع دے دیا تھا۔ اُس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ عاطف بیگ اُس کے ساتھ تھا۔ عاطف بیگ کی نظر سامنے بیٹھی لڑکی پر پڑی تو اُس نے برملا دھم ہو کر کہا۔

''ہاں، یہی ہے وہ لڑکی جس کے ساتھ اکثر فرینڈز نے حمزہ کو دیکھا ہے۔''

شہریار کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ کہاں وہ غصے میں مارنے مرنے پر تلا بیٹھا تھا، کہاں وہ سامنے بیٹھی لڑکی جو مجسم حسن تھی، کے سامنے دم سادھے کھڑا رہ گیا تھا۔ پھر سرسرائے لہجے میں پکارا۔

"تم نے مجھے جیت کیا ہے جانانہ!"

وہ بہ وقت یہی کہہ سکا اور نقرئی قہقہہ اطراف میں بکھرتا چلا گیا۔ پھر بولے سے لب ہلے تو لفظوں نے زبان پائی۔

"میری زندگی جگسا پزل گیم کی طرح ہے آخری ٹکڑے تک کیا صورت ہوگی، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور یہی تھرل مجھے پسند ہے۔ ویسے آج کے لئے میں تمہارے سامنے نیلم کا ایکٹ کر رہی ہوں۔ حمزہ سمجھتا ہے، میں اس کے بچپن کی کسی کہانی کی نیلم پری جیسی ہوں۔ میں نے بھی اسے اس فیری ٹیل سے باہر نکلنے نہیں دیا۔"

"تم نے اس زاویے سے چوٹ کیوں ماری؟" وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

عاطف بیگ کا چہرہ حیرت سے اٹا پڑا تھا۔ اگر یہ جانانہ تھی تو واقعی وہ انگلیوں پر زمانے کو نچا سکتی تھی، مگر اس زمانے میں کیا ضروری تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن بھی شامل ہوتا........

سوال ہنوز برقرار تھا۔ تب اس نے جوس کا سپ لیتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا، کیا واقعی مجھے سالار عبدالرحمٰن سے طوفانی عشق ہو گیا تھا؟ وہ خوب صورت ہے، مگر میری نظر اس پر اس لئے ٹھہری تھی، کیونکہ وہ مسٹر عبدالرحمٰن کا بیٹا تھا........ اور تمہارے باپ سے میرے کچھ حساب نکلتے ہیں۔ میں نے سالار سے جی بھر کر کھیلا، مگر میری کوشش تھی کہ میں کسی طرح تم سے متعارف ہو سکوں۔ تم اپنے باپ کے سب سے با اصول بیٹے تھے۔ تمہاری تربیت پر تمہارے باپ کو ناز تھا اور میں چاہتی تھی وہ ناز، وہ بھرم ٹوٹ کر رہ جائے۔ اس لئے میں نے معاملات اس نہج پر پہنچا دیئے کہ تمہیں میدان میں کودنا ہی پڑا........

شہریار عبدالرحمٰن! تمہیں اپنے باپ کی قابل اولاد ہونے کے علاوہ بھی تمغہ دیا تھا میرے دل نے........ مگر اس حساب کا گوشوارہ پھر کبھی، مگر یہ طے ہے، تم چاروں طرف سے ٹریپ ہو چکے ہو۔ حمزہ عابد میرے ساتھ صرف چند گھنٹے گزارنے کے لئے تمہاری دنیا کو ٹھکرانے سے بھی نہیں چوکے گا۔ تمہیں معلوم ہے حمزہ عابد بھی میرا ہی اسسٹنٹ تھا۔ وہ کچھ لالچی بھی ہے، کچھ کرپٹ بھی........ اس لئے میری جھوٹی محبت کو واقعی جھوٹی محبت سمجھنے کے باوجود وہ اس ساری کہانی میں موجود رہا۔ بقول اس کے میرا ساتھ دینے سے اُسے میں بھی ملتی تھی اور میرے مشورے پر عمل کرنے سے تمہارے باپ کی دولت اور تمہارے باپ کے نام سے منسلک ساکھ اور شہرت بھی اور بغیر کسی محنت کے ایک پتی ورتا بیوی بھی حاصل کرنے کا ترپ کا پتہ ایسا تھا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکا۔"

"تم........ تم بہت ظالم ہو جانانہ! تم نے مجھ سے کتنوں کے دل تڑوائے، میری ذات کو کہاں کہاں سوال نہیں بنا دیا، کیا کبھی ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں میرے دل پر رحم نہیں آیا؟"

”رحم....... ہاہاہا....... یہ لفظ میری ڈکشنری میں کبھی نہیں آتا۔ اگر میں رحم کرنے لگ جاؤں تو کسی مزار پر نہ جا بیٹھوں؟....... شہریار عبدالرحمٰن! ہوسکتا ہے، کسی پر مجھے کبھی رحم آیا بھی ہو، لیکن تمہیں سوچ کر ہمیشہ میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں چاروں طرف سے تنہا کردوں۔ تمہارے پاس کوئی رشتہ، کوئی ساتھی نہ ہو تم صحرا میں صدا دیتے دیتے، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے پھیرتے پیاس سے مرجاؤ اور تمہیں کوئی سیراب نہ کرے، کوئی بھی نہیں۔“

عاطف بیگ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے چپ رہنے پر مجبور کردیا تھا اور جانا نہ اترا کر بولی تھی۔

”میرے کمال کا جادو دیکھا۔ تم جانتے ہو، میں نے تمہیں ریجیکٹ کیا ہے۔ تم جانتے ہو حمزہ عابد کریٹ ہے لیکن پھر بھی تم کچھ نہیں کرسکتے۔ تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ تم حمزہ عابد کو دانیا سے دور نہیں کرسکتے....... تم عدیل عبدالرحمٰن کی محبت چھننے سے بچانے اور عائشہ سالار کو گھر میں باعزت طور پر لانے کی حسرت میں کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ تم میرے خلاف نہیں جاسکتے تم مجھ سے شدت کی نفرت کرنے کے باوجود اب بھی مجھ سے دور نہیں ہوسکتے....... ہے ناں کمال؟“

وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔ شہریار عبدالرحمٰن خاموشی سے اُس کے چہرے پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ یہ اوصاف کہ اُس کی نظریں اب بھی حمزہ عابد کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”بے فکر رہو....... وہ بہت کم ہمت ہے، میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔“ جانا نہ نے اُس کی نظروں کا مفہوم بھانپ کر جواب دیا۔ عاطف بیگ نے اشارے سے کچھ کہنا چاہا مگر وقت ظلم کی انتہا بن کر شہریار عبدالرحمٰن کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

جانا نہ کو دیکھ کر بھی عاطف بیگ مطمئن رہا تھا، مگر سالار عبدالرحمٰن کے ساتھ دانیا کو دیکھ کر اُس کی جان نکل گئی تھی۔

یہ نئی بھائی بھی ناں....... یہ آخر کس کس کا دامن میرے ہاتھ سے چھڑائیں گے؟ میرے پاس کھونے کے لئے ہے ہی کیا، جو یہ مجھ سے سانس لینے کا اختیار بھی چھین لینا چاہتے ہیں؟....... شہریار نے بے بسی سے سوچا تھا۔

دانیا، شہریار کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا تھا، مگر اُس کی آنکھوں کا کرب.......

حمزہ عابد، دانیا کے آتے ہی جانے کہاں سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ پھر شہریار اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ دانیا نے سوال کیا۔

''یہ ہے جانانہ...... یہ وہی لڑکی ہے ناں، جس نے نائمہ کو دربدر کردیا۔ سلامہ بھائی کو ڈھیر ساری شرمندگی بخشی...... یہی ہے ناں جانانہ، جس کی وجہ سے شاکرہ آنٹی کی ایک بیٹی زمانے کی بھیڑ میں گم ہوگئی اور ایک بیٹی ہنستے بستے گھر سے واپس اپنے گھر میں لا پٹخی گئی۔ جنید بھائی نے بھلے سخت آپشن کے بجائے نارسائی کا زہر پیا، لیکن یہ تو طے ہے ناں شیری بھائی، سارے اپ سیٹ اس جانانہ کی وجہ سے ہماری زندگی میں در آئے...... مگر آپ پھر بھی اسی کا دم بھرتے ہیں؟ کل سالار بھائی نے سفید مارٹل کے گھر کی کہانی سنائی، میں نے پاپا کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے، مگر پھر بھی مکر گئی کہ شاید کچھ مسئلہ ہے، شاید آپ کو کوئی بھی ٹھیک نہیں سمجھ رہا۔ کل حمزہ نے مجھے آپ کی غیر آفیشلی مصروفیات کی تفصیل سے آگاہ کیا تو میں حمزہ سے لڑ پڑی۔ میں آپ کے لئے ساری دنیا سے لڑ پڑی اور آپ...... آپ اس وقت بھی؟...... آپ کو پتہ ہے، میں اس وقت بھی حمزہ کو غلط سمجھتے ہوئے اس کے فون پر سنی بھائی کے ساتھ آئی تھی، مگر شیری بھائی......!''

شہریار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں نمی اور دھوپ ایک ساتھ بھر گئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں جانانہ، حمزہ عابد اور وانیا تینوں کے چہرے ٹرائی اینگل کی طرح دکھائی دیتے تھے، جو ملے دکھائی دیتے، تب بھی الگ الگ لگتے تھے۔ اُنہیں الگ رہنا بھی چاہئے تھا۔ وانیا معصوم تھی، حمزہ عابد، وانیا جیسی لڑکی کا جیون ساتھی بننے کا مستحق نہیں تھا۔ وانیا کا دل حمزہ عابد سے بدانہیں کیا جاسکتا تھا، وہ تو اتنی محبت کی ماری تھی کہ خود اُس کی غلطیوں کا انکار کرسکتی تھی، یہ تو پھر حمزہ عابد تھا۔ اُس کا منگیتر......

وہ کیا کرے کہ یہ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے...... سالار عبدالرحمٰن اور وانیا اور اس کا گھر سب بچ سکتے تھے۔ مگر کس طرح؟...... اُس نے اندر جھانکا اور پھر زیرک فہمی سے نئی چال چلی۔ بہت تاسف کا تاثر دے کر بولا۔

''مجھے افسوس ہے، میں تمہاری مرضی کے مطابق عمل نہیں کرسکا۔ میں نے بہت چاہا، میں جانانہ کی طرف سے دل موڑلوں، لیکن اُس کی محبت سے دامن چھڑانا میرے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ وانیا! میں چاہ کر بھی اپنے دل کو ماریہ سے شادی پر راضی نہیں کرسکا ہوں۔''

جانانہ نے اچانک پانسہ پلٹتے دیکھا تو حیرت سے شہریار کو دیکھنے لگی۔ حمزہ عابد کے چہرے سے بھی رنگ آکر گزر گیا۔ اُس نے تو نہایت مہارت سے عاطف بیگ کو ہوٹل کے باہر دیکھ کر یہ گیم کھیلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس چویشن میں شہریار کو پا کر سلامہ کی طرح وانیا بھی اس سے نفرت کرنے لگے گی، اس کے کردار کی پستی دیکھے گی تو خود ماریہ کے لئے اسے ریجیکٹ کر کے اپنی اس ضد سے باز آکر خاموشی سے اس کی محبت کے جھانسے میں آجائے گی، اس کا گھر دولت سے بھر دے گی۔ جانانہ کا نہ سہی، اُس کا پلان ضرور کامیاب ہوجائے گا۔ مگر اس لمحے چوروں کو مور پڑ گئے تھے۔ شہریار نے جانانہ کی اُنگلی سے ہی

رنگ نکال کر بصد خلوص اُس کی سیدھے ہاتھ کی دوسری اُنگلی میں پہنا کر مخمور لہجے میں مکرر کہا تھا۔
''آئی ایم سوری جانا نہ! یہ موقع بس اچانک ہی چلا آیا، وگرنہ میں نے اس منگنی کے لئے بے حد خوب صورت پروگرام ترتیب دیئے تھے۔ آج اس لمحے سے بھی تمہیں اپنانے کا عہد کرتا ہوں۔ اب تم پر کوئی شخص اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا۔''
سالار عبدالرحمٰن نے دانیا کا ہاتھ پکڑا تھا۔
''بھائی! گھر چلیں، مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔'' دانیا رونے لگی تھی لحہ بھر کو رُکی اور پھر شہریار کو دیکھ کر بولی۔ ''شیری بھائی! مجھے نہیں لگتا، یہ آپ ہیں۔ آپ کا دل تو کتنا سوفٹ ہوتا تھا، مگر آج اپنی خوشی کے آگے آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میری خوشی بھی نہیں...... آپ بدل گئے ہو...... آپ بہت بدل گئے ہو۔''
وہ پشت موڑ کر سالار بھائی کے ساتھ تیز قدموں سے ہوٹل کی سیڑھیاں اُترتی چلی گئی تھی۔ شہریار نے ایک لمحے کے لئے مڑ کر دیکھا تھا، پھر محبت سے تھاما ہوا جانانہ کا ہاتھ تیزی سے جھٹک دیا تھا، پھر قدرے سی سختی سے بولا تھا۔
''تمہارا گیم اپنی جگہ، مگر آج کے بعد دانیا اور سالار بھائی پر تم کوئی گیم نہیں کھیل سکتیں۔ وہ بہت حساس ہیں، مجھ سے بھی تو اور زیادہ...... وہ کسی کی استعمال کی ہوئی چیز تو کیا، کسی چیز پر اگر کسی کا نام بھی لے لیا جائے کہ اس شخص کی ہے تو بھی وہ انتہائی ضرورت میں بھی اس چیز کو چھوتے تک نہیں ہیں۔''
وہ مڑا، پھر حمزہ عابد کو دیکھ کر بولا۔ ''دانیا کی ضد تم جانتے ہو، اس لئے تم اندازہ کر سکتے ہو تمہارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔''
حمزہ عابد تن فن کرتا کھڑا رہ گیا تھا۔ صرف شہریار عبدالرحمٰن، عاطف بیگ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا تھا۔ پھر کھلی ہوا میں سانس لے کر اس نے عاطف بیگ کو مخاطب کیا۔
''میں نے کچھ دیر پہلے سب کو اُن کے نقصان سے آگاہ کیا، مگر عاطف! سب سے زیادہ تو خسارہ میرے حصے میں آیا ہے۔ میں کیا کروں، اپنی تنہائی کا ماتم کس طرح کروں کہ دل کو قرار آ جائے؟''
عاطف نے اُس کے لہجے سے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھاما تھا اور وہ، جو سگریٹ کو شعلہ دکھا رہا تھا، یکدم بے قراری سے عاطف کی طرف دیکھ کر اینچے لہجے میں بولا تھا۔ ''عاطف! آئی نیڈ آ ڈاکٹر۔''
عاطف بیگ، جو اُس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک سے پہلے ہی ہراساں ہو رہا تھا، اس جملے پر گھبرا گیا تھا۔ تیزی سے اُس نے فرنٹ ڈور کھولا تھا۔ شہریار بہ دقت فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ عاطف نے کار کو بہت تیز

رفتاری سے گاڑیوں کے سیل رواں میں ڈالا تھا۔شہریار نے سر سیٹ سے ٹکا رکھا تھا۔تب اچانک عاطف بیگ نے کہا تھا۔

''زبان کے نیچے گولی رکھ۔''

اور وہ اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ یہ سامنے کی بات اُسے یاد نہیں رہی تھی۔عاطف بیگ نے ہی اُس کے بتانے پر ڈیش بورڈ میں سے اُس کی دوا نکال کر دی تھی۔زبان کے نیچے گولی رکھنے کے باوجود آج در د لگتا تھا کہ سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔تب اچانک عاطف نے اُس کا کاندھا تھام کر کہا۔

''بی بریو! ہسپتال زیادہ دور نہیں، اپنے آپ کو ریلیکس رکھو۔آنکھیں کھولو۔دیکھو، جو میں کہنا چاہتا ہوں، وہ سمجھنے کی کوشش کرو۔اپنے آپ کو سنبھالو شیری! تم سن رہے ہو ناں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

شہریار نے بہ وقت آنکھیں کھولیں، پھر نرم لہجے میں بولا۔

''ریلیکس مجھے نہیں، تمہیں ہونے کی ضرورت ہے۔میری کنڈیشن ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی ہے تم آرام سے گاڑی......''

آدھا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا، کیونکہ جھوٹ بولنے پر دل نے بہت سختی سے تنبیہ کی تھی۔اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا تھا۔گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کی تھی، مگر لگتا تھا ساری آکسیجن ہوا سے کسی نے ایک ہی سانس میں پی لی تھی۔پھر اس سے پہلے کہ عاطف بیگ بالکل ہی ہمت چھوڑ بیٹھتا، وہ شہریار کے بتائے گئے ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

ڈاکٹر نواز بہت پہلے سے اُس کا کیس ہینڈل کر رہے تھے، اس لئے ٹریٹمنٹ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔تین گھنٹے کی سر توڑ کوشش کے بعد اُس کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔

عاطف بیگ پہلی بار جب اُس کے سامنے گیا تو عرق آلود پیشانی کے ساتھ پھولی ہوئی سانسوں میں وہ صرف عاطف کا ہاتھ تھام سکا تھا۔کوئی لفظ معنی نہیں بنا تھا، مگر شہریار کے ہاتھ کا دباؤ سب لفظ کہہ گزرا تھا۔ڈاکٹرز نے اُسے بولنے سے منع کر رکھا تھا، سو عاطف بیگ چند لمحے ٹھہر کر باہر چلا گیا۔

''پتہ نہیں، مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے یا تم سے شکوہ کرنا جائز ہے۔زندگی سے ہاتھ چھڑانے کا ایک موقع ملا تھا مگر اس میں بھی میں لوزر ہی رہا......معلوم نہیں موت بالکل قریب دیکھ کر دل ایک بار جینے کی ہمک کیوں کرتا ہے۔''

ہسپتال میں یہ اُس کا دوسرا دن تھا، جب اُس نے مربوط جملہ کہا تھا۔عاطف بیگ جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔وہ کل رات سے جاگ رہا تھا، ابھی تک اُس کی آنکھوں میں کچھ نیند کا خمار تھا۔وہ بس اُس کی

کیئر کرنے میں مگن تھا۔

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی، جب وہ ڈسچارج ہو کر اپنے رُوم میں آیا تھا۔ کمرہ پوری طرح کسی کی محنت کا غماز تھا۔
وہ لڑکی ناراضگی کے باوجود اور سب کی طرح اُس سے قطع تعلق نہیں کر سکی تھی۔ اُسے دانیا پر ڈھیروں پیار آ گیا تھا۔
وہ عاطف کو روم میں چھوڑ کر اندرونی سمت میں بڑھتا چلا گیا تھا مگر ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ حمزہ عابد کی آواز سن کر ٹھہر گیا تھا، پھر تیز قدموں سے اندر پہنچا تھا۔ شہریار کی آمد دیکھی تو حمزہ عابد نے اُس کی طرف اُنگلی اُٹھا کر پُریقین انداز میں کہا۔

”دیکھ لیجئے انکل! یہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود پوچھ سکتے ہیں کہ اس کی زندگی کے شب و روز کس حساب سے بیت رہے ہیں۔ دانیا تین دن سے ان کی وجہ سے پریشان ہے اور انہیں پروا نہیں ہے۔ وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے۔ جانانہ کا معاملہ آپ کے لئے بھی اب مبہم نہیں رہا، مگر انکل! مجھے یہ بتایا جائے، میری ماں نے شہریار کی آس میں جو ماریہ کے اچھے اچھے رشتے مسترد کیے، اس کا نقصان کس طرح پورا ہو گا؟ آپ جانتے ہیں ناں، جانانہ کس قسم کی لڑکی ہے اور یہ شہریار اس کے ساتھ شما میں مناتا ہے۔“

اُس نے بے چارگی سے ٹیبل پر پڑی تصویروں کو دیکھا اور سمندر کی طرح خاموش پاپا کو...... غلطی ہو تو فوراً جرم عائد ہونے سے دل کو تسلی ملتی ہے۔ لیکن اگر معافی دے دی جائے تو احساسِ زیاں زور پکڑنے لگتا ہے۔ صرف عدیل بھائی اس سارے معاملے میں اُس کی حمایت کر رہے تھے اور یہ بات کہ تین دن کی [illegible] غیر حاضری اور اتنی بے تکلفانہ تصویروں نے اُن کے اندر بھی شکوہ بھر دیا تھا۔ شکوے سے قطع نظر وہ پھر بھی اُسے سپورٹ کر رہے تھے۔ مسٹر عبدالرحمٰن کتنی دیر اُس کے چہرے کو دیکھتے رہے، پھر سرسراتے لہجے میں بولے۔

”کیا آپ واقعی میں جانانہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں شہریار عبدالرحمٰن؟“

اُس نے سر جھکا لیا تھا۔

پاپا اُس کی خاموشی سے شاکڈ رہ گئے تھے۔ اُن سے کتنی دیر کچھ نہیں بولا گیا تھا اور اس عرصے میں مانو اُس کے قریب آ چکی تھیں۔ پھر ہوا میں اُن کا ہاتھ بلند ہوا تھا اور اُس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا تھا۔ غصے میں پھنکار کر انہوں نے کچھ ساعت بعد کہا تھا۔

"تم.......مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم جیسی اولاد کبھی سُکھ نہیں دے سکتی۔ پتہ نہیں، کس کی غلطی ہو تم، جسے عبدالرحمٰن نے میری بیٹی کے سر تھوپ دیا۔ تم جیسے کیڑے مکوڑوں کو تو کچرے کے ڈھیر پر ہی رینگنے دینا چاہیے، یا کسی یتیم خانے میں ڈال کر بھول جانا چاہیے۔ عبدالرحمٰن نے سب سے بڑی غلطی کی ہے تمہیں اپنا نام دے کر.......تم نے اس نام کی عزت کی دھجیاں جس طرح اُڑائی ہیں، اس پر خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

شہریار کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو گیا تھا، مگر پاپا نے نانو کو کسی بھی لمحے چپ نہیں کرایا تھا، جیسے وہ اُن کی ایک ایک بات سے متفق تھے اور یہ بات اُس کے دل میں انی کی طرح کھب گئی تھی۔

سب اُس کے خلاف تھے، سوائے عدیل بھائی کے۔ اُس نے دل میں سوچا۔ اپنے دل کے کسی کونے میں وانیا بھی اُس کے لئے کوئی رائے ضرور رکھتی ہوگی۔ وہ کیا رائے ہوگی؟

وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا تاکہ جان سکے کہ وانیا کا اس معاملے میں کیا فیصلہ ہے.....حالانکہ تین دن پہلے کی ملاقات کوئی خوش گمانی اختیار کرنے سے ٹوک رہی تھی، مگر اپنا کمرہ دیکھ کر، اُس کی پرواہ کیے کر وہ زندگی کا ایک مارجن ضرور لینا چاہتا تھا۔

وہ ابھی تک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

"ہم ماریہ کی شادی تمہارے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بس ہو گیا فیصلہ۔ ماریہ بھی ہمیں وانیا سے کم عزیز نہیں۔" ماما نے پہلی بار زبان کھولی۔

حمزہ عابد، ماما کو ساکت دیکھنے لگا۔ ماما نے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو بے حد شرمندگی سے بولیں۔ "حمزہ بیٹا! ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں، لیکن ہم اس معاملے میں قطعی بے بس ہو چکے ہیں۔ جو ہم نے سوچا تھا، ویسا اب ہونے کا نا امکان ہے، نہ میری تمنا۔ ماریہ جیسی پیاری لڑکی کو خود اُس کی طرح کا کوئی پیارا انسان ہی ملنا چاہیے۔ وہ یہی ڈیزرو کرتی ہے۔"

ماما کے فقرے سے حمزہ عابد اُداس ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "آنٹی! غلطی شہریار کی ہو تو سزا وانیا کو کیوں ملے؟ آپ میری طرف سے اُسے سمجھانے کی کوشش کریں ناں کہ وہ شہریار کے کردار کے چھچھلے پن پر اپنی خوشیاں کیوں قربان کرنے پر تلی ہوئی ہے؟ یقین کریں آنٹی! اس سارے معاملے کے بگاڑ کے باوجود مجھے وانیا کو اپنا کر خوشی ہوگی۔"

وہ حق دق حمزہ عابد کی اس نئی چال کو دیکھنے لگا۔ اگر معاملہ وہی ہنوز رہنا تھا تو بدنامی سر لینے کا کیا مقصد رہ جاتا تھا۔

"پاپا! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اُس نے بہ وقت معاملہ حق میں کرنے کی کوشش سی کی، مگر نانو نے سختی سے اُسے گھور کے دیکھا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ نفرت سے کہا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو، کیا نہیں، ہم میں سے کسی کو اس میں دلچسپی نہیں۔ تم یہاں سے دفع ہو سکتے ہو اس سے پہلے کہ میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاؤں۔“
اُس نے پاپا کو دیکھا، پاپا نے اُس کی حمایت میں کوئی لفظ نہیں کہا اور وہ تیزی سے باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں لوٹا تو عاطف بیگ کو اپنا منتظر پایا۔
”کہاں رہ گئے تھے؟ ہوئی وانیا سسٹر سے بات؟“ رسالہ رکھ کر توجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہوا، مگر اُس کے چہرے پر نظر گئی تو پریشان ہو گیا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ٹھنڈے یخ ہاتھ تھام کر پریشانی سے دیکھا۔
”حمزہ عابد ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ اپنا کیس نئے سرے سے لڑ رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ کوئی ایک بھی وہاں میری حمایت میں نہیں ہے وہ سب جانانہ کے معاملے میں مجھ سے اتنا ڈس ہارٹ ہو گئے ہیں کہ میری تین دن کی غیر حاضری کو بھی وہ جانانہ کے ساتھ وقت گزاری کا پیش خیمہ سمجھ رہے ہیں۔ کسی نے بھی میرے چہرے کی تھکن پر غور نہیں کیا۔ میری آنکھوں کی تکلیف کسی نے مارک نہیں کی۔ اور وہ وانیا...... وہ لڑکی ناراض ہو کر اپنے کمرے میں ایسی بند ہے، ایک لمحے کے لیے بھی میں اُس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ عاطف! اگر یہی رہا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔
عاطف کچھ دیر تو اُس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سب لمٹ سے زیادہ ہے۔“
کچھ دیر تو اُس کی طرف سے کسی جملے کے آنے کا انتظار کیا، مگر اُس کی خاموشی سے بالآخر عاطف بیگ پھٹ پڑا۔
”مجھے تمہاری تھیوری سمجھ نہیں آئی؟ تم نے دیکھا، اُس شاطر نے بگڑا ہوا معاملہ کس طرح اپنے حق میں کر لیا۔ اگر تم یہ بات انکل سے پہلے کر گزرتے تو وہ اس وقت ایک لفظ کہنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہ کیا بے وقوفی ہے کہ سالار بھائی، عائشہ بھابی کے ہوتے ہوئے جانانہ میں انٹرسٹ لیں تو بھی تم اپنی جان پیش کر دو...... رابعہ بھابی اور عدیل بھائی کی محبت، جو وہ کالج کے زمانے سے کرتے آ رہے ہیں، سالار بھائی کی نا سمجھی سے اس محبت میں خسارہ آئے تو بھی تم اپنی ذات پیش کر دو...... حمزہ عابد کی فلرٹیشن کا دُکھ وانیا کی زندگی میں نہ آئے، وہ یہ بھی نہ جان سکے کہ حمزہ عابد کتنا بُرا انسان ہے، اُس کے لئے بھی ساری نفرت تم سمیٹ لو...... وانیا محبت سے محبت کرتی رہے، محبت کے نام پر وہ بکھر نہ جائے...... شیری! مجھے بتاؤ، جانانہ کا یا کسی اور کا کیا گیا؟ حالات نے چاروں طرف سے صرف تم سے گیم کھیلا ہے اور تم اس گیم میں ہار گئے ہو۔ کچھ معاملوں میں بہت زیادہ سوچنا سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، عائشہ بھابی کبھی یہ کہیں گی کہ انہوں نے تمہیں اپنا گھر بچانے کی قسم دے کر جانانہ کے سامنے چارے کی طرح لے جا کر پھینکا تھا؟ کوئی تمہاری گواہی نہیں دے گا۔ تم بدنام ہو گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے، بدنامی کیا ہوتی ہے؟“

شہریار نے زہریلے انداز میں قہقہہ لگایا، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں بدنامی کیا ہوتی ہے۔ بدنامی کا دوسرا نام شہریار ہے...... پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ میری تو پیدائش سب سے بڑی بدنامی ہے۔“

آج جو حجاب تھا، اُٹھ گیا تھا۔ وہ عاطف بیگ کے سامنے بالکل ویسا کھڑا تھا، جیسے اپنی تنہائی میں خود کو ملتا تھا۔ اس لئے کہ اُس کے اندر اپنی ذات کے کانپنے ہونے کا جو ہلکا سا احساس تھا، آج اس احساس کو پاپا کے جملوں نے مار دیا تھا۔ وہ پاپا کی ذات اور اُن کی توجہ کی وجہ سے اپنی ذات کی جنگ لڑ لیتا تھا۔ لیکن آج اُسے لگا تھا، جیسے پاپا نے مانو کے جملے پر کوئی ردِعمل نہ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ جیسے وہ واقعی ان پر بوجھ ہو......

وہ بت کی طرح بیٹھا تھا، جب عاطف نے اُس کی دراز سے اُس کی دوا نکالی تھی۔

”تمہارا بلڈ پریشر شوٹ کر رہا ہے، پھر سے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔ ڈاکٹر نواز نے کہا تھا، تم اپنی ذمہ داری پر گھر جا رہے ہو، مگر احتیاط نہ کی تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔“

”بات بگڑ گئی ہے عاطف! اور اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، زندگی طویل ہے یا مختصر...... بس اتنا علم ہے کہ زندگی تلخی کے سوا کچھ نہیں ہے میرے لئے......“

”تم صرف مایوسی سے سوچ رہے ہو۔ ورنہ دنیا میں ایسا کچھ نہیں ہے، جسے محنت سے بدلا نہ جا سکے...... کم آن شیری! تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے، زندگی پہلے جیسی ہو سکتی ہے۔“

شہریار عبدالرحمٰن اُسے دیکھنے لگا۔ کچھ نہیں بولا۔

”کچھ دیر کے لئے سب بھول جاؤ، دوا کھا لو۔“

”دوا، فاصلے موت کے کچھ اور بڑھا دیتی ہے۔ جانے لوگ پھر اسے دوا کیوں کہتے ہیں؟“ وہ استہزاء سے مسکرایا۔

عاطف بیگ اُس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر ملامت سے بولا۔ ”فضول سوچوں کو چھوڑ دو۔ مایوسی کی باتیں تم پر جچتی نہیں ہیں۔ کسی کے لئے نہ سہی، میرے لئے زندہ رہو۔ تم نہیں جانتے، تم میرے لئے کتنے ضروری ہو۔“

”اچھا...... میں اور تمہارے لئے ضروری ہوں۔“ وہ ہنسا، پھر اُس کی صورت کی گھبراہٹ سے حظ لیتا ہوا موڈ یکسر بدل کر شوخی سے بولا۔ ”تیرے لئے میں ضروری ہوں۔ اگر یہ بات تیری دو ورجن گرل

فرینڈز کو پتہ چل گئی ناں تو، تُو تو گیا۔"

عاطف بیگ اُسے مطمئن دیکھ کر اس بار اطمینان سے مسکرایا پھر نچھاور لہجے میں بولا۔ "تیرے لئے وہ ورجن گرل فرینڈز تو کیا، کچھ بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ اتنا پیارا ہے تو کہ تیرے مقابلے میں کچھ اور لے کر خسارہ کرنا ہے ہم نے؟"

"عاطف! بہت زیادہ ہے یہ اچھا، میں نے دوا کھالی ہے، اب زیادہ مسکہ مت لگاؤ۔" وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ کر مسکرایا۔

عاطف کرسی پر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "سینے میں اب تو درد نہیں ہے ناں؟ سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟"

وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن کو اُس کی بے لوث محبت پر بے اختیار پیار آگیا۔ اُس نے اُس کے ہاتھ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر چاہت سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ اب میں پہلے کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تم جیسے بہادر انسان سے مجھے یہی توقع تھی۔" جملہ ادا ہوا مگر عاطف خاموش بیٹھا تھا۔ عاطف نے پلٹ کر دیکھا، شہریار کی نظروں میں وہ چہرہ فوکس ہوگیا تھا۔

"عدیل بھائی!" شہریار کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

وہ اُس کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئے، پھر آہستگی سے بولے۔ "حالات کا مقابلہ بہادر لوگ ہی کیا کرتے ہیں اور مجھے یقین تھا، تم کم ہمت نہیں ہو۔" لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر مکرر بولے۔ "میں وہاں کھڑا تھا، سب کے بیچ، مگر دل کہتا تھا کچھ مس ہورہا ہے۔ میرا شیری اتنا کچھ غلط کرنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ شہریار کا دل جتنا سوفٹ ہے، کیئرنگ ہے، وہ یہ سب کر ہی نہیں سکتا۔ سو یہی سوال مجھے یہاں کھینچ لائے۔ گھر کے زیادہ تر افراد تمہارے غلط ہونے کا سوگ منا رہے ہیں مگر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے سوچا، ایک بار تو تم سے تمہاری آنکھوں میں آنکھ ڈال کر پوچھوں، سچ کیا ہے۔"

"اگر سچ وہی ہوتا تو؟" شہریار نے جانے کیوں پوچھا۔

مگر عدیل بھائی جذبات میں کنجوس کہاں تھے، فوراً اُس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولے۔ "مجھے تم پر جتنا یقین ہے، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں تمہیں غلط سمجھتا۔ اور اگر بالفرض وہ کہا گیا سچ ہوتا، تب بھی میں تمہاری ہی حمایت کرتا۔ کیونکہ میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے اور ایک بار ملنے والی زندگی کو بندہ اپنی مرضی سے تو گزارے۔"

شہریار تکیے کے سہارے بیٹھ کر مسکرا کر بڑی دلچسپی سے بولا۔ ''آپ کی سب باتوں میں صرف ایک بات آسودہ کر گئی مجھے۔''

''کون سی بات؟'' عدیل بھائی بے دھیانی میں بولے اور وہ مدھم لہجے میں بولا۔

''یہی کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر مجھے اختیار ہوتا تو پہلی بار بھی شکریے کے ساتھ زندگی کا آپشن رد کر دیتا۔''

عدیل بھائی نے سنا تو کان مروڑ کر بولے۔ ''پھر وہی بکواس...... ابھی کہا ناں، زندگی کو انجوائے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، بھلے وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ بعض اوقات تلخی میں انجوائے منٹ کا جو مزہ ہے، وہ زندگی کے مزے کو دوبالا کر دیتا ہے۔''

''بالکل جناب! آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔'' وہ ذرا کی ذرا اٹھا، مگر پھر سے لیٹ گیا۔

عاطف کے چہرے پر اُس کے لیٹنے سے بے چینی پھیل گئی تھی۔ خود عدیل بھائی نے بھی اُسے ہولے سے پکارا تھا۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟...... اینی پرابلم؟''

اُس نے بند آنکھیں کھول کر انہیں خمار سے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ شاید دواؤں کا اثر ہے۔ نیند سی محسوس ہو رہی ہے۔ اور تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

عدیل بھائی نے سر ہلایا اُسے سونے کا مشورہ دے کر کھڑے ہوئے۔ اُنہیں اُٹھتا دیکھ کر وہ بھی الرٹ ہو گیا۔ اُن کا ہاتھ تھاما، پھر آہستگی سے بولا۔ ''پاپا مجھ سے جی بھر کر ناراض ہیں۔ اور دانیا، شاید وہ بھی میری صورت نہ دیکھے۔ آپ بتائیے، پھر معاملات کیسے سدھارے جا سکتے ہیں؟''

''کوشش کرو۔ کچھ نہ کچھ رزلٹ نکل ہی آئے گا۔ لیکن یہ طے ہے، دانیا کو اس گھر میں سب سے زیادہ تم عزیز رکھتے ہو۔ تم ہی اس معاملے کو ہینڈل کرو۔ تم سے تمہاری بہن کی خوشی کے لئے اُٹھائے جانے والے کسی قدم پر کوئی سوال نہیں اُٹھائے گا۔''

''عدیل ٹھیک کہہ رہا ہے...... میں بھی اس بات سے متفق ہوں۔''

شہریار یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ایسے، جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔پاپا بے حد شکستہ حالت میں اُس کے سامنے کھڑے تھے۔پھر قدم قدم کرتے وہ اس کے قریب آئے اور بے چارگی سے بولے۔
''غیر اخلاقی حرکت سہی، لیکن کبھی کبھی چھپ کر باتیں سننے سے بہت سی باتوں سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔یہ اور بات، وہ باتیں تلخ بھی ہو سکتی ہیں اور شیریں تر بھی......میرے لئے یہ تجربہ آسودگی کو سمیٹے ہوئے تھا۔اس وقت تمہاری ذات نہیں، میری محبت داؤ پر لگی ہوئی تھی اور تم جانتے ہو، ہارے ہوئے شخص کے لئے اچانک جیت جانے کا احساس کس قدر فرحت انگیز ہوتا ہے۔''
شہریار بت کی طرح اُنہیں دیکھتا رہا۔اُسے یہ باتیں پتہ نہیں اچھی لگی تھیں یا بری، پتہ نہیں چل رہا تھا، بس وہ بے حس اُنہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔
عاطف بیگ نے اُسے چھوا تو اُس کی آنکھوں کی بے حسی سے زیادہ وہ اُس کا لمس لرز رہا تھا۔
وہ اس لمحے مانتے مانتے یکدم گزری ایک رات کی تلخی سے ایک بار پھر خود سے ناراض ہو گیا تھا، یعنی وہ پاپا سے ناراض تھا اور ناراض لوگوں کے سامنے آپ لفظوں، جذبوں کے کتنے ہی ڈھیر لگا دیں، وہ اگر راضی نہ ہونا چاہیں تو آپ انہیں زندگی کی طرف دیکھ کر مسکرانا نہیں سکھا سکتے۔
عدیل بھائی نے اُس کا موڈ دیکھا تو پاپا کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر ہولے سے بولے۔''ہمیں شیری کو پھر سے اپنی طرف لوٹنے کے لئے کچھ وقت دینا ہوگا۔''
پاپا اثبات میں سر ہلا کر اُن کے ساتھ دروازے کی طرف مڑ گئے۔
عاطف نے لاکھ آنکھ سے اشارہ دیا کہ وہ اُنہیں دروازے تک چھوڑنے کے لئے ضرور اُٹھے، مگر وہ خفگی سے لیٹا ہی رہا۔اُس کی سستی کی وجہ پر عاطف کچھ نہیں بولا۔وہ اس وقت جس کیفیت کا شکار تھا، اس وقت کوئی جملہ ڈھارس نہیں بن سکتا تھا۔کوئی لفظ تسلی کا کندھا نہیں ہو سکتا تھا۔دراصل اُس کے آنسو بہنے کے بجائے جم گئے تھے اور جو آنسو جم جائیں، اُن کا کھارا دل کو تل تل کر کے چاٹنے لگتا ہے۔سارے جذبے، ساری سانسیں خاک ہو کر رہ جاتی ہیں۔وہ کوشش کے باوجود آدھا زندگی کی طرف مڑا تھا، آدھا موت کی تلخی کے ہاتھوں رہن رہ گیا تھا۔
عاطف بیگ کچھ دیر تو اُسے دیکھتا رہا، پھر اس خیال سے کہ تنہائی ملنے پر شاید رو کر اس کے دل کا غبار ڈھل جائے، وہ اجازت چاہنے لگا۔
''پھر کل ملتے ہیں۔''
شہریار نے سر ہلایا، کچھ نہیں کہا، بیڈ پر لیٹا، اُسے بھی جاتا دیکھتا رہا۔

واپسی کے قدموں کو گنتے ہی گنتے اُس کی عمر پوری ہوئی تھی...... اُس تک آنے والے قدم بہت کم اُس تک پہنچ پاتے تھے...... محبت اور اُس کے بیچ تنہائی کا شوں شوں کرتا سمندر تھا......

وہ کتنی دیر تک اس تنہائی سے دل جلاتا رہا، پھر لیٹے لیٹے تھک گیا تو بے وقت اُٹھا۔ اُسے وانیا کا خیال ہراساں کر رہا تھا کہ وہ اُس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی......

اپنے کمرے سے نکل کر گھر کی طرف آنے کے لئے لان سے ہو کر گزرا، پھر سیڑھیاں چڑھی ہی تھیں کہ نانو ہی سے پہلے ٹاکرا ہو گیا۔

"اب کیا لینے آئے ہو؟ اس گھر کا سکون برباد کر کے بھی نہیں چین نہیں ملتا؟ کیا رہ گیا ہے برباد کرنے کے لئے، جو پھر اپنے منحوس قدم لے کر چلتے چلے آ رہے ہو؟"

شہریار کے قدم وہیں رُک گئے۔ اُس نے پہلی بار نانو کو پلٹ کر کچھ نہیں کہا، بس اُنہیں دیکھتا رہا۔ نانو نے حیرت سے اُسے چونک کر دیکھا، پھر جانے اُس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹتی چلی گئی تھیں۔

جو دل ہوتے ہیں...... اُن کے دل اُن کی آنکھوں میں آن بیٹھتے ہیں۔ شعلہ لگا دو تو بھڑ بھڑ جلنے لگتے ہیں..... اور کبھی کبھی بنا شعلے کے آپ ہی راکھ ہو جاتے ہیں..... اس وقت اُس کی آنکھوں میں ایسی ہی بے کسی تھی...... جلنے دو، ہمیں بجھاؤ مت...... اور نانو خاموشی کے اس شور سے ڈر گئی تھیں۔ کیا پتہ کوئی چنگاری اُڑ کر اُنہیں بھی خاکستر کر دیتی۔

وہ مناسب قدم اُٹھاتا وانیا کے کمرے میں آ گیا تھا۔

وانیا حسب توقع بیڈ پر اُداس بیٹھی تھی۔ منگنی کی رنگ اُتار کر اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

"وانیا......!" اُس نے نام پکارا۔ وانیا نے اُسے دیکھا، مگر کچھ نہیں بولی۔ وہ ٹھہرے قدموں سے چلتا ہوا اُس کے سامنے بیڈ پر آن بیٹھا۔ "تم...... تم مجھ سے ناراض ہو؟"

وانیا نے نفی میں سر ہلایا، پھر آہستگی سے بولی۔ "پہلے تاثر میں شاید آپ سے ناراض ہوئی تھی، مگر پھر تجزیہ کیا تو مجھے لگا میری ناراضگی زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔" اُس نے توقف کیا، پھر اسی لہجے میں بولی۔

"جب میں جانتی ہوں کہ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہر انسان کو ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ اگر آپ ایک آزادانہ فیصلہ لینا چاہتے ہیں، آپ ماریہ سے نہیں، جانانہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے آپ کی مخالفت کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ میں تو آپ کی بہن ہوں ناں، آپ کو تو خوش ہی دیکھنا چاہوں گی ناں۔"

شہریار کو لگا، ان جملوں سے اندر جمے ہوئے آنسوؤں میں کسی نے چنگاری ڈال دی ہو۔ برف پگھلنے لگی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔ ماما سامنے کھڑی تھیں۔ وہ اس چویشن کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ غصیلے لہجے

میں مخاطب ہوئیں۔

"شہریار! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے میری بیٹی کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھینی ہے۔ یہ لڑکی، اسے اب بھی تمہاری محبت کے آگے اپنی خوشی ہیچ لگتی ہے۔ اس کے پاپا نے کہا، ہم کچھ سوچ کر پہلے رشتے کو قائم رکھنے یا ندرکھنے کا فیصلہ کریں گے اور اس نے بغیر سوچ کہہ دیا، مجھے شیری بھائی کی خوشی عزیز ہے۔ اگر وہ جانا سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ رہی حمزہ سے شادی، تو اب شاید یہ رشتہ برقرار نہیں رہے گا۔ یہ لڑکی ماریہ کی اُداس آنکھوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی ہے، صرف تمہاری وجہ سے شیری!...... صرف تمہاری وجہ سے میری بچی کی خوشی اس سے منہ موڑ گئی ہے۔ تمہیں ایک لمحے کے لئے دانیا کا تو سوچنا تھا، مگر نہیں، تم سوچتے ہی تو نہیں ہو...... تم اتنے خود غرض، اتنے بے حس ہو سکتے ہو، مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا۔"

ماما یہ کہہ کر جس طرح آئی تھیں، اسی طرح چلی گئی تھیں۔ شہریار نے ایک لفظ صفائی میں نہیں کہا تھا۔ دانیا بھی ایسے ہی خاموش تھی، جیسے وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ شہریار جانتا تھا، وہ کہاں ہے اور یہاں کیوں نہیں ہے......

دل کے بھید دل والے ہی جان سکتے ہیں اور محبت کو وہ اتنی ہی سرعت سے جانتا تھا کہ کوئی اور لفظوں میں اس محبت کو اس کے دل سے بہتر ڈیفائنڈ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر...... اور دانیا سامنے خلاء میں یوں تک رہی تھی، جیسے کھونے والی خوشی یہیں اس کمرے میں دھواں بن کر تحلیل ہوئی ہو......

شہریار کچھ دیر تو اُسے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ پھر ساری رات اُس نے کتنی اسموکنگ کی، یاد نہیں رہا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو ناشتے کی میز پر آنو، ماما اور سالار بھائی کے وہی خفا چہرے نظروں سے ٹکرائے تھے۔

"کبھی کبھی نیکی کرنا کس طرح کا پھندا بن جاتا ہے، تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔" سالار بھائی نے جان کر اُس سے دو بدو کرنے کی کوشش کی۔

وہ سر جھکا کر ناشتہ کرتا رہا۔ پاپا اور عدیل بھائی اپنے دفتر جا چکے تھے۔ دانیا نے آج یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ وہ آج دیر تک سونا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں، سونا چاہتی تھی یا رونا چاہتی تھی...... شہریار نے کچھ اندازہ لگایا اور کچھ گماں کو خوش گمانی کا ہاتھ تھما کر زندگی کو ایک مارجن دیا، مگر سالار بھائی......

اُس نے چائے پیتے پیتے پہلی بار سر اُٹھا کر اُنہیں دیکھا تو اُس کے اس طرح دیکھنے کو حد ادب محسوس کیا اور بدملا کہا۔ "تم کیا اب اسی طرح سر اُٹھا کر دیکھنے کی جسارت کر سکتے ہو؟ تم...... کیا تم میں

حیا نام کا کوئی خانہ ہے؟“

”کہاں نانو! اس جیسے بچے...... ان کے پاس حیا کہاں ہوتی ہے؟ جن کی پیدائش غلط ہو ان کی زندگی ٹھیک کیسے ہو سکتی ہے؟“ سالار بھائی نے طنزیہ اُبال دیا۔

شہریار کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ اُس نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

سالار بھائی نے جواب نہ کہتے سنا تو تپ کر ایک دم اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، پھر چلّا کر بولے۔

”تم چپ رہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم کوئی بہت اعلیٰ پرسنالٹی ہو؟ بتاؤ، تم کیا ہو؟ کیا ملتا ہے دوسروں کی محبتوں کو چرا کر؟ بولو، کون ہو تم؟...... کیوں آئے ہماری زندگیوں میں؟...... کیا کمی تھی دنیا میں جو تمہیں دنیا میں بھیجنا ضروری سمجھا گیا؟ کاش! میرے اختیار میں ہو تو میں تمہیں کسی ایسے پاتال میں پھینک دوں کہ پھر کوشش کے باوجود تمہاری صورت، تمہاری شکل دکھائی نہ دے۔ تم مر کیوں نہیں جاتے؟ بولو! کیوں زندہ ہو؟“ سالار بھائی پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔ اُنہوں نے اُسے کھینچ کر دیوار سے رگید دیا تھا۔ ماما اُن کے نافہم رویے پر سہم گئی تھیں۔

”دانیا!...... دانیا......!“ نانو چیخنے جا رہی تھیں۔

اور وہ خاموشی سے کھڑا یوں بے حسی سے اُنہیں دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سب مس پی ہیو کسی اور کے ساتھ روا تھا۔

”سنی بھائی!...... سنی بھائی!“ اُن کے غصے میں چلتے ہاتھوں اور کف اُڑاتے لہجے کے درمیان یکدم دانیا کی آواز گونجی۔ وہ اُنہیں بمشکل پکڑ رہی تھی۔

”آپ اپنا دفاع کیوں نہیں کر رہے شیری بھائی؟...... کیا آپ کو چوٹ نہیں لگ رہی؟“ وہ ہراساں ہو کر چیخی۔

شہریار کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ خون کی لکیر جبڑے سے بہہ کر گردن تک آ رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا مگر اُس کی آنکھیں، اُن میں اتنی برفاب سی خاموشی تھی کہ دانیا کانپ گئی تھی اور سالار بھائی تھے کہ تینوں خواتین کی قید کے باوجود مچلے جا رہے تھے۔

”چھوڑ دو...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس نے ہماری زندگی کو تماشا بنا کر رکھ دیا ہے...... کیا حق ہے اسے ہماری خوشیوں سے کھیلنے کا؟ چھوڑ دیے مجھے۔“

وہ اب بھی پلٹ پلٹ کر اُس پر ہاتھ اُٹھا رہے تھے۔ دانیا نے اُنہیں بمشکل ملازمین کی مدد سے اُن کے کمرے تک پہنچایا تھا اور باہر سے لاک لگا دیا تھا۔

نانو نے فرسٹ ایڈ بکس منگوایا تھا۔ کچھ بھی تھا، بہر حال اُنسیت تو تھی ہی...... اور وہ تھا، اُسے جیسے اس اُنسیت کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ وانیا اُس کی بینڈیج کر رہی تھی۔ ٹنچر لگانے پر سسکاری شہریار کی جگہ وانیا نے بھری تھی۔ وہ ویسے ہی بے حس بیٹھا تھا۔ وانیا اپنا کام مکمل کر چکی تو اُس نے فرسٹ ایڈ بکس بند کر کے خفگی سے اُس سے پوچھا۔

"سالار بھائی ہوش میں نہیں تھے، آپ تو ہوش میں تھے۔ اُنہیں روک نہیں سکتے تھے؟ اگر آپ کو نقصان زیادہ ہو جاتا تو......" وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ شہریار نے جواب نہیں دیا تھا اور خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف واپس چلا گیا تھا۔

وانیا دوپہر کا کھانا لے کر اُس کے کمرے کی طرف گئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔

"شیری بھائی! کھانا کھا لیجیے۔"

شہریار نے ایک نظر اُسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے وانیا!" لمحہ بھر کو رُکا، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔ "جس طرح سنی بھائی مجھ سے نفرت کرتے ہیں وانیا! تم بھی مجھ سے ایسی ہی نفرت کرو۔ مجھے توجہ اور محبت اب تسکین نہیں دے سکتی۔ تم جتنا مجھ سے اٹیچڈ ہو گی، مجھے اتنی ہی تکلیف ہوتی چلی جائے گی۔ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے تو تم اظہار بھی کرو۔ تم ہر چیز درگزر کیوں کر دیتی ہو؟ تم کیوں چاہتی ہو تمہارے اس رویے پر مجھے خود سے نفرت ہونے لگے؟"

وانیا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، پھر ولار سے بولی۔ "دیکھیے! ہم اپنی قسمت سے تو نہیں لڑ سکتے۔ قصور آپ کا نہیں، قسمت کا ہے۔ پھر سزا آپ کو کیوں ملے؟"

"سزا مجھے کیوں نہ ملے؟" وہ یکدم بیڈ سے کھڑا ہو گیا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "تمہاری آنکھیں کتنی قیمتی ہیں۔ لیکن پاپا کی بیٹی کو میں نے جی بھر کر رُلایا ہے۔ میں بہت برا بھائی ہوں، بہت ہی برا بھائی۔ ہے ناں؟" شہریار نے اُس کے کندھے پر شکستگی سے ہاتھ رکھا۔ وانیا کو کرنٹ سا لگا۔

"آپ کو بخار ہو رہا ہے۔ آپ نے بتایا ہی نہیں؟"

"بتانے سے بخار مجھے چھوڑ سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو میں ہر چیز سے پہلے زندگی سے کہتا، مجھے چھوڑ دو، میں اس بندھن در بندھن سے اُکتا گیا ہوں۔"

وہ پھر سے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ قریب چلی آئی تھی۔ پھر ہراساں ہو کر بولی تھی۔

"آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے، میں ابھی عدیل بھائی کو فون کرتی ہوں، وہ آپ کو ڈاکٹر صمدانی کے کلینک لے کر جائیں۔"
دانیا تیزی سے باہر نکلی۔ شہریار اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر کسی نئی سچویشن سے بچنے کے لئے اُس نے گھر سے غائب ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی۔
دانیا واپس لوٹی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اُس نے اُسے ہر جگہ ڈھونڈا، موبائل پر کال کی مگر کہیں سے رزلٹ نہ نکلا۔ وہ تنہا کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ خالی کمرہ ایک خلا کی طرح اُس کے اندر تنہائی بھرتا چلا جا رہا تھا۔
یہ وہ لمحہ تھا، جب اُس نے محسوس کیا تھا، اس کی زندگی میں اُس کا یہ ناراض سا بھائی کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتی۔ وہ کیسا بھی ہو جائے، کتنا ہی برا، تب بھی وہ اُس کے لئے شیری بھائی ہی رہے گا۔
"میں آپ سے ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتی...... میں آپ کو کھونا بھی افورڈ نہیں کر سکتی...... آپ میری زندگی کا جزو لاینفک ہیں......" اُس نے خاموشی سے کہا۔
اور کمرے کی خاموشی اس کے اندر نئی طرح سے جاگ اُٹھی۔ اُس نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ ماضی کی بھول بھلیوں سے وہ اچانک ہی لوٹ آئی تھی۔
ہوش و خرد میں لوٹ کر پہلا خیال شہریار ہی کا آیا۔ یکدم دل میں ہوک اُٹھی۔
"شہریار بھائی......" اُس نے موبائل آن کیا۔ قریباً پندرہ سے پچیس بار شہریار کی ہی مسڈ کالز اس کی منتظر تھیں۔
اُسے اپنے پہلے کے رویے پر حد درجہ افسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ جذبات کی کس نہج پر پہنچ گئی تھی کہ ہر چیز، ہر بات اس کی نظر سے ہٹ گئی تھی۔ صرف اپنا خسارہ یاد آ کر اُسے رونا آ گیا تھا۔ وہ جتنی شہریار سے محبت رکھتی تھی، دُور ہوئی تو اتنا ہی دُور ہو گئی۔ یہ چند گھنٹے شہریار پر کس قدر تکلیف دہ ہو سکتے تھے، اُسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے شہریار کو ہسپتال میں اس حالت میں چھوڑ کر آ گئی۔ اُسے وہ کتنے ہی لمحے یاد آ گئے، جب وہ بیمار پڑتی تو شہریار ساری ساری رات اُس کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے جاگ کر گزار دیتا تھا۔ صبح اُس کی آنکھ کھلتی تو عدیل بھیا رشک سے کہتے۔
"دانیا ڈارلنگ! مجھے لگتا تھا، کبھی مجھ سے زیادہ تمہیں اور کوئی پیار نہیں کر سکتا۔ لیکن شیری جس طرح تمہارے لئے جلے پیر کی بلی بنا گھومتا ہے، تمہاری بیماری میں تو مجھے لگتا ہے، میری محبت تو اس کی توجہ کے سامنے ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔"

دانیا کو وہ دن بھی اچانک یاد آنے لگے تھے، جب محض اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے چکر میں اُس کی نمازوں میں بڑی ترتیب آجایا کرتی تھی اور وہ شرارت سے کہتا۔

''بہت زبردست جھگڑا ہوگا، جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا۔ چھوٹتے ہی کہیں گے، کیوں شہریار! کیا ہم سے بھی پیاری تھی تمہیں اپنی بہن؟ ہمارے لئے کبھی سجدہ نہیں کیا اور مسکہ لگانے کے لئے سجدے پر سجدے...... ویسے آپس کی بات ہے، میری شکل اتنی مسکین ہے، زیادہ چانس اس کا ہے، وہ کوئی سوال نامہ دیں گے ہی نہیں اور فوراً پاس کردیں گے۔''

دانیا اُس کی اس وجہ محبت پر بیماری کے باوجود ہنس ہنس کر بے حال ہوجاتی تھی اور وہ تھا کہ سوپ اور ایسی ہی چیزیں، جو وہ کسی کے ہاتھ سے لینا گوارہ نہیں کرتی تھی، وہ شہریار کے ہاتھ سے نہ، نہ کرنے کے باوجود کھا لیتی تھی۔ ایسے موقع پر ماما کے رویے میں بھی شہریار کے لئے نرمی آجاتی تھی، لیکن...... اُس کی سوئی اس لیکن سے جب بھی ٹکراتی، اُس کی شرمندگی بڑھ جاتی۔

موبائل پر بیل جارہی تھی مگر اُس کی سوچوں کی طرح بیل کی بھی کہیں تھاہ نہیں مل رہی تھی۔

''شہریار بھائی سوگئے ہوں گے۔'' اُس نے دل کو تاویل دی اور موبائل آف کردیا، پھر بیڈ پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ اچانک شہریار کا نمبر اسپارک کرنے لگا۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے موبائل آن کیا۔

''کیا بھائی! کب سے ٹرائی کررہی تھی۔ کیا سو رہے تھے؟''

''آہم...... دانیا بول رہی ہو؟'' بالکل الگ آواز۔ وہ چونک گئی۔

''آپ کون؟'' سوال سے زیادہ انجانا سا خوف تھا اور دل بے اختیار مناجات کررہا تھا کہ اُس کا بھائی خیریت سے ہو۔

''شہریار اس وقت سو رہا ہے گڑیا!'' اس بار آواز پہلے سے زیادہ صاف اور واضح تھی۔ وہ فوراً پہچان کی سیڑھی چڑھ گئی۔

''عاطف بھائی! آپ...... آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

''بس ویسے ہی، دل کچھ پریشان سا ہورہا تھا۔ پچھلے چار سال سے رابطہ واجبی سا تھا، لیکن صبح سے اتنی شدت سے یاد آیا یہ چھ کہ کراچی جس بزنس ڈیل کی وجہ سے آیا تھا، وہ ذہن سے نکل گئی۔ یاد رہا تو ایک خیال کہ کسی طرح شہریار سے ملاقات کرلی جائے...... ساری مصروفیات کینسل کرکے اس کے دفتر پہنچا، پتہ چلا یہ دفتر ہی نہیں آیا۔ فوراً موبائل پر رنگ کیا۔ بہت دقت بعد فون ریسیو کیا اس نے۔ ضرورت سے زیادہ شکستہ لگ رہا تھا۔ اس وقت باتوں باتوں میں فارننگ کا قصہ بھی نکل آیا، میں نے کہا، ملنا چاہتا ہوں، کہنے لگا، آج نہیں، پھر کبھی...... موڈ خراب ہوگیا اس کی بات سے۔ دل تو چاہا تھا، دوبارہ کال

ہی نہ کروں، مگر اندر کی بے چینی...... صبح نماز کے لئے اُٹھا تو پھر فون کیا۔ کب تک انگیج ٹون سنائی دیتی رہی، پھر کال ریسیو کی تو اُس کی جگہ انکل صمدانی تھے۔ معلومات کیں تو کھلا، صاحب بہادر ہسپتال میں دھرے ہوئے ہیں۔ سو نماز تک چھوڑ کر اس کے لئے بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا۔" ایک لمحے کو تفصیل دے کر چپ ہوا، پھر شکوے سے بولا۔ "مگر لڑکی! مجھے تم سے بہت شکایت ہے۔"

"کس بات پہ عاطف بھائی؟" دانیا نے مدھم ہو کر سعادت مندی دکھائی۔

"شکایت نہیں، بلکہ غصہ ہے۔ یہاں اتنا کچھ ہو گیا لیکن تم نے مجھے ایک فون کال ضروری نہیں سمجھی۔" عاطف بیگ ڈپٹ کر بولا۔ "اور دوسری بات یہ کہ تم نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا تھا؟ تمہیں پتہ ہے، جب میں ہسپتال پہنچا ہوں تو شہریار کا بی پی کتنا شوٹ کر چکا تھا۔ اگر بروقت میں اُس کی دل جوئی نہ کرتا تو...... تم نے تو آج اُسے گنوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر صمدانی تک ہراساں ہو کر تمہارے پاپا کو فون کرنے والے تھے۔ دانیا کی بچی! وہ کس قدر رڈس ہارٹ ہوا ہے، تمہیں معلوم ہے کچھ؟ مجھے دیکھ کر اس نے کچھ نہیں کہا، مگر اس کی آنکھوں کا کرب...... آخر تم اتنی روڈ کیوں ہو گئی تھیں؟"

دانیا سے کچھ نہیں کہا گیا۔ جو شرمندگی اُس پر طاری تھی، وہ اب آنسو بن گئی تھی۔

"مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی عاطف بھائی! لیکن میں کیا کروں، ماضی جب بھی میرے سامنے آتا ہے، مجھے شیری بھائی ایک لمحے کے لئے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے ماریہ یاد آ جاتی ہے حمزہ عابد نہیں بھولتا اور وہ لڑکی جانا نہ...... وہ دماغ میں کسی بری یاد کی طرح ایسی بیٹھ گئی ہے کہ نکلتی ہی نہیں ہے۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ لیکن اُس کے چپ ہونے پر مدھم ہو کر اُس نے جواباً کہا۔

"کچھ باتوں پر ضروری ہے، خود جواب طلب کرنے کے بجائے وقت کو جواب دینے کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ سزا اور جزا کا ترازو انسان اسی وقت تھام سکتا ہے، جب وہ عقل کل ہو، اس سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ کیا تم ایسی ہی شخصیت ہو؟"

دانیا نے ناں میں جواب دیا، پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شہریار بھائی اب کیسے ہیں؟ اب تو کوئی گھبرانے والی بات نہیں ہے ناں؟ ویسے شیری بھائی جتنا ان چار سال میں بدل گئے ہیں، آپ سے ملنے کا انداز کیا تھا ان کا؟"

عاطف بیگ کے مطمئن انداز میں ہنسنے کی آواز سنائی دی، پھر اس نے کہا۔ "وہ پہلے سے بہت میلنسڈ ہے۔ رہی بدلاؤ کی بات، تو وہ تو سر سے لے کر پیر تک بدل گیا ہے۔ اتنا ٹھنڈا، اتنا سرد مزاج۔ چیریٹی

کے نام پر جو پہلے ہزاروں روپے اُڑا دیتا تھا، اب اس کام سے ہی کان پکڑتا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں، کچھ روپے قرض مانگے تھے، مگر اتنی بری حالت میں بھی سرد مزاجی سے بولا۔ ''میں نے اُدھار دینا بند کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اتنا روپیہ لے کر کہاں جاؤ گے؟'' کہنے لگا۔ ''بے فکر رہو مر گیا، تب بھی تمہارے نام نہیں کروں گا۔''

''لو بھلا۔ دوستوں کا دوستوں پر حق نہیں ہوگا تو ہما شما کا ہوگا؟'' دانیا ٹینشن کے باوجود اُس کے انداز پر ہنسنے لگی۔ پھر گھڑی کی طرف نظر گئی تو بولی۔ ''فجر کی نماز کا وقت تو نکل گیا۔ سو میں کوشش کروں گی وزٹر آورز میں سب سے پہلے ہسپتال پہنچ جاؤں۔ بس آپ تب تک بھیا کو بہلا کر رکھیے گا۔''

''جیسے میری بہن کا حکم۔ سرتابی کی کسے مجال ہے۔'' عاطف نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

دانیا تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ کارن فلیک تیار کرنے کے لئے چین چولہے پر رکھا، اپنے اور عاطف کے لئے کافی اور سینڈوچ بنانے کی تیاری کرنے کا سامان بنا ہی رہی تھی کہ اچانک کچن کا دروازہ کھلا۔ اس کا خیال تھا، ماں یقیناً کچن کی لائٹ کھلی دیکھ کر آئی ہوں گی۔ مگر سامنے جسے دیکھا، وہ اُس کا بہت اپنا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اُس کے سینے سے جا لگی۔

''عدیل بھائی! شیری بھائی.......'' اُس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس روئے جاتی تھی۔ اور عدیل عبدالرحمٰن اُس کی پشت تھپکنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ لاہور سے آئے اُنہیں ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ صبح پاپا کا فون جاتے ہی اُنہوں نے چھٹی کی درخواست دے دی تھی۔ عموماً نوکری کے معاملے میں وہ کافی ذمہ دار تھے، اس لئے ایک ہفتے کی چھٹی آسانی سے مل گئی تھی۔ ہسپتال میں وزیٹر آورز نہیں تھے، لیکن پھر بھی وہ ایئرپورٹ سے سیدھے ہسپتال ہی گئے تھے۔ اپنی آنکھوں سے جب تک شہریار کو انہوں نے خیریت سے دیکھ نہیں لیا تھا، تب تک سکون مفقود تھا دل کا۔ سو تسلی ہونے پر انہوں نے اب گھر کی راہ لی تھی اور حسبِ توقع یہاں دانیا عبدالرحمٰن کو اُن کی اموشنل سپورٹ کی ضرورت تھی۔

''اب بس بھی کرو دانیا! تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ وہ اب خیریت سے ہے۔ میں خود اُسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب پلیز! یہ رونا دھونا بند کرو۔''

وہ آنکھیں مسلتی ہوئی عدیل عبدالرحمٰن کے شانے سے الگ ہوئی۔ گلابی ناک رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھی۔ عدیل بھائی کرسی پر بیٹھے تھے۔ پھر مخصوص لہجے میں بولے تھے۔

''شیری کے ناشتے کے ساتھ اگر مجھے بھی ناشتہ مل جائے تو، تمہیں پتہ ہے، پاپا نے جب شہریار کے اوپر فائرنگ کی اطلاع دی تھی، تب بھی بھوک مر گئی تھی۔ دفتر جانے کا خیال ذہن سے نکل گیا تھا۔ پھر رابعہ نے پریشانی دیکھ کر کہا، آپ شیری سے خود بات کر لیں، تاکہ آپ کی تسلی ہو جائے۔ سچ پوچھو تو اس سے بات کرنے کے باوجود دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ دل کی ضد تھی، اپنی آنکھوں سے جب تک نہ دیکھ لوں،

قرار نہیں پاؤں گا۔ سو دوپہر تک چھٹی کی درخواست دے دی۔ دوسری شام کو سامان پیک کیا اور نکل کھڑا ہوا۔ یہاں پہنچا تو پھر شہریار کو فون کیا۔ کیونکہ اس وقت صرف وہی جاگتا ہوا ہوتا ہے۔ زخمی بازو کے باوجود مجھے یقین تھا، وہ مجھے پک کرنے آجائے گا۔ مگر کتنی دیر تک کسی نے فون ریسیو نہیں کیا اور پھر مترنم آواز سنائی دی اور گھبرا دینے والی اطلاع۔ میرا تو یہ حال تھا کہ اگر شہریار ٹھیک حالت میں نہ ملتا تو دوسرا ہیڈ میرا ایک ہو جانا لازمی تھا۔ خیر، اب راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے تو ناشتے کا سوال جواب لئے بغیر نہیں مانے گا۔ کل صبح کا کچھ کھایا ہوا ہے، سو اب پیٹ میں چوہے دوڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

دانیا اُن کے ہلکے پھلکے انداز پر ہنسنے لگی، پھر اُن کا مخصوص پسندیدہ ناشتہ بنانے کے لئے آٹا گوندھنے لگی۔ دانیا کے ہاتھ کے پراٹھے انہیں بہت مرغوب تھے۔ ایک چولہے پر چائے چڑھی ہوئی تھی اور دوسرے چولہے پر وہ تازہ پراٹھا ڈال رہی تھی۔ رات کے رکھے ہوئے کبابوں کے ساتھ جب اُس نے پندرہ منٹ بعد عدیل عبدالرحمٰن کے سامنے ٹیبل پر ناشتہ چنا تو عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے کی مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔

"تھینک گاڈ، تم اتنی تیزی سے کام کرتی ہو۔ وگرنہ رابعہ سے اگر میں اس قسم کے ناشتے کی فرمائش کرتا تو میرا ڈیڑھ گھنٹہ کہیں نہیں گیا تھا۔ بہت سست ہے وہ، اسی لئے پراٹھے کا ناشتہ تو خواب ہو گیا۔ کبھی کبھی کہتی بھی ہیں محترمہ آپ کے لئے پراٹھے بناؤں؟ میں کہتا ہوں، سوری میرے پاس فرصت نہیں۔ جب ریٹائرڈ ہو گیا ناں، تب پراٹھے پکانا۔ تب وقت کی نہ اُسے پرواہ ہوگی، نہ مجھے...... ویسے اس عمر میں وہ ایک پراٹھا کم از کم کتنی دیر میں توے سے اُتار لیا کرے گی؟"

دانیا ہنسنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔ "کیا یہ حساب کا کوئی سوال ہے کہ باورچی کی رفتار حاصل ضرب کر کے بتائی جائے؟"

نیا پراٹھا توے سے اُتار کر اُس نے عدیل کے سامنے رکھا اور عدیل عبدالرحمٰن ناشتے میں ایسے مگن کہ اس کا جواب دینا بھول گئے۔ کپ خالی ہو گیا تھا۔ دانیا چائے سے پھر کپ لبریز کر رہی تھی۔ عدیل عبدالرحمٰن کے کھانے کے دوران ایک وقفہ آیا تھا۔ وہ اسے کپ میں چائے انڈیلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنا کام کر چکی تو بولے۔

"تم اتنی پیاری ہو گڑیا! کہ بس...... میں نے تو ابھی سے کہہ دیا ہے لائبہ سے، اپنی پھوپھو کی طرح بننا، ورنہ میری محبت نہیں پا سکوگی۔ لائبہ بھی ماں کی طرح کچھ لیزی ہے، پھر بھی بہت خیال رکھتی ہے ابھی سے۔ مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے تم دوبارہ چھوٹی ہو کر میرے گھر میں بھاگنے دوڑنے لگی ہو۔"

دانیا کچھ نہیں بولی۔ عدیل عبدالرحمٰن کے ریمارکس اُسے اندر سے خوشی دیتے رہے۔ وہ سینڈوچ بنانے میں مگن تھی۔ عدیل عبدالرحمٰن ناشتہ کر چکے تو اُس کی مدد کرنے لگے۔ کافی بنانے کی ذمہ داری انہوں

نے لے لی تھی۔ پھر وہ نماز پڑھ کر لوٹی ہی تھی کہ کچن کے ٹیبل پر ہر چیز تیار تھی۔ اُس کا خیال تھا، وہ کچن میں نماز کے بعد لوازمات رکھے گی، مگر عدیل عبدالرحمٰن یہ کام پہلے ہی کر چکے تھے۔ اُسے بھائی پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔ کچن خالی تھا۔ گھر کا کک جو کوارٹرز میں رہتا تھا، اب کچن میں آ چکا تھا۔

''آپ کے لئے ناشتہ بناؤں جی؟'' اُس نے خیر سگالی دکھائی اور دانیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سوری، میں اس وقت ناشتہ نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ ایک ایک کر کے چیزیں اُٹھا کر باسکٹ میں رکھنے لگی تھی۔ پھر باسکٹ اُٹھانے والی تھی کہ عدیل بھائی شاور لے کر ڈریس اپ ہو کر خود کچن میں چلے آئے۔

''تم گاڑی میں بیٹھو، میں باسکٹ لا رہا ہوں۔'' وہ لحہ بھر کو رُکے، پھر ہولے سے بولے۔ ''تم نے جازی کو نہیں اُٹھایا، کیا وہ ہمارے ساتھ ہسپتال نہیں چلے گا؟''

دانیا نے نظریں چرالیں۔ عدیل عبدالرحمٰن نے استفہامیہ دیکھا، پھر قدرے حیرت سے بولے۔ ''پچھلے سال جب میں اس سے ملا تھا تو وہ کانوینٹ چھوڑنے کے لئے بہت پُرجوش تھا۔ اُس کا خیال تھا، وہ گھر کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیا نہیں، وہ جان نہیں پاتا۔ اُس تک بات صرف اتنی پہنچتی ہے، جتنی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ شہریار کی ولداری کے خیال سے بھی کانوینٹ میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے سنا تو دل کو تسلی ہوئی تھی کہ شیری کے لئے محبت کا راستہ بالکل ہی ناسازگار نہیں۔ مگر اس لمحے تم کہہ رہی ہو کہ جازی شہریار سے ملنا نہیں چاہتا۔''

وہ جو کہہ نہیں پائی تھی، وہ اُس کی نظر چرانے سے پہچان گئے تھے۔ دانیا کچھ دیر تو چپ رہی، پھر ہولے سے بولی۔ ''دراصل جازی، جانا نہ کی وجہ سے کچھ اپ سیٹ ہے۔''

عدیل عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولے۔ دانیا نیچے چلی گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن نے باسکٹ اُٹھائی تھی۔ پھر جانے سے پہلے انہوں نے ماما کے کمرے میں دستک دی تھی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ ماما سلیپنگ گاؤن پہنے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئیں۔ پھر شعور بیدار ہوا تو اُن کے چہرے پر خفگی دکھائی دینے لگی، پھر بھرائے لہجے میں بولیں۔

''آ گئے تم؟'' کچھ خاموشی کا وقفہ دیا، پھر روٹھے پن سے بولیں۔ ''پچھلے سال میں نے کتنا کہا تھا تم سے کہ تم گھر آ جاؤ، دانیا کے سلسلے میں میری مدد کرو، میں فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن تم نے دفتری مجبوری کا بہانہ بنا لیا تھا اور آج کھڑے پیر بھاگے چلے آئے ہو۔ یعنی یہ سچ ہو گیا کہ تمہیں تمہارے پاپا کی طرح شہریار زیادہ عزیز ہے۔''

عدیل عبدالرحمٰن نے خاموشی سے ماں کا شکوہ سنا، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔

''اگر وہ ایسا ہے کہ اُس سے محبت کی جائے تو پھر کسی کو کیا اعتراض؟...... ویسے میں تو یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہم ہسپتال جا رہے ہیں، آپ ہمارے ساتھ جانا چاہیں گی؟''

ماما نے تیوری پر بل ڈال کر انہیں دیکھا، پھر سرسرائے لہجے میں بولیں۔
''پتہ نہیں کیا جادو ہے اُس میں۔ تم سب اُس کے گھیرے میں قید ہو۔ مگر مجھے ایسا کوئی دورہ نہیں پڑا۔ میرے لئے وہ پہلے دن سے مجبوری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اپنے بچوں کے لئے میں نے تمہارے پاپا کا وہ ناجائز حکم مانا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ اگر مجھے فیصلے کا حق دیا جاتا تو میں اسے پہلی فرصت میں کسی چائلڈ ہوم میں داخل کروا دیتی۔'' لمحہ بھر کو وہ رُکیں، پھر مکرر بولیں۔ ''وہ کیسا ہے، کیسا نہیں، زندہ ہے یا نہیں، مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں۔ اور میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ اُس کے سلسلے میں کوئی مجھ پر دباؤ ڈالے۔''
عدیل عبدالرحمٰن نے سر ہلایا۔ کچھ کہے بغیر پشت موڑ کر زینے اُترنے لگے۔ کار تک پہنچے تو دانیا کو اپنا منتظر پایا۔ باسکٹ انہوں نے پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی۔ دانیا اُن کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کرتی رہی۔ وہ فرنٹ ڈور کھول کر اُس کے برابر آن بیٹھے۔ واچ مین گیٹ کھولنے لگا۔ انہوں نے کار اسٹارٹ کی، پھر دانیا کی طرف دیکھ کر بولے۔
''ڈونٹ وری۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگا اور ہم پھر سب مل کر اُس کی دل جوئی کریں گے تو اُسے جلد ہی ٹھیک ہونا ہی پڑے گا۔''
دانیا نے سکوت سے اُنہیں دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ''آپ نے ماما سے ہسپتال چلنے کی بات کی ہوگی۔ انہوں نے کیا جواب دیا؟''
عدیل عبدالرحمٰن نے گہرا سانس کھینچا، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ ''ہمیشہ کی طرح اُن کے انداز میں سرد مہری کے سوا کچھ نہیں پایا میں نے۔ پتہ نہیں، وہ ماں ہو کر اپنے ایک بچے سے اتنا روڈ کیسے ہو سکتی ہیں۔''
''وہ شیری بھائی کو اپنی اولاد سمجھتی ہی نہیں ہیں۔'' دانیا نے بے بسی سے کہا۔
عدیل عبدالرحمٰن نے تیز نظروں سے اُسے دیکھا، پھر غصے سے بولے۔ ''مجھے یہی تو سمجھ نہیں آتا، اگر ماما کو اُس سے اتنی ہی نفرت تھی تو اُسے اپنی گود میں اٹھایا ہی کیوں؟ اور اگر مشرقی مجبور بیوی کی طرح انہوں نے یہ ذمہ داری لے ہی لی تھی تو اسے نبھا کیوں نہیں رہیں؟'' وہ لمحہ بھر کو رُکے، پھر تیز لہجے میں بولے۔ ''یہ سراسر نانو کی کارستانی ہے۔ انہیں گھریلو سیاست کا بہت شوق ہے۔ بس فارغ وقت میں کچھ بھی کر کے خود کو مصروف رکھنا، پھر چاہے وہ کسی کی زندگی ہی سے کھیلا جانا ہو، انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔''
دانیا نے کچھ نہیں کہا لیکن ان کے ایک ایک لفظ سے متفق تھی۔
پھر تیس منٹ بعد وہ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ دانیا نے عاطف بیگ کی آمد سے عدیل عبدالرحمٰن کو آگاہ کر دیا تھا۔ دراصل وہ عدیل عبدالرحمٰن کے

ہسپتال سے لوٹ جانے کے بعد آیا تھا، اس لئے اُن کے لئے یہ خبر خوشگوار تھی۔

عاطف بیگ اُنہیں ہسپتال کی لابی ہی میں مل گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھ کر اُس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن اُسے دیکھ کر بے ساختہ بولے تھے۔ ''اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ شہریار کی آدھی بیماری تو تمہیں دیکھ کر دور ہوگئی ہوگی۔ ناسازیٔ طبع میں دوستوں کی حاضری جادو کا کام کرتی ہے۔''

عاطف نے سکوت سے عدیل بھائی کو دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ ''شاید اس بار ایسا کچھ ہونے کی اُمید نہیں ہے۔ عجیب گھامڑ سا ہوگیا ہے، کسی بات کا ڈھنگ سے جواب ہی نہیں دیتا۔ بات اُس سے کرو، لگتا ہے میز کرسی سے بول رہے ہیں۔ سردمزاجی انتہا کو چھو رہی ہے۔ عدیل بھائی! جب میں گیا تھا، تب تو پھر بھی قابلِ قبول تھا۔ اب تو ایسا کھردرا ہوگیا ہے کہ الاماں، الاماں۔'' وہ اب کوریڈور میں آچکے تھے۔ کمرے سے ڈاکٹر عارف نکل رہے تھے۔ دانیا کو دیکھا تو خیرسگالی سے بولے۔

''مس دانیا! اچھا ہوا آپ آگئیں۔ مسٹر شہریار اس وقت بھاگ چکے ہیں اور حسبِ معمول اپنے اوپر غصہ کھا رہے ہیں۔ ویسے کل آپ نے اچھا نہیں کیا تھا۔ آپ کا ایک دم سے فیڈ آؤٹ ہونا ان جیسے پیشنٹ کے لئے ہائی رسک ہے۔ میرا خیال ہے، اب آپ احتیاط کریں۔''

دانیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ عدیل عبدالرحمٰن ڈاکٹر عارف سے صورتِ حال پوچھنے لگے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں کنڈیشن اسٹیبل تھی۔ وہ دروازہ ناک کئے بغیر داخل ہوئے تھے۔ شہریار آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ڈرپس میں گھلی ملی دوائیں اب بھی اس کے وجود میں اُتر رہی تھیں۔

''شیری بھائی! دیکھئے تو، میں کس کے ساتھ آئی ہوں۔'' دانیا نے خوشگوار لہجہ اختیار کیا۔ شہریار نے اُس کی آواز پر ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔ عدیل عبدالرحمٰن پر نظر پڑی۔ لگا کہیں برف میں بھولے بھٹکے سے کسی شگوفے نے سر اُٹھایا ہے۔ لیکن لہجہ گونجا تو لگا اندر آئس برگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

''ارے، آپ کو کیوں تنگ کر دیا۔''

عدیل عبدالرحمٰن مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے، کچھ نہیں بولے۔ خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ اُن کی نظروں سے جان چرا رہا تھا۔ مگر کب تک؟..... بالآخر نظریں چار ہوئیں اور عدیل عبدالرحمٰن کا مشفقانہ لہجہ گونجا۔

''بہت ڈفر ہو تم۔ مجھے تم سے ایسی کسی جذباتی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ تم جیسے شیر جوان بستر کی نذر ہوں، یہ تو زندگی پر کھلا طنز ہے۔ اماں یار! زندگی ابھی اتنی بھی بے کار شے نہیں ہے۔ ہاں، تم ضرور کچھ

فضول ہو۔ مگر بہر حال، زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنا پڑتا ہے۔"
پہلی بار شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کوندی۔ وہ جانتا تھا، یہ لفظ اُس کے لئے ڈھارس کے سوا کچھ نہیں۔ ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنے کا مشورہ اس لئے تھا کہ وہ کسی بھی بات کو جان پر نہ جھیلے۔
"سوواٹ" کی ٹھوکر لگائے اور دل سے جئے۔ وہ جانتا تھا، یہ سب کچھ بہت آسان ہے، اگر انسان تھوڑا سا بے حس، تھوڑا سا سیلفش ہو۔ لیکن اندر سے دل زندہ ہو تو ہر لفظ سیدھا آ کر دل ہی میں کھبتا ہے۔
کوئی بھی بات اگنور ہوتی ہی نہیں۔ اور پھر کل کی بات......
اُس نے سنبھالا لے کر انہیں دیکھا۔ بولا وہ اب بھی کچھ نہیں تھا۔
عاطف بیگ اُس کا بیڈ ٹیبل آگے سرکا کر باسکٹ میں سے کارن فلیک نکال رہا تھا۔
اپنا ناشتہ اُس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وانیا باؤل اور اسپون لے کر آگے بڑھی تھی مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔ تھوڑی دیر بعد دیکھوں گا۔"
عدیل بھائی نے وانیا کے چہرے کی مایوسی دیکھی تو فوراً بولے۔
"بری بات ہے شیری! بہن نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ صبح ناشتہ بنا کر مجھے دینے کے باوجود اس نے ایک لقمہ نہیں توڑا تھا۔ میں جانتا ہوں، وانیا کو بچپن سے تمہارے ساتھ کھانا پینا اچھا لگتا ہے۔
اب اگر مزید اسے بھوکا رکھنا ہے تو اور بات ہے۔"
شہریار نے تو لنے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔ خفگی کی گہری تہہ اب بھی اُس کی آنکھوں سے مٹی نہیں تھی۔ بھلے ساری دنیا اُس سے رُوٹھ جاتی، مگر وانیا نے کیوں ہاتھ جھٹکا؟...... یہ سوال بار بار دل سے یوں
ٹکرا رہا تھا کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
"آئی ایم سوری...... کل میں بہت تھک گئی تھی، اس لئے یہاں سے جاتے ہی سو گئی تھی۔" اُس نے کان پکڑ کر ایک بے ضرر سا جھوٹ بولا اور وہ روٹھے پن سے اُسے دیکھے گیا، پھر مدھم ہو کر بولا۔
"تمہیں پتہ ہے، آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے میں نے موبائل پر تمہاری مسڈ کالز دیکھی تھیں۔ ساری رات تمہیں کال کرتا رہا۔ تمہیں جانے کا تو کہہ دیا تھا مگر ہسپتال میں اکیلے لیٹے رہنا بہت ہارڈ فیلنگز

تھیں۔میں سوچ رہا تھا،اگر میں سو گیا اور اُٹھ ہی نہ سکا تو؟ خاموشی کی موت ،تنہائی کی موت اچھی تو ہوتی ہے،لیکن پھر بھی اچانک دل نے چاہا تھا،یہاں تمہیں ہونا چاہئے تھا تاکہ جاتے وقت ایک خوشگوار احساس تو رہے کہ تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود کوئی میرے لئے رو سکتا ہے۔"

"فضول مت بولیں اب......کچھ نہیں ہو رہا آپ کو۔معمولی سی پرابلم ہے۔احتیاط کریں گے تو صدیاں کہیں نہیں گئیں۔"

وہ اُس کی باتوں سے ہی رو سی ہو گئی۔عدیل بھائی نے پھر سرزنش سے دیکھا۔عاطف بیگ نے بال ہی کھینچ لئے۔شہریار کی چیخ نکل گئی تو جتانے کو بولا۔

"شروع سے بکواس ہے تو۔بس ایویں شو کرتا ہے کہ سب سے الگ ہے۔اندر سے اب بھی ویسا ہی ہے۔ڈرا سہما،محبت کا متلاشی شہریار......"

اُس نے کچھ نہیں کہا۔دانیا کے اسپون پر منہ کھول دیا۔کارن فلیک مزے کا تھا لیکن دوسرا ہی اسپون کھا سکا تھا کہ ڈاکٹر صمدانی کمرے میں داخل ہوتے چلے گئے۔ذرا سی دیر میں ایمرجنسی لگ گئی۔انہوں نے دوسرے چمچے سے کارن فلیک کا ٹیسٹ لیا،پھر تیزی سے بولے۔

"بے وقوف لڑکی!یہ کارن فلیک کھلا کر مارنا ہے بھائی کو؟ نو کیلوری بیٹا!اس کا کولیسٹرول لیول بہت ہائی ہے۔"

دانیا نے کرنٹ لگنے کی رفتار سے باؤل پیچھے کر لیا اور احمق نظر آنے لگی۔

شہریار نے حالت دیکھی تو بوریت سے بولا۔"شاہ انکل!آپ بھی ناں......بس تھرتھری پھیلانے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔"

دانیا نے ڈاکٹر شاہ صمدانی کو دیکھا،پھر منمنائی۔"اب بھائی ناشتہ کیسے کریں گے؟"

"ایسے ہی کریں گے،جیسے ابھی کر رہے تھے۔مگر یہ زیادہ تیمارداری اسٹائل کی ضرورت نہیں۔فٹ ہے،آرام سے خود ناشتہ کر سکتا ہے۔"لمحہ بھر کو رک کے،پھر مسکرا کر بولے۔"گھبراؤ نہیں،گھر سے منگوایا ہے سادہ دلیہ۔تمہاری آنٹی چکن کے سوپ میں سادہ دلیہ بہت اچھا پکاتی ہیں۔"

دانیا نے سکون کا سانس لیا مگر شہریار بور نظر آنے لگا تھا۔"انکل!یہ مجھے کب تک بیمار ہونے کا سین کرنا پڑے گا؟"

ڈاکٹر صمدانی اُس کی تازہ رپورٹس پڑھتے ہوئے چونکے،پھر بولے۔"تمہاری ول پاور پر منحصر ہے،ابھی بھاگنے دوڑنے لگو،ابھی تمہیں ڈسچارج کر دوں گا۔"

”ٹھیک ہے۔پھر میں شام تک آپ کے کہنے پر عمل کرگزرتا ہوں۔“

ڈاکٹر شاہ صمدانی نے جواب دینے کے بجائے نرس کو اُس کی ڈریس میں پہلے سے موجود دوا کی مقدار بڑھانے کا حکم جاری کیا۔

”شوگر ٹھیک ہے، لیکن کولیسٹرول پرابلم بہت زیادہ ہے۔تم سمجھو! بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہو۔اسموکنگ کی عادت سے خون میں انجماد کا تناسب یوں بھی بڑھ جاتا ہے۔تم دوہرے طریقے سے خطرے کے نشان کو چھو رہے ہو۔تمہارے بابا ہسپتال آجائیں تو میں تمہاری انجیو گرافی ضرور کرنا چاہوں گا۔دیکھوں تو رکاوٹ کتنی ہے اور کیسی ہے۔“

شہریار نے غصے سے انھیں دیکھا، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔”بس کریں انکل! اب میں یہ بیماری نامہ نہیں سننا چاہتا۔بہت بہتر ہوں پہلے سے۔انجیو گرافی زندگی میں پھر کبھی ہو جائے گی۔ویسے میرا خیال ہے، اتنا معاملہ گڑبڑ نہیں ہوگا۔“

وہ جان کر یہ ٹاپک بند کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وانیا نے زور و شور سے رونے پر کمر باندھ لی تھی۔عدیل بھائی اور عاطف بیگ کے چہروں پر بھی سراسیمگی تھی اور وہ شروع سے قائل تھا کہ اپنی ذات سے کسی قسم کی تکلیف کسی کو دینا کوئی اچھی بات نہیں۔“

”کیا معاملہ سیریس ہے انکل؟“ عدیل عبدالرحمٰن گھبرا کر نئے سرے سے رپورٹس پڑھنے لگے تھے اور اُس نے وانیا کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر دل بہلانے کو بولا۔

”سب کے سب ہمارے گھر میں شہنشاہِ غم ہیں۔بات رتی بھر ہوتی ہے، پہاڑ خود بخود بن جاتا ہے۔تم بے فکر رہو تمہاری شادی کروائے بغیر نہیں جاؤں گا۔بہت ڈھیٹ ہوں۔“ وانیا کے چہرے سے پہلے کے تاثرات زائل نہ ہو سکے۔تب ہی وہ چڑ گیا۔

”اب بس بھی کرو ناں۔کیا واقعی یہ جتانا ضروری ہے کہ آپ کتنے خطرناک موڑ پر کھڑے ہیں۔زندگی موڑ در موڑ، راستہ در راستہ کہانی ہے۔پھر کیا الگ ہے اگر اس موڑ کا کوئی رُخ مجھے تم سے، زندگی سے دُور لے جاتا ہے۔زندگی سے کہیں زیادہ موت میں سہولت ہے۔انسان کو جو تکلیف ملتی ہے، ایک بار ملتی ہے۔“

وانیا باسکٹ میں چیزیں اُٹھا اُٹھا کر رکھنے لگی تھی۔عاطف بیگ کھانا کھا چکا تھا، مگر وانیا نے صرف ایک کپ کافی ہی پی تھی۔عدیل عبدالرحمٰن، مسٹر شاہ صمدانی سے الگ صوفے پر بیٹھے معلومات لے رہے تھے۔عاطف بیگ کبھی عدیل بھائی کے چہرے کے تاثرات دیکھتا، کبھی شہریار کی موجودگی کا احساس کرتا اور رہی وانیا، اُس کے چہرے پر سوچوں نے جال بُن دیئے تھے۔

شہریار کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''کل حمزہ آیا تھا گھر؟''
دانیا کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ شہریار کو کیسے پتہ چلا؟ کیا اس پر الہام بھی اُترتے ہیں؟
شہریار عبدالرحمٰن نے اُس کی فیلنگ سے حظ لیا، پھر مسکرا کر توجہ بنانے کو بولا۔ ''کل ماما کا فون آیا تھا۔ موبائل پر خیریت پوچھ رہی تھیں تو باتوں باتوں میں حمزہ کا تذکرہ بھی نکل آیا۔'' کچھ لمحے کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''کل میرا فون بار بار ڈس کنکٹ ہونے کی وجہ یہی تھی ناں؟ تمہیں انصاف کرنے اور محبت نبھانے میں جو اُلجھن گھیرے ہوئے تھی، میں اسی کے سلوشن کے لیے تمہیں کال کر رہا تھا۔''
دانیا نے بے ساختہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ مدھم ہو کر بولا۔
''تم یہ بھول جاؤ، میں تم سے، اپنی زندگی سے کیا چاہتا ہوں۔ تم بس یہ یاد کرو، تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم اگر میرے کسی عمل پر باقی سب کی طرح مجھے اگنور کرنا چاہتی ہو تو ہچکچاؤ نہیں۔ دیکھو! مجھے تم سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ اور سیدھی سی بات ہے، آپ کو جو عزیز ہو، آپ اُسے تکلیف میں دیکھنا برداشت کر ہی نہیں سکتے۔''
دانیا دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر جھکا گئی تو اُس نے ہولے سے کہا۔
''ناراض ہونا چاہتی ہو مجھ سے؟''
دانیا نے سر اُٹھایا اور پلکوں پر دھرے آنسو رخساروں پر بہہ آئے۔ دل کی کل ضد تو یہی تھی مگر رات بھر میں تجزیہ کیا تھا تو گمان ہوا تھا، ساری خفگی، خسارے کے باوجود وہ کسی بھی طرح اپنے اتنے پیارے بھائی کو کھونا نہیں چاہے گی۔
''ماما نے واقعی خیریت پوچھی تھی؟'' اُس نے آنسو دوپٹے سے پونچھ کر اگلا سوال کیا تو اُس نے اپنا موبائل اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ماما کی پوری کال ٹیپ تھی۔
جتنے برے نام ہو سکتے تھے، وہ ماما نے اُسے اس مختصر کال میں دے دیئے تھے۔ وہ سمجھتی تھیں، دانیا کی خوشیوں میں سب سے بڑی رکاوٹ شہریار رہی ہے۔ ماما نے جانا نہ کے معاملے کو بھی خوب رگیدا تھا۔ سارے برے برے لفظ اُس کے حصے میں آئے تھے۔
دانیا سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا، اس لئے اس نے بیچ میں سے موبائل آف کر دیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا ایسا کچھ ہے۔میں ماما کی کسی بات سے متفق نہیں ہوں۔"
اُس نے معلوم نہیں، دل کو سمجھانے کے لئے یہ جملے کہے تھے یا شہریار کو مورل سپورٹ دینے کے لئے..... بس یہ تھا کہ اس کے بعد دانیا، ڈاکٹر صمدانی کے گھر سے آئے دلیے کو چھوٹے پیالے میں ڈال رہی تھی۔دانیا کے لئے بھی سینڈوچز آئے تھے۔شہریار نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ناشتہ کرنے کی تلقین کی۔وہ بھوک نہ ہونے کے باوجود سینڈوچز کھانے لگی تھی۔یہاں تک کہ پاپا کے آنے کے بعد شہریار کے لئے حالات پہلے سے زیادہ ناسازگار ہو گئے تھے۔
"پلیز پاپا! میں کسی انجیوگرافی کے حق میں نہیں ہوں۔میں جیسا ہوں، بس ٹھیک ہوں۔" اُس نے حتمی طور پر سختی سے کہا۔
پاپا کے چہرے پر بے بسی چھا گئی۔عدیل عبدالرحمن، دانیا اور عاطف پھر کسی قسم کی پیش رفت نہیں کر سکے۔یہاں تک کہ وہ کچھ دیر کے لئے نارمل چیک اپ کے لئے اکیلا رہ گیا تو ڈاکٹر صمدانی نے سرسرائے لہجے میں پوچھا۔
"اس بیماری کی طرح مجھے لگتا ہے، تمہیں یہ بھی معلوم ہے نقصان کتنا اور کہاں ہے۔"
اُس کا لیفٹ ہینڈ بیڈ پر کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔ڈاکٹر صمدانی نے لائٹر اور سگریٹ اُس کے سامنے کیا۔
"تمہیں شاید ٹینشن میں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"
اُس نے اُن سے نظریں چرالیں، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔"آپ جانتے ہیں سب کچھ، پھر کیوں بے مصرف محنت کرنا چاہتے ہیں؟ پلیز! دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ ایسے لوگ بھرے پڑے ہیں، جن کی زندگی کی کیئر کی جانی چاہئے، جنہیں واقعی زندہ رہنے کی حسرت ہے اور واقعی انہیں ان سے محبت کرنے والوں کے لئے زندہ رہنا چاہئے۔"
اُس نے لائٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر صمدانی نے خفگی سے لائٹر اٹھا لیا تھا۔پھر بزرگانہ شفقت سے بولے تھے۔"مجھے نہیں معلوم غلطی کہاں ہے۔لیکن یہ غلط ہے جو تم کر رہے ہو۔زندگی کو غموں سے، نامساعد حالات سے ہی بہ یک ٹھوکر ملتا ہے۔کچھ کر جانے کی لگن سر مارتی ہے، لیکن تمہارے اندر مایوسی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔تم مسلمان ہو ناں؟ اور مسلمان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔"
شہریار نے کچھ نہیں کہا۔سر تکیے پر ڈال کر ہر مشورے سے نظر چرا گیا۔چیک اپ کے بعد پاپا نے انجیوگرافی کا راگ چھیڑا تو ڈاکٹر صمدانی ہولے سے بولے۔

''پھر کبھی کرلیں گے پیشنٹ۔ ابھی کنڈیشن بہت بہتر ہے۔ اگر تعاون کرتا رہا شہریار تو پندرہ دن میں ڈسچارج ہو جائے گا۔''
شہریار نے سکون کا سانس لیا تھا۔



عدیل عبدالرحمن اس وقت عاطف بیگ کے ساتھ باہر گارڈن میں بیٹھے رات کو شہریار کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو کرید رہے تھے کہ اچانک اُن کی آنکھوں میں شناسائی جھلکی۔
''عاطف! اگر میں ٹھیک پہچان رہا ہوں تو یہ جانا نہ ہے ناں؟'' اسکائی بلیو جارجٹ کی ساڑھی پہنے، وینٹی بیگ جھلاتی، اوا سے روش پر چلتی عاطف بیگ کی نظر سے ٹکراتی وہ آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔
''کیا وہ شہریار سے ملنے آئی ہے؟'' عدیل بھائی نے سرسری سوال کیا اور عاطف کی نوک زباں سے اگلا سوال اُبھرا۔
''کیا اسے معلوم ہے، شہریار بیمار ہے اور اس ہسپتال میں ہے؟''
''شاید...... وہ جتنی اپ گریڈ رہتی ہے، میرے خیال میں اُس کے لئے یہ ناممکن نہیں ہے۔''
''چلئے پتہ تو کریں۔ کہیں وہ میرے ہیرو کو پھر کسی خراب پوزیشن میں لے جا کر نہ کھڑا کردے۔'' اس کا اشارہ اُس کی طبیعت کی خرابی کی طرف تھا۔ سو عدیل بھائی تیزی سے اُٹھے تھے لیکن ابھی وہ پارک سے نکلے بھی نہیں تھے کہ رُک گئے۔ ''یہ سالار ہسپتال میں...... امیزنگ!''
''اگر وہ شہریار کو دیکھنے آئے ہیں تو میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا۔ ویسے اپنی اس رائے پر مجھے افسوس ہے۔'' عاطف نے یہ رائے دے کر عدیل عبدالرحمن کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔ بہر حال وہ اُن کا بھائی تھا۔ اُس کی رائے کا برا بھی منا سکتے تھے۔ مگر تسلی ہوئی جب انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سنی کا یہاں ہونا معمولی بات نہیں۔ جہاں تک میرا خیال جاتا ہے، وہ یہاں جانا نہ کے پیچھے آیا ہے تم نے دیکھا نہیں، ٹائمنگ میں پانچ منٹ کے وقفے سے زیادہ دیر نہیں تھی۔''
تعاقب کی کہانی غلط بھی نہیں تھی۔ پھر اندازہ عدیل عبدالرحمن جیسے زیرک ڈی ایس پی نے لگایا تھا، جس میں غلطی کا اطلاق کم سے کم ہی رہتا۔
وہ دونوں بہت خاموشی سے سالار عبدالرحمن کو نظر میں رکھے ہوئے چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کوریڈور کے کمرہ نمبر 17 پر جا کر پھر رُک گئے۔

”یہاں کون ہے جس کے لئے سالار بھائی اتنی سحر خیزی کا مزہ لوٹ رہے ہیں؟“ عاطف نے ستون سے کمر ٹکا کر عدیل بھائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کندھا اچکائے، پھر آنکھ کے اشارے سے عاطف بیگ کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر وہ ہسپتال کے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ آج اسٹاف الگ تھا۔

”آپ کا اسم گرامی؟“ عاطف بیگ نے نارمل جملوں کی لائن بولی۔

مترنم مسکراہٹ کے ساتھ کہا گیا۔ ”مجھے عامرہ فیروز کہتے ہیں۔ جی فرمائیے! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟“

عاطف بیگ نے ہاتھ کے اشارے سے عدیل کو کام کا سوال کرنے کے لئے مدعو کیا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اپنا کارڈ نکال کر سامنے رکھا، پھر سرسراتے لہجے میں بولے۔ ”مجھے امید ہے، جو سوالات میں آپ سے کرنے جارہا ہوں، انہیں آپ انتہائی سیکرٹ رکھیں گی؟“

”کوشش کروں گی سر! اگر بات میرے اختیار کی ہوئی تو ضرور تعاون کروں گی۔ اگر سوال اعلیٰ انتظامیہ سے منسلک ہوا تو وہی بہتر جواب دینے کے مجاز ہیں۔“

لڑکی ذہین ہی نہیں، خاموش طبع بھی تھی۔ ایسے لوگ جو کم بولتے ہیں اور زیادہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جو زیادہ سنتے ہیں، زیادہ معلومات بھی انہی کے پاس جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے عامرہ فیروز ایک بالکل ٹھیک آپشن تھی۔

”فلور نمبر 3 کے متعلق آپ کے پاس بتانے جیسا کچھ ہے؟“

عامرہ فیروز نے سامنے رکھا رجسٹر کھولا، کچھ دیکھا، پھر ہولے سے بولی۔ ”فلور نمبر 3 ہمارے ہسپتال کے وی آئی پی رومز کی لوکیشن ہے۔ یہاں زیادہ تر وی آئی پیز آرام کرنے کی غرض سے قیام کرتے ہیں۔ یہاں وہ فونز، موبائل، انٹرنیٹ بلکہ کسی بھی طرح کوئی رابطے کا ذریعہ استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ جو مہمان یہاں ٹھہرتے ہیں ان کی مکمل معلومات ہماری اعلیٰ انتظامیہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہوتی۔“

عدیل عبدالرحمن نے تحیر سے عاطف کو دیکھا، پھر پلٹ کر بولے۔ ”کراچی بہت ترقی کرگیا ہے۔ لاجز گیسٹ ہاؤسز ہٹس کے علاوہ اب وی آئی پیز ہسپتال میں بھی قیام کرتے ہیں۔“

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا اور عدیل عبدالرحمن دوبارہ سے مڑ کر بولے۔ ”آپ کی یہ اعلیٰ انتظامیہ کن لوگوں پر مشتمل ہے؟“

”آپ ڈاکٹر نور کے کمرے میں جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسٹر اکرام رانجھا کے بعد وہی آپ کو بہتر گائیڈ کرسکیں گے۔ گراؤنڈ فلور، روم نمبر دس۔“

عدیل عبدالرحمن سر ہلا کر لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ پھر دو منٹ بعد وہ ڈاکٹر نور کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دستک دی گئی۔

"کم اِن۔" کی آواز سنائی دی تو وہ دونوں اندر بڑھتے چلے گئے۔

فائلوں سے سر کھپاتے ڈاکٹر نور نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نظر پڑی چہرے پر تو شہریار کی خیریت دریافت کی جانے لگی۔ عدیل عبدالرحمن نے سہولت سے بات ٹال دی، پھر فوراً سے پیشتر اپنے سوال پر آ گئے۔

"کیا آپ اپنے روم نمبر 17 کے وی آئی پی پرسن کی بابت کچھ معلومات شیئر کر سکتے ہیں؟"

"سوری سر! یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ ویسے یہ روم نمبر 17 میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ ایک دو دن پہلے بھی ایک صاحب اس روم کی بابت بہت کرید کر رہے تھے۔"

عدیل عبدالرحمن جان گئے تھے۔ وہ کوئی اور، کون ہو سکتا تھا؟ یعنی سالار عبدالرحمن بھی انجان تھے کہ اس روم میں کون تھا؟

"وی آئی پیز روم کی ٹرمز کیا طے کی گئی ہیں؟" انہوں نے اگلا سوال داغ دیا۔

ڈاکٹر نور نے تولنے والی نظروں سے انہیں دیکھا، پھر بولے۔ "سیدھی سی بات ہے۔ وی آئی پی پرسن ہمیں کسی نہ کسی کے بی ہاف پر کانٹریکٹ کرتے ہیں۔ سو ہمیں اُن کی شخصیت پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جانے مانے لوگ جب دنیا کی مصروفیت سے تنگ آ جاتے ہیں تو پھر وہ چاہتے ہیں، انہیں پرائیویسی میں روشنیوں کی چکا چوند سے سابقہ نہ پڑے۔"

"یعنی آپ ہسپتال میں پانچ ستارہ ہوٹل جیسی سہولت دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ غیر قانونی نہیں؟ کیا کسی ہسپتال میں ایسی باتوں کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے؟"

ڈاکٹر نور کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ پھر وہ مدھم ہو کر بولے۔ "دیکھئے! یہاں ہر شعبے میں ایسے کام جاری ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے غلط ہیں۔ لیکن بہر حال گنجائش تو نکالی جا سکتی ہے۔ اگر کبھی آپ کا ریلیکس کرنے کا پروگرام ہو تو ہم آپ کو بھی اتنا ہی اٹینڈنس دیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی قسم کی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو قطعی مایوسی ہوگی۔"

عدیل عبدالرحمن جانتے تھے، گنجائش کہاں کہاں اور کیسے کیسے نکالی جاتی ہے، سو انہوں نے سوال سمیٹ کر بے ساختہ پوچھا۔ "روم نمبر 17 میں مس جانانہ کے کوئی رشتے دار ہوتے ہیں؟"

ڈاکٹر نور کے چہرے پر ایک سایہ آ کر گزر گیا، مگر پھر بھی انہوں نے سنبھال لیا۔

"آپ کس جانانہ کی بات کر رہے ہیں؟ میں تو اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔"

عاطف بیگ نے بور ہو کر عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا تو وہ اختتامی جملے ادا کرتے اُٹھ گئے۔ کمرے سے باہر نکلے تو انہوں نے عاطف کو دیکھا، پھر بے چارگی سے بولے۔ "مگر معاملہ نجی نوعیت کا نہ ہوتا تو اب تک میں سرچ وارنٹ لا چکا ہوتا۔"

"سرچ وارنٹ؟" عاطف بیگ ہنسنے لگا، پھر شرارت سے بولا۔ "آپ کا کوئی مجرم تو بھاگا ہوا نہیں ہے جو سرچ وارنٹ کا راگ چلے گا۔ اور پھر یہ پرائیویٹ ہسپتال میرے خیال میں اپر کلاس میں اتنا نہیں ہے کہ اگر کوئی کارروائی کی تو پولیس کے گلے میں آ جائے گی۔ آپ کو نہیں معلوم لیکن ایک دفعہ سلامہ نے اس پرائیویٹ ہسپتال کے ان وی آئی پیز رومز کی داستان کو ہلکا سا چھیڑا تھا۔"

"پھر؟" عدیل عبدالرحمٰن نے دلچسپی سے دیکھا۔

عاطف بیگ نے چلتے چلتے مدھم ہو کر کہا۔ "پھر کیا، اوپر نیچے بھونچال آ گیا تھا۔ ہسپتال نے ہرجانے کا دعویٰ کرنے کی بات کی تھی۔ سلامہ نے دوسرے دن پھر ایسے تار چھیڑ دیئے کہ دعویٰ دوسرے دن غائب اور سلامہ کا کالم پھر پہلی ڈگر...... دراصل وہ ایسے ہاٹ ایشوز پر پہلے ہوم ورک مکمل کر لیتا ہے، پھر جتانے کے لئے یعنی تار چھیڑنے کے لئے کالم میں ایک دو کلیو دے دیتا ہے۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں، ہوم ورک کتنا مکمل ہے یا نامکمل...... بات بگڑنے کا خدشہ ہو تو بیک ڈور ڈیل طے پا جاتی ہے۔ سلامہ خوش، اس کے قلم کا ہدف بننے والا آبجیکٹ خوش۔ کیا سمجھے؟"

"اچھا، سلامہ آج کل اس قسم کی صحافت کرنے لگا ہے۔ پانچ سال پہلے میرے خیال میں وہ بہت آدرشی ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں، ایسا تھا۔ لیکن جب سے اس کی بہن مائمہ مس ہینڈل ہوئی ہے، تب سے وہ صحافت کا طریقہ، زندگی گزارنے کا طریقہ، محبت نفرت کا ذائقہ سب بھول چکا ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن افسوس سے اُسے دیکھتے رہے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ "تم نے اُس سے رابطہ کیوں نہیں رکھا؟ میں نے سنا ہے دوست اگر ساتھ ہوں تو انسان بڑے سے بڑے حادثے سے گزر جاتا ہے اور اس کی ہمت نہیں ٹوٹتی۔"

عاطف بیگ نے ایک نظر اُنہیں دیکھا، پھر تاسف سے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھیا! لیکن اگر دوست یہ سمجھنے لگے، جو دُکھ اُس نے بھوگا ہے، وہ اُس کے دوستوں کا دیا گیا تحفہ ہے تو؟"

"دراصل پہلے اس کی سوچیں مختلف تھیں، مگر جب سے اس نے "ہاؤس آف یوسفی" جوائن کیا ہے، تب سے اس کی سوچ یکسر بدل گئی۔ یوسف صاحب کی سیاست بازی میں وہ در پردہ ساتھ دیتا ہے اور آپ جانتے ہیں، مسٹر یوسفی کس قدر جذباتی انسان ہیں۔ "مارو یا مر جاؤ" اس کے علاوہ انہوں نے کبھی تیسرا راستہ نہیں اختیار کیا۔ سو سلامہ بھی اب ویسا ہی ہو گیا ہے۔ اب وہ ہر دولت مند شخص کو اپنے دُکھ کا سبب

سمجھتا ہے۔ان کے خلاف لکھ کر بھی اس کے اندر کی بھڑاس نہیں نکلتی ہے۔پھر بھلا وہ مجھ سے یا شہریار سے کیوں رابطہ رکھے گا؟" مدلل جواب دے کر اُس نے عدیل بھائی کو دیکھا تو وہ مسکرانے لگے، پھر مدھم سا ہو کر بولے۔

"مجھا ایسے ہر انسان سے ہمدردی ہے، جو انسان سے انسان کا تعلق بھول کر امارت کے بل پر کسی کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرتا ہے۔پانچوں انگلیاں کب برابر ہوتی ہیں؟"

عاطف بیگ نے سر ہلا کر تائید کہا۔

"یہی تو نقطہ ہے جو لوگ نہیں سمجھتے۔نہ بہت زیادہ دولت کسی کی برائی کا پیمانہ ہے، نہ بہت غربت کسی کی اچھائی کا پیمانہ...... یہ تو صرف انسان کی رُوح، اُس کا ضمیر ہے۔اگر وہ کسی میں مرا نہیں ہے تو نیکی کا سلسلہ بھی کبھی نہیں رُکتا۔بھلے کوئی اس نیکی کو اجر سمجھے یا وبال جان کر عمر بھر اس کی مخالفت کرتا رہے۔"

عدیل بھائی نے عاطف بیگ کے کندھے پر ہاتھ مارا، پھر مسکرا کر بولے۔"بچے! تم تو بہت عالمانہ گفتگو کرنے لگے ہو...... یہ شہریار کی محبت کا اثر ہے یا......"

عاطف بیگ کو تو خدا موقع دیتا فوراً بولا۔"یہ "یا" والی بات ہی درست ہے۔آپ نے خود اندازہ لگا لیا ہوگا، وہ کتنا اکل کھرا ہو گیا ہے۔ہر چیز، ہر انسان سے ناراض۔آپ سے بھی تو ڈھنگ سے گفتگو نہیں کر رہا۔"

عدیل بھائی نے گہری سانس لی، پھر ہولے سے بولے۔"قصور اُس کا نہیں ہے عاطف یار! بات یہ ہے کہ گوتاہی ہمیشہ سے ہماری طرف سے رہی ہے۔دراصل بچپن میں جب وہ مجھ سے کلوز ہونے کی کوشش کرتا تھا تو مجھے کتابوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔سالار ہمیشہ اسے دشمن کی نظر سے دیکھتا رہا۔رہی دانیا تو سارا وقت دانیا ہی کے ساتھ گزارنے کے بعد جب وہ مجھے اپنی طرف سے غافل دیکھتا تو لامحالہ اُسے میں سالار کی کیٹگری کا بندہ لگتا ہوں گا، مگر گھر کا ماحول...... اُس کی حمایت کرنے پر مما اُس پر اور زیادہ سختی کریں۔ تو وہ اُسے اُٹھتے بیٹھتے بے بھاؤ کی سنانے لگتیں۔پاپا کی حمایت کا بھی کچھ یہی ری ایکشن ہوتا تھا۔مما چاہتی تھیں، اُسے کوئی منہ نہ لگائے، کیونکہ وہ زبردستی ان کی زندگی میں شامل کر دیا گیا تھا۔سو اسی سبب سے میں نیوٹرل رہ کر خاموشی میں ہی اس کی عافیت سمجھتا۔مگر وہ اب یہ سمجھتا ہے اور غلط نہیں کہہ سکتا میں اسے، وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔جانا نہ کے معاملے میں بھی میں نے اور پاپا نے اس کے خیال کے مطابق خاموشی اختیار کر لی، سو وہ یہ تو مانتا ہے، یہی درست فیصلہ ہے، لیکن اس کا دل یہ چاہتا ہے اندر سے، کہ کوئی تو ہو جو اس کے لئے اسٹینڈ لے۔بس یہی کمی، یہی حمایت نہ ہونے کی حسرت نے اُسے ڈھیر سے ڈھیر سے دُونا دیا ہے۔"

تجزیہ بہترین تھا اُس کی شخصیت پر، اس لئے عاطف بیگ نے کوئی سوال نہیں اُٹھایا اور ہاتھ کے اشارے سے اُس کے رُوم کی طرف چلنے کی پیشکش کی۔عدیل بھائی خاموشی سے چلنے لگے۔مگر رُوم نمبر 17

کی شخصیت پر اب بھی اُن کی ساری سوچیں محور تھیں۔
شہر یار کا روم آچکا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ دانیا کو اُسے سیب چھیل چھیل کر کھلاتے دیکھا تو طمانیت محسوس کی۔ عدیل بھائی صوفے پر بیٹھ گئے، پھر گھڑی کی طرف نظر گئی تو بولے۔
"دانیا بیٹا! اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے ہیں، تم لنچ کے لئے گھر چلی جاؤنا۔"
دانیا نے پلٹ کر عدیل بھائی کو دیکھا، وہاں مسکینیت کے ساتھ بھوک کی شدت صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ عدیل بھائی شروع سے بھوک کے کچے تھے، لیکن مصروف ہوتے تو اُنہیں کھانا کبھی یاد نہیں رہتا تھا۔ ہاں، فارغ اوقات میں اُن کی ساری سوچیں صرف بھوک اور کھانا مل جانے کی ہوک میں مبتلا ہو جاتیں۔ سو اس وقت بھی وہ اسی دور سے گزر رہے تھے۔ دانیا نے سیب کی پلیٹ اُن کی طرف بڑھائی تو عاطف نے اُچک لی، پھر شہر یار کو نظر میں رکھ کر بولا۔
"خوب عیش ہو رہے ہیں۔ اگر ناز اُٹھوانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے بتا دیتا۔ اس کے لئے بیمار ہونا شرط تو نہیں ہے۔ ہم تو پہلے ہی تیرے بیاروں میں شامل ہیں۔"
شہر یار عبدالرحمٰن نے سکوت سے اُسے دیکھا، اندر کوئی ہلچل نہیں مچی اُس کے جملے سے۔ پتہ نہیں جذبات کی کتنی تہیں تھیں جن پر وقت نے برفاب ہاتھ رکھ کر زندگی منجمد کر دی تھی۔
"یہ کیا، ہر وقت چپ شاہ کا روزہ رکھ لیتا ہے؟ ہنسنا بولنا کیا بالکل بھول گیا ہے؟" دانیا کے کمرے سے نکلتے ہی عاطف اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا۔ اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اُس سے سوال دہرانے لگا۔
شہر یار نے آنکھیں سامنے رکھے گلدان پر ٹکا دیں، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔
"پھول گلدان میں تو ڑ کر لگانے سے پھولوں کی زندگی کتنی مختصر ہو جاتی ہے۔"
"ہاں، مگر شاخ پر کھلے ہوئے پھول بھی تو مرجھا ہی جاتے ہیں۔"
عدیل بھائی نے عاطف بیگ کی خاموشی کو آواز دی اور وہ اُن کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "ہاں، شاخ پر کھلے پھول بھی مرجھا ہی جاتے ہیں۔ مگر ان کی پتیاں جب تیز ہوا سے جھڑتی ہیں تو اس پودے کے اطراف ہی بکھرتی ہیں، اس پھول کے ہاتھ میں اپنی خوشبو کے معجزے کی طرح یہ ادراک تو ہوتا ہے، وہ کہاں کھلا، وہ کہاں بکھرا...... مگر جو پھول ایسے گلدانوں میں سجا دیئے جائیں، ان کی قسمت ڈسٹ بن کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ خوشبو کا معجزہ بھی ان کی دربدری کی سمت نہیں بھول پاتا۔"

عاطف بیگ نے دیکھا، اُس کی آنکھ کے کونے میں کوئی آنسو اٹکا تھا، مگر عیاں ہو کر بھی بہنا نہیں چاہتا تھا۔
"تم دل کھول کر رو کیوں نہیں لیتے؟ ایک بار شکوہ کرلو ساری دنیا سے، پھر کہتے ہیں، دل کو قرار آ جاتا ہے۔"
شہریار نے عاطف بیگ کو دیکھا، پھر ہنسا۔ مگر عدیل بھائی کو محسوس ہوا، وہ ہنسنے کے بہروپ میں شاید رویا تھا...... پھر ہنسی رُکی تو بولا۔
"اگر کوئی وجود ہی نہ رہے، صرف آنسو ہو تو پھر وہ کیسے روئے؟ روئے گا تو نمک نہ ہو جائے گا؟ شکوہ ذات میں ہو تو سوال بھی اُٹھائے کوئی۔ جس کی ذات ہی شکوہ بن جائے تو زندگی کا گلا چھل نہیں جائے گا نالہ کرتے؟ قرار، قرارِ دل ہو تو قرار کی حاجت بھی کرے کوئی، دل ہی بے قراری کی مٹی میں گوندھ کر بنایا گیا ہو تو کون سے چاک پر جا کر اس دل کی صورت گری کریں؟"
عدیل بھائی اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئے تھے اور دانیا، جو عدیل بھائی کے کہنے پر باہر جا کر موبائل سے دوپہر کے لنچ کے لئے مینیو لکھوا کر واپس پلٹی تھی، کمرے کی انتہائی خاموشی سے اچنبھے میں رہ گئی تھی۔
"کیا بات ہے؟ آپ لوگ اتنے خاموش......"
عاطف بیگ نے چونک کر دانیا کو دیکھا، جو مصنوعی قہقہہ لگا کر بولا۔ "کیا مطلب سسٹر! ہم خواتین تو نہیں جن کے خاموش رہنے پر تمہیں اتنی حیرت ہے؟"
عدیل بھائی نے دیکھا تو کہا۔ "تم ابھی تک یہیں ہو؟ میں تو سمجھا تھا کہ کچن میں کھڑی کچھ نہ کچھ پکانے میں لگی ہو گی۔"
دانیا ہنسنے لگی، پھر مسکرا کر بولی۔ "لگتا ہے بڑے بھیا! آپ کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ ٹھیک ہے، میں خود ہی جاتی ہوں۔ دراصل کمرے میں سگنلز نہیں آ رہے تھے، اس لئے گارڈن میں جا کر رفیق سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ تو جانتے ہیں ناں، وہ بھی رابعہ باجی سے کم لیزی نہیں۔ لہٰذا خود جائے بغیر اب لگتا ہے، کوئی حل نہیں۔ کار کی چابی۔" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔
عدیل بھائی نے جیب سے کار کی چابی نکال کر اُس کی طرف بڑھائی۔ دانیا نے چلنے سے پہلے شہریار کی طرف دیکھا۔ "آپ کے لئے کچھ لاؤں شیری بھائی؟"
شہریار نے پہلی بار یوں دیکھا، جیسے وہ اُس کی آمد سے اب تک بے خبر تھا۔ خاموشی سے وہ اندر کی گہرائی کو چھو کر پلٹ آیا تھا۔ بہن کی آنکھوں میں سوال ہنوز برقرار دیکھا تو بولا۔ "نہیں، میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا۔ تم کوئی تردد مت کرنا۔"
دانیا دروازے سے لوٹ آئی، پھر محبت سے بولی۔ "کھائیں گے نہیں تو کمزوری نہیں بڑھ جائے گی؟ کچھ تو لیں۔ ٹھیک ہے، میں چکن سوپ لے آؤں۔"

شہریار نے ہاں کہا، نتاں اور عاطف بیگ بولا۔ "ہاں، لے آؤ۔ مگر میرے لئے چکن کارن سوپ ہو تو کیا ہی کہنا۔ مجھے تمہارے ہاتھ کا چکن کارن سوپ بہت پسند ہے۔"
دانیا ہنسنے لگی۔ شہریار کے ہاتھ پر ڈھارس کا ہاتھ رکھتے ہی وہ باہر کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ عدیل بھائی، عاطف بیگ دونوں اُسے فارم میں لانے کے لئے مختلف باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پاپا صبح دس بجے ہاسپٹل سے ہی دفتر چلے گئے تھے، شہریار کو ڈھیر ساری نصیحتیں کرتے ہوئے، اس لئے وہ تو نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹرز آور بھی نہیں تھا۔ پھر یہ کون تھا؟ ہینڈل گھمائے جانے کے دو سیکنڈ بعد دروازہ کھل چکا تھا۔ اسکائی بلیو ساڑھی کے آنچل میں لپٹا وجود سامنے کھڑا تھا۔ شہریار کے مانیٹر میں یکدم اُس کی ہارٹ بیٹ تیز ہو کر مدھم ہوئی تھی۔ عاطف بیگ نے عدیل بھائی کی طرف دیکھا تھا اور پھر دونوں نے مل کر جانانہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ خاموشی پھر بھی برقرار رہی تو عاطف بیگ نے پوچھ ہی لیا۔
"دشمنوں کو خبر کیونکر ملی؟"
جانانہ ادا سے چلتی کمرے میں داخل ہوئی، پھر مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے، آپ کی خبر یا تو دوست کو ہو سکتی ہے یا دشمن کو۔ سو مجھ سے یہ خبر کیونکر چھپ سکتی تھی؟" وہ ہنسی پھر جتانے کو بولی۔ "کچھ لوگ جیسے میری انویسٹی گیشن کرتے پھرتے ہیں تو جواباً مجھ کو آنکھیں کھلی رکھنا فرض ہے ناں۔" عدیل بھائی کی طرف جواب اچھال کر شرارت سے شہریار کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ تم اندر سے اتنے کمزور ہو گے کہ محبت کا نیا الزام سہنا بھی تمہارے لئے دوبھر ہو جائے گا۔ ویسے اوقات سے بڑھ کر عزت افزائی ملنے لگے تو کچھ لوگ یونہی اتراتے پھرتے ہیں۔"
شہریار کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اُس کی بس آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھی۔ دماغ کہاں تھا، کہاں نہیں، خبر نہیں ہو رہی تھی۔
شہریار کی حالت یکسر ایک ہی طرح رہی تو عدیل بھائی نے پہلی بار جانانہ کو مخاطب کیا۔
"تمہیں آخر شہریار سے پرخاش کیا ہے؟ آخر تم اسے مارنے کے درپے کیوں ہو؟ کیوں بار بار اُس پر جھوٹے الزام لگا کر اُسے ذہنی اذیت دینا چاہتے ہو؟"
"ہا، ہا، ہا......" ایک طویل قہقہہ گونجا، پھر جانانہ سفاکی سے بولی۔ "موت میرے اختیار میں ہو تو میں اس شخص پر زندگی کو اتنا بھیانک کر دوں کہ یہ ایک ایک لمحے میں ہزار بار مرے مگر پھر بھی موت اسے نہ چھو سکے۔ مسٹر عدیل! کچھ لوگوں کا زندہ رہنا موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکی، پھر بولی۔ "ویسے مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے، اس جیسا شخص اندر سے اتنا کمزور کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے بے حس لوگ تو بہت کم کسی بات کو دل سے لگاتے ہیں۔ ایلیا رحیم ہو، جانانہ یا کوئی اور ہو...... شہریار کو فرق تو نہیں پڑنا چاہئے۔ پھر یہ کیوں دل پہ لیتا ہے ان ناموں کے غم؟"

انداز تضحیک آمیز تھا۔ شہریار کے چہرے پر ایک دم کرب آ گیا تھا۔ آنکھوں میں بے چینی تھی، دل کی دھڑکن پھر سے اپ سیٹ ہونے لگی تھی، تبھی عاطف بیگ غصے سے پھنکارا تھا۔ ”آخر کیا بگاڑا ہے اس نے؟“ جارحانہ موڈ میں کہہ کر اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی، مگر شہریار نے کپکپاتے ہاتھ سے اُس کی کلائی تھام کر آنکھ کے اشارے سے ارادے سے باز رکھا۔

جانانہ اپنے لفظوں کا ری ایکشن خاطر خواہ پا کر اُسے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ پھر کچھ ساعت بعد سرسرائے لہجے میں بولی تھی۔ ”پتہ نہیں کیوں، لیکن مجھے اپنے جیسے بے وفا لوگوں سے رج کر پیار ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے سامنے والا کتنا بھی دامن بچائے میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوتی۔ بس یہی وجہ ہے، شہریار سے میں اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتی۔ مجھے بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں اور اچھے لگنے والوں کے بھاگ اچھے رہیں، نہ رہیں، یہ تو ان کی قسمت ہے۔ بس مجھے....... مجھے آپ کے شہریار سے کچھ پیار سا ہو گیا ہے۔“

عدیل بھائی اتنے بے باک لہجے پر گڑبڑا کر رہ گئے۔ عاطف بیگ کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ صرف شہریار اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے والی ہلچل پر اُس نے قابو پا لیا تھا اور اب وہ اُسے ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے جانتا ہو، جانانہ کی آمد بے مقصد نہیں تھی۔

”تم جو نیا کہنے آئی ہو، وہ بتانا پسند کرو گی؟“

اُس کی بے ساختہ قسم کی خاموشی سے گھبرا کر شہریار نے بالآخر ایک جملہ جوڑا اور جانانہ اُسے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی۔ کتنی ہی ساعتیں اس شرارت کی نذر ہوئیں، تب اُس نے کہا۔

”زوار حسن نے سالار سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے نبھانے کا حق بھی اسی پر ہے۔ لیکن اگر میں یہ اسٹوری تمہارے گھر پہنچا دوں، کچھ اور سبب سے، صرف ایلیا کی تصاویر اور ایک اور ہاٹ اسٹوری تیار۔ تم تو یونہی بدنام ہو، تمہاری بات پر کسے یقین آئے گا؟“

شہریار نے خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”میں یقین کی حد سے نکل چکا ہوں۔ تم میری زندگی کو بے یقینی سے جتنا نتھی کرتی ہو، مجھ پر زندگی اتنی ہی سہل ہو جاتی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ، لیکن یہ حقیقت ہے، ذات کا یقین ہاتھ میں ہو تو رشتے، جذبے، دل، سب کا حق یاور رہتا ہے۔ بے یقینی حد سے سوا ہو جائے تو پھر کسی بھی سچائی سے تکلیف پہلی بار جیسی نہیں ہوتی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے، ایلیا کی کہانی کل رات بھی کھانے کی ٹیبل پر ڈسکس ہو چکی ہے۔ رہی اخبارات کی بات، تو لوگ ایسی خبروں پر اب دھیان نہیں دیتے۔ جو دیں گے تو کیا کہیں گے زیادہ سے زیادہ....... جتنے بھی تلخ لفظ زبان و بیان میں ہوتے ہیں، وہ میں پہلے سے اپنی ذات کو ریکارڈ کے طور دیتا رہتا ہوں۔ اس لئے زیادہ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یوں سمجھو! کچھ دھول جھڑ جائے گی۔“

ایسا لگتا تھا، وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ جانانہ نے یہ کیفیت دیکھی تو مصنوعی خفگی سے بولی۔ "ایسے تو مت کہو شیری میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہیں تو معلوم ہے، مجھے اپنی ذہانت پر کتنی ہو تو میں زیادہ مشتعل ہو جاتی ہوں۔ ویسے افسوس رہے گا مجھے، سالار نے میرے اتنے لطف کا موقع چھین لیا۔ مگر خیر، یار زندہ، صحبت باقی۔"

شہریار نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

عدیل بھائی اُس کی دیدہ دلیری پر عش عش کرتے رہے کہ وہ شہریار کے فیملی ممبر کے سامنے جھوٹ کا اقرار کر کے بھی اپنا نیا گیم کھیلنا چاہتی ہے۔

جانانہ، شہریار کی طرف سے مڑ چکی تھی۔ اب اُس کی نظر کے حصار میں وہ دونوں تھے، سو عدیل بھائی کی آنکھوں کے سوال کو اُس نے نہایت چابک دستی سے سمیٹ لیا تھا، پھر قدم قدم کر کے ان کے قریب آ کر رُک کر بولی۔

"شہریار کے گھر میں کون کون اُس کا حمایتی ہے، کون نہیں، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔ لیکن مزے دار بات تو یہ ہے، آپ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اسے کسی الزام سے بری نہیں کروا سکتے۔" وہ لمحہ بھر کو رُکی، پھر خاص انہیں جتانے کو بولی۔

"روم نمبر 17 بیگم سطوت جہاں کے نام الاٹ رہتا ہے۔ رہی اس میں موجود شخصیت کا سسپنس تو مسٹر عدیل او وہ گھر نہیں ہے، جہاں ہمیشہ ایک ہی فرد براجمان رہے، مہمان خانہ ہے اور مہمان آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں۔ آپ کس کس کا بائیو ڈیٹا یاد کریں گے؟ سوفی الحال اس کی تیمارداری ہی یکسوئی سے کر لیجئے۔ آپ کو نہیں پتہ، یہ میرے لئے کتنا ضروری ہے۔"

نیا سوالیہ نشان چھوڑ کر وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی چلتی چلی گئی۔ شہریار اُس کے سامنے تو بہت ریلیکس رہا تھا، مگر اُس کے جاتے ہی اُس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور لائٹر نکال لیا تھا۔

"ڈاکٹر صمدانی نے سختی سے منع کیا ہے اسموکنگ کو۔" عاطف نے لائٹر لینے کی ضد کی مگر اُس نے سختی سے اُسے دیکھا، اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ فوراً نیچے گر گیا۔ "یہ خودکشی ہے، جو تم کر رہے ہو۔" وہ پھر بھی منمنا کر اپنی بات پر جما رہا۔

عدیل عبدالرحمن اُسے خاموشی سے دیکھتے رہے اور وہ گہرے گہرے کش لے کر اندر کا حبس باہر نکالتا رہا۔



"آ گئی ماں کی جان!" اُس نے کار سے نکل کر اندرونی دروازے سے داخل ہو کر پہلی ہی صدا میں مسکراہٹ کو چھوا۔ اُسے دنیا میں اپنی ماں سے زیادہ کوئی عزیز نہیں تھا۔ دنیا کچھ بھی کہتی رہتی، یہ طے تھا، جانانہ کو سطوت جہاں کے نام سے پہچان پانا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ سو وہ بیگ صوفے پر ڈال کر صوفے پر بیٹھی ماں کے گلے کا ہار بن گئی۔ پھر اترا کے بولی۔

"آپ نے مجھے مس کیا تھا ماں؟"

سطوت جہاں کا قہقہہ دو آتشہ تھا، جس میں بیٹی کے لئے محبت بھی تھی اور اپنی ذات کی اہمیت کا نشہ بھی۔ سو انہوں نے جانانہ کو چھیڑنے کو کہا۔ "کہاں، میں کوئی ویلی ہوں جو تجھے یاد کروں؟ اور پھر چند گھنٹوں ہی تو ماں سے دُور ہوتی ہے تُو، پھر بھی تجھے مس کروں؟"

جانانہ، جو صوفے پر بیٹھ کر سطوت جہاں کی گود میں سر رکھ چکی تھی منہ بسورتے ہوئے پن سے بولی۔ "بھلے ایک پل دُور رہوں، لیکن آپ مجھے ایسے یاد کرتی رہو، جیسے کوئی مرجانے والے کو یاد کرتا ہے۔"

"ہائے اللہ بری فال منہ سے نہ نکال۔ مریں تیرے دشمن......" سطوت جہاں نے جانانہ کے منہ پر ہاتھ رکھا اور وہ ہنسنے لگی۔

"تمہاری یہی محبت تو میری طاقت ہے، تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے لگتا ہے، میں ساری دنیا کو زمین چٹا سکتی ہوں۔"

سطوت جہاں مسکرا کر جانانہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولیں۔ "وہ شہریار کا کیا ہوا؟ میں ایک ہفتے بعد لوٹی تو ایلیا نے بتایا، وہ یہاں آیا تھا، لیکن بغیر کسی رسپانس کے واپس چلا گیا۔ تُو نے اُسے ایسے ہی جانے دیا، کیوں؟"

جانانہ نے سطوت جہاں کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر محسوس کیا، پھر بولی۔ "ایسے کہاں جانے دیا ماں! زوار نے پوری ٹیم ہی اُس پر اُلٹ دی تھی۔ مس ایلیا نے یہ نہیں بتایا، جب وہ سالار کے سامنے کھڑا تھا تو بالکل بھیگا ہوا اُلّو لگ رہا تھا، پھر ماں! پھونک پھونک کر کھانے میں تم ہی تو بتاتی ہو، منہ نہیں جلتا۔"

سطوت جہاں نے بیٹی کے رخسار کو لاڈ سے چھوا، پھر پہلے سے ممتا سے چُور لہجے میں بولیں۔ "میری وصیت ہے تجھے، تُو عبدالرحمٰن کے دیئے ہوئے زخم کو کبھی مت بھولنا۔ تجھے اپنی خالہ کی اذیت ناک موت کبھی بھولی تو میں تجھے کبھی اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔"

جانانہ کچھ نہ بولی، آنکھیں بند کئے لیٹی رہی، اُسے سطوت جہاں کی گود میں اس طرح لیٹے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اور پھر جب وجود بری طرح تھکن سے چُور ہو تو یہ آسرا بہت خوب صورت لگتا تھا۔

''چل ماں، اب اُٹھ کے شاور لے لے جا کر۔ پھر کھانا لگوا دیتی ہوں۔'' سطوت جہاں نے اُس کے رخسار کو چھوا۔
وہ ترنگ میں اُٹھتی، لہراتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھتی چلی گئی۔
سطوت جہاں کمرے میں اکیلی رہ گئیں تو اُن کے چہرے پر ایسی عیارانہ چمک تھی کہ اس کی تشریح ممکن ہی نہیں تھی۔ اُنہوں نے گہرا سانس کھینچا تھا، پھر غرور سے بولی تھیں۔ ''عبدالرحمٰن! غلطی تم نے کی تھی، مگر سزا تمہیں قسطوں میں دینے کا جو میں نے مہرہ تیار کیا ہے، وہ پٹنے والا نہیں۔ ایک لڑکی کو میرے سامنے کھڑا کرنے، مجھ سے اونچی آواز میں بات کرنے کا جو ڈھنگ تم نے کسی کو سکھایا تھا، یہ وہی سخت لہجہ ہے، جو میں نے تمہیں لوٹا یا ہے........ کہتے ہیں، انسان اپنے اوپر بیتنے والی تکلیف بھول جاتا ہے۔ سہہ لیتا ہے، لیکن اپنی سب سے پیاری اولاد کی تکلیف اُسے سوگنا ہو کر تڑپاتی ہے۔ شہریار کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ تمہارا چہیتا بیٹا ہے اور چہیتی اولاد کی تکلیف، آنسو اور موت بہت بھیانک لگتی ہے۔ ہے ناں۔''
وہ پھر سے ہنسنے لگی تھیں، یہاں تک کہ جانانہ شاور لے کر سفید رنگ کے مہین لباس میں بال تولیے سے خشک کرتی ان کے پاس آ کر رکی۔
''ماں! کیا حمزہ عابد کا فون آیا تھا؟''
سطوت جہاں نے چونک کر، پلٹ کر بیٹی کو دیکھا، پھر اُس کے قیامت قدر پر نظر گئی تو اُن کی آنکھوں میں چمک دوگنی ہو گئی۔ ابھی زندگی سہل ہی رہنی تھی۔ کیونکہ اُن کی کمائی کا ذریعہ بہت سالڈ تھا۔
''کیا دیکھ رہی ہو ماں! میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' اُس نے تولیہ صوفے پر اُچھال کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
سطوت جہاں آنکھ میں شرارت بھر کر بولیں۔ ''تُو تو پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل کس کے خیال ہیں، جو تجھے اتنا خوش رکھنے لگے ہیں؟''
جانانہ نے ماں کو دیکھا، پھر جواباً ہنس کر بولی۔ ''بس ماں! تمہیں تو پتہ ہے، میں جب جب شہریار کو پہلے سے زیادہ ڈسٹرب دیکھتی ہوں، تو مجھے لگتا ہے، میں نے بہت بڑی کامیابی کمائی ہے...... اور کامیابی پر خوش ہونے کا حق تو سب کو ہے ناں۔''
سطوت جہاں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر کھانے کا حکم دینے لگیں۔ چنبیلی، نیلی، ایلیا، راحیلہ سب اُن کے کہنے پر اپنے اپنے کمروں سے نکل آئی تھیں۔ سب تھکن سے چُور تھیں، مگر اپنی زندگی کی عیش پسندی پر اُنہیں اس کا غم نہیں تھا کہ اُنہوں نے کیا گنوا کر کیا کمایا تھا۔ ملازمین ٹیبل پر کھانا چن رہے تھے۔ جانانہ اُن سب میں کوہ نور ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔ سطوت جہاں سربراہ کی کرسی پر بیٹھی

تھیں۔ کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ چائے کا دور چلا تو سطوت جہاں نے سب سے ان کی محنت کی کمائی پر بات چھیڑ دی۔ سب اپنی اپنی پارٹی کو خوش کر کے کافی کچھ کما کر لائی تھیں، صرف نیلی افسردہ تھی۔ اُس کی پارٹی بہت کنگلی ثابت ہوئی تھی۔ پانچ ہزار سے زیادہ ہاتھ پر نہیں رکھ سکی تھی۔ سطوت جہاں نے افسردگی کا تاثر گہرا دیکھا تو اُسے خود سے لپٹا کر بولیں۔

”بس میرے بچے! اُداس مت ہو۔ مجھے کیا پتہ تھا، وہ اتنا کنگلا ہوگا۔ مجھ سے تو پچاس ہزار کی بات کی، میں نے سوچا، پچاس ہزار دینے والا اتنا ٹھگا نہیں ہوگا۔ مگر چل، مجھ سے دس ہزار لے لینا۔ جی بھر کر شاپنگ کر لینا۔ اب تو ہنس دے۔“

نیلی پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگی۔ ساری لڑکیاں جیسے آئی تھیں، ویسے ہی اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئیں۔ جانانہ نے ملازمین کو کھانا اُٹھاتے ہوئے خاموشی سے دیکھا، پھر تنہائی ملی تو بولی۔

”ماں! مجھے تمہارا یہ دیالوپن اچھا نہیں لگتا، جو تم کرتی ہو۔ اس سے لڑکیاں بگڑ سکتی ہیں، تمہارے سامنے آکر اپنا حق مانگ سکتی ہیں، دبا کر رکھو گی انہیں تو ان کا ہاتھ تمہارے لینے والے ہاتھ سے نیچے رہے گا۔ کیا سمجھیں؟“

سطوت جہاں نے بیٹی کی طرف ہاتھ ہلا کر اس کی کم فہمی پر ہنس کر دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولیں۔ ”تو بالکل جھلی ہے جان! تجھے نہیں معلوم .... مگر لڑکی، کسی نے کہا ہے، اسپرنگ کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا سختی سے دباؤ تو اتنی ہی طاقت سے واپس پلٹتی ہے۔ اسے تو نرمی کی مار ہی مار کر رکھتی ہے۔ میرا یہ سلوک یاد رہے گا انہیں، وہ کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہیں سوچیں گی۔ میرے گھر کے علاوہ انہیں کہیں عافیت دکھائی نہیں دے گی۔ مگر یہ سب تم نہیں سمجھو گی۔ اور پھر تیری عمر ہے بھی نہیں سمجھنے والی۔ اس عمر میں تو بس جی ترنگ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اپنے دماغ کو مت تھکایا کر فضول باتوں کے لئے۔“

جانانہ نے متفق ہوتے ہوئے سونف کی پھنکی ماری، پھر سطوت جہاں کے قریب آکر بیٹھی ہی تھی کہ ایک کارڈ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ ”حمزہ عابد۔“

اُس نے ڈرائنگ رُوم میں بلانے کا حکم دیا، پھر سنبھل کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ سطوت جہاں اپنا پان دان اٹھا کر اندرونی کمروں کی طرف جاتی راہداری میں گم ہو گئیں۔ اب ڈرائنگ رُوم میں وہ اکیلی بیٹھی تھی۔

حمزہ عابد، ملازم کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ رُوم کی دہلیز پر آن رکا، پھر اس پر نظر گئی تو اُس کی آنکھوں کی چمک دُگنی ہو گئی۔

حُسن اتنا بے حجاب ہو تو نظر میں ایک پل کے لئے بے باکی آجانا نظر کا حق ہے۔ وہ متوازن چلتا ہوا اُس کے سامنے والے صوفے پر آن بیٹھا، پھر اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”حُسن کی حکومت کیا کسی دن ہمارے ہاتھ آئے گی؟ دیکھو نیلم! میں تو اس حکومت کے ملنے پر چار دن ہونے کا شکوہ بھی نہیں کروں گا۔ بس اتنا کرو کہ دو آرزو کے جو دن ہیں، انہیں انتظار سے ضرب دے کر

وصال کی شام میں نتھی کردو۔ دل والوں پر تمہارا یہ قرض ہوگا۔"

"ہا، ہا، ہا......" ایک طویل جلترنگ بجاتا قہقہہ سنائی دیا، پھر اُس نے ادا سے ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا، پھر مسکرا کر بولی۔ "حسن چھونے کی چیز نہیں، محسوس کرنے کی چیز ہے۔ لوگ صدیاں گزار دیتے ہیں، تب بھی وہ حسن کی تشریح نہیں کر پاتے۔"

حمزہ عابد نے اُس کے ہاتھ کو نرمی سے تھاما، پھر منجمد لہجے میں بولا۔ "ایک بار ملو تو تشریح تو کیا، حسن کی ساری وضاحت کر کے رکھ دوں گا۔ مگر وائے افسوس......

وہ ملتا نہیں ایک بار ہمیں

اور یہ زندگی دوبارہ نہیں"

شعر پڑھ کر حسرت نا کی سے دیکھا تو جانا نہ ہنستے ہوئے اُٹھی۔

"کیا پیئو گے، شیمپین یا......"

"کوئی کلاسک چیز پلاؤ کہ تمہارے روبرو بیٹھا رہوں اور عمر گزرنے کا افسوس نہ ہو۔"

جانا نہ دو گلاس سوڈا، آئس جار اور وائن کی بوتل اُٹھا لائی۔

حمزہ عابد نے جام بنانے کی ذمے داری لے لی تھی، سو وہ اسٹائلش سیٹی کے کراؤن سے ٹیک لگائے اُسے گلاس بناتے دیکھتی رہی۔ وہ نہایت انہماک سے مصروف تھا، تبھی اُس نے کہا۔

"تم نے دوپہر میرے نمبر پر مسڈ کال کیوں دی تھی؟ کوئی خاص کام تھا کیا؟"

حمزہ عابد نے نفی میں سر ہلایا، پھر جام کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "کوئی خاص کام نہیں تھا، تمہارا موبائل آف جا رہا تھا، اس لئے گھر کا نمبر ٹرائی کیا تھا۔ تمہاری آواز سننے کی طلب ہو رہی تھی۔ اور پھر ایک خبر بھی دینی تھی۔"

جانا نہ نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر اسے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا کہتی ہوئی بولی۔

”میں جانتی ہوں تم کیا خبر شیئر کرنا چاہتے ہو۔ شہریار کی بیماری کی گڈ نیوز دینا چاہتے تھے۔“ لمحہ بھر کو رُکی پھر بولی۔ ”بے فکر رہو، میں اس بیماری سے مل آئی ہوں اور اس کی بیماری کی اذیت بھی پہلے سے بڑھا آئی ہوں۔“

”اوکے، کوئی نئی گیم؟...... ویسے مجھے عمر بھر افسوس رہے گا، میں تمہاری اس خواہش کو پورا نہ کر سکا جس کے پورا کرنے کے لئے تم نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔“

”ہشت...... میں پاپڑ بیلوں گی؟“ ہنس کر اُسے دیکھا، پھر ادا سے بولی۔ ”میری ایک نظر حادثہ ہے مسٹر حمزہ عابد! میری نظر میں وہ لطافت ہے کہ پھر دنیا بھی متوجہ نہیں کر سکتی۔ جو نظر مجھ پر رُکے، پھر وہ میری ملکیت اور جو جیسا ہو، اُسے بے جا محنت کی کیا ضرورت۔ ہاں، بس سمجھو میں جو لطف دوبالا کرنا چاہتی تھی، وہ نہیں کر پائی۔ شہریار یہاں اچھی گیم کھیل گیا اور بس...... مگر وہ نیا کا مہرہ ہاتھ سے نکلا تو اب بھی نہیں ہے۔ تمہاری صورت میں اب بھی میں جب چاہوں، اُسے اُلٹے وہاؤ میں لا سکتی ہوں۔ ویسے یہ زرش تمہیں آج کل اتنا ٹائم کیوں دینے لگی ہے؟“

”مطلب؟“ حمزہ نے ہونق ہو کر دیکھا۔ یہ زرش سے جھگڑے والی بات تو انتہائی سیکرٹ تھی پھر...... جانانہ سے کیا کوئی خبر چھپ بھی سکتی ہے؟...... اُس نے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

جانانہ نے ہنس کر کہا تھا۔ ”اچھے بھلے تو چل رہے تھے، تمہارے تعلقات، یہ یکدم دراڑ کیوں پڑ گئی؟“

حمزہ عابد نے ٹھنڈی سانس لی، پر کراہ کر بولا۔ ”پتہ نہیں، کس نے اُس کے دماغ میں گھر گرہستی کا خواب جگا دیا ہے۔ اب تو اس سے موڈ بنانے کے لئے کوئی حسن کا ذکر چھیڑوں تو فوراً ہاتھ تھام کر کہتی ہے، اتنا پیار کرتے ہو تو گھر میں کیوں نہیں بسا سکتے...... سارا موڈ چوپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب کون بتائے اس احمق لڑکی کو، گھر اس جیسی لڑکی سے نہیں بسائے جا سکتے۔ ہم مرد لوگ، ہمیں تو بیوی ایسی چاہئے ہوتی ہے، جن کو سورج کی کرن بھی نہ دیکھ سکے۔ کسی آنکھ نے اس کا الوہی روپ کبھی چرا کر یا دنہ بنایا ہو۔ ہمیں تو اُن چھوئی چراغ خانہ قسم کی لڑکی اٹریکٹ کرتی ہے، جو ہمارے کہنے سے دن کرے، ہمارے کہنے سے رات۔“

جانانہ کا قہقہہ اُس کے جملے پر ایسا تھا کہ حمزہ عابد چونک کر اُسے دیکھنے لگا، پھر مست ہو کر خمار سے بولا۔ ”تمہارے وجود میں وجاہت ہے، دیکھتے ہی کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی بھر ف تمہارا خمار رہتا ہے، تمہیں دیکھتے رہنے کی حاجت کے سوا سب خواہشیں، تمنائیں مار دینے کو جی کرتا ہے۔“

”ہاہاہا......“ جانانہ نے ایک اور قہقہہ لگایا، پھر شرارت سے بولی۔ ”تم...... تم بہت جھوٹے ہو۔ اگر میں تمہیں نہیں جانتی ہوتی تو شاید تمہاری باتوں پر یقین کر لیتی لیکن......“

ایک لمحہ توقف کیا، پھر اسی لہجے میں بولی۔ ”لیکن ایک بات طے ہے حمزہ! تم سو کالڈ شرفا اندر سے ایک ہی طرح کے گارے مٹی سے بنائے جاتے ہو۔ ٹپیکل سوچ ٹپیکل آئیڈیالوجی۔ تم لوگ جتنا بھی

پڑھ لو، تمہارے اندر کا یہ جو روایتی مرد ہے ناں، یہ کبھی نہیں بدلے گا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ زرش کے بعد والے انیلا کا معاملہ کیا سچا ہے؟ نہیں، گھبراؤ نہیں، انیلا کا معاملہ فی الحال زرش تک نہیں پہنچے گا۔ ویسے آپس کی بات ہے، یہ انیلا تمہارا آخری پڑاؤ ہے۔''

حمزہ عابد نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وائن کا نشہ اُس کے حواس پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے آنے والی پوربی ہوا اُس کے سر کو سہلاتی ہوئی نشہ دو آتشہ کرتی گزرتی چلی گئی۔ جانا نہ جانتی تھی، وہ آؤٹ ہونے والا ہے۔ لیکن ایسے بہت سے کیس نمٹانے میں اُسے مہارت تھی۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا، پھر یکدم چپ ہوا تو ترنگ سے بولا۔ ''یہ حُسن والے زندہ کب رہنے دیتے ہیں؟ اور پھر آخری پڑاؤ...... یہ ہم جیسے مردوں کی زندگی میں کب آتا ہے؟ یہ تو بس مڈل کلاس لوگوں کا ہیڈک ہے۔ آخری پڑاؤ نہ بھی ہو تو خالی جیب دیکھ کر اسے آخری پڑاؤ سمجھنا پڑتا ہے، وگرنہ مرد کا دل وہ ایئرپورٹ ہے، جہاں ہر طرح کی فلائٹ آتی اور جاتی رہتی ہے۔ کیا سمجھیں؟''

جانا نہ نے اُس کے جام کو پھر سے بھر دیا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''کوشش کرنا، زرش کو ابھی ہاتھ سے جانے نہ دو۔ ہوسکتا ہے، وہ ہمارے کسی گیم میں آگے چل کر مددگار ثابت ہو جائے۔ بس اُسے بہلاتے رہو۔ اگر جھوٹ موٹ کی منگنی بھی کرنی پڑے تو کر لینا۔''

''تم بے فکر رہو، ایسا ہی ہوگا۔ میرے لئے تمہارا حکم ہر بات سے زیادہ اہم ہے۔''

''میں جانتی ہوں تم کتنے چیٹر ہو۔ اس لئے زیادہ کمنڈمت پھینکا کرو۔'' جانا نہ نے مصنوعی خفگی دکھائی اور وہ ہنسنے لگا مگر باز پھر بھی نہیں آیا، بلکہ ترنگ میں بولا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو، لیکن تمہارے لئے فیلنگ میں کچھ خاص ہے ضرور۔ وہ کیا خاص ہے، میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن بہرحال میری ساری سوچیں ہمیشہ کے لئے اس خیال سے وصل کر کے خوش ہو جاتی ہیں کہ جب ہم ملیں گے تو زندگی کیسی دھمال ہو جائے گی۔''

''ہاں، ہاں..... تم سوچو، اچھی طرح سوچو۔ لیکن میں ابھی کچھ تھکی ہوئی ہوں سو......'' اُس نے اُس کے رخسار کو چھوا۔

''اوکے، اوکے...... آرام کرو تم۔ میں یہاں ٹھیک ہوں، ابھی چلا جاؤں گا۔ بس کچھ دیر مجھے اس جنت سے مت نکالو۔'' اُس نے اپنے رخسار پر رکھے ہاتھ کو بے قراری سے چھوا۔ پالینے کی تڑپ حد درجہ لذی تھی، مگر وہ رکی کب تھی، تیزی سے اندر بڑھتی چلی گئی تھی۔ پھر وہ اپنے کمرے کے ہینڈل پر ہاتھ ہی رکھ سکی تھی کہ سطوت جہاں اُس کے سر پر آ کھڑی ہوئیں، پھر محبت سے بولیں۔

”جان! یہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ مجھے تیرا اس کے ساتھ بہت زیادہ میل ملاپ اچھا نہیں لگتا۔ دیکھ جانانہ! جو لوگ پشتینی رئیس ہوں ناں، ان کے نشست و برخاست میں ہوش اور بے خودی میں بھی ایک توازن ہوتا ہے، مگر جو لوگ ایلے میلے ہو کر دولت کما کر رئیس بنیں ناں تو وہ لوگ اندر سے ویسے ہی تھڑدلے رہتے ہیں، اعتبار کے قابل نہیں ہوتے، کبھی بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔“

جانانہ نے سطوت جہاں کے تجزیے سے اختلاف نہیں کیا۔ سطوت جہاں کا ہاتھ تھاما، پھر مسکرا کر بولی۔ ”بے فکر رہو ماں! میں تمہاری ہی بیٹی ہوں، ہر ایک پر اعتبار نہیں کرنے لگ جاتی۔ اور پھر یہ تو حمزہ عابد ہے، ایک ایسا نوجوان جو صرف عیش پرستی کو زندگی سمجھتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں، یہ میرے اگلے کسی گیم میں کلیدی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، مگر......“ ایک لمحے کو رکی، پھر مکر ربولی۔ ”تم یہ تو مانتی ہو ناں ماں! اگر دشمن کو چاروں اطراف سے دباؤ میں رکھو تو وہ زیادہ اذیت میں رہتا ہے۔ پھر جتنا اذیت کا شکار شہریار ہوگا، عبدالرحمٰن کو وہ اذیت دُگنی تو لگے گی ہی ناں۔ مجھے ان دونوں سے جو حساب لینا ہے، وہ اتنا آسان نہیں۔ سو مجھ سے اس اذیت کا حساب مت مانگا کرو، نہ میری ذہانت پر شک کیا کرو۔ ویسے میں پہلے سے جانتی تھی، حمزہ عابد، دنیا کو نہیں پا سکے گا۔ شہریار ابھی اتنا گیا گزرا نہیں کہ اس کی تھاہ کو نہیں سمجھ سکے گا۔“

سطوت جہاں نے بیٹی کو تولنے والی نظروں سے دیکھا، پھر شبہے سے بولیں۔

”شہریار...... جان! کہیں تو واقعی اس سے محبت نہیں کرنے لگی ہے؟...... محبت کے بنا تو کوئی کسی کی ذہانت ایڈمائر نہیں کرتا۔“

جانانہ نے ہنس کر سطوت جہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ ”ماں! کہتے ہیں، دشمنی میں بھی ظرف کا ساتھ رہے تو بندے کا نسب نہیں رُلتا۔ اب ہم میں نسب داری نہ رہے تو عام لوگوں میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟“ اُس کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔

سطوت جہاں مسکراتی اُسے دیکھنے لگیں، پھر کان میں گنگنا کر بولیں۔ ”تیری پہلی بات سر آنکھوں پر، مگر مجھے کیوں یقین نہیں آتا کہ تیرا دل شہریار سے صرف دشمنی نبھا رہا ہے۔ میرا خیال تم جانتی ہو، دل کبھی غلط نہیں کہتا۔“

جانانہ نے سطوت جہاں کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں، پھر نرمی سے بولی۔

”تم جانتی ہو ماں! میں تم سے جھوٹ نہیں بولتی۔ شہریار کے لئے اگر میرے دل میں کوئی نرم گوشہ ہوتا تو میں تم سے کیوں چھپاتی؟“ لمحے بھر کو رکی، پھر دوبارہ سے بولی، مگر اس بار اس کے لہجے میں روح کے داغ جل اُٹھنے کی اذیت ہی اذیت تھی۔ اُس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی کا ایک موسمی جھونکا اُمڈ آیا تھا، جیسے تیز بارش سے پہلے تیز ہوا...... اور وہ کہہ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے ماں! اگر شہریار مجھ سے شیرازی سے پہلے کے کسی گزرے موسم میں ملا ہوتا یا اس کے نام کا دُکھ کسی کے حصے میں نہ آیا ہوتا تو ہو سکتا ہے، وہ میرے دل میں کوئی چور دروازہ کھول نکالتا۔ لیکن اُس کی بدقسمتی ہے کہ وہ مجھے شیرازی کے بعد ملا اور یہ طے ہے، شیرازی کے بعد ملنے والے ہر مرد پر میرے دل کا خوں بہا واجب ہے، میں نہیں بھول سکتی وہ تکلیف جو پہلی محبت نے میرے دل کو سوغات کی، نہیں بھول سکتی۔“

وہ رُکی نہیں تھی، کہہ کر فوراً دروازہ کھول کر اندر بڑھتی چلی گئی تھی۔

سطوت جہاں پر دروازہ بند ہو گیا تھا مگر ان کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ جیسے کسی نئی کہانی کا دروازہ کھولنے کو تیار کھڑی تھی۔ اُنہوں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

”ہائے میری جان! مجھے تیرے اس غم پر ہمیشہ دُکھ ہی رہے گا۔ جانے کون سی گھڑی تھی، جو تُو نے شیرازی کا پلّہ پکڑا اور ساری حیاتی کے لئے ایک آدھ اُدھار مانگ لیا اور اُدھار چیزیں ہمیشہ واپسی کے لئے سر پر لٹکتی تلوار کی طرح ہوتی ہیں۔ جانے کب رسّی ڈھیلی ہو اور تلوار سر کے اور دل کے دو ٹکڑے کر کے گزر جائے، کون جانے...... اور یہ نہ جاننا ہی عافیت ہے۔“

وہ مدھم سرگوشی میں کہتی ہوئی کوریڈور میں بل کھاتی سج سج قدم رکھتی ہوئی یوں چلنے لگیں، جیسے راہ میں یا تو پھول بکھرے تھے یا دل...... اور وہ جانتی تھیں، پھولوں اور دلوں پر پیر رکھ کر کس طرح زندگی کا فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔



”آپ آخر کب سمجھیں گے کہ زندگی اتنی آسان نہیں جتنی آپ سمجھ بیٹھے ہیں؟“

بیگم عافیہ کمرے میں داخل ہو کر کچھ چڑے ہوئے لہجے میں پکاریں اور ٹی وی سرچ کرتے مسٹر سلیم چونک کر بیوی کو دیکھنے لگے۔ عافیہ بانو ایسے موڈ میں بہت کم آیا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ہی ان کا لہجہ نہایت میٹھا ہوتا تھا۔ مگر اس لمحے اگر وہ اس مزاج سے مخاطب تھیں تو یقیناً کوئی خاص وجہ رہی ہوگی۔

انہوں نے ایک دم ٹی وی آف کر دیا تھا، پھر ہاتھ بڑھا کر خیرسگالی سے بیوی کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف صوفے پر بٹھانے کی ایک معصوم سی خواہش کے اظہار کی کوشش کی۔ عافیہ بانو مسکراتے ہوئے اُن کے برابر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اُن کے انداز میں تبدیلی دیکھ کر مسٹر سلیم نے ہولے سے پوچھا تھا۔

”جی بیگم صاحبہ! اب کہیے، کیا بات ہے، جس نے آپ کو اتنا ہراساں کر رکھا ہے؟“
بیگم عافیہ گومگو کی حالت میں کچھ دیر اُن کو دیکھتی رہیں، پھر مدھم ہو کر بولیں۔
”آپ یہ کیوں نہیں سوچ رہے کہ پچھلے پانچ سال سے عابد صاحب آپ کو پاکستان آنے کیوں نہیں دینا چاہ رہے؟“
مسٹر سلیم بیوی کی خیال آرائی پر مسکرائے، پھر ہنس کر بولے۔ ”خدا کی بندی! وہ ایسا کیوں چاہیں گے؟ انہوں نے تو ہمیشہ میری پاکستان آمد کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہر چھ ماہ میں، میں ایک چکر لگا ہی لیتا ہوں۔ ہاں، یہ ضرور ہے، کچھ یہاں کی مصروفیات مجھے سانس نہیں لینے دے رہی ہیں کہ میں پاکستان کے بزنس کے حسابات کا ٹھیک طرح سے آڈٹ کر سکوں۔“
بیگم عافیہ نے انہیں غور سے دیکھا، پھر نرم لہجے میں بولیں۔ ”آپ کو مسٹر جواد حسن کیسے آدمی لگتے ہیں؟“
مسٹر سلیم نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر رسانیت سے بولے۔
”اُن کا لائف اسٹائل سننے میں آیا ہے، کچھ انگریزی سے ہے مگر بزنس کے اسرار و رموز وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ کبھی کبھی میں اگر کہیں پھنس جاتا ہوں تو وہی میری امداد کرتے ہیں اور بہت احسن طور پر ٹھیک راہ سجھاتے ہیں۔ بظاہر انہیں یہاں آئے کم مدت ہوئی ہے مگر حیرت انگیز طور پر وہ یہاں کے قانون اور بزنس کی چھوٹی چھوٹی باریکیاں مجھ سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو عافیہ! ان کے یہاں ہونے سے میں بہت مطمئن رہتا ہوں۔ عابد کا یہ مجھ پر ایک اور احسان ہے کہ انہوں نے اپنی طرح کا ایمان دار، وفادار بزنس پارٹنر مہیا کیا ہے۔ میں آنکھ بند کر کے مسٹر جواد حسن پر اعتبار کر سکتا ہوں۔“
بیگم عافیہ نے شوہر کو تاسف سے دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولیں۔
”کیا واقعی ایک انسان کو اتنا اندھا اعتماد کرنا سوٹ کرتا ہے، جبکہ اُس کے ماضی میں اسی اعتبار اور اندھے اعتماد نے تلخی سے بھری زندگی گزارنے کی سزا بھی دی ہو؟...... کیا یہ اندھا اعتماد واقعی جائز ہے، اُس انسان پر جس پر ابھی مزید دو بیٹیوں اور ایک کم عمر بیٹے کی ذمہ داری بھی ہو؟“
مسٹر سلیم نے ہاتھ بڑھا کر انہیں خود سے قریب کر لیا، پھر محبت سے بولے۔ ”میں کیا کروں، ماضی کی ہر تلخ یاد کے باوجود مجھے ابا کی طرف سے اعتبار کرنے کی خوشی کی طرف بڑھنے ہی نہیں دیتی۔ تم ٹھیک کہتی ہو، اگر میں اپنا ماضی یاد کروں تو شاید ہر تکلیف اتنی کڑی ضرور تھی کہ مجھے اپنے اوپر بھی اعتبار کرتے ہوئے دس بار سوچنا پڑے گا۔ مگر عافیہ! یہ بزنس ہے۔ اس میں سارا کاروبار اعتماد اور اعتبار ہی پر تو چلتا

ہے۔کسی بڑی کامیابی تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنے ورکرز پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔شک کسی بھی نوعیت کا ہو، کسی بڑی کامیابی کی فنش لائن کو کبھی چھونے نہیں دیتا۔"

بیگم عافیہ خاموش ہوگئیں۔یہ خاموشی ان کے متفق ہونے کی گارنٹی تھی۔لیکن کچھ ساعت گزری تھی کہ وہ پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

"آپ کی یہ بات ہضم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔لیکن کیا آپ کو معلوم ہے، انوشے اور عارف آج کل کتنے کلوز فرینڈ زبن چکے ہیں۔کیا یہ اچھی بات ہے؟ دانیال سے علیحدگی کے بعد یہ دوستی کس رنگ میں دیکھی جارہی ہے، آپ کو معلوم ہے؟" وہ لمحہ بھر کو رکیں، پھر بولیں۔"میں نے کتنی مرتبہ انوشہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی نظر سے زندگی دیکھنے کی عادت ڈالے۔ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں، بہت سی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے، کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔مگر وہ میری بات کو یوں سنتی ہے، جیسے بے کار کی لن ترانی ہے۔سلیم! مجھے ڈر ہے، اگر اس کا یہ رویہ برقرار رہا تو رائمہ اور مراد بھی مجھے اگنور کرنا شروع کردیں گے۔اور اگر ایسا ہوا تو میں تمہارے گھر کی ذمہ داری نبھانے میں فیل ہوجاؤں گی۔"

مسٹر سلیم نے بیگم عافیہ کی آواز میں آنسوؤں کی جھلک پائی تو بے چین ہو کر انہوں نے بیوی کے چہرے پر نظر ڈالی، پھر ماحول کو ہلکا کرنے کو بولے۔"آخاہ تو یہ بات ہے۔آپ کو لگتا ہے، آپ کے بچے انگریز ہونا چاہ رہے ہیں، اس لئے آپ کو پاکستان یاد آرہا ہے۔مسٹر جواد سے بھی اس لئے کچھ وحشت محسوس ہورہی ہے کہ عارف کی وجہ سے انوشا آپ کے کہنے میں نہیں رہی ہے۔میں بھی کہوں، آپ جیسی اعلیٰ ظرف عورت نام نسبت کو قابلیت اور انسانیت سے بڑھ کر کیسے سمجھنے لگی؟"

وہ لمحہ بھر کو رکے، پھر پُریقین لہجے میں بولے۔"ٹھیک ہے، آپ بے فکر رہیں۔اس بار ہم پاکستان ضرور چلیں گے اور میں کوشش کروں گا کہ پاکستان ہی میں سیٹل ہولیا جائے۔آپ کی تمنا ہر چیز سے پہلے......" بیگم عافیہ کا ہاتھ تھام کر وہ بیٹھے لہجے میں بولتے بولتے رکے، پھر آہستگی سے بولے۔"تمہاری جو تمنا ہے، یہ تمنا کب سے میرے دل میں بھی ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔مگر میں ہر دفعہ اس خواہش کو یوں دبا لیتا تھا کہ میری طرح آپ کی بھی پاکستان سے کچھ اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔پھر جہانیاں بیگم کا رسوخ اور اس کی دنیا کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے اپنے بچوں کا مستقبل غیر محفوظ سا لگنے لگتا ہے۔مگر خیر، پھر سوچتا ہوں، پہلے کی بات اور تھی، اب میری حیثیت اتنی اسٹرونگ ضرور ہے کہ جہانیاں بیگم یا ان کی گدی نشین ہماری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہزار بار سوچے گی۔ڈن، ہم پاکستان جارہے ہیں۔رہا ہوٹل مینجمنٹ تو اسے مسٹر جواد بھی اچھی طرح سے دیکھ ریکھ کرسکتے ہیں۔" انہوں نے بیگم عافیہ کو محبت سے دیکھا، پھر مکرر بولے۔"دل پہ بار مت لیا کرو۔تم اپنی پریشانی مجھے پارسل کرتی رہا کرو کہ تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے لئے یہ ناچیز کچھ بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔سچ پوچھو تو مجھے تمہارے چہرے پر ہلکا سا تفکر کا سایہ بھی برداشت نہیں ہوتا۔عافیہ! تمہیں معلوم ہی نہیں ہے، تم

میرے لئے کیا ہو؟...... تمہارے چہرے کی مسکراہٹ میرے لئے کتنی بڑی مورل سپورٹ ہے۔ آئی سویئر، تم میرے ساتھ جہاں بھی ہوتی ہو، مجھے لگتا ہے، ایک کامیابی ہے، جو میری زندگی سے وصل چاہتی ہے...... جہاں تم میسر نہیں ہوتی ہو، وہاں تمہارا خیال مجھے تقویت دیتا ہے کہ ناکامی بہر حال کامیابی کی ہی پہلی سیڑھی ہے اور جب میں یہ سوچتا ہوں تو ناکامی زندگی سے دامن چھڑا کر کامیابی کا ہاتھ میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ عافیہ! میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ تم نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا، جب میں اکیلا تھا۔ میری بچیاں بے یارو مددگار تھیں اور میرے لئے کوئی راستہ نہیں بچا تھا، جس پر چل کر میں کسی کامیابی کی اُمید کرتا۔"

بیگم عافیہ نے مسٹر سلیم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، پھر تڑپ کر کہا تھا۔ "آپ کتنے اعلیٰ ظرف انسان ہیں سلیم! کہ میرا سہارا بن کر آپ سہارا دینے کا کریڈٹ بھی مجھے دے کر مجھے ماضی کی راہوں پر جھیل جانے والی ہر اذیت، ہر شرمندگی سے بچا لیتے ہیں۔ مجھے آپ کا ساتھ، آپ کا گھر، اپنی ہر سانس کے گروی رکھے جانے کا مشروط معاہدہ بھی قبول ہے۔ میں زندگی چھوڑ سکتی ہوں مگر آپ کا ساتھ، ناممکن......"

مسٹر سلیم نے بیوی کا ہاتھ تھام کر اسی جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہی...... مجھے تمہاری یہی طوفانی محبت ہی تو پُر جوش رکھتی ہے۔ ہر مشکل تمہارے اس اظہار کے آگے نہ ہونے جیسی لگتی ہے۔"

عافیہ کی آنکھوں میں شوہر کی اس درجہ محبت پر موتی سے چمکنے لگتے۔

یہ آنسو بھی کیا ہوتے ہیں، دکھ میں کسی دوست سے پہلے یاری نبھانے آجاتے ہیں اور خوشی میں بھی سب سے پہلے ساتھ دینے کو موجود ہوتے ہیں، تنہا نہیں ہونے دیتے۔ اور ان کی یہی صفت دل کو بھلی لگتی تھی۔

وہ کمرے سے جا چکی تھیں جب اچانک گھر میں انوشے داخل ہوئی۔ مسٹر سلیم نے بیٹی کو دیکھا، تنگ پائنچے کی جینز، باب کٹ بال، مختصر ٹاپ پہنے ہوئے وہ کسی انگریز سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ انہیں بزنس سے بہت کم فرصت ملتی تھی کہ وہ اولاد کی طرف توجہ دیتے، پھر انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ گھر میں ان کی محبتوں کی نگہبان جو ہستی ہے، وہ اپنی جان تو دے سکتی ہے مگر ان کے گھر پر آنچ نہیں آنے دے سکتی۔ یہی یقین انہیں دنیا سے لڑتے رہنے میں یکسو رکھتا تھا۔ مگر آج جس طرح عافیہ بانو کی آنکھ میں آنسو آئے تھے، اُن کی روح تک پر اس کا افسوس پتھر باندھ کر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج انوشے کے آتے ہی انہوں نے اس کے حلیے پر غور کیا۔ وہ کہیں سے بھی پاکستانی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ رسم و رواج تو دور کی بات، وہ تو عام انداز میں بھی پاکستانی جھلک دینے میں ناکام رہی تھی۔

انوشے نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کینوس بیگ صوفے پر اُچھالا تھا، پھر چیونگم چباتی وہ بالکل اُن کے سامنے والے صوفے پر بے ڈھنگے انداز سے بیٹھ گئی تھی۔ آدھی صوفے پر تھی، آدھی صوفے

سے باہر لٹکی ہوئی موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔ اُس نے اتنی توجہ تک دینا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ باپ کو غیر متوقع گھر میں دیکھ کر وہ سلام دعا ہی کر لیتی۔

''انوشے......!'' مسٹر سلیم نے لہجے کو بے حد نرم رکھ کر اُسے پکارا۔

انوشے سلیم نے باپ کے آواز دینے پر ذرا کی ذرا اُن کو دیکھا، پھر نظر موبائل پر جمائے ہوئے بولی۔ ''کہو پاپا! کیا کہنا ہے؟...... میں بہت مصروف ہوں۔''

سلیم صاحب کو لگا، واقعی عافیہ بانو کتنی ذہنی اذیت سہہ رہی تھیں۔ اُن کا دس منٹ میں دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی، وہ اپنی ٹی وی کی مصروفیات چھوڑ کر یک دم مکمل طور پر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''یہ تم نے کس قسم کا لباس پہن رکھا ہے؟'' پہلا سوال ہی جچا تلا تھا، مگر وہ لڑکی طرح اس نے باپ کی بات پر انتہائی حیرت سے دیکھا تھا۔

''یہ آپ کو میرے لباس میں کیڑے کیوں نظر آنے لگے؟'' اُس نے توقف کیا، پھر چڑ کر بولی۔ ''یہ یقیناً مام کی کارستانی ہوگی۔ اُنہیں ہی ہم سے عجب پرخاش رہتی ہے۔''

مسٹر سلیم کچھ کہہ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ پہلے سے زیادہ خراب لہجے میں بولی۔ ''بابا! تمہیں آخر یہ مشورہ کس نے دیا تھا کہ شادی جیسی گھنٹی گلے میں ڈالو؟ دو بیٹیاں تو تم بھی پال سکتے تھے۔ اب ذمے داریوں کی لسٹ دیکھو، ہم کم تھے کہ ماما کی بیٹی اور ایک یتیم خانے کے بچے کی ذمے داری بھی تمہارے سر آ گئی؟ بابا تم نے اپنی زندگی کی بہت غلط پلاننگ کی ہے۔''

مسٹر سلیم کو لگا، ان کے دماغ میں کسی نے ہینڈ گرنیڈ رکھ کر اس کی پن کھینچ کر مٹھی میں بند کر لی ہو اور ان کی ذات کے پرخچے اڑنے میں صرف تین سیکنڈ ہوں۔ یہ ان کی بیٹی تھی...... اُنہیں حیرت نے گھیر لیا تھا۔

اُنہوں نے تو بہت پیار محبت سے پالنے کی کوشش کی تھی، مگر اب لگتا تھا، محبت کا عنصر زیادہ ہی غالب آ گیا تھا۔ مسٹر سلیم نے اپنی ریم لیس گلاسز کو صاف کیا تھا، انوشے اب صوفے پر نہیں تھی مگر اُس کی باتیں اُن کے دماغ میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ وہ لاپروا تھی۔ کچھ کہہ کر پلٹنا، یہ دیکھنا کہ اس کے لفظوں سے کسی کے دل پر کیا گزری ہے، آج تک اُس کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ خیال کرتی...... مگر جو عادت انسان میں نہ ہو، ضروری نہیں، تمام عمر یہ صفت پیدا ہی نہ کی جا سکے۔ اُنہیں یاد آ رہا تھا، جب وہ وقت کی پابندی میں کوتاہی کرتے تھے تو ان کے ابا نے اپنے ہر کام کا شیڈول ان کے ہاتھ میں لا رکھا تھا۔

''میں مصروف رہتا ہوں بیٹا! ذرا کی ذرا میں اپائنٹمنٹ کی ڈائری سے دیکھ دیکھ کر یہ تو بتانا، مجھے کس وقت کیا کیا کام سرانجام دینا ہے؟'' اور وہ ڈائری ہاتھ میں لئے ابا کے حکم پر سر ڈالے ڈائری میں لکھے وقت کو سوئیوں میں حاصل ضرب دے کر ابا کے گوش گزار کرتے تھے۔ کبھی کبھی ابا کوئی میٹنگ بھول جاتے مگر مسٹر سلیم ایک ایک سیکنڈ کا حساب رکھتے اور پھر جب ان کی یہ عادت پختہ ہو گئی تو ابا نے ایک دن مسکرا کر کہا۔

''کیوں بیٹا! وقت کی قدر آئی؟ اب تو میرے خیال میں تمہیں ایک ایک منٹ، سیکنڈ کا حساب کتاب رکھنا آ گیا ہوگا۔''

ابا ہنسے اور وہ منہ کھولے دیکھتے رہ گئے۔ کتنی چالاکی سے اُنہوں نے اُنہیں وقت کی پابندی کرنا سکھا دیا تھا۔ سو اس لمحے بھی انہوں نے ابا کی طرح سوچ کر اپنے اندر اُٹھنے والے ابال کو روکا تھا۔

''بہت پیار سے سمجھایئے گا، بیٹی ذات ہے، غصے میں کام بگڑ بھی سکتا ہے۔'' عافیہ نے انہیں جاتے جاتے سمجھایا بھی تھا، سو وہ گلا کھنکھار کے کھانے کے کمرے میں آ گئے۔

یہ لنچ کا وقت تھا۔ عافیہ کچن میں کھڑی سپیگیٹی اور قیمہ بنانے میں مصروف تھیں۔ مسٹر سلیم اُن کی پشت کو دیکھتے رہے۔ یہ عورت، اُس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی، وہ کتنا نیچے گر گئے تھے، تب بھی اس عورت نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں مزید گرنے سے بچا لیا تھا۔ تمام عمر یہ عورت سمجھتی رہی، سلیم افسر نے انہیں سہارا دیا ہے، مگر یہ سلیم افسر جانتے تھے، اس لمحے اگر عافیہ بانو کا ہاتھ اُنہیں نہ تھامتا تو شاید وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ یہ عورت کتنی عظیم تھی۔ اس نے عزت کے لئے اپنی ممتا کو ٹھکرا دیا تھا۔ سب سے کڑا امتحان تھا وہ لمحہ......... وہ لمحہ، جس میں انہیں لگا تھا، شاید انہوں نے سب کچھ گنوا دیا ہے۔

ابا کی ساری کمائی، دولت، عزت اور رکھ رکھاؤ....... وہ قلاش ہو گئے تھے۔ ان کے لئے کوئی راہ نہیں بچی تھی، جب انہوں نے آخری جوا کھیلا تھا۔

سلیم افسر کی نظریں عافیہ بانو کی پشت پر اب بھی ٹکی ہوئی تھیں مگر وہ جیسے کہیں ماضی میں کھو گئے تھے۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی، جب اچانک ابا نے اپنی طبیعت کی خرابی کے تحت سارے ڈاکومنٹس اُن کے نام منتقل کروائے تھے۔ افسر سلطان ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کی اونر شپ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے لوگوں میں ان کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ باہر سے دواؤں کی ترسیل بھی اُن کا ایک کلیدی شعبہ تھا۔ دیگر کمپنیز کو وہ یہ دوائیں اچھی قیمت کے ساتھ مکمل اعتماد کے اضافی چارج لئے بغیر ڈیلیور کرتے تھے۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اُن کی اس کاروبار میں بہت اچھی ساکھ تھی۔ وہ برسوں سے یہ کام کر رہے تھے لیکن جب یہی کام سلیم افسر نے پہلی بار کیا تو ان کی پہلی ہی کھیپ سیل کر دی گئی۔ ان کی منگوائی گئی دواؤں میں کچھ ایسی ڈرگس برآمد ہو گئی تھیں، جو ملکی سطح پر بین تھیں اور جس کے سائیڈ افیکٹ ساری دنیا میں حتمی نتائج کے طور پر خطرناک تھے۔

تب افسر سلطان نے پہلی بار بیٹے کے ساتھ سٹنگ کی اور سوال کیا۔

''پیسہ تمہارے لئے کتنا ضروری ہے؟''

''صرف اتنا ابا! کہ عزت سے بسر ہو سکے۔ میرے لئے میرا بزنس صرف دولت کمانے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ میں اس کو اپنے لئے حساس لیتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے، میرے کام سے ہزاروں لوگوں کا روزگار جڑا ہے۔''

مسٹر افسر سلطان نے بیٹے کو دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بس، مجھے تسلی ہو گئی۔ میرا خون خراب نہیں ہے۔ اب بھلے مجھے اس بزنس میں نقصان ہوا اس کیس میں تم ہار جاؤ، یہ طے ہے، میں سر اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی اولاد کی بہت اچھی تربیت کی اور اس خدا نے میری اس تربیت کو شرف قبولیت بخشا کہ تمہارے دل کو اندر سے اتنا نرم کیا کہ اس میں نیکی کے بیج بونے کے لئے مجھے بہت محنت نہیں کرنی پڑتی۔"

افسر سلطان نے بیٹے کو سپورٹ کیا تھا۔ خود سلیم افسر اعلیٰ سطحی طور پر اس سلسلے میں میٹنگز کرنے میں مصروف تھے۔ مگر اوپر سے لے کر نیچے تک ہر شخص جیسے ایک ان نون اکاؤنٹ بھرنے کے لئے سامنے آن بیٹھا تھا۔ وہ معاملات سدھارنے کی کوشش میں تھے کہ جان بچانے والی ادویات کی شارٹیج ہو جانے کو اخبارات میں خوب اچھالا جانے لگا تھا۔ ان کا نام بھی ان امپورٹرز میں شامل تھا، تب انہوں نے پہلی بار پریس کانفرنس کی تھی اور اپنے معاملے کو بہتر انداز میں سب کے سامنے لائے تھے۔ حکومتی سطح پر نرمی کی گئی تھی۔ ان کے کیس سے قطع نظر باقی دواؤں کی ترسیل ممکن بنائی گئی تھی۔ بہرحال کسی حد تک ان کی شنوائی ہوئی تھی مگر ان کی ساکھ اب بھی ہنوز خطرے میں تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، جب ایک بہت اچانک سروپ ان کے سامنے آن رکا۔

"میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کر سکتی ہوں، لیکن اس کے بدلے میں تمہیں بھی ہمارا خاص خیال رکھنا ہوگا۔"

"میں کس سلسلے میں آپ کا خیال کر سکتا ہوں؟" انہوں نے حیرت سے دیکھا تو بہت ادا سے کہا گیا۔

"سیدھی سی بات ہے، تمہارا سارا سامان کلیئر ہو گیا تو جو سامان قانونی نقطہ نظر سے بین ہے، وہ سامان میں خریدنا چاہوں گی۔"

"آپ...... مگر آپ کیا کریں گی؟ بین شدہ سپلائی میں کچھ ایسے فوڈ سپلیمنٹ ہیں، ایسی دوائیں ہیں جو ڈائٹ پروگرام پر عمل کرنے والوں کے لئے زہر ہے اور جنہیں یہاں کی کچھ غیر قانونی کمپنیاں نئی پیکنگ اور نئے نام سے مارکیٹ میں سیل کرتی ہیں۔ یہ کاروبار سلو پوائزن کی طرح ہے، مگر اس سلسلے میں ابھی تک حکومتی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔ اب یہی دیکھئے، میں ایسے کاروبار میں انوالو نہیں ہوں، لیکن پھر بھی بری طرح جکڑا گیا ہوں۔"

ایک نقرئی قہقہہ ان کی اس طویل تفصیل پر ان کے گرد بکھرا تو وہ محو ہو کر سامنے دیکھنے لگے۔ "آپ کو کس بات پر ہنسی آئی ہے مس......؟"

"مجھے تانیہ کہتے ہیں۔" ادھورے جملے میں جواب اُچکا کر اس کی طرف بڑھا دیا گیا۔

انہوں نے نئے سرے سے سوال کیا۔ ”آپ کو میری کون سی بات احمقانہ لگی، مس ثانیہ! کہ آپ نے قہقہہ لگانا ضروری سمجھا؟“

ثانیہ نے اُس کی ناگواری کو حیرت سے دیکھا، پھر مدھم ہو کر بولی۔ ”لگتا ہے، آپ سے آج تک کسی نے بزنس کے علاوہ گفتگو نہیں کی ہے۔ لطیف جمالیاتی حس اور ذوقِ مزاح آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔“

سلیم افسر نے شانے اچکا کر کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں ایک دوا اور دو چار کرنے والے بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ اردگرد مجھے کبھی دوستوں کا جھرمٹ نہیں ملا، نہ ہی مجھے شوق ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتی ہیں، میں انتہائی خشک انسان ہوں۔ ویسے آپ نے بتایا نہیں، آپ کا قہقہہ کس شمار میں تھا؟“

ثانیہ نے اپنی ساڑھی کا فال درست کیا، پھر کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”دراصل یہ سپلائی میرے بزنس کا حصہ تھی، مگر بروقت کوئی کارگو دستیاب نہیں تھی، اس لئے آپ کی سپلائی میں یہ ادویات رکھ کر ترسیل کروا دی گئیں۔ میرا خیال تھا، ہمیشہ کی طرح ہم یہ مال کلیئرنس کروا لیں گے، مگر عین موقع پر ایک ایمان دار افسر کی تقرری سے یہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر جب آپ کا کیس اخبار میں گیا تو افسران کے دلوں میں لامحالہ آپ کے لئے نرم گوشہ بنتا چلا گیا۔ آپ کا کام بھی نکل گیا، اس لئے میں چاہتی ہوں، میں بھی اپنے کام سے فارغ ہو جاؤں۔“

سلیم افسر اُسے حیرت سے دیکھتے رہے، پھر آہستگی سے بولے۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے، آپ کس چیز کا اعتراف کر رہی ہیں؟ اگر یہ بیان آپ کے خلاف استعمال کیا جائے تو آپ کہاں ہوں گی، آپ کو پتہ ہے؟“

ثانیہ شرارت سے مسکرائی، پھر سنجیدگی سے بولی۔

”آپ کو نہیں معلوم میں کیا چیز ہوں۔ اگر میں نے یہ اعتراف کیا ہے آپ کے سامنے تو اس اعتراف سے مکر بھی سکتی ہوں۔ یہی نہیں، میرے ہاتھوں میں وہ جادو ہے کہ آپ میری کہی ہوئی بات کو ثابت نہیں کر سکیں گے۔ آپ کی بدنامی آپ کے سر رہے گی۔ رہا مال تو اس کی ڈیلیوری اُٹھوا لینا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے، ہمارے ملک میں ہر چیز، ہر پرابلم کا ایک سلوشن ہے اور وہ ہے پیسہ...... پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے، آپ کے مال کو پروانہ راہداری ملنے کے بعد جب سب کچھ او کے تھا، تب ہماری مال کی ترسیل اس کھیپ میں کی گئی۔ آپ اس طرح پھنس چکے ہیں مسٹر سلیم افسر! کہ کوشش کے باوجود خود کو اس چنگل سے نہیں نکلوا سکتے۔ ہاں، اگر میرا ساتھ دیں تو یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔“

سلیم افسر نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی تھی کیونکہ ابھی ان کے بہت سے دواؤں کے پیکیج سیل ہی تھے اور ہر روز اس سلسلے میں انہیں کافی بڑی رقم چکانی پڑ رہی تھی۔ اگر یہ ترسیل جلد ہی ممکن نہ کی جاتی تو ان کا مال پورٹ پر پڑے ہی پڑے ضائع ہو جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ مسٹر افسر سلطان نے اس سلسلے میں بیٹے کی رائے لی تھی، مگر سلیم افسر نے یہاں بھی وہی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ پھر یوں ہوا،

اخبارات میں کچھ افسروں کے نام آئے تھے، جنہوں نے بے تحاشہ رشوت بٹورنے کے لئے ان کی سپلائی میں گڑبڑ کی تھی۔ اعلیٰ سطحی اجلاس میں موجود کچھ خصوصی پینل کے افراد نے مال کی جانچ کاری کی تھی اور واقعی وہاں بے ضرر دواؤں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ مسٹر سلیم افسر نے دھڑکتے دل اور پسینے سے شرابور جسم کے ساتھ اس معائنہ ٹیم کا استقبال کیا تھا اور جب اُنہیں کلین چٹ کلیئرنس مل گئی تو انہوں نے ایک بار پھر پریس کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ دو تین افسروں کی لسٹ جاری کی گئی تھی جو اس مذموم کارروائی میں شامل تھے۔ انہیں فوری طور پر معطل کر دیا گیا تھا۔
وہ اس طرح صاف عزت بچ جانے پر ثانیہ کے شکر گزار تھے۔ مگر یہ سب کیسے ممکن تھا، اس سلسلے میں وہ قطعی اندھیرے میں تھے۔ پھر وہ اس ڈیل کی کامیابی کا جشن منا رہے تھے، جب ثانیہ بہت اچانک اُن کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
"خوشبو کا تحفہ سب سے قیمتی ہوتا ہے۔" گلدستہ اُن کی طرف بڑھا کر وہ مسکرائی اور وہ اُسے دیکھ کر مسکرائے۔
اس بزنس میں اُنہیں اضافی طور پر فائدہ ہوا تھا۔ جتنا پیسہ لگایا تھا، اس سے دُگنا ہو کر واپس لوٹا تھا۔ انہوں نے یہ خاموش ڈیل اپنے ابا سے چھپائی تھی۔ سوئس اکاؤنٹس کی افادیت ان پر کچھ عرصہ پہلے ہی کھلی تھی۔ ابا نے ان کے طور طریقے بدلے دیکھے تھے، مگر جہاندیدہ ہونے کی وجہ سے سوال نہیں اُٹھایا تھا۔ بقول ان کے، برائی جب تک چھپ کر کی جائے، خوف رکھتی ہے، برائی کا عنصر رکھتی ہے۔ لیکن یہ آشکارا ہو جائے تو انسان پھر اسے ڈھٹائی سے "حق" کی طرح استعمال کرنے لگتا ہے اور وہ برائی اس ورثے تک نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ مگر افسر سلطان جب ثانیہ سے تقریب کے بعد ملے تو ان کا پہلا سوال تھا۔
"کیا تمہیں یہ لڑکی پسند ہے؟
کیا تم اس سے شادی کرو گے؟
یا پھر کیا یہ صرف تمہاری بزنس پارٹنر ہے؟"
تین سوال، ایک قطعی لہجہ......وہ ابا کو دیکھتے رہ گئے، پھر آہستہ سے بولے۔
"شاید آپ کے دل میں مجھے لے کر بہت سے سوال اُٹھ رہے ہیں۔ مگر ابا! یہ سچ ہے، میں اس سمندر میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں کر سکتا۔ ہر دور کی کچھ ویلیوز ہوتی ہیں۔ آپ کے دور میں ایمانداری،

وفاداری، خواہ قومی نوعیت کی ہو یا شخصی نوعیت کی، ایک بچ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر آج کا دور الگ ڈیمانڈ کرتا ہے۔ آج کل صرف سورج کو دیکھ کر رخ بدلتے والے لوگ ہی کاروبار میں اِن ہیں...... آپ جانتے ہیں، میں اپنی پہلی ہی ڈیل میں کس طرح پھنسا دیا گیا تھا...... دراصل یہ ڈیل پہلے سے تانیہ کی طے کردہ تھی۔ کچھ رقم کے معاملے پر تنازعہ تھا، جس کی وجہ سے ان افراد نے اسے قومی ایشو بنا کر اس گیم میں مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر نشانہ تانیہ تھی مگر اس کی وجہ سے میں بھی راندے میں آ گیا۔ تانیہ نے معاملات سدھار لئے تو آپ نے دیکھا، وہی افسر آسانی سے معطل ہونے کو بھی تیار ہو گئے۔ کیونکہ وہ آن وا ڈیوٹی کی طرح تنخواہ کے ساتھ معطل ہوئے اور پاکستان میں زم گرم انکوائری ہو کر کون سا شعبہ ایسا ہے، جہاں اس طرح کے افراد واپس نہیں لے لئے جاتے؟ انہیں معلوم تھا، وہ کچھ عرصے بعد پھر سے آن ڈیوٹی ہوں گے۔ اگر نہ بھی ہوئے تو نمبر دو کام سے پہلے بنا لا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر تانیہ نے بھی انہیں اس خاموشی کی اچھی قیمت ادا کر دی تھی۔ اس لئے صاف ہاتھ بچاؤ ممکن ہو گیا۔ آپ کو حیرت نہ ہوئی ہو گی، لیکن مجھے حیرت تھی کہ راتوں رات کس طرح سیل شدہ مال کہیں اور منتقل ہو گیا۔ ابا! میں یونیورسٹی میں سیدھا سادہ پڑھنے والا لڑکا تھا، مجھے بزنس کی سیاست سیکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ تو چاہئے ہو گا ناں۔"

"یعنی تم تانیہ کے نمبر دو کام میں سہولت سے اس کا ہاتھ بٹاؤ گے؟" ابا نے غور سے پہلی بار دیکھا۔

انہوں نے خاموشی کی زبان میں جواب دیا تو ابا نے قطعی طور پر ان کے بزنس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ڈاکومنٹ پہلے سے وہ منتقل کر چکے تھے، اس لئے اب ان کا زیادہ تر وقت اپنے فارم ہاؤس میں گزرتا۔ یہاں تک کہ دو سال میں سلیم افسر نے اتنا کما لیا جتنا ابا نے پندرہ سال میں کمانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی بہت سہل تھی، خوب صورت تھی۔ جب ابا کا سوال ان میں ایک بار پھر سے گونجا۔ بزنس پارٹنر کو لائف پارٹنر بنا لینے سے بہت سے مسائل حل ہو جایا کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی، انہوں نے ون ڈرنک کی ترنگ میں تانیہ کو شادی کی آفر کر دی۔ با ہوش و حواس شاید وہ اتنے واضح الفاظ میں شادی کی آفر نہیں کر سکتے تھے۔

تانیہ اُن کی طرح مدہوش نہیں تھی۔ اُس نے پہلی فرصت میں اُن کے ہاتھ میں پہنی رِنگ نکال کر اپنی انگلی میں ڈال لی اور بہت اترا کر بولی۔ "تم جیسا شریکِ سفر ملنا میری خوش نصیبی ہے۔ مگر مجھے کسی ایک کا ہو کر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ سو تم مجھ سے وعدہ کرو، اگر کبھی میں تمہاری پسند کی ہوئی زندگی سے اُکتا جاؤں تو تم مجھے کسی بندھن میں جکڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

وہ لال ڈورا آنکھوں سے تانیہ کے سراپے کو دیکھنے لگے، پھر بغیر سوچے ہوئے بازو وا کر کے بولے۔ "مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ تم جیسی لائف پارٹنر کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اگر آج تم یہ کہتیں کہ تمہیں بچے اچھے نہیں لگتے تو میں اپنی تمنا تمہاری تمنا پر سے وار دیتا۔ تم جان ہی نہیں سکتی ہو تانیہ! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

تانیہ ان کے اظہار کے آگے ایک سیکنڈ نہ کھڑی رہ سکی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی روح تھی، کتنے افیئر زچلائے تھے، کتنی ٹھوکریں دلوں کو ماری تھیں، تب کہیں جا کر اب احساس ہوا تھا کہ اسے اب اپنے مستقبل کے لئے کوئی محفوظ قدم اُٹھا لینا چاہئے۔ زندگی میں اُس نے ہمیشہ ایک ہی زندگی کا چلن دیکھا تھا۔ دولت پاس ہو تو کچھ بھی خریدنے کا سوچا جا سکتا ہے، کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے دولت کمانے کی الگ راہ اپنائی تھی۔ اپنے خاندانی معیار سے ہٹ کر الگ معیار بنایا تھا۔ لیکن جب بات شادی کی چلی تو اس نے انہیں اپنی کزن کے سامنے لا کھڑا کیا۔

”یہ ماحول......یہ لوگ......“

اُن کی آنکھوں میں سوال اُمڈ آئے۔ تانیہ کا لائف اسٹائل تو کہیں سے اس دنیا کا پروردہ نہیں لگتا تھا۔ وہ تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ تانیہ گھنگھروؤں کی چھنا چھن اور طبلے کی تھاپ سے کوئی علاقہ رکھتی ہوگی۔ وہ تو اُسے ایک شارپ بزنس وومن سمجھتے تھے، جسے ہائی فائی سوسائٹی میں موو کرنے کا ڈھنگ آتا تھا اور جسے تھرلنگ کا شوق مشکل سے مشکل اسٹیپ لینے پر اُکساتا تھا، مگر یہاں......

وہ ایک لمحے کے لئے کھو سے گئے تھے۔ ان کے اندر ابا کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ مگر دو سال سے وہ جو زندگی گزارنے لگے تھے، اس نے بھی اس خاصیت کو زیادہ اُبھرنے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے فوراً رشتے کی بات کر ڈالی تھی۔ حالانکہ یہاں شادی بیاہ کا رواج، رواج نہیں پا سکا تھا مگر پھر بھی انہوں نے عندیہ لیا تھا اور ایک ہفتے بعد تانیہ ان کی زندگی میں چلی آئی تھی۔

وہ بہت خوش تھے۔ ابا ان کو دیکھ کر چپ ہو گئے تھے۔ مگر ان دنوں وہ جس ہنڈولے میں جھول رہے تھے، اس میں ان ساری باتوں کی کہاں گنجائش نکلتی تھی۔ سو زندگی کو انہوں نے ایک طویل مارجن دیا تھا۔ اپنی من مرضی کرنے کا ایک طویل مارجن...... زندگی لگے لپٹے اصولوں کے برخلاف جی رہی تھی اور وہ خوش تھے۔ ڈانس پارٹیاں، فائیو اسٹار کی جھلملاہٹیں اور ڈرنک، کیا کیا خرابی نہیں تھی جو ان سالوں میں در آئی تھی اور کیا کیا نہیں تھا جو بدل گیا تھا۔ ابا بھی اس عرصے میں غریقِ رحمت ہو گئے تھے۔ جو ہو رہا تھا، وہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور جو ہونا چاہئے تھا، اس کے امکان کا شگن کھو گیا تھا، سو انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، موت اوڑھ لی تھی۔

سلیم افسر کی اس عرصے میں دو بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ ان کی ساری دولت تانیہ سلیم افسر کے نام ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ یہ ان کا قانونی حق تھا۔ کیونکہ وہ ان کی اولاد کی ماں تھی۔ مگر وہ صرف ماں بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ نمبر دو کام میں وہ اتنی مہارت رکھتی تھی کہ اس نے وہ پراپرٹی بھی، جو انہوں نے اپنے برے وقت کے لئے اُٹھا رکھی تھی، ان سے پوچھے بغیر اپنے نام منتقل کروالی تھی۔ جب انہیں پہلی بار یہ پتہ چلا تو پہلا جھگڑا ان کا اس دن ہوا۔

”تم........مجھے پتہ نہیں کیوں یہ لگنے لگتا ہے، تم صرف میری بیوی نہیں ہو۔“

ثانیہ نے تلخی سے اُنہیں دیکھا تھا، پھر ہنس کر بولی تھی۔ ”تمہاری حسیات حیرت انگیز طور پر، ہمیشہ اوورورکنگ کرنے کے باوجود تمہیں غلط مشورہ نہیں دیتیں۔ مگر افسوس تم نے ہر معاملے میں دیر کر دی ہے۔“

”تم نے مجھے لوٹ لیا ہے........کنگال کر دیا ہے........میرے سوئس اکاؤنٹ کی ساری رقم تمہاری عیاشی کی نذر ہوگئی ہے اور بزنس پراپرٹی کا سارا لین دین تم نے بینک کاغذات کے ذریعے اپنے نام کروا لیا ہے۔ مجھے کاسہ دست کر دیا ہے ثانیہ! مجھے سمجھ نہیں آتا، کوئی عورت اتنا چھل بھی کر سکتی ہے۔ ایسی عورت جس کی دو بیٹیاں بھی ہوں؟“

”بیٹیاں........یہ دردِ سر تمہارا پیدا کردہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے، مجھے اولاد کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ اس ذمے داری سے جان چھڑانی چاہی تھی۔ مگر یہ بھی ایسی بدروحیں تھیں کہ میری ہزار کوشش کے باوجود دنیا میں آ کر رہیں۔ تم نے پہلی بیٹی کو گود میں لے کر جس محبت کا اظہار کیا تھا، وہ میرے لئے حیرت انگیز تھا۔ تمہارے لئے یہ محبت کے چھوٹے چھوٹے پیرائے تھے اور میرے لئے یہ دردِ سر........ مگر تم یہ نہیں سمجھ سکتے، اس لئے علینا کے بعد میں نے اس ذمے داری سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ اٹھا لیا۔ میرا خیال تھا، گورنس اور آسائشات کے ساتھ یہ دونوں بچیاں پل جائیں گی، لیکن یہ بچیاں تمہاری طرح سکی ہیں۔ انہیں پیار چاہئے، ممتا چاہئے، گود کی گرمی چاہئے۔ مائی فٹ۔“

وہ طنطنے سے کہتی صوفے پر بیٹھ گئی، ایسے بے ڈھنگے انداز میں کہ آدھی صوفے پر تھی، آدھی صوفے کی ہتھی سے باہر ٹانگیں لٹکا کر مگن تھی۔ سلیم افسر نے بیوی کو دیکھا۔ تنگ پائنچے کی جینز، سلیولیس بلاؤز نما ٹی شرٹ........وہ حیرت سے اس دن پہلی بار جاگے تھے، پہلی بار انہوں نے پوری حسیات سے اس عورت کو دیکھا تھا........اس عورت کو، جس سے اُنہیں کبھی محبت ہونے کا دھوکا ہوا تھا۔

یہ عورت تو صرف بازار میں بکنے والی عورت تھی اور انہوں نے اس سے اتنا پاکیزہ رشتہ جوڑا تھا........ اُنہیں خود پر حیرت ہونے لگی تھی۔ علینا اور انوشے کو دیکھ کر اُنہیں لگتا تھا، بابا کی نسل بہت برے جوکھم میں آ کر پھنس گئی ہے۔ مگر وہ بال بال قرض میں ایسے جکڑ گئے تھے کہ ان کی یہ سوچ انہیں کوئی راستہ نہ دکھا سکی۔ علینا اور انوشے کو ثانیہ نے بورڈنگ ہاؤس میں ڈال رکھا تھا۔ ہوا ب میدان صاف دیکھ کر وہ ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیار سے، محبت سے، غصے سے، ہر طرح سے آزمایا مگر ثانیہ کی چال نہ بدل سکی۔ پھر وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی حد سے ایک انچ ادھر کھڑے تھے، جب انہوں نے ثانیہ کا نیا افیئر سنا۔ وہ طرح دیتے رہے مگر بات جب ان کی حد سے آگے نکل گئی تو وہ دوبدو پر اتر آئے۔ ثانیہ نے یہ مزاج دیکھا تو خلع کے کاغذات سامنے لا رکھے۔

”بہتر ہے، ہم مزید کسی اُلجھن کے بجائے علیحدہ ہو جائیں۔ شادی کا کھٹ راگ بھی تمہاری سوکالڈ شرافت نے پھیلایا تھا، سو مجھے اس حماقت کے پھیلاوے سے تم ہی نکالو۔ مجھے نہیں رہنا تمہاری دنیا

میں.....تمہاری دنیا.....سانس لینے کی آزادی ہے، نہ جینے کی۔"

وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ نشے کے باعث اُنہیں کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ مگر صبح جب وہ جاگے تو اُنہوں نے بنا کسی تردد کے خلع کے کاغذات پر سائن کر دیئے تھے۔ تانیہ زیورات اور سارے ڈاکومنٹس لے چکی تھی۔

قریبی دوست فاروق اعظم نے سنا تو کہا۔

"تمہیں اتنی جلدی ہار نہیں ماننی چاہیے تھی۔ اُسے عدالت میں تو گھسیٹتے، چکر پر چکر لگواتے، نیا کیس دھوکا دہی کا بھی چارج کر دیتے تو پھر پتہ چلتا وہ کیسے اور کیونکر محبت کی نئی کہانیاں شروع کر پاتی۔"

سلیم افسر کچھ نہیں بولے۔ مگر قرض کی واپسی کا تقاضا ایسا تھا کہ وہ لامحالہ تانیہ ہی کے پاس گئے۔

"مجھے کچھ رقم دے دو قرض چکانا ہے۔"

یہ ساری رقم تانیہ ہی نے اپنی عیش پسندی میں لٹائی تھی۔ نئی سے نئی گاڑی، مہنگے کپڑے، نئے گھر..... پیسہ کتنا ساتھ دیتا؟ پھر یوں ہوا تھا، کریڈٹ پر بات چلتی رہی۔ وقت اچھا تھا، کریڈٹ کا معاملہ نبھتا رہا مگر تانیہ کے ہاتھ تو جیسے جادو کی چھڑی لگ گئی تھی، سو بینک کا قرضہ بڑھتا گیا۔ وہ تانیہ سے ملے تھے، درخواست بھی کی تھی، مگر اس کو کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ بینک نے ان کا کاروبار، جائیداد اور گھر قرق کر لیا۔ وہ سڑک پر آ گئے۔ بچیاں بورڈنگ ہاؤس سے نکال دی گئیں۔ ایسے میں ابا کے ایک دوست مسٹر نور محمد نے ان کو سر چھپانے کی جگہ دی۔ بچیوں کی ذمے داری بھی ان ہی نے اپنے سر لے لی۔ مگر دل میں ایسی آگ لگی تھی کہ وہ انہیں گلیوں کی خاک چھاننے لگے، جہاں کبھی خواب میں بھی جانے کا نہیں سوچتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، اس سب کچھ کے باوجود انہیں تانیہ سے نفرت نہیں ہو سکی تھی۔ ہاں، وہ نفرت کرنے کا پوز ضرور دیتے تھے۔

پھر یوں ہوا، وہ انہی گلیوں میں قید ہو گئے۔ ان کے ذہن سے یہ بھی نکل گیا کہ وہ کبھی باعزت زندگی بھی گزارتے رہے تھے، یا ان کا نام کبھی سلیم افسر بھی تھا۔ بیٹیاں کہاں ہیں، یہ خیال بھی نشے نے ان سے چھین لیا تھا۔ وہ تانیہ کے چوبارے کے باہر بیٹھے رہنے لگے تھے۔ لوگ ایک پیگ شراب، ایک وقت کے کھانے کے لالچ پر اپنے بہت سے کام ان سے نکلوانے لگے تھے۔ وہ چوبارے میں خط و کتابت سے لے کر لڑکیوں کو لے کر جانے اور واپس لانے کی ذمے داری تک میں اب کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

اُن کی زندگی نے بہت دھماکہ خیز موڑ لیا تھا۔ لیکن انہیں خود پر حیرت نہیں ہوتی تھی کیونکہ حیرت کے لئے بھی ہوش و خرد میں ہونا ضروری تھا اور یہاں وہ ہر لمحے، ہر آن ہوش و خرد کو جام میں ڈال کر اندر ہی

وہ چھین لے مجھ سے حافظہ مرا' یہی وجہ تھی، انہیں ہر آن ٹیس دیتا۔ ماضی جب بھی یاد آتا، جس کا انجام بھی ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک ناکام زندگی ہیں، انہیں لگتا تھا، کہیں انڈیل لیتے تھے۔ یہ جہانیاں بیگم کے اثاثے کی تنگ ودو میں بہت نیچے اتر آئے۔ پھر یہی زندگی ان کا تعارف بن گئی تھی کہ وہ چہرہ چھپائے لڑکی ان کی سمت چلی آئی۔ اس لڑکی کو وہ بہت دفعہ ڈیٹ پر خود ڈراپ کر چکے تھے۔ کا سب سے قیمتی مہرہ تھی۔ اُن کی اور اس لڑکی کی اکثر چوری چوری گفتگو رہتی تھی، مگر جب اُس نے اس گفتگو کی ٹون بدلی تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔

انہوں نے سنا تو فلک شگاف قہقہہ لگا کر پوچھا۔ "کیا کروگی یہاں سے جا کر؟...... سب کچھ تو ہے یہاں۔ پیار، محبت، آسائش، زندگی......"

لڑکی نے اُن کی طرف دیکھا، پھر بے کسی سے بولی۔ "سب کچھ ہے، مگر یہاں عزت نہیں ہے۔ تم جانتے ہو ناں، عزت کے بارے میں...... میں نے سنا ہے تم کبھی بہت بڑے بزنس مین ہوا کرتے تھے؟"

سلیم افسر نے نشیلی آنکھیں اُس پر گاڑ کر اپنے خالی جام کی طرف دیکھا، پھر لاپروائی سے بولے۔ "کبھی تھا...... مگر اب میں یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ معاشرے میں عزت بھی کس کمال کا نام ہے۔"

"تم کیوں بھولنا چاہتے ہو کہ عزت اور نام نسب کی کوئی وقعت ہے؟"

سلیم افسر نے لڑکی کو دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "میں ناکام ہوں۔ اور ناکامی کو کسی عزت یا نسب سے کوئی علاقہ نہیں۔ میں بہت برا انسان ہوگیا ہوں...... اور مجھے لگتا ہے، میں اب پہلی سی حالت میں کبھی واپس نہیں لوٹ سکتا۔"

"کیا واقعی، انسان کوشش کرے، تب بھی حالات نہیں بدل سکتا؟"

انہوں نے خمار سے اُسے دیکھا، پہلی بار کسی بات پر سوچا تھا انہوں نے۔ لیکن خمار آلود دماغ کیا واقعی کچھ سوچ سکتا ہے؟

سلیم افسر نے جواب نہیں دیا اور وہ لڑکی جو خود کو عافیہ بانو کہتی تھی، پھر سے لگن سے بولی تھی۔ "زندگی...... آپ کو پتہ ہے، زندگی اسی لئے زندگی کہلاتی ہے کیونکہ یہ تغیر پسند ہے۔ تحریک اس کا خاصہ ہے۔ انسان زندہ ہے تو بدل سکتا ہے، صرف موت ایک انمٹ نقش ہے۔ زندگی میں زندہ رہنا چھوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟ آپ جینے کا ایک مارجن کیوں نہیں لیتے؟ دیکھئے! آسمان کی طرف ایک بار دیکھئے۔ آپ کو لگے گا، جب تک وہ خدا ہے، بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے، بلکہ سب کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ آپ ایک بار آسمان کو دیکھئے تو...... آسمان کتنا وسیع، کتنا نیلا ہے۔ کالے بادل آسمان پر ہمیشہ کے لئے نہیں چھاتے، یہ موسموں کا تسلسل ہے اور وہ موسموں کا خالق۔ وہ رنگ بانٹتا رہتا ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کس رنگ سے زندگی سجاتے ہیں۔ سلیم صاحب! انسان کے اندر اُمید زندہ رہے تو انسان بھی زندہ

رہتا ہے۔امید خدا کا دامن ہے۔آپ کو پتہ ہے یہ بات؟"

سلیم افسر خالی الذہنی کی حالت میں نقاب کشا لڑکی کو دیکھتے رہے۔اُس کی آنکھوں میں کچھ تھا، جس نے ان کا دل تھام لیا تھا۔

پھر یوں ہوا، وہ چھپ چھپ کر ان سے ملنے آتی رہی۔ہر بار ایک نیا اُمید کا در کھول جاتی۔وہ بھی اس سے اپنے دل کی باتیں کرنے لگے تھے۔انہوں نے تانیہ اور اپنی بیٹیوں کی بابت بھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔وہ یہاں شوفر کے طور پر نوکر رکھ لئے گئے تھے۔مگر اب......اب انہیں ایسا لگنے لگا تھا، جیسے یہاں کی فضا کی کثافت سے ان کا دماغ پھٹنے لگا ہے، وہ اب یہاں نہیں رہ سکتے۔تانیہ کی دلکش صورت بھی یہاں کی گندگی سے اٹ گئی تھی۔دل سے انہوں نے یہ نام کھرچ کھرچ کر اُتار دیا تھا۔عافیہ بانو کی باتیں دھیرے دھیرے ان کے دل کا زنگ اُتارنے لگی تھیں مگر جب وہ ڈرنک کر بیٹھتے تو عافیہ بانو کی ہر کوشش زیرو پر آ کر رک جاتی۔وہ اُنہیں آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی اور وہ خمار سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتے۔

"بے کار ہے یہ سب۔میں اتنا بگڑ گیا ہوں کہ سدھر نہیں سکتا۔تم بے کار محنت کر رہی ہو۔کسی اور کو آزماؤ، شاید تمہیں کامیابی مل جائے۔"

عافیہ بانو روتی دھوتی چلی جاتیں اور وہ خمار اُترنے پر خود سے شرمندہ ہو جاتے۔یہاں تک کہ ایک دن عافیہ بانو کو کسی کے ڈیرے پر چھوڑے جانے کا کام اُنہیں سونپا گیا۔وہ پہلی بار عافیہ بانو کو اتنا سجا سنورا دیکھ رہے تھے، مگر حزن کی کیفیت......اُن کی روح جل کر رہ گئی تھی۔وہ گاڑی چلا رہے تھے اور عافیہ بانو اُن کے پیچھے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔اب تک جو اُمید دامن تھامے کھڑی تھی، اس اُمید نے دل جلا دیا تھا۔وہ بار بار عافیہ بانو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔تب ایک تلخ ذائقے نے سوال کیا۔

"یہ سب آپ کی زندگی کا حصہ ہے، پھر آپ یوں جی کھول کر رو رہی ہیں جیسے کسی بہت عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں؟"

عافیہ بانو نے سخت نظروں سے انہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولیں۔"گناہ بے اختیاری یا کچی میں کیا جائے تو معافی مل سکتی ہے، جان کر، سمجھ کر کیا جائے تو سر قلم ہو جانا ہی اس غلطی کی سزا ہے۔میں اچھی نہیں ہوں، یہ آپ سمجھتے ہیں......مگر میرا رب کہتا ہے، اُس نے میرے دل کو چھو کر پاک کر دیا ہے۔پھر کسی بری بات کا گزر بھی بندگی سے ماورا ہے۔کسی بری بات کی کیچڑ سے خود کو لت پت کر لوں......

میرا باپ ایک نامور انسان تھا مگر میری ماں اپنی چال نہ بدل سکی۔وہ واپس یہیں چلی آئی۔میرے باپ نے مجھے اور عطیہ کو حاصل کرنے کی جتنی کوششیں کیں، وہ ناکام ٹھہرا دی گئیں۔میری ماں جانتی تھی، میرا باپ عزت اور خاندانی وقار کی وجہ سے عدالت میں سے نہیں گھسیٹ سکتا، اس لئے انہوں نے اپنی من مرضی کی۔میں اور عطیہ جب تک اپنی زندگی کے اس رخ سے نا آشنا تھے، ہمیں یہی زندگی سہل اور

خوش گوار لگتی تھی یا شاید ہم ایسا سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اندر کی ناگواری کو ہم اپنی بے بسی کے نام پر سمجھ کر بھیجتے رہتے تھے، مگر جب سے بابا سے ملے، ان کی موت کی خبر سنی، تب سے اندر سے کوئی ہے جو ہانک لگا رہا ہے۔ بدلو، زندگی کا رخ بدلو، یہ زندگی ہمارے لئے نہیں ہے۔ میں تب سے اس زندگی کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ عطیہ بغاوت کر کے اپنا گھر بسا چکی ہے، مگر میں اس آزادی کے لمس کو محسوس کرنے کے لئے کب سے تڑپ رہی ہوں۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے میں نے اُسے اُس کی مرضی کے مطابق سپورٹ کیا۔ بہت چال بازیوں کے بعد میں اُسے اس غلاظت سے نکال سکی ہوں۔ بڑی ماں اسی بات پر مجھ سے اور زیادہ خار کھاتی ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ لیکن یہ سچ ہے، عطیہ کے ساتھ ہونے سے جو اپنا پن محسوس ہوتا تھا، وہ تنہائی کی نذر ہو گیا ہے۔ میں یہاں اکیلی پڑ گئی ہوں۔ عطیہ نے یہاں سے نکل کر صرف ایک سال تک رابطہ رکھا، پھر شاید اُس کے شوہر نے سختی سے روک دیا ہو گا۔ میں اب اُس کی آواز تک بھولتی جا رہی ہوں۔"

وہ رو میں بہک کر جانے کہاں نکل گئیں۔ کتنی ساعتیں یونہی خاموشی کا پلو تھامے کھڑی رہیں، پھر انہوں نے حال میں لوٹ کر سلیم افسر کو مخاطب کیا۔

"سلیم صاحب! آپ کی تو خود کی بھی بیٹیاں ہیں۔ کیا پھر بھی میری التجا آپ کا دل موم نہیں کر رہی؟ کبھی آپ نے سوچا ہے، جو زندگی آپ گزار رہے ہیں، اس زندگی کے ہوتے ہوئے کون آپ کی بیٹیوں کو بیاہے گا؟ کبھی آپ نے سوچا، اگر تانیہ میری ماں کی طرح آپ کی بیٹیوں کو اپنی راہ پر لے آئی تو کہاں ہو گی آپ کی نسل؟...... مسٹر سلیم! کبھی آپ نے سوچا ہے یا نہیں، لیکن امارت بہت سے عیب چھپا لیا کرتی ہے مگر غربت اور مفلسی سے بڑا کوئی عیب نہیں۔ آپ کے پاس دولت نہیں ہو گی تو آپ کو معلوم ہے، تانیہ کے نام کی شہرت آپ کی بیٹیوں کو کہیں بسنے نہیں دے گی۔ لوگ انہیں ٹھوکروں میں رکھ لیں گے اور پھر اس بات کی گارنٹی کیا ہے کہ جہاں اور جس کے پاس آپ کی بچیاں ہیں وہ ان کو آپ کی طرح کی محبت دے گا؟...... بیٹی بہت نازک آبگینہ ہے سلیم صاحب! سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ اور آپ نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔"

آج نشہ کم تھا، تبھی اس بات کو سمجھنے کے لئے سوچ فوراً سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ عافیہ بانو خاموش تھیں اور وہ سوچ کے سمندر میں غرق مسلسل کار ڈرائیو کر رہے تھے۔

عافیہ بانو کو لگنے لگا تھا، جیسے انہوں نے اب تک ایک پتھر سے سر پھوڑا تھا۔ جذبات کی شاید اس انسان کی کیمسٹری میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن سنا ہے، پیسے کی بات ہر انسان کو بہت جلد متاثر کرتی ہے۔ سو انہوں نے نیا تیر پھینکا تھا۔

"سلیم صاحب! اگر آپ نے مجھے اس زندگی سے نکال لیا تو میں آپ کو اتنا پیسہ دے دوں گی کہ آپ ایک بار پھر ترقی کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ بس آپ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد کر دیں۔"

سلیم افسر نے پہلی بار انہیں توجہ سے دیکھا، پھر بہ آہستگی بولے۔ ''زندگی میں، میں نے بہت برا کیا، بہت کچھ ایسا کہ شاید ساری زندگی اپنے سامنے نظر نہ اُٹھا سکوں۔ مگر عافیہ بانو! آپ مجھے اتنی پستی میں بھی مت دھکیل دیجئے کہ میں کبھی اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا بھی نہ ہو سکوں۔ شراب...... شراب واقعی انسان سے ہر جذبہ غنڈہ ٹیکس کی طرح وصولتی ہے۔ وہ اندر کچھ بھی نہیں رہنے دیتی بجز صرف ہوس...... کہ صرف اپنی میں کی خو کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہنے دیتی۔ مگر ڈرنک کرنا میری ہابی نہیں، وہ ماضی ہے، جسے میں اس کے نشے میں ڈبو کر نیست و نابود کر دینا چاہتا ہوں۔ مگر ہر روز صبح جب یہ ڈوبا ہوا ماضی پھر سے ساحل پر آ کھڑا ہوتا، مجھ سے آنکھیں چار کرنے لگتا تو پھر مجھے لگا میں ہوش کو ایک بار ہی اپنے وجود سے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں۔ مگر عافیہ! میں جب سمجھ رہا تھا، میں غرقاب ہونے کی منزل کو چھونے ہی والا ہوں تو تم چلی آئیں۔ تمہاری باتوں نے عمر بھر کے اس فریب سے پھر نبرد آزما کرنے کے لئے مجھے میرے ہی سامنے دھکیل دیا۔ میری سفر کی کہانی پھر پہلے قدم سے شروع ہو گئی...... عافیہ! میں اس بچے کی طرح ہوں، جس نے گود سے اتر کر پہلی بار دھرتی پر قدم رکھا ہے۔ میرے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ بار بار لگتا ہے، میں اب گرا تو دھرتی کی ساری مٹی مجھے پھانک لے گی، میں چلنا بھول گیا ہوں۔''

وہ کم سن بچے کی طرح ہو گئے تھے اور عافیہ بانو کی ممتا نے انہیں سمیٹ لینے کی ہوک کی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں، یہ کیا رشتہ ہے، مگر ہر روز جب بھی وہ ان کے سامنے جاتیں تو انہیں لگتا، سلیم افسر ہی وہ انسان ہیں جن پر تقدیر نے انہیں اختیار دیا ہے۔ پتہ نہیں، وہ اُن کا نصیب تھے یا نہیں، مگر اس لمحے وہ ان کے لئے تمام تر شدتوں سے ایک ہی جذبہ رکھتی تھیں اور وہ تھا محبت۔ ان کی زندگی میں محبت کی کوئی ڈیفی نیشن نہیں تھی، مگر انہیں لگتا تھا، ان کی زندگی میں محبت ہی ان کی ذات کی دلیل بنتے جا رہی تھی۔

عافیہ بانو کا داہنا ہاتھ سلیم افسر کے کندھے پر دباؤ بڑھانے لگا تھا۔ سلیم افسر محبت کے ٹھکرائے ہوئے انسان تھے، مگر یہ کم بخت محبت، یہ دل تو دوسری بار، تیسری بار کیا، بار بار دھوکے افسوس کے باوجود محبت کرنے سے باز کب رہنے دیتا ہے۔ جو چنگاری اندر کہیں سلگ رہی تھی یا انہیں اس کا گمان ہوا تھا، وہ چنگاری یکدم تپش دینے لگی تھی۔

برسوں کے بن روئے آنسو جو جام میں انڈیل کر وہ پی گئے تھے، وہ آنسو آج سلیم افسر کی آنکھوں میں جلن پیدا کرتے رخسار پر بہہ نکلے تھے۔ انہوں نے سائیڈ پر گاڑی روک لی تھی۔ وہ بے تحاشہ تڑپ کر روئے تھے۔ عافیہ بانو پہلے تو تعجب کے بارے دیکھتی رہی تھیں، پھر دل سے ایک طوفانی جذبہ اُٹھا تھا اور ان کی محبت نے سلیم افسر کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا تھا۔ سلیم افسر، عافیہ بانو کے شانے پر سر ٹکائے روتے رہے۔ پھر بہ دقت خود کو سنبھال کر بولے۔

''جہاں جانے والے تھے، وہاں کے ٹرپ کا کیا کریں؟''

عافیہ بانو انہیں دیکھنے لگیں۔ اُنہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیا بہانہ بنائیں۔ کچھ ساعتیں ایسی ہی بے نیل و مرام گزریں، تب اُنہوں نے عافیہ بانو کو دیکھ کر کہا۔ ”آپ چھوٹی موٹی چوٹیں برداشت کر سکتی ہیں عافیہ؟“

عافیہ بانو سوالیہ دیکھنے لگیں، پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ ”آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے سلیم صاحب؟“

سلیم افسر مسکرائے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ ”آپ نے ابھی پیسوں کی بات کی تھی۔

عافیہ بانو کا چمکتا چہرہ تاریک ہو گیا۔ سلیم افسر نے اُن کی آنکھوں میں کرب دیکھا تو آہستگی سے بولے۔ ”آپ مجھے غلط مت سمجھئے۔ میں آپ کی جو رقم لوں گا، وہ رقم مجھ پر قرض کی طرح واجب ہو گی۔ لیکن یہاں سے نکلنے کے لئے مجھے زادِ راہ چاہئے ہی ہو گا۔ میرا ایک دوست انگلینڈ میں ہوٹل انڈسٹری سے وابستہ ہے، میں اُس سے ویزے کی بات کروں گا، پھر جب تک وہاں سیٹل نہ ہو جاؤں، آپ دبئی میں میرے گھر میں رہ سکتی ہیں۔ اس گھر کی بابت تانیہ کو خبر نہیں تھی۔ میں نے یہ گھر رینٹ پر اپنے ایک دوست کو دے رکھا تھا۔ آپ کے اور بچیوں کے ویزے کے لئے وہی کام آئے گا۔“

عافیہ بانو خاموشی سے انہیں دیکھنے لگیں تو وہ مکرر بولے۔

”دراصل تانیہ کے بعد گھر گرہستی سے میرا دل ایسا اچاٹ ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی اولاد بھی بری لگنے لگی تھی۔ گھر بار، دنیا جلا دینے کو دل کرتا تھا۔ مگر چند مہینوں میں آپ کی ذات نے میرے اندر جو اُمنگ اور زندگی کی رمق کا دیا جلایا ہے، اس نے زندگی کرنے کے سارے حربے پھر سے یاد دلا دیئے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

عافیہ بانو اثبات میں سر ہلا کر ان کے ساتھ کا کل عہد کر کے ان کو دیکھنے لگیں۔ وہ جس جذباتی نہج پر تھیں، اگر اس موڑ پر کوئی اس زندگی سے نکلنے کا واحد حل موت بھی بتاتا تو وہ بھی انہیں قبول ہوتا۔ یہ تو پھر زندگی کی بات ٹھہری تھی۔

سلیم افسر گاڑی کو پھر سے سڑک پر واپس لے آئے تھے۔ پھر گاڑی چلاتے ہوئے انہوں نے جانے کیا سوچا تھا۔ گاڑی کنارے روک کر ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو پیپر پر ایک تعارفی خط، دبئی اور انگلینڈ کے پتے اور بچیوں کے ٹھہرنے کی جگہ....... پاپا کے دوست کے نام الگ خط، نہایت مختصر ترین مدعا، پھر ٹشو پیپر کے تینوں ٹکڑے ان کے حوالے کر کے بولے۔

”پلیز عافیہ! آپ فرنٹ سیٹ سے اُٹھ کر پیچھے چلی جائیے۔ حادثہ ایک رسک ہے۔ اور میں چاہتا ہوں اس رسک میں آپ بچ جائیں۔ ایک دم خیال آیا تھا، مجھے کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس لئے یہ پتے آپ کو

دیئے ہیں۔ اگر معاملہ بگڑ جائے تو آپ مجھے چھوڑ کر بے دھڑک جا سکتی ہیں۔ ہاں، بس میری بیٹیوں کی ذمہ داری آپ کے سر ہوگی۔"

عافیہ بانو سنتی رہیں، پھر ایک دم جذبات کا اُبال اُٹھا۔ انہوں نے ان کا ہاتھ تھام لیا، پھر پُر یقین لہجے میں بولیں۔ "آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم دونوں مل کر بچیوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ مجھے آپ کی موت کی نہیں، زندگی کی اشد ضرورت ہے۔"

سلیم افسر نے ان کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں صرف سچائی اور اُلفت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بے اختیار انہوں نے جسارت کی تھی، عافیہ بانو نے اُن کی پُر محبت جسارت پر انہیں ٹوکا نہیں تھا۔ وہ سنبھلے تو انہیں لگا تھا، جیسے آج وہ جو بازی لگائیں گے اس میں جیتنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ وقت، محبت سب ان کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے داؤ لگایا تھا۔

حادثہ قطعی حقیقی مگر نقصان قطعی آرڈر میں تھا۔ عافیہ بانو قدرے زخمی ہوئی تھیں۔ سلیم افسر کو کچھ چوٹیں زیادہ آئی تھیں مگر بر وقت طبی امداد ملنے سے معاملہ سیٹل ہی رہا تھا۔

خون زیادہ نہیں بہا تھا۔ عافیہ کے ہاتھ اور داہنی ٹانگ میں گاڑی کے ٹکراؤ سے اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ پیشانی پر سائیڈ ڈور کے گلاس کی کرچیوں سے زخم آئے تھے۔ نیل پڑ گئے تھے۔ بڑی چوٹ کوئی نہیں تھی۔

بڑی ماں اس حادثے کے بعد فوراً ہی ہسپتال پہنچ گئی تھیں۔ ان کی دعا سلام سے بہت جلد ہی کور کر لیا گیا تھا۔ وہ سلیم افسر کے روم میں بیٹھی تھیں، جب بڑی ماں نے اس روم میں انٹری دی تھی۔ سلیم افسر ان کے بہت کام کے بندے تھے اس طرح بستر پر دیکھ کر وہ تاسف سے ہاتھ ملنے لگی تھیں۔ اس سے تسلی نہ ہوئی تو افسوس بھرے لہجے میں بولیں۔

"کیا ہے سلیم! تم تو ڈرائیونگ میں اتنے ماہر تھے۔ یہ اچانک کیا کر بیٹھے؟"

سلیم افسر نے چہرے کو تکلیف سے پُر کر لیا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ "کیا کروں بڑی ماں! ماہر آدمی بھی کبھی کبھی غلطی کر ہی دیتا ہے۔ مجھے تو بس افسوس ہے کہ عافیہ بانو، خان اظفر کے ڈیرے نہیں جا سکیں۔ آپ کی عزت پر میں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں، مگر کیا کروں، بے حد مجبور ہوں۔"

وہ جتنا جھوٹ اس لمحے بول سکتے تھے، انہوں نے بولا تھا۔ بڑی ماں مطمئن انداز میں انہیں دیکھنے لگیں، پھر لگاوٹ سے، آگے کام نکلتے رہیں گے، کے خیال سے بولیں۔ "ارے اس کی فکر مت کرو۔ خان اظفر نے پرائیویٹ پارٹی کے لئے کوئی مخصوص نام نہیں دیا، اس لئے وہاں میں نے نشلی کو بھیج دیا۔ وہ بھی کوئی کم قاتل حسن تو نہیں رکھتی۔ تم بس ساری سوچیں اپنے ذہن سے نکال دو، جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ تو میں ایک جشن کروں گی کہ اس اوپر والے نے میری چڑیا اور تمہیں بچا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

عافیہ بانو قاتل آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں مگر توجہ مڑ کر ان تک لوٹی تو ان کی آنکھوں میں بڑی ماں کے لئے لگاوٹ ہی لگاوٹ تھی۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر اپنے پرائیویٹ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ شکر گزار تھے کہ ڈاکٹر رحمان نے اس لمحے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ زخموں کی کہانی اتنی شدید نوعیت کی بھی نہیں تھی مگر انہوں نے میڈیکلی توجیہات پیش کر کے انہیں اچھی طرح گھما ڈالا تھا۔ ڈاکٹر رحمان ان کے دوست کے دوست تھے، ان کے قریبی دوست فاروق اعظم سے ان کی میل ملاقات اکثر رہتی تھی۔ وہ اکثر واک ایک ساتھ کیا کرتے تھے، کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کو چھوڑے کو لنچ یا ڈنر کی دعوت بھی دیا کرتے تھے اور انہی دعوتوں میں ان کے ڈرائنگ روم میں لگی مسٹر سلیم افسر کی تصویر سے شناسائی کے باعث سلیم افسر جب ایمرجنسی میں ہسپتال آئے، انہوں نے پہلی فرصت میں مسٹر فاروق اعظم کو کال کر دیا تھا کہ بقول ان کے ان کا مسنگ فرینڈ دریافت ہو گیا ہے۔ پھر پہلی بار ہوش آجانے پر انہوں نے فاروق اعظم کو دیکھ کر جلدی جلدی اپنی مجبوری سمجھائی تھی۔ تب فاروق اعظم کے کہنے پر ہی مسٹر رحمان نے اُن کا دامے، درمے، سخنے ہر طرح کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور بہت دلجمعی سے نبھایا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی ماں کے چلے جانے کے بعد فاروق اعظم کو دیکھ کر ان کے دل میں اپنے دوست کے لئے بے انتہا پیار ہی پیار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ مکمل طور پر قلاش تھے مگر عافیہ بانو کے ملتے ہی جیسے محبت نے ایک بار پھر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ مسٹر فاروق سامنے بیٹھے تھے اور سلیم افسر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے نظر جھکائے لیٹے تھے۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھے۔ فاروق اعظم اُنہیں دیکھے جا رہے تھے، پھر خفگی سے انہوں نے پہلی بار خاموشی کو زبان دی۔

"تم...... آخر تم خود سے اتنے مایوس کیسے ہو گئے تھے کہ ہر طرف سے منہ موڑ گئے؟ ایک ثانیہ نے تمہارا اعتبار توڑا اور تم...... تم نے ہم سب کو اس کے جیسا سمجھ لیا۔ بچپن کی دوستی کا خیال تک نہیں کیا۔ کسی کا خیال کرتے، نہ کرتے، کم از کم اپنی بیٹیوں کا تو خیال کرتے۔ تمہیں پتہ ہے، انکل کے دوست نور صاحب بھلے آدمی تھے مگر ان کی بیوی ایک نمبر کی کینہ پرور عورت تھیں۔ وہ چاہتی تھیں، تمہاری شادی ان کی بیٹی سے ہو، مگر تم ثانیہ کو یہاں لائے، یہ بات وہ ہضم نہیں کر سکیں۔ ان کی بیٹی اور مسز نور نے بچیوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا کہ الاماں، الاماں۔ وہ تو اچانک میں ایک دن مسٹر نور کے گھر چلا گیا۔ علینا مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی ہے۔ وہ چھ سال کی بچی، جیسے اپنے حالات بتا سکتی تھی، بتانے لگی۔ ان حالات میں مجھے جو بروقت سمجھ آیا، وہ کیا۔ فوراً میں اپنے ایک حاضر ڈیوٹی مجسٹریٹ دوست کے پاس گیا، بچیوں کو اپنی کسٹڈی میں کرنے کا کیس داخل کیا اور پھر ایک مہینے میں صرف دوستی اور سورس کی وجہ سے اس کا فیصلہ لے کر میں دونوں بچیوں کو حاصل کر سکا۔ اس کام کے لئے ناکوں چنے چبانے پڑ گئے تھے۔ مگر اچھی شہرت، مالی مستحکم حالت، تمہارے وہ چند خطوط، جو یوکے کے تعلیمی دور میں تم نے مجھے لکھے تھے، تمہاری نسبت جھکاؤ اور تمہارے اعتبار کو شو آف کرنے میں کافی کام آئے۔ اب اللہ کا شکر ہے،

تین سال سے بچیاں بورڈنگ ہاؤس میں مکمل طور پر پڑھائی میں مصروف ہیں۔ مگر سلیم ایڈیٹ! تمھیں اور کچھ نہیں سوجھا تھا؟ ثانیہ سے شادی کرنا غلطی سہی، مگر یہ نشہ...... یہ کیا تمھیں زیب دیتا تھا؟ تم جیسے گولڈ میڈلسٹ حساب دان کو یہ حماقت پر حماقت قطعاً زیب نہیں دیتی۔"

سلیم افسر کچھ نہیں بولے۔ مسٹر فاروق جو کہہ رہے تھے، تسلیم تھا، سو وہ کہہ کر تھمے تو انہوں نے آگے کا پلان بتایا۔ مسٹر فاروق نے عافیہ بانو کا نام سنا تو بدک گئے۔

"بالکل سٹوپڈ پھر ایک نئی حماقت۔ تجھے کیا عزت دار گھرانے کی کوئی لڑکی نہیں نظر آئی، جو...." وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ کیونکہ دروازے سے عافیہ بانو داخل ہوئی تھیں۔

"گھر سے سوپ آیا تھا، میں نے سوچا میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے پلا دوں۔ لیکن شاید آپ بے حد مصروف ہیں۔" انہوں نے سوپ کا پیالہ اُن کے سائیڈ ریک پر رکھ دیا۔ اُن کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

فاروق اعظم نے پہلی بار انہیں نظر بھر کر دیکھا تھا، ملائمت، آنکھوں کا تقدس، چہرے کی الوہی آنچ...... انہوں نے یکدم فیصلہ کر کے کرسی خالی کر دی، پھر ادب سے بولے۔

"پلیز عافیہ جی! آپ سلیم کو اپنے ہاتھ سے سوپ پلائیں گی، تبھی یہ کچھ کھا مرے گا۔ ورنہ ایک نمبر کا نکما آدمی ہے پلیز اِٹ سیلف۔ میں وہاں صوفے پر بیٹھ رہا ہوں آپ مطمئن ہو کر اپنی من مرضی کر سکتی ہیں۔"

عافیہ بانو نے لہجے سے ہٹ کر چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی پہلے تاثرات تیزی سے زائل ہو چکے تھے۔ سلیم افسر سوپ پی چکے تو دوا کھلانے کا کٹھن مرحلہ درپیش آیا۔ وہ گولیاں نگلنے کے سدا کے چور تھے مگر عافیہ بانو نے انہیں جس طرح ہینڈل کیا، اسے دیکھ کر عافیہ بانو کے جاتے ہی فاروق اعظم نے جوش سے کہا تھا۔

"پہلی بار تو نے صحیح فیصلہ لیا ہے۔ تجھ جیسے نکمے بندے کے لئے ایسی ہی لائف پارٹنر کی ضرورت ہے۔ عافیہ حکم نہیں چلاتیں، لیکن پھر بھی منوا لیتی ہیں اور یہ خوبی بہت کم عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ حکمرانی کی خواہش میں گلا چھیل لینا اور چپکے چپکے دل پر حکمرانی کرتے چلے جانا، اپنی بات آپ کے دل میں یوں اُتارنا کہ وہ خود بخود آپ کو اپنے دل کی بات لگے۔ اِٹس امیزنگ پاس، بلکہ فرسٹ کلاس۔ مجھے تمہاری اس چوائس پر اب کوئی تحفظات نہیں۔"

سلیم افسر ہنسنے لگے۔ پھر جتنے دن وہ ہسپتال میں رہے، فاروق اعظم نے اُن کی من مرضی کے سارے کام کر ڈالے۔ پاسپورٹ، ویزا، سب کچھ بیس پچیس دن میں مہیا کرنا ان ہی کا کمال تھا۔ مگر مسئلہ عافیہ کی ایک سالہ بیٹی کا تھا۔ اُن کی یہ بیٹی اپنی نام نہاد نانی سے بہت زیادہ وابستگی رکھتی تھی۔ کم عمر اتنی تھی کہ اُسے کچھ سمجھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سلیم افسر اور عافیہ دونوں اس معاملے میں پریشان کن موڑ پر آ کر اٹک گئے تھے کہ فاروق اعظم پھر روشنی کی کرن بن کر سامنے آئے۔ سلیم افسر کو ان کی دماغی صلاحیت پر بلا کا بھروسہ تھا کیونکہ عافیہ سے نکاح کے بعد فاروق اعظم ہی تو تھے، جنہوں نے انہیں محفلوں میں

پرائیویٹ پرسنالٹی بننے سے کمال مہارت سے بچالیا تھا، بس انہیں اپنے ایک رنگین طبیعت دوست کا سہارا لینا پڑا تھا۔ انہیں وہ گلیاں جانتی تھیں۔ سوشک کا پہلو نکالے بغیر پورے چھ ماہ کے لئے کنٹریکٹ بیس ٹائپ معاہدے کے تحت عافیہ کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں۔ یہ اور بات کہ وہ فاروق اعظم کے فارم ہاؤس میں سلیم افسر کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ سلیم افسر ہسپتال سے غائب ہوگئے تھے۔ بڑی ماں کے ہرکاروں نے انہیں بہت تلاش کیا تھا، مگر ہاتھ آ کر ہی نہیں دیئے۔ بڑی ماں ہیرا جیسا ملازم کھونے پر کچھ دن آزردہ رہیں، پھر سب بھول بھال گئیں مگر اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا، وہ عافیہ سے زیادہ نازک مسئلہ تھا۔

''تم کوئی حل نکالو یار! میں نے چار دن بعد کی ٹکٹیں کروائی ہیں۔'' سلیم افسر نے فاروق اعظم کو دیکھ کر سوال کیا اور سوچنے کی ذمہ داری سونپتے ہوئے کہا۔

فاروق اعظم مسکرائے، پھر مدھم ہوکر بولے۔ ''وہ تمہاری بڑی ماں.......''

سلیم افسر نے فوراً خفگی سے انہیں دیکھا، پھر اسی خفگی سے بولے۔ ''پلیز! اس عورت کو ماں جیسے مقدس رشتے سے نتھی نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ تم اسے جہانیاں بیگم کہہ سکتے ہو۔''

فاروق اعظم نے مسکرا کر اعتراض مان لیا۔ پھر بات جہاں رُکی تھی، وہیں سے شروعات کرکے بولے۔ ''میں نے سنا ہے، جہانیاں بیگم کا جو ملازم ہے، بوٹا فرام میاں چنوں، وہ عافیہ بھابی کی بیٹی کو روز کھانے فقیرا اسٹریٹ کے پارک میں لے جایا کرتا ہے۔ معلومات سے پتہ چلا ہے، وہ بے حد لالچی بھی ہے۔ اگر ہم بچی کے اغوا کا ڈرامہ کرنے کا اُسے اچھا معاوضہ دے دیں تو........''

سلیم افسر کو آئیڈیا پسند آیا مگر اس جواب سے نیا سوال اُبھرا۔ ''بچی کو اغوا کون کرے گا؟''

فاروق اعظم نے انہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ ''بلو گروپ۔ وہ اغوا برائے تاوان کا اسپیشلسٹ ہے۔ اگر قم لے کر بوٹا مکر بھی گیا، تب بھی بچی اغواء ہونے سے بچ نہیں سکتی۔ وہ اپنے کام کا ایسا ہی ماہر ہے۔ مگر سنو! عافیہ بھابی کو اس پلان سے آگاہ مت کرنا، وہ ماں ہیں، گھبرا نہ جائیں۔''

سلیم افسر نے سر ہلایا۔ فاروق اعظم نے سفارتی مہم دوسرے دن سے شروع کردی۔ پھر ڈیڑھ دن بعد کامیابی ہوئی۔ بلو گروپ سے بات ہوگئی۔ حسب پروگرام بچی اغواء کرلی گئی۔ سلیم افسر نے بیٹیوں کو بورڈنگ ہاؤس سے بلوالیا تھا۔

وہ سب دُبئی کی پرواز کے لئے نکلنے والے تھے۔ بچی فاروق اعظم ہی لے کر آنے والے تھے۔ مگر وہ انتظارگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جب اچانک فاروق اعظم گھبرائے ہوئے داخل ہوئے۔ سلیم افسر اُنہیں

عافیہ اور بچوں سے دُور لے گئے، پھر سوال کر بھی نہیں پائے تھے کہ فاروق اعظم سرسرائے لہجے میں بولے تھے۔

”سلیم اچوک ہوگئی۔ وہ بلّو بدمعاش نکلا۔ اپنے معاہدے سے پھر گیا۔ اُس نے بچی کے لئے مزید رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ میں نے کوشش بہت کی مگر مطلوبہ رقم مہیا ہونا اتنی آسان بات نہیں۔ اگر ایک دو دن ملتے تو شاید کوشش کامیابی بھی ہو جاتی۔ مگر اس وقت یہ سب ممکن نہیں رہا۔ تمہارا ٹرپ کینسل کرنے کا مطلب ہے، سارے معاملات بگڑ جائیں۔ عافیہ بانو پر زیادہ آنچ آنے کا اندیشہ ہے۔ اب تم بتاؤ کیا کریں؟“

سلیم افسر گنگ فاروق اعظم کو دیکھتے چلے گئے۔ وہ واقعی بہت پریشان کن چوئیشن میں آکر پھنس گئے تھے۔ انہیں اپنا آپ بہت اکیلا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کا مخروطی ہاتھ ان کے کاندھے پر آرکا۔ وہ بجلی کی تیزی سے پلٹے، ان کی پشت پر عافیہ کھڑی تھیں مگر اُن کی طرح ہراساں نہیں [...] عافیہ کمپوزڈ تھیں۔ اُنہیں حیرت ہوئی تھی۔ پھر یہ حیرت کوئی جملہ نہیں بن سکی تھی کہ بنگلے کے اس طرف سے جہانیاں بیگم کی صورت نظر آئی۔ بچی اُن کی گود میں تھی۔ عافیہ بانو کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ وہ جانتی تھیں، انہوں نے کیا کھو دیا ہے یا کیا کھونے جا رہی ہیں۔ جہانیاں بیگم ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر سلیم افسر کو مخاطب کر کے بولیں۔

”تم کیا سمجھتے تھے، تم ایک ماہر چالباز ہو؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو غلط نہیں سمجھتے تھے، لیکن میں نے جو دھوکا کھایا، وہ صرف اعتبار پر کھایا ہے۔ مگر دیکھ لو! میں کتنی جلدی اس جھٹکے سے سنبھل گئی ہوں۔ بلّو نے جتنی رقم کا مطالبہ تم سے کیا تھا، میں نے اُسے پانچ فیصد زیادہ رقم دے کر یہ لاٹری خرید لی ہے۔ چکی! تم پر میرا بہت خرچ آیا تھا مگر تمہاری بیٹی یہ سارا خرچ سود سمیت مجھے لوٹانے والی ہے۔“

عافیہ بانو کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ جہانیاں بیگم جانتی تھیں، وہ ان کی ممتا سے کھیل رہی ہیں اور اپنی من مرضی کا نتیجہ لینے کے لئے انہیں اسی ممتا کو استعمال کرنا تھا۔ ماں سب کچھ سہہ سکتی ہے، اپنی اولاد کو کھونے کا غم نہیں سہہ سکتی۔ سلیم افسر کی اولاد چاہ کر بھی ان کی اولاد تو نہیں بن سکتی تھی۔ یہی وہ نقطہ تھا، جو عافیہ کو جذبات کی اس سیڑھی پر پہنچا سکتا تھا کہ پھر انہیں منہ کے بل گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ سکیورٹی بھی ہاتھ باندھے کھڑی رہ جاتی تھی۔

”میری محبت تمہیں قید نہیں کرے گی۔ اگر تم......“ سلیم افسر نے اُن کا ہاتھ تھام کر فیصلہ دیا۔

عافیہ بانو نے ایک نظر سلیم افسر کو دیکھا۔ دوسری نظر چھ سالہ علینہ اور دو سالہ انوشے کی طرف گئی۔ پھر نظر موڑے بغیر اپنی بیٹی پر جا کر ٹک گئی۔ ایک راستہ زندگی کو جاتا تھا اور ایک ذلت کی موت کو...... ایک سمت میں گھر گرہستی کا موڑ تھا اور دوسری سمت ذات کی تذلیل...... ایک طرف محبت تھی، دوسری طرف محبت کی انتہا ممتا کے روپ میں کھڑی تھی۔ بچی نے ہمک کر ان کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے۔ انہیں

لگا تھا،ان کا دل یکبارگی بند ہو جائے گا۔ جہانیاں بیگم نے ترپ کا پتا پھینکا تھا اور شکست ہر آن اُن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ عافیہ بانو نے یک ٹک بچی کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”سلیم! چلیے، آپ کی محبت قید تو نہیں ہے، آزادی کا لمس ہے میرے لئے، جسے میں عمر بھر چکھنا چاہوں گی۔“

سلیم افسر نے عش عش کرتی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا، جو یکدم عظمت کے مینارے پر جا پہنچی تھی۔ جہانیاں بیگم تلملاتی رہ گئیں۔

”میں تمہاری اسی بیٹی سے ایک دن خاک چٹواؤں گی۔ تم اس آدمی پر بھروسہ کر رہی ہو ناں، دیکھنا یہی آدمی تمہیں سارے جہان میں رُسوا کرے گا۔ یہ مرد کبھی کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے، دیکھنا..... دیکھنا تم۔“

وہ چلاّتی رہیں۔ بچی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی۔ مگر عافیہ بانو پھر نہیں مڑیں۔ انہوں نے سن رکھا تھا، سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھو تو پتھر کا ہونے سے کوئی منتر نہیں روک سکتا۔ وہ پتھر کی ہونے سے بچ گئی تھیں مگر ایک بھاری پتھر تھا جو سینے میں دل کی جگہ رکھ کر وہ اس نئے سفر پر نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ نیا سفر جو کسی بھی طرح کا نیا اور انوکھا سر پرائز ان کی جھولی میں ڈال سکتا تھا مگر ان کے ساتھ چلنے والے مرد نے قسم کھائی تھی اس کی نم آلود ممتا کی کہ وہ اس عورت کو کبھی اپنے نام کا کوئی دکھ نہ دیں گے۔ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہاتھ کو انہوں نے بھینچ لیا تھا اور......

”کیا ہے سلیم! آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی۔ میں کب سے رکھ گئی ہوں۔ ٹھنڈی ہو گئی ہوگی اب تو......“

یکدم وہ آواز انہیں اتنے قریب سے سنائی دی کہ وہ ہڑبڑائے بنا نہیں رہ سکے۔ انہوں نے ان آنکھوں کی طرف دیکھا، جنہیں کبھی مسکراتے رہنے کی دعا دی تھی۔ وہ آنکھیں..... وہ آنکھیں ان پر ہی مرکوز تھیں۔

”کیا ہو گیا، اتنی محویت سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا پہلی بار ملے ہیں ہم؟“

سلیم افسر کی آنکھوں میں شوخی بھر آئی۔ وہ اُٹھ کر کام کرتی عافیہ بانو کے قریب جا کھڑے ہوئے، پھر جذبے سے بولے۔ ”تم سے جب ملتا ہوں، یونہی لگتا ہے، پہلی بار مل رہا ہوں۔ اور وہ فاروق ہے، وہ میری ایسی باتوں کا خوب ریکارڈ لگاتا ہے۔ کہتا ہے، جوان بچوں کا باپ ہو گیا ہوں، دو بیٹیوں کو بیاہ چکا ہوں، نانا بھی بن گیا ہوں مگر محبت کے معاملے میں مجھ میں ابھی تک میچورٹی نہیں آئی۔“

عافیہ بانو ہنسنے لگیں، پھر مسکرا کر بولیں۔ ”فاروق بھائی جو بھی کہتے ہیں، آپ کو ستانے کے لئے کہتے ہیں، ورنہ بہرحال آپ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ کبھی کبھی محبت میں امیچور پاسز، محبت کا اظہار برا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اظہار آپ کے جیون ساتھی کی طرف سے ہو تو... دل نئے سرے سے دنیا جیت لینے کی ہمک کرنے لگتا ہے۔ مگر آپ...... آپ نہیں سمجھیں گے یہ۔“

سلیم افسر نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر خمار سے کہا۔ ”آخاہ! تو میں یہ نہیں سمجھوں گا، میں جو محبت میں ناک تک ڈوبا ہوا ہوں اور کنارے کی حسرت تک کرنا محبت کی شان میں گستاخی سمجھتا ہوں۔“

عافیہ بانو بلش ہوگئی تھیں۔ پھر قدموں کی آواز محسوس کر کے گڑبڑا کر بولی تھیں۔ ”چھوڑیں بھی، بچے اب بڑے ہوگئے ہیں۔“
سلیم افسر نے عافیہ بانو کے ہاتھ چھوڑ دیئے، پھر مسکرا کر بولے تھے۔
”کیا ہے یار بیوی، اتنا اچھا موڈ بن رہا تھا مگر تم نے بچے درمیان میں لاکھڑے کئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟ ان کے بڑے ہونے کا غنڈہ ٹیکس ہم اپنی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ کر کیوں دیں؟“
”آہا، معصوم...... معصوم خواہشات...... مجھ پر سب روشن ہے آپ کی معصومیت۔“
سلیم افسر کا قہقہہ خوب جاندار تھا۔ عافیہ بانو بھی مسکرا رہی تھیں، جب کچن کے سامنے انوشے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔
”کیا آج کھانا ملے گا مام؟“
”کیوں نہیں بیٹا! ابھی پانچ منٹ میں سرو کرتی ہوں۔ آپ اور دائمہ مل کر ٹیبل پر چیزیں پہنچا دیجئے گا۔“
سلیم افسر نے انوشے کے چہرے پر ناپسندیدگی کا عنصر دیکھا، سو فوراً بدمزگی سے بچنے کے لئے بولے۔ ”رہنے دو بیٹا آپ۔ میں ٹیبل پر کھانا سرو کرنے میں آپ کی ممی کا ہاتھ بٹا لوں گا۔ آپ بس مراد اور دائمہ کو کھانا کھانے کے کمرے میں آنے کا کہہ دیں۔“
انوشے تیزی سے پیر پٹختی ہوئی انہی قدموں پر لوٹ گئی۔ سلیم افسر اسے جاتا دیکھتے رہے، پھر آہستگی سے بولے۔ ”جب سے اس کی شادی ناکام ہوئی ہے تب سے یہ بہت چڑچڑی نہیں ہوگئی عافیہ؟“
عافیہ بانو خاموشی سے سر ہلا کر انہیں دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ تبھی سلیم افسر نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔
”میں جانتا ہوں، انوشے کی شادی کی ناکامی خود اس کی متلون مزاجی اور بدمزاجی کے باعث ہوئی ہے۔ مگر یار بیوی! وجہ کچھ بھی ہو لڑکی اس حادثے پر بکھر کر رہ جاتی ہے۔ اب ہمیں ہی مل کر اسے سنبھالنا ہے۔“ لمحہ بھر کو وہ رکے، پھر مزید بولے۔ ”یہ طے ہے، انسان کی ساری اولاد ایک جیسی نہیں ہوتی، سب فرماں بردار ہوں تو خدا کیونکر یاد آئے گا۔ بس سمجھو! ہمارے اور خدا کی یاد کی یہ ایک کڑی ہے۔“
عافیہ بانو نے کندھے پر ہاتھ مارا، پھر مصنوعی خفگی سے بولیں۔ ”اب اتنی بری بھی نہیں ہے میری بیٹی۔ ہاں بس کچھ لاپروا اور ضدی ہے اور بس۔ رہا شادی کی ناکامی کا حادثہ تو یہ تو تقدیر ہے، جو لکھا ہوتا ہے وہ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ سب اسباب خود بخود تیار ہو جاتے ہیں، اس لئے اُمید رکھنی چاہئے، ہماری بچی کی زندگی میں خوشیوں کا نیا موڑ بہت جلد آئے گا۔ تمہیں نہیں پتہ لیکن علینہ بھی اس کی وجہ سے بہت

پریشان رہتی ہے۔"
سلیم افسر سر ہلا کر چیزیں اٹھا کر کچن سے ملحق کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ دائمہ اور مراد نے باپ کو کام کرتے دیکھا تو تیزی سے اٹھ گئے۔
"آپ بیٹھیے بابا! کھانا ہم دونوں مل کر لگا لیتے ہیں۔"
انوشے نے ناک سکوڑ کر دونوں کو دیکھا، پھر بڑبڑائی۔ "ہونہہ، گڈ بک میں آنے کی حسرت......" پھر چڑ کر بولی۔ "بابا! کیا ہم اتنے غریب ہیں کہ نوکر رکھنا افورڈ نہیں کر سکتے؟ جتنا بزنس آپ کا ہے، اس سے کم تنخواہ والے ملازمت پیشہ ماں باپ کی اولاد کے گھر دو، دو میڈز ہیں۔ مگر ہم ایک میڈ بھی نہیں رکھ سکتے۔ سارے فرینڈز اسکول میں کتنا مذاق اُڑایا کرتے تھے، اگر مجھے آپ خود اسکول چھوڑنے نہ آیا کرتے تو میری فرینڈز کو میری امارت پر شک ہی رہتا، مگر...... بابا! ہم نوکر کیوں نہیں رکھ سکتے؟ مجھے یہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"
سلیم افسر نے بیٹی کی گفتگو اور چڑا ہوا سوال سنا، پھر چاہا کچھ کہیں بھی اس کے جواب میں کہ دائمہ نے ان کی طرف سے پوزیشن سنبھال لی، پھر مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے بجو! مما کو ملازم رکھنا اچھا نہیں لگتا۔ انہیں لگتا ہے، ملازم رکھ کر ہم وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں گنوا دیتے ہیں جو ہمیں ڈھیر سارا سکون اور محبت میں مزید باندھ کر ایک نئے طرح سے جینے کا کمال بخشتی ہیں۔ مما کو ہمارے لئے کام کرنا اچھا لگتا ہے بجو!"
سلیم افسر مسکرا کر دیکھنے لگے۔ مراد بھی اس سے متفق تھا مگر انوشے، وہ یکدم کھڑے ہو کر چیخی تھی۔
"مما کو یہ کام کرنا اچھا لگتا ہے تو پھر مما ہی کو یہ نوکر بازی نبھانا چاہئے۔ وہ آخر ہم سے یہ توقع کیوں رکھتی ہیں کہ ہم ان کی طرح کی زندگی جینے کی تمنا کرنے لگیں۔ دانیال سے بھی میری ان ہی باتوں پر لڑائی ہوتی تھی۔ وہ...... وہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا تھا مگر پھر بھی اسے مشرق کے تعلقات، محبت کی کہانیاں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ مشرق...... مائی فٹ۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی، بھنّا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔
مراد، دائمہ اور عافیہ سلیم افسر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماحول یکدم نا خوشگوار ہو گیا تھا۔ سلیم افسر کو گھر کا موسم سنبھالنا تھا، سو ہنس کر بولے۔ "روز ہونے والی باتوں پر اس طرح نہیں چونکا کرتے۔ چلیں عافیہ! کھانا شروع کرتے ہیں۔ مراد! دائمہ! بیٹھیں آپ۔"
ان کے کہنے پر سب اپنی کرسی سنبھال کر بیٹھ گئے تھے مگر عافیہ بیگم...... ماں نہ سہی، ماں بن کر ہی انہوں نے انوشے کو پالا تھا۔ پھر بیٹی کے بھوکے رہنے پر حلق سے نوالہ کیسے اُترتا۔

”آپ کھانا شروع کیجیے، میں انوشہ کا کھانا اس کے کمرے میں دے کر آتی ہوں۔ بچی دو گھنٹے سے بھوک بھوک کر رہی ہے۔“

سلیم افسر نے آنکھوں سے منع کرنے کی جو کوشش کی، اسے انہوں نے ملائمت سے برابر کر دیا تھا۔ ”پلیز سلیم! میری بات سمجھئے۔ میں کہنا چاہتی ہوں، بچے اگر شور شرابا نہ کریں تو گھر اور قبرستان میں کیا فرق رہ جائے گا۔“

سلیم افسر نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ وائمہ اور مراد ماں کی محبت پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ بیگم عافیہ ٹرے میں کھانا لے کر انوشے کے کمرے میں گئی تھیں، مگر دروازہ کھول کر جو کچھ پہلی نظر میں انہوں نے دیکھا، وہ انہیں ہراساں کرنے کے لئے کافی تھا۔ انوشے یوں دروازہ کھلنے پر خود بھی ہونق ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کی بھوک کی کسے پرواہ ہوگی مگر عافیہ بیگم کو دیکھ کر ایک سایہ اس کے چہرے پر لہرا کر رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ عافیہ بیگم کچھ کہتیں، اس نے چور ہوتے ہوئے بھی الٹا کو توال کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔

”اگر تم اچھی سوسائٹی میں اُٹھتی بیٹھتیں مام! تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دروازے پر دستک ضرور دے لیتے ہیں۔ مگر نہیں، ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی عادت تمہیں کہیں کا نہیں رکھے گی۔ لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ کنوئیں کا مینڈک اگر تالاب میں چلا جائے تو بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔“

اس نے جان کر ڈرگ انجکشن کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ سلیم افسر اس کی بدتمیزی کے پہلے ہی منتظر تھے، سو اس کی چیخ پکار پر کھانا چھوڑ کر عافیہ بیگم کی پشت پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

”انوشے! تمہیں ماں سے بات کرنے کی تمیز کیوں نہیں آتی؟“

”سلیم! پلیز رہنے دیں۔“ عافیہ بیگم نے بات ختم کرنے کے لئے مدھم لہجہ اپنایا مگر مسٹر سلیم جو پہلے سے ہی اس کے رویے پر پیچ و تاب کھا رہے تھے، بالکل آؤٹ ہو گئے۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو، کیا دھرا ہے تمہارے اندر؟ کوئی خوبی ہے تو صرف عافیت کی وجہ سے، اور خامی...... اس پر اترانے والا سب سے بڑا احمق کہلاتا ہے۔ انوشے! تمہیں اچھا گھر، تعلیم سب کچھ دے کر بھی تمہاری شخصیت کو جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے تمہاری ماں یاد آ جاتی ہے۔ تم بالکل اس پر ہی گئی ہو، اسی کی طرح خود غرض، خودسر اور احسان فراموش۔“

”سلیم!“ عافیہ بیگم ماحول کو اتنے خطرناک موڑ پر جاتا دیکھ کر زرد پڑ گئی تھیں اور انوشے نے سامنے رکھا اوزار اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا، پھر چیخ کر بولی تھی۔

”ہاں، ہوں میں اپنی ماں کی جیسی...... کسی کو تو اُس کے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ علینہ بجو کو اس عورت نے اپنے جادو سے اپنی طرح کر لیا، مگر میں اس کے قابو میں نہیں آئی تو اس نے میری ذات ہی ایشو بنا لی

.......نہیں ہے میرے دل میں تمہاری بیوی کی عزت۔ بابا! مجھے تم سے بھی نفرت ہے۔ تم....... تم ہی تو ہو، جس نے میری ماں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا۔ پاکستان....... مجھے پاکستان سے اس لئے نفرت ہے کہ وہاں تمہاری بیوی نے جنم لیا۔ تم نے جنم لیا۔ آئی ہیٹ پاکستان۔ میں کبھی پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

سلیم افسر، جو اس کی باتوں سے گنگ ہو گئے تھے، یکدم کمرے میں در آئے تھے۔ پھر ان کا مردانہ ہاتھ اتنی تیزی سے اُٹھا کہ عافیہ بیگم بھی کچھ نہ کر سکیں۔ انوشے کا گال سرخ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے بیٹی کی طرف بڑھی تھیں لیکن انوشے نے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

"چلی جاؤ تم۔ مجھے معلوم ہے، تمہاری یہی ادائیں میرے بابا کو مجھ سے دور کر رہی ہیں۔ کچھ نہیں لگتی ہو تم میری....... کچھ نہیں۔"

عافیہ بیگم کے دونوں ہاتھ گر گئے تھے۔

سلیم افسر نے انہیں پشت سے تھام لیا تھا، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "اپنے دل پر بار مت لو۔ یہ جو کہہ رہی ہے، سچ نہیں ہے۔ ابھی یہ تمہاری محبت کو سمجھی نہیں ہے۔ جب سمجھے گی کہ تم نے اس کے لئے کیا کیا چھوڑا ہے تو یہ خود سر کے بل چل کر معافی مانگے گی۔ تم آزردہ مت ہو۔ بس پاکستان جانے کی تیاری کرو۔"

"میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔" انوشے پھر سے درمیان میں چیخی، جیسے اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہتی ہو۔

مگر سلیم افسر نے اسے خاص اہمیت نہیں دی۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے بولے۔ "جو یہاں رہنا چاہتا ہے، رہتا رہے۔ لیکن ہم اب پاکستان جا کر سیٹل ہونا چاہتے ہیں۔"

انوشے تیزی سے باپ کے سامنے آن کھڑی ہوئی، پھر بدتمیزی سے بولی۔ "تمہیں یہ پٹی بھی اسی عورت نے پڑھائی ہوگی۔ بابا! تمہیں نہیں پتہ، یہ عورت جادوگرنی ہے، یہ عورت......."

سلیم افسر کا ضبط جواب دے گیا۔ "بکواس بند کرو اپنی۔" انہوں نے ہاتھ بھی اُٹھایا تھا مگر عافیہ بیگم نے التجائیہ کہا تھا۔

"پلیز....... نہیں سلیم! جوان بچوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔"

انوشے نے حقارت بھرا ہنکارا بھرا تھا۔ "بس کرو یہ چاپلوسی۔ مجھے معلوم ہے تم کیا ہو۔ تم میرے بابا کی ساری جائیداد ہتھیانا چاہتی ہو۔ تم بہت بری طرح منہ کے بل گرو گی، سمجھیں۔ میری ماں کی جگہ لے کر تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔"

سلیم افسر، عافیہ بیگم کو کندھوں سے پکڑ کر باہر لے آئے تھے۔ کیونکہ انہیں لگا تھا اگر وہ اور رکے تو پھر ان کے ہاتھ کی تیزی کوئی نہیں روک پائے گا۔

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں آ گئے تھے۔ مراد اور دائمہ سر جھکائے بظاہر کھانا کھا رہے تھے، مگر ان کے چہرے کا خوف بتا رہا تھا وہ اس ماحول سے بہت زیادہ ڈر گئے ہیں۔ ان کے گھر میں اتنی چیخ پکار سے کسی کو بات کرنے کی عادت نہیں تھی، اس لئے انوشے جب جب ہنگامہ کھڑا کرتی، ان دونوں کے چہرے ایسے ہی اتر جاتے تھے۔ سلیم افسر کھانے کے لئے بیٹھ چکے تھے۔ عافیہ بیگم کی تو بھوک اڑ گئی تھی، مگر شوہر کا ساتھ دینے کے لئے وہ ان کی پلیٹ شیئر کر رہی تھیں۔ شروع سے دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھانے کے عادی تھے۔

سلیم افسر نے ماحول کا تناؤ دیکھا تو یکدم عافیہ بیگم کو ایک ہفتہ پہلے کی پاکستان سے آئی ایک کال سے بات شروع کر بیٹھے۔ عافیہ بیگم خالی الذہنی کی حالت میں رہیں تو پھر سے ملائمت سے بولے۔

"بھئی بتاؤ بھی، وہ تمہاری ڈیل کا کیا ہوا؟ فیشن اینڈ اسٹائل کمپنی نے تمہیں اپروچ کیا تھا۔ تم نے ان کی ڈیل کا کیا جواب دیا؟" لمحہ بھر کو رکے، پھر مکر رہو لے۔ "فیشن اینڈ اسٹائل ویسے پاکستان کی سب سے مشہور ملبوسات بنانے والی کمپنی ہے۔ تمہیں انہوں نے تمہارے انگلینڈ میں کئے جانے والے کام کی وجہ سے اپروچ کیا ہے تو یہ سمجھو یہ تمہارے لئے کامیابی کا بہت بڑا مارجن ہے۔ ویسے کمپنی کا اونر کون ہے؟"

عافیہ بیگم نے ایک لمحے کے لئے سوچا، پھر آہستگی سے بولیں۔ "اونر شپ تو مسٹر عبدالرحمٰن کے پاس ہے لیکن مجھے ان کے بیٹے شہریار عبدالرحمٰن نے اپروچ کیا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے، میں کام میں کتنی چوزی ہوں۔ پھر بہت زیادہ شور شرابا بھی نہیں چاہتی۔ مگر یہ دائمہ ہے نا، اس نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے کلیکشن سمیت میری پوری ویب سائٹ بنا دی۔ مجھے علم ہوا تو اس وقت جب شہریار عبدالرحمٰن کا اسی ویب سائٹ کے حوالے سے فون آیا۔ پہلے میرا خیال تھا، میں منع کر دوں گی۔ لیکن اب جب کہ آپ پاکستان جانے کی بات کر رہے ہیں تو پھر میں ان سے میٹنگ رکھ لیتی ہوں۔"

سلیم افسر محبت سے مسکرائے، پھر آہستگی سے بولے۔ "بالکل...... بالکل۔ اپنے ہر کام میں تمہارے پاس فری ہینڈ ہے اور میری خدمات وہ بھی بنا کسی اضافی چارج کے تمہارے لئے ہمہ وقت دستیاب ہیں۔"

بیگم عافیہ کے ہونٹوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا۔ مراد اور دائمہ کھانے کی ٹیبل صاف کرنے لگے تھے، جب اچانک ایک خیال کے آنے پر بیگم عافیہ نے سلیم افسر کو دیکھا۔

"سلیم! کیا واقعی انوشے ہمارے ساتھ نہیں جائے گی؟ دیکھئے، یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی تو یقیناً علینہ کے گھر ٹھہرنے کی کوشش کرے گی۔ آپ تو جانتے ہیں، اسے کوئی بھی کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادت نہیں۔ سو علینہ کے ہاں ٹھہری تو آپ کو معلوم ہے نا مظفر کس طرح کے ماحول کا عادی ہے۔ اگر اس نے وہاں کوئی ہنگامہ کیا تو خوامخواہ علینہ کو پرابلم ہو جائے گی۔ وہ شوہر اور بہن کے درمیان بیلنس رکھنے میں سینڈوچ بن جائے گی۔"

سلیم افسر بیوی کے تجزیے پر مسکرائے تھے، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ ”آپ کو یہ کس نے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ پاکستان نہیں جا رہی؟ دیکھئے، وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کا باپ ہوں۔ سو اچھی طرح سمجھتا ہوں، اسے کس طرح ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔“

”آپ اس پر سختی نہیں کریں گے۔“ وہ ان کے جملے سے جو سمجھیں، اس پر ہی ٹھہر گئیں۔ سلیم افسر نے ان کی ممتا کا حظ لیا، پھر شرارت سے بولے۔

”آپ نے ہی تو کہا تھا کچھ دیر پہلے، وہ عارف سے بہت کلوز ہے۔ پھر اگر ہم عارف کو ساتھ لئے جاتے ہیں، پاکستان کے بزنس کے حوالے سے تو آپ کا کیا خیال ہے، انوشہ اپنے فیصلے پر قائم رہ سکے گی؟“

عافیہ بیگم شوہر کی لاچارگی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکیں مگر ایک سوال انہیں بہت تنگ کر رہا تھا۔ سلیم افسر نے چہرے پر اس سوال کا جال دیکھا تو فوراً انہیں کندھوں سے تھام کر بولے۔ ”جس بات پر آپ پریشان ہیں، وجاہت مجھے بہت سے لوگوں نے پہلے بتا رکھی تھی مگر میں طرح دے رہا تھا، یا شاید اپنے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی خود کو۔ مگر اس لمحے وہ تم سے جس لہجے میں بول رہی ہے، میں نے اس کی آنکھوں کی سرخی سے جان لیا ہے کہ وہ واقعی ایڈیکٹ ہو چکی ہے۔ لیکن یہاں ہمیں قانون اتنی آزادی نہیں دیتا کہ ہم اپنے بچوں کو اپنی من مرضی سے ٹریٹ کریں۔ پاکستان جانے کا خیال صرف اس وجہ سے پختہ کیا ہے کہ وہاں ہزار بکھیڑے سہی، لیکن ماں باپ کی محبت کو قانون کسی حد تک سپورٹ کرتا ہے۔ اچھے ہسپتال وہاں بھی کم نہیں۔ تم بے فکر رہو، انوشہ اس عادت سے چھٹکارا پا لے گی۔ اور رہی اس کی نفرت تو تم دیکھنا، یہی نفرت ایک دن اس کی محبت بن کر تمہیں چھو لے گی۔ چلو، خاطر جمع رکھو اور پاکستان فون ملاؤ۔“

سلیم افسر نے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ عافیہ بیگم ڈائری میں لکھے نمبر کو ڈائل کرنے لگیں۔ چار پانچ دفعہ فون کرنے کے بعد ایک طویل وقفے کے بعد چھٹی دفعہ نمبر ملانے پر اُن کا رابطہ ہو سکا تھا۔

”ہیلو! شہریار اسپیکنگ۔“

بیگم عافیہ مطمع نظر بتانے لگیں۔ دوسری طرف سے شہریار کی گرمجوشی انتہا پر تھی۔

”ٹھیک ہے میم! آپ پاکستان جیسے ہی آتی ہیں، میں آپ سے فوراً ملنا چاہوں گا۔ ویسے اگر آپ تکلف نہ کریں تو ایئرپورٹ سے ہم آپ کو پک کروا لیتے ہیں۔ بلکہ رہائش کا مسئلہ ہو تو وہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔“

بیگم عافیہ نے مسکرا کر اس کی ساری تجاویز شکریے کے ساتھ لوٹا دی تھیں، پھر نرمی سے بولی تھیں۔ ”پاکستان میں میرے شوہر ہو ملنگ سے وابستہ ہیں۔ رہی رہائش تو آپ کے شہر میں ایک بہت خوبصورت گھر بھی ہے ہمارا۔ امید کرتی ہوں، آپ سے مل کر پاکستان سے وابستہ اچھی یادوں میں اضافہ ہو سکے گا۔“

”کیوں نہیں میم! آپ کو ہم کسی بھی طرح مایوس نہیں کریں گے۔“ دوسری طرف سے سلام دعا کے بعد فون رکھ دیا گیا۔
بیگم عافیہ، موبائل آف کر کے مڑیں تو تشویش سے بولیں۔
”پتہ نہیں یہ ٹھیک ہے یا نہیں، مجھے پہلے کی گفتگو اور آج کی گفتگو میں بہت فرق محسوس ہوا ہے سلیم!“
”یعنی کس قسم کا فرق، احترام میں کمی تھی یا........“
بیگم عافیہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا، پھر ہولے سے پکاری تھیں۔ ”آج پہلے کے مقابلے میں شہریار عبدالرحمن کے لہجے میں بہت تھکن تھی۔ بظاہر وہ اپنے اس شکستہ لہجے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر پتہ نہیں، مجھے وہ ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ شاید وہ کچھ بیمار بھی ہے۔“
سلیم افسر اُن کی خیال آرائی پر ہنسنے لگے تھے۔ پھر عافیہ بیگم کو تھام کر بولے تھے۔ ”خدا کا خوف کیا کرو عافیہ! اپنے درد سر کم ہیں جو تم دوسروں کے مسئلوں میں خود کو اُلجھا رہی ہو۔ ہو سکتا ہے، وہ ڈسٹرب ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، شہریار عبدالرحمن بیمار ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ حق قطعی نہیں دوں گا کہ تم غیر کے لئے میری جان کو ہلکان کرو۔“
عافیہ بیگم نے مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھا اور پُر سوچ انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ ابھی انہیں پیکنگ بھی تو کرنی تھی۔ اتنا سارا کام تھا اور وقت نہایت مختصر تھا۔
وقت بہت سارا ہو، تب بھی معلوم نہیں کیوں لگتا ہے، آنے بھی نہیں پاتا ہے کہ گزر جاتا ہے.......



شہریار کی اسموکنگ کی وجہ سے عاطف بیگ کا موڈ یکسر خراب ہو گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمن جانتے تھے، وہ اس پر اپنا غصہ نکالنے کی خواہش کے باوجود جو غصہ نہیں نکال پا رہا تھا تو یہی بات اسے اور تپا رہی ہے۔
”عدیل بھائی! میں ذرا گارڈن میں ہوں۔ کمرے کی گھٹن سے نکلنا چاہتا ہوں۔“ شہریار عبدالرحمن نے اس کی طرف دیکھا، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔
”تم کمرے کی گھٹن سے کیا، ہاسپٹل کی گھٹن سے بھی نکل سکتے ہو۔ تم مصروف آدمی ہو، تمہیں یہاں رُکنا ہی نہیں چاہئے تھا اب تک۔“
عاطف بیگ تلملا کر رہ گیا۔ عدیل عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ تھام کر پُرسکون رہنے کا عندیہ دیا مگر وہ ایسا آؤٹ ہو گیا تھا کہ پھر رُکا نہیں، کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

عدیل عبدالرحمٰن صوفے سے اُٹھ کر اس کے قریب آ گئے، پھر آہستگی سے بولے۔ ”تمہیں اس طرح کا رویہ نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ آخر کو وہ تمہارا پرانا دوست ہے اور تم سے کتنا مخلص ہے، جسے تمہارے آگے کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ تمہارے بعد۔“

شہریار عبدالرحمٰن نے گہری سانس لی، پھر آہستگی سے بولا۔ ”میں ماضی کی ہر چیز بھول جانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں، مگر میں بھول جانا چاہتا ہوں، اور چاہتا ہوں، دوسرے بھی مجھے بھول جائیں۔ مجھے یاد کرنے میں سوائے تکلیف، دُکھ اور خفت کے کسی کو کیا ملے گا؟“

”شیری! یہ مایوسی کی انتہا ہے۔ مجھے لگتا ہے، تمہیں کونسلنگ کی سخت ضرورت ہے۔ تم ڈپریشن کے ایک طرح کے قفس میں آ کر بند ہو گئے ہو۔ حالانکہ زندگی اتنی بھی بری نہیں ہے۔“

اس نے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں ایک طرح کے قفس میں آ کر بند ہو گیا ہوں، لیکن یہ قفس ڈپریشن نہیں، زندگی ہے۔ میرے لئے اس زندگی میں کوئی چارم نہیں ہے۔ زندگی میرے لئے ایک گنبدِ بے در ہے۔ جس میں، میں قید ہوں اور سانس لینے کے لئے ہلکا سا روزن بھی نہیں ہے، جہاں سے میرے اندر کا حبس نکل سکے۔“

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا، پھر محبت سے بولے۔

”زندگی گنبدِ بے در نہیں ہے، یہ صرف تمہارا احساس ہے۔ تم نے دروازے کی طرف پشت کر رکھی ہے اور کہتے ہو اس جگہ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ شیری! زندگی میں سانس لینے کے روزن محبتوں کے رشتے ہیں۔ کیا واقعی تم دنیا میں بالکل اکیلے ہو؟ کبھی تم نے مجھے اپنے دوستوں میں شمار نہیں کیا۔ رابعہ، عائشہ، دانیال، عاطف، بیگ اور میری بیٹی، کیا وہ بھی تمہارے اندر کوئی اُمنگ نہیں جگاتی؟“

شہریار عبدالرحمٰن نے کچھ نہیں کہا۔ دل ایک رائے قائم کر لے تو اس رائے سے ہٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ فوری طور پر تو بالکل ناممکن...... کیونکہ بظاہر یہ نام بہت سارے تھے، جو اُس سے محبت کرنے والے تھے۔ مگر ان کی محبتیں چکھنے میں اُسے ہزار برس کی تنہائی کا مٹی پڑتی تھی، پھر کہیں کوئی اُلفت آمیز ذائقہ دل کو چھوتا تھا۔ زندگی بہت رش تھی، بہت تیز رفتار...... اور یہ زندگی کا اصول ہے، زندگی سے تیز چلنے والے بھی اکیلے رہ جاتے ہیں اور زندگی کی رفتار سے کم چلنے والے بھی تنہا...... تنہائی جیسے محبت کی ذات کی سہیلی ہے، شاید کسی زبان میں محبت کا دوسرا مطلب تنہائی بھی ہوتا ہو......

”کیا سوچنے لگے تم؟...... یقیناً پھر کوئی دل کو پریشان کرنے والا خیال ہی سوچ رہے ہو گے۔“ عدیل عبدالرحمٰن نے اُسے پھر سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی چبھتا ہوا سوال دے پاتا، کمرے کے باہر دستک ہوئی۔

"آجائیے، یہ خانہ بے تکلف ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن کا خیال تھا، شاید راؤنڈ پر آنے والا ڈاکٹر فارمیلیٹی نبھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر جو شخص اندر داخل ہوا عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر اس کے لئے ستائش و محبت ہلکورے لینے لگی تھی۔

"ہیلو مسٹر مامون......!" عدیل عبدالرحمٰن نے سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مامون عبدالکریم نے عہدے کے لحاظ سے انہیں سیلوٹ مارا اور عدیل عبدالرحمٰن مسکرانے لگے۔

"ٹیک ایزی۔ میں یہاں صرف عدیل عبدالرحمٰن ہوں، آپ کے محکمے کا افسر نہیں۔"

مامون عبدالکریم دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے احترام سے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے سر! کہ آپ چھٹیوں پر ہیں۔ لیکن میں تو آن ڈیوٹی ہوں۔ اس لئے یہ میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے اُس کی بات کو تسلیم کیا اور وہ ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر بولا۔ "کیوں شیری کے بچے، بازو کا زخم کم لگنے لگا تھا، جو اتنی خراب چویشن میں ہسپتال میں آ کر پڑ گئے ہو۔ تمہیں پتہ ہے ناں، تمہارے بغیر جم، کلب کہیں مزہ نہیں آتا۔"

اُس کا سی جی مانیٹر ہٹا دیا گیا تھا اس لئے مامون عبدالکریم مطمئن سا ہو کر پہلی فرصت میں اس کے بازو کا زخم دیکھنے لگا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں زخم بھی بہت اچھی حالت میں تھا۔ اُس نے توجہ زخم سے ہٹائی تو اُس کی رپورٹس پڑھنے لگا۔ شہریار عبدالرحمٰن اُسے کافی دیر تک دیکھتا رہا، پھر چھیڑتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہاں کوالیفائیڈ ڈاکٹرز کی کمی نہیں۔ ہاں، تم جیسے آفیسرز کا محکمے میں ضرور قحط ہے۔ اس لئے اپنے شعبے ہی کو ٹھیک سے چلاؤ تو تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔ رہی میری کنڈیشن تو اگر کوئی بری خبر وقوع پذیر ہوئی تو اتنا تو فیمس ہوں کہ ایک کالمی خبر اخبار میں ضرور لگے گی۔ سو پلیز، کوئی نئی بات کرو۔ کیونکہ اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان چہرے دیکھتے دیکھتے میں اب بور ہو گیا ہوں۔"

عدیل عبدالرحمٰن اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس لمحے اُس کے لہجے میں دل کی ہلکی سی بھڑاس کے ساتھ ہلکی سی محبت کے لمس کی خوشبو بھی تھی اور یہ طے تھا، وہ اگر اپنے اندر کی بھڑاس نکالتا رہتا تو اندر کی تپش خود بہ خود ماند ہو جاتی۔

"تم دونوں باتیں کرو، میں ذرا دیکھوں، عاطف کہاں رہ گیا ہے؟"

"عاطف...... عاطف بیگ؟...... کیا وہ بھی یہاں آیا ہوا ہے؟ شیری کی باتوں میں بہت زیادہ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، میں اس کے تذکرے سے اتنا اسے پہچان چکا ہوں کہ پہلی نظر ہی میں

وہ میرے لئے اجنبی نہیں رہے گا۔ مگر حیرت ہے، وہ کمرے کے اندر ہونے کے بجائے کمرے سے باہر کیوں ہے؟"

عدیل عبدالرحمٰن مسکرائے، پھر آہستگی سے بولے۔ "اپنے اس دوست سے ہی پوچھو۔ وہ بندہ دوسرے شہر سے بزنس کے سلسلے میں آیا تھا، پھر بزنس درمیان میں ہی رہ گیا۔ اس کے گرد ہی توجہ لگا کر بیٹھ گیا۔ مگر یہ محترم محبت سے الرجک ہیں کہ ناراض کرتے بے چارے کو خارجی کا مطلب سمجھانے لگے۔ وہ بھی حساسیت میں ید طولیٰ، فوراً غائب۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے خفگی سے عدیل بھائی کو دیکھا۔ یہ تو طے تھا، یہ خفگی ان کے کسی جملے کی وجہ سے نہیں تھی، پھر عدیل بھائی نے دوبارہ دیکھا تو وہ خفگی سے گویا ہوا۔

"اگر میرا دماغ آؤٹ ہو گیا تھا تو کیا وہ رُک نہیں سکتا تھا؟ یہ ضرور تھا، فوراً فرمانبرداری نبھانے نکل کھڑا ہوتا۔ کیا جانتا نہیں ہے کہ ہر تکلیف دہ موڑ پر دوستی اور محبت کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے۔"

عدیل بھائی اس بار ہنس پڑے، پھر اُس کے قریب آ کر اس کا رخسار چھو کر پیار سے بولے۔ "تم....... تم مجھے کسی کم سن بچے کی طرح لگتے ہو۔ جس چیز کی ضد کرتے ہو، ناپسندی میں اسی کو ٹھوکر مارتے رہتے ہو۔ اب بتاؤ تعزیر کس پر لگائی جائے؟"

شہریار عبدالرحمٰن جواب میں کچھ نہیں بولا۔ جو کچھ بھی اس سے کہنے میں سرزد ہوا تھا، یہ وہی کمزور لمحہ تھا، جو ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی آتا ہے۔ ورنہ اس جیسا محبت میں وضع دار انسان ایسے اظہار کے ہر موقع سے جان بچانے ہی میں عافیت سمجھتا تھا۔ مگر یہاں ہاسپٹل آ کر جیسے بہت ساری بد پرہیزیوں کی طرح اس کی زبان، اس کے دل کی طرح اس کے کہنے میں نہیں رہی تھی۔

عدیل عبدالرحمٰن کمرے سے باہر جا چکے تھے اور وہ مامون عبدالکریم کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی خاص خبر ہے تمہارے پاس میرے لئے؟" شہریار نے گہرا سانس لے کر خاموشی کو توڑا تو مامون عبدالکریم ہنسنے لگا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"تم پر الہام بھی اترا کرتے ہیں یا یہ بیماری کا کوئی جادو ہے؟"

"بکواس نہیں، یہ بتاؤ، کیا نئی خبر ہے تمہارے پاس میرے لئے؟" اُس نے سگریٹ کی طرف پھر سے ہاتھ بڑھایا اور مامون عبدالکریم اسے منع کرنے یا روکنے کے بجائے اس سے بھی پہلے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا چکا تھا۔

"تم اسموکنگ نہیں کرو گے۔" شہریار نے سختی سے کہا۔

"کیوں، میں اسموکنگ کیوں نہیں کرسکتا؟ کیا میں نے کبھی تمہیں ڈرنک کرنے اور اسموکنگ کرنے سے منع کیا ہے؟" مامون نے لائٹر بھی اٹھا لیا تھا۔ تب اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوکے، میں اسموکنگ چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔"

"لیکن میں نے تم سے اسموکنگ چھوڑنے کی فرمائش تو نہیں کی۔" وہ حظ لے رہا تھا۔ شہریار جس طرح اُسے الگ نظریے سے دیکھتا تھا، وہ اسی خیال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مت پیو سگریٹ۔ اچھا خاصا بندہ اپھوڑ ہو جاتا ہے۔" اُس نے التجا کی اور اس نے دونوں چیزیں اپنی جیب میں ڈال لیں، پھر تیقن سے بولا۔

"ٹھیک ہے، میں نہیں کرتا اسموکنگ۔ مگر یاد رہے، اب تم بھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔

"تم میری کمزوری سے واقف ہو، اس لئے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ تم جانتے ہو، میں نے کبھی کسی کا آرڈر اپنے اوپر لاگو نہیں کیا لیکن تم......" لمحہ بھر کو رُکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کوشش کروں گا کہ اسموکنگ چھوڑ دوں، لیکن ایک دم سے کوئی بھی عادت بدلی نہیں جاسکتی تم جانتے ہو نا یہ بات؟"

مامون عبدالکریم نے نفی میں سر ہلایا، پھر بولا۔ "میں تمہاری اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ عادت کوئی بھی ہو، بدلی جاسکتی ہے۔" وہ رُکا، پھر شرارت سے بولا۔ "اماں یار! لوگ تو یہاں محبت بدل لیتے ہیں، اور تم ہو کہ تم سے عادت نہیں بدلی جاتی۔"

شہریار اب کچھ نہیں بولا تھا لفظ سارے کہہ چکنے کے بعد وہ اپنی آنکھوں کی طرح خالی ہو گیا تھا۔

"ناراض ہو گئے ہو؟" مامون نے ہاتھ تھام کر چاہت سے پوچھا مگر وہ خاموش رہا۔ مامون عبدالکریم نے کچھ دیر اُسے طرح دی، پھر شرارت سے اسے دیکھا تو کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں پہلے سے کرسی چھوڑ کر اُٹھ جاؤں یا تم کسی نئے طریقے سے مجھے خارجی دروازے کا پتہ اور اس کے استعمال کا طریقہ سمجھاؤ گے؟"

شہریار کے چہرے پر مسکان اُبھری، پھر کب قہقہہ بن گئی، خود اُسے بھی پتہ نہیں چلا۔ مامون نے اُس کے قہقہے کا ساتھ دیا، پھر دونوں کی ہنسی رکی تو شہریار نے کہا۔ "اب بتا بھی چکو تم آن ڈیوٹی ایسی کیا خبر رکھتے ہو کہ فوراً اسپتال بھاگے چلے آئے؟"

مامون عبدالکریم نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر ہولے سے بولا۔ "بکواس مت کرو۔ میرے پاس جو خبر تھی، وہ اتنی بھی اہم نہیں تھی کہ میں یوں دوڑا چلا آتا۔" توقف کیا، پھر بولا۔ "میرا خیال تھا، تمہارے دفتر جا کر تم سے تمہاری شوٹنگ کے بارے میں خبریں ڈسکس کر لوں گا، مگر پتہ چلا صاحب بہادر زرا سا تو تا پال کراس کی پرواشت کرنے ہاسپٹل فوروی پر نکل کھڑے ہوئے۔ ویسے یہ بات بہت بری ہے شیری! تم نے انٹرویو کال کر کے بیماری سے بغل گیری اختیار کر لی۔ ان بے چاروں کا کیا جو ایک اُمید سے تمہارے دفتر کے چکر مار رہے ہیں؟"

"افوہ...... میرے ذہن سے یہ تو بالکل نکل گیا تھا۔ اچھا ہوا، تم نے یاد دلایا۔" اُس نے سینٹرل ریک پر رکھا موبائل اُٹھایا، نمبر پریس کیا، پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "مسٹر راحم! پلیز، ایک نیا نوٹیفکیشن اخبار میں لکھوا دیجئے کہ ہماری ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ہونے والے انٹرویو ملتوی ہو گئے ہیں اور تین چار دن بعد کی تاریخ اناؤنس کر دیں۔ ہاں، ہاں، میں یہاں تین چار دن سے زیادہ نہیں رُک سکتا۔ بے فکر رہو، بستر مرگ نہیں سنبھال کر پڑ گیا ہوں۔ کیا، کون محترمہ ہیں؟ نہیں، پلیز، کسی سے اس طرح کا سلوک نہیں کرو کہ بدتمیزی یا بدتہذیبی کا احساس ہو۔ نہ اتنا میٹھا بنو کہ اقربا پروری کا احساس ہو۔ کہہ دیا ناں، انٹرویو قابلیت کی بنیاد پر ہی ہوں گے۔ ہمیں بہترین دماغ چاہئیں۔ تمہیں معلوم ہے، مجھے کمپرومائز سے سخت چڑ ہے۔" اُس کی آواز میں غصہ آ گیا تھا۔

"کول ڈاؤن، تمہارے لئے غصہ زہر قاتل ہے۔" مامون نے خفگی سے دیکھ کر کہا تھا۔

اُس نے چونک کر مامون عبدالکریم کو دیکھا، پھر لگا اس کے اوراس کی بات کو وہ یکدم نظر انداز کر کے دوسری طرف کی بات کو غور سے سننے لگا۔

"ٹھیک ہے، کراؤ میری بات۔ آخر پرابلم کیا ہے ان کی؟ انہیں میری بات کیوں سمجھ نہیں آ رہی؟" اسپیس آیا اُس کے جملوں میں، پھر اُس نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ "جی کہیے، مس مومنہ! آخر آپ کو میرے منیجر کی بات کیوں سمجھ نہیں آ رہی؟ جی ہاں، آپ نے درست سنا ہے، ہمیں کاپی رائٹر، گرافک ڈیزائنر اور ڈیسک ایڈیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ جی، آپ کا خیال ہے، آپ ان تینوں کاموں میں ماہر ہیں؟ سوری، مجھے کہنے دیجئے کہ آپ میرے پہلے ہی آپشن میں ناکام ہو جائیں گی، کیوں؟ سیدھی سی بات ہے، جو انسان مختلف کاموں میں انرجی ویسٹ کرتا ہے، وہ کوئی ایک کام میں بہترین کارکردگی نہیں دے سکتا۔ میں کہاں ہوں؟ کیا آپ کی اور میری اتنی بے تکلفی ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں؟ جی نہیں، میں اپنے دوسرے دفتر میں مصروف ہوں، مسٹر راحم کو غلط اطلاع ملی ہے میری بیماری کی۔ آپ فون مسٹر راحم کو دیجئے۔"

اُس کا غصہ پھر نقطہ عروج پر تھا۔ دوسری طرف ریسیور راحم کے ہاتھ میں آیا تو وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہیں میری طرف سے یہ اجازت تھی کہ تم میری بیماری کا ڈھنڈورا پیٹو؟ کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ

مجھے دعاؤں کی یا ہمدردی کی اشد ضرورت ہے؟ مسٹر راحم، پلیز! مجھے شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری کرنے والے ورکرز سے چڑ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں، آپ اپنی نوکری پر بحال رہیں تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا کیجئے۔ او کے، گڈ بائے۔"

اُس نے موبائل آف کر دیا۔ ذرا سی بات کرنے سے ہی اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں قطار در قطار دکھائی دینے لگی تھیں۔ ویک نیس حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی مگر اس نے پھر بھی مطمئن انداز میں مامون کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک اُسے شاکڈ کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اُس نے لہجے کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر آواز میں کمزوری نمایاں تھی۔

مامون نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تمہاری ڈاکٹر نواز سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"شاید پچھلے مہینے کی دس تاریخ کو...... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ڈاکٹر نواز نے تمہاری فریش رپورٹس دیکھ کر تم سے کچھ کہا تھا؟"

اُس نے ہولے سے سر جھٹکا پھر آہستگی سے بولا۔ "کم آن یار! کیا ہو گیا، کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ڈاکٹرز تو حواس باختہ کرنے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ جیسے یہ ڈاکٹر صمدانی ہیں۔ دانیا تک کو انجانا پرابلم کا بتا دیا۔ عدیل بھائی اور پاپا تو پھر بھی قابل قبول تھے مگر جازی اور دانیا دونوں کمزور دل کے ہیں۔ انہیں اتنی لمبی ہراسگی میں رکھ کر ڈاکٹر صمدانی نے اچھا نہیں کیا۔"

"لیکن ڈاکٹر نواز نے کیا کہا تھا؟" وہ اپنی پہلی ہی بات پر اڑا رہا تھا۔

"میں نے کہا ہے ناں، میں اسموکنگ چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔ تم مجھ پر کیا جتانا چاہتے ہو؟" اس کا لہجہ اس سے بھی زیادہ کھردرا ہو گیا تھا اور شہریار عبدالرحمٰن ایسے ہر موقع پر نماہو جاتا تھا۔ سو اس بار بھی اس کا لہجہ نرم تھا۔ مامون کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس نے لجاجت سے کہا۔

"تم اور ڈاکٹرز چاہتے تھے ناں، میں ڈرنک اور اسموکنگ چھوڑ دوں، تو میں نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے ناں۔ پھر کیوں سوالوں میں اُلجھ رہے ہو؟"

مامون عبدالکریم نے ترش نظروں سے اسے دیکھا، پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ”تم، اور کسی کی بات اتنی آسانی سے مان لو، ناممکن....... ایک نمبر کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔“ لمحہ بھر کو رکا، پھر اسی لہجے کو برقرار رکھ کر مکرر بولا۔ ”شاید اب تمہاری ڈرنک اور اسموکنگ چھوڑنے اور اپنائے رکھنے سے تمہاری زندگی کے فائدے نقصان میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اس لئے تم چیٹ کرنا چاہتے ہو کہ سب کی مان بھی لو، خوش بھی کر دو سب کو اور خسارے کی خبر..... وہ کسی کے کانوں کان تک بھی نہ پہنچے، ہے ناں، یہی بات ہے ناں؟“

شہریار عبدالرحمٰن کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں مامون عبدالکریم سے چرائی تھیں اور مامون عبدالکریم، وہ اُسے اتنے آرام سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔

”تم مجھے خود بتا رہے ہو یا مجھے ڈاکٹر نواز سے ملاقات کرنی پڑے گی؟“

شہریار نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”انجائنا کریٹیکل سچویشن کی وجہ سے کامیاب بھی ہوتا ہے یا نہیں، اس کی گارنٹی نہیں ہے، سو.......“

”سو کیا؟ تم نے اس بات سے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ تم آسانی سے خود کو موت کے حوالے کر دو گے؟“

”نہیں، بلکہ میں چاہتا ہوں، زیادہ سے زیادہ کام کر گزروں تاکہ وقت اچھا گزرے۔ میں ابھی زندہ ہوں، یہ حقیقت ہے۔ لیکن آپریشن ٹیبل سے واپس زندہ آسکوں گا، اس کی صرف ایک پرسنٹ امید ہے۔ پھر میں ننانوے فیصد امید کو ایک پرسنٹ پر کیوں داؤ لگاؤں؟“

”تم بہت عجیب ہو، بہت زیادہ عجیب....... تمہیں معلوم ہے، اس بار کے انجائنا اٹیک سے تمہارا کیس پہلے سے کہیں زیادہ بگڑ گیا ہوگا۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔ شاید انکل صمدانی بھی آگاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ بابا کی طبیعت کے پیش نظر اس بات کو لیک آؤٹ نہیں کرنا چاہتے اور یہی میرے لئے پلس پوائنٹ ہے۔“

”یعنی تم اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کرو گے؟ ڈوب جاؤ گے سمندر میں، حالانکہ تیرا جا سکتا ہے۔“

”شاید۔ لیکن کنارہ قسمت میں نہ ہو تو تیرنے کی خواہش زندہ نہیں رہ پاتی۔ خیر، ہٹاؤ اس بور ٹاپک کو۔ یہ بتاؤ، تم میرے پاس کسی خاص کام سے آئے تھے کیا؟“

”ہاں، تمہاری صورت دیکھنی تھی اور یہ بتانا تھا کہ تم پر گولی چلانے والے کا کلیو مل گیا ہے۔ بظاہر گولی غیر رجسٹرڈ بندوق سے چلائی گئی تھی، لیکن معاملہ تمہارا تھا اور تحقیقات میرے ذمے، سو تفتیش کرتے کرتے میں بادل خان تک پہنچ گیا۔ پہلے تو وہ مانا ہی نہیں تھا، پھر کچھ مخصوص حربے آزمائے اس نہج پر لے آیا کہ اُس نے با آسانی ہتھیار لینے والے کا حلیہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میری برانچ کے کمپیوٹر سیکشن

میں اس کے بتائے گئے حلیے کا خاکہ تیار کیا گیا، پھر عادی مجرموں سے لے کر سکیورٹی کمپنیز کے امپلائز تک، سب کا بائیو ڈیٹا چیک کیا گیا اور پھر بہت اچانک پتہ چلا، وہ زوار حسن شاہ کا بہت پرانا نمک خوار ہے، جسے گارڈ کے طور پر رجسٹرڈ کروایا گیا تھا۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ زوار حسن کے فارم ہاؤس پہنچ گیا، وہاں میرا خیال تھا، مجھے کافی مشکل پیش آ سکتی تھی، مگر حیرت انگیز طور پر مجرم میرے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے زوار حسن شاہ کا شکریہ ادا کیا اور اُس سے قاتلانہ حملوں کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ شہریار نے اس کے مالک کی عزت و آن بان سے چھیڑ چھاڑ کی تھی، جوان جیسے نمک خوار ملازموں کے لئے ہم قاتل ہے۔ وہ پہاڑی لوگ ہیں، اس لئے عزت اور آن پر جان لینے اور دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ زوار نے بظاہر اس معاملے کو دبا دیا تھا لیکن وہ یہ برداشت نہ کر سکا کہ اُس کا آقا کسی کے سامنے سرنگوں ہو۔ سوپارٹی والے دن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے اُس نے یہ مشکل معرکہ سرانجام دیا۔ اب بھلے اُسے کوئی مارے، پھانسی پر لٹکائے اُسے اس سے کوئی غرض نہیں۔" مامون عبدالکریم نے اُس کے بیان کی کاپی سے اپنے لفظوں میں تفصیل بیان کی۔

شہریار نے اُس کے چپ ہونے پر اُسے خاموشی سے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "مامن! کیا یہ کیس یہیں ختم نہیں ہو سکتا؟ دیکھو یار! وہ ایک معمولی سکیورٹی گارڈ ہے، اُس کے جیل جانے سے اُس کے گھر والے کرائسز میں آ سکتے ہیں۔"

"کرائسز میں آ سکتے ہیں؟" اُس نے اُسے طنز سے دیکھا، پھر غصے میں بولا۔ "تم جانتے ہو، اگر اس کے قاتلانہ حملے کامیاب ہو جاتے تو تم کہاں ہوتے؟ کیا چیریٹی کرنے کو قبر سے آ کر یہاں بازی کر رہے ہوتے؟"

شہریار بے طرح ہنسنے لگا، پھر تھم کر بولا۔ "بُری بات، ایسے نہیں کہتے۔ تمہیں تو معلوم ہے، مجھے چیریٹی کا حالانکہ شوق نہیں ہے، لیکن پھر بھی کسی کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ اب دیکھو، اگر اس کا حملہ کامیاب بھی ہو جاتا تو تم ہی کہو مرے ہوئے آدمی کو مارنے کی سزا تمہارے کس قانون میں درج ہے؟"

"بکواس مت کرو، میرا دماغ گھوم گیا ناں، تو ابھی تمہیں کریٹیکل پوزیشن میں لا سکتا ہوں۔"

"نہیں، مجھے معلوم ہے، تم ایسے نہیں ہو۔ تم نے اس وقت میری بات کا مان رکھا تھا، جب تم مجھے صرف نام کی حد تک جانتے تھے، اب تو خیر سے ہم بہت اچھے دوست ہیں۔"

"بس، بس...... زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔ لیکن پرامس کرو کہ تم بہت جلد ڈاکٹر نواز سے پھر سے کنسلٹ کرو گے۔"

"اوکے...... پہلی فرصت میں، میں یہ کام کر گزروں گا۔" اُس نے اُسے منانے کی کوشش کی۔

مامون عبدالکریم ہاتھ ملا کر کسی سے کھڑا ہو گیا۔ اُسے گئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عدیل بھائی، عاطف بیگ کو لئے روم میں داخل ہوئے۔ عاطف بیگ کے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ یہ تو طے ہے، عاطف بیگ فارمیلٹی سے زیادہ جذبات پر یقین رکھتا تھا۔ وہ گلدستے کے بجائے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا، نہ کہ پھولوں کی خوشبو سے اس احساس کو باندھتا۔ خوشبو تو خوشبو ہے، آزاد رہنے کی چاہ میں رہنے والا احساس...... اپنی مرضی کا مالک، چاہے تو آپ کے دل کی بات کہہ گزرے، نہ چاہے تو خاموش رہ کر اس لمحے کو بے اثر گزرتے دیکھتا رہے۔

"کون آیا تھا؟" اُس نے پہلے سے لہجے میں کہا، جیسے کبھی بدمزگی ہوئی ہی نہیں تھی۔

عاطف بیگ نے گلدستہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سرخ اور پیلے گلابوں سے بنا گلدستہ جس کی پسند تھا، شاید وہ اسے اچھی طرح سے دہرا سکتا تھا۔

"سلامہ آیا تھا؟" عاطف بیگ کی طرف دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

عاطف بیگ "ہوں......!" کہہ کر چپ رہ گیا۔ عدیل بھائی صوفے پر جا بیٹھے اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے بولا۔ "کہہ دیا ناں، سوری۔ اب ضروری ہے، شرمندگی دل میں محسوس کر رہا ہوں تو زبان سے بھی ضرور کہوں۔"

عاطف بیگ نروٹھے پن سے اُسے دیکھنے لگا، لیکن اب انداز میں پہلے سے کم خفگی تھی۔ سو شہریار عبدالرحمٰن نے پھر سے سوال دہرایا۔ "کیا سلامہ ارسلان مجھ سے ملنے آیا تھا؟"

عاطف بیگ نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "پہلی محبت کی نوعیت کیسی بھی ہو، پہلی محبت انسان بھولتا نہیں ہے۔ سو سلامہ صاحب بھی اس جذبے کے آگے ہار گئے۔ مگر مجھ سے ٹکرائے تو بولے، وہ یہاں اپنے کسی آرٹیکل کے ہوم ورک کے لئے آئے تھے۔ پتہ چلا، شہریار بیمار ہے تو اس کے لئے گلدستہ وارڈ بوائے سے کہہ کر منگوا لیا۔ میں نے کہا، شہریار کو پھولوں سے الرجی ہے تو کہنے لگے، اُسے کہنا پھولوں کو گلدان میں سجانے کے علاوہ ڈسٹ بن میں بھی پھینکا جا سکتا ہے، بشرطیکہ، پھولوں کو اس پر احتجاج کی حاجت بھی نہیں ہوگی۔"

شہریار کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ "پاگل ہے، مجھ سے کہیں زیادہ پاگل۔" ہاتھ کے اشارے سے پھولوں کو گلدان میں لگانے کی فرمائش کی۔

عدیل بھائی دونوں کی گفتگو نہایت محویت سے سن رہے تھے، سو عاطف کے چپ ہونے پر انہوں نے مامون کی آمد کی بابت سوال کیا۔ شہریار نے بلا کم و کاست سب واقعہ دہرا دیا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے سنا تو مسکرا کر کہا۔ "یعنی شیر جوان ذہین ہی نہیں، زیرک ترین آفیسر بھی ہے۔ خطروں سے کھیلنے کا شوقین بھی ضرور ہوگا؟"

''جی ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔ بظاہر اس کے پاپا ایک کامیاب سیاست دان ہیں، جاگیرداری بھی گھر کی ہے لیکن پھر بھی وہ آپ کی طرح کا شوقین مزاج ہے۔''

''شوقین مزاج........ بچے! یہ لفظ کافی ذومعنی نہیں ہو گیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے، ہو گیا ہو۔ لیکن جو آپ کو جانتے ہیں، وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ آپ دوسری قسم کی شوقین مزاجی ہضم ہی نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے بندے کو ذرا جگر بڑا رکھنا پڑتا ہے۔''

''اچھا جی، ہمیں چیلنج........ تمہیں معلوم ہے، جب میں بھوکا ہوتا ہوں تو سنک ہی جاتا ہوں۔ اگر اسی سنک میں شوقین مزاجی پر اتر آیا تو........؟''

''تو رابعہ بھابی کو صرف ایک فون کرنا کافی ہوگا، آپ کی ذہنی رو واپس لوٹ آئے گی۔''

''بچہ! جانتا ہے کمزوری۔ ہوں، بری بات ہے۔ کسی کی کمزوری سے نہیں کھیلتے۔''

وہ موڈ شوخ کر کے بظاہر بے ضرورت بول رہے تھے، مگر شہریار جانتا تھا، یہ سب محض اُس کی تنہائی کو دور کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''دانیا ابھی تک نہیں آئی۔ ڈیڑھ بج گیا ہے ماں۔'' اُس نے عدیل بھائی اور عاطف بیگ کی بھوک کا خیال کر کے سوال کیا اور عاطف بیگ مسکرانے لگا۔

''میری دانیا سسٹر سے بات ہوگئی ہے۔ وہ گھر سے نکلنے ہی والی تھی۔''

شہریار دل کھول کر ہنسا، پھر شرارت سے بولا۔ ''یہ یقیناً عدیل بھائی کی بھوک کی بے صبری ہوگی ہے ماں؟''

عدیل بھائی شرمندگی سے مسکرائے، پھر ہولے سے بولے۔ ''تم ٹھیک سمجھے۔ یہ میری نہیں میری بھوک کی بے صبری کا شاخسانہ ہے۔ اس لئے میں بری الذمہ ہوں ہر طرح کی تنقید سے۔''

''واہ........ آپ تو کسی ماہر پولیٹیشن کی طرح بیان داغنے پر اتر آئے۔'' عاطف نے مسکرا کر شہریار کی بات کا حظ لیا مگر ایک انجانی سی فکر تھی، جو اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھی۔ پتہ نہیں، اُسے کیوں لگنے لگا تھا، جیسے وقت کہیں بہت تیزی سے نکل گیا تھا اور اب صرف وقت کا اپنے ہونے کے واہمے کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ اس کی آنکھیں بظاہر شہریار پر تھیں مگر دل........ واہمہ میں اٹک گیا تھا۔



دانیا نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ سب سے پہلا ماں سے ہی ٹکراؤ ہو گیا۔

"کرلی اس خبیث کی تیمارداری؟......مل گیا تمہیں اور عدیل کو انعام؟ یا ابھی کوئی خاص تقریب ہوگی، جس میں تمہیں میڈل لگائے جائیں گے؟"

"پلیز نانو! اتنی سفاکی کا مظاہرہ مت کیا کریں۔ وہ میرا بھائی ہے، اُس کی پروا کرنا میرا فرض ہے۔" اُس نے قدم روکے نہیں اور حیرت انگیز طور پر نانو بھی صرف کہہ سن کر نہیں رہ گئیں بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اُس نے جانے کیا سوچا، کھنکار سے بولی۔

"نانو! پرہیزی کھانے پکانے میں آپ بہت ماہر ہو۔ پلیز، شیری بھائی کے دوپہر کے لئے کچھ بنا دیجئے۔"

نانو نے ناک سکوڑی۔ پھر تنفر سے بولیں۔ "اے، باؤلی ہوگئی ہو کیا؟ میں اور اُن کے لئے پرہیزی کھانا چڑھاؤں؟ زہر نہ دے دوں اُسے؟"

"نانو، پلیز! آپ جانتی ہیں، میں شیری بھائی کے متعلق کوئی کمنٹ نہیں سن سکتی۔"

"چاہے اُس کی وجہ سے خود تمہارا کتنا ہی نقصان ہوجائے؟" نانو نے ترشی سے پوچھا۔

اُس نے گہری سانس کھینچی، پھر آہستگی سے بولی۔ "جو نقصان ہوچکا، اُسے کیا بار بار دہرانا۔ آپ بھول کیوں نہیں جاتیں کہ میری کبھی منگنی بھی ہوئی تھی؟"

"اے ہے، کیسے بھول جاؤں؟ کیا لڑکیاں گھر میں بٹھا کر رکھنے والی چیز ہیں؟ تم سے کیا پایا تو من مانی کر گزر رو یا ضد کرلی ہے تو کوئی اور موقع لے کر گھر بسالو، کب تک میری ورا پنی ماں کی نیندیں حرام کرتی رہوگی؟"

دانیا کچھ نہیں بولی، کچن کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ اُس نے ملازمہ کو بلا کر پرہیزی کھانے کے ساتھ چکن کارن سوپ کا حکم بھی دے دیا تھا۔ اُس کا ارادہ شاور لینے کا تھا، سو وہ کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ پھر پندرہ منٹ بعد وہ اپنے بال تولیے سے سکھا رہی تھی کہ اُس کے کمرے میں ہلکی سی دستک کے ساتھ جازی عبدالرحمٰن داخل ہوا۔

"جازی! تم......؟ تم کالج نہیں گئے؟ میں تو تمہاری غیر موجودگی سے یہی سمجھی تھی کہ تم کالج میں ہوگے؟"

جازی عبدالرحمٰن خاموشی سے صوفے پر آکر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کالج گیا تھا، مگر پھر دل بے چین ہوا تو کلاسیں بنک کر کے گھر آگیا۔ ویسے مسٹر افضل آپ کی چھٹی سے خاصے اپ سیٹ تھے۔ بقول اُن کے، آپ سے زیادہ اچھی آئی آر کلاس کوئی لے ہی نہیں سکتا، سو دو دن سے مختلف ٹیچرز آزما کر اب وہ اپ سیٹ ہیں۔"

دانیا نے پُرخیال انداز سے اُسے دیکھا، پھر ہولے سے بولی۔ "یہ صرف مسٹر افضل کا حسنِ ظن ہے مجھ پر، ورنہ میں، جو ابھی اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائی تھی، مجھے لیکچررشپ کی آفر کرنا اُن کے ہی دل

گروپ کا کام ہے۔ میں نے کتنا کہا، ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کی آفر ایکسیپٹ کروں گی مگر وہ بھی ضد کے پکے تھے، فوراً پینل گروپ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا، پھر اعتماد سے بولے، اس لڑکی کا آپ جس طرح چاہیں امتحان لے سکتے ہیں۔ یہ لڑکی کم عمری کے باوجود ہم سب سے زیادہ بلیغ نظری رکھتی ہے۔ اس کے نوٹس، اس کی لگن ایسی ہے کہ سراہی جائے، سو یونیورسٹی میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ یہ نئی ذمے داری میرے سر آ گر رہی۔ اب یہ ان کی محبت ہی ہے کہ میں ان کے کالج کے ساتھ ہی ساتھ ان کی یونیورسٹی میں آنرزی آئی آر کلاس بھی لے پا رہی ہوں، مگر یہ تو طے ہے، میں کچھ بھی کر رہی ہوں، وہ اتنا اہم نہیں، جتنا میرے لئے میرے شہریار بھائی اہم ہیں۔"

"شیری بھائی......ہونہہ، آپ کو تو دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ ورنہ کیا رکھا ہے اُن کی شخصیت میں؟ انسان کی پوری سائیکی میں کردار اہم ہوتا ہے۔ ان کے پاس کردار ہی کی دولت مفقود ہے، پھر بھی آپ کہتی ہیں، آپ کو شیری بھیا سے زیادہ اہم کچھ نہیں لگتا۔"

"ہاں، مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ میں تمہاری طرح لمحوں میں اپنی رائے نہیں بدلتی، نہ ہی میری محبت سطحی ہوتی ہے کہ خامیاں اور برائی دیکھ کر راستہ بدل لوں۔ جازی! سچی محبت ہمیشہ محبت رہتی ہے، کبھی نفرت نہیں بنتی۔ صرف سطحی محبت کا چلن ہے یہ کہ سرد گرم دیکھ کر راہ بدلے۔"

جازی استہزاء سے ہنسا، پھر کڑواہٹ سے بولا۔ "مجھے تلقین کر رہی ہیں۔ حالانکہ آپ خود بھی اس کیٹگری سے کیا وہ دور تو نہیں۔ ماموں عبدالکریم کا ایشو ابھی اتنا پرانا تو نہیں ہے۔"

دانیا عبدالرحمٰن نے تیزی سے پلٹ کر جازی عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "ماموں کا موضوع پاپا، عدیل بھائی اور شہریار بھائی کی مرضی کا نام ہے۔ میں صرف اس کے ساتھ دو تین بار سے زیادہ کہیں نہیں گئی اور اس سے ملتے ہوئے بھی میں نے ہمیشہ یہ جتایا ہے اُسے کہ میں محبت صرف حمزہ سے کرتی ہوں، اُس کی اور میری پسند و ناپسند میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ کہ میں اُسے حمزہ کا مقام کبھی نہیں دے سکتی۔"

جازی عبدالرحمٰن صوفے سے اُٹھ کر یکدم اُس کے قریب آ گیا، پھر ہولے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولا۔ "آپ حمزہ بھائی کو اتنا پسند کرتی ہو تو اپنی مرضی سے جینے کا ایک مارجن کیوں نہیں لیتیں؟ چھوڑیئے، شیری بھائی کی ناپسندیدگی کا ڈر، وہ تو ایسے ہی ہیں، اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیتے آ رہے ہیں تو صرف آپ پر۔ آپ اُن کی بے حسی سے کم واقف تو نہیں۔"

"جازی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم شیری بھائی کے لئے اتنی نفرت سے کیوں سوچنے لگے ہو؟......کس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے ہو؟ نانو یا سالار بھائی یا ماما؟"

جازی عبدالرحمٰن نے کندھے اچکائے پھر بے پروائی سے بولا۔ ”اگر میں آپ کے گنوائے گئے ناموں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتا بھی ہوں تو یہ فطری عمل ہے۔ ہاں، آپ کو اعتراض ہے تو صرف یوں کہ یہ لوگ آپ کے بارٹ فیورٹ بھائی کے خلاف سچ بولتے ہیں اور سچ کبھی کسی کو پسند نہیں آتا۔ پھر آپ کو کیسے پسند آ سکتا ہے؟“

”سچ……کیا ہے سچ؟ میں بھی تو سنوں۔“ وہ بالوں میں برش کرتے کرتے بیڈ پر بیٹھ کر اُسے محویت سے تکنے لگی۔

”سوری! آپ کو سچ پسند نہیں آئے گا۔“ اُس نے کنی کترائی اور روانیا عبدالرحمٰن نے رعب دکھایا۔

”بتاؤ جازی! تم کس سچ کو سچ سمجھ رہے ہو؟……میں بھی تو جانوں، تمہاری سورس کہاں تک ہے؟“

”میں اور میری سورس کی حیثیت ہی کیا، لیکن اتنا عمل ہے کہ میں آنکھوں پر خودساختہ پردے نہیں ڈال کر رکھتا۔ میں اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہوں، اپنے دماغ سے سوچ سکتا ہوں۔ میرے دماغ کو کسی نے ٹریپ نہ کیا۔“

”اوکے، میں نے مان لی تمہاری یہ بات۔ اب بتاؤ تمہارا سچ کیا ہے؟“

”یہی کہ جاناں کوئی عام لڑکی نہیں، سوسائٹی گرل ہے۔ اُسے محبت بدلتے رہنے کا شوق ہے۔ کل تک میں سمجھتا تھا، شیری بھائی نے کسی بہت اچھی لڑکی کا دل دُکھایا ہے، مگر اب میں جان چکا ہوں، شیری بھیا جس قسم کی محبت ڈیزرو کرتے تھے، وہی ان کا نصیب بنی ہے۔ جتنی بدنامی اس نام سے اُن کے حصے میں آئی، مجھے اس پر اعتراض نہیں لیکن اس کی وجہ سے جو ہماری فیملی نے تکلیف دہ دور کاٹا، وہ بھولنے کی چیز نہیں۔ میں اُن سے دور تھا تو کسی قدر رباتوں کے پھیر میں اٹکا ہوا تھا۔ مجھے اُن کی باقی سب سے زیادہ اپنی طرف جھکاؤ والی محبت خوش نصیبی لگتی تھی۔ وہ جب میری برتھ ڈے وش کرنے میرے ہاسٹل ہر سال چپکے سے پہنچ جاتے تو مجھے اُن پر ڈھیروں پیار آ جاتا۔ مجھے لگتا، دنیا میں شیری بھائی سے زیادہ کوئی اچھا، پیار کرنے اور پروا کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے پاپا سے بھی بڑھ کر لگتے۔ جب میرے دوست مجھے کہتے، تمہارے بھیا بہت ڈیشنگ، بہت لونگ ہیں تو میں ایسے اتراتا پھرتا جیسے یہ سب میری تعریف ہو۔ مجھے اُن کے محبت کے چھوٹے چھوٹے اظہار اور ڈھیر ساری خاموشی اٹریکٹ کرتی۔ مجھے لگتا، انہیں آج تک کسی نے ٹھیک سے جج ہی نہیں کیا ہے……میں جب گھر چھٹیاں گزارنے آتا اور ان کی گھر سے غیر موجودگی کو ماما نو، ماما ہنی بھائی معنی پہنانے کی کوشش کرتے تو میرا دل کرتا، میں ان سب سے لڑ جاؤں۔ میرے شیری بھائی ڈرنک کے عادی نہیں ہو سکتے، سوسائٹی گرل ٹائپ افیئر نہیں کر سکتے، فلرٹ اُن کی شخصیت کا خاصہ نہیں ہو سکتا۔ میرا دل چاہتا، میں چیخ چیخ کر ان کی وائٹ کالر پرسنالٹی کے

لئے ہر ایک سے لڑ جاؤں مگر میں کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کرنے کے قابل عمر نہیں رکھتا تھا اس لئے ساری چھٹیاں میں اُن کا سایہ بنا رہتا تا کہ اُن کے پاس میرے حوالے سے بہت اچھی یادیں ہوں۔ وہ تنہائی پسند دکھائی دیتے تھے بجو! اور میرا دل کرتا تھا، میں اُن کی اس تنہائی کو باتوں سے بھر دوں، اُن کا اتنا خیال رکھوں کہ اُن کے دل میں ہلکی سی مایوسی کا شائبہ تک نہ پیدا ہو۔ لیکن میں غلط تھا اپنی توجہ کو ایک غلط انسان پر لٹا رہا تھا۔ یہ تو میں اب جانا ہوں کہ وہ جو مایوسی، تنہائی کا اسٹائل مارتے تھے تو اُس میں اُن کی ہمدردی سمیٹنے کی خواہش کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ وہ جذبات سے کھیلنے کے کتنے عادی تھے کہ پھر وہ کسی پر بھی اپنی یہ مہارت آزما سکتے تھے، چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں، جو اُن کو اپنا خاص سمجھتا تھا اور خود کو اُن کا خاص مانتا تھا۔" وہ چپ ہو کر ایک دُکھ میں ڈوب گیا۔

دانیا نے اُس کے کاندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا تو جیسے رُکی ہوئی بات پھر سے دُکھی زبان میں بجنے لگی۔

"پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شیری بھائی زندگی کو کس حد تک مذاق کے سوا کچھ نہیں سمجھتے، ایک کے بعد ایک نئی لڑکی، نام اور محبت بدل جاتی ہے، بس رہ جاتے تو وہی تنہائی اور خود ساختہ بے چارگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے شہریار عبدالرحمٰن...... بجو! سنی بھائی سے کل ہی میں نے دل کا غبار نکالنے کے لئے اپنے دل کا کتھارسس کیا تو انہوں نے میرے دل کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا۔ آپ کے سامنے بھائی اور جانانہ کی فیک قسم کی منگنی کی تقریب کا حال بھی بھلانے کے لائق تو نہیں۔"

دانیا نے اس خیال سے مرچیں سی آنکھوں میں بھرتی محسوس کیں، مگر کمال مہارت سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے نہیں دیئے۔

جازی اس بات کو کہہ کر شاید اسی لئے رکا تھا کہ اس کے دل کی بھڑاس سے اپنے دل کی بھڑاس کو مہمیز کرے گا۔ مگر دانیا اسی طرح پُرسکون تھی۔ بس اسی بات نے اُس کا پارہ چڑھا دیا، سو اس بار اُس کا لہجہ پہلے سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔

"بجو! وہ لمحات یقیناً کسی عقل مند ذی روح کے لئے اپنی سمت درست کرنے کا بہترین موقع تھے۔ مگر آپ اتنی بڑی انسلٹ بھول گئیں۔ آپ کو نائمہ بجو یاد نہیں آئیں، جو جانانہ کے فریب کا شکار ہو کر آج تک لاپتہ ہیں؟ آپ کو زہرہ بجو کا ٹوٹا گھر بھی یاد نہیں رہا؟ آپ کو وہ سارے مواقع بھی بھول گئے، جو جانانہ نے خود ساختہ منگنی کی سزا کے طور پر ہماری فیملی پر آزمائے۔ خبروں میں نکلنے والی وہ ساری چھوٹی بڑی بدنامیاں، جو آپ نے بلکہ سارے گھر والوں نے مجھ سے چھپائیں، وہ سب آپ کیسے بھول جاتی ہیں؟ پہلے مجھے سب کا رویہ شیری بھائی کی ذات کے لئے برا لگتا تھا، مگر اب میں جان گیا ہوں کہ سب انہیں میری طرح بہت اچھے سے جان گئے تھے، اس لئے اُن کی کارکردگی کے مطابق انہیں ریگارڈ دیتے تھے۔"

''جازی! اسٹاپ اِٹ۔ تم چھوٹے بڑے کی تمیز بالکل ہی بھول گئے ہو کیا؟''

''مجھے اپنی حدود کا اندازہ ہے بجو!...... بس آپ پتہ نہیں کب اپنی آنکھوں کی پٹی اُتاریں گی؟''

دانیا کچھ نہیں بولی۔ اُس نے کندھے پر دوپٹہ پھیلا کر کچن کا رخ کر لیا تھا، جہاں تینوں ٹک ہیڈ کُک کی نگرانی میں جلدی جلدی اُس کی مرضی کے مطابق کھانا تیار کرنے میں مصروف تھے۔

''کتنی دیر لگے گی رحیمہ؟''

''بس دس منٹ اور لگیں گے چھوٹی بی بی جی!''

دانیا رحیمہ کے جواب پر سر ہلا کر کچن سے باہر آ گئی۔ جازی کاریڈور میں کھڑا اُس کا منتظر تھا۔ بظاہر اُس کی بہت سی باتوں نے اُس کے دل کو ٹچ کیا تھا، وہ اُسے حق بجانب بھی سمجھتی تھی، مگر شہریار سے اُنسیت اور محبت ان باتوں کے باوجود اپنا راستہ بدلنے پر دل کو آمادہ نہیں کر سکی تھی۔

وہ جازی عبدالرحمٰن کو نظر انداز کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی جا رہی تھی کہ اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی پہلی ٹون میں بولا۔ ''آپ نے کل کہا تھا، جانا نہ نے شیری بھائی کی طرف سے ہم سب کے دل بدگمان کرنے کے لئے کچھ ڈرامے کئے تھے، کیا میں اُن کی تفصیل جان سکتا ہوں؟ اور مزید یہ کہ انہوں نے پانچ سال پہلے کس طرح شیری بھائی جیسے بندے کو برباد بھی کیا تھا، کیا آپ کے پاس اس سلسلے میں بھی کوئی جھوٹی کہانی موجود ہے؟ کیا واقعی آپ کو لگتا ہے، بھائی کو کوئی برباد کر سکتا ہے؟ بھائی جیسے انسان کو، جس نے کتنی ہی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔''

دانیا ہاتھ چھڑا کر تفصیل سے جان بچانا چاہتی تھی کیونکہ اُس کے پاس واقعی کوئی قابلِ ذکر واقعہ موجود نہیں تھا۔ مگر جازی عبدالرحمٰن ٹلنے والا نہیں تھا، اسی طرح تنا کھڑا اس سے پہلے ہی سوال پر اصرار کر رہا تھا۔

دانیا نے پہلے تو کچھ سوچا، پھر آہستگی سے بولی۔ ''جانا نہ نے بھی بھائی کی منگنی کا غلط فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ پبلک پلیس میں تقریبات میں اُن کا جینا دشوار کرنے لگی تھی۔ اعلیٰ سطحی پارٹیز میں، جہاں پاپا، سنی بھائی اور ماما کا جانا بھی ہوتا تھا، وہ جان جان کر وہاں خود کو شیری بھائی کی منگیتر کی طرح شو کرتی تھی۔ پھر جب اسی طرح کی کسی تقریب میں وہ اکیلی کسی نازیبا حالت میں ملتی تو اخبار پاپا کے نام پر کیچڑ اُچھالتے تھے کہ عبدالرحمٰن کی ہونے والی بہو میڈیا کی خبروں میں اِن رہنا جانتی ہے۔ رہی بھائی کو پانچ سال پہلے برباد کرنے کی بات، تو یہ میں نے بزنس پوائنٹ آف ویو کے حوالے سے کہا تھا۔ دراصل وہ بھائی کے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کی جانے والی شاپنگ کے ذریعے بھی ان کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی، بھائی کو جانا نہ سے علیحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ مگر جانا نہ عادت سے مجبور ہے، اب بھی بھائی

کے لئے مشکلات کھڑی کرتی رہتی ہے۔ کہیں نہ کہیں انہیں لیٹ ڈاؤن کرنے کی خواہش اُسے چین سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسڈ کالز، میسجز، خودساختہ ملاقاتیں، یہ سب آج تک جاری ہے۔ ایلیا رحیم کا معاملہ بھی اسی تکلیف دہ صورتِ حال کا شاخسانہ ہے۔"

وہ کہہ کر چپ ہوئی، نظر اُٹھا کر جازی عبدالرحمٰن کا چہرہ دیکھا، وہاں اُسے صرف طنز کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیا۔ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ طنز کیوں ہے، کیونکہ جانتی تھی، وہ پھر سے شہریار کے بخیے اُدھیڑنے میں منٹ نہیں لگائے گا۔ وہ چپ تھی مگر وہ بولنے پر مُصر تھا، پھر کیسے رُکتا؟ اُس نے ہنکارا بھرا تھا، پھر زہریلے لہجے میں بولا۔

"آپ کی کہی ہوئی کسی بھی بات نے شیری بھائی کے لئے کوئی نرم گوشہ وا نہیں کیا۔ بجوا جو کچھ آپ نے کہا، اسے سن کر کوئی بھی ذی ہوش جان سکتا ہے کہ بھیا کا چلن کتنا خراب تھا۔ جو کچھ جانانہ نے ان کے ساتھ کیا، وہ اسے ڈیزرو کرتے تھے اور خود انہوں نے ہی ایسے مواقع دیئے کہ ایک بری عورت نے ہمارے گھر کے سکون کو سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں بھائی کو پہلے ایک اچھا بزنس مین سمجھتا تھا لیکن شہریار بھائی تو اچھے انسان نہیں ہیں، اچھے بزنس مین کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمیشہ نقصان کا سودا کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے گنوایا، پاپا اور ہماری فیملی کو اس کے لئے بہت زیادہ سروائیو کرنا پڑا ہوگا۔ رہا ایلیا رحیم کا قصہ، تو یہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ایلیا رحیم بھی ان بہت سی لڑکیوں میں سے ایک ہے جو شیری بھائی کی میٹھی میٹھی باتوں میں آجانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے، ایلیا رحیم نے بھائی کے ساتھ کیا، کیا تھا؟"

وہ مزے لے لے کر یوں تفصیل بتانے لگا، جیسے یہ کوئی نیا واقعہ تھا، جس سے وانیا واقف نہیں تھی۔ مگر وانیا جانتی تھی، وہ اس طرح حظ لینے میں صرف اپنی اذیت بڑھانا چاہتا ہے کہ وہ کتنے عرصے تک بے وقوف بنتا رہا تھا۔ یہ حالت اچھی نہیں تھی۔ تبھی وانیا نے اُس کا شانہ ہلا کر بدبیل تذکرہ پوچھا۔

"جب شیری بھائی پر حملہ ہوا، سالار بھائی دفتر میں تھے۔ پھر اچانک وہ موقع واردات پر کیسے پہنچ گئے؟"

جازی عبدالرحمٰن اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ واقعی جاننا چاہتی ہے یا صرف اُسے موضوع سے بھٹکانا مقصود ہے؟ اُس کی آنکھیں بالکل صاف تھیں، سو آہستگی سے بولا۔

"بڑے بھیا اس وقت دفتر ہی میں تھے، لیکن کسی نے انہیں فون کر کے کہا تھا، وہ پھر سے جانانہ جیسا ایک نیا راستہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اس معاملے کو یہیں رفع دفع کر سکتے ہیں۔ سنی بھائی آندھی طوفان کی طرح اس معاملے کو بگڑنے سے پہلے سنبھالنے کی نیت سے شارٹ کٹ رش ڈرائیونگ کرتے اُن کے فلیٹ میں پہنچے، مگر وہاں جا کر شیری بھائی کا دوسرا روپ سامنے آیا۔ اس روپ میں

شیری بھائی پہلے سے زیادہ ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ فلرٹ دھونس سے بھی آگے کا راستہ طے کر چکے تھے۔ پہلے اپنی پسند سے لڑکیاں چوز کرتے تھے، مگر اب اُن میں یہ ہوس آگئی تھی کہ اگر انہیں کسی اور کی پسند پر پیار آجائے تو وہ اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کے لئے حد سے گزر جانے کو بھی معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ بھائی نے معاملہ کیسے ہینڈل کیا، یہ آپ جانتی ہیں...... اور کوئی سوال یا سوال نما اُلجھاوا کہ سامنے والا اس اُلجھن میں پڑ کر آپ کے ون اینڈ اونلی گریٹ بھائی کے متعلق رائے کا اظہار نہ کر سکے؟"

دانیا نے گہرا سانس لیا۔ اُس کا خیال تھا، وہ اُس کی باتوں میں آگیا تھا۔ مگر اُس کی غلطی سے وہ اسی بات میں جا کر اٹک گیا تھا، جس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مارنا چاہتا تھا۔ شہریار کی شخصیت پر اُس کی اب تک ایک مضبوط رائے بن گئی تھی، جس سے اُسے ہٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا، وہ اب کچھ بھی کہہ کر جازی کو شہریار کی طرف واپس نہیں لوٹا سکتی۔ سو تاسف سے نظریں جھکا کر اُس نے کمرے کا رخ کیا، پھر آرام سے بیٹھ کر اب تک کی باتوں سے ہونے والا سر کا درد دور بھی نہیں کر پائی تھی کہ عدیل بھائی کا فون چلا آیا۔

اُس نے فوراً نکلنے کا ارادہ کیا اور کار کی چابیاں لے کر کچن کا رخ کیا۔ ملازمین نے سوپ اور جج باسکٹ میں پیک کر دیا تھا۔ اُس نے ایک ملازم کو ساتھ لیا تھا اور جازی، ماما یا نو سے ساتھ چلنے کا کہے بغیر سیڑھیاں اُترنے لگی تھی۔ پھر کار کا لاک ہی کھولا تھا کہ عائشہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

"دانیا! میں تمہارے ساتھ چلوں کیا؟"

دانیا نے مڑ کر دیکھا اور مدھم لہجے میں بولی۔ "آپ کو ساتھ لے کر چلنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن سنی بھائی سے پوچھ لیا آپ نے؟ کہیں شام کو اسی بات پر ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں۔"

عائشہ بھابی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ "کچھ بھی ہو، میں اس معاملے میں اُن کی ڈکٹیٹر شپ نہیں مان سکتی۔ شہریار مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔"

"اُن کی تمام تر بلند کرداری کے باوجود؟" پتہ نہیں اُس کے لہجے میں کرختگی کیوں آگئی تھی۔

عائشہ بھابی کی آنکھوں میں حیرت تھی اور وہ خود بھی حیرت سے گنگ ہوگئی تھی۔ تو کیا وہ دل ہی دل میں جازی عبدالرحمٰن سے متفق ہو کر جا رہی تھی؟ اُسے بھی شہریار سے اس قسم کے شکوے تھے، جیسے گھر میں باقی ان افراد کو جو اُسے اپنی لسٹ میں سب سے ناپسندیدہ انسان سمجھتے تھے۔

"مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی دانیا!" عائشہ بھابی نے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھتے ہوئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وہ کان دبائے اپنی اس نئی کیفیت کو جھٹلاتی ان کے برابر آن بیٹھی۔

''آئی ایم سوری۔ وہ......... میں تھوڑی سی ڈسٹرب تھی،اس لئے غیر متوقع بات کہہ گزری۔''
عائشہ بھابی نے نرمی سے اُسے دیکھا، پھر مدھم ہو کر بولیں۔ ''میں جب آپ کو شیری بھائی کے لئے متردد دیکھتی ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اس گھر میں کوئی ان کا خیال رکھنے والا تو ہے۔ آپ کی دیکھ ریکھ، ان کے لئے حساسیت، یہ سب مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس لئے آپ کی طرف سے شہریار کے لئے کوئی چبھتا ہوا جملہ سن کر حواس بجا نہیں رہتے میرے۔''
''کہہ دیا ناں، سوری بھابی! آئندہ احتیاط کروں گی۔''
اُس نے اگنیشن میں چابی گھما کر کار اسٹارٹ کی۔ واچ مین نے گیٹ کھول دیا تھا، سو وہ گاڑی کو سبک رفتاری سے سڑک پر لا کر گاڑیوں کے سیل رواں میں بہنے لگی۔ عائشہ شہریار کی طرف سے ہراساں تھیں اور دانیا، جازی عبدالرحمن کے بدل جانے والے موڈ سے پریشان تھی کہ اگر اس وقت شہریار نے جازی عبدالرحمن کے نہ آنے کی وجہ معلوم کی تو وہ اس سے کیا بہانہ بنائے گی۔



وہ بہت تھکے ہوئے قدموں سے گرلز ہاسٹل کے احاطے میں داخل ہوئی تھی اور یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ شاید اب وہ اس گرلز ہاسٹل میں نہیں رہ پائے۔ دوسرے شہر سے آنے والی ورکنگ لیڈیز کے لئے بنایا جانے والا یہ ہاسٹل کچھ دن پہلے تک اُس کے لئے ایک سائبان کی طرح تھا، مگر آج اُسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت تیز دھوپ میں کھڑی کر دی گئی ہے۔ اُس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ہاسٹل کی وارڈن اُس کے لئے آج کل کسی عفریت سے کم نہیں ثابت ہو رہی تھی۔ گھر بار سے بے دخل عورت یوں بھی چڑچڑی اکل کھری ہو جاتی ہے، یہی حال اس ہاسٹل کی وارڈن کا تھا۔ جوان بچوں نے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ یہاں ایک چھت کی تمنا میں نوکری کر رہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا، وہ بے گھری کا دُکھ محسوس کرکے ان سب کے دلوں کا خیال رکھتی، مگر ہوا اس کے برعکس...... دُکھ یا تو انسان کو نرم کر دیتا ہے یا سخت۔ اور یہی اُس کے کیس میں ہوا تھا۔ وہ نرمی کی لکیر کو چھونے کے بجائے سختی کی حد عبور کر گئی تھی۔ مومنہ رفیق کو اسی سختی سے خوف آ رہا تھا کہ آج کا رویہ وہ کیسے سہہ پائے گی۔
وہ بچے تلے قدم رکھتی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کاریڈور میں آئی۔ غیر متوقع استقبالی طریقہ دیکھ کر اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ اُس کا سارا سامان اُس کے کمرے کے باہر رکھ دیا گیا تھا اور وارڈن نخوت سے اُسے گھور رہی تھی۔
''آ گئیں تم؟''

وہ کانپنے لگی تھی ۔اس لہجے پر ہمیشہ سے اُس کا یہی حال ہوتا تھا۔ یہ لہجہ بہت مدتوں تک اُس پر حکمرانی کرتا رہا تھا اور آج بھی اس لہجے کی ٹون سن کر اُس کی آواز اور وجود اسی طرح ری ایکٹ کرتے تھے۔
اُس نے بہ مشکل تھوک نگلا، پھر مرے مرے لہجے میں بولی۔ ”پلیز میم! تین چار دن کا وقت دے دیجئے...... میری نوکری جیسے ہی لگی، میں آپ کے سارے واجبات کلیئر کر دوں گی۔“
”ہونہہ، واجبات دینے والے چہرے تم جیسے نہیں ہوتے۔ سنو لڑکی! اگر تمہاری ضمانت شافعہ کہیل نے نہ دی ہوتی تو میں تمہیں ہرگز ہرگز کمرہ الاٹ نہیں کرتی۔ تم تو مجھے شکل سے ہی میسنی لگتی ہو۔“
”پلیز آنٹی! آپ میری مجبوری سمجھئے ناں۔ دیکھئے، میں ایک مہینے سے بے روزگار ہوں تو یہ میری مجبوری ہے، میری کوتاہی نہیں۔ پلیز، آپ مجھے ایک چانس تو دیجئے ناں۔“
”چانس اور تمہیں دوں...... آخر تمہیں پہلی لگی لگائی نوکری چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“
مومنہ رفیق نے تھوک نگل کر شرمندگی سے کہا۔ ”آنٹی! میرے دفتر کا باس مجھے حجاب اُتارنے کی ضد کرنے لگا تھا۔ میں نے اُس کی یہ حرکت کئی بار سختی سے اگنور کی۔ لیکن اُس دن اُس نے زبردستی میرا نقاب اُتار دیا، پھر اُس کے ریمارکس...... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں آنٹی! کہ اُس کے خطابات پر اپنی زندگی کا چلن ہی بدل دوں۔“
”ہا...... زندگی کا چلن۔ بس یہ سب پارسائی کے قصے کہیں اور جا کر سنانا۔ میں تمہیں اچھی طرح نہ جان گئی ہوتی تو شاید تمہاری اس بات پر تمہیں ریگارڈ ضرور دیتی۔ ویسے ایک بات ہے، اس میں برائی کیا تھی، اگر وہ تمہارا چہرہ دیکھ کر دل بہلانا چاہتا تھا؟“
”آنٹی! میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔“ اُس نے کمزور سا احتجاج کیا اور وارڈن ہنسنے لگی۔ تنفر اور حقارت بھری ہنسی، پھر اُس کی ہنسی رُکی تو بولی۔
”میں اچھی طرح جانتی ہوں، اس ہاسٹل میں آنے والی ننانوے فیصد لڑکیاں کیا نوکریاں کرتی پھرتی ہیں، تم بھی ان میں سے ایک ہی ہو۔ تمہارا گھر اس شہر میں ہے، لیکن پھر بھی تم اپنے گھر کی جگہ گرلز ہاسٹل میں رہنا چاہتی ہو۔ کیا میں نہیں جانتی، تمہیں تمہارے گھر والوں نے کیوں دھکے مار کر گھر سے نکالا؟ تم نے پسند سے شادی کی تھی ناں، گھر سے بھاگ کر۔ پھر کہاں گیا تمہارا ساتھی؟ بھاگ گیا ناں، چند روز عیش کر کے...... پھر کیا مسئلہ ہے، اگر دوسرے لوگ بھی تم سے تمہارے سابقہ شوہر کی طرح میل ملاپ رکھنا چاہتے ہیں؟“
”آنٹی!...... وہ اب بھی میرا شوہر ہے۔“ اُس نے بھرے گلے سے احتجاج کیا اور وارڈن کا قہقہہ زہر بن کر اُس کے اندر اُتر گیا اور زہریلا لہجہ پھر گونجا۔
”تمہارا یہ یقین بھی ایسا ہی ہے، جیسی تمہاری نام نہاد شادی...... کیوں پاگل بن کر اپنی زندگی کو گنوا رہی ہو؟ بہت زیادہ سال نہیں رہ گئے تمہارے پاس، جو کمانا کھانا ہے، کما لو۔ عیش، دنیا، روپیہ سب کچھ

تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو سکتا ہے۔ سمجھداری کا ثبوت دو مومنہ! ایک واہمے پر زندگی مت ضائع کرو۔"

وارڈن جا چکی تھی اور وہ کاریڈور میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اُسے شدید بھوک لگ رہی تھی، لیکن اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ شافعہ سہیل ایک ہفتہ پہلے جو پیسے اُس کی اچھی نوکری مل جانے کے یقین کے ساتھ اُدھار دے گئی تھی، وہ سب روپے خرچ ہو گئے تھے۔ آج کی نوکری کا چانس بھی ضائع گیا تھا۔ کمپنی کا اونر، اُسے انٹرویو لینے تک کی فرصت نہیں تھی۔ اُسے کیا معلوم کہ نوکری کے لئے آنے والی، دھکے کھا کر بمشکل جگہ بنانے والی مومنہ رفیق بھی کوئی نام ہے، کوئی وجود، جسے بھوک لگتی ہے اور جسے زندہ رہنے کے لئے ایک چھت کی بھی حاجت ہو سکتی ہے۔

"یہ سوکالڈ امیر لوگ......" اُس نے نفرت سے کاریڈور سے باہر تھوکا۔ مگر اُس کی نفرت کے اُبال سے بھوک کی ہانڈی میں پہلے سے زیادہ ہلچل مچ گئی تھی۔

'میں نے کھانے کے لئے آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔' اُس نے جیسے اپنے آپ کو نئے سرے سے مجتمع کیا۔ اندر ہونے والی کمزوری کو وضع داری کے سیمنٹ سے نئے سرے سے مضبوط کرنے کی کوشش کی مگر بھوک......

"تم نہیں جانتی تم میرے لئے کیا ہو۔ ایک بار اشارہ کرو، میں تمہارے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہوں......"

"چھوڑو یہ دقیانوسی باتیں۔ پردہ، حجاب، یہ سب محبت کرنے والوں کے لئے آزار کے سوا کچھ نہیں۔"

"مومنہ! ایک بار آجاؤ۔ بس کچھ شامیں گزار لو تمہارے سنگ تو مجھے لگے گا، میرا جیون رائیگاں نہیں گیا۔"

اُس نے اندر اٹھتی پرانی باتوں سے نئی اُبھرتی ٹھنڈی ہوتی بھوک کو بہلا وا دیا۔ معلوم نہیں، اس لمحے یہ باتیں اُس کے اندر کیوں گونج پیدا کر رہی تھیں۔

'کیا عزت کی قیمت ایک وقت کی بھوک کے سوا کچھ اور نہیں؟' اپنے اندر معکوس خیالات سے وہ ہراسگی سے چھپنے لگی۔ کاریڈور کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر جیسے اُس نے اپنی بھوک سے آخری جنگ کر لی تھی۔

"ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ جو عیش کما سکتی ہو اپنے چہرے کے بل پر، حاصل کر لو۔ پھر تم میں کیا رہ جائے گا، ڈھنڈا روجود، اس پر کوئی فقیر بھی کمائی نہیں لگانا چاہے گا، چہ جائیکہ کوئی زندگی گزارنے کا خواب دیکھے......"

اُس نے سر دائیں سے بائیں مارا۔ مگر پیٹ کی بھوک...... اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اچانک۔ بس اچانک اُسے لگا اس بھوک سے سزا کا کوئی ناتہ ہے......

کوئی پرانی سزا کا ناتہ......

اُس کی سماعت میں اچانک نومولود بچے کے رونے کی آوازیں آنے لگی تھیں...... اُس نے تو یہ تک نہیں دیکھا تھا کہ وہ بچہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ بس کپڑے میں لپیٹ کر "چلڈرن ہوم" کے پالنے میں ڈال آئی تھی۔ آواز نے بہت دیر تک اُس کے کلیجے کا دامن پکڑا تھا، مگر معصوم مٹھیوں میں شناسائی کا اتنا مضبوط حوالہ نہیں تھا کہ وہ اُس کے چلتے قدموں میں زنجیر ہو جاتے۔ وہ پلٹ آئی تھی اور آج آٹھ سال بعد اُسے اس بھوک میں وہ رونے کی آواز کسی سزا کا عندیہ لگنے لگی تھی۔

"میں نے اُسے جس حالت میں چھوڑا، کیا وہ زندہ ہوگا...... یا ہوگی؟ بھوک تو اُسے بھی تھی۔ پتہ نہیں، اُس کے پیٹ میں کچھ گیا بھی ہوگا یا نہیں؟...... میں آٹھ سالوں میں ایک دفعہ بھی تو اس طرح نہیں سوچ سکی کہ کسی کی بھوک آج بھی مجھ سے شکوہ کرتی ہوگی۔ میرے اللہ! مجھے معاف کر...... میں خطا کار ہوں، مگر مجبور...... تُو نے جس طرح راستے بچھائے، میں نے ایسا ہی سفر کیا۔ کس کس منزل پر میں لڑکھڑائی، یہ مجھ سے زیادہ تُو جانتا ہے۔ مجھے معاف کر میرے رب!"

اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ کر زار و قطار روتے ہوئے التجا کی اور بھول گئی کہ زندگی میں بہت کچھ اُس نے خالص اپنی مرضی سے کیا تھا۔ اُس رب نے اُسے جگہ جگہ تھام کر روکنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنے گھر کے جہنم سے نکل جانے میں اتنی اتاؤلی ہو رہی تھی کہ پھر صحیح اور غلط کا ہر امتیاز مٹ گیا تھا۔ وہ عافیت گھر سے نکل جانے میں سمجھنے لگی تھی، مگر گھر سے نکلی تو لگا، عافیت تو کہیں گھر کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ ساتھ کچھ یاد آیا تھا تو دنیا کا ڈر، عزت کا خوف۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے چھوٹی موٹی تکلیفوں کا پہاڑ بنا لیا تھا اور یہ پہاڑ اُسے روز تراشنے تھے...... کسی زمانے کی کسی نسل کی طرح اُسے وقت اور اپنی کی گئی غلطی نے اس پہاڑ کے پیچھے دھکیل دیا تھا اور وہ تھی کہ روز اس پہاڑ کو تراشتی تھی مگر جب فگار ہاتھ دیکھ کر سانس لینے کو رُکتی تو کہیں سے بھولی بھٹکی نیند اُس کی آنکھوں میں چلی آتی۔ صبح کی کرن سے آنکھ روشنی پیتی تو لگتا، پہاڑ تو ابھی تک پہلے جتنا بڑا اور کھردرا پن لئے اُس کے اور زندگی کے بیچ کھڑا ہے......

"میرے اللہ!"

اُس نے پھر سے سر جھکا لیا تھا۔ کاریڈور کے سارے کمرے بند تھے۔ اشتہا آمیز خوشبوئیں اُس کی بھوک میں اضافہ کر رہی تھیں مگر وہ بھیک کے لئے بار بار پھیلنے والے ہاتھ کو موڑ کر گود میں رکھے بے بسی

کے ساتھ مل کر اپنی بھوک کا تماشا دیکھ رہی تھی۔

''مجھ سے نہیں برداشت ہوتی اب بھوک۔'' یکدم اُس نے اپنا وینٹی بیگ ٹٹولا۔ اُس میں ایک وزیٹنگ کارڈ دھرا تھا۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ پڑھا۔ یہ اُس کے اُسی باس کا کارڈ تھا، جس نے اُسے ہر اچھے اور برے وقت میں اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

''بس ایک وقت کی بھوک نے تمہیں توڑ دیا......'' اُس کے اندر اُس کے ضمیر کی آواز نے ہانک لگائی۔ مگر اُس نے کان نہیں دھرے۔ اُسے اچانک احساس ہونے لگا تھا، وہ 38 گھنٹے سے بھوکی ہے۔ اُس نے ہنکارا بھرا مگر گیٹ سے باہر نکلی تو اُسے احساس ہوا، اُس کے پاس تو ندیم کمال کے پاس جانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ اور ندیم کمال کو فون کر کے وہ خود یہاں بلا لیتی، اس کے لئے بھی اُس کی خالی جیب تازیانہ تھی۔ وہ سر جھکائے سڑک پر نکل آئی تھی۔ پھر چل رہی تھی کہ کسی نے اُس کا نام لے کر پکارا۔ ایک رکشہ اُس کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے سر اُٹھایا اور حیرت بھری آنکھوں سے سامنے دکھائی دینے والے چہرے کو دیکھنے لگی۔



شافعہ سہیل ابھی ابھی گھر آئی تھی مگر گھر کی حالت...... گھر کی حالت دیکھ کر وہ اپنا یونیفارم بدل کر فوراً گھر کی بکھری چیزوں کو سمیٹنے لگی تھی۔ اُس کا گھر مڈل کلاس فیملی کا شاہکار قسم کا گھر تھا۔ گھر میں کل تین کمرے تھے۔ جن میں سے کونے والا کمرہ بند ہی رہتا تھا۔ ایک کمرے میں وہ اور اماں رہتے تھے اور تیسرا کمرہ نام نہاد قسم کے ڈرائنگ روم کی سہولت دینے میں ناکامی کے باوجود اپنی سی ضد پر آمادہ تھا۔ اُس کی ماں برسوں سے بیمار چلی آ رہی تھی، لیکن یہ شروع سے نہیں تھا۔ اُس کی ماں ہمیشہ بنک سنک سے تیار رہنے والی روح تھی۔ تیز طرار، باتوں کی ماہر۔ اور اُس کے ابا سہیل راشدی ایک نارمل چھوٹے سے بزنس مین۔ وہ کپڑوں کے آڑھتی تھے، لیکن ان کا کام عام لوگوں کی طرح بیسٹ سیلر نہیں تھا۔ عموماً اُن کی مروت کی عادت کی وجہ سے ان کا اکثر پیسہ قرضے دینے کی مد میں مارکیٹ میں باؤنڈ رہتا تھا، سو گھر میں صرف اتنی رقم آ پاتی تھی، جس سے بخوشی صرف تین وقت کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ اس گھر میں ابا کے ساتھ اُن کے ایک بھائی ارسلان راشدی بھی رہائش پذیر تھے۔ وہ پہلے اچھی نوکری کرتے تھے۔ سی ایس ایس کا امتحان دے کر فارن منسٹری کے عیش اُٹھا رہے تھے۔ ابا اور اماں پہلے اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے کیونکہ یہی ارسلان راشدی کی ضد تھی۔ ارسلان راشدی فارن منسٹری کے بعد شادی شدہ ہونے کی لسٹ میں بھی آ گئے تھے اور یہاں بھی انہوں نے چھکا مارا تھا۔ ان کے جاننے والے آج تک چاند، سورج کی جوڑی کی تشبیہ نہیں بھولے تھے۔ مگر اُن کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا، اس سلسلے میں اکثریت

خاموش تھی۔ہاں، کرید نے پر پتہ چلا تو یہ کہ ارسلان راشدی کے دل میں گھر کرنے والی اُن کی بیوی اچانک اُن کے دل سے اُتر گئی تھی۔جبران نے ٹھیک کہا تھا، ایک دل میں یا تو محبت رہ سکتی ہے یا شک۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ سانس بھرنے کی جسارت کر ہی نہیں سکتیں۔سو، جس دن شک نے داخلے کی اجازت چاہی، محبت چپکے سے پچھلے دروازے سے نکل گئی۔پھر اس محبت نے کتنے دُکھ اُٹھائے، کتنے امتحان دیئے، اس کے پاس اس کا کوئی گوشوارہ نہیں تھا کیونکہ ارسلان راشدی اور اس کی ماں آمنہ اس سلسلے میں ایسے چپ تھے، جیسے آسمان......ہزار موسم آئے مگر ان کی خاموشی میں کوئی دراڑ نہیں پڑی۔جو کچھ ہوا تھا، اس کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہوا تھا۔اس کے ابا کو دنیا سے گئے چوتھا ماہ تھا، جب وہ دنیا میں آئی۔اماں کی عدت کے بعد محلے اور خاندان کے لوگوں نے زور ڈالا کہ وہ نئے حالات کے پیش نظر ایک شرعی فیصلہ لے لیں تا کہ بچی کی پرورش اور خود اُن کی جوانی دونوں کی سہولت سے نگہبانی ہو سکے۔اماں اس بات کے لئے راضی نہ تھیں۔نہ ارسلان راشدی۔مگر دنیا کے لئے انہیں یہ فیصلہ لینا پڑا۔پھر وہ دو سال کی تھی، جب اچانک اُس کی خاموش و اُداس زندگی کو ایک نئی آواز نے توڑا۔یہ سونیا تھی، سونیا ارسلان راشدی۔جانے کیسے اور کب انکار، اقرار میں بدل گیا اور نئے وجود نے زندگی سے ہاتھ ملانے کی قسم کھائی۔

شاید یہ کوئی کمزور اور جذباتی لمحہ ہی ہو گا۔کیونکہ وہ گزشتہ کئی سالوں سے دیکھ رہی تھی کہ اُس کے بابا ارسلان راشدی اور اُس کی ماں آمنہ ارسلان راشدی کے درمیان ایک دوسرے سے خیریت پوچھنے کے علاوہ کوئی رابطہ نہیں تھا۔وہ ایک دوسرے کا خیال تو رکھتے تھے مگر جس طرح اور گھروں میں اُس نے کپل دیکھے، ان دونوں میں ایسا کوئی بھی جذبہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

وہ کمرہ صاف کر کے اماں کے کمرے کو ترتیب دینے لگی کہ دواؤں کے زیر اثر سوئی ہوئی اماں کی آنکھ کھل گئی۔انہوں نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا اور آہستگی سے بولیں۔''آ گئیں تم؟''

اُس نے ہمیشہ کی طرح صاف سر ہلا کر جواب دیا۔کیونکہ اس کی پوری توجہ صبح کے وقت کی بکھیری گئی چیزوں کو ترتیب دینے میں لگی ہوئی تھی۔اب اماں اُٹھ چکی تھیں۔

''تم بھی کیا سوچتی ہو گی، عجیب ماں ہوں، جسے نہ گھر کی پرواہ ہے، نہ اپنے بچوں کی پروا۔''وہ بیڈ شیٹ ٹھیک کر چکی تھی، سو اُس نے سہارا دے کر اماں کو اپنے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے اُن کی بات کا جواب زبان پر روکا تھا، پھر فارغ ہوئی تو بولی۔

''میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔کیونکہ میں نے سن رکھا ہے، ایک زمانے میں آپ بہت پھرتیلی اور بہت ہارڈ ورکر ہوتی تھیں۔اماں! اگر میں جوان ہوں تو یہ آپ کا حق ہے کہ میں آپ کی محنتوں کے صلے میں آپ کو مکمل آرام دوں۔اس میں گلٹی فیل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اُلٹی سیدھی باتوں میں اپنا دماغ نہیں کھاتی۔آپ اچھی طرح جانتی ہو۔''

"ہاں۔ مگر میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، میں نہ سہی لیکن سونیا کو تو تیرا ساتھ، تیرا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ مگر یہ بھی تیری ضد ہے کہ نہیں، وہ پڑھے، ڈاکٹر بنے۔"
وہ مسکرانے لگی، پھر آہستگی سے بولی۔ "مگر ایک بڑی بہن کی حیثیت سے میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھے، آگے بڑھے تو کیا بُرا کرتی ہوں؟ اگر میری جگہ سونیا کا بھائی ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا ماں۔ سو اماں! میں نہیں چاہتی، بھائی نہ ہونے کے قلق میں سونیا کی خواہش کو ہی ماردوں۔" لمحہ بھر کو وہ رُکی، پھر آہستگی سے بولی۔ "بابا گھر پہ ہیں اماں!......"
اماں نے سوال پر گہری ٹھنڈی سانس کھینچی مگر جواب اُن کے پاس نہیں تھا۔ سو وہ خاموشی سے اُٹھ گئی تھی۔
"آپ نے ابھی تک کھانا تو کھایا نہیں ہوگا؟" اُس نے گھڑی دیکھی، چار بج رہے تھے۔ وہ سیدھی کچن میں آئی، مگر سارا کچن یوں ہی بکھرا دیکھ کر اُسے کوفت اور احساسِ بے بسی نے گھیر لیا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اُس کے دل نے اماں کی طرح ہوک بھری تھی۔ کاش سونیا واقعی اُس کا ساتھ، اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے گھر ہی ہوتی...... مگر یہ سوچ زیادہ دیر اُس میں ٹھہری نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بجلی کی تیزی سے گندے برتن سنک میں رکھ کر کھانا گرم کرنے کے ساتھ ساتھ تازی روٹیاں بھی ڈال رہی تھی۔ فریج کے آٹے کی وجہ سے روٹیوں کی شکل اور ہیئت میں کافی فرق تھا، مگر بھوک مٹانے کے لئے گزارہ ہوسکتا تھا۔ وہ ٹرے میں کھانا اماں کے کمرے میں رکھ کر کونے کے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ دستک دینا اُسے پسند نہیں تھا اور پھر ارسلان راشدی کام میں اتنے منہمک ہوتے کہ لاکھ دستکوں کے باوجود اُن کے کان پر جوں تک نہ رینگتی، سو اب اُس نے یہ تکلف چھوڑ ہی دیا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ دہلیز پر ہی رک گئی تھی۔
ارسلان راشدی توقع کے مطابق کینوس پر جھکے کسی چہرے کو اُبھارنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھے۔
"بابا! آپ نے کھانا کھایا؟"
ارسلان راشدی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ پیلے بلب کی روشنی میں اُس کا تھکا ہوا چہرہ عجیب ٹھہرے ہوئے دُکھ جیسا تھا۔
"نہیں، بھوک نہیں ہے۔ تم کھالو۔"
"پلیز بابا! آپ جانتے ہیں، مجھے آپ کے بنا کھانا کھانا اچھا نہیں لگتا۔ چلیں ناں کمرے میں۔ اماں، مجھے اور آپ کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے کئی ماہ ہوگئے ہیں۔ کبھی آدھی بھوک آپ کے ساتھ، آدھی بھوک اماں کے ساتھ بانٹ بانٹ کر مجھے لگتا ہے، میں ادھوری ہوتی جارہی ہوں۔"

ارسلان راشدی نے برش احتیاط سے رکھ دیا تھا اور بہت خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتے چلے گئے تھے۔ پھر کھانا کھاتے ہوئے وہی رسمی جملے، یہ کھائیے ناں، آپ نے وہ سالن تو چکھا نہیں۔ اور ارسلان راشدی، اماں کی ہر بات پر سر جھکائے یوں خاموشی تانے بیٹھے رہے جیسے آمنہ ارسلان کسی اور سے مخاطب ہوں۔ وہ اماں اور بابا کے روپ میں ارسلان راشدی کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہی آدھی بھوک ختم ہونے کا بگل سن چکی تھی، سو بہت ہلکے ہلکے ہاتھ چلا رہی تھی۔ اُس کی مرضی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ مگر ایسا عموماً ہوتا کہاں تھا۔ ایسے ہر موقع پر اماں پر کھانسیوں کا دورہ پڑ جاتا اور بابا کو کوئی ضروری کام یاد آجاتا۔ یوں یہ محفل برخاست ہو جاتی۔

اس بار بھی کچھ مختلف نہیں ہوا تھا۔ وہ برتن سمیٹ رہی تھی۔ اماں نے کھانے کے بعد پھر سے بستر سنبھال لیا تھا اور وہ کچن کا رُخ کر کے اپنی سوچوں سے بچنے کی سعی لاحاصل میں لگ گئی تھی۔ پھر کچن سے فارغ ہوئی تو بابا کو کرسی پر گم صم، خاموش بیٹھے دیکھ کر دل کو عجیب سا دھچکا لگا۔

''کیا سوچ رہے ہیں بابا؟'' وہ محبت سے قریب بیٹھتے ہوئے چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھا کر پوچھنے لگی۔

ارسلان راشدی نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ ''ذات کا سرا کھو گیا ہے۔ کوشش کے باوجود مل نہیں پاتا ہوں خود سے۔''

''کیا واقعی آپ خود سے ملنا چاہتے ہیں؟''

ارسلان راشدی نے بے بسی سے اُسے دیکھا، پھر ہولے سے کہا۔ ''نہیں۔ بے چارگی یہ ہے کہ میں چاہنے کے باوجود بھی خود سے نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے لگتا ہے شافی! اگر میں کسی دن یہ جسارت کر بیٹھا تو بہت سے ادھورے سوال مجھے میری تنہائی سے چرا لیں گے۔''

''آپ کو تنہائی اچھی لگتی ہے؟'' اُس نے حیرت سے دیکھا۔

''تنہائی اچھی نہ سہی، مگر زندہ رہنے کے لئے ڈھارس کی طرح ہے۔ اگر کسی دن یہ تنہائی بھی چھن گئی تو روح سفر اوڑھ لے گی۔ میں، میں نہ رہوں گا، سوال بن جاؤں گا اور سوال جواب پانے کی حسرت کرنے لگیں ناں تو ہاتھ پلے کچھ نہیں رہتا۔ مسلسل ایک سفر بھگائے پھرتا ہے۔ کون کہاں بچھڑا، کیوں بچھڑا، یہ خیال تنگ کرنے لگتے ہیں۔ بس اس لئے میں تنہائی سے جان چرانے کے باوجود اسی کی قید میں رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ سر ہلا کر اُٹھ گئی۔ پھر شام کا کھانا بنا کر وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر چھوٹے سے آنگن میں کرسی پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ بے ساختہ کسی کے خیال نے اُسے ہراساں کر دیا۔ اُس نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا، شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ "پتہ نہیں، مومنہ کو نوکری ملی بھی ہے یا نہیں؟" اُس نے سوچا اور اس سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔

ایک ہفتہ پہلے وہ اُسے چار سو روپے دے کر آئی تھی تو اُس کا خیال تھا، اُسے تب تک نوکری مل ہی جائے گی۔ یہ ایک طرح سے عزتِ نفس کا دوسرے کی عزتِ نفس سے خاموش کیا جانے والا معاہدہ تھا۔ مگر جس طرح مومنہ رفیق نے اُس سے رابطہ نہیں کیا تھا، یہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ ابھی اپنی بے روزگاری کے کرائسز سے نکل نہیں سکی تھی۔

آج اُسے سیلری ملی تھی، جیب بھاری تھی، سو اپنے اور گھر کے خرچ سے نکال کر کچھ رقم بیگ میں ڈال کر کچن میں آئی تھی، پھر ٹفن باندھ کر اُس نے بابا سے اجازت چاہی تھی۔

"مومنہ رفیق۔ ہمیشہ صرف ذکر سنا ہے تم سے۔ کبھی لے کر آؤ ناں اُسے گھر۔"

"جی بابا! ضرور.... بس ذرا وہ بے روزگاری کے چنگل سے نکل آئے، پھر ملتے ہیں۔"

ارسلان راشدی نے سر ہلا کر اجازت دی اور اُس نے باہر کا رخ کیا۔ بہت سے راستوں میں سے ایک راستہ، جہاں کسی موڑ پر مومنہ رفیق شاید اُس کی منتظر تھی۔

مومنہ رفیق اور اُس کی ملاقات بالکل حادثاتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی، جب وہ ملازمت کی اسٹرگل میں نئی نئی وارد ہوئی تھی۔ وہ اور مومنہ ہاسپٹل کی لابی میں ملے تھے۔ اُس وقت بھی وہ حجاب میں تھی۔ وہ مردوں سے تو کیا، غیر خواتین تک سے چہرہ چھپا کر رکھتی تھی۔ خود اُس نے مومنہ رفیق کو دو ایک بار کے علاوہ جانے کبھی نہیں دیکھا تھا اور یہ دیکھنے کا مرحلہ جب آیا تھا تو اُس نے لڑکی ہونے کے باوجود اُسے بے طرح سراہا تھا۔

"میری دعا ہے، جتنا خوب صورت تمہارا چہرہ ہے، تمہارا نصیب بھی اتنا ہی خوب صورت ہو۔"

"خوب صورت نصیب، وہ بھی میرا...... ہونہہ!" اُس نے عجیب تلخ انداز میں کہا تھا۔ پھر وہ انٹرویو کے لئے اندر گئی اور باہر آئی تو بہت خفا تھی۔

"احمق ہے، اُنہیں نرس چاہئے یا کوئی ماڈل گرل۔ کہتے ہیں بی بی! آپ اپنا چہرہ دکھائیے۔ اس کے بغیر آپ کو نوکری نہیں مل سکتی۔ شافعہ! انہوں نے میری قابلیت، میرے سرٹیفکیٹ، کچھ بھی نہیں دیکھا اور صرف چہرہ دیکھنے کی ضد کی۔ آخر ایسا رکھا ہی کیا ہے اس چہرے میں...... میری خوب صورتی میرا نصیب تو نہیں بدل سکتی۔ میں کسی گم شدہ جزیرے کی شہزادی تو نہیں جو یہ سب مجھے لے کر اتنے کوشش ہیں۔"

اُس نے کچھ نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن جب اُس کی نوکری پکی ہوئی تو اُس نے سب سے پہلے اس گرلز ہاسٹل کی راہ لی، جہاں وہ رہتی تھی۔ وہ اُس سے ملی تو مطمئن ہو گئی کیونکہ اس لمحے وہ برسرِ روزگار ہو چکی تھی۔

"تمہارا کوئی گھر نہیں ہے کیا؟"

اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کیا اور اُس نے تمام تر ناپسندیدگی آنکھوں میں بھر کر کہا۔

"نہیں، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں یتیم خانے میں پلی تھی۔ دس سال کی تھی تو ایک عورت نے مجھے گود لے لیا تھا۔ میں کبھی میرے ولدر دور ہوئے۔ مگر گھر آئی تو کھلا، اس عورت کو اولاد نہیں، ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ وہ "چلڈرن ہوم" کے جائزے کے وقت ہمیشہ مجھے اچھا کھلاتی، اچھا پہناتی۔ مگر اُن کے جاتے ہی اُس کا رویہ بدل جاتا۔ پھر یوں ہوا "چلڈرن ہوم" اور میری ماں کے درمیان میرے لئے رسہ کشی ہونے لگی۔ کچھ لوگوں نے صحیح اطلاعات "چلڈرن ہوم" پہنچا دی تھیں، سو کیس عدالت میں گیا تو میری کسٹڈی کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میری خود ساختہ ماں مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی مگر یہ حقیقت تھی، اُس کے گھر کے کاموں کی انتہا تھی۔ مگر "چلڈرن ہوم" کے کاموں کی حد کہیں تھی۔ سو میں نے فیصلہ ماں کے حق میں دے دیا۔ میں نے ساری باتوں کو جھوٹا قرار دے دیا۔ لیکن جب میں بڑی ہوئی تو مجھے لگا، میں اب تک بہت بری زندگی گزار رہی تھی، جیسے بھیڑ بکری۔ سو میں نے یہ گرلز ہاسٹل کی راہ لی۔ ہاں، اب تم کہہ سکتی ہو، میں تنہا ہوں۔ میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔" اُس نے اتنی تفصیل سے جواب دیا تھا کہ پھر اس نے کبھی اُس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور آج وہ پھر سے اس مومنہ رفیق سے ملنے جا رہی تھی، جسے تلخی کی حد تک سچ کہنے کی عادت تھی۔



دانیا عبدالرحمٰن کھانے کی باسکٹ لے کر اندر آئی تھی اور حسبِ توقع عدیل بھائی اور عاطف بیگ دونوں کو بڑے طریقے سے کھانے کا منتظر پایا تھا۔

"اتنی دیر کر دی بہنا! یہاں قتل ہوتے ہوتے رہ گئے۔"

عاطف بیگ نے باسکٹ اچک لی، مگر اُس کے پیچھے عائشہ بھابی کو آتے دیکھ کر وہ سو بر بننے کی کوشش کرنے لگا۔

"کھانا لگوا دو میرا خیال ہے۔" اُس نے باسکٹ آرام سے واپس دانیا کے ہاتھ میں دے دی۔

عائشہ بھابی نے یہ انداز دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔ ”میرے لئے تم، شہریار جیسے ہو عاطف! اس لئے تکلف میں مت پڑو۔ جیسے ہو، ویسے ہی دکھائی دو۔“ اُس نے مسکرا کر اُن کی بات مان لی۔

دانیا ٹیبل پر کھانا لگانے لگی۔ پھر سُوپ لے کر وہ شہریار کی طرف آ گئی تھی۔

”میں نے کہا تھا ناں، میرے لئے تردد مت کرنا۔“

دانیا عبدالرحمٰن ان سنی کرتے ہوئے اُس کا بیڈ ٹیبل اُس کے قریب سرکانے لگی، پھر سُوپ کا پیالہ رکھ کر اسپون اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”میں نے سنا ہے کہ آپ چار دن میں ڈسچارج ہونا چاہتے ہیں۔ چلئے، اگر ایسا ارادہ ہے تو اپنا کام خود کرنے کی کوشش کیجئے۔“

شہریار عبدالرحمٰن نے چونک کر اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”آپ کو یہ کس نے کہا، میں چار دن میں فارغ ہونے والا ہوں؟“ اسپون سے پہلا سپ لیا اور وہ ہنسنے لگی۔

مسٹر راحم کا میرے نمبر پر فون آیا تھا۔ وہ کسی مومنہ نامی لڑکی کی التجاؤں سے بہت تنگ تھے۔

”مومنہ رفیق!......اوہو، یہ آخر کون ہے مومنہ رفیق، جو منیجر کی جان کو آ گئی ہے؟“

دانیا اُس کے ہونٹوں کے گرد سے سُوپ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے جواباً بولی۔ ”ہو گی کوئی بہت ضرورت مند لڑکی۔ آپ خود سوچئے، صرف ضرورت کے علاوہ کون لڑکی گھر سے نکلتی ہے؟ مڈل کلاس فیملی میں ویسے بھی معاشی بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔“

”آخاہ، یہ آج کل آپ مڈل کلاس پر کوئی تھیسس کر رہی ہیں کیا؟“ بات کرنے کی کوشش کی اور پھندا لگا بیٹھا۔ عاطف بیگ تو اپنا چھوڑ کر بھاگا۔ عدیل بھائی بھی تیزی سے اُٹھے اور وہ سر اونچا کر کے پھندا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھوں میں ذرا سی دیر میں سرخی بھر آئی تھی۔ چہرے کے تناؤ سے دانیا کا دل اُلٹنے لگا تھا۔ عائشہ بھابی الگ پریشان تھیں، جب اُس نے مدھم ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہوں......ٹھیک ہوں......آپ لوگ تو ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتے ہیں۔“

عاطف بیگ، جو اُس کی پشت تھپتھپا رہا تھا، اب تک اپنی ہڑ بڑاہٹ پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ شہریار نے اُس کے تاثرات دیکھے تو پہلی بار شرارت سے بولا۔ ”آپ جناب کی حالت ملاحظہ کیجئے۔ پھندا لگنے میں سانسیں اتنی تیز چل رہی ہیں، اگر اوپر نکل گیا ہوتا ناں، تو مجھے لگتا ہے، دوسری قبر آپ کی ہی تیار ہو رہی ہو گی۔“

”بکواس مت کرو۔ ابھی اتنا بھی محبت کا دعویٰ نہیں ہے مجھے۔“ وہ اب ریلیکس ہو چکا تھا۔ عدیل بھائی بھی پھر سے کھانے سے انصاف کرنے لگے تھے۔ شہریار نے دانیا کو زبردستی کھانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ وہ تینوں مصروف تھے، جب اُس نے فون بجنے پر ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔

”ہیلو، شہریار بول رہا ہوں۔ کون، مومنہ رفیق؟ اوہ، آپ کو کیوں سمجھ نہیں آتا کہ میں چیریٹی ایبل پروگرام کرنے پر بلیو نہیں کرتا۔ جی نہیں، اگر آپ قابل ہیں تو نوکری تو آپ کو تب ہی مل سکتی ہے۔ خدا واسطے پر نوکری بانٹنا شروع کر دوں تو پھر میری کمپنی چل گئی۔ کس سے بات کروانا چاہتی ہیں؟“ توقف کیا، پھر بوریت سے بولا۔ ”آپ کو لگتا ہے، آپ کی دوست کوئی بہت بڑی چیز ہے، جس سے بات کرتے ہی میں آپ کے لئے نرمی سے سوچنے لگوں گا؟ کیا...... کیا میں آپ کی دوست کو جانتا ہوں؟ اچھا...... حیرت ہے، وہ مجھے جانتی ہیں اور میں انہیں نہیں جانتا۔ ٹھیک ہے، بات کروایئے۔“ ایک لمحے کو لمبا وقفہ آیا، پھر دوسری طرف کی آواز تھی کہ شہد آگیں لہجہ۔ مومنہ سچ کہتی تھی، اس آواز کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ آواز اسے جانتی تھی۔ مگر نام سن کر وہ بدک گیا۔ ”کون، شافعہ سہیل؟ افوہ، آپ ہیں جنہیں چیریٹی کروانے کی بہت لت ہے۔ سوری، میں ایسا رسک نہیں لے سکتا۔ صرف آپ کے کہنے سے میں کیسے مان لوں کہ مومنہ رفیق میری کمپنی کے لئے بیسٹ چوائس ہوگی؟“

وہ پھر کچھ دیر کے لئے چپ ہوا تھا۔ شاید شافعہ سہیل اپنا موبائل لے کر مومنہ رفیق سے بہت دور ہو گئی تھی۔ کیونکہ پہلے اس ساری گفتگو میں وہ مسلسل اُسے زبانی ٹہوکے دیتی رہی تھی، مگر اب وہ بالکل خاموشی کے گھیرے میں تھی۔ پھر شہریار نے جو کچھ شافعہ سے سنا، اس نے اُس کی پیشانی کی رگوں کو اُبھار دیا تھا۔ وہ چاروں اسی کی طرف مرکوز تھے۔ اُس نے کچھ سوچا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”اوکے، آپ مومنہ سے کہہ دیجئے، وہ کل میرے دفتر چلی جائیں۔ اُنہیں گرافک ڈیزائننگ کے لئے مسٹر راحم جس طرح اپروچ کریں، وہ اُن کی رائے کی قدر کریں۔ جی ہاں، اُنہیں کہہ دیجئے گا، وہ ٹرائل بیسز پر ہیں۔ جب تک میں خود اُن کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو جاتا، اُنہیں مستقل نہیں کیا جا سکتا۔“

وہ موبائل بند کر چکا تھا۔ پھر اُس نے ایک اور نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر وہ جان پائے تھے کہ یہ دوسرا آدمی راحم یوسفی کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے اُس سے مومنہ رفیق کی جاب کے بارے میں بات کی تھی، پھر کچھ رقم ایڈوانس میں دینے کا حکم دیا تھا۔ راحم نے فیصلہ سن کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، تبھی اُس نے ہولے سے کہا تھا۔

”ہاں، ہاں...... میں نے ہی کہا ہے، وہ ٹرائل بیس پر ہوگی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ ہمارے لئے ایک گراں قدر امپلائی ثابت ہوں۔ تم تو جانتے ہو، مڈل کلاس میں کتنا پوٹینشل ہے، ہمیں اسے گین کرنا ہے۔ اچھی کارکردگی کے لئے اگر تھوڑا سا رسک بھی لیا جائے تو کیا برا ہے۔ ہاں، ہاں، اس ایڈوانس کو ہم اُس کی سیلری سے کاٹتے رہیں گے۔ اوکے، گڈ بائے! لیکن میری غیر موجودگی میں معاملات ویسے

ہی چلتے رہنا چاہئیں جیسے میری موجودگی میں تھے۔"

وہ فون ڈسکنکٹ کر کے پلٹا تو اپنے سر پر دانیا کو کھڑے پایا۔

"آپ یہ آرام کر رہے ہیں؟ ہاسپٹل میں لیٹ کر بھی کام آپ کی جان نہیں چھوڑ رہے۔" لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ مومنہ...... آخر ہے کون یہ مومنہ، جس نے آپ کو اتنا ڈسٹرب کر دیا ہے؟ اتنا ڈسٹرب کہ آپ طویل احکامات دینے پر مجبور ہو رہے ہیں؟"

شہریار نے پیالے کو دور کر دیا اور دانیا کا لہجہ اکاؤنٹ کرنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا، جیسے دانیا کے لہجے ہی میں نہیں، اس کی آنکھوں میں بھی طنز کا شائبہ تھا۔

عائشہ بھابی، دانیا کا رویہ بدلتے دیکھ کر فوراً بیچ بچاؤ کرانے کے خیال سے درمیان میں آ گئی تھیں مگر غیر متوقع شہریار نے اسٹریس نہیں لیا تھا اور آہستگی سے بولا تھا۔

"مومنہ، شافعہ سہیل کی فرینڈ ہیں۔ اسی کے بی ہاف پر میں نے اُسے یہ جاب آفر کی ہے۔ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔"

دانیا نے جواب سنا، لیکن جازی عبدالرحمٰن کی باتیں اس میں گونج پیدا کر رہی تھیں۔ اس لئے اس کی آنکھوں کی بے یقینی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے برتن باسکٹ میں رکھ رہی تھی، جب عاطف واش بیسن میں ہاتھ دھو کر اس کے قریب آ کر گنگنایا۔

"کیوں جگر! اس وقت اسموکنگ کا موڈ نہیں ہو رہا؟" شہریار، عاطف کی شرارت سمجھ گیا تھا۔ وہ صرف ایک جملے سے اسے چپ کرانا چاہتا تھا۔ مگر اس نے خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ فلاسک میں سے عدیل بھائی، عائشہ بھابی اور عاطف بیگ کے لئے چائے انڈیلنے لگی تھی۔ عاطف نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کی طرف سوالیہ سا نشان اُچھالا اور شہریار مسکرانے لگا۔

"لگتا ہے، دانیا بی بی کو اپنے اسٹوپڈ سے بھائی پر بہت سی باتوں کو لے کر بہت سارے تحفظات نے آن گھیرا ہے۔"

"میں نے ایسا کچھ کیا، کیا؟" وہ صوفے پر بیٹھ کر چائے دینے لگی۔ عاطف بیگ چائے کے بعد اب واقعی اس کا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر ڈھونڈنے لگا تھا۔

"ماموں آیا تھا۔ دونوں چیزیں اُس نے ضبط کر لیں۔ کہہ رہا تھا، اسموکنگ نہیں چھوڑی تو دفعہ تین سو دو کے تحت دار پر لٹکا دے گا۔"

"وہ کون ہوتے ہیں، میرے بھائی کو دار کی دھمکی دینے والے؟" اُس نے تیزی سے خفگی سے کہا اور شہریار ہنسنے لگا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"پور گرل! تم مجھ سے ناراضگی افورڈ ہی نہیں کر سکتی ہو، پھر کیوں ستاتی ہو؟"

وہ مسکرانے لگی تھی۔ پہلے کے اپنے علم میں آ گیا لائے گئے فیئر ز۔ جن کے گواہ سالار بھائی اور حمزہ عابد کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اُس نے مومنہ رفیق کو بھی اپنی عارضی فیئر کا مارجن دے کر بھولنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ گھر جائیے عدیل بھائی! تھوڑا آرام کر آئیے، ورنہ رابعہ بھابی خفا ہو جائیں گی۔ پہلے ہاسپٹل سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ عائشہ بھابی خفا ہو جائیں گی کہ ان کے ہیرو کا اچور بنا کر چھوڑا ہے کراچی والوں نے۔"

عدیل بھائی ہنسنے لگے۔ پھر وہ سات بجے سے پہلے ہاسپٹل سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ عائشہ بھابی اُن کے ساتھ تھیں اور دانیا عارضی طور پر اُن کے ہمراہ اس شرط پر واپس گھر گئی تھی کہ دو گھنٹے بعد وہ پھر سے ہاسپٹل آنا چاہے گی تو عدیل بھائی اُسے نہیں روکیں گے۔ عدیل بھائی نے وعدہ کیا تھا، سو تنہائی ملنے پر اُس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ عاطف بھی نیم دراز ہو گیا تھا۔ نرس نے اُسے خواب آور انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ زخم کی پٹی بھی بدلی جا چکی تھی، سو کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ نرس نے موبائل آف کرنے کا عندیہ بھی لینا چاہا تھا مگر شہریار نے ہولے سے انکار کر دیا تھا۔

"پلیز! موبائل وائبریٹ ہے، شور نہیں ہو گا۔"

نرس نے سر ہلا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر کتنی ہی دیر گزر گئی تھی، اچانک ڈاکٹر صمدانی کی آمد پر اُسے جاگنا پڑا تھا۔ وہ معمول کا چیک اپ کر رہے تھے۔ پہلے دن کے مقابلے میں دوسرے دن اور دوسرے دن کے اختتام تک اُس کی کنڈیشن تسلی بخش تھی۔ دل کی دھڑکن معمول پر تھی۔ آکسیجن کی ضرورت پہلے دن کے بعد دوبارہ نہیں محسوس کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی، ڈاکٹر صمدانی بہت زیادہ پُر امید، اُس کا کاندھا تھپتھپاتے اُس کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے لوٹے تھے۔ عاطف بیگ کی بھی بات چیت سے آنکھ کھل گئی تھی، سو وہ صوفے پر سے اُٹھ کر اُس کے بیڈ کے سامنے کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

"مبارک ہو، تم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یعنی ابھی کچھ دن اور زندگی کا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا۔"

شہریار نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔ "کون کم بخت اس وقت زندگی کا ساتھ چھوٹنے کی لگن لگا رہا ہے؟" لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر اپنے ذمے کے کاموں کی لسٹ گنوانے لگا، جس میں دانیا کی شادی، جازی کا بزنس میں سیٹل ہونا اور بہت سارے چھوٹے موٹے کام درج تھے۔ کام گنوا چکا تو بولا۔ "عاطف صاحب! ان سب چیزوں کو سیٹل کرنے سے پہلے میں چاہوں گا، میں زندگی کو دوست بنائے رکھوں تو ہی اچھا ہے۔"

عاطف بیگ نے ابرو چڑھا کر اُسے دیکھا، پھر خفگی سے بولا۔ ''میں تو سمجھا تھا تم میرے اس جملے سے اندر کی کچھ بھڑاس نکالو گے تو طبیعت کچھ اور فریش ہو جائے گی۔ مگر تمہیں سارا دھواں اپنے اندر رکھنے کی اتنی عادت ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔''

''مت پوچھو ناں پھر۔ بس تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تکیہ پشت کے نیچے رکھ کر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔ پھر قدرے بوریت سے بولا۔ ''جس سے آپ کی دشمنی ہے ناں، بس اُسے ہسپتال میں بندی بنا دو، قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ بندہ کچھ خوف سے اور کچھ بوریت سے آپ ہی مر جائے گا۔'' عاطف اُس کی ایکنو طبیعت کے بارے میں جانتا تھا، سو پھر یہ کیسے نہ پہچانتا کہ وہ ایک ہی کمرے میں محدود ہو جانے کے باعث جی بھر کے بور ہو چکا ہے۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ اس کیفیت سے اُسے نکالنے کے لئے کوئی چٹکلہ سنتا، اس کا موبائل وائبریٹ ہوا۔ شہریار نے آن کر کے فون ریسیو کیا اور بور چہرے پر یکدم مسکراہٹ عود کر آئی۔ ہاسپٹل آ کر یہ حوالہ تو اُس کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ یہ حوالہ یاد کرنے کے لائق نہیں تھا۔ بلکہ یہ اس لئے تھا کہ وہ خود سے محبت کرنے والوں کو ہراساں کرنے سے اجتناب کرتا تھا۔

''عینی!......... تم......... تم نے کیسے فون کر لیا بیٹا؟''

''بابا! میں نے سنا ہے، آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میری ماموں انکل سے کل شام بات ہوئی تھی۔ صبح سے میرے پاس بیلنس نہیں تھا۔ نہیں بابا! میں بس بینک نہیں جا سکی تھی، اس لئے، اور تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی رقمیں مجھے برابر مل رہی ہیں۔ بتائیے ناں بابا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

شہریار نے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے عاطف کی طرف سے رخ موڑا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''میری طبیعت فی الحال ٹھیک ہے جانِ بابا!......... مگر ابھی کچھ دیر بعد ایک جلاد ہے، جو مجھے خیریت سے نہیں رہنے دے گا۔ نہیں، ایول تو نہیں ہے، اس سے کیلی بد میں بڑی چیز ہے۔''

دوسری طرف معصومانہ قہقہہ گونجا۔ عینی اس شخصیت کے لئے یہ شتلی نام گنوا رہی تھی۔ پھر تیسرے نام پر اُس نے کہا تھا۔

''ہاں، ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو، یہ تمہارے عاطف انکل ہی ہیں۔ دراصل انہیں ہر وقت یہ لگتا رہتا ہے جیسے انہوں نے مجھے یا مجھے بتائے بغیر متنبہ کر لیا ہے۔ متنبہ کا مطلب، گود لے لیا ہے۔''

"ہاہاہا......پھر وہی قہقہہ۔ رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور اُس نے واقعی جارحانہ لہجے میں سوال کیا تھا۔
"یہ عینی کون ہے؟"
شہریار کوئی جواب دے ہی پاتا کہ اچانک دروازہ کھلا اور وانیا عبدالرحمٰن کو دیکھ کر شہریار کی سٹی گم ہوگئی۔
"اب یہ عینی کون ہیں؟" کبیدگی اُس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ عاطف نے سر پہ ہاتھ پھیر کر شہریار کے جو کھم میں پھنس جانے کا یقین کر لیا تھا اور وانیا، وہ ابھی تک اس پر مرکوز تھی۔
"میری ایک کلاس فیلو ہے۔ ابھی ابھی یورپ کے ٹور سے لوٹی ہے۔ اس لئے میری طبیعت کا جان کر ایک اچھے سے دوست کی طرح خیریت پوچھنا چاہ رہی تھی۔" اُس نے جان کر وانیا کو باتوں میں لگا کر نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا۔ وانیا نے واقعی اُس کے ہاتھ سے موبائل لے کر ابھی کچھ دیر پہلے کے نمبر پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔
"یہ انگلینڈ سے آپ کو کون فون کر رہا ہے بار بار؟ کیا یہ بھی کوئی دوست ہے، جسے آپ کی طبیعت ہراساں کر رہی ہے؟"
اُس نے موبائل لے کر نمبر دیکھا۔ نمبر قطعاً اجنبی تھا۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ کچھ سوچتا، موبائل ایک دفعہ پھر بجنے لگا۔
"ہیلو، شہریار اسپیکنگ۔"
پھر دوسری طرف کی آواز سن کر اُس کی گرم جوشی انتہا پر تھی۔
"ٹھیک ہے میم! آپ پاکستان جیسے ہی آتی ہیں، میں آپ سے فوراً ملنا چاہوں گا۔ ویسے آپ تکلف نہ کریں تو ایئر پورٹ سے ہم ہی آپ کو پک کر والیتے ہیں۔ بلکہ رہائش کا مسئلہ ہو تو وہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔"
وہ باتیں کرتا رہا، پھر فون آف کر کے ریلیکس ہوا تو عاطف بیگ کو فکر مند پایا۔ تفکر وانیا کے چہرے پر بھی تھا، مگر اس کی نوعیت دوسری تھی۔ مومنہ رفیق کے بعد عینی کا نام بار بار اس میں اسپارک کرنے لگا تھا۔
کیا واقعی وہ شہریار کے لئے ایک لایعنی جنگ کا ایندھن بن رہی تھی......؟
کیا واقعی حقیقت میں شہریار اتنا ہی بگڑ چکا تھا کہ اُس کے سدھرنے کی کوئی اُمید کرنا خود اُمید سے مذاق کے مترادف تھا......؟
وہ ہولے سے چلتے چلتے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی اور عاطف بیگ اُس کے چہرے کی فکرمندی سے کچھ اور سمجھ کے اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پریشان مت ہو دانیا! ڈاکٹر صمدانی کہہ رہے تھے، شہریار بہت اچھی ریکوری کر رہا ہے۔ اب وہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔“

دانیا نے سر اونچا کر کے ایک لمحے کو شہریار کو دیکھا، پھر دوسری طرف نظر موڑ کر عاطف کو دیکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں، واقعی شیری بھائی اب بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔“

یہ عام سا فقرہ تھا مگر عاطف بیگ کو عجیب احساس ہوا تھا اور شہریار اس احساس کی نبض کو اپنے اندر قدم قدم اُترتے دیکھ رہا تھا۔

دانیا اس جملے کے بعد رُکی نہیں تھی۔ عاطف نے گھر چھوڑنے کی زبردستی آفر کی تھی، وگرنہ شاید وہ اکیلی ہی کمرے کے لئے نکل جاتی۔ کراچی آ کر اُس نے پندرہ دن کے لئے کار رینٹ پر لے رکھی تھی، سو اس وقت یہی سہولت کام آئی تھی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد وہ شہریار کے پاس لوٹا تو اُسے بائیں ہاتھ کی کروٹ کر کے سوئے ہوئے پایا۔ یہ اور بات کہ وہ جانتا تھا، وہ صرف اس وقت کی کیفیت اور عاطف کے سوال سے بچنے کی کوشش کے سوا کوئی اور مارجن لینا نہیں چاہتا تھا۔ کمرے کی لائٹ آف ہو چکی تھی اور وہ اس کے پاس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”صوفے پر جا کر سو جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، اپنی نیند مت خراب کرو۔“ اس نے کروٹ بدلے بغیر کہا۔ خیال اُچھالا مگر وہ کرسی چھوڑ کر اٹھا نہیں تھا۔

”تم دانیا کی ناراضگی سے ہراساں ہو؟“ اس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

وہ نم لہجے میں بولا۔ ”نہیں، مجھے دانیا سے کوئی شکایت نہیں۔ مگر ہاں، دل میں کچھ ٹوٹا ضرور ہے۔ پتہ نہیں، میں اُن کی محبت سے اتنی زیادہ توقعات کیوں رکھتا ہوں؟ مجھے لگتا ہے، میں دنیا کی کسی بھی برائی میں اُتھڑ جاؤں، پھر بھی دانیا کے لئے میں اُس کا شیری بھائی ہی رہوں گا۔ وہ جھنک کر اوروں کی طرح مجھے تنہائی کے سمندر میں نہیں دھکیلے گی۔ مگر...... مگر اب مجھے اس بات کے لئے خود کو تیار کر لینا چاہئے کہ میں نے اپنے دو مضبوط آسرے، دو مضبوط گھر کھو دیئے ہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں خالی ہاتھ ہو گیا ہوں اور تم جانتے ہو عاطف! کسی کے دل سے نکلنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔“

وہ سیدھا ہو کر اُس سے سوال پوچھنے لگا مگر جواب اُس کی آنکھ کی کور میں اٹکا رہ گیا تھا۔

”تم رو رہے ہو؟“

”نہیں تو......“ اُس نے صاف مُکر جانے والا جھوٹ بولا اور آنکھیں موند لیں۔

وہ جو کہتا تھا، وہ ان دو مضبوط آسروں کے کھونے پر شاید ہی زندہ رہ سکے۔ وہ حجازی عبدالرحمٰن اور دانیا عبدالرحمٰن کے بچھڑ جانے کے باوجود زندہ تھا اور حیرت انگیز طور پر اُس کی ہارٹ بیٹ نے بھی کوئی گڑبڑ

نہیں کی تھی۔ عاطف بیگ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ڈھارس کے لئے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا تھا اور اُس نے اسی تسلی سے اپنے دل کو دھڑکتے، زندگی کی تلخی کو پینے کے لئے ہمکتے پایا تھا۔



رات آہستہ آہستہ بھیگ چلی تھی اور زندگی.......

وہ پتہ نہیں کہاں تھی، اس کمرے میں یا اس کمرے سے باہر.......

یا پھر اُس کا کہیں وجود ہی نہیں تھا اور سب کو زندگی کے ہونے کا واہمہ ہوتا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ سر اُٹھایا تھا اور سامنے رکشے سے اُترنے والی لڑکی کو دیکھ کر اس کی آدھی مری ہوئی سانس پوری طرح جینے لگی تھی۔

''مومنہ! کہاں جا رہی تھیں؟''

اس نے چونک کر شافعہ سہیل کو دیکھا مگر اُسے لگا یہ سوال شافعہ نے نہیں کیا تھا، کسی شہ رگ میں رہنے والے نے کسی اور کے لہجے میں سرزنش کی تھی۔

واقعی، وہ کہاں جا رہی تھی؟ اس نے خود سے سوال کیا اور شرمندگی سے سر جھکا گئی کہ وہ بھوک کے ٹرانس میں قدم بقدم کہاں آ کر رُکی تھی۔ مگر وہ رُکی کہاں تھی، اُسے تو روکا گیا تھا، وگرنہ آج اُس کے قدم اُٹھنے کے بعد رُک ہی کہاں پا رہے تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، جس سے وہ خفا تھی۔ مگر اُس کی تمام تر ناشکری کے باوجود وہ اُسے اکیلا نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہر برائی میں سے اُس کے لئے اچھائی تلاش کر کے اُسے سوغات کر دیتا تھا اور کبھی پلٹ کر سوال کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ ''اس احسان کا قرض کس طرح چکاؤ گی، کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گی اور کب تک جھٹلاتی رہو گی۔'' وہ کبھی یہ سوال نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ خدا تھا، جانتا تھا، بشر ہو کر وہ اس سوال کا کیا جواب دے سکے گی، لیکن آج دل میں کسی نے چپکے سے کہا تھا۔

''اگر جو واقعی اس نے یہ سوال کر ہی لیا تو وہ جواب میں کیا کہہ پائے گی.......؟''

آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی آنکھیں شرمندگی سے جھک گئی تھیں۔ وہ بڑی بڑی خوشیوں کے پیچھے بھاگنے کی اتنی عادی تھی کہ چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے دامن بھر ہی نہیں پاتی تھی۔

''کیا ہو گیا، اتنی رات گئے تم کہاں جا رہی تھیں؟'' وہ رکشے سے اُتر کر اُس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر وہ رونا نہیں چاہتی تھی، مگر اُس کا کندھا ملتے ہی رونے لگی تھی۔ اُس کی مٹھی میں اُس کی عزت کا

آخری کنارہ دبا ہوا تھا، جسے وہ شکم کی بھوک کے لئے نیلام کرنے نکلی تھی۔

"میں بہت بری ہوں شافی! بہت بری۔ صرف بھوک کے لئے آج میں نے اپنی سوچ کو کہاں تک گرا دیا...... میں اپنی نظروں میں کبھی نہیں اُٹھ سکتی۔"

شافعہ تحیر سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس کی بات کا مطلب سمجھی تو اُس نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"پاگل لڑکی! پریشان تھی تو مجھے ایک فون نہیں کر سکتی تھی؟"

اُس نے پلو سے آنسو پونچھے، پھر بے بسی سے بولی۔ "کیسے فون کرتی؟ میرے پاس پیسے ہی نہیں ہیں۔ میرے پرس میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی ہے۔"

شافعہ سہیل افسوس کرنے لگی۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "مجھے خود تمہارا خیال کرنا چاہئے تھا۔ یہ میری کوتاہی ہے کہ میں نے تم سے صرفِ نظر کیا۔"

مومنہ رفیق نے اُس کے ہاتھ کو محبت کے لمس سے چھوا اور بولی۔ "میں تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہوں شافی! بس خوامخواہ کچھ لمحوں کی دوستی کو جیسے میں نے تم پر حق کی طرح مسلط کر دیا ہے۔" وہ لحہ بھر کو رکی، پھر نرمی سے بولی۔ "تم اتنی اچھی ہو کہ ایک نادیدہ رشتے پر اتنی توجہ خرچ رہی ہو۔ حالانکہ آج کے دور میں کوئی سگا رشتہ اتنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے اس کے اپنے ہونے کا تھوڑا تھوڑا سا یقین آتا ہے۔ شافی! لوگ کہتے ہیں، جانے دنیا اب تک کیوں قائم ہے؟ مگر کوئی یہ سوال پوچھے تو میں کہوں، دنیا تم جیسے لوگوں کے دَم پر قائم ہے۔ جنہیں اچھائی کرنے کے لئے کسی صلے کی تمنا نہیں ہوتی۔ مدد کرنے کے لئے کسی رشتے کا ٹیگ بھی ضروری نہیں لگتا۔ جو بس دونوں ہاتھوں سے دینا جانتے ہیں اور بس۔"

شافعہ مسکراتی رہی۔ اس کے کسی جملے پر اس نے اسے ٹوکا نہیں۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی تعریف سننے کی شائق تھی، بلکہ وہ جانتی تھی، اس کے اندر بہت سارا دھواں بھر گیا ہے۔ تنہائی نے اُس میں جالے تَن دیئے ہیں، اس لئے وہ لفظوں اور باتوں سے اس کثافت کو مٹا دینا چاہتی تھی۔

وہ باتوں کے دوران گرلز ہاسٹل میں آ چکے تھے۔ شافعہ نے کمرے کی روم میٹ کی حیثیت سے مومنہ رفیق کا پچھلے مہینے کا ڈھائی ہزار کرایہ اور کھانے کا خرچ جمع کروایا تھا۔ رجسٹر پر دستخط کیے، رسید لی، پھر رسید مومنہ کو دے کر وہ سختی سے وارڈن سے مخاطب ہوئی تھی۔

"مومنہ کا سامان جس طرح باہر نکالا گیا تھا، اسے اسی ترتیب سے رکھ دیا جائے، وگرنہ اس کی شکایت کمیونٹی دفتر میں بھی درج کروائی جا سکتی ہے۔

وارڈن نے کان دبا کر دو میڈز سے اُس کا سامان اُس کے کمرے میں واپس ترتیب سے رکھوا دیا تھا۔ وہ دونوں اب کمرے میں تھیں۔ اُس کی روم میٹ گہری نیند سو رہی تھی۔ سو شافعہ نے اُسے زحمت دیئے بغیر بہت خاموشی سے مومنہ رفیق کے آگے کھانا رکھ دیا تھا۔ کھانا دیکھ کر مومنہ کی آنکھیں پھر سے برسنے لگی تھیں۔ مگر پھر وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گئی تھی۔ شافعہ سہیل کچھ سمجھ نہیں پائی تھی اُس کے اس رویے کو۔ وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر دو منٹ بعد وہ واش روم سے نکلی تو اُس نے اُس کے گیلے چہرے سے اندازہ لگایا، وہ وضو کر کے باہر آئی تھی۔ اُس نے جائے نماز بچھا کر دو نفل شکرانے کے پڑھے تھے، پھر دوبارہ کھانے کے لئے دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شافعہ اس سارے عرصے میں خاموش رہ کر اُس کی ذات کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ اپنے میں مگن کہنے لگی تھی۔

"جب میں گھر میں ہوتی تھی، مجھے لگتا تھا، مجھ سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ جب میری ماں اپنے برے حالات میں دال یا سبزی پکاتیں اور مجھے سب سے آخر میں کھانا ملتا تو میں کہتی، مجھ سے زیادہ کوئی برا نہیں جی سکتا، جسے کھانے کے لئے ڈھنگ کا کھانا بھی میسر نہیں۔ مگر شافی! جب بے عافیت سے نکل کر دنیا کی بھیڑ میں آئی ہوں، تب کھلا، میں تو بہت عیش میں جی رہی تھی۔ تین وقت کا کھانا برابر کھاتی تھی۔" وہ کچھ لمحے کو خاموش ہوئی، پھر بولی تھی۔ "ان نو سالوں میں میں نے سوکھے ٹکڑے تک پانی میں بھگو کر کھائے ہیں، جو ہم گھر میں بھوسی ٹکڑے والے کو یونہی خیرات کر دیا کرتے تھے۔ میری ماں بہت سخت تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کبھی روٹی نہیں بیچی تھی۔ وہ کہتی تھی، اس سے بڑا گناہ کیا ہے کہ میں اللہ کا دیا رزق بیچوں اور بھوسی ٹکڑے سے کماؤں کتنا، یہی دو روپے، تین روپے۔ کیا بہتر نہیں، یہ میں ایسے ہی خیرات کر دوں۔ ضائع کرنے سے اس کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ اللہ نے جس محبت سے کھانے کو دیا ہمیں بھی اس محبت کا سلوک یاد رکھنا چاہئے...... میری ماں بہت سخت تھی۔ مجھے لگتا تھا، وہ دنیا کی بہت ظالم عورت تھی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے، وہ تو بہت نیک عورت تھی۔ وہ مجھے دنیا کے نشیب و فراز سمجھانے کے لئے حق کا چولا پہنے ہوئے تھی اور میں اُسے سمجھے بغیر اُسے چھوڑ آئی۔ دنیا کبھی ماں نہیں بن سکتی مگر ماں ایک دنیا ہوتی ہے۔ جس نے اسے ٹھکرایا، دنیا بھی اسے ادھورے حوالے کے ساتھ کبھی قبول نہیں کرتی اور ٹھکرا دیتی ہے۔"

شافعہ سہیل نے اس کے لئے گلاس میں پانی انڈیلا تھا، پھر نرمی سے بولی تھی۔

"تم اپنی ماں کو تنا مس کرتی ہو، پھر لوٹ کیوں نہیں جاتیں اُس کے پاس؟ میں نے سنا ہے، اولاد کتنی ہی بری ہو، ماں کو کتنا ہی ستائے لیکن پھر بھی ماں کے دل کا در اور بانہیں ہمیشہ اولاد کے لئے کھلی رہتی ہیں۔"

مومنہ رفیق نے خالی پن سے اُسے دیکھا، پھر نہایت آزردگی سے بولی۔ "میں ایک بار گئی تھی۔ مگر ماں اپنا گھر وہاں سے بیچ کر کہیں اور منتقل ہو گئی۔ میری ماں کا سگا ایک ہی بیٹا تھا، جو میرے یتیم خانے سے گھر لائے جانے کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، یہ گھر اُسی نے اپنی بیوی کے کہنے پر بیچ دیا۔ میں نے معلومات کی تو پتہ چلا، گھر میں روزانہ جھگڑا ہوتا تھا۔ میری بھابی روز اپنے شوہر کو میری

ماں کے خلاف بھڑکاتی تھی اور وہ روز اُسے سخت سست سنایا کرتا۔ محلے والے کہتے ہیں، پتہ نہیں اب وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ اُنہیں معلوم نہیں، میری ماں زندہ بھی ہے یا......" اُس نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ پھر بہت دل گیری سے بولی تھی۔ "شافی! میرا دل کرتا ہے، میری ماں بہت جیے۔ اتنا زیادہ کہ کسی دن میں جو جاہوں تو اُس سے جا کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکوں...... لیکن کیا واقعی ہم سب اپنی غلطی کی معافی مانگ سکتے ہیں؟

شافی! ہمارے پاس ماں اور باپ اور ان کا سایہ تختے کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں، یہ سب ہمارا حق ہے اور حق کے لئے انسان ہمیشہ سخت لہجہ اپنا لیتا ہے۔ حق کے لئے کمینہ تک بن جاتا ہے...... اسے لگتا ہے، یہ اس کا حق ہے تو بس پھر وہ اس حق کو جب تک چاہے، استعمال کرے۔ جتنا استعمال کرے، جس طرح چاہے استعمال کرے۔ مگر حق لینے کے لئے ذمہ داریاں بھی تو کندھوں پر آپڑتی ہیں۔ مگر ہم ذمہ داری نہیں اُٹھاتے۔ غلطی کرتے ہیں دوبار، سہ بار اور سمجھ لیتے ہیں، کون ہے جو ہم سے اس کی بابت سوال کرے۔ کبھی جو ضمیر کچوکے دیتا ہے تو کہتے ہیں، بہت وقت پڑا ہے، فرصت ملی تو غلطیوں کی معافی بھی مانگ ہی لیں گے۔ روٹھے دل منا ہی لیں گے۔ مگر شافی! ہر چیز کی حد ہوتی ہے، عمر کی حد ہوتی ہے۔ ہم یہ بھول کر اپنی چارج شیٹ کے حساب تلخ کرتے رہتے ہیں نہیں جانتے عمر کی حد کہاں، کس لمحے پاؤں سے سمیٹ لی جائے...... معافی مانگنے کی مہلت ملے یا نہیں، معاف کرنے والے لب، معافی اُچھال سکیں یا یونہی ناراض آنکھیں، دل اور خاموش لب لے کر مٹی تلے جا سوئیں، کوئی نہیں جانتا، لیکن ہم پھر بھی معکوس راہوں پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔"

وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ شافعہ نے اُسے بولنے سے روکا نہیں تھا۔ پھر جب مومنہ اندر کے سفر سے واپس لوٹی تب شافعہ نے اُس نے نئی نوکری کی بابت سوال کیا۔

"کہاں اپلائی کیا تھا تم نے؟"

"فیشن اینڈ اسٹائل کے بی ہاف پر مسٹر شہریار کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لئے اپلائی کیا تھا۔"

"کون شہریار عبدالرحمٰن......؟" اُس نے ذہن پر زور ڈالا اور مسکرا کر بولی۔ "تم نے اگر وہاں اپلائی کیا ہے تو سمجھو تمہیں نوکری مل گئی۔"

مومنہ رفیق نے بے بسی سے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کہاں ملے گی نوکری؟ مجھے تو لگتا ہے، پرائیویٹ کمپنیز میں بھی اب سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ میں مقررہ دن پر انٹرویو کے لئے گئی تھی، لیکن پتہ چلا انٹرویو کینسل کر دیئے گئے ہیں۔ مسٹر شہریار کے منیجر نے کہا، ان کے پاس بہت مصروف ہیں۔ میں نے بہت لجاجت سے ان سے بات کرنے کی درخواست کی تو بمشکل بات کروائی گئی مگر مسٹر

شہریار، سوروڈ......"

شافعہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی۔ اُسے اپنی پہلی ملاقات یاد آ کر رہ گئی تھی۔ اس لئے اُس نے ڈھارس کو کہا۔

"وہ واقعی بہت روڈ ہیں۔ مگر مومنہ! جو لوگ روڈ ہوتے ہیں ناں، مجھے لگتا ہے، اُن کے اندر کوئی کمی ضرور ہوتی ہے، جسے چھپانے کے لئے وہ اپنے گرد خول چڑھانے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ رہے شہریار عبدالرحمٰن تو پہلی نظر میں آپ اُن کی شخصیت کے متعلق بہت غلط رائے ضرور رکھ سکتے ہیں، مگر مجھے لگتا ہے، وہ بہت کیئرنگ ہیں۔ تمہارے پاس اُن کا نمبر ہے؟"

مومنہ نے نفی میں سر ہلایا۔ شافعہ سہیل نے کچھ سوچا، پھر جیسے یاد آنے پر اپنا پرس کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر دس منٹ بعد اُس کے بیگ کی الم غلم چیزوں اور وزیٹنگ کارڈز میں سے شہریار عبدالرحمٰن کی کمپنی کا کارڈ برآمد ہوا تھا، جس میں لائن سے سب کے موبائل نمبرز درج تھے۔ یہ خصوصی کارڈ صرف خاص نوعیت کے اہم سمجھے جانے والے افراد ہی کو فراہم کئے جاتے تھے۔ مسٹر صمدانی کے تھرو یہ کارڈ اُسے فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں دیا گیا تھا، جو اُس نے اب تک سنبھال کر رکھا تھا اور اب کام آ گیا تھا۔ اُس نے موبائل نکال کر مومنہ کو نمبر ڈائل کر کے دیا تھا۔

"مجھ سے بات نہیں ہوگی اُن سے۔ وہ بہت کرخت انسان ہیں۔"

"نہیں ہیں کرخت۔ بہت ڈیسنٹ بندہ ہے۔"

"آخاہ، آپ اتنی زیادہ اس کی طرف داری کیوں کر رہی ہیں؟ کچھ دال میں کالا ہے کیا؟" شافعہ سہیل نے اس کے سر پہ چپت لگائی تھی۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ آگے کر کے کہا تھا۔

"بی بی صاحبہ! یہ دیکھ رہی ہیں رنگ؟ اسے انگیجمنٹ رنگ کہتے ہیں۔ یعنی جملہ حقوق بحق فلاں فلاں کے محفوظ ہیں۔ سو یہاں ایسا کوئی خیال عمل میں نہیں آ سکتا۔ اور بالفرض ایسا نہ بھی ہوتا تو میں صبح سب سے پہلے شیشہ دیکھتی ہوں اس لئے بہت سرعت سے جان سکتی ہوں کہ کتنے پانی میں ہوں۔ سو اگر کوئی میری تعریف کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو میں اس کے جھوٹ کا کاؤنٹ شروع کر دیتی ہوں اور دماغی خلجان سے محفوظ رہتی ہوں...... اور پھر بی بی مومنہ! یہ بھی تو ہے، ہم جیسے مڈل کلاس لوگ، اپر کلاس میں چاہیں بھی تو فٹ نہیں آ سکتے۔ پہلے تو پروانہ راہداری ہی نہیں ملتا۔ اگر فلرٹ کے دھوکے میں یہ پروانہ ملنے کی اُمید ہو، تب بھی ساری کلاس مل کر اُس ایک اکیلے بندے کے پیچھے پڑ کر اسے مار مار کر اپنے غول سے باہر نکال دیتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ رشتے اور تعلق داریاں بھی صرف اسی وقت نبھاتے ہیں، استوار کرتے ہیں، جب انہیں اس سے کوئی منفعت کا امکان ہو۔ سو یہ خانہ خالی ہے، اس لئے مجھے ایسے دھوکے نہیں ہوتے۔"

مومنہ رفیق نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شافعہ نے نمبر پریس کرتے کرتے جو ہاتھ روک دیا تھا، پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ پھر طویل گفتگو کے بعد اُس نے جب اُسے کوریڈور سے واپس آ کر اس کے سامنے آ کر اس کی نوکری پکی ہونے کی خبر نشر کی تو مومنہ رفیق کا پہلا سوال تھا۔

''تم نے میرے لئے نوکری خیرات کی طرح تو نہیں مانگی تھی ناں؟ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ شہریار صاحب کا لہجہ آج بھی میرے ساتھ اچھا نہیں تھا اور تم نے بھی میرے سامنے بات کرنے کے بجائے تنہائی کا سہارا لیا تھا۔ کیا واقعی تمہیں لگتا ہے مجھے خیرات کے علاوہ کوئی نوکری نہیں دے سکتا؟'' شافعہ سہیل کے مسکراتے ہونٹ یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ اُس نے اُس کے قریب آ کر کہا۔

''تم...... مومنہ! تم بہت عجیب ہو۔ بہت ہی عجیب۔ کبھی رشتوں، تعلق داریوں کے لئے تڑپتی ہو تو کبھی سب کچھ بہ یک قلم موقوف کر کے تنہا ہو جانے میں عافیت سمجھتی ہو۔ کبھی خدا کی مہربانی کے لئے سجدے کرتی ہو تو کرتی چلی جاتی ہو اور کبھی اس خدا کی ذات سے فرنٹ ہو جانے ہی کو حق مانتی ہو۔ کبھی چاہتی ہو، کوئی اپنائیت سے تمہارے راستے کے سارے کانٹے چن لے اور کبھی تم سارے کانٹے خود اپنے پیروں کی قسمت سمجھ کر اس زنجیر سے خود کو آزاد کرنے کو سب سے بڑا آزار، سب سے بڑا گناہ سمجھتی ہو۔'' لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر آہستگی سے مکر رہ بولی۔ ''میرا خیال ہے مومنہ! اگر انسان قابل ہو تو پہلی بار اُس کی سفارش کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ قابل شخص کو پہلی بار کے بعد دوبارہ کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی آگے کا راستہ طے کرنے کے لئے خود اُس کے قدم منزل کھوج لیتے ہیں۔''

مومنہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی میں جیسے وہ اس کی بات سے متفق ہو کر چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ شافعہ سہیل نے اس کا انداز دیکھا تو خاموشی سے ٹفن بند کرنے لگی۔ پھر اپنے کام سے تھمی تو اپنے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے بیگ میں ڈالنے لگی۔ مومنہ نے فوراً اس کا ہاتھ روک لیا تھا۔

''پلیز نہیں شافی! تم خود بھی تو بہت ساری ذمہ داریوں میں بٹی ہوئی ہو۔ ایک سینئر نرس کو اتنی تنخواہ بھی نہیں ملتی کہ وہ یوں اسے ضائع کرتی پھرے۔''

شافعیہ نے خفگی سے اسے دیکھا، پھر روٹھے پن سے کہا۔ ''تم بھی ناں مومنہ! کیا دوستوں سے وقت یا پیسہ شیئر کرنے سے وہ ضائع ہوتا ہے؟'' لمحہ بھر کو رکی، پھر اسے کندھوں سے تھام کر بولی۔ ''کاش! میں کبھی تمہارا محبت پر خدا پر ایمان پختہ ہوتے دیکھوں۔ لیکن مومنہ ڈیئر! دنیا میں جو چیزیں اب قصہ پارینہ لگتی ہیں، پہلے یہ اسی دنیا میں وجود رکھتی تھیں۔ سو میں اسی قبیلے کی کھوئی ہوئی نسل کی نمائندہ ہوں، اس لئے مانتی ہوں، محبت میں خرچ کی گئی رقم، جذباتیت، عمر، یہ سب ضرب ہو کر واپس ہمیں لوٹا دی جاتی ہیں۔ ایک عمر دنیا کی عمر ہے اور ایک عمر دل میں جینے کی عمر ہے۔ ہم اگر مرنے کے بعد بھی کسی کے دل میں زندہ رہتے ہیں تو ہم اس کی عمر اس کی سانسوں میں نئی طرح سے جی رہے ہوتے ہیں۔ جتنے زیادہ دل، اتنی لمبی عمر، کیا سمجھیں؟'' اُس نے نوٹ اس کے پرس میں ڈال دیا، پھر ملنے کا عندیہ دیتی گرلز ہاسٹل سے باہر

نکلتی چلی گئی۔ مومنا اسے باہر گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ پھر وہ رکشے میں بیٹھی تو اس نے پرس کو دیکھا۔ واقعی اس کے حساب سے زیادہ رقم اُٹھ چکی تھی، یعنی یہ مہینہ اُسے بہت زیادہ ٹف ٹائم دینے والا تھا۔ اُس نے فکرمندی سے سوچا، پھر دل کو تسلی دی کہ وہ مسٹر رفیق سے کہہ کر وہ ایک پرائیویٹ مریضوں کی دیکھ بھال کی اضافی خدمات سرانجام دے کر اس ٹف ٹائم کو کچھ نرم کرنے کی سعی کر سکتی ہے۔



بچے کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ وہ جلے پیر کی بلی بنی کب سے کچن کے کاموں میں مصروف تھی۔ مگر دل تھا کہ بچے کی پہلی آواز سے لے کر اب تک کے مسلسل رونے کے ساتھ خود بھی سسک رہا تھا۔

"باجی! بچہ دیکھیں کیسے روئے جا رہا ہے۔ بڑی بی بی صاحبہ پتہ نہیں کہاں ہیں، آپ کہو تو میں بچے کو دیکھ آؤں جی؟"

کام کرتے کرتے ہاتھ اس التجا پر لحہ بھر کو رُکے، پھر سختی سے کہا گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں آقا زادے کو چھونے کی۔ تمہیں یاد نہیں ہے، پچھلی دفعہ تم نے یہ حرکت کی تھی تو دو دن تک بھوکی رہی تھیں۔"

بڑی سی چادر کا بکل ڈالے عورت نے بھیگی پلکوں سے رحم طلب نظریں سبزی کاٹتی عورت پر ٹکا دیں۔

"کام کرو کنیز! تمہیں اپنی پروا نہیں ہوگی لیکن مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے۔ بڑے آقا صاحب اس بات پر جان سے بھی مار سکتے ہیں۔ وہ آقا زادے کے لئے ملازمہ بھی نسلی تلاش کر کے آئے ہیں تو پھر وہ تمہیں کیسے چھونے دیں گے اسے۔ اپنے دل کو سمجھاؤ اور کام کرو۔ تمہیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر خود سے، اپنی حالت سے اور اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔"

بکل میں کھڑی عورت کی آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگی تھیں لیکن ایک خاموشی کا معاہدہ تھا زندگی سے، سو وہ چپ کر کے اس لوری کو توجہ سے سننے لگی تھی، جو بچے کو چپ کرانے کے لئے اُس کی مالکن گا رہی تھی۔

"پہلے میں کتنا اچھا گایا کرتی تھی۔ اس آواز پر سب سے آگے ہوتی۔ لیکن اب تو لگتا ہے، گلا چھل کر زخم کے سوا کچھ نہیں رہا ہے۔"

اُس نے پلو سے آنسو پونچھے اور سالن بنانے میں مصروف ہو گئی۔ پھر کھانے کی میز پر کھانا چن دیا گیا تو وہ بے مقصد چولہے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ کوئی بھی ڈش دوبارہ منگوائی جا سکتی تھی اور بڑے آقا صاحب کو کھانا تازہ اور گرم کھانے کی اتنی عادت تھی کہ وہ اس سلسلے میں کسی ملازم کی معمولی کوتاہی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ گھر کے سارے ملازم اُن کی عادت سے خوب واقف تھے اور اتنے سال رہ کر وہ بھی ان عادتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ کھانا بخیر و خوبی جس طرح چنا گیا تھا، اسی طرح اُٹھا لیا گیا تھا اور اب وہ حویلی سے ملحق غلام گردش کے کھانے کے کمرے کے باہر کھڑی ملازموں کے بھی کھانا

کھائے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ چولہے کی راکھ کرید کرید کر وہ جانے کون سے سفر، کون سے راستے ناپ رہی تھی کہ ایک کرخت آواز گونجی۔
''کیا مری پڑی ہے، سالن نکال کے دے۔ کتنی آوازیں دیں تجھے تارہ نے، مگر تُو تو عقل کی اندھی ہی نہیں، بہری بھی ہے۔''
ڈش پتیلی پر لا کر پٹخ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے ڈھکن ہٹا کر سالن ڈش میں ڈالنے لگی تھی۔ پتیلی کا آخری سالن بھی ختم ہو چکا تھا۔ خالی باقی پتیلیاں اُس کی بھوک کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ملازم جس طرح وھپ وھپ کرتا آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا تھا۔ وہ برتن دھو کر تھکن سے چُور وجود لئے رسوئی گھر سے اُٹھی تھی، پھر اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ کمرے کے باہر زنجیر ہلی تھی۔
''دیکھو کون آیا ہے؟'' اُس کے کمرے کی تیسری ملازمہ نے پہلی ملازمہ سے بھی پہلے حکم دیا اور وہ، جو ابھی بیٹھنے کے بارے میں بھی نہیں سوچ پائی تھی کہ دروازہ کھولنے چل دی۔ کرخت صورت کمدار اُس کے سامنے کھڑا تھا۔
''تو آج بھی بھوکی رہ گئی ہے ناں؟''
''ہاں، مگر مجھے اب بھوکے رہنے کی عادت ہو چکی ہے۔'' اُس نے نرمی سے جواب دیا۔ مگر کمدار نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔
''دیکھ، تُو جتنا مجھے انکار کرتی ہے، میرے اندر اتنے ہی بھانبھڑ جل اُٹھتے ہیں۔ اگر تُو عزت دار ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ تُو تو پہلے ہی جھوٹی ہے، پھر کیوں اتنا مزاج دکھاتی ہے؟'' کل میں کھڑی عورت کی آنکھوں میں تذلیل سے آنسو بھر آئے، چہرہ سفید پڑ گیا۔ مگر سامنے کھڑے مرد کا وہی ہر روز پرانا والا مطالبہ برقرار تھا۔
''مجھے معاف کر دے شفیقے! میں بہت بری ہوں۔ بہت رذیل۔ مگر دیکھ! اب میں اور پستی میں نہیں گرنا چاہتی۔ دیکھ، تجھے میرے سوہنے رب کا واسطہ۔ وہ غلطی معاف کرنے والا ہے، تُو بھی میری غلطی معاف کر دے۔''
کمدار کے چہرے کی شیطانی مسکراہٹ کچھ اور فراخ ہو گئی۔ اُس نے اُس کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں چھوڑتے خباثت سے کہا۔
''ناانصافی نہ کر کنیزے! مالک بلائے تو تُو چوں بھی نہ کرے، ہم تجھے محبت سے پکاریں تو تجھے سوہنا رب یاد آنے لگتا ہے...... مت بھیجہ خراب کر میرا۔ تجھے معلوم ہے، اتنا انکار میں اپنی جوروں کا بھی نہ سنوں۔ تُو تو پھر کنیز ہے۔ ملازموں کی ملازم۔ چل شاباش، اُٹھ، میں تجھے کھانا دوں گا۔ آج پیٹ بھر کر کھانا کھانا۔ کیا یاد کرے گی، کس سخی سے پالا پڑا تھا۔

اُس نے چادر کو اپنے گرد اور کس کر لپیٹ لیا تھا، مگر لگ رہا تھا کہ چادر سربازار کھینچنے لگی ہے۔

''مجھے نہیں کھانا، تیرا کھانا۔ مجھے نہیں لگی بھوک۔'' اُس نے تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی، مگر کمدار آج تر نگ میں تھا۔ اُس نے بوٹ دروازے میں رکھ کر دروازے کو بند نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

''اماں! سنو، یہ کمدار میری بات نہیں سن رہا۔ اُتھو اماں! اسے روکو۔ تم تو اس حویلی کی پرانی ملازمہ ہو اماں۔'' اُس نے اپنے قریب لیٹی بوڑھی عورت کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس سارے شور سے کمرے کی دونوں عورتوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جس عورت نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا تھا، وہ پوری بتیسی نکالے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے کرختگی سے کہا تھا۔

''چلی بھی جا۔ اب کیوں ریں ریں کر رہی ہے؟ ہم جانتے نہیں ہیں کیا تیری پاکبازی؟ گھر سے بھاگی ہوئی عورت ہے تُو۔ آقا زادے کی جھوٹن۔ اگر کوئی اور چکھنا چاہتا ہے تو انکار کیوں کرتی ہے؟ لے جا شفیعے! آج یہ نہ نہ کا ڈبہ ہی گول کر دے۔ میں بھی تنگ آ گئی ہوں اس چخ چخ سے۔''

بغل میں کھڑی عورت کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔

''اُٹھو اماں! یہ دیکھو، کیا ہونے جا رہا ہے؟ تم بھی تو کسی کی ماں ہو۔ کیا میں تمہیں بیٹی کی طرح نہیں لگتی اماں؟''

اُس نے آخری بار کوشش کی۔ بوڑھے وجود میں حرکت ہوئی۔ بغل اور بوڑھے کھڑی عورت کے جسم میں طاقت بیدار ہوئی۔ شاید وہ بچالی گئی ہے۔ مگر بوڑھے لب ہلے تھے اور اُس نے سنا تھا۔

''لے جا شفیعے! اسے لے جا۔ مجھے اس کا یہ وکھرا پن بڑا کھلتا ہے۔ کیا سمجھتی ہے یہ خود کو، مہارانی ہے یہ کہیں کی...... ہونہہ، ملازم حویلی کی ملازم ہے یہ، اس لئے اس پر سب کا حق ہے۔ لے جا شفیعے! میں بھی تو دیکھوں، اسے کس بات کا گھمنڈ ہے۔''

''اماں!'' اُس نے پھٹی پھٹی آواز میں چیخنا چاہا۔ آج ماں کا بے کراں سینہ، ڈھارس کا کندھا اُسے بہت یاد آیا تھا۔

''مت کرو یہ ظلم...... میں بڑے صاحب سے شکایت کر دوں گی، میں تمہیں کہہ دے رہی ہوں۔''

مگر اندھیری رات سے بھی اندھیرے دل میں اُس کی آواز کہیں دب گئی تھی۔

پھر دوسری صبح، رات سے بھی کالی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی سسک رہی تھی، مگر کسی کو اُس کے رونے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔
"چل اُٹھ شالا! بہت کام پڑا ہے۔" اسی بوڑھی عورت نے اُس کے چور وجود کو ٹھوکر ماری تھی اور اس ٹھوکر سے اُسے وہ لمحے یاد آگئے تھے، جب بہت بے پروائی سے اُس نے بھی اسی طرح محبت کو ٹھوکر ماری تھی۔
"بھری تھالی کو ٹھوکر مارنے والے کبھی نہیں پھلتے۔" اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، مگر وہاں اماں نہیں تھیں، صرف اُن کی نصیحت بھری آواز چکراتی پھر رہی تھی۔
صبح ہو چکی تھی، مگر اُسے لگ رہا تھا، سیاہ گھنگھور رات ابھی تک کوسوں دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اُس نے بدقت اپنے وجود کو مشترکہ غسل خانے کی طرف لے جانے پر آمادہ کیا تھا۔ پھر نہا کر، کپڑے بدل کر جب وہ اپنے کوٹھری نما کمرے سے نکلی تھی تو اُس کے قریب سے جمالا کندھے سے کندھا مار کر گزرا تھا۔
"آج تیرا کھانا میرے ذمے ہے۔ دیکھ، شفیقے جیسا مجھے بھی موقع دے تو تیری عمر بھر غلامی کروں گا۔"
اُس نے اُس پر تھوک دیا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا، اُس نے یہ تھوک زمین پر نہیں، اپنے وجود پر تھوکا تھا۔ آسمان کی بلندی چھونے کے لئے اپنی نسائیت کی اس تذلیل پر وہ خود پر جتنا احتجاج کرتی، کم اتنا کم تھا۔ مگر قسمت یہی تھی...... اور بدقسمتی سے اب یہی اُس کی زندگی کا پیٹرن تھا۔ وہ حویلی میں داخل ہو کر سیدھی کچن میں داخل ہوئی تھی۔ پھر چائے پکنے کے لئے رکھ کر وہ ہیڈ سینک رہی تھی، جب کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ اس حویلی میں لانے والا وجود اُس کے سامنے کھڑا تھا۔
نک سک سے درست، وجاہت کا بہترین نمونہ۔ اُس کے ہونٹوں پر ہمہ وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جیسے اُس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی ڈور تھی اور ان ڈوریوں کو تھرکانے میں کمال مہارت رکھتا تھا۔
"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے ناں؟" شرارت بھری مسکراہٹ سے سوال کیا گیا اور اُس نے بغل میں منہ چھپا کر اپنی ہر تکلیف سے مکرنا چاہا، مگر آنسو بہت تیزی سے پلکوں کی باڑ پھلانگ کر چلے آئے تھے۔
"چ، چ، چ...... تم جیسی لڑکی روتے ہوئے قطعاً اچھی نہیں لگتی۔ دیکھو ناں، اگر تم اس طرح روؤ گی تو مجھے لگے گا، میں اپنی رعیت کے لئے بہت ظالم حکمران ہوں۔ حالانکہ تم جانتی ہو، مجھ جیسا پولائٹ، براڈ مائنڈڈ انسان اس پورے کرۂ ارض میں نہیں ہوگا۔"
اُس نے انتہائی بے بسی سے اُسے دیکھا، پھر ہر تذلیل بھول کر لجاجت سے بولی۔ "مہربانی کرکے شاہ صاحب! مجھے میرے بچے سے ملنے سے تو مت روکیں۔"
"تمہارا بچہ؟" سامنے کھڑے وجود نے اچنبھے سے اُسے دیکھا، پھر جتانے کو سختی سے بولا۔ "تمہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، تم یہاں کنیزوں کی کنیز ہو۔ اور تم جیسی عورت ہماری اولاد پر کوئی دعویٰ کرے، یہ ہم

برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مگر یہ دعویٰ جھوٹا تو نہیں ہے شاہ صاحب! وہ میرا ہی بچہ ہے ماں، جسے آپ نے مالکن کی گود میں لے جا کر ڈال دیا۔"

سامنے کھڑے خوبرو چہرے پر سجے ہونٹ مسکرائے۔ یوں، جیسے اُس کے دعوے کی ساخت پر طنز سے ہنسے ہوں۔ پھر وہ اُس کے قریب آ کر بولا۔ "تم سے جو تعلق تھا، اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ کچھ سالوں کے لئے تم اچھی لگیں اور بس...... مگر اولاد کی تربیت، اس میں، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ وہ ہمارا خون ہے۔ اُسے تم جیسے کم ذات اپنا کہنے کی جسارت بھی کریں تو ہمارا خون کھول اُٹھتا ہے...... ہمیشہ یاد رکھو تم ہمارے ملازموں کی ملازم ہو۔ یہی تمہاری حیثیت ہے اور یہی تمہاری اوقات۔"

آنسو برساتی آنکھوں نے غصے سے خوبرو وجود کو دیکھا اور پھر چلا کر بولی۔ "میری یہی حیثیت ہے، یہی اوقات ہے تو پھر کیوں ہر بار آپ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آ جاتے ہیں؟"

ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ بکل سر سے نیچے گر گیا اور مردانہ ہاتھ کا پورا نشان اُس کے چہرے پر ثبت ہوتا چلا گیا۔ پھر سامنے کھڑے آقازادے نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

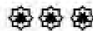
"آواز نیچی رکھ کر بات کیا کرو۔ مجھے ملازموں سے اس آواز میں بات سننا قطعاً پسند نہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس گستاخی کے باوجود تمہاری زبان اور تم سلامت ہو۔ ورنہ ایسے ملازموں کو میں اپنے خونخوار کتوں کے آگے ڈال دیا کرتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر مزید بولا۔ "تمہیں دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ تم میں دھرا ہی کیا ہے، پہلے تو پھر بھی قابل قبول لگتی تھیں، اب تو کسی بھٹیارن سے بھی زیادہ گئی گزری ہو گئی ہو۔ تم سے مجھے اب گھن آنے لگی ہے۔ ہمارے ملازموں کی ملازم بھی لگنے کے لائق نہیں رہی ہو تم...... اور تم ہم سے زبان درازی کرنے کی کوشش کرتی ہو؟ سنو لڑکی! تمہیں میں صرف اس لئے دیکھنے آتا ہوں تاکہ جان سکوں کہ گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں آخر کب تک اپنے الوژن سے باہر نہیں نکل پاتیں۔"

"الوژن......؟" اُس نے سسکاری بھری اور سر جھکا لیا۔

کہانیاں، خوب صورت انجام والی کہانیاں پہلے اُسے کتنی پسند تھیں۔ اُسے ہر وہ کہانی اٹریکٹ کرتی تھی، جس میں ساری دنیا اوپر سے نیچے بھی ہو جاتی، تب بھی ہیرو سے ہیروئن کا ملن ہو کر رہتا۔ ان کہانیوں میں نہ سماج بیچ میں آپاتا ہے، نہ امیری غریبی...... اُسے خواب دیکھنا بہت پسند تھا۔ خوش انجام خواب، جس میں ساری تمنائیں اُس کی رعیت کی طرح ہوتیں۔ سر جھکائے پورا ہونے کی حسرت کرتی ہوئی تمنائیں...... اور وہ مزے سے زندگی کو مسکرا کر دیکھا کرتی۔ اس زمانے میں شاید زندگی مسکرانے ہی کا دوسرا نام تھا، مگر بس اچانک کہیں سے شناخت کا بحران در آیا اور......

”تم......تم پاگل تو نہیں ہو؟ ہمدردی دکھا رہی ہو یا اُسے جلا رہی ہو؟“ کان کے قریب مالکن کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر چونکی اور دوسری ملازمہ نمک مرچ لگا کر صاحب کے کچن میں آنے کا قصہ لے بیٹھی۔
”تمہاری یہ ہمت......“ مالکن کی سانسیں تیز چلنے لگی تھیں۔ ملازمہ کی دی گئی چائے کی پیالی مالکن نے اُس کے چہرے پر اُچھال دی تھی۔ وہ اوک کی آواز نکال کر دوہری ہوگئی تھی۔ تب مالکن کے مخروطی ہاتھوں نے اُس کے ان بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر کھینچا، جن بالوں میں اُس کی ماں کی جان بند تھی۔ اُسے لگتا، کبھی کبھی ماں اُس سے بھی زیادہ اُس کے بالوں سے پیار کرتی ہے۔ اور کبھی جو ماں کنگھی میں بے دھیانی پر سختی کر ڈالتی تو وہ واویلا کر کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ ”اماں! میرے بال کیوں کھینچے؟ کتنا درد ہو رہا ہے ناں مجھے۔“ اور آج وہی بال بےدردی سے کسی کی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھے، مگر چہرے کی جلن کے آگے یہ تکلیف اُسے محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔
”کم ذات، اگر پھر تو نے اُن سے بات کی یا اُن کے سامنے آئی تو میں تیرے چہرے پر تیزاب ڈلوا دوں گی۔ جان سے مار دوں گی۔ چلی جا سامنے سے۔ اب حویلی میں کہیں دکھائی مت دینا۔“ زور سے دھکا دیا گیا اور وہ گھٹنوں کے بل پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی۔
”اماں!“ دل کی گہرائی سے اُس نے ماں کو پکارا۔ مگر یہ حسین محبت کا احساس تو وہ خود پیچھے چھوڑ آئی تھی، پھر کس منہ سے شکوہ کرتی، کس سے شکوہ کرتی۔
وہ مرے مرے قدموں سے چلتی اپنے ملازموں کے کوارٹر کی سمت بڑھتی چلی گئی تھی۔ چہرے کی جلن اتنی تھی کہ چیخ اُٹھانے کو من کرتا تھا۔ اُس نے یکلدم سوچا، گھر میں ہوتے ہوئے ایسے حادثے پر اُس کا کیا ردِعمل ہوتا؟ اُسے ماضی کے کتنے ہی واقعات یاد آ کر رہ گئے تھے، جس میں معمولی سی خراش، چھری سے پڑنے والا کٹ یا کھانا پکاتے ہوئے بھاپ سے جلنے والی کلائی پر وہ سوں سوں کرتی پورے گھر میں ایمرجنسی نافذ کر دیا کرتی تھی۔ اماں بھی تو تھ پیسٹ لگا رہی ہوتیں اور کبھی بہنیں اُس کی دل جوئی کرنے لگتیں اور بھائی کہتا۔ ”اسے کسی اچھے کلینک میں لے جاتے ہیں اماں! گڑیا کو بہت تکلیف ہو رہی ہے شاید۔“ پھر اماں لاکھ منع کرتیں، مگر بھائی اُسے بائیک پر بٹھا کر کسی نہ کسی کلینک لے ہی جاتا۔ پھر ڈاکٹر کے لاکھ تسلی دینے پر بھی وہ اسی پریشانی سے کہتا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کوئی فکرمندی کی بات تو نہیں ہے ناں؟ دیکھئے، مجھے میری بہنیں بہت عزیز ہیں۔“ ڈاکٹر مسکرانے لگتا۔ اُس کے بھائی کی محبت پر اُسے رشک سے دیکھنے لگتا۔ مگر آج......وہ آدھے وجود سے بستر پر گر گئی تھی۔
”میں نے جو کیا اسی کی سزا پائی۔ میرے بھائی برے نہیں تھے مگر مجھے صبر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اور بےصبری کا کام شیطان کا کام ہوتا ہے۔ میں نے اماں کی نصیحتیں جوں جوں ٹھوکر سے ماریں توں توں زندگی نے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ جو ہوا، میرے کیے گئے اعمال کا صلہ ہے۔ مگر میرے اللہ! تجھے تو بخشش کرنے کی اتنی عادت ہے کہ میرے گناہ تیری معافی کے آگے مثل صابن کے جھاگ کے کچھ

نہیں......کیا یہ سزا ختم ہوگی کبھی؟ کیا کبھی میں اس جہنم سے نکل سکوں گی......؟'' اُس نے تکیے پر سر ڈالا، ہاتھ بلند کر کے دُعا مانگی، پھر تکلیف کی حدت کے باوجود رات بھر کے جاگے ہوئے وجود نے نیند میں کب پناہ ڈھونڈی، اُسے خبر نہیں ہوسکی۔



''اماں! خیریت تو ہے؟ آپ بہت ہراساں لگ رہی ہیں؟'' زہرہ جنید نے گرل سے پار صبح ہوتی کرنوں میں کھو جانے والی اُمید کو کھوجنے کی کوشش کی۔ مگر زہرہ جنید، جو ناشتے کے ساتھ ساتھ ماں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں، اُن کے چہرے کی ہراسگی کسی طور نظر انداز نہ کرسکیں۔

شاکرہ بانو نے بیٹی کو دیکھا، پھر بے چارگی سے بولیں۔ ''پتہ نہیں۔ لیکن نائمہ میرے دھیان سے نکلتی ہی نہیں ہے۔ اتنی لاابالی، اتنی کام چور سی تو لڑکی تھی وہ۔ جانے اب کہاں کہاں کی خاک چھان رہی ہو گی، جانے کس حال میں ہوگی۔ کتابوں سے زیادہ اس نے زندگی پر توجہ ہی کب دی تھی، جو اب زندگی کے ناز اُٹھا رہی ہوگی۔''

زہرہ جنید کو لگا، اب مزید چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارنا دوبھر ہوگا۔ وہ کرسی کھسکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اماں تک آ کر رک گئیں، پھر لجاجت سے بولیں۔

''وہ جہاں ہوگی، عیش سے ہوگی۔ تبھی تو اُس نے پلٹ کر ہمیں ہلکا سا یاد بھی کرنا ضروری نہیں سمجھا۔''

گلے میں آنکھوں کے آنسو در آئے تھے۔ تبھی شاکرہ بانو نے بیٹی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دل گیری سے پوچھا تھا۔

''تم تو دنیا کو اچھی طرح جانتی ہو۔ تم بتاؤ، کیا گھر سے نکلی ہوئی لڑکی بہت عیش سے زندگی گزار سکتی ہے؟''

زہرہ جنید نے آنکھیں نیچے کرلیں، پھر شاکرہ بانو کو دونوں کندھوں سے تھام کر ناشتے کی ٹیبل تک لے آئیں۔

''ناشتہ کرلیجیے اماں! وگرنہ سلامہ آئے گا تو مجھ پر خفا ہوگا کہ میں نے اتنی دیر تک آپ کو بھوکا کیوں رکھا۔''

اماں بنا چوں چرا اُن کے ناشتے کی ٹیبل کے گرد اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ ''تمہاری جنید سے دوبارہ بات ہوئی زہرہ؟''

زہرہ جنید، جو اُن کے لیے بریڈ پر مارجرین لگانے میں مصروف تھیں، یکدم ٹھہر کر خالی آنکھوں سے ماں کو دیکھنے لگیں۔ پچھلے چھ سات سال سے وہ جس جوکھم میں پھنسی تھیں، ابھی تک نکل نہیں پائی تھیں۔

جنید ہر ہفتے بچوں سے ملنے آتے تھے، اُنھیں باہر کھانا کھلانے لے جاتے تھے مگر ماں سے کیے وعدے پر ایسے کاربند تھے کہ ابھی تک وہ بچھڑے دوستوں کی طرح مل پانے کی حسرت کرنے میں بھی ناکام رہے تھے، چہ جائیکہ شریک سفر کی طرح ایک دوسرے کو خوش آمدید نظروں سے دیکھتے۔

''تم نے بتایا نہیں، جنید نے ابھی تک تمہارے معاملے کا کوئی حل نہیں نکالا؟'' شاکرہ بانو آج اس موضوع سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھیں اور زہرہ جنید چاہتی تھیں، وہ یہ موضوع بھول جائیں۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی نئی بات کہہ کر اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو پاتیں، اچانک ڈور بیل بجی۔ زہرہ جنید تیزی سے اُٹھیں۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ سلامہ ارسلان کے ساتھ لوٹی تھیں۔ سلامہ، عارفہ کو کالج چھوڑنے گیا تھا۔ کچھ احباب نے نائمہ کے بعد عارفہ کے مستقبل پر قدغن لگانے کی کوشش کی تھی مگر اُس نے نہایت سرد مزاجی سے یہ آپشن ٹھکرا دیا تھا اور تلخ لہجے میں بولا تھا۔

''میری غلطی کہاں تھی، میں جان گیا ہوں۔ اس لئے تاریخ اب کبھی خود کو دوبارہ نہیں دہرائے گی۔ عارفہ کو اتنی سہولت، عیش، آرام دوں گا میں کہ پھر اس میں نائمہ جیسی ٹیڑھ پیدا نہیں ہو سکے گی۔ وہ دولت کے پیچھے گھر چھوڑ کر گئی تھی ناں، میں نے اُس کے جانے پر گھر میں اُس کی جگہ دولت سے پُر کر دی۔ اب ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا، نائمہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔''

شاکرہ بانو ان باتوں پر بہت کلستی تھیں، لیکن آج.......

''کوئی خاص بات تم کچھ پریشان لگ رہے ہو، کیا رات کو سو نہیں سکے تھے؟'' شاکرہ بانو نے بیٹے کی آنکھوں کی سرخی سے جانچ کی، مگر وہ اپنے لئے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے رُکھی میں بولا۔

''کوئی خاص بات نہیں تھی اماں! بس ایک اسٹوری پر کام کر رہا تھا، اس لئے رات دیر گئے سو سکا تھا۔''

شاکرہ بانو نے سلامہ ارسلان کو اسی توجہ سے دیکھا، جیسے انہیں اُس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ ''تم ماں سے جھوٹ نہیں بول سکتے، تم جانتے ہو ناں یہ بات۔ پھر کوشش ہی کیوں کرتے ہو؟''

سلامہ ارسلان نے سپ لیتے ہوئے شاکرہ بانو کو دیکھا، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کا بیٹا ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اگر میں یہ خبر دوں گا تو آپ ہر صورت اُسے ملنے جانے کی ضد کریں گی اور یہ میں نہیں چاہتا کہ آپ وہاں جائیں۔''

شاکرہ بانو نے بریڈ پیس پلیٹ میں پٹخ دیا تھا، پھر خفگی سے بولی تھیں۔ ''تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے اب تک چھپا کر رکھی، میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں شہریار کے ہسپتال ایڈمٹ ہونے کی اطلاع آج ہی ملی ہو گی۔''

وہ کچھ نہیں بولا تھا اور شاکرہ بانو تیزی سے اُٹھی تھیں۔ ”مجھے شہریار کو دیکھنے ہسپتال جانا ہے۔“ اپنے کمرے کی طرف جاتے سلامہ ارسلان کو انہوں نے خاص جتا کر کہا اور اُس نے مڑ کر خفگی سے کہا۔

”پتہ نہیں، کیا جادو کر دیا ہے اُس نے آپ پر کہ اُس کی وجہ سے ملنے والے دکھوں کی ایک لمبی رات کاٹنے کے باوجود آپ کا دل اُس کے لئے نرم ہے۔“

شاکرہ بانو نے بیٹے کی طرف دیکھا، پھر تیقن سے بولیں۔

”مجھے حیرت ہوتی ہے، جو بات ڈاکٹرز نے وقتی طور پر تمہاری ریکوری میں مشکل ڈالنے کے سبب تم سے دور کی تھی، تم نے ٹھیک ہونے کے باوجود خود کو اُس سے اسی طرح دُور کر لیا، جیسے کبھی کوئی میل ہی نہیں تھا۔

سلامہ ارسلان کے چہرے پر غصہ آیا تھا، مگر لمحہ بھر کو، پھر وہ ماں کے قریب آ کر بولا تھا۔ ”آپ غلط سمجھتی ہیں کہ میں شہریار کو اُس کے دکھ کا سبب سمجھ کر اُس سے دور ہوا ہوں۔ دراصل زندگی کے اس تلخ سچ سے میں نے صرف ایک ہی بات سیکھی ہے، غریب ہونا دنیا کا سب سے بڑا الزام ہے اور یہ جو امارت کے بل پر امراء ورکرز کی اولادوں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں ناں تو یہ دراصل آپ کی غربت سے حظ لینے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ انہیں آپ سے، آپ کی پرابلمز اور ضرورتوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ صرف اپنی حاشیہ برداری کے لئے انہیں لوگ چاہئے ہوتے ہیں، جو اُن کی جے جے کار کریں، اُن کے بوٹ چاٹنے کو زندگی کا ایمان سمجھیں۔ مگر میں اس فیز سے نکل آیا ہوں۔ اب میں جانتا ہوں، زمانے کو کس طرح اپنے لئے موڑا جا سکتا ہے۔ زمانے کے دل پر کیسے حکمرانی کی جا سکتی ہے اور سو کالڈ امراء کی محفلوں میں ان کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر کیسے حالات و واقعات کا رخ موڑ کر عزت کروائی جاتی ہے، میں یہ جان گیا ہوں۔ اس لئے سرمایہ دار طبقے سے دوستیاں گانٹھنا شایانِ شان نہیں سمجھتا۔“

شاکرہ بانو منہ پر ہاتھ رکھے بیٹے کی لمحہ بہ لمحہ ہونے والی تبدیلی کو ایک مکمل شکل میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ جس مقام پر تھا، اسے کسی اور سمت موڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے بحث ضروری نہیں خیال کی تھی اور چادر پہننے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی تھیں اور زہرہ جنید، جو اتنی دیر سے ماں بیٹے کی گفتگو میں صمٌ بکمٌ بیٹھی ہوئی تھیں، یکدم سلامہ ارسلان کے قریب آ کر فکرمندی سے بولی تھیں۔

”شہریار کو ہوا کیا ہے؟ دو تین دن پہلے وہ مجھے ایکسپو سینٹر میں ملا تھا۔ اُس کے کسی دوست کا موبائل اسٹال تھا وہاں۔ اس لمحے تو وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا، پھر یہ اچانک.....“

سلامہ ارسلان نے زہرہ جنید کو دیکھا، پھر سفاکی سے بولا۔ ”انجائنا پیشنٹ ہے وہ۔ سات سال پرانا مرض ہے یہ اُسے۔“ لمحہ بھر کو رکا، پھر طنز سے بولا۔ ”بھائی لوگ عیش و آرام میں ہوں، تب بھی دل تھامے ہسپتال کی سیر کرنے نکل پڑتے ہیں....... ان سے اچھے تو ہم ہیں ناں، سخت جانی سے ہر واردات دل پر سہہ کر بھی استقامت سے کھڑے رہتے ہیں۔“

زہرہ جنید کچھ نہیں بولی تھیں۔اُن کا دل یکدم شہریار کے لئے ممتا سے بھر گیا تھا اور شاکرہ بانو، جو چادر پہن کر باہر آئی تھیں، وہ دونوں بہن بھائی کو بات کرتے دیکھ کر ان کی باتوں میں چھپی خبر سے اچھی خاصی ہراساں ہوگئی تھیں۔

"اتنی سی عمر میں یہ کیا مرض پال لیا ہے اس بچے نے؟" اماں نے پہلا جملہ کہا، پھر زہرہ کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔ "کیا تم مجھے ہسپتال لے چلو گی؟ یا تم بھی اپنے بھائی کی طرح بے حسی دکھانا چاہو گی؟"

زہرہ جنید نے کار کی چابیاں اٹھائی تھیں۔پھر شاکرہ بانو کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے انہوں نے شاکرہ بانو کو ریلیکس کرنے کی جتنی کوشش کی تھی،اس کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

"جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گی اپنے بچے کو، سکون نہیں ملے گا مجھے۔"

شاکرہ بانو نے اس جملے کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی اور کار فراٹے بھرتی ہسپتال کی سمت اُڑی جا رہی تھی۔



ملازم نے کوئی تیسری بار اُس کے کمرے کو ناک کیا تھا، مگر جواب میں وہی خاموشی طاری تھی۔ملازم نے نئی طرح سے پرانی دستک دی، تب ہلکی سی کمرے میں آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

"چھوٹی بی بی! بڑی بیگم صاحبہ آپ کا ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں۔" ملازم نے رٹے رٹائے جملے دہرائے اور اندر سے بوجھل آواز اُبھری۔

"نہیں کرنا مجھے ناشتہ۔مما سے کہو، وہ اکیلے ناشتہ کر لیں۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ملازم سر ہلاتا ہوا واپس کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا، مگر پہلے اس سے کہ کچھ کہہ پاتا، اُس کی نظر بڑے صاحب پر گئی تو ہوش بجا رکھنے دشوار لگنے لگے تھے۔

"کیا بات ہے، تم اونٹ کی طرح کیا منہ اٹھائے سامنے آن کھڑے ہوئے ہو؟" بڑے صاحب نے حسبِ توقع سختی سے سوال کیا۔وہ ہڑبڑا کر رہ گیا۔بیگم صاحبہ نے اُن کی مشکل سمجھی تو بولیں۔

"کیا کہہ رہی ہے زرش؟ تم اُسے اُٹھانے گئے تھے ناں؟"

"کیا یہ اُسے اُٹھانے گیا تھا؟" بڑے صاحب کے چہرے پر چنگیزی غصہ اُبھر آیا۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے، میری بیٹی کو ڈسٹرب مت کیا کرو، مگر تمہاری مڈل کلاس ذہنیت....."

صاحب کا پارہ ہمیشہ کی طرح ہائی ہو گیا تھا۔ ملازم نے منظر عام سے ہٹ جانے میں عافیت سمجھی تھی اور صاحب کی نظریں کھا جانے والے انداز میں بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ ''میں نے تم سے کچھ کہا ہے نا، تم کیوں بے بی کی عادتوں میں مخل ہوتی ہو؟''

''بے بی...... وہ اب بے بی نہیں رہی ہے آغا صاحب! وہ اب پچیس سال کی لڑکی ہے۔ مگر آپ سمجھتے ہیں، ابھی تک وہ باربی ڈول اور فیری ٹیل سننے کی عمر سے باہر نہیں نکلی۔ آپ ہمیشہ باہر رہتے ہیں، گھر آتے ہیں وہ ایک ہفتے کے لئے۔ آپ کو کیا پتہ، آپ کے پیچھے آپ کی اولاد کیا کیا کرتی پھرتی ہے۔''

''کیا کیا کرتی پھرتی ہے، میں بھی تو سنوں۔'' انہوں نے کپ ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور بیگم عمرانی نے فوراً شکایتی دفتر کھول لیا تھا۔ غصے سے بھنانے کے باوجود لہجہ سنبھال کر بولی تھیں۔

''ثانیہ کی طرح زرش کی بھی زندگی پارٹی، ڈانس کلب تک ہی محدود ہو گئی ہے۔ پانچ سال سے وہ یہی زندگی گزارنے کی عادت ہو گئی ہے۔ صبح منہ اندھیرے گھر آتی ہے اور کبھی کبھی گھر آتی ہی نہیں ہے۔ کچھ پوچھوں تو کہتی ہے، یہی عمر ہے مما لائف انجوائے کرنے کی۔ آپ کے دیئے گئے فلیٹ میں رہتی ہے، غیر مردوں سے سلام دعا کرتی ہے۔ مجھے تو اُس کے طور طریقے بھی اچھے نہیں لگتے۔''

آغا صاحب نے توجہ سے سنا، مگر ردعمل، وہ بہت حیرت ناک تھا۔ سخت مزاج عمرانی صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے جا رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا، یہ باتیں جن پر وہ خود کڑھتی رہتی ہیں، اُن کے شوہر کے علم میں آئیں تو شاید اُن کا مزاج بھی مکدر کر دیں گی۔ مگر یہاں ردعمل بہت وکھرا تھا۔

''آپ کو میری باتیں ہنسنے کے قابل لگ رہی ہیں۔ حالانکہ ثانیہ کی دفعہ میں آپ دھوکا کھا چکے ہیں۔''

''بتاؤ......'' مسز عمرانی نے لاپروائی سے پھر سے چائے کا کپ لبریز کیا تھا، پھر جتانے کو بولے تھے۔ ''زرش اور ثانیہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ثانیہ کو آسمان کی جگہ زمین پسند تھی۔ مگر زرش، اُسے آسمان سے کم کوئی چیز رکنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں جانتا ہوں اپنی بیٹی کو...... تمہیں کیا پتہ، شہرت کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ماڈلنگ میں اتنا بڑا نام ہے کہ مجھے اس پر کبھی کبھی بہت فخر ہوتا ہے۔ رسالوں میں اُس کی تصویریں، انٹرویو، یہ سب بہت انٹرسٹنگ ہے میرے لئے۔''

بیگم عمرانی نے شوہر کو رحم طلب نظروں سے دیکھا اور بھرائے لہجے میں بولیں۔ ''اتنے سال ہو گئے مجھے آپ کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے، مگر میں ابھی تک آپ کو نہیں سمجھ سکی۔ آپ کو بیٹی کے انٹرویو اچھے لگتے ہیں، اُس کی فیشن رسائل کی تصویریں آپ کو آرٹ دکھائی دیتی ہیں۔ راتوں کو گھر سے غائب ہونا، لائف انجوائے منٹ کے زمرے میں اپنی تمام بدصورتیوں کو چھپا لیتا ہے۔ لیکن عمرانی صاحب! یہ

ٹھیک نہیں ہے۔ ہم یورپ میں نہیں جی رہے ہیں، ہم پاکستان میں رہتے ہیں۔ یہاں باپوں کی ذمہ داری کچھ اور ہے جو آپ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔"
"ہاں...... بس کرو یا اپنے پریکٹیکل معاشرے کی باتیں۔ مجھے اچھی نہیں لگتی ہیں یہ فضول باتیں۔ زندگی کو میں اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔ سو مجھے اور میرے بچوں کو زندگی انجوائے کرنے دو۔ اپنا گلٹ تم اپنے پاس رکھو۔ مولوی اسمٰعیل کی بیٹی ہو تو یہ حوالہ صرف اپنے تک محدود رکھو۔ مجھ پر یا میری بیٹی پر اسے مسلط مت کرو۔"
بیگم عمرانی نے پھر کچھ نہیں کہا تھا گمران کے جانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں گئیں تو جیسے کسی نے ان کے پیر جکڑ لئے تھے۔ یہ آواز...... کتنی پیاری تھی یہ آواز جب لحن سے قرأت کرتی تو اُس کا دل اندر ہی اندر جھومے جاتا۔ مگر ایک دن یہی آواز اُس کے پیچھے کتنی دُور تک آئی تھی۔
"مت محبت کے دھوکے میں آ۔ وہ لڑکا اچھا نہیں۔ تیرے باپ کی بے عزتی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، وہ تجھے ایک اشارہ دے تو تُو اُس کے لئے گھر بار چھوڑ دے گی۔ وہ تیرے باپ پر ہنستا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی کیا تربیت کی ہے کہ وہ جب چاہے اس تربیت کو سوالیہ نشان بنا سکتا ہے۔ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔"
"اماں! مجھے بس شادی کرنی ہے تو عمرانی سے۔ بس، کہہ دو ابا سے۔" انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔ پھر ابا نے اُس کی شادی عمرانی سے کر دی تھی۔ مگر دہلیز سے پار جانے سے پہلے کہا تھا۔
"آج کے بعد تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں، تُو ہمارے لئے مرگئی ہے۔"
انہوں نے عمرانی کے ساتھ کھڑے ہوئے غرور وانبساط سے دیکھا تھا۔ انہیں ابا کی بات بری نہیں لگی تھی، نہ ہی اماں کی خاموش واویلا کرتی، بین ڈالتی آنکھوں نے اُن پر اثر کیا تھا۔ انہیں لگتا تھا، آج وہ خوش ہیں تو زمین آسمان خوش ہیں۔ انہوں نے محبت کی تھی، محبت پائی تھی۔ یہ سب سے مسرت آمیز بات تھی۔
مگر شادی کے تیسرے دن عمرانی کھڑے تھے۔ "او ب گیا ہوں میں تم سے۔ مجھے بہت دیر تک کوئی وجود اٹریکٹ نہیں کرتا۔ تم بڑی پردہ دار، بڑی ویلیو والی تھیں، تبھی یہ شادی کا ڈھونگ بھی کرنا پڑا۔ اگر باتوں سے، دولت کی چمک سے ہی قابو آجاتی تو یہ گھنٹی گلے میں نہ ڈالنی پڑتی۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں تمہارا؟"
انہوں نے چوتھی کی دُلہن کی ساری شوخی کو اپنی آنکھوں میں مرتے پایا تھا۔ پھر بڑی لجاجت سے بولی تھیں۔ "جو نام دیا ہے، وہ کبھی مت چھینئے گا۔ میں آپ کے کسی شوق میں حارج نہیں ہوں گی۔"
اور آج اتنے سالوں بعد بھی وہ وہیں کھڑی تھیں۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے جیسے گھر کا کھانا ٹیسٹ کرلیا جاتا ہے۔ عمرانی کی زندگی میں بھی اُن کی یہی اوقات تھی اور آج وہ اپنی دوسری بیٹی کے لئے

بھی بے راہ روہونے کے باوجود عضو معطل سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔

''اماں! مجھے آپ کے خاموش بیٹوں نے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی ہے جو مجھ میں دن رات رہتا رہتا ہے...... کوئی ہے، جو کہتا ہے مولوی اسمٰعیل کی بیٹی، مولوی بشارت کی پوتی ہوکر تم نے جوانے پیار کرنے والوں کے ساتھ کیا، وہی وقت تمھیں لوٹا رہا ہے۔ ایک بیٹی ہے، سوسائٹی پراپرٹی کی طرح، جسے اس کا شوہر آرٹ مانتا تھا اور ایک بیٹی تھی، وہ کہیں اپنی پسند کی شادی کر کے زمانے کی بھیڑ میں کھوگئی تھی۔ اُس نے تو اُن کی طرح اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور اس کے مرنے کے دوسال بعد اُنہیں پتہ چلا تھا کہ وہ مرگئی ہے۔ بیٹی کے مرنے کی خبر پر وہ ماہئ بے آب کی طرح تڑپی تھیں اور ان کے شوہر نے نخوت سے کہا تھا۔

''مرگئی ہے تو مرنے دو۔ مجھے ایسی اولاد نہیں چاہیے، جس نے میرا نام ڈبودیا۔ ایسے شخص سے شادی کی، جس نسل کے ہم کتے بھی نہیں پالتے۔''

وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر بے مصرف جھولنے لگی تھیں اور وقت مٹھی میں فرشتہ اجل کی طرح اُن کی حسرت کو قید کیے خاموش کھڑا تھا۔ اُن کی زندگی کا بدن سرد تھا اور سانسیں کسی نے بھینچ رکھی تھیں۔ یہ درد مسلسل کی طرح تھا۔ مگر وہ اس سے رہائی نہیں چاہتی تھیں۔ اُنہیں لگتا تھا اگر خطا کی سزا دنیا میں ہی کچھ کاٹ لی جائے تو اعمال نامہ کا وزن کچھ قیراط کم ہوجاتا ہے۔

لیکن کیا ایسا ممکن تھا؟...... کچھ دل تھے، جو ٹھنڈک میں لپٹے خاک میں مل کر خاک ہوچکے تھے۔ وہ ایسے ہر لمحے یہی پوچھتے تھے۔ ''کیا ایسا ممکن ہے، دل دُکھانے اور معافی مانگے بغیر کسی جرم کی سزا اور اس جرم کی نوعیت میں نرمی برتی جاسکتی ہے؟'' وقت ایسے ہر لمحے میں خاموش رہتا تھا اور یہی خاموشی مسلسل اُن کی سزا کا حصہ تھی۔

انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں اور خود کو وقت کے حوالے کردیا تھا۔



شہریار اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ عدیل بھائی اور عاطف بیگ، پاپا کے ساتھ اُن کی ڈھارس کے لئے ہمہ وقت موجود تھے۔ صبح چیک اپ پر ڈاکٹر صمدانی اپنے ہاسپٹل جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں آئے تو وہ ہر روز سے زیادہ فریش نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی کل دن بھر کی اُس کی رپورٹس پڑھ رہے تھے۔ وہ انتہائی منہمک تھے، جب اُس نے چھٹی کی بات کی تھی۔

ڈاکٹر صمدانی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تھا، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ ''اچھا تو تمہیں لگتا ہے تم چار دن میں فٹ ہوچکے ہو۔''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب اچانک انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔
”زمین پر پیر رکھ کر واش روم تک دس قدم چلنا اور بات ہے، لیکن عام روٹین میں قدموں کا ساتھ دے پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“
شہریار نے اُن کی طرف دیکھا، پھر اپنے اصل لہجے میں بولا۔ ”آسان کام میری زندگی میں کبھی دستیاب ہی نہیں ہو سکے۔ مشکل کام کرنا میری عادت بن چکے ہیں، اس لئے پلیز! آپ میری درخواست پر غور کریں۔“
ڈاکٹر صمدانی نے اس سے متفق ہونے کی کوشش کی، مگر پھر بھی ایک ڈاکٹر کی طرح ہی سخت لہجہ اپنا کر بولے۔ ”تمہارے نئے سرے سے ٹیسٹ ہوں گے۔ زمین پر پیر رکھ کر بھی چلتے ہوئے تمہاری فیلنگ بہتر ہوئیں، دوبارہ سے ای سی جی مانیٹرنگ ہو کر بھی رزلٹ تمہارے حسب خواہش نکلا تب ہی میں کوئی فیصلہ لے سکوں گا۔“
شہریار نے فوراً عمل کرنے کی پیشکش کر دی۔ عاطف بیگ، جوان دونوں کی باتوں کو آدھی سوئی، آدھی جاگی کیفیت میں خالی الذہنی سے سن رہا تھا، اس کے پیر لٹکانے پر فوراً اُس کے قریب پہنچا تھا۔
”انکل! آپ کو لگتا ہے، اس وقت اس کا چلنا بہتر رہے گا؟“
ڈاکٹر صمدانی نے کندھے اچکائے تھے، پھر نرمی سے بولے تھے۔ ”میں نے تو ایک آپشن رکھا ہے۔ فیصلہ تو خود ان کا ہے۔ سو بس دیکھنا چاہتا ہوں، اس کی چھٹی کی درخواست تک درست رہے گی۔“
عاطف نے اُسے اس خیال سے باز رہنے کا عندیہ دیا مگر وہ مانا نہیں۔
ڈاکٹر صمدانی کے آنے کی اطلاع پر ڈاکٹر سہیل بھی کمرے میں چلے آئے تھے۔ انہوں نے ماحول دیکھا تو ڈاکٹر صمدانی کو حیرت سے مخاطب کیا۔ ”سر! کیا اس وقت یہ ٹیسٹ بہتر رہے گا؟ مسٹر شہریار کی کنڈیشن کیا اس کی اجازت دیتی ہے؟“
عاطف بیگ نے گھبرا کر شہریار کو دیکھا اور اُس نے بنا تاثر کے ڈاکٹر سہیل کو مخاطب کیا۔ ”سر! کنڈیشن جو بھی ہو، یہ طے ہے، اب میں مزید ہسپتال میں نہیں رہ سکتا۔ میرے بہت سے ضروری کام پینڈنگ میں پڑے ہوئے ہیں، اس لئے مجھے یہاں سے جانا ہی ہے۔“
ڈاکٹر سہیل کچھ نہیں بولے تھے اور ڈاکٹر صمدانی نے اپنے دیگر معاونین کے ساتھ اُس کے باقی ٹیسٹ لینے شروع کر دیئے۔ بلڈ پریشر رپورٹ، کولیسٹرول رپورٹ اور دیگر ٹیسٹ بہتر آئے تھے۔ سو اُس نے

ڈاکٹر صمدانی کے اگلے ٹیسٹ کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی۔ عاطف بیگ نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اس محبت سے اُسے باز رکھا تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح اپنے آپ پر انحصار کرنا چاہتا تھا، سو بہت دھیمے قدموں سے کمرے میں چلنے لگا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی نے ٹائم دیکھ کر اُسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ عاطف بیگ اس کے چہرے کی نقاہت سے پریشان ہو رہا تھا اور ڈاکٹر سہیل، ڈاکٹر صمدانی سے اس کے سلسلے میں اپنی میڈیکل لینگویج میں محو گفتگو تھے۔ وہ واپس آ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ نرس نے ای سی جی مانیٹر آن کر دیا تھا۔ اُس کی دھڑکنیں بے ترتیب نہیں تھیں۔ جو کچھ اثر تھا، اس میں ننانوے فیصد کمزوری کا عمل دخل تھا۔ ڈاکٹر صمدانی نے مانیٹر آف کروا دیا تھا۔ اب وہ نبض دیکھ رہے تھے۔ اسٹیتھو سکوپ سے بھی جانچ کر لی گئی تھی، سو رزلٹ اناؤنس کرتے ہوئے انہوں نے اُسے ساٹھ فیصد بہتر ہونے کا مارجن دیا تھا۔

''تمہاری ریکوری حیرت انگیز ہے۔ ٹھیک ہے، میرا خیال ہے، تین چار دن میں تم واقعی اس قابل ہو جاؤ گے کہ ڈسچارج کیے جا سکو۔ لیکن یاد رہے، اس کے باوجود ہر ہفتے چیک اپ کے لئے تمہیں یہاں آتے رہنا پڑے گا اور دواؤں میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہوگا۔''

اُس نے سر ہلا کر آرام دہ حالت میں لیٹ کر اُن کی ہر بات سے متفق نظر آنے کی کوشش کی تھی۔ عاطف بیگ اُسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ عدیل بھائی ناشتے کی باسکٹ لئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

''کیسے ہو ینگ مین! میں نے سنا، ڈاکٹر صمدانی اپنے شیر جوان سے بہت امپریس ہو گئے ہیں۔''

وہ کچھ نہیں بولا، مسکراتا رہا۔ عاطف اُس کا ناشتہ اُس کے سامنے ٹیبل پر لگانے لگا۔ تب اُس نے مدھم سے لہجے میں پوچھا۔ ''دانیا کچھ مصروف تھی بڑے بھیا؟''

عدیل عبدالرحمن نے پلٹ کر اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ ''مصروف تو نہیں تھی، بلکہ وہ تو آج بھی آنے کی ضد کر رہی تھی، مگر میں نے کہا تھا، پہلے سے تین چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ کام کا حرج مت کرو۔ سو بمشکل راضی ہوئی تھی۔''

شہریار نے مزید نہیں کریدا تھا۔ لیکن یہ طے تھا، اُسے اس بات پر یقین بھی نہیں آیا تھا۔ عدیل بھائی نے دانیا کا رول پلے کرنے کی کوشش میں اس کے سامنے رکھے باؤل میں سوپ کے چمچے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے بولنے سے منع کر دیا۔

"میں مینج کرلوں گا بھائی! آپ عاطف کے ساتھ ناشتہ کرلیں جا کر۔"

"آر یو شیور؟" عدیل بھائی نے جانچنے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے اندر کی کیفیت اندر ہی رہنے دی اور پورے اعتماد سے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں ناں، اس سچویشن کو ہینڈل کرلوں گا۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔"

عدیل بھائی نے انداز میں قطعیت دیکھی تو خاموشی سے اُٹھ کر عاطف کے قریب جا بیٹھے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں رات کا قصہ کریدتے رہے۔ دانیا کی اچانک واپسی ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ مگر رات کوشش کے باوجود نہ عاطف بیگ نے معاملے کی ہوا لگنے دی تھی، نہ دانیا ہی۔ اُنہی راز سے پردہ ہٹایا تھا۔ سو وہ پھر رات کے ادھورے کام نمٹانے کی کوشش میں جتے ہوئے تھے۔ مگر عاطف بیگ بھی گھاگ تھا، ہاتھ آکر نہ دیا۔ سو عدیل بھائی نے اپنی ساری سفارتی کوششیں ترک کردیں۔ شہریار سے وہ رابعہ کی بابت شیئر کررہے تھے کہ وہ کتنی پریشان ہیں اس کی بیماری کو لے کر.... شہریار نے موبائل اٹھا لیا تھا۔

"بات کرنا چاہتے ہو رابعہ سے؟" عدیل بھائی نے سوالیہ پوچھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ذرا سے شرمندہ دکھائی دیئے۔ "رابعہ سے تم دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی بات کرسکو گے۔ اس وقت وہ اُٹھی نہیں ہے۔"

شہریار اُن کی بات سے پہلے ہی نمبر پریس کرچکا تھا۔ پہلے اس سے کہ لائن ڈس کنکٹ کرتا، دوسری طرف سے فون ریسیو کرلیا گیا تھا۔ اُس نے ہیلو کہہ کر عدیل بھائی کو فاتحانہ دیکھا، پھر اترا کر بولا۔ "رابعہ بھابی! یہ آپ کے شوہر نامدار کہہ رہے تھے، آپ لیٹ کمر واقع ہوئی ہیں۔"

عدیل بھائی تیزی سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلے آئے، پھر کان مروڑ کر بولے۔ "خبیث! کیوں میری زندگی اجیرن کرنا چاہتا ہے؟"

اس نے ویسے تو ریسیور پر ہاتھ رکھا تھا مگر اُن کا ڈائیلاگ ہاتھ آیا تو فوراً ہاتھ ہٹا کر مزید بولا۔ "دیکھیے بھابی! بڑے بےحیا کیا کہہ رہے ہیں۔ بقول ان کے، آپ کے ساتھ ان کی زندگی اجیرن رہتی ہے۔"

رابعہ کی ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ جواب میں کچھ بولنے کے بجائے محبت سے بولی تھیں۔ "خدا کا شکر ہے، شیری! تم بالکل ٹھیک ہو۔ ورنہ جب سے عدیل گئے ہیں، میں تب سے تمہارے لئے ہراساں ہوں۔ اور یہ عدیل...... یہ بھی کراچی آکر کوئی خیر خبر دینے کے ایسے چور ہیں کہ اللہ پوچھے۔"

شہریار کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا، پھر جواباً بولا۔ "بس بھابی! کراچی تو ان کے لئے جنت ہے، جنت۔ ایک دو ہوں تو کچھ گنواؤں بھی، یہاں آکر تو یہ راجہ اندر بن جاتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو لڑکے! کیوں میری زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" انہوں نے رابعہ کی شکی طبیعت کے تحت اس بار واقعی خفگی سے کہا تھا اور شہریار کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ وہ اُن کی کیفیت سے حظ

لے رہا تھا، لیکن دوسری طرف کی خاموشی محسوس کی تو بات سنبھالنے کو بولا۔ ''آپ نے یہ تو پوچھا نہیں، وہ محترمہ ہیں کس عمر کی؟''

''مجھے کیا، کسی بھی عمر کی ہوں۔'' چڑا ہوا جواب آیا اور اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''پاپا کے یہ والے بیٹے، پاپا سے زیادہ چیرٹی کے شوقین ہیں، اس لئے آپ بے فکر رہئے، آپ کی لڑکیاں ان جیسے اُنیس سو ڈیڑھ کے پیس پر نہیں مرسکتیں۔ رہیں وہ محترمہ تو بھابی جی! وہ ماتو کی عمر کی تو ہوں گی۔ اس لئے میرے خیال میں آپ کی ناراضگی جائز نہیں۔''

''توبہ ہے شہریار! آپ نے تو میرا دل ہلا کر رکھ دیا تھا۔''

شہریار ہنسنے لگا تھا، پھر جواباً بولا تھا۔ ''واہ جی، آپ کو اپنی محبت پر بس اتنا ہی اعتبار ہے یا اِدھر کسی شیطان نے کان بھرے، اُدھر آپ کی ہارٹ بیٹ بدلنے لگی۔''

''شیری! اب مجھے لگتا ہے، تم عدیل کو بھڑکانے کا کام کر رہے ہو۔''

اُس نے کندھے اچکائے، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''نہیں، یہ بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ محبت میں اتنا جھوٹا اعتبار ساتھ نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا ناں تو آنکھ بند کر کے اپنے محبوب پر مرمٹتا۔ مجھے وہ جتنا ملتا، صرف اسی قدر اپنی محبت کا نصیب سمجھ کر قناعت کرتا اور اگر کوئی آ کر اس محبت میں اعتبار کا سوال اُٹھاتا تو کہتا، اعتبار میں سودے بازی نہیں ہوتی کہ سامنے والے نے اعتبار کیا تو ہم نے کیا۔ اُس نے محبت میں چلن بدلا تو ہم نے بھی چلن بدل لیا۔ بھابی جی! محبت کرنا سیکھئے، محبت پر مرمٹنا سیکھئے، ہماری طرح۔''

''تمہاری طرح؟....... تم نے کب کی محبت؟'' عدیل بھائی کی طرف سے سوال اُٹھا تھا اور اُس نے آنکھیں بند کر کے کہا تھا۔

''میرے لئے محبت وجود کا نام نہیں ہے عدیل بھائی! محبت دل کا نام ہے اور یہ دل محبت پر ایسا یقین، ایسا اعتبار رکھتا ہے کہ پھر مجھے اس سے غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ محبت جو میرے دل کے نہاں خانے میں کسی کے ان چھوئے نام پر انتظار جھیل رہی ہے، وہ کسی منزل کو بھی ضرور چھونے کی لذت کو محسوس کرے۔ محبت میں منزل....... وہ تو موت ہے ناں۔ مسلسل سفر کا نام محبت ہے۔''

رابعہ بھابی موبائل کی دوسری طرف اُس کا یہ فلسفہ سن رہی تھیں، سو اُس کی بات سے سوال نکال کر بولیں۔

''مسلسل سفر کا نام محبت۔ یعنی فلرٹ کرنا جائز ہوا ناں، پھر۔''

اُس نے ہنس کر عدیل کو دیکھا، پھر بولا۔ ”عاطف بیگ کے لئے یقیناً محبت مسلسل سفر کا دوسرا نام فلرٹ ہے۔ مگر شہریار عبدالرحمٰن کے لئے محبت میں توحید کا قائل ہو کر کسی ایک نام پر جی اُٹھنا اور جی مرنے کا نام ہے محبت۔“

”جی مرنے کا نام؟...... مطلب؟“ رابعہ بھابی نے اگلا سوال کیا اور اُس نے آسودگی سے کہا۔

”مطلب یہی کہ محبت میں مرجانے والے لوگ مرتے کہاں ہیں، کسی ایک دل میں زندہ رہ جائیں تو ان کی زندگی پھر سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر بیٹھتی ہے۔ ٹائم اور اسپیس نکل جاتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں، محبت روح کی بات ہے اور روح کبھی نہیں مرتی۔“

”واہ، واہ...... کیا نادر خیالات ہیں آپ کے۔“ عدیل بھائی نے جان کر اُس کے ہاتھ سے موبائل لے کر جملہ مکمل کیا، پھر بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔ ”آپ کو کیا لگتا ہے، شہریار ہاسپٹل کی جگہ کسی سیمینار میں شریک ہیں، جس کا عنوان ہے ”محبت ایک آفاقی مسئلہ“...... رابعہ ڈیئر! اتنی دقیق گفتگو سے میرے دماغ کی چولیں تو ہلی ہی ہلی ہیں، مگر عاطف بیگ کو فلرٹیے پر سنائی پر بہت اعتراض ہوا ہے۔ اگر بندہ دوست نہ ہوتا تو ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ رہے شہریار، تو بھاری بھرکم گفتگو کر کے اب گہرے سانس لے رہے ہیں۔“ آواز کو مزید سوفٹ کیا، پھر بولے۔ ”رابعہ ڈیئر! خیال کرو کچھ۔ بچے کی طبیعت ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہے، یہ تو اپنی جان کا دوکھی ہے، آپ ہی کچھ پروا کر لیں۔“

رابعہ عدیل کو بات سمجھ آ گئی تھی، سو انہوں نے نیک تمناؤں کے بعد فون رکھ دیا تھا اور شہریار عبدالرحمٰن تھا، وہ ان کے آخری جملوں پر عدیل عبدالرحمٰن کو گھور کے دیکھنے لگا تھا۔

”کیا ہے؟ اب کیا اپنی محبت کا جادو مجھ پر بھی چلانے کا ارادہ ہے؟“ لمحہ بھر کو رُک کے، پھر بولے۔ ”مگر میرے پیارے اس کے لئے آنکھوں میں تھوڑا سا پیار اور نشہ بھی بھرنے کی کوشش کرو۔ اتنے آرام سے تھوڑی تمہاری محبت میں گم ہو سکوں گا میں۔“

”ہا، ہا......“ شہریار کا قہقہہ خود بہ خود عدیل عبدالرحمٰن کے شوخ لہجے پر نثار ہو گیا۔ عاطف بیگ مگر اس سارے معاملے میں اُسے خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا، وہ جب کسی معاملے میں بہت ٹینس فیل کر رہا ہوتا تھا، تبھی لایعنی، بے سروپا باتوں میں انرجی ویسٹ کرتا تھا اور دنیا کا معاملہ اتنا بھی کم اہم نہیں تھا کہ وہ اس پر ٹینس ہوئے بنا رہ پاتا۔ مگر وہ اس بات کو ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اور یہی زیادہ پریشان کن صورتِ حال تھی۔ پھر پہلے اس سے کہ عاطف تنہائی ملنے کی جستجو کر کے اس کے اندر کا غبار باہر لانے کی سعی کرتا، اچانک وزٹ آور شروع ہونے پر کمرے کے دروازے سے شاکرہ

بانو اور زہرہ جنید اندر داخل ہوتی نظر آئیں۔ شہریار نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر عدیل بھائی نے اُسے روک دیا۔

"ابھی مکمل آرام بیٹے! ورنہ میں تمہاری چھٹی کے وقت کینسل کروا دوں گا۔"

زہرہ جنید نے سن کر مسرت کا اظہار کیا۔ "شہریار ڈسچارج ہو رہا ہے...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

عدیل بھائی نے اُسے دیکھ کر کہا۔ "ہاں زہرہ صاحبہ! چھٹی بھی دھونس سے لی جا رہی ہے۔ ورنہ صمدانی انکل کا تو بیس دن تک قیام کروانے کا ارادہ تھا۔"

"بیس دن؟...... او مائی گاڈ! میں تو بور ہو کر ہی مر جاتا۔"

"بکواس مت کرو اسٹوپڈ۔ پٹو گے اب جو دوبارہ یہ مرنے جینے کی باتیں کیں تو۔" عدیل بھائی نے بہت تیزی سے اُسے ٹوکا تھا۔ شہریار کے دل میں برف کے نیچے سے کوئی پھول کھلنے کے لئے سر مارنے لگا تھا۔ اہم ہونا، کسی کا محبوب ہونا، کم خوشی آمیز احساس تو نہیں تھا، جو اس کے اندر زندگی، پھر سے جینے کی آخری کوشش، آخری داؤ کھیلنے کی تمنا نہ بھرتی...... وہ ریلیکس ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے شاکرہ بانو کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے اماں! مجھ سے زیادہ تو میری بیماری کام آئی۔ ورنہ آپ کی صورت دیکھنے کو تو شاید مجھے قیامت کا انتظار کرنا پڑتا۔"

زہرہ جنید اُس کے جملے پر مسکرانے لگی تھیں اور شاکرہ بانو نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔ "پہلے میں تم سے نہیں مل رہی تھی، لیکن شہریار تمہاری جگہ جو میرے دل میں تھی، وہ میں نے کسی کو لاٹ نہیں کی۔ سلامہ کو بھی تمہاری محبت کا حصہ نہیں بانٹا، بلکہ سینت سینت کر رکھا کہ جب تم سے ملوں گی تو تمہیں اکٹھا ہی یہ حصہ دے جاؤں گی۔ تمہاری جگہ جو میری دعاؤں میں تھی، وہ آج بھی تمہاری ہی دعا کا حصہ ہے۔ آج بھی میں اپنے رب سے تمہارے لئے اتنی ہی خوشیوں، اتنی ہی کامیابیوں کی تمنا کرتی ہوں جیسے سات آٹھ سال پہلے کیا کرتی تھی۔ مجھے تم سے ملنے سے کسی دکھ نے، کسی شکوے نے نہیں روکا تھا، بلکہ میں سمجھتی تھی، میں جب جب تمہارے سامنے گئی، تمہیں نائمہ کا دکھ یاد آئے گا، تمہیں زہرہ کی تکلیف دکھ دے گی۔ بس اس لئے میں نے ماں کے دل پر پتھر رکھ لیا اور سمجھا لیا خود کو کہ میری اتنی محبت اور اتنی دعائیں تمہیں کسی بھی بڑے جو کھم میں پھنسنے نہیں دیں گی۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر آج پہلی بار اُس نے آنسوؤں سے انکار نہیں کیا تھا۔ اُس نے شاکرہ بانو کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈ پر ان کے لئے جگہ بنائی تھی، پھر ماضی کی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر آہستہ سے

کرلایا تھا۔

"وہ آپ کی دعائیں تھیں، تبھی میں سوچتا تھا، کون ہے۔ جس کی دعائیں مجھے یاد رکھتی ہیں؟ میں مایوسی کے سمندر میں ڈوبنے لگتا ہوں تو کس کی محبت ہے، جو مجھے ڈوبنے نہیں دیتی اور مجھے سمندر اچھال دیتا ہے۔" آنسو اُن کے پلو میں جذب ہو رہے تھے۔ عاطف بیگ سکتے کی کیفیت میں تھا اور عدیل عبدالرحمٰن کو لگ رہا تھا، ان کا یہ بھائی کتنا تنہا، کتنا اکیلا ہے۔ ماں کا سہارا کتنا بڑا سہارا ہے مگر اس کی ممی...... اس بار میں اس کے حق میں جنگ لڑ کر ہی جاؤں گا۔ ماں کے خلاء نے اس کے وجود میں خود کتنا بڑا خلا بھر دیا ہے...... وہ سوچ جا رہے تھے اور وہ ان کی گود میں سر رکھے بولے جا رہا تھا۔ وہ سارے موقعے جب اُسے اُن کی ڈھارس کی ضرورت تھی اور وہ اکیلا پڑ گیا تھا۔

شاکرہ بانو اُس کے سر میں انگلیاں پھیر کر اپنی ممتا کی انرجی اس میں محسوس انڈیلے جا رہی تھیں۔ خود وہ بھی رو رہی تھیں، مگر اُن کے آنسوؤں میں شہریار کی طرح کی بےبسی نہیں، صرف ممتا تھی، احساس تھا کہ اب وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔

کتنی دیر تک یونہی باتوں کا سلسلہ جاری رہا تھا، جب کمرے میں داخل ہونے والی نرس نے اُسے وارن کیا تھا۔

"اتنا جھک کر لیٹنا آپ کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے مسٹر شہریار، اباؤ کی وجہ سے اگر پھر کوئی پرابلم ہوگئی تو......"

"محبت ہر پرابلم کا سلوشن ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا، ایک ہی طرح گود میں سر رکھے رکھے اس کے سینے میں ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔ مگر شاکرہ بانو کی محبت کا لمس ایسا تھا کہ وہ اس احساس کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"بہت کرلیا لاڈ۔ اب آرام سے لیٹ جاؤ، اگر بستر چھوڑنا ہے تو۔" شاکرہ بانو کی ممتا نے اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ سے اندازہ لگایا اور اسے کندھوں سے تھام کر اُٹھنے میں مدد دی۔ اُس نے سر تکیے پر رکھ دیا تھا مگر شاکرہ بانو کا ہاتھ اس نے ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔

"آپ آج کہیں مت جایئے گا۔ آج میں نے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اپنے بچے کے پاس ہی رکوں گی۔"

زہرہ جنید نے عہد و پیماں ہوتے دیکھے تو مسکرا کر بولیں۔ "ٹھیک ہے اماں! پھر میں ہاسپٹل چلتی ہوں۔ شام کو آتے وقت آپ کو پک کر لوں گی۔"

شہریار نے مسکرا کر ان کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ پھر وہ اُٹھنے ہی والی تھیں کہ اُس نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔ "آپ کے ذاتی کلینک کی بات کہاں تک پہنچی ہے بجو؟"

زہرہ جنید کھڑے ہوتے ہوتے ہوئے یکدم بیٹھ گئیں، پھر حیرت سے بولیں۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا، میں ذاتی کلینک کی بابت سوچ رہی ہوں؟"

وہ مسکرایا، پھر آہستگی سے بولا۔ "دور ہو گیا ہوں آپ سب سے، لیکن سلامہ نے یہ قدغن کب لگائی کہ دور رہ کر آپ سب کے بارے میں باخبر بھی نہ رہوں۔ پھر ایسی باتیں چھپتی کہاں ہیں، اگر کوئی ہم جیسا سرپھرا انسان جاننے کی بری عادت میں ملوث ہو۔"

زہرہ جنید نے ہنس کر اُس کی بات ٹال دی مگر اُس کا اصرار جاری رہا تو انہوں نے کندھے جھکا کر کہا۔ "سیدھی سی بات ہے، شیری! کلینک کے لئے لون اتنی آسانی سے کہاں ملے گا؟ اور میرے پاس ایسا کوئی اثاثہ بھی نہیں، جسے گروی رکھ کر میں لون لوں۔ مگر بہرحال میں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ دو تین فرینڈز کے ذریعے بینک سے معاملہ چل رہا ہے۔ دیکھو، کیا بات بنتی ہے؟"

"آپ نے کس بینک کو اپروچ کیا ہے بجو؟" اگلا سوال کیا۔

زہرہ جنید بینک کا نام بتانے لگیں۔ پھر درمیان میں رک کر بولیں۔ "دیکھو شیری! کوئی مہربانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جانتے ہو، مجھے اپنے معاملات اپنی ہی بیس پر حل کرنے کی عادت ہے۔ انحصار پسندی انسان کی شخصیت کو ڈیمج کر دیتی ہے۔"

اُس نے سر ہلا کر اُن کی بات سمجھ لینے کا عندیہ دیا، مگر دماغ بہت تیزی سے مسئلہ حل کرنے کی بابت زقند لگا رہا تھا۔ زہرہ جنید جا چکی تھیں اور وہ شاکرہ بانو سے محو گفتگو تھا۔ اگلے سالوں کی باتیں شیئر کر رہا تھا۔ سلامہ کیسا ہے، اب بھی اُسے یاد کرتا ہے یا نہیں، عارف کیا ابھی تک اس سے ناراض ہے، یا سے مائرہ کے کیس میں بری کر چکی ہے...... کچھ باتوں کے جواب ہونٹوں پر مسکان بکھیر رہے تھے اور کچھ باتوں نے پلکوں میں آنسو اٹکا دیئے تھے۔ مگر وہ لگتا تھا، دنیا سے آج پشت موڑ کر صرف زندگی جی رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے اُس کی محویت دیکھی تو عاطف کو ساتھ لئے باہر آ گئے۔ کمرے میں اب صرف وہ تنہا تھے یا ان کے درمیان محبت کا سب سے آفاقی جذبہ تھا۔ ممتا اس پر بے طرح نچھاور تھی اور یہی لمس اُسے ہر لمحے، ہر پل کے لئے اپنی زندگی میں چاہئے تھا۔



وہ مسلسل کھانسے جارہی تھی، مگر اردگرد کوئی نہیں تھا، جسے وہ آواز دے کر کہہ پاتی کہ اس کا حلق خشک ہو چکا ہے، اسے پانی کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے تکیے پر بہت بے قراری سے سر مارا تھا۔ بہ دقت اپنے وجود کو گھسیٹ کر سینٹرل ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی پینے کی آخری سی کوشش کی تھی، مگر گلاس ماربل کے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ خوف زدہ سے انداز میں گلاس کی کرچیوں کو دیکھے جارہی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا، وہ بیڈ کے بجائے زمین پر کرچیوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی اسے جھاڑو سے سمیٹ کر ڈسٹ بن کی نذر کر سکتا تھا۔ اُس کی زندگی ڈسٹ بن کے اردگرد گھومتے ہی تو گزری تھی۔ وہ خالی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کاش، کوئی مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دے...... اُس نے کانٹے جیسی زبان سے خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی اور اسی دوران داخلی دروازے میں چابی گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔

''مجھے پانی پلا دو۔ خدا کے واسطے، مجھے کوئی پانی پلا دو۔'' دروازہ کھولنے میں دوسری طرف ہیجان محسوس ہوا۔ کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت چہرہ اور متناسب فگر والی لڑکی جینز اور بلیک ٹاپ پہنے اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ کچن کے سودا سلف سے بھرے ہوئے تھے۔

''زرش! مجھے پانی پلا دو بیٹا۔ میری جان نکلی جارہی ہے۔''

لڑکی تیزی سے سامان صوفے پر پھینک کر کچن سے گلاس میں پانی ڈال کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا ہو گیا بجو! یا اچانک آپ کی طبیعت اتنی خراب کیوں ہو گئی؟'' اُس نے سہارا دے کر پانی پلاتے ہوئے سوال کیا اور وہ جواب دینے کے بجائے غٹاغٹ پانی پیتی چلی گئی، پھر سنبھلی تو بولی۔ ''کل رات کو اچانک بہت سخت ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ میرے تو سارے جسم کی مانو، جان ہی کھنچ کر رہ گئی ہے۔'' وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

زرش اُس کے بیڈ کے قریب ٹوٹے گلاس کی کرچیاں چن رہی تھی۔

''زرش! تم اسے ڈسٹ بن میں ڈالتے وقت یہ تو نہیں سوچو گی، یہ گلاس نہیں، یہ میں ہوں۔''

''بجو! آپ بھی ناں...... اتنی مشکل باتیں کیوں کرتی ہیں؟ یہ گلاس ہے، آپ کیسے ہو سکتی ہیں؟''

''پتہ نہیں، مجھے لگتا ہے، گھر سے نکلی ہوئی ہر لڑکی شیشہ ہوتی ہے۔ ایک بھی پتھر اسے پاش پاش کر سکتا ہے، چکنا چور کر کے ڈسٹ بن کی راہ دکھا سکتا ہے، جیسے مجھے...... جیسے مجھے ڈسٹ بن کی نذر کیا زندگی

نے......زرش! کیا من مرضی کی زندگی جینے کی تمنا کرنا اتنا ہی قابل تعزیر جرم ہے؟''

زرش کچھ نہیں بولی تھی، کچن میں جا کر اس کے لئے سوپ بنانے لگی تھی۔ پھر واپس لوٹی تو بستر پر آنکھیں بند کیے وجود نے اس سے سوال کیا۔

''میں نے سنا ہے، بابا واپس آگئے ہیں پاکستان۔''

وہ، جو سوپ کو چمچ چلا کر جلدی جلدی ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں تھی، چونک کر بولی۔ ''آپ کو کیسے پتہ کہ بابا گھر آگئے ہیں؟''

بند آنکھیں یکبارگی کھلیں، پھر آہستگی سے کہا گیا۔ ''ماما کی آواز سننے کے لئے گھر فون کیا تھا۔ فون بابا نے اٹھایا تھا۔ میں کتنی دیر تک ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ سنتی رہی۔ زرش! بابا کی آواز کا تناؤ، غرور ابھی تک ویسا ہے۔ انہیں میرا کوئی غم ہی نہیں ہے۔ ہلکا سا بھی افسوس نہیں ہے ان کے لہجے میں۔''

زرش کچھ نہیں بولی، اُسے سوپ پلانے میں مصروف ہوگئی۔ آدھا پیالہ سوپ لیا تھا کہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''بس، اب اور نہیں۔ میں تم سے حمزہ عابد کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

زرش نے سوپ کا پیالہ رکھ کر بہن کی طرف سے پشت کرلی، پھر آہستگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں لائی! وہ مجھے کبھی بھی گھر بسانے جیسی لڑکی نہیں سمجھتا یا شاید بغیر کسی اضافی محنت کے، وہ مجھے حاصل کر چکا ہے، اس لئے اب خالی خولی ریپر کو چاٹ کر وہ اپنا وقت کیوں برباد کرے۔ اس کے لئے میں سوسائٹی گرل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔''

''تم نے یہ راہ کیوں چنی؟ تم تو جانتی تھیں، اس راہ میں کچھ نہیں رکھا۔''

بہت گہرا سانس کھینچ کر سوال کیا گیا اور زرش نے کھڑکی کا پردہ سرکاتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''شروع شروع میں بابا کی دولت کا بہت زعم تھا۔ اپنی خوب صورتی کا بڑا زور تھا۔ میں سمجھتی تھی، میں زندگی کو اپنے طریقے سے ڈیفائن کرسکتی ہوں۔ پھر ریمپ واک میں آگئی تو منزل کی جستجو میں نئی سے نئی غلطی دہرائی جانے لگی۔ یہ واحد شعبہ ہے ثانی! جس میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ دولت کسی کے لئے تمغہ نہیں بنتی۔ یہاں اگر واقعی ناقابل یقین کامیابی حاصل کرنی ہے تو انسان کو سمندر میں اتر کر ڈوبنے سے کون بچا سکا ہے۔ تیرنے میں وقت لگتا ہے اور جب تک آپ تیرنا سیکھتے ہیں، آپ مکمل طور پر ڈیڈ پرسن بن چکے ہوتے ہیں۔ پھر چاہ کر بھی خود کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ سو میں بھی اس لہر میں بہتی چلی گئی۔ جب غلطی کا احساس ہوا، اس وقت غلطی سدھارنے کا موقع چپکے سے آکر چلا گیا تھا......حمزہ عابد انہی دنوں کی یاد ہے۔ وہ میری اصلیت جانتا تھا اور میں سمجھتی تھی، میں اُسے سحر

پڑھ کر اپنا کرلوں گی۔ وہ میرے حُسن سے متاثر نہ ہوا تو میری شہرت پر مرمٹے گا۔ میری شہرت بھی اُس کا دامن نہ تھام سکی تو بابا کی کروڑوں کی جائیداد اُسے روک لے گی۔ مگر ثانی! تعلق داری میں تو وہ کسی سوسائٹی گرل سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔ وہ بابا کی جائیداد کے لئے مجھے صرف فلرٹ کرسکتا ہے، اور بس...... میں بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں، اُسے چھوڑ دوں، لیکن دل نہیں مانتا۔ وہ میری چیک بکس پر میرے ہی سائن کروا کر خوب عیش کرتا ہے اور میں چپ چاپ اُسے دیکھتی رہتی ہوں۔ میں، جو احتجاج کا ایک ہلکا سا زندگی کا احساس رکھتی تھی ثانی! مجھے لگتا ہے، وہ بھی اب میں بھولتی جارہی ہوں۔ میں خود کو بھولتی جارہی ہوں ثانی!"

"بے وقوف لڑکی! ایسا نہیں کہتے۔ کبھی نہ کبھی حمزہ کو تمہاری محبت بانٹ کرے گی! ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ محبت اتنی بے اثر ثابت ہو؟"

"ثانی! تم بھی ناں، محبت کا اتنا خطرناک انجام دیکھ کر بھی محبت کی اثر پذیری کی بات کرتی ہو؟ ثانی! وہ بابا کا دوسرا ایڈیشن ہے، بالکل بابا جیسا۔" زرش نے کہا۔

"بابا جیسا......؟" ثانیہ کے چہرے پر کرب چھا گیا۔ پھر کتنی ساعتوں بعد اس نے کہا۔ "یعنی تمہارے گھر کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ممی کو دیکھو، آج تک اُن کی واپسی کے قدم گن رہی ہیں، مگر ان کے آگے جاتے قدموں کی گنتی بڑھتی جارہی ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھی، جیسے اُس نے اس بدصورتی سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ وہ اب بہن کا کمرہ ٹھیک کررہی تھی کہ یکدم اُس نے سوال کیا۔

"زرش! تم سے میں نے ایک کام کہا تھا، جان!"

"میں نے کوشش کی تھی ثانی! مگر شہریار عبدالرحمٰن آج کل اپنے دفتر میں نہیں ہوتا۔ اور کوئی ایسا قابلِ اعتبار بندہ نظر ہی نہیں آتا، جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ وہ شہریار عبدالرحمٰن کے متعلق سب کچھ جانتا ہوگا۔"

بیڈ پر لیٹی لڑکی نے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے بیڈ کی سائیڈ پر اوندھے رکھے فریم کو ہولے سے اپنے سامنے کیا تھا اور اُس کی شبنمی آنکھیں تصویر پر جم گئیں۔ تصویر میں وہ اور شہریار عبدالرحمٰن ایک بچی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"شہریار! بہت برا کیا ہے ہم نے۔ ہم سب نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ کاش، وقت مجھے اپنی غلطیاں سدھارنے کا موقع دیتا۔ تم کتنے سادہ دل ہو اور ہم نے تمہاری سادہ دلی کا بہت فائدہ اٹھایا۔ محبت کرنا بری بات نہیں، لیکن ہم نے تمہیں اس محبت کے فورم پر لوٹا اور تم سادگی سے لٹتے چلے گئے۔ کاش! کبھی میں تمہارے سامنے پورے قد سے کھڑی ہوکر کہہ سکوں کہ دنیا میں اگر کچھ اچھا ہے تو وہ تمہارا

دل ہے شہریار! وہ تم ہو شہریار عبدالرحمٰن! صرف تم......" اُس نے دل میں کرلاتے ہوئے فریم دوبارہ اوندھا کر دیا تھا۔

"کیا سوچنے لگی تائی؟" زرش نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے پوچھا اور اُس نے بے بسی سے کہا۔

"میں جلد سے جلد ٹھیک ہو جانا چاہتی ہوں، زرش!"

زرش نے بجلی کی تیزی سے پلٹ کر اُسے دیکھا اور وہ پھیکے سے انداز میں ہنس کر بولی۔" اتنے سرپرائزنگ نچ سے مت دیکھو۔ میں جانتی ہوں، اب میرا ٹھیک ہونا ممکن نہیں، لیکن میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ایک بار شہریار عبدالرحمٰن سے سچ کہہ کر معافی مانگنا چاہوں گی۔ اتنے برسوں سے جو وہ جھوٹ نبھا رہا ہے، میں چاہتی ہوں، وہ جتنی خاموشی سے اس جھوٹ کا گواہ بنا تھا، اسی خاموشی سے اس جھوٹ کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرے۔ میں مرنے سے پہلے اپنی یہ غلطی سدھارنا چاہتی ہوں زرش!"

زرش نے بہن کا ہاتھ بے قراری سے تھام لیا تھا۔ وہ موت کے قدموں کو اپنی بہن کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی، لیکن پھر بھی کسی معجزے کے ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر کیا سارے معجزے ہماری پسند کے مطابق، ہماری زندگی کی داستان بدل سکتے ہیں؟ یہ وہ سوال تھا، جس کا جواب صرف وقت کے پاس تھا۔ یہ وقت، جو اس کمرے میں لیٹی ہوئی لڑکی کے پاس بہت کم رہ گیا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن نے دفتر میں انٹری دی ہی تھی کہ ان کی نظر بار بار وہ خاتون پر جا کر رک گئی۔ سب انہیں "گڈ مارننگ!" کا فارملیٹی سلام اچھال رہے تھے، مگر مومنہ اتنے انہماک سے مصروف تھی کہ وہ بہت بعد میں جاگی تھی۔

"گڈ مارننگ سر!" وہ اُسے شہریار عبدالرحمٰن سمجھ کر احترام دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ مگر سالار عبدالرحمٰن اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ تیز نظری سے جائزہ لے کر اپنے کیبن کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد راحم یونہی اپنے کیبن سے نکلا تھا۔

مومنہ کی جان لبوں پر آ گئی تھی۔ "سر، بہت زیادہ غصیلے ہیں کیا؟"

"بہت زیادہ۔ لیکن یہ تم حجاب کیوں کرتی ہو؟" اُس کی بات کا جواب دے کر دوسرے کمپیوٹر پر بیٹھی لڑکی نے فوراً دل میں اُٹھنے والے سوال سے اپنے دماغ کو آزاد کیا۔

"بس، ویسے ہی۔ مجھے حجاب کرنا اچھا لگتا ہے۔" مومنہ نے آہستگی سے کہا۔

”حجاب کر کے اسٹائل وژن میں جاب کرنا، امیزنگ!“ آئیڈیا منیجر نے ٹیبل پر پھیلے ہوئے کینوس پر بکھرے ہوئے خیال کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے خیال آرائی کی اور مومنہ اپنے اندر سمٹنے لگی۔ وہ شروع سے ایسی ہی تھی۔ بہت بہادر ہونے کا سوانگ تو بھر لیتی تھی، مگر جہاں تنقید اُٹھنے لگتی، وہیں اُس کے ہاتھ پیر پھول جاتے۔

”مس مومنہ! آپ کو اتنی اچھی پوسٹ پر کیسے رکھ لیا گیا، حالانکہ ابھی انٹرویو بھی شروع نہیں ہوئے؟“ ایک نیا سوال اُبھرا۔

”مسٹر شہریار عبدالرحمٰن کی مہربانی ہے کہ میں یہ نوکری حاصل کر سکی۔“ اُس نے نرمی سے کہا۔

”کس کی مہربانی؟......پھر سے کہنا۔“ شوخ آواز......مومنہ کا دل دھڑکنے لگا۔

”مسٹر شہریار عبدالرحمٰن، جی......“

”اُفوہ، یہ جی وی بھی لگنے لگا۔ حیرت ہے، اتنے ہارڈ اسٹون بندے سے ایسی توقع؟“ خیال آرائی کو میز ملی اور اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی۔

”مس مومنہ! آپ کو باس بلا رہے ہیں۔“ پیون نے آکر اس کی جان کو اور ہلکان کر دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھی تھی اور کہیں سے آواز آئی تھی۔

”اتنی خوب صورت آنکھیں ہراساں ہوں تو دل کٹتا ہے۔“

اُس کے پیروں میں لرزش بھی آگئی۔ دفتر کا ماحول اُسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ شاید سب یہاں ایک دوسرے سے اتنے کلوز تھے کہ اس گفتگو سے ضرور حظ لیتے ہوں گے۔ مگر اُسے یہ باتیں ہراساں کر رہی تھیں۔ وہ شروع سے تنہائی پسند، الگ تھلگ رہنے والی ایک خوف زدہ سی لڑکی تھی، جسے ایک فیصلے نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی باس کے کمرے کے سامنے پہنچی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے سالار عبدالرحمٰن کی غصیلی آواز سنائی دی۔

”مسٹر شہریار، کب سے اسٹائل وژن کے اندرونی معاملات میں دخل دینے لگے؟ وہ اسٹائل وژن میں بزنس مارکیٹنگ کے معاملات دیکھتے دیکھتے میرے فیصلوں پر حاوی کیوں ہونے لگے ہیں؟“

مومنہ کو پتہ چلا کہ وہ شہریار عبدالرحمٰن نہیں ہیں تو اُس نے دل میں سوچا، کیا ساری عبدالرحمٰن فیملی ایسی ہی خوف ناک ہے؟ مگر اُس کے خیال کو مزید وضاحت سے پہلے ہی راحم یوسفی نے روک لیا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر آیا تھا کہ خود مومنہ کو آگے کرنے کے لئے پیش رفت کر سکے۔ مگر اُسے باہر کھڑا دیکھ کر کھسیانا سا ہنس کر بولا۔

”مس مومنہ! آپ باہر کھڑی ہیں تو اب تک اندر کیوں نہیں آئیں؟“
”سر! باس کے غصے سے خوف زدہ ہو رہی تھی۔“
راحم یوسفی نے ترحم سے اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”باس بہت اچھے ہیں۔ صرف کبھی کبھی غصے کا اظہار کرتے ہیں، اس لئے کوشش کیجئے گا، آپ ان کی مرضی کے خلاف کوئی جواب مت دیجئے گا۔ آپ کو اتنا تو علم ہوگا ہی ناں، باس کی ہاں میں ہاں کیسے ملائی جا سکتی ہے۔ اور ہاں، ایک خاص بات، باس کے سامنے کسی بھی لحاظ سے شہریار عبدالرحمٰن کا ذکر کسی نیک پہلو سے مت کیجئے گا۔ باس اس بات سے چڑ جاتے ہیں۔“
راحم یوسفی یہ ساری باتیں بہت ہی دھیمے انداز میں کر رہا تھا، سو بیل کی آواز سن کر اس نے فوراً دستک دی تھی اور مومنہ کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔
سالار عبدالرحمٰن ریوالونگ چیئر پر آنکھیں بند کرکے جھول رہے تھے، سو دستک کے بعد اُن کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ پہلے کے موڈ میں آ گئے۔ مومنہ رفیق نے نظر بھر کر دیکھا اور سوچا، اگر صورت کے ساتھ خدا مزاج بھی اچھا دے دیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اور سالار عبدالرحمٰن تھے اُس کے خیالات سے بے پروا اُس سے اُس کے کام کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اُس کا انٹرویو تھا۔ وہ اُن کے جوابات سے اچانک امتحان گاہ میں کھینچ لئے جانے کے باوجود بہت بھرپور انصاف کر رہی تھی۔ سو سالار عبدالرحمٰن اس معاملے میں کوئی خامی نہ نکال سکے تو یکدم انہوں نے اُس کے پردے پر سوال اُٹھا دیا۔
”آپ جانتی ہیں، اسٹائل وژن ایک ایڈورٹائزنگ زون ہے۔ یہاں پردے پر سوال بھی اُٹھ سکتے ہیں۔ ہمارے ورلڈ طرح کے کلائنٹس ہیں، جو ہماری زندگی پر، اپروچ پر سوال اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں بنیاد پرستی کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ یہ پردہ......“
مومنہ نے اپنے وجود کو کرسی سے اُٹھنے پر آمادہ کیا۔ ”سوری سر! میں حجاب نہیں چھوڑ سکتی۔“
”یہ آپ کا قطعی فیصلہ ہے؟“ سالار عبدالرحمٰن نے ابرو چڑھا کر سوال کیا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور جانے کی اجازت چاہی۔
”آپ جا سکتی ہیں۔ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھئے۔ میں آپ کے بارے میں فیصلہ کچھ دنوں بعد کروں گا۔“
جانے کیا بات تھی کہ اپنی مرضی کے خلاف جواب کے باوجود ان کے اندر اپنے وجود کو منوانے کی تمنا نے سر نہیں اُٹھایا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن سے اُن کی جتنی زیادہ جنگ تھی، اتنا ہی اُس کے بغیر اُن کا موڈ

خراب ہو رہا تھا۔ ہر لمحے، ہر آن اپنے سامنے رکھ کر اُسے نظر انداز کرنے میں جو مزہ تھا، وہ اُس کے منظرِ عام سے ہٹ جانے میں نہیں تھا۔ آخر ایسی کیا پرابلم ہو گئی ہے کہ ہسپتال سے محترم کا آنے کو دل ہی نہیں کر رہا...... ہمیشہ تو اسٹرونگ مین بنا رہتا تھا، پھر؟...... سوالیہ نشان اُٹھا تو بے سبب سوچا، آخر کون ہے جس سے اس کے بارے میں معلومات لی جا سکیں اور ازلی انانیت کو بھی دھچکا نہ پہنچے۔ وہ مسلسل ریوالونگ چیئر پر جھولے جا رہے تھے۔

"زخم اتنا گہرا تو نہیں تھا؟" انہوں نے سوچتے ہوئے گھر فون کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا۔ اُن کا خیال تھا، عائشہ سے اکھڑ لہجے میں کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں اور شرطیہ عائشہ اُن پر اُن کی شخصیت کے رعب کی وجہ سے کبھی اس لمحاتی کمزوری کو دوبارہ دہرانے کی کوشش بھی نہیں کریں گی۔ انہوں نے سیکرٹری کو گھر کا نمبر ملانے کی ہدایت کی۔

ایک منٹ بعد اُن کے روم میں بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔ مسٹر عبدالرحمٰن کے گھر میں ہر بیٹے کا فون نمبر الگ تھا۔ یہی وجہ تھی، انہوں نے عائشہ کے لئے نمبر ملوایا تھا۔ مگر فون کافی دیر تک نہ اُٹھایا گیا تو انہوں نے ڈرائنگ روم کے کامن نمبر پر ڈائل کرنے کا حکم دیا۔ پانچویں چھٹی بیل پر فون اُٹھا لیا گیا اور یہ بلاشبہ عائشہ کی آواز تھی۔ مگر اس آواز میں گھبراہٹ اور خوف کا ملا جلا تاثر بہت واضح تھا۔

"ہیلو عائشہ! میں سالار بول رہا ہوں۔"

"سالار...... اچھا ہوا، آپ نے فون کیا۔ پلیز سالار! جلدی سے گھر آ جائیں۔ بڑی مما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ گھر کی گاڑی بنے گئی ہوئی ہے اور اس وقت ایمبولینس کو فون کیے ہوئے بھی پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔"

سالار عبدالرحمٰن نے ریسیور تیزی سے پٹخا تھا اور بھاگم بھاگ دفتر کی سیڑھیاں اُترتے چلے گئے تھے۔ پھر تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے جب وہ گھر پہنچے تو معلوم ہوا، اُن کی بڑی مما کو ایمبولینس میں قدیم ترین پرائیویٹ ہاسپٹل لے جایا گیا ہے۔ انہوں نے کار کو گیٹ سے داخل کیے بغیر یوٹرن دیا اور پندرہ منٹ بعد مطلوبہ ہاسپٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا دل بے حد تیز دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے سینہ توڑ کر باہر آ جائے۔ چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ گھر بھر میں وہ سب سے زیادہ جذباتی اور سب سے زیادہ چھوٹے دل کے تھے۔ معمولی سی تکلیف بھی اُنہیں بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ پھر یہ پریشانی تو ان کی سب سے پسندیدہ ہستی سے متعلق تھی۔ اُن کا ہولنا ہو جانا لازمی تھا۔ وہ کاؤنٹر سے معلومات لیتے ہوئے اوپر پہنچے۔ مما اور عائشہ کو حسبِ توقع ہراساں پایا۔ سو اپنے چہرے کے تاثرات انہیں چھپانے پڑے۔ کیونکہ یہاں ان دونوں کو ڈھارس دینے کے لئے یہ ضروری تھا۔

''کیا ہوا تھا نو کو؟'' انہوں نے متوازن لہجے میں پوچھا۔

مما بس رونے لگی تھیں اور عائشہ نے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''اچانک بڑی مما پر استھما اٹیک (Asthma Attack) آ گیا تھا، مگر ان کا انہیلر (Inhaler) ختم ہو گیا تھا۔ بڑی مما نیا انہیلر منگوانا بھول گئی تھیں، بس اس لئے ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔

سالار عبدالرحمٰن سر ہلا کر مما کو تسلی دینے لگے تھے۔ پھر تین گھنٹے کی سر توڑ کوشش کے بعد ڈاکٹر نے ان کی کنڈیشن بہتر بتائی تھی۔ مما شام تک ان سے مل سکتی تھیں مگر حشمت خانم کچھ بولنے کی کنڈیشن میں نہیں تھیں۔ پاپا اور عدیل بھائی بھی ایمرجنسی میں ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کی طبیعت معمول پر آتی گئی تو رات گئے مما نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا تھا۔

''امی جی! آج اگر آپ کی ذرا سی بے احتیاطی سے میرا کوئی نقصان ہو جاتا تو؟''

حشمت بیگم، بیٹی کے اس اظہار پر نہال سی ہو گئیں مگر کچھ ساعت بعد جملے کی ساخت کو سمجھیں تو بولیں۔ ''عالیہ! یہ میری غلطی ہے یا تمہاری؟...... تم نے تو مجھے اتنا عادی بنا دیا ہے کہ میں اپنے سے کوئی فیصلہ ہی نہیں لے پاتی۔ رہا میری دوائیاں اور انہیلر تو یہ تو تم ہی دھیان میں رکھتی ہو ناں۔''

''میں دھیان میں رکھتی ہوں؟'' مما نے اچنبھے سے پوچھا۔

حشمت خانم نے یقین سے کہا۔ ''ہاں، تم...... میرے پرس میں، کمرے میں، ڈرائنگ روم میں رکھے شوپیسز کے نیچے، سائیڈ بورڈ کی دراز میں، ہر جگہ مجھے انہیلر مل جاتا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے، مجھے چیزیں رکھ رکھ کے بھولنے کی کتنی عادت ہے، اس لئے ہی تو تم میری پہنچ کے مطابق میری زندگی کا سامان مہیا کرتی ہو ناں۔''

مما خاموشی سے حشمت خانم کو دیکھتی رہیں، پھر آہستگی سے بہت دیر بعد بولیں۔ ''آپ جو میرے بارے میں رائے رکھتی ہیں، میں وہی رائے آپ کے بارے میں سمجھ رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا، آپ میری بھولنے کی عادت سے تنگ آ کر خود اپنا دھیان رکھتی ہیں۔ دراصل اپنی اس خامی پر میں اندر ہی اندر بے حد شرمندہ تھی اور کوشش کرتی تھی کہ ویسا دھیان آپ کا رکھ پاؤں جیسا ایک بیٹی کو رکھنا چاہئے۔ مگر آپ کے ہر کام کی ترتیب میں مجھے ایسا موقع ہی نہیں ملا۔''

حشمت خانم، بیٹی کو دیکھتی رہیں۔ پھر پہلے کہ وہ اس کارروگی کو کسی کے کھاتے میں ڈالتیں، مما کے فون پر بیل ہوئی۔ انہوں نے پرس سے موبائل نکالا، پھر بھنا کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔

"کس کا فون تھا؟" حشمت خانم نے سوال کیا۔

مما نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کس کا ہو سکتا ہے؟...... ایک ہی تو ہے، جس سے میری جان نہیں چھوٹتی۔"

"کون شہریار تھا؟" حشمت خانم نے تائید چاہی مگر مما نے جواب نہیں دیا اور حشمت خانم نے مکرر پوچھا۔ "تم نے عبدالرحمن سے پوچھا ہے شہریار کس وجہ سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے؟"

"ہو گی کوئی احمقانہ سی وجہ۔ اُس نے کون سے ہاسپٹل کے بل پے کرنے ہیں جو وہ اس بارے میں سوچے۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا مگر انہوں نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے، کام کرنے کو دل نہیں کر رہا ہو گا، سو فلمی اداکاروں کی طرح ہاسپٹل میں ریلیکس کرنے کے لئے بھرتی ہو گئے ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے، آج کل نرسیں کتنی خوب صورت اور کم عمر رکھی جانے لگی ہیں۔"

حشمت خانم نے کچھ نہیں کہا۔ مما کہہ کر چپ ہو گئیں۔ پھر وہ ابھی باہر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ عائشہ اندر داخل ہوئیں۔

"بڑی مما! شہریار کا فون ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

حشمت خانم نے آج پہلی بار نخوست سے اس کی آواز سننے سے انکار نہیں کیا تھا۔

عائشہ سیل فون پکڑا کر باہر چلی گئی تھیں اور مما جان کر بیٹھی رہی تھیں، تا کہ جان سکیں اس نے انہیں فون کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ انہیں، جن سے وہ جی بھر کر خار کھاتا ہے۔

"ہیلو، نانو! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" حشمت خانم کو اُس کی آواز کی کمزوری سے عجیب سا احساس ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں تم بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"ایک دم فائن نانو! تین دن بعد چھٹی مل جائے گی۔ آپ بتایئے، آپ کو ڈاکٹر نے کیا کہا؟" وہ یوں گفتگو کر رہا تھا، جیسے ہمیشہ سے اتنے ہی فرینک لہجے میں مخاطب رہتا تھا اور نانو آج ان کے اندر سے بھی اس سے جھگڑا کرنے کی ہمک نہیں ابھر رہی تھی۔

"ایک ہفتہ رکھیں گے ابھی۔ دراصل بروقت نہ پہنچنے سے کچھ معاملہ سدھارنے میں وقت ہو رہی ہے۔"

"آئی ایم سوری نانو! مجھے بیمار نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

حشمت خانم کچھ نہیں بولیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ جانتی تھیں، شہریار کی اس سوری کی کیا وجہ تھی۔ مما نہیں جانتی تھیں، اس لئے بھنا کر انہوں نے حشمت خانم سے موبائل چھین لیا تھا۔ پھر بہت اچھی طرح اُس کی طبیعت صاف کر کے ہی انہوں نے لائن ڈس کنکٹ کی تھی۔

حشمت خانم، بیٹی کو پُرسوچ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر بہت آہستگی سے بولی تھیں۔ "تم نے اُسے بے بھاؤ کی سنائیں، جی بھر کر برا بھلا کہا، مگر اُس نے جواب میں تم سے کچھ کہا؟"

"کیا کہے گا، ایسا منہ رکھتا ہے کہ میری کسی بات سے اختلاف کر سکے؟"

حشمت خانم نے آنکھیں بند کر کے بیٹی کے اس جملے کو سنا، پھر آہستگی سے بولیں۔ "تمہیں نہیں معلوم، یہ سچ لگے گا نہیں، لیکن عالیہ! اُس نے تمہاری کسی بات سے صرف اس لئے اختلاف یا اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ صرف تمہاری آواز سننے کا متمنی تھا۔ بھلے وہ آواز ڈانٹ کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ ورنہ بد تہذیب بچے بھی اتنا اونچا لہجہ سننا برداشت نہیں کر سکتے، تم جانتی ہو یہ بات۔"

مما، حشمت خانم کو تحیر سے دیکھتی رہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ان کے بیان سے شدید اختلاف کے باوجود فی الحال اپنا ردِ عمل نہیں دے سکی تھیں، بلکہ انہیں صرف اس لئے حیرت نے آ لیا تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن کے لئے انہوں نے ہمدردی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ مگر حشمت خانم نے خود سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

پھر یا ان کے ہاسپٹل میں تیسرا دن تھا جب ڈاکٹرز نے اُن کی ریکوری دیکھ کر انہیں ڈسچارج کر دیا تھا۔ چونکہ ریکوری رپورٹ کے پیشِ نظر یہ فیصلہ لیا گیا تھا، اس لئے وہ منتظر تھیں کہ کون انہیں لینے آئے گا۔ دانیا نے کالج جانا تھا، مگر غیر متوقع وہ ناشتے کے ساتھ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تھی اور غیر متوقع دوسری گاڑی سے عدیل بھائی کی سرکردگی میں شہریار کو اُترتا دیکھ کر اُس کی جذباتی نیچ اپس اینڈ ڈاؤن ہو گئی تھی۔ تین دن سے وہ شہریار سے نہیں ملی تھی۔ یقیناً وہ اُس سے خفا ہو گا۔ مگر جب وہ نارمل طریقے سے اُس سے اُس کی کالج کی مصروفیات کے بارے میں جاننے لگا تو اُسے لگا، وہ ابھی کہ ابھی رو دے گی۔ اُس کی صورت سے ہی پتہ چل رہا ہے، وہ کتنے بڑے کرائسس سے گزر رہا تھا۔ نقاہت اور کمزوری بہت نمایاں تھی اُس کی شخصیت میں مگر وہ پھر بھی نانو سے ملنے چلا آیا تھا۔ عدیل بھائی نے بہت انکار کیا تھا مگر پھر انہیں ماننا ہی پڑا تھا۔ سو وہ لفٹ کے ذریعے نانو کے روم تک گئے تھے۔ نانو صوفے پر سامان کا بیگ لئے بیٹھی تھیں، جیسے زندگی کے جنکشن پر کوئی آخری پڑاؤ کے لئے ذرا کی ذرا ٹھہرا ہو۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے نانو؟" شہریار نے عدیل بھائی کے لاکھ ہاتھ تھامنے کی ضد کے باوجود ان سے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور اب وہ نانو کا ہاتھ تھامے ان سے ان کی خیریت کی رپورٹ لے رہا تھا۔ عدیل بھائی نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے، اس سوال کا جواب دینا نانو جیسے مزاج کی خاتون کے لئے آسان نہیں ہو گا۔ کیونکہ ان کی جلی کٹی عموماً سننے سے زیادہ محسوس کرنے کے

لئے زہر سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ مگر نانو...... اُن کا ردِ عمل بہت مختلف تھا۔ انہوں نے شہریار کا ہاتھ تھام کر اُس کی خیریت پوچھی تھی۔

"بالکل فٹ ہوں نانو! بس معمولی سا مسکولر پین تھا۔ ڈاکٹر ٹھہرے فارغ، سو فوراً میڈیکلی جھاڑنے کے لئے اتنے دن تک کا ریسٹ بتا دیا۔ کہنے لگے، مسٹر شہریار! آپ کے اعصاب بہت تھک گئے ہیں، اس لئے کچھ دن تو آرام کرنا لازمی ہے۔ ان دنوں میں بھی فارغ تھا اس لئے ڈاکٹروں کی ضد کو طرح دے دی، ورنہ......"

حشمت بیگم نے اُس کا چہرہ دیکھا، پھر مدھم سا بولیں۔ "تم مجھے بہلا تو نہیں رہے ہو شیری؟ تم ٹھیک ہو ناں؟...... بالکل ٹھیک؟"

"جی نانو! میں ٹھیک ہوں...... بالکل ٹھیک۔ اب میں آ گیا ہوں ناں تو آپ کو دوبارہ بیمار ہونے کا موقع نہیں لینے دوں گا۔" اُن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے کہا۔ عدیل بھائی اور دانیا دونوں اس نئے رشتہ محبت پر حیران پریشان تھے۔ مگر وہ دونوں مگن تھے۔

"مجھے معلوم ہے، سارے بچوں میں تم مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہو۔"

نانو کلیاں...... عدیل بھائی کو چکر آنے لگے تھے۔

"خیریت تو ہے نا نو! آج سورج مشرق سے ہی نکلا تھا ناں؟" اُن سے برداشت نہ ہو سکا تو بول پڑے۔

نانو مسکرانے لگیں اور شہریار شوخی سے بولا۔ "بس، جل گئے ناں؟ نانو مجھ سے پیار کریں، یہ آپ کو کیسے ہضم ہو سکتا ہے؟"

عدیل بھائی نے بیگ کندھے پر ڈالا، پھر ہولے سے بولے۔ "مجھے ایسے اسٹریس نہیں پڑتے۔ میں محبت سب کے لئے مقولے پر عمل کرتا ہوں۔ یہ راگ تو صرف سالار ہی اچھا گا سکتے ہیں۔"

"پلیز، سنی بھائی کے خلاف کوئی نہیں بولے گا۔" دانیا نے تپ کر کہا تو عدیل بھائی، شہریار کے کان میں گنگنائے۔

"لیجیے، سنی کا ایک اور کارندہ تیار۔ بیٹا! تمہارا ووٹ بینک تو مجھے لگتا ہے، خالی ہو کر ہی رہے گا۔ ویسے تم خود بھی اپنے آپ کو ووٹ دینا چاہو گے یا......؟"

شہریار نے 'یا' پر مہر لگا دی اور دانیا کو پٹخنے لگ گئے۔

"تمہیں اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے گڑیا؟" عدیل بھائی نے نانو کو وہیل چیئر پر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے دانیا کو پھر سے چھیڑا مگر اُس نے جواب دینا قطعاً ضروری خیال نہیں کیا۔ عدیل بھائی نے کندھے

اچکائے اور لفٹ کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگے۔

شہریار، ودانیا کے برابر میں کھڑا تھا، مگر ودانیا اُسے مخاطب کرنا تو کجا، اُسے دیکھنے تک سے احتراز کر رہی تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے، واقعی تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو؟" شہریار نے جھک کر سوال کیا اور ودانیا کی جلتی آنکھیں اُس پر آ کر تک گئیں۔

"میں اب غیر ضروری معاملات پر انرجی ویسٹ کرنا حماقت سمجھتی ہوں، شیری بھائی!"

"شکر ہے، شیری بھائی کا صیغہ برقرار رکھا۔ اگر اس رشتے سے ہی مکر جاتیں تو میں کیا کر لیتا؟"

"ہونہہ، خواہ مخواہ کی بلیک میلنگ۔" اُس نے بظاہر بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ مگر کہنے میں پہلو یہی تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن آسانی سے سن لے۔ تو اُس نے یہ تلخ گھونٹ بہت آرام سے پی لیا تھا۔ عدیل بھائی دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروانا چاہتے تھے مگر ودانیا نے انہیں یہ موقع نہیں دیا تھا۔ لفٹ دو منٹ بعد آ گئی تھی، سو تینوں ماں کے ساتھ نیچے جانے کے سفر پر گامزن ہو گئے تھے۔ عدیل بھائی نے وہیل چیئر کار کے پاس لے جا کر روکی تھی اور شہریار نے حشمت بیگم کو سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ عاطف بیگ ہاسپٹل سے ہی اپنی بزنس میٹنگ میں چلا گیا تھا، جسے وہ اتنے دنوں سے پوسٹ پون کرتا آ رہا تھا، سو وہیل چیئر وارڈ بوائے کے حوالے کر کے وہ گھر کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

گھر...... جہاں ماما اپنی ماں کی صحت یابی کے لئے جشن منانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آج غیر متوقع پاپا بھی گھر ہی میں موجود تھے۔ ہاں، یہ ضرور تھا، ان کا گھر میں رکنا حشمت خانم سے زیادہ شہریار عبدالرحمٰن کی محبت کا پیش خیمہ ضرور تھا۔ پاپا نے گیٹ ہی پر شہریار کو سینے سے لگا لیا تھا۔ مما نے اُس کی طرف مقدور بھر توجہ بھی دینی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ وہ حشمت خانم کو عائشہ بھابی کے ساتھ سہارا دے کر اُن کے کمرے تک لے جانے میں ساری توجہ صرف کر رہی تھیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر ماما کی مدد کرنی چاہی، مگر ماما نے اُس کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے۔ غیر متوقع اُس نے اسٹریس نہیں لیا تھا۔ وہ پاپا اور عدیل بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر باتیں کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عدیل بھائی نے اس کی رہائش کا مسئلہ اُٹھا دیا تھا۔

"پاپا! شیری کو میر اور رابعہ کا کمرہ دے دیجئے ناں۔ ہم تو سال سال بعد آتے ہیں، شہریار کے آؤٹ ہاؤس میں بھی ٹھہر سکتے ہیں۔"

شہریار نے ابرو چڑھا کر انہیں دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "کیوں جناب! یہ مہربانی کیوں؟ میں آؤٹ ہاؤس ہی میں بہت پُرسکون رہ سکوں گا۔ آپ جانتے ہیں، بھیڑ بھاڑ سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہی جیسے اُس کا رُوڈ رویہ بھی عود کر آیا تھا۔
تبھی عدیل بھائی نے اُس کا کان مروڑ کے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''بس، بس۔ اب یہ ڈراؤنا رویہ اپنے پاس ہی رکھنا۔ سارے گھر والوں کو ڈرا ڈرا کے خود سے دور کر رکھا ہے۔ کم آن یار انسانوں میں اُٹھو بیٹھو تو کچھ چینج آئے زندگی میں۔ حالانکہ اب کوئی نئی اور بڑی تبدیلی ہونا تو ناممکن ہے، مگر امید پر دنیا قائم ہے جگر......!''
شہریار مسکرانے لگا۔ وہ پھر بھی راضی نہیں ہوا تھا اُن کے فیصلے پر۔ پھر پاپا نے زیادہ زور ڈالا تو کسمسا کر بولا۔ ''آؤٹ ہاؤس میں اسٹر کام ہے ناں پاپا! اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی، مجھے کوئی پرابلم ہوئی تو میں فوراً آپ کو انٹر کام کروں گا ناں۔ لیکن پلیز، مجھے شفٹ کرنے کے لئے زور نہ دیں۔ مجھے اپنے کمرے سے بہت اُنس ہے۔''
''کمرے سے اُنس چھوڑو، انسانوں سے اُنس کرو میاں! کیوں جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟''
شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، بلکہ اپنے اریب قریب ناحسوس پھرنے والی دانیا کو دیکھ کر بات کرنے لگا تھا۔ ''ایک کپ چائے پلا دو دانی! بہت تھکن ہو رہی ہے۔''
دانیا عبدالرحمن نے ہاں کہا، نہ ناں اور ملازم کو آواز دینے لگی۔ ملازم کی شکل دکھائی دی تو شہریار کا پیغام آگے ریفر کر دیا۔ شہریار نے دیکھا تو منہ بگاڑ کر بولا۔ ''رہنے دو عباس! مجھے چائے نہیں پینی۔ تم جا سکتے ہو۔''
عباس اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ مگر دانیا نے قطعاً اُس کے مزاج کے برہم ہونے کا اثر نہیں لیا اور فون پر گپ بازی میں مصروف رہی۔ عدیل بھائی نے شہریار کے چہرے کے تاثرات خطرناک دیکھے تو بولے۔
''خاص تمہارے لئے کیا میں چائے بنانے کی جسارت کر سکتا ہوں؟ دیکھو، دانیا جیسی تو نہیں ہوگی لیکن پھر بھی پینے کے لائق ہی سمجھو۔''
شہریار نے کچھ کہنے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ عدیل بھائی نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اُٹھ کر کچن کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ عدیل بھائی کو کچن کے لئے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر دانیا نے فون یکدم رکھ دیا اور اُن کے پیچھے تیزی سے بھاگی تھی۔
''آپ رہنے دیں بڑے بھیا! چائے میں بنا دوں گی۔''
عدیل بھائی نے مڑ کر اُسے دیکھا، پھر خفگی سے بولے۔ ''اگر یہی بات تم شہریار کی مان لیتیں تو کیا برا تھا؟'' لمحہ بھر کو رُکے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ ''وہ تمہارے ہاتھ کی چائے کا ذائقہ جانتا ہے، اس لئے تمہارے ہاتھ کی چائے کو تو اس لمحے وہ قطعاً منہ نہیں لگائے گا۔ تمہیں پتہ ہے ناں، وہ کتنا نک چڑھا ہے۔ اگر کوئی اسے ایک بار کام کو منع کر دے ناں، پھر منت سماجت کر کے کام کرنے کی ہامی بھرے تو اس

کا انکار، اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ ویسے آپ کے شہریار کے ساتھ اتنے بہترین تعلقات کی نہج کیا بات بنی ہے؟"
واضح اشارہ اُس کی بد مزاجی کی طرف تھا، جو پچھلے چار دن سے وہ شہریار کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھی۔ مگر وہ کیا بتاتی کہ بہت ساری چھوٹی موٹی باتوں نے اس کے اندر بڑی بڑی تبدیلیاں کر دی تھیں اور یہ اس کا خیال تھا۔ وہ چونکہ ہر حالت میں شہریار کی سائیڈ لینے کے عادی تھے، اس لئے وہ کوشش کے باوجود ان کے دل میں اپنا دل ڈال کر انہیں اس کی کسی خامی پر رد عمل ظاہر کرنے پر نہیں اکسا سکتی تھی۔ سو اُس نے خاموشی اختیار کئے رکھی تھی۔
عدیل بھائی اُسے چھوڑ کر کچن میں داخل ہو گئے تھے۔ ملازمین میں انہیں دیکھ کر کھلبلی مچ گئی تھی۔ پھر اُن کی آمد کی وجہ معلوم ہوئی تو ہر شخص اپنی خدمات دینے پر راضی دکھائی دیا۔ مگر عدیل عبدالرحمٰن سب کو سلیقے سے منع کر کے خود اس کے لئے چائے بنانے لگے تھے۔
پھر تین کپ لے کر وہ نیچے آئے تو ڈرائنگ روم میں وہ صوفے پر بیٹھا بیٹھا سو چکا تھا۔ پاپا اُس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھے اُسے ایسی محویت سے دیکھ رہے تھے کہ اگر سالار عبدالرحمٰن ہوتے تو ضرور جیلسی کے تحت ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ مگر وہ عدیل عبدالرحمٰن تھے، سو مسکراتے ہوئے پاپا کے سامنے بیٹھتے ہوئے بہت مدھم بولے۔
"آپ بہت محبت کرتے ہیں ناں اس سے؟"
پاپا نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بہت آہستگی سے بولے۔ "ہاں، مجھے اپنی ساری اولادوں میں یہ بچہ سب سے پیارا ہے۔ میرا بس نہیں چلتا کہ اس کے راستے کے سارے خار اپنی پلکوں سے چن لوں۔ اسے صرف خوشی اور محبت کی بارش میں بھیگتا دیکھتا رہوں، دیکھتا رہوں، یہاں تک کہ زندگی کی شام ہو جائے۔"
"ہاؤ رومینٹک...... مگر پاپا! یہ ماما نہیں شہریار ہے، تون بدلیں اپنی۔"
پاپا نے ہنستے ہوئے ان پر کشن کھینچ مارا۔ "خبیث ہو عدیل! تم بھی۔ کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو؟" عدیل بھائی کے سینے سے قہقہہ پھوٹا۔ پاپا، ماما کے ذکر پر بلش ہی ایسے ہو گئے تھے۔ شہریار کی آنکھ ان کے قہقہے سے کھل گئی تھی۔ پھر دونوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو کنفیوز ہو گیا۔
"میرے بارے میں کوئی ڈس کشن چل رہی تھی؟"

""نہیں تو، ہم چائے پر بحث کر رہے تھے۔کھانے کی طرح مردوں کے ہاتھ میں چائے بنانے کے لئے ایک خاص اور الگ ذائقہ دیا ہے اس خدا نے۔" لمحہ بھر کو رک کے، پھر اپنا کپ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر اس کا کپ اس کی طرف بڑھا کر بولے۔"پیو، پیو تم بھی کیا یاد کرو گے، کس عظیم باورچی سے پالا پڑا تھا۔"

""خدا نہ کرے، آپ کی زندگی میں یہ "تھے" والا صیغہ آئے۔"

""کیوں بیٹا! میں نے عمر خضر کا پیالہ پیا ہوا ہے؟" انہوں نے حظ لیا اُس کی جذباتیت سے اور وہ چائے کا کپ لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

""عمر خضر کا پیالہ نہ پیا ہو، تب بھی میری دعائیں ایسی بھی رائیگاں نہیں۔اللہ تعالیٰ سے خصوصی ڈسکاؤنٹ مانگی ہے آپ کے لئے۔پوتا پوتی کھلائے بغیر نہیں جانے دوں گا آپ کو۔"

""ویری گڈ! یہی اسپرٹ چاہئے مجھے۔"سو واٹ؟" کا ایک جملہ ہے، اسے زندگی میں شامل کر لو تو پھر کچھ بھی برا نہیں لگے گا۔"

""ہاں، مگر اس کے لئے بندے کا بے حس ہونا ضروری ہے۔کیا آپ چاہتے ہیں۔۔۔۔۔"

اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔عدیل عبدالرحمٰن نے اس جملہ ادھورے جملے کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ واقعی اسے بے حس نہیں دیکھنا چاہتے تھے، سو بہت خاموشی میں چائے پی جا رہی تھی۔لیکن چائے پینے کے بعد شہریار کی حالت۔۔۔۔۔۔چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔وہ بیٹھے سے یکدم لیٹ گیا تھا۔

""تم ٹھیک تو ہو شیری؟" پاپا اور عدیل بھائی ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے۔اس نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

""تمہیں طبیعت سنبھلنے تک چائے کافی سے پرہیز کرنا چاہئے شیری!" پاپا نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کے صوفے پر بیٹھنے کی جگہ بنائی۔عدیل بھائی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے چہرے کا پسینہ صاف کر رہے تھے۔ہراسگی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔تھوڑی دیر پہلے کی ساری شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

""شہریار! آنکھیں کھولو ناں۔مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔"

شہریار نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔بہ دقت آنکھیں کھولیں، پھر مدھم لہجے میں بولا۔"شاید تھکن کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔آپ پریشان مت ہوں۔گھبرانے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔"

دانیا کو کسی ملازم نے خبر دے دی تھی، سو وہ سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے بے چینی سے نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔کچھ واضح نہیں ہو پا رہا تھا، سو واپس کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔تھوڑی دیر بعد واپس لوٹی تو اُس کے ہاتھ

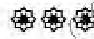
میں چائے کا کپ تھا۔ وہ ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُترتی چلی گئی اور عین اسی وقت شہریار نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ دانیا کے چہرے پر بے نیازی تھی، مگر اُس نے تیز نظری سے اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ اسے تسلی ہو گئی تھی، وہ ٹھیک ہے۔ سو اُس نے نانو کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ شہریار نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا مگر اُس کے چہرے کا پھیکا پن عدیل بھائی اور پاپا دونوں نے محسوس کیا تھا۔

"میں اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتا ہوں پاپا!" وہ بدقت اٹھا، پھر عدیل بھائی اور پاپا اسے روکتے رہ گئے، مگر وہ رکا نہیں تھا۔ عدیل بھائی اسے سہارا دیتے ہوئے آؤٹ ہاؤس کی طرف لے کر چل پڑے تھے۔

"جب تک میں یہاں ہوں، میں شیری کے ساتھ ہوں پاپا!"

پاپا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ شیری نے بھی کچھ کہنا ضروری نہیں خیال کیا۔

یوں خفا زندگی اُس کے ہمراہ اپنی تنہائی کی ذات میں سمٹتی چلی گئی۔



شافعہ سہیل نے اپنی ڈیوٹی کے آف پر بیرسٹر رفیق کے دفتر کا قصد کیا تھا۔ مسٹر رفیق اسے آدھے گھنٹے بعد فری ملے تھے، سو اُس نے اُن سے اپنی پرابلم شیئر کی تھیں۔ مسٹر رفیق کافی دیر تک سوچتے رہے تھے، پھر آہستگی سے انہوں نے اپنے سامنے رکھے رجسٹر کو کھولا اور دو تین صفحے پلٹ کر بولے تھے۔

"یہ مس زرش ہوتی ہیں، بہت ٹاپ کی ماڈل تھیں، اپنی کسی عزیزہ کے لئے ایک جز وقتی نرس کی سخت ضرورت ہے۔ اگر تم جاؤ تو میرے خیال میں یہ تمہیں اس کام کا اچھا معاوضہ بھی دیں گے۔"

"مجھے منظور ہے سر! آپ مس زرش سے میری بابت بات کر لیجئے، میں شام چھ بجے سے ان کی مریضہ کو اٹینڈ کرنے کے لئے فری ہوں گی۔ رہی ڈیوٹی کی ٹائمنگ تو یہ بات آپ ان سے پہلے ہی طے کر لیجئے گا کہ یہ میری مجبوری ہے، میں اپنی گورنمنٹ ملازمت چھوڑنا نہیں چاہوں گی۔"

مسٹر رفیق نے سر ہلایا تھا اور وہ دفتر سے باہر نکلتی چلی آئی تھی۔ پھر اُس کا رخ سڑک کی طرف تھا کہ ایک کار اُس کے بالکل سامنے آ کر رک گئی تھی۔ وہ عام گھریلو لڑکی نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس طرح کی ول گئی سے عموماً گھبرا ہی جاتی تھی۔ سو اُس نے ہلکے قدموں سے چلنا شروع کر دیا تھا کہ یکدم کسی نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔ ڈارک گلاسز نیچے ہوئے تھے اور اس کے ہراساں چہرے پر قدرے مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

"افوہ، آپ......آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

اُس نے واپسی کے قدم گنے فرنٹ ڈور کھول دیا گیا تھا اور وہ آرام سے اب کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''آپ اتنا اچانک۔فون پر تو آپ کہہ رہے تھے، آئندہ چھ ماہ تک آپ کا پاکستان آنے کا پروگرام نہیں بن سکتا۔''

اُس نے چادر کے کونے سے پسینہ صاف کیا اور ساتھ بیٹھے ہوئے مرد نے اُسے پوری گہری نظروں سے دیکھا۔اس نظر میں لمس محسوس کرنے کی تڑپ حد درجہ تھی، مگر وہ اپنے اوپر چیک رکھنے کی اتنی عادی تھی کہ آسانی سے اُس نے اس پیغام کو رد کر دیا تھا۔سامنے بیٹھے مرد نے اُس کی اس جسارت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔آنکھوں میں واضح طور پر خفگی کا تاثر موجود تھا۔تبھی اُس نے ہولے سے اُس کے ہاتھ کو چھو کر نرمی سے کہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں، میں زندگی کا ایک واضح اصول رکھتی ہوں۔''

''مگر محبت میں کوئی اصول نہیں ہوتا۔صرف محبت ہوتی ہے۔''جواباً ایک ہٹ دکھائی گئی۔شافعہ کے چہرے پر مسکان اُبھری، ڈوب گئی۔اُس نے مدھم کہا۔

''ہاں، محبت صرف محبت ہوتی ہے۔لیکن محبت کرنے والے ذی ہوش ہوتے ہیں، اس لئے ان پر اضافی ذمے داری آپڑتی ہے کہ وہ اپنی محبت کو باہوش رہنے دیں۔''

''مگر محبت مدہوشی کا دوسرا نام ہے۔من وتو کے فاصلے مٹا دینے کو محبت کہتے ہیں۔کیا تمہارا دل نہیں چاہتا، تم مجھے محسوس کرو، مجھے چھو کر دیکھو کہ میں تمہارا کتنا ہوں، کتنا نہیں....کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم میرے ساتھ گھومو؟ پھر خواہ کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی، دنیا کو اپنے اور میرے بیچ نہیں آنے دو۔''

شافعہ کیل نے سنجیدگی سے اُس کے جذبات سے جلتے بجھتے لہجے کو سنا۔آنچ دل میں قدم قدم اُترتے دیکھی، مگر پھر بھی خود کو سنبھالا دے کر بولی۔''میرا یہ سب دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں محسوس کروں۔میرا دل چاہا ہے، میں تمہارے ساتھ خوب گھوموں، پھروں۔مگر عارف! یہ سب ابھی ممکن نہیں۔میں منگنی کو ایک کچا بندھن سمجھتی ہوں۔جس دن تم نے میری محبت کو بیاہ کر اپنے گھر کی دہلیز کا راستہ دیا، اس دن تمہاری ہر تمنا، ہر آرزو پوری کرنا ضروری ہوگی مجھ پر۔تم میری زندگی کی پہلی تمنا ہو عارف! پھر تم سے ہٹ کر مجھے کچھ دکھائی کب دے گا؟''

عارف اس جواب پر شرارت سے مسکرانے لگا تھا۔''ایک معصوم جسارت کی اجازت تو دوگی ناں؟ کتنے ماہ بعد مل رہے ہیں ہم، میری محبت تمہارا احساس چاہتی ہے۔''

شافعہ بلش ہوگئی۔عارف اُس کے چہرے کے رنگوں سے محظوظ ہوتا رہا۔اُس نے جس معصوم جسارت کی اجازت چاہی تھی، اُس کو اس پل رہنے دیا تھا۔گاڑی سبک رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔

''بجو! اگر عارف بھائی اتنے دولت مند نہ ہوتے تو بھی آپ کا کیا یہی فیصلہ ہوتا؟'' عارف جواد نے سونیا کو سرزنش سے دیکھا مگر شافعہ کے چہرے پر خفگی نہیں ابھری تھی ۔اُس نے مدھم سا کہا تھا۔

''عارف میرے لئے صرف عارف ہیں ۔دولت، شہرت، عزت، یہ سب مجھے اس لئے اچھی لگتی ہے کیونکہ یہ ان کے وجود کا حصہ ہے، ان ہی پر جچتی ہے ۔لیکن اگر یہ سب کچھ وقت ان سے چھین لے، تب بھی میں ان کی پشت پر رہوں گی۔ مصیبتوں میں دوست تو نہیں چھوڑ کے جاتے ۔دوست تو کنول کے پھول کی طرح ہوتے ہیں ۔تالاب سوکھ جائے تو وہ بھی سوکھ کر وہیں مرجھا جاتے ہیں ۔مرغابی کی طرح نیا تالاب نہیں ڈھونڈنے نکل پڑتے۔''

''واہ، واہ.......یہی باتیں تو مجھے تمہارا دیوانہ کرتی ہیں ۔تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچنے ہی نہیں دیتیں ۔'' وجاہت ختم کر کے سونیا کی طرف مڑا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''تم نے اپنی بجو سے تو سوال کر لیا، یہ تو بتاؤ، اس سوال کا محور تم ہوتیں تو تمہارا کیا جواب ہوتا؟''

سونیا مسکرا کر بولی۔ ''سیدھی سی بات ہے، میں ذرا بجو کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پریکٹیکل ہوں، سو اگر ایسا موقع میری زندگی میں آیا تو میں مرغابی کی طرح نیا تالاب ڈھونڈنا چاہوں گی ۔آپ تو جانتے ہیں، غربت پھانکتے پھانکتے کوئی ولی ہی ہوگا، جو راہ نہیں بدلے گا ۔میں تو انسان ہوں، سو شارٹ کٹ پر یقین رکھتی ہوں۔''

شافعہ نے اُسے سرزنش سے دیکھا اور عارف جواد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''میں ذاتی طور پر تم سے پہلی بار مل رہا ہوں، مگر تمہاری صورت سے میں نے تمہارے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل غلط نکلا........ویسے تم ہماری منگنی میں کیوں نہیں آئی تھیں؟''

شافعہ کا خیال کر کے وہ سخت کمنٹ دیتے دیتے یکدم بات کو زم موڑ دے بیٹھا ۔اور رہی سونیا تو اُس نے اُس کے لہجے کا ذرا نوٹس نہیں لیا اور اپنی وہ مصروفیات بتانے لگی، جس کی وجہ سے اُس نے منگنی مس کی تھی ۔عارف جواد نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ البم مانگنے لگا تھا، جو شافعہ کے ساتھ اُس نے ہاسپٹل کے دنوں میں بنوائی تھی ۔یہ ہر تصویر میں وہ صحت یابی کے مختلف پروسیجر سے گزر رہا تھا ۔کندھے پر ہاتھ رکھے چلنے والی تصویر پر ایک لمحے کو وہ ٹھہر گیا تھا، پھر محبت سے بولا تھا۔

''یہ وہ لمحہ تھا شافی! جب مجھے لگا تھا، بس زندگی گزارنی ہے تو صرف تمہارے ساتھ ۔تمہارے علاوہ مجھے کوئی اور سنبھال ہی نہیں سکتا ۔تم جانتی تھیں، میری کار کا ایکسیڈنٹ ڈرنک کی وجہ سے ہوا تھا، لیکن پھر بھی تم نے ذرا سی بھی نفرت کا اظہار کیا نہ خوف زدہ ہوئیں ۔نائٹ شفٹ میں بھی میری دیکھ بھال میں تم جس طرح پُر اعتماد رہتی تھیں، اس پر میرے دل نے کہا تھا، بس یہی لڑکی ہے، جو مجھ جیسے بگڑے

ہوئے انسان کو سدھار سکتی ہے۔"

شافعہ کچھ نہ بولی تھی۔ سونیا دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر باہر آ گئی تھی۔ اُس کا رُخ بابا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دبے قدموں بابا کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ آج بابا اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لئے لا یعنی لکیریں نہیں کھینچ رہے تھے۔ آج اُن کے کینوس پر دو بہت گہری آنکھیں تیرتی پھر رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں محبت کا بے نام سا دیا بھی آنچ دے رہا تھا۔ سونیا کو محبت سے کوئی علاقہ نہیں تھا، مگر آنکھوں کی خوب صورتی، وہ انہیں سراہے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"واؤ، بابا! کیا آنکھیں ہیں۔ یہ کس کی آنکھیں ہیں بابا! اس کا چہرہ...... اس کا چہرہ بھی تو بنائیے بابا!"

ارسلان راشدی چونک کر مڑے۔ "چہرہ...... ان آنکھوں میں کوئی عکس میرے نام کا نہیں، لیکن پھر بھی یہ آنکھیں ابھی تک جتاتی ہیں کہ جیسے ان پر میرا اختیار آج بھی ہے...... مگر چہرہ پینٹ کر دوں تو یہ جو ایک واہمہ ہے، یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔"

سونیا ارسلان راشدی انہیں خاموشی سے دیکھے گئی۔

"بابا! آپ کی شادی اماں سے مجبوری کی شادی تھی ناں؟ آپ پہلے سے کسی کو پسند کرتے تھے ناں؟"

ارسلان راشدی کچھ نہیں بولے اور اُس نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بابا! میں محبت کو شغل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ لیکن جب میں اسی محبت میں آپ کو جلتے دیکھتی ہوں تو مجھے محبت سے چڑ بھی ہوتی ہے اور اس محبت پر رشک بھی آتا ہے، جو آپ جیسے کری ایٹو بندے کو بھی اپنے آنچل میں باندھ کر بے نیازی سے نارسائی کا سم پلاتے ہوئے بھی اپنی محبت ہونے کے زعم سے باہر نہیں نکلتی۔ اور نہ ہی آپ اس محبت کے دائرے سے خود ہی نکلنا چاہتے ہیں۔"

ارسلان راشدی نے تھکے تھکے انداز میں بات مسکراہٹ میں رکھ کر برابر کرنے کی کوشش کی اور سونیا ان کے سر ہو گئی۔

"آپ وہی نظم سنائیے بابا! جو آپ اکثر گنگناتے ہیں۔" لمحہ بھر کو رکی، پھر شرارت سے بولی۔ "عارف بھائی بھی آئے ہوئے ہیں بابا! میں ابھی اُنہیں بھی بلا کر لائی۔ آج مل کر خوب شاعری کھیلتے ہیں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ پانچ منٹ بعد واپس لوٹی تو عارف اور شافعہ ساتھ تھے۔

ارسلان راشدی کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ دونوں سونیا کے برابر میں آن بیٹھے تھے۔ سونیا نے ایک دو بار ضد کی تھی، تب ارسلان راشدی نے اپنی پسندیدہ نظم سنائی تھی۔

''لاکھ ضبط کی خواہش کے

بے شمار دعوے ہوں

اس کو بھول جانے کے

بے پسند ارادے ہوں

اور اس محبت کو ترک کر کے جینے کا

فیصلہ سنانے کو

کتنے لفظ سوچے ہوں

دل کو اس کی آہٹ پر

برملا دھڑکنے سے کون روک سکتا ہے

پھر وفا کے صحرا میں

اس کے نرم لہجے اور سوگوار آنکھوں کی

خوشبوؤں کو چھونے کی

جستجو میں رہنے سے

روح تک پگھلنے سے

ننگے پاؤں چلنے سے
کون روک سکتا ہے
آنسوؤں کی بارش میں
چاہے دل کے ہاتھوں میں
ہجر کے مسافر کے
پاؤں تک بھی چھو آؤ
جس کو لوٹ جانا ہو
اس کو دور جانے سے
راستہ بدلنے سے
دور جا نکلنے سے
کون روک سکتا ہے
کون روک سکتا ہے......"

یکدم ارسلان راشدی کو لگا، وہ اس کمرے سے کہیں اور جا نکلے ہوں اور کوئی ہاتھ ہے، جو اُن کے ہاتھ سے ابھی کے ابھی چھڑا کر اُن کے حصے میں محبت کی بے وفائی کا دکھ چھوڑے جا رہا ہو۔
"مت جاؤ چھوڑ کر، میں نے تمہارے بغیر چلنے کی عادت ہی نہیں ڈالی ہے قدموں کو۔ میں تمہارے بغیر چلا تو مجھے گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا......"
وہ تیزی سے دوڑے مگر ہاتھ، ہاتھ سے نکل جائے تو راستوں کی مرضی ہے، دوبارہ کبھی ان ہاتھوں کو پھر سے ملائیں یا نہیں؟

"بابا! آپ نے سنا، عارف بھائی نے کیا شعر پڑھا ہے؟" سونیا نے انہیں واپس اندر کے سفر سے کھینچ لیا تھا۔ وہ چونک کر عارف کو دیکھ رہے تھے اور شافعہ سہیل، عارف کے لبعد محبت پر نغمہ سرا تھیں۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں ، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں ، میں اب ہجر کی کوئی بات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں ، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں ، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ، ڈر کیسا؟
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

"واہ، واہ۔" عارف اور سونیا نے شوخی سے شافعہ کو داد دی اور ارسلان راشدی ان تینوں کھلکھلاتے چہروں کو دیکھنے لگے۔ یہ چہرے، انہیں محبت نے ابھی چھوا تھا۔ محبت نے ابھی ان کی طرف اپنے نام کا کوئی دکھ نہیں سنڈلیس کیا تھا، اس لئے یہ ہنس سکتے تھے، پورے دل سے کھلکھلا سکتے تھے۔

کاش محبت کی ساری عمران کی خوشی کو لگ جائے اور محبت نام کے دکھ سب میری قسمت میں ڈال دے وہ رب۔ انہوں نے دل ہی دل میں مناجات کی۔

محفل برخاست ہو چکی تھی۔ عارف، ارسلان راشدی کی پینٹنگ سے محظوظ ہو رہا تھا اور شافعہ سہیل ان کی تازہ تصویر پر آ کر رک گئی تھیں۔

"بابا! یہ آنکھیں...... ایسا لگتا ہے، میں نے ان آنکھوں کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے...... بہت زیادہ مگر یاد نہیں آ رہا...... آپ اس کا چہرہ بھی بنا دیجیے ناں۔"

ارسلان راشدی نے چہرہ بنانے کے بجائے ان آنکھوں پر بھی کالا رنگ پھیر دیا تھا۔

"بابا! یہ آپ نے کیا کر دیا؟...... اتنی اچھی تو تھیں یہ آنکھیں۔"

"ہاں، مجھے بھی پہلے یہی دھوکا ہوا تھا۔"

ادھورا جملہ کہہ کر انہوں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا تھا اور سونیا اس کے چیریٹی فنڈ ریزنگ کے دن کی تصویریں دیکھنے لگی تھی۔

''بابا! یہ دیکھیے، یہ ہیں مسٹر عبدالرحمٰن، جنہوں نے اس سلسلے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا۔''

ارسلان راشدی نے البم ہاتھ سے لی تھی، پھر تصویر پر نظر جاتے ہی ان کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک کوندی تھی۔

''اچھے انسان ہیں، انہیں لوگوں سے ہمدردی جتانے اور ہمدردی کرنے کا خاص سرسام رہتا ہے۔'' البم واپس کرتے ہوئے کمنٹ دیئے۔

''بابا! یہ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔'' شافعہ سہیل حیران ہو گئی۔

''ہاں، میں جانتا ہوں، یہ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔'' بظاہر عام لہجہ تھا، مگر سونیا چونک گئی تھی۔ کیونکہ لہجے میں خاص تنفر کا احساس واضح تھا۔

بابا، اتنے اسٹریٹ فارورڈ کمنٹ دینے والوں میں سے تو نہیں، پھر...... پھر کیا وہ مسٹر عبدالرحمٰن کو پہلے سے جانتے ہیں؟

''عبدالرحمٰن، یہ نام تو بہت سنا ہوا ہے میں نے۔'' سونیا کے ذہن نے سوال اچھالے اور اس کے اندر ہلچل مچ گئی۔



نئے ہفتے کی صبح شہریار کے لئے عام دنوں سے ہٹ کر تھی۔ آج وہ مکمل طور پر خود کو تنہائی کا پرسہ دے کر اٹھا تھا۔ بظاہر عدیل بھائی اس کے ساتھ ناشتے پر تھے، مگر اُسے لگ رہا تھا، وہ اکیلا ہی بیٹھا ہے۔ ناشتہ بہت خاموشی میں کیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ ناشتے کے بعد اُسے وہی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ ہاتھ پیروں میں سے بالکل جان نکل گئی تھی۔ عدیل بھائی اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے، اس لئے آرام کا یہ وقفہ بہت لمبا نہیں کیا تھا اس نے۔ اُسے دوبارہ کھڑے ہوتے دیکھ کر عدیل بھائی نے اشارے سے پوچھا تھا۔

''کہاں کا قصد ہے؟''

''دفتر جاؤں گا۔''

''پاگل ہو، ابھی کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام کرو صرف۔ جب ٹھیک ہو جاؤ، تب دفتر جانے کا قصد کرنا۔''

''یعنی پھر تو کبھی دفتر جا ہی نہیں سکوں گا۔''
''کیا مطلب؟'' عدیل بھائی کے کان کھڑے ہوئے اور اُس نے دانتوں تلے زبان دبالی۔ جلدبازی میں غلط جملہ غلط بندے کے سامنے نکل گیا تھا پھر بھی بات سنبھالنے کو بولا۔
''سیدھی سی بات ہے بڑے بھیا! انجائنا پرابلم تو ایک مستقل دردِ سر ہے۔ پھر مکمل ٹھیک تو میں کبھی نہیں ہوسکتا۔ سو، کام کب تک میرے انتظار میں پڑے رہیں گے؟''
''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کام تمہارے انتظار میں نہیں پڑے رہیں گے، اس لئے سالار کو بھی کچھ کرنے دو۔ خوامخواہ زیادہ بوجھ اپنے سر لے کر رکھتے ہو، پھر بھی کہنے میں یہی آتا ہے، تم بزنس مارکیٹنگ سیل کے علاوہ کچھ تیر نہیں چلاسکتے۔''
''آخاہ تو آپ کو میری محبت سالار بھائی سے لڑا رہی ہے۔'' لمحہ بھر کو رکا، پھر توقف کے بعد بولا۔ ''سنی بھائی غصے کے جتنے بھی تیز سہی، یہ طے ہے، بڑے بھیا کام میں مجھ سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ ہم دونوں مل کر ہی کام کریں، تبھی فیشن اینڈ اسٹائل اپنی ساکھ برقرار رکھ سکتا ہے۔''
''مگر ابھی تمہیں آرام کرنا چاہئے۔'' کسمسا کر انہوں نے پھر بھی چانس لیا مگر وہ پینگ شدہ کپڑے لے کر شاور لینے چلا گیا تھا۔ پھر تیار ہو کر باہر آیا تو عدیل بھائی کے دل کو پھر سے وہم نے گھیر لیا۔
''میں مانتا ہوں تم نے میری بات مانتے ہوئے پچھڑے کی چھٹی کرلی تھی، سنڈے بھی آرام کیا تھا، مگر شیری! مجھے لگتا ہے، تمہیں بھی اور آرام کرنا چاہئے۔''
''کرلوں گا۔ پہلے کام نمٹالوں، پھر اکٹھا آرام کرلوں گا۔''
''مطلب؟ یہ تم ذومعنی گفتگو کیوں کرنے لگے ہو؟''
''کہاں بڑے بھیا! سمپل جملہ ہے۔ ظاہر ہے، انسان کام مکمل کر کے ہی آرام کرنے کا حق ادا کرسکتا ہے ناں۔''
عدیل بھائی کچھ نہیں بولے تھے اور وہ پورے اعتماد سے گارڈن سے ہوتا ہوا کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پہلا منظر ہی تکلیف دہ تھا۔ دانیا مزے سے ناشتے میں مصروف تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے پر ملال کا تاثر نہیں اُبھرا تھا۔ اُس نے گہرا سانس لے کر اپنی خالی کرسی سنبھالی۔ پاپا نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور ماتو نے اُس کا رخسار چھو کر اُس کی طبیعت کی بحالی کی بابت پوچھا۔
''ایک دم فرسٹ کلاس ہوں، ماتو! آپ بتائیے، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میری طبیعت تمہارے آنے سے بہتر ہوگئی ہے، میرے بچے!''

دانیا کے ہاتھ کے کپ کی چائے چھلک گئی تھی۔ جازی عبدالرحمٰن نے بھی حیرت سے محبت کے اس نئے تعارف کو دیکھا تھا۔ ماما کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ گلہ تھا اور مسٹر عبدالرحمٰن مطمئن ہوکر اسے دیکھ رہے تھے، جیسے انہیں اپنی اس اولاد کی قابلیت پر کوئی شک تھا ہی نہیں۔ وہ لمحوں میں کوئی بھی سحر پڑھ کر پھونک سکتا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن آج بہت صبح ہی دفتر چلے گئے تھے، اس لئے اُس نے ناشتہ کرتے جازی عبدالرحمٰن کی طرف توجہ اُچھالی تھی۔

''جازی! آج کالج کے بعد تم میرے دفتر آجانا۔''

جازی عبدالرحمٰن نے کوفت سے اُس کی طرف دیکھا۔ جواب دینا کسرِ شان محسوس ہوا تھا اُسے...... مگر شہریار بہت کلیئر تھا اس نئے فیصلے پر، سو پوری توجہ سے بولا۔ ''جازی عبدالرحمٰن! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟''

''لیکن مجھے آپ سے کچھ سننے کی حسرت اب نہیں ہوتی۔''

''اوکے، ٹھیک ہے۔ مگر پھر بھی، آج سے آپ آفس جوائن کر رہے ہیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' اُس نے [illegible] لئے بغیر اپنا فیصلہ سنا دیا اور وہ تپ گیا۔

''پلیز، مجھے ریموٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے شیری بھائی! میں اپنے فیصلے خود لیتا ہوں۔''

''مگر بیٹا! شہریار آپ کے بھلے کے لئے ہی کچھ کہہ رہا ہے تو اسے ماننے میں کیا حرج ہے؟'' مسٹر عبدالرحمٰن نے درمیان میں آکر اسے سپورٹ کیا۔

عدیل بھائی کی آنکھیں بھی جازی پر اٹکی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کے رویے پر سخت ناپسندیدگی واضح تھی۔ لیکن جازی عبدالرحمٰن کا دل اب چاہ کر بھی شہریار عبدالرحمٰن کے لئے نرمی سے نہیں دھڑک سکتا تھا، یہی وجہ تھی، اس نے مکمل اُسے اگنور کر کے دانیا کو دیکھا تھا۔ ''بجو! چلئے، کالج کے لئے لیٹ ہو رہا ہوں۔''

شہریار نے دانیا عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔ ہاسپٹل جانے سے پہلے تک یہ ذمہ داری اس کے سر تھی۔ شہریار ہی اُسے پک اینڈ ڈراپ کیا کرتا تھا۔ جس دن بہت مصروف ہوتا تو ڈرائیور کو ہی بھیج دیتا۔ مگر اس ذمہ داری سے صرف نظر نہیں کرتا تھا۔ مگر آج جیسے سب کچھ مختلف ہو رہا تھا، جیسے سارے اختیارات ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔

ایک لمحے کو دل نے آزردگی سے سوچا، پھر اُس نے تسلی دی خود کو، اس کے بعد بھی تو یہ سب کچھ کسی نہ کسی کی ذمے داری میں آنا ہی تھا۔ پھر کیا برا ہے اگر اس کے ہوتے ہوئے یہ ذمے داری اصل ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ اس نے نگاہ موڑلی تھی، مبادا آنکھ کی کور میں جدائی کی نمی نہ کوئی دیکھ لے۔ پھر آہستگی سے بولا تھا۔

"پاپا! بیگم عافیہ پاکستان آچکی ہیں۔ چار پانچ دن سے وہ اپنے گھر کو رینویٹ کروارہی تھیں، اس لئے میٹنگ کا دن آج لنچ پر طے پایا ہے۔ آپ بتائیے، میرے پاس کس قسم کے اختیارات ہیں؟"

عبدالرحمٰن نے اچنبھے سے بیٹے کو دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ "سالار اور تمہارے اختیار یکساں ہیں شہریار! ہاں، بس کچھ کاموں میں تم دونوں اسپیشلٹی رکھتے ہو، اس لئے ان کاموں کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہو۔ باقی جس وقت جو فیصلہ لینا چاہے، اسے اختیار حاصل ہے۔ میں نے نئی ول میں یہ سب لکھ دیا ہے۔"

"ول......؟" شہریار نے بے قراری سے پاپا کو دیکھا۔

انہوں نے بیٹے کی آنکھوں میں ہراسگی دیکھی تو بولے۔ "یہ تو سمپل بات ہے بیٹا! میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ یہ جو چل رہا ہے، یہ تو صرف بونس ہے۔ اس لئے بعد کے مسائل سے بہتر ہے، زندگی ہی میں سب کچھ اپنے بچوں میں برابر تقسیم کردوں تاکہ ان کے دلوں کی محبت کسی لڑائی کا ایندھن نہ بن جائے۔"

اس نے کچھ نہیں کہا تھا، مگر تیزی سے اس کے دماغ نے بھی اسے ایک نیا خیال دیا تھا۔ مگر اس خیال پر وہ بہت خاموشی سے عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ سو وہ خاموشی ہی میں لپٹا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ عدیل بھائی نے اُس کا ارادہ دیکھا تو آہستگی سے بولے۔

"جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے، تمہاری گاڑی رفیق ڈرائیو کرے گا۔"

"عدیل بھائی! آپ تو مجھے ہتھیلی کا چھالا بنائے دے رہے ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں بابا!"

"عدیل غلط نہیں کہہ رہا۔ کچھ ہفتے تم یہ احتیاط کرلو، اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" اُس نے بے چارگی سے سر ڈال دیا تھا۔

پھر دفتر جاتے ہی سب سے پہلے وہ مومنہ رفیق سے ملا تھا۔ حجاب میں چھپی آنکھیں.. اُس کے اندر کوئی یاد رینگنے لگی تھی۔ یہ آنکھیں...... ایسا لگتا تھا، اُس نے یہ آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھی تھیں۔ مگر کہاں؟ وہ اس یاد کے ساتھ ساتھ چل نہیں پا رہا تھا۔ مگر بہر حال اُس کا کام تسلی بخش تھا، سو اس نے سالار عبدالرحمٰن کے دفتر میں انٹری دی تھی۔

"آج آپ صبح ہی دفتر آ گئے سنی بھائی!"

سالار عبدالرحمٰن نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمپیوٹر پر ڈریس کلیکشن کی ویب سائٹ کھولے بیٹھے تھے۔

"سنی بھائی! آپ نے انٹرویو کر لئے باقی؟"

سالار عبدالرحمٰن نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا، پھر تلخی سے بولے۔ "یہ اختیار میرے پاس کہاں ہے؟ اسے تو آج کل آپ ایچو کر رہے ہیں، میں تو ایکٹنگ ڈائریکٹر ہوں اسٹائل وژن کا۔"

وہ کمرے کی دہلیز سے یکدم اندر آ گیا، پھر ہولے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آئی ایم سوری بھائی! میں نے مومنہ کو آپ کی اجازت کے بغیر رکھا۔ لیکن اگر آپ کو اس پر اعتراض ہے تو میں اپنا فیصلہ واپس لے سکتا ہوں۔ ویسے بھی اُسے میں نے ٹرائل بیس پر ہی اپائنٹ کیا تھا۔"

"رہنے دو اپنا یہ میٹھا پن۔ اپنی مرضی کی گزارتے ہو پھر بھی اچھے بن جاتے ہو۔ بدلو اپنی یہ دوغلی پالیسی۔ تم جانتے ہو، مجھے منافق لوگوں سے سخت چڑ ہے۔" اس کا ہاتھ انہوں نے جھٹک کر کندھے سے ہٹا دیا تھا۔

وہ کچھ ساعت تو یونہی کھڑا رہا، پھر اپنے روم میں جا کر کری ایٹو ڈپارٹمنٹ کے منیجر رازی فاروقی کو اس نے اپنے دفتر میں بلا بھیجا۔ دس سیکنڈ بعد رازی فاروقی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ جوان العمر بقدرے وجیہہ انسان تھا۔ ایڈ کی زیادہ تر ذمے داری اسی کے شعبے کے سر تھی۔ کوئی بھی آئیڈیا میٹنگ میں امپروو ہونے سے بھی پہلے ڈیسک ایڈیٹر سے ہوتا ہوا اُس تک پہنچتا تھا۔ پھر اگر اس میں کوئی خامی ہوتی تو اس آئیڈیا کو پھر سے ڈرا کیا جاتا، نئی پریذنٹیشن تیار کی جاتی، واقعاتی پریذنٹیشن کو میٹنگ میں اپروول کے لئے پیش کیا جاتا۔ پھر کہیں وہ میڈیا کے حوالے کیا جاتا۔ کاپی رائٹنگ، جنگل بنائے جانے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد پھر کہیں وہ ایڈ کی شکل میں فوکس کیا جاتا۔ شہریار نے بھی اس وقت رازی فاروقی کو نئے ایڈ کی بابت پوچھنے ہی کے حوالے سے طلب کیا تھا۔ آج کل ان کے پاس موبائل زون کے کالنگ کارڈ کا کانٹریکٹ ابتدائی مرحلے میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رازی فاروقی کی شکل دیکھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"مسٹر فاروقی! موبائل زون کی کمپین کہاں تک پہنچی؟"

رازی فاروقی نے ابتدائی شکل میں موجود کمپین کے مندرجات اس کے سامنے لا رکھے تھے۔ آئیڈیا کاپی، پچھلا کمپین، پورٹ فولیو، پچھلی مارکیٹنگ کے حوالے سے ڈیٹا پروفائل، سب ایک ساتھ اس کے سامنے رکھی تھی۔

''اس کمپنی کا بزنس بہت اچھا ہے مسٹر رازی! کیوں، آپ کا کیا خیال ہے؟''

رازی فاروقی نے مسکرا کر کہا۔ ''جی سر! یہ کمپنی آل ریڈی پاکستان میں بہت ہائی کلاس بجٹ رکھتی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں اس کے کسٹمرز موجود ہیں۔ فرنچائزز کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اگر اس کا بزنس ہمیں اس سال کے لئے مل گیا تو ہم بہت بہترین طریقے سے اپ پوزیشن میں آسکتے ہیں۔ اس کمپنی کا ایڈ حاصل کرنے کے لئے ہمارے اسٹائل وژن کے ساتھ ساتھ دوسری بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں پرکشش پیکیج دے کر یہ بزنس حاصل کرنا چاہتی ہیں۔''

''پھر ہم نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟'' وہ اس کی ترتیب سے بنائی گئی فائل کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

رازی فاروقی نے گھڑی دیکھی، پھر آہستگی سے بولا۔ ''کل رات کی میٹنگ فکس ہے سر! آپ ابتدائی معاملات طے کرنے کے لئے پیش رفت کرسکتے ہیں۔ اسٹائل وژن کی ساکھ بھی ہے اور خود آپ کی کام میں دلچسپی آپ کو اس موقع کو حاصل کرنے میں زیادہ ٹف ٹائم نہیں لینے دے گی۔''

اس نے فائل سائیڈ پر رکھ دی، پھر پہلی بار رازی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں یہ میٹنگ اٹینڈ کروں گا۔ آپ یہ فائل یہیں رہنے دیجئے۔''

رازی فاروقی سر ہلا کر اجازت لے کر داخلی دروازے کی طرف مڑ گیا اور وہ نئے طریقے سے فائل پر پھر سے غور کرنے لگا تھا۔ آئیڈیا، پریذنٹیشن سب بہترین تھے۔ وہ کری ایٹو ڈپارٹمنٹ کی صلاحیتوں کو سراہتا ہوا کچھ اور سوچنے کی جستجو میں تھا کہ اچانک اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر ریسیو کرلیا مگر دوسری طرف اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''ہیلو، شہریار اسپیکنگ......کون؟''

دوسری طرف سے آواز کی جگہ سسکی سنائی دی۔

''ہیلو......کون؟'' شہریار کو لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن یکدم بڑھ گئی تھی۔

''ہیلو، میں بول رہی ہوں۔''

''کون......کون ہو تم؟'' اس کی آواز میں دل کی دھڑکن سے بھی زیادہ تیزی تھی مگر جواب کی جگہ رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس نے موبائل پر نمبر دیکھا، مگر یہ اجنبی نمبر تھا۔

کون تھی وہ؟...... یہ آواز بہت سنی ہوئی ہے۔ مگر یاد نہیں آرہا، کون تھی وہ؟ اُس نے بہت ذہن دوڑایا مگر جواب ندارد تھا۔ یہاں تک کہ وہ میٹنگ کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اُس نے جازی کو سالار کے رُوم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیز قدمی سے اس تک پہنچا پھر مسکرا کر بولا تھا۔

"اچھا کیا، تم نے میری بات مان لی۔"

"مجھے سالار بھائی سے کام تھا۔ میں آپ کے کہنے پر دفتر نہیں آیا، مائنڈ اٹ۔"

شہر یار دیوار سے ٹیک لگا کر مسکرانے لگا، پھر ہنس کر بولا۔

"تم ہاں، بالکل سنی بھائی کی کاربن کاپی ہو صورت شکل میں بھی اور عادت واطوار میں بھی...... دل میں بھلے کچھ بھی ہو، مگر اوپر سے یوں جتاتے ہو جیسے تمہیں کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

جازی نے اس کی طرف تلخی سے دیکھا، پھر غصے سے بولا۔ "پہلے میں اپنے جذبات کو طشت از بام کرنے میں ہی سہولت سمجھتا تھا، مجھے لگتا تھا جو دل میں ہے، وہی باہر ہونا چاہئے۔ مگر پھر کچھ لوگوں نے اس جذباتیت کا اتنا حظ اُٹھایا، اتنا زیادہ لطف لے کر دل چُور چُور کیا کہ پھر مجھے جذبات ظاہر کرنا سب سے بڑی حماقت لگنے لگا۔"

شہر یار اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اُس نے اُس کے بیان کی وضاحت نہیں دی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، وہ اپنی سوچ کو جو رُخ دے چکا ہے، اب لاکھ وہ اس بات سے انکار کرے، وہ پھر بھی اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ سو وہ کچھ کہے بنا اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ شوفر نے اس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔

وہ وقت مقررہ پر ریزروڈ میز تک پہنچ گیا تھا، مگر یہاں دور دور تک بیگم عافیہ بانو کا نام ونشان نہیں تھا۔ اُس کا دل بے حد مکدر ہوا تھا۔ وہ جس طرح خود وقت کا پابند تھا، اسی طرح سامنے والے سے بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح وقت کی پابندی کرے گا، مگر......

اب کیا، کیا جائے؟...... وہ وقت گزاری کے لئے کوئی دلچسپی سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کے قریب پوائزن کی مہک پھیلتی چلی گئی۔

جانا نہ...... بے ساختہ دماغ کو دل نے اطلاع دی۔ اُس نے چور نظروں سے دیکھا، مگر وہ سامنے کے بجائے اُس کی پشت سے ہوتی ہوئی سامنے آئی تھی۔ اُس کی خوب صورتی آج بھی دو آتشہ تھی۔

"تم یہاں؟" اُس نے کرختگی سے سوال کیا۔

"سالار تمہارے آج کی لنچ میٹنگ کے بارے میں بہت کانشس ہے۔ اُس کا خیال ہے، پتہ نہیں تم اتنی بڑی ڈیل سنبھال بھی سکو گے یا نہیں، اس لئے یقین واثق ہے وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہی دفتر سے نکلا ہوگا، سو میں نے سوچا، کیوں نہ پرانی دال کو نیا تڑکا لگا دوں۔ ایک پنتھ دو کاج۔" وہ ہنسی۔

"مطلب......؟" وہ خالی الذہنی سے سوچنے لگا اس لئے ڈھنگ سے سوال بھی نہیں کرسکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، جانانہ کہہ رہی ہے تو سالار عبدالرحمٰن ضرور اُسے واچ کر رہے ہوں گے اور سالار کے ساتھ اگر جازی بھی ہوا تو اُس کی پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ ایک پنتھ دو کاج کی پھبتی اس لئے کسی گئی تھی۔ اُس کی غصیلی آنکھیں جانانہ کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ تھی، اترا کر بولی تھی۔

"تم جب اتنی خفگی سے مجھے دیکھتے ہو ناں، تو میرے دل میں تمہارے لئے محبت اور بڑھ جاتی ہے شیری اویسا ایک پنتھ دو کاج کی اطلاع ایک خوب صورت خبر کے ساتھ نتھی تھی۔ اگر تم کہو تو سناؤں؟" اُس نے ابرو چڑھا کر اُسے دیکھا اور وہ لطف لے کر بولی۔ "دانیا عبدالرحمٰن پانچ دن سے حمزہ عابد سے بڑی ہی محبت اور سلوک سے مل رہی ہے۔ تم جانتے ہو ناں، حمزہ عابد میرا اپنا ہوا مہرہ ہے، جسے تم نے ایک بار شکست دے دی تھی۔ مگر اب وہی دانیا عبدالرحمٰن کی تم سے نفرت ہے جو اس پٹے ہوئے مہرے کو پھر سے بساط میں کارگر بنا چکی ہے۔ یہ صرف تم جانتے ہو، حمزہ عابد کتنا بڑا فلرٹ ہے، کتنا بڑا لیڈی کلر ہے۔ مگر دانیا سمجھتی ہے وہ اب تک حمزہ عابد کو ٹھیک طرح سے سمجھی ہی نہیں تھی، اس لئے وہ اب اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حمزہ عابد کے دن کہنے پر دن کہہ رہی ہے اور رات کہنے پر رات کہنے کی جستجو رکھتی ہے۔ تم جانتے ہو ناں، میں اس سچویشن کو کہاں تک لے جانا چاہوں گی؟"

شہریار کو لگا، اُس کے پورے بازو سے درد ہوتا ہوا اُس کی کمر میں پھیلتا جا رہا ہے۔ مگر وہ پھر بھی استقامت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی کسی کمزوری سے جانانہ کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ یکدم ہوٹل کے داخلی دروازے سے اُس نے بیگم عافیہ کو اندر آتے دیکھا۔ اس وقت وہ کسی سے ملنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن پھر بھی اُس نے کھڑے ہو کر مسز عافیہ اور مسٹر سلیم افسر کا استقبال کیا تھا۔

"سوری مسٹر شہریار! دراصل ہم ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے، اسی لئے دیر ہو گئی۔"

جانانہ نے دیکھا تو کھڑے ہو کر ادا سے بولی۔ "اوکے مسٹر شہریار! ہم اگلی ماڈلنگ کمپنی کے بارے میں پھر ڈسکس کر لیں گے۔"

"ارے آپ بیٹھئے ناں، ایک وقت میں دو کام بھی ہونا ممکن ہیں۔"

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! مگر یہ وقت صرف آپ کا تھا، جسے میں نے تھوڑا سا استعمال کیا۔ میرے خیال میں اس وقت کے مس یوز پر آپ ناراض نہیں ہوں گے۔ بس اچانک میں یہاں لنچ کرنے کے لئے آگئی تھی تو مسٹر شہریار کو دیکھ کر رہ نہیں سکی۔''

''ارے، کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

جانانہ نے بیگم عافیہ سے ہاتھ ملایا اور مسکراتی ہوئی ٹیبل سے اُٹھتی چلی گئی۔

پھر شہریار تھا اور بیگم عافیہ۔ دونوں نے سیر حاصل بحث کے بعد معاہدے کی ٹرمز طے کرلی تھیں۔ فائلیں وہ ساتھ ہی لایا تھا، سو پڑھنے کے بعد ایک فائل مسٹر سلیم نے رکھ لی تھی اور دوسری فائل شہریار عبدالرحمٰن نے سنبھال لی تھی۔ پھر وہ انہیں لنچ کرا کر خود سوکھے منہ ہی اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ مینو میں ایسی کوئی ڈش نہیں تھی، جسے وہ اس کریٹیکل پوزیشن میں لیتا۔ سو آج کل کا آزمودہ ''ڈائٹنگ پر ہوں'' کہہ کر اُس نے بات سنبھال لی تھی۔ مسٹر سلیم افسر نے سنا تو نہایت بے تکلفی سے بولے تھے۔

''خیریت ہے مسٹر شہریار! آپ جیسے فگر کے بندے کو بھی ڈائٹنگ کا اسٹریس ہو سکتا ہے؟''

''کیا کروں مسٹر سلیم! کسی کا خیال ہے، مجھے اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔''

''اوہو، کسی کا خیال...'' وہ ذومعنی انداز میں ہنسے۔ بیگم عافیہ نے آنکھیں نکال کر انہیں عادتاً جولی موڈ سے باز رکھا اور انہوں نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکال لیا تھا۔ پھر مسکرا کر بولے تھے۔ ''مسٹر شہریار! کہیں اسموکنگ سے بھی کسی نے منع تو نہیں کر رکھا؟''

شہریار ہنس پڑا۔ حالانکہ تکلیف ایسی تھی کہ وہ فوراً اُٹھ جانا چاہتا تھا، مگر فی الحال یہ ناممکن تھا۔ وہ یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ یہ اُن کی کیس کے خلاف تھا، اگر وہ مہمانوں کے اُٹھنے سے پہلے اُٹھ جاتا۔ مسٹر سلیم اختر نے اُس کے ہنسنے کو خود ہی معنی دیئے تھے۔ پھر وہ کافی پی کر ہی اُٹھے تھے۔ شہریار نے اُن کے اُٹھتے ہی اپنا موبائل اور فائل اُٹھائی تھی اور جانے کے لئے قدم بڑھائے تھے۔ بل چونکہ کمپنی کے حساب میں تھا، سو اُسے اس طرف سے سہولت تھی۔ لیکن گیٹ سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ جانانہ کی اطلاع وجودیت اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

سالار بھائی اور رجا زی، اُس نے ایک نظر میں دونوں کا جائزہ لیا۔ دونوں کے موڈ بے حد خراب لگ رہے تھے۔ مگر وہ رک کر کوئی تاویل دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ خود سالار عبدالرحمٰن نے بھی اُسے چھیڑا نہیں

تھا۔صرف جتانے کے لئے وہ اُس کے سامنے آئے تھے کہ بقول وہ جو "عیاشیاں" کرتا پھر رہا ہے، وہ اُن سے ڈھکی چھپی نہیں اور یہ کہ جازی بھی اب اس کی حرکتوں سے آگاہ ہے۔

اُس نے دل ہی دل میں اُن کی کوشش پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور سیڑھیاں اُترتا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی ساری استقامت ہوا ہوگئی تھی۔ اُس نے منرل واٹر کی بوتل کی سیل کھولی تھی، پھر کوٹ کی جیب سے اپنی دوائیں نکال کر ایک ہی سیکنڈ میں نگل لی تھیں۔ جس لمحے وہ تکلیف کے ریلیز ہونے کا انتظار کر رہا تھا، اسی وقت اُس کا موبائل بجا تھا۔ دوسری طرف عاطف تھا۔

"ہیلو، شہریار اسپیکنگ۔" بہت گہری سانس لی تھی اس نے۔ درد کی لہر تیزی سے اُٹھ کر اب معدوم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر دوسری طرف عاطف تھا، گھبرا گیا تھا۔

"کہاں ہے تُو؟...... اور یہ تیری آواز کیسی ہو رہی ہے؟ پھر تو درد نہیں ہو رہا؟"

اُس نے اُس کی ہراسگی سے حظ لیا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "ہے تو کچھ ایسی ہی بات، مگر بے فکر رہ، ابھی نہیں مرنے والا۔ ابھی بہت کام ہیں مجھے۔"

"بکواس مت کر۔ آخر تیرے بغیر کیا اسٹائل وژن چل ہی نہیں سکتا، جو بھاگا بھاگا پھر رہا ہے، بنا آرام کے؟"

اُس نے موبائل بائیں سے دائیں ہاتھ میں منتقل کیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "ہر کام ہو جاتا ہے۔ کسی کے ہونے، نہ ہونے سے کام نہیں رُکتے۔ مگر یار! مجھے فارغ رہنے کی عادت نہیں ہے۔ فارغ ہوا تو بہت جلدی وقت طے ہو جائے گا۔"

"بکو مت۔ یہ بتاؤ، گھر جا رہے ہو ناں؟ میں گھر آتا ہوں۔"

"نہیں، پہلے گھر جانے کا ارادہ تھا۔ مگر اب میں گھر نہیں جا رہا، پاپا کے دفتر جا رہا ہوں۔ نئی بزنس ڈیل فائنل ہوئی ہے، اس کے ڈاکومنٹ پاپا کے وکیل کے پاس سمٹ کروانے ہیں۔"

عاطف نے کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ شہریار جانتا تھا، وہ سخت ناراض ہو چکا ہے، لیکن کام بہرحال بے حد ضروری تھا، سو وہ اُسے منائے بغیر راستے کی طرف نظر کے خلاؤں میں دیکھنے لگا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اُسے لگ رہا تھا، زندگی شاید ختم ہونے والی ہے۔ مگر دوسرے ہی پل سانس کی بحالی سے زندگی کو نئی مہمیز لگی تھی۔ زندگی اور موت کا فاصلہ یہی سانس بھر کا تو تھا......

وہ اپنی حالت پر خود ہی ہنسا۔ یہاں تک کہ دفتر کی عمارت دکھائی دینے لگی۔ شوفر نے کار بالکل سیڑھیوں کے قریب روکی تھی۔ مسٹر عدیل عبدالرحمٰن کے اس کے بارے میں شوفر کو سخت قسم کے احکامات تھے، اس لئے وہ پوری طرح ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر شوفر نے بھاگ کر پہلے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ عدیل بھائی کی محبت پر ہنستا اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اندر باہر اُس کی آمد پر سب میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سالار کے غصے کے مقابلے میں اُس کی سخت مزاجی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے اچھے اور بہترین پیکیجز منظور کرواتا رہتا تھا اور یہ بھی تھا کہ وہ اس رحم دلی کو چیریٹی کے نام پر پوائنٹ آؤٹ ہونے کے بھی سخت خلاف تھا، سو سب امپلائز کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ باس کے لئے بہترین چوائس تھا۔

اُس نے پاپا کے کمرے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سالار عبدالرحمٰن کی سخت آواز کمرے میں گونجی۔

''پاپا! آپ ہر قسم کے اہم کاموں کے لئے اس جیسے لاابالی انسان کو کیوں منتخب کرتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے، وہ آج بھی میٹنگ کے نام پر جانا نہ سے ڈیٹ مار رہا تھا۔ جانا نہ اُس کے نام کا ایسا لاحقہ ہے جو اس کے نام سے کبھی ہٹ نہیں سکتا اور نہ ہی ہماری فیملی اس نام کی بدنامی سے بچ سکتی ہے۔ پاپا! آپ کو سوچنا پڑے گا کہ آپ اپنی کمپنی کے کاموں میں کس حد تک سنجیدہ ہیں۔''

شہر یار نے حیرت سے دروازہ کھولا۔ کیونکہ، بہر حال وہ یہ مان نہیں سکتا تھا کہ سالار عبدالرحمٰن اس سے پہلے دفتر پہنچ گئے ہوں گے۔ کیونکہ دفتر آنے کے لئے شارٹ کٹ بھی اتنے کم فاصلے کا نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ پاپا کمپیوٹر میں مصروف تھے اور ٹیلی فون کے ہینڈ فری بٹن کی وجہ سے سالار عبدالرحمٰن کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

مسٹر عبدالرحمٰن نے شہر یار کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور اپنے طریقے سے سالار عبدالرحمٰن کو ہینڈل کر کے فون آف کر دیا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا پاپا کی مصروفیت کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

تیس منٹ بعد پاپا نے ویب سائٹ آف کی، پھر وہ اُس کی طرف مڑے تھے۔

''بہت تھک گئے ہو شاید؟''

''جی، بس تھوڑا سا.......'' اُس نے مختصر کہہ کر فائل اُن کے سامنے رکھ دی۔

مسٹر عبدالرحمٰن فائل میں لکھی ٹرمز پڑھنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔ ''گڈ! تم نے بہت اچھے ڈیسیژن لئے ہیں۔ اور ہاں، سالار کی باتوں کو دل پر مت لینا۔ وہ بس یونہی جذباتی سا ہے کچھ۔ مگر یہ طے ہے، وہ عدیل سے کم تم سے پیار نہیں کرتا۔''

اُس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے وجود کو کرسی سے اُٹھنے پر آمادہ کیا تھا اور سرد مہر ٹون میں بولا تھا۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پاپا! کہ کون مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے، کتنا نہیں۔ مجھے تو بس ایک ورکر کی طرح کام کرنا ہے۔''

مسٹر عبدالرحمٰن نے سر ہلا کر اس کے لہجے کا برا منائے بغیر اسے جانے دیا تھا۔ وہ دفتر سے نکلا تھا تو اس لمحے اُس کا رخ سیدھا گھر کی طرف ہی تھا۔ وانیا کے متعلق جو کچھ اس نے سنا تھا، وہ اس کی وضاحت چاہتا تھا۔ دفتر کا خارجی دروازہ پش کر کے وہ باہر نکلا مگر اپنی کار سے ٹیک لگائے عاطف بیگ کو دیکھ کر اُس کے قدموں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''تم، یہاں؟......تم تو شاید خفا تھے؟'' اُس نے رُوڈنیس سے سوال کیا اور وہ تلخی سے بولا۔

''ہاں، ناراض تھا۔ مگر پرانے زمانے کا بندہ ہوں، اس لئے دوستی کو آخری موڑ تک چھوڑنے کا قائل ہوں۔'' لمحہ بھر کو رکا، پھر اسی لہجے کو برقرار رکھ کر بولا۔ ''تمہیں پرواہ ہے یا نہیں، لیکن مجھے ہے۔ اس لئے دیکھنے آیا تھا کہ تمام تر عاقبت نااندیشیوں کے باوجود ابھی زندہ ہو یا فاتحہ خوانی کے لئے دس پانچ بندے جمع کرنے کی مہم شروع کروں۔''

اُس نے جواب دینے کے بجائے پچھلی سیٹ کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ اُس نے فرنٹ ڈور کھول دیا اور شوفر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کار کی چابی مجھے دو اور میری کار تم گھر لے جاؤ۔ کار میں ڈرائیو کرلوں گا۔''

شوفر نے شہریار عبدالرحمٰن کی طرف تصدیق کے لئے دیکھا۔ شہریار نے ہولے سے سر ہلایا۔ ''جو کہہ رہا ہے، وہی کرو۔ کسی زمانے میں کراچی کا دادا ہوا کرتا تھا یہ۔''

شوفر نے نافہم انداز میں دیکھا مگر چابی اُس کی طرف بڑھا دی تھی۔ عاطف بیگ نے اپنی کار کی چابی اُس کی طرف اُچھال دی تھی اور پھر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا تھا۔ ''تم نے اپنے شوفر کو اچھا خاصا خوف زدہ کردیا ہے۔ اگر اس نے ون فائیو کو فون کردیا تو؟''

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ دراصل اس وقت اُس کا کچھ بولنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ وانیا، اجنبی فون کال اور مومنہ رفیق کی آنکھیں...... یہ سب بے تحاشا سوالات تھے، جنہوں نے اُس کے لفظ کھا لئے تھے۔ وہ سوچ جا رہا تھا مگر کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیس منٹ بعد وہ گھر کے سامنے تھے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ یقیناً وانیا گھر آ چکی ہوگی۔

وہ سوچ جا رہا تھا، عاطف اُس کے چہرے پر بکھرے سوالات پڑھ پا رہا تھا مگر خود سے دخل اندازی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہی مزاج کا ایک تھا، کس بات پر تھے سے اکھڑ جاتا، پہلے سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

''عاطف......!'' طویل خاموشی کے بعد اپنے کمرے کا لاک کھولتے ہوئے اس نے اسے پکارا۔

''کسی بات پر پریشان ہو تم؟'' وہ نام لئے جانے کی ٹون سے فوراً سمجھ گیا کہ وہ کچھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔

”ہوں، میں بہت پریشان ہوں اس وقت......“ اُس نے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ واقعی اس وقت بہت تھک گیا تھا۔

”کس بات سے پریشان ہو؟ کوئی بڑی بات ہے؟ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ چھوٹی باتوں پر تم اتنا اسٹریس نہیں لیتے۔“

شہریار اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”حمزہ عابد نے کسی طرح سے وانیا کا دل پھر سے اپنی طرف موڑ لیا ہے۔ آج جا نا ملی تھی، وہ کہہ رہی تھی، وہ پھر سے گیم میں واپس آ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو تم جانتے ہو، پاپا اور عدیل بھائی کے باوجود ہم اس حماقت سے اسے نہیں روک سکتے۔“

عاطف نے اسے دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ شہریار نے اُسے پھر سے متوجہ کیا تو اُس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”پتہ نہیں، تمہیں یہ اچھا لگے گا یا برا، لیکن یہ طے ہے، جب تک ٹھوکر نہ لگے، قدم سنبھلتے ہیں نہ منزل کو پانے کی جستجو میں راستے کا درست تعین کر پاتے ہیں۔ اس لئے پلیز، اسے خود تجربہ کرنے دو۔“

”تجربہ...... یہ آگ کا تجربہ ہے۔ ہاتھ جل گیا تو؟“

”جل جانے دو۔ آگ جلائے گی نہیں تو کندن اور کوئلے میں فرق کیونکر ہوگا؟“

”ہاں، مگر وہ کوئی ایکس وائی زیڈ نہیں، وہ وانیا ہے...... میری جان ہے اُس میں...... اگر اُسے کچھ ہوا تو میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔“ اُس نے تیزی سے بے قراری سے کہنے کی کوشش کی مگر کراہ کر بستر پر اُٹھتے اُٹھتے پھر لیٹ گیا تھا۔

”مر جاؤ گے کسی دن۔ کیوں بنے ہوئے ہو اپنے دشمن؟“ عاطف بیگ گھبرا کر اُس کی طرف بڑھا مگر آدھے راستے میں ہی اُسے رک جانا پڑا تھا۔ کیونکہ غیر متوقع نانو سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

”نانو! آپ یہاں؟...... آپ کو آرام کرنا چاہئے نانو!“ وہ یکدم بیٹھ گیا۔

عاطف بیگ نے جلتی نظر ڈالی، پھر رہ نہیں سکا تو خدا حافظ کہہ کر نکل گیا۔ نانو اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔ ”تمہیں بھی کچھ اور آرام کرنا چاہئے تھا بچے! شکل دیکھو کیسی اتر گئی ہے۔“

”کچھ اتنی خاص نہیں اتری نانو! بہت دنوں بعد کام کیا ہے ناں، اس لئے شاید کاہلی سے صورت پر ایسا نکھار آیا ہے۔“

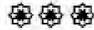
نانو نے مسکرا کر اُسے دیکھا، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر اُس نے اندر کی بات باہر نکلوانے کے لئے نانو کا استعمال کیا۔

”نانو! حمزہ عابد کیا آج کل گھر آ، جا رہا ہے؟“
نانو کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلنے لگے۔ کیونکہ حمزہ عابد سے جانا نہ اور جانا نہ سے ڈھیر ساری بدنامی وہ کیسے بھول سکتی تھیں۔ انہوں نے خاموشی سے جوتی میں پیر ڈالے تھے، پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی تھیں۔
شہریار اُن کی کیفیت سے آگاہ تھا، اس لئے اُس نے زور ہی نہیں دیا تھا۔ اُس کی پوری توجہ اس وقت اپنی طبیعت کے سنبھل جانے کی طرف تھی۔ مگر شام سے پہلے یہ ممکن نہیں ہوا تھا، سو شام کی چائے پر وہ لان کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اُس کی شکل دیکھتے ہی جازی نے طنز سے جملہ اڑایا۔
”کچھ لوگ اپنے پہلے تجربے سے کچھ نہیں سیکھتے، انہیں غلطی کے بعد غلطی کرنے کی اتنی عادت ہوتی ہے کہ پھر باقی سب کچھ فیڈ آؤٹ (Fade out) ہو جاتا ہے۔ صرف اپنا مشغلہ یاد رہ جاتا ہے، چاہے اس مشغلے سے اُن کے کچھ اپنوں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہوتی ہو۔“
شہریار نے مقدور بھر اثر نہیں لیا۔ اپنے لئے چائے انڈیلنے لگا۔ دانیا اُس کے چہرے سے تاثرات جاننے کے لئے بے چین تھی۔ کیونکہ نانو نے اُس کا سوال اُس تک سہولت سے پہنچا دیا تھا، اس لئے وہ چاہتی تھی کہ یہ بات جتنی جلدی کلیئر ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ حمزہ عابد اور ماریہ دونوں نے مل کر اس پرانے رشتے کو نئے سرے سے استوار کرنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ چائے کے سپ لے رہا تھا، جب بسکٹ کھاتی دانیا کی طرف سوال اُچھالا۔
”تم حمزہ عابد سے پھر سے ملنے لگی ہو؟“
”آف کورس...... شاید آپ کو یاد ہو، وہ میرا فیانسی ہے۔“
”فیانسی ہے نہیں، تھا۔ شاید تمہیں یاد نہیں ہے، پاپا اور ہم تمہاری شادی مامون سے کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ایک وقت میں تم خود بھی اس پر راضی تھیں، پھر یا چانک......“
اُس نے سوالیہ جگہ چھوڑی اور دانیا خفگی سے بولی۔
”ہاں، ایک وقت واقعی میں آپ تینوں کی خواہش کے آگے کمزور پڑ گئی تھی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا، آپ میرے لئے کچھ غلط نہیں سوچ سکتے۔ مگر جب میں نے دیکھا، خود آپ کی زندگی تو ایک کے بعد ایک

سرمستی سے بھری پڑی ہے، ایک نام پرانا بھی نہیں ہوتا کہ نیا نام آپ کے نام کے ساتھ اسپارک کرنے لگتا ہے تو پھر میں کیوں آپ کی غلطیوں کا حساب رکھوں؟ مامون اچھا ہو سکتا ہے، میں کیسے مان لوں؟ آخر وہ ہے تو آپ کا دوست ہی ناں، میں کیسے بھول سکتی ہوں وہ گرفتاری، جو مامون کے ہاتھوں آپ کی، کی گئی تھی۔ ڈرگ برآمد ہوئی تھی ناں آپ کی کار سے؟...... سارے اخبار بھرے پڑے تھے اس بدنامی سے، جب اچانک مامون عبدالکریم نے پریس کانفرنس کر کے کہا تھا، آپ کسی کی دشمنی کا شکار ہوئے تھے۔ ڈرائیور جو عارضی بنیادوں پر رکھا گیا تھا، سارا الزام اُس بے چارے کے سر گیا تھا اور آپ صاف بچا لئے گئے تھے۔ میں ایسے شخص پر اپنی زندگی کا انحصار کیسے کروں، جس کے کردار کی کوئی ضمانت نہیں، سوائے آپ کی گواہی کے۔ اور آپ کی گواہی......" وہ استہزاء سے ہنسی، پھر مکرر بولی۔ "آپ کی گواہی کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو شخص ڈرنک کرتا ہو، فلرٹ کرتا ہو، وہ ڈرگ بھی لے سکتا ہے اور ڈرگ لینے والے پھر کوئی بھی برائی اپنا لیں، انہیں کون روک سکتا ہے؟"

شہریار کے ہاتھ یخ ہونے لگے تھے۔ مگر وہ خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ حمزہ عابد نے چند دنوں میں دانیا عبدالرحمٰن کی بہت اچھے سے برین واشنگ کر لی تھی۔ جازی اُس کے ساتھ اس پر طنز سے مسکراتے ہوئے خاموش تماشائی کا کردار نبھا رہا تھا۔ سو، وہ جو خیال دل میں لے کر آیا تھا، اسی تیزی سے کین کی کرسی پر سے اٹھ گیا تھا۔ جواب میں کچھ کہے بغیر وہ واپس اپنے روم میں لوٹ آیا تھا۔ جس وقت اُس کی کمرے میں انٹری ہوئی، اسی وقت اس کا موبائل بجا تھا۔

'یقیناً یہ عاطف ہو گا۔' اُس نے ریسیو کرنے کے بجائے موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا، مگر بہت سی باتیں ایسی گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ اُسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔



"تو اچھی رہی، تیری تو حویلی سے جان چھوٹ گئی۔ پتہ نہیں، کس کی دعا ہے تیرے ساتھ، تیرا برا کرنا چاہو تو اور بھی اچھا ہو جاتا ہے۔" رات آرام کرنے کے لئے لیٹتے ہوئے بوڑھی نوکرانی نے بکل مارے ہوئے گم صم بیٹھی عورت کو دیکھ کر حسرت سے کہا۔

"میرا بھلا...... میرے لئے اچھا بھی ہو سکتا ہے؟" وہ یونہی بڑبڑائی۔ مقصد خیال آرائی نہیں تھا، صرف ذاتی محاسبہ تھا۔ مگر وہ بوڑھی ملازمہ یہی سمجھی کہ وہ اس سے مخاطب ہے، سو فوراً اٹھ کر پھر سے بولی۔ "تو اور کیسی ہوتی ہے اچھی قسمت۔ اِدھر دیکھ، پچاس سال ہو گئے، کسی نے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اور تو ہے، ہر رات کوئی نہ کوئی تجھے اپنا سنگی بنا لیتا ہے۔ تیرے پاس اب اتنے سارے روپے ہوتے ہیں۔ میں نے تو جامی سے سنا ہے، تجھے شفیع نے وہ بغیر بجلی والا فون بھی لا کر دیا ہے۔ وہ جو آقا زادے استعمال کرتے ہیں، پھر خوشبو، کپڑے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، پھر تو خوش قسمت کیسے نہیں ہے؟"

بکل میں لپٹی عورت نے کچھ نہیں کہا۔ کمرے میں ہر رات کے دیئے گئے تحفے یونہی بکھرے پڑے تھے۔ دوسری نوکرانیاں وہ سامان عاریتاً اٹھاتیں مگر وہ اُن کی ملکیت ہی بن جاتا۔ بکل میں لپٹی عورت اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتی۔ کچھ مہینوں میں ہی اُسے لگنے لگا تھا، وہ قریب المرگ ہوگئی تھی۔ اُس کی ممتا جدائی سہہ نہیں پا رہی تھی۔ حویلی میں تھی تو ایک آدھ بار ہی سہی، اپنے بچے کو دیکھ لیتی تھی۔ مگر یہاں غلام گردش میں تو جیسے وہ گردش ہی میں آگئی تھی۔

جانے رات کے کتنے پہر تک وہ جاگتی رہی۔ پھر وہ دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہوئی تھی کہ بیگم صاحبہ کا پیغام چلا آیا۔

"تجھے شہر جانا ہے، بی بی کے ساتھ......."

وہ سر ہلا کر جس حلیے میں تھی، اسی حلیے میں چادر لپیٹتی اُٹھ گئی تھی۔

پھر دوپہر تک وہ گاؤں کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کر رہی تھی۔ یہ راستے اُسے پرانی کہانی میں کھینچے لے جا رہے تھے۔ یکدم تیز دھوپ میں اُسے لگا، گھور اندھیری چھا گئی تھی۔ ایک رات اُس کے قدموں سے آن لپٹی تھی اور ایک بدنامی اُس کے لباس کا تار بن گئی تھی۔ لباس اُتارتی تو بھی رُسوا ہوتی تھی، لباس وجود پر رہتا تو بھی رُسوائی کسی ہزار پا کی طرح اُس کی رُوح میں رینگتی پھرتی۔ سوچوں کے دوران پھر راستہ کیسے طے ہوا، اُسے خبر ہی نہیں ہوسکی۔ خبر تو کوٹھی میں گاڑی کے رکنے کے بعد ہوئی کہ راستہ قدموں سے لپٹے لپٹے انت سمے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ مگر کیا واقعی اُس کے دکھوں کا کوئی آخری سرا تھا؟

"چل اُتر......... آئی بڑی خوب صورت۔" بڑی بیگم صاحبہ کا لہجہ......... وہ حیران رہ گئی۔ اُسے دو ملازماؤں نے سختی سے کھینچ کر اُتارا تھا۔ اُس کا بیگ بھی اُس کے قدموں میں پھینک دیا گیا تھا۔ پھر بیگم صاحبہ نے رعونت سے کہا تھا۔

"تو پتہ نہیں، عورت کی کون سی نسل سے ہے؟ اتنی بے عزتی کے ٹکڑوں پر پلنے اور دوسروں کے گھر والوں کی جھوٹی محبت پر ہی جینے کی عادت ہے۔ حویلی کی ساری عورتیں تجھ سے تنگ تھیں۔ وہ کہتی تھیں، ان کا گھر والا ان سے زیادہ تجھے وقت دیتا ہے، پیسہ لٹاتا ہے۔ بس میں نے سوچ لیا، تجھے اب حویلی میں نہیں رکھنا۔ تُو رہ اس کوٹھی میں۔ اب تجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ رہ یہاں پر جب تک تجھے تیری بے غیرتی جینے دیتی ہے۔" لمحے بھر کو رکی، پھر اسی رعونت سے بولی۔ "تو اگر سمجھ رہی ہے، تجھے یہاں زوار آکر ملے گا تو اس بات کو بھول جا۔ یہ کوٹھی میرے باپ کی پراپرٹی کا حصہ ہے، جس کا زوار کو بھی علم نہیں۔ اب تجھے یہاں سے تیری موت ہی نکال سکتی ہے۔"

وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ کچھ نہیں بولی اور گاڑی میں بیٹھتی ہوئی امامہ نے ڈرائیور سے کہا تھا۔

"اگر یہ یہاں سے بھاگنا چاہے تو اسے روکنا مت۔ حویلی والوں کے لئے یہ مسلسل دردِ سر ہے، اسے جانے دینا جہاں جانا چاہے۔ مگر سنو، اسے اس سارے پلان کا علم نہ ہو۔ اسے یہی سمجھنے دینا کہ یہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگی ہے۔ رہے زوار، تو میں انہیں کسی نہ کسی طرح سمجھا لوں گی۔ مگر تم یہاں آنے کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ کوئی بھی پوچھے، کہنا بھاگ گئی کنیز......"

"جو حکم......" ملازم نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ امامہ کے خاص ملازم نے واچ مین کو کچھ ہدایتیں دی تھیں۔ مگر وہ کیا ہدایتیں تھیں، بکل میں لپٹی عورت ان سے بے خبر تھی۔ ہاں، بس وہ یہ جانتی تھی کہ وہ یہاں آزادی سے سانس لے سکتی تھی۔ اُس نے ایک کوارٹر کو قابلِ استعمال بنایا تھا۔ مگر تین دن نہیں گزرے تھے کہ اُس کے سر پر بم پھٹ گیا تھا۔ زوار حسن اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا تم اتنی آسانی سے مجھ سے پیچھا چھڑا سکتی ہو؟ تمہیں یاد ہے، تم نے پہلے دن میری کتنی انسلٹ کی تھی، میری طلب کو بڑھنے دیا تھا۔ میرے منہ پر جو تھپڑ مارا تھا، اسی نے مجھے تم سے بددل کیا تھا، وگرنہ شاید میں تمہیں اپنا نام دے ہی دیتا، بھلے وہ نام عارضی ہی کیوں نہ ہوتا۔ مگر نہیں، تمہیں عزت راس نہیں آئی، تب میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہیں اتنا پامال کروں گا، اتنا زیادہ کہ تم خود چیخ پڑو۔ تم جان لو کہ عزت اسے ہی ملتی ہے، جسے ہم عزت دینا چاہیں۔ ذلت اُسے ملتی ہے، جس کی پشت سے ہم ہاتھ اٹھا لیں۔ سوچو، سوچو...... تم سوچتی رہو کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا، تو جان لو، تمہاری مالکن کی طرح میرے بھی کچھ خاص ملازم ہیں، جنہیں میری غیر موجودگی میں میرے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ چلو اٹھو، اپنا سامان پیک کرو۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔"

اُس نے مرے مرے ہاتھوں سے سامان بیگ میں رکھا تھا، پھر واش روم کی طرف بڑھی تھی۔ زوار کمرے سے باہر تھا، مگر وہ احتیاط کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے بیسن میں نلکا کھول دیا تھا، پھر یاد کرنے لگی تھی۔ کوئی نمبر تھا، جسے ایک وقت میں اُس نے بہت دفعہ ملایا تھا مگر اس وقت اُسے وہی نمبر ملانے کے لئے بہت ذہن پر زور ڈالنا پڑ رہا تھا، جیسے ماضی کی ساری میموری اسکرین بلینک ہو گئی تھی۔

زیرو تھری ہنڈریڈ...... پھر جیسے نمبر خود بہ خود بلینک میموری اسکرین پر اسپارک کرنے لگے۔ پانچویں بیل پر ریسیو کیا گیا تھا۔

"ہیلو، شہریار اسپیکنگ۔"

وہ رو پڑی تھی۔ اُس نے اپنی ہچکی کو کھینچ لیا تھا، مگر پھر بھی سسکی سن کر دوسری طرف لہجے میں تیزی آ گئی تھی۔

"ہیلو، کون؟"

”میں.......میں بول رہی ہوں۔“

”کون.......کون ہو تم؟“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی باہر دستک ہوئی۔

”جلدی نکلو لڑکی! میں شام تک یہاں تمہارا ملازم کی طرح انتظار نہیں کر سکتا۔“

اُس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ پھر موبائل اُس نے بکل ہی میں چھپا لیا تھا اور قیدیوں کی طرح سر ڈالے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تھی۔

یہ وقت جانے اُسے کیا دکھانے والا تھا؟

کوثر انہی پرانے راستوں سے گزر رہی تھی اور اُس کا دل کہہ رہا تھا فون کال میں اُس نے جو ایک سوال گم نام چھوڑا ہے، اس کے جواب کے لئے کوئی ہے جو تندہی سے کوشش کرے گا۔ مگر کیا واقعی اس شخص کے لئے اس گمنام سوال کی کوئی اہمیت ہوگی؟

اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔



عارف، مسٹر سلیم افسر کے سامنے بیٹھا ہوا نئے پروجیکٹ کی تفصیل دے رہا تھا اور جینز شرٹ میں ملبوس انوشہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اُس نے کراچی گھومنے کا پروگرام بنایا تھا، مگر مسٹر سلیم افسر نے اچانک نئے پروجیکٹ کی تفصیلات طے کرنے کے لئے عارف کو روک لیا تھا۔ وہ ہوٹلنگ کے شعبے سے منسلک فاسٹ فوڈ چین میں سرمایہ کاری کرنے کے متمنی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عارف جواد نے فاسٹ فوڈ سے منسلک افراد کا کاروبار کا پورا پروفائل، بائیو ڈیٹا اُن کے سامنے لا رکھا تھا۔ وہ اسی پر بحث کر رہے تھے کہ کس پارٹی سے میٹنگ فکس کی جائے؟ اُس کا موبائل بار بار وائبریٹ ہو رہا تھا مگر وہ اس وقت دھیان نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر انوشہ اس لاپروائی کے اظہار کے لئے تیار نہیں تھی، سو فوراً سے پیشتر وہ کوٹھی میں بنے ہوئے آؤٹ ہاؤس دفتر میں چلی آئی تھی۔

”پاپا! ہمیں باہر جانا ہے، پلیز، سن ڈے کے دن تو کام مت کیا کیجئے۔“

سلیم افسر نے اُسے دیکھا، پھر کاغذات سنبھال لئے۔ ''او کے عارف! تم گھومو جا کر، میں یہ ذرا تفصیلات دیکھ لوں، پھر کل دفتر میں بات ہوگی۔''

عارف اُٹھ گیا تھا، پھر کار میں بیٹھتے ہوئے وہ اُس کے لہجے میں بولا تھا۔ ''تمہارے پاپا باس بن کر بہت رُف ہوجاتے ہیں، جان ہی نہیں چھوڑ رہے تھے میری۔ اچھا ہوا تم چلی آئیں۔''

''بکومت عارف! وہ میرے پاپا ہیں، اُن کے خلاف میں کوئی غلط بات نہیں سن سکتی۔'' انوشے نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں نکالیں۔

''بس یہی، مجھے تمہاری یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں۔'' وہ اُس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا، پھر بائیں ہاتھ سے اُسے خود سے قریب کرلیا۔

''تمہاری قربت میں مجھے لگتا ہے، میں بہت محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔''

''اچھا، تبھی آج تک لیٹ نائٹ میرے ساتھ گھومنے نہیں گئیں۔ اگر اتنا اعتماد ہے تو چلو ناں، کسی دن۔''

''چلوں گی...... کسی دن چلوں گی، لیکن ابھی مجھے اس ملک کو سمجھنے دو اور یہ جاننے دو کہ میرے مطلب کی چیز کہاں دستیاب ہوسکتی ہے؟''

''مطلب کی چیز؟'' عارف جواد کی آنکھوں میں چمک لہرائی، پھر شرارت سے بولا۔ ''اگر تمہیں بتا دوں کہاں سے جنت کا پتہ ملتا ہے تو کیا دوگی؟''

''جو مانگو گے، وہی ملے گا۔''

اُس نے مخمور آنکھوں سے دیکھا اور وہ مسکرا کر بولا۔ ''چلو، پھر گھومنے کو چھوڑو، میں تمہیں جنت کی سیر کرواتا ہوں۔'' اُس نے کار ٹرن دیا اور پھر بہت ہی گندی گلیوں میں سے ہوتا ہوا ایک گلی میں جا کر رک گیا۔

''تم اندر چلوگی یا باہر رہوگی؟''

''تمہارے ساتھ اندر چلوں گی۔'' وہ اُس کے بازوؤں پر اپنے وجود کا بوجھ ڈالتی اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ گندا سا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر وہ اندر آئے۔ کوڈ ورڈ میں بات چیت کے بعد کہیں جا کر وہ ممنوعہ حد سے مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ ایک طرف فروٹ پیٹیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ایک طرف بستر تھا، گندا بستر اور ایک عورت اس پر لیٹی ہوئی تھی انوشے کی ساری توجہ اس عورت پر جا کر ٹک گئی تھی۔ وہ قطعی مفلوج تھی، مگر اُس نے بہت توجہ سے انوشے کو دیکھا تھا۔

انوشے کو عجیب سا احساس ہوا۔ عارف ایک چالیس، پینتالیس سال کے مرد سے اپنے مطلب کی باتیں کر رہا تھا۔ انوشے اُنہیں مصروف دیکھ کر اس عورت کے پاس جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔

”تم کون ہو؟“ اُس نے اُس کے بالوں کو چہرے سے ہٹا کر پوچھا۔

اُس عورت نے اُس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”سونا...... چوڑیاں...... سونے کی چوڑیاں، مجھے دے دو...... مجھے دے دو۔“

انوشے کی اُس کی ہذیان سے گھبرا کر چیخ نکل گئی تھی۔ عارف تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ اُس نے بہ وقت اُس کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر اُس مفلوج عورت میں بلا کی طاقت تھی۔

”یہ ایسے نہیں مانے گی صاحب! ایک منٹ۔“ وہ مرد اندر گیا۔ واپس آیا، اُس کے ہاتھ میں ایک انجکشن تھا، جو اُس نے بے دردی سے اس عورت کے بازو میں لگا دیا تھا۔

”مت لگاؤ...... یہ زہر ہے...... مجھے چھوڑ دو...... میں کچھ نہیں مانگوں گی...... مجھے دولت نہیں چاہیے...... چھوڑو، چھوڑو۔“ انوشے اپنا ہاتھ چھڑا کر بار بار اُسے جھٹک رہی تھی۔

”کون ہے یہ پاگل عورت؟“ عارف نے قدرے کھردرے لہجے میں پوچھا تو وہ مرد خباثت سے ایک آنکھ دبا کر بولا۔

”پتہ نہیں صاحب! کون ہے؟ ہم کو تو آٹھ سال پہلے یہاں کچرے کے ڈھیر پر ملی تھی، اُس وقت بھی یہی دولت، پیسہ پیسہ کہہ رہی تھی...... نچلا دھڑ اس کا شروع سے مفلوج ہے، سو روزانہ پانچ سو روپے دیہاڑی پر ایک منگتی آکر اسے لے جاتا ہے، دن بھر اس کے نام پر کماتا ہے، ہمارا حصہ دے جاتا ہے۔ خوب عیش میں ہے...... یہ بھی...... ہم بھی۔“

انوشے گھبرا کر دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی تھی، اس لئے اُس نے یہ ساری گفتگو نہیں سنی تھی۔ مگر بستر پر لیٹی ہوئی عورت اُسے ابھی تک ہانٹ کر رہی تھی۔

کتنی لاوارث لگ رہی ہے، جیسے اس کا کوئی نہیں ہے۔ اگر اس کی اولاد ہوتی تو شاید اتنی زیادہ بری حالت نہ ہوتی۔ مشرق میں اب بھی تھوڑی بہت ویلیوز باقی ہیں۔ لوگ بھلے عزت سے جینے نہ دیں، مگر عزت و احترام سے دفن ضرور کرتے ہیں...... کیا میرا بھی یہی انجام ہوگا؟ میری بھی کوئی اولاد نہیں ہے میرے باپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری ماں سوتیلی ہے۔ ایک بہن ہے مگر وہ بھی سوتیلی ماں کی زبان بولتی ہے۔ میرا بھی ایسا ہی خوف ناک انجام منتظر ہے کیا......؟ اُس نے جھرجھری لی، پھر ہذیانی انداز میں بولی۔ ”عارف! چلو یہاں سے۔ میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔“

”اوکے، چلتے ہیں، چلو۔“ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا اور انوشے کو سنبھالتے ہوئے باہر آ گیا۔

وہ کار میں بیٹھی تو اُس نے سوال کیا۔ ”کون عورت تھی وہ عارف؟“

عارف ہنسنے لگا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”ہے ایک پاگل عورت...... کسی نے اُسے اس حالت میں کچرے کے ڈھیر پر ڈال دیا تھا۔ اُس کا خیال تھا، وہ مر جائے گی، زیادہ مقدار میں ہیروئن کے استعمال کی وجہ

ہے……اور ایک فقیر ہے۔ اسے ریڑھے پر بٹھا کر مصروف سڑک پر لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں، وہ کوئی پہنچی ہوئی اماں ہے۔ مختلف سوال کرتے ہیں لوگ، جس پر یہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہہ دے، ہنس دے اس کے لوگ معنی ڈھونڈنے لگتے ہیں، فقرہ نکالتے ہیں، کچھ لوگ اپنے معنی میں ٹھیک نکلتے ہیں تو اُن کا اعتقاد اس پر بڑھتا جاتا ہے۔"

انوشے کھلے منہ سے اُسے دیکھتی رہی، پھر بہت تاسف سے بولی۔ "اوہ، پور وومن! پتہ نہیں کس کی زندگی کا حاصل ہوگی۔"

"ایسی عورتیں کسی کی زندگی کا حاصل نہیں ہوتیں۔ کوئی ایویں سی ہی عورت ہوگی، ورنہ……"

"پلیز عارف! یوں مت کہو، پتہ نہیں، اس بے چاری کے ساتھ وقت نے کیا کیا انی گھڑی ہے، جو وہ یوں تصویر عبرت بنی ہوئی ہے۔"

وہ اس کے دُکھ میں ڈوب گئی تھی کہ عارف جواد نے اُس کا شانہ ہلایا تھا۔ "چھوڑو دوسروں کا غم، یہ دیکھو، تمہاری جنت کا پتہ لے کر آیا ہوں۔" اُس نے لفافہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ کافی مقدار میں ڈرگ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار بھر گیا تھا۔ "تم……تم میرے کتنے اچھے دوست ہو عارف!" اُس نے اُس کے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔ مگر عارف جواد، اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"آج لیٹ نائٹ سی ویو چلیں؟"

اُس نے ہاں کہہ دی۔ مگر عارف جانتا تھا، آج کے موقع کو اُس نے کس طرح استعمال کرنا تھا۔ انوشے ڈرگ اڈیکٹ تھی، آزاد خیال تھی مگر آج تک اُس نے اتنی آسانی سے کبھی تنہائی کا موقع نہیں دیا تھا اور آج وہ موقع اُسے مل رہا تھا اور جواد حسن کے کہنے پر وہ دولت حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی بھی دولت کے علاوہ نہیں سوچا تھا، لیکن ایک حادثے کی طرح محبت اُس کی زندگی میں آئی تو اُس نے ایک کیٹگری بنائی، محبت کے لئے اور دولت کے لئے دل میں الگ الگ پورشن رکھنے کی کوشش کی۔ وہ محبت شافعہ سے کرتا تھا، مگر دولت کے لئے انوشے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شافعہ سے ملنے کے بعد واقعی اُس کی زندگی میں بدلاؤ آیا تھا، مگر اُس نے اتنے برے حالات دیکھے تھے کہ دولت اور پیسے کے لئے اُس کے اندر خود بہ خود ایک لالچ بھر گیا تھا، ایسے جیسے پیٹ بھر جائے مگر نیت نہ بھرے۔ پھر جواد حسن تھے، اُس کی زندگی کا زیادہ تر وقت اُن کے ساتھ گزرا تھا اس لئے بچپن سے جو چالاکیاں، غلط بیانیاں اور کرپشن اُس کے اندر در آئی تھی، وہ چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ پھر جب جواد حسن سے اُس نے شافعہ سے شادی کی بات کی تھی تو انہوں نے اپنے لائن آف ٹریک سے اُس کے ہٹنے پر اُسے خوب جھاڑا تھا۔ اُن کا خیال تھا، انوشے سے شادی کے بعد یہ محبت کا بھوت بھی اتر جائے گا۔ مگر وہ ضد پر اڑا رہا تو انہوں نے تجویز رکھی کہ وہ انوشے کو کسی بھی طرح حاصل کر کے ان کی دولت حاصل کرنے کے پلان کو کامیاب بنا دے تو وہ خود شافعہ کو اس کے لئے بیاہ لائیں گے۔ مگر شافعہ کا معاملہ

اُسے اس وقت تک دبا کر رکھنا پڑے گا، جب تک وہ فریب سے اُس کی زیادہ تر دولت اپنے نام منتقل نہ کروالیں گے۔ وہ ماننا نہیں چاہتا تھا لیکن شافعہ کے لئے مان گیا تھا۔ پہلے وہ درحقیقت صرف انوشے کو چیٹ کرتا تھا، لیکن اب صرف جواد حسن کی ضد کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا اور آج کا پلان بھی جواد حسن کے دماغ کی کارستانی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے پہلے کہ انوشے جیسی سرپھری لڑکی کی پسند بدل جائے یا وہ اس کو ٹھوک دے، وہ اسے اس مقام پر لے جائے کہ پھر انوشے اور سلیم افسر کے پاس سوائے عارف جواد کے ساتھ شادی کے آپشن کے کچھ نہ بچے۔ آج حالات اور موقع اس کے ساتھ تھا، اس لئے وہ شافعہ کو پانے کے خیال سے مست انوشے سلیم افسر کے ساتھ جواد حسن کے ذاتی ہٹ کی طرف نکل آیا تھا۔ راستے میں اُس کی شدید خواہش پر اُس نے اُسے مائلڈ مارفین کا انجکشن دے دیا تھا، اس لئے اُس کا خیال تھا، وہ اُس کے لئے بہت آسان ثابت ہوگی۔

سی ویو کی ٹھنڈی ہوا نے انوشے کے نشے کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ وہ انوشے کو سہارا دیئے ہوئے ہٹ کی طرف بڑھ رہا تھا، جب بہت اچانک کسی نے پوچھا تھا۔

"اینی پرابلم سر؟"

"نو، بس میری دوست ذرا زیادہ تھک گئی ہیں۔"

نووارد کی آنکھوں میں اُس کے جواب سے بے یقینی در آئی۔ شاید اُس کے لہجے میں احساسِ جرم کی لرزش در آئی تھی، وگرنہ پہلے تو وہ بہت ہی دلچسپ تجربے سے گزرنے کے باوجود بھی ہمیشہ کمپوزڈ رہتا تھا۔ عارف لہجے کی لرزش کو قابو میں رکھ کر اپنے ہٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اُسے لگتا تھا، یہ موقع کھو گیا تو شاید وہ شافعہ کو کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ وہ محبت تو کرتا تھا، مگر آسائش کو چھوڑنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اور اپنی مرضی کرنے پر اُسے ایسی ہی زندگی کا منہ دیکھنا پڑتا، سو وہ جواد حسن کی مرضی کرنے پر مجبور تھا۔ وہ فرہاد نہیں تھا۔ آج کے جدید زمانے کا، کم خوبیوں اور زیادہ خامیوں سے بھرا ہوا انسان تھا۔ ایسا انسان، جسے شاید ابھی محبت اور اٹریکشن کا فرق تک نہیں معلوم تھا، جسے خود محبت کا مطلب بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ لفظ اُس کے وے آف لائف میں کھوٹا سکہ تھا، متروک لفظ تھا...... اور غیر متوقع اس حمیت نے اُسے چُج کر لیا تھا۔

پھر پانچ منٹ بعد کی بات تھی، جب انوشے کی چیخوں نے اُسے ہراساں کر دیا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟...... کون ہو تم؟"

''کوئی نہیں ہے، میں ہوں انوشے!'' اُس نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ کرانے کی کوشش کی مگر ہٹ پر دستک ہوتی چلی گئی تھی۔

''سر! دروازہ کھولئے۔ مجھے لگتا ہے، آپ کو میری سخت ضرورت ہے۔''

''آپ جو کوئی بھی ہیں، پلیز! اپنے کام سے کام رکھئے۔'' عارف نے کہا۔ مگر دوسری طرف جو کوئی بھی تھا، اب سوال کرنے کے بجائے ہٹ کے دروازے کو کندھے کی چوٹوں سے ہلا رہا تھا۔ کنڈی ہلنے لگی تھی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا تھا۔ انوشے کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ جس قسم کی چویشن کی اُسے توقع تھی لڑکی اس سے بچ گئی تھی اور خمار آلود خوف سے ان دونوں کو تک رہی تھی۔ وہ جوان اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔

''مجھے لگتا ہے مسٹر! آپ لڑکی کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

عارف جواد بساط اُلٹتے دیکھ کر بھنا گیا تھا۔ ''کون ہو تم؟ تمہیں کس نے حق دیا کہ ہمارے معاملے میں بولو؟ یہ آخر لگتی ہی کون ہے تمہاری؟''

اجنبی اس سوال پر گڑبڑا گیا تھا، پھر سنبھالا لے کر بولا۔ ''آپ کا سوال بجا اور میرا جواب بھی مناسب نہیں، لیکن سیدھی سی بات ہے، صورت سے لڑکی اچھی فیملی سے لگ رہی ہے، شریف دِکھتی ہے، اس لئے مجھے لگا، مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

عارف نے سنا، نگران سنا کر کے سامنے کھڑے لڑکے سے بھڑ گیا۔ یہ لڑکا اُسے اُس کی شافعہ سے دور کر رہا تھا اور وہ اپنی زندگی میں نارسائی کا مزہ نہیں چکھنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکے کو بری طرح رگید رہا تھا۔ تبھی اجنبی لڑکے نے اُس کے وار سے بچتے ہوئے چلا کر کہا تھا۔ ''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے، میں ابھی آپ کو سخت مشکل میں بھی ڈال سکتا ہوں۔ پولیس سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔''

''آخاہ! تو یہ کہو! مل بانٹ کر کھانے والے قبیلے سے تعلق ہے تمہارا۔''

''کہاں سرکار! ہم گناہ گار اس قبیلے کو کہاں Belong کر سکتے ہیں؟ وہ تو عظیم لوگ تھے۔ ہم جیسے دنیا دار لوگ تو بس تھوڑی بہت نیکی کما لیں تو یہی بہت ہے۔''

''نیکی یا...... قیمت بتاؤ نیکی کی؟''

اجنبی کو چھوڑ کر اب اُس نے والٹ کھول لیا تھا اور نوجوان نے موقع غنیمت پا کر موبائل نکال لیا تھا۔ پھر اُس نے ایک نمبر پش کر کے کہا تھا۔ ''ڈی ایس پی مامون! دیکھئے، آپ کی رعیت میں آپ کے

دوست کے ساتھ کتنا برا سلوک ہو رہا ہے۔"
عارف جواد کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ وہ کتنا بھی تیز طرار سہی، لیکن یہ ملک اُس کے لئے فی الحال اجنبی تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ جانتے بوجھتے کہ ساحل کے معاملات عام پولیس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے، پھر بھی پریشان ہو کر انوشے کو چھوڑ بھاگا تھا۔ نوجوان نے کوفت سے لڑکی کو دیکھا۔
"یہ لڑکی......؟" اُس نے ذہن پر زور ڈالا اور یکدم بزنس پارٹی کی ایک تصویر اُس کے ذہن میں اُبھر آئی۔ یہ خاندان برسوں سے بزنس میں تھا مگر اس ملک میں یہ فیملی ابھی حال ہی میں شفٹ ہوئی تھی۔ یکدم اُسے ملک کی ساکھ بھی ستانے لگی تھی۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے پاکستان ویسے ہی ننانوے فیصد اچھا نہیں ہوتا، سو وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ تاثر مزید گہرا ہو، سو اس نے لڑکی کو سہارا دے کر اُٹھایا تھا۔ اُس کے وینٹی بیگ میں اُس کے پتے سے آگاہی چاہی تھی۔ مگر اُس کے بیگ میں ڈرگ کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔
شہریار...... وہ ضرور جانتا ہوگا، بزنس کمیونٹی کے لئے وہ ڈائریکٹری تھا اُس نے لڑکی کو اپنی کار کا فرنٹ ڈور کھول کر بہت آہستگی سے بٹھایا تھا، پھر کار کا سیفٹی بیلٹ باندھ کر اس نے کار اسٹارٹ کی تھی اور سڑک پر چلتے ہوئے موبائل پر نمبر پریس کر کے Bluetooth کے ذریعے دوسری طرف فون اُٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد اُس کی آواز سنائی دی۔
"ہیلو، شہریار اسپیکنگ......کون؟"
"کون ہوسکتا ہے میرے علاوہ...... بقول شاعر۔

ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہ عدم
اپنا غم، تیرا غم، جہان کا غم

"کون، عاطف؟" دوسری طرف سے ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی، پھر آہستگی سے بولا گیا۔ "یہ رات کے گیارہ بجے تو کہاں سے بول رہا ہے؟"
"کہاں سے بول رہا ہوں، یہ چھوڑ، یہ بتا، یہ تو گیارہ بجے سونے والوں کی لسٹ میں کب سے شامل ہو گیا؟"
دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آئی، پھر اُس نے آہستگی سے کہا۔ "بس، ویسے ہی یار طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، اس لئے جلدی لیٹ گیا تھا۔"

”طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، مطلب اینی پرابلم؟“ وہ اپنا مقصد بھول کر سراسیمہ ہو کر پکارا اور شہریار کا قہقہہ اُس کی سماعت سے ٹکرایا۔

”بہت ڈفر ہے عاطف، تُو۔ پتہ ہے، کبھی کبھی تو مجھے یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ بالکل بیویوں والی ٹون میں بولتا ہے۔“ لمحے بھر کو رکا، پھر نرمی سے بولا۔ ”کوئی خاص پرابلم نہیں ہے، بس کام کرنے سے جلدی تھکاوٹ ہو جاتی ہے، اس لئے آرام کر رہا تھا۔ ویسے ہے کہاں پر تُو؟“

”سی ویو پر تھا۔“

”سی ویو پر، اتنی رات گئے؟ کیا کر رہا تھا؟“

”کیا کروں گا، تیرا غم منانے آیا تھا۔ مگر یہاں تو نیکی کرنی پڑ گئی۔ بلکہ سچ پوچھو، نیکی گلے پڑ گئی۔“

”کیا مطلب؟“ شہریار کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو اس نے سلسلۂ کلام آگے جوڑا۔

”اماں یار، یہ جو آج کل ہوٹلنگ میں نئے لوگ آئے ہیں ناں، جن سے تیری بھی میٹنگ ہوئی تھی، کیا نام ہے اُن کا؟“

”مسٹر سلیم افسر۔ اور تصحیح کر، وہ ہوٹلنگ میں قریباً 25 سال سے ہیں۔ ہاں، وہ پاکستان ابھی آئے ہیں۔ مگر تجھے اچانک رات کے گیارہ بجے یہ سوال کرنے کا خیال کیوں آیا؟“

”وہ یار اُن کی بیٹی ہے ناں انوشے، ہاں دیکھ لڑکیوں کا نام میں نہیں بھولتا۔“

”بکواس مت کر، تیری باجی کی عمر کی ہے۔ عزت سے ذکر کر۔“ دوسری طرف سے شہریار کی تنبیہی آواز سنائی دی تو وہ مسکرانے لگا، پھر شرارت سے بولا۔

”اماں، باجی کی عمر کی ہو نہ ہو، اپنا کام تو دل بہلانا ہے۔ ویسے غلط مت سمجھ، دراصل بات یہ ہے......“ وہ کہہ کر پوری واقعاتی تفصیل دینے لگا۔ پھر اپنی ذہانت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے ہنس کر بولا۔ ”یوں، رانگ کال کر کے ماموں کا دل دھڑکا دیا، تب کہیں میری اور لڑکی کی جان چھوٹی۔ ورنہ تجھے پتہ ہے، میں یہ فون تجھے کہاں سے کر رہا ہوتا؟“

”آئی تھنک، ہسپتال سے۔ کیونکہ ہمارے گروپ میں لڑائی بھڑائی کے سارے کام سلامہ جو کرتا تھا۔“

”سلامہ......؟“ یکدم اُس کی زبان نے دل کے دُکھ کو چھونے کی کوشش کی اور عاطف فوراً اُسے اس دکھ سے چرا لے گیا۔

''بس، بس...... زیادہ شہنشاہِ غم بننے کی ضرورت نہیں۔ اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ ہاں، تو یہ بتا، تیری میم صاحب کا گھر کہاں ہے؟''

شہریار نے کچھ لمحے سوچا، پھر بولا۔ ''تجھے نہیں پتہ، مسٹر عابد کا جو گھر ہے ناں، وہی بیگم عافیہ کا گھر ہے۔ مسٹر عابد اس گھر سے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔''

''اچھا چل، تیرا شکریہ کہ تو نے میری بکواس سنی۔ باقاعدہ شکریہ کہنے صبح آؤں گا تیرے دفتر۔''

''بک بک مت کر۔ میرے دفتر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں، تجھے پوری اٹینشن دے نہیں سکوں گا، پھر تیرا ہو تھا پھول جائے گا۔''

''بڑا ہی خبیث ہے تو۔ دوستی محبت کو یوں قتل کرتا ہے کہ......''

''کہ بے ساختہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔ معلوم ہے، مجھے اپنا ہنر۔ زیادہ تعریف مت کرو۔ ورنہ انکل صمدانی کو پھر شکایت ہوگی کہ میں بد پرہیزیوں سے باز نہیں آ رہا۔''

''تو ہے ایسا، ہر وقت ستانے کو تیار رہتا ہے۔'' عاطف بیگ نے خفگی سے کہا اور وہ ہنسنے لگا۔ پھر شرارت سے بولا۔

''اپنی تو یہی باتیں ہیں۔ چل اب لڑکی کو حفاظت سے چھوڑ کے آ۔ پھر ملیں گے تو باقی کی بکواس پھر سن لوں گا میں تیری۔''

''او کے، خدا حافظ! اپنا خیال رکھنا۔''

''اچھا میری بیگم!'' اس نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

عاطف بیگ نے موبائل آف کر کے گاڑی کو ذیلی سڑک پر موڑا، پھر پندرہ منٹ بعد وہ سلیم افسر کے گھر کے سامنے موجود تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تھا، پھر وہ انوشے کو سنبھالتے ہوئے اندر بڑھتا چلا گیا تھا۔ مسٹر سلیم افسر نے تحیر سے اُسے دیکھا تھا۔

''مسٹر سلیم!...... یہ آپ کی بیٹی بہ حفاظت آپ کی کسٹڈی میں...... یہ مجھے ہی وے پر ملی تھیں۔''

''اوہ میری بچی۔'' بیگم عافیہ نے اُسے سنبھالا۔ وہ نیم غنودگی میں بھی اُن کے ہاتھ جھٹک رہی تھی اور مسٹر سلیم اس کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

''آپ بہت عظیم انسان ہیں بیٹے! آپ نے آج مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ عارف بتا رہے تھے، یہ اُن سے کسی بات پر جھگڑا کر کے اُٹھ کر کہیں چلی گئی تھی۔ دراصل یہ بی غصے کی بہت تیز ہے۔''

"غصے کی تیز اور قدرے عاقبت نااندیش......." اس نے بارڈا سپوکن ہونے کا ثبوت دیا ے

سلیم افسر نے سر جھکالیا اور عین اسی وقت عارف جواد اندر آیا۔

"ابھی آنٹی نے انوشے کے گھر آنے کی اطلاع دی آپ نے پوچھا، یہ کہاں چلی گئی تھی؟"

عاطف بیگ تحیر سے اُسے دیکھنے لگا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ عارف کے بولنے کے انداز سے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس گھر میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے وہ کسی گھریلو سیاست کا شکار ہوئے بغیر کافی کی آفر کو خوش اسلوبی سے انکار کر کے باہر نکل آیا تھا۔ مگر اُسے لگ رہا تھا، عارف کسی بڑی خرابی کا ہرکارہ بن کر اس گھر میں شامل ہے، جس سے اس گھر کے مکین تک آگاہ نہیں تھے۔

اس نے واپس گاڑی کو اپنے کراچی کے فلیٹ کی طرف موڑلیا تھا۔ یہ فلیٹ اس نے بزنس کی سہولت کے حساب سے خرید رکھا تھا۔

مومنہ رفیق بہت سہولت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی تھی۔ اُسے آئے ہوئے ساڑھے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ایڈوانس میں اُسے تنخواہ کا صرف پانچ فیصد ملا تھا، جو خرچ ہو گیا تھا۔ شافعہ کی دی گئی رقم بھی خرچ ہو چکی تھی اور آج پھر دوسرا دن تھا کہ وہ بھوکی تھی۔ حالت ایسی تھی کہ دل چاہ رہا تھا، کوئی جھوٹے منہ ہی لنچ کے لئے پوچھ لے تو وہ ایک سیکنڈ بیٹھنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ مگر دفتر کے باقی لوگوں کے لئے وہ ابھی تک اجنبی ہی تھی۔ کچھ وہ خود بھی لئے دیئے رہنے والی لڑکی تھی اور کچھ دفتر کے لوگ بھی شاید اُسے میرٹ سے ہٹ کر سفارش پر آنے کی وجہ سے اُس سے دُور دُور تھے۔ شافعہ سے وہ قرض مانگنا نہیں چاہتی تھی اور بنا کام کے ایڈوانس دیئے جانے پر بھی دفتر میں چہ مگوئیاں اُٹھ رہی تھیں اس لئے وہ اس بات سے بھی بچنا چاہتی تھی۔ بار بار اُس کے ذہن میں اندھیرا چھا جاتا، مگر وہ مصروف تھی جب بہت اچانک پیون نے اُسے شہریار کے کمرے میں پہنچنے کی اطلاع دی۔ وہ سنبھلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ شہریار ریوالونگ چیئر پر جھول رہا تھا۔

"مس مومنہ! دی رائزنگ کمپنی کے Logo کا کیا ہوا؟"

"سر! تیار ہے۔" اس نے پرنٹ آؤٹ کی فائل اس کے سامنے لا رکھی۔

دی رائزنگ کمپنی، ایمپلائر مہیا کرنے کے سلسلے میں رجسٹریشن کا ایک پرائیویٹ ادارہ تھا، جہاں ملازمین کی درخواستیں کمپیوٹرائزڈ طریقے سے محفوظ کرلی جاتی تھیں اور پھر سرچنگ کے ذریعے قابل افراد کو جاب کے لئے پیغام بھیج دیا جاتا تھا۔ کمپنی بھی چونکہ نئی تھی، اس لئے Logo کی تیاری اور پبلسٹی کا کام شہریار کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے سپرد کیا گیا تھا۔ شہریار پرنٹ آؤٹ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ مومنہ

رفیق نے بہت ذہانت سے Logo بنایا تھا۔سورج کی کرنیں اور درمیان میں ایک کونپل پھوٹتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔سبز دائرہ زندگی کی اسٹرگل کو واضح کر رہا تھا۔مگر شہریار کو اس دائرے پر اعتراض ہوا تھا۔

''مس مومنہ! یوں نہیں لگتا، اس دائرے سے ہم نے زندگی کی کھلنے والی اُمید کو محدود کر دیا ہے؟ زندگی میں لامحدودیت ہونی چاہئے۔آپ جانتی ہی ہوں گی، زندگی ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے، صرف لوگ مر جاتے ہیں۔پلیز! اسے آپ اس پوائنٹ آف ویو سے دیکھئے۔''

''اوکے سر! میں پھر سے کوشش کرتی ہوں۔'' اُس نے فائل اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر چکرا گئی۔

شہریار تیزی سے اُٹھا تھا۔''مس مومنہ! آپ ٹھیک ہیں؟''

''جی سر! میں بالکل ٹھی.......ٹھ.......ٹھیک.......''

وہ مزید کھڑی نہیں رہ پائی۔شہریار نے ہنگامی حالت میں اُسے بازوؤں میں سنبھالا مگر وہ تب تک بے ہوش ہو چکی تھی۔اُس نے اُسے بازوؤں میں اُٹھا کر اپنے روم میں رکھے صوفے پر لٹا دیا تھا۔چہرے سے حجاب اس افراتفری میں اُتر گیا تھا۔شہریار پہلی مرتبہ اُسے دیکھ رہا تھا۔وہ بلاشبہ بہت حسین ترین لڑکی تھی، مگر اُس کی توجہ اُس کی خوب صورتی سے کہیں زیادہ اُس کی آنکھوں پر ٹھہر گئی تھی۔

یہ آنکھیں.......انہیں اُس نے کہیں دیکھا تھا۔مگر کہاں؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا.......وہ سوچتے ہوئے تیزی سے باہر نکلا تھا، پھر اپنی سیکرٹری کو دھیمے لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔

''مس انیلا! پلیز میرے روم میں جا کر مس مومنہ رفیق کو دیکھئے۔آئی تھنک، وہ بے ہوش ہو چکی ہیں۔اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو ڈرائیور سے کہہ کر انہیں کسی کلینک لے جائیے۔''

انیلا اُسے غور سے دیکھتے ہوئے تیزی سے اُس کے روم کی طرف مڑی۔شہریار نے پشت موڑ کر ٹرن لیا اور ایک گہرا سانس اُس کے سینے سے نکلا۔جازی عبدالرحمٰن اُس کے سامنے کھڑا تھا اور اُس کی آنکھوں میں خاص طرح کا طنز نمایاں تھا۔

''اب دفتر کی لڑکیاں بھی آپ سے محفوظ نہیں ہیں۔''

''جازی! بکواس مت کرو۔تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم اس طرح مجھ سے بات کرو یا میرے کردار پر کیچڑ اُچھالو۔''

''کردار.......'' وہ استہزائیہ سے ہنسا، پھر نکر کر بولا۔''آپ کا کردار.......ہونہہ، سب کچھ روشن ہے مجھ پر، آپ کتنے پاکباز ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں بہت برا انسان ہوں۔ پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔''
وہ بحث کے بجائے اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ہینڈل کھول کر دروازہ ذرا سا کھلا ہی تھا کہ اُس نے سنا مومنہ رفیق بڑی شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔
''سر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ دراصل دو دن سے کھانا نہیں کھایا میں نے۔ میرے پاس پیسے ختم ہوگئے تھے، اس لئے۔''
''پاگل لڑکی اتنا نہیں سمجھ سکتی تھیں مجھے؟ ہم بھلے ایک دوسرے کو نہیں جانتے، مگر انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ انسانیت کا رشتہ بہت بڑا رشتہ ہوتا ہے۔''
شہریار نے باہر کھڑا رہنا ضروری نہیں سمجھا اور تیزی سے کمرے میں آگیا۔ مومنہ حجاب لگانے کے لئے سرگرداں ہوئی مگر شہریار اُن کی طرف سے پشت کر کے کھڑا تھا۔
''مس انیلہ! میں لنچ کا آرڈر کر رہا ہوں۔ آپ دونوں یہیں ریلیکس ہو کر بیٹھئے۔ مجھے باہر کچھ کام ہے، اس لئے آپ کو کسی قسم کی دقت نہیں ہوگی۔''
نظریں نیچی کئے اُس نے چابیاں اٹھائی تھیں اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ مومنہ نے اُس کی پشت کو دیکھ کر کہا تھا۔
''بہت اچھے انسان ہیں، مسٹر شہریار۔ پہلی گفتگو سے مجھے لگا تھا، یہ بالکل ہٹلر ہوں گے۔ مگر یہ تو بہت نرم دل انسان ہیں۔''
انیلہ اُس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد دفتر میں بہت پُرتکلف لنچ ٹیبل پر سجا ہوا تھا۔
''اتنا سارا کھانا...... انیلہ! یہ بہت زیادہ ہے۔'' مومنہ رفیق نے گھبرا کر کہا۔
انیلہ مسکرا کر بولی۔ ''جو دل چاہ رہا ہے، وہ کھالو۔ رُکو، میں اسٹاف کی دو تین فرینڈز لڑکیوں کو بھی لے کر آتی ہوں۔''
مومنہ نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی۔
پھر وہ لنچ سے نمٹے ہی تھے کہ کمرے کے ایکسٹینشن پر کال آئی۔ انیلا نے فون اٹھایا تھا۔ ''ہیلو، اسٹائل وژن۔ آپ کون؟''
''مس انیلہ! میں شہریار بول رہا ہوں۔ آپ بتائیے، آپ فارغ ہوگئیں؟''
''اُفوہ، سر!...... جی سر! ہم لنچ کر چکے ہیں۔''

”اوکے، بس یہی پوچھنا تھا۔ اچھا خدا حافظ!“

انیلہ جانتی تھی، یہ فون کیوں کیا گیا ہے، سو اس نے مومنہ سمیت باقی لڑکیوں سے فوراً کہا۔ ”سر دفتر میں واپس آنا چاہ رہے ہیں، اس لئے اپنی اپنی سیٹ پر چلو۔“

مومنہ، انیلہ کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے انیلہ! سر کو کہیں جانا نہیں تھا، وہ صرف ہماری پرائیویسی کے لئے اتنی دیر تک ٹائم پاس کرتے رہے۔“

”تم ٹھیک سمجھی ہو۔ سر بہت اچھے انسان ہیں۔ بظاہر سخت دکھائی دیتے ہیں، سخت رویہ رکھتے ہیں، مگر مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے، وہ ہماری ماں جیسے ہیں۔“ انیلہ نے مسکرا کر کہا۔

مومنہ اس اصطلاح پر ہنسنے لگی۔ انیلہ مگر سنجیدہ ہی رہی تھی۔

کام ایک بار پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ جارج عبدالرحمٰن، مومنہ رفیق کے حجاب سے ڈھکے چہرے کو بہت تیکھی نظروں سے دیکھتا ہوا نکلا تھا۔ سو مومنہ رفیق نے تعارف چاہا تھا۔ انیلہ نے اُس کے کان میں گھس کر کہا تھا۔

”شہریار صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ پہلے کافی جولی ہوا کرتے تھے۔ اسٹاف سے کافی بے تکلف بھی تھے۔ لیکن پچھلے کچھ مہینوں میں ان میں بہت چینج آ گیا ہے۔ اب یہ خود کو کچھ مالک مالک سمجھنے لگے ہیں۔“

”بری بات مس انیلہ! کسی کی برائی نہیں کرتے۔“

انیلہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ مومنہ کی بھی سانس تیز چلنے لگی تھی، کیونکہ شہریار ان کے بالکل پیچھے آ کر جانے کب کھڑا ہو گیا تھا۔

”وہ سر! ہم تو بس ایسے ہی......“ انیلہ نے ہکلانا شروع کر دیا۔ شہریار کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا، پھر وہ نرمی سے بولا۔ ”اٹس او کے، آپ تو یوں گھبرا رہی ہیں، جیسے حضرت عزرائیل کو دیکھ لیا ہو۔ مس انیلہ! میں بہت برا ہوں، مگر اتنا برا نہیں۔ ویسے آدم خور قبیلے سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”ایسے تو نہ کہیں سر! ہم آپ کے بارے میں اتنی بری رائے نہیں رکھتے۔“ مومنہ نے منمنا کر کہا اور وہ ہنس پڑا۔

”یعنی ثابت ہوا، بری رائے رکھتے ضرور ہیں، وہ زیادہ بری نہیں ہے، یہ اور بات ہے۔“

مومنہ اور انیلہ کی زبان کو تالا لگ گیا اور وہ حظ لیتا ہوا وہ کام کرنے لگا، جس کام کے لئے آیا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سفید لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"مس مومنہ! اس میں کچھ رقم ہے۔ میرے خیال میں آپ کے کچھ نہ کچھ کام آ ہی جائے گی۔"

مومنہ نے کسمسا کر اُسے گومگو کیفیت میں دیکھا تو وہ مزید بولا۔

"بے فکر رہئے، یہ آپ کی تنخواہ کا حصہ نہیں ہے، آپ کے معاملات سدھارنے کے لئے یہ میری ذات کا کنٹری بیوشن ہے۔"

"سوری سر! میں خیرات نہیں لیا کرتی۔" اس نے استقامت سے منع کر دیا حالانکہ ہاتھ لفافے کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ شہریار نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کے کھردرے لہجے میں جواب دیئے جانے پر نرمی کی پھوار ڈالی۔

"یہ خیرات نہیں ہے مومنہ صاحبہ! آپ اسے ایک انسان کا دوسرے انسان پر حق سمجھ لیجئے۔ دیکھئے آپ میری ایمپلائی ہیں اور آپ کی پوری توجہ کام پر رکھنے کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں آپ کو معاشی تنگی سے ہارنے نہیں دوں۔ آپ معاشی طور پر مستحکم ہوں گی تبھی میری کمپنی کے لئے بیسٹ رزلٹ دیں گی ناں۔ سو یہ احسان ہے نہ رحم۔ اسے آپ Give and take سمجھ سکتی ہیں۔"

مومنہ نے لفافہ لے کر پرس میں ڈال لیا تھا۔ شہریار بات ختم کر کے رکا نہیں تھا، واپس اپنے رُوم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور انیلا نے بہت باؤ ہو کر کے اس سرپرائزنگ فیصلے پر آنکھیں گھمائی تھیں۔

"بی بی مومنہ! دال میں کچھ کالا ہے۔ شہریار صاحب بظاہر ایسے فیصلے لیتے رہتے ہیں مگر انہوں نے کبھی اپنے کسی فیصلے کی اتنی وضاحت نہیں دی، جتنی آج تمہاری تشفی کے لئے بولے ہیں۔"

مومنہ کچھ نہیں بولی اور نئے سرے سے اپنے کام میں لگ گئی۔

پھر شام کی بات تھی، جب عاطف بیگ دفتر چلا آیا تھا۔ شہریار اس وقت فیشن اینڈ اسٹائل کے موسم گرما کے ملبوسات کی نمائش کے لئے پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جو ماڈلز اُسے درکار تھیں، اُن سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ڈیٹ لینا پڑتی تھی۔ سو وہ ہال کی بکنگ اور ماڈلز کے معاملات طے کرنے کے سلسلے میں پوائنٹ لکھ رہا تھا۔ کس دوست کے ذریعے کس ماڈل کو اپروچ کیا جائے تو کوسٹ کم لگے...... کون سا ہال بہترین لوکیشن دے سکے گا...... یہی معاملات تھے کہ اُس کے غور و فکر کے درمیان عاطف بیگ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو آرنلڈ شیواز ینگر! کیسے ہو؟"

شہریار نے سر اُٹھا کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ”تم ابھی تک یہاں ہو؟ میرے علم میں تو تھا تم یہاں صرف پندرہ دن کے پروگرام پر آئے تھے۔ میں تو سمجھ رہا تھا، میری کہی ہوئی دو ہفتے پرانی بات پر تم اتنے خفا ہو گئے تھے کہ ملے بغیر ہی چلے گئے ہو۔“

”آں ہاں، ایسا ہو سکتا ہے؟ تجھ سے اتنی ناراضگی میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ ویسے کام سے زیادہ تیری طبیعت کی وجہ سے میرا قیام بڑھتا جا رہا ہے۔“

”اونہوں، ایسا مت کرو تم بے فکر ہو کر پنڈی جاؤ۔ وہاں زکریا بھائی پر سارا لوڈ آ گیا ہوگا۔ میری فکر مت کرو، میں بالکل پرفیکٹ ہوں اب۔ تمہیں تو پتہ ہے ہاں، دوائیں وغیرہ سب وقت سے لے رہا ہوں میں۔“

عاطف بیگ چلتے چلتے اُس کے قریب آ گیا، پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے، تُو اپنا بہت خیال رکھ رہا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، میرا دل نہیں مان رہا کہ تجھے چھوڑ کر جاؤں۔ پانچ چھ سال پہلے گیا تھا تو دیکھ کتنی بری حالت میں تجھے پایا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں کہ اب چھوڑ کے گیا تو......“

شہریار اُسے دیکھنے لگا۔ وہ اُس کا ادھورا جملہ جانتا تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ سو اس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جذب سے کہا تھا۔

”دل میں وہم مت ڈال کر جا۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے...... اور اگر کچھ ہونا لکھا بھی ہے تو بے فکر رہ، بہت سی دُعاؤں میں ایک یہ دُعا بھی مانگی تھی میں نے کہ آخری لمحے تیرا چہرہ ضرور دیکھ کے جانا ہے۔ حالانکہ بہت بوریت ہوگی کہ مرتے وقت بھی تجھ جیسے خبیث کو دیکھوں، مگر دوستی کی ہے تو نبھانی تو پڑے گی ناں......“

عاطف بیگ نے اُس کے بال مٹھی میں بھر لئے تھے اور وہ ہنسی کر رہا تھا۔

”احمق! دفتر میں تو عزت کر۔ میرے ورکرز پر کتنا برا اثر پڑے گا مجھے اس حالت میں دیکھ کر۔

”کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ تو خوش ہوں گے کہ کوئی تو ہے، جو اُن کے انکل کھڑے باس کے بھی کان کھینچ سکتا ہے۔“ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ ”چل، آج اپنے پسندیدہ ریستوران چلتے ہیں۔ بہت دن ہوئے مزے کی کافی نہیں پی۔ آج میں تیری شاعری بھی سنوں گا۔“

”ارے واہ، جاتم رہے ہو، شاعری میں سناؤں۔ پاگل سمجھ رکھا ہے کیا؟“

”بکواس نہیں، بس جلدی سے اُٹھ۔ آج میں تیری ایک نہیں سنوں گا۔“ اُس نے بازو پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔

شہریار نے کار کی چابیاں لیں اور موبائل جیب میں ڈال کر اُس کے ساتھ باہر نکلا اور بدقسمتی سے اسی وقت سالار عبدالرحمٰن بھی اپنے کمرے سے نکلے تھے۔ سوئے باہر جاتا دیکھا تو ملازم پر رکھ کر اُسے سنانے کو بولے۔

''رشید! فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے کچھ کام ہی کرلیا کرو۔ ہر وقت اپنے ہی مشاغل میں لگے رہتے ہو۔ کمپنی تمہیں تنخواہ وقت ضائع کرنے کے لئے تو نہیں دیتی۔''

شہریار کے اُٹھتے قدم رک گئے۔ عاطف بیگ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا، مگر شہریار نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اُسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ پھر سالار عبدالرحمٰن اور وہ ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔

کار شہریار ڈرائیو کر رہا تھا عدیل عبدالرحمٰن چونکہ واپس جا چکے تھے، اس لئے اپنے آپ سے پھر سے ناراضگی کا دور چل رہا تھا۔

''میں سوچتا ہوں تمہارے جانے کے بعد زندگی کتنی خاموش ہو جائے گی۔''

''ایسے ہی خاموش ہو جائے گی؟ میری زندگی ہے نغمہ...... بیٹا! جانے کا مطلب یہ تھوڑی ہے، دنیا سے جا رہا ہوں۔ اب تیری ساری روٹین کے باوجود رابطہ نہیں منقطع کرنے کا۔'' عاطف نے سر ہلا کر کہا۔ شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔

''اب کیا سوچا جا رہا ہے؟''

''دانیا میرے کہنے میں نہیں آ رہی۔'' شہریار نے عاطف کے کہنے پر کہا۔

''بہت ذہین بچی ہے، اچھا کر رہی ہے۔'' وہ شرارت کے موڈ میں نہیں تھا، لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی اسٹریس لے، سو اُس کی توجہ بٹا رہا تھا۔ مگر اب کیا، کیا جائے کہ دانیا کا معاملہ اُس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ خود عدیل بھائی بھی اس سلسلے میں ناکام ہو چکے تھے۔ بس ماما اور نانو، چاچی عبدالرحمٰن اور سالار بھائی اس سلسلے میں خوش تھے۔ مگر یہ صرف وہ جانتا تھا کہ دانیا کتنے بڑے رسک سے کھیل رہی تھی۔ اس سلسلے میں اُس کی ماموں عبدالکریم سے بھی بات ہوئی تھی، مگر اُس کا یہی خیال تھا، ''اُسے فری ہینڈ دے دو۔ جتنا تم اسے روکو گے، وہ اتنی ہی تندہی سے اس راستے پر دوڑے گی۔ صنفِ نازک کی یہ کل سیدھی نہیں ہوتی۔ جب کام سے روکو تو یہ شک میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ شاید اس بات سے انہیں فائدہ ہو رہا ہوگا اور یہ صنفِ کرخت انہیں کامیابی سے روکنا چاہتی ہے۔ سو میری جان! بے فکر رہ، دانیا پوری طرح میری ذمے داری ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہے وہ۔ حمزہ عابد پر بہت کڑی نظر ہے میری۔''

بظاہر ماموں کی اس بات پراُسے بھرپور یقین تھا،مگراُس کا ضمیر اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی پرسخت کمنٹ دیتا رہتا تھا۔یہی وجہ تھی،وہ بظاہر پُرسکون رہتا تھا،مگراندر ہر وقت ایک ہلچل مچی رہتی تھی۔

''کچھ دیر کے لئے سب بھول جا۔ہم آج صرف یونیورسٹی کے دن جینا چاہتے ہیں۔'' اُس نے اُس کے اسٹیئرنگ وہیل پر مشاقی سے چلتے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دلداری سے کہا۔

شہریار سر ہلا کر کارکوٹرن دینے لگا۔''کیایاد کرے گا،آج کی زبردست کافی میری طرف سے۔''

عاطف نے آسودگی سے مسکرا کر اُسے دیکھا،پھر دس منٹ بعد وہ کافی ان میں بیٹھے تھے۔اُن کی مخصوص میز ریزرو تھی،سو وہ ایک کونے کی خالی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔کافی ان کی خنک اور مہکی فضا نے شہریار پر اچھا اثر ڈالا تھا۔وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''تجھے یاد ہے،ایک زمانے میں ہم یہاں بے وقوف بننے کے لئے کتنی دلجمعی سے آیا کرتے تھے۔''

عاطف بیگ ہنسنے لگا،پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔''ہاں،بہت شوق تھا ناں ہمیں دیوداس کا سوانگ کرنے کا۔لڑکیاں سمجھتی تھیں،وہ ہمیں بے وقوف بنا رہی ہیں اور ہم انہیں بنا کر نکل جاتے تھے۔سلامہ کتنا زچ ہوتا تھا،ہماری اس شرارت سے۔''

''سلامہ......ہاں،آں......'' شہریار کے ہنستے لب یکدم خاموش ہوگئے۔

عاطف بیگ نے دانتوں تلے زبان دبالی۔مسکراہٹ کی بات وہ غلطی سے دکھ کی طرف لے گیا تھا،مگر بہت جلد وہ اس فیز سے نکل آیا،پھر اسی ٹون میں ہنستے ہوئے بولا۔

''مجھے یاد ہے،وہ اعلیکچوئل ماہا کا قصہ......وہ،جو اپنی فرضی ذہانت سے لڑکوں کو بے وقوف بنایا کرتی تھی۔جب ہم نے اُسے کہا،سلامہ اُس کا دم بھرتا ہے تو وہ کتنا بلش کرگئی تھی۔پھر پورے کیمپس میں پیچھے پیچھے وہ ہوتی اور آگے آگے ہمارا شیر جوان......کتنی منتیں کرتا تھا،مجھے بچالو۔وہ تو شکر ہے،بروقت آغاز الدین نے انٹری دی،اُسے پرپوز کیا اور اپنے سلامہ صاحب گھر کو لوٹے۔تجھے یاد ہے،ہم دانیا کو بھی کتنا جیٹ کیا کرتے تھے۔''

شہریار ماضی یاد کر کے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرگئی تھیں۔وہ شروع سے ایسے ہی ہنستا تھا۔عاطف نے اُسے دیکھا تو کہا۔

''تجھے یاد ہے،وہ پری وش،تیری ہر وقت آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے وہ کتنا امپریس ہوگئی تھی۔کہتی تھی،ہائے اللہ!شہریار،جانے بے چارے کو کیا غم ہے؟ہم کہتے،اس کی آنکھوں میں آنسو ہمیشہ قہقہہ

لگا کر ہنسنے سے آتے ہیں، تو کہتی تھی، تمہیں کیا پتہ، اس بے چارے کو کیا غم ہے۔ کتنے عرصے تک وہ تیرے فرضی غم میں پاگل رہی تھی۔"

شہریار ہنسے جا رہا تھا۔ پھر وہ تھم کے بولا۔ "پری وش بھی خوب تھی۔ اُسے یتیم اور مسکین نظر آنے والے ہر چہرے پر ٹوٹ کے پیار آجاتا تھا۔ ہم سب اُسے مدر انڈیا کہتے تھے ناں۔"

"آں ہاں، مدر انڈیا...... اُس کی چال ڈھال، ساڑھی کے پلو، سب بھولنے جیسے نہیں تھے۔ واقعی وہ بھی اپنے مزاج کی ایک ہی لڑکی تھی۔"

شہریار مزید کافی اور چکن سینڈوچز کا آرڈر دے چکا تھا۔ اُن کی باتیں ابھی تک جاری تھیں کہ عاطف نے اُسے محبت کے فرضی قصوں سے یکدم شاعری کی طرف کھینچ لیا۔

"تو نے وقتی فلرٹ کے لئے کتنی غزلیں لکھ ماری تھی ناں، سلامہ کہتا تھا لڑکیاں شاعروں پر بہت مرتی ہیں اور تو نے کہا تھا شکر ہے، فوجیوں پر مرنے کا دور گزر گیا۔ ورنہ پھولوں سے ڈھکی قبر سے کون محبت کر رہا ہے، کون نہیں، صاحب قبر کو کیا معلوم...... سلامہ نے ہم دونوں کو کتنی ملامت کی تھی، دانیا بھی اُس کے ساتھ مل گئی تھی اور تب ہم نے کہا تھا۔ "ہم شریف، پاکباز لڑکیوں سے چھیڑ نہیں کرتے۔ جو لڑکیاں بے وقوف بنانے میں خود کو باکمال سمجھتی تھیں، ہم صرف ان سے اپنی ذہانت کا خراج لیتے ہیں۔ سلامہ مانتا ہی نہیں تھا یار لا جک، جب تک واقعی اسے ہماری شرافت پر یقین نہیں آگیا کہ ہم فلرٹیشن میں بھی عزتوں کا پاس رکھتے ہیں، تب تک وہ ہم سے ٹھیک طرح سے گھلا ملا بھی نہیں تھا۔"

"ہاں، وہ وقت بھی کیا وقت تھا۔ ساری شرارتیں شروع کے دو سال میں ہی کر لی تھیں۔ پھر ایسا لگا تھا، زندگی کے رنگ، مسرت سب جیسے غائب ہو گئے تھے۔"

"ہاں، شاید۔ شروع کے ساڑھے تین سال ہم نے کتنی فلرٹیشن کی، سیاست کی تک بندی کی، مقابلے جیتے، ڈیبیٹ کئے، سلامہ نے ایتھلیٹ میں نام کمایا...... ہم سب نے جو کچھ کیا، شروع کے تین ساڑھے تین سالوں میں کر لیا تھا۔ پھر تیرا، جانا نہ کا مسئلہ آگیا۔ زکریا بھائی ہارٹ پیشنٹ بن گئے، سلامہ پر گھر کی ذمے داریاں آگئیں تو سب کچھ ختم ہو گیا۔"

شہریار اسی تکلیف دہ دور میں چلا گیا۔ اُس کی آنکھیں اس لمحے بھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں، مگر قریب کہیں بھی پری وش جیسی دل پھینک لڑکی نہیں تھی۔ نہ ہی اُس کی شاعری سے زیادہ اُس کی پرسنالٹی پر مرنے والی ماہی تھی۔

"آج سنا نا کچھ سنجیدہ سا۔ جو واقعی قلبی واردات کے تحت لکھا ہو۔"

شہریار نے کسمسا کر اُسے دیکھا، مگر عاطف کی آنکھوں میں ایسا تحکم تھا کہ اُسے شاعری کے سمندر میں غوطہ لگانا ہی پڑا تھا۔

”ایک نظم ہے۔ پتہ نہیں، تمہیں پسند آئے گی بھی یا نہیں؟“

”بے فکر رہ۔ تیری ہر چیز مجھے پسند آجاتی ہے۔ بس جی کڑا کر کے سنا ڈال۔“

اُس نے رو دھم بنایا، پھر اپنے مخصوص لہجے میں سنانے لگا۔

”آج کے دن ہوں تمہاری محفل میں

آج کا دن نہ یوں برباد کرو

پھر کسے فرصت ہے کہ یوں

وقت سے مہلت لے کر

تمہیں پانے، تمہیں چھونے کا سفر اختیار کرے

بچھڑنے کے لمحات کو یوں بے ثمر نہ گزرنے دو

کہ

بعد میرے تمہیں اک تشنگی کا احساس رہے

اور اس دوسرے جہاں میں یہ میرا کم مایہ دل

تمہاری آنکھوں کی طرح ناشاد رہے“

عاطف بیگ گم انداز میں اُسے دیکھنے لگا تھا۔ شہریار نے چٹکی بجا کر اُسے متوجہ کیا تھا۔

”کہاں کھو گئے حضرت! کافی اور سینڈوچ باسی ہو رہے ہیں...... بقول سلامہ کہ کافی اور سینڈوچ تو گرم گرم ہی لطف دیتے ہیں۔“

عاطف بیگ سر ہلا کر کافی پینے لگا اور شہریار ریک ٹک سامنے دیکھنے لگا تھا۔
''تمہیں پتہ ہے، ہماری مخصوص ٹیبل پر کون بیٹھا ہے؟''
''کون......؟''
''سلامہ......!''
شہریار نے جواب دیا اور عاطف بیگ نے مڑ کر دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔''ہم سے ناتہ نہیں رکھنا چاہتا مگر ہماری یادیں سنبھال کر رکھتا ہے، امیزنگ۔''
''امیزنگ نہیں ہے،
بس کچھ لوگوں کو زندہ انسانوں سے زیادہ مردہ یادوں کو یاد کرنے میں خاص مزہ ملتا ہے۔''شہریار کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ یہاں یوسفی صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔''بھلے دوستی نہیں رکھتا، مگر یوں دغاباز لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر دوستی کی یادکو رسوا تو نہیں کرتا۔ آئی ہیٹ یوسفی صاحب......!''
عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ وہ اس کمنٹ سے سو فیصد متفق تھا۔ اُسے جیل کے وہ دن کبھی نہیں بھول سکتے تھے، جب ہر طرف سے مایوسی نے گھیر لیا تھا کہ سلامہ نے روشنی کی کرن بن کر انہیں اس پریشان کن صورت حال سے نکال لیا تھا۔
''تجھے یاد ہے ناں، وہ جیل یار؟'' عاطف بیگ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے یاد دلایا اور شہریار ہنسنے لگا۔
''ہاں، وہ بھی کیا دن تھے۔ تجھے یاد ہے، ہم نے روسٹرم پہ جا کر دوگانا نظم پڑھی تھی۔ کیا تھی وہ نظم......
''خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو......''
عاطف بیگ نے پہلا مصرعہ پڑھا اور شہریار نے اُسے اشارے سے روک دیا۔

”یہ نظم میں دہراؤں گا۔“

عاطف بیگ نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ماضی کی طرح اشارہ دیا اور شہریار پڑھنے لگا۔

”خواب مرتے نہیں

خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو

ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے

جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں

خواب روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں

جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی پھکتے نہیں

روشنی اور نوا اور ہوا کے علم

مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں

خواب تو نور ہیں

خواب سقراط ہیں

خواب منصور ہیں“

شہریار پڑھ کر رکا تو عاطف نے ہنس کر کہا۔ ”تجھے یاد ہے، جب ہم یہ نظم پڑھ کر تھکے تھے تو واہ واہ کے ساتھ انعام ملا تھا...... عدیل بھائی کی جیپ رُکی تھی اور تُو نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔ میں تیرے ساتھ نہیں ہوں۔“

شہریار پھر سے ہنسنے لگا تھا، پھر مکر ر بولا۔ ”تُو شروع سے طوطا چشم ہے۔“ کہتے کہتے تھما، پھر عاطف کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ”آج ہم پرانی باتیں کیوں دہرا رہے ہیں؟...... عاطف! کہیں یہ کسی حساب کی کلوزنگ کا اشارہ تو نہیں؟“

”بک مت۔ تجھے تو وہم مجھ سے بھی زیادہ چڑھتے ہیں۔ چل اب اُٹھ۔ ویٹر ہمیں بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔“

شہریار نے چابیاں اور موبائل اٹھایا تھا اور عین اسی وقت اُس کے موبائل پر میسج آیا تھا۔

”پلیز ہیلپ می!“

اجنبی نمبر...... شہریار یاد کرنے لگا۔ اس نے یہ نمبر پہلے بھی کبھی دیکھا تھا۔ یکدم یادداشت میں دفتر کا منظر گھوم گیا۔

”کیا ہوا، کس کا میسج تھا؟“ عاطف بیگ نے بل پے کرتے ہوئے سوال کیا اور وہ کچھ کہے بغیر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ پھر کار میں بیٹھتے ہوئے اُس نے میسج کی بابت اُس سے ذکر کیا تھا۔ عاطف بیگ بھی اُس کی طرح سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”کون ہو سکتی ہے؟ تجھے مامون کے ذریعے کال لوکیٹ کروانے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔“

”ہاں، یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ ٹھیک ہے، میں اب یہی کروں گا۔“ شہریار نے دھیرے سے کہا اور عاطف بیگ، بیگم عافیہ کی نک چڑھی بیٹی کے متعلق پوچھنے لگا۔

شہریار نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ ”تیری باجی بھی ناں بڑی سرچڑھی ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ باپ سے اُس کی نہیں بنتی، ماں کو وہ اپنا دشمن سمجھتی ہے، چھوٹے بہن بھائیوں کو وہ آزار سمجھتی ہے۔ اور تو اور، اُس رات والے واقعے تک سے وہ بے خبر ہے۔ تجھے پتہ ہے، عارف نے خود اُس سے اسی رات کا واقعہ پوچھا اور وہ صمٌ بکمٌ۔ عارف نے اُس کے ذہن میں یہ ڈال دیا تھا کہ وہ اس سے لڑ جھگڑ کر، اسے اکیلی چھوڑ کر اکیلی سی سائیڈ چلی گئی تھی، جہاں کسی اور نے اس کے ساتھ بدتہذیبی کی کوشش کی اور اس لڑکی نے یہ مان لیا۔ کیونکہ وہ بہت زبردست ڈرگ ایڈکٹ ہے۔ نشے میں اُسے اپنے

وجود پر ہی تشکیک شروع ہوجاتی ہے، سوائے تو یہ بات سچ ہی لگی ہوگی۔ پھر تو نے بھی تو عارف کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کیا تھا۔"

"وہ تو میں نے ضروری نہیں سمجھا۔ میں کسی کی ذاتی زندگی میں کیوں گھسوں؟ پھر جب وہ مسٹر عابد جیسے کرپٹ آدمی کی چالبازیوں کو ابھی تک نہیں سمجھ سکے تو میرے کہنے پر وہ عارف پر شک کرتے۔ میں نے عارف کی اس گھر میں بڑی آؤ بھگت ہوتے دیکھی تھی، اس لئے بیٹا، اپنی عزت پر ہاتھ کے مقولے پر عمل کیا تھا۔ مگر...... بیٹا، یہ تو بتاؤ، یہ تم تک میری باجی کی عادات واطوار کے قصے کون پہنچا رہا ہے، خیریت تو ہے؟"

شہریار نے ترچھی نظر سے دیکھا، پھر مسکرا کر بولا "غلط مت سمجھ۔ وہ میرے لئے زہرہ پھوجیسی ہی ہیں۔ دراصل کام کے سلسلے میں کافی آنا جانا تھا اُن کا دفتر میں۔ وہیں ملاقات رہتی تھی۔ پھر خاموش لوگ تو تجھے پتہ ہے ناں مجھے کتنے ہانٹ کرتے ہیں۔ سو بات چیت بڑھی، پھر وہ شام کو روز کلب جاتی ہیں۔ تمہیں تو پتہ ہے ناں، بگڑی اولادوں کے چونچلے۔ سو ہیں دوستی ہوئی، بے تکلفی بڑھی تو بیگم عافیہ نے خاص طور مجھے یہ کام سونپا ہے کہ میں کسی طرح ان کی بیٹی کا دل ان کی طرف سے صاف کردوں۔ ڈرگ لینے کی عادت بھی ہوسکے تو چھڑوانے کی کوشش کروں۔ اور ہاں، ایک بات، اُن کے گھر میں بیگم عافیہ، عارف کی طرف سے کافی بددل ہیں مگر بیٹی کی وجہ سے خاموش ہیں۔"

"ارے واہ، تم تو سلیم افسر کی فیملی کے اسپیشلسٹ ہوگئے ہو۔ مجھے تو آثار اچھے نہیں لگ رہے۔"

"عاطف کے بچے! پٹے گا میرے ہاتھ سے۔" اُس نے دائیں ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے بایاں ہاتھ مارنے کے لئے اٹھایا اور عاطف نے گھبرا کے کہا۔

"ابے، گاڑی سنبھال۔ کیوں چندی میری میت بھیجنے کا چانس لے رہا ہے؟"

شہریار نے تیزی سے گاڑی سنبھالی، ورنہ شدید نوعیت کا ایکسیڈنٹ لازمی تھا۔

"کہاں اُتاروں؟" اُس نے اُس کے پہلے پروگرام کے مطابق پوچھا اور وہ اُسے لوکیشن بتانے لگا۔ شہریار نے اُسے اُس کی مطلوبہ جگہ اُتار دیا، پھر وہ گاڑی موڑ کر واپس دفتر جا رہا تھا کہ اُسے سڑک پر تنہا کھڑی شافعہ سہیل دکھائی دے گئی۔ مومنہ سے بات چیت کے باعث شافعہ سہیل سے بھی اچھی علیک سلیک ہوگئی تھی، اس لئے اُس نے کار اُس کے قریب جا کر روک دی تھی۔

"آیئے مس شافعہ! کہاں جایئے گا؟"

شافعہ سہیل نے اُسے خیر سگالی مسکراہٹ سے دیکھا اور آہستگی سے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ ’’ گھر ہی جاؤں گی۔ لیکن آپ غیر متوقع یہاں.......‘‘

شہریار کو لگا، لفظ فضا میں نہیں، اُس کے دل میں جلترنگ بجاتے چلے گئے ہوں۔ اس لڑکی سے ہمیشہ ہی اُس کے اندر کوئی پرانی یاد مہکنے لگتی تھی۔ اُس نے کبھی محبت نہیں کی تھی مگر شافعہ سے وہ جب بھی ملتا، اُسے لگنے لگتا تھا، جیسے محبت کا یہ احساس نیا نہیں ہے، وہ اُسے مدتوں سے جانتا ہے اور جو نہیں جانتا، شاید وہ جاننے کی پہلی سیڑھی چڑھ کر جان سکتا تھا۔ یہ لڑکی جتنی دور تھی، اُسے لگتا، وہ اس کے اتنے ہی قریب ہے۔ قربت چھونے میں بھی نہیں تھی اس کے لئے قربت محسوس کرنے میں تھی۔ وہ اسے دھیرے دھیرے اپنا مان رہا تھا تو اسے لگ رہا تھا، محبت بھی اسے دھیرے دھیرے اپنا مان رہی تھی۔

’’ آپ شروع سے بہت کم بولتے ہیں مسٹر شہریار؟‘‘

شہریار نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا، وہ مسلسل بولتی رہے اور وہ اُس کی شیریں آواز سے اپنا دل یادوں سے بھرتا چلا جائے۔

’’ نہیں، بہت زیادہ کم نہیں بولتا، بس ہر بات کی وضاحت کرنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔ میری ایک سوچ ہے، اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو آنکھیں پڑھ کر جان لیں۔ اگر نہیں تو لفظوں کا ڈھیر لگانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔‘‘

شافعہ سہیل نے اُسے دیکھا اور ایسے دیکھا کہ یکبارگی اُسے لگا، اُس کا دل اس لمحے اگر تھم بھی گیا تو زندگی کا محبت میں مر جانے کا سودا مہنگا نہیں ہوگا.......

’’ آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔‘‘ اُس نے اُس کی نظروں سے بچنے کے لئے لفظوں کا سہارا لیا اور اس نے بھی تیزی سے نظر کا زاویہ بدل کر کہا۔

’’ میں کہہ رہی تھی، ہر شخص آپ کی اس سوچ کے معیار پر پورا اترے، یہ ضروری تو نہیں۔ ہر انسان اتنی گہرائی سے بات کو نہیں لیتا۔ لوگ لفظوں کے سحر میں رہتے ہیں۔ آپ خود بھی تو لفظوں سے کھیلتے ہیں، لفظوں کے سحر میں جکڑے خواب بیچتے ہیں آپ کو تو ذرا پریکٹیکل ہونا چاہئے۔‘‘

شہریار ہنس کر چپ ہو گیا۔ وہ بات غلط نہیں کہہ رہی تھی، مگر شروع سے جو اُس کی فطرت تھی، وہ اسے بدل نہیں سکتا تھا۔

’’ آپ کو میوزک سے کچھ دلچسپی ہے؟‘‘

’’ جی ہاں، لائٹ میوزک اور غزلیں پسند ہیں۔‘‘

”ارے، یہ تو بالکل میرا ٹمیسٹ ہے۔ ویسے آپ کو گلوکاروں میں کون پسند ہے؟“ شہریار نے فوراً ہی اگلا سوال کیا۔ شاید وہ کم وقت میں اسے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔

اُس نے بالوں کو کیچر میں قید کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”جنید جمشید اور عاطف اسلم اچھا گا رہے ہیں۔“

”لیکن جنید تو آج کل میوزک سے آؤٹ ہیں۔“

”ہاں، مگر اُن کا پہلا کیا گیا کام ابھی تک زندہ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے، اگر انسان کا کوئی کام اس کے بعد بھی رہے تو وہ فیلڈ سے کبھی آؤٹ نہیں ہوتا اور نئی فیلڈ، وہ بھی کچھ بری نہیں۔ میری نظر میں تو وہ اب پہلے سے زیادہ بیسٹ ہیں۔“

”آپ کو مذہب سے کتنا لگاؤ ہے؟“ شہریار کا اگلا سوال تھا۔

شافعہ نے سر جھکا کر کہا۔ ”سیدھی سی بات ہے، میرے لئے مذہب میری زندگی ہے۔ زندگی سے الگ کوئی خفتہ حصہ نہیں ہے۔ نماز، روزہ یہ سب میری پہلی ترجیحات ہیں۔“ وہ جواب دے کر رُکی، پھر آہستگی سے بولی۔ ”آپ کا مذہب سے کتنا لگاؤ ہے؟“

شہریار نے سوچ میں اُتر کر دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”مذہب میرے لئے بھی زندگی جیسا ہے۔ مگر میں آپ کی طرح اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ روزے بھی رکھتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں مگر زکوۃ کے علاوہ کوئی کام مستقل مزاجی سے نہیں کر پاتا اور اس سلسلے میں ہمیشہ شرمندہ رہتا ہوں۔ مگر سونے سے پہلے اللہ سے دعا کر کے سوتا ہوں، زندہ رکھے تو مسلمان، موت دے تو مسلمان کی موت دے۔ شافعہ صاحبہ! میں بہت بڑے بڑے کام نہیں کرتا، نہ بڑی بڑی نیکیاں کماتا ہوں، لیکن اللہ کے بندوں سے محبت کرتا ہوں۔ لوگ مجھے روڈ سمجھتے رہیں، میں اپنی استطاعت کے مطابق چھوٹی چھوٹی نیکیاں کماتا رہتا ہوں۔ بس سمجھ لیجئے، میں پہلے جن باتوں کو بہت اہمیت دیتا تھا، اب ان باتوں پر جان ہلکان نہیں کرتا۔ میرے لئے مذہب لمبی لمبی عبادت نہیں، چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہیں۔“

شافعہ اُسے پھر سے غور سے دیکھنے لگی۔ پہلا تجربہ اُس کا بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ اُس کے دل نے اُسے یک قلم مسترد کر دیا تھا، مگر جیسے جیسے بات بڑھی تھی، اسے وہ آج کے زمانے میں ذرا ہٹ کے رہنے والا انسان محسوس ہوا تھا۔ شہریار کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگا رہا تھا۔ خوب صورت آواز کار میں بکھرتی چلی گئی تھی۔

اُداس لوگوں سے پیار کرنا ، کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں زندگی بھرنا ، کوئی تو سیکھے
کوئی تو آئے خزاں میں پتے اُگانے والا
گلوں کی خوشبو کو قید کرنا ، کوئی تو سیکھے
کوئی دکھائے محبتوں کے سراب مجھ کو
مری نگاہوں سے بات کرنا ، کوئی تو سیکھے
کوئی تو آئے نئی رتوں کا پیام لے کر
اندھیری راتوں میں چاند بننا ، کوئی تو سیکھے

غزل دوسری مرتبہ چل رہی تھی، جب شافعہ سہیل نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ ''صرف یہی غزل......؟''

شہریار کے چہرے پر مسکان اُبھری۔ ''یہ غزل مجھے بے حد پسند تھی۔ سو دانیا نے میری برتھ ڈے پر پورے کیسٹ میں یہی غزل ٹیپ کروا دی۔ اُس دن یہ سب سے خوب صورت تحفہ تھا میرے لئے۔''

''دانیا آپ کی......؟'' جانے اُس نے کیوں جاننا چاہا تھا۔

شہریار نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا مگر اُس کے چہرے سے دل کا حال جان لینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، سو بہت مدھم لہجے میں بولا۔

''دانیا، مائی لٹل سسٹر۔ وہ میری بہن بھی ہے، دوست بھی اور میری باربی ڈول بھی۔ مجھے لگتا ہے، دانیا میری شخصیت کی اساس ہے۔ وہ میرے قریب ہو تو مجھے لگتا ہے، میں کچھ نہیں ہار سکتا۔''

شافعہ سہیل کے چہرے پر الوہی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اُس نے ملائمت سے کہا۔ ''میرا کوئی بھائی نہیں ہے، اس لئے مجھے معلوم نہیں ہے بھائی کس طرح اظہار کرتے ہیں اور اس کی خوشی کس طرح محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شہریار صاحب! ایک بات طے ہے، آپ کی دانیا ہے بہت خوش قسمت کہ اُسے آپ جیسا بھائی ملا۔''

شہریار کچھ نہیں بولا۔ان لفظوں نے جیسے اُس کے اندر خاموشی اُتار دی تھی۔کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ دانیا کی زندگی میں اب وہ دُور دُور تک نہیں رہا تھا۔لیکن یہ سچ سہی، پھر بھی وہ کیوں مانے۔کھویا تو دانیا نے تھا اُسے۔وہ تو ابھی تک دل سے اُس کے لئے ایسی ہی نرمی، حلاوت اور پدرانہ شفقت سے سوچتا تھا۔خسارہ تو اُس نے لیا تھا، مگر حیرت کی بات تھی، خسارہ اُس نے لیا تھا مگر نقصان میں اُس کی اپنی ذات کا ڈیبٹ بڑھتا جا رہا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کوئی بات بری لگ گئی کیا؟"

"ارے نہیں مس شافعہ! ایسی کوئی بات نہیں۔بس مجھے حاضر غائب رہنے کی عادت ہے۔"

"چلئے، جس حالت میں آپ خوش رہیں۔آں، ہاں، بس لیفٹ لے لیجئے۔یہی سفید رنگ کا گھر ہمارا ہے۔"

سفید ماربل اور عام اینٹوں سے سفید رنگ سے پینٹ شدہ گھر۔دونوں میں کوئی کمی بیشی نہیں تھی، لیکن اُسے لگ رہا تھا وہ جیسے آدھا سفید ماربل میں کہیں رہ گیا تھا۔ویسے ہی اس سفید عام سے گھر میں کہیں بٹ گیا تھا۔پتہ نہیں، یہ گھر اُسے ناآشنائی سے کیوں نہیں دیکھ رہا تھا۔اُسے لگنے لگا تھا، جیسے اس گھر نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا تھا۔مگر اس گھر سے اُس کا کیا تعلق تھا......

وہ کار روک چکا تھا۔شافعہ سہیل اُسے چائے کی دعوت دے رہی تھی۔ایک دل آیا، انکار کر دے۔مگر دوسرے ہی لمحے اس گھر نے پکارا۔میرے اندر سمٹ آؤ، میں تمہیں چومنا چاہتا ہوں، تمہیں اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا ہوں، پلیز مجھ سے ملے بغیر مت جاؤ، مت جاؤ......!

اُسے لگنے لگا تھا، جیسے اُسے اس گھر نے مسمرائز کر دیا تھا۔وہ جانے کی خواہش کے باوجود نہیں جا سکا تھا اور کار سے اُترنے پر اُس نے اپنے قدموں کو مجبور پایا تھا۔

"آپ کے پاپا کہیں برا تو نہیں منائیں گے؟" اُس نے مڈل کلاس پرابلم شیئر کی اور شافعہ سہیل مسکرانے لگی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔میرے پاپا عام ٹیپیکل مردوں جیسے نہیں ہیں۔انہوں نے ہم دونوں بہنوں کو فری ہینڈ دے رکھا ہے۔میری بہن دوسرے شہر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور میں اس شعبے سے منسلک ہوں، جسے معاشرے میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔حالانکہ ہم ان کے زخموں پر پھاہے رکھتے ہیں، ان کے دُکھوں کو چنتے ہیں، لیکن پھر بھی لوگ ہمیں عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

"ارے، آپ دل چھوٹا مت کیجئے۔یہ تو لوگوں کا مزاج بن گیا ہے۔پھر یہ بھی تو طے ہے، دوسروں کی سوچ کی غلطی کی سزا اپنے آپ کو دینا سب سے بڑی حماقت ہے۔"

”اوکے، چلئے، اندر چلئے۔ آج میں آپ کو اپنے بابا سے ملواتی ہوں۔ کسی زمانے میں اُن کی تصویروں کا، مجسموں کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ اس شہر کے بہت جانے مانے آرٹسٹ تھے، لیکن آرٹ اُن کا شوق تھا۔ آپ کو پتہ ہے، میرے بابا سی ایس ایس کلیئر کر کے فارن منسٹری میں وزیر رہ چکے ہیں۔“

”ارے واہ۔ وہ تو پھر بہت قابل انسان ہیں۔ میں اُن سے ضرور ملنا چاہوں گا۔“

شافعہ نے بیل دی۔ دروازہ ارسلان راشدی ہی نے کھولا تھا۔

شہریار کو لگا، یہ چہرہ وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ کہاں دیکھا تھا یہ چہرہ؟...... یکدم ایک پرانی یاد رینگ کر سب سے اوپر آ گئی۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں میں اُنہیں دیکھے گیا، پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے واپس مڑ گیا۔

”مس شافعہ! میں پھر کبھی آپ کے ہاتھ کی چائے پیئوں گا۔ آج مجھے کہیں بہت ایمرجنسی میں پہنچنا ہے۔“

شافعہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئی اور وہ گاڑی کو ٹرن دیتا راستوں کو ہمراہ لئے، پھر سے عازم سفر ہوا۔ اُس کا رُخ پاپا کے دفتر کی طرف تھا۔ مسٹر ارسلان راشدی اور پاپا کی تصویر اُس نے اُن کے دفتر میں لگی دیکھی تھی۔ بے شمار سوال تھے اور وہ تھا......

گاڑی تیز رفتاری سے اُڑی جا رہی تھی۔ وہ جیسے جیسے پاپا کے دفتر سے قریب ہو رہا تھا، اُسے لگنے لگا تھا، وہ اپنے اندر اُٹھتے سوالوں کے جوابوں سے قریب ہو رہا تھا۔



سلامہ ارسلان نے اپنے سے دو چار میز دُور شہریار اور عاطف کو بیٹھے دیکھا۔ ہلکی ہلکی آوازیں اُس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں، لیکن پھر بھی وہ اپنی ساری توجہ اپنے باس یوسفی صاحب کی طرف لگا کر بیٹھا تھا۔

یوسفی احمر سیاست کو آرڈینیٹ کرتے کرتے بڑے بڑے سیاست دانوں کی دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھتے رکھتے اب بہت بڑے سرمایہ دار بن گئے تھے۔ اپنا ذاتی اخبار چلا رہے تھے، جس کا ایڈیٹر ان چیف سلامہ ارسلان تھا۔ وہ آج کل کے ڈرگ کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ پر بات کر رہے تھے۔

”تمہیں پتہ ہے سلامہ! یہ ڈرگ کا کاروبار کرنے میں سب سے زیادہ کون ملوث ہے؟“

”میں جانتا ہوں سر! لیکن حسن ابراہیم شاہ وہ نام ہے کہ کبھی اس سلسلے میں پوائنٹ آؤٹ نہیں کیے جاسکتے۔ آپ جانتے ہیں ناں، ہر حکومت میں مزے سے اپنی جگہ کلیئر کر لیتے ہیں اور پچھلے چھ سال سے تو وہ سیاست میں صرف پیسہ لگانے کی پالیسی ترک کر کے خود بھی سیاسی لیڈر بن چکے ہیں اور ان کی پارٹی آج کل پاور میں ہے۔ آپ ہی بتائیے، ایسے میں آپ اپنے اخبار کے ذریعے کیا رزلٹ لینا چاہتے ہیں؟“
مسٹر یوسفی نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ ”تمہیں معلوم ہے، میری سرمائے داروں سے رزلٹ کی ضمن میں کیا مانگ ہوتی ہے۔ تمہیں وہ شہریار کا واقعہ یاد ہے، جسے ہمارے اخبار نے بہت ہائی لائٹ کر کے چھاپا تھا؟“
سلامہ ارسلان نے ایک سیکنڈ سوچا اور بولا۔ ”جی ہاں۔ وہ بھی ڈرگ سے متعلق ہی خبر تھی۔ دوسرے شہر سے آتے ہوئے ہائی وے پر اُسے ڈرگ کے سلسلے میں روک لیا گیا تھا۔ مگر ڈرگ کی یہ مقدار اتنی کم تھی کہ اس وقت کے ہائی وے پولیس کے انسپکٹر مامون نے سخت تادیبی کارروائی سے صرف نظر کیا تھا۔ بات ڈرائیور پر رکھ دی گئی تھی اور شہریار رو دھو کر فارغ ہو گیا تھا۔“
یوسفی صاحب نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر بولے تھے۔ ”تم اُس وقت میرے اخبار میں نہیں تھے، اس لئے درمیان کی بات سے آگاہ نہیں ہو۔“
”یعنی سر؟“ سلامہ نے سوالیہ دیکھا اور وہ مسکرا کر بولے۔
”یعنی یہی سلامہ ارسلان! کہ وہ ڈرگ جانا نہ کے ایما پر اُس کی گاڑی میں رکھی گئی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ شہریار کو ہر وقت ہائی لائٹ کرتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی، بدنامی کی کوئی صورت باقی نہ بچے اور یہ کام اس وقت کے حسن ابراہیم نے کروایا تھا۔ اس طرح سے انہوں نے جانانہ کا دل بھی جیت لیا تھا، دوسری طرف اپنا مطلب بھی حل کر لیا تھا۔“
”مطلب حل کر لیا تھا، میں سمجھا نہیں؟“ آج اُس پر راز کھل رہے تھے۔ وہ مبہوت ہو گیا تھا اور یوسف احمد صاحب ترنگ میں کہہ رہے تھے۔
”مطلب حل کر لیا، سے مراد یہ تھی کہ جن دنوں یہ کام ہوا، اُنہی دنوں مسٹر حسن ابراہیم کی ڈرگ کی ایک بڑی کھیپ آرہی تھی۔ اطلاع صرف ڈرگ کی تھی، مقدار کا تعین نہیں تھا، سو انہوں نے آدھا کلو ڈرگ شہریار کی گاڑی میں منتقل کروا دی، پھر ہائی وے پولیس انسپکٹر مامون نے شہریار کی گاڑی سائیڈ کروائی تو باقی گاڑیوں سے خود ہی چیک ہٹا لیا تھا، یوں وہ بہت آسانی سے کروڑوں کمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔“
”پھر سر! ان پرانی باتوں کا مقصد؟“
”مقصد یہی ہے کہ میں آج کل ٹی وی چینل کھولنے کے لئے این او سی لینا چاہتا ہوں، سو وہ پرانا کیس پھر سے ری اوپن کر کے اپنے مطلب کا فقرہ نکالوں گا۔“

''آپ کو لگتا ہے، وہ یہ بات مان لیں گے؟'' سلامہ نے حیرت سے پوچھا۔
یوسف احمر بولے۔ ''ہاں، مجھے معلوم ہے، وہ یہ بات مان لیں گے۔ کیونکہ انہی دنوں میں نے بہت خاموشی سے مسٹر ابراہیم کو فالو کیا تھا۔ کرائم رپورٹنگ میں ایک نام سنا ہوگا گمنام، وہ میرا ہی اسسٹنٹ تھا۔
ان دنوں میں نے بہت سے معاملات میں ہلچل مچائی۔ جو کام تم آج کر رہے ہو، وہ کام میں اُن دنوں کیا کرتا تھا۔ سو انہی دنوں کی کچھ یادیں فوٹوگرافس کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اس لئے حسن ابراہیم کو
میری خاموشی کی کچھ تو قیمت دینی ہوگی۔ میں نے یہ ترپ کا پتا اسی لئے سنبھال کر رکھا تھا۔ پھر اگر یہ معاملہ بھی ڈھیلا رہا جو کہ ناممکن ہے تو بھی میرے ہاتھ خالی نہیں ہیں۔ تم نے جو بیک ڈور ڈپلومیسی اپنائی
ہے، وہ میری ہی شخصیت کا تو پرتو ہے تم بالکل میری طرح تو سوچنے لگے ہو، سو تمہیں بتانے میں حرج نہیں، لائف کیئر ہاسپٹل کی پرائیویٹ روم کی رنگینیاں ہوں یا حکومتی گیسٹ ہاؤسز کی کہانیاں، سب کی
تصویریں، فوٹیج موومنٹ میرے پاس محفوظ ہے۔ کچھ ہاسپٹل کی چیئرز کے قصے ہیں، جہاں سے ہمارے سیاسی لیڈروں، بزنس کمیونٹی کی راتیں مہکتی ہیں۔ اگر وہ سب اخبار کی زینت بن جائیں تو سیاسی
میدان بالکل خالی رہ جائے گا۔''
''آپ کو کبھی تختہ دینی کارروائی سے خوف نہیں محسوس ہوا؟'' سلامہ ارسلان نے ضمنی سوال پوچھا اور یوسف احمر ہنسنے لگے۔ پھر مسکرا کر بولے۔
''تم بھی تو اسی کرائے میڈیا کا حصہ ہو۔ تمہیں کسی تختہ دینی کارروائی کا خوف ہوا؟''
سلامہ ارسلان نے شوخ نظری سے انہیں دیکھا اور کہا۔ ''میں ہر رپورٹ پہ مکمل ہوم ورک کر کے ہی ہاتھ ڈالتا ہوں۔ تتلی کی تار ہلانا ہی سب سے بڑی مہارت کا کام ہے سر! اور یہ کام مجھے بہترین
بنیادوں پہ آتا ہے۔ کمزوریوں کو کس طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے، یہ میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے سر!''
''بس پھر اپنا سوال واپس لے لو۔ کیونکہ شیر کا باپ شیر ہی ہوتا ہے۔''
سلامہ ارسلان ہنسنے لگا، پھر بہت اچھی ہائی ٹی ختم کی گئی۔ سلامہ ارسلان کافی اِن سے نکلا تو اُس کا رُخ زہرہ جنید کے سائٹ پہ ہونے والے کلینک کی طرف تھا۔ یہ زمین بھی اُس نے زہرہ جنید کے لئے اپنی
سیاسی بازی گری سے تیس سال کی انتہائی لو انٹرسٹ پہ لی تھی۔ لون کے لئے دو تین بزنس پارٹنرز کو بلیک میل کرنے کا کام جاری تھا مگر ابھی فی الحال جنید کی جمع پونجی اور خود زہرہ کی کمائی گئی رقم استعمال میں تھی
اور پھر زہرہ خود اس بات سے آگاہ تھیں کہ اچھے کلینک کے لئے لون لئے بغیر کام جاری رکھنا ناممکن ہے، سو وہ خود بھی انہی کوششوں میں تھی۔ جنید نے اس سلسلے میں اس گھر کے کاغذات زہرہ کے حوالے کر

دیئے تھے، جہاں وہ فیملی کی بہترین رہائش کے لئے منتقل ہونے والے تھے۔ مگر ائمہ کی گمشدگی کا حادثہ آ گیا تھا، سواس کے بعد سے یہ گھر یونہی بغیر استعمال کے پڑا تھا۔ زہرہ نے کتنی بار جنید کو صلاح بھی دی تھی کہ جب تک استعمال میں نہیں آتا، گھر کو رینٹ پر دے دو۔ مگر جنید کی ضد تھی، اس گھر میں پہلا قدم زہرہ جنید ہی رکھیں گی، وگرنہ یہ گھر ایسے ہی پڑے پڑے مٹی ہو جائے گا۔ "بہت سے خواب دیکھے ہیں ہم نے۔ اور یہ خواب ہم مل کر ہی جئیں گے۔"

سو زہرہ اسی گھر کے کاغذات پر لون کی بابت پیش رفت کر رہی تھیں۔ سلامہ نے حالانکہ منع بھی کیا تھا مگر وہ کلینک کے سلسلے میں کوئی ڈیل نہیں چاہتی تھیں۔ زمین کے لئے بھی سلامہ نے کافی ہوم ورک کر کے کاغذات اُن کے حوالے کئے تھے۔ جس وزیر کے ذریعے یہ زمین دی گئی تھی، سلامہ در پردہ اسے بلیک میل کرنے کا مرتکب ہوا تھا اور اس وزیر نے باقاعدہ میڈیا پر پریس کانفرنس کر کے کلینک کے لئے زمین دیئے جانے کو حکومت کے بہبودِ عوام پروگرام کا حصہ قرار دیا تھا۔ یہ نیک کاز تھا، اس لئے میڈیا پر حکومت کی اس سلسلے میں کافی تعریف وتوصیف ہوئی تھی، سو زہرہ جنید کو اس کام کے Fake ہونے پر ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا اور سلامہ چاہتا تھا، لون بھی اسی طرح پاس کروا دے کہ زہرہ کو زیادہ سٹرنہ کرنا پڑے۔ مگر جن بزنس مینوں پر وہ دباؤ ڈال رہا تھا، وہ اعلیٰ درجے کے کمینے انسانوں میں شمار ہوتے تھے، اس لئے امکان غالب تھا کہ وہ اس کام میں چوک جاتا۔

"ہیلو بجو!" سلامہ نے گاڑی پارک کی اور عارضی طور پر بنائے دفتر میں بیٹھی زہرہ کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے انٹری دی۔

"ہیلو سلامہ! اچھا ہوا تم آ گئے، بچے! مجھے اس وقت تم سے ہی کام تھا۔ ذرا یہ چیک تو کیش کرا لاؤ۔ رقم کی کمی کی وجہ سے کام میں رکاوٹ آ رہی ہے۔"

"مگر آپ تو کہہ رہی تھیں، کلینک کے سلسلے میں آپ کی ڈاکٹرز میٹنگ ہو رہی ہے۔"

"ہاں، ڈاکٹرز میٹنگ ہوئی تھی اور ڈاکٹرز اسٹاف جس طرح میرا ہاتھ بٹا سکتے تھے، انہوں نے بتایا ہے۔ میرے کلینک میں ڈاکٹرز کی ایک بڑی تعداد رضا کارانہ طور پر کام کرنے پر راضی ہے۔ میڈیکل ریپشنٹس بھی وزٹ کر رہے ہیں، دوائیوں کے سلسلے میں بھی کافی مدد کا امکان ہے۔ کلینک کے لئے مشینری بھی بہت حد تک ملنے کا گراف بن چکا ہے، مگر یہ سب اس وقت ممکن ہے جب کلینک بن کر تیار ہو جائے۔ سو میرے بھائی! جلدی سے جاؤ، میرا یہ کام کر دو۔"

سلامہ ارسلان نے چیک لے کر جیب میں ڈالا اور اُلٹے پیروں واپس بینک کی طرف ہو لیا۔ بینک بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا، اس لئے اُس کی گاڑی بہت تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی

تھی ۔وہ نئے سرے سے لون کے لئے اسٹریٹجی بنا رہا تھا، مگر اس بار جیتنے کا امکان کم تھا۔

آج بیگم عافیہ ضد کر کے انوشے کے ساتھ سفر کر رہی تھیں حالانکہ انوشے ان کے وجود سے بھی چڑتی تھی، لیکن بیگم عافیہ کو لگتا تھا، وہ دائرہ کی طرح ان کے وجود ہی کا حصہ ہے۔ محبت کو سمجھنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے، اور وقت بھی۔ لیکن ان کی پرورش میں پل کے یہ ناممکن ہے کہ وہ محبت کو بالکل ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

"آپ جانتی ہیں، میں کتنی ریش ڈرائیو کرتی ہوں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ بیٹھ کر مجھے کوئی ڈر نہیں لگے گا۔"

انوشے نے ناک چڑھا کر کار اسٹارٹ کی۔ پھر سڑک پر وہ عام حالت سے زیادہ ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ عافیہ بیگم خاموشی سے اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تم میرے وجود کا غصہ اپنے اوپر کیوں نکالنا چاہتی ہو؟"

"میں کار ٹکرا دوں گی۔ آپ جانتی ہیں ناں، مجھے آپ سے کتنی نفرت ہے۔"

عافیہ بیگم نے ہولے سے اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا، پھر نرمی سے بولیں۔ "مجھے مارنے کے لئے تم اپنی جان پہ مت کھیلو۔ تم چاہتی ہو، میں مر جاؤں تو میں خود اپنی گاڑی ٹکرا سکتی ہوں۔ مگر شرط ہے تم میرے ساتھ گاڑی میں موجود نہیں ہوگی۔ کیونکہ تمہیں ہلکی سی بھی خراش آئے، میرا دل یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

انوشے نے گاڑی ایک جھٹکے سے روک دی تھی۔ "مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔"

بیگم عافیہ مسکرائیں، پھر ملائمت سے بولیں۔ "یہ کیوں نہیں کہتی ہو، تمہیں میری موت برداشت نہیں ہوگی، اسی لئے اس ڈیل سے بچنا چاہتی ہو۔"

انوشے نے کچھ نہیں کہا، منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عافیہ بانو نے مزاج حد درجہ برہم دیکھا تو اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کے بولیں۔ "تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہتی ہو، جا سکتی ہو۔ میں ٹیکسی لے کر دفتر چلی جاؤں گی۔"

انوشے نے انہیں نہیں روکا تھا، سو وہ باہر نکل کر کسی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگیں۔ انوشے اُن کے اُترنے کے باوجود اپنی کار آگے نہیں بڑھا سکی تھی، یہاں تک کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ انوشے نے اُنہیں ٹیکسی

میں بیٹھتے دیکھ کرا پنی کار گاڑیوں کے سیلِ رواں میں ڈالی تھی۔ بیگم عافیہ نے انداز دیکھا تو دل ہی دل میں بڑبڑائی تھیں۔

"شہریار ٹھیک کہتا ہے، انوشے جتنی بھی میری طرف سے رُوڈ بنے، یہ حقیقت ہے، وہ علینہ کی طرح ہی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ بس اس کے پیار کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ اس کا انکار، اقرار کی ہی ترجمانی ہے...... شہریار۔ انوشے سے یکدم اُن کی دماغی رَو شہریار کی طرف مڑ گئی۔ پتہ نہیں شہریار سے وہ جتنی بھی بار ملی تھیں، انہیں اُس سے اپنا پن کیوں محسوس ہوا تھا۔ شاید اس بچے کو ہر ایک سے اسی طرح گھل مل جانے کی عادت تھی۔

وہ آج پہلی بار فیشن اینڈ اسٹائل کے ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں شریک ہو رہی تھی۔ ورنہ ابھی تک جتنی بات چیت یا معاملات طے ہوئے تھے، وہ شہریار عبدالرحمٰن اور سلامہ عبدالرحمٰن کے ساتھ میٹنگ میں طے ہوئے تھے۔ مگر کل ہی شہریار نے انہیں سمر کلیکشن کی لانچنگ ڈیٹ اُن کے کام کے حساب سے فکس کرنے کی بابت فون کیا تھا، سو وہ آج اسی سلسلے میں فیشن اینڈ اسٹائل آئی تھی۔ ٹیکسی کو انہوں نے کافی دور روک دیا تھا۔ انہیں یہ سب کچھ آکورڈ لگ رہا تھا لیکن بیس منٹ کا یہ راستہ پیدل چلنا اُن کے لئے سوہانِ روح تھا۔ شروع میں سخت حالات سے لڑنا اسٹرگل کرنا سب از بر...... مگر اتنے سالوں سے وہ جو زندگی جی رہی تھی، اس میں اب ایکسٹرا اوڈنری محنت کی گنجائش کم ہی تھی۔ وہ مددطلب نظروں سے اِدھر اُدھر ہی دیکھ رہی تھی کہ اچانک اُن کے قریب امدادِ غیبی کی طرح کار آ کر رُکی۔

"اوہ میم! آپ یہاں، خیریت؟"

بیگم عافیہ نے تشکر بھرا سانس لیا اور مسکرا کر شہریار کو دیکھنے لگیں اور صرف دیکھنا ہی نہیں، جواب دینا بھی ضروری تھا، سو وہ کار بند ہو گئی ہے کہ گھسے پٹے بہانے سے اس وقت کی اس شرمندگی کو چھپانے لگیں جس کا سبب انوشے بنی تھی۔ مگر اپنی بیٹی کو ڈسکس کرنا اور وہ بھی کسی قسم کی غلطی کے ضمن میں انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر شہریار اُن کے لئے فرنٹ ڈور کھول چکا تھا۔

"آئیے میم! میں بھی میٹنگ کے لئے ہی آیا ہوں۔" اُس نے انہیں تعظیم دی اور اُن کی احسان مندی کے احساس کو زائل کرنے لگا۔ حالانکہ جانتا تھا، اُس نے جتنی حیرت سے سوال کیا تھا، وہ بیگم عافیہ کو سمجھانے کے لئے کافی تھا کہ اُسے اس میٹنگ کا خیال محو ہو چکا تھا۔ ورنہ حقیقت میں وہ اس میٹنگ میں سالار عبدالرحمٰن کی خفگی سے بچنے کے لئے شرکت سے جان چھڑا گیا تھا۔ یا اور بات کہ اندر چلنے والے سوالات کی وجہ سے وہ بیگم عافیہ کو مدعو کئے جانے کا دھیان تک بھول گیا تھا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں شہریار؟"

شہریار، جو اپنے ہی دھیان میں تھا، اُن کی موجودگی کو قطعی فراموش کر چکا تھا، یکدم چونک کر اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟“

”ہاں...... میں کہہ رہی تھی، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہو، بیٹا! خیریت؟“

اس توجہ پر اُنس بھرا احساس شہریار کی آنکھوں میں کوندا۔ اُس نے کار باقی گاڑیوں کو دیکھ کر پارک کر دی تھی، ہوا ترتے ہوئے بہت نرم لہجے میں بولا۔

”کوئی ایسی بات نہیں ہے میم! بس جب تک یہ سمر کلیکشن وقت پر اور میرے سوچے ہوئے آئیڈیاز کے مطابق لانچ نہیں ہو جاتا، مجھے پریشانی تو رہے گی ہی۔“

بیگم عافیہ مسکراتے ہوئے اُسے دیکھنے لگیں۔ پھر اُس کا گال چھو کر بولیں۔ ”تم بہت زیادہ مخلص ہو اپنے کام سے۔ اور جو لوگ کام کو ڈیوٹی کی طرح لیتے ہیں، انہیں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

”یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے میم! ورنہ مجھے ابھی اس فیلڈ میں بہت سیکھنا ہے۔“

بیگم عافیہ اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، سو مسکرا کر بولیں۔ ”جو انسان یہ سمجھ لے کہ وہ حرفِ آخر نہیں ہے، سیکھنے کے عمل کو سرشان نہیں سمجھتا، وہی انسان...... صرف وہی انسان کامیابی کی نئی جہت دریافت کرتا ہے اور اپنے سے پہلوں کے راستے پر چلتا ضرور ہے، مگر جب منزل پر جا کر رُکتا ہے تو کامیابی کی طرف آنے والے کئی نئے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور تم...... میرے بچے! تم اسی انسان کا پرتو ہو۔“

شہریار مسکرانے لگا۔ وہ مزید کچھ کہہ کر بیگم عافیہ کی بات کا حُسن اور اُن کی محبت کو ضائع نہیں کر دینا چاہتا تھا، سو انہیں میٹنگ روم کے سامنے لے جا کر کھڑا کرنے کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔ بیگم عافیہ نے وجہ پوچھی تو بولا۔

”یہاں سے میری اختیاری حد فی الحال ختم ہوتی ہے، میم! آپ سے باقی معاملات سالار عبدالرحمٰن طے کریں گے۔ میرا کام صرف کلیکشن کی لانچنگ کا سینریو بنانے، ماڈلز کو ہائر کرنے اور ہال کی بکنگ تک تھا۔ باقی سب کام سالار عبدالرحمٰن دیکھیں گے اب۔“

بیگم عافیہ نے اُسے دیکھ کر کہا۔ ”باقی کام؟...... اب کوئی کام کرنے کو بچا بھی ہے؟ سارے ٹف کام تو تم نے سہولت سے نمٹا لئے ہیں، مگر کریڈٹ کسی اور کو دینا چاہتے ہو۔“

وہ ہنس کر چپ ہو گیا۔ بیگم عافیہ میٹنگ روم میں داخل ہو چکی تھیں۔ سو وہ مسٹر عبدالرحمٰن کے کمرے میں بیٹھ کر اُن کا انتظار کرنے کے خیال سے داخل ہوا تھا۔ مگر یہ کیا...... پاپا بہت خاموشی سے ریوالونگ

چیئر پر آنکھیں بند کر کے جھولے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سوچوں نے ایسے جال بُن دیئے تھے کہ ایک لمحے کو اسے دھڑکا ہوا کہیں ڈاکٹر صمدانی نے خود اس کی بابت کوئی سیریس بات تو نہیں کر دی۔ وہ بہت خاموشی سے ان کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا، وہ سوچ کا کون سا سرا پکڑے کہ یہ جال بلکہ جالے لا ایک دم سے صاف ہو جائیں۔ ایک......وہ......مگر تیسرے منٹ تک اُس نے ہر خیال کو چھوڑ کر باقاعدہ اُنہیں پکارنا ضروری سمجھا تھا۔

''پاپا!......خیریت ہے؟''

مسٹر عبدالرحمٰن نے چونک کر حیرت سے اُسے دیکھا۔ حیرت تو خود شہریار کو بھی کم نہ تھی کیونکہ پاپا ہمیشہ اُس کے قدموں کی آہٹ سے اُسے پہچان لیا کرتے تھے۔ مگر آج وہ جانے خیالوں میں کہاں غرق تھا کہ وہ اس کی آمد تک سے بے خبر رہے تھے۔

''سب ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ، آج غیر متوقع......کل تو میرے سارے اصرار پر تم نے سر دمہری سے انکار کر کے سالار اور جازی پر فیصلہ لینے کی ذمہ داری ڈال دی تھی، پھر اچانک تم یہاں؟''

''کیا آپ چاہتے ہیں، میں یہاں سے چلا جاؤں؟''

مسٹر عبدالرحمٰن نے اس بار ناپسندیدگی سے اُسے دیکھا، پھر کھردرے لہجے میں بولے۔ ''آخر تمہیں ڈھنگ سے بات کرنا کب آئے گی یار!''

''شاید کبھی نہیں۔ آپ جانتے ہیں ناں یہ بات، پھر بار بار مجھ سے غلط اُمیدیں کیوں لگاتے ہیں؟''

مسٹر عبدالرحمٰن اس بار کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائل کھول لی تھی۔ اس فائل میں وہ ڈیزائن تھے، جو سمر کلیکشن میں بھاری اکثریت سے منتخب کر لئے گئے تھے۔ شہریار جانتا تھا، یہ فائل کھولنا اور اس کی طرف سے بے پروا ہو جانا، مسٹر عبدالرحمٰن کی مصروفیت سے زیادہ ناراضگی کا تاثر دینے کی معصوم سی کوشش تھی۔ اُسے پاپا پر ہنسی آنے لگی تھی، مگر وہ پھر بھی دم سادھے کھڑا تھا۔

مسٹر عبدالرحمٰن نے کچھ ساعتوں بعد یونہی سر اُٹھایا مگر اُسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر وہ جلبلائے۔ ''کیوں اپنا وقت برباد کرنا چاہتے ہو؟ ایک بوڑھے آدمی کے پاس بیٹھنے سے تمہیں کیا ملے گا؟''

اُس نے پوری آنکھیں کھول کر مسٹر عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''کافی پیو گے؟'' وہ سمجھے، وہ خفا ہو کر جا رہا ہے، سو فوراً اس کی پسند سے اُس کے قدموں میں زنجیر ڈالی اور پھر مسکراہٹ، وہ کیسے رُکتی۔

"میں کہیں جا نہیں رہا تھا۔ لیکن خیر، کافی پینے کا موڈ تو کبھی بھی، کہیں بھی بنایا جا سکتا ہے۔ چاہے دوست ناراض دوست ہی کیوں نہ ہوں۔"
مسٹر عبدالرحمن نے اُس کی طرف دیکھا، پھر مدھم ہو کر بولے۔ "ابھی تک ناراض ہو مجھ سے۔ حالانکہ وہ بات گزرے سات آٹھ سال ہو گئے ہیں۔"
"اس بات کا ذکر، مجھے تو شاید اب وہ یاد بھی نہیں۔"
"کیا واقعی تمہیں وہ باتیں یاد نہیں آتیں، جو ہم سب ہی نے تمہارے لئے کسی سزا کی طرح تجویز کی تھیں؟"
اُس نے نظریں چرائی تھیں، کچھ بولا نہیں تھا اور مسٹر عبدالرحمن اُٹھ کر اُس کے پاس چلے آئے تھے۔ پھر اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔
"کیا واقعی کبھی ایسا ہو گا کہ میں تمہارے لئے پہلے جیسا دوست بن جاؤں؟"
شہریار نے نظر اٹھا کر دیکھا، پھر سرسرائے لہجے میں بولا۔ "کیا ہے جب وقت کوئی گانٹھ آ جائے تو کپڑا پھر بھی سِل لیا جاتا ہے۔ بظاہر وہ دیکھنے والی نظر کو اعلیٰ کوالٹی ہی کا لگتا ہے، مگر پاپا! آپ کو معلوم ہے ناں، وہ گانٹھ پھر بھی اندر رہتی ہے، چبھتی ہے اور ایک دن ڈھل ڈھل کر وہ کپڑا وہیں سے پھٹ جاتا ہے۔ قوتِ برداشت کی حد بھی ایسی ہی ہے اور اُس دن وہ حد تمام ہو گئی تھی۔"
"کیا میری پچھلی محبت کے عوض ایک غلطی معاف نہیں کر سکتے تم؟ حالانکہ میں نے تمہاری ہزاروں غلطیاں درگزر کی تھیں۔" پاپا نے نئے زاویے سے اُسے پکڑا اور وہ سر جھکا کر بہت بے بسی سے بولا۔
"میں آپ سے نفرت تو نہیں کرتا پاپا! پھر......"
"پھر یہ کہ تم مجھ سے محبت بھی تو نہیں کرتے، پہلے جیسی۔"
اُس نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ اُس کی کور میں نمی سی تھی۔
"کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم پہلے کی طرح کوئی غلطی کر کے آؤ اور سیدھے میری گود میں آ کر چھپ جاؤ۔ اور میں پہلے کی طرح تمہیں ساری دنیا سے چھپا لوں، تمہیں دوستی کے لئے کہیں باہر کچھ کھوجنا نہ پڑے۔"
"میں نے دوستی کا نصاب اپنی زندگی سے نکال دیا ہے پاپا! آپ جانتے ہیں۔" اُس نے پھر جان بچائی اور پاپا نے ایک نئے طرح سے اُس کو ٹریپ کر لیا۔
"اگر میں مر جاؤں تو کیا تب تم مجھے معاف کر دو گے؟"

"پاپا......" اُس نے بے قراری سے اُن کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "میں اپنی زندگی میں یہ دُکھ کبھی دیکھنا نہیں چاہتا۔" اُس نے عجیب سی ضد کی اور مسٹر عبدالرحمٰن نے اُس کو خود سے قریب کر کے کہا۔

"وقت بہت کم رہ گیا ہے شیری! تم جانتے ہو، میں جو گزار رہا ہوں، وہ صرف بونس ہے۔ پھر کیوں خفا رہتے ہو یار؟ دیکھو، ناراضگی کی کوئی حد نہیں، مصروفیت کی بھی کوئی حد نہیں، لیکن زندگی کی حد ہے، زندگی کو کسی نہ کسی لمحے ختم ہو جانا ہوتا ہے۔ پھر وہ لمحے، جو ہم ایک دوسرے سے مل بانٹ کر گزار سکتے ہیں، جو ایک دوسرے کی محبت میں جی سکتے ہیں، اسے ہم دائمی جدائی سے پہلے عارضی جدائی سے بڑھاتے کیوں چلے جاتے ہیں؟ زندگی مختصر، محبت مختصر، لیکن موت ایک طویل زندگی کا نام ہے شہریار! اس زندگی کو بغیر کسی محبت، کسی پیار، کسی یاد کے جانے والے دل کی خلش کے بغیر جینا بہت اذیت ناک ہوتا ہے، تم جانتے ہو۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا، اُٹھ کر مسٹر عبدالرحمٰن کے کھلے بازوؤں میں سماتا چلا گیا تھا۔ آخر کب تک تلخی، سرد مہری کا ڈھونگ کرتا رہتا؟ محبت اتنی دیر تک اُس کے دروازے پر کھڑی رہی تھی، یہ کیا کم تھا؟ سو اُس نے مسٹر عبدالرحمٰن کی بہت ماضی میں کی گئی غلطی کو اپنی طرح بشری کمزوری کا وجہ دے کر معاف کر دیا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ اب نارسائی لے کر جینے سے اُکتا گیا تھا۔ سو دوستی اور محبت کے کھلے بازوؤں کو اُس نے زندگی سے مانگ لیا تھا۔ مسٹر عبدالرحمٰن نے اُسے سینے سے ایسے بھینچ رکھا تھا، جیسے وہ برسوں بعد انہیں کھوئے ہوئے ملا تھا اور وہ خود اُن کے کندھوں سے آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیون کے کافی لانے پر وہ دونوں ایک جھٹکے سے الگ ہوئے تھے۔ شہریار نے پیون کی طرف سے پشت کر کے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے تھے اور مسٹر عبدالرحمٰن نے ہمیشہ کی سنجیدگی سے اس آمد کو اور کیا تھا۔ پیون کافی رکھ کر چلا گیا تھا اور مسٹر عبدالرحمٰن نے کافی بناتے ہوئے خوش دلی سے کہا تھا۔

"آج پورے چھ سال بعد کافی پی رہا ہوں شیری! تمہاری دوستی کے بعد میں نے کافی کو بھی زندگی سے نکال دیا تھا۔ یہ گرم بھاپ اُڑاتے کپ کے ساتھ تمہاری محبت مجھے بانٹ کرتی تھی، جو تم مجھ سے اُدھار کی طرح چھین چکے تھے۔"

"پاپا! ...... آئی ایم ساری......" وہ اُن کے ہاتھ کو چوم کر مدھم ہو کر بولا، پھر کافی کا کپ تھام کر اُس نے آخری گھونٹ حلق سے اُتارا اور حیرت سے وہ سوال کیا، جو وہ کمرے میں آتے ہی کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر اُن کی باتوں سے ٹریپ ہو کر کرنا بھول گیا تھا۔ اُس نے گلا کھنکھارا، پھر آہستگی سے بولا۔

"پاپا! آج کی میٹنگ کو تو آپ سپر وائز کرنے والے تھے ناں، پھر آپ میٹنگ میں گئے کیوں نہیں؟"

"بس، ویسے ہی۔ میرا دل کہہ رہا تھا تم آنے والے ہو، اس لئے۔"

"پلیز پاپا! اب بنائیے مت۔ سچ بتائیے، آپ میٹنگ میں کیوں نہیں گئے؟"
مسٹر عبدالرحمٰن نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا پھر آہستگی سے بولے۔ "کیا تم نے بتایا ہے مجھے کہ تم جو کل مصروفیت کا رونا رو کر اس میٹنگ میں شریک ہونے سے جان بچا رہے تھے تو اچانک دفتر میں کیوں نظر آ رہے ہو؟"
شہریار عبدالرحمٰن نے اُن کی طرف دیکھا، پھر یکدم ایک خیال تیزی سے ذہن کے پردے میں در آیا۔ اُس نے سوال کو سہولت سے کرنے کے لئے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اس کی آنکھیں حیرت سے ناکام لوٹ آئیں۔
"پاپا! یہاں دیوار کے وسط میں ایک تصویر ہوتی تھی۔ وہ کہاں گئی؟"
مسٹر عبدالرحمٰن کے جسم میں تناؤ اُبھرا، مگر انہوں نے چہرے کے تاثرات بدلے بغیر مدھم لہجے میں کہا۔ "بہت پرانی ہوگئی تھی وہ تصویر، اس لئے کری ایٹو ڈپارٹمنٹ سے کہا، اس تصویر کی جگہ کچھ اور لگنا چاہئے، تاکہ آنے والے مہمانوں پر اچھا اثر پڑے۔"
"مگر پاپا! آپ تو کہتے تھے، وہ دوستی کا ایک لمحہ ہے اور دوستی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔"
مسٹر عبدالرحمٰن گڑبڑا گئے۔ اُنہیں کیا معلوم تھا، وہ اُن کی باتیں اتنے غور سے سنتا ہے۔ نہ صرف سنتا ہے بلکہ یاد بھی رکھتا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش اُسے دیکھتے رہے، پھر آہستگی سے بولے۔ "شہریار تم بھی ناں، کیا پرانی باتیں لے بیٹھے ہو۔ بیٹا! انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ زندگی میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوتی رہیں، تبھی زندگی کا احساس زندہ رہتا ہے۔ وگرنہ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔"
شہریار اس بار کچھ نہیں بولا تھا، بس اُنہیں دیکھے جا رہا تھا۔ پاپا اُس کے خاموش سوال سے گھبرائے جا رہے تھے کہ جانے اب وہ اس خاموشی سے کیا صدا بلند کرے کہ اچانک اُس نے اپنی بات پھر سے عبدالرحمٰن صاحب کی طرف موڑ دی۔ "جہاں تک میرا خیال ہے، آپ نے بیگم عافیہ سے ابھی تک کوئی ملاقات نہیں کی ہے۔"
مسٹر عبدالرحمٰن نے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کی اور وہ اُن کی فائل پر ہاتھ رکھ کر جھکا ہوا اُن سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ بیگم عافیہ سے جان کر ملنا نہیں چاہتے۔ کیا وہ بھی آپ کو جانتی ہیں، یا یہ پہچان کا

سر آپ کے ہاتھ ہی میں ہے؟'' مسٹر عبدالرحمٰن کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور شہریار سے یہ کیسے چھپ سکتا تھا۔
''پاپا! بتائیے، آپ بیگم عافیہ کو جانتے ہیں؟''
مسٹر عبدالرحمٰن نے نفی میں سر ہلایا، مگر جھوٹ چور بنا اُن کی آنکھوں میں بیٹھا تھا۔
''تو آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ بیگم عافیہ سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ پاپا! آپ یہ بھی جانتے ہیں، ارسلان راشدی کا آپ کی زندگی میں کیا رول ہے۔ لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے۔''
''شہریار پلیز! بھول جاؤ یہ سب۔'' انتہائی بے بسی سے انہوں نے اُسے دیکھا اور وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔
''اچھے دوست ہیں آپ، اچھی دوستی ہے آپ کی، بھروسہ نہیں کرتے نا مجھ پر؟...... دیکھئے پاپا! میں صرف ایک سوال لے کر آیا تھا، مگر آپ نے میرے پاس سوالوں کا ٹیسٹ پیپر کھول دیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں، میں سوالوں کے جواب پانے کے لئے کسی بھی حد سے گزر سکتا ہوں۔''
مسٹر عبدالرحمٰن اُسے بے بسی سے دیکھتے رہے، مگر کچھ نہیں بولے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی اور طریقے سے اُنہیں اپنی ڈھب پر لاتا، دروازے پر دستک ہوئی۔
شہریار نے دروازہ کھولا تو سالار عبدالرحمٰن نے اُس کی شکل دیکھ کر بہت برا سا منہ بنایا، پھر اندر آ کر دھیمے لہجے میں بولے۔ ''پاپا! بیگم عافیہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''
مسٹر عبدالرحمٰن نے سراسیمگی سے سالار عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا، پھر بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''سوری سالار! تم خود انہیں Manage کر لو۔ میں آج بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کسی کو بھی اٹینڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''
سالار عبدالرحمٰن سر ہلا کر باہر چلے گئے اور شہریار انہیں توجہ سے دیکھنے لگا۔ پھر جو جملہ اُس نے کہا، مسٹر عبدالرحمٰن، جو پشت کئے کھڑے تھے، چونک کر پلٹے تھے۔
''کیا کہا تھا تم نے ابھی؟'' اُن کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ اور وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔
''میں نے کہا تھا، بیگم عافیہ کسی زمانے میں آپ کی دوست تو نہیں رہ چکی ہیں کہیں؟ آپ کو کسی جھوٹے اور ادھورے وعدے کی شرمندگی تو نہیں ہے، جو آپ کو اُن سے ملنے سے روک رہی ہے؟ کیونکہ خود بیگم عافیہ بھی اتنی ہی شدت رکھتی ہیں آپ سے ملنے میں، جتنی شدت سے میں آپ سے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔''

"شہریار، پلیز! تم جاسکتے ہو۔ میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔" مسٹر عبدالرحمٰن نے غصے سے کہا اور وہ کچھ کہے بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔

پھر سیڑھیاں اتر رہا تھا، تب جازی عبدالرحمٰن اور سالار عبدالرحمٰن میٹنگ میں اُٹھائے جانے والے پوائنٹس ڈسکس کرتے ہوئے آگے چلتے نظر آئے۔ شہریار اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور بہت خوش تھا کہ جازی عبدالرحمٰن اُس کے خیال کے مطابق بالکل ٹھیک عمر میں فیلڈ میں آگیا تھا۔ خود اُس نے بھی تو اسی عمر سے جدوجہد شروع کی تھی۔ وہ مطمئن چل رہا تھا، جب اچانک جازی نے مڑکر اُسے دیکھا اور حیران ہوکر بولا۔

"آپ دفتر میں؟...... فرصت مل گئی تھی کیا آپ کو؟"

"ظاہر ہے...... بغیر فرصت کے میں یہاں کیسے نظر آسکتا ہوں؟" اُس نے بھی مطمئن انداز میں جواب دے کر ناکسی اسٹریس کے کہا۔ جازی کا منہ بگڑ گیا۔ کیونکہ سالار عبدالرحمٰن کے ساتھ رہ کر وہ خود بھی اُن کی ہی طرح اذیت پرست ہوگیا تھا۔ سامنے صرف ایک نام تھا، شہریار عبدالرحمٰن...... اور بس اُس کا دل کرتا تھا، وہ اپنے ہر آنسو کا حساب اُس سے لے جو اُس نے محض اُس کی محبت میں بہایا تھا۔

شہریار اُس کے دل سے خوب واقف تھا، سو اُسے طرح دیتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ آج اُس کا رُخ غیر متوقع کافی اِن کی طرف تھا۔ کوئی وجہ نہیں تھی، لیکن بس دل چاہتا تھا، پھر سے کسی یاد کو بلائے، کسی خواب کو پکارے۔ اُس نے کافی اِن میں قدم رکھا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

یہ کیونکر ممکن تھا......؟ وہ سوچتے ہوئے سناٹے میں کھڑا رہ گیا تھا۔



"مجھے سمجھ نہیں آتی اماں! آپ آخر شہریار کو کس بات کا مارجن دے رہی ہیں؟ آخر آپ کیسے بھول سکتی ہیں وہ ساری شرمندگی اور تکلیف، جو اس گھر نے اس لڑکے کی وجہ سے اُٹھائی ہے۔"

حشمت خانم نے بیٹی کو دیکھا، پھر بیڈ پر بیٹی کے لئے جگہ بناتے ہوئے بولیں۔ "پہلے میرا بھی یہی خیال تھا، عالیہ! کہ شہریار عبدالرحمٰن سے شاید ہی میں کبھی نرمی سے بات کرسکوں، مگر اب سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے، ہمیں اسے سمجھنے کا کچھ مارجن دینا ہی چاہئے۔ تمہیں یہ نہیں لگتا عالیہ! کہ ہم اپنے بچوں کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کردیا کرتے ہیں، مگر اس کا معمول سے ہٹ کر کیا گیا ذرا سا کام ہمیں کھولا کر رکھ دیتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے، اس نے ہر حد پار کرلی ہے اور اب اس کے لئے کوئی تادیبی کارروائی نہ کی گئی تو ساری دنیا کا نظام تلپٹ ہوکر رہ جائے گا۔"

بیگم عبدالرحمٰن تحیر سے ماں کو دیکھنے لگی تھیں۔ اتنی بڑی تبدیلی شخصیت میں...... حالانکہ اُن کی پرسنالٹی اتنی مضبوط تھی کہ کبھی کبھی وہ بیٹی ہونے کے باوجود اُن کی سخت گوئی سے نہیں بچ پاتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا، اُن کی شخصیت میں وقت اور حالات کی سختی نے جو کچھ بدل دیا ہے، وہ شاید ہی کوئی دوسرا رخ اختیار کر سکے۔ مگر یہاں وہ اپنے پہلے رویے سے بالکل مختلف کھڑی تھیں۔ بیگم عبدالرحمٰن کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ انہوں نے پھر سے سلسلۂ کلام جوڑا تھا۔

"عبدالرحمٰن نے جو غلطی کی، اب یہ بھی نہیں معلوم یہ غلطی تھی یا ترحم...... تو سوچو عالیہ! اس میں شہریار کا کیا قصور تھا؟ وہ تو ایک گندھی ہوئی مٹی کی طرح تمہاری گود میں لا ڈالا گیا تھا۔ اُس نے تمہاری مجبوری ہی میں سہی، تمہارا دودھ پیا ہے، تمہاری گود کی گرمی لی ہے، پھر بھی تمہیں اُس سے محبت نہ سہی، کیا کبھی اُنس بھی محسوس نہیں ہوا؟"

بیگم عبدالرحمٰن چپ میں ڈوبی ہوئی واقعی اندر اتر گئیں۔

محبت...... شاید انہوں نے تو اُس سے کبھی اُنس بھی نہیں کیا۔ انہوں نے شہریار کو Pet کی حیثیت بھی نہیں دی تھی کبھی۔ وہ بری سے بری حالت میں بھی اُن کے دل کا کواڑ کھٹکھٹانے میں ناکام رہا تھا۔

کیا واقعی، وہ ماں تھیں......؟

کیا واقعی، وہ عورت تھیں......؟

وہ عورت جس میں ممتا ہر جز سے زیادہ ڈالی مالک نے......

کیا واقعی اُس نے اُن کے دل کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا......؟

دل نے کہا بار بار، ہا بار ہا اُن کے اندر ہلچل مچی، بار ہا دل نے تھام کر اُسے باقی اولاد کی طرح سینے سے لگانے کی ہوک بھری، مگر فطری انا، ضد اور اُس کی ذات کے ساتھ منسلک سوال نے اُن کے قدم روک دیئے۔ انہیں اُس تک جانے والے ہر راستے میں خار ہی خار دکھائی دیتے تھے...... اس طرح کہ وہ بھی خار بن کر اُن کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

انہوں نے گہرا سانس لیا اور پھر سے حشمت خانم کو دیکھنے لگی تھیں۔

"تم نے محاسبہ کیا، غلطی کہاں ہے، معلوم ہوا؟"

انہوں نے آہستگی سے سر ہلایا پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "تلخی ہماری طرف سے تھی۔ اور بگڑاؤ اور نافرمانی اُس کی طرف سے تھی، اماں!"

"تم اب بھی غلط انداز لگا رہی ہو۔ کیا واقعی تمہیں لگتا ہے، وہ نافرمان اور بدتمیز بچہ ہے؟ کیا اُس نے کبھی تمہاری کسی بھی تخت بات پر پلٹ کر سالار کی طرح جواب دیا ہے؟"

ماما نے سر جھکا لیا۔ "شاید نہیں......... لیکن مجھے اُس کے وجود سے یہ احساس بھی نہیں ہوا ہے کہ میں اُس کے لئے ضروری ہوں۔"

بیگم حشمت مسکرانے لگیں۔ پھر آہستگی سے بولیں۔ "پہلے مجھے بھی یہی لگتا تھا......... تمہاری طرح وہ مجھے جواب دینے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس لئے میرے اندر اُس کے لئے تم سے زیادہ غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی۔ مگر جب میں ہسپتال گئی تو مجھے لگا، وہ تمام چڑ کے باوجود مجھے اہمیت دیتا ہے۔ عالیہ! اس لئے مجھے لگتا ہے، ہمیں اُسے سمجھنے کا ایک اور موقع لینا چاہئے۔ ہوسکتا ہے، اُس کے اور ہمارے درمیان کی یہ تلخی ختم ہو جائے۔"

عالیہ بیگم نے اُن کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولیں۔ "آخر آپ کی بیماری میں ایسا کیا راز چھپا ہے، جو آپ میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے اُس کی طرف سے۔"

حشمت خانم نے آنکھیں بند کر لیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ "جس وقت مجھے استھما کا اٹیک ہوا، میرے اندر سانس لینے کی خواہش نے مہمیز لگائی۔ مگر سینے کے اندر گھٹن بڑھتی گئی۔ میں نے اپنی درازیں، اپنا وینٹی بیگ، ہر جگہ انہیلر ڈھونڈا، مگر سب جگہ انہیلر کی دوا ختم ہو چکی تھی۔ اُس لمحے مجھے لگا تھا، بس زندگی کی کتاب کا نصاب ختم ہونے والا ہے کہ بہت اچانک طبی امداد دی جانے لگی۔ میں ہسپتال میں جب پہلی بار ٹھیک طرح سے ہوش میں آئی اور اُس نے مجھے عائشہ کے موبائل پر فون کر کے جب کہا۔ "سوری نانو! مجھے بیمار نہیں پڑنا چاہئے تھا۔" تب وہ بات بہت واضح ہو کر میرے سامنے آ گئی، جو بہت دیر سے مجھے اُلجھن میں ڈال رہی تھی کہ میرے انہیلر کا خیال نہ میں رکھتی ہوں، نہ تم۔ تو آخر کون ہے جو اس بے کار کے مشغلے پر توجہ انویسٹ کرتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے عالیہ! اس بے کار کام کو ذمہ داری کی طرح شہریار نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ ایک بار میں نے اُسے اپنے وینٹی بیگ میں گھستے دیکھا بھی تھا، مگر اس وقت تلخی کی ایسی پٹی بندھی تھی کہ میں سمجھی، وہ اور بہت سی برائیوں کی طرح شاید رقم اُڑانے کے لئے اچھے برے کسی بھی راستے کو اپنانے میں یقین رکھتا ہے۔ یونیورسٹی میں وہ پیسہ پانی کی طرح بہاتا بھی تو ایسے ہی تھا۔ سو میرے اندر یہ خیال لازمی پیدا ہوا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ سے چھین کر میں نے وینٹی بیگ دیکھا تو ہر چیز جگہ پر تھی۔ میں نے سوچا، میرے وقت پر پہنچنے سے وہ اپنی کارروائی میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنے سالوں بعد میں نے اُس دن جانا، وہ میرے لئے کتنی اپنائیت سے سوچتا تھا......... آپ سانس لینا چاہیں اور سانس سینے میں اٹکنے لگے تو آپ کو لگتا ہے، ساری ناراضگیاں، ساری باتیں صرف اس سانس کے آنے اور جانے سے منسلک ہیں۔ مرنے کے بعد ہر تلخی، ہر

نفرت، ہر شکایت اپنے آپ مرجاتی ہے...... میں نے سوچا، میں بھی مرگئی اگر اس لمحے تو میرے پاس کیا ہوگا، جو لے کر جاؤں گی؟ کیا کوئی بھی بچہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے......؟ جواب آیا، صرف تختی سے وہ مجھ سے منسلک ہیں۔ میرے جانے پر وہ آزادی اور خوشی محسوس کریں گے۔ تب میں نے سوچا، اگر زندہ رہ گئی تو زندگی کو ایک نئے طریقے سے جینے کی کوشش کروں گی۔ سو، بس یہی سوچ ہے، جو تمہیں مجھ میں حلاوت محسوس ہوتی ہے۔"

وہ کچھ لمحے کو رُکیں، پھر بولیں۔

"بہت مشکلات اُٹھا کر تمہیں پالا تھا، عالیہ! باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو اولاد ماں کے لئے دوہری ذمہ داری کی طرح کندھوں پر آن پڑتی ہے۔ سو میں نے تمہیں ماں کی طرح دیکھا، باپ کی طرح تمہاری نگہداشت کی، تم پر نظر رکھی۔ شاید تمہیں بھی مجھ سے انہی باتوں پر گلہ ہو۔ اور غلط نہیں ہوگا یہ گلہ، ایک بیٹی کی طرح تم جو مجھ سے نرمی کی توقع رکھتی تھیں، میں نے اس سے صرفِ نظر کیا۔ مگر عالیہ! یہ سب تمہاری بہترین تربیت کے خیال سے کیا تھا۔ پھر جب تمہاری شادی کی تو مجھے لگا، تمہاری اولاد کی ذمہ داری ایک بار پھر سے آدھی آدھی مجھ میں بٹ گئی ہے۔ یوں میں تمہارے بچوں کو اسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے پوری ذمہ داری سے تمہیں پالا تھا۔ مگر بچوں کو بھی مجھ سے تمہاری ہی طرح کی شکایتیں تھیں، جنہیں میں چاہتی ہوں کہ زمِ طبعی سے اب دُور کردوں۔"

بیگم عالیہ نے حشمت خانم کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ وہ اس لمحے کمزور جذباتی نہج پر کھڑی تھیں، اس لئے حشمت خانم نے کہا۔

"جو سبق زندگی سے میں نے سیکھا ہے عالیہ! میں چاہتی ہوں، تم تجربے کئے بغیر میرے تجربے ہی سے سیکھ لو۔ بچوں کو توجہ دو۔ اور شہریار، اُسے خاص طریقے سے، بالکل نیوٹرل ہو کر دیکھو، ہو سکے تو یہ بالکل بھول ہی جاؤ کہ وہ تمہاری اولاد نہیں ہے، اُسے وقت نے تمہیں کن حالات میں سونپا تھا۔ اُسے صرف سالار اور جازی کی طرح اپنی اولاد سمجھو۔ عالیہ! مجھے معلوم ہے، تم ایسی ہی ہو کہ بہت کم اپنی رائے بدلتی ہو، لچک نہیں ہے تمہارے اندر۔ مگر کوشش کرو، لچک لاؤ۔ یہی زندگی ہے۔"

بیگم عالیہ نے سمجھنے کی کوشش کی اور حشمت خانم کے لئے سُوپ لینے کے لئے اُٹھ گئیں۔ حشمت خانم نے آہستگی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اُنہوں نے کوشش کی تھی، زندگی کی غلطی کو دُور کرنے کی اور غلطی کا احساس اور اُسے دُور کرنے کا ہنر صرف اُسے ہی بخشا جاتا ہے، جس کے ساتھ قدرت محبت اختیار کرتی ہے۔



شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے
روح و جاں میں بستی ہے
شہرِ دل کی گلیوں میں
تاکِ شب کی بیلوں پہ
شبنمیں شگوفوں کی
بے شمار لوگوں نے
یادگار چھوڑی ہے
اتنی بات تھوڑی ہے؟
صد ہزار باتیں تھیں

حیلہ و شکیبائی
صورتوں کی زیبائی
قامتوں کی رعنائی
ان سیاہ راتوں میں
ایک بھی نہ یاد آئی
جا بجا بھٹکتے ہیں
کس کی راہ تکتے ہیں
چاند کے تمنائی!
یہ نگر کبھی پہلے
اس قدر نہ ویراں تھا
کہنے والے کہتے ہیں
قریہ نگاراں تھا
خیر اپنے جینے کا
یہ بھی ایک ساماں تھا
آج دل میں ویرانی

ابر بن کے گھر آئی
آج دل کو کیا کہیے
باوفا نہ ہرجائی
پھر بھی لوگ دیوانے
آ گئے ہیں سمجھانے
اپنی وحشتِ دل کے
بن لئے ہیں افسانے
خوش خیال دنیا نے

وہ پڑھتے پڑھتے رک گئی تھی۔ کیونکہ اسی وقت ڈرائنگ روم میں اُس کی دیکھ بھال کرنے والی نرس داخل ہوئی تھی۔

''ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟''

ثانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ آج وہ پہلی بار اُسے دیکھ رہی تھی۔ تین دن سے مسلسل وہ آنے کا عندیہ دیتی مگر کسی نہ کسی مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں پا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زرش نے اُس کے لئے عارضی طور پر میڈ کا انتظام کیا تھا اور آج وہ غیر متوقع آ گئی تھی تو اُس کا چونکنا لازمی تھا۔

''تم.....!'' اُس نے تعارف کے لئے خالی جگہ چھوڑی اور آنے والی تعارف دینے لگی۔

''میں شافعہ ہوں میم! آج سے میں آپ کو لک آفٹر کروں گی۔''

''کیا آپ نے یہاں آنے سے پہلے مس زرش سے بات کر لی تھی؟'' اُس نے زرش کی ان تین دن میں ان باتوں کو یاد کر کے اپنے اندر دہراتے شافعہ کو مخاطب کیا، جس کا ماخذ یہی تھا کہ وہ نرس شافعہ سے

بہت بدل ہے۔
"جی میم! میں نے آنے سے پہلے میم زرش سے فون پر بات کرلی تھی۔انہوں نے کافی سخت لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا تھا، لیکن میری پرابلم سمجھ کر انہوں نے خفگی ختم کرکے مجھے آپ کے فلیٹ آنے کا این او سی جاری کردیا۔"
"اوکے۔یہ رہا میری دواؤں کا چارٹ اور ٹائم ٹیبل۔یہ ڈاکٹر کے کنسلٹ کی ٹائمنگ۔یہ غذا کا مینوئل۔آپ کو اسی روشنی میں مجھے لک آفٹر کرنا پڑے گا۔"
شافعہ چارٹ لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔پھر پانچ منٹ بعد اُس نے سر اُٹھا کر کہا تھا۔"میم! میں نے سارا چارٹ ازبر کرلیا ہے۔لیکن ایک بات کہنا چاہوں گی آپ کے چارٹ میں ایک چیز مسنگ ہے۔"
"کون سی چیز مس شافعہ؟" ثانیہ نے جانے مانے ڈاکٹر کے چارٹ میں خامی نکالنے پراُسے پوری توجہ سے دیکھا اور اُس نے آہستگی سے کہا۔
"میم! میں جس ہسپتال سے وابستہ ہوں، وہاں دوا کے ساتھ ماحول پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ہمارے سرڈاکٹر صمدانی کہتے ہیں، انسان بیماری میں صرف دوا لینے سے اتنا ٹھیک نہیں ہوسکتا، جتنا وہ ماحول کی تبدیلی سے، کونسلنگ سے بہتر امپروومنٹ محسوس کرتا ہے۔سو میم! آپ کے چارٹ میں مجھے کہیں بھی کونسلنگ، کنسلٹیشن دکھائی دیتی ہے، نہ کہیں باہر ماحول کی تبدیلی کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔حالانکہ آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے ایک بہت خوب صورت پارک موجود ہے۔"
ثانیہ نے اُسے دیکھا اور پہلی بار خود کو اطلاع دی۔اُس کے فلیٹ کے باہر ایک خوب صورت پارک موجود ہے۔
"کیا آپ چاہیں گی کہ میں آپ کو شام کو پارک میں گھمانے لے جاؤں؟" شافعہ نے پوچھا۔
"کیا آپ کے لئے یہ روز ممکن ہوگا؟" اُس نے سوال کیا اور شافعہ نے سر ہلا کر کہا۔
"میرے لئے یہ خوشی کی بات ہوگی میم! کہ میں آپ کو اس گھٹن کے ماحول سے باہر لے جا کر کچھ خوشی دے سکوں۔"
ثانیہ نے اُس کی طرف دیکھا اور کپکپاتے ہاتھ سے اُس کے ہاتھ کو چھو کر پوچھا۔"کیا ساری نرسز ایسی ہی ہوتی ہیں شافعہ! جیسی آپ ہیں، ہمدرد و ترحم سے بھری ہوئی۔"
شافعہ نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مدھم کہا۔"کیوں نہیں میم! یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔"

ثانیہ نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مگر مجھے نہیں لگتا، یہ لمس کسی ڈیوٹی کا حصہ ہے۔ تمہارے چھونے میں ایک نرمی ہے، حلاوت ہے۔ یوں لگتا ہے، محبت تمہاری ہمرکاب رہتی ہے۔''

شافعہ کے ہونٹوں کو مسکان نے چھوا اور آنکھوں میں عارف جواد کا چہرہ جھلملانے لگا۔

''خوابوں سے تمہاری دوستی نئی لگتی ہے، شاید اسی لئے تمہاری آنکھوں کو خواب چھپانے نہیں آتے۔''

''میم! آپ...... آپ کیسی شاعرانہ باتیں کیا کرتی ہیں۔ کیا آپ شروع سے اتنی ہی شاعرانہ گفتگو کرتی ہیں؟''

ثانیہ نے نفی میں سر ہلایا، پھر کہا۔ ''یہ لمس میرے لئے بہت پرانا نہیں ہے۔ لیکن ہاں، اب مجھے لگتا ہے، محبت پالینا کیا ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے میم؟ محبت پالینا کیا ہوتا ہے؟'' شافعہ تازہ تازہ نہانے کی وجہ سے اُس کے اُلجھے بالوں میں صوفے پر رکھے برش سے مہارت دکھانے لگی۔ ثانیہ نے نرمی سے کہا۔

''تمہارے بال سلجھانے میں بڑی نرمی ہے۔ یوں لگتا ہے، میری ماں کے ہاتھوں کی دعا تمہارے ہاتھوں کو لگ گئی ہے۔''

شافعہ نے اُسے کہنے دیا۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی، اُس کی باتوں میں ربط نہیں تھا۔ مگر چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اُس کی ذات جھلک رہی تھی۔ اور یہی اُس کے لئے ضروری تھا کہ وہ جو کہنا چاہتی ہے، کہتی رہے تا کہ اندر رُکی ہوئی باتیں دل کی بھڑاس نکالتی رہیں اور اندر کا حبس کم ہو جاتا۔

''میم! میں نے سنا ہے، آپ کسی زمانے میں بہت مشہور ماڈل ہوا کرتی تھیں۔''

ثانیہ کے چہرے پر ایک سیکنڈ میں ہلدی گھل گئی۔ یوں لگا، یہ سوال نہیں، موت کا بلیک وارنٹ تھا۔

''پانی...... ایک گلاس پانی دو۔'' تڑختے گلے سے اُس نے پکارا تھا۔ شافعہ نے گھبرا کر جگ میں سے پانی انڈیل کر اُس کی طرف ترحم سے دیکھا، پھر تاسف سے بولی۔

''آئی ایم سوری میم! شاید مجھے آپ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے۔''

ثانیہ نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولی۔ ''شافعہ! سوال تمہارا تلخ نہیں تھا۔ بس جواب کی تلخی تھی، جس نے سانس لینے کی ہمت بھی چرالی تھی۔''

شافعہ نے اُس کے بال بنا کر کیچر سے باندھ دیئے تھے۔ وہ صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھی تھی۔ یوں، جیسے کوئی بہت تھکا ہارا مسافر کسی سفر سے لوٹا ہو یا لوٹنے کی حسرت میں ایک نئے سفر کے لئے دھکیل دیا گیا ہو۔

”تم نے ابھی کیا پوچھا تھا، مجھ سے شافعہ؟“ اُس نے یوں کہا، جیسے پہلے کی کہی بات اب کہیں جا کر اُس کے اندر اتری تھی۔

”میں نے کہا تھا، میم! آپ کسی زمانے میں بہت مشہور ماڈل تھیں ناں؟“

ثانیہ نے اُسے دیکھا، پھر آہ بھر کر بولی۔ ”تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے شافعہ؟“

”جی میم! مجھے شاعری سے بہت گہرا رابطہ ہے۔“

ثانیہ کھوکھلی سی ہنسی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ”دل کی بات کرنے والوں کو دل کی باتیں کرنے کے لئے شاعری کا ساتھ چاہئے، محبت کا ہاتھ چاہئے۔ اور محبت کا ہاتھ یہ جذبوں سے مہکتے لفظ ہی تو ہیں، جو بھلے شاعر نے پوری سچائی سے نہ کہے ہوں، مگر دل والوں پر یہ واردات بہت گہری ہو کر گزرتی ہے۔“

”میم! مجھے لگتا ہے، آپ کہیں لکھتی بھی رہی ہیں۔“

”نہیں، مجھے لفظوں سے چڑ تھی۔ مگر مجھے لگتا ہے، تمہیں لکھنے سے کچھ شغف ہے شاید۔“

شافعہ مسکرانے لگی، پھر شگفتگی سے بولی۔ ”میں تو صرف نرس تھی میم! مگر عارف کہتے تھے تم میں آرٹیکل لکھنے کا بہت اسٹف موجود ہے۔ اس لئے دو سال سے معاشرتی برائیوں پر لکھ رہی ہوں۔ تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتی ہوں۔ لیکن یہ دوسروں کے لئے نہیں، صرف عارف کے لئے کرتی ہوں۔ ہاں، مگر ابھی سنائی اُسے بھی نہیں ہے۔“

”کیوں؟...... جس کے لئے لکھتی ہو، اُسے ہی کیوں نہیں سناتی ہو؟ کس بات کا انتظار کرتی ہو؟“

عافیہ مسکرا کر اُسے دیکھنے لگی، پھر جذب سے بولی۔ ”میم! محبت کی شاعری سے لگاؤ ہے تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، محبت میں چپ رہ کر دل میں اُترنے کی ضد کتنی ہٹیلی ہوتی ہے۔ محبت خوشبو ہے۔ اگرچہ یہ محسوس ہونے کی چیز ہے میم! اور میں اسی لئے جو لکھتی ہوں، وہ چاہتی ہوں میری آنکھوں میں خود بخود در آئے۔ بقول فراز۔

سامنے تو ہو تو ہزاروں خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں
کاش اب کے میری آنکھوں میں میرا دل نہ رہے

”مگر شافعہ! اس میں تو آنکھوں میں دل نہ آ بیٹھنے کی تمنا اُمڈ رہی ہے۔ اور تم کہتی ہو تمہارا دل تمہاری آنکھوں میں در آئے، خود کچھ کہہ دے تو کہہ دے تم منہ سے کچھ نہیں کہو گی۔“

شافعہ مسکراتی رہی، کچھ نہیں بولی۔ پھر کافی دیر بعد آہستگی سے بولی۔ ”میم! آپ نے محبت کی ہے تو آپ جانتی ہی ہوں گی، یہ جو کہہ رہی ہوتی ہے، اس کا مطلب وہ نہیں ہوتا۔ محبت کبھی کبھی بڑی سیاسی ہو جاتی ہے، کہتی کچھ ہے، کرتی کچھ ہے۔ اور دل کے اندر رکھ اور پالتی رہتی ہے۔ اسے حاضر میں غائب اور غائب میں حاضر کو ڈھونڈنے کی ایسی لت ہے کہ جب یہ کہتی ہے، کاش میرا دل میری آنکھوں میں نہ آ بیٹھے تو در حقیقت یہ کہنا چاہتی ہے کہ محبت میں پوری محبت، پورا دل سمٹ آئے تاکہ لفظوں کا سہارا ہی نہیں لینا پڑے۔“

ثانیہ اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور شافعہ ٹائم دیکھ کر کچن میں رکھا اُس کا سوپ گرم کرنے چل دی۔ واپس لوٹی تو بولی۔ ”میم! آپ کو شاعری سے کتنا لگاؤ ہے؟“

”پہلے نہیں تھا، مگر اب بہت زیادہ ہے۔ جب ماڈلنگ کرتی تھی تو لگتا تھا، آسمان چھونے کے لئے میرے ہاتھ کی کمند بہت ہے۔ اس وقت لفظ جھوٹے ہو کر ملتے تھے، اس لئے بھی انہوں نے متوجہ نہیں کیا، مگر جب میری زندگی میں علی آیا تو مجھے لگا لفظ اپنے ہمراہ دعا کی طرح ہونے چاہئیں۔ بہت سارے لفظ، جس سے دل کی واردات کہنا آسان ہو جاتا۔ مگر جب یہ لفظ کہنے سیکھے تو 'محبت گمشدہ میری' جیسی کیفیت نے چوس لیا مجھے۔ آپ کسی سے محبت کریں، ساری دنیا چھوڑ کر صرف اُس سے، اور وہ کہہ دے آپ سے محبت نہیں تھی تو کیا کیفیت ہو سکتی ہے شافعہ! تم جانتی ہو گی۔“

شافعہ نے اُس کا درد دل میں محسوس کیا، پھر چمچ سے اُسے سوپ پلاتے ہوئے بہلانے کو بولی۔ ”میم! آپ اگر کچھ سنائیں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔“

”شاعری...... پتہ نہیں کچھ یاد بھی ہے مجھے، یا شاید یاد نہیں ہے۔“ وہ گومگو کی کیفیت میں پہلے کی طرح اٹک گئی۔ پھر گہرا سانس لے کر گنگناتے ہوئے بولی۔

”تو چل اے موسم گریہ، پھر اب کی بار بھی ہم ہی
تری اُنگلی پکڑتے ہیں، تجھے گھر لے کے چلتے ہیں
وہاں ہر چیز ویسی ہے، کوئی منظر نہیں بدلا
تیرا کمرہ بھی ویسے ہی پڑا ہے، جس طرح تو نے
اُسے دیکھا تھا، چھوڑا تھا

تیرے بستر کے پہلو میں رکھی اُس میز پر اب بھی
دھرا ہے مگ وہ کافی کا
کہ جس کے خشک اور ٹوٹے کناروں پر
ابھی تک وسوسوں اور خواہشوں کی جھاگ کے دھبے نمایاں ہیں
قلم ہے، جس کی نب پر رت جگوں کی روشنائی یوں لرزتی ہے
کہ جیسے سوکھتے ہونٹوں پہ پپڑی جمنے لگتی ہے
وہ کاغذ ہیں
جو بے روئے ہوئے کچھ آنسوؤں سے بھیگتے رہتے ہیں
تیرے چپل بھی رکھے ہیں
کہ جن کے بے ثمر تلووں سے وہ سب خواب لپٹے ہیں
جو اتنا روندے جانے پر بھی، اب تک سانس لیتے ہیں
ترے کپڑے
جو غم کی بارشوں میں ڈھل کے آئے تھے
مری الماریوں کے ہینگروں میں، اب بھی لٹکے ہیں
دلاسوں کا وہ گیلا تولیہ

اور بچیوں کا ادھ گھلا صابن
چمکتے واش بیسن میں پڑے ہیں
دریچے کی طرف دیوار پہ لٹکی گھڑی
اب بھی ہمیشہ کی طرح
آدھا منٹ پیچھے ہوئی رہتی ہے
کیلنڈر پہ رُکی تاریخ نے، پلکیں نہیں جھپکیں
مگر اے موسمِ گریہ!
اسی ساعت
نجانے کس طرح سے تُو چلا آیا
ہمارے بیچ سے گزرا
ہمارے بیچ سے تُو اس طرح گزرا
کہ جیسے دو مخالف راستوں کو کاٹتی سرحد
کہ جس کے ہر طرف بس دُوریوں کی گرد اُڑتی ہے
اسی اِک گرد کی تہ سی
تجھے دروازے کی بیل پر بھی شاید نظر آئے

کوئی تصویر کے اندر کمی شاید نظر آئے
تمنا سے بھری آنکھیں، جو ہر وقت مسکراتی تھیں
اب ان آنکھوں کے کونوں میں، نمی شاید نظر آئے"

شافعہ نے دیکھا، گنگناہٹ میں نمی گھل گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ جانے کب کے رکے ہوئے آنسوؤں کا قرض تھا ذات پر۔ شافعہ نے سوپ کا پیالہ رکھ دیا تھا اور اُسے رونے دیا تھا۔ ثانیہ نے خود ہی رو کر خود ہی آنسو پونچھ لئے تھے۔ شاید یہی اُس کا معمول تھا۔ کافی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے شافعہ! پلیز ٹی وی ریموٹ دینا۔"

شافعہ نے تھوڑی سی بحث کی تھی، تب کہیں اُس نے آدھا پیالہ سوپ پی لیا تھا۔ شافعہ نے ریموٹ اُس کی طرف بڑھا کر خود اُس کے قدموں میں کشن پر بیٹھ کر خود بھی ٹی وی پر نظریں جما دی تھیں۔ فیشن اینڈ اسٹائل کے سمر کلیکشن کی تیاریوں پر مشتمل ریڈ کارپٹ پروگرام چل رہا تھا۔ یکدم چلتے چلتے کیمرہ ایک چہرے پر آکر رکا تو ثانیہ نے مسکرا کر ایک بے بی پنک کلر کا لباس پہنے ہوئے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ زرش ہے، میری بہن۔ مسٹر عبدالرحمٰن کی اسٹائل وژن نے اس سال کے لئے اپنی سمر کلیکشن کے لئے اسے کمپین لیڈر کے لئے چنا ہے۔ اس کے چلنے میں کتنا سبھاؤ ہے۔ یہ قدم اُٹھا رہی ہے تو لگتا ہے زمین کے بجائے آسمان پر قدم رکھ رہی ہو، ہواؤں پر چل رہی ہو......" لمحے بھر کو رکی، پھر اپنے پیروں کو دیکھ کر بولی "پہلے میں بھی ایسے ہی چلتی تھی۔ لوگ کہتے تھے، ثانیہ ماڈلنگ ریمپ پر ایسے چلتی ہے، جیسے ہوا ہو یا ہوا پر حکمران ہو۔ مگر اب......"

وہ یکدم مایوسی میں لپٹ گئی تھی۔ ادھورے جملے میں وہ پوری خلش کی طرح اٹک گئی تھی۔ اُس نے ریموٹ پھینک دیا تھا اور ٹی وی کی طرف سے پشت موڑ لی تھی۔ شافعہ نے ٹی وی آف کر دیا تھا اور ثانیہ نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"پلیز، مجھے میرے کمرے تک لے جاؤ۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔ تم بھی چاہو تو کچھ دیر آرام کر سکتی ہو۔"

شافعہ نے اُسے سہارا دے کر وہیل چیئر پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے اُس کے کمرے میں لے جانے لگی۔ اُس کے سائیڈ ٹیبل پر ایک تصویر اوندھی پڑی تھی۔

''کیا یہ علی کی تصویر تھی؟'' شافعہ نے صرف سوچا مگر پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔ پہلے دن کے حساب سے وہ پہلے ہی بہت زیادہ دخیل ہونے کی جسارت کر چکی تھی، اب اگر کسی بات پر وہ تھے سے ہی اُکھڑ جاتی تو......

اُس نے اُسے بستر پر لٹایا تھا۔ دوا کھانے میں اُس کی مدد کی تھی اور پھر کرسی پر بیٹھ کر رسالے دیکھنے لگی تھی۔ یہ رسالے سات آٹھ سال پرانے تھے، جن میں ماڈلنگ ریمپ پر زرش کی جگہ وہ کھڑی تھی اور شافعہ نے تصویریں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ بلاشبہ بہت حسین ترین لڑکی ہوا کرتی تھی، مگر محبت سے ہار گئی تھی...... یہ علی کون تھا؟ اور کیا واقعی محبت ہارنے کی جیسی ہی بازی تھی، جس میں جیتنے والا بھی آخری لمحے تک نہیں جان پاتا کہ اُس نے کیا جیت کر کیا ہار دیا ہے......؟

شافعہ رسالے پلٹتی رہی اور خاموشی پورے کمرے میں چکراتی پھری۔

❀❀❀

شہریار نے پہلی نظر کے احاطے میں آنے والے منظر کو سہ بارہ دیکھا تھا اور حیرت پہلے لمحے کی طرح محسوس کی تھی۔ کرسی پر عارف جواد اور شافعہ بیٹھے تھے اور بہت خوشگوار لمحوں کو جی رہے تھے۔ کیا واقعی، یہ لمحے شافعہ کو چرانے کا حق تھا؟ اُس کی نظروں میں انوشے سلیم آ گئی تھی، جو اُس کے لئے اسی طرح حلاوت سے سوچتی تھی۔

عارف کو اُس نے کئی جگہ اسی طرح اُس کے ساتھ گھومتے پایا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے کافی منگوائی تھی۔ پھر اچانک اُس نے دیکھا تھا، عارف کے چہرے پر سراسیمگی در آئی تھی۔ اُس نے موبائل رکھ کر شافعہ سے کچھ کہا تھا، پھر وہ کافی دیر تک کسی بات پر اُس سے اصرار کرتا رہا تھا، پھر اُس کا کندھا تھپتھپاتا ہوا وہ خارجی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ شہریار نے کچھ سوچا تھا اور ویٹر سے کافی اپنی میز کے بجائے شافعہ کی میز پر لانے کا اشارہ کر کے اُٹھ گیا تھا۔

''ہیلو مس شافعہ! کیسی ہیں آپ؟''

''اوہ مسٹر شہریار! آپ...... اچھا ہوا، آپ آ گئے۔ دراصل میں اکیلے کافی پینے کے خیال سے بور ہو کر اُٹھنے ہی والی تھی۔''

''مگر آپ تو کسی کے ساتھ تھیں شاید......''

”اوہ ہاں، عارف تھے میرے ساتھ۔ لیکن اچانک اُن کے باس نے انہیں کسی ضروری کام سے بلوالیا۔ وہ تو مجھے گھر چھوڑنے کا کہہ رہے تھے۔ لیکن میں دوپہر کی ضروری ڈیوٹی کے بعد اتنی تھک گئی تھی کہ مجھے تھوڑا سا ریلیکس کرنا ہی تھا۔ پھر گھر بھی جا کر آدھا گھنٹہ ہی آرام کرنا تھا۔ کیونکہ آج سے میری رات کی شفٹ شروع ہوگئی ہے۔“

”رات کی شفٹ...... لیکن ابھی تو آپ دوپہر کی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔“ اُس نے عارف جواد کا معاملہ ہضم کر کے نیا سوال کیا اور وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

”میری سسٹر ہے سونیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ اُس کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لئے میں دو تین جگہ اضافی طور پر بطور نرس کام کرتی ہوں۔ تین جگہ صرف ایک ایک گھنٹے کا کام ہے سوائے مس زرش کی سسٹر کے۔ اُن کے ہاں ایک بجے سے چھ بجے تک مجھے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔“

”آپ اتنی محنت کرتی ہیں، آرام کب کرتی ہیں؟“

شافعہ ہنسنے لگی، پھر مسکرا کر بولی۔ ”مسٹر شہریار! آرام ہمارے نصیبوں میں کہاں؟ بقول امجد کے، ہم مڈل کلاس لوگوں کی زندگی میں سورج اس وقت نکلتا ہے، جب سانس شام کا کنارہ تلخ گھونٹ کی طرح پی چکی ہوتی ہے۔“

شہریار ساکت اُسے دیکھنے لگا۔ وہ کسی مڈل کلاس سے تعلق نہیں رکھتا تھا، لیکن ساری دولت کے باوجود محبت کا گوشوارہ اسی کھاتے کی نذر ہو رہا تھا۔ کیا واقعی اُس کی سانس بھی کسی شام کے کنارے کو تلخ گھونٹ کی طرح پینے کے بعد ہی کسی سورج کی تمنا کو بازیافت کر پائے گی؟

”آپ کیا سوچنے لگے مسٹر شہریار؟“ شافعہ نے اُسے پھر سے خیال و خرد میں آدھا آدھا بانٹ لیا۔

اُس نے مسکرا کر دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ”آپ کافی کے ساتھ سینڈوچز لیجئے ناں۔ یہاں کے سینڈوچ بہت مزے کے ہیں۔“

شافعہ نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید آپ یہاں اکثر آیا کرتے ہیں۔“

”جی...... ایک زمانے میں روز ہی آیا کرتا تھا۔ وہ کونے والی میز ہمارے لئے ہمیشہ ریزرو رہتی تھی۔ میں، عاطف، سلامہ، دانیا اکثر شام کو یہیں کافی پینے آتے تھے۔ مگر اب تو شاید سالوں گزر گئے، ہم ایک ساتھ یہاں نہیں آئے۔“

شافعہ نے اُس کے چہرے پر سوالیہ نظریں گاڑیں مگر کچھ پوچھنے سے جان کر بچ رہی تھی۔ شہریار کچھ دیر تنہائی سے اپنے اندر کھٹکنے والے سوالات سے بچنا چاہتا تھا، سو خود ہی بولا۔

''آپ کچھ پوچھنا چاہ رہی ہیں، مس شافعہ؟''

''وہ...... دراصل آپ نے ایک نام لیا تھا، سلامہ...... دراصل یہ میرے بہت اچھے دوست کا نام بھی ہے۔ اس لئے میں یونہی سوچ رہی تھی، یہ اتفاق ہے یا ایک ہی شخص کے دو تعارف۔''

شہریار نے دلچسپی سے اُسے دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''کیا آپ کا صحافت سے کوئی تعلق ہے مس شافعہ؟''

شافعہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر ملائمت سے بولی۔ ''کچھ اتنا خاص نہیں ہے۔ میں نے کمپل ماسٹر کیا ہوا ہے، وہ بھی گیپ دے دے کر۔ تعلیم اور ڈیوٹی ایک ساتھ نبھانے میں کچھ نہ کچھ وقت تو ہوتی ہے۔ لیکن پھر اچانک ایک دن بابا نے کہا، تم بہت اچھا بولتی ہو، اخبار میں چھپنے والی خبروں کا پوسٹ مارٹم بہت اچھے طریقے سے کر لیتی ہو، تمہیں لکھنا چاہئے تھا۔ اور بس، اس طرح میں لکھنے لگی۔ پہلی تحریر لے کر جب میں اخبار کے دفتر گئی تو بہت کنفیوزڈ تھی، مگر مجھے وہاں سلامہ ارسلان ملے۔ انہوں نے میرا ڈر خوف کم کیا۔ پہلی تحریر تو نہیں لگ سکی، اس میں واقعات کی جگہ جگہ منگ تھی۔ جہاں تجزیہ ہونا چاہئے تھا، وہاں واقعہ تھا، جہاں تفصیل ہونی چاہئے تھی، وہاں صرف سرسری تھی۔ سو میں نے آہستہ آہستہ سلامہ سے سیکھا، لکھتے کیسے ہیں۔ ڈیسک رپورٹ، بیورو رپورٹ کا فرق ہو یا اسٹیبلشمنٹ کی میڈیا خبروں کی گتھی سلجھانے کا ہنر، یہ سب مجھے سلامہ نے ہی سکھایا تھا۔ سو، مجھے شک ہوا، شاید......'' وہ ادھوری بات کہہ کر چپ ہوگئی۔

شہریار مسکرا کر اُسے دیکھنے لگا، پھر نرمی سے بولا۔ ''پہلے آپ صرف میری دوست کی دوست تھیں، مگر اب میرے دوست ہو کر اور زیادہ عزیز ہوگئی ہیں۔ ویسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سلامہ نے زندگی کو بالکل ہی اگنور نہیں کیا۔''

''ارے تو یہ سلامہ آپ کے یونیورسٹی فیلو ہیں؟''

''جی ہاں...... ایک زمانے میں ہم بہت اچھے دوست ہوا کرتے تھے۔'' اُس نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دینے کے ساتھ ساتھ جملہ بھی جوڑا اور وہ اُسے دیکھنے لگی۔

''آپ کے درمیان ناراضگی کی کوئی خاص وجہ، مسٹر شہریار؟''

''ارے نہیں مس شافعہ! کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس اُس یار باش آدمی کو بھی آپ کی طرح مصروفیت نے نگل لیا۔ ورنہ کبھی کبھار بات چیت ہوتی رہتی ہے۔'' وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ مقصد کوئی خاص

نہیں تھا، سوائے دوستی کو اُس کی نظروں میں باعزت رکھنے کی تمنا کے۔ اگر اُسے پتہ چلتا، وہ کس وجہ سے دُور ہوئے ہیں تو اُس کے لائف اسٹائل سے شاید سلامہ کی رہنمائی میں وہ اُس سے بھی کنی کترا جاتی، اُس کے بارے میں مشکوک ہوتی اور وہ انہی دونوں باتوں سے بچنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، وہ چپکے چپکے اُس کے لئے ضروری ہوتی جا رہی تھی۔

وہ چور نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اور وہ کھلے دل سے اُس کے سامنے بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اُس کے انداز میں عام لڑکیوں جیسا پزل انداز نہیں تھا۔ شاید مردانہ وار کام کرنے والی لڑکیوں کے دل اُن کے گھروں کی اُلجھنوں اور مسائل کے پاس گروی رکھے جاتے ہیں اور موسم آئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کبھی اُنہیں خبر نہیں ہونے پاتی اور کبھی خبر ہونے کے باوجود موسموں کی طرف کھلنے والے در اُنہیں اپنے ہاتھوں سے بند کرنے پڑتے ہیں۔ یہ بالکل وہی کیفیت ہوتی ہے کہ سورج کی طرف پشت کر کے اندھیرے سے دوستی کر لی جائے تاکہ کچھاپوں کی زندگی میں بلیک آؤٹ نہ ہو۔

''مس شافعہ! مجھے آپ کے اسٹیمنا پر کبھی کبھی رشک آتا ہے۔'' اُس نے خاموشی کی نذر ہونے والے لمحوں کو اُس کی آواز سے قیمتی کرنے کی حسرت کی اور وہ ہنسنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

''آپ کو تو شاید تعریف کرنے کا شوق ہے مسٹر شہریار ورنہ جو زندگی میں جی رہی ہوں، وہ ہمارے مڈل کلاس کی ننانوے فیصد لڑکیاں جیتی ہیں، اس میں نیا کیا ہوا۔'' وہ ایک ساعت رُکی، پھر نرمی سے بولی۔ ''سوری مسٹر شہریار اب میں چلنا چاہوں گی۔ میری ڈیوٹی کا وقت ہو رہا ہے۔''

شہریار نے کھڑے ہو کر اُسے تعظیم دی۔ وہ گلاس ڈور پش کر کے باہر نکلتی چلی گئی اور وہ اُس کے عکس کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ نظر سے اوجھل ہوئی تو اُس نے آنکھیں یوں بند کر لیں، جیسے اس عکس کو وہ دل میں نقش کر رہا ہو۔

جانے کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا، پھر کیفے اِن سے بل پے کر کے باہر آیا تو کار میں بیٹھتے ہوئے اُس کا موبائل بجا تھا۔ اُس نے ریسیو کیا۔ دوسری طرف عاطف تھا۔

''ہیلو یار من! کہاں ہو تم؟''

''کیفے اِن کے سامنے کھڑا ہوں۔'' اُس نے سادگی سے بتایا۔ اور دوسری طرف سے حکم ملا۔

''اور کہیں مت جانا۔ وہیں رہو، میں آ رہا ہوں۔''

پھر وہ کچھ اور کہہ پاتا، اس کی گنجائش چھوڑے بغیر اُس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ سو وہ کار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔ دس منٹ بعد عاطف آیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور شوفر مستعدی سے اُس کے احکام

بجالا رہا تھا۔شہریار نے اُسے دلچسپی سے دیکھا تھا اور وہ آدھے گھنٹے کا ٹائم دے کر اُس کے قریب چلا آیا تھا۔شہریار نے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا، پھر شرارت سے بولا تھا۔

''کیوں میری جان! آج حکمرانی کا چسکا اُٹھایا تھا، کیا؟''

عاطف جھینپ کر ہنس دیا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔وہ آج میرا آخری دن ہے ناں، اس لئے شوروم سے میں نے ڈرائیور کو بلوایا تھا، تاکہ ایئرپورٹ سے وہ گاڑی شوروم واپس لے جاسکے۔''

شہریار کے چہرے کی ساری شوخی ہوا ہوگئی۔بہت دقت سے اُس نے کہا۔''اچھا تو تم جارہے ہو۔''

''ہاں......لیکن ابھی آدھا گھنٹہ ہوں ناں تیرے ساتھ۔چل یہ آدھا گھنٹہ سلیبریٹ کرتے ہیں۔''

اُس کا جسم بے جان سا ہوگیا تھا۔وہ اُسے زبردستی کھینچتے ہوئے کیفے کے ڈور سے اندر داخل ہوا تھا۔پھر اپنی مخصوص میز کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ شہریار نے اُسے روک دیا تھا۔''وہ میز پورے سال ریزرو رہتی ہے اُدھر نہیں، ہم کسی اور خالی میز کی طرف چلتے ہیں۔''

عاطف بیگ نے سمجھنے والے انداز میں اُس کا ساتھ دیا تھا۔پھر کافی کا آرڈر دے چکا تو شرارت سے بولا۔''فون پہ جلدی میں تھا، اس لئے پوچھنا بھول گیا۔لیکن اب بتا، یہ بے ٹائم کس کے ساتھ کافی اُڑائی جارہی تھی؟''

شہریار نے جواب سوچا اور پہلی ملاقات کا عکس آنکھوں میں در آیا۔

''خیریت، یہ تیری آنکھیں اتنی گہری اور چمکیلی کیوں لگ رہی ہیں؟ مجھے تو تُو اتنی محبت سے دیکھ نہیں سکتا۔پھر......پھر کون تھی؟''وہ ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔

شہریار نے فوراً خود کو سنبھالا دیا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔''تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ایسی کوئی واردات نہیں گزری دل پر۔''

''دل کم بخت کا ذکر کون کرتا ہے۔میں نے تو آنکھوں کی چوری پکڑی تھی۔سچ بتا، جھوٹ بول کر تجھے خوشی ملے گی؟ اگر ہاں، تو میں اصرار نہیں کروں گا۔''

شہریار نے آنکھیں جھکالی تھیں، پھر بہت سادگی سے بولا تھا۔''شافعہ......مجھے شافعہ سے محبت ہوگئی ہے۔مجھے لگتا ہے، میری زندگی میں زندگی کی طرف کھلنے والا یہ واحد دریچہ ہے۔پتہ نہیں، میں اُسے

پانا چاہتا ہوں یا نہیں، لیکن میں اُسے اپنی زندگی میں کسی اور کا ہوتے دیکھوں اور سہہ لوں، یہ ناممکن ہے۔"
عاطف بیگ نے سکتے کی کیفیت میں ہاتھ سے سینڈوچ رکھ دیا تھا۔ اُس کے چہرے پر بہت تغیر آگیا تھا۔ اُس نے اُس کا چہرہ دیکھا، وہاں صرف محبت تھی، سادگی تھی اور ولولہ تھا۔ شہریار نے کافی کا مگ اُٹھایا تھا، پھر اُس کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔
"کیا ہوا؟ کیا مجھے محبت کرنے کا حق نہیں ہے؟" وہ لمحہ بھر کو رُکا، پھر بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا کہیں واقعی تُو یہ تو نہیں سمجھنے لگا، مجھے اُس سے محبت ہوگئی ہے؟"
عاطف بیگ نے کندھے اچکا کر وضاحت چاہی۔ اور وہ پھر سے بولا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ تیرا ارادہ تھا تو اس دل میں کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا، اگر کہوں گا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے تو تجھے یقین تو آنا نہیں تھا۔ پھر دل نے کہا، کیوں نہ Bluff ماروں۔ مگر حضرت ہیں کہ خوشی کے بجائے اُلٹے سناٹے میں ڈوب گئے ہیں۔ سو مذاق ختم، اب سنجیدگی سے صرف کافی پئیں گے ہم۔"
عاطف نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو کہ تمہیں شافعہ سے محبت نہیں ہے؟"
"ہاں بھئی۔ مجھے میری ہی قسم، مجھے شافعہ سے محبت نہیں ہے۔"
"تجھے معلوم ہے، جھوٹی قسم کھانے سے کیا ہوتا ہے؟" اُس نے خوف سے اُسے دیکھا اور وہ سہولت سے مسکرانے لگا۔
"پتہ ہے، مجھے کیا ہوتا ہے۔ لیکن بے فکر رہ۔ میری موت مجھے ہی آئے گی۔ بس اب یہ ٹاپک بند۔ ہم کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔"
"کچھ اور باتیں۔" عاطف نے سوچا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ مسڈ کال کا کیا ہوا؟ کس کی تھی؟"
شہریار نے نرمی سے کہا۔ "مامون کے توسط سے لوکیشن کسی گاؤں کی ہے۔ دیکھو، زیادہ تفصیل ابھی نہیں ہو سکی، کوشش جاری ہے۔"
"سم کس کے نام ہے؟" عاطف نے اگلا سوال کیا۔
"کسی بادل خان کے نام ہے۔ مامون کہہ رہا تھا اُس کی فورس کا ایک خاص بندہ اُس گاؤں جا کر معلومات کرے گا، پھر ہی کچھ واضح ہوگا کہ یہ کالز کون کر رہا ہے۔"
عاطف نے اُس کی طرف پُرسوچ نظروں سے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "خیالی گھوڑے دوڑاؤ، تب بھی کچھ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کون لڑکی ہے، پھر سوچتے ہیں فلرٹ کی اتنی عادت تھی ہمیں۔ کہیں ان

ہی لڑکیوں میں سے کسی کو تو تجھ سے سچا عشق نہیں ہو گیا؟"

"بکواس مت کر...... کیوں بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے؟ میں ایسا نہیں ہوں تُو جانتا ہے۔ رہا عشق تو بیٹا! اُس نے چھوٹتے ہی بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا، سارے منہ کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

عاطف بیگ ہنسنے لگا، پھر بولا۔" آخاہ! تو آپ حضرت بھی اُنہی لڑکوں میں شمار ہوتے ہیں، جو بہنوں کے بھائی بننا پسند نہیں کرتے۔"

شہریار بے ساختہ ہنسنے لگا، پھر بے یقینی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔" تو واقعی تُو پنڈی جا رہا ہے۔" لمحہ بھر کو رُکا، پھر خفگی سے بولا۔" اچھا بھلا کراچی میں تھا۔ لے کر اتنی دُور جانے لگا کہ مرنے کی اطلاع پہنچتے پہنچتے بھی باسی ہو جائے گی۔"

"پھر وہی بکواس......" اُس نے بے دھڑک اُس کے بازو میں چٹکی بھری تھی۔ پھر اُس کی سسکاری کے درمیان ہی بولا تھا۔" اور شاید تجھے جانا نہ کی وجہ سے نہ معلوم ہو، مگر یہ طے ہے، ہم نے کراچی بہت بُرے حالات میں چھوڑا تھا۔ اُن دنوں تُو جاننا نہ کے جو کھم میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ میں نے تجھے بتانا اور اپنی پریشانیاں بھی تیرے کندھوں پر ڈالنا ضروری خیال نہیں کیا۔ مگر آج، جب ہم اُس فیز سے نکل آئے ہیں تو تجھے بتانے میں کوئی حرج نہیں لگتا مجھے۔" ایک لمحے کو وہ چپ ہوا، پھر بولا۔" تجھے پتہ ہے نا، یہاں ابا کا پبلشنگ کا ایک چھوٹا سا ادارہ تھا، جس سے اچھی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ مگر ابا کے بعد زکریا بھائی وہ ادارہ نہیں چلانا چاہتے تھے، سو ادارہ بیچ کر انہوں نے وہ رقم کاروبار میں لگانے سے بہتر سمجھا کہ کسی فنانسنگ کمپنی میں لگا دی جائے۔ زکریا بھائی کا خیال تھا، وہ رقم دوگنی ہو گئی تو وہ رینٹ کار کا شوروم کھولنا چاہیں گے۔ مگر بدقسمتی سے وہ کمپنی جعلی نکلی۔ پیسہ لے کر صرف اُس نے ایک دو مہینے تک پرافٹ شو کیا، پھر راتوں رات بھاگ گئی۔ کمپنی میں پیسہ ڈوب جانے پر پہلا اٹیک اُن پر اُس وقت آیا تھا۔ تکلیف مدت سے تھی مگر اٹیک اُس دن ہوا تھا۔ پھر بھائی کے علاج پر ہم بہت مقروض ہو گئے۔ بُرے دنوں میں چچا نے ہمارا خوب ساتھ دیا۔ بھائی کو اپنے ادارے میں نوکری دی، مجھے پڑھائی کے ساتھ ساتھ جاب کی سہولت دی۔ دھیرے دھیرے پھر سے ہم کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ زکریا بھائی کی چچا کی بیٹی سے شادی ہو گئی، بھائی نے اپنا نیا پبلشنگ ادارہ رجسٹرڈ کروا لیا۔ دن بدل گئے، مگر بُرے حالات میں جس طرح پنڈی نے ہمیں سہارا دیا ہے، اس وجہ سے چاہنے کے باوجود پنڈی چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ رہنا تو وہیں ہے، مگر آتا جاتا رہوں گا میں تُو دل چھوٹا نہ کر۔"

"کراچی تیری آمد کی وجہ؟" اُس نے بہت دنوں پہلے کیا جانے والا سوال اب کیا تھا اور اُس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"ایک رائٹر ہوتے ہیں، جن کی کتاب کی اشاعت کے حقوق ہم نے خریدے تھے۔ مگر انہوں نے ہمارا لاہور سے پروف شدہ مسٹر جو نظر ثانی کے لئے بھیجا گیا تھا، کسی پبلشر کو مہنگے داموں بیچ دیا۔ سو قانونی

کارروائی کے سلسلے میں آیا تھا۔ معاملات سختی سے ہی سہی، طے پا گئے ہیں تو واپسی کا قصد کیا ہے۔ مسودہ ہرجانے کی وصولی کے ساتھ واپس لے کر جا رہا ہوں۔"

"بہت کمینہ ہے تُو۔ بے چارے اُس پبلشر کا کیا قصور تھا؟"

"تو ہمارا کیا قصور تھا، یہ بتا۔ غلطی اُن کی تھی، سو سزا تو ملے گی ہی ناں۔ میں نے تو اُس رائٹر کو آئندہ کے لئے اپنی لسٹ سے آؤٹ ہی کر دیا ہے۔ اس مسودے کے پیسے دے چکے ہیں، سو یہ کتاب ضرور چھاپیں گے۔"

شہریار نے مسکرا کر دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "ٹھیک ہے بیٹا! جو چاہو، کرو لیکن اب یہاں سے اُٹھ چلو۔ ورنہ کافی اِن کے ویٹرز مجھے ویلا سمجھ کر غلط کمنٹس دینے لگیں گے۔"

عاطف بیگ سر ہلاتا اُٹھ گیا تھا۔ دونوں پھر ایک ساتھ سیلِ رواں میں بہنے لگے تھے۔ شہریار اُسے ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا تھا، حالانکہ عاطف اُس کی بے صرف ڈرائیونگ سے خفا ہو رہا تھا، مگر اُس نے ایک نہیں مانی تھی۔

"کیا یاد کرے گا، کس جی داری سے خود کو تنہائی سوغات کی ہے میں نے۔"

عاطف کی یہی ضد تھی کہ وہ رابطہ رکھے گا اور شہریار اُس کے وعدے پر ہنس رہا تھا۔ پھر گنگنا کر بولا۔

"وعدہ وفا نہ کر مجھے

بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں"

عاطف نے خفگی سے اُسے دیکھا تو مزید بولا۔ "عدیل بھائی کو دیکھ، ڈیڑھ ماہ میں ایک فون کال کے علاوہ اُن کی آواز نہیں سنی میں نے۔ پھر کیسے یقین کر لوں کہ تُو بھی اپنی دنیا میں مگن ہو کر مجھے نہیں بھول جائے گا؟"

عاطف پھر کچھ نہیں بولا تھا۔ یہاں تک کہ وقت جدائی قریب آیا تو شہریار کے چہرے کا رنگ اُڑنے لگا۔

"اتنی گہری اور گھور تنہائی...... سانس بھی نہیں آئے گی مجھے عاطف! مت جاؤ ناں۔" شہریار نے اُسے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ جیسے کوئی بس آخری بار ملنے جا رہا ہو۔ بلیک وارنٹ کے قیدی کی آخری ملاقات جیسا زرد چہرہ تھا اُس کا...... عاطف نے اُسے دیکھا تھا، پھر گھبرا کر بولا تھا۔

"ایسے سی آف کرے گا تو میرا دل چاہے گا جانے کو؟ دیکھ، تجھے پتہ ہے ناں، میرا دل کتنا کمزور ہے۔"
شہریار نے اُس کے کندھے سے آنکھیں رگڑیں اور مدھم بولا۔ "تو کیا تجھے لگتا ہے، میرا دل بہت بہادر ہے؟ مجھے تو سرٹیفکیٹ بھی مل چکا ہے۔" وہ اب کی بار ہنسا تھا۔ مگر کھوکھلی ہنسی۔ عاطف نے اُسے پھر سے سینے سے لگا لیا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولا تھا۔
"اپنا خیال رکھنا، کسی کے لئے نہ سہی، میرے لئے سہی۔ تجھے پتہ ہے ناں، تُو مجھے کتنا عزیز ہے۔ دوائیں وقت پر لینا۔"
"اچھا میری بیگم......" اُس نے شوخی دکھائی۔ مگر آنکھ کی کور میں پھر سے نمی جمع ہونے لگی۔ عاطف نے الوداعی مصافحہ کیا۔ شہریار نے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا، جیسے وہ اُسے جانے نہیں دینا چاہتا ہو...... عاطف کے چہرے پر ہراس آ گیا۔ وہ مسافروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے اُس کی ہتھیلی الگ ہوئی، پھر دھیرے دھیرے کر کے انگلیوں نے جدائی کا لمس چکھا اور پھر وہ خالی ہاتھ کھڑا رہ گیا۔
"شیری! اپنا بہت خیال رکھنا۔" بہت سے شور میں سے صدا اُبھری۔ اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا، پشت موڑے رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اپنی کار میں آن بیٹھا۔ رات آٹھ بجے ڈاکٹر نواز سے اُس کی ملاقات تھی۔ مگر وہ جان کر اس میٹنگ کو ٹھکرا گیا تھا۔ اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔ پھر کار لاک کر کے وہ ماٹو کی خیریت دریافت کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ماٹو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ جازی نے اُسے پکارا تھا۔
"شیری بھائی! ماما آپ کو کھانے پر بلا رہی ہیں۔"
اُس نے اچنبھے سے جازی کو دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ گھر میں کھانا عموماً ساڑھے نو بجے کھا لیا جاتا تھا۔ پھر کیوں...... وہ اُن کے بلاوے کی نوعیت جاننے کی تگ و دو کرتے ہوئے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پورا کمرہ خالی تھا۔
"تم ہاتھ منہ دھو لو، میں تمہارے لئے کھانا لگوا دیتی ہوں۔"
وہ بجلی کی تیزی سے مڑا۔ کیا واقعی کسی نے وہی کہا تھا، جو اُس نے سنا تھا؟ ماما ٹیبل پر کھڑی اُس سے ہی مخاطب تھیں۔ تازہ بریک کے بعد سے وہ وائٹ فوڈ پر گزارہ کر رہا تھا، مگر ماما یہ نہیں جانتی تھیں۔ اُس نے سوچا اور انہوں نے اسی نرمی سے کہا۔

"آج میں نے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا ہے۔شاید تمہیں پسند آئے۔"

وہ ڈرائنگ رُوم سے ملحق واش روم سے ہاتھ منہ دھوتا کھانے کے کمرے میں آ گیا تھا۔ملازم میز پر کھانا چن رہا تھا اور اس میں سے کوئی بھی ڈش اُس کو لالو نہیں تھی،مگر ماما کا دل۔

آج پہلی بار اُنہوں نے اُسے اتنی نرمی سے پکارا تھا......

آج پہلی بار وہ اُنہیں یاد رہا تھا......

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ماما دو تین کرسیاں چھوڑ کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"پاپا آ گئے گھر؟"اُس نے پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے بہت مدھم پوچھا۔

"ہاں،وہ تو آٹھ بجے ہی آ گئے تھے۔کھانا کھا کر وہ تو سو بھی چکے ہیں۔"

"آج آپ نہیں سوئیں؟"اصل سوال۔

اُنہوں نے پہلی بار اُس کی طرف توجہ سے دیکھا۔واقعی،کیا کمی ہے اس میں جو اُنہوں نے آج تک اسے اپنی اولاد کا درجہ نہیں دیا؟......رہا جانانہ کا معاملہ تو وہ تو اب قصہ پارینہ بن گیا تھا۔وانیا کے جس دُکھ کی وجہ سے وہ اُس سے نفرت کرنے لگی تھیں،آج کل وہ دُکھ خوشی میں ڈھل گیا تھا۔حمزہ عابد اور وانیا اپنی زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ لے چکے تھے،پھر وہ اُسے سزا کے کٹہرے میں کیوں کھڑا کر کے رکھیں؟......آج اُن کے دل نے اُسے بری کر دیا تھا۔بہت دل آویز مسکراہٹ تھی اُن کے لبوں پر۔

یہ مسکراہٹ کیا صرف میرے لئے ہے؟کیا صرف میرے لئے؟......اُس نے ماما کے ہاتھ کے بنے ورقی پراٹھے کا نوالہ چکن کڑاہی کے سالن کے ساتھ حلق سے اُتارا۔

"مر جاؤ گے تم......مت کھاؤ۔"اندر سے صدائے احتجاج بلند ہوئی،مگر اُس نے اس صدا کا گلا گھونٹ دیا۔اتنی ساری محبت،وہ بھی اکیلے میرے لئے......

موت نیا وہ بھیانک نہیں ہو سکتی ہے......

وہ کھانے میں مگن تھا،جب عدیل بھائی کا فون لئے جازی اندر داخل ہوا۔اُس کے چہرے پر ہراس چھا گیا تھا۔ماما موبائل لئے باہر چلی گئی تھیں اور جازی نے چیل کی طرح آ کر اُس کے ہاتھ سے نوالہ

چھین لیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں، یہ آپ کے لئے کتنا خطرناک ہے؟"

جازی کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ مگر وہ اطمینان سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر نرمی سے بولا تھا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں یہ میرے لئے کتنا خطرناک ہے، میں مر سکتا ہوں۔ لیکن مام نے اتنی محبت سے کہا کہ انکار نہیں ہو سکا مجھ سے۔"

"مام آپ کی پرابلم نہیں جانتیں، آپ خود تو جانتے ہیں ناں۔"

شہریار نے بائیں ہاتھ سے اُس کا کندھا تھپتھپا کر کہا تھا۔ "میں اپنی ساری پرابلم جانتا ہوں، لیکن شاید تم بھول گئے ہو تم تو مجھ سے نفرت کرتے ہو ناں۔ پھر میرے مرنے سے جو تسلی تمہیں ملے گی، تم اس خوشی کو کھونا کیوں چاہتے ہو؟"

جازی پیر پٹختا ہوا مڑا مگر عین اسی وقت مما نے انٹری دی تھی۔

"کیا ہوا؟...... کھانا اچھا نہیں پکا کیا؟" ماما ہمیشہ کی طرح کانشس ہونے لگیں اور اُس نے بدلا کہا۔

"بہت مزے دار کھانا ہے مام! لیکن یہ جازی......" اُس کا جملہ اُس کے منہ میں ہی تھا کہ جازی نے مام کو کندھے سے تھام کر کہا تھا۔

"مام! بھائی دل کے مریض ہیں۔ اور یہ کھانا...... یہ کھانا کھا کر یہ مر بھی سکتے ہیں، مگر پھر بھی باز نہیں آرہے۔"

دل کے مریض...... ماما نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہریار کو دیکھا۔ لگا نوالہ، جو وہ حلق تک لے جانے والا تھا، انہوں نے اس سے چھین لیا تھا۔ "پاگل ہی ہے شیری تُو تو۔"

ماما سے اور کچھ نہیں بولا جا رہا تھا۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھے ہوئے شہریار کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔

"اتنی محبت کرتا ہے مجھ سے، کہ میرے کہنے پر زہر بھی کھانے کو تیار ہو گیا۔"

"جتنا سمجھتی ہیں آپ، اس سے بھی کہیں زیادہ محبت کرتا ہوں مام!" اُن کے سینے سے الگ ہو کر اُس نے نرمی سے کہا۔ پھر وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ مما اُس کی پشت دیکھ رہی تھیں۔

'یہ لڑکا...... واقعی یہ لڑکا بہت الگ ہے۔سب سے الگ...... اماں ٹھیک کہتی ہیں، مجھے اسے سمجھنے کے لئے ایک مارجن لینا ہی پڑے گا۔'

وہ ملازم سے کہہ کر، کھانا اُٹھوا کر حشمت بیگم کے کمرے میں آئی تھیں۔یہ اُن کی دواؤں کا ٹائم تھا مگر دروازہ کھولا تو شہریار پہلے سے وہ ذمہ داری نبھا چکا تھا۔بیگم حشمت نے پانی کا گلاس اُس کی طرف بڑھایا تھا۔

''آج میں نے سنا ہے، ماں بیٹے میں دوستی کا نیا معاہدہ ہوا ہے؟''

شہریار نے مما کو دیکھا، جیسے وہ خود نانو کی طرح اُن سے تصدیق چاہتا ہو۔

ماما اُس کی طرف چلی آئیں، پھر اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھنسا کر بولیں۔

''ایک موقع دیا ہے۔مگر اس سے کہہ دیں اماں! اگر پھر کسی لڑکی کا ذکر اس کے نام کے ساتھ پیش آیا ماں، تو میری ناراضگی سات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دُھلے گی۔''

شہریار کچھ نہیں بولا تھا مگر اپنے کمرے تک جاتے جاتے بے ساختہ خدا یاد آ گیا تھا۔اُس نے لیٹنے سے پہلے احتیاطاً دوا لی تھی مگر درد تھا کہ بڑھنے پر کمربستہ تھا۔وہ تکیہ پشت کے نیچے رکھ کر آرام دہ حالت میں لیٹ گیا تھا، مگر نہیں...... اُس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

'آج ہی دھڑکا ہے، آج ہی مرجائے گا کیا؟'...... اُس نے بے بسی سے سوچا تھا۔لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔یکدم باہر سے ہینڈل گھمایا جانے لگا تھا۔

اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ...... مگر دروازہ کھل چکا تھا۔اُس کے سامنے ماما کھڑی تھیں۔

''ڈائٹ دودھ ہے تمہارے لئے۔میں خود گرم کر کے لائی ہوں۔'' اُس نے بہت دقت سے اُن کا جملہ سنا تھا۔ماما اب اُس کے بیڈ کے قریب آ گئی تھیں۔''تم کچھ بول نہیں رہے۔کیا میری کوئی بات بری لگ گئی ہے؟''

اُس نے کچھ کہنے کے بجائے کپکپاتے ہاتھ سے اُن کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ماما اُس کے یخ ہاتھ ٹکراتے ہی گھبرا گئی تھیں۔

''شہریار! تم ٹھیک تو ہو؟...... تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں؟'' اُنہوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اُس کے قریب بیٹھ گئی تھیں اور وہ خاموشی سے اُنہیں دیکھے جا رہا تھا۔درد کم ہونے پر تیار ہی نہیں تھا۔پہلی بار اُس کی سسکی نکلی تھی۔

''مام!'' اُس نے اُن کا ہاتھ بھینچ لیا تھا۔ تکلیف اب چہرے پر بھی در آئی تھی۔

''شہریار! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟...... میں تمہارے پاپا کو اُٹھاؤں؟'' ماما گھبرا گئی تھیں۔ اُس نے اُنہیں نفی میں جواب دیا تھا۔

''اِٹس او کے مام! یہ تکلیف...... یہ تکلیف چھ سات سال سے بھگت رہا ہوں میں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ درد خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں، شاید کچھ وقت لگے گا آج......''

''چھ سات سال...... چھ سات سال سے تم......'' ماما ادھورا جملہ کہہ کر پوری طرح اُس پر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اپنی ساڑھی کے آنچل سے وہ اُس کے چہرے پر آنے والا پسینہ صاف کر رہی تھیں۔ تب اُس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''وہاں دراز میں ایک بوتل رکھی ہے مام! کیا آپ وہ مجھے دیں گی؟''

مام تیزی سے اُٹھی تھیں مگر دراز کھنگال ڈالنے پر بھی اُنہیں بوتل نہیں ملی تھی۔ شہریار کو یاد آیا، وہ دوا آج اُس نے کیمسٹ سے لینی تھی۔

''کیا ہوا، کہاں رکھی تھیں گولیاں؟ رکھ کر بھول گئے ہو کیا؟''

''نہیں مام! وہ...... میں مصروفیت کی وجہ سے خرید ہی نہیں سکا تھا۔''

''پھر...... پھر اب کیا ہو گا؟'' ماما ہونق ہو گئی تھیں۔

تب اُس نے تکلیف سے قطع نظر اُن کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر بہت دھیرے سے کہا تھا۔ ''آپ اتنا پریشان ہوں گی تو مجھے گلٹی فیل ہو گا۔ پلیز، ریلیکس کیجیے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہو جاؤں۔'' ماما اُنگلیوں سے اُس کا سر سہلانے لگی تھیں اور وہ پہلے سے بھی مدھم لہجے میں بولا تھا۔ ''اگر آج زندگی کا آخری دن ہے تو مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔ مگر ایک حسرت ضرور کروں گا کہ کاش! آپ کی محبت کا لطف لینے کا زندگی کچھ وقت اُدھار ضرور دیتی۔''

ماما رونے لگی تھیں۔ اُس نے سر تکیے سے اُٹھا کر اُن کی گود میں رکھ لیا تھا۔ پھر گہرا سانس لیا تھا۔ ماما نے گھبرا کے پکارا تھا۔ ''شیری!'' اور اُس نے بند آنکھیں کھول کر اُنہیں دیکھا تھا۔ ''مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے...... میں ابھی جازی یا سالار کو بلا کر لاتی ہوں۔''

اُس نے سر اُن کی گود میں رکھے رکھے سختی سے اُن کے خیال کو رد کر دیا تھا۔ پھر دو گھنٹے بعد اُسے اپنا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آج ایمرجنسی ٹیبلٹ لئے بغیر کام چل گیا تھا۔ کیا واقعی محبت میں اتنی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ زندگی کی لکیر سے دوسری طرف جاتے جاتے اُسے محبت نے روک لیا تھا۔ اُس کا چہرہ تھکن سے بالکل پژمردہ ہو گیا تھا۔ ماما نے اُسے بہت آہستگی سے تھام کر تکیے پر لیٹنے میں مدد کی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں مام! آپ جا کر سو جائیے۔''

''نہیں...... میں تمہیں ایسی حالت میں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔'' وہ اُس کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

پھر وہ بہت گہری نیند میں تھا، جب وائبریٹ کرتے موبائل نے اُس کی نیند توڑی تھی۔ مام ابھی تک کرسی پر بیٹھی تھیں اور بہت گہری نیند میں تھیں۔ اُس نے موبائل اُٹھایا تھا۔ اُس کا خیال تھا، شاید عاطف کا فون ہوگا۔ مگر دوسری طرف وہی سسکتی آواز......

''کیا آپ واقعی مجھے بھول گئے ہیں، شیری بھائی؟''

''تم اپنا نام کیوں نہیں بتاتیں؟'' وہ تیزی سے بولا تھا اور دوسری طرف دُکھ میں ڈوبی آواز پھر سے سنائی دی۔

''میرا خیال تھا، مجھے میری بدقسمتی کے ساتھ کوئی ڈھونڈے نہ ڈھونڈے، لیکن شیری بھائی! آپ مجھے کھوجنے کی کوشش ضرور کریں گے۔''

''کک...... کون......؟'' وہ بیڈ سے یکدم تیزی سے اُٹھا تھا۔ جگ اُس کے ہاتھ سے ٹکرا کر گر گیا تھا۔ ماما کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ پشت کیے پوچھ رہا تھا۔ ''نائمہ...... تم نائمہ بول رہی ہو ناں؟''

''ہاں شیری بھائی! میں نائمہ بول رہی ہوں۔ پلیز، مجھے اس جہنم سے نکال لیجئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے...... میں یہاں اور رہی تو مر جاؤں گی۔''

''نہیں بچے! ایسا نہیں کہتے...... میں ہوں ناں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ پتہ بتاؤ، میں تمہیں لینے آتا ہوں۔''

اُٹھنے کو تو وہ تیزی سے اُٹھ گیا تھا، مگر نائمہ کا نام سن کر اُس کا بلڈ پریشر یکدم شوٹ کر گیا تھا۔ اُس نے تیزی سے دیوار کو تھاما تھا مگر پھر وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

''شہریار......!'' ماما پوری قوت سے چیخی تھیں۔ اُس نے چونک کر پلٹ کر ماما کو دیکھا تھا اور پھر گرتے ہی آنکھیں بند کرتا چلا گیا تھا۔

ماما دیوانوں کی طرح اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔ ''شہریار! آنکھیں کھولو...... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' اُنہوں نے گلاس لے کر واش روم سے پانی بھرا تھا۔ پھر اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے

تھے۔ کافی دیر تک ہلاتی رہی تھیں، پھر مایوس ہونے ہی والی تھیں کہ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ماما گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ماما!.......وہ مائرہ تھی۔ آپ جانتی ہیں ناں، سلامہ کی بہن مائرہ......."

ماما نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم کون مائرہ، کون سلامہ۔ مجھے صرف اس وقت یہ پتہ ہے کہ تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔ چلو اٹھو! میرا سہارا لے کر اٹھو۔ آرام سے بستر پر لیٹو۔ اور یہ موبائل ادھر دو۔ تمہارے پاپا کا چین بھی اس چھوٹی سی ایجاد نے چھین رکھا ہے اور تمہیں بھی دیکھو، کس حال پر پہنچا کر چھوڑا ہے۔"

وہ اُسے سہارا دے کر بیڈ پر بٹھا چکی تھیں اور اب نیا حکم دے رہی تھیں۔ "سونے کی کوشش کرو۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

اُس نے نہ چاہنے کے باوجود تکیے پر سر رکھا تھا۔ مگر اردگرد مائرہ کی آواز چکرا رہی تھی۔ اگر وہ عین وقت پر بے ہوش نہیں ہوتا تو مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ اُسے اپنے اعصاب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ماما اُس کے چہرے کے اُترتے چڑھتے بدلتے تاثرات بغور سے نوٹ کر رہی تھیں۔

"سینے میں اب درد تو نہیں ہو رہا ناں بچے؟"

"اتنی محبت سے پوچھیں گی تو صاف مکر جاؤں گا۔" اُس نے تھکے ہوئے انداز سے ہنستے ہوئے کہا اور ماما نے فکرمندی سے کہا۔

"کل تم اپنے پاپا کے ساتھ ڈاکٹر صمدانی کے کلینک ضرور جاؤ گے۔ بے احتیاطی اچھی چیز نہیں ہوتی بیٹا!"

اُس نے کچھ نہیں کہا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔



"پاپا! آج میں آپ کو اپنا نیا کام دکھاتی ہوں۔" رائمہ نے مووی کیمرے سے بنائی گئی ایک ڈاکومنٹری ٹائپ فلم دکھانے پر سلیم افسر کو مجبور کیا تھا۔ یہ فلم اُس نے مختلف ایریاز میں جا کر بھیک مانگنے والوں پر بنائی تھی۔ سلیم افسر ابھی دفتر سے لوٹے تھے۔ بیگم شافعہ نے اُن کے لئے چائے پیش کی تھی اور وہ صوفے پر دھنس کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے بیٹا! دکھاؤ، جو دکھانا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارا اصل انٹرسٹ کس شعبے کی طرف زیادہ ہے۔"

”ایسے نہیں پاپا! اس نظریے سے دیکھیں گے تو آپ کو میرا کام بہت بچکانہ لگے گا۔ یہ تو میری پہلی کوشش ہے۔ اسے اس نظریے سے دیکھئے گا۔“

سلیم افسر مسکرانے لگے تھے۔ آج غیر متوقع انوشے بھی اُن کے ساتھ چائے میں شریک تھی۔ رائمہ مختلف کلپس دکھاتے ہوئے ایک بائیک گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت پر آ کر رک گئی۔ ”پاپا! یہ عورت Packtion کرتی ہے، آپ کو معلوم ہے؟“

مسٹر سلیم افسر نے بے یقینی سے دیکھ کر کہا۔ ”لیکن اسے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا، یہ Packtion کرتی ہوگی۔ اس کی حالت دیکھو، یہ تو شاید ٹھیک طرح سے آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی۔ اس کے منہ سے کیسی رال ٹپک رہی ہے۔ یہ مجھے صرف ڈرگ ایڈیکٹ لگتی ہے اور بس۔“

رائمہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”یہی پاپا! یہ یہی ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے ہیں، یہ کوئی بزرگ ہستی ہے۔ اور جیسے باہر ٹیلو کارڈ میجک بال والا سسٹم ہوتا ہے ناں، یہ وہی طریقہ ہے۔ میں نے پتہ لگایا ہے۔ یہ کسی بلّو نام کے آدمی کے پاس قید ہے۔ وہ اسے مانگنے والے کو دیہاڑی پر اُدھار دیتا ہے۔ دن بھر وہ اس کے نام سے کماتا ہے، پھر پرافٹ نکال کر اس عورت کو واپس اس قید خانے میں جمع کروا آتا ہے۔“

”تم اتنے بڑے بڑے کام کیسے کر لیتی ہو؟“ سلیم افسر نے اپنی بیس سالہ بیٹی کو دیکھا۔

رائمہ نے مسکرا کر سلیم افسر کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں، پھر بولی تھی۔ ”یہ کام میرے لئے مشکل ہوتے ہیں، مگر آسان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی اور ماما کی دعائیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ اور یہ مراد جو ہے میرے ساتھ۔“

”ارے ہاں، یہ مراد کہاں ہے؟ دکھائی نہیں دیا اب تک۔“

انوشے نے تلخی سے اُنہیں دیکھا، پھر غصے سے بولی۔ ”پاپا! تمہیں صرف وہی لوگ کیوں یاد آتے ہیں، جو تمہارے قریب نہیں ہوتے؟ جو قریب ہوتے ہیں تم اُنہیں گھاس نہیں ڈالتے۔ اور اگر یہی طریقہ ہے تمہارا تو پھر تمہیں وہ عورت کیوں یاد نہیں آتی، جس نے تمہارے لئے زندگی مٹا دی۔“

”سوا...... سوا...... یہ مجھے دے دو۔“ سلیم افسر نے پلٹ کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ انوشے یکدم فیڈ آؤٹ ہوگئی تھی۔ ”یہ آواز......“ اُن کے اندر سنسنی سی پھیلتی چلی گئی تھی۔

”شافعہ!“ اُنہوں نے آواز دی تھی اور انوشے اپنی بات کا اثر نہ دیکھتے ہوئے تپ کر باہر چلی گئی تھی۔ رائمہ باپ کے چہرے پر سرخی دیکھ رہی تھی۔ مگر یہ سرخی کسی کے ملنے کی سرخی تھی یا کسی تکلیف کی وجہ سے،

وہ جان نہیں پا رہی تھی۔

انوشے پیچھے دیکھے بغیر باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ آج کل ایک بڑے اچھے ہسپتال میں اُس کا منشیات سے بچاؤ کا علاج چل رہا تھا۔ بظاہر تو ایسے افراد کو ادارے ہی میں رکھا جاتا تھا، مگر اُس نے ضد رکھی تھی کہ علاج کروائے گی، مگر ہسپتال میں داخل نہیں ہوگی۔ شہریار کی کمپنی کی وجہ سے وہ اس لت سے کسی حد تک بچ بھی رہی تھی۔ مگر جس دن عارف مل جاتا، ساری کسر پوری ہو جاتی۔ زندگی اسی مدہوشی کی طرف لوٹ آتی۔ اُس نے خود عارف کو بھی کافی بار ڈرگ استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ مگر جب نشہ سامنے ہوتا تو اُس کے اپنے اندر خود اتنی قوت نہیں رہتی کہ وہ خود کو روک پاتی، پھر اُسے کیونکر بچنے کی صلاح دیتی۔ اس وقت وہ غصے میں تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر نکل آئی تھی۔ گاڑی بے ڈھنگے انداز میں چل رہی تھی کہ اچانک ایک بے ہنگم شور کے بعد بیچ سڑک پر رُک گئی۔ اُس نے مجبوراً عارف کو فون کیا۔

"آج میں مصروف ہوں۔" اُس کی آواز آئی۔ پیچھے سے کسی لڑکی کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اُس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"تم کہاں ہو عارف؟"

"میں راستے میں ہوں...... گھر جا رہا تھا۔" جھوٹ اتنا صاف تھا کہ پہلے ہی جھٹکے میں پکڑا جا رہا تھا۔

"تم ابھی اور اسی وقت مجھے پک کرنے آؤ۔" اُس نے بیر پٹخ کر چلا کر کہا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

پھر آدھے گھنٹے بعد وہ اُس کے سامنے تھا۔ "کیا ہے یار! تم اتنے جلالی موڈ میں کیوں تھیں اس وقت؟"

انوشے نے اُس کی طرف گھورتی نظروں سے دیکھا، پھر غصے سے تنک کر بولی۔ "کون ہے ایسی لڑکی جو تمہاری زندگی میں میری جگہ بدل دے؟"

"ارے ایسی لڑکی...... اس دنیا میں...... انوشے! ایسی لڑکی اس پورے کرۂ ارض میں نہیں ہے۔ یقین کرو میری بات پر۔" اُس نے گڑبڑا کر بات سنبھالی۔

"تمہیں میری خامیوں سے اُلجھن ہوتی ہے؟" اُس نے برملا کہا۔

"نہیں یار! بھلا مجھے اُلجھن کیوں ہوگی؟ یہ تو حُسن والوں کی عادتیں ہیں، جن کا احترام کرنا دل والوں پر واجب ہے۔"

"تمہیں میرے ڈرگ ایڈیکٹ ہونے پر کوئی سوال ہے؟"

"بالکل نہیں..... یہ تو امیر بچوں کی ادائیں ہیں۔ اور پھر میں خود بھی تو کبھی کبھی مارفین لیتا ہی ہوں۔"
انوشے نے اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھا اور پھر اُس کا ہاتھ تھام کے بولی۔ "تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"
"مگر تمہاری گاڑی....... اسے کون لائے گا؟"
"مائی فٹ، یہ گاڑی کتنے لاکھ کی ہو، بہر حال، اتنی قیمتی نہیں ہے جتنا میرا زندگی گزارنے کا نیا فیصلہ۔"
عارف کی زیرک فہمی نے کچھ نہ کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔ سو بنا چوں چرا کئے وہ اُسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ مگر موبائل سے اُس نے شوفر کو گاڑی کی لوکیشن بتا کر گاڑی کسی مکینک کے پاس لے جانے کا حکم ضرور دے دیا تھا۔
گاڑی رواں دواں تھی کہ اُس کا موبائل بجا تھا۔ عارف نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے موبائل اُٹھانے کی کوشش کی تھی، مگر انوشے نے اُس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ موبائل اُس کے ہاتھ میں تھا، اُس نے نمبر دیکھا، شافعہ نام پڑھ کر اس کو چٹخنے لگ گئے۔ عارف سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی کہ اُس نے موبائل آن کر کے تلخی سے کہا تھا۔
"تم جو کوئی بھی ہو، یہ جان لو، میں نے اور عارف نے ابھی اور اسی وقت شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم اس کی کوئی گرل فرینڈ تھیں تو تمہیں اپنی کوشش ترک کر کے کہیں اور ڈرائی مارنی چاہئے۔ اور اگر ایکس وائی زیڈ قسم کی لڑکی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا، ایسے دولت مند مردوں کی اس شہر میں کمی نہیں، جو تمہیں ٹھیک طرح سے پے کر سکیں۔" رابطہ منقطع کر کے اُس نے اُسے گھور کے دیکھا تھا۔
کون تھی....... اُسے معلوم تھا۔ شاید شافعہ ہی ہوگی۔ کیونکہ اُس نے اپنے کسی دوست کی اچانک بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے اُس کی برتھ ڈے پارٹی سے معذرت چاہی تھی۔ لیکن اگر یہ شافعہ ہی تھی تو....... اُس نے سوچا۔ وہ دوبارہ شافعہ سے ملنا چاہے گا۔ دل میں ہلکی سی رمق اُٹھی۔ شاید وہ اُس سے ملنے چاہے گا۔ مگر ساتھ بیٹھی کروڑوں کی لاٹری دیکھ کر اُس نے کندھے نیچے ڈال دیئے تھے۔
"تم اُس سے محبت کرتے تھے؟"
"نہیں....... میں نے تمہارے علاوہ کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔" اُسے اپنی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ کیا وہ اتنا بڑا جھوٹا تھا؟ دل نے کہا، تم بدلے ہی نہیں تھے، محبت نے شاید تمہیں جذب ہی نہیں کیا تھا۔ ورنہ تمہاری خامیاں لے کر تمہیں اپنی ساری اچھائیاں سوغات نہ کر دیتی۔ تم ایک لڑکی کو دھوکا دیتے رہے۔ ایک ایسی لڑکی کو، جو تم سے واقعی سچا عشق کرتی تھی۔ وہ، جو تمہاری ایک ایک خوشی کو

اپنے دل سے محسوس کرتی تھی۔ جس کی دعاؤں میں ہمیشہ تم رہتے تھے۔ وہ ہر تکلیف اپنے حصے میں لے کر تمہارے حصے میں صرف سکھ بانٹتی آئی تھی۔ تمہاری تنہائی کو اُس نے اپنے لفظوں، اپنے جذبوں سے رونق میں بدل دیا تھا۔ جس نے کبھی مذاق میں بھی تمہارا دل نہیں توڑا، لیکن تم نے اُس کا دل توڑنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔ تم کہتے تھے، بہت سے دھوکوں نے تمہیں تم سے چرا لیا ہے۔ وہ ان بہت سے دھوکوں سے لڑ کر تمہارے اندر اعتبار، اعتماد کی کونپل لگا کر اس کی دن رات آبیاری کرتی تھی۔ تمہاری مسکراہٹ جس کے لئے دنیا کی سب سے قیمتی جز تھی۔ مگر تم نے کیا اُس کی محبت کا ریٹرن ٹھیک دیا تھا؟ کیا وہ واقعی اسی رویے کی متقاضی تھی؟

''تم کہاں گم ہو عارف؟ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں ناں۔''

''میں سن رہا ہوں۔ تم کہتی رہو۔''

دل نے کیا کہا، آج کے بعد تم کچھ محسوس کر سکو گے.......

آنکھ نے کیا کہا، آج کے بعد تمہیں محبت اپنا دیدار دے گی کبھی.......

زندگی نے کیا کہا، واقعی جینے کے لئے دولت ہی سب کچھ ہے.......

اُس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ غلطی ساری اُس کے حساب میں نکل رہی تھی۔ وہ شافعہ سے محبت کرتا تھا یا شاید محبت کرنے کے دھوکے میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انوشے کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُسے لگتا تھا، وہ اپنے مطلب کا فگر نکال کر شافعہ کو جب کبھی بھی پانا چاہے، پا سکتا ہے۔ مگر وہ شافعہ جیسی لڑکی کو پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس نے کتنی قیمتی آفر ٹھکرا کر اپنی عزت، اپنی حرمت کی حفاظت کی تھی۔ وہ دولت کی بھوکی ہوتی تو آج کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی۔ وہ نہیں جانتا تھا اور وقت سب جانتا تھا ہوا س کے خسارے کے اس سودے پر ہنس رہا تھا۔

گھر آچکا تھا۔ وہ مارے بندھے انداز میں اُس کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ مگر ڈرائنگ روم کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ سلیم افسر کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں اور بیگم شافعہ ان کا کندھا تھپک رہی تھیں۔

''حوصلہ کریں.......زندگی میں اس سے زیادہ تلخ سچ دیکھنے پڑتے ہیں۔''

رائمہ کا رنگ فق تھا۔ وہ کچھ نہیں سمجھی تھی اور سلیم افسر دکھ کی تصویر بنے کہہ رہے تھے۔
''یہ عورت...... یہ عورت کتنی قیمتی تھی، مگر اس نے خودمٹی کے بدلے اپنا کندن بیچ ڈالا۔ مجھے اسے اس حالت میں دیکھنے کی کبھی توقع نہیں تھی شافعہ! میں نے بھی...... میں نے بھی بہت پیار کیا تھا۔''
شافعہ سمجھدار بیویوں کی طرح اُن کا غم بٹا رہی تھی اور انوشے انہیں بے رنگ آنکھوں سے دیکھ کر بولی تھی۔
''بابا! میں نے آج ایک فیصلہ کرلیا ہے۔''
سلیم افسر نے چونک کر، پلٹ کر انوشے کو دیکھا۔ اُن کی دروازے کی طرف پشت تھی، اس لئے دونوں میں سے کوئی اُسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اب دیکھا تھا تو اُس کے جملے کی ساخت میں اٹک گئے تھے۔
''کیسا فیصلہ بجو؟'' رائمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک سچ کو چھپاتے ہوئے نیا سوال کیا کہ اس سچ کی تلخی کہنے سے زیادہ چھپا لینے میں ہی کامیابی تھی۔
''میں...... میں اسی مہینے عارف سے شادی کر رہی ہوں، بابا!''
سلیم افسر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا تھا، جو مراد نے ابھی ابھی ان کے ہاتھ میں دیا تھا۔
''پلیز بابا! میں اپنے اس فیصلے پر کوئی آرگومنٹ نہیں سنوں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے، اور آپ کو یہ ماننا پڑے گا۔''
سلیم افسر کچھ نہیں بولے تھے۔ ایک تصویر کلپ میں رُکی ہوئی تھی، ایک سامنے کھڑی تھی۔ ایک نے اپنی زندگی کے فیصلوں کا ذائقہ چکھ لیا تھا اور دوسری اپنے فیصلوں پر اترا ہٹ کا شکار تھی۔
''میرا کیا فیصلہ ہونا چاہئے؟'' انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیگم شافعہ کی طرف دیکھا۔ اُن کے ہاتھ کی تھپکی کی نرمی واضح تھی کہ ان کا کیا جواب ہونا چاہئے، سو انہوں نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔
''ٹھیک ہے...... مجھے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میری شرط ہے، عارف کا رشتہ اس کے پاپا خود لے کر میرے گھر آئیں۔''
''عارف! تمہیں اس پر اعتراض تو نہیں؟'' عقل کل بنی وہ پوچھ رہی تھی۔
اور اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا تھا۔ ''میرے پاپا کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا انکل! وہ میرے کہنے پر ایک ہفتے کے اندر اندر آپ سے آکر ملیں گے۔''
عارف جا چکا تھا اور انوشے بھی اب دہلیز پر کھڑی نہیں تھی۔ تبھی سلیم افسر نے کہا تھا۔ ''کیا یہ فیصلہ درست ہے عافیہ؟''

عافیہ نے پلو سے آنسو پونچھ کر کہا تھا۔ ”ہر فیصلے میں خطرہ تو ہوتا ہے ناں۔ کرنے دیں زندگی کا یہ نیا فیصلہ بھی اسے۔ ہو سکتا ہے، یہی فیصلہ اسے اس کی روٹھی ہوئی خوشیاں لوٹانے میں مدد دے۔“
سلیم افسر کچھ نہیں بولے۔ بہت متاسف ہو کر پھر سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اس عورت کو اپنے حسن پر کتنا گمان تھا، اور اب...... انہوں نے پھر سے دیکھا، مندی مندی آنکھیں، مدقوق چہرہ، بھنبھناتی مکھیاں...... وجود کا غرور اب کہیں نہیں تھا۔ اُن کی آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی۔
بیگم عافیہ، شوہر کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ پھر اُن کے دل نے ایک فیصلہ کیا تھا۔
آج شافعہ فلیٹ میں داخل ہوئی تو بہت مُردہ قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ ثانیہ نے اُسے دیکھ کر سراہا تھا۔ آج وہ روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔

”کیا ہوا، خیریت......؟“ اُس نے سوال کیا۔
تب شافعہ اُس کے قریب بیٹھ کر بولی۔ ”کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کل ایسے ہی طبیعت مضمحل تھی، اس لئے میک اپ اتارے بغیر سوگئی تھی۔ اور آج دیر ہونے کی وجہ سے یہ آزار نہیں اُتار پائی۔“
”آزار...... پاگل لڑکی! تم تو بہت پیاری لگتی ہو، میک اپ کر کے۔“
”مگر ایسے سنگھار کا فائدہ جو کسی کا دل نہ باندھ سکے۔“
”کیا ہو گیا، آج تو مجھے لگتا ہے، تمہاری جگہ مجھے تمہاری تیمارداری کرنی پڑے گی۔“
”اُفوہ، نہیں میم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔“
وہ کچن میں اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ کک آج اُس کا پرہیزی کھانا پکانے نہیں آئی تھی، اس لئے یہ اضافی کام اُسے کرنا تھا۔
”کل تمہارے گھر کوئی پارٹی تھی کیا؟“
اُس نے دو ہفتے کی بہترین بات چیت کے تحت بے تکلفی سے سوال کیا۔ لیکن وہ ڈبہ تھام کر، باہر آ کر پوچھنے لگی۔
”نمک کتنا لیتی ہیں میم؟“

”ایک چٹکی۔لیکن اگر اِس بوتل سے کچھ ڈالنا چاہتی ہو تو تمھیں پوچھنا چاہئے، میں چینی کتنی لیتی ہوں۔“

”چینی......“ اُس نے چونک کر دیکھا۔وہ نمک کی غلطی میں چینی کا جار اُٹھا لائی تھی۔دونوں جار ایک جیسے تھے،اس لئے یہ غلطی ہو گئی تھی۔ثانیہ نے اُس کے چہرے پر تمبیھر تا دیکھی تو ہاتھ بڑھا کر اسے قریب بلا لیا۔

”تم اِدھر آ کر بیٹھو،ہم کھانا باہر سے منگوا لیں گے۔آج چائنیز ہی ہو جائے گا۔کوئی حرج نہیں۔لیکن اگر تم ایسی خاموش رہیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔مجھ سے کسی کی پریشانی بالکل نہیں دیکھی جاتی۔“وہ اُس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی تو اُس نے اُس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔”تمہارا بوائے فرینڈ تھا یا......“

”میرا منگیتر تھا میم!......لیکن کل رات......“

”اُس نے کوئی بدسلوکی کی تم سے؟“اُس نے اپنے حسابوں میں جملے کی ساخت میں اُترنے کی کوشش کی مگر وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”میم!کل میری سالگرہ تھی۔وہ،میں،پاپا سب ایک ساتھ تھے۔کل ہم پہلی بار اتنی خوشی سے سالگرہ منا رہے تھے۔ہمیشہ وہ میری برتھ ڈے پر باہر ہوتا تھا۔میرا خیال تھا،آج ہم مل کر خوب مزہ کریں گے۔مگر اُس کے موبائل پر ایک کال آ گئی۔اُس نے کہا کہ اُس کے دوست کو سیریس انجری آ گئی ہے۔میں نے سمجھا،واقعی سچ ہو گا۔مگر میم!اُس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا......وہ کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔“

ثانیہ نے اُس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا تھا،پھر آہستگی سے بولی تھی۔

”یہ تو مردوں کی عادت ہوتی ہے۔منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے وہ ہاتھ پیر مارتے ہی رہتے ہیں۔مگر شافعہ!یہ یاد رکھنا،مرد ہمیشہ اُسی عورت کا ہوتا ہے،جو قانونی طور پر اُس کی بیوی ہوتی ہے۔“

”مگر میم!میرے پاس یہ حوالہ نہیں ہے۔اور وہ لڑکی کہہ رہی تھی،وہ اور عارف شادی کرنے والے ہیں۔“

”تمھیں کیا لگتا ہے،عارف ایسا ہے کہ تمھیں دھوکا دے؟“

”پتہ نہیں میم!میں تو ایک نقطہ پر آ کر کھڑی ہو گئی ہوں۔مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے،مرد دھوکے بھی دیتے ہیں۔میرے بابا،میرے کزنز سب کی زندگی خوشگوار تھی۔کسی نے بھی کبھی ایسا کیا ہی نہیں کہ مجھے لگتا،میرے ساتھ دھوکا ہو گا۔“

’’پھر تمہیں خود کو اس دھوکے کو سہنے کے لئے تیار کرنا چاہئے۔تم عارف کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، اس لئے تم تاریکی میں کوئی بھی غم اُٹھا کر اپنے گھر لے آؤ گی۔‘‘

’’میم! آپ........ کیا آپ جانتی تھیں، علی صاحب آپ کو دھوکا دیں گے؟‘‘

’’دھوکا اور علی........‘‘ وہ زور زور سے ہنسنے لگی، پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ’’تمہیں یہ کیسے لگا کہ علی نے مجھے کوئی دھوکا دیا تھا؟‘‘

’’پھر میم! آپ کو انہوں نے کیوں چھوڑا؟ آپ...... آپ تو اتنی پیاری، اتنی خوب صورت سی ہیں۔‘‘

ثانیہ نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ’’میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں جتنا خوب صورت علی تھا۔ اُسے دیکھ کر سورج کی بھی سانس رک جاتی تھی۔ وقت بھی تھم تھم کے چلتا تھا۔ پھر میں اُس کے حصار میں کیسے نہ آتی۔ میں بھی اُس کے قریب رکی تو وقت کی طرح ساکت ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی۔ پھر مجھے لگا، مجھے اُس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے اُسے لڑکی ہونے کے باوجود پرپوز کر دیا۔ وہ سوفٹ ڈرنک کا گلاس رکھ کر میری جسارت پر گم رہ گیا تھا۔ میں سمجھی، وہ میرے حسن کے تیر سے گھائل ہو گیا ہے۔ مگر اُس نے بہت سرد لہجے میں کہا تھا۔ ’’میں کسی ماڈل گرل سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے بیوی پاکباز اور باعزت چاہئے۔‘‘ میں نے کہا، میں تمہارے سانچے میں ڈھل جاؤں گی، نماز روزہ سیکھ لوں گی، سات پردوں میں رکھو گے، رہ لوں گی۔ مگر وہ نہیں مانا........ وہ نہیں مانا اور پھر مجھے ضد ہو گئی، کسی بھی طرح اُسے پا لینا ہے۔ اُسے پانے کے لئے میں نے کتنے جھوٹ بولے، کتنے لوگوں کا آلۂ کار بنی، جو مجھے کہتا، وہ مجھے علی سے قریب کر سکتا ہے، میں اُس کے قدموں کی خاک چومنے سے باز نہ رہی۔ مگر کسی نے ایسا نہ کیا۔ پھر........ پھر ایک دن میری زندگی میں انقلاب آ گیا۔

ایک ایسی ہستی دریافت ہوئی، جس نے واقعی علی سے مجھے ملانے کی قسم کھائی۔ علی جس منسٹری میں تھا، وہ اس منسٹری کی نورِ نظر تھی۔ اُس نے اُس پر دباؤ ڈالا کہ اگر وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا تو اُس سے اُس کی نوکری چھین لی جائے گی۔ فیک انکوائری میں گھسیٹ لیا جائے گا۔ علی اس بات پر بھی راضی نہیں ہوا۔ وہ بڑا اَجی دار آدمی تھا۔ اُس نے کہا، وہ اپنی زندگی کے ہر بحران کا مقابلہ کرے گا، مگر مجھ سے شادی نہیں کرے گا........

میں مایوس ہو گئی تھی، جب اُس کی کمزوری اُس کا بھائی نظر آیا۔ وہ اُن دنوں ریسرچ پیپر کی تیاریوں میں تھا۔ علی کا سارا گھرانہ بہت علمی و ادبی سا تھا، سو اُس کا بھائی بھی ریسرچ کے میدان میں آگے جانا چاہتا تھا۔ تب اُس منسٹر کی طرف سے اُس پر دباؤ ڈالا گیا کہ اگر وہ نہیں مانا تو اُس کی ریسرچ کو درمیان ہی سے ختم کر کے اُسے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ علی اپنی ذات پر کمزور نہیں پڑا تھا، مگر وہ اُس ڈراوے پر

مان گیا۔ کیونکہ اُس کے بھائی کی زندگی کا ایک اکیلا خواب یہی تھا کہ وہ اپنی ریسرچ میں کامیاب ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جائے۔ اُس کے اس ریسرچ پیپر کی تیاری پر ہی اُس کی اسکالرشپ منحصر تھی۔ وہ تھم گیا، وہ ہار گیا۔ اور میں سمجھی، میں نے اُسے پا لیا ہے........

وہ میرے ساتھ تھا، ہر آن...... میں اُسے جب چاہتی، چھو سکتی تھی...... جب چاہتی، اُسے دیکھ سکتی تھی۔ میری آنکھیں اُس کے حُسن سے ہر وقت خیرہ رہتیں۔ میرا دل کرتا، میری آنکھیں کھلیں تو میں اسے دیکھوں۔ جب آنکھیں بند کروں تو اسے دیکھوں۔ مگر وہ میرے بارے میں ایسا نہیں سوچتا تھا۔ وہ جب مجھے چھوتا، اُس کے ہاتھ برف کی طرح سرد ہوتے...... ہمارا ساتھ ایسے تھا، جیسے دریا کے دو کنارے اور بیچ میں نارسائی.......

تین سال، چار سال...... مگر پانچویں سال میرا صبر جواب دے گیا۔ میں نے کہا تم چاہتے ہو، میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں؟..... شافعہ! تمہیں پتہ ہے، اُس نے کیا کہا؟"

شافعہ کا دل آنکھوں میں آن بیٹھا۔ "کیا کہا تھا، میم؟"

ثانیہ نے گہرا سانس لیا، پھر بولی۔ "اُس نے کہا، ہاں، میں چاہتا ہوں، تم میری زندگی سے چلی جاؤ تم...... جو نہ میری مرضی سے آئی ہو، نہ کبھی میرے من کی مرضی بن پاؤ گی۔ تم واقعی چلی جاؤ، بالکل چلی جاؤ۔ بالکل ثانیہ!...... بالکل چلی جاؤ۔

اُس نے یہ کہا اور اُس دن میں نے جانا، محبت، محبت حاصل نہیں کرسکتی۔ اسے صرف پایا جاتا ہے، مانگا جاتا ہے۔ میں نے اُسے چھیننے کی کوشش کی تھی اور محبت نے مجھے اس جسارت پر اپنے دل سے باہر نکال دیا...... مجھے اپنے دل سے باہر نکال دیا شافعہ! ورنہ کیا یہ ممکن نہیں تھا، وہ اُس کا دل میری طرف موڑ دیتی...... وہ پورے کا پورا مجھ سے پیار کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا شافعہ! سو میں اُسے چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی........

میں نے گھر آ کر بہت ساری خواب آور گولیاں کھالیں۔ مجھے معلوم تھا، میری زندگی کی طرح اُسے میری موت کا بھی کوئی غم نہیں ہوگا۔ لیکن میں نے پھر بھی مرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے فلیٹ میں اکیلی تھی، جب میری دوست نے مجھے اچانک آ کر سرپرائز دینے کی کوشش کی، مگر وہ خود سرپرائزڈ ہو گئی۔ اُس نے مجھے ہاسپٹل پہنچایا۔ وہ ہسپتال کے عملے سے لڑنے لگی۔ اُس نے کہا، اگر مجھے کچھ ہوا تو وہ پورے ہسپتال کو ہلا کر رکھ دے گی۔ میرا کیس ایمرجنسی کیس بن گیا تھا۔ پھر مجھے بچا لیا گیا۔"

اُس نے ایک گہری سانس لی۔ اتنی افسردہ سانس کہ شافعہ کو اُس پر ترس آنے لگا۔

"میم! زندگی ابھی اتنی بری نہیں ہے کہ آپ اپنے جینے پر افسوس کریں۔"

ثانیہ نے خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور جیسے اُس کی بات سنے بغیر بولی۔ "مجھے بچا لیا گیا تھا، مگر ڈاکٹر صرف میرا وجود بچا پائے تھے۔ میرا اندر مر گیا تھا اور انہیں خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک مُردہ انسان میں زندگی کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ میری دوست ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک نام بار بار لیتی، اس کا حوالہ دے دے کر مجھے کہتی کہ وہ انسان کو چھوڑنے کی نہیں، جتنی اذیت مجھے پہنچی ہے، وہ اس سے دُگنی اذیت اُسے دے گی۔ مگر میری زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں بول پائی تھی۔ اس لمحے میرے اندر صرف ایک بات چل رہی تھی۔ "مجھے جینا نہیں ہے...... دنیا میں جینے جیسا کچھ نہیں ہے۔" اور بس، میں یہی سوچتی رہی۔ پھر ایک دن میں ہسپتال سے نکل آئی۔ میں کسی بھی گاڑی کے نیچے آ کر مرجانا چاہتی تھی۔ کیونکہ زندگی نے مجھ سے میرا علی چھین لیا تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک میرے سامنے ایک ٹرک ایک مجھ جیسی لڑکی کو کچلتا چلا گیا۔ میں نے اپنے سامنے موت کو دیکھا۔ موت اتنی بھیانک، اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے، میں تو اسے ایک ہلکی سی خراش جیسی تکلیف سمجھتی تھی۔ میرا ادھ مُوا وجود اس صدمے سے بے حال ہو گیا تھا۔ میں چل رہی تھی کہ چلتے چلتے بے ہوش ہو گئی۔

پھر میری آنکھ کھلی تو میں کسی گھر میں تھی۔ وہ بہت تنگ و تاریک گھر تھا۔ مگر وہاں کے لوگ وراُن کے دل تاریک تھے نہ تنگ...... انہوں نے مجھے وہیں کی کسی گلی سے اُٹھایا تھا۔ وہ لوگ مزدور تھے۔ انہوں نے میری بہت خدمت کی تھی، بہت پیار دیا تھا۔ تب میں نے ایک اور سبق لیا تھا زندگی سے کہ محبت کے لئے دولت آسائش ضروری نہیں ہوتیں...... نہ انسانیت سیکھنے کے لئے انسانیت پر بڑے بڑے مذاکرے، سیمینار اٹینڈ کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ یہ تو بس الہام ہوتے ہیں۔ اور الہام صرف دل والوں پر اُترا کرتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر کو چپ ہوئی اور اسی کچھ دیر میں بیل بجی تھی۔

"دیکھو، شاید لنچ باکس آیا ہو۔" اُس نے وینٹی بیگ سے دو ہزار نکال کر دیے تھے۔ شافعہ نے لنچ باکس لے کر پے منٹ دی تھی۔ پھر وہ پلیٹوں میں کھانا نکال کر ثانیہ کے سامنے ٹیبل پر کھانا چن رہی تھی۔

ثانیہ اُسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر بہت مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"پتہ نہیں، وہ آدمی خوش قسمت نہیں تھا یا اُس کی قسمت بری تھی، مگر یہ طے ہے، اُس نے بہت بڑی محنت گنوا دی ہے۔ تم جو صرف ایک مریض کے لئے اتنی توجہ، اتنی محبت، اتنی لگن سے اپنی خدمات پیش

کرتی ہو تو اس آدمی کے لئے تم کیا ہوتیں...... کیا کیا نہیں کر گزرتیں...... اُس نے بہت خسارے کا سودا کیا ہے شافعہ! میں اُسے دیکھے بغیر بتا سکتی ہوں کہ وہ ہار گیا ہے۔ وہ محبت سے ہار گیا ہے، اپنے آپ سے ہار گیا ہے۔"

شافعہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُس کے پاس جیسے کہنے کو کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ ثانیہ اُسے دیکھتی رہی، پھر اپنی کہانی کو وہیں سے چھیڑنے لگی، جہاں سے کہانی نے سانس روکی تھی۔

"میں وہاں بہت سارے دن رہی۔ وہ لوگ مجھے کسی اچھے گھر کی بے سہارا لڑکی سمجھ کر ریگارڈ دے رہے تھے۔ میں کچھ دن اور وہاں رہ سکتی تھی، مگر میری عزتِ نفس نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ میں ایک دن چپکے سے اُن کے گھر سے نکل آئی۔ میری حالت کم کھانے اور بہت سارے دُکھ نے مل کر بگاڑ دی تھی۔ شاید میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی تھی...... میں چلتی چلی جا رہی تھی کہ ایک جگہ بھوک سے نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔ میرے سر کی چادر کا پلو پھیلا رہ گیا۔ کسی راہ چلتے نے اُس میں دو روپے ڈالے، کسی نے ایک روپے کا سکہ اُچھالا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا، میں کب اور کیسے سیٹھ عمرانی کی بیٹی ہونے کے باوجود بھکارن بن گئی۔

میرا دل چاہا تھا، اُس دن میں جاؤں اور اپنے باپ کو لا کر چپکے سے اپنا حال دکھاؤں اور کہوں۔ "دیکھو میرے بابا! تمہاری بے جا آزادی، غلطیوں سے چشم پوشی، شہرت کی بھوک اور ماڈرن ازم نے مجھے کہاں لا کر پٹخا ہے...... میری مثال اُس انسان کی طرح ہو گئی ہے، جس نے نقلی پَر لگا کر آسمان کی بلندیوں پر اُڑنا چاہا مگر سورج کی آنچ نے مجھے فلک سے کہاں پستی میں پھینک دیا۔ میرا سارا جسم چُور چُور ہے۔ بابا! اگر یہی آپ کی بے مہار آزادی کی تمنا ہے تو مجھے کہنے دیجئے، میرے دل نے تمنائیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔" میرا دل چاہا، میں اپنے باپ سے پوچھوں، کیا واقعی وہ اس حالت میں مجھے پہچانیں گے؟ مگر میں ایسا نہیں کر سکی......

پھر شام تک جمع ہونے والی ریزگاری سے میں نے اپنی زندگی کا کڑوا کھانا کھایا، جیسے مرجانے والوں کے بعد کڑوی روٹی بٹتی ہے ہاں، وہی......"

وہ سانس لینے کو رکی، پھر بولی۔

"مگر میرے اندر کھانے سے اور آگ لگ گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے گھر جانے والی بس کا نمبر کسی سے پوچھا تھا۔ گاڑیوں میں گھومنے والی ثانیہ عمرانی نے پہلی بار بس دیکھی۔ اور شافعہ! جب میں نے بس میں قدم رکھا تو عورتوں کی آنکھوں میں میرے لئے حقارت تھی۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور پسینے کی بدبو سے میرا پورا وجود اَٹ چکا تھا اور میرے لئے وہ عورتیں باتیں بنا رہی تھیں، جن کی

مہینے بھر کی کمائی کے برابر تھی میں صرف ایک پرفیوم خریدا کرتی تھی۔ میں پلو میں منہ دے کر پہلی بار جی بھر کر روئی۔ کسی نے میری آنکھ کے آنسوؤں پر ترس کھایا تو کہا۔ ”گلبرگ آ گیا ہے بی بی!“ میں اندھوں کی طرح سڑک پر اُتری۔ آج میں اپنے گھر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اُس گھر کو جس میں، میں نے سالوں بتائے تھے۔ میں نے اپنے باپ کا نام بتایا تھا، تب بہت سارے لوگوں میں سے آتے جاتے قدموں میں صرف ایک نے مجھے راستہ سمجھایا۔

”عمرانی صاحب کی بیگم آج ہی کے دن صدقہ خیرات دیا کرتی ہیں۔ مگر بی بی! تم نے آج دیر کر دی ہے۔“ واچ مین نے میرے حلیے کو دیکھ کر جواب دیا۔ حالانکہ میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

”وہ ثانیہ......“ میرا جملہ حلق میں تھا۔ پہچان کی سیڑھی پر پہلا قدم تھا میرا کہ مجھے پتہ چلا، میں ایک سال پہلے مر چکی ہوں...... میں نے افسوس سے اپنی طرف دیکھا، پھر لجاجت سے پوچھا۔ ”کیسے مری تھی بی بی صاحب؟“

واچ مین نے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”کیسے مرتا ہے یہ بڑا لوگ، تمہیں نہیں معلوم، تمام عمر گھر سے بھاگا پھرتا ہے، پھر مرنے کے لئے بھی گھر نصیب نہیں ہوتا۔ مر گیا ہے بے چارہ سڑک پر، جیسے عام لوگ مرتا ہے۔ کبھی کبھی بڑا لوگ بھی عام لوگ کی طرح مر جاتا ہے۔ اچھا چلو، اب تم جاؤ، صاحب نے ہمیں تم سے بات کرتا دیکھ لیا تو جان کو آ جائے گا۔ بہت خبیث آدمی ہے ہمارا صاحب۔ گھر میں بیٹیاں ہیں، پھر بھی...... چلو خوچہ تم جاؤ ناں۔“

اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور میں اس ادھوری بات کا دُکھ جان گئی۔ کیونکہ وہ ادھوری پورے دُکھ کی طرح ہر وقت میری ماں کی آنکھ سے چھلکتی رہتی تھی۔

میں اپنے گھر سے چلی آئی۔ یہاں دارالسکون میں رہنے لگی۔ پھر اچانک دو سال بعد میری ماں کے دیئے تحائف دینے میری بہن وہاں آئی تو اُس نے مجھے اتنی بری حالت میں بھی پہچان لیا۔

”میرا دل کہتا تھا بجو! تم زندہ ہو۔ میرا دل کہتا تھا۔“ اُس نے میرے گندے مندے کپڑوں، اُلجھے بالوں کے باوجود اپنے قیمتی کپڑوں کا خیال کئے بغیر اپنے سینے سے لگا لیا۔ تب مجھے لگا، محبت ہے دنیا میں...... شافعہ! کیا واقعی محبت میں ایسا ہوتا ہے؟ بندہ بری ترین حالت میں بھی کسی اپنے کو پہچان لے؟“

شافعہ اُس کا ہاتھ تھام کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ثانیہ کی ہی نہیں، اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ باتوں میں کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ثانیہ ہاتھ روکے کہانی کہنے لگی تھی اور شافعہ بھی ڈیوٹی بھول کر اسے سننے لگی تھی۔ سو کہانی ختم ہوئی تو شافعہ مائیکرو ویو اوون میں کھانا گرم کرنے کے لئے کچن میں گئی تھی۔ پھر دس منٹ بعد وہ کھانا کھا چکی تھیں۔ یہ وقت ثانیہ کے آرام کا وقت ہوتا تھا۔ سو وہ اُسے سہارا

دیتے ہوئے اُس کے کمرے تک لائی تھی۔ اُسے لٹا چکی تو بولی۔ ’’میم! آج کچھ سنائیں گی نہیں؟ آج دل بہت اُداس ہے۔‘‘
ثانیہ نے اُس کی طرف دیکھا اور تکیے کے نیچے رکھی ڈائری اُٹھائی۔ تصویر سائیڈ ٹیبل پر آج بھی اوندھی رکھی تھی۔ اُس نے سر تکیہ پر ڈال کر نظم کہنی شروع کردی تھی۔
’’چاند کبھی تو تاروں کی اس بھیڑ سے نکلے
اور مری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا
میں اس کو بانہوں میں بھرلوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب وہ باتیں کرلوں
جو مرے تالو سے چمٹی
دل میں کمتی رہتی ہیں
سب کچھ ایسے ہی ہوجائے، تب ہے ناں
چاند مری کھڑکی میں آئے، تب ہے ناں‘‘
شافعہ نے دیکھا، بستر پر لیٹی ہوئی کمزور چہرے والی لڑکی یکدم بیس برس کی لڑکی کی طرح بلش کرگئی تھی۔ اُس کی پلکوں میں ہلچل تھی۔ رو رہی تھا۔ مگر وہ چاند....... وہ چاند کہاں تھا۔
میرے دل کا چاند بھی تو....... شافعہ نے ہولے سے خالی ہتھیلی پھیلائی۔
سامنے لڑکی کے ہاتھ بھی خالی ہو کر پھیلے ہوئے تھے اور اُس کا دل چاہ رہا تھا، وہ اور ثانیہ چپکے سے کسی فٹ پاتھ پر ایسے ہی سر جھکا کر بیٹھ جائیں۔ لوگ اُنہیں فقیر سمجھیں۔ کوئی اِن کے برابر کی توجہ خالی دامن میں ڈالے تو کوئی پانچ روپے کے برابر محبت جھولی میں سرکا دے۔ خالی دامن بھرتا جائے، بھرتا ہی جائے۔ مگر یہ وضع دار دل، یہ عزتِ نفس کا مارا ہوا نفس..... کیا یہ اس جھوٹی محبت کا سم امرت کہہ کر پی سکے گا؟

انہوں نے آنکھیں موندیں تو ابا چلے آئے، آنسوؤں سے بھیگے ہوئے...... اماں در آئیں، دُکھ میں ڈوبی ہوئیں۔
''مت جاؤ بیٹا! تیرے ابا یہ غم سہہ نہیں سکیں گے۔'' کوئی آواز اُبھری وردل سے اُٹھ کر سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔
''مجھے بددعا لگ گئی اماں کی۔''
ماں کبھی بددعا نہیں دیتی۔ بددعا تو ہمارے اعمال خود ہو جاتے ہیں...... انہیں بھی ضد، خودسری نے بددعا کی طرح خود سے چمٹا لیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا، مسٹر عمرانی ابھی تک نشے کی ترنگ میں تھے۔ بیگم عمرانی کی آنکھوں میں اماں کے آنسو بھی آن رکے تھے۔
''یا اللہ! معاف کردے...... مجھے معاف کردے کہ تو بہت معاف کرنے والا ہے۔''
مگر کیا معافی اتنی آسانی سے مل سکتی ہے......؟ جب دل دُکھے ہوں تو وہی دُکھ دل کے اندر اُترنے سے پہلے زندگی کبھی معاف نہیں کرتی...... اب اور کون سا دُکھ رہ گیا ہے جو بھوگنا ہے دل کو...... انہوں نے بے بسی سے سوچا اور ایک دُکھ تھا کہ آنکھیں مل کر جاگ گیا تھا۔
زندگی گنوانے کا جو دُکھ میں نے جیا، وہ دُکھ تم جیسے بغیر اس کٹہرے سے آزاد نہیں ہوسکتیں...... اور یہ طے ہے، کبھی کبھی کسی ایک کی غلطی سارے گھر کو بھی بھگتنی پڑتی ہے۔



زہرہ جنید سامنے بیٹھی تھیں اور انہیں حیرت نے آلیا تھا۔ اتنا بڑا لون صرف اُن کے ایک عام سے فلیٹ پر منظور ہو گیا تھا۔ کبھی اُن کا خیال تھا، یہ ملک کبھی ترقی نہیں کرسکتا، جب تک کہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو یا اداروں کو مضبوطی اور پاور نہیں بخشی جاتی، لیکن آج وہ اسی حُسنِ سلوک پر انگشت بدنداں تھی۔
''آپ نے چیک کرلیا، مسٹر رفیع عثمانی! یہ لون شاکرہ ہسپتال کے ہی لئے پاس کیا گیا ہے؟''
مسٹر رفیع عثمانی نے مسکرا کر زہرہ جنید کو دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ ''میم! آپ نے ابھی سارے ڈاکومنٹس خود چیک کئے ہیں، پھر اتنی بے اعتباری...... یہ ٹھیک نہیں ہے میم! کامیابی کے لئے اپنے اوپر، اپنی صلاحیتوں پر اعتبار کرنا آنا چاہیے۔''

”آپ کو لگتا ہے، مسٹر رفیع عثمانی صاحب! ہم آپ کا لون اور ہر مہینے کا انٹرسٹ چکا سکیں گے؟“
انہوں نے نئے طریقے سے رفیع عثمانی کو جانچنے کی کوشش کی اور وہ مسکرانے لگے۔
”میم جنید! اگر اس طرح کی باتیں آپ نے دیگر بینک آفیسرز کے سامنے کیں تو شاید وہ اپنے فیصلے پر ایک بار پھر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“
”لیکن رفیع عثمانی صاحب! مجھے یہ بات حیرت میں مبتلا کر رہی ہے کہ چھ ماہ تک آپ کے کاغذات کی تھرو ہم پر قسط کی ادائیگی کے لیے سختی نہیں برتی جائے گی۔ جو قسط کی مد میں ہم آسانی سے جمع کروا دیں گے۔ آپ کا بینک اسے قبول کر لے گا، یہ بینک کی انتہائی دریا دلی ہے۔“
مسٹر رفیع عثمانی نے مسکرا کر دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولے۔ ”اگر یہ بزنس لون کے حوالے سے ہوتا تو شاید ہمارے رُول اور ریگولیشن ذرا سخت ہوتے۔ مگر یہ ایک ٹرسٹ ہسپتال کے قیام کا منصوبہ ہے۔ اس لیے حکومت اور پھر صنعت کار طبقے کی سپورٹ حاصل ہے آپ کو۔ پھر آپ کا عزم اسی بات سے واضح ہے کہ ابھی جتنا ہاسپٹل تیار ہے، آپ نے اسی میں قوم کی مسیحائی کا کام شروع کر دیا ہے۔ پھر ہمیں یہ گمان کیونکر ہو کہ آپ اپنا لون واپس نہیں کر سکیں گی؟ پُر عزم لوگ الگ سے پہچانے جاتے ہیں میم! بس ہم نے پہچاننے کا کام کیا ہے، اسے ثابت کرنے کا کام آپ کا ہے۔“
زہرہ جنید کچھ مطمئن ہوئیں، کچھ نہیں ہوئیں اور اپنے کاغذات اُٹھا کر رقم اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا کر گھر لوٹ آئیں۔ سلامہ ارسلان آج گھر میں ہی تھا۔ دونوں بچے اُس کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ عارفہ، سلامہ کے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی میتھس کے مشکل سوال سلامہ کی مدد سے حل کر رہی تھی۔ زہرہ کی طرح عارفہ نے بھی میڈیکل ہی جوائن کی تھی۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے بجائے تعلیم کے سلسلے میں سلامہ اور زہرہ سے مدد لیتی تھی۔ کالج کے بعد اُس کے اس طرح گھر میں بند رہنے کو اماں سمیت وہ تینوں بہت محسوس کرتے تھے، مگر وہ کہتی تھی۔ ”بس مجھے گھر سے باہر جانا اچھا نہیں لگتا تو میں کیا کروں؟“
زہرہ جنید نے ایک بار زیادہ پوچھا تو بولی تھی۔
”نائمہ بجو کو جس طرح راستوں نے کھا لیا ہے، میں ڈرنے لگی ہوں کہ مجھے بھی یہ راستے، یہ منزل کا گمان کہیں نگل نہ لے۔ میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگی ہوں۔ ہر قدم پر گمان ہوتا ہے، شاید غلط سمت اُٹھنے والا قدم ہے۔ مگر پھر آپ کا اعتبار، اماں کا پیار مجھے مضبوط کر دیتا ہے کہ اتنے تلخ تجربے کے باوجود آپ لوگوں نے زندگی کو اور مجھے ایک مارجن دیا۔“
زہرہ کمرے کی دہلیز میں کھڑی ہوئی ابھی تک عارفہ کو دیکھ رہی تھی۔ نائمہ کے جانے سے وہ بہت پژمردہ ہو گئی تھی۔ ہلکی سی آواز سے بھی اُس کا سانس اتنا تیز چلنے لگتا تھا، مانو ابھی دل بند ہو جائے۔

”کیا پڑھا جا رہا ہے؟“ انہوں نے عارفہ کے کندھوں پر ہاتھ دھر کر سوال کیا اور وہ مسکرانے لگی۔

”کل کے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی ہوں بجو! اور کیا کروں گی؟ آپ کو تو پتہ ہے، میرے چار سال پہلے ہی ضائع ہو چکے ہیں، اس لئے محنت دُگنی کروں گی تبھی تو لسٹ میں نام آئے گا۔“

زہرہ نے کچھ کہے بغیر اُس کے کندھے پر یقین سے یوں ہاتھ رکھا، جیسے کہہ رہی ہوں، مجھے تمہاری صلاحیت پر بہت یقین ہے، جیت تمہاری ہوگی.......

عارفہ پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی تھی، جب زہرہ نے سلامہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ”سلامہ! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، ذرا میرے کمرے میں تو آؤ۔“

بچے اُس کے ساتھ اُٹھنے لگے تھے کہ انہوں نے فوراً منع کیا۔ ”نو، نو بیٹا! آپ نانو کے پاس جائیں گے، مجھے آپ کے ماموں جان سے بہت پرسنل میٹر ڈسکس کرنا ہیں۔“

بچوں نے برا سا منہ بنایا۔ سلامہ اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے واپس آ کر دوبارہ جوائن کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے باہر نکل گیا، پھر زہرہ کے کمرے میں پہنچا تو زہرہ ایزی چیئر پر بیٹھی ہوئی سوچوں میں غلطاں جھومے جا رہی تھیں۔

”جی بجو! آپ کیا ڈسکس کرنا چاہتی تھیں؟“

زہرہ جنید نے جھولنا ترک کر دیا، پھر اُس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ”تمہارا زرد صحافت کے بارے میں کیا خیال ہے سلامہ؟“

سلامہ اُن کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”ظاہر ہے بجو! زرد صحافت کے متعلق میری بھی رائے یہی ہے کہ یہ بہت غلط راستہ ہے۔ اس پر چلنے والے خواری کے سوا کچھ نہیں اُٹھاتے۔“

زہرہ جنید کی آنکھیں اُس پر آ کر بالکل فوکس ہوگئیں، پھر وہ آہستگی سے بولیں۔ ”تمہارا کیا خیال، میں تمہارے ملک میں زرد صحافت کی توسیع میں کتنے اخبار شامل ہیں؟“

سلامہ نے اُنہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”سیدھی سی بات ہے بجو! اچھی صحافت کے تذکرے یا تو ماضی میں ملتے ہیں یا رائٹر کی کہانیوں میں۔ وگرنہ جو عقل اور شعور رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ آج کل اخبار یا تو اسٹیبلشمنٹ کے بل پر چلتا ہے یا بیوروکریسی کے کندھوں پر اپنا بوجھ کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشتہارات، خبروں کا حصول، جی ایچ کیو کی نظر عنایت، یہی پہلی چوائس ہوتی ہیں کسی بھی اخبار کی۔ سو بڑے بڑے اخبار بھی اس جنگ سے نہیں بچ پاتے۔ ایک دو سیمی خبریں اور بہت ساری معمول کے مطابق نیوز، یہی کرائے ٹیریا ہے، اس لئے ٹوٹلی وائٹ کالم صحافت تو آپ کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔“

زہرہ جنید کے چہرے سے لگا، وہ اُس کی لفاظی سے متاثر نہیں ہوئیں کیونکہ اُن کا اگلا سوال تھا۔ ”سب سچ، پھر بھی کچھ اخباروں کے نام صرف زرد صحافت کی شہرت سے جگمگاتے ہیں۔“

سلامہ نے دو تین نام لئے مگر اب زہرہ جنید اس کے قریب اُٹھ کر آ گئی تھیں۔ انہوں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں، پھر سرسرائے لہجے میں بولی تھیں۔

''وی ایچ'' شاید یوسفی صاحب کا انگلش اخبار ہے ناں؟ یہ تو اس صحافت کا بے تاج بادشاہ ہے۔ سلامہ! مجھے حیرت ہے، تم نے اس اخبار کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ تم تو اس اخبار کے سب کچھ ہو۔''

سلامہ ارسلان نظریں چرا گیا تھا۔ وہ اتنی تفصیل سے جاننے کی ضد سے ہی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے، مگر یہ ملا اس انکوائری سے بھاگتا تو مہر ہی لگ جاتی زرد صحافی ہونے کی ابھی کچھ گنجائش تو باقی تھی...... مگر یہ اُس کی سوچ تھی۔ کیونکہ دس منٹ تک زہرہ نے جس طرح اُس کے قلم کو رگیدا تھا، اُسے تنقید کا نشانہ بنایا تھا، اس نے اس امکان کو آدھی موت دے دی تھی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھیں اور نئے سرے سے اُس کو ہدف تنقید بناتے ہوئے بولی تھیں۔

''سلامہ ارسلان! پہلے میرے کولیگ، تمہارے دوست کہتے تھے تم جھوٹے، ابن الوقت صحافی ہو۔ پیسے کے لئے کچھ بھی کر گزرتے ہو، تمہارے لئے اصول کا مطلب بے چارگی کی موت ہے...... مگر میں یہ سب سن کر انکار کر دیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا، تمہیں نائمہ کے غم نے پاگل کر دیا ہے، اس لئے تمہارے بولنے کا ذائقہ بدمزہ اور کھردرا ہو گیا ہے۔ میں سمجھتی تھی، تم اونچے ایوانوں میں کامیابی کے جھنڈے لگا رہے ہو تو یہ قابل فخر بات ہے کہ مڈل کلاس میں سے کوئی ہے، جو اپنے حصے کا قرض کامیابی کی صورت اُتار رہا ہے...... مگر کچھ دنوں پہلے مجھے پتہ چلا کہ اونچے ایوانوں میں تمہاری کامیابی صرف تمہاری بلیک میلنگ کی وجہ سے ممکن ہو سکی ہے۔'' انہوں نے اب اس کا کندھا تھام کر دکھ سے کہا تھا۔ ''سلامہ! تم نے اماں کے نام سے بننے والے ٹرسٹ ہسپتال کی زمین بھی دھونس اور بلیک میلنگ سے حاصل کی ہے ناں؟''

سلامہ نے شفاف آنکھوں سے اُنہیں دیکھا تھا، پھر بولا تھا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، آپ کے پاس زمین کے قطعی قانونی اور اصلی کاغذات ہیں۔ بجو! آپ خوامخواہ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔''

زہرہ جنید نے اب ٹیبل پر رکھی فائل اٹھائی تھی، پھر غصے سے بولی تھیں۔ ''یہ فائل دیکھو، پورے پانچ کروڑ کا لون مجھے دیا گیا ہے، کیونکہ میں ٹرسٹی ہاسپٹل بنا رہی ہوں۔ تم اندازہ کر سکتے ہو ناں، ایک ایسا ہسپتال، جو ابھی بنیادیں جما رہا ہے، اُس پر پانچ کروڑ...... رفیع عثمانی کہتے ہیں، حکومت اور صنعت کار برادری کا ان پر پریشر ہے کہ اس کام میں مجھے مدد ملنی ہی چاہئے۔ مگر مجھے لگتا ہے، یہ پریشر صرف تمہارے رسوخ کا ہے۔ ہے ناں؟''

''اگر ہے بھی تو آپ کا کیا جاتا ہے بجو! آپ آم کھائیے ناں، گٹھلیاں کیوں گن رہی ہیں؟''

زہرہ جنید سکتے میں بیٹھی رہ گئیں۔ پھر بہت بھرائے، گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ''میرا مقصد کتنا نیک تھا سلامہ! لیکن تم نے اسے رسوائی سے آلودہ کر لیا۔ میری زندگی کتنی شفاف اور صاف ستھری تھی، کبھی شارٹ

کٹ نہیں آئے میری زندگی میں........ میں نے محنت سے جان نہیں چرائی، کبھی پیچھے نہیں ہٹی۔ جنید کے معاملات میں بھی میں نے سچائی کا ساتھ دیا۔ شارٹ کٹ وہاں بھی نہیں لگایا۔ اتنا لمبا راستہ چنا ان تک جانے کا کہ تقدیر کبھی مجھے میری بے ایمانی کا طعنہ نہ دے کہ اپنے سواد، اپنے مزے کے لئے میں نے باقی رشتوں کو ڈبل کراس کیا ہے۔ مگر سلامہ! تم نے........ تم نے میری ساری محنت برباد کردی۔ ابا کا رزق حرام نہیں تھا، پھر تمہارے معدے نے حرام رزق کیسے قبول کرلیا؟........ کیسے؟" وہ منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔

سلامہ سکتے کی کیفیت میں اُنہیں دیکھ رہا تھا، لیکن اس لمحے اگر وہ اُنہیں تسلی دیتا تو اُن کا دل پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجاتا، سو سر جھکائے اُن کے کمرے سے نکلتا چلا آیا تھا۔

زہرہ جنید جو کہہ رہی تھیں، جھوٹ نہیں تھا۔ لیکن یہ لون اُس کی کسی دھاندلی دھونس کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا، یہ بھی غلط تھا۔

وہ فوراً باہر نکل آیا تھا۔ پھر سیڑھیوں سے اتر رہا تھا، جب اماں اپنے پڑوس سے میلاد سے واپس آتی دکھائی دیں۔

"کہاں جارہے ہو بچے؟"

وہی شفیق لہجہ، مگر اُسے برا لگا۔ کیونکہ کبھی اسی لہجے میں انہوں نے شہریار کو بھی مخاطب کیا تھا، بلکہ ابھی حال ہی میں وہ ان کی زندگی میں پھر کسی بری یاد کی طرح در آیا تھا۔ اماں کی دعائیں جب سے لمبی ہونے لگی تھیں، اُسے لگنے لگا تھا، جیسے وہ اماں کی دعاؤں اور محبتوں سے لپٹا ہوا واپس اس گھر میں آگیا ہے۔ اس گھر میں، جس کے ساتوں در وہ اُس پر بند کرچکا تھا۔



سطوت جہاں اس وقت بے حد غصے میں ٹہل رہی تھیں۔ اُن کی خاص خادمہ نجمن اُنہیں دیکھ رہی تھی، لیکن کب تک، بالآخر انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ "آخر کیا ہوگیا نشیلی! تمہیں اتنا غصہ کس بات پر آرہا ہے؟"

سطوت جہاں نے چونک کر یوں دیکھا، جیسے وہ ابھی تک خود کو تنہا محسوس کررہی تھیں اور نجمن کی آواز سن کر اب ہوش و خرد نے اُنہیں چھوا تھا۔ مگر جو بات ان میں چل رہی تھی، وہ بات سامنے والی عورت کے حوالے نہیں کرسکتی تھیں۔ یہ بات جیسے اُن کی سب سے لاڈلی اولاد کی طرح تھی، جسے وہ کسی اور کو نہیں دینا چاہتی تھیں۔ سو وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی اپنے مخصوص تخت پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔ نجمن کے ہاتھ سے نئی گلوری لے کر منہ میں دباتے ہوئے بولیں۔

"اے ہے، وہ اس چھٹی زلفی کا کیا حال ہے؟ مجھے تو دوبارہ پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔"

گنجن نے تاسف سے سطوت جہاں کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ ”بہت برے حالوں میں ہے نشلی، وہ ڈاکٹر ایک طرح سے جواب ہی دے چکے ہیں۔ روز غفورے سے کہتی ہے، وہ گھر آنا چاہتی ہے۔ مگر سوچتی ہوں، ٹی وی بڑی واہیات بیماری ہے نشلی! پرائے تو پرائے، اپنے بھی قریب نہیں پھٹکتے۔ اس لئے غفورے کو کہہ دیا ہے، اُس کی مشکل آسان ہو جائے تو وہیں کہیں دفنا دینا۔ لاش تک کو بھی لانے کی ضرورت نہیں ہے اُس کی۔“

سطوت جہاں نے خاص لاڈ کی نظر سے اُسے دیکھا، جیسے وہ اُس کے فیصلے سے خوش ہوئی ہوں۔ دونوں کے درمیان باتوں کی چھکا چھک چلنے لگی تھی۔ جانانہ بھی باہر سے آ کر ان کی باتوں میں شامل ہو گئی تھی مگر اُس کا دھیان بار بار زلفی مائی کی باتوں میں اٹک رہا تھا۔

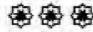
”آنکھیں کھول کر رکھا کرو بنو! تو بہت سادی ہے۔ تجھے نہیں پتہ، دنیا کتنی چلتر ہے۔ سنبھل کے چل۔ کسی کی بات کو اپنے منہ سے کہہ کر اپنی بات کو دھوکا مت دے۔ کسی کی سوچی ہوئی بات کو اپنے دماغ میں پکا پکا کر اس کا زردہ دوسرے کے حلق میں مت ڈال۔ دنیا بڑی بے جگہ ہے بنو! دنیا بڑی بے جگہ ہے۔“

یہ باتیں اس وقت ہوئی تھیں، جب وہ زلفی اماں کو دیکھنے گئی تھی۔ غفورا اُس کے پاس جما کھڑا تھا، اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر دوائیں لینے کی بات آئی، تب وہ اُٹھا تھا۔ غفورے کے اُٹھتے ہی زلفی اماں جو ہاؤ ہو کر کے مری جا رہی تھی، اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر جو کچھ مختصر کیا تھا، وہ اسے حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ خود کو دھوکا دینے کا کاروبار کرتے تھے۔ پھر کون ہے جو ان جیسے زیرک بازو کو چوٹ دے جائے۔ ایک دل آ رہا تھا، سطوت جہاں سے ان لفظوں کا ماحاصل پوچھے لیکن زلفی اماں جس طرح ڈر ڈر کے بولی تھیں، اس کی وجہ سے اُس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو بیٹھی رہی، پھر ایک تازہ چیک اُن کی طرف بڑھا کر بولی۔

”یہ مسٹر سرمد کی محبت کی پہلی قسط ہے ماں! ایسے بہت سے چیک آپ کے ہاتھوں میں آنے کے لئے اُس کی جیب میں تڑپ رہے ہیں۔“

سطوت جہاں مسکرانے لگیں۔ وہ اندر کی طرف بڑھتی چلی گئی تو گنجن نے انہیں آنکھ مار کر کہا۔ ”تو بڑی سیانی نکلی نشلی! نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری، پر رنگ چوکھے کا چوکھا لگا ہے تجھے۔“

سطوت جہاں نے مسکرا کر اُسے دیکھا، مگر اُن کا دماغ اب بھی پہلی بات ہی میں اٹکا ہوا تھا، سو وہ تیزی سے سوچے جا رہی تھیں کہ اس بات کو حرفِ غلط کی طرح کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔ مگر بات پوری سچائی کے ساتھ اُن کے سامنے دھری ہوئی تھی۔



ماما اس وقت کچن میں کھڑی ہوئی کک سے بھی پہلے ناشتہ بنانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں کہ یکدم کچن کا دروازہ کھلا۔ مسٹر عبدالرحمٰن کی آنکھ تھوڑی دیر پہلے کھلی تھی اور وہ انہیں کمرے میں نہ پا کر انہیں ڈھونڈتے ہوئے کچن تک چلے آئے تھے۔

آپ، خیریت ہے آج کچن میں؟ اور وہ بھی اس وقت؟"

"وہ، میں شیری کے لئے ناشتہ بنا رہی تھی۔

"کیا کہا آپ نے، کس کے لئے ناشتہ بنا رہی تھیں؟" مسٹر عبدالرحمٰن کو اچنبھا ہوا اور ماما پزل ہو گئیں، پھر سنبھالا لے کر بولیں۔

"کیوں، میں کیا شیری کے لئے ناشتہ نہیں بنا سکتی؟" لمحہ بھر کو رکیں، پھر مسکرا کر بولیں۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے وہ میری اولاد ہی نہ ہو۔"

"ہائیں، یہ آج سورج کس سمت سے نکلا تھا بیگم! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں وہی سن رہا ہوں، جو آپ کہہ رہی ہیں۔ لیکن اگر یہ خواب ہے، تب بھی میں چاہوں گا کہ میری آنکھ کبھی نہ کھلے۔"

"رحمٰن صاحب! آپ بھی ناں......" ماما نے ناشتہ ٹرے میں رکھا تھا، پھر رات کی اُس کی بے احتیاطی اور ساری رات کی طبیعت کی خرابی کی تفصیل بتانے لگی تھیں۔ پاپا اُلٹے قدموں ہی لوٹ گئے تھے۔ ماما اُس کے لئے کم چینی والی چائے اور براؤن بریڈ کا ناشتہ لے کر جا رہی تھیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن کا ناشتہ بھی تقریباً اُس سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ سو، وہ ٹرے لے کر باہر نکلیں۔ مگر کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے واک سے واپس آتے ہوئے جازی پر نظر پڑی تو اُنہوں نے اُسے روک کر کہا۔

"جازی! یہ ٹرے شہریار کے روم میں لے کر چلو۔"

جازی کسمسا کر بچنا چاہتا تھا، مگر جانتا تھا، ماما کو منع کرنا ناممکن ہے، اس لئے سر جھکائے وہ شہریار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، جہاں کبھی نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ حالانکہ کل کافی رات تک وہ اُس کی بد احتیاطی کی وجہ سے پریشان بھی رہا تھا۔ خفگی نفرت اپنی جگہ مگر کبھی کی جو محبت دل میں گھر کر گئی تھی، وہ ایک دم سے ویسی نکالا نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے دروازہ ناک کیا۔ پاپا صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے ٹرے میز ٹیبل پر رکھی تھی۔ ماما نے حیرت سے مسٹر عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔

"آپ نے ابھی تک اسے اٹھایا نہیں۔"
مسز عبدالرحمٰن نے الوہی مسکراہٹ سے اُنہیں دیکھ کر کہا۔ "نہیں عالیہ! میرا دل نہیں چاہا کہ میں اس کی اتنی پیاری نیند خراب کروں۔ اور پھر آنکھ کھلتے ہی یہ لڑکا قابو میں کہاں رہے گا؟ اُٹھے گا اور بس لگ جائے گا کاموں میں۔ اسے اپنی پرواہی کب رہتی ہے؟"
جازی عبدالرحمٰن کو اتنی تعریفوں کے تذکرے میں شہریار کی ذات کو ڈسکس کرنا قطعی بھلی معلوم نہ ہو رہی تھی، سو اُس نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے، مبادا کہیں کوئی دل شکن جملہ نہ نکل جائے۔ مگر ماما نے عین موقع پر اُس کا یہ پلان ناکام بناتے ہوئے نیا حکم جاری کیا تھا۔
"جازی! بھائی کو اُٹھاؤ۔" جازی عبدالرحمٰن نے برا سا منہ بنایا اور دروازے سے لوٹ کر شہریار کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ ویسے اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ شہریار نیند کا جیسا ہوشیار تھا، اتنی بات چیت کے باوجود ابھی تک کیوں نہیں کسمسایا تھا۔
"شیری بھائی! اُٹھیں، ماما ناشتے پر بلا رہی ہیں۔" اُس نے ناپسندیدگی سے اُس کا شانہ ہلایا، مگر سر سے لے کر پیر تک ایک سنسنی سی تھی، جو پھیلتی چلی گئی تھی۔
"شیری بھائی!........شہریار بھائی!" اس بار اُس نے گھبرا کر بہت سختی سے اُس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تھا۔ اُس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ شہریار نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُسے اپنی تھوڑی دیر پہلے کی حرکت پر ہنسی آنے لگی تھی۔
"کیا ہے؟" شہریار نے بھرائے لہجے میں پوچھا۔
"ماما........ناشتہ........" اُس نے پھر سمجھایا۔
شہریار اب بھی نیند کے خمار سے نہیں نکلا تھا۔ اتنی گہری نیند شاید ہی وہ کبھی سویا ہوگا۔ ماما اُس کی طرف سے جواب نہ پا کر اب خود اُس کے قریب آ گئی تھیں۔
"اُٹھو شہریار! ناشتہ نہیں کرنا ہے کیا؟ دیکھو تو، ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔"
شہریار نے بند آنکھیں پھر سے کھول کر ماما کو دیکھا۔ کل رات کی بات جیسے اُس کے دماغ میں خواب کی طرح فیڈ ہوئی تھی۔ وہ اس وقت حیرت سے ماما کو دیکھ رہا تھا۔

"ماما! آپ........؟"

"ناشتہ شہریار! چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" تھرماس سے پاپا نے اپنے کپ میں چائے انڈیلی تھی۔

ایک نظر ماما کو دیکھ کر دوسری نظر پاپا پر جا کر جھک گئی تھی۔ جازی عبدالرحمن بلاوجہ کھڑا تھا۔ حالانکہ وہ فوری طور پر جانا چاہتا تھا۔ جانے کس بات نے اُس کے قدم روک لئے۔ کیا وہ اُس کی خیریت کی فریش رپورٹ لینا چاہتا تھا؟ اُس نے دل سے سوال کیا، جواب ندارد پایا۔ اُس نے اب بھی اُٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی

"مام! آج میں دفتر نہیں جا سکوں گا شاید۔"

"کون کہہ رہا ہے، دفتر جاؤ۔ لیکن ناشتہ تو کر لو بیٹا!"

جازی کے دل میں پھر سے ہلچل ہونے لگی تھی۔ کیا طبیعت زیادہ خراب ہے؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھے بغیر پاپا کے سامنے رکھے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ پاپا نے حیرت سے اُس کی یہ حرکت دیکھی تھی، مگر شہریار نے حیرت کا اظہار کرنا بھی ضروری نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ بہ وقت تکیے سے ماما کا سہارا لے کر اُٹھا تھا۔ اُسے اپنے اسٹیمنا پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ جب اکیلا تھا تو اس سے بھی زیادہ بری حالت کے باوجود دوسرے دن دفتر کا قصد کرتا تھا اور آج سو میں سے تیس فیصد طبیعت کی خرابی پر اُس کا جسم اُس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔

'محبت طاقت ہوتی ہے یا کمزوری؟' دل نے سوچا اور کہیں اندر سے جواب دیا۔

'ترسے ہوئے پیاسوں کو بوند بھی مل جائے تو اس سیرابی کے دھوکے سے بھی ان کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔'

"کیا ہو گیا ہے بیٹا! آپ اتنے کمزور تو پہلے کبھی نہیں تھے۔" ماما کو بھی اُس کے اس رویے سے فکرمندی ہونے لگی تھی۔

اُس نے خود کو لاکھ کہا۔ ہمت کرو شہریار تم ابھی اتنی بری حالت میں نہیں ہو، مگر اعصاب نے ساتھ ہی نہیں دیا تھا۔ پاپا تک گھبرا کر اس کے قریب آ گئے تھے۔

"جازی! بھائی کا ناشتہ یہیں لے آؤ۔"

ماما نے اور حکم دیا۔ وہ جلبلاتا ہوا ٹرے لے کر ماما تک چلا آیا۔ پھر پاپا اور ماما نے ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا، بلکہ آج ماما نے کم کھایا تھا اُسے زیادہ کھلایا تھا۔ اس نے لاکھ انکار کیا مگر ایک نہیں مانی گئی۔ جازی

نے پہلے کے مقابلے میں چہرے پر رونق دیکھی تو فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ اُس نے اُس کی پشت کو دیکھا اور سوچا۔

جازی! کیوں ہو تم اتنے ظالم کہ دل کہی کہہ نہیں پاتے کہ تمہیں میری پروا ہے، میری تکلیف سے تمہاری سانس رکنے لگتی ہے۔ مگر پتہ نہیں یہ محبت نے کھونے میں ہی اقرار کا مزہ کیوں رکھا ہے۔ جب تک محبت گنوا نہ دیں ہم، ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کس سے محبت کرتے تھے۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ماما نے ملازم کو انٹر کام سے کہہ کر ناشتے کے برتن لے جانے کا حکم دیا، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

''تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہیں ڈاکٹر صمدانی کے کلینک پر لے جاؤں گی۔''

''آپ مجھے کلینک لے جائیں گی؟'' وہ ہنس دیا۔

ماما نے برا منایا۔ ''کیوں، میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ کیا میں بری ڈرائیور ہوں؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا، پھر مسکرا کر بولا۔

''مجھے آپ کی ٹینشن پر ہنسی آ رہی ہے مام!'' لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''میں نے کل رات کو آپ کو جی بھر کر ستایا تھا، آپ کو محسوس تو ہوا ہوگا، جیسے بچپن سے لے کر اب تک کی ساری تنگ کرنے کی حسرت نکال لی ہو میں نے۔''

ماما کچھ نہیں بولی تھیں، اُس کا گال تھپتھپا کر باہر چلی گئی تھیں۔ اُن کے جاتے ہی اُس نے موبائل کی طرف نظر کی تھی۔ ماما نے موبائل آف کر رکھا تھا۔ اُس نے موبائل آن کیا لیکن پھر بھی موبائل میں زندگی نہیں دوڑی۔ کل ہاتھ سے چھوٹ کر موبائل ماربل کے فرش پر اُس کی طرح بہت زور سے گرا تھا، یقیناً یہ فالٹ اسی کا ہوگا۔ اُس کی کمر بھی درد کر رہی تھی۔ اُس نے کچھ لمحے کے لئے سوچا تھا، پھر بیڈ سے پیر اُتار رہے تھے کہ یکدم اُس کے کمرے کا ایکسٹینشن بجنے لگا۔

''صبح ہی صبح کون ہے؟'' آج وہ بالکل آرام کرنے کے موڈ میں تھا مگر فون اٹھانا مجبوری تھی۔ دوسری طرف عاطف کی آواز سن کر اُس کے اندر ٹھنڈے میٹھے احساس نے نم دیا۔

''تم.......خبیث! رات کو سویا بھی تھا یا ٹیلی فون پر جھولتا رہا تھا؟'' وہ اُٹھتے اُٹھتے پھر لیٹ گیا تھا اور دوسری طرف عاطف بیگ گڑ بڑا گیا تھا۔

''کیا ہے یار! تیرے موبائل کو کیا ہوا ہے؟ کل کتنی دیر تک تجھے ملاتا رہا ہوں، پہلے تو بیل جا رہا تھا، پھر پاور آف آنسر آنے لگا۔ تجھے پتہ نہیں ہے، میں نے رات کتنی پریشانی میں گزاری، آخر ہوا کیا تھا؟''

اُس نے ریسیور کان سے لگا کر اُس کی ساری ہراسگی اپنے دل میں اتاری، پھر نرمی سے بولا۔ ”تھوڑی سی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔“

”تھوڑی سی طبیعت........کیوں، کیا ہوا تھا؟“ وہ تفصیل لینے لگا۔ اُس نے کل کی تفصیل بتائی تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ ”احمق اعظم! کیوں اپنے دشمن بنے ہوئے ہو؟“ لمحہ بھر کو رکا، پھر مکرر بولا۔ ”آج پہلی فرصت میں انکل صمدانی کے کلینک جاؤ۔ مجھے آثار اچھے نہیں لگ رہے۔ اگر نہیں گئے تو شام کی فلائٹ سے کراچی آرہا ہوں میں۔“

شہریار نے فوراً اُسے ٹوک دیا۔ ”نہیں اوئے، کراچی مت آ۔ میں ڈاکٹر صمدانی کی ڈیوٹی بجالوں گا۔“

عاطف بیگ نے قہقہہ لگایا، پھر خفگی سے بولا۔ ”بہت بری بات ہے شیری! دولت کی آمد پر ایسا ریسپونس۔ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ شرارتی بچہ کراچی بھیجا گیا اور خط آنے پر جواب لکھا گیا۔ ”آپ سیلاب کراچی بھیج دیں، ہم آپ کا بچہ واپس ڈی پورٹ کررہے ہیں۔“ یعنی بالکل ہی لاحول ولاقوۃ۔“

شہریار نے زور سے قہقہہ لگایا مگر آدھے قہقہے ہی میں دم بخود ہوگیا۔ کتنی ساعتوں تک اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ دوسری طرف عاطف کی پریشانی، شہریار نام کی گردان۔ اس نے نرمی سے کہا۔

”میں تمہیں خود فون کرتا ہوں، اس وقت مما میرا انتظار کررہی ہیں عاطف!“

عاطف بیگ رابطہ منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر اُس کے جملے کی وجہ سے اُسے رابطہ منقطع کرنا پڑا۔

وہ فون رکھ کر شاور لینے اُٹھ گیا تھا۔ یہ اور بات، بہت ہمت مجتمع کر کے اُس نے یہ کام کیا تھا۔ سوکپڑے بدل کر باہر آیا تو پورا سے پسینے میں شرابور تھا۔

”بیٹا شہریار! لگتا ہے، اُلٹی گنتی شروع ہوگئی ہے، خطرے کی گھنٹیاں بہت تیز تیز بجنے لگی ہیں۔“ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کرسی پہ بیٹھ کر فل اے سی میں خود کو ٹھنڈا کیا تھا، پھر موبائل جیب میں ڈال کر والٹ اُٹھائے وہ ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نظر دانیا پر پڑی تھی۔ شاید ماما نے اُس کی طبیعت کی بابت اُسے بریف کیا تھا، کیونکہ اس کا چہرہ کچھ اترا ہوا تھا۔

”چلئے ماما! میں تیار ہوں۔“ اُس نے دروازے کو تھام رکھا تھا۔ درد اب بھی سینے میں بہت تیزی سے سر مار رہا تھا، جیسے کوئی شوریدہ سمندر کہ سب بہا لے جائے، مگر اُس نے استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ماما اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دانیا اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ جازی کے برخلاف شہریار کی طبیعت کا سن کر اس کا پیر گھر سے نکل ہی نہیں سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ سامنے کے مرر میں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ شہریار اُس کی نظروں کے حصار سے ناواقف نہیں تھا، لیکن اس وقت وہ کوئی ردِعمل دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

وہ کلینک میں آ چکے تھے، مگر ڈاکٹر صمدانی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اُن کی کار باہر آ کر رکی تو دانیا تیزی سے باہر نکلی تھی۔

"خیریت ہے دانیا؟" ڈاکٹر صمدانی نے اُس کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا اور وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"بھائی...... مجھے بھائی کی طبیعت کچھ اچھی نہیں لگ رہی ہے انکل!"

ڈاکٹر صمدانی نے اپنے کمرے میں جاتے ہی سب سے پہلے اسے بلایا تھا۔ پھر اُس کا مکمل چیک اپ کرنے کے لئے انہوں نے دانیا اور ماما کو باہر رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ اکیلے ہوئے تو بولے۔

"آ گیا مزہ۔ بے احتیاطی ہمیشہ ایسے ہی دُکھ دیتی ہے۔" وہ کچھ نہیں بولا اور وہ اُس کے سر پر کھڑے ہو کر بولے۔ "کل ایک ڈنر میں میری ڈاکٹر نواز سے بات ہوئی تھی۔ وہ کسی مریض کا کیس تجربے کی بنیاد پر میری رائے لینے کے لئے بیان کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، مریض کی عمر اتنی نہیں ہے، لیکن اندرونی طور پر وہ بہت تیزی سے ڈیج ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل آپریشن تجویز کیا گیا ہے۔ مگر مریض اتنا مصروف ہے کہ وہ آپریشن کے لئے بھی ٹائم نہیں نکال سکتا۔ سو وہ مجھ سے کچھ اچھی دواؤں کے متعلق سیر حاصل بحث کر رہے تھے کہ اُس کا کیس اُس کی فرصت تک سنبھالا جا سکے۔"

شہریار منہ کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر ناپسندیدگی اتر آئی۔ "ڈاکٹر نواز نے ڈاکٹری ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ بہت بری مثال ہے کہ ایک مریض کا کیس کسی ڈنر میں ڈسکس کیا جائے۔"

ڈاکٹر صمدانی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر دل سوزی سے بولے۔ "اس کا مطلب ہے، میرا شک درست نکلا۔ تمہیں آپریشن ہی تجویز کیا گیا ہے۔"

وہ اس اچانک حملے سے گڑبڑا گیا تھا۔ کیا وہ ٹریپ کیا گیا ہے؟ اُس نے سوچا اور وہ اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے، پھر آہستگی سے بولے۔

"پہلی دفعہ جب تم ہاسپٹل آئے تھے، تمہارے والٹ سے کچھ کاغذات نکلے، جن میں صرف دواؤں کے نام شو تھے، تمہارا نام نہیں لکھا تھا۔ شاید یہ تمہاری احتیاط پسندی کی وجہ سے تھا، ورنہ دواسے بھی پہلے ہمیشہ مریض کا نام اور عمر ضرور درج کی جاتی ہے۔ ان پرچیوں میں لکھی ہوئی کچھ دوائیں ڈاکٹر نواز کے کلینک کی تھیں اور کچھ باہر کی لکھی گئی تھیں۔ وہ نسخہ جات تمہاری فیملی سے جان پہچان کی وجہ سے ڈاکٹر سہیل نے مجھے سونپے تھے۔ ڈاکٹر نواز کے دستخط کے ساتھ دواؤں کی ہائی پوٹینسی بتاتی تھی کہ معاملات بہت گڑبڑ ہیں۔ مجھے شک ہوا تھا اس لئے تم سے دواؤں کے نام اُگلوانے کے لئے میں نے سخت جان ماری کی تھی، مگر تم نے اُس دن بھی ٹھیک دواؤں کے نام نہیں بتائے تھے، دو تین گولیوں کے نام چھپا گئے تھے۔ جانتے تھے، مجھے معلوم ہوئے نا تو میں کیس ہسٹری کی جڑ تک چلا جاؤں گا اور تمہارے لئے بہت پرابلم کری ایٹ ہو جائے گی۔ وہ تو تمہاری قسمت تم سے زیادہ اچھی ہے کہ ساری عاقبت نا اندیشی کے باوجود تم مرے نہیں۔"

کچھ لمحوں کے لئے انہوں نے سانس لیا، پھر اسی غصے سے بولے۔ ’’پہلے دن تمہاری جو حالت تھی، وہ صرف انجائنا اٹیک شو نہیں کررہی تھی، مجھے لگ رہا تھا، کچھ مس ہورہا ہے۔ اور اب دیکھ لو، وہ کچھ مس ہونا کیسے پھر سے اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔‘‘

وہ خاموش ہو کر اُس سے طبیعت کی تفصیل لینے لگے۔ پورا قصہ سنتے سنتے اُن کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ پھر جب وہ اپنی بے ہوشی کے معاملے پر پہنچا تو انہوں نے گھبرا کر اُسے دیکھا تھا۔

’’کیا ہوا، آپ گھبرا کیوں رہے ہیں؟‘‘

ڈاکٹر صمدانی نے اسٹیتھو اسکوپ اُٹھایا اور اُس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگے۔ اس سے نمٹے تو اُس کی نبض کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہوئے تو ان کی پوری توجہ اُس کی طرف ہی تھی۔ آنکھوں میں بے طرح غصہ تھا۔

’’پلیز انکل! آپ کس بات پر اتنا غصہ کررہے ہیں، مجھے بتائیں گے؟‘‘

انہوں نے ایک لمحے کے لئے اُس کی طرف دیکھا تھا اور بولے تھے۔ ’’تمہارا بلڈ پریشر جس دھماکے کی طرف اشارہ کررہا ہے، تم جانتے بھی ہو، وہ کیا بات ہے؟‘‘

’’آپ بتایئے ناں، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔‘‘ اس نے نرمی سے پوچھا۔

وہ سرسرائے لہجے میں بولے۔ ’’تم جسے بلڈ پریشر کا شوٹ کر جانا سمجھ رہے تھے شیری! وہ ایک بہت ہی مائل اٹیک تھا۔‘‘

’’مائل اٹیک...... لیکن انکل! میں نے تو سنا ہے، پہلا اٹیک کبھی مائل اٹیک نہیں ہوتا۔‘‘

’’ہاں، عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن کچھ کیسز میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کلاٹ بہت معمولی سا ہو اور اس کی وجہ سے دل اپنی کارکردگی میں تھوڑا سا تعطل لے لے تو بے ہوشی فطری بات ہے۔ لیکن آخری کوشش کے طور پر اگر دل پریشر کے ذریعے اس کلاٹ کی رکاوٹ کو دور کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اٹیک کی بے ہوشی کسی طبعی امداد کے بغیر خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن تم سمجھ سکتے ہو، کسی بڑے زلزلے سے پہلے جس طرح چھوٹے چھوٹے شاک آتے ہیں، یہ انہی میں سے ایک تھا۔ تمہیں معلوم ہے ناں، زلزلہ کب اور کیسے اچانک آجائے، کیا کچھ زمین میں دفن کردے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شہریار! اگر آپریشن نہیں کیا گیا تو آئندہ آنے والا اٹیک صرف دس سیکنڈ میں تمہاری زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں، اس بات کو......‘‘

شہریار نے آہستگی سے جھکا ہوا سر اُٹھایا، پھر خود اعتمادی سے بولا۔ ''کیا آپ آپریشن کے بعد میری زندگی کی گارنٹی دے سکتے ہیں انکل؟''
''زندگی کی گارنٹی تو شاید کوئی نہیں دے سکتا شہریار!'' انہوں نے بے بسی سے اُسے دیکھا تو وہ مدھم ہو کر بولا۔
''پھر انکل! زندگی کی گارنٹی جس کے پاس ہے، ہمیں اُس پر بھروسہ کرنا چاہیے ناں۔ دیکھئے، بہت سے ادھورے کام ہیں میرے، انہیں تمنائے بغیر میں اس رسک میں نہیں اُترنا چاہتا۔ بس ہو سکے تو کچھ اچھی دوائیں لکھ دیجیے، جو میرے کاموں کے پورے ہونے تک میرا ساتھ دے سکیں۔''
''تم آگ سے کھیل رہے ہو شہریار! میں عبدالرحمن سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تمہیں نہیں پتہ، تمہاری کنڈیشن عبدالرحمن کے مقابلے میں بھی تیس فیصد زائد خراب ہے۔ اگر بروقت علاج نہ ہوا تو پھر کرنے جیسا کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔'' ڈاکٹر صمدانی واپس اپنی کرسی کی طرف بڑھ رہے تھے، جب اُس نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
''میں نے کبھی کوئی ضد نہیں کی آپ سے کبھی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔ اس لئے پلیز! زندگی میں پہلی بار آپ سے زبان بندی کا عہد فرمائش کے طور پر مانگ رہا ہوں۔ پرامس، تمام عمر پھر کبھی کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔''
''کسی فرمائش کے قابل بچو گے تو کرو گے ناں۔'' ڈاکٹر صمدانی نے غصے سے بھنا کر کہا۔
لیکن شہریار اُن کی ٹون سے سمجھ گیا تھا کہ وہ اب اس بات کا عہد کر چکے ہیں اور عہد میں وہ بھی اسی کی طرح پکے تھے۔ ڈاکٹر صمدانی اُس کے لئے نئی ہائی پوٹینسی کی گولیاں تجویز کر رہے تھے۔ دو انجکشن بھی بازو میں اتارے گئے تھے۔ سو جب دروازہ کھلا تو دانیا اور ماما کے چہرے آدھے گھنٹے کی اس میٹنگ پلس چیک اپ کی وجہ سے بالکل اُتر گئے تھے۔ اب وہ دونوں بھی کمرے میں آ چکی تھیں۔ کلینک میں پہلا نمبر انہی کا تھا، اس لئے انہیں تسلی تھی، تفصیل سے بات ہو سکے گی۔ ماما نے تفصیل پوچھی تھی اور ان کی جگہ شہریار نے کہا تھا۔
''کوئی خاص بات نہیں ہے ماما! بہت معمولی سی تکلیف تھی۔ شاید مسکولر پین تھا۔ اب ہر وقت دل کی تکلیف ہی ہو، یہ ضروری تھوڑی ہے۔''
انجکشن سے طبیعت میں واقعی بہتری آئی تھی، اس لئے وہ بہت فراٹے سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی صرف اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ ایک فیک نسخہ بھی لکھا گیا تھا، جو ماما نے لے کر بیگ میں رکھ لیا تھا۔ پہلا نسخہ وہ کوٹ کی جیب میں دروازہ کھلنے سے پہلے ہی رکھ چکا تھا، اس لئے گھر آیا تو طبیعت بہت حد تک معمول کے مطابق تھی۔

''مام! میں دفتر جا رہا ہوں۔''

''پاگل ہو گئے ہو ہمدانی بھائی نے ریسٹ کا کہا ہے بیٹا!''

''بس مام! اب طبیعت بہتر ہے، اس لئے میرا نہیں خیال، مجھے گھر میں رہ کر آرام کرنا چاہئے۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔ ڈرائیور نے ساتھ چلنے کی فرمائش کی مگر اُس نے دم چھلا ساتھ لئے پھرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا، ریلیکس بھی نہیں ہوا تھا کہ بہت غیر متوقع جو شخص اُس کے دفتر میں پیون کے منع کرنے کے باوجود اندر گھستا چلا آیا تھا، اُس نے اُسے بے طرح ڈسٹرب کر دیا تھا۔

''تم......'' اُس نے بہت مدھم پوچھا اور اُس کی جگہ پیون منمنایا۔

''سر! یہ منع کرنے کے باوجود اندر آئے ہیں، اس میں میری کوئی غلطی......''

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پیون کو روکا، پھر نرمی سے بولا۔ ''اِٹس او کے، یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ آپ پلیز، ان کے لئے اچھی سی کافی بھجوائیے۔''

''میں کافی نہیں پیتا۔'' اُس نے اسی رُوڈ سے لہجے میں کہا۔

پیون نے اُس کی طرف دیکھا۔ ''لاؤں یا نہیں لاؤں؟'' کا سوال اُچھالا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پیون کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر دروازہ بند ہوتے ہی نرمی سے بولا۔

''تم اتنے غصیلے تو کبھی نہیں تھے۔ ہمارے گروپ کے سب سے معاملہ فہم انسان تھے۔ پھر آج اتنے ہٹ کے موڈ میں؟''

وہ اسی طرح کیلتی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک آنے کا اجمالی خاکہ بیان نہیں کر سکا تھا۔

شہریار نے اُس کا چہرہ دیکھا، پھر اپنی کرسی سے اُٹھ کر اُس کے قریب چلا آیا، اُسے کندھوں سے تھام کر بولا۔ ''پہلے بھلے غصہ کھا لو، لیکن آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔ اتنے سالوں بعد میں تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جی بھر کر خود کو دیکھنے تو دو۔''

وہ اُسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن اب بیٹھ چکا تھا۔ کافی دیر لگی تھی اُسے اپنے غصے کا گراف نیچے لانے میں۔ پھر وہ بھنائے لہجے میں بولا تھا۔

''تم زہرہ پھو سے ایک ہفتہ پہلے ملے تھے؟''

شہریار نے سر ہلایا۔یعنی پول کھل گیا۔اقرار لازمی تھا،سواس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر کہا تھا۔

''ہاں،یہ ٹھیک ہے،میں زہرہ بجو سے اس مہینے کافی مرتبہ ملا ہوں۔لیکن یہ قطعی اُن کے ہاسپٹل کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹانے کی نیت سے تھا۔تم بتاؤ،تمہیں کس بات پر غصہ آیا ہے،زہرہ بجو سے میرے ملنے پر یا......؟''

سلامہ ارسلان نے پیپر ویٹ کو پوری قوت سے گھمایا تھا،پھر اسی ٹون میں بولا تھا۔''یہ تمہاری غریب پروری کا بخار اتر کیوں نہیں جاتا؟ کیا تمہیں ہم سے بہتر حاشیہ بردار نہیں مل پائے ہیں،اب تک جو ہماری جان سے چمٹے ہوئے ہو؟ آخر کب تک تم میری سادگی پسند ماں کو محبت کا دھوکا دیتے رہو گے؟ ہماری زندگی جینے کا اتنا شوق ہے ناں تو چھوڑ دو یہ عالیشان دفتر،گھر،گاڑی،اپنے کریڈٹ کارڈز۔پھر میں دیکھتا ہوں،تمہیں ہماری زندگی جینا کتنا دلکش کام لگتا ہے۔دو دن میں بھاگ جاؤ گے۔لیکن دولت کے بل پر درویشی کا ناٹک کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے،جینا زیادہ مشکل۔''

شہریار اُسے ترحم سے دیکھنے لگا،کچھ بولا نہیں تو سلامہ نے جھکا ہوا سر دوبارہ اُٹھا کر اسی نفرت و حقارت سے کہا۔''تم دولت مند لوگ جو کچھ کرتے پھرتے ہو،کیا وہ ایمانداری ہے؟ وہ ٹیکس ہوں یا ٹرسٹ کے کام ہوں یا پھر خیرات،تمہارے کون سے کام میں سچ ہوتا ہے؟ ہر چیز میڈیا پر چھانے کی ہوس کی طرف قدم اُٹھانے کا نام ہے۔لیکن جب یہی کام ہم مڈل کلاس لوگ کریں تو تم لوگوں کو اصول،انسانیت اور ایمانداری کے بھوت چڑھ جاتے ہیں۔ہاں،میں کرتا ہوں زرد صحافت،تمہیں اس سے کیا تکلیف ہے؟ تم اپنی خبر لگتی ہے تو تمہاری غلطیوں پر ایسا ہوتا ہے۔سوچنا تو تمہیں چاہیے ناں کہ غلطی یا تو کرو مت یا کرو تو ثبوت مت چھوڑو۔ثبوت چھوڑو گے تو ہم تو چسکا لیں گے ناں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔''شہریار اُس کی اتنی طویل گفتگو کے بعد اب بات کی تہہ تک پہنچا تھا۔کیونکہ وہ جتنی مرتبہ زہرہ جنید سے ملا تھا،اتنی ہی دفعہ اس نے انہیں سلامہ کے بیچ کے روٹ بدل لینے پر اس کے بارے میں صحافتی برادری میں پھیلی ہوئی شہرت کے قصے سنائے تھے۔وہ ان سے یہی کہتا تھا کہ وہ ان کی بات مانتا ہے،اس لئے اس سے وہ کہیں کہ جو اس کے قلم کی قسم تھی،وہ اسے نبھائے،رسوا نہ کرے قلم کو۔اور اب معاملہ اتنا دھماکے دار انداز میں اُس کے سامنے تھا۔یقیناً زہرہ جنید نے اُس کے ساتھ اس مسئلے پر میٹنگ کر لی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو ایسے جیسے کسی بھی معاملے میں تمہارا ذکر غیر ضروری ہو گیا ہے۔ورنہ تم تو بالکل وائٹ کالر ہو۔''

اُس نے بہت حوصلہ سے یہ تنقید سنی تھی۔کیونکہ اس جملے سے وہ نائمہ کے کیس کی طرف مڑ گیا تھا۔پتہ نہیں،خود سلامہ کا بھی یہی ارادہ تھا یا نہیں،لیکن دل میں اچانک پھر سے چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

"تم بس یہی غصہ نکالنے آئے تھے؟"

"نہیں...... ایک اور بات بھی ہے، جس پر تمہارے کمنٹ چاہئیں۔" لہجہ استہزاء سے بھرپور تھا، جیسے درپردہ جتا رہا ہو، تم کسی گنتی میں نہیں ہو میری۔ تم سے بات کر رہا ہوں تو یہ میرا ظرف ہے اور تمہاری خوش قسمتی اور بس۔"

"جی کیا بات ہے؟" اُس نے حوصلے سے اپنے جذبات کا بوجھ سہارتے ہوئے نرمی سے سوال کیا۔ اور وہ طنز سے بولا۔

"تمہاری بیسہ برداری میں یہی خامی ہے، جو تمہارے سامنے سر اُٹھائے، یا تو تم اس کو خرید لیتے ہو یا اُس کا سر کاٹ دیتے ہو یا پھر بزور طاقت اُس کا سر جھکا دینے پر کمر بستہ ہو جاتے ہو۔ تم سے برداشت ہو ہی نہیں سکتا کہ عام عوام میں سے کوئی اُٹھ کر تم سے سوال پوچھنے کی جسارت کرے۔"

شہریار نے طویل سانس لی، پھر کمپوزڈ لہجے میں بولا۔ "یہ تم عام عوام اور مڈل کلاس کا طعنہ کس کو دے رہے ہو؟ کیا واقعی اب تم مڈل کلاس میں رہ گئے ہو؟ سلامہ! تم جھوٹ بولنے کے اتنے عادی ہو گئے ہو کہ اب تم اس سچ کا سامنا بھی کرنے کی ہمت نہیں پاتے ہو خود میں کہ جس طبقہ کو تم ڈی گریڈ کرتے تھے اسی طبقے نے تمہیں خود میں سے نکال کر باہر پھینک دیا ہے۔ تم نہ تیتر رہے ہو، نہ بٹیر۔ وگرنہ جان لیتے کہ دولت کسی کی برائی کا پکا سرٹیفکیٹ ہوتی ہے، نہ غریبی کسی کی ایمانداری کی پکی مہر۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ تم میں بھی ہیں، ہم میں بھی ہیں۔ مگر حوصلہ تو کرو یہ اعتراف کرنے کا کہ ہاں، تم نے یہاں غلطی کی ہے۔" شہریار لمحے بھر کو رکا، پھر اسی نرمی سے بولا۔ "میرے دفتر میں کام کرنے والوں کی اکثریت مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے لیکن ان میں تمہاری طرح کا خود ساختہ خوف اور احساسِ کمتری نہیں ہے اپنی کلاس کے بارے میں۔ وہ جو ہیں، اس میں خوش ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں، خوشی دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ اور رہی عزت، تو وہ دولت سے خرید کر بہت زیادہ دن نہیں چلتی۔ لوگ پیچھے پیچھے آپ پر فقرے غرور چست کرتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہیں، تمہارے کو لیگ تمہیں کیا کہتے ہیں؟"

سلامہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اسی نرمی سے بولا۔

"تمہارے کولیگ تمہیں ذہنی پاگل قرار دیتے ہیں جو اپنی ویلیوز پر شرمندہ رہتا ہے، جسے اپنی کلاس پر فخر نہیں، شرمندگی ہوتی ہے اسی کلاس پر جس پر وہ کبھی جی بھر کر اترایا کرتا تھا کہ دولت نہ سہی، لیکن انسان ہونے کا فخر اُس کے پاس بھی ہے، اُسے بھی خدا نے اتنا ہی دماغ دیا ہے جتنا کسی امیر زادے کو، بلکہ اُس کے پاس ذہانت کسی آسائشات کے آکسیجن ٹینٹ میں رہنے والے امیر زادے سے کہیں زیادہ

ہے۔وہ زندہ ہے، اس لئے نہیں کہ سانس لیتا ہے بلکہ وہ زندہ ہے، کیونکہ سوچنے کا ہنر اُسے بخشا گیا۔وہ، جو فخر کرتا تھا کہ اُسے قارون اور فرعون کے خزانوں سے بھلے کچھ ملے نہ ملے، لیکن وہ علم کے جس خزانے کا بیوپار ہے، وہ رسولوں، انبیاء کے درجے کا مال ہے۔پہلے والا سلامہ جانتا تھا لیکن تم نہیں جانتے۔تم سب بھول گئے ہو۔سب کچھ۔"

سلامہ ارسلان کچھ نہیں بولا تھا۔کافی آچکی تھی۔وہ کافی پی رہا تھا کہ اُس نے نئے سرے سے شہریار کی گوشمالی کی کوشش کی۔"تم نے لون کے سلسلے میں جو بلنڈر کیا ہے، کیا وہ اچھی بات ہے؟"

شہریار کو نئی حیرت نے آلیا۔کیا واقعی سلامہ اتنی بڑی چیز بن گیا ہے کہ کہیں سے کوئی بھی خبر نکلوا یا اُگلوا سکتا ہے۔

"کون سے لون کی بات کر رہے ہو تم؟ میں نے تو اس وقت کسی طرح کا لون پاس نہیں کروایا۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ لون تم نے اپنے لئے پاس کروایا ہے۔" سلامہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر تلخی سے ہنسا اور وہ پزل ہو گیا۔نیکی خاموشی سے ہو تو نیکی رہتی ہے۔ظاہر ہو جائے تو نری شرمندگی، وقت کا زیاں ہو جاتی ہے۔

"بولو، اب تم اس سلسلے میں کیا بولو گے؟" اُس نے اُسے پھر چھیڑا۔

اور وہ گلا کھنکھار کے بولا۔"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سمجھ آرہی۔آخر میں کسی کے لئے لون کیوں پاس کرواؤں گا؟"

"ظاہر ہے، ظاہر داری کے لئے، خود کو اچھا، نیک ثابت کرنے کے لئے۔" پھر طنز کا تیر چلایا اور وہ مدھم ہو کر بولا۔

"تو تمہیں لگتا ہے، میں اچھا نہیں ہوں؟" ایک اسپیس دیا، پھر بہت بے چارگی سے بولا۔"تو اب تمہیں بھی لگتا ہے، میں اچھا نہیں ہوں؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔تم مجھے غیر ضروری باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔" سلامہ کنی کترا گیا اُس کے لہجے سے اور اُس نے کہا۔

"میں قطعی تمہارے خیال سے متفق نہیں، میں نے کسی بھی سلسلے میں کوئی بلنڈر نہیں کیا ہے۔"

سلامہ نے اُسے دیکھا، پھر اپنے سامنے رکھی فائل اُس کی طرف پھینک دی، پھر کھردرے لہجے میں بولا۔"تم نے کوئی بلنڈر نہیں کیا تو یہ کیا ہے؟ تم نے ہمارے فلیٹ کے کاغذات خود رکھ کر اپنے دو فلیٹس کے کاغذات کیوں جمع کروائے ہیں؟ تم نے زہرہ بجو کو فیک کاغذات کے ذریعے لون دلوایا، درحقیقت یہ لون تمہارے فلیٹس کے پیپرز کے تھرو دیا گیا تھا، تمہاری انتہائی خاص اپروچ کے تحت......تم

.......آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم کوئی بہت بڑے دیالو ہو، یا پھر یہ بھی تمہاری نمائش پسندی کی حس کی تسکین کا ذریعہ ہے؟''

''جو سمجھ لو، لیکن یہ طے ہے کہ تم زہرہ بجو کے سامنے یہ نہیں ثابت کر سکو گے۔ کیونکہ جس کسی نے بھی تمہارے سامنے چاہے کسی لالچ، کسی دھونس یا خوف کی وجہ سے یہ راز فاش کیا ہے، وہ اب دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ تم جانتے ہو تمہارے ساتھ رہ کر اتنی سیاست تو مجھے بھی آ ہی گئی ہے کہ میں کالی بھیڑ کا پتہ لگا لوں۔ رہے یہ کاغذات تو انہیں فیک ثابت کرنے کے لئے مجھے بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ فلیٹ میں نے انکم ٹیکس کے بچاؤ کے لئے یوں بھی فیک نیم اور آئیڈنٹیٹی کے ذریعے ہی حاصل کئے تھے۔ اور پھر تیسری بات، تم زہرہ بجو کی نظر میں اتنے جھوٹے ثابت ہو چکے ہو کہ وہ میرے مقابلے میں تمہیں اعتماد سے سن ہی نہیں سکتیں، اس لئے اس معاملے کو یہیں دبا لو تو بہتر ہے۔''

سلامہ تن فن کرتا ہوا اٹھا اور پوری طاقت سے گلاس ڈور بند کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے اپنی مصنوعی قسم کی استقامت کو اپنے وجود سے دور ہوتے محسوس کیا۔ وہ اب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، لیکن اسے تسلی دی تھی کہ اس نے بالکل درست سمت میں کیس حل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت اعصاب ڈھیلے ڈالے بیٹھا تھا کہ اچانک خیال کے پردے پر شافعہ کا چہرہ گھوم گیا۔

سلامہ سے وہ شافعہ کے متعلق کوئی سوال کرتے کرتے رہ گیا تھا کیونکہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے سادہ سوال میں سے بھی وہ کون سا مطلب نکال لے۔

'شافعہ سہیل!......کاش، میں تم سے کبھی کہہ سکتا کہ مجھے تم زندگی کی طرح عزیز ہو۔ کبھی جو محبت کا خواب دیکھا تو اس خواب میں جی اُٹھنے والی محبت تم ہی ہوتیں، تم ہی ہو سکتی تھیں۔ صرف تمہارے لمس سے دل جینے کی ضد کرتا ہے۔ لیکن کیا واقعی میں یہ کبھی تم سے کہہ سکوں گا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو؟''

اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں کہ اچانک اُس کی سیکرٹری نے اُس کے گھر سے کال آنے کا عندیہ دیا۔ گھر سے کال......کون ہو سکتا ہے؟......اُس نے بٹن پریس کرتے کال اپنے فون پر منتقل کی اور دوسری طرف کی آواز سن کر اُس کی روح تک کھل اُٹھی۔

''مام! آپ......خیریت ہے؟''

''خیریت تو تمہاری پوچھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ، طبیعت کیسی ہے اب؟''

''بالکل ٹھیک ہے مام! ایک دم پرفیکٹ ہوں۔ دیکھئے، آپ کو میری آواز سے نہیں لگ رہا؟''

”نہیں....... کیونکہ تمہاری آواز ساری کوشش صرف کرنے کے باوجود بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔ شیری! بچے! گھر آجاؤ، آرام کرلو۔ کام تو ہوتے رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مام! میں آتا ہوں گھر۔ لیکن پانچ بجے تک آؤں گا۔ ابھی مجھے کچھ کام ہیں، وہ نمٹا لوں۔“

”تم نہیں سدھرو گے۔ ٹھیک ہے، میں تمہارا چائے پر انتظار کروں گی۔“

”ٹھیک ہے مام! میں چائے تک آجاؤں گا۔“ اُس نے ریسیور رکھا، پھر مڑا ہی تھا کہ خیریت مشکوک نظر آنے لگی۔

”سالار بھائی! آپ؟....... خیریت؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔“

”بس، بس....... فرمانبرداری کا یہ ڈرامہ رہنے دو۔ یہ بتاؤ یہ سلامہ ارسلان تمہارے دفتر میں کیا کر رہا تھا؟“

”ایک دوست دوسرے دوست کے دفتر میں کیا کرنے آتا ہے بڑے بھائی؟“

”بکواس مت کرو، اُس کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ یہ بلیک میلنگ میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ تم بتاؤ تم نے تازہ کیا بلنڈر کیا ہے، جو اُسے تمہارے دفتر کا راستہ ملا؟“

اُس نے چڑ کر اُنہیں دیکھا، پھر خشک لہجے میں بولا۔ ”سنی بھائی! آپ بھی ناں.......“ لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے، آپ میرے بارے میں بہت بری رائے رکھتے ہیں۔ میں آپ کی نظر میں کبھی کوئی مقام نہیں بنا سکوں گا۔ لیکن یہ طے ہے سنی بھائی! اگر میں بقول آپ کے، کچھ بلنڈر کرتا بھی ہوں تو اس کی لیپا پوتی بھی خود ہی کرنے میں ماہر ہوں۔ اس لئے آپ دل پہ بوجھ مت لیا کریں۔“

”ہاں، لیپا پوتی....... تمہاری غلطیاں آج تک عبدالرحمٰن فیملی کو بھگتنی پڑ رہی ہیں، مگر تم مانو گے تھوڑی اپنی غلطی؟“

”ظاہر ہے، میں بھی اسی دنیا کا باسی ہوں۔ اس لئے جانتا ہوں، غلطی ماننے کا مطلب ہے، اپنے گلے میں پھندا ڈال لینا۔ سو آزادی اور زندگی کسے بری لگتی ہے؟“

سالار عبدالرحمٰن نے نہایت خفگی سے اُسے دیکھا تھا، پھر جو نئے ایڈ کی فائل لینے وہ کمرے میں آئے تھے، وہ فائل لے کر وہ واپس چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی اُس نے مامون کو فون ملوایا تھا۔ موبائل وہ ریپئرنگ کے لئے بھجوا چکا تھا، سو مامون کا رابطہ ہوتے ہی اُس نے اُسے دفتر آنے کا حکم دیا تھا۔ مگر دوسری طرف بڑی بے بسی سے کہا گیا تھا۔

”نہیں آسکتا میری جان!..... میری خصوصی ڈیوٹیز لگی ہوئی ہیں، ایم پی اے ہاؤس میں۔ کوئی ڈیم فل قسم کی تقریب ہو رہی ہے اور اُنہیں خطرہ ہے کہ کہیں تقریب میں کسی قسم کا دہشت گردی ٹائپ ایلیمنٹ نہ شو ہو۔“

"اوکے، تمہاری معذرت قبول ہے مگر میری جان! شام کو کافی اِن میں ضرور آنا۔ بہت ضروری معلومات ڈسکس کرنی ہیں۔"
اُس نے ریسیور رکھا۔ پھر اُٹھنے سے دس منٹ پہلے اُس کا موبائل واپس آیا تھا۔ اُس نے سم ڈال کر موبائل آن کیا ہی تھا کہ پہلا فون ہی دھماکے دار ثابت ہوا تھا۔
"ہیلو، شہریار اسپیکنگ، عدیل بھائی!"
"بہت اچھے جا رہے ہو بیٹا! مجھے تو لگتا ہے، وزارتِ عظمیٰ تمہارے ہی کندھوں پر دھری ہے۔"
"کیا ہوگیا بڑے بھیا! موڈ کچھ خراب لگتا ہے آپ کا؟"
"کچھ خراب؟ شہریار! اس وقت میں اتنا بھنایا ہوا ہوں ناں کہ اگر تم میرے سامنے ہوتے تو کوائٹ شیور تم بہت برے طریقے سے پٹتے میرے ہاتھ سے۔"
"لیکن آخر غصہ ہے کس بات کا؟" وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تبھی اُنہوں نے خفا لہجے میں کل کی اُس کی حماقت کی تفصیل بتانی شروع کر دی تھی۔ اپنی بات کہہ چکے تو تپ کر بولے۔
"اگر زندگی سے اتنا ہی چڑ گئے ہو ناں تو تھوڑا سا زہر کھا لو۔ کیوں بار بار ہمیں اذیت دینا چاہتے ہو؟" لمحہ بھر کو تھمے، پھر بولے۔ "آخر وہ کون سا جملہ یا لفظ ہوگا، جو تم تک یہ یقین پہنچا سکے کہ میں تم سے انتہا کی محبت کرتا ہوں؟"
شہریار کا اُن کے لہجے کی شدت سے دم رُکنے لگا تھا۔ کتنی دیر اُس سے بات ہی نہ ہوسکی۔ پھر خاموش ساعتوں کے خالی جانے کے بعد اُس نے بھرائے لہجے میں کہا تھا۔ "اتنی محبت مت کریں عدیل بھائی! بہت مشکل ہو جائے گی ورنہ آپ کو۔"
"کیا مشکل ہو جائے گی، وضاحت دو۔" وہ جرح کرنے لگے اور اُس نے نرمی سے کہا۔
"سیدھی سی بات ہے بڑے بھیا! کسی بھی چیز کی عادت ہو جانا اچھی بات نہیں۔ انسان کو کچھ لوگوں کے ساتھ رہنا اور کچھ لوگوں کے نہ ہونے پر بھی جینا آنا چاہیے۔"
"بکواس مت کرو، میں اس فلسفے سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ تم لوگ اور کچھ نام ایسے ہیں، جنہیں میں ہمیشہ اپنے محسوسات اور زندگی کی لسٹ میں اپنے قریب لازمی چاہتا ہوں۔" ایک ساعت کو وہ رُکے، پھر بولے۔ "دانیہ بتا رہی تھی تم انکل صمدانی کے کلینک گئے تھے۔ کیسا رہا چیک اپ؟"

”ایک دم فرسٹ کلاس۔ دانیا نے یہ نہیں بتایا آپ کو؟“ وہ ہنسا اور وہ چڑ کر بولے۔
”دانیا کا خیال ہے تم نے اُس سے اور مما سے Bluff مارا ہے، اُس کا خیال ہے، تمہاری طبیعت خاصی خراب تھی، جسے تم نے چھپانے کی پوری کوشش کی ہے۔“
”اچھا، دانیا تو کچھ دنوں میں کافی ذہین ہوگئی ہے۔ ویسے یہ آج کھلا ہے، آپ کو یا تو آپ کا دوست جان سکتا ہے یا دشمن۔“
”بُری بات۔ بہن کو دشمن کہہ رہے ہو، شرم کرو کچھ۔“
وہ دھیرے سے ہنس گیا پھر اترا کر بولا۔ ”آپ نے اتنی ساری باتیں کرلیں، لیکن جو بات کہنا چاہئے تھی سب سے پہلے، وہ ابھی تک نہیں کہی ہے۔
عدیل بھائی کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ پھر شوخی سے بولے۔ ”مجھے معلوم تھا، تمہارے اندر بڑی کھدبد ہورہی ہوگی۔ لیکن میں طرح دے گیا۔ اب چیخ پڑے ہو تو کہنا ہی پڑے گا۔ مام کا دل جیت لینے پر مبارکاں میری جان!“
”ایک اور بات فون کرنے کی اصل وجہ بھی بتا دیجئے۔ کیونکہ دانیا کی طرح میں بھی کافی ذہین ہوگیا ہوں۔“
عدیل بھائی کا قہقہہ پہلے سے بھی طویل اور شاندار تھا اور شوخی، الاماں الاماں! وہ کافی دیر تک ہنستے رہے، پھر محبت سے بولے۔ ”لاہور آ گیا تھا، مگر دل کراچی والے نے ایسے چرا کر رکھ لیا کہ پھر دل ہی نہیں لگا یہاں۔ سو ڈیڑھ مہینے سے ٹرانسفرز کی کوششوں میں تھا۔ گڈ نیوز، اگلے ہفتے آرہا ہوں میں رابعہ اور لائبہ کے ساتھ۔“
”کیا واقعی عدیل بھائی؟...... فنٹاسٹک! یہ خبر تو بہت اچھی ہے۔“ وہ پورے دل سے خوش ہوا اور دل نے اتنے دم سے خوش ہونے پر اعتراض بھیجنا شروع کردیا۔ بہ وقت سلام دعا کے بعد اُس نے موبائل رکھا مگر وہ ذرا دیر میں پھر بجنا شروع ہوگیا۔ اُس نے پانی سے دوا کی خوراک نگلی پھر موبائل آن کر کے پکارا۔
”ہیلو، شہریار اسپیکنگ...... آپ کون؟“
”میں نائمہ، بھائی!...... کل سے آپ کا نمبر ملا رہی ہوں لیکن نمبر لگ ہی نہیں رہا تھا۔“
اُس کی سانس پھر تیز ہونے لگی تھی۔ ”جگہ بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں آتا ہوں تمہیں لینے۔“ وہ اُس کا سوال ہضم کر کے اصل بات کی طرف آ گیا تھا۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک لائن ڈس کنکٹ ہوگئی۔

وہ بے جان موبائل کو دیکھے جا رہا تھا، جب بیگم عافیہ Knock کے بغیر اُس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''ہیلو شہریار! کیسے ہو تم؟''

''میم، آپ......؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آیئے ناں، پلیز! بیٹھیے۔'' اُس نے کرسی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ مہمان واری کے خیال سے رُوم میں لگے ہوئے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ''آپ کا کام کیسا چل رہا ہے میم؟'' اُس نے سوال میں پہل کی اور وہ گم کیفیت میں بولیں۔

''ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک چل رہا ہے۔ اس ہفتے تک سارے ڈیزائن او کے ہو جائیں گے شہریار!''

شہریار نے اُن کا چہرہ دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''میم! کوئی خاص بات، جو آپ کو ہراساں کر رہی ہے؟''

بیگم عافیہ نے اُسے دیکھا، پھر انوشے کی شادی کا ذکر لے بیٹھیں۔ وہ اس معاملے میں اُتر بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اُس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''تم اپنے پاپا کے کتنے قریب ہو شیری؟''

اُس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ اُس کے سوال کی ساخت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے وہی سوال دوبارہ دہرایا۔

اُس نے گہری سانس لی، پھر نرمی سے بولا۔ ''میں اور پاپا شروع سے بہت اچھے دوست ہیں میم! نہ اُن سے کچھ چھپاتا ہوں، نہ خود اُن کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے۔''

بیگم عافیہ نے تولنے والی نظروں سے اُسے دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''کیا واقعی آپ کے پاپا آپ سے کچھ نہیں چھپاتے؟''

''نو میم! میرے خیال میں، میں پورے گھر میں اُن کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔''

''پھر تم عطیہ بانو کے نام سے واقف ہی ہو گے؟''

''عطیہ بانو......؟'' وہ پہلے ہی قدم پر منہ کے بل گر گیا تھا۔

بیگم عافیہ نے اُسے دیکھا تھا، پھر بے حد سرد لہجے میں کہا تھا۔ ''ہاں، عطیہ بانو۔ تم پوچھنا اپنے پاپا سے، وہ اس نام سے واقف ہیں یا نہیں؟'' وہ رُکیں، پھر رحم سے بولیں۔ ''ایک اور بات، آج کے

بعد......آج کے بعد کسی سے یہ مت کہنا، تم اپنے پاپا کو سب سے زیادہ جانتے ہو۔" وہ یہ کہہ کر رُکی نہیں تھیں۔ وہ اُن کی پشت دیکھتا رہ گیا تھا۔

عطیہ بانو......یہ نام اُس نے کبھی پاپا کی زبان سے نہیں سنا تھا۔ وہ فوری طور پر پاپا سے ملنا چاہتا تھا۔ اُس نے کمرے سے نکل کر پاپا کو ڈھونڈا، مگر پاپا، بیگم عافیہ کے دفتر آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے نکل گئے تھے۔ اُس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر سوچا، پاپا اُسے کہاں مل سکتے ہیں؟ پھر تعین کر کے وہ نیچے سیڑھیاں اترنے لگا۔ گو رفتار بے حد دھیمی تھی۔ جازی اُس سے بہت زیادہ تیز رفتاری سے اُس کو کٹ کرتا ہوا اُس سے پہلے سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

آج ایک چاکلیٹ ایڈ کی کمپنی پریذنٹیشن تھی۔ آئیڈیا او کے ہونے پر ایڈ پروڈکشن [اوپن] کا کام شروع ہوا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن کی تھوڑی دیر پہلے کی ملاقات اور فائل طلب کیے جانے سے اُس نے یہ اندازہ لگایا تھا۔ اشتہار سازی ایک طویل اور تھکا دینے والا کام تھا، جس کے ابتدائی سارے معاملات جن پر یہ کام ٹیم تھا، خود بخود اُس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

"میٹنگ میں معاملات طے کرنا، ایڈ کمپین کا بجٹ بنانا، کمپین حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنا، کاغذی کارروائی کمپلیٹ کر کے کمپین حاصل کر کے دینا، پھر کمپیوٹر کے تھرو پہلی کمپنی کی پروفائل ڈیٹا لینا، کمپنی کی ساکھ، چیز کی کوالٹی، ماڈلز کی ڈیٹ لینے کے لیے کی جانے والی کاوشیں، اُن ماڈلز کے نخرے کی لمبی لسٹ نبھانے کی ذمے داری، یہ سب ہوتا تھا، تب کہیں ایڈ امپرول کی سیڑھیاں چڑھتا تھا۔

لیکن وہ اس لیے خوش تھا کہ اس بار اس ایڈ کے لیے اکثر ذمے داری اُس کے اسسٹنٹ کے ذریعے جازی عبدالرحمٰن نے اُٹھائی تھی۔ یہ پوری کمپنی جازی عبدالرحمٰن کی صلاحیتوں پر مشتمل تھی اور اُس نے اس سلسلے میں بہت کم غلطیاں کی تھیں۔ وہ اب گاڑی تک آ گیا تھا، تب اُس کے موبائل پر میسج ٹون سنائی دی۔

اُس نے کار میں بیٹھنے کے بعد میسج پڑھا، لکھا تھا۔ "اپنا میل بکس چیک کرنا، پھر مجھ سے بات کرو، تمہارے فون کا شدت سے منتظر، عاطف!" اُس نے اس میسج کو اہمیت دیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اُس کا خیال تھا، یہ صرف عاطف کی شرارت تھی اور بس۔ یقیناً اُس کا بکواس کرنے کا موڈ ہو رہا ہوگا۔ سو اُس نے اُس کے میسج کو پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھا تھا۔

اُس کی گاڑی بڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔ اُس کا رخ پاپا کے فارم ہاؤس کی طرف تھا۔ کیونکہ وہ جب بھی ڈسٹرب ہوتے، یہیں چلے آتے تھے۔ دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ پاپا کے فارم ہاؤس پہنچ سکا تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اُس نے اندرونی برآمدوں کی طرف بڑھتے ہوئے پاپا کے بارے میں معلومات کی۔ ملازمین نے اُن کے مخصوص کمرے کی طرف اشارہ کیا، جہاں آج تک وہ بھی کبھی داخل نہیں ہو سکا تھا، آج وہ اس کمرے کو دیکھنے والا تھا۔ اُس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ اُس نے اکیلے ہونے کے مارجن کے تحت اجازت لینے کی ضرورت نہیں محسوس

کی تھی۔ پاپا ایک مجسمے کے سامنے خود بھی بت کی طرح ایستادہ تھے۔

''عطیہ بانو کون ہیں پاپا؟''

پاپا بجلی کی تیزی سے مڑے تھے۔ آج سارے راز جیسے اُن کی آنکھوں میں تیر تے پھر رہے تھے۔ آج انہوں نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا اُن کے قریب آ گیا۔

''بتائیے ناں پاپا! یہ عطیہ بانو کون ہیں؟'' اُس نے پھر سوال کیا۔

پاپا نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کر دیا۔ شہریار کی آنکھیں یکدم پھٹ گئی تھیں۔

''یہ......یہ عطیہ بانو ہیں؟......یہ......؟''

وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ تصویر میں ارسلان راشدی اور عطیہ بانو ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ پاپا جس راز کو چھپا رہے تھے، وہ بہت واضح ہو کر اُس کے سامنے آ گیا تھا۔

دانیا عبدالرحمٰن آج حمزہ عابد کے گھر جانے پر مدعو تھی۔ مما ساتھ ہی تھیں، سو بہت خوشگوار ماحول میں باتیں جاری تھیں۔ پھر دانیا، حمزہ عابد کے ساتھ اوپر ٹیرس پر آ گئی تھی۔ ماریہ، شہریار کے معاملے کے بعد سے دل برداشتہ ہو کر یو۔کے چلی گئی تھی۔ وہاں حمزہ عابد کے ماموں رہائش پذیر تھے۔ عابد صاحب نے بیٹی کو اس خیال سے بھی بھیجا تھا کہ اُن کے برادران لا جس خواہش کا اظہار اُن سے بار بار کر چکے تھے، وہ معاملہ کسی پار لگے۔ مقصد یہی تھا کہ ماریہ، رافع حماد کو دیکھ لے، سمجھ لے۔ اور رافع حماد، ماریہ کو اچھی طرح جانچ لے تو دونوں کی بات طے کر دی جائے۔ یہ اور بات کہ ماریہ جانتے بوجھتے اس مسئلے سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ دراصل شہریار کو جو مقام اُس کے دل نے دے دیا تھا، وہ مقام وہ کسی کو نہیں دینا چاہتی تھی۔ مگر حمزہ سمیت دونوں کا خیال تھا کہ یہ وقتی ابال ہے جو بالآخر تمام ہو کر کسی نئے رشتے کی بنیاد بن جائے گا۔ سو حمزہ عابد یک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے اپنی پیار کی کہانی آگے بڑھا رہا تھا۔ جس گیم سے وہ نکل گیا تھا، اب قسمت سے واپس اس گیم میں آ گیا تھا۔ جانا نہ کو ایک بار پانے کی حسرت میں اُسے لگتا تھا، وہ کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ دانیا کو پانے کے بعد دولت تو اُس کے گھر کی باندی بن ہی جاتی، مگر اس گیم میں قائم ہو جاتا تو جانا نہ جیسی خوب صورت ترین لڑکی کے آتشیں وجود سے پگھل جانے کو وہ ہوک رہا تھا۔

ہر کسی کی قسمت میں جانا نہیں ہوتی، اُس کی قسمت میں تھی، اس لئے وہ سوچ جانا نہ کو رہا تھا اور دیکھ دانیا عبدالرحمٰن کو رہا تھا۔ دانیا اُس کی آنکھوں کی تپش سے بلش کر رہی تھی اور وہ اس سے بے خبر تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں حمزہ؟" دانیا کی شرمائی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک کر حال میں آ گیا۔ اب اُس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔ اُس نے دانیا کا ہاتھ تھام کر خود سے قریب کیا تھا۔ دانیا کسمسا رہی تھی، مگر اُس کی جسارت پر اُس کا احتجاج بہت مدھم تھا۔ وہ اُس کے کان میں گنگنایا۔

"جب تم سامنے ہو تو زندگی سامنے ہوتی ہے۔ اور یہ زندگی سے دُور ہو کر قریب ہونے والا ہی جانتا ہے کہ زندگی کا لمس اس کے لئے کتنا ساحر ہے۔"

دانیا کے ہونٹوں پر بہت خوب صورت سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر اُس نے نا خواب آگیں لہجے میں پوچھا تھا۔ "آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں حمزہ؟"

حمزہ عابد نے اُسے کندھوں سے تھام کر دیکھا، پھر خمار آلود لہجے میں بولا۔ "تمہاری محبت...... تمہاری محبت میرے لئے ایسے ہے، جیسے زخم پر کوئی مرہم کا پھاہا ہو، کوئی بہت شہری یاد ہو، جو ہر وقت آنکھوں سے انعکاس کرتی رہے۔ کوئی بہت پیارا سفر، جس پر ساتھ ساتھ چلنے والے ہی جانتے ہیں کہ محبت میں وصل کا مزہ کیا ہوتا ہے۔ دعاؤں میں خدا کے خیال جیسی بات ہے۔ تمہاری محبت بالکل اَن چھوئی، بہت ہی پیاری، تمہاری طرح ہے تمہاری محبت میرے لئے......"

دانیا عبدالرحمٰن کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور حمزہ عابد جانتا تھا، یہ چمک، یہ سانسوں کا ردھم اگلا کیا سوال دل میں بیدار کرتا تھا؟ وہ جانتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ بے حد مسرور تھا کہ شہریار کی تمام تر چالاکی کے باوجود وہ کامیابی سے ہم کنار ہونے والا تھا۔

"ہم کب ملیں گے حمزہ؟"

حمزہ عابد کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھر آئی، جسے دانیا عبدالرحمٰن نے محبت کی ہنسی سمجھا۔ محبت کی ہنسی، جس کے اندر محبت کے آنسو روتے ہیں، مگر ہر نئے محبت کرنے والے کے لئے وہ ہنسی ہوتی ہے، محبت کی ہنسی۔ دانیا بھی اسے محبت کی ہنسی سمجھی تھی اور حمزہ عابد تھا، شرارت سے بولا تھا۔

"تم جانو، ہم کب ملیں گے؟ دیر تو صرف تمہاری وجہ سے تھی۔ یہاں تو کب سے دل کا دروازہ کھولے بیٹھے ہیں۔"

دانیا عبدالرحمٰن نے اُس کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولی۔ "واقعی حمزہ! آپ نے ہی ڈھنگ سے محبت اپنائی۔ مجھے تو محبت کرنا بھی نہیں آتی۔ میری مرضی سے آپ نے محبت کا راستہ استوار رکھا، مجھے

میرے حساب سے چاہا اور میں دوسروں کے فیصلوں پر آپ کی اس محبت سے اجتناب کرتی رہی۔" لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ "اگر ماریہ رشتے کی بات نہ بن لیتی تو شاید میں اب بھی اس شادی کے لئے راضی نہیں ہوتی۔"

حمزہ عابد کچھ نہیں بولا تھا اور یوں وہ ایک اچھی سی شام گزار کر گھر آ گئے تھے۔

مما اپنے کمرے میں پہنچی تھیں۔ پھر انہوں نے سی ایل آئی پر عدیل عبدالرحمٰن کا نمبر دیکھا تھا۔ فوری طور پر انہوں نے اُن کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ دو تین دفعہ ٹرائی کر کے انہوں نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ پھر کمرے سے باہر آئیں تو بیگم حشمت کو انہوں نے صوفے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ماما اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اماں؟"

بیگم حشمت نے تفکر آمیز انداز میں انہیں دیکھا تھا، پھر سرسرائے لہجے میں بولی تھیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے عالیہ! حمزہ عابد واقعی دانیا کے لئے ٹھیک ثابت ہوگا؟"

"آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں اماں؟" ماما نے حیرت سے کہا اور حشمت بیگم دھیرے سے بولیں۔ "سیدھی سی بات ہے عالیہ! آنکھ بند کر کے کوئی بھی راستہ چلو، ٹھوکر ضرور لگتی ہے۔ اس لئے کسی بھی سمت کا سفر ہو، آنکھ کھول کر رکھو، دماغ کو حاضر رکھو، سارے معاملے دل سے مجبور ہو کر طے ہوں ناں تو غلطی کی گنجائش رہ جاتی ہے۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟" ماما کے اچھے لہجے میں تلخی گھل گئی تھی۔ پھر انہوں نے روٹھے پن سے کہا تھا۔ "آپ کی اس بات سے میں یہ سمجھوں اماں! کہ آپ بھی شہریار کے جیسے جیسے قریب ہو رہی ہیں، ویسے ویسے آپ کا رویہ بھی سوالیہ نشان بن رہا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے، جسے شہریار سے محبت ہو جائے، وہ اُس کی بات، اُس کے فیصلے بھی دوسروں پر ٹھونستا جائے؟"

حشمت خانم نے اُن کی بات کا برا نہیں منایا تھا، پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

"شہریار سے جب سے میں نے نرمی اختیار کی ہے، میرا دل کہتا ہے، میں اُسے زیادہ سے زیادہ جانوں، آخر اُس میں کہاں کمی ہے، جس نے ہمیں اُس سے اتنا دور رکھا؟...... عالیہ! جب میں نے سوچا تو میں زیادہ سے زیادہ اُس کی اس چھوٹی سی دنیا میں داخل ہوتی چلی گئی جو اُس نے تنہائی میں آباد کر رکھی تھی۔ پھر یوں ہوا، میں اس وقت بھی اُس کے رُوم میں جاتی جب وہ ہوتا اور اس وقت بھی جاتی جب نہیں

ہوتا۔ اُس کے کمرے کی دیکھ بھال، جو پہلے دانیا ملازمین لگا کر کرتی تھی، اب اُس کے اُس سے قطع تعلق کے بعد میں نے اٹھالی۔

ماما انہیں دیکھ رہی تھیں۔ شاید کوئی بہت دھماکے دار اطلاع تھی اُن کے پاس۔ حشمت خانم نے بیٹی کی دلچسپی دیکھی تو نرمی سے بولیں۔ ”کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہیں، میں تمہیں کوئی راز بتانے والی ہوں؟“

”اماں! آپ کی باتوں کا تو یہی مطلب نکلتا ہے۔“ ماما نے قدرے حیرت سے کہا اور حشمت خانم نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

”ہاں...... پہلے میرا بھی خیال تھا، لیکن بعد میں، میں نے سوچا، یہ یک طرفہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے تمہارا دل اسے اس طرح نہ لے جس طرح اسے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جو بات دل میں جگہ کرلے، وہ بہت کم دل میں سے اپنی جگہ بدلتی ہے، تا آنکہ آپ خود اس سچ تک نہ جا پہنچیں، سو عالیہ! میں یہی چاہتی ہوں تم آنکھیں کھول کر حمزہ عابد کا جائزہ لو اور پھر خود سے کوئی فیصلہ لو۔ سچ دو طرفہ ہو تو دل یقین کرنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔

ماما انہیں دیکھے گئیں، لیکن یہ ہوا تھا کہ اچانک اُن کے اندر اپنے فیصلے کو لے کر تشکیک سی آگئی تھی۔ وہ پہلے جتنے اپنے فیصلے پر یقین کرتی تھیں، حشمت خانم کے ان سے بڑھ کر یقین نے انہیں ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ ماما پُرسوچ انداز میں خاموش ہوگئی تھیں۔ پھر کتنی دیر وہ صرف اسکرین پر نظر گاڑے بیٹھی رہی تھیں۔ حشمت خانم نے کیو چینل لگا رکھا تھا۔ اسلام کے درخشاں اصولوں پر مبنی پروگرام چل رہا تھا، لیکن ماما کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ پھر یکدم انہوں نے چونک کر پوچھا تھا۔

”شہریار گھر آیا؟“

حشمت خانم نے نفی میں سر ہلایا پھر آہستگی سے بولیں۔ ”تمہارے جانے کے بعد اس کا فون آیا تھا، اُس نے تمہارے موبائل پر مسڈ کال دینے کی بابت پوچھا تھا، خیریت ہے؟ تو میں نے کہہ دیا تھا تمہارا نمبر نہیں مل رہا تھا اس لئے تم نے اسے مسڈ کال دی تھی۔ پھر تمہارے اور دانیا کے پروگرام کا بتا کر کہہ دیا تھا کہ شاید شام کی چائے پر وہ تم سے نہیں مل سکیں گے۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن حمزہ کے ذکر پر وہ کافی ڈسٹرب ہوگیا تھا۔“

ماما کچھ نہیں بولی تھیں۔ انہوں نے پھر سے عدیل بھائی کا نمبر ملایا تھا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی انہوں نے خیریت ہی دریافت کی تھی اور دوسری طرف سے عدیل بھائی تھے، شوخی سے بولے تھے۔

”کمر کس لیجئے مام! رابعہ کے ساتھ کراچی آرہا ہوں۔ بڑی زبردستی ٹرانسفر کروایا ہے، اس لئے دو بہوؤں کو ایک ساتھ ہینڈل کرنے کے لئے ابھی سے ماتو سے گر سیکھ لیجئے۔“

’’بہت شوخ ہو رہے ہو، کوئی خاص بات؟‘‘ ماما مسکرانے لگیں۔

وہ اسی ٹون میں بولے۔ ’’شوخ....... میں تو دنیا میں آنے کے آدھے گھنٹے بعد سے ہی خوش وخرم ہوں ماما! ویسے تازی شوخی صرف اس خیال سے لہجے میں در آئی ہے کہ میں اب کسی قاعدے قانون اور لگے بندھے وقتوں کے لئے آپ سب سے نہیں ملنے والا، کھل کر جینے کا ارادہ ہے ماما! سچ پوچھیں تو آپ سب سے دور ہو کر ہی آپ سب کی قدر جانا ہوں۔‘‘

’’بس بس، مجھے بناؤ مت۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تمہارے لہجے کی یہ شوخی کیوں ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔‘‘

’’کیا کہہ رہی ہے ماما؟‘‘ انہوں نے طرح دی ور ماما مسکرا کر مدھم لہجے میں بولیں۔

’’لاڈلے بھائی سے تمہارے تعلق اچھی ڈگر پر چل نکلے ہیں، تبھی خوش ہو رہے ہو ناں؟‘‘ لمحہ بھر کو اچیس آیا، پھر خفگی سے بولیں۔ ’’وگرنہ تو ماں تمہاری محبت کی لسٹ سے بالکل ہی نکل گئی تھی۔‘‘

’’ایسے تو نہ کہیں ماما! بھلے خفگی جتنی بھی سہی۔ آپ سے محبت میں اسی درجے کی کرتا ہوں، کیا واقعی آپ کو میری محبت پہ شک نہیں کرتی تھی؟‘‘

’’اب بس، زیادہ بڑ بڑ مت کرو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔‘‘

ماما نے سلام دعا کر کے فون رکھ دیا۔ بظاہر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں ایک مستقل گہری سوچ نے جگہ لے رکھی تھی۔ یہ سوچ اتنی گہری تھی کہ ان کی خوشی کو بھی کھا گئی تھی۔



زندگی کی راہوں میں
چار سو اندھیرا ہے
من کی سونی وادی ہے
خامشی کا ڈیرا ہے
جتنے خواب روشن تھے سرمگیں نگاہوں میں

جتنے پنچھی اُڑتے تھے بھٹکتی فضاؤں میں
کھو گئے ہواؤں میں
آندھیوں کی راہوں میں
کیا ہُو کا عالم ہے
جو فضا پہ طاری ہے
ہر کسی کے چہرے پر اک سوگواری ہے
تم کو اپنا کہنے کی یہ سزا ہماری ہے
ہاں مگر یہ خواہش ہے، پھر سے آسماں بدلے
پھر سے یہ جہاں بدلے
میرا مہرباں بدلے
میں کڑے سفر میں ہوں
خوف کے اثر میں ہوں
رات کے اندھیرے میں، اجنبی نگر میں ہوں
پھر بھی ساتھ تیرا ہو تو نہ فکر ہو مجھ کو
ہاں اگر چاہے لے چلے اُدھر مجھ کو

دو قدم کے رستے پر

اک نیا سویرا ہے

اک بار پھر کہہ دے

تُو ابھی بھی میرا ہے

تُو ابھی بھی میرا ہے......ایک حسرت اُس کے دل سے چمٹی ہوئی تھی اور وہ اُس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔

شافعہ اس لمحے ثانیہ کے فلیٹ میں تھی۔ عارف جواد اس کے ہاسپٹل سے اُس کی ڈیوٹی لوکیشن طے کر آیا تھا۔ ہاسپٹل میں یوں بھی سب اُسے شافعہ کے فیانسی کی حیثیت سے جانتے تھے، اس لئے خاص دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے، جب شافعہ نے کہا تھا۔

"جس کے پاس گئے ہو، کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟......اتنی خوب صورت کہ اُس نے تم سے میرے نام کی محبت مانگی اور تم انکار نہیں کر سکے؟"

عارف جواد تاسف سے اُسے دیکھ رہا تھا، پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔ "وہ بہت خوب صورت ہے، لیکن وہ تم کیسی نہیں۔ میں محبت صرف تم سے کرتا ہوں۔"

شافعہ بے بسی سے ہنسی تھی۔ "تم......تم اب بھی یہی کہہ سکتے ہو، اتنے یقین سے کہ تمہیں آج بھی مجھ سے محبت ہے۔ عارف! تم نے اتنے ہی یقین سے اُسے بھی تو کہا ہوگا کہ تم اُس سے جی جان سے محبت کرتے ہو، تبھی تو اُس کا دل ہارا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم کسی پر اتنی ساحر آنکھیں ڈالو تو اُس کی دیوار جان نہ ٹوٹے، اُس کا دل اُس کے کہنے میں نہ رہے، وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے۔ عارف! تم اور تمہارے لفظ ہر چہرے کو اتنی ہی چاہت سے کیسے دیکھ لیتے ہیں کہ میں تو تمہارے بعد دیکھ بھی نہیں پاتی۔ اب کچھ بھی نظر نہیں آتا، کوئی منظر، کوئی چہرہ فوکس نہیں ہوتا مجھ سے اور تم......تم ہر نئے چہرے سے کہہ سکتے ہو، کہہ دیتے ہو کہ تم اس سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہو......تم ساری عمر اس سے محبت کرتے رہو گے......کیسے کہہ دیتے ہو یہ سب کچھ تم؟"

عارف جواد گنگ تھا، وہ کسی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اُس سے لفظ نہیں ادا ہو رہے تھے، وہ صرف اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کتنی ساعتوں بعد اس نے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو شافعہ! میں تمام عمر تمہارا مقروض رہوں گا، لیکن تم مجھے میری یہ غلطی معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں تمہارا دل سخت نہیں ہے۔"

شافعہ سہیل نے اُسے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ ”تم کبھی آتے اور سر جھکا کے کہتے، شافعہ! مجھے تمہاری محبت کے باوجود کسی اور کے دل کی محبت کھینچنے لگی ہے، میرا دل آدھا تمہاری طرف مُڑا ہوا ہے، آدھا اُس محبت نے چرا لیا...... تو میں دل کو بڑا کرلیتی۔ تمہاری اُلفت دیکھ کر محبت کی یہ عبارت بانٹ لیتی۔ حالانکہ تمہیں تو شاید میرا دل خدا کو بھی نہ سونپنے دے لیکن میں پھر بھی اس کڑے فیصلے سے گزر جاتی، لیکن ایسا ہوتا تو......

ایسا نہیں ہوا عارف! تم میرے ساتھ یہ دھوکا چپکے چپکے کرتے رہے۔ تم میری آنکھوں میں مرکوز ہوتے تو مجھے لگتا تمہاری آنکھوں میں آن بیٹھنے والا دل صرف میرا انتظار بھوگ رہا ہے، مگر وہ دل...... وہ دل کوفریب تھا، وہ دل کسی کا بھی نہیں تھا۔ نہ میرا، نہ انوشے کا...... تم نے محبت کو بہت کم ترین چیز سے مقابلہ کیا۔ دولت...... عارف! صرف دولت نے دل کی حکمرانی چھین لی۔ یہاں دیکھو، یہاں ہر روز دولت کی آفر زندموں میں ڈھیر ہوتی ہیں، مگر محبت انہیں ٹھوکر لگا دیتی ہے۔

مشکل زندگی جینا بہت مشکل ہے عارف! مگر دولت، صرف دولت کے لئے جینا...... زندگی یہ ڈیپ رونہیں کرتی۔ محبت بھلے متروک لفظ ہے آج کے زمانے میں...... بھلے یہ آج کے زمانے میں سب سے زیادہ کانٹوں بھرا راستہ ہو۔ بھلے محبت کے حصے میں پتھر آئیں، مگر عارف! یہ بھی تو سچ ہے، آج بھی کہیں محبت کا ذکر سن کر دل ضرور دھڑکتا ہے۔ محبت کا کوئی سچا قصہ آج بھی سانس تیز کر دیتا ہے۔ لگتا ہے، دل کو، یا ابھی اتنی بھی بے مایہ نہیں۔ مگر تم نے اس کی لاج نہیں رکھی۔“

وہ رُکی، پھر اُس کی طرف دیکھ کر پورے دُکھ سے بولی۔

”تم آج جیسا چاہتے ہو، جیو۔ زندگی تمہارا ہاتھ نہیں پکڑے گی۔ لیکن عارف! زندگی میں تنہائی کا ایک ایسا فیز ضرور آئے گا، جب دولت کے باوجود، لوگوں کے باوجود تم تنہا ہو گئے تو تمہیں یہ لمحہ، یہ وقت اور یہ محبت ضرور یاد آئے گی۔ کوئی تمہارے دل میں ضرور کہے گا، تم نے کس چیز کے لئے کیا گنوا دیا تھا...... عارف! آج تم مجھے کھو رہے ہو۔ خسارہ صرف تمہارا ہے، حالانکہ سننے والوں کو لگے گا، خسارہ صرف میرے حصے کا نصیب ہے۔ مگر صرف لوگوں کو ایسا لگے گا...... کیونکہ میرے پاس محبت کی سچائی، اس کا احساس تمہارے جانے کے بعد بھی زندہ رہے گا، لیکن تم...... تم آج بالکل خالی ہو کر جا رہے ہو۔ خالی ہونے کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟ کوئی یاد، کوئی لفظ، کوئی محبت، کچھ نہیں...... تم اس بادشاہ کی طرح ہو گئے ہو عارف! جس نے کہا تھا، خدا مجھے وہ ہنر دے کہ میں جس چیز کو چھولوں، وہ سونا بن جائے...... آج تم نے خود اپنے آپ کو چھو لیا ہے۔ تم اور تمہارا دل پیلا پڑ گیا ہے۔ حرارت سے بے نیاز پیلاہٹ ہے یہ...... اس کے بعد سے یہ کبھی مت کہنا، تم زندہ ہو...... کیونکہ جس دن تم نے یہ کہا، اُس دن تمہاری

آنکھیں چور لگنے لگیں گی، زندگی ہنس پڑے گی تمہارے اس جھوٹ پر۔"

وہ مڑ چکی تھی۔ عارف جواد خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ شاید کوئی لمحہ آئے کہ اُس کا دل پگھل جائے، مگر آج وہ صرف ہار رہا تھا۔

وہ پلٹی نہیں تھی، سو وہ اُٹھ گیا تھا۔ اُس کے قدموں میں واضح لرزاہٹ تھی۔ اُس نے تو سوچا تھا، وہ دولت اور شافعہ کو ایک ساتھ، ایک سانس میں جی لے گا، مگر وہ نہیں جانتا تھا، محبت اور دولت میں اگر پلڑا دولت کا بھاری ہو تو محبت ہمیشہ ہار جاتی ہے۔

وہ دولت جیت گیا تھا مگر محبت نے اس سے محبت کی خلعت اُتار کر اُسے دروازے سے باہر نکال دیا تھا تو اسے لگ رہا تھا، وہ کچھ بھی نہیں جیتا تھا۔ صرف جیتنے کا اُسے اشتباہ نظر ہوا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم سے جا چکا تھا۔ شافعہ ہاتھ چہرے پر رکھے روئے جا رہی تھی۔ تب وہیل چیئر سرکاتی ثانیہ اس کے قریب آرکی۔ اُس نے بہت مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"کیا ہو جاتا اگر تم محبت کو اس کنڈیشن کے ساتھ قبول کر لیتیں؟...... شافعہ! تم نہیں جانتیں، لیکن میں جانتی ہوں، تم کتنی خوش قسمت ہو۔ وہ خود چل کر تمہارے پاس آیا تھا تم سے یہ کہنے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر مسکرا کر بولی۔ "ادھر دیکھو، مجھے دیکھو، میں علی کے منہ سے یہ لفظ سننے کے لئے کتنے سال نارسائی کی آگ میں جلتی رہی ہوں، میں نے تو اپنی حالت کسی فقیر کی طرح کر لی تھی کہ شاید میری محبت پر نہ سہی، میری بے چارگی پر ہی اُسے ترس آ جائے اور وہ مڑ کر کہہ دے ہاں میں نے ایک لمحے میں، ایک کمزور لمحے میں واقعی تم سے محبت کا رشتہ نبھایا تھا۔ پھر بھلے وہ اس لمحے سے مکر جائے، مگر میری محبت، میرے دل کے لئے وہ ایک معمولی سا جھوٹ عمر گنوانے کے لئے کافی ہوتا...... مگر ایسا نہیں ہوا شافعہ! اُسے بھی تمہاری طرح سچ کہنے کی اتنی عادت تھی کہ وہ لمحہ اور اس لمحے کی بے چارگی جتنے دبے قدموں میرے دل میں آئی، اتنے ہی دبے قدموں واپس لوٹ گئی۔ یوں، جیسے ایک غریب کسی دوسرے غریب کے گھر مہمان بن کر آئے، مگر اُس کے گھر کی کسمپرسی دیکھ کر رات کے اندھیرے میں دروازہ کھول کر باہر نکل جائے کہ اگر میزبان کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی پڑیں تو اس کی غربت کا تماشا کس دل سے دیکھے گا۔ میرے لئے ایسی ہی تھی محبت کی حسرت...... لیکن تم نے محبت کی پوری آنکھیں اپنے اوپر مرکوز دیکھنے کے باوجود محبت کو ٹھکرا دیا۔ تم نے بہت برا کیا شافعہ!"

شافعہ نے ثانیہ کی طرف دیکھا، پھر بھیگے لہجے میں بولی۔ "محبت یوں نہیں اچھی ثانیہ میم! محبت میں وضعداری ہو، عزتِ نفس ہو تو محبت دل میں پھول کھلاتی ہے، ورنہ دل میں مایوسی اور بے کسی کے کانٹے اُگ آتے ہیں اور کانٹوں سے پھر کس کا دامن، کون سا خواب محفوظ رہ سکتا ہے۔"

ثانیہ نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اُس کا کندھا تھپتھپانے لگی۔

شافعہ نے سر جھکا لیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے کی باتیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھی۔ کچھ دن پہلے وہ اکیلے میں سوچ رہی تھی کہ محبت بھیک کی طرح بھی مل جائے تو شاید وہ قبول کر لے گی، مگر آج محبت اُس کے در تک آئی تھی مگر محبت میں دل کی عزت یاد آ کر یہ موقع گنوا چکی تھی۔ وہ بالکل نامراد بیٹھی تھی، اور دل محو مناجات تھا۔

کاش پھولوں کی ردا ہو جائے

اتنی حساس ہو جائے

مانگتے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دے

اتنا مجبور خدا ہو جائے

وہ مانگ رہی تھی دل بے پناہ سے۔ اور نہیں جانتی تھی، وہ اُس سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ دُکھ کو دائمی دُکھ کی طرح اُس کے دامن میں ڈالنے سے کترا کر اُس نے چپکے سے اُس کے آنسو چن لئے تھے۔ کسی بہت ہی محبت آمیز وقت کے لئے اُسے سمیٹ کر اُس کے ہاتھ پر کلیاں رکھ دی تھیں، وہ اس خوشبو کے احساس سے بے خبر تھی، اس لئے غمگین تھی...... اور وقت جانتا تھا، وقت بنانے والا خدا جانتا تھا، اس لئے محبت اُسے مسکرا کر تک رہی تھی۔

ایک پھولوں بھرا راستہ اُس کا منتظر تھا، کچھ دیر تھی اور بس........

اور بس انتظار کے درمیان کا خلا ہی تو مایوس کرتا ہے۔ مگر صرف اُنہیں، جنہیں اپنے رب پر بھروسہ نہ ہو۔



مسٹر سلیم افسر حیران کھڑے تھے اور عافیہ بانو اُن کا کندھا تھام کر لجاجت سے بولی تھیں۔

''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ وہ اس سارے شہر میں صرف آپ کو جانتی ہے اور اس حالت میں آپ اُسے لک آفٹر نہیں کریں گے تو کون کرے گا، سلیم! انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔''

سلیم افسر نے پوری آنکھیں کھول کر اس عورت کو دیکھا جو نفسیاتی ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں زنجیروں سے جکڑی ہوئی تھی اور جسے حاصل کرنے کے لئے عافیہ بانو نے ایک خطیر رقم خرچ کی تھی اور اب یہاں علاج کے لئے بھی رقم خرچ ہو رہی تھی، اور سلیم افسر تھے کہ اپنی بیوی کے اس رنگ پر حیران ہو رہے تھے۔ وہ ثانیہ کو دل سے نکال چکے تھے۔ اور یہ عورت..... اس نے ثانیہ کو ان کے سامنے پھر لا کھڑا کر دیا تھا۔

"تمہیں آخر یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ تم جانتی ہو نا، میں اس عورت سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔"

عافیہ بانو نے ان کو کندھوں سے تھاما، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ "جو دل صرف محبت کرنا جانتے ہوں، انہیں چاہ کر بھی نفرت کرنا نہیں آسکتی۔ اگر آپ نفرت کرنے میں اتنے ایکسپرٹ ہوتے تو برسوں پہلے سب کچھ گنوا دینے پر بھی صرف ثانیہ کی صورت دیکھنے کے لئے بدنام گلیوں کا رزق نہ بنتے۔ آپ جو سمجھتے تھے، آپ دنیا سے چڑ کر، بدنامی سے خوف کھا کر وہاں شراب میں ڈوبے رہتے تھے تو یہ صرف آپ کا اپنی ذات کو دیا جانے والا معصوم دھوکا تھا۔ آپ اپنی تکلیفوں کو خاموش کروانے کے لئے یہ دھوکا خود کو دیتے تھے۔ کیونکہ اگر آپ اپنے دل کا سچ خود سے کہہ گزرتے تو ان تکلیفوں کا حشر کون سنتا؟ کیسے سنتا؟"

سلیم افسر کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔

"میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں شافعہ! تمہارے علاوہ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ نہ کوئی ہے ایسا جو مجھے تمہاری طرح خوش رکھ سکے۔ مجھے خود سے الگ مت کرنا۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔"

انہیں عجیب سے دھڑکے نے جکڑ لیا تھا۔ بیگم عافیہ نے شوہر کی اس محبت کو بھیگی آنکھوں سے دیکھا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

"میں خود آپ کو خود سے بانٹنا نہیں چاہوں گی، لیکن میں چاہتی ہوں، انوشے۔ جو اپنی ایک ماں کی حسرت میں مجھ سے نفرت کرتی ہے، وہ اصل ماں کی محبت پا کر محبت سے محبت کرنا سیکھ جائے۔ سلیم! میں چاہتی ہوں، زندگی کا جو نیا فیصلہ اس نے لیا ہے، وہ ناکام نہ ہے کیونکہ جو کچھ اس کے اندر اپنی ماں کی گمشدگی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، وہ ماں کے مل جانے سے ترتیب پا جائے گا۔ آپ یوں سمجھیں، کوئی کہانی شروع ہو، بچہ سنتے سنتے سو جائے، پھر آدھی کہانی میں جاگے تو درمیان کی جو کڑیاں رہ جائیں ناں، وہ ہمیشہ اس کہانی میں تشنگی کا احساس رہنے دیتا ہے۔ پھر بچہ اپنی طرف سے اپنے احساس سے گھڑ گھڑ کر اس درمیانی حصے کو مکمل کرنے کی کوشش کرے اور کہانی کچھ کی کچھ ہو جائے۔ سلیم! اسے کہانی مکمل کرنے دیں، تاکہ وہ زندگی کی کہانی ٹھیک ٹھیک جی سکے۔"

سلیم افسر نے بیوی کو محبت سے دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ "زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہیں ہوگا، جب مجھے لگا نہ ہو کہ میں نے زندگی میں درست فیصلہ نہیں لیا۔ عافیہ! تم میری کسی بھولی بھٹکی نیکی کا ثمر ہو، اور بس۔"

عافیہ بانو مسکراتی رہیں۔

پھر دونوں کمرے سے باہر آ کر ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ کی تفصیل لے رہے تھے۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا، معاملہ اُن کے دماغ کا نہیں، صرف اس نشے کا ہے، جس کی وجہ سے اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر پڑا ہے۔ کیونکہ جس وقت عافیہ بانو انہیں ہاسپٹل لائی تھیں اور ڈاکٹرز نے اُن کی دماغی استعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ان پر بہت کم محنت کے ساتھ اچھا رزلٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عافیہ بانو نے نفسیاتی علاج کے ساتھ ساتھ فزیوتھراپسٹ بھی ہائر کر رکھا تھا، سواس لمحے دونوں ایک ساتھ گاڑی کی طرف بڑھے تھے۔ ڈرائیور نے دونوں طرف سے دروازے کھولے تھے۔ سلیم افسر نے آرام سے بیٹھتے ہوئے عافیہ بانو سے سوال کیا تھا۔

"وہ مسٹر عبدالرحمٰن سے آپ کی ملاقات کا کیا رہا، عافیہ؟"

عافیہ بانو نے ٹھنڈا سانس لے کر مدھم کہا۔ "مسٹر عبدالرحمٰن مجھ سے ابھی تک نہیں ملے ہیں۔ حالانکہ سارے کام اُن کے اپروول سے پہلے انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے نہ ملنے کے لئے سارے اختیار اپنے تینوں بیٹوں سالار عبدالرحمٰن، جازی عبدالرحمٰن اور شہریار عبدالرحمٰن میں بانٹ دیئے ہیں۔ شہریار کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا، وہ اپنے پاپا کے بہت قریب ہے، مگر جب میں نے عطیہ کے بارے میں اُس سے سوال کیا تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔"

"حیرت زدہ رہ گئے یا اپنے پاپا کے راز کی نگہبانی کرنے کے لئے جھوٹا تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے شہریار؟"

عافیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر نرمی سے بولی تھیں۔ "نہیں سلیم! وہ بچہ ایسا نہیں ہے۔ جو اُس کے اندر ہوتا ہے، وہی اُس کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں دل سے الگ کوئی رابطہ نہیں رکھتیں۔"

سلیم افسر مسکرانے لگے، پھر شرارت سے بولے۔ "خیریت تو ہے، یہ آپ شہریار کا تذکرہ اتنے پیار سے کیوں کر رہی ہیں؟ سچ پوچھیں تو مجھے اب جیلسی ہونے لگی ہے۔ کیونکہ دائمہ، شہریار بھائی کی دیوانی ہیں۔ مراد کا شہریار کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ اور وہ دنیا جہاں کی نک چڑھی انوشے، وہ بھی اُس کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتی ہے۔ اور آپ، آپ بھی اُس کا ذکر اتنی محبت سے کرتی ہیں۔" وہ ہنسے اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

عافیہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔ "خدا کا خوف کریں سلیم! وہ بچہ ہے ہی اتنا اچھا کہ دل اُس کی طرف خود بخود کھنچتا ہے۔ آپ کو نہیں پتہ، لیکن انوشے نے اُس کی بہت مدھم مدھم ایڈوائز کی وجہ سے ہی ڈرگ کو تقریباً خیر باد کہہ دیا ہے۔ بہت چینج آیا ہے اس میں شہریار کی وجہ سے۔ اُس دن میں نے سنا، وہ اپنی فرینڈ سے بھی شہریار کا تذکرہ محبت سے کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ بالکل

شہریار کی طرح ہوتا۔ اگر نہیں ہوتا تو میں دن رات یہی مناجات کرتی کہ میری زندگی میں شہریار جیسے ایک بھائی کا سہارا ضرور ہو۔ تمہیں نہیں پتہ، بھائی نہ ہو تو سوسائٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا بہت مشکل کام ہے۔ اب تو انوشے، مراد کو بھی اہمیت دینے لگی ہے اور اس جیسی لڑکی میں تبدیلی کا اتنا بڑا مارجن ایسا تو نہیں کہ نظر انداز کیا جا سکے، اور جس کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی ہے، اُسے سراہا نہ جائے۔"

"او کے، او کے۔ آپ کا شہریار بہت عظیم انسان ہے۔ بس۔ ویسے سچ بتاؤں تو اُسے دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں خواہش جنم لیتی ہے کہ کاش اُس جیسا میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا۔ مسٹر عبدالرحمن بہت لکی ہیں ناں۔"

عافیہ مسکرانے لگی تھیں مگر اُن کی سوچیں اب بھی عطیہ بانو کی کہانی جان لینے کے گرد ہی گھوم رہی تھیں۔ آخر وہ کس سے پوچھیں کہ اُن کی بہن کے ساتھ وقت نے کیا ظلم ڈھایا؟ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ ساری کاوشیں دہرائی تھیں، جو سلیم افسر کے ساتھ طویل سفر پر جانے سے پہلے انہوں نے دہرائی تھیں۔ مسٹر عبدالرحمن ان دنوں ملک میں نہیں تھے اور جس کے ساتھ کا خواب دیکھ کر عطیہ بانو نے قدم باہر نکالے تھے، وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ لوگ کہتے تھے، وہ گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ کہاں رہتا ہے، کہاں نہیں، کوئی نہیں جان سکا تھا۔ اور نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک بند گلی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ راستہ کہیں نہیں تھا۔

کیا واقعی راستہ نہیں تھا؟ یا وہ راستہ ڈھونڈ نہیں پا رہی تھیں......؟



"تمہیں کیا لگتا ہے، شاہ صاحب کو خبر نہیں ہو گی کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟" سائیں نے رازداری سے کہا تو ملازمہ نے مدھم لہجے میں کہا۔

"سائیں! کوئی پتہ نہیں چلتا، بڑے سرکار اُس کی جان کے دشمن ہیں، وہ اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ صرف شاہ صاحب کی وجہ سے وہ حویلی میں ہے، لیکن اگر ہم اُسے اس طرح ادھ موا کر کے کہیں شہر میں پھینک دیتے ہیں تو وہ یہاں کون سا دے پائے گی؟ مر جائے گی پڑے پڑے۔ شاہ صاحب پوچھیں گے تو کہہ دینا آپ کہ بری عورت تھی، بھاگ گئی، جیسے پہلے گھر سے بھاگی تھی۔" ملازمہ تھوڑی دیر کو رکی، پھر جل کر بولی۔

"کھانے کو اُسے کچھ نہ دو، کام جی بھر کر کراؤ، پھر بھی اُس پر اثر ہی نہیں پڑتا۔ ساری حویلی کے مردوں کے دلوں پر راج کر رہی ہے۔ نہ منہ نہ متھا، پھر بھی جانے مردوں کو اس میں کیا نظر آتا ہے کہ......"

اُس نے ایک گندی سی گالی دے کر بات بدامد کی اور سائیں نے پُرسوچ انداز میں اُسے دیکھا۔ جو دھڑکا ایک کام کرنے والی ماسی کو تھا، وہی دھڑکا اُسے بھی تو تھا۔ پتہ نہیں، مرد کی نظر میں پھر کب تبدیلی آ جائے۔ اماں نے کہا تھا، ایک بار روٹی توے پر پلٹنے میں دیر لگتی ہے، مگر مرد کا دل اس سے بھی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ پھر کامران شاہ کا بھوت بھی تو اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کی سگی ماں تھی۔ آج نہ سہی، کل کسی موقع پر بیٹے کو ماں کا خیال آ گیا تو...... وہ تو اس حویلی میں نکو بن جائے گی۔ دوسرے درجے کی عورت...... پانچ سال کا بچہ بہت لاڈ میں پل رہا تھا، گو اُسے ہی ماں گردانتا تھا ابھی تک۔ اُس کی لوری

کے بغیر نہیں سوتا تھا، مگر سگی ماں تو سگی ماں ہوتی ہے ناں.......

بس اسی بات نے اُسے ملازمہ کی باتوں میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ زوار حسن شاہ ایک ہفتے بعد کسی کام کے سلسلے میں انگلینڈ جانے والا تھا اس لئے وہ چاہتی تھی، یہ کام اُس کے جانے کے فوراً بعد کرلیا جائے تاکہ لیپا پوتی کی گنجائش نکل سکے۔ حویلی کی اکثر عورتیں اس کام میں خود بخود اُس کی مددگار بن جاتیں۔ وہ اُن کی مالکہ تھی، وہ جو کہتی حویلی کے سب لوگ یہی کچھ کہتے، اس کا اُسے یقین تھا۔ سو وہ مطمئن ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر غلام گردش میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کی کنیز، بغل میں چہرہ چھپائے بے تحاشہ رو رہی تھی۔ اُسے پتہ نہیں، اپنی قسمت پر رونا آرہا تھا، یا اپنی زندگی پر، کچھ ظاہر نہیں تھا۔ زندگی پہلی ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ زوار حسن شاہ کسی نہ کسی حوالے سے اُس کے لئے ابھی بھی مشکلات پارسل کرتا رہتا تھا۔ اُس کی مجبوری، اُس کی دُکھ میں ڈوبی گڑگڑاہٹ تک اُس کے دل کو موم کرنے کے بجائے اور پتھر کردیتی تھی۔ اُسے لگتا تھا، اُس کا خدا اُس سے ناراض ہے۔ ورنہ دل کا موم کرنا کیا مشکل ہے۔

اُس نے سر جھکا لیا تھا، پھر آہستگی سے خود سے بولی تھی۔ ''زمِ دل کی کھیتیاں اُجاڑنے والے کیا اتنی آسانی سے محبت کی فصل کاٹ سکتے ہیں؟''

دل نے کٹہرے میں لے جا کر کھڑا کردیا، پھر تعزیر لگائی۔ ''یہ کیونکر ممکن ہے؟ موم دل تو خود آنسوؤں میں پگھلا کر بہا دیئے تم نے، پھر پتھر سے دوستی میں اتنی اُلجھن کیوں؟....... مگر ضبط کبھی کبھی دو نیم ہو جاتا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے کر رونے لگتی، یا پھر چپکے چپکے میسج کرتی رہتی۔ کبھی میسج سینڈ ہو جاتا، کبھی اُس کی دعاؤں کی طرح واپس لوٹ آتا۔ اب تو جیسے اُسے انتظار کرتے کرتے بھی تھکن ہونے لگی تھی۔ انتظار اُس کے لئے ایک طویل خاموشی اور طویل خلاء کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اتنے سال بعد اُس پر کھلا تھا، اُس نے جیسے اپنے گھر کے دروازے سے قدم دنیا میں نہیں، ایک خلاء میں رکھ دیا تھا۔ ایک ایسا خلاء، جہاں زندگی نہیں تھی، آکسیجن نہیں تھی اور وہ نیچے سے نیچے گرتی چلی جارہی ہے۔

''اوئے، چل اُٹھ! بہت کام پڑے ہیں۔'' بوڑھی ملازمہ نے اُسے ٹھڈا مارا اور وہ کراہ کر رہ گئی۔ ''کمی کمینوں سے بھی گئی گزری ہے تو....... مالکن بننے لگی ہے۔ کم بخت میری بیٹی کا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔ اِدھر دیکھ، ہماری ساری نسلیں اس حویلی کی غلاموں کی غلام ہیں، ہمارا شجرہ نسب ہے، ہماری نسلوں کی پہچان ہے، ہمارے باپ دادا کا پتہ ہے۔ تیری طرح نہیں کلموہی!'' اُس نے اُسے اُٹھنے بھی نہیں دیا تھا اور سر کی چادر کھینچ کر زمین پر گرا دیا۔ وہ منہ کے بل گری تھی۔ پیشانی زمین کی خاک سے خاک ہوگئی تھی۔ بالوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ اور تبھی اُسے لگا تھا، اُس کی ماں نے اُس کا ہولے ہولے شانہ ہلایا تھا۔

''اُٹھ نیک بخت! نماز پڑھ لے۔ جو سر سجدے میں جھکتا ہے، وہ ہزار سجدوں سے بچ جاتا ہے۔ پتہ نہیں، تجھے خدا سے، نماز سے کیا اُلجھن ہے۔ میرا تو دن نہیں چڑھتا جب تک میں بارگاہِ الٰہی میں سر نہ

جھکا دوں۔"

"سر نہ جھکا دوں......" اُسے لگا جیسے اُس کی ماں کا آخری جملہ اُس کی زندگی کی پنچ لائن بن گیا تھا۔ "جو سر خدا کے آگے نہ جھکیں، اُنہیں پھر وہ جھکانا جانتا ہے۔ کبھی دُکھ دے کر، کبھی بیماری دے کر، کبھی آزار دے کر، وہ جھکانا جانتا ہے، مگر صرف اُنہیں جن سے وہ پیار کرتا ہے، صرف اُنہیں وہ ٹھوکر لگاتا ہے کہ سنبھل جا، زندگی کی سمت ٹھیک کر لے۔ جن سے محبت نہیں کرتا، اُن سے بے نیازی اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے مہماندار دوست اپنے دوست کا بڑھ کر استقبال کرے مگر اتنا مروتا ہو کہ بھول بھٹک کر آنے والے کو بھی اپنے مہمان خانے سے ہاتھ پکڑ کر نکالے تو نہیں، پر گلے سے بھی نہ لگائے۔

اُس کے اندر اماں کی کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ مرے مرے قدموں سے پلٹ سے اُٹھی تھی۔ تب عارف کی بات نے اُس میں سانس بھری تھی۔

"پر اماں! کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے، جو لوگ بہت پرہیز گار ہوتے ہیں، اُن کے لئے دنیا، دنیا داروں سے بھی زیادہ تنگ ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ سے پیار کرتے ہیں پر پھر بھی قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔ قدم قدم پر مشکلیں اُنہیں مسل دیتی ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دوست تو ایسا نہیں کرتا۔ دوست کو تو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔"

"نہیں کرنا چاہئے۔ پر دوستی کو جانچنے کا بھی تو کوئی ذریعہ ہے ناں۔ تم محبت کرو کسی انسان سے، دل میں کہیں نہیں کہیں ہوک تو ہوتی ہے ناں۔ جان لو، تمہارا محب یا محبوب تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کیا اتنی محبت کہ تمہارے لئے دنیا ٹھکرا دے؟ تم سوچتے ہو ناں، لیکن خوف سے یہ جانچ نہیں کرتے، کیا پتہ وہ تمہاری کسوٹی پہ پورا نہ اُترے، کیا پتہ تمہیں چھوڑ کر رسائی دے ڈالے اور حقیقت میں محبت کو آزمائش میں ڈالنا بھی نہیں چاہئے۔ مگر وہ خدا ہے، بادشاہ ہے اور بادشاہ دل کے شاہوں کو ہی حکم باریابی بخشتا ہے۔ اُنہیں جن میں سہار ہو، وضع داری ہو، برداشت ہو...... تم نے کبھی کسی بادشاہ کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھا ہے؟"

"پر اماں! ہر کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ ہم عام لوگ کہاں جائیں؟"

"محبت میں عام لوگ ہی تو خاص ہوتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا، تیاگ یہ نہیں کہ آپ عیش وعشرت، آسائش اور دنیا سے منہ موڑ لیں، تیاگ یہ ہے کہ آپ ان سب چیزوں میں شامل ہوں مگر آپ کا دل اندر سے درویش ہو۔ درویش بادشاہ ہے اور دل کا بادشاہ خدا کے آگے درویش ہے، عام بندہ ہے۔ اسے حکم باریابی کی صدا کچھ اور سننے نہیں دیتی۔ وہ اُس کی آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہے، اُس کے کان سے سنتا ہے اور یہ محبت کی انتہا ہے۔ اس انتہا تک جانے کے لئے آزمائش گزارنی پڑتی ہے، جیسے نذر گزاری جاتی ہے۔ مالک کی مرضی نذر قبول کرے یا رد کر دے۔ دُکھ، آزار، پریشانیاں، یہ سب اس محبت کے

پیمانے ہیں کہ ہم کتنی چاہ کرتے ہیں اس کی، کس تکلیف پر جا کر چیختے ہیں یا ضبط سے نکل جاتے ہیں۔ عارف! ضبط سے گزر جانا محبت ہے، محبت۔ سمجھی ہو ناں؟"
"پر اماں! ابلیس نے بھی تو محبت کی تھی، پھر بھی وہ راندۂ درگاہ ہوا۔"
اماں نے اُس کے اس انوکھے سوال پر اُسے دیکھا، پھر مسکرا کر بولیں۔
"تیرے دماغ میں ہمیشہ ایسی اُلٹی باتیں ہی کیوں آتی ہیں؟" اماں نے مسکرا کر اُسے سہ بارہ دیکھا۔ پھر مکرر بولیں۔ "ابلیس نے محبت کب کی تھی؟ محبت تو رب نے کی تھی۔ ہزار درجے دیئے، ہزار ڈھیلیں دیں، ہزار زمیاں کیں کہ کہیں سر جھکا دے تو معاف کر دوں، پر اُس نے سر نہیں جھکایا۔ اپنی عبادت کے زعم میں راہ کھوٹی کی اپنی۔ ابلیس نے عبادت کی۔ بڑے دل سے، بڑی جان مار کر، پر محبت نہیں کی نا ئمہ! اگر وہ محبت کرتا تو محبوب کو انکار ہی نہیں کر سکتا تھا۔ محبوب کی تو بارگاہ میں ہاں کا سکہ چلتا ہے، جی حضوری۔ بیٹا! اس نقطے کو سمجھ محبت میں انکار نہیں، محبت میں انا نہیں، زعم نہیں، خودی نہیں۔ یہ سمجھ بیٹا! یہ سمجھ۔"
اور اس وقت وہ ساری غلام گردش کے برتن راکھ اور کوئلے سے مانجھتے ہوئے اپنے اندر ماضی کا درس دہرا رہی تھی۔ اُس نے بھی تو سر نہیں جھکایا تھا۔ محبت کی بارگاہ میں رشتے بخشے اُس رب نے اور اُس نے اپنی خودی کے زعم میں سب ٹھکرا دیا۔
کیا یہ سزا کبھی ختم ہوگی، میری......؟ اُس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔ پھر موقع ملتے ہی اُس نے اسی پرانے نمبر پر کال ملائی تھی، پھر سسک کر بولی تھی۔ "میں ائمہ۔ بھائی! کل سے آپ کا نمبر ملا رہی ہوں، لیکن نمبر لگ ہی نہیں رہا ہے۔"
"جگہ بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں آتا ہوں تمہیں لینے۔"
وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُس کو کسی نے چٹیا سے پکڑ لیا تھا۔
"اچھا...... تو یہ چکر بازیاں ہیں تیری۔ حویلی کے لوگ کم پڑ گئے ہیں جو باہر سے اپنے سگوں کو بلا رہی ہے؟ بول، کسے فون کر رہی تھی؟ بول!" بالے نے اُسے تھپڑوں پر رکھ لیا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی۔
"بالے! میرا فون دے دے۔ قسم سے، میں کسی کو نہیں ملا رہی تھی۔ بالے! مجھے فون دے دے۔ تیرے بچے جئیں۔" وہ گھٹنوں کے بل جھک کر گڑگڑانے لگی۔ اُسے لگا، وہ فقیرنی ہو گئی ہے۔ اُسے اپنا ایک عمل یاد آنے لگا تھا۔ اُس کے سامنے کسی نے اس طرح گڑگڑا کر کہا تھا۔ "وے، مائی ایک روٹی کا سوال کرتی ہے۔ تیرے بچے جئیں۔"

”نہیں ہے میرے پاس۔ کچھ نہیں ہے۔ تجھ جیسی مسٹنڈیاں، ہٹی کٹی عورتیں، ان کو تو میں اپنا بخار بھی نہ دوں، چل ہٹ، راستہ دے۔“

”نائمہ! ایسے نہیں جھڑکتے کسی کو۔ کیا پتہ، کس رمز میں کون ہو، کون اللہ کا مقرب بندہ ہو، کون کیا ہو، نہیں دینا مت دے، پر جھڑک مت، دل مت توڑ۔ دل اللہ کے رہنے کی جگہ ہے، بادشاہ کے دل میں بھی وہی، فقیر کے دل میں بھی وہی۔ کیا پتہ، تیرے کس جملے سے اس کا کون سا تانکا اُدھڑ جائے، درد کا مارا کوئی دل ہو تو تجھے آہ لگ جائے۔ مت کر ایسے۔“

”مجھے نہیں کرنی یہ آپ کی جیسی رحم دلی۔ کچھ نہیں ملتا اس سے۔ یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں ان مانگنے والوں کے۔“

”بالے! تجھے رب کا واسطہ، مت ظلم کر مجھ پر...... مت توڑ۔ دیکھ میری عزت تیرے قدموں میں ہے۔ مت کر بالے! ایسا مت کر۔“ اُس نے اپنا دوپٹہ اُس کے پیروں میں ڈال دیا اور بالے نے ٹھوکر لگائی۔

”پرے ہٹ۔ تو اور تیری عزت...... ہٹ......“ اُس نے سم سمیت موبائل بوٹ کے نیچے رکھ کر بڑی طاقت سے کچل دیا اور وہ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ جیسے ابھی کوئی موت ہوئی ہے۔ اُس کے بین پوری غلام گردش میں گونجتے پھرے تھے۔

”سائن! وہ تو پاگل ہو گئی ہے۔ بالے نے موبائل کچلنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ اس پر رکھ دیا۔ بالے نے اس کا ہاتھ بھی کچل دیا ہے۔ سائن! شاہ صاحب کو پتہ چلا تو بڑا برا ہوگا۔“

سائن نے ملازمہ کی طرف دیکھا تو اُس نے کندھے اچکا کر کہا۔ ”شاہ صاحب پوچھیں تو کہہ دینا، ہاتھ چوٹ سے جل گیا ہے اور اس سے کہنا، سچ بولا تو پورا جلا دوں گی اسے۔“

ملازمہ سر ہلاتی آگے بڑھ گئی اور وقت پر لگائے اُڑتا چلا گیا۔

حویلی کی غلام گردشوں میں اُس کا سانس گھٹنے لگا۔ اُسے پھر اس زندگی سے نکلنے کی حسرت بھی ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی کہ بالے کے لئے کھیتوں پر کھانا لے جاتے ہوئے کچھ شہریوں نے اُسے اغواء کر لیا تھا۔ اُس کے ساتھ کی دوسری نوکرانی نے حویلی میں خبر دے دی تھی۔

”وہ کنیز کو اُٹھا کر لے گئے جی...... وہ کنیز کو......“

زوار حسن شاہ نیا جام بھر رہا تھا کہ تیزی سے اُٹھا تھا۔ ”کس کی مجال ہے، جو میری ملازمہ کو اغواء کر کے لے گیا، میری زمین سے؟“ اُس نے بندوق لے کر باہر نکلنا چاہا کہ سائن نے اُسے روک لیا۔

”مت جاؤ شاہ جی! چلی گئی ہے تو جانے دو اُسے۔ کون سی وہ ہمارے لئے ضروری تھی بڑا فساد تھی حویلی میں۔“

زوار حسن شاہ نے اُسے دیکھا اور پھر بیوی کے بال مٹھی میں پکڑ کر غرایا۔ ”بتا اُلو کی پٹھی! یہ تیرا کوئی نیا ڈرامہ تو نہیں؟...... تُو اُس سے جلتی تھی ناں...... بتا، وہ تیرے آدمی تو نہیں تھے، جنہوں نے کنیز کو اغواء کیا؟“

”نہیں شاہ صاحب! میری مجال ہے یہ؟ میں تو صرف گھر کی سیاست کرتی ہوں شاہ صاحب! مجھے میرے بچے کی قسم شاہ صاحب!“

زوار حسن شاہ کی تنی ہوئی رگیں کچھ ڈھیلی ہوئیں مگر اُس نے اُس کی تلاش نہیں چھوڑی۔ پھر ایک دن بالے کو کسی نے شدید زدوکوب کر دیا۔ وہ اُس کے پاس غلام گردش کے مردان خانے میں گیا تھا۔ شہر سے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو بلوایا گیا تھا کہ آخر کو بالا اُس کا داہنا ہاتھ تھا۔

”کون تھے بالے! وہ، جنہوں نے تیرا یہ حال کیا؟“

”پتہ نہیں صاحب! چار بندے تھے۔ پتہ نہیں، ہوا سے آئے تھے یا زمین سے نکلے تھے، مجھے تو خبر ہی نہیں ہوئی شاہ صاحب! انہوں نے مجھے ایک ساتھ پیٹنا شروع کر دیا۔ میں تو اُن کی شکلیں بھی نہیں دیکھ سکا شاہ صاحب!“

”تجھے کیا لگتا ہے بالے! وہ لوگ فیاض کے آدمی تو نہیں تھے؟“ زوار حسن شاہ نے پُرخیال انداز میں اُسے دیکھا تو وہ کراہ کر بولا۔

”نہیں شاہ صاحب! فیاض کی سات پشتوں کو میری غلام نسل جانتی ہے۔ اُن کے غلاموں کا شجرہ بھی مجھے حفظ ہے۔ اُن میں کوئی اتنا دم خم والا نہیں کہ شاہ حسن ابراہیم کے غلاموں کو چھو بھی سکے۔ وہ کوئی اور تھے شاہ صاحب!...... بالکل کوئی اور......“

”کہیں یہ آدمی شہر کی خفیہ پولیس کے لوگ تو نہیں تھے؟“

”خفیہ پولیس کے لوگ؟“ اُس نے سوال کیا اور زوار حسن شاہ رازداری سے بولا۔

”ہاں! آج کل اوپر سے نیچے تک چھانٹی ہو رہی ہے بالے! اپنے فیور کے سارے لوگوں پر سخت کھنچائی ہو گئی ہے۔ میری نقل و حرکت پر بھی نظر ہے۔ بابا سائیں بھی لپیٹے میں آئے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں، کہاں کہاں سے کیس کھل رہے ہیں۔ میں تو یہی سوچ کر ولایت جا رہا ہوں کہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو آ جاؤں۔ مگر بالے! سمجھ نہیں آتا، وہ شہری لوگ کون تھے جو کنیز کو لے گئے۔ پر لے کہاں گئے؟...... بالے! اطلاع ملتے ہی شہر کو جانے والی واحد شاہراہ پر میں نے اپنے بندوں کا پہرہ لگا دیا تھا۔ پر وہ لڑکی اپنے علاقے سے باہر نہیں گئی۔ لیکن سمجھ نہیں آتا، گئی کہاں ہے۔ ساری طرف سے اُلجھنیں پڑتی چلی جا

رہی ہیں۔اور بالے ابّو.... تو بھی ٹانگیں تڑوا کر بیٹھ گیا ہے۔پتہ نہیں، پھر سے کھڑا بھی ہو سکے گا یا نہیں؟"

بالا اپنی تکلیف اور اُس کے ٹھیک ہونے نہ ہونے کا اندازہ لگا کر پھر سے رونے لگا تھا۔

زوار حسن شاہ کچھ دیر تو اُسے دیکھتا رہا، پھر بور ہو کر اُٹھ گیا۔اُس کی نظر میں وہ اُس کے لئے بے کار ہو گیا تھا۔ریس کے گھوڑے کی طرح، مالک جس پر اسی وقت تک پیسہ لگاتا ہے، شرطیں باندھتا ہے جب تک گھوڑا ٹریک پر دھواں دھار دوڑ سکے۔گھوڑا زخمی ہو جائے تو مالک اس کی تیمارداری نہیں کرتا۔صلے کے عوض ایک کارتوس انعام میں دیتا ہے تاکہ اس کی موت زیادہ سہل ہو سکے۔

بالا اپنی اوقات سے آگاہ ہو گیا تھا، اس لئے رو رہا تھا۔مگر مکافاتِ عمل، وہ کبھی بھی کسی کو بھی نہیں بخشتا۔آپ کے اعمال خود آپ کے سامنے سزا کی طرح آجاتے ہیں۔کبھی آپ کے سامنے، کبھی آپ کی کسی آگے کی نسل کے سامنے۔مگر مکافات ہوتا ضرور ہے۔وہ روئے جا رہا تھا، اُسے ایک لڑکی کے دل کا دُکھ لگ گیا تھا۔

کبھی اپنی کسی غلطی کا احساس اتنی جلدی ہوتا نہیں ہے، مگر بستر مرگ ہو یا معذوری، یہ ایسی حالتیں ہیں کہ عموماً دل پگھل کر آنکھوں سے بہہ ہی جاتا ہے۔اور دل پگھلنے کی حالت میں آجائے تو سمندر بن جاتا ہے۔اور سمندر چٹانوں تک کو ہلا کر توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔وہ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔



"کون ہو تم؟........چھوڑو مجھے۔" اُس نے پوری طاقت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور ایک بہت گمبھیر آواز نے اُسے سکتے میں مبتلا کر دیا۔

"تمہیں وہ زندگی بہت پسند ہے کیا؟ کیا تم وہیں رہنا چاہتی ہو؟ تمہیں آزادی نہیں چاہیے تو ہم تمہیں خود اُس حویلی کے دروازے پر چھوڑ سکتے ہیں۔بتاؤ، کیا تم ایسا چاہتی ہو؟"

نائمہ کے جسم کا سارا احتجاج دم توڑ گیا۔اُس نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا۔"کون........کون ہیں آپ لوگ؟"

"تمہارے خیر خواہ ہیں۔اور خیر خواہوں کے نام نہ بھی ہوں تو بھی کام چل جاتا ہے۔"

"مگر آپ کو کس نے بھیجا ہے میرے لئے؟"

مگر چاروں میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔پھر اُن کی جیپ زوار حسن شاہ کی زمینوں کو روندتی ہوئی طوفانی رفتار سے شاہ فیاض کی زمینوں کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

"آپ شاہ فیاض کے آدمی ہو؟" اُس نے خوف سے کپکپاتے ہوئے پھر سے کراہ کر سوال کیا۔ کیونکہ یہ تو وہی تھا کہ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹک جائے۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟ آپ کس کے آدمی ہیں؟"

"ہم اللہ کے آدمی ہیں۔ اللہ کے بندے ہیں۔ ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں، لیکن شاہ فیاض کے اوپر ہمارا ایک قرض ہے۔ ہمارے باس نے ایک بار شاہ فیاض کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ بس اس لئے آج ہم اپنے کام کو نکلوانے کے لئے اُن کا استعمال کر رہے ہیں۔ جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے، ہم تمہیں شہر لے جانے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ شہر کی طرف جانے والی ایک ہی مین سڑک ہے، جہاں پر تمہارے سدوار شاہ کے آدمی پہرہ دے رہے ہوں گے۔ سو تمہیں کچھ دن اور قید میں گزارنے پڑیں گے۔ لیکن یہ قید زوار حسن کی قید سے مختلف ہوگی۔ تم یہاں آرام اور عزت سے رہو گی۔"

نائمہ نے بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ شاہ فیاض کی حویلی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک لیٹر نکال کر شاہ فیاض کی طرف بڑھایا تھا اور جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ شاہ فیاض نے لیٹر پڑھ کر کافی دیر تک مراقبے میں غوطہ لگایا، پھر گہری سانس لے کر بولے تھے۔

"شاہ حسن ابراہیم سے ہماری نسلوں کا جھگڑا چلا آرہا ہے۔ ہمارے اور اُن کے بہت سے آدمی اور خاندان کے لوگ اس تنازعے کا شکار ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کے باس کا واقعی ہم پر ایسا احسان ہے کہ ہم اس تنازعے کے باوجود اُس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔" انہوں نے ذمہ داری لی تھی، پھر بہت گمبھیرتا سے آواز دی تھی۔ "امین احمد! ادھر آؤ۔"

امین احمد "جی سائیں" کہتا ہوا آگے آیا تو انہوں نے برابر کھڑی نائمہ کی طرف اشارہ کیا۔ "امین احمد! یہ لڑکی آج سے ہماری پناہ میں ہے۔ اسے ہم تمہاری ذمہ داری میں دیتے ہیں۔ یہ آج سے تمہاری دھی رانی کی طرح ہے۔"

"جی سائیں!" امین احمد نے ہامی بھری اور شاہ فیاض نے پھر سے گمبھیرتا سے کہا۔ "امین! دیکھ یہ تیری دھی ہے تو دھی ہی ہے، ہماری پناہ کا مطلب پناہ ہے۔ مجھے میرے دوست کے آگے شرمندہ نہ ہونے دینا۔"

"نہیں سائیں! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ میری دھی رانی ہے سائیں! مجھے اپنی دھی کی قسم، یہ آج سے میری دھی ہے۔"

شاہ فیاض نے امین کے ہاتھ کو نائمہ کے سر پر رکھے دیکھا اور اطمینان سے بولے۔ "آپ اب بے فکر ہو جائیں، یہ میرا خاص ملازم ہے، اب یہ اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر آپ کی دی گئی امانت میں کوئی

خیانت نہیں کرسکتا، نہ خیانت کرنے دے سکتا ہے۔"

چاروں نوجوان اُٹھ گئے تھے۔ اُنہیں پچھلے دروازے سے باہر نکال دیا گیا تھا، جہاں سے وہ یہاں آئے تھے۔

وہ امین کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ایک اور غلام گردش میں گم ہو گئی۔ ایک غلام گردش خلاء کا راستہ تھا اور دوسری غلام گردش جانے کون سا راستہ دکھانے والی تھی۔ پتہ نہیں، اُس کا اگلا قدم خلاء میں پڑنے والا تھا یا زمین چھو لینے والا تھا۔ وہ اُلجھی ہوئی اپنی زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانے کی دعا کرنے لگی۔

یہاں آ کر اس نے پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا، نہا دھو کر پہلی بار سجدہ کیا تھا اور آج اُسے لگ رہا تھا، شاید ماں کے دُکھے دل نے اُس کے لئے کوئی دعا کسی قید پرندے کی طرح آزاد کی تھی، تبھی زندگی میں ایک دُکھ کم ہونے کی سبیل پیدا ہوئی تھی۔

"شہریار بھائی! کاش آپ مجھے ڈھونڈ سکتے، مجھے یہاں سے لے جا سکے۔ مجھے ایک موقع زندگی سے دلوانے کی لایعنی جنگ لڑتے کہ میں معافی مانگ سکتی۔ میں اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر تمام عمر معافی مانگنے کی جزا کما سکتی۔ شاید میں پوری طرح بخش دی جاتی......کاش......" اُس نے دعا کرتے کرتے ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ جھکا لیا۔



مومنہ رفیق اب دفتر میں بہت گھل مل گئی تھی۔ اُس کے اچھے رویے نے سب کے دل جیت لئے تھے۔ اتنے ماہ سے کام کرنے پر اور اُس کی قابلیت دیکھنے پر اُن سب کے ذہن سے یہ خیال بھی نکل گیا تھا کہ وہ بنا انٹرویو کے، سفارش پر اپائنٹ کی گئی ہے۔ اُن کا خیال تھا، دفتر کے لئے اس سے اچھی ورکر ہزاروں انٹرویو کے بعد بھی ڈھونڈنا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کی بہترین دوست بن گئی تھی۔ آج وہ سب کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساری ساتھی ورکرز ہی تھیں، اس لئے سب کا اصرار تھا کہ وہ پردے کے پیچھے کا حُسن دیکھنا چاہیں گی۔ وہ مسلسل انکار کر رہی تھی کہ نائیلہ نے سوال کیا تھا۔

"کیا تم شروع سے حجاب کرتی ہو؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ پھر آہستگی سے بولی تھی۔ "پہلے میں بہت ماڈرن قسم کی لڑکی تھی۔ میری ماں مجھے اس بات پر بہت ٹوکتی تھی۔ اُس کا خیال تھا لڑکا لڑکا چھپا کر رکھنے والی شے کا نام ہے۔ اور میں کہتی تھی کہ ماں! تم دقیانوسی ہو اس لئے ایسا سوچتی ہو......ماں میری سنتی اور چپ رہ جاتی۔ سچ پوچھو تو میری غلطی میں میری ماں کی بھی غلطی شامل تھی۔"

"غلطی؟........تم نے بھی کوئی غلطی کی ہے؟" بہت ساری آوازیں، اور اُس نے سر اثبات میں ہلا کر کہا۔

"ہاں، میری غلطی........میری ماں نے مجھ پر ہر وقت چیک رکھنا شروع کر دیا۔ میں بڑی ہوئی تو مجھے لگتا تھا، میں کوئی عادی مجرم ہوں، جو نظر بچاتے ہی کوئی گناہ کر گزروں گی۔ ماں کو ہر وقت مجھ پر شک رہتا۔ میری سہیلیاں اُنہوں نے کبھی بننے نہیں دیں۔ اُن کا خیال تھا لڑکی کو سہیلیاں بگاڑ دیتی ہیں۔ میرا کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ جو اسکول فرینڈ زتھیں، ماں نے ان سے بھی مجھے چھڑوا دیا۔ اُن کے فون آتے تو ماں اُن سے اُن کے فون کرنے کی اتنی تفصیل لینے بیٹھ جاتیں کہ پھر مجھ تک فون آتے آتے خدا حافظ کے فقرے میں ڈھل جاتا۔ کبھی ماں کے سونے میں، میں کوئی فون ریسیو کر لیتی تو ماں کو پتہ نہیں، کیسے پتہ چل جاتا، وہ فوراً اپنے کمرے کا ایکسٹینشن اُٹھا لیتیں۔ رات کو کتنی بار مجھے اُٹھ اُٹھ کر آ کے دیکھتیں........میرا بھائی کہتا، ماں تو سائیکو کیس ہے۔ میں اُسے جھڑک دیتی، کیونکہ مجھے لگتا یہ ماں کی محبت ہے جو وہ میرا اتنا دھیان رکھتی ہیں۔ کبھی ماں کی اس محبت کی عادت تھی کہ میری زندگی میں رفیق آ گئے۔

"رفیق........اوہو، محبت کا ٹوئسٹ۔" تانیہ نے ہنس کر کہا اور اُس کی آواز بھیگ گئی۔

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔ میں ارد گرد کے ماحول سے بھاگنے کے لئے اس رانگ کال پر چھپ چھپ کر باتیں کرنے لگی۔ محبت ہو تو چالاکیاں بھی آ ہی جاتی ہیں۔ گھر کی گھٹن نے مجھے باہر جھانکنے پر مجبور کیا۔ پھر جب وہ کہتے، اُنہیں مجھ سے کتنی طوفانی محبت ہے تو میرا دل کھل جاتا۔ مجھے ماں کی سائیکو محبت سے چڑ ہونے لگتی۔ بھائی کی سرد مہری سے خار آنے لگتی۔ اور بس پھر یہ محبت ایسی طوفانی ہوئی کہ میں نے گھر چھوڑ دیا۔ رفیق الزماں سے میری شادی ہو گئی۔ مگر گھر سے نکل کر کھلا کہ گھر در حقیقت کتنی بڑی پناہ ہوتا ہے۔ بہت دھکے کھائے۔ رفیق مجھے کچھ ہی عرصے بعد میکے چھوڑ گئے تھے۔ وہ جیسے چپکے سے ملے تھے، میں نے اُنہیں اتنے ہی چپکے سے کھو دیا تھا۔ میں سڑکوں پر آ گئی تھی۔ پھر جب ہر ایک کی نظریں مجھ پر آ آ کر اٹکنے لگیں تو میں نے پہلی بار حجاب کیا۔ مجھے لگا، یہ حجاب نہیں، یہی میری ماں کا کھینچا گیا حصار ہے، جسے میں نے توڑا تو میں در بدر ہو گئی۔"

"تمہاری کوئی اولاد؟........کبھی رفیق الزماں سے پھر ملیں؟" بہت سے سوال۔ ساری لڑکیوں کی آنکھیں اُس کے دُکھ میں بھیگ گئی تھیں۔ کھانا کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔

وہ کتنی دیر تک بت بنی رہی، پھر مدھم بولی۔ "ایک اولاد ہوئی تو تھی، لیکن غربت سے گھبرا کر میں نے اُسے لٹل پیراڈائز میں جھولے میں ڈال دیا تھا۔ مجھے تو انیلا! یہ بھی پتہ نہیں، وہ بچہ میری بیٹی تھی یا بیٹا........"

انیلا نے اُس کے ہچکیاں لیتے وجود کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

اور بہت اچانک دروازہ کھلا تھا۔ ساری لڑکیاں گھبرا گئی تھیں۔ اُنہیں لگا تھا، وہ ابھی اُن کی سستی، کاہلی اور اُن کے وقت ضائع کرنے پر ہمیشہ کی طرح اُنہیں اچھی خاصی باتیں سنائے گا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سکوت تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا مومنہ رفیق کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ پھر بہت غیر متوقع اُس کا ہاتھ اُس کے سر پر آ کر ٹھہر گیا تھا اور بھرائے لہجے میں اُس نے کہا تھا۔

"خود کو آج کے بعد سے اکیلا مت سمجھنا۔ میں ہوں ناں تمہارا سگا بھائی نہ سہی، لیکن مجھے آج کے بعد تم دانیا کی طرح عزیز رہو گی۔"

یہ کہہ کر وہ رُکا نہیں تھا۔

ساری لڑکیوں کے چہرے پر حیرت جیسے ثبت ہو چکی تھی۔ خود مومنہ رفیق کا وجود اس لمحے کے آنے اور گزر جانے کے بعد زلزلوں کی زد میں تھا۔

یہ یک دم ختم ہو چکا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ خالی آنکھیں لئے اپنے دفتر کی میز کی دوسری طرف گم صم تھا۔

اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ آج لیٹ نائٹ کام تھا، اس لئے وہ پاپا کے انکشاف کو اپنے اندر اُتارے چپکے سے واپس دفتر آ گیا تھا۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا تھا، پاپا اُس کی ماں کو کیسے جانتے تھے کیونکہ اُس نے پاپا کی آنکھوں میں دیکھا تھا، وہاں آج بھی اُن کا کمہلایا ہوا دل بیٹھا تھا۔ وہ دل، جو شاید ہار گیا تھا۔

وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھا جھولے جا رہا تھا اور مومنہ کا بے چارگی بھرا جملہ اس میں گونج پیدا کر رہا تھا۔ "میری ایک اولاد ہوئی تو تھی، لیکن غربت سے گھبرا کر میں نے اُسے لعل پیرا ڈائز میں جھولے میں ڈال دیا تھا۔ مجھے تو اب تک یہ بھی پتہ نہیں، وہ بچہ میرا بیٹا تھا یا بیٹی۔"

وہ اب ریوالونگ چیئر سے جھولتے جھولتے اُٹھا تھا۔ پھر باہر نکلا تو پتہ چلا، سارا اسٹاف گھر جا چکا ہے۔

اتنی جلدی؟......وہ ابھی تو کمرے میں آیا تھا......اُس نے رسٹ واچ دیکھی۔ اُسے خلاؤں میں گھورتے، ریوالونگ چیئر پر جھولتے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

پھر وہ گھر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایڈیٹنگ روم سے جازی نکلتا نظر آیا۔ ایڈیٹنگ روم اور کھانے کا کمرہ ساتھ ساتھ تھے۔ نیچے جانے کے لئے جس کوریڈور سے ہو کر جانا ضروری تھا، وہ ورکرز کے الگ الگ بنے ہوئے گلاس کیبن تھے، جہاں وہ کھڑا تھا۔

"کمپنی پریزنٹیشن کیسی رہی، جازی؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس شیری بھائی!" وہ ترنگ میں بولا۔ پھر اُسے لگا، وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے شاید اعصاب پر کنٹرول کھو چکا ہے، ورنہ شہریار عبدالرحمٰن سے وہ ایسے بات کرتا، جس سے وہ بھرپور نفرت کرنے لگا تھا۔

شہریار اُس کی کیفیت سمجھ گیا تھا، پھر بھی اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مدھم بولا۔

"بہت ناراض ہو گئے ہو مجھ سے۔ کیا تمہیں لگتا ہے، میں واقعی چاہے جانے کے قابل نہیں ہوں؟" پتہ نہیں اس لمحے اُس کا موڈ اتنا پانی پانی کیوں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے نمی بھر گئی تھی۔

جازی عبدالرحمٰن کوئی تلخ سی بات کہہ کر اُس کا مزاج ٹھیک کرنا چاہتا تھا، لیکن جانے کیا تھا اُس کے چہرے میں کہ وہ خاموش رہ گیا تھا۔

"جازی! بتاؤ ناں، کیا واقعی میں نے تمہاری محبت میں کوئی کمی رہنے دی ہے، جو تم مجھ سے اس طرح دور ہو گئے ہو؟ دانیا بھی مجھے چھوڑ گئی تم بھی...... تمہیں معلوم ہے، میں تم دونوں کے بعد کتنا تنہا رہ گیا ہوں۔"

جازی عبدالرحمٰن مسمرائز ہو گیا تھا۔ پھر یکدم جیسے ٹرانس ٹوٹتا ہے، اُس نے پلکیں جھپکائی تھیں، پھر تلخی سے بولا تھا۔

"آپ کو آپ کی عادتوں نے تنہا کیا ہے شہریار بھائی! محبت کا راستہ تو آپ نے خود چھوڑا ہے۔ پھر الزام ہمیں کیوں دے رہے ہیں؟"

وہ وہیں کھڑے سے بیٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، جو اُس کے اندر روئے جا رہی تھی۔ اُسے کسی کے کندھے کی ضرورت تھی۔ وہ بہت ڈھیر سارا رونا چاہتا تھا۔ مگر کس کے سینے میں منہ چھپا کر روتا؟ اُس نے اب سر جھکا لیا تھا۔

"جاؤ! تم گھر جاؤ۔ میں واقعی لایعنی جنگ لڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ واقعی محبت میرے لئے نہیں تھی ہمیرے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس کی حسرت ترک کر دینی چاہئے شاید۔"

جازی عبدالرحمٰن کے دل کو یکبارگی کچھ ہوا تھا، اُس کے لہجے سے...... مگر عین اسی وقت اس کے کسی دوست کا فون آ گیا تھا۔ سو وہ باتیں کرتا ہی سیڑھیاں طے کرنے لگا تھا۔

شہریار نے کمرے میں آ کر اپنے کمرے کی لائٹس خود بند کی تھیں۔ ملازم اُس کا منہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا، وہ اتنا تھکا ہوا کیوں لگ رہا ہے۔ کیا اُس کی طبیعت خراب ہے؟ مگر وہ کچھ پوچھ ہی نہیں سکا، مالک اور ملازم کے رشتے میں بندھا خاموش رہ گیا تھا۔

"تم گھر نہیں جاؤ گے عبدالرحیم؟" اُس نے پلٹ کر نرمی سے پوچھا۔

رحیم نے اُس کی طرف دیکھا، پھر مؤدبانہ بولا۔ ''سر! آج فائنل ہے ایڈ کا۔ سالار صاحب دو دن سے مسلسل ایڈیٹنگ میں مصروف ہیں۔''

''لیکن ایڈ کی پریذنٹیشن تو آج ہوئی تھی۔'' اُس نے رُک کر سوال کیا اور اُس نے پھر مؤدبانہ کہا۔

''جی، یہ چپس کا ایڈ ہے۔ کل اسے میڈیا کے حوالے کیا جانا ہے، اس لئے وہ اس کا کام فائنل کرنا چاہتے ہیں۔ روزانہ صبح چھ بجے آ جاتے ہیں اور رات کو بہت دیر تک مصروف رہتے ہیں۔''

''انہیں اسسٹ کون کر رہا ہے؟'' اُس نے اگلا سوال کیا۔

''مسٹر صاحب جمال ہیں اُن کے ساتھ۔''

اُس نے سر ہلایا۔ صاحب جمال اُن کی کمپنی کا بہترین دماغ تھا۔ اُس نے قدم آگے بڑھائے مگر پتہ نہیں کیا بات تھی جو اُسے روک رہی تھی۔ وہ جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔ اب اُس کے قدم ایڈیٹنگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی کوئی اُس کے دروازے وا کرنے سے باہر آئی تھی، مگر روم میں سالار عبدالرحمٰن اکیلے تھے۔

''میں نے تو سنا تھا، آپ کو صاحب اسسٹ کر رہا ہے، لیکن یہاں تو آپ اکیلے ہیں۔''

وہ اندر آیا اور سالار عبدالرحمٰن نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ شہریار کو یکدم گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ دوڑ کر اُن کے قریب پہنچا تھا۔

''سالار بھائی! آپ ٹھیک ہیں؟''

سالار عبدالرحمٰن نے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنا سینہ مسل رہے تھے اور شہریار عبدالرحمٰن کے ہاتھ پاؤں گھبراہٹ سے لرزنے لگے تھے۔

''عبدالرحیم!...... عبدالرحیم!'' اُس نے چیخ کر بلایا۔ پھر اُنہیں تھام کر باہر نکلا۔ سالار عبدالرحمٰن کچھ نہیں بول رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی فریز حالت میں آ گئے ہوں۔

شہریار نے دفتر اور سارے کمپیوٹر کھلے چھوڑ دیئے تھے جن پر وہ میڈ میں میوزک جنگل اور ڈائیلاگ مکسنگ کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ وہ لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچا تھا۔ عبدالرحیم کو وہ دفتر بند کرنے کا کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اُنہیں فرنٹ ڈور کھول کر سیٹ پر بٹھا کر اُس نے سیفٹی بیلٹ باندھ دیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر دی تھی، کوٹ وہ کام کے دوران اُتار چکے تھے، لیکن پھر بھی اُنہیں لگ رہا تھا اُن کے سینے کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔

”آپ گہرے گہرے سانس لیں سنی بھائی! بس دس منٹ، یہاں سے انکل صمدانی کا کلینک بہت قریب ہے۔ آپ حوصلہ کریں۔ دیکھئے، اپنے دماغ کو اندھیرے میں مت ڈوبنے دیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

اُس کی سانس اُن سے زیادہ تیز چلنے لگی تھی۔ دل کی دھڑکن بے ترتیبی کا شکار ہو رہی تھی، مگر پھر بھی وہ پوری توجہ سے رِیش ڈرائیونگ انجام دے رہا تھا۔

دس منٹ کا سفر پانچ منٹ میں طے کر کے وہ کلینک میں داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی کا یہ کلینک ایک چھوٹا سا ہسپتال ہی تھا۔ سوئے تسلّی تھی، وہ سالار عبدالرحمٰن کو بالکل ٹھیک جگہ لایا ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر صمدانی نے ایمرجنسی میں سالار عبدالرحمٰن کا چیک اپ شروع کر دیا تھا اور وہ ان کے باہر جانے کے اصرار کے باوجود ان کے سر پر کھڑا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن کے آدھے گھنٹے میں سارے ضروری ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ پھر ڈاکٹر صمدانی اُس کے قریب آئے تھے۔ اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔

”بہت پیار کرتے ہو ناں اپنے بھائی سے؟“

اُس نے اُن کے چہرے پر آنکھیں ٹکا دی تھیں۔ وہ جلد از جلد رزلٹ جاننا چاہتا تھا اور وہ اُسے دیکھے کو کہہ رہے تھے۔

”اگر یہ واقعی ہارٹ پرابلم ہوتی اور سالار کو کچھ ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟“

”میں......میں اسی وقت مر جاتا۔ مجھ میں کسی کا بھی دُکھ دیکھنے کی ہمت نہیں ہے انکل!“ اب اُس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

ڈاکٹر صمدانی نے اُسے پاپا کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر آنسو......وہ کیسے رُکتے، یہ وہ آنسو تھے جو کسی کا کندھا چاہتے تھے، اس لئے کندھا ملتے ہی آنکھوں کی حدود پھلانگ کر باہر آ گئے تھے۔ ڈاکٹر صمدانی نے اُسے رونے دیا تھا پھر ہولے سے بولے تھے۔

”جتنی محبت تمہیں سالار سے ہے تمہارے پاپا اور میں بھی تم سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں۔ پھر تم کیوں ہماری محبت سے کھیل رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں کھو کر جی سکیں گے؟“

وہ اُن کے کندھے سے آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر نرمی سے بولا تھا۔

”میں بھی جینا چاہتا ہوں۔ مگر ابھی حالات میرے بس میں نہیں۔ کچھ مسائل ہیں، ان سے نمٹ لوں تو جینے کا ایک چانس میں بھی لینا چاہوں گا۔“ وہ رُکا، پھر بولا۔

""سنی بھائی کے ٹیسٹ کا کیا رزلٹ رہا؟"" اُن کے کندھے سے الگ ہو کر سوال کیا۔
ڈاکٹر صمدانی نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ""سب کچھ ٹھیک آیا ہے۔ بہت زیادہ محنت سے اچانک مسکولر پین ہو گیا تھا۔ پھر نازک مزاج وہ اتنے ہیں کہ بالکل ہمت چھوڑ بیٹھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، سینے کے اتنے شدید درد کو وہ ہارٹ اٹیک کی کنڈیشن سمجھے تھے، اس لئے گھبرا گئے اور تمہیں بھی پریشان کر دیا۔ تم تو جانتے ہو، سینے میں اُٹھنے والا ہر درد دل کی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں، پھر بھی ڈاکٹر سے رجوع کر لینا بہتر ہے۔""
""میں بھائی کو لے جا سکتا ہوں؟"" اُس نے اگلا سوال کیا۔
ڈاکٹر صمدانی نے نفی میں سر ہلایا، پھر نرمی سے بولے۔ ""دوا یک خواب آور انجکشن دیئے ہیں میں نے، اس کی نیند تین چار گھنٹے میں کھلے گی۔ وہ خود سے جاگے گا تو بہت فریش ہو کر اُٹھے گا۔ اس لئے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔""
اُس نے سر ہلا دیا تھا اور سالار عبدالرحمٰن کے بیڈ کے پاس جا کر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ دفتر فون کر کے اُس نے رحیم کو کہہ دیا تھا کہ گھر سے کوئی بھی فون آئے تو وہ یہی کہے کہ صاحب اور شہریار دونوں ایڈیٹنگ روم میں مصروف ہیں اور فون پر بات کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا، گھر میں باقی سب پریشان ہوں۔ سو اُس نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ آنکھ بند کی تو پاپا کی آواز آئی۔
""یہ ہے عطیہ بانو......تمہاری ماں......""
وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک حجاب آلود لڑکی اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
یہ لڑکی کون تھی؟......اس سے اس کا کیا رشتہ تھا؟......کیا وہی رشتہ تھا، جو وہ سمجھا تھا؟
ایک نیا سوال اُس کے سامنے تھا اور اُسے اس کا جواب ڈھونڈنا تھا۔
""انوشے! میں نے آپ کی شادی کے لئے ایک سرپرائز چوائس کیا ہے۔""

انوشے کے کمپیوٹر پر چلتے ہاتھ یکدم رک گئے تھے۔اُس کی نظریں عافیہ بیگم پر تھیں، مگر خفگی کی وجہ سے وہ اُن سے بات نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ کل اتنے دنوں کے بعد اُس نے عارف کے مس بی ہیو پر پھر ہیروئن کا انجکشن لیا تھا۔کل اس کے باوجود کہ عارف اس سے بات نہیں کر رہا تھا،اس نے اسے لنچ پر بھی بلایا تھا مگر وہ اس کا انتظار کر کر کے واپس لوٹ آئی تھی۔پھر رات کو عارف کے ساتھ اُس نے بک جھک کر کے ناراضگی کی بنیا وڈالی تھی اور گاڑی لے کر نکل گئی تھی۔پھر وہ واپس لوٹی تھی تو عافیہ بیگم نے بہت سختی سے اُسے ڈانٹا تھا۔پہلی بار اُس نے پلٹ کر عافیہ بیگم کو کچھ نہیں کہا تھا۔لیکن اُس کی خودسری، ناراضگی، وہ اپنی جگہ۔اس لئے اُس نے اس وقت بھی زبان کے بجائے آنکھ کو سوال کیا تھا۔
بیگم عافیہ نے اُسے کندھوں سے یوں تھام لیا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔پھر کان میں دھیمے لہجے سے بولی تھیں۔
''میں نے تمہاری مما کو ڈھونڈ نکالا ہے انوشے! شام تک علینہ بھی آنے والی ہے،پھر ہم مل کر تمہاری مما سے ملنے جائیں گے۔میں نے یہ خبر علینہ کو بھی نہیں دی ہے۔''
''آپ کو یہ خیر خواہی کا بھوت کیوں چڑھا؟ مجھے تو لگتا ہے،اس میں بھی کوئی چال ہوگی آپ کی۔''
انوشے کا طرز تخاطب شہریار کی کمپنی سے بدل گیا تھا،اس لئے عافیہ بیگم کو بھی وہ بہت پیارا ہو گیا تھا۔یکدم اُنہیں یاد آیا تو بولیں۔
''انوشے! تم نے شہریار کو الگ سے کارڈ دیا ہے یا نہیں؟''
انوشے نے ایک لمحہ کے لئے سوچا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔''مجھے خصوصی طور پر کسی کو ریگارڈ دینا اچھا نہیں لگتا۔سامنے والا بندہ قدر کرنا چھوڑ دیتا ہے۔''
عافیہ بیگم نے اُس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا اور سمجھ گئیں، یہ کل کا تجربہ ہے۔جس نے اُسے اتنا ڈس ہارٹ کر دیا ہے۔پھر وہ کچھ سوچ ہی رہی تھیں کہ عارف جواد کا فون آیا، وہ اُس سے کل کی مصروفیت کا ذکر کر کے کل کے مس بی ہیو پر معذرت کر رہا تھا۔انوشے کچھ دیر تو نہ ماننے کا پوز دیتی رہی، پھر اُٹھ کر ایک دم اُس کی آواز پر لبیک کہتی کھڑی ہو گئی۔جلدی جلدی اُس نے کپڑے بدلے تھے، پھر یہ جا، وہ جا۔
شام کے پانچ بجے اُس کی واپسی ہوئی تھی۔گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ علینہ کی آمد پر وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تھی۔عافیہ بیگم اُس سے اتنی سی دیر میں شہریار اور اُس کی وجہ سے انوشے کے بدلاؤ پر گفتگو کر چکی تھیں۔علینہ نے اُسے گلے سے لگایا تھا، پھر شرارت سے بولی تھی۔
''اتنا بدلاؤ شہریار کی وجہ سے کر لیا، پھر پسند کے وقت اُسے کیوں مس کر دیا؟''

انوشے نے بہن کو مسکرا کر دیکھا، پھر بولی۔ ''وہ بہت چھوٹا ہے مجھ سے۔ مجھے تو وہ دوسرا مرد لگتا ہے، علینہ! تمہیں نہیں پتہ، اُس کے ساتھ آپ بیٹھے ہوں تو بور نہیں ہوتے، آپ اُس کے ساتھ چل رہے ہوں تو آپ کو لگتا ہے، ایک گہرا حفاظتی حصار ہے، جسے توڑ کر کوئی پرابلم آپ کو چھو نہیں سکتی، بس میرے دل میں ہوتا ناں تو میں زندگی میں کسی بہت اچھی دعا کے طور پر اُسے ایکسچینج کر لیتی۔ تم ملو گی ناں تو تمہیں بھی وہ بہت اچھا لگے گا۔''

علینہ نے سر ہلایا تھا۔ پھر انوشے کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ آج انہوں نے لنچ علینہ کی وجہ سے لیٹ کیا تھا۔ اس ٹرپ میں صرف تنہا علینہ ہی آئی تھی، اس لئے بیگم عافیہ جی بھر کر اُس سے باتیں کر رہی تھیں۔ بات انوشے کی شادی پر پہنچی تو علینہ نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

''مام! مجھے عارف انوشے کے لئے بالکل مس فٹ لگتا ہے۔ پچھلے دنوں دانیال ملا تھا تو وہ بہت اپ سیٹ تھا انوشے کے اس فیصلے پر۔ حالانکہ اب اُس کا اُس سے کوئی تعلق نہیں، لیکن وہ اتنا اچھا انسان ہے کہ انوشے کے اس فیصلے پر وہ صرف اُس کے دُکھ کی وجہ سے اپ سیٹ ہے۔ کہہ رہا تھا، علینہ! جو انوشے نے مجھے چھوڑ دیا، مجھے اس کا غم نہیں ہے۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ ایک اور غلط فیصلہ کر لے۔ جواد حسن کی شہرت پاکستانی کمیونٹی میں اچھی نہیں ہے...... میں نے خود پاپا کو اس سلسلے میں کتنی مرتبہ وارن کیا ہے، مگر پاپا بھی انوشے کی طرح حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ مام! وہ لوگ پیراسائٹ پرسن ہیں۔ ساری زندگی دوسروں کی زندگی پر اپنی زندگی جیتے آئے ہیں۔ انوشے خوش نہیں رہے گی مام! کیا اسے کسی طرح روکا نہیں جا سکتا؟''

بیگم عافیہ نے بیٹی کو دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولیں۔ ''میں اور تمہارے پاپا اس سلسلے میں کچھ ری ایکٹ نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ وہ اس سلسلے میں پہلے ہی بہت جھگڑا کر چکی ہے۔ اُس کا خیال ہے، میں ایک بہت بری ماں ہوں، اس لئے اُسے خوش نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب تم ہی بتاؤ اس سلسلے میں کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟''

علینہ نے بیگم عافیہ کی گود میں سر رکھ دیا تھا۔ پھر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی تھی۔ ''وہ تو پاگل ہے مام! اُسے کسی چیز کی تمیز ہی نہیں ہے۔ نہ ہی انسانوں کی پرکھ ہے۔ ورنہ آپ کی محبت پر میری طرح ہمیشہ فخر کرتی۔ مام! دنیا کی کوئی بھی عورت آپ سے اچھی ماں نہیں ہو سکتی۔ آپ کو پتہ ہے، کبھی کبھی میں جب ان دونوں شیطانوں کو ڈیٹ کرتی ہوں اور پھر اپنا محاسبہ کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے، میں تو آپ جیسی توجہ، محبت اور ممتا کا عشر عشیر بھی اپنی اولاد کو نہیں دے پاتی، جتنا آپ نے ہمارے ساتھ کیا یا ہماری زندگی کو دیا۔ مام! میں چھوٹی ضرور تھی، لیکن مجھے وہ منظر آج تک نہیں بھولا ہے، جب آپ نے پاپا کی محبت اور وعدے پر اپنی بیٹی کے ہمکتے ہاتھوں کو اگنور کر دیا تھا۔ میں نے جب خود اولاد کی خوشی پائی، تب سمجھ سکی ہوں، آپ نے کتنا بڑا ایثار کیا تھا، اُس وقت۔ مام! آپ کی جتنی قدر کی جا سکے، اتنی کم ہے۔''

عافیہ بیگم کی آنکھوں میں اتنی محبت پر آنسو بھر آئے تھے۔ پھر انہوں نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا تھا اور محبت سے بولی تھیں۔

"علینہ! یہ حقیقت ہے، بچہ کبھی اپنی ماں کو نہیں بھول سکتا۔ کیا تمہیں اپنی ماں یاد نہیں آئی؟"

علینہ نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "شاید کبھی کبھی ہلکی سی ایک یاد دل میں چٹکی ضرور لیتی ہے کہ کبھی میں ماں کو دیکھوں کہ ان کا غرور اب بھی ویسے ہی قائم ہے یا نہیں، محسوس کروں کہ کیا کبھی ان کے دل میں ہماری محبت نے کوئی تشنگی جگائی یا نہیں۔ بس اس لئے یاد آتی ہیں وہ، وگرنہ محبت کے ذکر پر تو صرف آپ کا چہرہ آنکھ میں در آتا ہے۔"

عافیہ بیگم اُس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھیں، پھر مدھم لہجے میں وہ دوبارہ بولی تھیں۔

"میں نے تمہاری مام کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہو گی؟"

علینہ کے چہرے پر جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آیا اور عافیہ بیگم جانتی تھیں، یہ فطری بات تھی، بچہ چاہے جتنا کہے سے چھوڑ کر جانے والی ماں اسے کبھی یاد نہیں آئی، کبھی یاد نہیں آتی، لیکن ایک دل کی ان کہی ہوتی ہے، جو ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔ ایسا بچہ زندگی سے آنکھ ملا کر جیتا بھی ہے، خوش بھی رہتا ہے، مگر اپنی ماں کے ذکر پر اُس کی آنکھ میں جگنو اور دل میں محبت کے چھوٹے چھوٹے دیے خود بخود جلنے لگتے ہیں۔

عافیہ بیگم نے علینہ کو اس کیفیت میں ڈوبے رہنے دیا تھا، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"وہ نفسیاتی ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ بہت تیزی سے ریکوری کر رہی ہے۔ آج شام ہم ان سے ملنے جائیں گے۔"

"شام تو ہو گئی ہے مام!" علینہ نے بہت کوشش کی تھی مگر جذباتی لگاؤ کسی طور نہیں چھپا تھا۔ بیگم عافیہ نے علینہ کے رخسار کو پیار سے چھوا تھا، پھر مسکرا کر بولی تھیں۔

"تمہارے پاپا آ جائیں تو پھر چلتے ہیں علینہ! جب تک تم آرام کر لو۔"

علینہ اُٹھ تو گئی تھی لیکن چہرے سے لگتا تھا، یہ وقت بہت شاک گزر رہا ہے اس پر۔ پھر سات بجے تھے جب سلیم افسر اپنے چہرے پر ایک گہری سوچ سجائے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ بیگم عافیہ نے اُن کا کوٹ اور بریف کیس ہاتھ سے لیا تھا۔ پھر وہ صوفے پر بیٹھ گئے تھے، جب انہوں نے ٹھنڈا ٹھار صندل کا شربت اُنہیں پیش کیا تھا۔ انہوں نے بیوی کی اس وجہ محبت کو مسکرا کر دیکھا تھا مگر چہرے کی گمبھیرتا......وہ کسی طور کم نہیں ہوئی تھی۔

"خیریت تو ہے سلیم! آپ آج کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولے۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں عافیہ! زندگی میں اندھا بھروسہ کسی پر نہیں کرنا چاہیے۔"

"یعنی؟" انہوں نے سلیم افسر کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا۔ وہ پھر آہستگی سے بولے۔

"عابد صاحب نے واقعی ہمیں ڈھیر سے ڈھیر ے، بہت خاموشی سے لوٹا ہے۔ آج ایک ہفتہ کی سوچ بچار کے بعد میں نے نیا سپروائزر فنانس رکھا ہے اور عافیہ! اس بندے نے صبح سے لے کر شام پانچ بجے تک جتنا بھی حساب کتاب آڈٹ کیا ہے، اُس کے مطابق یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ عابد صاحب دیمک کی طرح ہمارے بزنس کو کھا گئے ہیں، بلکہ ہمارے ہی پیسے سے ہولڈنگ میں قدم جما چکے ہیں۔ اگر ہم آج انہیں کرپٹ ڈکلیئر کر دیں، تب بھی اُن کی ساکھ اور اثر و رسوخ اتنے زیادہ ہیں کہ وہ ایک دن کے لئے بھی جیل نہیں جا سکتے۔ اِٹ از ٹو مچ، عافیہ! آپ بہت ٹھیک تجزیہ کرتی ہیں۔ آپ کی کہی ہوئی بات سے میں نے جب جب صرفِ نظر کیا ہے، واقعی مجھے بہت نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، آپ کی ایک حس ہم سے اضافی ہے۔"

بیگم عافیہ نے شوہر کے کندھوں پر اعتماد سے ہاتھ دھرے تھے، پھر محبت سے بولی تھیں۔ "میری اضافی حس محبت اور محبت کے خدا پر یقین ہے سلیم! میں پانچ وقت اُس کے سامنے سر جھکاتی ہوں تو مجھے لگتا ہے، میرے گرد ایک حفاظتی حصار بن گیا ہے، اب مجھ سے کچھ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ غلط کرنے پر وہ الہام کی طرح دل میں بولنے لگتا ہے۔ میں اس پر حسنِ ظن رکھتی ہوں، اُس کے آسرے پر خوش گمان رہتی ہوں اور وہ کہتا ہے، خود میں اپنے بندوں کے لئے ویسا ہی ہوں، جیسا وہ اپنے دل میں میرے لئے گمان رکھتے ہیں۔ سلیم صاحب! بزنس ورنس چھوڑیئے، اُس کی طرف پلٹ آیئے۔"

سلیم افسر نے بے چارگی سے انہیں دیکھا تو نرمی سے بولیں۔ "وقت ملنے کا، فرصت کے وقت اُسے یاد کرنے کا ارادہ رکھیں گے تو یاد رکھیں، زندگی کبھی موقع نہیں دیتی۔ زندگی سے موقع لینا پڑتا ہے۔ ہم اپنے شریکِ سفر اور بچوں کے لئے بھی تو زندگی سے وقت خود چراتے ہیں، پھر اس کے لئے ہم کس وقت کا انتظار کرتے ہیں؟"

سلیم افسر نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولے تھے۔ "دل کی ہر اُنگی...... لگتا ہے تمہاری باتوں سے جاق رہی ہے۔ پھر جس کے ذکر سے زندگی میں اتنا سکون آ گیا ہے، خود اُس سے ملنے کی آرزو، وہ یقیناً بہت بڑی خوشی دے گی۔ بس طے ہو گیا، آج سے میں بھی وقت نکالوں گا اپنے لئے۔"

بیگم عافیہ مسکرانے لگیں، پھر نرمی سے بولیں۔ "آپ نے عابد صاحب کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

”کیا سوچوں گا؟ میں نے پہلی فرصت میں اُنہیں نکالے جانے کا حکم نامہ جاری کردیا۔“

”کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟“

”ہو بھی سکتی ہے، نہیں بھی ہوسکتی۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کرلیا ہے، میں اس پر قائم ہوں۔“

بیگم عافیہ نے اُنہیں دیکھا، پھر علینہ کی خیال آرائی اُن تک پہنچائی۔ سلیم افسر گہری سوچ میں ڈوب گئے، پھر آہستگی سے بولے۔

”علینہ کا خیال غلط نہیں ہے۔ جواد احسن، عابد صاحب کے دوست ہیں۔ دونوں بہت کلوز فرینڈ ہیں، اس لئے یہ تو طے شدہ بات ہے، دوستی ہمیشہ ہم خیال افراد ہی میں ہوتی ہے، وہ بھی اتنی گہری دوستی، سو جواد خود بخود میری نظر میں ایک دم سے نیچے آگئے ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کو رکے، پھر بولے۔ ”سچ پوچھو تو انوشے کی ضد نہ ہوتی تو میں کبھی اس رشتے کے حق میں فیصلہ نہ دیتا۔“

بیگم عافیہ ان سے متفق نظر آئیں۔ پھر شام کی چائے کے بعد وہ تینوں گھر سے نکلے تھے اور تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد نفسیاتی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

سلیم صاحب نے ڈاکٹرز کے پینل سے پروگریس جاننی چاہی تھی۔ علینہ اور انوشے ماں کے کمرے کا نمبر معلوم ہوتے ہی بے قراری سے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔ ڈاکٹر نے اُن کی بے قراری کو تاسف سے دیکھا تھا، پھر سلیم افسر کی طرف دیکھ کر بولے تھے۔

”میم کی دماغی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ میم مضبوط اعصاب کی مالک تھیں، اس لئے ڈرگ کا استعمال ترک کرتے ہی انہوں نے تیزی سے امپروو کیا ہے، مگر........“

”مگر کیا ڈاکٹر؟“ سلیم افسر نے بے تابی سے پوچھا۔

”ان کا دماغ آج سے پچیس سال پیشتر کے فیز میں جاکر رک گیا ہے۔ وہ یہ تو جان گئی ہیں کہ وہ کون ہیں، اُن کا نام کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ پرابلم ہوگئی ہے، وہ اپنے آپ کو جوان العمر خاتون سمجھنے لگی ہیں۔ اُن کے ذہن سے یہ بات مس ہوگئی ہے کہ وقت کتنا گزر چکا ہے، کتنا نہیں۔“ ڈاکٹر نے تفصیل بتائی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے اُٹھ گئے تھے۔ پھر کمرے میں داخل ہوئے تو اُن دونوں کے چہرے پر تاسف تھا۔ کیونکہ علینہ دیوار سے لگی کھڑی تھی اور انوشے سکتے کی کیفیت میں تانیہ کے بیڈ کے پاس بیٹھی تھی۔

”کیا ہوگیا؟“ بیگم عافیہ نے علینہ کو چھو کر پوچھا اور علینہ اُن کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مام! میں بہت بری ہوں....... بہت بری کہ اپنی محبت میں اتنی سیلفش ہوگئی کہ آپ کی ساری ریاضت کو بھلا بیٹھی۔ مام! یہ عورت...... یہ عورت ہماری ماں نہیں ہوسکتی۔ اس نے صرف ہمیں پیدا کیا ہے، مگر یہ ہماری ماں نہیں ہوسکتی۔“

انوشے، علینہ کے ان جملوں پر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اُس کی آنکھوں میں احتجاج کا کوئی جذبہ تھا، نہ ایکسائٹمنٹ تھی۔

سلیم افسر، ثانیہ کے پاس دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے پہنچے تھے اور ثانیہ نے بھی اُن کی کوشالی کی تھی۔

”آ گئے تم...... پھر میری زندگی اجیرن کرنے کیوں چلے آئے ہو؟...... چلے کیوں نہیں جاتے اپنی بچیوں کو لے کر؟ مجھے نہیں پالنی تمہاری اولاد...... ہونہہ، اس کام کے لئے تھوڑی میں نے تم سے شادی کی تھی؟ مجھے نہیں پسند بچے۔ نفرت ہے مجھے بچوں سے۔ خوامخواہ زندگی کا تھرل انجوائے منٹ برباد کردیتے ہیں۔“ وہ کہتے کہتے رکی، پھر بولی۔ ”یہ لڑکی...... اسے دیکھو، پتہ نہیں کس نے میرا بھیجا خراب کرنے بھیجا ہے۔ کہتی ہے، ممی! آپ میری ممی ہو۔ ہونہہ، اتنی بڑی بچی کی ممی ہونے سے بہتر ہے میں زہر کھالوں۔“

انوشے سناٹے میں گمی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ علینہ نے اُسے تھاما تھا اور اُس نے رنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔

”واقعی علینہ! کچھ چیزیں کھو جائیں، کچھ لوگ مس ہو جائیں تو ان کی یادیں خوب صورت ہو کر ملتی ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ ہم کچھ چیزوں اور لوگوں کو یاد کرنے کے بجائے اپنی زندگی میں زبردستی کھینچ لائیں اور پھر تمام عمر گریہ وزاری کرتے رہیں۔“

علینہ نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور وہ چاروں باہر آ گئے تھے۔

”جب تک یہ بالکل ٹھیک نہ ہو جائیں، آپ ان کا علاج جاری رکھئے گا۔“ سلیم صاحب نے گزشتہ مہینے کا حساب کلوز کرتے ہوئے، نئے مہینے کے لئے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد، آئندہ ماہ ہونے والے اخراجات کا چیک دیتے ہوئے کہا تھا۔

انوشے اس وقت عافیہ بیگم کے قریب بیٹھی تھی۔ وہ بہت زیادہ دل گرفتہ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، جب عافیہ بیگم نے اُسے خود سے قریب کرتے ہوئے چمکار کے کہا تھا۔

”دل پر بار مت لو انوشے! وہ بے چاری ابھی اپنی سدھ بدھ میں نہیں ہیں، یادداشت پوری طرح بحال ہوگی تو دیکھنا کتنی محبت سے ملتی ہیں تمہیں۔“

علینہ نے عافیہ بیگم کو تشکر سے دیکھا تھا اور پھر اُس کے دل سے کہا تھا۔

"یہ عورت بھی تو ہے، اِس سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن کیسے ہتھیلی کے چھالے کی طرح انہوں نے پالا ہے تمہیں۔ اور ایک وہ عورت تھی، اُس نے جنم دیا تھا مگر اُس کے اندر اب تک ممتا نے جنم نہیں لیا۔ ماں واقعی اس عورت ہی جیسی ہوتی ہے۔"

علینہ نے عافیہ بیگم کے کندھے پر سر رکھ کر تشکر اور محبت کے آنسو کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ رہی انوشے تو وہ ابھی تک سکتے کی کیفیت سے نہیں نکلی تھی، ورنہ اس طرح چمٹائے جانے پر یہ ممکن تھا کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ اٹھاتی۔

گاڑی سبک رفتاری سے چکنی سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی اور اسی طرح وقت اُس کی ہتھیلی تھی، اُس کے ہاتھ سے بھی زندگی اسی طرح پھسلتی جا رہی تھی۔



شافعہ بہت ہونق ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئی تھی، حالانکہ ایسے حالات سے اُس کا دن رات سامنا پڑتا تھا لیکن یہی پریشانی جب خود اُس کے ساتھ پیش آئی تو اُس کو ساری ملی ہوئی تعلیم بھک سے اُڑتی محسوس ہوئی تھی۔ ارسلان راشدی نے سنبھالا لے کر حالات کو اپنے قابو میں کیا تھا۔ ڈاکٹر کیس ہسٹری لے رہے تھے۔ فوری رزلٹ پر ٹریٹمنٹ شروع کر دی گئی تھی اور شافعہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کی ماں کی ہر وقت رہنے والی کھانسی استھما ثابت ہوئی تھی۔

"مجھے یاد نہیں ہے، کبھی ماں کی حالت ایسی ہوئی ہو۔ بابا! ہمیں تو کبھی ماں کو انہیلر کی ٹریٹمنٹ دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، پھر یہ اچانک...... ڈاکٹر کہہ رہے تھے، انہیں ڈسٹ الرجی ہے۔ مگر ماں کا کمرہ تو میں خود روز صاف کرتی ہوں۔ اماں نے کبھی ڈسٹ صاف کرتے، کمرے کی چیزیں جھاڑتے ہوئے مٹی اُڑنے پر ہلکی سی بھی الرجی شو نہیں کی۔ وہ تو پُرسکون آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی تھیں، پھر اچانک......"

ارسلان راشدی نے بیٹی کو کندھوں سے تھاما تھا، پھر نرمی سے بولے تھے۔ "بیماری ہو سکتا ہے آج سے ہی شروع ہوئی ہو۔ ہوتا ہے ناں، بہت عرصے تک کسی بیماری کے جراثیم اندر ہی خاموشی سے سوئے رہتے ہیں، پھر اچانک کسی واقعے، حادثے یا بیماری کی کمزوری کی وجہ سے ایک دم باہر آ کر ری ایکشن دیتے ہیں۔"

شافعہ نے ارسلان راشدی کو دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔ "بابا! یہ دوسری قسم کی بیماریوں میں کلیہ درست ہو سکتا ہے، لیکن الرجی، یہ تو میں نے سنا ہے، شروع سے ہسٹری رکھتی ہے۔"

ارسلان راشدی نے بیٹی کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ پھر ساری رات وہ دونوں شفٹوں میں آصفہ کا دھیان رکھتے رہے تھے۔ اور پھر صبح سے پہلے آصفہ کو ہوش اور سونیا کی آمد ایک ساتھ ہوئی تھی۔ شافعہ نے بہن کی محبت بھری آمد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ "تم لاہور سے اتنی جلدی کراچی کیسے آ گئیں؟" سوال میں خوشی اور حیرت کا امتزاج موجود تھا۔

سونیا اس وقت ارسلان راشدی کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی کہ چونک کر، گلا کھنکھار کے بولی۔ "وہ، ایک دوست کے ابو کی وجہ سے بائی ایئر آئی ہوں بجو!"

شافعہ نے یہ جواب سن کر اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ ارسلان راشدی نے بھی بیٹی کے اس آپشن کو گلے سے دیکھا تھا۔ تب سونیا نے پھر سے منمنا کر کہا تھا۔

"بابا! بجو کا فون ہی ایسا تھا کہ میں بہت گھبرا گئی تھی۔"

آصفہ کو سارا منظر جیسے پھر سے یاد آ گیا تھا اور اس نے جو سوال کرنے سے رہ گیا تھا تڑپ کر پوچھا تھا۔

"یہ تم ہاسٹل سے رات کو کہاں غائب تھیں؟ ہاسٹل سے باہر رہنے کے کوئی اوقات کار ہوتے ہیں یا نہیں؟ اور تمہاری وارڈن، تمہارے ہاسٹل کے ایڈمن سب کا تمہارا نام سن کر لہجہ کڑوا کیوں ہو جاتا ہے؟"

سونیا کو لگ رہا تھا، وہ آج چوری کرتے ہوئے پکڑی جا چکی ہے لیکن پھر بھی جھٹلانے کو بولی۔ "بجو! ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ ہم مخصوص دوست باہر تھے۔ جس نمبر پر آپ نے فون ملایا، وہ میری دوست کا موبائل تھا، جسے وقتی طور پر میں نے لے لیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ آپ سے رابطہ کرنے میں کوئی پرابلم نہ ہو۔ رہا ہاسٹل کی وارڈن وغیرہ کا رویہ تو بجو! حق بات کہنے والے کو کہیں پسند نہیں کیا جاتا۔

ارسلان راشدی نے بیٹی کا عذر تسلیم کر لیا تھا لیکن شافعہ کی آنکھوں کی ناپسندیدگی بڑھتی چلی جا رہی تھی، مگر اس نے کمال ہنرمندی سے اپنے جذبات چھپا لئے تھے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے اپنی ایکسٹرا ڈیوٹی کرنی ہے سونیا! اس لئے اماں کا خیال تم رکھو۔ مجھے یقین ہے، تم اس کام میں مجھ سے زیادہ بہتر کارکردگی دکھاؤ گی۔"

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی کہ شافعہ ہسپتال آئی تو ہر طرف سے نظریں آ کر اس پر ٹک کر رہ گئی تھیں۔ کچھ آنکھوں میں حیرت تھی اور کچھ آنکھوں میں تمسخر۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ڈیوٹی کے لئے وی آئی پی روم میں داخل ہوئی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہ ایک وزیر کے بیٹے کا روم تھا، مگر الاٹمنٹ اس کے دوست کے پاس تھی، جو محض دل داری کے لئے یہاں ایڈمٹ تھا۔

شافعہ نے بہت ترش رویے سے اس کا حد سے بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکا تھا۔ "مسٹر فہمی! شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں ان چند ایک نرسز میں سے نہیں ہوں، جو اپنے رتبے اور اپنے پروفیشن کو بدنام کرتی پھرتی ہیں۔"

فہمی رزاق نے تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا، پھر والٹ اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ "رقم اپنی مرضی سے لے سکتی ہو، مگر وقت میں اپنے حساب سے کیش کروں گا۔ کتنے پیسے چاہئیں، بلا جھجک نکال لو۔"

شافعہ پیلی پڑ گئی تھی۔ اُس نے والٹ اُس کے منہ پر دے مارا تھا، پھر چلّا کر بولی تھی۔ ”تم جیسے امیر لوگ ساری سرمایہ داری کو بدنام کرنے کا سلوگن ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں، تمہیں تمہارے ماں باپ پیدا کیوں کرتے ہیں۔“

”میں بتاؤں، کیوں پیدا کرتے ہیں؟“ اُس نے شافعہ کے بازو کو موڑ کر پشت پر سمیٹا تھا، پھر غرا کر بولا تھا۔ ”ہمارے باپ ہمیں تم جیسی لڑکیوں کے لئے پیدا کرتے ہیں جن کی ساری عمر محنت کرتے، مسائل کے گرد گھومتے گھومتے گزر جاتی ہے، لیکن لطف کا ایک لمحہ بھی قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمارے ماں باپ کماتے ہی اس لئے ہیں کہ ہم تم جیسی کچھ پیسوں پر بکنے والی لڑکیوں کے ناز اُٹھا سکیں۔ اب بولو، کتنا لوگی؟......بتاؤ؟“

شافعہ نے بہت بے بسی محسوس کی تھی۔ کسی مرد کی جارحانہ پکڑ سے نکل جانا اتنا آسان نہیں تھا، لیکن اُسے اپنے بچاؤ کے لئے جلد ہی کچھ سوچنا تھا۔ یکدم اُس کے ذہن میں بجلی کی تیزی سے خیال کوندا تھا۔ اُس نے بیڈ کے قریب لٹکتے ایمرجنسی بٹن کو استعمال کر ڈالا تھا۔

سیکنڈ نہیں گزرے تھے، کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ فہمی رزاق نے گھبرا کر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنا یونیفارم اور بال ٹھیک کرتے ہوئے دروازے کا لاک کھولنے لگی تھی۔

”مسٹر! آر یو سیف؟“

”یس مسٹر امین!“ وہ تیزی سے باہر نکلی تھی، جیسے کوئی قید سے چھوٹ کر بھاگا ہو۔

ماں کو دیکھ کر وہ دوپہر کی چائے کے لئے اسٹاف روم میں آئی تھی تو سب کی نظریں اُس پر سوالیہ طور پر اُٹھ گئی تھیں۔

”تمہاری ڈیوٹی فہمی کے رُوم میں کس نے لگائی تھی؟“ سینئر ترین نرس نے سوال کیا اور وہ مدھم لہجے میں بولی۔

”پتہ نہیں، لیکن ڈیوٹی آور کے ساتھ ڈاکٹر نور کے دستخط تھے۔“

”ڈاکٹر نور...“ سینئر انچارج نرس نے قریب آ کر سوالیہ اُسے دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔

”ہمارا گارڈ امین بتا رہا تھا، تم نے ایمرجنسی بٹن دبایا تھا......تم کسی مشکل میں پڑ گئی تھیں کیا؟“

اُس نے سر جھکا لیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے تھے۔ تب سینئر انچارج نرس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

''امین کا خیال ٹھیک تھا، ڈاکٹر نور نے فہمی رزاق کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ یہ رُول ہے، جو لڑکیاں اس کام میں دلچسپی نہیں رکھتیں، انہیں بلاوجہ تنگ نہیں کیا جائے گا۔''

''کیسا کام میم؟......آپ کی باتیں لایعنی ہیں۔''

سینئر انچارج نرس نے نرمی برقرار رکھی تھی، پھر بولی تھی۔ ''دو گھنٹے کے پانچ ہزار کمانے کے اشتہار کبھی نظروں سے نہیں گزرے؟'' وہ پھر بولی۔ ''تم بہت سیدھی اور اچھی لڑکی ہو۔ شاید آج ہی تمہاری ڈیوٹی بدلی گئی ہے۔''

''جی میم! میں دراصل چلڈرن وارڈ میں ہوتی تھی مگر......''

سینئر انچارج نرس نے اُس کا کندھا تھپتھپایا تھا، پھر آہستگی سے بولی تھی۔ ''اگر مگر، یہ سب چھوڑو۔ کل سے تمہاری ڈیوٹی تمہیں واپس مل جائے گی۔ تم آج کی بقیہ ڈیوٹی ریسپشن پر دو۔''

شافعہ بہت سارے سوالات اُٹھائے نیچے کی سیڑھیاں اُترنے لگی تھی۔ پھر کوریڈور سے گزری بھی نہیں تھی کہ سینئر نرس کی غصیلی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''ڈاکٹر نور! آپ کیوں چاہتے ہیں، ہم جو کام اتنے سالوں سے بنا کسی جھنجھٹ کے کرتے آرہے ہیں، اُس میں بلاوجہ کی اُلجھنوں کا شکار ہو جائیں؟ آپ کو معلوم ہے ناں، آج کل ایک صحافی ویسے ہی ہمارے بزنس کی راہ گھاٹ ٹٹولتا پھر رہا ہے۔ اُسے کتنی مشکل سے مطمئن کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آج کچھ ہو جاتا تو یہ لڑکی پورے ہسپتال کو ہلا کر رکھ دیتی، آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات؟''

شافعہ کے سامنے اب اپنے ہسپتال کے حوالے سے بہت سے معاملات واضح ہو گئے تھے۔ سلامہ نے بھی اُسے اُس کے ہسپتال کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی ایسی لڑکی تھی کہ کچھ سمجھی ہی نہیں تھی۔ اب وہ ریسپشن پر ڈیوٹی کے لئے آن کھڑی ہوئی تھی۔ چارج اُسے دے دیا گیا تھا آج کی ساری اضافی ڈیوٹیاں شام چھ کے بعد طے پائی تھیں۔ وہ مصروف تھی جب دو ڈاکٹر وہاں کھڑے ہو کر یہ گفتگو کرنے لگے تھے۔

''قربِ قیامت کی نشانی ہے، آج کل مرد اور عورت بس پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ حلال ذریعے سے ہو یا حرام......تمہیں پتہ ہے، وہ بیڈ نمبر 37 کی مریضہ کے ساتھ آئی لڑکی، وہ پورے ہسپتال میں ان تین دنوں میں ایسی مشہور ہو گئی ہے کہ توبہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ ہاؤس جاب کرتے فریش ڈاکٹرز، پرانے گھاگ شکاری قسم کے سینئرز میں وہ ہاٹ ٹاپک ہے۔ تین دن میں اُس لڑکی نے پندرہ ہزار بنا

لئے۔تم یقین کروگی، اتنی تو ہماری مہینے کی تنخواہ نہیں ہے۔"
شافعہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔وہ جونیئر نرس کو اپنی جگہ عارضی کھڑا کرکے اماں کے کمرے کی طرف گئی تھی، پھر جاتے ہی اس نے سونیا کا پرس اچک لیا تھا۔اماں نے حیرت سے دیکھا تھا، مگر سونیا ارسلان راشدی کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔اماں کی آنکھیں نوٹ دیکھ کر پھٹ گئی تھیں۔
"اتنے سارے نوٹ تیرے پاس کہاں سے آئے سونیا؟"
سونیا نے اماں کی طرف دیکھا، پھر اپنی حالت پر قابو پا کر بولی۔"میرے اپنے ہیں یہ پیسے......اماں! اجو کو ایسا رویہ زیب نہیں دیتا۔"
"اماں! آپ کو پتہ ہے، یہ......یہ کتنا برا کام کرکے یہ پیسہ کما رہی ہے؟" شافعہ نے ماں کو مخاطب کیا تھا۔
اماں کو اس برے کام کی نوعیت جاننے کے لئے پھر کسی اضافی مالج کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔وہ منہ پر دوپٹہ ڈال کر رونے لگی تھیں۔انہوں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔
"تم نے یہ راستہ کیوں چنا؟" شافعہ کی آواز تیز ہوئی۔
اماں نے دوپٹے سے چہرہ نکال کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔"چیخ چیخ کر کیوں اپنی بدنامی سوا کر رہی ہو؟......مجھے گھر لے چلو، ہم گھر میں بات کرتے ہیں۔"
"لیکن اماں! آپ کی طبیعت......وہ ابھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔"
"نہ ہو، مگر میں اب اس جگہ ایک منٹ نہیں رکوں گی۔"
شافعہ نے پھر بہت کوشش کی، مگر آصفہ ارسلان راشدی کا فیصلہ نہیں بدلا۔شافعہ نے ڈاکٹرز سے اپنی ذمہ داری پر انہیں ڈسچارج کروا لیا تھا اور اب وہ ہاف لیو پر گھر جا رہی تھی۔سونیا کے چہرے سے صرف ناپسندیدگی کے عنصر کے سوا کوئی تاثر نوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اماں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھیں۔
شام کو ارسلان راشدی واپس لوٹے تو بہت خوش تھے۔
"مجھے نئی نوکری مل گئی ہے۔جس دوست کے دفتر میں عارضی آڈٹ کا کام دو دن سے سنبھال رہا تھا، اسی نے ایک بہت مشہور ہوٹنگ چین کے افسر کے ہاں بھیج دیا۔انہیں سپروائزر فنانس چاہئے تھا۔تنخواہ

آٹھ ہزار روپے ہے، مگر ترقی کی گنجائش ہے۔ انہیں میری سی۔وی نے بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن تم لوگ اتنی جلدی ہسپتال سے کیوں آ گئے ہو؟" وہ کامیابی کی خبر دیتے دیتے کمرے کی خاموشی سے چونک کر سوال کرنے لگے۔ تب شافعہ نے ساری داستان کہہ سنائی۔ سونیا ذرا متاثر نہیں ہوئی۔ ارسلان راشدی کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔ پھر اُن کے لب ہلے تھے۔

"کرپشن..... مجھے کرپشن اور کرپٹ لوگوں سے شدید نفرت ہے۔ آصفہ! تم گواہ ہو ناں، میں نے اپنے اس اصول کے لئے کیا کیا کھو دیا تھا؟ اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا، کیونکہ وہ کرپٹ تھی، وہ بے وفا تھی۔ اپنے بچپن کے دوست کو چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ دھوکے باز تھا۔ میں نے دنیا سے اسی لئے منہ موڑ لیا تھا کہ مجھے ساری دنیا ایسی لگتی تھی۔ آصفہ! میں نے اتنے شدید صدمہ کے باوجود تمہاری بیٹیوں پر اعتبار کیا، لیکن یہ بھی ویسی ہی نکلیں۔ آصفہ! یہ ویسی کیوں نکلیں؟ انہیں تو تم نے پالا تھا۔ یہ تو تمہاری بیٹیاں تھیں، پھر یہ عطیہ جیسی کیوں نکلیں؟"

آصفہ ارسلان راشدی پر پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ڈسٹ کہیں نہیں تھی، لیکن اُن کا سانس پھر سے اُکھڑ گیا تھا۔ شافعہ نے انہیں فوری طبی امداد دی تھی۔ انہیلر کا استعمال بتایا تھا۔ پھر بہت تھکے ہوئے اعصاب لے کر وہ اپنے کمرے میں اُٹھ آئی تھی۔ مگر ساری رات اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اُٹھ کر سونیا کے کمرے میں آ گئی تھی اور پھر اس نے غسل خانے سے سلیپنگ سوٹ پہن کر نکلتی ہوئی سونیا کو دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر اُس نے شافعہ کے بولنے سے پہلے ہاتھ اُٹھا کر فوراً اُسے چپ کروا دیا تھا، پھر تلخی سے بولی تھی۔

"مہربانی کریں بجو! مجھے کسی قسم کی نصیحت مت کیجئے گا، کیونکہ آپ جانتی ہیں، میں کتنی ضدی ہوں۔ اور پھر برائی کیا ہے، اگر آپ کے پاس تھوڑا سا حُسن ہے اور آپ اس سے کامیابی کے دروازے کھل جا سم سم کہہ کر کھلوانے کی طاقت رکھتی ہیں تو حرج ہی کیا ہے اپنا ہنر آزمانے میں؟"

شافعہ نے دُکھ سے بہن کو دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔ "تمہیں نہیں پتہ، لیکن اماں نے جس طرح بابا کا اعتبار عورت ذات پر واپس لوٹایا تھا، تم نے اسے پھر تاراج کر دیا ہے۔"

سونیا نے بیڈ پر بیٹھ کر اُسے تمسخر سے دیکھا، پھر بولی۔ "بجو پلیز! تم بابا کے اعتبار کی تو بات ہی مت کرو۔ اگر وہ اندر سے عافیہ چاچی کو بھلا چکے ہوتے ناں تو ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہوتے۔ بابا کا مسئلہ کیا ہے ناں، وہ عافیہ چاچی کو الزام بھی دیتے ہیں، ڈھونگ بھی کرتے ہیں، وہ اُن سے نفرت کرتے ہیں اور کہیں سے اندر سے خواہش بھی کرتے ہیں کہ اچانک کسی دن عافیہ چاچی آ کر انہیں کہہ دیں کہ وہ غلطی پر تھیں، ورنہ اب تک عافیہ چاچی کے دل پر صرف وہ حکمرانی کرتے ہیں۔ بابا خود کمپوزڈ نہیں ہیں، پھر ہمیں ایک ترتیب والی زندگی کیسے دیتے؟ بابا کہتے ہیں، انہوں نے ہم پر اعتبار کیا، میں کہتی ہوں اگر وہ ہم پر اعتبار نہیں کرتے تو دوسرا آپشن کیا ہوتا اُن کا...... گھر چلانے کے لئے تمہیں انہوں نے انسانوں کے جنگل میں پھینکا ہی تھا ناں، اگر تم اُن کی سگی بیٹی ہوتیں تو کیا وہ تمہیں اتنا مارا مارا کام

کرنے دیتے؟ کیا وہ اسی طرح کی بے عمل زندگی گزارتے؟ انہیں تو ہم پر اعتبار کرنا ہی تھا، کیونکہ تم سہیل راشدی کی بیٹی تھیں اور میں آصف راشدی کی اولاد ہوں، میرے دنیا میں آنے کا سبب محبت نہیں تھی، کوئی خودساختہ دُکھ تھا، ترحم کا جذبہ تھا۔ بجو! مجھے بابا پر کبھی بھی اور لڑکیوں کی طرح فخر نہیں ہوا۔ کیونکہ میں جانتی تھی، میں عملی زندگی میں قدم رکھوں گی تو تمہاری طرح کوئی اُف زندگی میری منتظر ہوگی اور میں زندگی کو گزارنے پر یقین نہیں رکھتی، زندگی کو جینے پر یقین رکھتی ہوں۔"

شافعہ کی زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ کچھ باتیں ایسی تھیں، جن پر اُسے سونیا کا نقطہ نظر ٹھیک لگا تھا، لیکن وہ اپنے بابا کے دل کی حالت اس لئے بہتر جان سکتی تھی کیونکہ کچھ دن پہلے ہی اُس نے بھی اعتبار کھویا تھا۔ اگر کچھ عرصہ پہلے یہ سب باتیں سونیا نے کی ہوتیں تو وہ اُس سے حرف بہ حرف متفق ہو جاتی۔ ارسلان راشدی کو ظالم گردانتی۔ مگر اب اپنے دل کا دکھ اتنا سوا تھا کہ اسے یہ محسوس کرنے میں وقت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے بابا نے کتنے تکلیف دہ سال گزارے ہیں۔ یہ محبت...... یہ محبت اچھے بھلے عملی آدمی کو بے کار و برباد کر کے چھوڑتی ہے۔ اس کا نہ جینے میں شمار ہوتا ہے، نہ مرنے میں۔ موت زندگی میں ایک بار آتی ہے، مگر محبت کرنے والے ایک ایک لمحے میں ہزار بار مرتے ہیں۔

اس نے خاموشی سے سونیا کے بیڈ سے اپنے بیڈ کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔



آج ماما کو بس اچانک کچھ خریداری کے لئے مال جانا پڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل تنہا تھیں۔ پھر کپڑوں کی شاپنگ کے بعد انہوں نے جیولری سیکشن کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ اُن کا خیال تھا، وہ دانیا کی شادی کے حساب سے کوئی اچھا سا سیٹ خریدیں گی اور پھر بزنس کمیونٹی کی طرف سے وہ ایک فنکشن تھے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے سلیم افسر کی بیٹی کی شادی کا انویٹیشن بھی اُن کے ہاتھ میں تھمایا تھا، اس لئے آج کی شاپنگ کچھ انہی خیالات کے تحت کی جانی تھی۔ وہ گھومتے گھومتے ایک شاپ کی طرف بڑھی ہی تھیں کہ اُن کی آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ انہیں اُس شخص کو اس طرح دیکھنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ایک نہیں، سہ بار اُسے دیکھا، مگر کسی کی حسین گردن میں ہار پہناتے ہوئے ہاتھ اُسی کے تھے۔ اُس کے ہاتھ، جس کے ہاتھوں میں وہ اپنی بیٹی کا سارا جیون دے چکی تھیں۔

انہوں نے بیگ سے موبائل نکالا تھا، پھر پشت کر کے نمبر پریس کر کے منتظر دکھائی دینے لگی تھیں۔ کافی بیلز کے بعد فون ریسیو کیا گیا تھا اور انہوں نے لاڈ سے پوچھا تھا۔

"حمزہ بیٹا! آج آپ مصروف تو نہیں ہیں ناں؟"

دوسری طرف سے شہد آگیں لہجے میں کہا گیا۔ ''مصروف تو ہوں ممی جی! لیکن آپ بتایئے، آپ کو کیا کام تھا مجھ سے؟''

''بس بیٹا! دانیا اور تمہاری شادی کی خریداری میں تمہاری مدد کی ضرورت تھی۔ تم تو جانتے ہو ناں، مجھے تمہاری چوائس پر کتنا بھروسہ ہے۔''

دوسری طرف سے ہنس کے کہا گیا۔ ''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ممی! ورنہ میری پسند کچھ اتنی خاص نہیں۔ رہی شاپنگ تو آج تو میرا بہت ٹف ٹائم ڈیوائیڈ ہوا ہے۔ ابھی پانچ منٹ بعد ہی پہلی میٹنگ ہے، شام تک فارغ ہوسکوں گا۔ اگر آپ شام تک کا انتظار کریں تو۔''

''کیوں نہیں بیٹا! میں آپ کا شام کو انتظار کروں گی۔ آپ سات بجے گھر آجایئے گا۔''

''جی ممی! آپ بے فکر رہیں۔''

فون آف کر کے وہ پھر شوخی میں لگ گیا تھا۔ اُس کی آنکھ کی چمک، ماما کو اُس کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔

''تم میری دانیا کے قابل نہیں ہو، شہریار ٹھیک کہتا ہے۔''

ماما نے حتمی فیصلہ کیا اور تیزی سے بنا خریداری کے گھر آگئیں۔ پھر اپنے کمرے کی طرف جارہی تھیں کہ اچانک انہوں نے ساتھ سے گزرتے ملازم کو روک کر شہریار کا پوچھا۔

''آج صاحب گھر پر ہی ہیں۔ دفتر نہیں گئے ہیں۔''

ماما نے سر ہلا کر ملازم کو چائے کا اشارہ کیا، پھر وہ اُس کے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ آہستگی سے انہوں نے ڈور پش کیا تھا۔ وہ کمپیوٹر کھولے کسی کام میں بہت انہماک سے مصروف تھا۔

ای میل پڑھ کر اُس نے عاطف کی Send کی ہوئی فائل کو کھولا تھا اور حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ کیونکہ اب اُس کے سامنے ایک لڑکی کی تصویر اسکین ہوچکی تھی۔

یہ لڑکی...... اسے تو وہ بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔

اُس نے پشت پر کسی کی آمد کا احساس کئے بغیر موبائل اُٹھایا تھا، پھر بیل کی لمبی قطاریں تھیں اور دوسری طرف عاطف کی بے نیازی۔

''ناراض ہوگیا ہے خبیث۔'' وہ بڑبڑایا اور ماما کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ آج وہ انہیں اپنی سب اولادوں سے پیارا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کا عام انداز آج بہت خاص لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ، وہ بھی جان

لیتا تھا جو اُن کی نظروں سے اوجھل رہ جاتا تھا۔

اُس نے اب پھر نمبر پریس کیا تھا۔ اس بار کال ریسیو کرلی گئی تھی، تبھی اُس نے خفگی سے کہا تھا۔

''کیوں بھئی، یہ تم ناراض کس بات پر ہو رہے تھے؟''

''کیا مطلب؟ کیا صرف تم ہی عزت دار ہو؟ ہم اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ آوازسن کر لائن ڈس کنکٹ کروانے کے باوجود پھر بھی اس طرح باچھیں کھول کر استقبال کریں گے۔''

شہریار نے اب کی بار سر ہلایا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔ ''وہ یار! کل طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی۔''

''تو سمجھ لے، آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔'' اُس نے لائن ڈس کنکٹ کردی۔

شہریار برا سامنہ بنا کر پھر اُس کا نمبر ملا رہا تھا۔ فون تیسری بیل پر ریسیو کرلیا تھا اُس نے۔ تب وہ غصے سے بولا تھا۔ ''ابھی ہوں تو تیری اتراہٹ ختم نہیں ہو رہی، یاد رکھ، چلا گیا ناں تیری زندگی سے پھر ملاتا رہنا یہ نمبر۔ قیامت تک آواز کو ترسے گا میری۔''

''بکواس مت کر۔ آج میں تیری کسی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔ ہاں نہیں تو، بھائی لوگوں کو ذرا سی بیماری مل جائے تو شو آف کرتے نہیں تھکتے۔''

''شو آف کے بچے! میں تجھ سے تیری Send کی ہوئی ای میل سے اٹیچڈ فائل کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں اور تو ہے کہ مجھ پر ہی چڑھا جا رہا ہے۔''

''کہیں تو چڑھ رہا ہوں، تیری طرح ہر وقت بندے کی عزت خاک میں تو نہیں ملاتا۔''

''عاطف پیارے، یہ تجھے عزت داری کا شوق آخر کیوں چرا گیا ہے؟''

''بس، میری مرضی۔'' اُس نے کہے بغیر پھر لائن کاٹ دی اور وہ واقعی بھنا گیا۔

''آخر سمجھتا کیا ہے خود کو، اسٹوپڈ۔'' اُس نے موبائل ٹیبل پر پھینک دیا۔

ماما اُس کی ساری حرکتیں بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

'یہ بچہ کتنا سادہ سا ہے۔ کیا پتہ، جانانہ کے معاملے میں بھی ہمیں کوئی دھوکا ہوا ہو۔' ماما کے دل میں خود بخود نئے سوال نے سر اُٹھایا تھا۔

''بہت ناراض کر دیا ہے تم نے عاطف کو۔''

وہ چونک کر مڑا۔ ''اُفوہ، مام! آپ...... آپ کب آئیں؟'' وہ کرسی سے اُٹھ کر تیزی سے اُن کی طرف آیا، پھر اُن کے قدموں میں بیٹھ کر حیرت سے بولا تھا۔ ''پہلی بار...... پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی کے کمرے میں آنے کا مجھے سگنل نہیں ملا۔ مجھے لگتا ہے، دواؤں سے میرے اعصاب اور حسیات خواب خرگوش کے مزے لینے لگے ہیں، وگرنہ آپ آئیں اور مجھے خبر نہ ہو۔''

ماما ہنس پڑیں۔ ''بہت بولنے لگے ہو۔ وگرنہ تو تمہاری صورت دیکھ کر مجھے کسی آئس گلیشیر کی یاد آتی تھی۔'' انہوں نے پھر اسپیس دیا۔

''اچھا، آپ کبھی اس طرح بھی مجھے دیکھتی تھیں؟'' وہ مکرر بولا۔ ''آپ بہت تیز ہیں مام! مجھے خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور میرا جائزہ مکمل ہو جاتا تھا۔ اور یہاں دل تھا کہ حسرت میں تڑپتا رہ جاتا تھا کہ کبھی آپ مجھے عدیل بھائی یا سالار بھائی کی طرح تو دیکھیں۔ آپ کو نہیں پتہ، لیکن آپ کی بے نیازی ہی نے تو میرے اندر سرد مہری، زندگی سے دشمنی بھر دی تھی۔ مجھے لگتا تھا، آپ کی آنکھ جو مجھے محبت سے نہیں دیکھتی تو پھر دنیا کو بھی میری آنکھ کی توجہ اور محبت کے لئے ترسنا ہی چاہئے۔ اسی وجہ سے تو اپنی زندگی سے ناتا توڑ لیا تھا۔ ہر لمحہ زندگی کے قدموں کی آہٹ میں موت کی چاپ سننے کے لئے بے قرار رہتا تھا، مگر اب......''

''مگر اب؟'' ماما نے اُس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی رحل میں تھام لیا تھا۔ اور وہ جذب سے بولا تھا۔

''مگر اب ماما! اب مجھے لگتا ہے، زندگی کو باقی رہنا چاہئے۔ اب میرا دل کرتا ہے، موت کا بے آواز لمحہ مجھے آپ سے دور کرنا بھی چاہے تو نہ کرے۔ سچ پوچھیں ماما! تو سچ یہ ہے کہ آپ کی محبت کو پا کر میرا دل مرنے کو نہیں چاہتا۔ مجھے لگتا ہے، مجھے کچھ اور جینا چاہئے۔''

''تو جیو نا، تمہیں کون روکتا ہے؟'' اب ماما نے پیشانی چوم کر اُسے زندگی کی کوئی الوہی دعا دی تھی۔ اُس نے لفظ نہیں سنے تھے، مگر دل میں احساس ہوا تھا کہ محبت نے اُسے سب سے خوب صورت بندھن میں باندھ لیا تھا، اُس نے ماما کے گھٹنے سے سر ٹکایا تھا، پھر بہت چاہت سے بولا تھا۔

''زندگی طویل ہو یا مختصر، لیکن میں چاہوں گا، وہ آپ کی محبت میں گزر جائے۔'' سر اُٹھا کر اُنہیں دیکھا، پھر لجاجت سے بولا۔ ''مگر پلیز مام! دانیا اور جازی کی طرح آپ کبھی میرا ہاتھ مت جھٹکیے گا، کبھی اپنا لہجہ مجھ سے مت بدلیے گا۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔''

ماما نے اپنے دل کو کسی خشک پتے کی طرح چٹختے ہوئے پایا تھا۔ پھر جو کچھ ہوا تھا، وہ سب اُن کی ممتا کی جذباتیت تھی۔ انہوں نے شہریار کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ بس اُس کے کندھے سے سر ٹکائے روئے جا رہی تھیں۔ یوں جیسے اب تک کی ساری بے نیازی، غصہ، خفگی ان آنسوؤں میں بہا دینا چاہتی ہوں۔

شہریار نے اُنہیں رونے دیا تھا، پھر کافی دیر بعد اُس نے ٹشو سے اُن کی آنکھیں صاف کر کے کہا تھا۔ "یہ آنکھیں بہت قیمتی ہیں مام! ان میں اگر پھر آنسو دکھائی دیئے تو مجھے بہت تکلیف ہوگی۔"

ماما نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا، پھر سنبھل کر متوازی بولی تھیں۔ "عاطف سے کیا کہہ رہے تھے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اُفوہ، مام! وہ تو صرف اُسے ٹھنڈا کرنے کا حربہ تھا۔"

ماما نے اُس کا کان مروڑ دیا تھا، پھر مسکرا کر بولی تھیں۔ "یہ بات مان لی تو بھی اس سوال سے نہیں بچ سکتے کہ کل چار بجے تک کہاں تھے تم؟"

"کل چار بجے تک......وہ، مام! کل ایک ایڈ کا فائنل تھا، اُسی میں مصروف تھے میں اور سالار بھائی۔"

"ماننے کو دل نہیں کرتا کہ آگ اور پانی ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن کام کی نوعیت دیکھ کر مارجن دیا جا سکتا ہے کہ شاید تم سچ بول رہے ہو۔"

شہریار کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ ماما نے اُسے اتنے خوشگوار موڈ میں دیکھا تو دل سے دعا کی، وہ ہمیشہ انہیں ایسے ہی مسکراتا ہوا ملے۔

"آج دفتر کیوں نہیں گئے؟" سوچتے سوچتے سوال کیا اور وہ مسکرا کر بولا۔

"آج مجھے دراصل ڈریس کلیکشن کے لئے منتخب کئے گئے ہال میں انتظامات دیکھنے تھے مام! ماڈلز اور اُن کے نخرے، کلیکشن کی ہال تک ترسیل، ہر چیز میں وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اور پھر تین دن سے جو ماڈلنگ کی ریہرسل ہو رہی ہے، اس کو فائنل ٹچ دینا ہے۔ میک اپ کے لئے جس پارلر کو بک کیا گیا ہے، اس کا رزلٹ بھی آج ہی دیکھا جائے گا۔ ریپ میوزک کا کلیکشن ارینج کرنا ہے، پارٹی میں موجود شرکاء کے لئے کھانے کا انتظام دیکھنا ہے اور ایکسٹرا چھوٹے چھوٹے کام الگ۔ سو اس لئے میں نے دفتر سے چھٹی کر لی۔"

ماما نے اُس کے رُکنے پر اُس کے سر پر ہاتھ مارا تھا، پھر خفگی سے بولی تھیں۔ "اتنے ڈھیر سارے کام اکیلے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جازی اور سالار کو بھی اس سلسلے میں اپروچ کرو۔ آخر کو جتنی ذمہ داری تمہاری ہے، اتنی اُن کی بھی تو ہے۔"

''ہم سب کام مل کر ہی تو کرتے ہیں مام!'' پھر وہ اُٹھ گیا تھا۔ الماری سے اس نے ہینگ شدہ سوٹ نکالا تھا اور حیرت سے گم لہجے میں بولا تھا۔ ''مام! میرے روم میں دانیا آئی تھی کیا؟''

''نہیں تو۔ دانیا کو آج کل یونیورسٹی سے فرصت ہی کب ملتی ہے جو وہ یہاں آئے۔ لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

اُس نے اپنی خوش گمانی کو خود ہی پرے دیا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولا تھا۔ ''بہت دنوں سے میں اپنا کمرہ بہت ترتیب سے پاتا ہوں۔ ہر چیز بالکل اسی طرح ملتی ہے، جس طرح دانیا کے ہاتھوں کی ترتیب کی وجہ سے ملتی تھی، سوسوچ تو کافی دنوں سے رہا تھا کہ یہ سوال کروں گا، لیکن ہر روز بھول جاتا تھا۔ اب آپ کہہ رہی ہیں، دانیا میرے کمرے کی طرف آتی ہی نہیں ہے تو؟...... مام! یہ ترتیب کسی ملازم کے ہاتھ کی تو نہیں ہوسکتی۔ اور نہ صرف ترتیب بلکہ میرے کپڑوں کی استری، میچنگ ٹائی...... ان سارے کاموں کی میں کسی ملازم سے اُمید نہیں رکھ سکتا۔''

ماما نے سوچا اور بجلی کے کوندے کی طرح اُس کے ذہن میں حشمت خانم کی بات گھوم گئی...... ''آج کل میرا زیادہ وقت اُس کے کمرے کی دیکھ بھال میں گزر جاتا ہے۔''

ماما مسکرانے لگی تھیں، پھر الماری کے پٹ کھول کر اس ترتیب کو چھو کر محبت سے بولی تھیں۔ ''ہاں...... یہ صرف اماں کا اسٹائل ہے۔ اور کل پرسوں وہ کہہ رہی تھیں کہ اب تمہارے کمرے کی دیکھ بھال میں ان کا زیادہ تر وقت گزر جاتا ہے۔''

''نانو...... مما! نانو یہاں سر کھپاتی ہیں اپنا؟''

ماما نے اثبات میں سر ہلایا تھا، پھر سنجیدگی سے بولی تھیں۔ ''کل کی تقریب کے لئے کوئی اچھا سا سوٹ خرید لینا ہے اور ہاں، نوشے کی شادی ہے پرسوں، اُس کے لئے بھی بازار جا کر کچھ خریداری کرنا ہے۔ تمہارے پاپا تو اس شادی کو ایوائڈ کر رہے ہیں، لیکن بیٹیوں کی شادی میں شرکت کرنے کا میرا بڑا من کرتا ہے۔ پہلے مجھے لگتا تھا، شاید دانیا کی شادی نہیں ہو پا رہی، اس لئے میرے اندر کا فرسٹریشن اس طرح بھاپ اُڑاتا ہے، مگر اب...... اب مجھے گمان ہوتا ہے، شاید یہ میری کوئی نامعلوم سی دماغی گرہ ہے، جسے میں ٹھیک طرح کھول نہیں پا رہی۔''

شہریار نے ہینگر واپس ٹانگ کر ماما کو دونوں کندھوں سے تھاما تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ ''آپ غلط فہیم کر رہی ہیں خود کو۔ دراصل آپ ایک عورت ہیں مام! اور عورتوں کی شادی بیاہ پسند ہی ہوتا ہے، پھر کسی کی خوشی میں خوش ہونا تو یہ کیفیت دل میں نرمی اور حلاوت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ سو پلیز، آپ خوامخواہ اُلجھن میں نہ پڑیں، بس تیاری کریں۔ پاپا نہ سہی، میں ضرور آپ کے ساتھ اس شادی میں شریک ہوں گا۔''

"تم میرے لئے ٹائم نکالو گے شہریار؟"

"آف کورس مام! میرا سارا وقت جو بیت گیا، وہ بھی آپ کا تھا، جو بیتے گا، وہ بھی صرف آپ کے نام ہے۔"

ماما اُس کے جملے سے پہلے تو خوش ہوئیں، پھر شوخی سے بولیں۔ "لیکن بیٹا! شادی ہونے کے بعد شاید ترمیم ہو جائے گی تمہارے جملے میں۔ بیگم کو خوش کرنے کے چکر میں ماں کو بھول جاؤ گے، یہ طے شدہ امر ہے۔"

شہریار ہنس پڑا تھا، پھر اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر جذب سے بولا۔ "آپ بیگم کی بات کرتی ہیں مام! یہاں آپ کی خوشی کے لئے دنیا چھوڑنے کی ہمت رکھتا ہوں میں، اور پھر......" لمحہ بھر کو رُکا، پھر نرمی سے بولا۔ "اور پھر مام! یہ بھی سوچیں، کسی لڑکی کی مت ماری گئی ہے، جو مجھ سے شادی کر کے بیوہ ہونے کے کاغذ پر اسٹیمپ لگائے گی؟"

"بکومت۔ خدا نہ کرے، میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہوں۔"

وہ ماما کی خفگی محسوس کر کے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے جھول گیا تھا، پھر اُنہیں راضی کرنے کو بولا۔ "او کے، او کے...... اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ حضرت خضر کے ہاتھ سے میں نے ہی صدیوں جینے کا نسخہ حاصل کیا تھا، اس لئے موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اب ٹھیک بولی ہے لائن؟"

ماما نے اُس کے سر پہ چپت لگائی، پھر نرمی سے بولیں۔ "اولاد ہو، ماں نہیں ہو ناں، وگرنہ تمہیں پتہ چلتا، اس ہولا دینے والے خیال سے سانس کیسے رُک جاتی ہے۔"

"پلیز!..... سانس واپس کو آرام سے آنے دیں، وگرنہ یہ بندہ بے موت مارا جائے گا۔"

"پھر کی بکواس؟" ماما نے کان پکڑ کر مروڑا تو وہ ہنسنے لگا۔ ہینگر سمیت کپڑے لے کر باتھ رُوم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ماما اُسے جاتا دیکھتی رہیں، پھر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔ ابھی اُنہیں دوپہر کے لنچ کے لئے مینو سیٹ کرنے کی ذمہ داری بھی نبھانی تھی۔

شہریار نہا کر نکلا ہی تھا کہ اُس کا موبائل بجتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے نمبر دیکھا، عاطف کا نمبر تھا۔ پھر ریسیو کر رہا تھا کہ موبائل پھر بجنے لگا۔

"میری تو قبر میں بھی یہی ٹون سنائی دے گی۔" وہ اس وقت واقعی جھنجلا گیا تھا۔ جتنی جلدی نکلنا چاہتا تھا، اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ اُس نے نمبر دیکھے بغیر موبائل آف کر دیا تھا۔ پھر سارے کاموں سے نمٹ کر شام سات بجے دفتر پہنچا ہی تھا کہ دفتر میں ہر شخص کو اُس نے کافی سہما ہوا محسوس کیا۔ وہ سیدھا نائلہ کی ٹیبل کی طرف چلا گیا۔

''خیریت، دفتر میں بم کی رو مرآ گئی ہے کیا؟''
انیلہ خوف زدہ سی ہنسی، پھر مدھم ہو کر بولی۔ ''سالار صاحب نے صبح سے دفتر سر پر اٹھایا ہوا ہے۔''
''مگر کیوں بے بی؟'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر پہلے کہ وہ اُسے بتا پاتی اُس کا موبائل پھر بجنے لگا۔ نمبر پاپا کا تھا۔ اُس نے فوراً ریسیو کرلیا۔
''کہاں ہو؟''
''میں تو وہیں ہوں جہاں ہونا چاہیے...... آپ بتایئے، آپ اتنا کیوں گھبرا رہے ہیں؟ خیریت؟''
پاپا نے ٹھنڈی سانس لی اور نرمی سے بولے۔ ''اگر دفتر جانے کا ارادہ ہے تو آج کینسل کر جاؤ، تمہارے لئے حالات بہت خراب ہیں۔''
وہ ہنس پڑا۔ ''پاپا! یہ آپ پیشین گوئیاں کب سے کرنے لگے؟ کیا ہمارا بزنس خدانخواستہ اچھا نہیں جا رہا، جو نیا سائیڈ بزنس شروع کرلیا؟''
''شہریار تم سمجھ نہیں رہے ہو۔''
''تو آپ سمجھا بھی کہاں رہے ہیں پاپا؟'' وہ ماما کی محبت کی وجہ سے خوب جولی ہو رہا تھا۔ پھر پاپا کچھ بتانے کی کوشش کرنے ہی والے تھے کہ اُس کے سر پر اچانک بم پھٹ گیا، بنا اطلاع کے۔ وہ آہستہ آہستہ کر کے مڑا۔ سالار بھائی غصے میں سرخ ہوتے ہوئے اُس کے سر پر کھڑے تھے۔
''میرے کمرے میں آؤ۔''
''واپس زندہ جانے کی گارنٹی دیتے ہیں تو آتا ہوں۔''
انیلہ نے ہنسی سر جھکا کر بمشکل روکی۔ سالار بھائی کو اس بات سے اور بھی پتنگے لگ گئے۔ وہ اُس کا بازو پکڑ کر زبردستی اپنے کمرے میں لیتے چلے گئے، پھر پوری طاقت سے دروازہ بند کیا۔
''ٹوٹ جائے گا سنی بھائی!'' کراہ کر کہا۔ پتہ نہیں، یہ پیشین گوئی دروازے کے لئے تھی یا بازو کے لئے، مگر ایک ننھی گئی تھی۔ انہوں نے اُسے صوفے پر لے جا کر دھکا دیا تھا، پھر غرا کر بولے تھے۔
''تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میری سلیکٹ کی ہوئی ٹاپ ماڈل کو یوں نکالنے کی؟''

اُس نے سر سہلایا، پھر ہکلا کر بولا۔"بڑے بھائی! وہ ماڈل کچھ اوور ری ایکٹ کر رہی تھی۔حالانکہ اُس کے ساتھ اُس کی بیسٹ ماڈل زرش بھی تھی، مگر وہ اُسے بھی جگہ جگہ لیٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔جتنی دیر میں ہماری ماڈلز ریمپ کا چکر دو دفعہ لگا کر آجائیں، اتنی دیر تک تو اُس کا میک اوور پورا نہیں ہوتا تھا۔بس اس لئے میرا دل اتنا بُرا ہوا کہ میں نے اُس کو فوری فائر کر دیا۔"

"فوری فائر کر دیا...... تمہیں معلوم ہے، اُس سے جو کنٹریکٹ اس سمر کے لئے طے پایا ہے، اُس میں ہماری طرف سے شرط تھی کہ اگر وہ اس سارے عرصے میں کسی اور جگہ ریڈ کرے گی، فوٹو شوٹ کروائے گی یا ماڈلنگ ریمپ پر دکھائی دے گی تو جو رقم ہم نے اُسے اس کنٹریکٹ پر ادا کی ہے، وہ اُسے ہمیں ڈبل کر کے لوٹانی پڑے گی۔لیکن اگر ہمارا معاہدہ ہماری طرف سے ختم ہوتا ہے تو یہی شق ہم پر لاگو ہوگی۔ تم جانتے ہو، تمہاری اس غلطی کی وجہ سے ہمارا جو سرمایہ آل ریڈی بزنس میں لگا ہوا ہے، اُس کے ہوتے ہوئے اتنی بڑی رقم کو یکمشت دینا اور وہ بھی بغیر کسی پرافٹ کے، کتنا بڑا بوجھ بن جائے گا؟ سال بھر کا کنٹریکٹ تھا ہمارا اُس کے ساتھ۔"

شہریار نے رقم جوڑی اور ٹھنڈا سانس بھرا۔یہ رقم واقعی میں اس کنڈیشن میں ادا کیے جانا فیشن اینڈ اسٹائل کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اُس نے نرمی سے پوچھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے، پھر اس بار نرم لہجے میں بولے۔"میں نے معاملہ حل کرنے کے لئے اُسے آج ڈنر کی دعوت دی ہے۔اگر تم اس سے معذرت کر لو اپنے رویے کی تو......"

"یہ ناممکن ہے، میں ایسی میڈیا کر قسم کی لڑکی سے معافی نہیں مانگ سکتا۔" وہ کھڑا ہو گیا اور سالار عبدالرحمن کا پارہ پھر ہائی ہو گیا۔

"تم اُس سے معافی نہیں مانگ سکتے تو رقم کا بندوبست کر دو۔" لمحہ بھر کو وہ رُکے، پھر غصے سے بولے۔"آخر تمہیں ہمارا نقصان کر کے کوئی سکون ملتا ہے کیا؟...... آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ چلتا ہی رہتا ہے تمہارا۔ایک معاملے پر قلعی کرو، دوسرا منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے۔" وہ رُکے، پھر بولے۔"کل اتنی ایمرجنسی تھی؟ کیا کمپیوٹر آف نہیں کر سکتے تھے؟"

ایک نیا چارج۔اُس نے اعصاب ڈھیلے ڈال دیئے، پھر مرے ہوئے لہجے میں بولا۔"آخر ہوا کیا؟ پتہ تو چلے۔"

"پتہ چلا تو کیا کر لوگے؟" وہ پھر غصے سے بولے۔"کراچی میں لوڈ شیڈنگ کا معلوم ہے نا، پھر بھی بد احتیاطی کر دی تھی تم نے۔ایڈیٹنگ روم کے تینوں کمپیوٹر کھلے چھوڑ گئے۔دفتر میں کوئی تھا نہیں جو جنریٹر آن ہوتا۔جھٹکا لگا اور ایک کمپیوٹر اُڑ گیا۔جس ایڈ پر کام کر رہا تھا، بار بار بجلی کے آنے جانے سے پورا ایڈ اُڑ گیا۔وہ تو شکر ہے، اور یجنل سے میں نے کاپی کر رکھا تھا، ورنہ سا کھا لگ خراب ہوتی اور ہرجانہ اپنی

طرف سے بھرنا پڑتا۔ شہریار! میں تمہارا آخر کروں کیا؟"

اُس نے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ اگر اس وقت وہ کل کی کنڈیشن دہراتا تو جواب یہی ملتا۔

"ڈر رہا تھا ناں، میں مر تو نہیں گیا تھا، جو بے احتیاطی برتی۔"

سالار بھائی ایسے ہی تھے۔ غصے میں اپنی غلطیاں تک دوسروں پر تھوپ دیتے تھے کہ اگر میں غلط کر رہا تھا تو روکا کیوں نہیں، سو کچھ یاد دلانا عبث تھا، وہ کافی دیر تک بیٹھا رہا، پھر نرمی سے بولا۔

"میں جاؤں بھائی؟"

"کہاں جاؤں، پہلے طے کرو، ہرجانہ کون بھرے گا؟"

"کمپیوٹر کا ہرجانہ میں بھرنے کو تیار ہوں۔ کانوں چیک؟"

سالار عبدالرحمٰن بھنا کر بولے۔ "کمپیوٹر میں نے بخش دیا ہے، میں راعنا کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں نے پہلے کہہ دیا ہے، میں معذرت نہیں کروں گا۔"

"دفع ہو جاؤ پھر۔ میں یہ بات پاپا سے کلیئر کروں گا۔"

"لیکن ڈنر تو آج ہے بھائی!" اُس کی شوخی کسی طور نہ چھپی۔

اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ "تم جا سکتے ہو۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں، تمہیں صرف ہمارا خون جلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔"

"شکر ہے میرے پیدا ہونے کے کسی سبب سے تو آپ متفق ہوئے۔" وہ بڑبڑاتا نکل گیا۔ اُس کی پشت پر دروازہ بہت زور سے بند ہوا تھا۔

وہ آج کی عزت افزائی پر سر دھنتا پاپا کے دفتر کی طرف چلا گیا۔ پھر اُن کے دفتر میں داخل ہوا ہی تھا کہ بہت تیز تیز آوازوں سے اُس کا دماغ جھنا گیا۔

"یہاں بھی جھگڑا......" وہ بڑبڑایا۔ تب اچانک اُس کے کانوں میں آواز پڑی۔ یہ آواز بلاشبہ بیگم عافیہ کی تھی۔

"عبدالرحمٰن! میں تم سے پوچھ رہی ہوں، میری بہن عطیہ کہاں ہے؟ میں نے اُسے تمہارے آسرے پر چھوڑا تھا۔ میں ارسلان راشدی کو نہیں جانتی تھی، میں نے صرف تمہاری آنکھوں کی سچائی پر اتنا بڑا رسک لیا تھا۔ تم نے کہا تھا وہ بہت اچھا انسان ہے۔ وہ نرم دل ہے، وہ عطیہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے، وہ پڑھا لکھا انسان ہے، وہ فارن منسٹری میں ہے۔ یہ سب تم نے مجھے کہا تھا اور میں نے ان باتوں میں سے کسی بھی بات کی چھان بین نہیں کی تھی اور عطیہ تمہیں سونپ دی تھی۔ میں تو اُس کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوسکی تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن! آج میں سلیم کے دفتر میں گئی تو وہاں میں نے ارسلان راشدی کو دیکھا۔ میں نے عطیہ کے بارے میں جاننا چاہا تو تم جانتے ہو، اُس نے کیا کہا؟"

لحہ بھر کو لہجہ تھما، پھر دُکھ میں ڈوبی آواز آئی۔

"اُس نے کہا، کون سی عطیہ؟ میں کسی عطیہ کو نہیں جانتا۔ میں ایسی عورت کو جاننا بھی نہیں چاہتا، جو بے وفا ہو، جو شوہر کے ہوتے ہوئے اُس کے دوست سے پینگیں بڑھاتی ہو، جو گھر چھوڑ کر تین دن اُس کے دوست کے گھر رہ کر آئے، جو ہسپتال میں ہو تو اُس کے آپریشن کے لئے اتھارٹی کے طور پر اُس کے شوہر کے بجائے اُس کا دوست دستخط کرے۔ اُس نے مجھ سے کہا، آپ بتائیے عافیہ! میں ایسی عورت کی اولاد پر کیوں یقین کرلوں کہ وہ میری ہی اولاد ہے؟...... اُس نے مجھ سے کہا اور میں سلیم افسر کے سامنے ہلکی پڑ گئی۔ انہوں نے مجھے سپورٹ کیا ہے، مگر میرا دل...... میرا دل پھٹا جا رہا ہے اس دُکھ سے...... بتاؤ عبدالرحمٰن! میری بہن کہاں ہے؟"

"عطیہ...... عطیہ مرچکی ہیں عافیہ!...... عطیہ بیس سال پہلے مرچکی ہیں۔ وہ ڈلیوری کے آدھے گھنٹے بعد ہی مرچکی تھیں۔"

"ڈلیوری... عطیہ کی اولاد ہوئی تھی؟... کون ہے اُس کی اولاد؟ کہاں ہے اُس کا بچہ؟"

شہریار یکدم اس سوال پر اندر آگیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، اُس کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ "پاپا! آپ کی میٹنگ تھی ناں، آج؟"

پاپا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر جاں کنی کی سی کیفیت تھی۔

"عبدالرحمٰن! بتاؤ ناں، وہ اولاد کیا تھی؟ لڑکا یا لڑکی؟"

"لڑکی تھی میم!" شہریار کے منہ سے نکلا تھا۔ پاپا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور وہ مزید بولا تھا۔ "میم! ایک دفعہ آپ نے کہا تھا ناں، میں آئندہ یہ نہ کہوں کہ میں اپنے پاپا کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں،

بلکہ سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ میم! آپ جان سکتی ہیں، میں پاپا کے کتنے قریب ہوں۔"

"عبدالرحمٰن! کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"ہاں، مگر......" پاپا کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ انہوں نے کچھ اور بھی کہنا چاہا تھا، مگر بیگم عافیہ نے اس کی مہلت نہیں دی تھی اور تپ کر بولی تھیں۔

"عبدالرحمٰن! میں تمہیں کتنا غلط سمجھی تھی تم کتنے مختلف نکلے ہو۔ عبدالرحمٰن! کیا عطیہ کی بیٹی ہونے کے سچ کی طرح یہ بھی سچ ہے کہ تم نے اس بچی کو چلڈرن ہوم میں داخل کروا دیا تھا؟"

"عافیہ! آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں، میں نے تو..." مسٹر عبدالرحمٰن نے پھر کہنے کی کوشش کی مگر بیگم عافیہ سنے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئیں اور عبدالرحمٰن اُس پر اُلٹ پڑے تھے۔

"شہریار! تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟ کیوں کہا تم نے کہ عطیہ بانو کے ہاں بیٹی نے جنم لیا تھا؟"

شہریار نے اُن کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، بلکہ تیز تیز چلتی سانسوں کو قابو میں کر کے کہا تھا۔ "پاپا! ہمارے سر کلیکشن کا کیا ہوگا؟ کیا میم عافیہ ہمارا کنٹریکٹ جاری رکھیں گی یا یہ معاہدہ ٹوٹ جائے گا؟" پتہ نہیں اُس نے اتنا مختلف سوال کیوں کیا تھا۔ پاپا کا سوال کیوں ہضم کر گیا تھا۔

پاپا نے اُس کے چہرے پر محسوس تکلیف دیکھی مگر پھر بھی خفگی برقرار رکھ کر بولے تھے۔ "شہریار! تم اتنی تاجرانہ سوچ کب سے رکھنے لگے ہو؟"

اُس نے اب خود پر قابو پا لیا تھا، سو متوازن لہجے میں بولا تھا۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے پاپا! اگر میں ہر پہلو سے حالات کا جائزہ لے لوں۔"

"شہریار!" پاپا نے اُس کا کندھا تھاما، پھر نرمی سے بولے۔ "شہریار! کیا واقعی تمہیں عافیہ کی کہی ہوئی کسی بات نے ہرٹ نہیں کیا؟ جو بیان انہوں نے کوڈ کیا، اس پر تمہیں اعتراض نہیں ہوا؟... تمہیں یہ جاننے کی جستجو بھی نہیں ہوئی کہ یہ ارسلان راشدی کون ہے؟"

اُس نے پاپا کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "نہیں۔ مجھے یہ جاننے کی جستجو نہیں ہے کہ ارسلان راشدی کون ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، وہ ہستی کہاں رہتی ہے اور کیسی دکھتی ہے۔"

"تم جانتے ہو، ارسلان راشدی کون ہے، کہاں ہے؟" پاپا کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ پھر انہوں نے بے قراری سے کہا تھا۔ "تم مجھے اس کا پتہ دے سکتے ہو شہریار؟...... میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا

ہوں۔ میں اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ عطیہ بے قصور ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے پاپا! کیونکہ میں جانتا ہوں، وہ آپ کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اگر وہ آپ کی یا میری طرح ہوتے تو شاید وہ اتنا بڑا الزام نہیں لگاتے ماما پر۔ اُنہیں محبت کرنی نہیں آتی تھی پاپا! اور آپ نے اُن کی سفارش کی تھی۔ ایسے انسان کی سفارش، جس کی نظر میں محبت با اعتبار نہیں تھی، جس کا اعتبار صابن کے جھاگ کی طرح تھا، ذرا سی تیز دھوپ ہوئی اور بیٹھ گیا۔ پاپا! مجھے ارسلان راشدی کی کہی ہوئی کسی بات کا دکھ نہیں ہوا۔ کیونکہ کمزور اور بکھرے ہوئے افراد زندگی کو ایسے ہی تباہ کرتے ہیں۔ پاپا! مجھے ماما کی حسرت پر دکھ ہوتا ہے۔ اور مجھے...... مجھے آپ کے دل پر ترس آتا ہے۔ اگر آپ نے مام سے شادی نہ کی ہوتی تو آپ کی فرسٹ چوائس عطیہ مام ہوتی ناں؟"

عبدالرحمٰن کھڑے سے بیٹھ گئے تھے، بالکل گم صم سے، تب اُس نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

"محبت کرنا جرم تو نہیں پاپا! جو آپ گلٹی فیل کرتے رہے ہیں اتنے برسوں سے۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے، انسان زندگی کسی کے ساتھ شروع کرتا ہے اور دل کسی اور کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ مگر پاپا! آپ اس لحاظ سے اچھے انسان رہے کہ آپ نے دونوں میں سے کسی کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، دونوں کے ساتھ دل اور زندگی شیئر کی، اتنی زیادہ کہ آپ کبھی خود کو خود ہی میسر نہیں آئے۔ کوئی کرتا ہے اتنا بڑا دان؟" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ "مجھے آپ کے کردار کی بلندی پر فخر ہے پاپا! کہ آپ اپنے دل کا مدعا سامنے ہوتے ہوئے اس پر خاموشی کا پہرہ رکھے رہے۔ آپ نے عافیہ میم سے عطیہ مام کو اپنے لئے نہیں، ارسلان راشدی کے لئے اُنہیں مانگا۔ آپ نے یہ برا کیا پاپا؟"

عبدالرحمٰن صاحب نے سر جھکا لیا تھا، پھر نرمی سے بولے تھے۔ "کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے شیری! محبت آپ کو چاروں طرف سے باندھ لیتی ہے۔ مجھے بھی اس نے باندھ لیا تھا۔ میں اور ارسلان بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ وہ بہت خوددار انسان تھا۔ میں اُس کی مدد کرنا چاہتا تو وہ انکار کر دیتا، اس لئے مجھے اُس کی مدد کرنے کے لئے بھی بہانے ڈھونڈنے پڑتے۔ میں اُسے گفٹ میں کبھی کتابیں دیتا، کبھی قلم، کبھی اچھے کپڑے...... وہ مجھے گھورتا رہتا، مگر میں باز نہیں آتا۔ وہ پڑھائی میں تمہاری طرح بہت تیز تھا، مجھے لگتا تھا، وہ اپنے گھر کے نامساعد حالات کے باوجود بہت آگے جائے گا، سو میں نے صرف اُس کے راستے کے پتھر دُور کیے تھے، اس راستے پر دیوانہ وار وہ خود چلا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ پینٹنگ بھی کیا کرتا تھا، مجسمہ سازی میں بھی کمال رکھتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ سی ایس ایس کلیئر کر کے میرے ہمراہ اونچے پیمانے کی پارٹیز میں گیا تو فوراً لوگوں کی نظروں میں آ گیا۔ میں صرف اُسے لے کر گیا تھا، اُس نے اپنی شخصیت کے لئے جگہ خود بنائی۔ ان ہی پارٹیز میں اُسے

عطیہ ملیں۔ وہ میرے بی ہاف پر عطیہ سے ملتا رہتا۔ اور بس، جس دن اُس نے کہا کہ مجھے عطیہ سے محبت ہے، اس لمحے مجھے لگا، میں کس راستے پر چلنے لگا تھا؟ عطیہ کے چھن جانے کے دھڑکے نے میری سانس روک دی تھی، مگر عطیہ...... جب انہوں نے ارسلان راشدی کا نام اس دیوانگی سے لیا تو مجھے لگا کہ مجھے اس ملن کے لئے اپنی کوشش تیز کر دینی چاہئے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی تمام تر کاوشیں صرف کر دیں۔ مگر یہ محبت، یہ ہمیں چاروں طرف سے باندھ لیتی ہے......" پاپا کہتے کہتے رک گئے اور وہ پاپا کو دیکھے گیا۔ پاپا کے دل پر اُس کے دل کو پہلے سے زیادہ پیار آنے لگا تھا۔ ترحم سے اُس کا دل بھر گیا تھا۔ اُس نے پاپا کو خود سے بھینچ لیا تھا، کچھ نہیں بولا تھا، مگر نم آنکھیں اُن پر مرکوز تھیں۔

"مجھے پہلے آپ پیارے تھے، اب تو میری جان بن گئے ہیں پاپا!"

پاپا نے ہولے سے اُس کے گال کو پیار سے تھپکا تھا، پھر کچھ دھیان میں آیا تو بولے۔ "پر تم نے لڑکی کا کیا شوشہ چھوڑا ہے؟ کاغذات میں صرف ایک لڑکے کا اندراج ہے اور وہ تم ہو۔ سوچو، اگر عافیہ تحقیقات کرنے نکل گئیں تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "میں پکا کام کر کے آیا ہوں پاپا!"

"مطلب تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" پاپا نے حیرت سے دیکھا اور اس نے کہا۔

"اُس دن کی بات پر مجھے لگا تھا کہ میم عافیہ اس بات کی تحقیقات ضرور کریں گی، جو میں چاہتا تھا کہ نہ ہو۔ پھر اچانک قسمت نے میری مدد کی اور میں نے کاغذات میں تبدیلی کروالی۔ میں ساری زندگی صرف آپ کے نام سے جانا، جانا چاہتا ہوں دنیا میں۔"

پاپا نے اُسے خود سے قریب کر لیا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولے تھے۔ "کون کافر ہے جو تمہارے ساتھ جینا نہیں چاہتا؟ لیکن بیٹا! تمہاری بات ابھی بھی ادھوری ہے، ٹھیک طرح سے واضح تو کرو۔"

وہ پاپا کے پہلو پر اپنی جگہ بنا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کاغذات میں ایک لڑکی کا اندراج پرانی تاریخوں میں کروایا تھا کہ اگر میم عافیہ ڈھونڈنے نکلیں تو بھی وہ مایوس ہو جائیں، کیونکہ لڑکی کا اندراج مرے ہوئے بچے کی حیثیت سے کیا تھا۔ مگر جن دنوں میں یہ کارستانی کرنے میں منہمک تھا، ایک پرانی مڈوائف نے اُلٹی مجھ سے تحقیقات شروع کر دیں۔ وہاں سے مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ مجھے معلومات دینے کی ایک بھاری پیشکش پر آمادہ ہو گئی تھیں کہ عافیہ مام کے ہاں اُس دن ایک نہیں، دو بچے ہوئے تھے۔ میں نے معلومات کو وسیع کیا میم عطیہ کے حوالے سے، مگر مجھے ان پرانی مڈوائف کی

ریٹائرڈ فرینڈ سے اصلیت جاننے پر پتہ چلا کہ وہ بچی انہوں نے دولت کے لالچ میں ایک امیر عورت کو بیچ دی تھی۔ میں پتہ کر کے وہاں گیا مگر معلوم ہوا، وہ بچی کو صرف چار سال اپنے ساتھ رکھ سکے تھے، پھر انہیں اسٹاک مارکیٹ میں اتنا نقصان ہو گیا کہ اُن کے کھانے کے لالے پڑ گئے۔ یوں وہ بچی "چلڈرن ہوم" میں پلنے لگی۔ اب میں کاغذات میں نئی تبدیلی کروانے کے لئے ہراساں ہوں۔ کیونکہ میری کاوش کی خبریں ہاسپٹل کی انتظامیہ تک جا پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر وائف نے نوکری کے بچاؤ کے لئے میرا نام تو نہیں لیا ہے لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا، ماما کی بیٹی کو کاغذات میں زندہ کیسے کروں تاکہ عافیہ میم اُسے اپنی کسٹڈی میں لے سکیں؟"

"کیا مطلب، کیا تم جانتے ہو، عافیہ کی بیٹی کہاں ہے؟"

"پہلے نہیں جانتا تھا، ورنہ یہ حماقت نہیں کرتا۔ مگر اس دن جب آپ نے کہا تھا، یہ ہیں تمہاری ماں عطیہ، تو میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ مجھے اچانک یاد آ گیا تھا، میں جس یاد کے ساتھ اس دن نہیں چل پا رہا تھا، وہ یہی تصویر تھی پاپا! جس دن آپ کو پہلی بار اٹیک ہوا تھا، اُس دن میں کالج سے آپ کے دفتر بہت اچانک آ گیا تھا، تب ہی میں دفتر کے ورکر کے ساتھ آپ کو ہاسپٹل لے کر پہنچا تھا۔ پھر نرس نے جب آپ کی چیزیں میرے ہاتھ میں دی تھیں، تب آپ کے والٹ میں پہلی بار میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی اور بہت سالوں بعد کسی اور کی آنکھیں دیکھ کر مجھے وہ منظر یاد نہیں آ رہا تھا، مگر ماں کی تصویر دیکھ کر مجھے یاد آ گیا تھا، وہ چہرہ نقاب کشا ہوا تو میں جانا، میں نے جلد بازی میں ایک غلط کارروائی کر دی ہے۔ جس سے نمٹنا اب دُشوار ہو گیا ہے۔ عطیہ مام کی بیٹی ہمارے دفتر ہی میں جاب کرتی ہے پاپا! مگر اب میں اس غلطی کو کس طرح سنبھالوں، مجھے سمجھ نہیں آتا؟"

"تم بہت جذباتی، بہت ہی جذباتی ہو شیری! اگر تم اب بھی اُس لڑکی کے بجائے یہ سوچتے کہ ایک اُمید کی کرن پھوٹی تھی تو تم کاغذات بدلنے کے بجائے عافیہ کے سامنے آسانی سے اپنی ذات کلیئر کروا سکتے تھے۔ نہ صرف اُن کے سامنے بلکہ ساری دنیا کے سامنے ارسلان راشدی کے نام کا اعتبار پا سکتے تھے۔ تمہاری ذات معتبر ہو سکتی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک تم پر اور مجھ پر جو سوال اُٹھتے آ رہے تھے، وہ اپنی موت آپ مر جاتے۔"

"ایسا ہو سکتا تھا پاپا! لیکن میں دنیا کی قیمت پر بھی آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں، اس طرح آپ کی ریاضت، آپ کی محبت کی توہین ہوتی۔ اور میں ایسا نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم بہت الگ ہو شہریار! بہت زیادہ الگ۔ مجھے لگتا ہے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں، لیکن ہر بار تمہاری کوئی نہ کوئی بات چونکا دیتی ہے۔"

وہ مسکرایا تھا مگر اس مسکراہٹ میں دکھ رچا ہوا تھا۔ پاپا نے اُس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔

''بہادر بنو شیری! میں تمہیں بہت اسٹرانگ سمجھتا ہوں۔''

اُس نے آہستگی سے پاپا کے شانے پر سر ٹکا دیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ ''میں صرف اسٹرانگ نظر آتا ہوں، مگر اندر سے ہوں نہیں۔''

''اچھا تو تم اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرو گے؟'' پاپا نے اُس کے رخسار کو چوما تھا۔

اور وہ پھیکی سی ہنسی سے بولا۔ ''پتہ نہیں پاپا! یہ ابھی خود مجھ پر واضح نہیں، لیکن میری نیت نیک ہے، اس لئے مجھے یقین ہے، کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔''

پھر وہ رخصت چاہنے ہی والا تھا کہ پاپا کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سالار عبدالرحمٰن نے اُن کا جو یہ لاڈ پیار دیکھا تو بھنا گئے۔

''پاپا! آپ پر تو اس نے پتہ نہیں کیا جادو کر رکھا ہے، آپ کو اس کی کوئی بات بری ہی نہیں لگتی ہے۔''

پاپا نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا اور ہولے سے بولے۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ صبح بھی تم ایسے ہی لہجے میں شہریار کا پتہ کر رہے تھے، جیسے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہے اس نے؟''

سالار عبدالرحمٰن نے بلا کم و کاست ایڈیٹنگ روم اور ماڈل گرل کی بابت سب کچھ کہہ سنایا۔ پاپا نے شہریار کو تائیدی نظروں سے دیکھا تو اُس نے آنکھوں سے اثبات میں اشارہ کر دیا۔ سالار عبدالرحمٰن نے دونوں کی مجرمانہ سازش جیسی خاموشی دیکھی تو آؤٹ آف کنٹرول ہو کر بولے۔

''پاپا! میری معمولی غلطیاں بھی آپ کو بڑی بڑی لگتی ہیں، لیکن اس کی بڑی سے بڑی غلطی آپ ایسے ٹال دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ آپ بہت زیادہ فرق کرتے ہیں اپنے بچوں میں۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے سالار! تم میری عادت جانتے ہو، مجھے چیخ چیخ کر کوئی بات منوانا یا غلطی کا احساس دلانا کبھی بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں تمہاری شکایت پر کوئی ایکشن نہیں لوں گا، یہ تمہاری بھول ہے۔ تم گواہ ہو، تمہاری غلطیوں پر بھی تمہیں تنہائی میں بلا کر ہی کوئی ردعمل دیتا ہوں۔''

سالار عبدالرحمٰن پتہ نہیں، اس بات سے متفق ہوئے تھے یا نہیں، لیکن اُن کے کمرے سے وہ واپس لوٹ گئے تھے۔ پھر اُن کے جاتے ہی پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا تھا۔

''کوئی نیا بلنڈر رہے بیٹے جان؟'' رُک کے، پھر مسکرا کر بولے۔ ''کبھی کبھی بھائی کو تم بہت ستاتے ہو شیری! یہ بری بات ہے۔''

''بری بات ہے یا نہیں، آپ پوری بات جانے بغیر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ہمیشہ دو طرفہ بات سن کر فیصلہ کرنا سود مند ہوتا ہے پاپا!''

''اچھا بیٹا جی، اب آپ مجھے یہ بھی سکھائیں گے؟''

وہ شرارت سے ہنس دیا، پھر اپنا مقدمہ پیش کر چکا تو بولا۔ ''اب بتائیے، میری کہاں غلطی ہے پاپا؟''

پاپا نے غور سے اُسے دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ ''پہلے والے معاملے میں یقیناً تمہاری غلطی نہیں ہے، لیکن شہریار جی! ماڈل گرل والے معاملے میں سو فیصد آپ کی غلطی ہے۔''

''میری غلطی کہاں ہے پاپا؟'' اُس نے سوال کیا اور عبدالرحمن صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''بیٹا جی! اس سے زیادہ نخریلی ماڈل گرلز کے ساتھ ہم نے کام کیا ہے، اُن سے کام لیا ہے، مگر کبھی غصے کو شوٹ نہیں کرنے دیا۔'' وہ رُکے، پھر ہنس کر بولے۔ ''ہوتا ہے یار! جن لوگوں پر پروڈکٹ لانچ ہوتی ہے، جن کو ہزاروں کیا، لاکھوں لوگوں کی ستائش ملتی ہے، اُن میں خود بخود غرور نخرہ آ ہی جاتا ہے۔ سو اس فیلڈ میں جوان چھوٹے چھوٹے معاملات کو ہینڈل کرنا سیکھ گیا، وہی کامیاب ہو گیا۔''

''یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں، میں اُس لڑکی سے معافی مانگوں؟'' شہریار کا موڈ خراب ہو گیا۔ تب پاپا نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر دھر کر کہا۔

''نہیں، میرا بیٹا اگر کسی سے معافی نہیں مانگنا چاہتا تو میں اس کی عزتِ نفس کی قربانی نہیں دوں گا۔ ہاں، اگر بات احترامِ انسانیت کی ہوتی تو شاید مجھے کوئی عار نہیں ہوتا، بلکہ پھر تمہیں تمہارا ضمیر خود ہی معافی مانگنے سے روک نہیں سکتا تھا، لیکن بات چونکہ صرف ہار جیت، غرور اور نیچا دکھانے کی ہے تو اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

''لیکن پاپا! اس کنڈیشن میں آٹھ لاکھ کا انتظام کہاں سے ہو سکے گا؟''

''سوچتے ہیں، اس پر بھی سوچتے ہیں۔ بلکہ رُکو، ابھی سفارتی کوششیں کر دیکھتا ہوں۔ اس وقت تمہاری مام کو ہونا تو گھر پر ہی چاہئے۔'' پاپا نے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن شہریار نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ پیسے مام سے لیں گے پاپا؟'' پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''بری بات لگتی ہے پاپا! غلطی میں کروں اور جرمانہ مام پورا کریں؟...... او کے، ٹھیک ہے، میں راعنا سے سوری کر لیتا ہوں۔''

پاپا نے اتنی جلدی فیصلہ لینے پر اُس کی محبت کو حیرت سے دیکھا، پھر ردِعمل بھی دے نہیں پائے تھے کہ اُن کا موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھ کر وہ مسکرائے پھر شرارت سے بولے۔ ''بڑی اسٹرانگ ہے تمہاری مام کی محبت۔ دیکھ لو ضرورت پڑی اور کہنے سے پہلے چلی آئیں محترمہ...... ہیلو! عبدالرحمٰن بول رہا ہوں۔'' اُنھوں نے آدھا جملہ اُس کی طرف اچھالا اور آدھا جملہ بٹن پریس کرتے ہی بیگم کی طرف پارسل کیا۔

مام نے آواز سنی تو فوراً بولیں۔ ''عبدالرحمٰن صاحب! یہ سالار اور شہریار کا نیا کیا اختلاف ہوا ہے؟ عائشہ بتا رہی تھی، بہت غصے میں تھی پر آنے سے انکار کیا ہے اُس نے اور بہت زیادہ برا بھلا کہہ رہے تھے اُسے شہریار کی خودساختہ بہن ہونے پر۔''

پاپا اُنھیں تفصیل دینے لگے۔ ماما نے سنا تو بوریت سے بولیں۔

''سالار بھی ناں، پتہ نہیں کب سدھریں گے؟ ٹھیک ہے، آپ چیک سائن کر کے بھیج دیں، میں خود دستخط کر کے چیک آپ کے بتائے گئے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گی۔''

پاپا نے ہنس کر فون بند کر دیا، پھر شرارت سے بولے۔ ''اچھی بیوی ہونے کا یہی پلس پوائنٹ ہوتا ہے۔ سیکھو کچھ میری زندگی سے شہریار صاحب!''

شہریار ہنسنے لگا اور وہ جوائنٹ اکاؤنٹ کا چیک سائن کرنے لگے۔ سائن کر چکے تو بولے۔ ''اب یہ چیک گھر کون لے کر جائے گا بھئی؟''

شہریار نے اپنی خدمات پیش کر دیں تو بولے۔ ''نہیں، تمہیں بالکل ہٹ کر پڑے گا، تمہیں تو شاید شاپنگ کے لیے جانا تھا ناں؟''

''جانا تو ہے، لیکن میں سوچ رہا ہوں، میں نے جو غلطی کی ہے، اسے کس طرح سدھاروں؟ اور پھر آپ کے ادھورے جواب اور میرے انکشاف کے بعد وہ، جو آپ کے بارے میں غلط رائے لے کر گئی ہیں، اسے بھی تو دور کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی ناں۔''

پاپا نے اُس کے ہاتھ میں چیک بڑھا دیا۔ وہ کچھ نہیں بولے تھے مگر اُن کی پیاری سی مسکراہٹ سارے راز کھولے دے رہی تھی۔

'محبت پر واقعی کسی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی شیری! جہت آج تک اس میں ڈھونڈ ہی نہیں جا سکی۔'

''آخر یہ ''Stranger'' ہے کون، جس نے اخبارات میں تہلکہ مچا دیا ہے؟ کیسی اندر کی باتیں......'' یوسفی صاحب نے سلامہ کے سامنے اخبار پٹخ دیا۔ کچھ دنوں سے میڈیا میں اس فیک کالم نگار کی رپورٹس پر پورا ملک حیران تھا۔ یہ ایک ایسا کالم نگار تھا کہ جسے دنیا کی پروا تھی، نہ اپنی جان کی۔ میڈیا پر آج کل یہی ہاٹ ٹاپک تھا۔ سب جاننا چاہتے تھے، یہ اسٹرینجر کون ہے جس نے بڑے بڑے ایوانوں میں

ہلچل مچارکھی ہے؟

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو، آخر یہ ہے کون؟" لمحہ بھر کو رُک کے، پھر بولے۔ "اس اسٹرینجر کا طریقہ واردات بالکل میرے جیسا ہے۔ جیسے میں نے کسی زمانے میں گمنام کے نام سے کیا تھا۔ لیکن یہ مختلف ہے کہ یہ اس چھپے سچ سے میری طرح کمانے کے بجائے اسے عوام کے سامنے لا لاکر رکھتا جارہا ہے۔ بالکل مخبروں جیسی عادات کا حامل لگتا ہے۔"

"مگر سر! مخبر بھی کوئی نہ کوئی نفع کے آپشن تو رکھتے ہی ہیں۔ مجھے تو نہیں لگتا، یہ بندہ ایسا کرتا ہوگا؟"

یوسفی صاحب تھک کر بیٹھ گئے، پھر ہنسا کر بولے۔ "اگر ایسے راز میرے پاس ہوتے تو میں کروڑوں کما چکا ہوتا۔ مگر یہ بے وقوف صرف عوام کی واہ واہ پر خوش ہے۔"

"سر! کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن میں خدمتِ خلق کا جذبہ ہر چیز سے بڑھ کر ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ اخبار کا پروفنگ میٹر پڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ کالم چھوٹ رہے تھے، سو اس نے فوری بے ضرر قسم کی نیوز گھڑ کر ان کالمز کو پُر کر کے دوبارہ فائنل کے لئے سب ایڈیٹر کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب وہ قطعی فارغ تھا۔

فارغ ہوا تو یکدم اُسے شافعہ کی یاد آنے لگی۔ کچھ مہینوں میں وہ جتنی اُس کے قریب ہو گئی تھی، اُس کی ڈھارس تسلی کے لئے جو عارضی جملے وہ کہتا رہا تھا، جان جملوں نے اُسے باندھ لیا تھا۔ آخر کو اُس نے شادی تو کرنی ہی تھی، سو پھر وہ شافعہ کیوں نہیں ہوسکتی؟ اُس نے اماں اور زہرہ بجو سے بھی رائے لی تھی، دونوں نے بشمول جنید، اس پروپوزل کو بالکل ٹھیک فیصلہ قرار دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ابھی اندر ہی اندر تھا۔ شافعہ کی نظروں میں پسندیدگی کا عنصر تو تھا، لیکن یہ پسندیدگی واقعی محبت تھی، یہ جاننا باقی تھا۔ ابھی وہ فائنل پروف پڑھ کر اخبار کی پہلی کاپی آنے کے بعد دفتر سے اُٹھا تھا۔ اُس کا رُخ اب گھر کی طرف تھا۔ اُس نے بیل دی۔ دروازہ زہرہ بجو نے کھولا۔ زہرہ اور جنید ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اتنی رات گئے ہاسپٹل کے معاملات ڈسکس کر رہے تھے۔ نقشے پر بھی کچھ اعتراض اُٹھائے جارہے تھے۔ مگر وہ اُن کی گفتگو میں شامل ہوا تھا، نہ خیر سگالی کے خیال سے رُکا تھا۔ زہرہ بجو نے اُس کی سرد مہری پر اُسے خفگی سے دیکھا مگر اُس نے خفگی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ وجہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

اب وہ اپنے کمرے میں آچکا تھا۔ پھر بستر پر لیٹتے ہی اُس کی نظر اپنے کمرے میں لگے فون پر پڑی تھی۔ اُس نے اپنے فون پر دن بھر آنے والی کالز سنی تھیں، پھر ایک آواز تھی، جسے وہ ہمیشہ اپنے گرد سنتے رہنا چاہتا تھا۔ اس آواز کو سن کر وہ زیادہ نائم ہونے کے باوجود نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔ آج ہاسپٹل میں اُس کی رات کی ڈیوٹی تھی، اُس کی کال سے یہ اطلاع اُسے پہنچی تھی۔ سو وہ بے دھڑک اُس کا نمبر ملا رہا تھا۔ کافی دیر بعد اُس کا رابطہ ہو سکا تھا۔ آواز سن کر اُس کا دل کھل اُٹھا تھا۔

"کیسی ہیں شافعہ! آپ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں...... یہ بتایئے، آپ کیسے ہیں؟" وہ لمحہ بھر کو رُکی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "آپ نے آج رات کا میڈیا ٹرائل دیکھا۔ سچ سلامہ! مجھے تو دیکھ کر ہی اُس شخص کی جواں ہمتی پر رشک آیا۔ دیکھئے سلامہ! جو بات میں آپ سے کہہ رہی تھی، وجاہت کس طرح کسی اور کے دل نے پک کر لی۔"

سلامہ طنز سے ہنسا، پھر بولا۔ "آپ جسے میڈیا ٹرائل کہہ کر خوش ہو رہی ہیں، اُس کی جواں ہمتی پر آپ نے کبھی غور کیا؟ یہ واقعی میڈیا ٹرائل بھی ہو سکتا ہے، اسٹیبلشمنٹ کی بچگانہ کوشش، آپ نے اندازہ لگایا، اس میڈیا ٹرائل کے اکثر لوگ اپوزیشن سے متعلق ہیں حکومت میں۔ ایک وزیر ہے کو گندا کرنے کی جوان فیئر وار جاری ہے، یہ اسی کا حصہ ہے۔ آپ اندازہ لگایئے، اگر اُس اسٹرینجر کی دھاک بیٹھ گئی اور در پردہ کوئی ڈیل ہو گئی تو حکومت کے ایوانوں کے پائے اور مضبوط ہو جائیں گے اور اسٹرینجر کے کہنے میں عوام ایک بار پھر نئے سرے سے بے وقوف بن جائے گی۔"

"پلیز سلامہ! کسی کو سراہ نہیں سکتے تو اس پر اعتراض تو مت کیجئے۔ کسی کی اچھی بات کو سراہنا کوئی بری عادت تو نہیں۔"

سلامہ نے خفگی سے ہنکارا بھرا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "مجھے دراصل اس دشت کی سیاحی میں ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ میں ایسے کھیلوں سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لئے اسٹرینجر کی ذات کو بھی شک سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ اور شافعہ! آپ کو پتہ ہے، یہ میڈیا کو خبریں جس نیٹ ورک سے کی جاتی ہیں، اس کو آج تک ٹریس نہیں کیا جا سکا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم، یہ بات ناممکنات میں سے ایک ہے کہ حکومت اس نیٹ ورک، اس ویب سائٹ کو ٹریس نہ کر سکے؟ کسی بھی ملک کا نیٹ ورک سسٹم پوری طرح حکومت کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ معلومات ملکی سطح کی ہو یا غیر ملکی، اس سے باخبر ہوتی ہے۔ حکومت کو کہاں سے خبر لانچ کی گئی، میڈیا کے لئے یہ جاننا تھوڑا مشکل ہے، مگر حکومت کے لئے یہ آسان ترین ہدف ہے۔ مگر حکومت ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ جی ایچ کیو بھی اس سے لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔ سو شافعہ! مجھے کہنے دیجئے، یہ بہت بڑا پلنڈر ہے، جس کے ڈانڈے ہماری عمومی سیاست سے جا کر ملتے ہیں۔ اس لئے پلیز! اسے منصور اور سقراط کی کیٹیگری میں مت ڈالئے۔ کیونکہ آج کل دنیا اتنی تیز رفتار، اتنی جدید اور اتنی گیو اینڈ ٹیک کا شاخسانہ بن چکی ہے کہ آپ اگر اپنے بھائی کے لئے بھی کچھ کرتے ہیں تو اس میں بھی پرافٹ کا کوئی نہ کوئی مارجن ضرور رکھتے ہیں، یہ تو پھر اعلیٰ درجے کی سیاست ہے۔"

"سیاست ہے یا نہیں، لیکن یہ تو دیکھئے، وہ کیسے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے؟" شافعہ اپنی بات پر اڑی رہی تو وہ طنزیہ ہنسا، پھر نرمی سے بولا۔

"اگر حکومت میری بیک پر ہو تو ایسے دھماکے دار کام میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے ایک مل اونر کا بیٹا سچ کی علمبرداری میں اپنی نوکری کو لات مار آئے اور ایک مڈل کلاس پرسن سچ کی کٹھن کو

طنز سے اس پر ہنسے اور کہے، وہ بھی کیا آدمی ہے، اس کے اندر تو عزتِ نفس نام کو نہیں، مجھے دیکھو عزتِ نفس پر نوکری کو لات ماردی مگر گردن نہیں جھکائی۔ سب آپ کی طرح اس کی بات، اس کی جواں ہمتی پر واہ واہ کریں، مگر مڈل کلاس پرسن، وہ آپ کی تعریف پر شکوے سے آپ کو دیکھ بھی نہ سکے۔ شافعہ! یہ زیادتی ہے یا اسے آپ زیادتی نہیں سمجھتیں؟''

''آپ کی بات بہت ہیڈک فل ہے۔ لیکن زندگی کا صرف یہی نظریہ ہر جگہ تو لاگو نہیں ہوتا۔ سچ کے لئے نوکری کو ٹھوکر مارنے کے لئے ہمت کی تو ضرورت ہوتی ہے ناں سلامہ!''

سلامہ نے گہرا سانس لیا، پھر نرمی سے بولا۔ ''شاید میں آپ کو اپنی بات سمجھا نہیں پایا، ورنہ آپ جان لیتیں، بھوکے پیٹ اور بھرے ہوئے پیٹ کی ترجیحات کیوں مختلف ہوتی ہیں؟'' وہ چند لمحے رکا، پھر مزید بولا۔ ''آپ سراہتی رہئے اپنے اسٹرینجر کو، لیکن حقیقت کھلنے پر دل ٹوٹے گا تو مجھے الزام نہیں دیجئے گا۔''

شافعہ کی ہنسی سنائی دی، پھر اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''بے فکر رہئے سلامہ! میں اپنے آئیڈیل میں خاص کی گنجائش رکھ کر انہیں ایپری شی ایٹ کرتی ہوں، اس لئے دُکھ ہوگا بھی تو اتنا شدید نہیں ہوگا کہ میری شخصیت ہی بکھر جائے۔'' وہ رُکی، پھر بولی۔ ''لیکن سلامہ! سورج کی تمنا کرنے والے ہاتھوں کے قلم ہونے کے خوف سے اندھیرے کی دیوار توڑنے کی حسرت نہیں چھوڑ دیتے۔ اُمید...... کسی اچھے دن کی اُمید، کسی صبح پر قرض رکھ کر ہر روز سوتے ہیں، ہر روز جاگتے ہیں۔ نیند گہری ہوجائے تو اپنی آنکھوں کی امید دوسروں کو ہدیہ کر جاتے ہیں، ہار پھر بھی نہیں مانتے۔ اور بس میں، زہرہ پھپھو، اماں، جنید بھائی اور شہریار سب یہی چاہتے ہیں کہ آپ اس اُمید کو پھر سے اپنے اندر جی اُٹھنے دیں۔ زبردستی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آپ نے جو اپنی سچائی کا سانس روک رکھا ہے، اُس۔ بے دھڑک آنے دیں۔ سلامہ! آپ کو نہیں معلوم، آپ میرے لئے کتنے اچھے دوست ہیں اور میں آپ کو کس سفر کی سمت جاتا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

سلامہ باقی ہر خطاب حذف کر گیا، صرف اُسے سنائی دیا تو یہ کہ وہ اُسے اچھا دوست سمجھتی ہے، سو اُس نے تڑپ کے کہا۔ ''صرف دوست شافعہ......؟'' وہ آج کہہ دینا چاہتا تھا اور دوسری طرف شافعہ تھی، اس کی ادھوری بات پر ادھورا سا سانس بھر کر چپ رہ گئی۔ سلامہ نے دوبارہ پوچھا، تب وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''دل ایسے شہر کے پامال ہوجانے کا منظر بھولنے میں

جہانِ رنگ کے سارے خس و خاشاک

سب سرو صنوبر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر
کہیں اُمید کا چھوٹا سا اک گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے

لمبا، ٹھنڈا سانس لے کر وہ خاموشی میں اُتر گئی، پھر نرمی سے بولی۔ ”آپ کو جو بھی لڑکی پا لے گی، وہ بہت خوش قسمت ہو گی سلامہ! لیکن میں شاید وہ لڑکی نہیں ہوں۔“

”تم مجھے اس لئے تو نہیں ٹھکرا رہی ہو کہ میں سچ نہیں لکھتا؟“

وہ دُکھ کے رچاؤ سے ہنسی، پھر بولی۔ ”آپ کے اندر اپنے قلم کے غلط استعمال کا گلٹ موجود ہے، یہی اس کی طرف اشارہ ہے کہ آپ بہت دیر تک زرد صحافت کا حصہ نہیں بنے رہیں گے۔ کبھی نہ کبھی سچائی بس ایک لمحے میں آپ کے دل میں سرایت کر جائے گی۔ کپکپی بن کر آپ کے دل کو نئی طرح سے دھڑکا دے گی سلامہ! ہوتا ہے کبھی کبھی، بہت ساری باتیں، نصیحتیں، لیکچر جو بدلاؤ نہیں لا سکتے، وہ کبھی ایک واقعہ، ایک اپنی زندگی کے ساتھ ہونے والا حادثہ بہت سرعت سے سکھا دیتا ہے۔ ابھی آپ نہیں سمجھ رہے کہ برائی کا ساتھ دینے سے آپ برائی کو نہیں پھیلا رہے، بلکہ ایک اچھائی کو مٹائے دے رہے ہیں اور یہ اچھائی کبھی اپنے مزاج پر اتر آئی تو کھلے گا، آپ اب تک کتنا غلط قدم اُٹھا رہے تھے۔“

”مگر میں نے تم سے کچھ اور پوچھا تھا۔ کیا تم مجھے اس لئے ریجیکٹ کر رہی ہو؟“ وہ اپنی بات پر اڑا رہا تو اُس نے نفی میں جواب دے کر بہت مدھم ہو کر کہا۔

”سلامہ! میں وہ لڑکی نہیں، جو آپ کو پا کر خود کو خوش قسمتی کا تمغہ لگائے۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے، آپ کے ساتھ آپ ہی کی طرح ٹوٹ کر محبت کرنے والی لڑکی سوٹ کرے گی، اور میں...... میں اپنے حصے کی محبت کر چکی ہوں۔ میرا نڈھال دل شاید آپ کی اُمید پر پورا نہ اُتر سکے۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے، میری نہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، سوکھ جانے والا پیڑ اگر زمین میں جڑیں رکھتا ہے تو ہر خزاں کے بعد اس پر بہار کا موسم آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ زخم لگتا ہے تو وہ زخم بھر بھی جاتا

ہے۔ کچھ وقت گزر جائے تو اس نشان کو پوائنٹ آؤٹ کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ سو جب تم اس احساس سے گزرو تو میرے دل کو پیغام ضرور دینا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

شافعہ نے کچھ نہیں کہا۔ پھر دونوں پروفیشنل گفتگو کرنے لگے، یہاں تک کہ شہریار کے نام پر سلامہ کا منہ کڑوا ہو گیا۔

"تم ابھی تک شہریار سے ملتی ہو؟"

"کیوں؟ آپ اس طرح کیوں ذکر کر رہے ہیں اُن کا؟ وہ تو بہت اچھے انسان ہیں ناں۔"

سلامہ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "یہی تو پرابلم ہے، وہ اچھے بہت زیادہ ہیں۔ اُن کی تعریف میں لفظوں کی کمی کا شکار ہو جاتا ہوں میں۔"

"سلامہ! آپ اتنا طنز کیوں کر رہے ہیں؟ وہ تو آپ کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں۔"

"اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، آپ سمجھئے، میرا ظرف ذرا کمتر درجے کا ہے۔" وہ چڑ کر بولا اور وہ مسکرانے لگی، پھر محبت سے بولی۔

"آپ اس وقت غصے میں اُنہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے شاید اُنہیں ٹھیک طرح سے جج نہیں کر پا رہے۔"

"اوکے تم کرتی رہو اُسے ٹھیک طرح سے جج۔ میں اب سونے جا رہا ہوں۔"

اُس نے جتنی بے قراری سے فون کیا تھا، اتنی ہی شدت سے رابطہ منقطع کر دیا۔ پتہ نہیں، اُسے شہریار کا نام سن کر ہی اُلجھن کیوں ہونے لگی تھی۔ پہلے جو نام رگِ جاں محسوس ہوتا تھا، وہی اب قابلِ نفرین لگتا تھا۔ آج وہ بستر پر لیٹا تو اُسے لگا، جو بات وہ خود سے جھٹلا رہا تھا، شاید حقیقت یہی تھی کہ وہ نائمہ کی زندگی کے حادثے کو اسی کی ذات کا پیش خیمہ سمجھتا تھا۔ پھر زہرہ جنید تھیں، اُن کی زندگی خشک اور بے رنگ ہونے کا بھی وہ اُسی کو ذمہ دار گردانتا تھا۔ شافعہ کی شخصیت میں اُس کی محبت کے باوجود جو ایک کمی، ایک خوف بیٹھ گیا تھا اس کے لئے بھی وہ شہریار کو معاف نہیں کر پاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جن معاملوں میں اُس کا دماغ اُسے بری کر دیتا، ان معاملوں میں بھی وہ اُسے بخشتا نہیں تھا۔

وہ سوچتا رہا تھا، پھر جانے اُسے کب نیند آ گئی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو ایک نیا تہلکہ اُس کا منتظر تھا۔ یہ حکومتی طور پر فائنل ہونے والے زمین کے کئے جانے والے سودے کی رپورٹ تھی، جس کی فکر پر بہت بڑے بڑے نام فدا ہو گئے تھے۔ کروڑوں کی زمین

ہزاروں میں الاٹ کروی گئی تھی ۔اُوپر سے نیچے تک فون کھڑکنے لگے تھے۔

کل ہی اُس نے بات کی تھی اور آج اُس کا ہدف حکومت میں موجود کچھ افراد بن گئے تھے۔سلامہ نے پہلی بار اس اسٹرینجر کے بارے میں نئی طرح سے سوچا تھا۔وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ اس وقت کس طرح اوپر سے نیچے تک فون کھڑک رہے ہوں گے۔

''کون ہے یہ؟'' ایک یہی سوال ہر طرف گردش کر رہا ہوگا۔اُس نے بڑے بڑے تینوں اخباروں میں یہ نیوز رپورٹ بہت سکون سے پڑھی تھی، پھر بہت خاموشی سے اخبار رکھا تھا اور ناشتے کی میز پر زہرہ بجو تھیں، جو شافعہ کی طرح اس نڈر صحافی کے قصیدے پڑھ رہی تھیں، جو ہر لمحہ اپنی جان ہتھیلی پہ لئے پھرتا تھا۔وہ اس تعریف کو سمیٹتا ہوا اُٹھ ہی رہا تھا کہ گھر میں بہت غیر متوقع جنید داخل ہوئے۔

''خیریت جنید بھائی......؟'' اُس نے سوال کیا اور وہ صوفے پر بیٹھ کر بہت مسرزدہ لہجے میں بولے۔

''تمہارا دوست شہریار، وہ......وہ تو امیزنگ مین ہے بھئی!''

''مطلب، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' اُس نے کڑوے منہ سے سوال کیا اور وہ مدھم لہجے میں بولے۔

''تمہیں تو پتہ ہے ناں، امی دو ہفتے سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں، زہرہ ہاسپٹل کے پروجیکٹ کے باوجود امی کی ساری ذمے داری سنبھالے ہوئے ہے، اُن کی باقی دونوں بہوئیں اُن کو قطعی اگنور کر کے اپنی زندگی میں مست ہیں۔یہ شہریار وہاں چلا آیا۔پتہ نہیں اُسے امی کی طبیعت کی خرابی کا کس نے بتایا؟ شاید زہرہ نے ذکر کیا ہوگا۔''

وہ سوال کرتے کرتے خود کو جواب دینے لگے اور سلامہ اُنہیں اُلجھن سے دیکھنے لگا۔وہ مختصر لفظوں میں پوری کہانی سننے کا شائق تھا، مگر جنید بھائی رنگ آمیزی کے قائل تھے، سو کچھ گپ دے کر بولے۔

''مطلب یہ کہ اُس نے امی کا برین واش کرنے کی چپکے چپکے کوششیں شروع کر دیں۔وہ نامحسوس طور پر زہرہ کی اُن کے لئے محبت اور ٹینشن کا ذکر کرتا رہا۔اتنے سالوں سے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہنے پر، اُس کے مضبوط کردار پر قصیدے پڑھتا رہا، یہاں تک کہ امی کی نظر زہرہ کو دیکھنے کے سلسلے میں بدل گئی۔اُن کے انداز میں زہرہ کے لئے پیار اور تشکر آگیا تو کل اُس نے زہرہ کے ہاسپٹل سے جانے کے بعد پتہ ہے کیا نکتہ اُٹھایا؟''

''کیا نکتہ اُٹھایا؟'' زہرہ کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور جنید مسکرا کر بولے۔

”کل اُس نے راحیل کے متعلق امی کے سامنے رائے ظاہر کی۔ کہنے لگا، آنٹی جی! راحیل بھی تو آپ کے گھر کا فرد ہے ناں، یہ وہی ہے ناں جس سے نائمہ کی بات طے کی جانی تھی، لیکن آپ نے دیکھا، اُس نے کیسے شارٹ کٹ مارنے کے چکر میں سارے خاندان کو بدنام کرکے رکھ دیا۔ غبن کے الزام میں گرفتار ہوگیا تھا، اخبارات میں خبریں لگ گئی تھیں، مگر دے دلا کر معاملہ دبا دیا گیا تھا اس کا۔ کیونکہ اگر وہ پکڑا جاتا تو کچھ بڑے افراد کا بھی اس کے بیان میں ذکر ملتا، اس لئے انکوائری کسی نتیجے کے بناء ختم ہوگئی۔ پھر آنٹی! آپ بتایئے، آپ کے خاندان والوں نے کیا اُسے اپنے اندر سے باہر نکال کر پھینک دیا؟ کیا آپ کی گھریلو تقاریب میں اُسے بلانا چھوڑ دیا گیا؟“ امی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تو بولا۔ ”پھر آنٹی! آپ بتایئے، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غلطی نائمہ نے کی اور سزا آپ نے زہرہ بجو کو دی؟ دیکھئے ناں، زہرہ بجو کے ساتھ ساتھ اُن کے دونوں بچے کیسے ایک گھر کے ماحول سے نکالے گئے تو مرجھا گئے۔ آنٹی جی! آپ کو دل سے فیصلہ لینا ہوگا۔ کیونکہ یہ طے ہے، اگر زہرہ بجو ایک بہترین انسان نہ ہوتیں تو وہ اتنا طویل نارسائی کا عذاب نہ جھیلتیں۔ جنید بھائی اُن کے حق میں تھے، لیکن اُنہوں نے پھر بھی آپ کے رشتے کو ڈبل کراس نہیں کیا۔ اور سلامہ، یہ بات امی کے دل کو ایسی لگی کہ اُنہوں نے فوراً زہرہ کو اور بچوں کو گھر لانے کی ضد کردی۔ امی بیماری کی وجہ سے کچھ ویسے ہی نرم دل ہوچکی ہیں، لیکن یار! اپنا تو کام نکل گیا، یہی بہت ہے۔“

وہ تھکے تو زہرہ نے اُنہیں گھور کے دیکھا، پھر اُن کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ”شرم کریں کچھ، امی کی محبت کے بارے میں ایسے کمنٹ دیتے ہیں؟“

جنید ہنسنے لگے، پھر شرارت سے بولے۔ ”بس بیگم! تمہیں کیا معلوم، کتنی مشکل سے اپنی زندگی میں تمہیں دوبارہ لانے کا این او سی جاری کروایا ہے۔ سو بہتر ہے، اس سے پہلے کہ امی کا فیصلہ بدلے، اپنی پیکنگ شروع کردو۔“

زہرہ مسکرا کر اُٹھ گئیں اور کمرے کی دہلیز پر کھڑی اماں اطمینان سے مسکرانے لگیں۔ کیونکہ ہر روز کی رپورٹ شہریار، اماں کو باقاعدگی سے دیتا آرہا تھا۔ جنید یہ سمجھتے تھے، وہ صرف اُن کی بیماری میں اُن کی اماں کے قریب گیا ہے۔ حالانکہ یہ معرکہ وہ ڈیڑھ مہینے سے انجام دینے کی کوشش کررہا تھا۔ ہاسپٹل سے آنے کے بعد اُس نے اپنے روٹین پروگراموں میں یہ کام بھی شامل کرلیا تھا۔ بہت سخت باتیں سنی تھیں اُس نے، کافی دھکے کھائے تھے، تب کہیں جاکر فیروز جہاں اُس کے لئے نرم پڑی تھیں اور آج وہ کامیاب ہوا تھا۔

انہوں نے کمرے میں جاکر اُس کا موبائل نمبر ملایا تھا، مگر جواب نفی میں آرہا تھا۔ اُن کا دل خوف زدہ ہوگیا تھا۔

”اے اللہ! میرا بچہ ٹھیک ہو۔“ اُنہوں نے دل ہی دل میں مناجات کی، پھر آدھے گھنٹے بعد دوبارہ موبائل سے نمبر ملایا تو اُس کی اندر تک خوشی بھر دینے والی آواز سنائی دی۔ وہ صرف ہیلو کہنے سے ہی پہچان

گیا تھا، سو بہت دل سے انہیں زہرہ کے گھر واپسی کی مبارک باد دے رہا تھا۔ شاکرہ بانو ششدر رہیں، پھر بولیں۔

''کہاں ہے آج؟ ماں کا دل بہت چاہ رہا ہے، اپنے بیٹے کو دیکھنے کو۔''

وہ ہنس پڑا، پھر نرمی سے بولا۔ ''بیٹے کی طرف سے ماں کے لئے پیغام ہے کہ آج شام فیشن اینڈ اسٹائل کا شو آرگنائز ہو رہا ہے، اس لئے وہ انہیں مل نہیں پائے گا، بہت مصروف ہے ناں۔ مگر وعدہ کرتا ہے کہ بہت جلد اپنی پیاری پیاری ماں کی گود میں سر رکھ کر بہت ساری باتیں کرنے ضرور آئے گا۔''

شاکرہ بانو مسکرانے لگیں، پھر وہ بات کرنے کی تمنائی تھیں کہ اُس کے گاڑی میں ہونے کا احساس کر کے وہ گھبرا گئیں۔

''بہت احتیاط سے چلا کرو بیٹا! سڑکیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہیں اماں! لیکن زندگی سے کم خطرناک ہوتی ہیں۔ زندگی سے نبھا رہا ہوں تو ان کی خطرناکی کا تجربہ بھی کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ جان ایسے جائے یا ویسے، بات تو ایک ہے ناں۔''

''بکومت۔ پٹو گے میرے ہاتھ سے ایسی فضول باتوں پر۔''

شہریار ہنسنے لگا، پھر بہت ساری دعاؤں کے بعد ٹلا تھا۔ شاکرہ بانو فون رکھ کر مڑیں تو اپنے سامنے سلامہ کو دیکھ کر ساکت ہو گئی تھیں۔

''اماں! مجھے نہیں سمجھ آتی، آپ اسے کس وجہ سے اتنا بگاڑ دیتی ہیں۔ کیا وہ بہت اچھا ہے؟ مجھ سے بھی بہت زیادہ اچھا؟ کیا اُس کے والٹ میں مجھ سے زیادہ پیسے ہیں جو آپ.....''

شاکرہ بانو کی آنکھیں حیرت سے بیٹے کے چہرے پر آ کر رک گئی تھیں۔

''تم...... مجھے نہیں لگتا تھا، تم جتنا علم بڑھاتے جا رہے ہو، اتنا ہی جہل تم میں بھرتا جا رہا ہے۔ تم ایک ماں کی محبت کو دولت کے نظریے سے جانچنا چاہتے ہو۔ تم بھی نائمہ جیسے ہو، اُسے بھی انسانوں کی قدر نہیں تھی، وہ بھی دولت کو سب کچھ سمجھتی تھی اور تم بھی دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو۔ اب تو مجھے بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے، تم نے کہیں شہریار کی دولت کی وجہ سے تو اُس سے دوستی نہیں گانٹھی تھی؟ ہوتا ہے ناں، کچھ لوگ دوسروں کے پیسوں پر عیش کرنے کے بڑے حریص ہوتے ہیں۔''

''اماں! یہ بہت زیادہ ہے۔ آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔''

”تمہاری انسلٹ ہونے پر تم بھڑک جاتے ہو اور ماں کو سلیم کرتے ہو اور تمہارا دل نہیں کانپا۔ تم جاننا چاہتے ہونا، اس شہریار میں ایسا کیا ہے، جو سب کو اس کی طرف کھینچتا ہے، تو وہ ہے اُس کی عزت دینے کی عادت۔ وہ کبھی کبھی خود سے بھی زیادہ سامنے والے کو احترام دے ڈالتا ہے۔ کسی صلے یا تمنا کے بغیر، وہ لوگوں کو اُن کی معاشی حیثیت کے مل پر کیٹگریز میں نہیں ڈالتا، وہ ہر اُس شخص سے کھلے دل سے ملتا ہے، جسے اپنی حیثیت پر شرم نہیں آتی، فخر ہوتا ہے۔ یہ فرق ہے اُس میں اور تم میں۔ اُس کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اور تم...... تم اپنے احساسِ کمتری کو احساسِ برتری میں چھپانے کے لئے زیادہ سے زیادہ رُوڈ اور سیلفش دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہو۔ کیونکہ تمہیں ڈر ہے، کوئی تمہیں اس طرح نہ جان لے، جس طرح تم واقعی اندر سے ہو۔“

شاکر علی تو کبھی کرزئی نہیں تھیں اور وہ بت کی طرح اُن کے کمرے کی دہلیز پر کھڑا رہ گیا تھا۔ بہت کڑا تجزیہ کیا تھا ایک ماں نے اپنے بیٹے کا۔ لیکن کیا یہ سچ تھا؟

اُس نے اپنے دل میں جھانکا، جواب ملنے بھی نہیں پایا تھا کہ اُس نے سر جھٹک کے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے ہی میں عافیت جانی تھی۔



آج بہت صبح اُٹھ کر انوشے ہاسپٹل چلی آئی تھی۔ اُس کا دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ اُس کی برسوں سے فیری ٹیل میں موجود مظلوم ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ اس عورت کو اس نے کتنی صدماتی کیفیت میں دیکھا تھا، اور اب کتنے الگ ہٹ کر وہ اُسے ملی تھیں۔

بابا کہتے ہیں، وہ میری ماں ہیں۔ لیکن مجھے کیوں نہیں لگتا، وہ میری ماں ہیں؟ ماں نام کی ہستی کا میں جب بھی تصور کرتی ہوں، مجھے مام کیوں یاد آنے لگتی ہیں؟ میں نے جب سے اُنہیں دیکھا ہے، میرے دل میں کتنی بار خیال آیا، میں آنکھیں بند کروں اور دیکھوں، میرا دل کسے چاہتا ہے۔ اور جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں، میری آنکھ کی پتلی پر صرف مام کا عکس ہوتا ہے۔

وہ ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی، جب اچانک تانیہ دو نرسوں کے سہارے سے چلتے ہوئے اُس کے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھی۔

”مام......!“ اُس نے ہولے سے اُس کا ہاتھ تھاما، مگر ہاتھ حرارت سے خالی تھے اور آنکھ میں انوشے کے لئے بیزاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”تم آخر ہو کون، جو میری بیٹی بننے پر تُلی ہوئی ہو؟ میں نے کہا ہے ناں، میری صرف دو بچیاں تھیں، جنہیں میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔ مجھے بچے پالنے سے سخت چڑ تھی، مگر سلیم افسر اُسے بچوں سے عشق تھا۔ پتہ نہیں، وہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی ایسا احمق کیوں تھا؟“ تانیہ لمحے بھر کو رُکی، پھر رازداری سے بولی۔ ”سنو! میرا مشورہ ہے تمہیں، تم شادی نہ کرنا۔ شادی کھٹ راگ ہوتی ہے......“ تانیہ نے ایک گالی کے ساتھ

بات بدلی کی، پھر مسکرا کر بولی۔ ”اِدھر دیکھو، میری زندگی کتنی مست ہے۔ نہ شوہر کی ذمے داری، نہ بچے۔ جہاں چاہتی ہوں، چلی جاتی ہوں۔ جیسے چاہتی ہوں، زندگی انجوائے کرتی ہوں۔ تمہیں پتہ ہے، زندگی گزارنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری کیا چیز ہوتی ہے؟“

”محبت.......؟“ انوشے نے دلگیر لہجے میں کہا اور وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

”محبت....... یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ جب پیٹ خالی ہو ناں، تو محبت ساتھ نہیں دیتی۔ پیٹ کو روٹی چاہئے اور روٹی کے لئے پیسے چاہئے ہوتے ہیں۔ اور میں نے زندگی کا یہی اصول بنا لیا ہے، پیسہ جہاں سے جتنا ملے، حاصل کرلو۔ یہ مت دیکھو، ذریعہ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے اپنی ساری زندگی اسی نظریے پر گزاری ہے۔ دیکھ لو پیسوں میں کھیل رہی ہوں، پیسوں میں.......“

انوشے صدماتی کیفیت میں اُٹھی تھی۔ پھر باہر نکلی تھی تو نرس نے اُس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر تاسف سے کہا تھا۔

”میم تانیہ جس فیز میں آ کر رُک گئی ہیں، اس فیز کی ایک ایک بات میں صرف یہی تذکرہ ملتا ہے کہ ان کے پاس بہت پیسہ ہے، انہوں نے بہت عیش سے زندگی گزاری ہے۔ مگر میم! مسٹر سلیم افسر نے ان کے بتائے گئے اکاؤنٹ نمبر اور فیک نیم سے جو اُن کی رقم جمع تھی، بینک سے اُس کے بارے میں معلومات لیں تو پتہ چلا ان کے سارے اکاؤنٹ کسی نے خالی کروا لئے۔ میم تانیہ کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کا محور دولت ہے اور ڈاکٹر مرزا کے خیال میں اگر یہ بات انہیں کبھی پتہ چلی تو شاید وہ دماغی توازن برقرار نہیں رکھ سکیں گی۔“

انوشے سن کر رکی نہیں تھی۔ اُس کا رُخ گھر کی طرف تھا اور دل بہت اُداس تھا۔ وہ جس آس پر یہاں آئی تھی، اُس آس نے آپ ہی آپ دم توڑ دیا تھا۔ دل نے تانیہ کو کئی سیڑھیاں اور نیچے اُتار دیا تھا۔



وہ ابھی ابھی دفتر سے نکلا تھا۔ ہر طرف اُس کی جی داری کے ہی قصے تھے۔ اُسے پہلی بار لگا تھا، وہ واقعی جینے والوں کی لسٹ میں شامل ہے، ورنہ بہت سالوں پہلے تک اُسے ہر لمحہ اپنے وجود سے گھن کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ کوئی ایک بھی ایسی ٹھوس وجہ نہیں تھی، جسے وہ جینے کی وجہ بنا سکتا۔ پھر اچانک اُسے لگا، اگر وہ اپنے دل کی بھڑاس نہیں نکالے گا تو دماغ پھٹنے سے یا تو مر جائے گا یا پھر اور بہت سے لوگوں کی طرح بے حسی کی چادر لپیٹ کر سو جائے گا۔ یہ نیند سامری کے جادو جیسی نیند تھی، جہاں ہر شخص نیند میں چلنے کی بیماری میں مبتلا تھا۔ ہر کام ہو رہا تھا، سب کی زندگیاں کہیں رُکی نہیں تھیں، لیکن پھر بھی سوچنے کا دستور یہاں کے لوگوں کے نصاب سے نکل گیا تھا۔ آج کل لوگ کسی کے گھر کی آگ میں صرف ہاتھ تاپتے تھے یا چٹخارے بھری خبروں سے اپنی اپنی زندگیاں گرماتے تھے یا پھر سگریٹ اور سگار کے

دھوئیں میں بیٹھ کر امجلگچو ئلز کی طرح دھماکے وار نکلتے نکال کر پریس نوٹ جاری کرتے تھے کہ یہاں، اس ملک میں کچھ نہیں بدلا جاسکتا، یہ ملک رہنے کے قابل نہیں رہا، اور بس.......

اور وہ اس اور بٹ میں سے زندگی کشید کرنے کے عمل سے ہو گزرا تھا۔ جب اُس نے پہلی بار 'اجنبی' کے نام سے پہلا کالم لکھا، اُس دن اُس نے پہلی بار اپنے ہونے کا احساس پایا۔ وہ نیٹ کے ذریعے اپنے لکھے ہوئے کالم کو کسی بھی بڑے اخبار کے لئے میل کر دیتا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اچانک ایک دن اُس کے باس نے اُس کی یہ چوری پکڑ لی تھی۔

''آخاہ تو آپ ہیں اجنبی۔ حیرت ہے، اتنا اچھا لکھتے ہو تو میرے دفتر میں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو صحافت کا حصہ ہونا چاہئے تم نے ایم اے صحافت کر رکھا ہے ناں۔''

''جی سر! لیکن صحافت سے مجھے نفرت ہے۔''

''لیکن جو تم لکھ رہے ہو، یہ بھی تو صحافت ہے؟'' اُس کے باس نے نکتہ اُٹھایا۔

اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نو سر! یہ صحافت نہیں ہے، مجھ پر کچھ قرض واجب ہے۔ اسے آپ اس کی قسطیں سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے سر! میں نے آج تک اپنے کسی کالم کا اعزازیہ نہیں لیا۔ حالانکہ 'اجنبی' کا لکھا ہوا کالم تینوں بڑے اخباروں میں اُردو اور انگلش میں ہر روز چھپتا ہے۔''

''ماننا پڑے گا بھئی، آپ ہماری طرح ہی کے سر پھرے ہیں، آپ کی عظمت کو تو سلام کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں، ایک بزنس پارٹی میں بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی اُس دن۔ میں آپ کو دیکھ کر چونک گیا تھا، لیکن آپ نے اُس دن بات ٹال دی تھی۔ آپ نے کہا تھا، آپ وہاں اپنے فادر کے بی ہاف پر شریک ہیں۔ آپ کے فادر، مسٹر.......''

اور اُس نے فوراً اشارے سے اپنے باس کو روک دیا تھا۔ ''پلیز سر! وہ میرے فادر ہیں، یہ سچ ہی لیکن میں اسی اذیت سے بے حال پھرتا ہوں۔ اچھا گھر، گاڑی، عیش و آرام، میں نے یہ سب اس نام کی وجہ سے ملنے پر ہی چھوڑا ہے۔ آپ جب مجھے میری کسی غلطی پر ڈانٹتے ہیں ناں سر! تو مجھے لگتا ہے، آپ نے میری غلطی کو نہیں، میرے فادر کی دی ہوئی، جی ہوئی زندگی سے ہونے والی غلطی کو جھڑکا ہے، انہیں جھڑکا ہے۔ سو مجھے اس دن بہت خوشی ہوتی ہے۔''

''اُفوہ، آپ بھی ناں، اپنے مزاج کے ایک ہی ہیں۔'' یہ اُس کے باس کا اُس کے بارے میں آخری کمنٹ تھا۔ پھر وہ 'اجنبی' نام بہت مشہور تھا، جب اُس کے میل بکس میں ایک بہت ہی رومینٹک ای میل آئی۔

''محبت کرنے والوں کی قدر کرنا صرف دل والے جانتے ہیں اور دل والے پیار کے لئے کچھ بھی ٹھکرا سکتے ہیں، چاہے وہ عیش و آرام ہو، جان ہو، کچھ بھی۔ اگر یہی اسٹف تم میں موجود ہے تو محبت کا دعویٰ

ہم بھی کرتے ہیں۔"

وہ چونک گیا۔اس ای میل کو پڑھ کر لکھے گئے آئیڈینٹی پر اُس نے میل بھیجی تھی۔پھر یہ سلسلہ چل نکلا تھا اور تین ماہ بعد پہلی بار اُس سے بالکل اجنبی شخص آ کر ملا تھا اور تب بات چیت کرتے اُسے اس نئے سرکل میں آنے کا موقع ملا تھا۔"محبت ڈاٹ کام" اسی سرکل کا ایک خفیہ ادارہ تھا۔بظاہر کلیئرنگ فارورڈنگ کمپنی تھی،مگر اندرونی طور پر سب اسی کام کے ماہر تھے۔تھرل،سچ تک رسائی،سچ کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرنا،یہی ان کا کام تھا۔

وہ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اُس کے موبائل نے وائبریٹ کیا۔اُس نے میسج پڑھا،لکھا تھا۔"زندگی بہت خوب صورت ہے۔"وہ میسج پڑھ کر اُٹھ گیا تھا۔کیونکہ یہ میسج ایک طرح سے اُس کے لئے کوڈ تھا۔"ملنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے جواب ٹائپ کیا۔"زندگی صرف تمہاری وجہ سے ہی خوب صورت ہے۔"جس کا مطلب تھا۔"ملیں گے،مگر اسے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

وہ خاموشی سے اُٹھ گیا تھا۔ایک نیا اسائنمنٹ اُسے مل گیا تھا،سو وہ چائے کا بل پے کر کے اُٹھ گیا تھا۔



آج اُس کا حُسن دو آتشہ تھا۔آج پہلی بار اُس نے اپنی زندگی کا سب سے لمبا داؤ کھیلنے کی ہامی بھری تھی۔غربت و افلاس دیکھ کر اپنی بہن کو جان مارنے کے باوجود زندگی کے پیچھے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اُس نے سوچ لیا تھا،وہ اس کی طرح کی زندگی کبھی نہیں گزارے گی،وہ کبھی زندگی سے ڈیپ نہیں ہوگی۔اُس کی ضد تھی،زندگی اُس کے پیچھے دوڑے۔آئینہ کہتا تھا،وہ ہے بھی ایسی کہ زندگی،لیکن سب اُس کے غلام رہیں اور وہ اس کمنٹ سے کبھی انکار نہیں کر سکی تھی۔یہی وجہ تھی کہ لاہور میں تعلیم کے لئے آنے کے باوجود ہفتے کے تین دن اُس کے کراچی میں گزرتے۔وہ کوئی ماڈل گرل تھی،نہ اداکارہ۔لیکن پھر بھی ہائی فائی پارٹیز میں پہلی ترجیح تھی۔

اُس نے آج تک اپنے وجود کا کندن کسی کی جھولی میں نہیں ڈالا تھا۔وہ ایسا نہ کرنے کے لئے کسی اصول،کسی معاشرتی بندھن کو نہیں مانتی تھی بلکہ وہ منتظر تھی کسی ایسے جی دار انسان کی،جو اُسے روپے پیسے کے جھولے میں لمبی لمبی پینگ دے سکے اور یہ رفتار کبھی دھیمی نہ ہو،لمبی پینگ لیتے لیتے اوپر جانے کا سفر دلکش ترین تھا،مگر اُسے اوپر سے نیچے آنے میں کبھی مزہ نہیں آتا تھا،یہی وجہ تھی کہ وہ کسی ایسے مرد کی

تمنائی تھی، جس کی زندگی میں شامل ہو کر وہ کبھی نیچے کا سفر نہ کرے۔ بلند سے بلند، اُونچی سے اُونچی ہوتی جائے۔ اور یہ سفر اُسے دینے والا آ گیا تھا۔ بات صرف کمپنی دینے سے شروع ہوئی تھی، مگر اب لگتا تھا، بہت آگے جانے والی تھی۔ اُس کے سنگ رہنے والا شخص اُس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا اور وہ یہی چاہتی تھی۔ ایک عیش پسند زندگی اور ایک خواب نگر کا سفر۔"

اُس نے لپ اسٹک سے ہونٹوں کو نکھار دیا۔ پرفیوم اسپرے سے اپنے وجود کو خوشبوؤں میں بسایا اور اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی کو دیکھا۔ ڈائمنڈ لگی ہوئی انگوٹھی اُس کے خوابوں میں رنگ بھرے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں دل سے اپناتا ہوں۔ زندگی کا سفر تمہارے ساتھ گزرے تو زندگی مسکرا دے گی۔ سونیا پلیز! انکار مت کرو۔ دیکھو، میں ایک ہفتے بعد جا رہا ہوں۔ آج اپنا بنا کر رخصت کرو تو دل ساری عمر تمہاری محبت کی قید سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہیں سکے گا۔" مخمور آواز کا ردِعمل اور اُس کا نقرئی قہقہہ........

"آپ جانتے ہیں ناں میری ڈیمانڈ؟........ مجھ سے شادی کرنی پڑے گی آپ کو۔"

"دل سے تمہارا ہوں، پھر بھی تم فارمیلیٹی نبھانا چاہتی ہو؟ چلو، ابھی چلو۔ ہم ابھی شادی کر لیتے ہیں۔"

ایک اور نقرئی قہقہہ........ دو ساتھ ساتھ اُٹھنے والے قدموں کی آواز۔ ایک دھوکا دینے پر مصر، ایک دھوکا کھانے پر تیار۔

زندگی نے نیا موڑ لیا۔ وہ نکاح تک جاتے جاتے صرف منگنی کی انگوٹھی پر مان گئی مگر پھر بھی ضد کر کے بولی۔ "میں نے سنا ہے، آپ پہلے سے شادی شدہ ہیں؟"

"ہاں، میں شادی شدہ ہوں تم سے کیوں چھپاؤں گا؟ مگر سونیا! وہ عورت میری ٹائپ کی نہیں ہے، گاؤں میں رہتے رہتے وہ بالکل ڈل ہو گئی ہے اور مجھے........ مجھے تم جیسی پُر جوش محبت ہی لطف دے سکتی ہے۔ تم اسے بھول جاؤ، وہ گاؤں میں رہے گی، میں تمہیں یہاں الگ گھر دوں گا۔ جو تم چاہو، وہ تمہارے نام لکھنے کو تیار ہوں، دولت، گاڑی، گھر اور اپنا آپ، سب کچھ۔"

نقرئی قہقہہ پھیلتا چلا گیا۔ اُس کی طوالت پورے دن جتنی ہو گئی اور آنکھوں کی چمک اندھیرے میں جگنو کی بوند بوند کرن کی طرح چمکتی چلی گئی اور آج کا دن تھا، وہ اپنے اسی فیصلے پر مسرور تھی۔ اُس نے کسی کا دل پلو سے باندھ لیا تھا۔ زندگی میں کہیں شارٹ کٹ نہیں ہوتا، لیکن اُس نے یہ رسک لے لیا تھا۔ ہاسٹل میں اُس کا امیج ایک بری لڑکی کا تھا۔ شریف گھروں کی لڑکیاں اُس سے دور دور رہتی تھیں، لیکن اُسے اس کی کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا، جو جو وہ کر رہی ہے، وہ جائز ہے۔ جس طرح بے انتہا بھوک میں، غربت میں حرام جانور بھی حلال ہو جاتا ہے، اسی طرح نامساعد حالات، تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے اس کام میں کوئی برائی نہیں ہے، اگر وہ ایک دو گھنٹے کے لئے کسی کے پاس اپنا وقت اور اپنی کمپنی فارسیل کرتی ہے۔ اُس نے کبھی کسی مرد کو حد سے تجاوز کرنے نہیں دیا تھا۔ وہ

بہت بڑی دنیا میں تھی، پھر بھی ہمیشہ اُس نے اپنا آپ سنبھال کر رکھا تھا۔ لیکن یہ جانتی تھی کہ اُس کی بڑی شہرت کبھی اُس کا کوئی اچھا گھر نہیں بسنے دے گی اور اُس کی مڈل کلاس میں کوئی اچھا گھر بسنے کی تمنّا بھی کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی۔ سو اُس نے اپنی شہرت کو پہلی بار اس فیلڈ میں موجود جانا نہ کے سپرد کیا تھا۔ یہیں سے وہ زوار حسن شاہ سے ملی تھی اور آج پورے ایک سال کی کاوش کے بعد وہ ایک وعدے سے بندھی اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے جا رہی تھی۔

زوار حسن شاہ اُس کی محبت میں لاہور چلا آیا تھا، یہی بہت تھا۔ اُس نے ہاسٹل کی دیوار پھلانگی تھی اور واچ مین کی مٹھی گرم کر دی تھی تاکہ الزام اُس کے سر بھی نہ آئے اور وہ اپنی خاموشی بھی برقرار رکھے۔ رہی واپسی تو اُسے اس کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ واپسی کے بعد وہ مسز زوار حسن شاہ ہوگی۔ پھر اُس کے رسوخ کے آگے کیسی انکوائری، کس کی انکوائری تھی جو ٹک سکتی۔ اُس نے آخری بار اپنے آپ کا جائزہ لیا، پھر وہ اُس کے آنے والے قدموں کا انتظار کر رہی تھی کہ اُس کے موبائل پر کال آئی۔

"ہیلو، سونیا اسپیکنگ۔"

"ہیلو سونیا! میں شافعہ بول رہی ہوں۔ پلیز تم جلدی سے گھر آنے کی کوشش کرو، اچانک اماں کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہاسپٹل لے آئی ہوں۔ لیکن پتہ نہیں، میرا دل بہت ڈر گیا ہے۔ تم آ رہی ہو ناں سونیا؟"

"ہاں...... آں، میں آ رہی ہوں۔" اُسے لگا، کسی نے اُسے سب سے اونچی عمارت کے ٹاپ سے دھکا دے دیا ہو۔ اتنا قیمتی لمحہ اُس کی زندگی سے آئے بغیر جا رہا تھا۔ یہ اُس کے خواب کا اختتام تو نہیں تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ! تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو آج۔" کسی نے عقب سے کہا تھا مگر اُس کے چہرے پر نظر پڑی تو حیرت سے پوچھا۔ "کیا ہو گیا ڈول! کیا میرے دیر سے آنے پر خفا ہو؟ دیکھو، میں تمہیں پہلے بتا دوں، مجھے منہ پھلائے زندگی کا ساتھ دینے والی پارٹنر پر بہت غصہ آتا ہے۔ سنو لڑکی! آج ہماری زندگی کا اتنا پیارا دن ہے اور تم اُداس ہو؟"

"میری امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے، مجھے کراچی جانا ہوگا شاہ صاحب!"

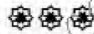
زوار حسن شاہ نے اُسے کندھوں سے تھاما، پھر خمار آلود لہجے میں بولا۔ "او کے، دل پر بار مت لو۔ ہم ملن کی یہ سلیبریشن پھر کر لیں گے۔ تم گھر جاؤ۔ میں خود تمہارے ٹکٹ کا انتظام کرتا ہوں۔ لیکن سنو! اب میرے جانے کے بعد تم کراچی میں ہی رہنا، میں جانے سے پہلے اب تم سے وہیں ملوں گا۔"

''شکریہ شاہ صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھے فخر ہے میرا انتخاب غلط نہیں۔''

''انتخاب تو میرا بھی بہت اچھا ہے میڈم!'' زوار حسن شاہ نے بھرپور محبت کا احساس دیتے ہوئے اُس کے کان میں گنگنا کر کہا۔ سونیا نے محبت کے ان پلز پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا پھر اُس نے ہوٹل کے کمرے سے ہی اُس کی سیٹ کنفرم کروائی تھی۔ زوار حسن شاہ نے اُسے ایئرپورٹ تک جانے کے لئے اپنی گاڑی باوردی ڈرائیور کے ساتھ عنایت کی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے بیگ کو کندھے پر ڈال کر باہر نکلی تھی۔ پھر اُسے نکلے پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے، زوار حسن نے ایک موبائل نمبر پریس کر کے کہا تھا۔

''گلوریا، پلیز! کیا آج کے دن تم مصروف تو نہیں ہو؟...... نہیں، بہت تنہائی ہے ڈارلنگ! سچ پوچھو تو صرف تم ہی وہ لڑکی ہو، جس نے مجھے سمجھا ہے۔ پلیز ڈارلنگ! میری تنہائی کو سجا دو۔''

اُس نے موبائل انڈیکس آف کی تھی اور زندگی اُس کی زندگی پر ہنس رہی تھی۔



آج پتہ نہیں اُن کے دل کو کیا ہو گیا تھا، وہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے اُٹھے تھے اور پھر کھانستے ہوئے وجود کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''آج آپ کو بہت کھانسی اُٹھ رہی ہیں، خیریت تو ہے؟'' وہ اُن کی پشت تھپکنے لگے۔ اُن کا پھندا بمشکل کھلا تھا، لیکن یہ کھانسی کا پھندا تھا کہ کسی جرم کا احساس۔

اُنہوں نے اپنے شوہر ارسلان راشدی کو دیکھا۔ خود ارسلان راشدی بھی اُنہیں ہی دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ وہ اُن کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ اُنہوں نے بہت غیر متوقع اُن کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اگر اُن کا وجود ٹرانسپیرنٹ ہوتا تو دکھائی دے جاتا کہ اس محبت کے لمس نے اُن کی جلد کے نیچے کتنے ننھے ننھے سے دیے جلا کر بہا دیئے تھے۔ اُنہیں تو اب منت بھی یاد نہیں تھی کہ وہ کس منت پر کہاں اور کیوں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔

''آصفہ! کل جو کچھ آپ نے کہا، وہ سچ تھا؟'' بہت دیر سے رُکی ہوئی بات اُن کے ہونٹوں پر پھسل آئی تھی۔

آصفہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ طبیعت کی خرابی پر وہ یہی سمجھی تھیں کہ شاید ہی بچ سکیں، سو اُنہوں نے ایک سچ کا اقرار کر لیا تھا۔ لیکن اب یہ شخص، جو سامنے بیٹھا تھا، اُس نے جتنی محبت سے ان کا ہاتھ تھام رکھا تھا، اگر وہ کہتیں ہاں، وہ سب سچ تھا تو وہ اس کی نفرت سہہ سکیں گی؟ خود ان کی بیٹی ان کی موت پر رونے کے بجائے ان کی نفرت میں جل بھن جائے گی۔ شاید اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگے گی۔

"آصفہ! تم نے کل جو کچھ کہا تھا، کہہ دو، وہ جھوٹ تھا۔ تم صرف مجھے میرے دکھ سے آزاد کروانے کے لئے جھوٹ بول رہی تھیں ناں؟ تمہیں لگا تھا، تم کل مر جاؤ گی تو میں کیسے دو دو موتوں کا بوجھ اٹھا کر جی سکوں گا؟ میں خود سے نفرت میں کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لوں۔ تم یہی چاہتی تھیں ناں، میں عطیہ کے غم کو کسی سمندر میں بہا دوں؟ اُس کی بے وفائی کا غم بھول جاؤں اور پھر سے جینے لگوں؟ تم یہی چاہتی تھیں ناں کہ میں نے جو اپنے گرد ایک تنہائی کا صحرا کھینچ لیا ہے، وہاں سے کسی تمنا کی شدید پیاس سے رگڑ کھاتی ایڑیاں کوئی چشمہ پھوٹ بہائیں، تم یہی چاہتی تھیں ناں، میں پھر سے جینے لگوں؟"

آصفہ ارسلان راشدی نے اُنہیں دیکھا اور ایک قیمتی سی تمنا نے اُن کے سچ کا گلا گھونٹ دیا۔ انہوں نے ان کے ہاتھ پر اپنے لمس کا جگنو رکھ دیا تھا، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔

"میں صرف آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں...... میں چاہتی ہوں، آپ پھر سے پہلے کی طرح جئیں۔ آپ، جن کا آئی کیو لیول ہنڈرڈ پرسنٹ تھا، لوگ آپ کی گفتگو سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے، میں چاہتی ہوں، آپ شافعہ کا ساتھ دیں۔ وہ بچی دن رات محنت کر کر کے تھک گئی ہے۔ ارسلان! آپ کی پینٹنگز اتنا نہیں کما پائیں کہ شافعہ سکون کا گہرا سانس لے سکے۔ آپ کو پتہ ہے، تین دن سے وہ مسلسل جاگ رہی ہے۔ اُس کی آنکھیں جاگ جاگ کر سرخ انگارہ بن گئی ہیں، مگر وہ پھر بھی ڈیوٹی دے رہی ہے۔ ارسلان! یہ وہ زندگی نہیں، جو میں نے اُس کے لئے سوچی تھی۔

ارسلان راشدی نے اُن کی طرف دیکھا تھا، وہ کچھ نہیں بولے تھے مگر اُمید کا قیدی آزاد ہوا تھا۔ آج اُنہوں نے اپنے کمرے کی نئے سرے سے صفائی ستھرائی کی تھی، پرانے کاغذات نکال کر اُنہوں نے اُنہیں ترتیب دیا تھا اور دوپہر کو جب شافعہ گھر آئی تھی تو انہوں نے اسے سیدھا اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔

شافعہ نے حیرت سے ارسلان راشدی کو اور کمرے کو دیکھا تھا۔ آج وہ ڈھنگ کے حلیے میں تھے، کسی خوبرو فلمی ہیرو کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ آج بھی اُن کے چہرے کا جمال ایسا تھا کہ ہزاروں دل رُک جاتے ہوں۔ تبھی، عطیہ چاچی صحیح تو دل ہاری تھیں۔ عطیہ چاچی، آج تک اُس نے اس گھر میں اُن کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی، صرف بچپن میں ذکر سنا تھا، جب اماں اُن کے نام لئے جانے پر جل بلا کر اُن کے لئے نفرت انگیز گفتگو کرتیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرائے۔

وہ اُن کے بستر پر بیٹھ گئی۔ "بابا!...... بابا!...... آپ تو آج پہچانے ہی نہیں جا رہے۔"

ارسلان راشدی نے اُس کا چہرہ دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولے۔ "میں تو پھر بھی پہچانا جا رہا ہوں، لیکن شافعہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے، چند دنوں میں تم میں بہت چینج آیا ہے۔ تمہارا رنگ کتنا جل گیا ہے اور

تمہاری یہ آنکھیں، یہ کیوں سوج رہی ہیں؟ کیا روتی رہی ہو؟"
"نہیں تو بابا! آپ کو وہم ہوا ہے۔" اُس نے نظریں چرالیں۔ مگر ارسلان راشدی مصر رہے تو اُس نے اُنہیں عارف جواد کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔
ارسلان راشدی کے چہرے پر کرب آ گیا تھا۔ پھر اُنہوں نے سر جھکا کر کہا تھا۔ "اگر آج میں منسٹری میں کسی اچھے عہدے پر ہوتا تو شاید یہ فیصلہ کبھی نہیں لیتا۔ محبت...... محبت ہمیشہ دولت کے پیچھے بھاگ کر کیوں رُسوا ہوتی ہے؟ رُسوا کرتی ہے۔ وہ عطیہ...... اُسے بھی صبر نہیں تھا۔ اُس نے بھی محبت اور دولت میں سے دولت کو چن لیا تھا۔ اور یہ عارف...... مجھے تو نفرت ہے محبت سے۔ میں...... میں دکھاؤں گا اس محبت کو، میں آج بھی دولت کما سکتا ہوں۔ محبت نے میرا انتظار نہیں کیا، لیکن میں اسے اپنا انتظار کرنا سکھاؤں گا۔"
"عطیہ چاچی...... بابا! آپ کو پتہ ہے، عطیہ چاچی کہاں ہوں گی؟" اُس نے اُن کا ہاتھ تھام لیا اور وہ نفرت انگیز لہجے میں بولے۔
"ہو گی کہیں اپنے محبوب کے پاس۔ دولت والوں سے پیار کرنے والوں اور حُسن سے پیار کرنے والوں کو کوئی ایک ٹھکانہ ہوتا ہے کہیں؟ یہ محبت تھوڑی ہے جو ایک ہی در پر پڑے پڑے راہ کا پتھر ہو جائے؟"
اُن کی نفرت سے کمرہ جلنے لگا تھا اور باہر دیوار سے ہاتھ ٹکائے کھڑی آصفہ ارسلان راشدی تھیں۔ اُن کے اندر ایک یاد چکراتی پھر رہی تھی۔
"پلیز آصفہ بھابی! ایک بار ارسلان کو بتا تو دیجیے کہ عطیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ عطیہ کا بیٹا میں اُسے سونپنا چاہتی ہوں۔ پلیز! ایک بار مجھے اُس سے ملنے تو دیجیے۔ وہ جتنا بھی خفا سہی، لیکن عطیہ کی موت کی اطلاع اُسے موم کر دے گی۔ اُس کی اولاد پر صرف اُس کا حق ہے آصفہ بھابی! پلیز......"
اور عورت سے اُنہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا، پھر سرد لہجے میں بولی تھیں۔ "رکھ لیجیے عطیہ کی اولاد کو اپنے پاس۔ ہمیں نہیں چاہیے اُس کی اولاد۔ دفنا دیجیے آپ ہی اُسے۔ ہمارے لیے وہ چھ مہینے پہلے مر چکی تھی۔"
"بھابی! یہ ظلم مت کریں، عطیہ بے قصور ہیں، وہ آج بھی ارسلان کا نام لیتے لیتے دنیا سے گئی ہیں۔ پلیز بھابی! آپ تو عورت ہیں، اتنی پتھر دل تو مت بنیں۔"
مگر اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُنہیں اس وقت اپنے آپ آنے والی اولاد کا بھلا سوچنا تھا۔ وہ نبیل راشدی کی بیوی تھیں مگر اُن کی اچانک حادثے میں ہو جانے والی موت نے اُن کے لالچ کو مہمیز دی تھی۔ تین برس سے وہ اولاد کو ترس رہی تھیں اور اب یہ خوشی اُن کی جھولی میں ڈالی گئی تھی تو اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ عطیہ بانو ایک سال پہلے ارسلان راشدی کی زندگی میں آئی تھیں۔ پہلے ارسلان راشدی اپنی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ اُن پر اور اپنے بھائی پر لٹا دیتا تھا، لیکن بیوی کے آنے سے اُن کی توجہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ پھر اُن کی ماں نے اُنہیں ورغلانا شروع کر دیا تھا کہ اگر بیوی کے آنے سے وہ ایسا بدل

گیا ہے تو اولاد ہونے پر تو وہ ان کے ہاتھ سے بالکل ہی نکل جائے گا۔ پھر اُن کی اولاد کا مستقبل کتنا تاریک ہو جائے گا۔ دیکھ لو، ابھی سے وہ تمہیں چھوڑ کر منسٹر سے ملنے والے بنگلے میں شفٹ ہو گیا ہے اور تم ابھی تک دو کمرے کے گھر میں پڑی سڑ رہی ہو۔

اور بس پھر اُٹھتے بیٹھتے اُن کو یہی پیراگ ہو گیا تھا۔ اُن کے شوہر اُنہیں قناعت، صبر کی تلقین کرتے، جتنا مل جائے، اُس پر شکر کرنے اور اپنے سے بہتر حالات میں جینے والوں سے حسد کرنے سے روکتے تھے، مگر اُنہیں یہی فکر کھائے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے رو دھو کر اپنے دل کی بات ارسلان راشدی تک پہنچا ہی دی تھی۔

"خدا اچھا وقت دکھائے تو برے حالات میں ساتھ دینے والوں کو بھلانا نہیں چاہیے۔"

ارسلان راشدی اس جملے میں چھپے پیغام کو سمجھ گئے تھے۔ سو گھر کو کرائے پر اٹھا کر وہ زبردستی بھائی اور بھاوج کو لئے اپنے بنگلے میں آ گئے۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی کہ انہیں اس میں بھی خامی نظر آنے لگی۔ وہ پورا ہولڈ چاہتی تھیں گھر پر۔ اُن کا خیال تھا، عطیہ کو بھی ریموٹ کرنے کا اختیار ان کے پاس ہونا چاہیے۔ خود عطیہ بھی نرم طبیعت کی مالک تھیں، اس لئے اُن کی اس بچگانہ ضد کو بھی بھی مان لیتی تھیں۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے فیصلوں کے لئے وہ اُن سے رائے لیتیں مگر آصفہ کو لگتا، یہ سب ان کا ڈھونگ ہے۔ یوں دھیرے دھیرے کھنچاؤ بڑھنے لگا۔ سہیل راشدی نے آصفہ کو اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ جس راستے پر چل رہی تھیں، اُس میں توازن برقرار رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی شکایتوں سے گھر میں بڑی بڑی لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہی بات سہیل راشدی کو اندر ہی اندر کھا گئی تھی۔ سو ایک دن کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ حادثاتی طور پر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زندگی نے بالکل اپوزٹ یوٹرن لیا اور پھر عطیہ بانو بھی اُن کی زندگی سے نکل گئیں۔

"اماں! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ دیکھئے تو آپ کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ آپ کو سخت آرام کی ضرورت ہے۔"

کہیں قریب سے شافعہ کی آواز پر وہ چونکیں۔ سارا ماضی دھڑ دھڑ کرتا اُن پر آ گرا۔ ریت، مٹی اُڑ اُڑ کر اُن کی سانس کی نالی میں اٹکنے ہونے لگی۔ اُن پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ فوری طور پر انہیں ہسپتال لے کر بھاگی تھی۔ ارسلان راشدی آج پہلی بار اُس کے ساتھ تھے۔ شافعہ کو لگ رہا تھا، وہ اس کمزوری میں جیسے نئے سرے سے اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی ہوں۔ انحصار پسندی چاہے جتنی بھی بری شے ہو، تکلیف اور دکھ میں اگر کوئی ہو، جو آپ کی پشت پر آپ کی ڈھارس کی طرح آ کھڑا ہو تو زندگی سے جنگ لڑنا اور جیت جانا جیسے بہت آسان کام لگتا ہے۔



عطیہ کے حالیہ دُکھ کے باوجود ایک ماں کی حیثیت سے عافیہ بیگم انوشے کی شادی کی خریداری کے لئے نکلی تھیں اور بہت غیر متوقع انہیں وہ چہرہ نظر آ گیا، جس سے پہلی بار ملنے کے بعد بھی دل نے کہا تھا کہ وہ اس چہرے کو شاید بہت پہلے سے جانتی ہیں۔ اور اکثر پبلک پلیس پر جسے دیکھ کر دل نے اکثر اُس سے مل بیٹھنے کی ہمک بھری تھی اور کافی دفعہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس چہرے سے مل بیٹھی بھی تھیں۔ لیکن آج دل کے ملنے میں الگ ضد تھی۔

''ہیلو جاناں......!'' بیگم عافیہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور جانانہ نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

''ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟'' خیر سگالی دکھانے کی کوشش کی۔ مگر جب معاملہ برائیڈل شاپنگ کا آیا تو وہ اچنبھے میں آ گئی۔

''کسی برائیڈ کی شاپنگ میں کروں میم! یہ بہتر نہیں ہے۔''

''کیوں بہتر نہیں ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ وہ ٹالنے لگی، پھر اصرار بڑھا تو اُس نے انہیں اپنی ناکام شادی کی بابت بتا کر یقیناً چونکانے اور باز رکھنے کی کوشش۔ اُس کا خیال تھا، وہ ماں ہیں اس لئے عمومی وہم کی وجہ سے وہ اُس سے کیا جانے والا یہ اصرار چھوڑ دیں گی۔ وہ یہاں بے مصرف نہیں گھوم رہی تھی، بلکہ وہ یہاں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اُس کی کسی کے ساتھ کمپنی دینے کی ڈیل طے پائی تھی۔ تین گھنٹے کے پچاس ہزار بظاہر اس جیسی لڑکی کے لئے بہت کم تھے، لیکن وہ آج کل اپنے ہر لمحے کو کیش کر لینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا، وہ بہت جلد اور تیزی سے واپسی کی سیڑھیوں کا سفر طے کرنے والی ہے اور واپسی کا سفر بہت تھکا دینے والا، ہانپ جانے والا سفر تھا۔ وہ کل کے لئے کچھ جوڑ لینا چاہتی تھی، مگر یہ خاتون......

''تم......مجھے نہیں معلوم تھا تم جاہل عورتوں کی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہو۔ مجھے اس پر یقین نہیں۔ پھر ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے بھی سختی سے منع فرمایا ہے کہ اچھے اور برے شگن لینا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ اور میرا ماننا ہے، اچھا یا برا جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔''

جانانہ نے کندھے ڈال دیئے، پھر وقت بدلنے کا اُس نے مطلوبہ نمبر پر میسج کر دیا تھا۔ اب وہ مارے بندھے اُن کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ شیرازی کے بعد سے اُسے شادی اور اُس کے تذکرے سے بھی ہیڈک ہو جاتی تھی، مگر عافیہ بیگم یہاں پر ہر فیصلہ اُس کی پسند و ناپسند سے لے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب وہ شاپنگ کے بعد آئس کریم پارلر میں داخل ہوئیں تو بہت مسکرا کر بولی تھیں۔

''بہت حیرت انگیز، جانانہ بیٹا! تمہاری اور میری پسند میں مائنس صفر برابر بھی ٹکراؤ نہیں ہے۔ تم نے اسی چیز پر ہاتھ رکھا جو مجھے بھی پسند تھی۔'' لمحہ بھر کو رکیں، پھر مسکرا کر بولیں۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا بیٹا! میں

دُور دُور سے ملنے کے بجائے آپ سے اکثر اور بہت قریب ہو کر مل سکوں؟ میں تمہیں اپنے گھر بلوانا چاہتی ہوں۔“

جانانہ نے بےزاری سے اُنہیں دیکھا۔ وہ اُسے پتہ نہیں کیا سمجھ رہی تھیں۔ ان جیسے شریف گھرانے کے لوگ اس جیسی کسی لڑکی کا سایہ بھی اپنے گھر پر پڑنے دینا گناہ سمجھتے تھے اور وہ اُسے اپنی بیٹیوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔ وہ غلط فہمی میں تھیں اور اسے یہ غلط فہمی دور کر دینا ضروری تھی کیونکہ شیرازی سے محبت میں فریب کھانے کے بعد اُس نے دکھ فریب، پریشانی، یہ سب مردوں کی جھولی میں ڈالنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ روتی ہوئی آنکھ رونا بھول کر ہنسنے لگے تو پھر وہ ہنسی کسی پاگل پن کو جا کر چھو لے، کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

”آپ اتنا چپ کیوں ہیں بیٹا؟ میں نے آپ سے ایک اجازت مانگی ہے۔“

جانانہ نے اُن کی طرف دیکھا، پھر گلا کھنکھار کے بولی۔ ”مسز سلیم افسر! شاید آپ میرے بارے میں اتنا نہیں جانتیں، جتنا رشتے قائم کرنے کے لئے جاننا ضروری ہے۔ سو مجھے کہنے دیجئے، کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے آپ کو پتہ ہونا چاہئے، میں کسی عام شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی۔ شرفاء بھی مجھ سے صرف رات کی تنہائی میں ملنا پسند کرتے ہیں۔ آپ اب سمجھ گئی ہوں گی۔ میں آپ کے گھر آنے کے قابل نہیں ہوں۔“

بیگم عافیہ سکتے کی کیفیت میں منہ تکنے لگیں۔ اُن کا خیال تھا، وہ کسی بہت ویل آف گھر کی لڑکی ہوگی، مگر جانانہ اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو آئس کریم کپ ہاتھ سے پرے کر کے اُٹھ گئی۔ پھر وہ قدم اُٹھانے والی تھی، جب بیگم عافیہ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم مجھے غلط مت سمجھو جانانہ! میں سطحی سوچ رکھنے والی عورت نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے، یہ زندگی کوئی بھی خوشی سے نہیں اپناتا۔“

”لیکن اگر میں کہوں، میں یہ زندگی خوشی سے اپنائے ہوئے ہوں؟ اگر میں یہ کہوں کہ دن کی روشنی میں ویل آف فیملیز کے لوگوں کی آنکھوں میں مجھے اپنے قریب دیکھ کر جو خوف دکھائی دینے لگتا ہے، مجھے اُس خوف سے عشق ہے تو آپ کیا کہیں گی؟“

بیگم عافیہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ ”میں تب بھی یہی کہوں گی، یہ دل کے معاملے ہیں۔ اور دل بہت کم دماغ کی مانتا ہے، جان! مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنا اور باتیں کرنے میں جو خوشی ملی ہے، تسکین ملی ہے، اتنی شاید زندگی کے کسی لمحے نے نہیں چرائی۔“

جانا نہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی، پھر تھم کر بولی۔ ”میم! آپ تو شاعری کرنے لگی ہیں۔“

بیگم حافیہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اُسے اپنے گھر کا پتہ دے کر اور آنے کا اصرار کر کے وہ اُٹھ گئی تھیں۔

اُن کے جانے کے بعد جانا نہ نے اُن کی پشت کو دیکھا تھا۔ یکدم اُسے لگا تھا، اندر سے کہیں شیرازی سے ملنے والی جانا نہ نے اس محبت سے ادھار لے کر سانس بھری تھی۔

'یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟...... مجھے عام عورتوں کی طرح بھی نہیں سوچنا۔ مجھے محبت سے نفرت ہے تو جہ میری نظر میں پیسے سے خریدی جانے والی جنسِ بے مایہ ہے، اور کچھ نہیں۔'

اُس نے دل میں یہ جملہ بار بار دوہرایا مگر اندر سے ایک عجیب طرح کی بغاوت تھی، جو لڈے چلی آرہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، آج کل سطوت جہاں بھی اس پر توجہ نہیں دے رہی تھیں، وگر نہ جب وہ دنیا سے فیڈ اپ ہو کر ان کی گود میں سر رکھتی تو ساری تھکن، سارا احساس بے چارگی اپنی موت آپ مر جاتا، مگر سطوت جہاں کی سرد مزاجی کچھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ اُس نے دل میں سوچا اور اُٹھ گئی۔ مگر اس وقت اُس کی گاڑی کا رُخ گھر کی طرف تھا، نہ ہی اُس نئے اپارٹ کی طرف جہاں اُس نے میسج کر کے گرویزی کو بلایا تھا۔ وہ اس وقت پروگرام کینسل کر کے میسج کر کے ہاسپٹل جا رہی تھی۔

آج کل اُس کا وقت زلفی مائی کے پاس گزرتا تھا۔

زلفی مائی کسی زمانے میں بہت اچھا گایا کرتی تھی۔ پھر نئے لوگوں کے آنے سے زلفی مائی کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا۔ پھر وہ صرف رسوئی گھر تک محدود ہو گئی تھیں اور اتنے عرصے بعد لفظوں اور تنہائی کا دھواں بھرتے بھرتے اس مقام پر آ کھڑی ہوئی تھی کہ ڈاکٹروں نے اُسے ٹی بی ڈکلیئر کر دی تھی۔

جانا نہ کا زیادہ بچپن زلفی مائی کے ساتھ گزرا تھا، اس لئے اُس کا اُنس اتنی خطرناک بیماری کے باوجود قدم موڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اُس نے گاڑی پارک کی تھی، پھر زلفی مائی کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تھی۔ غفورا کمرے میں نہیں تھا۔ وہ خود اس موذی بیماری سے بچنا چاہتا تھا، اس لئے زیادہ تر کمرے سے باہر رہتا تھا۔ زلفی مائی ڈاکٹرز اور نرسز کے رحم و کرم پر رہتی تھی۔ غفورا کمرے میں صرف اس وقت ہوتا تھا، جب جانا نہ اُس سے ملنے آتی تھی۔ لیکن اس وقت حیرت انگیز طور پر وہ اُسے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے زلفی؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

زلفی مائی نے اُسے دیکھا، پھر ہنس کے بولی۔ ”آج جی کھول کے باتیں کریں گے۔ غفورے کو میں نے فون کر کے گھر بلایا ہے۔ کوئی خاص بات ہوگی شاید۔“

جانا نہ نے تحیر سے اُسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا زلفی! میرے دل میں کیا چل رہا ہے؟“
زلفی مائی نے لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا، پھر مسکرا کر بولی۔ ”عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔ آنکھوں کے ان کہے بول، دل کے ثمر، ہاتھوں کی زبان، سب جانتی ہوں، سب جانتی تھی، پر اب تو لگتا ہے، بالکل کوڑ ہو گئی ہوں، کوڑ مجھتی ہے ناں، کچرا، بالکل ختم۔
جانا نہ نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، پھر ہمدردی و ترحم سے بولی۔ ”تم دل چھوٹا مت کیا کرو زلفی! تم اب بھی کوئی کمتر شے نہیں ہو۔ بہت عزت ہے تمہاری میرے دل میں۔ بس کچھ مصروفیت ہوتی ہے، وگرنہ میں روز تم سے ملنے آؤں۔“
زلفی مائی نے اُسے دیکھا اور فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھ سے ملنے میں کیا رکھا ہے؟ وقت ملے تو آپ اپنے سے کسی دن مل لے، زندگی سنور جائے گی تیری۔“ لمبا سانس لیا، پھر دوبارہ بولی۔ ”تو اس جوگی میں نہیں ہوے جانے، تیری دنیا اور ہے، تو اپنی دنیا ڈھونڈ۔ کیوں ہم رزیلوں میں پڑی ہوئی ہے؟“
جانا نہ اُسے دیکھنے لگی، پھر اُداسی سے بولی۔ ”میں نہیں جانتی، وہ کیسی عورت تھی اور کیسی نہیں۔ پر مجھے یہ پتہ ہے، میری ماں کی زندگی، اور اس کے بعد میری ماں وہی ہے جس نے مجھے پالا۔ اس نے کبھی مجھے میری ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کوئی اور کرتا ہے کسی اور کے بچے کی چاکری جیسی ماں نے کی؟“
زلفی مائی نے اُسے دیکھا، پھر کہا۔ ”تو اگر لڑکا ہوتی تو میں دیکھتی، کون کرتا تیری چاکری؟ ہماری دنیا میں صرف بیٹیوں کی چاکری کی جاتی ہے۔ کیونکہ بیٹی ہمارا منافع ہوتی ہے، جس پر ہم کچھ لگاتے ہیں تو کچھ کماتے بھی ہیں۔ یہ محبت نہیں ہے، لالچ ہے۔ جانے، کبھی تو نے نہیں سوچا، محبت اور لالچ کو الگ الگ کر کے دیکھے۔“
جانا نہ نے زلفی مائی کو دیکھا، پھر خفگی سے بولی۔
”مت کیا کر زلفی! مجھ سے ایسی اوکھی اوکھی باتیں، جن پر میں سوچنے لگ جاؤں۔ مجھے جینے دے وہی زندگی جو میں جینا چاہتی ہوں۔“
مائی زلفی نے اُسے دیکھا، پھر کہا۔ ”کبھی تیرا دل نہیں چاہا، تو شیرازی سے ایک باری اور ملتی؟ کبھی تیرا دل نہیں چاہتا، تو جانتی کہ تیرا ہونے والا بچہ، بیٹا تھا یا بیٹی؟“
جانا نہ کسی گہری پاتال میں اُتر گئی۔ محبت تخلیق کی طرح کا جاں گسل عمل ہے اور وہ کبھی اس محبت کے پاتال میں اتری تھی، مگر یوں ہوا، محبت اُس کی مٹھی سے نکلی، کہیں اندر ہی کھو گئی اور وہ خالی ہاتھ لہروں سے

ٹکراتی، مرتی، زندگی میں موت کو جیتتی باہر آ گئی۔ ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ شیرازی اُسے چھوڑ کے جا چکا تھا اور اُس کی محبت کا احساس دنیا میں آنے کے کچھ گھنٹوں بعد ہی واپس محبت کے نگر لوٹ گیا تھا۔ وہ تو اپنی اولاد کو نام تک نہیں دے سکی تھی کہ کبھی دل چاہتا تھا، اُسے کسی اچھے نام سے پکار کر یاد ہی کر لیتی، اُس کی برسی مناتی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اور آج اتنے سال بعد وہ اسی دُکھ میں سمٹ آئی تھی۔ زلفی مائی نے اچھا نہیں کیا تھا۔

اُس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اور زلفی مائی نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ ”تجھے پتہ نہیں، یہ خبر خوشی دے گی یا دُکھ، لیکن میں آج تجھے بتا رہی ہوں، نشلی نے مجھے جو بچہ گود میں دیا تھا، وہ بچہ مُردہ نہیں تھا۔ وہ بچہ زندہ تھا۔ وہ تیرے شیرازی کا بیٹا تھا۔ پر نشلی نہیں چاہتی تھی کہ تیرے اندر کوئی ماں ہمک بھرے۔ تجھے نہیں پتہ، لیکن ہمارے طرز کی دنیاؤں میں وروشنیں یا تو اللہ سائیں سے لو لگا کر ہاتھ کام سے جاتی ہیں یا ماں بننے کے بعد ماں بن کر سوچنے سے۔ اور نشلی نہیں چاہتی تھی تُو اس دنیا، اس راج پاٹ کو ایک بچے کے لئے چھوڑ دے۔ وہ بچہ، جس کے باپ کی محبت نے اُس کے سامنے سر اُٹھایا تھا، ہماری گلیوں کے لڑکے شادی بیاہ کے بندھن کے لئے نہیں ہوتے، وہ صرف گاہک گیری کے لئے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں، کیسے شیرازی میں عزت کی زندگی جینے کی ہوس پڑ گئی؟ پتہ نہیں، کیسے وہ تیرا دیوانہ ہو گیا، تجھ پر مرمٹا؟“

”بس کرو زلفی! تم نہیں جانتیں، تم میرے کتنے زخموں کو پھر سے اُدھیڑ رہی ہو۔ اب مجھے کیا لینا، شیرازی کیسے ملا، کیوں ملا؟ مجھے تو یہ یاد ہے، وہ مجھ سے بچھڑ گیا، بے وفا انسان.....“

لفظ سسکی کی طرح اُس کے ہونٹوں سے نکلے مگر اُس نے فوراً ہی اپنے تاثرات پر کنٹرول کر لیا تھا اور اسی بے پروائی سے بولی تھی، یوں جیسے جذباتی کمزوری لمحوں سے نکل کر کوئی سچ سے دوبدو کرے۔ اُس نے زلفی کو دیکھا تھا، پھر نفرت سے بولی تھی۔ ”زلفی! اب مجھے اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ شیرازی کے ساتھ میں نے جینے کے کیا خواب دیکھے تھے، میری زندگی کی ایک سمت متعین ہے اور مجھے اسی ٹریک پر دوڑنا ہے۔ بھلے یہ راستہ بند گلی کو جائے یا کسی تاریک گلی کی گمنام موت بن کر میرا استقبال کرے، مجھے ایسے ہی جینا ہے۔ مجھے اب اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ شیرازی کی اولاد زندہ تھی، مری نہیں۔ سچ پوچھو تو اس کی بے وفائی کے غم سے میں سنبھلتی تو اس زندہ بچے کو میں خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتی۔ مجھے کسی چیز سے اب فرق نہیں پڑنے والا۔“ لمحے بھر کو وہ رُکی، پھر اپنے بیگ سے نوٹ نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ کر بولی۔ ”اپنا خیال رکھنا۔ مجھے واقعی تمہاری محبت کی قدر ہے۔ ورنہ کون کرتا ہے آج کے زمانے میں بے مطلب کی محبت۔ تم واقعی عظیم عورت ہو۔ بہت زیادہ۔“

اُس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ اُٹھ گئی تھی، مگر ہر قدم پر ایک سوال خود بخود اُٹھ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ شیرازی کی بے وفائی کے غم میں شیرازی کے بچے کا گلا گھونٹ دیتی؟ اگر ایسا ہوتا تو اُس نے اس بچے کو دنیا میں لانے

کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ کیا اُس کے اندر ماں زندہ تھی، جسے واقعی سطوت جہاں نے مار دیا تھا؟ کیا واقعی اُس کے اندر ماں اور ممتا بھری عورت مر گئی تھی؟...... لیکن اگر ایسا ہوتا تو روز رات کو اُس کا تکیہ کیوں بھیگتا رہتا تھا؟ وہ دنیا کے لئے ظالم تھی یا صرف دکھائی دینے کی کوشش کرتی تھی؟

بہت سارے سوالوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ پھر یہ گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا چلا گیا اور اُس نے گھر آ کر اپنے کمرے میں یوں گہرے گہرے سانس لئے، جیسے آکسیجن یکدم ہوا سے کسی نے چرالی ہو۔

"میرا بچہ...... وہ زندہ ہے؟...... وہ سانس لیتا ہوا، بولتا ہوا بچہ تھا اور ماں نے کہا، وہ مُردہ پیدا ہوا تھا۔ میرا دل اُس کی کتنی برسیاں منا چکا ہے...... کتنی ساری؟ اب...... اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہوگا ناں۔ پتہ نہیں کس پر گیا ہوگا، مجھ پر یا شیرازی پر؟ شیرازی کہتا تھا، میرا من کرتا ہے، میری جو بھی اولاد ہو، وہ تم پر جائے تمہارے دل کی طرح خوب صورت ہو، بھلے رُوپ میں کم تر کیوں نہ ہو۔"

"شیرازی......!" اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔

پھر اُس نے دروازہ کھولا تھا اور سطوت جہاں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"اماں! تم نے مجھ سے آج تک جھوٹ کیوں بولا؟"

سطوت جہاں نے حیرت سے اُس کے لہجے کی کاٹ کو سنا، پھر اسے چمکار کر بولیں۔

"ماں صدقے، یہ کیا حال بنالیا ہے؟ تیری آنکھیں رونے کے لئے تھوڑی ہیں جانے! اِدھر آ، ماں کی بانہوں میں آ۔" انہوں نے بازو پھیلا لئے۔ مگر جانا نہ دور کھڑی رہی تھی۔ پھر سرسرائے لہجے میں بولی تھی۔

"ماں! میرا بچہ زندہ تھا ناں؟"

سطوت جہاں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، مانو ایک عالم نے تھو تھو کر دیا ہو۔ وہ چپ کھڑی رہی تھیں، پھر انہوں نے کہا تھا۔

"یہ سب ماس بیبی زلفی نے کہا ہوگا تجھ سے...... اِدھر دیکھ جانے! او تو بیماری سے پگلا گئی ہے۔ تُو اُس کی باتوں میں کیوں آ رہی ہے؟ ویسے ہی مرنے سے پہلے مُردہ لوگ، زندہ نظر آنے لگتے ہیں۔"

جانا نہ انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی، مگر اُس کی آنکھوں کا شک دُور نہیں ہوا تھا تب سطوت جہاں نے ہنکارا بھر کر کہا تھا۔

"ہاں، تیرا بچہ زندہ ہوا تھا، پھر...... میں نے کیا کرنا تھا بیٹے کا؟ بیٹی جنی ہوتی تو پھولوں کی طرح رکھتی میں۔ مجھے کوئی دوسرا شیرازی تھوڑی پیدا کرنا تھا اپنی حیاتی کے لئے؟ ناس مارا تیرا دل جیتا پر پھر بھی دغا کر گیا

تجھ سے۔ دیکھ، کیسی تیری محبت رولی ہے اُس نے پیروں میں۔ پھر باپ کا رنگ نہ ہوتا اُس میں تو کیا ہوتا؟ جس کے باپ سے وفا نہیں، اُس کی اولاد سے کیا وفا ہوتی؟ میں نے تو تیرا بھلا ہی چاہا تھا۔"
جانانہ خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اُس نے الماری کھولی تھی، پھر ایک بکس اُٹھا کر وہ بیڈ پر آ کر بیٹھی تھی۔ پتہ نہیں، یہ چیزیں تھیں کہ کسی کا دل۔ وہ ایک کے بعد ایک شے نکالتی چلی گئی۔
پازیب، کنگن، خوب صورت آرٹی فیشل نگوں والا سیٹ.......
اُس نے بکس کے اندر دیکھا، ایک گلاب کا پھول بھی تھا۔
"تمہارے نام جانِ جاں' جب میرا دل تجھ سے محبت کرنا بند ہو گا ناں، تو اس گلاب کی خوشبو آپ ہی آپ مر جائے گی۔"
اُس نے مرجھائے ہوئے پھول کو ناک سے لگا کر سونگھا، مہک ابھی تک بسی ہوئی تھی اردگرد۔ لگتا تھا، شیرازی، شیرازی کی کوئی مالا جپ رہا تھا۔ غور کیا تو یہ تو اُس کا اپنا دل تھا۔
تو کیا شیرازی ابھی تک اُس کے دل سے نہیں نکلا تھا؟

ستارے جو چمکتے ہیں
کسی کی چشمِ حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمالِ ابر و باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہو گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد ہو گی

گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ اُن کی یاد میں ہوگی
جانا ثمہ نے کبھی کا دیا ہوا کارڈ کھولا، پڑھا اور پھر رونے لگی۔
''مجھے نہیں رونا ہے۔ اس محبت کے لئے تو بالکل نہیں جس کے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے۔ یہ محبت کرنے والوں کو کبھی شانتی نہیں کرتی۔ اس کے ہاتھوں میں ہمیشہ انگارے ہوتے ہیں۔ دل جانتا ہے، پھر بھی یہ سارے انگارے دامن میں بھر لیتا ہے۔ پھر جہاں دل جلا، وہاں وجود راکھ ہوا۔ کسے خبر، کون آہ کرے، کون دہائی دے۔ یہ محبت بہت ظالم ہے۔ شیرازی کی محبت بہت ظالم ہے۔
اُس نے ساری چیزیں اُٹھا کر رکھ دیں۔ مگر مرجھایا ہوا گلاب کا پھول اُس کے نازک مخملیں ہاتھوں میں تھا۔
''اس میں سے جب تک خوشبو آئے......'' کوئی کہیں قریب کھڑا کہے جا رہا تھا اور وہ خوشبو کہیں گم ہوتی جا رہی تھی۔
پتہ نہیں، خوشبو اُس مرجھائے ہوئے پھول میں تھی یا اُس کے مرجھائے ہوئے دل میں؟ یکبارگی سانس لے اُٹھی تھی۔ مگر یہ تھا، آج وہ بھولے بھٹکے اپنے آپ سے ملی۔ پتہ نہیں، یہ اپنے آپ سے ملنا اُس کے لئے نیک استعارہ تھا یا نہیں؟ لیکن یہ طے تھا، محبت اُس کی کہانی کو ٹھیک سمت موڑ کر بہت خوش تھی۔
سالار عبدالرحمٰن کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی۔
کیا وہ زندہ ہیں......؟ پہلا احساس چونکا دینے والا تھا۔
سینے کا درد پھر سے یاد آ گیا تھا۔ اُنہوں نے پہلے دائیں دیکھا، پھر بائیں طرف جا کر اُن کی نظر ٹھہر ہی گئی تھی۔ شہریار عبدالرحمٰن کرسی پر بہت آرام سے سو رہا تھا۔ نیند اتنی گہری تھی اُس کی کہ اُن کے ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل پر دھرا ہوا گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا، مگر وہ پھر بھی نہیں جاگا تھا۔
اُنہیں اچانک دفتر کا منظر یاد آ گیا تھا۔ پھر کار ڈرائیو کرتے ہوئے اُس کے مشورے، اس تکلیف میں وہ اُنہیں دنیا کا سب سے اچھا انسان لگا تھا، جس نے ذاتی عناد کو پرے رکھ کر اُن کی زندگی بچانے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اب اُن کی نظر سائیڈ ریک پر رکھی دواؤں اور منرل واٹر کی بوتل پر جا کر اٹک گئی تھی۔

تو ان کا معاملہ اس حد تک خراب ہو گیا ہے؟'

اُنہیں حیرت ہونے لگی تھی، اتنی سخت خراب حالت میں بھی شہریار کے علاوہ کوئی اٹینڈ نہیں تھا۔ نہ اُنہیں عموی طور پر دی جانے والی طبی امداد کا کہیں شائبہ تھا۔ انکل صمدانی کا کلینک بالکل اچھا نہیں تھا، انہیں کارڈیو ویسکولر جا کر نئے سرے سے چیک اپ کروانا چاہئے۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے ناپسندیدہ انسان کو نیند سے جگانے کی کوشش کی تھی۔ پھر تیسری کوشش پر کہیں جا کر وہ کامیاب ہوئے تھے۔ شہریار نے مندی مندی، خون رنگ آنکھوں سے اُنہیں دیکھا تھا۔ ایک سیکنڈ اُسے ماحول سے آشنا ہونے میں لگا تھا، پھر دوسرے ہی سیکنڈ اُس نے ریک پر رکھی دوائیں اُٹھالی تھیں۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے، سنی بھائی؟''

''ٹھیک لگ رہی ہے۔ لیکن میری طبیعت کیسی ہے، یہ صرف ٹھیک ٹھیک تم ہی بتا سکتے ہو۔''

شہریار مسکرایا تھا، پھر نرمی سے اُنہیں سہارا دیتے ہوئے بولا تھا۔ ''آپ ایک دم پرفیکٹ ہیں سنی بھائی! اصمدانی انکل کہہ رہے تھے، وہ تکلیف صرف مسکولر پین کی وجہ سے ہوئی تھی۔''

''پھر یہ دوائیں؟'' مدھم سوال کیا اور اُس نے اسی نرمی سے کہا۔

''ایک دوست کا فون آیا تھا، اُس کے فادر کے لئے یہ دوائیں چاہئے تھیں، اُس نے ارجنٹ کہا تھا کہ آج تک کا کہہ دے۔ مگر کل کے لئے میں آتے ہوئے ڈرگ اسٹور سے یہ دوائیں لیتا آؤں۔''

سالار عبدالرحمن کو پتہ نہیں، کیوں لگا کہ وہ سچ نہیں بول رہا لیکن انہوں نے کوئی عذر نہیں کیا تھا۔ آہستگی سے بیڈ سے اُٹھ کر وہ ریسپشن پر آئے تھے۔ چیک آؤٹ کا واؤچر تھا۔ پے منٹ کی تھی اور شہریار کے برابر بیٹھ کر انہوں نے گھر کا سفر کیا تھا۔ ایک خوف سے ہو کر آئے تھے اور ایک انجانے خوف میں لپٹ گئے تھے۔

اگر واقعی آج وہ مر جاتے؟...... دل بار بار یہی سوال کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے ہر خوف کو جھٹک کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ چہار سُو اندھیرا چھایا تھا اور یہ اندھیرا اُنہیں اس وقت بہت غنیمت لگ رہا تھا۔ پھر جب یہ تاریکیاں چھٹیں تو گاڑی ایک جھٹکے سے رُک چکی تھی۔

گھر آ چکا تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تھا اور خود اُس نے بہت تیزی سے نکل کر اُن کی طرف کا دروازہ کھولا تھا، پھر سہارے کے لئے ہاتھ دیا تھا کہ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''اگر مر بھی رہا ہوں گا ناں، تو شاید تمہارا سہارا لینا نہیں چاہوں گا۔'' وہ کچھ لمحوں پہلے کی بات یکدم فراموش کر کے غصے سے بولے۔

اُس نے سر ہلا کر اُنہیں اپنی مرضی کرنے دی تھی۔ پھر گاڑی پارک کر کے وہ اندر آیا تو عائشہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں شیری بھائی! آپ کے لئے زندگی کتنی مشکل ہو گئی ہے، مگر اسے ہمیشہ یاد رکھئے گا، ایک بہن آپ کے لئے ہر روز بہت ساری اور بہت لمبی دعائیں مانگا کرتی ہے۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے اپنے آؤٹ ہاؤس روم کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر بستر پر ٹھیک سے لیٹا بھی نہیں تھا کہ اُس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

"ہیلو، شہریار اسپیکنگ۔ کون؟"

"شیری کے بچے! میں عاطف......"

"پلیز، میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، پھر کبھی فون کرنا۔" اُس نے تلخی سے کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کر دی اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں، پھر کب نیند آئی تھی، اُسے معلوم نہیں ہوا تھا۔

❀ ❀ ❀

بیگم عافیہ، سلیم افسر کے ساتھ لنچ میں شرکت کے بعد گھر واپس لوٹی تھیں۔ سلیم افسر وہیں سے ایک میٹنگ میں چلے گئے تھے اور وہ گھر آ گئی تھیں۔ بظاہر عطیہ بانو کا معاملہ اُن کی زندگی میں ٹھہر گیا تھا، لیکن اُن کا دل تھا کہ ہر وقت عطیہ بانو کے دکھ چھتا رہتا تھا۔ جس بہن کو وہ اب تک ڈھونڈ تی رہی تھیں، وہ اب اس دنیا میں نہیں تھی اور اُس کی بیٹی......وہ......وہ جانے کہاں ہوگی۔

بیگم عافیہ گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ علینہ نے اُنہیں بہت محبت سے تھاما تھا۔ سلیم افسر کی محبت کا عکس ہوتا تھا اُس کی چاہت میں۔

"مام! آپ سے کوئی ملنے آیا ہوا ہے۔ لیکن آپ تو مجھے بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔" علینہ نے اُنہیں غور سے دیکھا اور عطیہ بانو کے خیال سے جو آنسو اُن کی آنکھوں میں آ گئے تھے، وہ ٹشو سے صاف کئے۔

"کون آیا ہے علینہ؟"

"مام! امراؤ بتا رہا تھا، وہ آپ کی کوئی فرینڈ ہیں۔ شاید جانانہ نام بتایا تھا اُس نے۔"

"جانانہ....." اُنہوں نے نرمی سے نام لیا۔ آنسو جانانہ کی آمد کا سن کر جانے کیسے تھم گئے تھے۔ "جانانہ کو میرے روم میں بھیج دو۔ میں کچھ تھک گئی ہوں۔"

علینہ سر ہلا کر رہ گئی۔ عافیہ بیگم نے اپنے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھائے۔ پھر وہ گھر کے آرام دہ لباس میں آئی ہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ جانانہ!"
جانانہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ عافیہ بیگم نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ مگر آج اُسے سینے میں لگانے میں اُن کی وہ ممتا کی تڑپ بھی شامل تھی، جو عطیہ کی بیٹی کو سینے سے لگانے کی حسرت سے دو آتشہ ہو گئی تھی۔
"خیریت میم! آج آپ بہت دل گرفتہ لگ رہی ہیں؟"
"نہیں تو...... بس ویسے ہی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ یہ بتاؤ، تم کیسی ہو؟ مراد نے تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟"
جانانہ ہنسنے لگی، پھر محبت سے بولی۔ "پتہ نہیں میم! مراد میں عام بچوں جیسی بات نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے وہ دُکھنے والی عمر سے کہیں زیادہ اندر گزر جانے والی عمر میں بڑا ہوا۔ اُس کی باتیں سن کر مجھے لگتا ہے، میں کبھی بھی بور نہیں ہو سکتی۔ میم! مراد میں اتنی سی عمر میں جو سیلف ریسپکٹ کا عنصر ہے، وہ بہت حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ واقعی میم! والدین اگر اچھے ہوں تو اولاد ہمیشہ آپ کو سنکھ دیتی ہے۔" اُس کی آواز ڈوب گئی تھی۔
پتہ نہیں اولاد کے تذکرے سے اُسے وہ کل کل کرتا بچہ یاد آ گیا تھا یا اپنی خالی زندگی سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ وقت گزرتا گیا تھا، مگر آج کل وہ محاسبے کے سفر میں تھی کہ اس نے اس وقت سے کیا کمایا۔ شہریار کی تکلیف دینے کی حسرت بھی اس سوچ کے سمندر میں ڈوب چکی تھی۔ اُسے کبھی کبھی خود پر حیرت ہوتی تھی۔ کیا وہ...... وہ ہی جانانہ ہے۔ جس کے ناز و نخرے سے دنیا کا سانس چلا کرتا تھا۔
سطوت جہاں آج کل اُس سے بہت آزردہ خاطر رہتی تھیں۔ کچھ پریشان بھی رہنے لگی تھیں۔ مگر آج کل اُسے کوئی بھی بات متاثر نہیں کرتی تھی۔
"کیا سوچنے لگی بچے؟" بیگم عافیہ نے اُس کا رخسار چھو کر پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
"پتہ نہیں میم! آج کل میری آنکھوں میں اتنا غم کیوں آنے لگا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے کوئی میرے اندر بیٹھ کر دن رات روتے جاتا ہے، روئے جاتا ہے، مگر اندر نمی ہے کہ کم نہیں ہوتی۔"
"شاید تم بہت زیادہ اُداس ہو میرے بچے! ورنہ تمہاری عمر کی لڑکیوں کا وقت تو صرف خواب دیکھنے اور خواب بُننے میں ہی صرف ہوا کرتا ہے۔ جب میں تمہاری عمر کی تھی تو یہ فیز مجھ پر بھی آیا تھا۔ میرا دل بھی جان نہیں پاتا تھا کہ میرا اپنا آپ خود سے کیا چاہتا ہے، کیا نہیں۔ جو زندگی تم گزار رہی ہو، وہی زندگی کبھی میری بھی تھی۔ لیکن خدا کو مجھ پر رحم آیا اور میری زندگی میں سلیم افسر کو بھیج دیا۔ اور ایسا بھیجا کہ ماضی کی

ہر تلخ یاد مجھے ایک خواب لگنے لگی۔"

جانا نہ نے پوری کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ "میم! کیا واقعی مرد اتنے اچھے بھی ہوتے ہیں کہ ہم جیسی عورتوں کو بھی عزت سے رکھ سکیں؟"

"بہت سے مرد ایسے ہوتے ہیں جانا نہ! جو ہم جیسی عورتوں کو بہت عزت، مان دیتے ہیں، جو وعدہ کر لیں، تمام عمر نبھا جاتے ہیں۔" لمحہ بھر کو وہ رکیں، پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "اگر تمہارے اندر ایک اچھی سوچ سیڑھی چڑھ رہی ہے تو اسے جھٹکو مت۔ کسی ایک کا دامن تھام لو، زندگی سہل ہو جائے گی۔"

"میم! یہ بات کہنے میں بہت آسان لگتی ہے، لیکن عمل کرنے میں بہت مشکل لگتی ہے۔ ہم جیسی بدنام عورتوں کی بدنامی سے کون ناتہ جوڑنا چاہے گا؟ اور اگر ایسا کوئی میرے لئے ہو بھی تو میم! محبت میں ایک بار دھوکا کھانے کے بعد مجھ میں دوسرا جھٹکا کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"کون تھا وہ بدنصیب، جس نے تمہیں دھوکا دیا؟" بیگم عافیہ بیڈ پر تکیہ پشت کے نیچے رکھ کر ملائمت سے بولیں۔ یوں لگ رہا تھا، وہ جیسے اپنے اندر کا فشار ان باتوں سے ریلیز کر دینا چاہتی ہوں۔

جانا نہ نے ایک لمحے کو سوچا، پھر شیرازی کے متعلق سب کچھ کہہ سنایا۔ وہ کیسے ملے، کتنی ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، اور پھر کتنا اچانک وہ اسے چپکے سے چھوڑ گیا تھا۔ پھر جب وہ اپنے بیٹے کے ذکر تک پہنچی، عافیہ بیگم کو لگا جیسے وہ ان کے دل کے زخم کے بہت قریب آ گئی ہو۔ ان کی آنکھیں اس کے دکھ سے کم، اپنے دکھ سے زیادہ بھیگ گئی تھیں۔

"پتہ نہیں میم! میرا بچہ کیسا ہو گا؟....... دیکھنے میں کیسا لگتا ہو گا؟....... پتہ نہیں، زندہ بھی ہو گا یا نہیں؟"

"ہاں، پتہ نہیں زندہ بھی ہو گی یا نہیں؟" وہ بڑبڑائیں۔ جانا نہ نے انہیں چونک کر دیکھا، تب انہوں نے دھیان بٹانے کو گھر کی مختلف تقریبات میں کھینچی جانے والی تصاویر دکھانے کی آفر کی۔ پتہ نہیں، وہ اس کا غم بٹانا چاہتی تھیں یا اپنے دکھ سے نظریں چرانے کی سعی کی تھی۔ جانا نہ واقعی تصویروں میں کھو گئی تھی۔ اس کی زیادہ تر توجہ مراد کی تصویروں پر تھی۔ پھر اچانک ایک تصویر پر اس کی نظر جا کر ٹھہر گئی۔

"میم! یہ شخص آپ کی فیملی گیدرنگ میں......."

بیگم عافیہ نے تصویر دیکھی، پھر ہولے سے بولیں۔

"میرا کوئی خاص تعلق نہیں ہے ان سے۔ بس آفیشلی نوعیت کے تعلقات سمجھو۔ میں ان کی کمپنی میں ڈریس ڈیزائنر انچیف ہوں۔"

جانا نہ نے ہولے سے اُن کی طرف دیکھا، پھر نفرت سے بولی۔
”میم! یہ آدمی بہت برے انسان کا بیٹا ہے، اور خود اس سے بھی کہیں زیادہ برا۔ ہو سکے تو آپ اس سے دور ہی رہیئے گا۔“
بیگم عافیہ کو کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات یاد آ گئی۔ اُن کا حلق بھی کڑوا ہونے لگا تھا کہ اچانک جانا نہ کی تحیر آمیز آواز سنائی دی۔ وہ اب بہت پرانے وقت کی تصویروں میں اُلجھی ہوئی تھی۔
”میم! یہ...... یہ تصویر...... یہ آپ کی کون لگتی ہیں؟ آپ کے پاس ان کی تصویر......“
عافیہ بیگم نے اُس کی طرف دیکھا، پھر ہولے سے بولیں۔ ”تم کچھ جانتی ہو ان کے بارے میں؟“
”میم! یہ میری ماں ہیں۔ اور میری منہ بولی ماں کی کزن ہیں۔ میری ماں نے محبت میں دھوکے کے بعد خودکشی کر لی تھی، اس لئے مجھے میری ماں کی بہن نے ہی پالا پوسا تھا اور میں انہیں ماں ہی کہتی ہوں اور اپنی ماں کو شروع سے دوسرے بچوں کی طرح خالہ کہا کرتی تھی۔ وہ مسٹر عبدالرحمٰن سے محبت کرتی تھیں۔ بہت ٹوٹ کر محبت کرنے والی روح تھیں۔ مگر عبدالرحمٰن نے انہیں ٹھکرا دیا۔ وہ کہتے تھے، بری گلیوں میں رہنے والی لڑکیاں گھر میں نہیں بسائی جا سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ تم بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھے پا سکتی ہو، میں تم جیسی لڑکیوں سے محبت کرنے کا تو کیا، دشمنی رکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں اور بس میم! یہی بات انہیں مار گئی۔ وہ اندر ہی اندر گھل گئیں۔ پھر ایک دن اس اذیت سے بچنے کے لئے انہوں نے خودکشی کر لی۔ تب سے مجھے مسٹر عبدالرحمٰن سے جی بھر کر دشمنی ہے میم! میرا دل کرتا ہے، میں ان کی زندگی میں اتنا درد بھر دوں کہ پھر وہ جینا چاہیں تو جی نہ سکیں۔ مرنا چاہیں تو موت بھی انہیں چھو کر نہ گزرے۔ تڑپاتی رہے انہیں۔“
بیگم عافیہ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ”تمہاری منہ بولی ماں کا نام کیا ہے جانا نہ؟“
”سطوت جہاں، میم!“
عافیہ بیگم کو لگا، اُن کا دل ابھی کے ابھی بند ہو جائے گا۔
کاش یہ لڑکی...... یہ لڑکی ان کی بیٹی ہوتی تو وہ اس کے سارے درد اپنے وجود میں سمیٹ لیتیں اور اسے صرف شادکامی عطا کرتیں۔ وہ ان کی بہت اچھی دوست کی بیٹی تھی، مگر ان کے لئے یہ بات نئی تھی کہ مسٹر عبدالرحمٰن نے اسے کوئی دھوکا دیا تھا۔ وہ عافیہ بانو کے حوالے سے مسٹر عبدالرحمٰن کو بہت اچھے سے مقام پر دیکھتی تھیں، مگر کچھ دنوں پہلے کی ملاقات کے بعد سے انہوں نے مسٹر عبدالرحمٰن کی جگہ اور مقام

اپنی نظر میں بدل دیا تھا اور اس نئی اسٹوری سے وہ اور کچھ نیچے زینے پر آن رکے تھے۔

"عبدالرحمٰن! میں آپ کو کیا سمجھتی تھی اور آپ کیا نکلے؟" انہوں نے دل میں سارے دُکھوں کا بار ایک ساتھ محسوس کیا۔ جانانہ نے اُن کی گم صم کیفیت دیکھی تو اُٹھنے کے لئے اپنے وجود کو لاکھ اُٹھتے اُٹھتے بھی اس نے پوچھا تھا۔

"میری ماں آپ کی کیا لگتی تھیں میم؟"

"وہ میری بہت اچھی دوست تھی جانانہ! میں آج جو زندگی جی رہی ہوں، وہ اسی کی محبت، کاوش اور مدد کی وجہ سے ممکن ہے۔ میں اس کی بہت قرض دار رہوں۔ اور تم اس کی بیٹی ہو تو میرے لئے میری انوشے، علینہ اور رائمہ جیسی ہو۔ آتی رہنا جانانہ! مجھے تم سے مل کر ہمیشہ اچھا لگے گا۔" وہ اسے گلے مل کر رخصت کرنے باہر تک آئیں۔

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی، جب اُن کے لنچ ٹائم پر اچانک شہریار نے آ کر انہیں ایک بار پھر تکلیف کے اسی موڑ پر لا کھڑا کیا جس تکلیف کو وہ بھولنا چاہتی تھیں۔

"آپ اور یہاں، مسٹر شہریار؟" بیگم عافیہ نے کھانا چھوڑ دیا تھا اور بے حد رُوڈ لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔

شہریار نے اُن کے لہجے کا برا منائے بغیر اپنے قدموں کو اُن کی سمت بڑھنے سے رکنے نہیں دیا تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا اُن کے قریب آ گیا تھا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"

"ناراض...... نہیں تو...... کیونکہ ناراض تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے اور آپ میری اپنوں کی کسی کیٹگری میں نہیں آتے۔ ہمارے صرف آفیشل تعلقات ہی بہتری سے جاری رہ پائیں تو وہی بہتر ہے۔ کیونکہ میں عبدالرحمٰن فیملی سے اس سے زیادہ گہرے تعلقات استوار رکھنا ہی نہیں چاہتی۔"

"کوئی نئی بات؟" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ رائمہ نے دونوں کی گفتگو کو حیرت سے سنا مگر آہستگی سے اُٹھ گئی اور شہریار نے پھر سے انہیں توجہ سے دیکھا۔

"بتائیے ناں میم! آپ کے مزید تحفظات کیا ہیں پاپا سے تعلقات میں؟"

"کچھ نہیں۔ میں مسٹر عبدالرحمٰن کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں انہیں جو سمجھتی تھی، وہ اس مقام کے اہل نہیں تھے۔" لمحہ بھر کو رکیں، پھر بولیں۔ "جو کچھ عبدالرحمٰن نے میری بیٹی عطیہ کے

ساتھ کیا، رجو کے ساتھ کیا، میں اسے نہیں بھول سکتی۔"

"رجو......کون میم؟" اُس نے اگلا سوال داغ دیا۔

پھر بیگم عافیہ اُسے کہانی سنانے لگیں۔ جانانہ کے تذکرے پر اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور جو سٹوری وہ سنا رہی تھیں وہ پاپا سے اچھے طریقے سے سن سکتا تھا اُسے اس لمحے جانانہ اور بیگم عافیہ دونوں کے ٹریپ کیے جانے پر افسوس ہو رہا تھا مگر اُس نے اس وقت اُنہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اُس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اور کسی ثبوت کے بغیر خود کو وائٹ کالر ثابت کرنا قدرے دشوار ہی نہیں، ناممکن تھا۔ سو وہ آج جو بات کہنے آیا تھا، اس نے بات کو اسی سمت کا رستہ دیا تھا۔ بہت اپنائیت سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے اور جذب سے بولا تھا۔

"آپ دل سے کہیے، کیا واقعی آپ مجھے صرف اپنے باس کا بیٹا سمجھتی ہیں؟"

بیگم عافیہ کو پتہ نہیں کیا ہوا، اُس کے جملے سے کون سا ناتا اُدھڑا تھا کہ وہ منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔

"پلیز میم! دیکھیے، مجھے خواتین کا رونا برداشت نہیں ہوتا۔ آخر آپ اتنی چھوٹے دل کی کیسے ہوگئی ہیں؟ میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا۔"

بیگم عافیہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ شہریار نے کپکپاتا ہاتھ اُن کے کندھے پر رکھا تھا اور تبھی بیگم عافیہ نے شاکی نظریں پھر سے اُس پر ڈالی تھیں۔

"عبدالرحمن نے رجو کے ساتھ تو برا کیا ہی ہے، مگر میری بہن کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا۔ میری بہن کا یہ انجام تو نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس کی بیٹی، اُس کا کیا قصور تھا شہریار؟ انسانیت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟"

شہریار اُن کے قریب بیٹھ گیا پھر آہستگی سے بولا۔

"آپ نے اس وقت بھی پاپا کی بات پوری نہیں سنی تھی اور اس وقت بھی آپ ادھوری بات پر پاپا کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں۔"

"ادھوری بات؟......تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اتنا ہی میم! کہ پاپا کا پورا جملہ یہ ہے، میم عطیہ کے ہاں بیٹی نے جنم تو لیا تھا، مگر کچھ دیر بعد مرگئی تھی۔ پاپا نے بچی اور میم عطیہ دونوں کو سپردِ خاک کر دیا تھا۔ پھر آپ ہی بتائیے، پاپا کیسے مورد الزام ٹھہرائے جانے کے قابل ہیں؟"

بیگم عافیہ نے غور سے دیکھا، پھر کرلا کر بولیں۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ عطیہ کی بچی مر نہیں سکتی۔ میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، میں خود آپ کی تسلی کے لئے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ پاپا سے میں نے معلومات لے لی ہیں، چلئے۔“ اُس نے اُنہیں آفر کی۔ بیگم عافیہ نے ایک نظر اُسے دیکھا، اُس کے خلوص کو جانچا اور فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ رجسٹر ڈ میں بچی کا اندراج تھا، مگر اُسے مُردہ شو کیا گیا تھا۔ کاغذات چینج کروانے میں جو وقت ہوئی تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ پرانے کاغذات میں اپنے پاپا کی محبتوں کو ریگارڈ دینے کے لئے جس طرح اُس نے تبدیلی کروائی تھی، نئی صورتِ حال میں اُسے واقعی دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ یہ حقیقت پہلے سامنے آتی تو کاغذات میں وہ میم عافیہ کے ہاں بیٹے کی جگہ بیٹی ہی کو شو کرواتا اور اس کا اندراج زندوں میں ہی رہنے دیتا، تا کہ نئی صورتِ حال میں بات اچھی طرح نبھ جاتی، مگر اب اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس طرح اس معاملے کو ہینڈل کرے۔ پرائی ڈ وائف کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا، مگر اُس کی ڈ ےتھ کی وجہ سے بھی معاملہ التوا میں ہو گیا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی، ناکام ہونے پر روئے جا رہی تھیں۔ اُن کی جستجو ناکام ہو گئی تھی۔ اور شہریار سوچ رہا تھا کہ وہ بیگم عافیہ پر عطیہ بانو کی بیٹی کا معاملہ کیسے کھولے۔

بیگم عافیہ روئے جا رہی تھیں، جب شہریار نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے اُنہیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ ”پلیز میم! اپنے آپ کو سنبھالئے۔ جو فیصلے خدا کے ہوں، ان پر تو صبر کرنا ہی پڑتا ہے ناں۔“

”مگر میرے دل کو یقین نہیں آتا کہ میری عطیہ کی بچی مر چکی ہے...... میرا دل کہتا ہے، وہ زندہ ہے۔“

”مگر میم! قرائن تو یہی کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں، ہاں شاید مجھے اس بات پر، قسمت کے اس فیصلے پر صبر ہی کرنا پڑے گا۔ مگر کیا ہوتا اگر میری عطیہ کی بیٹی زندہ ہوتی۔“

وہ روئے جا رہی تھیں، جب اچانک عافیہ بیگم کے موبائل پر گھر سے فون آیا۔ موبائل بجنے کے ساتھ ہی اسکرین سیور کے طور پر جو تصویر سیٹل کی گئی تھی، شہریار کو بیگم عافیہ کی محبتوں پر بے ساختہ پیار آ گیا تھا۔ جس معاملے کو حل کرنے کے لئے وہ نئے سے نئے واقعاتی، اجمالی خاکے بنا رہا تھا، وہ معاملہ بہت آسانی سے حل ہو گیا تھا۔

”میم! یہ تصویر کس کی ہے؟“ اُس نے آنسو پونچھنے کے لئے ٹشو دیتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ...... یہی تو عطیہ ہے، میری بہن۔“

”لیکن میم! یہ شکل...... یہ شکل تو میں نے ابھی حال ہی میں کہیں دیکھی ہے۔“ اُس نے پوز دیا سوچنے کا پھر یاد آ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے یاد آیا میم! یہ لڑکی تو میرے دفتر میں حال ہی میں ملازم ہوئی ہے۔ ایک دفعہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اُس کا حجاب اُترنے پر میں نے اسے دیکھا تھا، مگر کاغذات...... کاغذات میں تو میم عطیہ کی بیٹی مُردہ شو کی گئی ہے۔ پاپا بھی آج تک یہی سمجھتے رہے ہیں۔“

”ہاں...... مگر کیا پتہ، اس مڈوائف نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ ہسپتالوں میں تو پیسوں کے چکر میں اس سے بھی پہلے بچوں کو والدین سے جدا کیا گیا ہے۔ کیا پتہ میری عطیہ کی بیٹی کے ساتھ بھی یہی بلنڈر ہوا ہو۔ کاش، وہ لڑکی واقعی میری عطیہ کی بیٹی ہو، تاکہ میں اُسے سینے سے لگا کر اپنی عطیہ کو محبت سے جذب کرسکوں، پیار دے سکوں، وہ سارا پیار جو عطیہ کا مجھ پر قرض ہے۔“

”اللہ کرے میم! یہی سچ ہو۔ واقعی مجھے خوشی ہوگی میم عطیہ کی بیٹی اگر مل جائے، بلکہ پاپا تک خوشی سے جھوم اُٹھیں گے۔ چلیں میم! چلتے ہیں اُس کے ہاسٹل۔“

شہریار نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی اور گاڑیوں کے سیل رواں میں بہنے لگا۔ وہ انہیں لے کر مومنہ کے گرلز ہاسٹل گیا، مگر پتہ چلا چھٹی کے دن اکثر وہ صبح سے شام تک کہیں چلی جاتی ہے۔ کہاں جاتی ہے، پتہ نہیں۔

”یہ اُس کا اکثر کا معمول ہے۔“

شہریار کو باقی باتوں کے برخلاف اس دفعہ واقعی حیرانی ہوئی تھی اور اُس نے اُس کی روم میٹ سے سوال کیا۔

”ایک مہینے سے تو لازمی طور پر یہی روٹین رکھے ہوئے ہے۔ اُس سے کبھی پوچھتی بھی ہوں تو گہری سوچ میں چلی جاتی ہے، کچھ بتاتی نہیں ہے۔“

شہریار وزیٹر روم میں انتظار کرنے لگا تھا۔ پھر اُس کی روم میٹ نے آدھے گھنٹے بعد آ کر اُس کے آنے کی اطلاع دی۔ شہریار، بیگم عافیہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھا اور وہ اس وقت پہنچے، جب ہاسٹل کی وارڈن اُس سے سخت لہجے میں بول رہی تھی۔

”اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ تم اس فقیرنی کو لے کر یہاں سے جا سکتی ہو۔“

”وہ میری ماں ہے میم! آپ اتنی سفاکی کا مظاہرہ مت کریں۔“

”میں سفاکی کا مظاہرہ نہیں کر رہی، یہ رُول ہے یہاں کا۔ مومنہ! یہ ہاسٹل ہے، کوئی یتیم خانہ نہیں۔ تم جانے کی سوچو، ورنہ میں خود تمہیں سڑک پر لے جا کر کھڑا کردوں گی۔ ہونہہ، بڑی آئی سماج سیوک۔“

”پلیز میم!“ وہ وارڈن کے پیچھے کمرے سے باہر تک نکلی، مگر کوریڈور میں شہریار اور بیگم عافیہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

''شہریار صاحب! آپ؟''

شہریار نے جواب دینے کے بجائے آہستگی سے اُسے حکم دیا۔''اپنا سامان سمیٹو۔اب تم یہاں نہیں رہوگی۔یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔''

''مگر شہریار صاحب! میں کہاں جاؤں گی؟ اتنی رات گئے رینٹ پر گھر کہاں ملے گا؟''اُس نے بے چارگی سے کہا اور بیگم عافیہ جواب تک سکتے کی کیفیت میں کھڑی تھیں، بے ساختہ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

''یہ تو بالکل میری عطیہ ہے۔شہریار! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں تم نے میری رائیگاں تلاش کو معنی دے دیئے۔''

''شہریار صاحب.......''مومنہ نے سوال کیا مگر ادھورا اور شہریار مختصر لفظوں میں اُسے اجمالی خاکہ بیان کرنے لگا۔مومنہ حیرت سے بت بن گئی۔اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔مگر جب اُس کی ماں نے بھی باتیں اُس سے کیں تو وہ کھڑے سے بیٹھ گئی۔یتیم خانے کا نام، پہلے والدین کا تذکرہ، سب کچھ وہی تھا۔دونوں بیانوں میں سرِ مو فرق نہیں تھا۔سو وہ مدھم رفتار سے اپنے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھنے لگی۔عافیہ بیگم اُس کی مدد کر رہی تھیں اور اس مدت میں شہریار مومنہ کی ماں کو سہارا دیتا ہوا دھیرے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔واپس لوٹا تو عافیہ بیگم کے کندھے سے سر لگا کر وہ رو رہی تھی۔

''میری ماں میری خوش قسمتی تھی، میم! میں نے ماں کو چھوڑا تو جیسے خوشی نے، زندگی نے، سکون نے اور......اور اب خدا نے بھی میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔''

''بری بات مومنہ! اگر ایسا ہوتا تو برے سے برے حالات میں وہ کسی نہ کسی دل کو تمہارے لئے موم کر کر کے کیوں بھیجتا رہتا؟ اس نے تمہیں کسی کھائی میں گرنے نہیں دیا۔یہ اُس کی محبت کی انتہا ہے۔آپ اللہ کی محبت کو غلط جج کر رہی ہیں۔''شہریار نے اُس کے ادھورے جملے سے بات مکمل کی اور اُس کا سر تھپکتا ہوا، اُس کا سوٹ کیس لینے کے لئے آگے بڑھا۔اس محبت، اس ملن کے منظر سے اُس کی خود کی بھی آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔دل بے ساختہ چاہ رہا تھا، وہ ہر احتیاط چھوڑ دے اور اتنے برسوں بعد ملنے والی اپنی بہن کو سینے سے یوں لگا لے کہ پھر کبھی کوئی تشنگی اُس کے دل پر قرض نہ رہے۔مگر طے یہ تھا کہ اُس نے خود پر جبر کیا تھا اور وہ اس کے لئے تیار تھا۔عافیہ بیگم مومنہ کو ساتھ لگائے لگائے گاڑی کے قریب پہنچی تھیں۔

پھر رات کافی دیر تک وہ عافیہ بیگم کے گھر بیٹھا محبت کی مدھ چھلکتا رہا تھا۔ڈیڑھ بجے کی طرف سوئی نے سفر اختیار کیا تو وہ تیزی سے اُٹھا۔

''اوکے میم! اب کل ملاقات ہوگی۔میرے خیال میں کل آپ کے لئے ایک بہترین دن ہوگا۔''

بیگم حافیہ مسکرانے لگیں تو اُس نے مومنہ کی طرف دیکھا۔ ”مومنہ! کل صبح وقت پر دفتر پہنچ جانا۔ بہت سارے کام فائنل کرنے ہیں۔“

مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ سلام دعا کرتا باہر نکل گیا۔ موبائل اُس نے اس سارے عرصے میں سائیلنٹ کر رکھا تھا۔ سو گاڑی میں بیٹھا تو میسجز اور مسڈ کالز دیکھنے لگا۔ ایک نمبر پر نظر پڑی تو اُس نے گاڑی سائیڈ پر کر کے روک لی۔

”ہیلو! بابا بات کر رہا ہوں، عینی! تم نے فون کیا تھا۔ خیریت؟“

”بابا! میں بہت پریشان ہوں۔“ عینی کی گھبراہٹ زدہ آواز سنائی دی تو اُس نے لب بھینچ کر خود کو ریلیکس کیا، پھر نرمی سے بولا۔

”جانِ بابا! آخر ہوا کیا؟ تم جیسی بہادر لڑکی کسی عام بات سے تو پریشان نہیں ہو سکتی۔ پھر ابھی پندرہ دن تم کراچی رہ کر گئی ہو، تم نے کسی بھی قسم کی پرابلم کا ذکر نہیں کیا تھا اور اچانک...... آخر معاملہ کیا ہے؟“

وہ چپ ہوا اور دوسری طرف مدھم لہجے میں کہا گیا۔ ”بابا! پتہ نہیں، یہ ٹھیک ہے یا نہیں، لیکن لگ رہا ہے، کچھ دنوں سے ہاسٹل آ کر کچھ لوگ میرے بارے میں بہت زیادہ انویسٹی گیشن کرنے لگے ہیں۔ اور میں نہیں چاہتی، آپ کسی پرابلم میں پڑیں۔“

”کچھ لوگ؟...... کون لوگ ہیں، تم نے اُنہیں دیکھا ہے؟“

”نہیں بابا! میں نے اُنہیں نہیں دیکھا۔ مگر مدر سپیریئر بتا رہی تھیں، وہ دو الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو میرے بارے میں معلومات لینا چاہ رہی تھیں۔ مگر مدر سپیریئر نے اُنہیں میرے بارے میں کسی بھی قسم کی انفارمیشن دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب بتایئے بابا! میں کیا کروں؟“

شہریار نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور آہستگی سے بولا۔ ”تم پریشان مت ہو بیٹا! میں یہ کلیکشن سے نمٹ کر پہلی فرصت میں تمہارے پاس آتا ہوں، پھر مل کر سوچتے ہیں کچھ۔“

”اوکے بابا!“ دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

شہریار نے باقی نمبرز پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ کیونکہ یہ سارے نمبر عاطف کے موبائل، گھر اور دفتر کے نمبرز تھے۔ اور وہ اُسے فرصت سے فون کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گاڑی بے حد سبک رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ وہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا، پھر بھی دل بہت سارے معاملوں میں ایک ساتھ اُلجھا ہوا تھا۔ اس وقت اُس کا دل اسموکنگ کو بے طرح چاہنے لگا تھا، مگر عہد کا پکا ایسا تھا کہ مامون عبدالکریم نے

جب سے لائٹر اور سگریٹ اُٹھایا تھا، اُس نے تب سے پلٹ کر اسموکنگ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بے حد مشکل ترین امر تھا کہ اتنی پرانی اور پختہ عادت وہ چھوڑ دیتا۔ لیکن وہ ایسا ہی تھا، جو ٹھان لیتا، کر گزرتا۔ چاہے پھر اس کے لئے اسے کتنی ہی اذیت اور ضبط کرنا پڑتی۔ پھر اُس کے سامنے اُس کے پاپا کی مثال بھی تھی۔ وہ اُس سے بھی بڑھ کر چین اسموکر تھے، لیکن صمدانی انکل کے کہنے پر بس ایک دن انہوں نے فیصلہ لے لیا تو پھر دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مگر آج پتہ نہیں، اُسے کیوں اسموکنگ کی طلب ہو رہی تھی۔

اُس نے موبائل نمبر ملایا تھا۔ مامون عبدالکریم کی چہکتی آواز سنائی دی تھی۔

"کہاں ہے تُو؟ اور یہ اتنی رات تک کیوں جاگ رہا ہے؟"

شہریار ہنسنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "یہ سوال تو تجھ سے بھی پوچھا جا سکتا ہے، تُو اب تک جاگ کر کیا کر رہا ہے؟"

مامون عبدالکریم ہنسا، پھر بولا۔ "اپنی تو یہی صبح و شام ہے۔ پیارے وطن کے لئے، اس کی سرحدوں کے لئے نیند قربان کرتے ہیں، اور پھر کسی دن اپنوں کی ہی چلائی گولیوں سے موت اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ مگر دیکھ لو، پھر بھی شوق سفر نہیں جاتا۔"

"بکواس مت کر۔ تیری خطرناک باتیں سننے کے لئے فون نہیں کیا۔ یہ بتا، تیری نئی ایلیٹ فورس کی کارکردگی کیسی جا رہی ہے؟"

"ایک دم پرفیکٹ۔ تُو نے بالکل ٹھیک بندے سے ملوایا تھا۔ اپنے بڑے کام نکل رہے ہیں اُس سے۔ اُونچے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا ہے، تجھے پتہ ہے؟"

"ہاں، ہاں، روز پڑھتا ہوں تیری گڈ نیوز۔ یہ بتا، وزیرِ داخلہ کے فرسٹ سیکرٹری کے معاملات ابھی تک کانفیڈنشل ہی ہیں نا؟ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کل اگر ان کی کسی میں پر تُو نے ہاتھ مارا تو تیرے گلے میں ہی نیکی نہ آ جائے۔"

"ارے نہیں، معاملات وزیرِ داخلہ سے بھی اوپر کے ہیں۔ اب ہم پہلے والی کیٹگری کے نہیں رہے۔ تیرے بھائی کی ٹور بن گئی ہے جانی!"

"ابے مامون! یہ تیری بولنے کی ٹون بھی بدل گئی ہے کیا؟ آج کل کن لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا ہے؟"

"ہر طرح کے لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے میری جان! معلومات ایسے ہی تھوڑی ملا کرتی ہیں؟" لمحہ بھر کو رکا، پھر ملائمت سے بولا۔ "اب یہ بتاؤ، تم نے فون کیوں کیا تھا؟"

شہر یار نے گلا کھنکھارا، پھر لجاجت سے بولا۔ ''مامون یار! اسموکنگ کو آج بڑا دل چاہ رہا ہے۔ اگر تو اجازت دے تو......''
''نہیں۔ ایک لت چھوڑ دی ہے تو بس چھوڑ دی، ہاں!''
''پلیز مامون!'' اُس کے لہجے میں شیرینی کچھ اور بڑھ گئی۔
مامون نے گھبرا کر کہا۔ ''ابے کیا محبوباؤں والے نخرے دکھا رہا ہے۔ دل پانی پانی ہونے لگا ہے، تیری شیریں زبانی سے۔'' رُکا، پھر نرمی سے بولا۔ ''او کے، ٹھیک ہے۔ مگر صرف ایک سگریٹ سے زیادہ نہیں پیو گے۔ وعدہ کرو تو اجازت ملتی ہے۔''
''اچھا صرف تین...... تین زیادہ نہیں۔ پینے دے۔''
''تین پیکٹ یا تین سگریٹ؟''
وہ ہنسا، پھر شرارت سے بولا۔ ''جیسی تیری مرضی، مجھے پینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ تین سگریٹ یا تین پیکٹ، جو دل چاہے، حکم جاری کر دے۔ بقول شاعر، جو چاہے ترا حُسن کرشمہ ساز کرے۔''
''بس، بس...... زیادہ پھیلو نہیں۔ تین سگریٹ کے علاوہ ہاتھ لگایا تو سمجھ بیماری سے نہیں، میرے ہاتھ سے مرے گا۔''
''منظور ہے جناب! منظور ہے، او کے؟'' وہ کچھ دیر کو چپ ہوا۔
شاید وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر بات اندر رُکی ہوئی تھی۔ مامون عبدالکریم نے اُس کی خاموشی کو سنا اور دھیرے سے کہا۔
''جس وجہ سے پریشان ہے، اس پریشانی کو میرے نام کر دیا ہے ہاں، پھر اس کے لئے خود کو وقف مت کیا کر۔ سمجھ لے سارے معاملات ابھی اپنے اختیار میں ہیں۔''
''جانانہ کی تازہ ترین صورتِ حال......؟''
''جانانہ...... وہ آج کل کچھ فارم میں نظر نہیں آ رہی۔ کتنے ہی معاملات میں وہ اپنے ہاتھ کا جادو جگا کر لائم لائٹ میں آ سکتی تھی۔ دو تین وزیروں کی اُس کی وجہ سے کھنچائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وہ عین موقع سے واک آؤٹ کر گئی تھی، بلکہ اُس نے اُنہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیا، اس لئے معاملہ پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی سے آگے نہیں بڑھا۔ کچھ موڈ آف ہے قیامت کا۔ اور ہاں، وہ تمہاری میم عافیہ ہیں

ہاں، آج کل اُن کے ساتھ بہت اُٹھنا بیٹھنا ہے اُس کا۔"
شہریار نے ہامی بھری، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "پاپا سے پتہ چلا تھا، میم عافیہ کی پہلے ایک بیٹی تھی، جو وہ یہیں لاس کر کے باہر چلی گئی تھیں، اس لئے میرے خیال میں جاناں سے اُن کی میل ملاقات اسی کمزوری کا ردعمل ہے۔"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اوکے، چلو اب بہت بات ہوگئی، مجھے سائن آف کرو۔"
"کمپیوٹر پر کام کرتے کرتے خود بھی کمپیوٹر بن گیا ہے کیا؟" اُس نے ہنس کے پوچھا۔ اور وہ جواباً بولا۔
"بس ایسا ہی سمجھ لے کچھ۔"
"اوکے، باقی باتیں پھر سہی۔"
اُس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ اب وہ گھر کے بہت قریب تھا۔ دس منٹ بعد وہ گھر کے سامنے تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تھا، وہ گاڑی اندر بڑھا لے گیا تھا۔ رسٹ واچ میں ڈھائی بج رہے تھے۔ اُسے گھر میں کسی کے جاگنے کی توقع نہیں تھی، مگر بہت اچانک پاپا کی آواز سن کر اُس کے قدم خود بخود رک گئے۔
وہ آہستہ آہستہ مڑا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ ابھی تک سوئے نہیں پاپا؟"
"نہیں۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا، آج تم جس اذیت سے گزر کر آؤ گے، اس کے لئے کسی کا کندھا ضرور چاہئے ہوگا، اور وہ کندھا ایک دوست کا ہو تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"
"پاپا!" وہ واقعی کسی کی باہوں کا منتظر تھا۔ پاپا نے اتنی محبت سے اُسے آسرا دیا کہ پھر آنسو کہاں تھمنے تھے۔ یہ سارے وہ آنسو تھے، جو عافیہ بیگم کے گھر میں قہقہوں کی سلفونک پیکنگ میں چھپ گئے تھے، مگر اب بے دھڑک بہہ رہے تھے، جیسے کوئی چڑھیا دریا ہر بار توڑ دے، ہر رکاوٹ پار کر لے۔
"بہت دل چاہا ہوگا ناں، مومنہ کو اپنے گلے سے لگانے کو، یہ کہنے کو کہ تم اُس کے ماں جائے ہو، لیکن اپنے ہی دل کی خوشی میں اجنبی بن کر شریک ہونا پڑتا ہے تو دل تو دُکھتا ہے ناں بچے!"
وہ اُن کے کندھے سے سر ٹکائے اثبات میں سر ہلانے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "میرا دل چاہ رہا تھا، پاپا! میں یکدم مومنہ کو ایک سرپرائز دوں۔ خوشی عافیہ میم کے ملنے پر اُس کے چہرے پر بکھری تھی۔ میں

اس خوشی کو شفق کی طرح پھیلتے دیکھوں، میں اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ رکھوں اور کہوں، میں شہریار ہوں مومنہ! تمہارا اپنا بھائی شہریار۔ مگر میں نے ایسا نہیں ہونے دیا پاپا! میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا، آپ وہاں نہیں ہوتے، تب بھی میرے ان جملوں سے آپ کا دل رک جاتا، آپ کو لگتا آپ کی محبت ضائع ہوگئی، ماما کی محبت نے مجھے بندھن میں نہیں باندھا۔ اور پاپا! پھر یہ بھی تو تھا، میں اُسے یہ بتا کر کرتا بھی کیا؟ آج نہیں تو دو ایک سال بعد مجھے تو بچھڑنا ہی ہے ناں، پھر میں کیوں اُس سے اپنے نام کا اتنا بڑا دُکھ دے کر جاتا۔ لڑکیاں تو یوں بھی دُکھوں کو اوڑھ لیتی ہیں، پھر میں کیوں چاہتا کہ وہ اس دُکھ میں گھل جاتی کہ ہم ڈھنگ سے ملے بھی نہیں کہ بچھڑ گئے۔"

پاپا نے اُس کے ان آخری جملوں پر اُسے خود سے الگ کیا، پھر خفگی سے بولے تھے۔

"دوستی کا کندھا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے، تم اپنے دوست کی جان ہی نکال لو۔" کچھ پھر کو رُکے، پھر اُس کی پیشانی پر آئے بال سنوار کر بولے۔ "تمہیں کیا پتہ تم میرے لئے کیا ہو؟ تمہیں کھونا ایسا ہے جیسے میں خود مر جاؤں۔ کیا تم چاہتے ہو، میں مر جاؤں؟"

"نہیں پاپا! آپ کے لئے تو میں نے ایک طویل زندگی مانگی ہے۔"

"تو پھر یہ کیوں نہیں سوچتے تمہارے لئے بھی کوئی ایسی ہی طویل زندگی کی دعا اچھے دنوں کے پلو سے ہر روز باندھتا ہے۔" وہ رُکے، پھر اُس کا رخسار چھو کر بولے۔ "تمہاری ماما....... تمہیں پتہ ہے، آج کل بڑی پکی نمازن بنتی جا رہی ہیں۔ اور وجہ....... وجہ تم ہو۔ تمہارے لئے لمبی عمر کی دعاؤں سے ہر وقت اُن کے ہونٹ کانپتے رہتے ہیں۔"

"سچ پاپا! امیزنگ، میں تو اس خوشی سے مر ہی جاؤں گا کہ کسی کے لئے میں اتنا ضروری ہوگیا ہوں۔"

"بکومت۔" پاپا نے اُس کا کان مروڑا۔ وہ ہنسا بھی، مگر یہ ہنسی اندر تک نہیں اتری تھی۔ پتہ نہیں، اُسے ان سب باتوں کے باوجود کیوں یقین سا تھا کہ وقت بہت تیزی سے گزرے جا رہا ہے۔ سمیٹ کر رکھنے کے لئے وقت بچا ہی نہیں ہے۔ مگر یہ سوچ اُس نے پاپا سے شیئر نہیں کی تھی اور کوریڈور کے ستون سے ٹیک لگائے ماما تھیں، اُن کا دل بے ساختہ اُس کی باتوں سے کپکپانے لگا تھا۔ آج پہلی بار اتنی جلدی اُن کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔

"نہیں اللہ! ابھی نہیں۔ بہت سارے سالوں تک نہیں۔ ابھی میرے بچے نے دنیا جی ہی کتنی ہے۔ اس کی تو ساری عمر کام میں گزر گئی۔ ابھی اسے خواب دیکھنے کی تمنا دے، اسے خواب جینے کی عمر دے۔

ابھی نہیں، ابھی تو بالکل نہیں۔"

مگر دعا کے باوجود ایک بے کلی سی ان کے اندر ہی اندر رینگتی رہی اور وہ اس ان کہی سے منہ موڑ گئی تھیں۔

پھر صبح آٹھ بجے ہی وہ سب سے پہلے کھانے کے کمرے میں موجود تھا۔ ماما نے اسے ناشتہ سرو کیا تھا، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"کام کی اتنی زیادتی ٹھیک نہیں ہے۔ بچے! آرام بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔"

"ہے تو مام! مگر یہ چڑیا ہماری زندگی میں نہیں چہچہاتی۔" اس نے براؤن بریڈ کا پیس چائے سے نگلتے ہوئے کہا اور مام اس کے کپ میں گرم چائے ڈالنے لگیں۔ پھر اپنا کام مکمل کرچکیں تو نرمی سے بولیں۔

"کل تم نے اسموکنگ کی تھی؟"

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" وہ گھبرا کر بولا۔ مام نے اس کی طرف خفا نظروں سے دیکھا، پھر آہستگی سے بولیں۔ "کل تم نے ہی صبح جلدی دفتر جانے کا عندیہ تھا، اپنے پاپا کو۔ سو میں ساڑھے سات بجے تمہارے کمرے میں تمہیں اٹھانے گئی تھی، لیکن ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے دیکھ کر بہت دل مکدر ہوا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا، فوراً اٹھا کر کلاس لگاؤں تمہاری، لیکن سوتے میں تم اتنے معلوم لگتے ہو کہ ہمت ہی نہیں پڑی ڈانٹنے کی۔"

"آخاہ تو میں جاگتے میں اچھا نہیں لگتا کیا؟" اس نے لاڈ سے ماما کو دیکھا۔

ماما نے اس کا چہرہ چھو کے دیکھا، پھر نظر ہٹا کر بولیں۔ "میرا بچہ ہے ہی اتنا پیارا کہ ہر رنگ میں اچھا لگتا ہے مجھے۔ مگر بس جب بہت زیادہ مصروف ہو جاتا ہے تو غصہ آنے لگتا ہے مجھے اس پر۔"

"اظہار کر دیا کیجئے ناں، مام! آپ کے اظہار میں اور آپ کے غصے میں جو محبت ہے، وہ میرے لئے انرجیٹک ثابت ہوگی۔ ویسے مام! آپ شام کو کلیکشن پارٹی میں تو آرہی ہیں ناں؟"

"ہوں، تمہارے پاپا نے انوائٹ کیا ہے تو آنا پڑے گا۔"

شہریار نے شرارت سے انہیں دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔ "واہ ماما! پاپا تو ہم سے بھی تیز نکلے۔ پہلے ہی انوی ٹیشن کلیئر کروا لیا ہمیں لاڈ دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

ماما نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، پھر بولیں۔ "انوائٹ تو تمہارے پاپا نے کیا ہے، مگر میں اس بزنس پارٹی میں صرف اس لئے آرہی ہوں کہ مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی ہے کہ کوئی بہت بڑا ڈی جی ہے جو اس پارٹی

کو ہوسٹ کرنے والا ہے۔"

"مام! آپ بھی ناں......" وہ شرما گیا تھا۔ ماما مسکرانے لگی تھیں۔

پھر وہ سلام دعا کے بعد گھر سے نکلتا چلا گیا تھا اور ماما نے ڈھیلے اعصاب کے ساتھ اپنے وجود کو کرسی کے حوالے کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ غلط فہمیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لئے وہ ہر روز پہلے سے زیادہ اُنہیں عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ کل رات کی باتوں سے یہ بھی کنفرم ہو گیا تھا۔ وہ جس بات کے لئے اتنے عرصے سے خار کھائے رہتی تھیں، وہ بھی اُن کی خام خیالی تھی، وگرنہ وجاہت جو مسٹر عبدالرحمٰن اتنے طویل عرصے سے انہیں کہتے آ رہے تھے، وہ مان نہ چکی ہوتیں۔ وجاہت جسے پہلا اٹیک کے بعد انہوں نے بہت دل گیری سے شہریار کے مستقبل کے خوف سے ان سے ایک بار پھر شیئر کی تھی۔

اور انہوں نے بہت خفگی اور شکوے سے اُنہیں دیکھ کر اُن کی طبیعت کے خیال سے کہا تھا۔ "آپ نے شیری کے لئے جو بھی ایسٹ رکھے ہیں، جیسے آپ چاہتے ہیں وہ زندگی گزارے اس سے ہم میں سے کوئی غرض نہیں رکھے گا۔ میں نہ ہی اس سے آپ کا نام واپس لوں گی، نہ ہی مقام۔ وہ آپ کا بیٹا ہے اور ہمیشہ آپ کی ذمہ داری ہی رہے گا۔"

پاپا نے اُن کے اس جملے کے بعد سے ریکوری شروع کر دی تھی اور آج اُنہیں تیس سال بعد اپنے شوہر کے سچ پر یقین آیا تھا۔ بے اختیار اُن کی آنکھیں پھر سے گیلی ہونے لگی تھیں۔

"میں کہاں کہاں غلط تھی اور کتنا زعم رکھتی تھی کہ مجھ سے زیادہ ٹھیک علم رکھنے والا کوئی نہیں۔" انہوں نے خود کو سرزنش کی اور ناشتے کے برتن اٹھانے لگیں۔

شہریار دفتر پہنچا تو مومنہ پہلے سے موجود تھی۔ سارے دفتر میں اُس کی ماں کے ملنے اور میم عافیہ کی بھانجی ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور سب مٹھائی کے باوجود اُس کے سر ہو رہے تھے کہ وہ انہیں اچھی سی ٹریٹ دے۔ شہریار نے انٹری دی تو انیلہ نے فوراً اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھئے ناں شہریار صاحب! اِیلڑکی اتنی بڑی خوشی کو بھی نفع اور نقصان کے حساب سے تول رہی ہے۔ کہتی ہے، میں فضول خرچی نہیں کر سکتی، حالانکہ اب اُس کے ساتھ ایسا کوئی پرابلم بھی نہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے، اگر یہ پہلے والی صرف مومنہ رفیق ہوتی تو شاید ہم اپنی ڈنر صرف مٹھائی کے بغیر بھی بانٹ لیتے، مگر اب تو یہ میم عافیہ کی بھانجی ہے، اسے اتنا بخیل ہونا زیب نہیں دیتا۔"

شہریار نے مومنہ کی طرف دیکھا اور وہ سر جھکا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے شہریار صاحب! وہ میری خالہ ہیں، اُن کا جو کچھ ہے، جذباتی نہج میں یقیناً میرا ہے، میرا ہو سکتا ہے مگر میری عزتِ نفس اور خودداری سے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ میں ہیرا سائٹ زندگی جیوں، سو شہریار صاحب! اپنی تنخواہ کے حساب سے میں نے اپنی خوشی بہت اچھے سے سلیبریٹ کر لی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اُس نے گلاب جامن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مومنہ نے فوراً ڈبے پر ڈھکن ڈھک دیا۔ ”سوری سر! میرے خیال میں آپ کا ہر وقت بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے۔ شوگر لیول بھی اُنیس بیس ہی چل رہا ہے۔ اس لئے اسے رہنے دیں۔“ وہ رُکی، پھر بولی۔ ”میں آپ کے لئے شوگر فری سویٹ منگوا لیتی ہوں، بس پانچ منٹ انتظار کر لیجئے۔“

شہریار دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ اب اُن کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ مومنہ نے پیون کو مٹھائی لانے کا حکم دیا اور انیلہ نئے سرے سے اپنے مقدمے میں واپس آ کر پھر سے بولی۔

”بولئے نا سر! مومنہ ٹھیک کہہ رہی ہے یا میں؟“

شہریار نے دونوں کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ”میرے خیال میں آپ دونوں ہی کا نقطۂ نظر بالکل ٹھیک ہے۔ کسی ایک کا ساتھ دینا زیادتی ہوگی۔“ اُس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ اُس کے فرینڈلی انداز کی وجہ سے سارے ممبرز نے ہلکا پھلکا احتجاج کرنا شروع کر دیا۔

شہریار کے ہونٹوں پر بھی ہنسی آ گئی۔ اُسے ایک لمحے کے لئے یہ عام سا جینے کا انداز بہت اچھا لگا تھا، سوان کا احتجاج اس سے پہلے کہ زور پکڑ جاتا، اُس نے ہاتھ اُونچا کر کے ہولڈ کہا۔ سب کے ہونٹ کھلے بند ہوئے اور وہ کھڑے ہو کر بولا۔

”آج کا کلیکشن اگر لانچنگ سرمنی میں پلس پوائنٹ حاصل کر لیتا ہے، میڈیا میں کامیاب رہتا ہے تو مومنہ کی طرف اُدھار سلیبریشن میں آپ کے لئے ارینج کروں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی شہریار بھائی!“ انیلہ کی زبان بے ساختہ پھسلی۔ اُس نے دانتوں تلے زبان دبالی۔ حاکم اعلیٰ سے رشتہ جوڑنے کی رسم عام کہاں تھی جو اُس کے پاس یہ غلطی سرزد ہونے کا مارجن رہتا۔

انیلہ نے آہستہ آہستہ کر کے شہریار کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں ویسے ہی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

”نیور مائنڈ انیلہ! آپ کہیں نہ کہیں، لیکن آپ سب میرے لئے واقعی ایسی ہی ہیں، اس لئے مجھ سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیجئے، وہ ایک برا دور تھا جو اب گزر چکا ہے۔“ وہ رُکا، پھر دوبارہ پروگرام میں ترمیم کر کے بولا۔ ”او کے، اگر ہم بالفرض میڈیا کی اتنی کوریج نہیں حاصل کر پاتے جو ہمارا ٹارگٹ ہے، تب بھی بے فکر رہئے۔ پارٹی کے بعد آپ سب کا ڈنر میرے اوپر ڈیو رہے گا۔ سو جو اپنے گھر میں اطلاع کرنا چاہتا ہے، پہلے سے کر دے۔ پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری بھی میری اور پھر......“

”واؤ“ سارے ورکرز کی ہاؤ ہو سے پورشن بھر گیا۔ وہ انہیں خوش ہوتا دیکھتا وہاں سے اُٹھ آیا۔ کانفرنس روم میں سالار عبدالرحمٰن میڈیا کے افراد کے ساتھ میڈیا کوریج کے لئے ویو پوائنٹ آؤٹ کر رہے

تھے۔ جازی عبدالرحمن پارٹی کا اسکیچ مینوئل ترتیب دے رہا تھا، جو شہریار ہی کا پوائنٹ آؤٹ کردہ تھا۔ مدعوئین کی میزیں کہاں ہونی چاہئیں، پریس گیلری کہاں ہوگی، مہمانانِ خصوصی کے لئے کتنے اور کون کون سے افراد مدعو کیے جائیں گے، بزنس حاصل کرنے کے لئے اشتہارات کا حصول کس کس کمپنی کو اپروچ کرنے سے حاصل ہوگا، کون کون سے چینل پر یہ تقریب آن ایئر دی جانی ہے، جازی بہت انہماک سے مصروف تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اپنے روم میں آکر بیٹھ گیا۔ سارے کام مکمل تھے، صرف اب پریذنٹیشن باقی تھا، جس کا کریڈٹ آسانی سے جازی لے سکتا تھا۔ چھوٹا تھا وہ، شروع میں اتنی سہولت تو اُسے اس کی طرف سے ملنی ہی چاہیے تھی۔ ہاں، یہ تھا کہ اس سارے کام میں اُس نے کسی نہ کسی حد تک اسے انوالو ضرور رکھا تھا تاکہ اسے معاملات کی نہج سمجھنے میں وقت نہ ہوتی۔ ذہین اور زیرک وہ اس سے کہیں زیادہ تھا، اس لئے وہ اس کے منہماک سے اچھا شگن لے کر اُٹھا تھا اور اب اُس کا وقت اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت خیال کے ساتھ وقت بتا رہا تھا۔

''آج کی کلیکشن سیریمنی کے بعد کہہ دوں گا، شافعہ! مجھے تم سے ویسی ہی محبت ہے، جو کبھی جبران نے کی تھی۔ مجھے تمہاری محبت میں جینے سے زیادہ مرجانے کی آرزو ہے۔ میرا دل کرتا ہے تم مجھے زندگی میں کسی خوشی میں نہ یاد کرسکو تو بھلے نہ کرو مگر دُکھ میں جب بھی تم روؤ تو تمہاری آنکھ سے میرا دل دُکھ بن کر ٹپکے۔ تم مجھے بھول جاؤ، مگر میں چاہ کر بھی تمہیں بھلا نہ سکوں۔ تمہاری محبت میں میری زندگی آزار ہو جائے، دیوار ہو جائے، مگر تمہارا خیال میرے ہمراہ یوں چلے جیسے وہ صرف میرے لئے بنا تھا۔ میں تمہیں ہمیشہ اس قیدی کی طرح یاد رہوں، جو بادشاہ کے حکمِ معافی سے پہلے دار پر لٹکایا جا چکا ہو۔ میں تمہیں خلش میں یاد رہوں، درد میں یاد رہوں، تمہیں نہ یاد رہوں تو محبت ضرور ایک بار مجھے میری طرح دل گیری سے ضرور یاد کرے۔''

''کیا سوچ رہے ہو؟'' بہت غیر متوقع آواز سنائی دی۔

خوشی سے اُس کی چیخ نکل گئی تھی۔ ''عدیل بھائی! آپ....... آپ تو تین دن بعد آنے والے تھے ناں۔'' وہ اُن کے سینے سے جا لگا تھا۔

انہوں نے کافی دیر تک اسے خود سے بھینچے رکھا تھا، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ ''اگر دیئے گئے وقت پر آتا تو اتنی خوشی جو تمہارے چہرے پر دیکھی ہے، دیکھنے کو کہیں ملتی کیا؟''

''عدیل بھائی! آپ بھی ناں۔'' اُس نے ہلکے سے اُن کے کندھے پر مکا مارا، پھر سرخوشی سے بولا۔ ''اچھا کیا آپ آج آگئے۔ آج کلیکشن سیریمنی بھی ہے ناں۔''

''ہے تو۔ مگر مجھے تو وہ پوچھنا ہے، جو تم مجھ سے چھپانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہو۔ خیریت میرے شیر؟ آج تیری آنکھیں بڑی چمکیلی ہو رہی ہیں۔''

''ہوں گی....... ہوں گی....... کیوں نہیں ہوں گی سر! بچہ محبت کے کئی زینے ایک ساتھ جو چڑھ گیا ہے۔''

"مامون! تم...... اتنے غلط ٹائم پر؟" وہ واقعی حیران ہوا تھا اور عدیل بھائی نے ہنس کر کہا تھا۔

"یہ ہمیشہ غلط ٹائم پر ہی ٹھیک انٹری دیتا ہے، لیکن اس وقت میری اور اس کی چہرہ کشائی صرف اس لئے ہے کہ رات کو ہم تمہاری پارٹی میں نہیں آسکتے۔ کچھ آفیشلی معاملات ہیں۔ مامون مجھے آج سے اسسٹ کررہا ہے۔"

"اچھا تو یوں کہئے، آپ دونوں میرے لئے ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ محبت کا رعب مجھے دے رہے ہیں۔" وہ یکدم خفا ہو کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر عدیل بھائی اُس کی میز پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بیٹے شہریار! صرف آج کا دن ہمیں دے دو۔ کل سے پرامس، زیادہ وقت تمہارا۔"

"سارا وقت میرا کیوں نہیں؟" اُس نے کڑے لہجے میں پوچھا اور مامون شوخی سے بولا۔

"سارا وقت تجھے دے دیا تو رابعہ بھابی کو شکایتیں پیدا ہوں گی، دیکھ لے پھر......"

بے ساختہ قہقہہ پھر سینے میں کیسے رُکتا۔ وہ بے ساختہ ہنسے جارہا تھا۔ عدیل بھائی نے کندھے پر یکدم ہاتھ رکھ دیئے تھے۔

"کون ہے وہ، بتایا نہیں تم نے؟"

"کوئی نہیں ہے بڑے بھیا! یہ مامون تو بس......"

"کیا مامون تو بس، یہ پرانی فلمی کہانیوں جیسی محبت کرتا ہے۔ کہتا ہے، وقت آنے دے، سب بتا دوں گا۔ اسے میں نے کہا بھی کہ اگر وقت نکل گیا تو کہنے لگا میری قسمت میں ہوگی تو مجھے ضرور ملے گی۔ جبران آج کل بھائی کا فیورٹ رائٹر بنا ہوا ہے۔" مامون اسے پوری طرح ایکسپوز کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے بہت گھور کے اسے دیکھا تھا اور مامون نے ٹیبل پر رکھے والٹ کو عدیل بھائی کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"دیکھ لیجئے، کون ہے جس نے بھائی جیسی چٹان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔"

"عدیل بھائی! نہیں، پلیز نہیں۔" اُس نے اُٹھ کر والٹ چھیننے کی کوشش کی۔ مامون نے اُسے بازوؤں میں بھر کر پکڑ رکھا تھا، جب عدیل بھائی نے اُس کے والٹ میں لگی تصویر کی رونمائی کر دی تھی۔

''اوہو تو یہ محترمہ ہیں، جو ہمارے پیارے بھائی کا دل اُڑا کر لے گئیں۔''

وہ لسوڑ کر ناراض بیٹھا تھا، جب اچانک مومنہ دروازہ ناک کر کے اندر آئی تھی۔ سب معتبر ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ نیمل کی بے ترتیبی کو مامون اور عدیل بھائی درست کر رہے تھے۔ مومنہ کی آنکھیں مسکرائی تھیں، کیونکہ تینوں کا شور کمرے سے باہر صاف سنا جا سکتا تھا۔

''سر! ہم سب تیار ہیں۔ آپ کب تک نکلیں گے؟''

شہریار نے وال کلاک کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''آدھے ایک گھنٹے میں نکلتے ہیں مس مومنہ!''

مومنہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ عدیل بھائی شرارت بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگے، پھر نرمی سے بولے۔ ''بہت محبت کرتے ہو اس سے؟''

شہریار کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ چمکیلی ہو گئی تھیں۔ اُس نے آنکھیں موند کر اثبات میں سر ہلایا تھا، پھر جذب سے بولا تھا۔

''مجھے اُس سے محبت ہے

محبت بھی ستاروں سی

کلیوں سی، آبشاروں سی

صبح دم کھلتے پھولوں کی مہک جیسی

کنارے سے گلے ملتے ہوئے لہروں کے پانی سی

سُروں کے رقص پہ جیتے ہوئے سنگیت کے جیسی

کسی آزاد پنچھی کی اُڑانوں سی

مجھے اس سے محبت ہے

رم جھم پیار برساتی ساون کی بارش سی

مجھے اس سے محبت ہے

ہاں، بس اس سے محبت ہے"

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ دونوں بہت سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"اتنی محبت کرتے ہو اس سے، پھر کہنے سے کیوں ڈرتے ہو؟" مامون نے اپنا مسمریزم سے نکل کر اس کی کلاس لی اور وہ مسکرایا۔

"ایسی محبت کا مزا لگ ہے۔ چپ چاپ سے جل جانا، راکھ ہو جانا، اس میں بھی تھرل ہے۔"

"مگر بیٹے! یہ سولہویں یا سترہویں صدی نہیں ہے، جو ایسی محبت کا راگ الاپو تم۔ ادھر دیکھو، رابعہ مجھ سے کالج کے زمانے سے محبت کرتی تھی، لیکن اس کا اظہار اُس نے میرے اظہار کے بعد ہی کیا تھا۔ یہ مشرق ہے شیری! یہاں پہل مرد کرے تو ہی اچھا لگتا ہے۔"

"اوکے، اوکے آپ کی پیار کلاسیں لوں گا تو جلد اس مقام پر پہنچ جاؤں گا کہ برملا کہہ دوں، شافعہ! مجھے تم سے محبت ہے۔"

"بکومت۔ آج رات وہ آ رہی ہے ناں، تو بس آج کہہ دینا کہ تم اُس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"شادی.... مگر بڑے بھیا! میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

"اب پٹو گے میرے ہاتھ سے۔ میں سالار نہیں۔ تم جانتے ہو، میں بہت برا آدمی ہوں۔"

"مجھے پہلے سے یقین ہے اس بات پر۔ مگر اتنے ہی اعتماد سے کبھی رابعہ بھابی کے سامنے کہیں ناں تو جانوں کہ شیر جوان ہیں آپ۔"

عدیل بھائی جواب کے بجائے ہنسنے لگے۔ پھر وہ دونوں ساڑھے بارہ سے پہلے کافی پیے بغیر نہیں اُٹھے تھے۔

عدیل بھائی کے نکلتے ہی وہ بھی اپنے گروپ کے ساتھ دفتر کی وین میں جا بیٹھا تھا۔ پھر ڈیڑھ بجے سے پہلے وہ ہوٹل نہیں پہنچ سکے تھے۔ جازی اور سالار باہر کے کاموں میں مصروف تھے اور تقریب کی ارینج

منٹ اور انتظامات کے لئے وہ جان مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین بجے زبردستی مومنہ نے کھانے کا بریک کروایا۔ پھر وہ سب تو کھانا کھا رہے تھے اور مومنہ اپنا موبائل لے کر ایک قدرے خاموش گوشے میں کرسی پر جا بیٹھی تھی۔ وہ صبح سے کافی مرتبہ شافعہ کو فون ملا چکی تھی، مگر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر ٹرائی کیا تھا اور اس بار غیر متوقع رابطہ ہو گیا تھا۔

مومنہ کی آواز سن کر وہ بہت خوش ہو گئی تھی اور شہریار، عافیہ بانو، عطیہ بانو اور ارسلان راشدی کے نئے رشتے کے حساب ہوں، اس سے باتوں میں دو دو ہاتھ کرنے خود بھی سارے سینڈوچز اور چائے چھوڑ کر آ گیا تھا۔ مومنہ کی اُس کی طرف پشت تھی، سو وہ اسی خوشی سے مصروف گفتگو تھی۔

شافعہ نے اُس کے لہجے کی خوشی نوٹ کی تو بولی۔ ”تم اتنی خوش کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟“ اُس نے سوال کیا اور مومنہ ہنس پڑی، پھر بہت شوخی سے بولی۔

”شافعہ! خدا کو میری محبت پر یقین آ گیا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ تمہیں پتہ ہے، آج میں کتنی خوش ہوں۔ آج....... آج پورے دو ماہ سے مجھے جس کی تلاش جگہ جگہ بھٹکائے دے رہی تھی، میں نے اُسے پا لیا۔ مجھے وہ مل گئی۔ شافعہ! مجھے میری ماں مل گئی۔ بھائی نے اُنہیں اولڈ ہوم میں ایڈمٹ کروا دیا تھا اور آج میں نے...... میں نے اپنی ماں کو پا لیا۔ اور ایک اور گڈ نیوز، میری کل بیگم عافیہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری ماں سے کچھ پوچھنا چاہتی تھیں، لیکن جب وہ میرے ہاسٹل آئیں تو حیرت ناکی میری منتظر تھی۔ شافعہ! تم سوچ نہیں سکتی ہو، مجھے کتنے بڑے بڑے سرپرائز ملے ہیں۔ شافی! وہ میم عافیہ میری خالہ نکلیں، اُن کے پاس میری سگی ماں کی تصویریں تھیں، میری ماں بالکل میرے جیسی دِکھتی تھیں۔ اُفوہ، میں یہ کیا کہہ رہی ہوں، نہیں شافی! میں بالکل اپنی ماں کے جیسی ہوں۔ تم شام کو آنا، آج میں بہت خوش ہوں۔ عافیہ آنٹی بھی بہت خوش ہیں۔ آج کے دن ان کا پہلا کلیکشن لانچ ہو رہا ہے اور آج کے دن وہ میرا ملنا بھی سلیبریٹ کر رہی ہیں۔ شافی! تم آؤ گی ناں ہوٹل؟ دیکھو! آج میرا تم سے بہت باتیں کرنے کا من ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ ”خیریت شافی؟ تم کچھ بول نہیں رہیں۔ اپنی تھنگ رانگ؟“

”ارے نہیں، تم کسی کو بولنے کا موقع دو تو کوئی بولے ناں۔“

”اُفوہ، سوری شافی! آج میں اتنی خوش تھی کہ کیا بتاؤں۔ تمہیں پتہ ہے مسٹر شہریار نے ہمارے سارے آفس کی لڑکیوں کو خصوصی ڈنر کے لئے انویٹیشن بھی دیا ہے آج۔ ہم تو خوب مزہ کرنے والے ہیں۔“

”واقعی، یہ تمہارا حق ہے مومنہ! تم نے جتنی ٹف زندگی جی ہے، اس کے لئے یہ موج مستی جائز ہے۔“ اُس نے ہنس کر اسے مبارکباد دی۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

”پلیز شافی! تم اگر آج ہمارے ساتھ ڈنر پر چلو تو اچھا لگے گا ناں؟“

”تمہیں اچھا لگے گا، مگر ضروری تھوڑی ہے تمہارے شہریار صاحب کو بھی یہ بے تکلفی اچھی لگے؟ اگر کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو خوامخواہ میرے ہاتھ سے خرچ ہو جائیں گے۔“

”آپ کے ہاتھ سے خرچ ہو جانے میں جو مزہ ہے مس شافی! وہ بچت میں کہاں ہے۔ ویسے آپ مجھ سے تقریباً ہر روز ملتی ہیں، ہم باتیں بھی کرتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ آج تک نہیں جان پائیں، میں اندر سے کیا ہوں۔ اس شافعہ! کیا واقعی آپ میرے بارے میں اتنی بری رائے رکھتی ہیں؟“

مومنہ نے اچانک فون اچکنے پر احتجاج کرنا چاہا، مگر شہریار پر نظر پڑی تو وہ اعصاب ڈھیلے ڈال کر اُسے بات کرتا دیکھنے لگی اور دوسری طرف شافعہ تھی، اتنے اچانک جملے پر پہلے تو لڑکھڑائی، پھر سنبھالا لے کر بولی۔

”روز ملتی ہوں تو بھی کیا، مسٹر شہریار ہم روز کچھ گنی چنی باتوں پر ہی ڈسکشن کرنے کے سوا کرتے ہی کیا ہیں۔ حالاتِ حاضرہ، عالمی طاقتوں کی جنگ، بزنس مارکیٹ پر سیر حاصل تبصرے کے علاوہ ہماری گفتگو کا لب لباب نکلتا ہی کیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں، ان باتوں سے کسی انسان کو نہیں جانچ سکتا۔“

”کیوں نہیں جانچ سکتا مس شافعہ! جبران تو کہتا تھا، ہم جو چھوٹے چھوٹے مکالمے بولتے ہیں، وہ ہمارے اندر ہماری ذات کو ظاہر کرنے کے چھوٹے چھوٹے روشندان ہوتے ہیں، جہاں سے پورے کے پورے ہم جھانکتے ہیں، اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ میرے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتیں۔ مس شافعہ! یہ انصاف نہیں ہے۔“ اُس سے کوئی بات نہیں بن سکی تو وہ بات بدلنے کو بولی۔ ”آپ مومنہ کے ساتھ ہیں شہریار صاحب۔“

شہریار اُس کی چالاکی پر ہنس پڑا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”کل میم عافیہ کے بالکل فلمی انداز میں مومنہ کے ملن کی خوشی میں ایک رول پاس ہوا کہ مومنہ صاحبہ! انوشے اور رائمہ، علینہ کے لئے میں ون اینڈ اونلی بھائی کا رول پلے کروں گا۔ انوشے اور علینہ بجو تو بڑی بہن بننے پر مصر ہیں، اس لئے رعب گانٹھنے کے لئے تین ہی ملی ہیں، سو بہت مزے میں ہوں۔ رہا اس وقت مومنہ کے پاس ہونے کا سوال تو جناب مومنہ میرے پاس ہیں، مائنڈ اِٹ، شو آرگنائز کرنے کے لئے اس وقت دفتر کا ایک گروپ میرے پاس ہی موجود ہے، جسے مومنہ لیڈ کر رہی ہیں۔“

”یقیناً یہ گروپ لڑکیوں پر مشتمل ہوگا۔“ اُس نے پھر زبان کو چٹخارہ دیا۔ پتہ نہیں، اُسے چڑانے میں کیا مزہ مل رہا تھا، مگر وہ چڑا نہیں تھا، قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا تھا۔ پھر ہنسی تھمی تو شرارت سے بولا۔

”آپ بالکل ٹھیک آپشن پر پہنچی ہیں مس شافعہ! اگر میں شاہ رخ ہوتا تو ایک کروڑ آپ کو ضرور دیتا، مگر ریکارڈ درست فرمائیے لڑکیوں کا گروپ اس لئے میرے ساتھ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں، آدمی کے مقابلے میں عورت میں کریٹیویٹی کی ایک حس زیادہ ہوتی ہے، سو بس اتنی سی بات ہے اور آپ مجھے کہاں سے کہاں ملائے دے رہی ہیں۔“ لمحہ بھر کو رکا، پھر مدھم لہجے میں مکرر بولا۔ ”مس شافعہ! کیا واقعی آپ

مجھے اتنا برا انسان مانتی ہیں؟“

”اُفوہ شہریار صاحب! ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔“

”ارے واہ! آپ کا مذاق اور ادا ٹھہری اور یہاں کوئی جان سے جاتے جاتے بچا ہے۔“

”شہریار صاحب! خیریت تو ہے، آج آپ ہمیشہ سے بہت مختلف بول رہے ہیں۔“

وہ پھر سے ہنسا، پھر سرخوشی سے بولا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں مس شافعہ! بتائیے، کیا آج آپ اپنی شام میرے نام کریں گی؟“

”جی شہریار صاحب!“ وہ اچنبھے میں رہ گئی۔ یہ اُس شہریار کی ٹون نہیں تھی، جس سے وہ اکثر کافی ان میں ملا کرتی تھی۔ اس طرف خاموشی نے سر پکڑا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں کہا گیا تھا۔

”میرے جملے کا غلط مطلب مت لیجیے گا مس شافعہ! میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں، آج آپ ہوٹل ریڈیانی ضرور آئیے گا۔ آپ سے انتظام پر داد لینی ہے میں نے۔ اور ایک بات اور آج کے شو کو میں ہوسٹ کر رہا ہوں، سو اچھے سننے والوں کی مجھے سخت ضرورت ہے۔“

شافعہ بے ساختہ ہنس پڑی، پھر مسکرا کر بولی۔ ”آپ تو اپنی اعلیٰ قیادت ہو گئے شہریار صاحب! اپنی ہی تعریف میں رطب اللسان، یہ بری بات ہے اور یہ بھی سوچیے، اگر کسی نے سوال اُٹھایا، اچھے سننے والوں کی لگن رکھنے والے شہریار صاحب کیا اچھا بولنا بھی جانتے ہیں تو کیا جواب دیں گے آپ؟“

”کیا جواب دوں گا، اُسے میں بہت محبت سے کہوں گا، آئیے ناں، مجھے پلیز! آ کر سنئے پھر فیصلہ کیجیے۔“ وہ رُکا، پھر بولا۔ ”بتائیے ناں شافعہ! آپ آئیں گی ناں؟“

شافعہ نے کافی دیر تک سوچا، ہونیا کے معاملے کی وجہ سے دل اتنا مکدر تھا کہ وہ کہیں آنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی، مگر پھر بھی اس نے شہریار کی خواہش کو طرح دے کر ہامی بھر لی تھی۔

فون آف ہو چکا تھا، مگر وہ پھر بھی ایک سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ مومنہ ہی نے اُسے شانہ ہلا کر چونکایا تھا۔ وہ اُس کی شریر آنکھوں کی تحریر پڑھ چکا تھا، مگر نظر چرا گیا تھا اور مومنہ تھی، بہت رازداری سے بولی تھی۔

”اگر بات یہاں تک آ پہنچی ہے تو مجھے بتائیے سر! میں آپ کے دل کی بات بہت آسانی سے اس تک پہنچا سکتی ہوں۔“

ہنستے ہنستے اُس کا چہرہ یکدم پھیکا پڑ گیا۔ یکدم اُسے دانیا بہت شدت سے یاد آ گئی تھی۔ کبھی دانیا اتنی بے تکلفی سے مومنہ کی طرح اس سے مخاطب رہا کرتی تھی، مگر اب کتنے دن، کتنے ماہ سے اُس نے اُس کی

آواز بھی نہیں سنی تھی۔

"مس مومنہ! میرے خیال میں اب ہمیں کچھ کام کر لینا چاہئے۔" وہ پتہ نہیں خود بخود کیوں رُوڈ ہو گیا۔ مومنہ نے اچنبھے سے اُس کے بدلتے تیور دیکھے تھے مگر وہ ایسا سنجیدہ ہو گیا تھا، جیسے کبھی مسکرایا بھی نہ ہو۔

سب لڑکیاں اُس کے ساتھ مصروف تھیں۔ پھر یہی کوئی ساڑھے سات بجے مسٹر عبدالرحمٰن اور سالار عبدالرحمٰن نے مہمانوں کو ریسیو کرنا شروع کر دیا تھا۔ شہریار بظاہر مصروف تھا لیکن اُس کی نظر داخلی دروازے پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ مومنہ اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔ تبھی کونے میں جا کر اُس نے پھر سے شافعہ کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری بیل پر اُس نے ریسیو کیا تھا۔ مومنہ نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

"کہاں ہو تم؟ یہاں مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں اور تمہارا ابھی تک دور دور تک پتہ نہیں ہے۔"

شافعہ نے ڈپٹ سنی تو نرمی سے بولی۔ "اچانک آج ایک گھنٹے کی ڈیوٹی لگ گئی ہے مومنہ! مجھے آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔"

شافعہ نے سر ہلایا تھا اور اس وقت کسی کے نرم ہاتھوں نے اُس کا شانہ چھوا تھا۔ "کیسی جا رہی ہے تیاری؟ نروس تو نہیں ہو؟"

وہ مڑا اور پھر مسکراہٹ نے اُس کے چہرے کو ڈھانک لیا۔ "مام! آپ...... مجھے واقعی آپ کا بہت شدت سے انتظار تھا۔"

"مگر سر! آپ کو کسی اور کا بھی تو شدت سے انتظار ہے شاید۔"

"مومنہ! پلیز....." اُس کی شرمگیں مسکراہٹ ماما کو حالِ دل کہنے سے نہیں روک سکی تھیں۔

"کون ہے وہ؟ مجھ سے ملواؤ گے؟" مام نے ماؤں والے چاؤ سے پوچھا اور وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

"آئے گی تو ضرور دکھاؤں گا۔ ویسے پتہ نہیں، آپ کو پسند آتی بھی ہے یا نہیں۔"

"واہ، کیسے پسند نہیں آئے گی؟ تمہاری چوائس بری تو نہیں ہو سکتی۔" مام نے اتنے یقین سے کہا کہ اس کے چہرے پر اطمینان پھیلتا چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، مومنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"سر! جائیے، اسٹیج کی بیک سے کیو دیا جا رہا ہے کہ آپ فوری بیک اسٹیج پر پہنچیں۔"

شہریار نے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ پھر مائیک سنبھالے اسٹیج کی اسپاٹ لائٹ میں آ کر کھڑا ہوا تو زور و شور سے تالیاں بجا کر اُس کا استقبال کیا گیا تھا۔

اُس نے فرشتلی پاپا کو اسٹیج پر انوائیٹ کیا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، جب اُس نے اُن کے لئے نظم پڑھی تھی۔

”کچھ لوگ سبز موسموں کی طرح

زندگی میں پھول کھلایا کرتے ہیں

خوشبو کی سوغات کو لے کر

چپکے چپکے یہ جیون مہکایا کرتے ہیں

ون اینڈ اونلی ڈیشنگ مین، مسٹر عبدالرحمٰن!“

پاپا کے چہرے پر اُس کے تعارف سے مسکراہٹ عود کر آئی۔ اُس نے بہت سلیقے سے انہیں خطاب کی دعوت دی تھی۔ پاپا روسٹرم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر ایک آفیشلی خطاب کے بعد بہت ساری تالیوں میں اس نے انہیں رخصت کیا تھا اور مائیک تھام کر بولا تھا۔

”ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہے۔ لوگ کہتے ہیں، مگر میں نے ایسا دیکھا ہے۔ کیونکہ ہم سب کی کامیابی کے پیچھے صرف ایک عورت کا ہاتھ ہے۔ اور وہ ہے میری مام، مسز عالیہ عبدالرحمٰن۔ پلیز مام......!“ اُس نے چمکتے بچے کی سی سرخوشی سے مام کو آن دی اسٹیج بلایا۔

مام کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ آج تک کی تقریبات میں انہیں کبھی بھی اتنے مان سے آن دی اسٹیج نہیں بلایا گیا تھا۔ اُن کے لئے ہمیشہ سے یہ بزنس پارٹی روکھی پھیکی سی ہوتی تھی۔ مگر آج ایک بہت خوشگوار یاد وہ یہاں سے لے کر جارہی تھیں، جیسے عمر بھر کی محنت کو کسی نے ایک لفظ میں سمیٹ دیا تھا۔ ”محبت“ یہ لفظ محبت تھا، جو شہریار کی آنکھوں میں تھا۔ مسٹر عبدالرحمٰن کے چہرے پر تھا۔ وہ صرف نیک تمناؤں کے اظہار کے سوا کچھ نہ کہہ سکی تھیں اور بھیگی آواز کے ساتھ لوٹ آئی تھیں اور ان کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوگیا تھا۔ وہ ہر ماڈل کے چہرے پر کوئی نہ کوئی شعر پڑھ دیتا اور مدعوئین اُس کی اس حسِ ذوق سے متاثر ہوتے چلے جاتے۔ بزنس اور شاعری بہت الگ ٹریک ہیں، مگر وہ کیا کرتا کہ شاعری اُس کے اندر تھی، اُس کے خون میں تھی۔

تقریب اپنے مد میں تھی، جب داخلی دروازے سے شافعہ داخل ہوئی تھی اور اُس نے نظریں اُس پر گاڑے شعر پڑھا تھا۔

"تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا"

شعر بے محل نہیں تھا۔ ریمپ اسٹیپ پر زرش تھی۔ سب نے اُس کے شعر کو داد دی تھی۔ مگر ماما نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اُس کے لہجے کی حدت صرف ماما نے محسوس کی تھی اور وہ گم تھا۔

نئی ماڈل نے اپنا اسٹیپ بھی نہیں لیا تھا کہ وہ گنگنانے لگا تھا۔

"تم جس خواب میں آنکھیں کھولو

اُس کا روپ امر

تم جس رنگ کا کپڑا پہنو

وہ موسم کا رنگ

تم جس پھول کو ہنس کے دیکھو

کبھی نہ وہ مرجھائے

تم جس حرف پہ اُنگلی رکھ دو

وہ روشن ہو جائے"

مومنہ نے گھبرا کے دیکھا تھا اور اس نے فوراً بات سنبھال لی تھی۔ "ہم جس سے محبت کرتے ہیں، ہمیں اس پر، اس کی محبت پر معجزے کا سا گمان ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں، وہ جو چاہے، بدل سکتا ہے، جو روپ چاہے، لے سکتا ہے۔ سوید ڈریس محبت کرنے والوں کے نام ریڈ اور سنہرے کنٹراس کے ساتھ...... ریڈ محبت کا رنگ، آپ اسے اپنی محبوب ہستی کے لئے گفٹ کر سکتے ہیں۔"

زوردار تالیوں میں اُس کے کمنٹ پر داد ملی تھی۔ وہ اپنی تھکا دینے والی ذمہ داری نبھاتا چلا گیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد تقریب کے اختتام پر بیگم عافیہ اور اُن کے ساتھ شامل افراد نے اس تقریب کے تھرو اپنے

کام میں کی جانے والی جانفشانی کی مختصر کہانی سنائی تھی اور تقریب کے اختتام پر کھانے کا آغاز کردیا تھا۔
شہریار آزادی ملتے ہی تیزی سے شافعہ کو نظر میں رکھے ہوئے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔مگر جب تک وہ اُس تک پہنچتا، وہ داخلی دروازہ کراس کرچکی تھی۔وہ مومنہ کے پاس جا کر رک گیا تھا۔
''کیا ہوا، شافعہ کھانا کھائے بغیر کیوں چلی گئیں؟''
مومنہ نے مڑ کر اسے دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔''وہ صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر یہاں آئی تھی۔آج لیٹ نائٹ ڈیوٹی ہے اُس کی۔''
شہریار مایوس ہوگیا تھا۔سالار عبدالرحمٰن اور جازی کلیکشن سیکشن میں چلے گئے تھے۔پریس فوٹوگرافر اُن کے ڈیزائن کردہ کپڑوں کے شوٹ لے رہے تھے۔چینلز کے کرواُن کے کلیکشن کا فوٹیج شہریار کے طے کردہ ویوز سے شوٹ کررہے تھے۔تقریب ہر سال کی طرح بہترین رہی تھی۔سب نے بیگم عافیہ کے ڈیزائنز کو خاص طور پر سراہا تھا۔لوگوں نے اس بار کی تقریب کی خوبی میں شہریار کو بھی نامینیٹ کیا تھا۔کئی ٹو ٹیکس نے اُن کے ڈیزائن کلیکٹ کرکے بزنس بھی دیا تھا۔بہر حال یہ تقریب اختتام پذیر ہوگئی تھی۔مہمان جاچکے تھے۔صرف شہریار بچا تھا یا اُس کے ورکرز، جنہیں اُس نے پارٹی دینے کے لئے روک لیا تھا۔وہ اُن کے پاس پہنچا تھا۔
''ہاں بھئی کہیے، کہاں ڈنر کریں گے آپ لوگ؟''
''سر! میرے خیال میں آج رہنے دیتے ہیں، آج آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔''
اُس نے مومنہ کی بات پر نفی میں سر ہلایا تھا۔''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔آپ بتائیے، کہاں ڈنر کریں گے؟''
سب میں ہوٹل کے نام کو لے کر اختلاف شروع ہوگیا، یہاں تک کہ اُس نے خودوژن کا نام لیا تھا۔
''سر! وہ بہت مہنگا ہوٹل ہے۔اور ہم پورے بائیس افراد ہیں۔''
''تو کیا ہوا؟'' اُس نے مومنہ کے احتجاج کو رد کردیا اور سب کو وین میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔پھر ہوٹل پہنچ کر ان ہی کی مرضی سے آرڈر دیا۔سب کھانے میں مگن تھے، جب اچانک ائیلہ نے کہا تھا۔
''سر! مجھے لگتا ہے، آپ کا شاعری کا نصاب بہت اچھا ہے۔پلیز، کچھ سنائیے ناں۔''

"ارے گلا تھک گیا ہے اسٹیج پر شعر پڑھ پڑھ کر۔ اب ہمت نہیں ہے۔ پلیز، پھر کبھی۔"

عمارہ نے فوراً اُسے ٹوکا تھا۔ "پھر کہاں سر! پھر کہاں موقع ملے گا؟ ہماری مصروفیات اور آپ کی مصروفیات اجازت کہاں دیں گی کہ اس طرح کی بے تکلف محفل سجائیں؟ کل تو ویسے ہی سر عبدالرحمٰن نے چھٹی اناؤنس کی ہے ناں، اس لئے ابھی ہمارے پاس ڈیڑھ گھنٹہ ہے، ابھی تو صرف ساڑھے دس ہوئے ہیں سر!"

وہ مسکرانے لگا تھا۔ پھر ابھی ردِعمل بنایا بھی نہیں تھا کہ اُس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

"پلیز سر! محفل سے یوں ہی اُٹھ کر مت جائیے گا، محفل کا مزہ خراب ہوگا۔"

اُس نے انیلہ کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "لوگ دنیا سے یونہی اچانک اُٹھ جاتے ہیں انیلہ! اور آپ محفل کے مزے کی بات کرتی ہیں۔"

مومنہ کی حجاب سے جھانکتی آنکھیں خفگی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ مومنہ میں دانیا کو یاد کرتا کال ریسیو کر رہا تھا۔

"کہاں ہے؟" سوال کیا گیا۔

"وژن......" اُس نے عاطف کے سوال کا اتنا ہی مختصر جواب دیا تھا کہ سب نے اُسے حیرت سے دیکھا تھا اور وہ اندر ڈوب گیا تھا۔ پھر اُس کی گمبھیر آواز اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ نظم پڑھ رہا تھا۔

"ہم ہیں آوارہ سو بسو لوگو!
جیسے جنگل میں رنگ و بُو لوگو!
ساعت چند کے مسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو!
تھے تمہاری طرح کبھی ہم بھی

رنگ و نکہت کی آبرو لوگو!
قریہ عاشقی سراچہ دل
گھر ہمارے بھی تھے کبھو لوگو!
وقت ہوتا تو آرزو کرتے
جانے کس شے کی آرزو لوگو!
تاب ہوتی تو جستجو کرتے
جانے کس کس کی جستجو لوگو!
کوئی منزل نہیں، رواں ہیں
ہم مسافر ہیں، بے ٹھکانہ ہیں
ہم مسافر ہیں......'' اُس نے آخری مصرعہ دوبارہ پڑھا، پھر آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ سامنے کی کرسی پر جہاں عمارہ بیٹھی تھی، وہاں عاطف بیٹھا تھا اور اُس نے اُس کی یہ نظم بہت آہستگی سے موبائل میں ریکارڈ کرلی تھی۔
''تم یہاں؟......میں تو سمجھا......'' اسپیس دے کر جملہ مکمل کیا اور وہ مسکرا کر بولا۔
''سالار بھائی سے پتہ کیا تھا، انہوں نے اس ڈنر کا بتایا، مگر صحیح لوکیشن نہیں بتائی تھی۔ سو میں یہاں آگیا تو تمہیں کال کرکے نام پوچھا۔ حیرت انگیز طور پر میں وژن کے سامنے ہی تھا، اس لئے تمہاری نظم سننے کا شرف حاصل کرسکا۔''
سب مسکرانے لگے۔ شہریار خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی آمد غیر متوقع سہی، بے وجہ نہیں تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟ مجھے پتہ ہے، ایک نظم سے تیرے منہ کے چھالے نہیں پھوٹے ہوں گے۔ کوئی اور اچھی نظم سنا۔" اُسے کیودے کرور کرزی طرف مڑا اور بولا۔

"آپ کا باس بہت اچھا شاعر بھی ہے۔ آپ کو پتہ ہے، نہیں ناں؟ لیکن شہریار عبدالرحمٰن پوری یونیورسٹی کے روحِ رواں ہوا کرتے تھے اور شاعری نصابی کتابوں سے بھی زیادہ ضروری سبجیکٹ ہوا کرتی تھی ان کا۔"

"کیوں سر! کیا سر عاطف ٹھیک کہہ رہے ہیں؟"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا اور اب کی بار انیلہ نے فرمائش کی تھی۔

"ارے بھئی مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہی۔" اُس نے جان بچائی اور مومنہ نے کہا۔

"سر! اُس دن آپ ایک نظم گنگنا رہے تھے، وہی سنا دیجئے ناں، وہی نظم اے عمرِ رواں آ پاس میرے"

"آپ نے مجھے یہ نظم کب گنگناتے ہوئے سنا مس مومنہ؟" اسے حیرت ہوئی۔ اور مومنہ شوخی سے اسے دیکھ کر بولی۔

"سر! اُس دن آپ کیفے اِن سے دفتر آئے تھے۔ شاید کوئی فائل بھول گئے تھے آپ اور کبڈز میں، ریکس میں فائل ڈھونڈتے ہوئے آپ یہی نظم گنگنا رہے تھے، میں اس وقت دفتر سے آف کر رہی تھی۔ یونہی آپ کی آواز سے چونک کر کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے دیکھنا چاہا تھا، یہ آپ ہی ہیں یا کوئی اور۔ لیکن وہ آپ ہی تھے۔ سر پلیز! آپ کی آواز اس نظم میں بہترین ویلکم دیتی ہے۔ سنائیے ناں سر!" شہریار بری طرح پھنس گیا تھا اور سب نے بھی مومنہ کی حمایت کر دی تھی، سوائے نظم سنانی پڑی تھی۔ عاطف نے ایک بار پھر سے ریکارڈنگ کا آپشن آن کر دیا تھا۔

"اے عمرِ رواں

آ، پاس میرے

اِک راز کی بات بتانی ہے

اِک خواب سنانا ہے تجھ کو

اِک درد کی ٹیس جو دل میں ہے

اک رنگ دکھانا ہے تجھ کو

اے عمرِ رواں آ، پاس میرے

یہ نیم شبی کی خاموشی

یہ نیند کی پلکیں بوجھل سی

اک خوف سا ذہن و دل پر ہے

تنہائی مری چپکے سے کہے

اے عمرِ رواں آ، پاس میرے

تجھ سے فقط یہ کہنا ہے مجھے

رفتار کو اپنی دھیما رکھ

اک شخص سے ملنا ہے مجھ کو

ملنے کی گھڑی جو ٹھہری ہے

دو چار صدی یا اب کے برس

اے عمرِ رواں آ، پاس میرے"

وہ کہتے کہتے تھما اور عاطف بیگ نے مومنہ کو غور سے دیکھا۔

"واہ مومنہ جی! آپ نے تو جی کھڑا کر کے اچھی طرح ہی جاں سوا کر دی ہے۔ یہ خود کیا کم ہے آنے جانے کے ذکر سے چڑاتا ہوا، جو آپ بھی شامل ہو گئیں اسے بڑھاوا دینے کے لئے۔"

''میں نے تو سر! ایک فرمائش کی تھی۔'' مومنہ پزل ہونے لگی تو شہریار نے جواباً اُسے گھورا۔
''عاطف کے بچے! بچوں کو ستا مت۔ اچھا بھلا موڈ برباد مت کر۔''
سب کے چہرے اس کے کمنٹ سے پھر سے چمکنے لگے۔ شہریار نے کھانے کے بعد سب کو آئس کریم کھلائی تھی، پھر وین ان سب کو لے کر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ عاطف کے سامنے اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔
عاطف نے سگریٹ سلگائی تھی اور اُس نے اُس کے پاکٹ سے پیکٹ نکال کر اپنے لئے بھی سگریٹ سلگائی تھی۔
''تو نے تو کہا تھا، تو نے اسموکنگ چھوڑ دی ہے، کسی سے وعدہ کیا ہے۔''
''ہاں، لیکن کبھی کبھار ایک دو سگریٹ پینے کا نیا ترمیمی بل پاس کروالیا ہے۔ تو اس کی فکر مت کر۔''
عاطف نے مطمئن نہ ہوتے ہوئے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ ''نائمہ کا کیا ہوا؟ تم کہہ رہے تھے، مامون، نائمہ کو لوکیٹ کر چکا ہے۔''
''ہاں، وہ اب محفوظ ہاتھوں میں ہے۔'' لمحہ بھر کو رکا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''اگر مجھے اس کے محفوظ ہونے، اس اذیت سے چھوٹ جانے کا یقین نہ ہوتا تو زندگی کو اتنے مزے سے انجوائے کر سکتا تھا؟ ہر ہفتے میں دو تین دن کے لئے اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ دراصل وہ زوار حسن شاہ کے مخالف وڈیرے کے ہاں امانتاً رکھی گئی ہے۔ مامون کے ذریعے میں نے اسے حویلی کے باہر سے اس وقت اغواء کروالیا تھا، جب وہ زوار حسن شاہ کے خاص کمدار کے حکم پر اس کے لئے کھیت میں روٹی لے کر نکلی تھی۔ بالا زوار حسن شاہ کا منہ چڑھا ملازم ہے اور زیادہ تر اس کی اذیتوں کا سبب بھی۔ سو، زوار حسن نے اسے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ حویلی کی اس کنیز پر جس طرح چاہتا زور دکھا سکتا تھا، مگر...... مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا، اُس نے یہ ساری تکلیفیں کسے دی تھیں، نائمہ کو۔ مامون نے بہت اچھی طرح اس کی گوشمالی کر دی تھی۔ شاید اب وہ عمر بھر چل نہ سکے گا۔ مگر مجھے اس کی کسی تکلیف کا سبب بننے پر افسوس نہیں ہے۔ وہ یہی ڈیزرو کرتا تھا۔''
اس کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ عاطف کانپ گیا تھا۔
''شہریار! تم اتنے سفاک تو نہیں تھے۔''
''نہیں تھا۔ مگر نائمہ کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا ہے، اس پر ان کے ساتھ جتنا بھی برا ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا عاطف! اُسے، میں نے دیکھا تھا، وہ لڑکی...... وہ لڑکی را کھ بھی نہیں رہی

ہے۔اور جب پہلی بار میرے سینے سے لگ کر روئی تھی تو مجھے لگا تھا اس کے دکھ سے آسمان بھی رو پڑا ہوگا۔عاطف! میں جانا نہ اور زوار کسی کو نہیں چھوڑوں گا، سب کو اپنا حساب دینا ہوگا۔"
وہ کہتے کہتے تھما۔تبھی اُس کے موبائل پر عدیل بھائی کی آواز سنائی دی۔وہ گھبرائے ہوئے تھے۔"شہریار! ہوٹل سے نکلتے ہوئے شافعہ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔وہ بچ تو گئی ہے، مگر کار کی ٹکر سے لگنے والی چوٹیں ایسی ضرور ہیں کہ اسے ہسپتال میں کافی دن رہنا پڑے گا۔"
"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ وہ کس ہسپتال میں ہے؟"
"سٹی ہسپتال میں۔میں وہیں سے بول رہا ہوں تم آ رہے ہو ناں؟"
اُس نے عاطف کو سٹی ہسپتال چلنے کا کہا لیکن وہ ابھی ٹرن بھی نہیں لے سکا تھا کہ اُس کا موبائل پھر سے بجنے لگا تھا۔
"ہیلو......کون......؟"
"میں امین بول رہا ہوں سرکار! شاہ فیاض کی حویلی سے۔"
"اوہ، امین! بولو، کیا بات ہے؟"
"صاحب! غضب ہوگیا ہے جی۔آپ نے جس لڑکی کو یہاں پناہ دی تھی، وہ لڑکی خطرے میں ہے جی۔زوار حسن شاہ اور شاہ فیاض کے بیٹے امیر فیاض کے درمیان بالا ہی بالا معاملات طے ہو رہے ہیں جی۔زوار حسن شاہ، امیر فیاض کو ایک ہزار ایکڑ کی وہ زمین دینے پر تیار ہوگیا ہے جس کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں سالوں سے تنازعہ چلا آ رہا تھا۔میں نے یہ خبر ناممہ ڈھی کو بچانے کی وجہ سے دی ہے صاحب! اگر آ سکو تو آ جاؤ۔"
شہریار نے عاطف کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔پھر اُسے اُس نے دوسری سیٹ پر جانے کا عندیہ دے کر ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی تھی۔
"شہریار! اس طرح تنازعہ میں کود پڑنا حماقت ہے۔تمہیں عدیل بھائی کی مدد لینی پڑے گی۔" عاطف نے سمجھانے کی کوشش کی اور اس نے موبائل پر ماموں سے رابطہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔
"میں اس وقت لوکیشن پر ہوں، یہاں سے نہیں ہٹ سکتا۔تم......آخر تمہیں ایمرجنسی کیا آ گئی ہے؟" شہریار اُسے تفصیل دینے لگا اور ماموں نے تحیر سے پوچھا۔

''کہاں جارہے ہوتم؟''

''شاہ فیاض کی حویلی۔'' اُس نے دوبارہ دہرایا اور مامون کی شوخ آواز آئی۔

''مت آپھرتو یہاں۔میں ہینڈل کرلیتا ہوں۔ کیونکہ آج کل ہم اس گاؤں میں ریڈ پر ہیں۔''

مگر شہریار نے ارادہ نہیں بدلا تھا۔اس کی گاڑی اپنی سمت کی طرف اُڑی جارہی تھی کہ اچانک بے ہنگم شور کے ساتھ بند ہوگئی۔

''یہ کیا نئی افتاد پڑ گئی......لگتا ہے انجن جام ہوگیا ہے۔'' اگنیشن میں کی ڈال کر پھر سے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور عاطف نے تیزی سے سر ہلایا۔

''مت کرمحنت۔گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوگی۔''

''کیوں، اتنے یقین سے کیسے کہدیا ہے؟'' شہریار نے کوفت سے دیکھا اور وہ رینٹ اے کار کے دفتر پر رنگ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

''گاڑی رینٹ پر لی ہے۔صرف شہر کی حد تک بات طے تھی، اس لئے شہر کی حدود ختم ہوتے ہی ٹریکر سسٹم کے تحت خود بخود بند ہوگئی ہے۔'' عاطف کہہ کر دوسری طرف کی بات سن کر اپنی ایمرجنسی کلیئر کرنے لگا۔پانچ منٹ بعد کار دوبارہ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

''گاڑی ہمیشہ اپنی ہونی چاہئے۔'' عاطف اُس کے غصے کو شوخی سے دیکھتا چلا گیا۔شہریار اس وقت ڈاکٹر کی تمام تر احتیاط بالائے طاق رکھ کر اپنی زندگی کی سب سے رِیش ڈرائیونگ کررہا تھا۔یہاں تک کہ وہ 35 منٹ بعد ایریا میں پر پہنچے۔مامون نے اُسے موبائل پر کاشن دیا تھا۔گھپ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح لگ رہے تھے۔عاطف نے قطعی خود کو شہریار کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔وہ مامون کے کاشن پر پنسل ٹارچ کی روشنی کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔دس منٹ بعد وہ اس کے قریب پہنچے تھے۔

''نائمہ کا کیا رہا؟'' اس نے پہلا سوال کیا۔

مامون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زمی سے کہا۔''ہمارے دو ورکرز امین کی مہربانی سے حویلی میں گئے تو ہیں۔لیکن ابھی تک کوئی آنسر نہیں آیا ہے۔''

اُس نے تفصیل دے کر دونوں ورکرز سے رابطہ کیا، تبھی وائرلیس پر اُن کی آواز سنائی دی۔''سر! زوار حسن شاہ نے لڑکی کو لے جانے کے بجائے کسی طرح سے بے ہوش کردیا ہے۔سر امین بھی بری طرح

سے زخمی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، یہ امیر فیاض ہی نہیں، شاہ فیاض کی ایماء پر بھی ہوا ہے۔ لڑکی اور امین ہماری کسٹڈی میں ہیں۔ لیکن سر! جوابی طاقت کا استعمال کیے بغیر ہم باہر واپس نہیں آسکتے۔ کیونکہ اندرونِ خانہ امین کی حرکت کی سزا دیئے جانے پر غالب امکان ہے کہ وہ ہمیں آسانی سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ آپ کے حکم کا انتظار ہے۔"

مامون تھوڑی دیر کے لئے چپ رہ گیا تھا اور اسی وقت اُس کی فورس کے بندے کی پھر آواز آئی۔ "سر! یہ مسٹر فیاض آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم برے طریقے سے ٹریپ ہو گئے ہیں، سر! یہ سب سوچی سمجھی اسکیم تھی، زوار حسن شاہ نے ٹریپ کا پتا چلا ہے۔"

مامون نے سر سہلایا تھا، پھر وائرلیس پر مخاطب ہوا تھا۔

"مسٹر فیاض! اگر آپ سمجھتے ہیں، آپ نے ہمیں ٹریپ کر لیا ہے تو یہ غلط ہے۔ بقول آپ کے، آپ آج کی اس کارروائی کو پریس کے سامنے لائیں گے، بھونچال اُٹھا لیں گے تو اسے ہمیشہ یاد رکھئے، میں بھی ایک جاگیردار کا بیٹا ہوں۔ ایسے چھوٹے موٹے ٹوٹکے میرے پاس بھی رہتے ہیں۔ سوال گیم میں آپ کے ہی گیم میں آپ ہی کو ٹریپ کر دوں تو کیسا لگے گا؟ آپ کے خلاف لڑکی کے اغواء کا پرچہ درج کروانا اور اس کی بازیابی بہت سے سوال اُٹھا سکتی ہے۔ اور ایسی بازیابی کہ لڑکی اس بری حالت میں ملے، پولیس آپ پر سوال اُٹھا سکتا ہے۔ اگر آپ یہ معاملہ بھی دبا جائیں تو بھی زوار حسن شاہ کے گودام میں گندم کی بوریوں میں ڈرگس کی برآمدگی کا قضیہ بھی آپ پر تھوپنا میرے لئے مشکل نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں، ہم پولیس والے سیاہ و سفید میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی کم لگے تو گرین فائل کا حوالہ دے دینا بھی کافی ہونا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں، میں دوستی دشمنی میں اسی وقت انوالو ہوتا ہوں، جب ہوم ورک مکمل کر لوں۔"

"ٹھیک ہے، ہم لڑکی اور امین کو با حفاظت تم تک پہنچا رہے ہیں، مگر یہ کوئی آخری ٹرن نہیں ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا میری ہابی ہے۔"

مامون مسکرایا تھا، کچھ بولے بغیر اُس نے وائرلیس آف کر دیا تھا۔ پھر وہ شہریار کی طرف مڑا تھا۔

"سر عدیل بہت سخت باس ہیں۔ ان کی باز پرس سے بچنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت بھی میں نے جو بکواس کی، وہ صرف اندھیرے میں تیر پھینکا تھا، ورنہ سٹرینجر کی گرین فائل میں کیا ہے کیا نہیں، میں قطعی لاعلم ہوں۔ ہاں، بس ریڈ والی بات تک ٹھیک پتہ چلا تھا، میں....." لمحہ بھر کو رکا، پھر مزید بولا۔ "شیری کے بچے! مشکل میں آگیا ہوں میں۔ دوستی اور نوکری دونوں میں سے کسی کو چنا جا سکتا تھا اور میں نے دوستی کے حق میں ووٹ کاسٹ کیا ہے۔"

مامون کی فورس کے رکن شاہ فیاض کے وعدے کے مطابق آ پہنچے تھے۔ حویلی سے آنے والے رکن نے مامون کو سیلوٹ کیا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''سر! اگر وہ چاہتے تو امین اور لڑکی کو قتل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے مجھے لگتا ہے، اس معاملے میں ہماری توجہ بانٹنے میں بھی شاہ فیاض کی کوئی چال ضرور تھی، جو فی الحال سمجھ نہیں آ رہی۔''

مامون ابھی اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کے وائرلیس پر سگنل آنے لگا۔

''سر! مسٹر زوار ہم سے مس ہو گئے ہیں۔''

مامون نے ایک نظر شہریار کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''نائمہ کو تم جتنی جلدی شہر لے جا سکتے ہو، لے جاؤ۔ امین اور نائمہ کی حالت مجھے بہتر نہیں لگ رہی۔''

شہریار نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بولا۔ ''تمہارا کیا ہوگا؟''

مامون نے شوخی سے کہا۔ ''درجۂ شہادت پر متمکن ہونے سے مجھے آج کوئی نہیں روک سکتا۔ میرے بھائی مجھے سولی پر چڑھا دیں گے۔ پورے دس دن کی محنت خاک میں مل گئی ہے، زوار کے مس ہونے سے۔ ہمیں الگ معاملے میں انوالو کرنے کی وجہ یہی کارروائی تھی۔ لیکن خیر، پھر موقع ملے گا۔''

شہریار اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا اپنی کار کی طرف بڑھا تھا۔ عاطف نے اس بار ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور کار پوری رفتار سے اُڑی جا رہی تھی۔

آندھی طوفان بنے جو راستہ پہلے پینتیس منٹ میں طے کیا گیا تھا، اس وقت اس سے بھی زیادہ ریش ڈرائیونگ سے پچیس منٹ میں طے ہوا تھا۔ قریب ترین ہاسپٹل، کیئر ہاسپٹل تھا۔

شہریار، نائمہ کو بازوؤں میں تھامے ہوئے ایمرجنسی ڈور تک پہنچا تھا۔ اسے فوراً اسٹریچر مل گیا تھا۔ عاطف نے امین کے لئے بھاگ دوڑ کی تھی، مگر دونوں معاملات میں پولیس کی انوالومنٹ کی وجہ سے ڈاکٹرز نے کیس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر عدیل بھائی کو فون ملایا تھا، مختصر لفظوں میں ایمرجنسی کے بارے میں بتایا تھا۔ عدیل بھائی نے فون ڈاکٹر کو دینے کو کہا، پھر ساری ذمہ داری انہوں نے لینے کا عندیہ دیا، تب کہیں جا کر وہ نائمہ کو ایمرجنسی روم میں لے کر گئے تھے۔

''نائمہ کی کنڈیشن بہت خراب لگ رہی تھی، عاطف! وہ تھمے رک رک کر سانس لے رہی تھی کہ میرا اپنا دل رکنے لگا ہے۔ نائمہ...... نائمہ ٹھیک تو ہو جائے گی ناں؟''

عاطف نے شہریار کی طرف دیکھا۔ وہ تھکن سے بالکل چُور لگ رہا تھا، مگر پھر بھی اس کی سانس نائمہ میں اٹکی ہوئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر ضمیر اس کے قریب آئے تھے۔

"لڑکی کے ساتھ بہت زیادہ ناروا سلوک کیا گیا ہے۔شاید ڈرگز کی زیادہ مقدار دی گئی تھی۔کیا لڑکی ڈرگ لیتی تھی؟"

"نو سر! اسے مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔" شہریار رکا، پھر دوبارہ بولا۔" نائمہ بچ تو جائے گی ناں سر؟"

ڈاکٹر نے اُس کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔

"ہم جو کوشش کر سکتے تھے، کر چکے ہیں۔لیکن لڑکی کو سنبھلنے میں بہت عرصہ لگ سکتا ہے۔یہ بھی اس صورت میں اگر اسے ہوش آگیا تو۔"

شہریار نے بے یقینی سے ڈاکٹر کو دیکھا، پھر نائمہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"سوری مسٹر شہریار! اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔آپ چوبیس گھنٹے تک ان سے نہیں مل سکتے۔پلیز، آپ ویٹنگ روم میں جب تک آرام کر سکتے ہیں۔"

عاطف نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر اُس کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ پریشان ہو گیا۔" تجھے تو ٹمپریچر ہو رہا ہے۔"

"ہاں، شاید بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔"

عاطف نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور فکرمندی سے بولا۔" تیرے چہرے پر اتنی تکلیف، اتنی تھکن کیوں ہے؟ کہیں پھر سے درد تو نہیں ہو رہا؟"

شہریار نے کپکپاتے ہوئے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مدھم لہجے میں بولا۔" بے تو کچھ ایسی ہی بات، لیکن آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا تو ٹینشن مت لے۔"

وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔عاطف اُس کے پیچھے لپکا تھا۔" ہم ہسپتال میں کھڑے ہیں۔اگر ضرورت محسوس کر رہا ہے تو میں ڈاکٹر سے کنسلٹ کر لیتا ہوں۔"

" کہہ دیا ناں، سب ٹھیک ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔مگر اندرونی تکلیف اپنی جگہ ہلائے دے رہی تھی۔آج اس نے خود کو ضرورت سے زیادہ تھکا لیا تھا۔اتنی ریش ڈرائیونگ کی تھی، اب اثرات تو ظاہر ہونے ہی تھے۔صبح آٹھ بجے کا جاگا ہوا تھا اور اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"یار عاطف!" کافی دیر بعد اُس نے رسالہ دیکھتے ہوئے عاطف کو مخاطب کیا اور وہ چونک کر دوسرے صوفے سے اُٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"کیا ہوا، اپنی تھنک رائٹنگ؟"

اُس نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ”درد بڑھتا جا رہا ہے یار!...... کہیں سے پانی مل جاتا تو میں اپنی دوا لے لیتا۔“

”پانی...... ابھی لایا۔“ عاطف بجلی کی تیزی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔ پانچ منٹ بعد جب وہ کینٹین سے منرل واٹر کی بوتل خرید کر لایا اس وقت شہریار صوفے سے پشت ٹکائے ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ اے سی کی کولنگ کے باوجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

”شیری!...... شہریار!“ عاطف نے اُس کا شانہ ہلایا۔ شہریار نے خمار آلود آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ اس سے منرل واٹر کی بوتل لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر کراہتے ہوئے صوفے پر لڑھک گیا۔

”شہریار...... ڈاکٹر!“ عاطف پاگلوں کی طرح چیخا تھا۔

میل نرس کی مدد سے فوراً اُسے ایمرجنسی روم کی طرف لے جایا جانے لگا تھا۔ عاطف اس کے اسٹریچر کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ مگر ایمرجنسی روم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

دروازہ بند ہو گیا تھا اور عاطف باہر کھڑا بالکل سرد ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنے پاس کسی کو بلانے تک کا ہوش نہیں تھا۔ وہ گم صم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، جب شہریار کے موبائل پر بیپ آئی۔

”ہیلو!“

”ہیلو شہریار! نائمہ کیسی ہے بچے؟“ عدیل بھائی کی محبت میں ڈوبی آواز سنائی دی اور عاطف بیگ حوصلہ کھو بیٹھا۔

”عدیل بھائی!...... میں عاطف۔ عدیل بھائی! پلیز، یہاں جلدی آ جائیں۔ شہریار کو یہاں اچانک پین اٹیک ہوا ہے۔ وہ ایمرجنسی روم میں ہے۔“

”کیا بکواس کرتے ہو......“ عدیل بھائی کی آواز کانپ گئی تھی۔ فون بند کرنے کے تیس منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھے۔

”ہوا کیا تھا؟ تم لوگ ہوٹل سے اتنی دُور کیا کرنے آئے تھے؟“

عاطف انہیں تفصیل بتانے لگا۔ عدیل بھائی کے چہرے پر تفصیل سن کر تفکر پھیل گئی۔

”شاہ فیاض کی حویلی سے کسی کو اس طرح لے آنا کریٹیکل چیویشن ہے۔ ماموں اور میرے لئے اس کا ریزن دینا بہت مشکل ثابت ہوگا۔“ وہ تھکے، پھر سر جھٹک کر بولے۔ ”دیکھا جائے گا سب۔ یہ بتاؤ، اس کی طبیعت کیوں خراب ہوئی؟“

عاطف نے بے تحاشہ محنت کو اس کا سبب بتایا اور عدیل بھائی اس کے ساتھ ایمرجنسی روم کے باہر قطار سے لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہے تھے، جب اچانک ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر راشد نے فل یونیفارم میں عدیل عبدالرحمن کو دیکھا، پھر ساری توجہ عاطف بیگ کی طرف کر کے پوچھا۔

''آپ، مسٹر عاطف! مسٹر شہریار کے ساتھ ہیں؟''

''جی سر! بتائیے، وہ اب کیسا ہے؟''

''شاید پین کی شدت کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ اب تو اُن کی پلز بالکل ٹھیک ہیں۔ ویسے مسٹر عاطف! آپ خوش قسمت ہیں جو وقت سے بہت پہلے یہاں موجود تھے۔ ورنہ یہ پین اٹیک شدید ترین ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا تھا۔ ویسے مسٹر شہریار کو یہ تکلیف کب سے ہے؟''

''گزشتہ سات سال سے وہ انجائنا پیشنٹ ہے سر!''

''صرف انجائنا پیشنٹ......؟ مگر مسٹر عاطف! اُن کے کوٹ سے جو دوائیں نکلی ہیں، وہ تو کچھ اور شو کر رہی ہیں۔''

عدیل بھائی کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ''کیا...... کیا پرابلم ہے اسے؟''

ڈاکٹر راشد نے عاطف بیگ سے توجہ ہٹا کر اُن کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''وہ انتہائی کریٹیکل کنڈیشن کا شکار ہیں سر! اُن کے ایمرجنسی میں لئے گئے ٹیسٹ بتاتے ہیں، انہیں مائل ہیکو بھی آ چکے ہیں اور ان کی دواؤں کی ہائی پوٹینسی بتاتی ہے، انہیں ان کے ڈاکٹر نے بائی پاس کا مشورہ بھی دیا ہوگا۔''

عاطف کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ عدیل بھائی بھی اندر سے ہل کر رہ گئے تھے۔

''اتنی محبت مت کیجیے عدیل بھائی! آپ کے لئے بہت مشکل ہو جائے گی۔'' عدیل بھائی کے اندر اس کا کہا گیا فقرہ شور مچاتا پھرا۔ وہ کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔

یہ لڑکا...... یہ لڑکا پتہ نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کوئی بہت سپر ہیومن ہے کیا؟...... وہ اس سے آپ ہی آپ لڑنے لگے تھے۔ عاطف

بیگ سکتے کی کیفیت میں اُن کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''ابھی ہوں تو اترا ہٹ ختم نہیں ہو رہی، پھر ملاتا رہنا یہ نمبر، قیامت تک آواز کو ترسے گا۔'' اُس کے ہاتھ میں اس وقت بھی اُس کا موبائل اور اُس کا والٹ تھا۔
''اسے کچھ نہیں ہوگا ناں عدیل بھائی؟'' عاطف کی آواز لرز رہی تھی۔
عدیل بھائی خود ضبط کے باوجود اپنی نمی نہیں چھپا سکے تھے۔ انہوں نے عاطف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر دو گھنٹے بعد وہ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا، جب انہوں نے اس سے چڑ کر کہا تھا۔
''بہت برے ہو شہریار تم۔ آخر اکیلے اکیلے دُکھ سہنے میں کیا مزہ ملتا ہے تمہیں؟''
اُس نے تھکے ہوئے انداز میں اُنہیں دیکھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ ''دُکھ ہمیشہ اکیلے میں سہنا آسان رہتا ہے۔ اب دیکھئے، آپ اور عاطف نے ذرا سی دیر میں خود کو ہراساں کر کے کس حال کو پہنچا لیا ہے۔ ڈونٹ وری بڑے بھیا! معمولی سا پین اٹیک تھا یہ، اور بس۔''
''تم نہیں سدھرو گے۔ شہریار تم کبھی نہیں سدھرو گے۔'' عدیل بھائی کی آواز بھرا گئی تھی۔
اُس نے بائیں ہاتھ سے اُن کے رخسار کو چھوا تھا، پھر مدھم بولا تھا۔ ''اب سدھرنے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں ہے بڑے بھیا! اس لئے محنت کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ویسے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔''
''ہاں، لگ رہا ہے، واقعی تو بالکل ٹھیک ہے۔'' عاطف نے اُسے لگی ڈرپس کی طرف طنز سے اشارہ کرتے ہوئے جھلا کر کہا اور وہ دھیرے سے ہنسنے لگا۔
''اچھا، ابھی ٹھیک نہیں ہوں، دو چار گھنٹے میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔ یہ بتائیں نائمہ کی پروگریس کیسی ہے؟''
عاطف بیگ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ اُس کی پریشانی میں نائمہ کو تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔
''میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔'' عاطف بیگ تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا اور شہریار، عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر پھیلے ہوئے غصہ اور خفگی کے ملے جلے تاثرات سے ہراساں ہوتا رہا۔
''مجھے لگتا ہے اس وقت تمہیں صرف مام ٹھیک کر سکتی ہیں۔'' عدیل بھائی نے موبائل نکالا۔
''پلیز عدیل بھائی!'' اُس نے تیزی سے ڈرپس والے ہاتھ سے انہیں روکنے کی کوشش کی اور کلائی سے سوئی کے ہلنے سے خون رسنے لگا۔
''شہریار! میں تمہارا کیا کروں بچے!'' عدیل بھائی نے موبائل ریک پر رکھ کر ایمرجنسی کا بٹن دبایا۔ نرس تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ ڈرپ کی سوئی نکال کر اس نے خون صاف کیا، پھر نئے سرے سے نس

ڈھونڈ کراس نے ڈرپ لگادی تھی۔
"پلیز، احتیاط کیجیے مسٹر شہریار! آپ تو پڑھے لکھے انسان ہیں۔"
عدیل بھائی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مکمل اس سے خفا تھے۔
"شافعہ کیسی ہے بھائی؟"
عدیل بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اُس نے ہولے سے انہیں پکارا۔"ناراض ہیں آپ؟"
"کیا اب بھی بتانا پڑے گا کہ شہریار صاحب! میں آپ سے سخت ناراض ہوں؟" وہ جلبلائے۔
اُس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔"پلیز! ناراض مت ہوا کریں بڑے بھیا! جتنا وقت محبت میں کٹ جائے، وہی اچھا ہے۔" اُس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ڈرپ میں ملی دوائیں اُسے ایک گہری نیند کی طرف لے جارہی تھیں۔
"عدیل بھائی! آپ بہت اچھے ہیں۔"
عدیل بھائی جو اس کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھے تھے، اس کے لہجے پر پگھل کر مڑے تھے، مگر اس کی آنکھیں اس وقت تک بند ہو چکی تھیں۔
"شہریار!.......شہریار!......" انہوں نے گھبرا کر اُس کا شانہ ہلایا، پھر گھبرا کر وہ باہر نکلے۔ نرس نے اُن کی کمپلین پر کمرے کا وزٹ کیا، پھر مسکرا کر بولی۔
"سب کچھ ٹھیک ہے مسٹر عدیل! صرف دواؤں کی وجہ سے غنودگی میں چلے گئے ہیں، اور بس۔"
عدیل عبدالرحمن اس پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ اس کے وہ سارے ذو معنی جملے جن کو سن کر ان کے اندر ایک خطرے کا الارم بجا تھا، ایک کے بعد ایک یاد آئے جارہے تھے۔ ان کا دل اس کے لئے محبت سے بھر گیا تھا، مگر ساتھ ساتھ خفگی کا تاثر بھی اتنا کڑا تھا کہ وہ اسے آسانی سے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

عاطف، نائمہ کی پروگریس لے کر آ چکا تھا۔ نائمہ ہوش میں تھی۔ عدیل بھائی کچھ دیر کے لئے اسے بھی تسلی دینے گئے تھے۔ مگر اب مکمل اُن کی توجہ اس دشمن جاں کی طرف تھی۔
صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ انہیں جمائیاں آ رہی تھیں جب صبح آٹھ بجے اُس نے کراہ کر خود ہی آنکھیں کھولی تھیں۔
عدیل عبدالرحمٰن نے کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھے تھے، جب عاطف نے بڑھ کے پوچھا تھا۔
''ناؤ یو فیل بیٹر؟''
شہریار نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں اب۔'' اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ عدیل عبدالرحمٰن نے پھر بھی ردِعمل نہیں دیا تھا، مگر خفا آنکھیں اُس پہ اس طرح مرکوز تھیں کہ وہ پھر تکیے پر سر ڈال کر لیٹ گیا تھا۔
''کیا پکی پکی ناراضگی ہو گئی ہے عدیل بھائی؟'' اُس کی آواز میں اب بھی خمار تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن کو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح کا ردِعمل دیں۔
''مان جائیے ناں، اتنے پیار سے ویسے میں نے آج تک کسی کو نہیں منایا ہے۔''
''پھر کیا میں اس خوشی میں بھنگڑا ڈالوں کہ یہ اعزاز آپ نے مجھے بخشا ہے؟''
''بڑے بھیا!'' اُس نے ٹینس ہو کر انہیں دیکھا۔ وہ اب تک کی خفگی کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا، مگر عدیل عبدالرحمٰن کا مزاج واقعی بہت گرم ہو گیا تھا۔ جب تک اس کی طبیعت خراب تھی، ان کی جان آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی اور اب وہ ٹھیک تھا تو وہ پھر سے خفگی میں سمٹ گئے تھے۔
''عاطف! تم یہاں ہو ناں؟ مجھے دفتر میں کچھ کام ہے۔'' وہ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بار عاطف نے بھی انہیں اچنبھے سے دیکھا تھا۔
''عدیل بھائی!'' وہ اب کے بستر سے بہت تیزی سے اُٹھا تھا۔
عدیل عبدالرحمٰن دروازے سے لوٹ آئے تھے۔ ''کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟'' انہوں نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر روک لیا تھا۔ اس کی کلائی سے ڈرپ نیڈل کی وجہ سے پھر خون رس گیا تھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ عدیل بھائی کو غصہ برقرار رکھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے کندھوں سے تھام کر گلے لگا لیا تھا۔

”تم سے زیادہ ضدی اور خودسر انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“

وہ اُن کے کندھے سے آنکھیں رگڑنے لگا۔ ”پھر تو آتی خاص اپرچونٹی پر آپ کو مجھے سراہنا چاہیے، نہ کہ خفگی دکھا کر بور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں تمہیں بتاتا، خفگی کس چڑیا کا نام ہے۔“

”شکر ہے میری طبیعت ناساز ہے، ورنہ آپ ......آپ بہت ظالم ہو بھائی!“

”میں ظالم ہوں یا تم ظالم ہو؟“ اب کی بار انہوں نے لحاظ کیے بغیر اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے تھے۔ اس نے سسکاری بھری تھی اور عاطف بے قراری سے آگے بڑھا تھا۔

”بڑے بھیا! اسے درد ہو رہا ہے ناں۔ پلیز اس کے بال چھوڑ دیجیے۔“

شہریار نے چونک کر اس کے چہرے کے پھیکے پن اور آواز کی حد درجہ کمزوری کو نوٹ کیا تھا۔ عدیل بھائی نے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

”شام کو واپس آؤں گا۔ تم آرام کرو۔“

”آپ گھر میں کیا کہیں گے؟“

”تم بتاؤ، کیا کہنا چاہیے؟“ عدیل عبدالرحمٰن نے اُلٹا اس سے ریزن پوچھ لیا تو وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”کیا ریزن دوں! افوہ آپ یہ کہہ دیجیے گا، اچانک عاطف کا بائیک ایکسیڈنٹ ہوگیا، اس لیے ہوٹل سے نکلتے ہی میں ایمرجنسی میں پنڈی چلا گیا ہوں۔“

”دیکھ رہے ہو عاطف! یہ لڑکا کتنا سٹوپڈ ہے۔ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے تمہارے استعمال سے بھی دریغ نہیں کر رہا۔“

”کرنے دیجیے ناں عدیل بھائی! یار ہے اپنا۔ اسے ہر طرح کا اختیار ہے میری زندگی پر۔“

اب کی بار شہریار نے چڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”یہ جنون ہے ناں ریشمہ عظمٰی والی، اسے بدل۔ مجھے تو لگ رہا ہے، جیسے میرے پاس وقت ختم ہوگیا ہے اور تُو ہیرو کے دوست کی طرح میری ہر خواہش پر آمنا صدقنا کر کے مرتے مرتے بھی خوش و خرم رکھنا چاہتا ہے مجھے۔ اماں یار! پریکٹیکل بنو، یہ دوستی اور محبت میں صرف محبت ہو تو اچھی لگتی ہے۔ محبت میں رحم دلی اور ترس کھانے والی حالت، مجھے نفرت ہے اس

حالت ہے۔"

عدیل عبدالرحمن نے عاطف کو دیکھا تھا، عاطف نے شہریار کو، مگر وہ کوئی کمنٹ دیئے بغیر باہر نکل گئے تھے۔ شہریار کو لگ رہا تھا، وہ اس سے ابھی تک ناراض ہی گئے ہیں۔

عدیل عبدالرحمن کے باہر نکلتے ہی شہریار نے عاطف کی طرف دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "نائمہ کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

عاطف اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا، پھر نرمی سے بولا۔ "ڈاکٹرز کے خیال میں اُس کی ریکوری بہت بہتر ہے، لیکن زیادہ تر پرابلم اُس کی ذہنی وقلبی تکلیف کی وجہ سے برقرار ہے۔ اور ہاں، وہ مسلسل تمہارا ابھی پوچھ رہی ہے۔"

شہریار نے پُرخیال انداز میں اس کو دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "چلو، میں پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں نائمہ سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

عاطف کے چہرے پر غصہ آیا مگر ایک لمحے کے لئے، پھر وہ دوبارہ سے بیٹھے لہجے میں بولا۔ "مجھے لگتا ہے، ابھی تمہیں سخت آرام کی ضرورت ہے۔ میں نائمہ سے تمہاری مصروفیت کی بابت کوئی نہ کوئی بہانہ کرلوں گا۔"

"پاگل ہوئے ہو، مصروفیت کا بہانہ سن کر وہ میرے بارے میں کتنی غلط رائے رکھے گی۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو، اس وقت اسے اپنوں کی مورل سپورٹ کی جتنی ضرورت ہے، اگر وہ نہ ملی تو ساری زندگی کے لئے اس کے اندر ایک گرہ رہ جائے گی۔" اس نے بستر سے پیر لٹکائے اور عین اسی وقت ڈاکٹر اور نرسز اندر داخل ہوئے۔

"مسٹر شہریار! یہ کیا؟....... آپ کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہے تو سر! لیکن وہ میری سسٹر نائمہ کو میرے آرام سے زیادہ میری ضرورت ہے اس وقت۔"

"مس نائمہ، اوہ ہو...... تو وہ آپ کی سسٹر ہیں؟"

"جی، ایسا ہی سمجھ لیجئے۔" کہہ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جیسے اس کے کمنٹ کا انتظار کر رہا ہو۔ ڈاکٹر نے نرس کے تجویز کردہ انجکشن کے لئے اس کی شرٹ کی آستین کو فولڈ کیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن کے پندرہ منٹ بعد پھر سے پلس کاؤنٹنگ کی، بلڈ پریشر لیا، پھر نرمی سے بولا۔

"اوکے مسٹر شہریار! آپ کے پاس وجہ اتنی سولڈ ہے کہ مجھے اجازت دینی پڑے گی۔ مگر پلیز! کسی بھی قسم کا اسٹریس مت لیجئے گا، ورنہ آپ کی طبیعت پھر بگڑ سکتی ہے۔"

شہریار نے سر ہلاتے ہوئے شرٹ کے کف بند کئے اور بہت دھیرے سے بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے شوز کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے کہ عاطف آگے بڑھ آیا تھا۔

''رہنے دے، میں پہنا دیتا ہوں۔ ڈاکٹر! اس کا جھکنا اس وقت سود مند نہیں ہے ناں؟''

ڈاکٹر اُس کے لہجے پر مسکرایا، پھر بولا۔''ڈاکٹری نقطہ نظر سے اس وقت ان کا ہلنا بھی سود مند نہیں ہے مسٹر عاطف! لیکن اگر یہ اپنے اسٹیمنا کا امتحان لینا ہی چاہتے ہیں تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔''

ڈاکٹر کہہ کر رکا نہیں تھا۔ مگر عاطف نے اس سلسلے میں ایک نہ سنی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور عاطف بیگ اُسے Socks پہنا رہا تھا۔ شہریار کو اُس کے انداز پر بے طرح ہنسی آ رہی تھی۔''عاطف کے بچے! اس وقت تو تُو بالکل فرمانبردار بیوی کی لک دے رہا ہے۔ میں کیا کروں گا تیرا؟''

''کیا مطلب، کیا کروں گا سے کیا مراد ہے تیری؟'' اُس نے شوز پہناتے ہوئے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا، مگر شہریار کی ہنسی یکدم ماند پڑ گئی تھی۔ ایک ان کہی تھی، جو ہونٹوں پر آ رہی تھی۔ آنکھوں سے بول رہی تھی۔ وہ دوسرا شوز بھی پہنا چکا تھا اور جان کر اس کی آنکھوں کی ان کہی سے منکر گیا تھا۔

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا۔ صرف ہولے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''پتہ نہیں، میں تجھے پھر کبھی یاد آؤں گا بھی یا نہیں، لیکن مجھے تیری یہ محبت بہت یاد آیا کرے گی۔ بہت مس کروں گا میں تجھے۔''

''بکواس نہیں، میں کہیں نہیں جا رہا تجھے چھوڑ کر۔ سو مس کرنے کا ارادہ خود ہی ختم۔''

''آ خاہ، زکریا بھائی نے سن لیا ناں یہ تو احتجاج کرتے کراچی چلے آئیں گے کہ ان کا ماہی منڈا کو اچ لیا ہے کراچی والوں نے۔''

''رہنے دے، میرے بھائی کو تو نہیں سمجھتا۔ وہ بہت نائس مین ہیں۔ اور پھر زکریا بھائی وہاں اکیلے کب ہیں، آصف اور راحیل بھی تو ہیں ان کے ساتھ۔''

''یعنی اس طرح تجھے فری ہینڈ مل گیا ہے کام چوری کا۔ ویسے تیری آمد.......'' اُس نے سوال کیا اور وہ ہنس دیا۔

''تجھے بتایا تو تھا، تصویر بھی بھیجی تھی۔ تُو نے پتہ نہیں، کیا یا نہیں؟''

شہریار اور وہ کوریڈور میں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ شہریار کی آواز بہت ہی مدھم تھی۔ اسے بات کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ پھر سوال خود اس کی اپنی غلطی سے اسی طرف آ گیا

تھا، جس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ سو دھڑکن خود بخود تیز ہوگئی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''تجھے معلوم ہے وہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ معلوم ہوتا تو تجھے کہتا کہ کراچی والے بائیو ڈیٹا پوچھ۔''

شہریار نے اُس کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''تجھے یہ لڑکی کہاں ملی تھی؟''

''ملی کہاں ہے، میری کزن پڑھتی ہے اس کے کالج میں۔ یہ بھی میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں ہے۔ وہی کزن کو لانے لے جانے میں دو ایک بار اسے دیکھا تھا۔''

''مگر تصویر تو موبائل سے کھینچی ہوئی لگ رہی تھی۔ کیا کالج کے باہر بھی اُسے فیکل کرتا رہا ہے؟''

عاطف نے مجرمانہ انداز سے سر جھکا لیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔

''یار! بس کیا کروں، اُسے دیکھ کر پہلی بار قابو نہیں رکھ سکا خود پہ۔ ہاں، کافی دفعہ اُسے فیکل کیا ہے میں نے۔''

''پھر کیا اندازہ لگایا تو نے؟'' وہ خود سے کچھ کہنے سے بچنا چاہتا تھا اور عاطف نے سر اُٹھا کر کہا۔

''لڑکی ذرا براڈ مائنڈڈ ہے۔''

''ذرا...... عاطف؟'' اُس نے تحیر سے دیکھا اور عاطف بے بسی سے بولا۔

''کیا کروں یار! جتنا میں خود سے کہتا ہوں، مجھے اس کے بارے میں نہیں سوچنا، مگر دل جان جان کر اسے یاد کرتا چلا جاتا ہے۔''

شہریار نے اس کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''کچھ تو معلومات ہوں گی تیرے پاس اس کی بابت۔''

''ہاں، کزن سے معلوم ہوا تھا۔ یہاں کراچی میں اس کی بہن ہے۔ اس کے پاپا ارسلان راشدی ہیں اور وہ خود دونوں کی زندگی سے خوش نہیں ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی شائق ہے۔''

''کیا...... کیا نام ہے اس کا؟'' شہریار کی مدھم آواز اور مدھم ہوگئی تھی۔

''سونیا...... سونیا ارسلان راشدی۔''

شہریار چلتے چلتے یکدم پھر سے رک گیا تھا۔ یہ لڑکی...... وہ تو اسے ایلیا رحیم کے نام سے جانتا تھا۔ کتنا غلط نام دیا تھا اس نے اسے۔ وہ ارسلان راشدی کی بیٹی ہے۔

اُس نے عاطف کا کندھا تھام لیا تھا۔ ''یہ نائمہ سے شام کو ملیں؟''

''کیا بات ہوئی؟'' عاطف حیران ہو گیا تھا مگر زیادہ دیر حیرت برقرار نہیں رکھ سکا تھا کیونکہ اُس کے چہرے کے پھیکے پن سے وہ با آسانی سمجھ گیا تھا۔

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا، تجھے ابھی آرام کرنا چاہئے، مگر شہریار! پتہ نہیں کون سی مٹی سے بنا ہے تو؟'' وہ یکدم گھبرا گیا تھا۔ مگر شہریار بہت آہستہ روی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے رُوم کی طرف واپس آ گیا تھا۔ پھر اپنے بیڈ پر آ کر وہ بیٹھا نہیں تھا، بلکہ لیٹ گیا تھا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤں؟'' اس نے اس کی بند آنکھوں سے گھبرا کر سوال کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کچھ نہیں ہوا مجھے۔ بس ایسے ہی گھبراہٹ ہو گئی تھی آہستہ آہستہ نارمل ہو جاؤں گا۔''

عاطف خاموشی سے اس کے جوتے اتارنے لگا تھا۔ شہریار نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ عاطف نے اس کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر کو کال کر لیا تھا۔

ڈاکٹر نے نئے سرے سے اس کا چیک اپ کیا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔ ''مسٹر شہریار! آپ نے پھر سے کسی بات کا اثر لیا ہے شاید۔ ورنہ اتنی جلد تبدیلی ناممکن ہے۔''

شہریار نے خالی پن سے اسے دیکھا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔



ارسلان راشدی کھانا باہر سے کھا کر آئے تھے۔ جب سے سونیا کا معاملہ بگڑا تھا، انہوں نے آصفہ اور سونیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا، اس لئے جب شافعہ کی رات کی ڈیوٹیز ہوتیں، وہ کھانا باہر سے ہی کھا کر آ رہے تھے۔ سو اس وقت وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے 'یادِ ماضی عذاب ہے یا رب' کی تفسیر بن گئے تھے۔

تین چار روز پہلے جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا، وہ سب کچھ انہوں نے گھر میں کہیں ڈسکس نہیں کیا تھا۔ عافیہ بیگم نے جس طرح ان سے سوال پوچھا تھا، کچھ لمحے کے لئے وہ واقعی گنگ ہو گئے تھے۔ پھر

آہستہ آہستہ انہیں وہ سارے لمحات یاد آتے گئے تھے جن کی اذیت سے آج بھی ان کی روح پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ پھر یہ تلخی اتنی بڑھی تھی کہ انہوں نے لفظوں کے انتخاب میں بھی سہولت سے کام نہیں لیا تھا۔ جو کچھ ان کے اندر اتنے برسوں سے غبار جمع تھا، انہوں نے بیگم عافیہ کے اوپر نکال دیا تھا۔ بیگم عافیہ اپنی بہن کے متعلق یہاں سے بھی مایوس ہو کر بہت دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ لفظ ان کے چہرے پر دراڑیں چھوڑ گئے تھے۔

وہ سب کچھ کہہ کر نکل آئے تھے مگر ان کا خیال تھا، اتنی سچائی کے اظہار پر شاید ہی ان کی نوکری برقرار رہ سکے۔ مگر شام کو جب وہ کچھ فائلز پر مسٹر سلیم افسر سے دستخط لینے گئے تھے، تب بیگم عافیہ نے کہا تھا۔

"یہ کیسے بھی ہیں، مگر عبدالرحمن کہتے تھے، ان کا حساب بہت اچھا ہے۔"

"عبدالرحمن۔" اُن کا منہ کڑوا ہو گیا تھا، مگر نوکری اتنی اچھی تھی کہ ماضی کی طرح کی عزتِ نفس نے ان کے اندر ہنکارا نہیں بھرا اور وہ خاموشی سے فائلز پر دستخط لے کر اپنے کیبن کی طرف واپس چلے آئے۔ مگر دل کے اندر جانے آج اتنے برسوں بعد کیوں ایک ہمک جاگی تھی کہ وہ کہیں سے عطیہ کو دیکھ پاتے۔ بھلے وہ اب ان کی نہیں تھیں، بھلے انہوں نے گھر سے نکالتے وقت ان کے ہاتھ میں فیصلہ رکھ دیا تھا، مگر ایک تعلق جو سانس بھر چکا تھا، وہ کبھی کبھی اندر ہی اندر سرسرانے سا لگتا تھا۔

انہوں نے آنکھیں بند کیں تو ایک تیز بارش کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں آ کر دیا۔ دھیان لگایا، بہت دھیان لگایا، تب ایک بھیگتی ہوئی شبیہ اُن کی نگاہ میں فوکس ہوئی۔ "پلیز ارسلان! مجھے گھر سے مت نکالو۔ میں اس تیز بارش میں کہاں جاؤں گی ارسلان؟" آواز میں دکھ ہی دکھ تھا اور انہوں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، پھر غرا کر بولے تھے۔

"تمہیں دولت کی ہوس ہے ناں، تو جاؤ، کہیں بھی چلی جاؤ۔ تم جیسی عورتوں کے لئے گھروں کی کمی تھوڑی ہوتی ہے؟" وہ رکے، پھر تحقیر سے بولے۔ "کسی اور گھر کی بات کیا ہے، وہیں چلی جاؤ ناں، عبدالرحمن کے پاس۔ وہ تمہارے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو گا۔ ابھی بھی تو ایک ہفتہ اس کے پاس رہ کر آئی ہو ناں۔"

"یہ جھوٹ ہے ارسلان! آمنہ بھابی! گواہی دیجئے ناں، میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ، میں کیا جانوں؟ میں کیا تمہارے ساتھ گھومتی رہی ہوں؟"

"آمنہ بھابی! آپ........آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" حیرت اس چہرے پر ثبت تھی اور انہوں نے ان کی حالت کا خیال کئے بغیر انہیں دھکا دیا تھا۔

”دفع ہوجاؤ۔میری زندگی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔میں تمہیں طلاق دیتا ہوں،طلاق دیتا ہوں.......“
اور وہ عورت، جو دھکے سے بچ گئی تھی، یکدم زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔
وہ بیٹھتی چلی گئی تھی اور ارد گرد بارش کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔انہوں نے دروازہ بند کرلیا تھا مگر وہ اندر کھڑے ہوئے اسی اذیت میں بھیگ رہے تھے، جس اذیت میں عطیہ بانو تھیں۔اور بارش کی بوندوں میں تیرتا،ٹپ ٹپ کرتا ایک خوش جمال لمحہ تھا، جو اُن کے اندر باہر یادوں کی گونج پیدا کررہا تھا۔

میرے ہاتھ پر لکھ دو
فیصلہ جدائی کا
اتنا مختصر لکھنا
جتنی تم نے مجھ سے
مختصر محبت کی
اتنا مختصر لکھو
فیصلہ جدائی کا
جتنی مری سانسیں ہیں
جتنی مری ہستی ہے
جس میں، میں آج سے پہلے
مقید تھا

فیصلہ جدائی کا اب طویل مت لکھنا
جس طرح مری چاہت
جس طرح مری خواہش
فیصلہ جدائی کا گر طویل لکھوگی
تب میں نہ پڑھ پاؤں گا
میں تو اب جدائی کے فیصلے کو پڑھنے تک
زندگی کا ساتھی ہوں
زندگی تمہاری ہے

''نظم تو بہت اچھی سنائی آپ نے۔''

''یہ نظم نہیں، میرا دل تھا، تمہیں اس میں لطف آ رہا ہے عطیہ! تم بہت بری ہو، تمہیں میری محبت پر تڑپ کر محبت نہیں آ رہی، ہنسی آ رہی ہے۔'' انہوں نے ان کی لٹ سے چھیڑ کی اور گلابی شام سا لہجہ ان کے اردگرد جلترنگ بجانے لگا۔

''آپ کو کیا پتہ، یہ ہنسی آپ کی محبت پر آئی ہے یا کسی اور بات پر؟''

''اور کون سی بات ہے جس پر تم ہنسیں؟''

''مجھے اپنی خوش قسمتی، اپنی زندگی کے خوب صورت ہونے کے یقین نے مسکراہٹ بخشی ہے۔ ارسلان! آپ نہیں جان سکتے، آپ کچھ مہینوں میں مجھے کس قدر عزیز ہو گئے ہیں۔ اگر میں آپ کے بعد زندگی کا تصور کرتی ہوں تو زندگی کا کوئی پیرایہ مجھے زندگی کا لمس چکھنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔'' لمحہ بھر کو وہ رکیں، پھر اترا کر بولیں۔ ''اگر میرا جواب آپ کی نظم کے برخلاف انکار میں ہوتا تو؟''

ارسلان راشدی نے انہیں دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر جذب سے بولے تھے۔ ''پہلے تو مجھے یقین تھا ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو واقعی فیصلہ جدائی کا پڑھنے تک ہی زندہ تھا میں۔ پھر تم منت کرنے کے باوجود مجھے جینے پر مجبور نہیں کرسکتی تھیں۔''

''اتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟''

''بہت زیادہ۔ جتنا تم سمجھ سکی ہو اس سے زیادہ۔ موت کے علاوہ مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کرسکتا۔''

''اتنے بڑے بڑے دعوے مت کریں۔ نبھا نہ سکے تو......؟'' نقرئی شوخ لہجہ اور وہ ان آنکھوں میں ڈوب گئے۔

''نہیں نبھا سکا تو تمہارے ساتھ مرجاؤں گا۔''

''مرجانا آسان نہیں ہوتا۔'' نئی ادا سے دل کو چھوا۔

اور ارسلان راشدی ٹرانس میں بولے۔ ''محبت کرنا بھی تو آسان نہیں ہے۔ سمجھو، مجھے مشکل کام کرنے کی عادت ہے۔''

''ہاں، جانتی ہوں میں آپ کو۔''

''محبت کی ہنسی سے ان کا روگر دگونجنے لگا تھا۔ انہوں نے پشت کیے ہوئے دروازے سے یکدم لاک کھول کر گلی میں دیکھا، مگر جہاں عطیہ بانو کچھ دیر پہلے پورے قد سے زمین پر بیٹھ گئی تھیں، وہاں بارش کے سوا کچھ نہیں تھا، جیسے بارش کو وہ اپنے آنسو دے کر چلی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور محسوس کیا، ان کا دل اندر سے مر چکا تھا۔ پھر آصفہ کن حالات میں ان کی زندگی میں آئیں؟ کیسے عمر کٹ گئی؟ انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر وہ، جو دل اندر سے مر گیا تھا، وہ پھر زندہ نہیں ہوسکا تھا اور آج اتنے سالوں بعد اسی دل میں ایک بار پھر سے جیسے کسی نے چنگاری ٹٹول کر آگ سلگا دی تھی۔

''پتہ نہیں، کیسی ہوگی میری عطیہ؟''

''مگر وہ میری عطیہ کہاں ہے اب؟'' دل نے پہلی اڑان بھری اور تلخ سچائی کو سہہ کر منہ کے بل زمین پر آن گرا۔ انہوں نے کروٹ بدلی تھی، خیالات کو واپس پٹارے میں بند کرنا چاہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی بیل نے انہیں چونکا دیا تھا۔

"ہیلو، ارسلان راشدی!.......کیا؟ جی، وہ میری بیٹی ہے۔ اوکے، میں ابھی آتا ہوں۔"
ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح گھر سے نکلے تھے۔ پھر کیسے نہ کیسے کر کے ہسپتال پہنچے، مگر وہاں فل یونیفارم میں پولیس افسر کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔ "کیسی ہے میری بیٹی؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔
بہت میٹھے لہجے میں کہا گیا۔ "شی از آل رائٹ سر! بس ٹانگ میں فریکچر ہے، تھوڑی سی سر پر چوٹ ہے۔ باقی اتنا نقصان نہیں ہوا، بہت بڑی چوٹ سے بچت ہو گئی مس شافعہ کی، وگرنہ کارے ہٹنگ پوائنٹ سے ہٹ کرنا اور بچ جانا معجزہ ہے۔"
"مگر ایسا کون کر سکتا ہے مسٹر عدیل؟" انہوں نے ان کے بیج سے نام پڑھ کر سوال کیا اور عدیل عبدالرحمن مسکرا کر بولے۔
"دراصل ان کا ہسپتال میں کسی سلسلے میں کلیش چل رہا تھا۔ مس شافعہ نے ان معاملات میں اپنا ایک واضح نقطۂ نظر برقرار رکھا تو انہیں یہ نتائج بھگتنا پڑے۔ لیکن آپ بے فکر رہئے، اب مس شافعہ کی سکیورٹی کی ذمہ داری میرے ذمہ ہے۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"
ارسلان راشدی انہیں دیکھتے رہے، پھر کندھا تھپتھپا کر بولے۔
"کوئی بہت اچھا انسان ہے، جس نے آپ کی اتنی اچھی تربیت کی، وگرنہ آپ جیسی وردی والے عام عوام کو منہ تک نہیں لگاتے، چہ جائیکہ ان کی سکیورٹی کی ذمہ داری لینے کی بات کریں۔"
"ارے سر! سارے پولیس افسر برے بھی نہیں ہوتے۔ یہ بہت غلط انفارمیشن پھیلی ہوئی ہے عوام میں۔ ویسے رہی میری تربیت تو مام اور میرے پاپا کی توجہ ہی اس کا کریڈٹ لینے کی حق دار ہیں۔"
"آپ کے پاپا......" ارسلان راشدی نے ادھورے تعارف کے لئے جگہ خالی چھوڑی اور عدیل عبدالرحمن مسکرا کر بولے۔
"میرے پاپا مشہور بزنس مین مسٹر عبدالرحمن آفاقی ہیں سر!"
"آپ کی مام کا نام پوچھ سکتا ہوں میں؟" ان کی روح آنکھوں میں کھنچ آئی اور عدیل عبدالرحمن نے توجہ سے مسکرا کر کہا۔
"کیوں نہیں سر! اس میں کوئی حرج نہیں، میری مام مسز عالیہ عبدالرحمن آفاقی ہیں سر!"

ارسلان راشدی نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ایک دل میں آیا، عطیہ بانو کا پوچھیں، مگر دوسری دفعہ میں انہوں نے یہ خیال رد کر دیا اور خاموشی سے ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔
عبدالرحمٰن سے ملنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ میں بھی تو دیکھوں، اس شخص کے اندر واقعی انسانیت، رواداری، اپنے جرم پر کوئی شرمندگی ہے یا نہیں۔



بیگم عافیہ، شادی کی فائنل تیاریوں میں تھیں۔ اس وقت انہیں شہریار کی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی، مگر مسٹر عبدالرحمٰن سے پتہ چلا تھا کہ وہ تین دن پہلے اپنے ایک دوست کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر پنڈی چلا گیا تھا اور اب کل انوشے کی شادی تھی۔
"کیا شہریار، انوشے کی شادی میں شریک نہیں ہو گا مام؟" علینہ نے جوڑا پیک کرتے ہوئے سوال کیا اور بیگم عافیہ کندھے جھٹک کر آہستگی سے بولیں۔
"نہیں، شاید وہ شادی میں نہ آ سکے۔ کیونکہ اس کا دوست کافی سیریس انجری کے تحت ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔" انہوں نے کچھ لمحوں کا سپیس لیا، پھر نرمی سے بولیں۔ "انوشے شادی سے خوش تو ہے علینہ؟"
علینہ نے کام کرتے ہاتھ روک کر بیگم عافیہ کو دیکھا، پھر سوالیہ بولیں۔ "آپ نے یہ سوال کیوں کیا مام؟ کیا آپ کو لگتا ہے، انوشے خوش ہیں؟"
بیگم عافیہ اس کے قریب بیٹھ گئیں، پھر نرمی سے بولیں۔ "پتہ نہیں، مجھے کیوں لگتا ہے، انوشے خوش نہیں ہے۔ وہ بار بار عارف سے لڑ پڑتی ہے، چڑچڑی ہو کر جواب دیتی ہے۔ خوشی اس کو تو نہیں کہتے علینہ! خوشی تو اسے کہتے ہیں جو تمہارے چہرے پر رہتی ہے۔ اپنے جیون ساتھی کا نام سن کر جس طرح تمہارے چہرے پر روشنی کے قمقمے جل اٹھتے ہیں، خوشی اس کو کہتے ہیں علینہ!"
علینہ نے پُرسوچ ہو کر بیگم عافیہ کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "مام! یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ نانیا مام کے ملنے اور ان کے مس بی ہیو پہ خود سے خفا ہو گئی ہو۔ اس نے مام کا بچپن سے جو ایک خاکہ بنا رکھا تھا، جس طرح نہیں مظلوم بنا کر وہ آپ سے مس بی ہیو اختیار کرتی تھی، یہ سب سوچ کر وہ خود سے شرمندہ ہوتی ہو گی۔ یہی شرمندگی اسے اندر سے کاٹتی ہو گی مام! کیونکہ وہ اتنی ضدی ہے کہ آپ کے سامنے جھکنے میں بھی اس کی آن آڑے آتی ہو گی۔"
بیگم عافیہ نے سر ہلایا تھا، پھر بہت ما محسوس وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی تھیں۔ پھر وہ جب شادی کا جوڑا پہن کر باتھ روم سے نکلی تھی تو پتہ نہیں، اسے کیا ہوا تھا، کون سا ناٹکا اُبھرا تھا کہ وہ ان کے گلے سے آ کر لگ گئی تھی۔

"مام! مجھے نہیں پتہ، معافی کیسے مانگتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ، غلطی کرنے سے کیسے روکتے ہیں خود کو۔ مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ ماں کی جو محبت میں مام تانیہ سے چاہتی تھی، وہ محبت مجھے صرف آپ سے ملی ہے۔ میں نے پورے بیس دن مام تانیہ کے سامنے جا جا کر ان کے اندر کی محبت کو چھونا چاہا تھا، مگر تانیہ...... وہ جانتی ہی نہیں ہیں محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔ جس طرح آپ علینہ کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہیں، انہیں محبت کو اس طرح گلے لگانے کی عادت ہی نہیں ہے۔ وہ صرف دولت، دولت کرتی ہیں۔ مام! میں جب ان کے پاس گئی، ان کی زبان سے صرف دولت کا ہی تذکرہ سنا، اس لمحے ان کے چہرے پر بالکل وہی ملائمت، وہی محبت ہوتی تھی مام! جیسی علینہ، رائمہ یا مراد کو پیار کرتے وقت آپ کے چہرے پر ہوتی تھی۔" وہ روئے جا رہی تھی اور بیگم عافیہ کا دل ایک سرخوشی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ ان کی محنت اور محبت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اب وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنی ایک اور یاد دہرائی تھی۔ "آپ کو یاد ہے مام! جب ایک دفعہ میں سوئمنگ کی کلاس ضد میں لینے گئی تھی اور آپ کہتی تھیں تم علینہ کی طرح اچھی سوئمر نہیں بن سکتیں، آپ کو لگتا تھا میری توجہ یکسو نہیں تھی اور شاید آپ یہ بھی جانتی تھیں، مجھے پانی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ مگر میں نے آپ کو غلط ثابت کرنے کے لئے سوئمنگ کلاس جوائن کی اور آپ میری کلاس سے میرے ساتھ تھیں۔ آپ کو لگتا تھا، آپ کو کسی بھی وقت میری کسی بھی حماقت سے لڑنا پڑ سکتا تھا۔ میں نے پول میں پہلی سیڑھی پر قدم اٹھایا تھا اور آپ میری ٹیچر کے ریلیکس کہنے کے باوجود کرسی سے اُٹھ کر میرے پاس آ گئی تھیں۔ "تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ناں؟" آپ نے میرا ہاتھ چھونے کی کوشش کی تھی اور میں نے آپ کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، کیونکہ اس وقت میں واقعی خوف سے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ پھر آپ نے دوبارہ پوچھا تو میں ضد میں پانی میں کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اُس وقت مس ویلینا کا ضروری فون آ گیا، وہ اندر بڑھ گئیں۔ ساری بچیاں، بچے ٹرینڈ تھے، اس لئے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ ان کے ذہن سے شاید میں نکل ہی گئی تھی۔ مگر مام! آپ صرف مجھ پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔ آج علینہ کی کلاس نہیں تھی، اس لئے آپ کو میری فکر زیادہ تھی۔ "اتنے گہرے پانی میں مت جاؤ انوشے! تم ڈوب جاؤ گی۔" میری فرینڈ نے مجھے وارن کیا اور مجھے اس وقت آپ کے جذبات سے کھیلنے میں اتنا مزہ آ رہا تھا کہ میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں ڈوب رہی تھی مام! اور آپ...... آپ جو میری طرح پانی سے ڈرتی تھیں، سوئمنگ سے ڈرتی تھیں، آپ نے میرے لئے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس وقت آپ کے اندر وہ طاقت تھی کہ تیرنا نہ آنے کے باوجود آپ مجھے کنارے پر گھسیٹ لائی تھیں۔ کسی نے میم ویلینا کو بلا لیا تھا۔ میم نے ذرا کی ذرا دیر میں تیزی سے ڈوبنے کے باعث میرے اندر جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر جب میں نے آنکھ کھول کر دیکھا، اس وقت آپ پانی میں شرابور بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میم نے مجھ سے کہا۔ ”تمہاری مام تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔“ مگر مجھے لگا تھا، یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی جس سے اندازہ ہوسکتا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ مگر آج جب میں تانیا مام سے دھتکار کھا کھا کر چُور ہوگئی ہوں، تو مجھے لگتا ہے، محبت تو صرف آپ کو کرنا آتی ہے۔ مام! محبت کے بغیر کوئی اپنی جان پر یوں تو نہیں کھیل جاتا۔“

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ بیگم عافیہ کی بھی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اتنے سالوں بعد سہی، انہیں محبت نے ان کی ریاضت کا صلہ دے دیا تھا۔ انہوں نے انوشے کو گلے سے لگا لیا تھا۔ پھر وہ دونوں کافی دیر بعد ایک دوسرے سے الگ ہوکر آنسو پونچھ رہی تھیں، جب علینہ بیوٹیشن کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بیگم عافیہ اُس کا سر تھپتھپاتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ پھر وہ ڈرائنگ روم سے ہوکر گزر رہی تھیں، جب سلیم افسر کی سنجیدہ صورت نے ان کے قدم روک لئے تھے۔

”خیریت سلیم؟“ وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔ اور سلیم افسر ان کی آمد پر یکدم چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش کرنے میں مصروف ہوگئے۔

”چہرہ سچ بولنا چاہتا ہے تو اسے جھوٹ بولنے پر کیوں اُکسا رہے ہیں؟“

”نہیں تو عافیہ! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

عافیہ بیگم اُن کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی انوشے کی گفتگو دہرانے لگی تھیں۔ بات مکمل کرچکیں تو بولیں۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے تھے، وہ اندر ہی اندر مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اور اسی بات کو چھپانے کے لئے وہ مجھ سے رُوڈلی بی ہیو کرتی تھی۔ مگر تانیا سے ملنے کے بعد وہ پتھر ہٹ گیا۔ وہ سارے آنسو، جو اُس نے اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر بہانے کے خیال سے سنبھال کر رکھے تھے، وہ سارے آنسو آج اس نے میرے گلے سے لگ کر بہادیئے۔ سلیم! مجھے خوشی ہے کہ زندگی کے اس نئے سفر پر اُس کے دماغ کی کوئی گرہ، کوئی الجھن اس کے ساتھ رخصت نہیں ہورہی۔ تم دیکھ لینا، اس بار ہماری انوشے جو گھر بسانے جارہی ہے، وہ واقعی خوشیوں بھرے راستے سے ہوکر آتا ہے۔“

سلیم افسر نے ان کی طرف دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ”کاش تمہاری یہ پیشین گوئی اب تک کی پیشین گوئیوں کی طرح ٹھیک ثابت ہو۔ ورنہ عافیہ! آثار تو بہت برے ہیں۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ بیگم عافیہ کی آواز کپکپا گئی تھی۔

سلیم افسر نے ان کی طرف دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ ”عابد صاحب کی ریشہ دوانیوں اور خورد برد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال سے بچنے کے لئے میں نے انہیں نوکری سے نکال دیا۔ مگر

عافیہ! آج وہ میرے دفتر میں آئے اور انہوں نے پتہ ہے، کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" اُن کی سانس اٹکنے لگی۔

سلیم افسر دُکھ سے بولے۔ "وہ کہنے لگے، مسٹر سلیم افسر! آپ نے میری بے ایمانی کے بدلے میں مجھے نوکری سے نکال دیا، اچھا کیا۔ کیونکہ میں خود یہ ملازم ہونے کا دم چھلا اب اُتار پھینکنا چاہتا تھا۔ مگر مسٹر سلیم افسر! آپ جواد حسن کے بیٹے کو جو اپنی بیٹی دے رہے ہیں، آپ نے اس کی چھان بین کر لی ہے؟ شاید آپ کو یاد ہو، جواد حسن کو آپ کے بزنس میں، میں نے ہی انوالو کیا تھا۔ پھر آپ یہ کیسے بھول گئے کہ چور کا بھائی گرہ کٹ ہوتا ہے...... عافیہ! آپ...... آپ جانتی ہیں انہی سوچ کر میں نے پانچ چھ دن سے جواد حسن سے میل ملاقات بڑھا دی تھی۔ وہ ڈرنک کے عادی تھے، میں نے بہترین ڈرنک انہیں سروکی اور پھر نشے میں انہوں نے وہ سب کچھ اُگل دیا جو اُن کے دل میں تھا۔ انہوں نے ہماری نوشے کو ہم پر ہی حربے کی طرح استعمال کیا ہے۔"

"آپ...... آپ نے عارف سے بات کی ہے؟"

سلیم افسر نے ان کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا کر بولے۔ "وہ لڑکا...... اُس کی تو جون ہی بدل گئی ہے۔ لگتا ہی نہیں ہے، یہ وہی عارف ہے، جسے ہم اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ بالکل خاموش ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے سامنے اس کے پاپا کی بابت بحث کی تو سر جھکا کر بولا کہ میں کیا کر سکتا ہوں انکل! پاپا شروع سے ایسے ہی سوچتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی بیٹا سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے بھی اپنے لئے آسائشات مہیا کرنے کے اے ٹی ایم، کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں، نوشے خوش نہیں رہے گی تو آپ یہ رشتہ ختم کر سکتے ہیں...... بیگم! آپ بتائیے، پھر میں کیا کرتا؟ عارف اپنے اوپر آئے کسی الزام سے منہ نہیں موڑ رہا، کسی الزام سے مکر نہیں رہا۔ پھر...... پھر میں کیا کروں؟"

بیگم عافیہ نے ان کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولیں۔ "اگر وہ ایسا ہو گیا ہے تو سمجھ لیجیے، اس کے دل کو کسی نے بدل دیا ہے۔ کوئی دیا روشن ہو گیا ہے اس میں۔ اور اندھیرے میں کھڑے شخص کے لئے دیا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وہ نوشے کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔"

"مگر اس کے پاپا......؟" سلیم افسر نے تشکیک بھرے لہجے میں پوچھا۔

بیگم عافیہ نے کچھ نہیں کہا، مگر ان کی آنکھوں کا یقین ایک اُمید روشن کر رہا تھا۔ سلیم افسر نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔



”مسٹر مامون! آپ کو کیا لگا تھا، شہریار آپ کا باس ہے جو آپ نے یہ رسک لیا؟ آپ کو پتہ ہے، آپ کی اتنی سی غلطی سے سیاسی میدان میں کتنی ہلچل مچ گئی ہے؟ اور وہ زوار حسن، وہ آپ کی ذہانت کو کیسے جل دے گا۔ اسے اس لڑکی سے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ مرتی یا زندہ رہتی۔ لیکن اس نے عین موقع پر یہ پتا کھیل کر آپ کی ساری حکمت توجہ شاہ فیاض کی حویلی کی طرف موڑ دی اور خود صاف بچ نکل گیا۔ آپ کو پتہ ہے، شہر میں جس کوٹھی پر چھاپہ مار کر ڈرگ کی ایک بڑی مقدار ضبط کی گئی ہے، وہ کوٹھی بھی اس نے کاغذات کے ذریعے کسی نامعلوم شخص شیخ زاری کے نام پر پرائی ڈیٹس میں اس کے نام منتقل کر کے خود کو صاف بچا لیا ہے۔ آپ نے وہ افواہ جو اڑائی تھی کہ حسن ابراہیم کے گوداموں سے ڈرگ برآمد ہوئی ہے، وہ بھی گلے میں اٹک گئی ہے۔ مسٹر حسن ابراہیم نے پارلیمان میں ہماری کارروائی پر قرارداد مذمت داخل کرنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ دوسری طرف آپ کی گرین فائل کے شوشے کی صحت پر شاہ فیاض کو شک ہو گیا ہے، اس لئے شاہ فیاض بھی ہمارے محکمے پر حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کے لئے بڑے بڑے لائر سے مل رہا ہے۔ مسٹر مامون! آپ کے پاس ان اپ ڈاؤنز کا ہے کوئی جواز؟“

”سوری سر! لیکن اس وقت مجھے لگا تھا، وہ لڑکی اور اس کی زندگی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اس وقت میرا دوست شہریار نہ بھی مجھے اپروچ کرتا اور یہ اطلاع کسی اور ذرائع سے میرے پاس آتی تو بھی میں انسانیت کے ناتے اپنی نوکری کو داؤ پر لگا دیتا۔“

”کیا یہ اس لئے ہوتا مسٹر مامون! کیونکہ نوکری آپ کی ضرورت نہیں، مشغلہ ہے؟“

”سر! یہ قطعی الزام ہے مجھ پر۔ کیونکہ ضرورت ہو یا مشغلہ، میں نے زندگی اور فرض میں سے ہمیشہ فرض کو چنا ہے۔“

عدیل عبدالرحمن خاموشی سے مامون عبدالکریم کو سخت تنبیہی نظروں سے دیکھتے رہے، پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی نکتہ نکال کر اسے بحث میں گھسیٹتے، کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”کون؟“ عدیل عبدالرحمن نے سخت کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

”مسٹر منیجر سر!“

”کم ان۔“ نام سن کر بہت ہی خندہ پیشانی سے انہوں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

”آپ ،مسٹر اسٹر بنجر! آپ جیسے نوجوانوں پر جتنا فخر کیا جائے، کم ہے۔“

”سر! یہ آپ کی محبت ہے۔“

”آخاہ تو محبت ڈاٹ کام اتنا سر چڑھ کر بول رہا ہے۔“ عدیل عبدالرحمٰن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اسٹر بنجر نے ان کی طرف دیکھا تھا، پھر ان کے سامنے ایک فائل لا رکھی تھی۔

”مامون صاحب کا فون جاتے ہی میں نے میڈیا کوششیں شروع کر دی تھیں سر! اس فائل میں کچھ تفصیلات ہیں، کچھ تصویریں ہیں اور آخری صفحے پر ایک سی ڈی بھی ہے، جس میں مسٹر حسن ابراہیم کی کچھ قابل گرفت حرکات، ایکس کلوز شاٹ میں قید ہیں۔ کچھ بدنام زمانہ افراد سے ملاقات کا بھی تذکرہ ہے اور اپنے بیٹے سے بھی زیادہ حسن پرستی کے کچھ قصے بھی درج ہیں۔ کچھ ایسی باتیں بھی ہیں، جو دست اندازی حب الوطنی کے زمرے میں آتی ہیں۔ آپ ان باتوں کا حوالہ دے کر ان کو خاموش کروا سکتے ہیں۔ رہے شاہ فیاض، تو انہیں کل ہی مامون صاحب نے اچھی طرح سنبھال لیا تھا اور جو کسر رہ گئی تھی، وہ میں نے گرین فائل کے مندرجات پوسٹ کر کے پوری کر دی ہے۔“

مامون نے زبان دانتوں تلے دبالی تھی اور عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر پوچھا تھا۔

”وضاحت کریں، مامون عبدالکریم!........ یہ سنبھال لینا، اس کا کیا مطلب ہے؟“

مامون پہلے تو ہکلایا، پھر سر جھکا کر بولا۔ ”سر! میں نے شاہ فیاض کو کل دھمکی آمیز فون کر کے کہا تھا، اگر وہ حویلی کے معاملے کو زیادہ اچھالیں گے تو پھر ہم بھی امین کو بطور گواہ میڈیا کے سامنے لا کر یہ ملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ بظاہر دشمنی نبھانے کا ڈھونگ کرنے والے دو سیاسی خانوادے اندر سے ایک ہیں۔ ہمیں ڈرگ کی اطلاع ملی تھی، اس لئے ہم نے حویلی پر ریڈ کیا تھا۔ امین اسی ریڈ میں زخمی ہوا تھا۔ اور سر! آپ تو جانتے ہیں، جو روپیا تنے برسوں پرانا ملازم ہونے کے باوجود شاہ فیاض نے ایک ہزار ایکڑ کی زمین کے لئے اس کے ساتھ روا رکھا ہے، وہ بہت آسانی سے یہ بیان دینے پر تیار ہو جائے گا۔“

”مگر یہ پرانے نمک خوار بہت کم غداری کرتے ہیں۔“

مامون نے سر ہلایا تھا مگر پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”سر! اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو انگلی ٹیڑھی کرنی بھی آتی ہے مجھے۔“

عدیل عبدالرحمٰن نے منہ کھولے اس کی طرف حیرت سے دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ ”مسٹر مامون! آپ اس وقت میرے دفتر میں موجود ہیں، اپنی جاگیر میں نہیں کھڑے۔ زبان و بیان میں احتیاط کو ملحوظ

خاطر رکھئے۔"

"جی سر! سوری سر!" اس نے کہا اور مدھم لہجے میں کہا۔

اسٹر بنجر اس انداز پر مسکرا دیا تھا۔ پھر وہ اس کی سفارش کرنے ہی والا تھا کہ عدیل عبدالرحمٰن نے اپنا وہ فون کھسکا لیا تھا جو قطعی ڈائریکٹری میں نہیں تھا۔ یہ ٹوٹلی پرائیویٹ نمبر تھا۔ پھر مامون نے انہیں اپنے لہجے میں دھمکیاں دیتے ہوئے سنا تھا۔

اسٹر بنجر ہنس پڑا تھا اور مامون عبدالکریم نے شکوے سے انہیں دیکھا تھا اور وہ مسکرا کر بولے تھے۔

"کیا کروں، کبھی کبھی واقعی گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکالنا پڑتا ہے۔" وہ مڑ کے، پھر بولے۔ "جس طرح تم نے شاہ فیاض کا معاملہ ہینڈل کیا، ویری گڈ آئی ایپری شی ایٹ یو۔"

اسٹر بنجر کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ مامون بھی ہنسا تھا اور عدیل عبدالرحمٰن نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"دفتر کا ٹائم ختم، اب مامون بچے! جلدی سے چائے بنا لاؤ۔ اس کے لہجے میں گفتگو کرتے کرتے منہ میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اور ہاں سنو، ساتھ میں بسکٹ لانا۔ آخر کو مہمان آئے ہیں۔"

"سر! آپ بھی ناں...... پتہ ہی نہیں چلتا کب آپ سنجیدگی سے عزت کر رہے ہیں، کب مذاق فرما رہے ہیں۔"

عدیل عبدالرحمٰن ہنسے، پھر مسکرا کر بولے۔ "شخصیت میں اتنا تنوع تو ہونا چاہئے کہ پرتیں الگ کرتے وقت اچھا لگے۔"

"ایکسیلنٹ سر!" اسٹر بنجر نے بھی باتوں میں حصہ لیا اور مامون عبدالکریم چائے بنانے کے لئے کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔



ہسپتال میں عدیل عبدالرحمٰن کے ساتھ مامون کی بھی آمد ہوئی تھی۔

"کیسا رہا سارا دن؟ عاطف نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟" عدیل عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"نہیں تو بڑے بھیا! یہ تو مجھے کبھی بھی تنگ نہیں کیا کرتا۔ ہاں، میں ہی اسے کبھی کبھی ستانے لگتا ہوں۔"

شہریار خاموشی سے ابھی تک سونیا اور ایلیا رحیم کی پرتیں الگ کرنے میں جتا ہوا تھا۔اس نے مامون اور عدیل عبدالرحمٰن کی موجودگی کو مس کررکھا تھا۔

''اگر اس طرح خاموش ہو کر تم مجھ پر یہ جتانا چاہتے ہو کہ تم مجھ سے خفا ہو تو پھر تمہیں میرے ہاتھ سے قتل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

شہریار عبدالرحمٰن نے عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا، پھر بے چارگی سے بولا ''کر دیجئے نا ں قتل۔جان چھوٹ جائے گی۔آپ کی بھی، میری بھی۔آئی ایم فیڈ اپ مائی لائف۔''اس کی آواز میں نمی گھلی ہوئی تھی۔

مامون، عاطف، عدیل عبدالرحمٰن تینوں حیرت سے ساکت ہو گئے تھے۔اس لہجے میں اس نے کبھی بھی بات نہیں کی تھی۔پھر آج کیا نیا ہو گیا تھا۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو رہے ہو؟''مامون نے ہاتھ تھام کر سوال کیا اور وہ چڑ کر بولا۔

''تنگ آ گیا ہوں میں اپنی بیماری سے۔دوائیں، صرف دوائیں، یہ ہے زندگی؟ اگر ہے تو مجھے نفرت ہے اس زندگی سے۔میں جینا چاہتا ہوں اب۔بس اب اور نہیں پریشان دیکھ سکتا آپ کو، اور اذیت نہیں سہہ سکتا خود۔میری کلائی چھلنی ہو گئی ہے ڈرپس سے۔درد...... زندگی کیا صرف اسی درد کا ہی نام ہے، جس کو میں سہتا پھرتا ہوں؟''

اُس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اُسے جانے غصہ کس پر تھا اور وہ اپنا غصہ کس پر نکال رہا تھا۔عدیل عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر اُسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے میری جان! اتنا غصہ تو تم نے کبھی کسی پر نہیں کیا، پھر......''

انہوں نے اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ جواب دینے کے بجائے ان کے سینے سے لگا رونے لگا تھا۔اسے روتا دیکھ کر عاطف اور مامون دونوں کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی تھی۔خود عدیل عبدالرحمٰن کا دل بھی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا اور وہ ان کے کندھوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے پھر اسی لہجے میں بولا تھا۔

''میں تھک گیا ہوں عدیل بھائی! اب اور نہیں سہا جاتا۔''

عدیل بھائی نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔پھر بھی بھرائے لہجے میں بولے تھے۔''کیا بچے! تم تو میرے سب سے بہادر بھائی ہو۔اتنی جلدی ہمت ہار دو گے تو عدیل عبدالرحمٰن پر یہ دونوں خوب ہنسیں گے کہ وہ اس اسٹیمنا کی بات کیا کرتے تھے، جو شہریار عبدالرحمٰن میں دور دور تک نہیں ہے۔''

شہریار پھیکے سے انداز میں ہنسا تھا، کچھ بولا نہیں تھا۔ نرس نے اسے پھر سے خواب آور انجکشن لگا دیا تھا اور وہ تکیے پر سر رکھے ہوئے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

''ہر روز سوتے وقت اس بات کے لئے خود کو تیار کرتا ہوں شاید یہ آخری نیند ہو، شاید دوبارہ نہ جاگ سکوں، بہت اذیت انگیز ہوتا ہے عدیل بھائی! یہ زندگی بے یار دھڑکا۔ میں اس دھڑکے میں جیتے جیتے تھک گیا ہوں۔'' اس کی آواز مدھم سے مدھم ہوتی چلی گئی تھی۔ عدیل بھائی اس کے غنودگی میں چلنے جانے پر ضبط کھوتے چلے گئے تھے۔

''محبت کرنے والے دلوں کو یہ کم بخت دل کا روگ ہی کیوں لگتا ہے ماموں؟''

''شاید محبت خراج میں ہمیشہ دل ہی لیتی ہے عدیل بھائی! اس لئے بہت کم دل محبت کرنے کا رسک لے پاتے ہیں۔'' عاطف بڑبڑایا تھا۔ اس کی آواز میں بھی نمی گھلی ہوئی تھی۔ پھر تینوں نے رات جاگ کر گزاری تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو تینوں کرسی، صوفے اور کاؤچ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اسے رات کی کوئی بات بھی یاد نہیں تھی۔ جو کچھ کہا تھا، شدید ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو کر کہا تھا اس نے۔ سو تینوں نے جاگنے کے بعد کل کی کسی بات کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت کمپوزڈ حالت میں جاگا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟'' عدیل بھائی نے رخسار چھو کر کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ ''ٹھیک ہوں بالکل۔ مجھے کیا ہونا ہے؟'' لمحہ بھر کو وہ رکا، پھر نرمی سے بولا۔ ''آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا؟ اتنی سرخ اور سوجی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں؟ اپنی تھکن کا رنگ؟''

''نہیں تو۔ بس کل رات ذرا سو نہیں سکا اس لئے۔ ویسے تو کوئی پرابلم نہیں تھی۔''

اس نے اگلا سوال کیا تھا۔ ''نائمہ اور شافعہ کیسی ہیں بھائی؟''

''دونوں بہت بہتر ہیں اب۔ نائمہ نے تمہارا پوچھا تھا، میں نے کہا تم پنڈی گئے ہوئے ہو۔''

''آپ لوگ مجھے کب تک پنڈی بھیجتے رہیں گے؟ انوشے، عافیہ آنٹی، مام، سب پنڈی پر ہی چڑ کر خفا ہو رہی ہوں گی۔''

''واہ بھیا! دیکھا اس ڈفر کو؟ ہم تو اس کا ہی جھوٹ نبھا رہے ہیں اور یہ ہے ہمیں ہی الٹا مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔'' عاطف نے خفگی دکھائی اور وہ ہنسا۔

”بڑے لوگوں کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ گردن دیکھ کر پھندا تیار کرتے ہیں۔“
”موڈ ٹھیک لگ رہا ہے بھائی کا۔“ مامون نے محبت سے پوچھا اور وہ مسکرا کر چپ رہ گیا۔
پھر دوسرے دن صبح ہی اُس نے طبیعت کی بہترین ریکوری کے ساتھ ڈسچارج کی مانگ کی تھی۔ عدیل بھائی مطمئن نہیں تھے مگر اُس کی ضد کے آگے ایک نہ چلی تھی۔ وہ ڈسچارج ہو کر نائمہ کی طرف ہی گیا تھا۔
”شیری بھائی! آپ.......“ اسے دیکھ کر نائمہ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ اُس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔
”مت روؤ بچے! میں ہوں ناں۔ کیا پرابلم ہے؟“
اُس نے بازو وا کیے اور اس کا سر اس کے سینے سے آ لگا۔ سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئی تھیں۔ اب وہ تیز آواز میں رو رہی تھی، جیسے کسی کی میت پر بین کر رہی ہو۔ مگر شہریار جانتا تھا، وہ اپنی ذات کے مار دیے جانے پر بین ڈال رہی تھی۔ اس نے قدم اٹھائے تھے اور کھائی میں جا گری تھی۔ ہاتھ پکڑ کر چلنے والے بھی گر جاتے ہیں اور ہاتھ چھوڑ کر تیز دوڑنے والے بھی سنبھل نہیں پاتے۔ اس نے بھی مضبوطی سے قدم نہیں جمائے تھے، سو وہ بھی گر گئی تھی اور یہاں گرنے والوں کے ہاتھ تھامنے والے کتنے ہوتے ہیں؟ رک کر کسی گرے ہوئے پر ہنسنے والے ہزاروں مل جاتے ہیں، مگر سہارا دے کر دوبارہ کھڑا کرنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اور وہ خوش قسمت تھی کہ اس کے پاس ایک ہاتھ ایسا تھا، جو اسے تھام لینے میں کوتاہی کرنے پر تیار نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے اس شخص کی ذات کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا تھا، اور اب یہی شخص اس کی دل جوئی کو سب سے پہلے پہنچا تھا۔ وہ جی بھر کر رو چکی تھی، سو اب اس کی توجہ شہریار کی طرف تھی۔
”شیری بھائی! آپ پہلے سے بہت کمزور نہیں ہو گئے ہیں؟“
وہ مسکرایا۔ اس کے آنسو ٹشو سے صاف کر کے مدھم لہجے میں بولا۔ ”نہیں تو بیٹا! تمہیں بس ایسا لگ رہا ہے۔ ورنہ میں تو اب بھی پہلے جیسا ہٹا کٹا ہوں۔“
نائمہ کی آنکھوں میں بے یقینی آئی مگر اس نے جواب پانے کی ضد نہیں کی۔ ضد کرنے کی بہت سالوں تک سزا کاٹ کر آئی تھی، اس لئے اسے سزا اور ضد کا ذائقہ بہت اچھے سے ازبر تھا۔
”سلامہ بھائی سے آپ اب ملتے ہیں؟“ اس نے متوازن لہجہ اختیار کیا۔
شہریار اسے خاموشی سے دیکھنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”بزنس مین ہو گیا ہے تمہارا بھائی۔ ہم جیسے گمناموں سے کہاں ملے گا؟“

”وہ آپ سے خفا ہیں کیا، یا آپ ان سے خفا ہیں؟“ وہ زیرک فہمی سے اصل جڑ تک پہنچ گئی اور وہ مسکرا دیا۔

”چھوڑو ناں گڑیا! خفا وہ ہوں یا میں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سات سال سے ایک دوبار کے علاوہ کبھی نہیں ملے۔“

نائمہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ ہلکورے لینے لگا۔

”کیا ہو گیا، کیا سوچ رہی ہو؟“ اس نے اس کا شانہ ہلا کرا سے گم ہونے سے بچایا اور وہ اس کی طرف دیکھ کر بھرائے لہجے میں بولی۔

”میں بہت بری ہوں شیری بھائی! میری وجہ سے آپ دونوں اتنے اچھے دوست جدا ہو گئے، میری ماں کی محبت شرمندہ ہو گئی، زہرہ پھپھو کا سر جھک گیا، عارفہ کی زندگی تنگ ہو گئی۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے بھائی! میں قابلِ معافی نہیں ہوں، مجھے کبھی معافی نہیں ملنی چاہیے۔“

شہریار عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ ”غلطی کرنا بہت آسان ہے نائمہ! مگر غلطی کو سدھارنا انتہائی مشکل۔ جرم کرنا آسان مگر معاف کرنا بے حد کٹھن۔ لیکن نائمہ! معافی مانگنے کے لئے دل سمیت جھکنے کی توفیق بھی خدا کسی کسی کو دیتا ہے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہیں غلطی سدھارنے کا موقع دیا گیا۔ پہلی غلطی خدا معاف کر سکتا ہے تو وہی خدا بندوں کے دل میں بھی اس کی محبت اور نرمی ڈال دیتا ہے۔ تم اس کے لئے پریشان مت ہو کہ تمہیں کوئی دھتکارے گا نائمہ! بھلے یہ ساری دنیا تمہیں اپنے اندر سے باہر نکال کر پھینک دے، تب بھی تمہارا شیری بھائی ہوگا، جو تمہاری غلطی سمیت تمہیں بھی تنہا نہیں ہونے دے گا۔“

نائمہ ایک بار پھر سے رونے لگی تھی۔ شہریار نے اس بار کچھ نہیں کہا تھا، اس کے سر پہ تھپتھپاتے ہوئے ہاتھ رکھ کر چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ اور نائمہ، اُسے لگ رہا تھا اس کے سر پہ شہریار نے صرف ہاتھ نہیں رکھا تھا بلکہ دل کے خزانے سے ایک دعا اس کے پلو سے باندھ دی تھی۔ یہ دعا جو تمام عمر کے لئے اسے شادکام کرنے کے لئے کافی تھی۔

شہریار اس کے سو جانے تک وہیں رکا، پھر اس نے فون کر کے اپنے ایک بہت قریبی دوست کی ممی کو نائمہ کا خیال رکھنے کے لئے فون کیا تھا۔ رات تک وہ آ گئی تھیں، تب اس نے بہت تشکر بھرے انداز میں کہا تھا۔

”صرف آج اور کل آپ اس کی کیئر کر لیں آنٹی! میں کل تک اس کو لک آفٹر کرنے کے لئے میڈ کا بندوبست کر لوں گا۔“

آنٹی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کی بات رکھ لینے کا عندیہ دیا تھا اور وہ اس سے رخصت ہو کر گھر آ گیا تھا۔ ٹیکسی سے اُتر کر وہ گیٹ سے داخل ہی ہوا تھا کہ مام کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکا تھا۔

'مام کو ریزن دینا بہت مشکل ہوگا۔' اُس نے پریشان ہو کر سوچا اور مام واقعی بہت تیزی سے اُس تک آپہنچی تھیں۔ وہ گارڈن کے وسط میں کھڑا تھا۔

''شہریار!'' پشت پر آواز سن کر اس طرح رُکا جیسا سے مام کے جاگتے رہنے پر اچنبھا ہوا تھا۔

''مام! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟'' وہ بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

مام نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا، پھر نرمی سے بولیں۔ ''عاطف کی طبیعت کیسی رہی بچے؟ چوٹ زیادہ شدید تو نہیں آئی تھی اُسے؟''

''نہیں مام! بہت معمولی چوٹیں تھیں۔ وہ ریکور کر گیا ہے، تبھی تو میں لوٹ سکا ہوں۔ مگر آپ یہ بتائیے، آپ اب تک کیوں جاگ رہی ہیں؟''

مام نے مسکرا کر اس کے رخسار کو چھوا اور نرمی سے بولیں۔ ''جس ماں کے دو بچے گھر سے غائب ہوں، وہ آرام سے سو سکتی ہے؟'' لمحہ بھر کو رکیں، پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ ''میں پہلے بہت بری ماں تھی۔ مگر اماں کے کہنے پر اچھی ماں بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ لچک، جو اماں کی سختی کی وجہ سے مجھ میں مفقود تھی، وہ سختی اب اماں کی نرمی کی وجہ سے لچک بن رہی ہے۔ اس لئے ماں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا سیکھو۔ ماں کو معاف کرنے کی عادت ڈالو خود میں۔ یہاں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ خامیاں تو ہر ایک میں ہوتی ہیں ناں۔ تھوڑی سی مجھ میں بھی ہیں۔ کوشش کر رہی ہوں کہ......''

شہریار نے مام کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر نرمی سے بولا۔ ''اب تک آپ کی گفتگو میں سن نہیں رہا تھا، آپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس لئے آپ نے میری مام کے خلاف بہت کچھ کہہ دیا، مگر اب اور نہیں سنوں گا۔ مام! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں تھی اور شکایت کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ آپ مجھے پیار کریں نہ کریں، میری محبت آپ کے لئے ہمیشہ ایک جیسی رہے گی۔''

مام کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی، پھر بولیں۔ ''تم میری سب اولادوں میں سب سے اچھے بیٹے تھے۔ مگر میں نے تمہارے ساتھ اتنا ہی برا رویہ رکھا۔ میں کبھی خود کو اس کے لئے معاف نہیں کر سکتی۔''

وہ ہنس پڑا۔ پھر مام کے گلے میں لاڈ سے بانہیں ڈال کر بولا۔ ''ابھی آپ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی، معاف کرنا سیکھو، معاف کرنے کی عادت ڈالو تو معاف کر دیجئے ناں۔ محبت میں اتنی سختی اچھی نہیں ہوتی مام!''

مام کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس کے سینے سے سر ٹکا کر وہ بے آواز رو رہی تھیں۔

”ارے مام! یہ پھر آنسو...... میں نے آپ سے کہا تھا ناں، دوبارہ آنسو آپ کی آنکھ سے نکلے تو بہت تکلیف ہوگی مجھے۔“
مام نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے تھے اور بہت مدھم لہجے میں پوچھا تھا۔
”تم نے کھانا کھالیا ہے یا نہیں؟“
اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچن کی طرف لیتی چلی گئی تھیں۔ پھر پاپا کا پرہیزی کھانا گرم کرکے انہوں نے اس کے سامنے لا رکھا۔ وہ آہستہ روی سے کھانے میں مگن ہوگیا تھا۔ مام اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی اس کی گریجویشن سیریمنی کے حوالے سے فیشن میگزینز میں لگی چٹ پٹی خبروں کو شیئر کررہی تھیں۔ وہ مسکرا کر ماما کی ایکسائٹمنٹ کشید کررہا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا، مگر اچانک شافعہ کے تذکرے پر اسے پھندا لگ گیا تھا۔ ماما اس کی کمر تھپتھپانے لگی تھیں۔
”دھیان سے۔ آخر جلدی کس بات کی ہے؟“
اس نے بہ مشکل گہرے گہرے سانس لے کر اپنی حالت پر قابو پایا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”آپ کو پتہ ہے، مام! شافعہ کا بھی تین دن پہلے ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟“
مام پانی کا گلاس بھرتے بھرتے تھم گئی تھیں، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ ”کیا آفت آگئی ہے۔ پہلے عاطف، پھر شافعہ۔“ وہ رکیں پھر مکرر بولیں۔ ”تم تو پھر اسے دیکھنے نہیں گئے ہوگے ناں؟ تم تو کراچی میں تھے ہی نہیں۔“ لمحہ بھر کو رکیں، پھر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولیں۔ ”بہت چھوٹے بچے ہو تم۔ بڑے عرصے سے کہہ رہے تھے، انوشے کی شادی میں، میں لے کر جاؤں گا مام! مگر موقع پر ندارد...... پھر پتہ ہے، عبدالرحمٰن صاحب کی منتیں کرکے شادی میں شرکت کی تھی میں نے۔ ویسے جوڑی بہت پیاری تھی دونوں کی۔“
مام کسی خیال میں گم ہوگئی تھیں اور وہ معذرت کرنے لگا تھا۔ مام نے اس کی معذرت پر اسے یوں چونک کر دیکھا، جیسے کسی خیال نے انہیں اپنے اندر سمو لیا تھا۔ ان کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھو لیا تھا۔
”خیریت، یہ مسکراہٹ کس ضمن میں؟“
مام نے اس کے پیشانی پر آجانے والے بال سنوارے، پھر ہولے سے بولیں۔ ”صبح ہم شافعہ سے ملنے ہسپتال جائیں گے۔ اور سن لو، میں پہلی فرصت میں اس سے تمہاری بات پکی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کیونکہ آل ریڈی تمہاری شادی میں بہت دیر کردی ہے میں نے۔“

اسے سمجھ نہیں آیا، وہ مام کو کیا کہہ کر روکے۔ نئی صورتِ حال میں وہ یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔
"مام پلیز! ابھی وہ ویسے ہی ایکسیڈنٹ سے تھوڑی ڈسٹرب ہوگی اور آپ شادی کی بات کر کے اسے اور ڈسٹرب کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ وقت دیجئے اسے مام! تاکہ وہ اور میں اس نئے فیصلے کو دل سے قبول کر سکیں۔"
مام نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا مگر اس کی بات مان لینے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگیں اور وہ اٹھ کر اپنے روم میں آ گیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے سب سے پہلا نمبر مامون کا پریس کیا تھا۔
"ہیلو! کیسا ہے تُو؟ اب سنا، کیسی طبیعت ہے تیری؟" مامون سلام دعا کے بعد نان اسٹاپ شروع ہو گیا اور وہ ہنسنے لگا۔
"بہت بری ہوگی دنیا کے ساتھ، اتنا بولتا ہے تُو کہ کبھی کبھی کمنٹیٹر کو بھی مات کر دیتا ہے۔"
"ارے واہ! میرے بولنے کو تو لوگ سننے کے لئے ترستے ہیں۔ تجھے کیا پتہ، کیا جادو ہے میری آواز میں۔"
شہریار ہنسنے لگا، پھر نرمی سے بولا۔ "واقعی، تیری آواز بڑی قاتل قسم کی ہے۔ اگر میں لڑکی ہوتا تو تیری آواز کی وجہ سے تجھ پر عاشق ہو جاتا۔"
"ہاہاہا......" مامون کا قہقہہ بہت بلند تھا۔
شہریار نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ "میری وجہ سے تجھ پر کوئی عتاب تو نہیں آیا؟"
"نہیں۔ تیری بیماری کی وجہ سے بچت ہوگئی۔ بھائی صاحب اتنے ہراساں ہو گئے تھے کہ زیادہ باز پرس کر ہی نہیں سکے۔ پھر اکبر چچا کی کارکردگی نے بھی ہم دونوں کو پھانسی لگنے سے محفوظ رکھا۔"
شہریار نے مطمئن ہو کر موبائل آف کر دیا۔ پھر سونے ہی لگا تھا کہ اچانک اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے فون ریسیو کیا اور دوسری طرف مکمل سکوت تھا۔
"کون بول رہا ہے؟" اس نے سوال کیا۔
مگر دوسری طرف صرف گہرے ہلکے سانس گونجتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے خود ہی بے زار ہو کر آف کر دیا۔
"کون ہو سکتا ہے؟" اُسے حیرت ہونے لگی۔ مگر یہ حیرت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ کیونکہ عاطف کا فون دس سیکنڈ بعد اس کی تنہائی کو تہہ بالا کرنے کے لئے اس کا منتظر تھا۔ اِدھر اُدھر کی بہت ساری باتیں

تھیں اور خود شہریار بھی کچھ اس طرح تنہائی سے اُکتایا ہوا تھا کہ وہ اس کی بکواس کا ساتھ دیتا رہا، یہاں تک کہ قریباً دو بجے وہ سو سکا تھا۔

پھر دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کے لئے ایک نیا دھماکہ لئے منتظر تھی۔

"آپ تین چار دن کہاں رہے بھائی؟" جازی عبدالرحمٰن کا لہجہ بہت عام سا تھا۔ مگر شہریار اس کے لہجے سے چونک گیا تھا۔

"کیوں، یہ آج میری بابت تمہیں فرلیش رپورٹ لینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" اس نے براؤن بریڈ کا پیس دانتوں سے کترتے ہوئے پرسکون لہجے میں پوچھا اور جازی عبدالرحمٰن کا چہرہ، وہ یکدم بھنا ہٹ کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن نے بھی اس بارے چونک کر دیکھا تھا، تب جازی نے ان کے سامنے اخبار پھینک کر کہا تھا۔

"دیکھ لیجئے مام! آپ کے بیٹے آج کل کتنا فیمس ہو رہے ہیں اور وہ بھی کن معاملات میں۔ مجھے تو سوچ کر ہی شرم آ رہی ہے۔"

شہریار نے کپ ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور سالار بھائی سے بھی پہلے اخبار اٹھا لیا تھا۔ اخبار کے فرنٹ پیج پر کسی لڑکی کے اغوا کی روداد چھپی تھی۔ وہ یک کالمی خبر کے اندراج اتوا اپنا نام پڑھ کر اس کی ہارٹ بیٹ بڑھتی چلی گئی تھی۔ خبر بشکریہ "دی ایج" چھپا ہوا دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔

"کیا خبر ہے؟" مام نے بھی چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ شہریار اتنی اچانک چویشن سے اپنا بچاؤ کسی بھی طرح نہیں کر پایا تھا۔ دھماکہ اتنا اچانک کیا گیا تھا کہ اس کا اندر تک ہل گیا تھا۔ مام خبر پڑھ کر اب اس کی صفائی سننا چاہتی تھیں۔ مگر وہ کیا صفائی پیش کرتا؟ اسے اس لمحے عدیل بھائی کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی تھی۔ پاپا، عاطف بھائی، رابعہ بھابی سب کی نظریں اس پر تھیں، جب جازی نے نیا ہنگامہ لا کھڑا کیا۔

"آپ کو پتہ ہے مام! آپ کے یہ بیٹے جھوٹ بولنے کے کتنے عادی ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ جھوٹ بولنے کے لئے کس کی ذات کس طرح استعمال کر رہے ہیں، بس جھوٹ بول دیتے ہیں۔ مگر آپ کو تو معلوم ہے ناں، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" پاپا نے ترشی سے پوچھا اور جازی اسی تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ "مطلب یہ ہے پاپا! کہ عاطف بھائی کا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ پنڈی گئے تھے۔ میں نے خود دو دن پہلے عاطف بھائی کو یہاں کے شاپنگ مال میں دیکھا۔ پھر میں نے شیری بھائی کا نمبر بھی ملایا مگر یہ اپنی کچھ لایعنی مصروفیات میں اتنے مصروف تھے کہ انہوں نے میری کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی۔" لمحہ بھر کو رُکا، پھر مکرر بولا۔ "کیا آپ ہمیں بتانا پسند کریں گے کہ وہ بدنصیب لڑکی کون تھی، جسے آپ نے اپنی عادت کے مطابق ایک نئے سانپ سیڑھی کے کھیل میں گھسیٹ لیا ہے؟ شیری بھائی! آپ آخر اپنی یہ

عادتیں کب چھوڑیں گے؟ کبھی امامہ، کبھی ایلیا رحیم، کبھی جا نا نہ، کبھی کوئی، کبھی کوئی۔"

شہریار ٹیبل سے اٹھ گیا تھا، مگر ماما نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ کچھ نہیں بولی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں واضح لکھا تھا کہ وہ اس کی طرف سے صفائی چاہتی تھیں۔ پاپا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ سالار بھائی بھی بنا ردعمل کے اُٹھ گئے تھے۔ وہ برے طریقے سے پھنس گیا تھا۔ جازی اسے بہت طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دانیا کی آنکھوں میں وہ جانا نہ سے فرضی منگنی والے دن کے دُکھ کی طرح جھلملانے لگا تھا۔

"ان کے پاس اپنی کسی غلطی کا آج سے پہلے کوئی ایکسپلے نیشن ہوتا تھا جو آج ہوگا؟ ماما! رہنے دیجیے، آپ جتنا سچ میں اترنے کی کوشش کریں گی، آپ کا دل اتنا ہی ان سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس لئے پلیز، اپنے دل کو تکلیف میں مت ڈالیں ماما!" شہریار نے تیز نظروں سے جازی کو دیکھا تھا مگر کچھ بولا نہیں تھا اور اس نے نیا شوشہ چھوڑا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے پاپا! انہوں نے مسٹر سرمد کی لائرز چیمبر کے ہوتے ہوئے ایک نئے وکیل کو سائن کیا ہے، جو صرف ان کے معاملات دیکھے گا۔"

سالار عبدالرحمٰن جو بریف کیس لے کر دروازے کے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے، اس بات پر ٹھہر کر کھانے کے کمرے میں آ گئے تھے۔

"ایسا کیوں کیا تم نے؟" سالار عبدالرحمٰن جو قطعی نیوٹرل ہونے کی کوشش کر رہے تھے، اب اپنا ارادہ برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔

"میرے کچھ ذاتی معاملات تھے، جن پر مجھے رفیق صاحب کے کمنٹ اور ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ یہ قطعی میرا ذاتی معاملہ تھا، اس لئے دفتر کے لئے ہائر کئے وکیل مسٹر سرمد سے میں نے رابطہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔"

"تمہارے ذاتی معاملات ہمارے داخلی معاملات سے ایسے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ ذاتی نہیں رہتے۔ دھیان رہے، اس بار ہم کسی بھی طرح کی رعایت نہیں برتیں گے۔"

"اوکے، یاد رہے گا۔" وہ بھنا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ پاپا دفتر کے بجائے اس کے روم کی طرف چلتے چلے گئے تھے۔ وہ اس سے کسی بات کی وضاحت نہیں چاہتے تھے۔ وہ بس اس کے موڈ کو بہتر کرنے کے خیال سے اس تک پہنچے تھے۔ مگر وہ تیار ہونے کے بجائے بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔

"شہریار! اتنی ٹھنگ رانگ؟" اس نے پاپا کو دیکھا مگر اٹھا نہیں حالانکہ وہ ان کے احترام میں ہمیشہ کتنا بھی تھکا ہوا ہوتا، یکدم اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔

"تمہارا موڈ بہت خراب لگ رہا ہے۔ میں نے آج تک تمہیں اتنا خفا نہیں دیکھا۔ خیریت تو ہے؟"

"ویسے ہی پاپا! جازی کی تنقید بہت زیادہ سخت لگی تھی، اس لئے موڈ خراب ہو گیا تھا۔"

پاپا نے اس کے قریب بیٹھ کر ہولے سے رخسار چھوا، پھر مدھم ہو کر بولے تھے۔ ”یہ ساری غلط فہمیاں تمہاری خاموشی کی وجہ سے ہی بڑھتی جا رہی ہیں۔ سات سال پہلے اگر تم نے خاموش رہنے کا وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں ساری دنیا کو بتا دیتا میرا بیٹا کتنا نایاب، وہ لونگ اور کیئرنگ ہے۔“

”اس سے کیا ہوگا پاپا؟ کہہ کر، جتا کر ثابت کیا تو کیا؟...... کیا میری زندگی کھلی کتاب کی طرح نہیں ہے؟ میں کسی ادق زبان کا لفظ تو نہیں ہوں کہ مجھے ترجمہ کرنے کے لئے ایکسٹرا اوورڈ ڈکشن کی ضرورت پڑے۔“

”مگر دنیا وہی دیکھتی ہے، جو اسے نظر آتا ہے۔ وہی مانتی ہے، جو اسے دکھایا جاتا ہے۔ تم خود بھی تو اشتہار سازی کی دنیا سے وابستہ ہو، تمہیں تو اچھے سے پتہ ہونا چاہئے، جو دکھتا ہے، وہی بکتا ہے۔“

”ہاں پاپا! مگر مجھے لگتا ہے، دنیا مجھے بنا کہے جان پائے۔“ وہ لیٹا رہا۔ شرٹ کے کف فولڈ تھے اور بس پاپا کی نظر اچانک اس کی کلائی پر جا کر رک گئی تھی۔

”تم واقعی پنڈی نہیں گئے تھے ناں شہریار؟“

دروازے کا ہینڈل تھامے ہوئے کھولنے کی جستجو کرتی ماہ کا وجود سرد ہو گیا تھا۔ کیا وہ کوئی ایسی بات سننے والی تھیں جو جازی کے بقول، تلخ سچ تھا۔ وہ ٹھہر گئی تھیں اور اندر وہ چور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے پاپا! میں واقعی پنڈی میں ہی تھا۔“ مگر اس کا لہجہ بہت کمزور سا تھا اور پاپا کی غصے میں بھری ہوئی آواز ارد گرد گونجی تھی۔

”تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کہ میں حقیقت نہیں جان پاؤں گا؟ شہریار! تم چار دن کسی ہاسپٹل میں گزار کر آئے ہو ناں؟“

”ہاسپٹل میں......؟“ ماہ کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور مدھم لہجے میں کہا گیا۔

”کسی خاص وجہ سے ایڈمٹ نہیں تھا پاپا! بس اچانک تھوڑا سا چین ہو گیا تھا، اس لئے ڈاکٹرز نے خواہ مخواہ پکڑ کر بکرا بنا دیا۔“

”بکومت شہریار! اتنی جلدی جلدی چین ہونا اچھی علامت تو نہیں ہے۔“

”اب کیا کریں پاپا! اچھی علامت ہو یا بری، زندگی میں آنے والی تبدیلیوں سے کون جان چھڑا سکا ہے؟“

”مطلب؟“ پاپا کی ہراسگی بھری آواز ابھری اور وہ ہنس کر بولا۔

"آپ تو ایسے پریشان ہو رہے ہیں پاپا! جیسے میں نے آپ کو بحران سنا دیا ہو۔" وہ تھما، پھر شوخی سے بولا۔ "میں نے یونہی ایک جنرل سی بات کی تھی پاپا! آپ پتہ نہیں کیا سمجھے؟"

پاپا کی آواز نہیں سنائی دی تھی اور ماما اُلٹے قدموں واپس لوٹ گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آ کر ان کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ پتہ نہیں، کب تک وہ اپنا کمرہ بند کر کے روتی رہی تھیں۔ پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سنبھلیں تو آنسو خشک کر کے وہ اس کے کمرے کی طرف دوبارہ گارڈن کراس کر رہی تھیں۔

باہر سے آؤٹ ہاؤس کا دروازہ کھلا ہی رہتا تھا۔ ہاں، بس اس کا کمرہ اندر سے لاک ہوتا تھا، مگر آج غیر متوقع انہوں نے اس کے کمرے کے دروازے کو چھوڑا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ کلائی آنکھوں پر رکھے وہ بہت گہری نیند میں سو رہا تھا۔ مام نے اس کی کلائی میں سرنج جیسے سیاہی مائل ہوتے دیکھے تھے اور ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

"آخر میں کیا کروں ایسا کہ تیری عمر کے سارے دکھ مجھے مل جائیں شہریار؟" مام نے اُس کے نقش کو چھوا بھی، بہت واضح لہجے میں کہا بھی مگر وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ ہلکا سا بھی کسمسایا نہیں۔ حالانکہ پہلے نیند کا اتنا کچا تھا کہ قدموں کی چاپ سے بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

مام وہیں بیٹھی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ شام کے چھ بجے جاگا تو مام کو اس نے اپنے کمرے ہی میں پایا۔

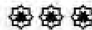
"مام! آپ......آپ کب آئیں؟" وہ تیزی سے اٹھا۔ حالانکہ تیزی سے اٹھنے سے بہت تیز ٹیس اٹھی تھی مگر وہ ضبط کر گیا تھا۔ مام اس کے کمرے کی لائٹس آن کر کے اس کے قریب آ کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولیں۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی تھی۔ میں تو سمجھی تھی، تم دفتر میں ہو گے، مگر شرفو نے بتایا تم تو آج دفتر گئے ہی نہیں تھے۔ شاید سفر کی تھکن زیادہ ہو گئی ہے ناں؟"

"جی مام!" اسے مام سے جھوٹ بولنا عجیب سا لگا تھا مگر اس نے جھوٹ بول دیا تھا اور مام نے اس کے جھوٹ کو خاموشی سے پی لیا تھا۔ پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

"تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے لئے چائے لگوا دیتی ہوں۔"

"اوکے مام!" وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا اور مام کچن کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔



شافعہ کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملتے ہی سلامہ ارسلان ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔پہلی بار وہ ایک نئے طرح کے خوف سے لرزا تھا۔شافعہ ہاسپٹل کی بابت اپنا خوف شیئر کررہی تھی۔تب اسے لگا تھا، وہ جو سچ چھپاتا آرہا تھا، وہ کسی نہ کسی کی زندگی میں ایسا ہی حادثہ بن کر رونما ہوتا ہوگا۔مگر وہ اپنے قلم سے بڑی ہی چابک دستی سے اس واقعے کو اس طرح پیش کرتا تھا کہ اس کا ممدوح دنیا کا سب سے بڑا ہیرو لگنے لگتا تھا۔سچائی چھپانے کی سزا اگر کڑی ہو کر اس کی زندگی کو بددعا کی طرح لگ جاتی، اگر واقعی شافعہ کو کچھ ہو جاتا تو......یہ سوچ کر اُس کا دل لرز جاتا تھا اور پہلی بار ایک سچ نے اسے اسی خوف سے بندھے بندھے ورثہ دیا تھا۔ہم حادثے کا مطلب اس وقت تک سمجھ ہی نہیں پاتے جب تک وہ حادثہ خود ہماری زندگی سے قربت اختیار کرکے ہماری سانسیں اتھل پتھل نہیں کردیتا۔ہم خبر کو صرف ایک خبر سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہوگیا تھا یہ واقعہ۔جب وہی خبر خود ہماری زندگی سے کسی خون آشام کی طرح آکر چمٹ جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اس خبر میں کتنا دکھ، کتنی آہیں، کتنے بین چھپے تھے، جو ہماری ساعتوں نے ان سنے کر دیئے تھے۔

وہ یہاں بیٹھا تھا اور اس کے اندر اس کی ذات ایک کنفیس پارکس میں کھڑی تھی۔

ارسلان راشدی عدیل عبدالرحمٰن کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے اور سلامہ ارسلان کا دل چاہ رہا تھا، وہ یونہی بہت سی غیر ضروری باتوں میں رکھ کر ایک بہت ضروری بات پوچھے کہ شہریار عبدالرحمٰن کیسا ہے؟ اسے کچھ دنوں پہلے کی ملاقات بہت شدت سے یاد آئی تھی جب وہ اس کے ہر تلخ لہجے پر یونیورسٹی والے لہجے میں نرمی سے مخاطب تھا۔وہ اس پر گرج برس رہا تھا اور وہ سمندر کی طرح پُرسکون تھا۔اماں کہتی ہیں، وہ بہت اچھا انسان ہے۔زہرہ پھو کہتی ہیں، اس جیسے بچے اب دنیا میں خال خال دکھائی دیتے ہیں، جو اپنے حصے کی خوشی سے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیں۔عارفہ کہتی ہے، شہریار بھائی کی وجہ سے ان کی زندگی ڈس بیلنس ہوگئی ہے۔اگر وہ نہ ہوتے، وہ گھر نہ آتے تو شاید نائمہ پھو گھر سے بے گھری کا عذاب نہ سہتیں۔

نائمہ......! سلامہ ارسلان کی رُوح پھر سے آنکھوں میں کھنچ آئی اور سامنے غنودگی میں لیٹی ہوئی شافعہ کی طرف اُس کی نظر مرتکز ہوگئی اور ایک پرانی یاد در آئی، جہاں وہ شافعہ کے ساتھ کھڑا حقوقِ نسواں کانفرنس کی کوریج کر رہا تھا اور بیک گراؤنڈ میں نظمیہ گونج رہا تھا۔

یہ کوچے، یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے کارواں زندگی کے

کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے؟
ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
اُس نے نظمیہ کی اُٹھان پر نظر موڑ کر پشت بھی موڑلی تھی اور اُس کا اسسٹنٹ کوریج کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی فوٹیج بھی لے رہا تھا۔
"تمہیں کیا لگتا ہے، یہ سب بکواس ہے؟" اُس کے اسسٹنٹ کم دوست نے چھیڑنے کی کوشش کی اور وہ کندھے اچکا کر بولا۔
"مجھے ایسے لوگوں سے قطعی ہمدردی نہیں جو اپنی تکلیفوں کے خود ذمے دار ہوں اور یہ لڑکیاں، انہیں زیادہ تر ان کے خواب رُلاتے ہیں۔ ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کیا کریں اگر یہ لڑکیاں خود اپنی عزت کی اہمیت نہ سمجھتی ہوں؟"
"بکواس مت کر۔ اگر کسی کے کان میں تیرے یہ نادر خیال پڑ گئے نا، تو ابھی کھڑے کھڑے ہال سے باہر نکال دیں گے۔" دوست نے مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کانفرنس کی کرتا دھرتا این جی او کی چیئرپرسن کا خصوصی پوز لیا اور نظمیہ آگے بڑھا۔
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے، ماں بھی
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی
ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
اُس نے طنز سے چیئرپرسن کی طرف دیکھ کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھایا اور اس کے دوست رضوی احمر نے کہا۔ "یہ عورت بھی کمال کی چیز ہے۔ تمہیں پتہ ہے اس کے بیٹے کی شادی پر گرینڈ فینالے ٹائپ کا مجرا ہوا تھا اور جو گا ئیکہ بلائی گئی تھیں، ان میں سے دو لڑکیاں روتی ہوئی گئی تھیں۔ وہ پہلی بار اس ایونٹ میں آئی تھیں اور اس کے بیٹے اور اس کے دوستوں نے کسی بھی قسم کے احتجاج کو خاطر میں نہ

لاتے ہوئے کارروائی ڈال دی تھی اور رقم بھی کوئی خاص نہیں خرچی تھی۔

''چپ کر، وہ تجھے ہی دیکھ رہی ہے۔'' سلامہ نے اسے بمشکل چپ کرایا اور نظم کا آخری بند اس کے کانوں میں سیسے کی طرح اترا

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ

یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ

ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ

ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

رضوی نے اُس کے کان میں گنگنا کر کہا۔ ''ثناء خوانِ تقدیسِ مشرق کو اگر بلا لیا گیا، اختیار رو بہ عمل آگیا تو مشرق کا تو رام نام ست ہو جائے گا........''

''کیا بکتا ہے، مسلمان ہے بھی یا نہیں؟'' سلامہ نے اسے چٹکی کاٹی اور وہ خباثت سے ہنس کر بولا۔

''موقع اور وقت کے حساب سے میں سب کچھ ہوں۔ جہاں کامیابی کے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھنا ہو تو میں چوک نہیں سکتا۔'' وہ تھما، پھر بولا۔ ''ادھر دیکھ، تیری گرل فرینڈ تیرے پاس آ رہی ہے۔ میں تو چلا۔''

سلامہ ارسلان ہنس کر چپ ہو گیا اور اُس کی اس نظم کی تعریف کرنے لگا جو اُس نے قطعی نہیں سنی تھی۔

''مسز رضا بہت اچھی انسان ہیں۔''

''ہاں، واقعی ان جیسے انسانوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے۔'' اس نے طنز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، مگر طنز پھر بھی جھلک آیا تھا۔

وہ مارے بندھے کو ریج بھگتا رہا تھا، جب باقی پریس کے سامنے وہ لڑکیاں پیش کی گئیں۔ ایک گھر سے فرار ہو کر محبت پانے نکلی تھی اور ایک جبراً اغواء کی گئی تھی۔ دونوں کے انجام ایک جیسے تھے۔ سلامہ جانتا تھا، اس کانفرنس کے بعد ان لڑکیوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں، سارے این جی اوز کس ڈگر پہ چلتے ہیں۔ مگر مسز رضا جس این جی او کی چیئرپرسن تھیں، وہاں ایسی لڑکیوں کے نام پر امداد تو اکٹھی کی ہی جاتی تھی، مگر بڑے بڑے با اثر افراد کے لئے پھر ایسی لڑکیاں رہائش، کھانے اور عزت کے دھوکے میں بلکہ احسان میں اسی ڈگر پہ چلائی جاتی تھیں، جس ڈگر پر انسانیت کے نام پر انہیں ہاتھ

پکڑ کر تھما گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے مسٹر سلامہ! آپ کو ایسی لڑکیوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ورنہ اتنی کوفت نہ ہوتی آپ کے چہرے پر۔“ شافعہ کسی سلسلے میں آگے کہیں تھی جب مسز رضا نے اسے آلیا تھا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا، پھر کرختگی سے بولا۔

”ایسی لڑکیوں سے ہمدردی کیوں کی جائے میم! جنہیں دل کی پروا نہ ہو۔ انہیں دل سے جڑی کسی یاد میں ہمیشہ یاد کر کے کیا ملے گا؟ ایسی لڑکیاں...... انہیں تو پہلی فرصت میں گولی ماردینی چاہیے۔“

”کیا تم اپنی بہن کو گولی مار سکتے ہو؟ میں نے سنا ہے، وہ بھی تو گھر چھوڑ کر بھاگ گئی تھی ہاں؟“ مسز رضا نے جانے کس جنم کا بدلہ لیا تھا۔ سلامہ ارسلان کو لگا تھا، وہ اچانک دہکتی آگ میں گھسیٹ لیا گیا ہو۔ لال سرخ انگارہ آنکھوں سے اس نے مسز رضا کو دیکھا، پھر کرختگی سے بولا۔

”زندہ انسان کو گولی مارنے کا سمجھ آتا ہے اور جو دل میں مر چکے ہوں، انہیں مارنے کے لئے کسی بلٹ کی ضرورت نہیں پڑتی، صرف ایک بے نیاز نگاہ کافی ہوتی ہے میم! مگر یہ دل کی باتیں ہیں، یہ آپ جیسی سوکالڈ بیبہ پارٹی نہیں سمجھ سکتی۔“

مسز رضا بھنا کر آگے بڑھ گئیں۔ وہ واپس پلٹا تو اپنے پیچھے شافعہ کو کھڑے پایا۔

”آپ...... دے آئیں آپ انٹرویو؟“ اُسے پولیس کے دوسرے افراد سے اُس کا گھلنا ملنا برا لگا تھا۔

شافعہ نے اچنبھے سے اُسے دیکھا تھا، پھر نرمی سے بولی تھی۔ ”آپ کو کس پر اعتبار نہیں ہے، مجھ پر یا خود پر؟“

”پتہ نہیں۔“ اُس نے سگریٹ سلگا لیا اور وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

”آپ نے نائمہ کے بعد بظاہر عارفہ پر کوئی قدغن نہیں لگائی، لیکن آپ کی نظروں کی تیزی سے وہ بچی ہر وقت سہمی رہتی ہے۔ آپ کہتے ہیں، آپ کو اپنی محبت پر اعتبار ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے، آپ کو سب سے زیادہ کنفیوژن خود اپنے آپ پر ہے۔ آپ اندر سے موم ہیں اور باہر سے پتھر بننے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ رویہ خود اپنے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔ انسان اپنے آپ سے لڑتا رہے تو بہت جلدی تھک جاتا ہے۔ رہی بات ایسی لڑکیوں کی غلطی پر سفاکی سے دیا گیا آپ کا کمنٹ، تو سلامہ! مجھے کہنے دیجئے، یہ آپ اپنے اندر کا فرسٹریشن باہر نکالنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ورنہ نائمہ اگر زندگی میں

کبھی آپ کے سامنے آئی تو آپ اس کے چہرے پر بے نیازی والی نظر بن ہی نہیں سکتے۔ آپ اندر سے اتنے لونگ، اتنے کیئرنگ ہیں کہ نائمہ کی جگہ اگر کوئی انجان لڑکی بھی آپ کی مدد کی طلب گار ہوتی تو آپ پشت نہیں موڑ سکتے۔ پلیز سلامہ! اپنے اوپر سے یہ دوہرا خول اُتار دیجئے، آپ کیا ہیں، یہ سمجھئے......"

"مسٹر سلامہ! آپ ریسٹ کرلیں۔ مس شافعہ اتنی سیریس انجری پیشنٹ نہیں ہیں۔" نرس کی آواز اُسے پھر سے حال میں لے آئی اور یکدم اسے عدیل عبدالرحمٰن کا محبت آمیز رویہ یاد آنے لگا۔

"دولت بری نہیں ہوتی، اسے استعمال کرنے کا اور نہ کرنے کا فیصلہ اچھا یا برا ہوتا ہے۔ اسے استعمال کرنے کا طریقہ ٹھیک یا غلط ہوتا ہے۔"

عدیل بھائی کے ہاتھ کا لمس اس کے کندھے پر اب تک تھا۔

"پتہ نہیں کون ہے جو میرے ہاسپٹل کے پروجیکٹ میں ساری راہ کے کانٹے چنتا چلا جا رہا ہے؟" اس کی ذہنی رو پھر سے شہریار کی طرف مڑ گئی۔ زہرہ بجو کا لہجہ گونجنے لگا، وہ اس لہجے میں چھپی محبت کو جھٹکنا چاہتا تھا کہ جنید بھائی کی آواز آنے لگی۔

"پتہ نہیں، کیا جادو ہے اس شہریار میں، اس نے ماں کا اتنا کڑا فیصلہ بدل دیا۔"

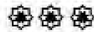
اس وقت اس نے دل کے اندر شہریار کے لئے ایک لمحے کے لئے پیدا ہونے والی نرمی کو، اس کی اچھائی کو اس کے مطلب پرست ہونے کے جھوٹے الزام سے برابر کرنا چاہا تھا مگر اس لمحے اس نے پوری آواز سے کہا تھا کہ زہرہ بجو کے گھر واپس ہونے، زندگی کے سفر میں خوشی کے سنگ شامل ہونے میں اس کا واقعی کیا مطلب تھا؟

دماغ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر پھر بھی ایک ضد کی تھی، شاید وہ ایک غلطی سے سدھارنا چاہتا تھا، تبھی غلطی کو اپنی دوسری غلطی کی۔ مگر کیا واقعی نائمہ کے گھر چھوڑنے کے فیصلے میں وہ کہیں شامل تھا؟ کیا واقعی اسے موردِ الزام ثابت کیا جا سکتا ہے؟

کیا کبھی اس نے اس کی محبت کو اپنے کسی مفاد کے لئے استعمال کیا تھا؟ کیا شہریار نے اس کے ساتھ جتنا بھی اچھا کیا، جتنے برے لمحات میں وہ اس کے کام آیا، کیا کبھی اس نے اس کا ریٹرن مانگا یا کبھی جتایا؟ وہ تو ہر اچھا کام کر کے بھول جایا کرتا تھا۔ خود سلامہ ہی اُس کی اچھائی، نیکی کی عادت سے متاثر رہا کرتا تھا۔ لیکن کیا واقعی وہ متاثر ہوا کرتا تھا یا یہ احساس اس کے اندر ایک ناراضگی بھر دیا کرتا تھا، جسے وہ خود ساختہ احسان مندی میں چھپائے رکھتا تھا؟

اماں کہتی ہیں، وہ نائمہ کی طرح شاید انسانوں سے نہیں، ان کی امارت سے متاثر ہوتا تھا۔ اس کے اندر خلا تھا۔ کیا واقعی یہ ٹھیک تھا؟
پتہ نہیں وہ کتنی کنفیس پاکس کے لئے تیار تھا بھی یا نہیں۔ لیکن روح کے اندر کوئی اُس کے اس دہرے خول کو کھرچ رہا تھا۔
آخر یہ تبدیلی کیوں ہو رہی تھی؟...... اُس نے لمبا ٹھنڈا سانس کھینچ کر سوچا اور دل نے کہا۔ انسان اپنے اوپر آنے والی ہر مصیبت، ہر دکھ، ہر تکلیف سہہ جاتا ہے مگر وہ جس سے محبت کرتا ہے، اس پر گرم لُو کا ایک ہلکا سا تھپیڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک کانٹے کے برابر خراش بھی سہہ نہیں سکتا۔ اور پھر شافعہ...... شافعہ صرف اُس کی محبت کہاں تھی، وہ تو اُس کے اپنے وجود کا حصہ تھی اور وجود پر ہونے والی افتاد، اُسے دل اتنی آسانی سے کب بھلا پاتا ہے؟'
کیا وہ اندر سے بدل رہا تھا؟...... اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور چپکے سے کمرے سے وزٹ آورز کی وجہ سے باہر آ گیا تھا۔ اچانک اسے اس لمحے کی اماں کی خفگی بھی یاد آنے لگی۔
''تم...... مجھے نہیں لگتا تھا تم جتنا علم بڑھاتے چلے جا رہے ہو، اتنا ہی جہل تم میں بھرتا جا رہا ہے۔ تم ایک ماں کی محبت کو دولت کے نظریئے سے دیکھنا چاہتے تھے۔ تم بھی نائمہ جیسے ہو۔ اُسے بھی انسانوں کی قدر نہیں تھی۔ وہ بھی دولت کو سب کچھ سمجھتی تھی اور تم بھی دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو۔ اب تو مجھے بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے، تم نے کہیں شہریار کی وجہ سے تو اس سے دوستی نہیں گانٹھی تھی؟ ہوتا ہے ناں، کچھ لوگ دوسروں کے پیسوں پر عیش کرنے کے بڑے حریص ہوتے ہیں۔''
کیا واقعی وہ حریص تھا؟'' اس نے دل میں جھانکا۔ اماں خفا، اُس کے سامنے پھر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔
وزیٹرز آورز میں زہرہ پھجو اور اماں سب سے پہلے داخل ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے اماں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے رویے میں اُس کے لئے خفگی تھی، مگر شافعہ سے وہ بہت محبت آمیز رویے سے مل رہی تھیں۔
''آپ کا شہزادہ ابھی تک پنڈی سے نہیں آیا؟'' اس نے جان کر اماں کے ہاٹ ٹاپک کو چھیڑا۔ مگر اماں خاموش رہیں۔
زہرہ پھجو بولیں۔ ''اماں سے اس کی بات ہوئی تھی، وہ ایک دو دن میں کراچی واپس آنے والا ہے۔''
''واپس آنے والا ہے۔ اور آتے ہی ایک دھماکہ اس کا منتظر ہے۔'' اس نے شہریار کی واپسی کا سوچ کر ''دی ایج'' میں لگنے والی آئندہ رپورٹ کے بارے میں سوچ کر خود سے کہا۔ مگر اب معاملہ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ مسٹر یوسفی کی بات ماننے کے لئے مسٹر حسن ابراہیم نے شہریار کی ذات کے بخیئے اُدھیڑنے کا کام سونپا تھا اور اس نے اُس کی طرف سے خار کی وجہ سے یہ رپورٹ تیار کی تھی۔ مگر اب یہ

رپورٹ...... وہ تھوڑا سا ہراساں ہوا تھا، مگر یہ ہراسگی پاورفل نہیں تھی۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ شافعہ کی وجہ سے اس کی سوچ میں بہت تیزی سے بدلاؤ آیا تھا۔ لیکن یہ بدلاؤ ایسا ہی تھا، جیسے تیز سمندر کا بھونچال۔ اب سمندر پُرسکون ہو کر سب کچھ بھول جائے یا یاد رکھے، یہ وقت کو طے کرنا تھا۔



زندگی ان کی نظر میں محبت سے کہیں زیادہ دولت میں پوشیدہ تھی۔ جب بھی انہوں نے زندگی کا ایک نقشہ کھینچا اس میں محبت کے فانوس، قمقمے بھلے نہ جلائے ہوں، عود و عنبر کی خوشبو میں بھلے نہ وجود بھگویا ہو، مگر آسائشات کے نام پر ہمیشہ انہوں نے اپنا دل ہمکتا ہی پایا تھا۔ زندگی میں دولت نہ ہو اور کٹتی ہو، اس کا کبھی انہوں نے گوشوارہ نہیں رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی، جب دولت نے گھر کی راہ دیکھی تو ان کے اندر کی حریص عورت نے سوچا، یہ ساری دولت کس طرح اپنی رہ سکتی ہے۔ اور بس پھر آنکھ بند کر کے انہوں نے جو سمجھ میں آیا، کیا۔ گھر کسی کا بسایا بھی، اُجاڑا بھی، پھر بیوگی سر پر تیز دھوپ کی طرح چھا گئی تو انہوں نے اسی اُجڑے ہوئے گھر کی دلداری میں توجہ انویسٹ کر دی۔ مگر یہ توجہ بھی محبت کے ضمن میں نہیں تھی، اسے بھی انہوں نے کچھ لو اور کچھ دو کے پیرائے میں بانٹ لیا تھا۔ پھر زندگی کا نیا سفر شروع ہوا تو خبر ہوئی، آسائشات اور دولت کا جو ایک الگ کرائے میرا بنایا تھا، وہ تو کہیں درمیان ہی سے محبت کے نقصان میں کھو گیا ہے۔ جس دل پر انہوں نے دستک دی تھی، اس دل پر تو محبت نے پہلی دستک پر در کھل جانے کے بعد سے ہی اندر سے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی تھیں۔ گھر عسرت کا منہ بولتا نمونہ بن گیا تھا۔ گھر میں کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ جس انسان کی دولت کی چاہ نے انہیں عورت کے معیار سے گرا دیا تھا، وہ عورت ایک بار پھر ٹریپ ہو گئی تھی۔ تب پرانی شناسائی اچانک سر راہ مل گئی تھی۔ وہ ٹرانس میں آ گئی تھیں۔ قدم خود بہ خود اس کی طرف اُٹھنے لگے تھے۔ پھر تیز دھوپ میں ننگے پیر چل کے ایئر کنڈیشنر کی سرد ہوا کا جھونکا چھو جائے تو آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی جاتی ہیں، سو انہوں نے بھی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اندر کی عورت کو ایک بار پھر سے نیند کی گولیاں کھلا کر خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر وہ ہر روز اس شناسائی سے ملنے لگیں، ملتی ہی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھا بیٹھیں۔ شناسائی پھر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی اور وہ ایک دھوکے کو لئے گھر واپس آ گئیں۔

وقت بیتتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس دھوکے نے نیا جنم لیا۔ ان کے شریک سفر نے پہلی بار مردہ آنکھوں سے ایک امید کو زندہ ہوتے دیکھا۔

''میری بیٹی...... یہ میری اولاد ہے۔'' انہوں نے بچی کو گود میں لیا اور وہ سر جھکا گئیں۔ کچھ کہہ بھی نہ پائیں۔ اور آج اتنے سالوں بعد یہ سوال پھر سے نئے سرے سے اٹھا تھا۔

''مجھے کرپشن سے سخت چڑ تھی۔ یہ تو میری بیٹی تھی نا آصفہ! یہ تمہاری بیٹی تھی نا، پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟'' آوازیں، اردگرد آوازیں......

وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"یہ تمہاری بیٹی ہوتی تو شاید یہ ایسی نہیں ہوتی، تم تو درویش صفت انسان تھے اور وہ......وہ عطیہ، وہ تو تم سے کہیں زیادہ صابر اور محبت کی بھوکی تھی۔ مگر میں نے اپنی حرص اور لالچ میں سب کچھ لٹا دیا۔"

"سہیل......!" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں۔ اور آخری فون کال ان کے کہیں اندر دل کے خاموش کمرے میں بجتی چلی گئی۔

"مت کرو یہ سب آصفہ! آخر تم کیوں برباد کرنا چاہتی ہو میرے ارسل کے گھر کو؟ عطیہ اتنی پیاری، اتنے اچھے سلوک والی لڑکی ہے۔ اس نے ہمیں ایک بیٹی کا سکھ دیا ہے، مگر تم کیسی ماں ہو، اپنی بیٹی کا گھر برباد کرنا چاہتی ہو۔ کتنی دولت چاہیے تمہیں؟ آخر کس دولت کا معیار چھونا چاہتی ہو؟ آصفہ! تم تو وہ عورت تھیں جو کہتی تھیں، دل بہت ضروری ہے، محبت کے بغیر تمہیں سانس نہیں آتا، پھر......پھر آج کل......

اور پھر دولت کے لئے انہوں نے جتنی بھی ہوس کا اظہار کیا تھا، سہیل راشدی کے لئے وہ صدمے سے کم نہیں تھا۔ ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے سہیل راشدی کے ساتھ ناخوش ہونے کے جتنے تلخ اور سفاک لفظ تھے، سب ایک ساتھ انڈیل دیئے تھے۔ اور یہی بات اتنی جانکاہ ثابت ہوئی تھی کہ وہ گاڑی پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔ گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ کوسٹر سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ گھر میں برف ہو گئی تھیں۔

"سہیل....! سہیل....!" وہ چیخ بھی تھیں مگر ان کی چیخیں ان تک واپس لوٹ گئی تھیں۔

ارسلان راشدی شام تک کارروائی کے بعد لاش گھر لا سکے تھے اور آج اتنے سالوں بعد ان پر کھلا تھا، درحقیقت ارسلان راشدی، سہیل راشدی کے بے جان وجود کو نہیں، خود ان کو دفنا کر آئے تھے۔ انہیں مرے ہوئے اتنے سال ہو گئے تھے اور لوگ آج بھی انہیں زندہ سمجھتے تھے۔

ایک دم پھر سے انہیں لگا، ایک گھر کی منہدم عمارت کا سارا ملبہ ان پر آن گرا ہے۔ ان کی سانس میں مٹی اٹکتی چلی گئی۔ ان پر پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ سونیا گھبرا کر ان تک آئی تھی۔ شافعہ کے بتائے گئے طریقے سے وہ انہیں ٹریٹ کر رہی تھی کہ اچانک انہوں نے اُسے جھٹک دیا۔

"دفع ہو جاؤ تم......تم میری بیٹی نہیں ہو۔" سونیا نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ "چلی جاؤ......تو اگر ارسلان کی بیٹی ہوتی تو......تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اپنے باپ کی طرح دھوکے باز، مفاد پرست نکلی ہے تُو۔"

سونیا کھڑے سے بیٹھ گئی تھی۔ "میں تمہاری بیٹی ہوں اماں!" اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ہسٹریک ہو کر چیخ کر کہا۔

”ہاں، ہاں.......تُو میری بیٹی ہے، میری بیٹی.......اسی لئے ایسی ہے۔ تجھے عزت پر دولت زیادہ بھلی لگتی ہے.......“ وہ اُسے گالیاں دینے لگیں۔ اس لمحے انہیں لگ رہا تھا، وہ جتنا زیادہ اُسے برا بھلا کہہ رہی تھیں، اتنا ہی وہ اپنی کسی غلطی کو لتاڑ رہی تھیں۔ مگر دماغ نے یکدم انہیں ایک فیز میں لا کر کھڑا کر دیا۔

کیا یہ غلطی سونیا نے کی تھی؟

کیا وہ اس سلسلے میں بالکل بری الذمہ تھیں؟

کیا یہ نہیں تھا کہ ان کی غلطی کو سونیا نے اپنے کندھے پر اٹھانے کا دکھ جھیلا تھا؟

وہ گم صم سی سونیا کو دیکھنے لگیں۔ ان پر پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور اسی وقت بیل ہوئی۔ سونیا بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی۔ مگر جو شخص سامنے کھڑا تھا اس نے سونیا کے کندھوں پر پڑے ہوئے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم آنسو بھر آئے تھے۔ زوار حسن اس سے ملے بغیر پتہ نہیں ملک سے باہر چلا گیا تھا یا کہاں غائب تھا؟ اور وہ تین دن سے اس کے ہر نمبر کو ٹرائی کر کر کے تھک گئی تھی۔

”یہ مرد بھی آپ کے نہیں ہوتے۔“ زرش نے ایک دفعہ اس سے جانا نگی محفل میں حمزہ عابد کی بانہوں سے نکل کر خاموش بیٹھی ہوئی سونیا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ اس وقت زرش بے حد نشے میں تھی اور سونیا نے زوار کو کسی اور کے لب و رخسار کی تعریف کرتے دیکھ کر اپنا خون جلاتے ہوئے زرش کا یہ جملہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ اور آج آصفہ اور ارسلان راشدی نے جو کہا تھا، اس نے اس کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس کی ذات اتنی رائیگاں اور اس کی شناخت اتنی کمزور بندھن سے بندھی تھی کہ تیز ہوا کا ایک جھونکا برداشت نہیں کر سکی۔

”سونیا!.......آپ رو رہی ہیں؟“ وہ یکدم اندر آ گیا تھا اور اس کے آنسو، وہ کب تھمنے تھے۔

”دل دُکھانے کی سزا اتنی کڑی ہو سکتی ہے شہریار صاحب؟“

”کتنی کڑی؟“ شہریار عبدالرحمٰن نے نرمی سے پوچھا اور وہ جو دماغی طور پر بالکل ختم ہو چکی تھی، کسی نفسیاتی مریض کی طرح بڑبڑائی۔

”اتنی کڑی شہریار صاحب! کہ آپ کو اتنے برسوں بعد اچانک پتہ چلے کہ آپ جس کے نام کی شناخت لے کر گھومتے رہے ہیں، جس کے نام پر اتراتے رہے، جس کے نام پر آپ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کچھ بھی کہہ سکتے تھے، وہ آپ کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ میں تیز، چلچلاتی دھوپ میں تنہا رہ گئی ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ میری ماں، نہ.......نہ میرا باپ۔ پتہ نہیں میرا باپ کون تھا؟“ وہ خون

رنگ آنکھوں سے شہریار کا گریبان پکڑ کر اس طرح دیکھنے لگی، جیسے اس بے شناخت ہونے کی سزا اس نے ہی اسے دی تھی۔

"سونیا! آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

سونیا نے یکدم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بالکل گم صم ہو کر دیوار سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

آصفہ ارسلان راشدی اس عرصے میں اپنے کمرے سے رُک رُک کر باہر آ گئی تھیں۔

شہریار نے آصفہ ارسلان راشدی کو دیکھا اور اسے لگا، اس کی ماں یہیں کہیں بادلوں کی بارش میں کھڑی آج تک بھیگ رہی تھی۔ پاپا نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گھر کے برابر والے پڑوسیوں نے کس طرح انہیں فون کیا تھا اور جب وہ وہاں پہنچے تو بارش میں، گلی میں گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے عطیہ بانو کس طرح برف کی مورت بن گئی تھیں۔ انہوں نے انہیں کیسے کیسے نہ سنبھال کر اٹھایا تھا، مگر انہیں اس لمحے لگا تھا، عطیہ بانو کا وجود ضرور ان کے ساتھ چلا گیا تھا مگر ان کی روح وہیں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہ گئی تھی۔ زندگی کو انہوں نے ان کی آنکھوں سے مرتے دیکھا تھا اور دل میں محسوس کیا تھا، زندگی کا ایک حصہ خود ان کے دل میں بھی مر گیا تھا۔ پھر تین دن آئی سی یو میں رہتے اور بچوں کو جنم دیتے ہی وہ یوں ہاتھ چھڑا کر آگے نکل گئیں کہ پاپا کے ہاتھوں میں جدائی کے لمس کا ذائقہ تک نہ ٹھہر سکا۔

"کون ہو تم؟" آصفہ ارسلان راشدی اُس تک آ گئی تھیں۔ اور وہ گم کیفیت میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اندر سے دل چاہ رہا تھا، وہ دنیا کی جتنی بد تہذیبی کا ثبوت اس عورت کو مخاطب کرنے میں دے سکتا تھا، وہ جائز ہوتا۔ مگر یہ عورت...... یہ عورت اس کے باپ کی بیوی تھی اور زندگی نے اس کی ذات پر بھی کچھ اچھے نقش نہیں چھوڑے تھے۔ وہ بظاہر زندہ تھی، مگر شہریار کو اس لمحے لگا، وہ زندہ ہونے کے صرف واہمے میں اٹکی ہوئی ہیں۔

"کون ہے یہ؟...... کیا یہی زوار حسن ہے؟" آصفہ ارسلان راشدی چیخیں اور وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"نو میم! میں شہریار ہوں...... شہریار عبدالرحمٰن۔ مجھے پاپا نے شافعہ کے لئے دوپہر کا لنچ لینے بھیجا تھا۔"

آصفہ ارسلان راشدی کی آنکھوں میں دکھ، غلطی کے سارے کرب سمیت رونے لگا تھا۔ انہوں نے سونیا کو آواز دی۔

"اٹھو جلدی سے۔ بہن وہاں بھوکی ہو گی۔ کھانا باندھ کر دے انہیں۔"

''بہن......کون سی بہن؟ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میری کوئی ماں نہیں ہے۔''
شہریار نے پلٹ کر سونیا کو دیکھا اور اس کے چہرے پر ترحم بھر آیا۔
آصفہ ارسلان راشدی اس کے انکار پر خود کھانا باندھنے کچن میں چلی گئی تھیں اور شہریار اس کے قریب اس کی طرح بیٹھ گیا تھا۔
''میرے ساتھ چلو گی؟''
سونیا نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا، پھر سرسرائے لہجے میں بولی۔ ''تم موت ہو؟'' وہ رکی، پھر دوبارہ بولی۔ ''اگر تم موت ہو تو میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔ میں جینا نہیں چاہتی شہریار صاحب!''
اس کے لہجے میں اب نہ آنسو تھے، نہ کرب۔ وہ بالکل آئس گلیشیر کی طرح ڈھل گئی تھی۔
شہریار نے کچھ نہیں کہا۔ کھڑے ہو کر اسے ہاتھ تھام کر اٹھانے لگا۔ پھر اسی کے لہجے میں بولا۔ ''چلو، آج ہم دونوں خاموشی سے زندگی کو آوازیں دیتے ہیں۔ زندگی کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ کیا پتہ، موت سے پتہ پوچھیں تو زندگی خود ہماری سفاکی پر حیران ہو کر ہمیں دیدار کرا دے۔''
سونیا مسمرائز ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔
شہریار عبدالرحمٰن اُسے کار میں چھوڑ کر لنچ اندر دینے گیا تھا۔ پھر واپس آیا تھا تو کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔
''تم سمجھتی ہو......کیا تم اب سمجھتی ہو کہ دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں رہا ہے؟''
سونیا نے خالی آنکھوں سے دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھی۔ ''میری زندگی میں کچھ اچھا ہوتا تو کیا میں سونیا ہوتی؟ کیا میری ماں آصفہ ارسلان راشدی ہوتی؟''
''کیا تم اپنی ماں کو غلطی کا مارجن نہیں دے سکتیں؟ وہ بشر ہیں اور غلطی بشریت کی پہلی سیڑھی ہے۔''
''مگر میں آخری سیڑھی پر کھڑی کر دی گئی ہوں۔ مجھے کیا پتہ، پہلی سیڑھی سے گرنے کا کیا مزہ ہوتا ہے۔ میں تو زمین پر منہ کے بل گرا دی گئی ہوں۔ اور کوئی نہیں ہے جو میرا ہاتھ تھامے، مجھے زندگی سے چڑ ہو گئی ہے۔''
''تم جینا نہیں چاہتی ہو؟'' شہریار نے کار کو یوٹرن دیتے ہوئے نیا سوال کیا اور وہ خالی دل سے لہجے میں بولی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، میں زندہ ہوں؟'' شہریار نے اس کا چہرہ دیکھا، وہاں واقعی زندگی نے موت اوڑھ لی تھی، مگر اسی موت کی تمنا سے اسے زندگی کو کھینچ نکالنا تھا۔

''تمہیں اگر میں کہوں، زندگی اب بھی تمہارا استقبال کرنے کے لئے تیار کھڑی ہے تو تم کیا سوچو گی؟''

''کیا سوچوں گی؟ مجھے لگے گا، آپ مجھ پر طنز سے ہنسنا چاہتے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لئے یہ سوچوں گی، پھر آپ کے ساتھ مل کر خود پر خود بھی ہنسنے لگوں گی۔ آپ کو کیا لگتا ہے، میری ہنسی اتنی بری ہے؟''

شہریار کو لگا، وہ اس سے کہیں زیادہ طنزیہ فقرہ تھی اپنے لئے اور اُسے chill کرنا اتنا آسانی نہیں ہے۔

وہ اُسے پڑاہٹ لے گیا تھا۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' اس نے سوال کیا مگر وہ خاموشی سے ماحول کو دیکھنے لگی۔ اس ماحول میں وہ کتنی مرتبہ زوار حسن کے ساتھ آچکی تھی، مگر یہاں ہمیشہ وہ بہت لیٹ نائٹ آیا کرتے تھے، دنیا سے چھپ کر، چوری چوری...... آج وہ یہاں سر جھکائے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی، کاش کوئی اس کی پہلی چوری ہی پکڑ لیتا تو اس کی روح قلم ہونے سے تو بچ جاتی۔ مگر یہاں کسے اس کے حال سے کوئی مطلب تھا۔ شارٹ کٹ ہمیشہ کسی منزل پر جا کر نہیں رکتا، کبھی کبھی بے نام مسافت بھی اوڑھ لیتا ہے۔ وہ بھی اسی مسافت میں گرد گرد تھی۔

''تم مجھے کیسا انسان سمجھتی ہو؟''

''شاید خود سے بہت بہتر۔'' مختصر جواب۔

شہریار نے گہرا سانس لیا۔ ابھی اندر سے ساری شخصیت نہیں مٹی تھی۔ وہ بہتر اور بہترین اور بدترین کا فرق جان رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا، اس کے اندر ابھی توازن تھا، سمجھنے اور فرق کرنے کی حس موجود تھی اور زندگی کے لئے یہی سب سے ضروری کلیہ تھا۔ اس نے اس کی پلیٹ میں بہت شائستگی سے پزا رکھا تھا، پھر بہت نرمی سے بولا تھا۔

''جب ہم بالکل اکیلے ہوں تو اپنے ساتھ چلنے والے سائے کو بھی اپنا دوست سمجھنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس دلاسے کے لئے اور کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ کیا میں سمجھوں تم مجھے ایسا سایہ سمجھ سکتی ہو؟''

''سائے اندھیرا ہوتے ہیں، اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔''

شہریار نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے بولا۔ ''لیکن تپتی جھلستی دھوپ میں اپنے اکیلے ساتھ کے لئے ایک سایہ ساتھ ہو تو کیا برا ہے؟ دھوپ میں ہر کوئی آپ کے ساتھ نہیں چلتا، ساتھ چلنے والے

وہی ہوتے ہیں، جنہیں آپ سے محبت ہو۔"
"آپ کہنا چاہتے ہیں، آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" اس نے طنز سے اسے دیکھا۔
وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔"ہاں، مجھے محبت ہے، ہر اس انسان سے جو اپنی غلطی کو غلطی مان کر زندگی میں دوبارہ اسے نہ دہرانے کا خود کو عندیہ دے۔ مجھے تم سے محبت ہے کیونکہ تم ایک بہت معصوم لڑکی ہو۔"
"میں، اور معصوم لڑکی؟ آپ کہیں مجھ پر طنز تو نہیں کر رہے مسٹر شہریار؟...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میں کیسی لڑکی ہوں۔ خود آپ نے بھی تو میری برائی سے بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔"
اُس نے نا کف سے تھوڑا سا ٹکڑا کٹ کیا تھا، پھر شائستگی سے بولا تھا۔"اچھائی...... آپ کے اندر کی اچھائی کسی برائی سے کتنی مرتبہ بھی ٹکرا کر ٹھوکر کھائے، اسے سنبھلنے کے لئے وہ خدا خود ہاتھ تھما دیتا ہے۔ بس میرے لئے یہی ڈھارس بہت ہوتی ہے۔ میں نے کسی کے لئے برا نہیں کیا۔ رہی تمہاری غلطی تو اسے میں کب کا بھلا چکا ہوں۔ پاپا، عطیہ میم اور ارسلان راشدی، یہ تینوں اتنے کلوز فرینڈز تھے کہ مجھے تمہاری مدد کرنے میں یوں محسوس ہوگا، جیسے میں نے ان کی دوستی کو جزا کی سوغات بھیج دی ہے۔"
سونیا یک ٹک اُسے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی۔ پھر ایک آنسو ٹپکا، دوسرا آنسو ٹپکا، پھر یوں لگا جیسے کوئی باندھ ٹوٹ گئی ہو۔ وہ پبلک پلیس میں ہونے کا احساس تک بھول گئی تھی۔ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔
"مجھے زوار نے دھوکا دے دیا۔ ہم شادی کرنے والے تھے۔" اس نے سسکیوں میں کہا۔ شہریار کے چہرے پر ایک سخت تاثر اُبھرا مگر اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"تم زوار سے محبت کرتی تھیں؟"
"نہیں۔ شاید میں صرف ایک اچھا جیون جینے کی تمنا میں اسے محبت کا دھوکا دے رہی تھی، یا شاید خود کو یہ دھوکا دے رہی تھی اور...... اور وہ چال چل گیا۔"
شہریار اسے ترحم سے دیکھتا رہا۔"اگر میں کہوں، تمہیں زندگی میں کوئی سچا پیار کرتا ہے تو؟"
"تو شاید مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا۔"
"اگر میں یقین دلا دوں؟"
سونیا نے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر سر جھکا کر بولی۔"کون کرے گا مجھ سے محبت؟ میں نے دنیا کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ میں نے کبھی زندگی کا حق نہیں ادا کیا، پھر میں کیسے مان لوں،

زندگی میری اتنی فاش غلطیاں معاف کرسکتی ہے؟"

شہریار نے اپنے سامنے رکھے موبائل کا بٹن پریس کیا تھا، پھر محبت سے بولا تھا۔ "کہاں ہے تو؟ فوراً پرل ہٹ کلفٹن برانچ آجا۔"

"کیا مطلب، کیا تیرا ڈاکٹر سے جھگڑا ہوگیا ہے یا خود سے خودکشی کرنے کا کوئی عہد باندھ لیا ہے؟" عاطف بیگ کی تپی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ مسکرا کر بولا۔

"تجھے بکواس کرنے کی اتنی عادت ہے عاطف! کہ وقت اور موقع ضائع کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ دیکھ، میں یہاں تیرے لئے ایک بہت بڑا سرپرائز لئے بیٹھا ہوں۔"

"مگر میں نے تو ٹی وی کے کسی کوئز پروگرام میں حصہ نہیں لیا؟"

"آرہا ہے یا نہیں؟" اب کی بار بہت سختی سے کہا اور جواب ملا۔

"دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔"

وہ وہیں انتظار کرنے لگا۔

سونیا اسے دیکھے جارہی تھی۔ "یہ عاطف کون ہیں؟"

"میرا دوست ہے۔ پنڈی ٹو لاہور سے تم سے دل کی بات کہنے یہاں کراچی تک چلا آیا۔ جب اس نے مجھے تمہاری تصویر send کی تو میں ایک لمحے کے لئے ہونق ہوگیا۔ مجھے لگا، وہ ایک بہت غلط راستے پر چل پڑا ہے۔ لیکن جب ارسلان راشدی کا نام سنا، شافعہ کا حوالہ ملا تو مجھے لگا، میں تمہیں سختی سے، منت سے کسی بھی طرح اس راہ سے قدم موڑنے پر مجبور کردوں گا کیونکہ تم عطیہ میم کی فیملی کا حصہ ہو، پاپا کے دوست کی بیٹی ہو۔ مجھے اس کا احساس تو ہوا تھا، شاید یہ کام بہت مشکل تھا مگر تقدیر نے خود ایسا ماحول پیدا کردیا کہ مجھے تم پر بہت محنت نہیں کرنی پڑی۔"

"مگر میں سمجھتی ہوں، میں آپ کے خیالات پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اور پھر مسٹر عاطف، وہ ایک مرد ہیں۔ وہ کیا میرے ماضی کا حوالہ دے دے کر ٹیز نہیں کریں گے؟ آپ کو کیا لگتا ہے، مرد دیوتا ہوتے ہیں؟"

"دیوتا...... ہاں، دیوتا پتھر ہوتے ہیں سونیا جی! اور پتھر میں جذبات ہوں، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے آپ تیز دھوپ میں بارش کا تصور کریں۔ رہا انسان تو دل رکھنے والا کوئی بھی انسان کبھی بھی اتنا بلند ہوسکتا ہے کہ اس کے کردار کی رفعتوں پر رشک آئے۔ دل، رحم، محبت، یہ سب آسمانی تحفے ہیں۔ کسی کی جھولی میں بھی وقت کا خدا ڈال سکتا ہے۔"

عاطف گلاس ڈور پش کر کے آیا تھا اور سامنے سونیا کو دیکھ کر وہ ہونق رہ گیا تھا۔
شہریار نے اسے دیکھا، پھر مصنوعی خفگی سے بولا۔ "بہت اچھے جناب! ہم سرپرائز دے رہے تھے، یہاں چہرے پر ایسے تاثرات ہیں، جیسے شیمز مارکیٹ میں جگنو کے شیمز ایک دم سے گر گئے ہوں۔"
عاطف ہنسنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "یقین کرو، دور دور تک میرے ذہن میں یہ سرپرائز نہیں تھا۔ تیرے تاثرات اتنے لایعنی تھے کہ میں نے تو دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ مگر یا چانک......"
شہریار نے اسے کندھے سے تھام کر کہا۔ "اچانک......خوشیاں اچانک ملیں تو ان کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔"
عاطف کھڑا رہا، پھر شہریار کے کہنے پر وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ تب اس نے چلتے چلتے کہا تھا۔ "ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اس کا تُو نے بہت خیال رکھنا ہے، تمام عمر۔ دوبارہ کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ناں، سمجھ تیرا قتل ہو جائے گا میرے ہاتھ سے۔" وہ رُکا، پھر سونیا کی پشت سے جا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اسے غور سے دیکھ، یہ مجھے دانیا کی طرح عزیز ہے۔ اور تُو جانتا ہے ناں، میں دانیا کے سلسلے میں کتنا حساس ہوں؟"
"جانتا ہوں، جانتا ہوں میرے بھائی! مگر اب اتنی بھی دھمکیاں مت دے کہ مجھے ون فائیو کو فون ملانا پڑے۔"
شہریار ہنسنے لگا۔ ٹیبل سے اس نے چابیاں اور والٹ اٹھایا تھا، پھر پشت موڑلی تھی۔ سونیا نے بھرائے لہجے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔
"دانیا کون ہے سر؟" یکدم اس کا لہجہ مؤدب ہو گیا تھا۔ اس کا نیک عمل اس کے لئے احترام کی حد کھینچتا چلا گیا تھا۔ مگر شہریار اس کے اس تاثر کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا تھا، سو مسکرا کر بولا۔
"دانیا میری کیوٹ، لٹل سسٹر ہے سونیا! اور پلیز، مجھے آئندہ سر مت کہنا۔ عاطف کے دوست کی حیثیت سے ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ اور اگر کسی قابل سمجھو تو دانیا کی طرح تم مجھے اپنا بھائی بھی کہہ سکتی ہو۔"
وہ اب رُکا نہیں تھا اور سونیا نے دوسری بار ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ "میں نے جو کچھ شہریار کے ساتھ کیا، میں اسے سوچوں تو ساری زندگی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی، چہ جائیکہ خود کو ان کی بہن کے بدابہ لے جا کر کھڑا کروں۔"
عاطف کچھ نہیں بولا تھا۔ آج صرف سونیا بول رہی تھی اور وہ سن رہا تھا۔



انوشے کی شادی کے بعد سے بیگم عافیہ کی جانا نہ سے صرف ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہ اس کا نمبر ملاتی رہی تھیں اور ان سے رابطے میں نہیں رہی تھیں اور آج بہت اچانک وہ انہیں ایک سڑک پر چلتی نظر آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں اُتر گیا تھا۔ بظاہر وہ خود کو فریش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر بیگم عافیہ کو لگا تھا، جیسے وہ خود کو کہیں چپکے سے ہار گئی تھی۔ بیگم عافیہ نے گاڑی جانا نہ کی ٹیکسی کے پیچھے ڈال دی تھی۔ پھر وہ اُتر کر باہر نکلی تھی اور بیگم عافیہ کو حیرت ہونے لگی تھی۔ یہ ہاسپٹل کی عمارت تھی۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اندر کی سمت بڑھ گئی تھیں۔ پھر وہ ایک مریضہ سے کچھ بات کرتی رہی تھی۔ مریضہ نے ایک پرچہ اسے پکڑایا تھا اور وہ اس پرچے کو تھام کر باہر نکل گئی تھی۔ بیگم عافیہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ اس مریضہ کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں، یوں، جیسے وہ کسی بہت بڑے راز کے قریب سے قریب ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

بیگم عافیہ اس لمحے اُس مریضہ کے بالکل سامنے تھیں۔

"زل......زلفی......؟" نام کئی ٹکڑوں میں ادا ہوا تھا۔

مریضہ نے بند آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔ کافی دیر تک بوڑھی آنکھیں شناسائی کا کوئی سرا تھامنے کے لئے بے قرار تھیں کہ اچانک بہت تیز حیرت ماکی کے ساتھ دوسری طرف سے شناسائی کا حق ادا ہوا تھا۔

"عافیہ......عافیہ بانو!"

"زلفی! ہاں، میں عافیہ۔ یہ تم کس حال کو پہنچا دی گئی ہو؟"

"کس حال میں ہونا تھا مجھے، عافیہ! تم اور عطیہ کیا گئیں، ہماری دنیا سے تو عزت داری، رواداری، مروت سب چلا گیا۔ [illegible] نے تو دنیا ہی اتھل پتھل کر دی تھی۔ مجھے کونے میں لے جا کر ڈال دیا تھا۔ مجھے پتہ ہے عافیہ! ارجو مر گئی ہے، خودکشی کر لی تھی اُس نے عبدالرحمٰن کے لئے۔"

"میں عبدالرحمٰن صاحب کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" وہ نئے سرے سے پرانی اطلاع پر پھر سے تاسف میں ڈوب گئیں اور زلفی مائی نے اسی ٹون میں کہا۔

"ہاں عافیہ! اپنی رجو مر گئی اور میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ میرا دل چاہتا ہے، اس کے قاتل کو ہزار بار پھانسی پر لٹکاؤں۔ ہزار بار جھٹکا دوں۔ مگر میں مجبور ہوں اور اس کا قاتل ویسے ہی دندناتا پھر رہا ہے۔" زلفی مائی کے لہجے میں غصہ پھنکاریں مار رہا تھا مگر وہ بے بس تھی اور یہ بے بسی اس کو اور ہلکان کئے دے رہی تھی۔

''صبر کرو زلفی! صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔''
''ہاں، مجھے بھی اللہ کے انصاف کا انتظار ہے۔ وہ واقعی منصف ہے، وہی گواہ ہے۔ مجھے اُس کے فیصلے پر اندھا یقین ہے۔''
بیگم عافیہ نے ان کی طرف دیکھا، پھر یکدم لجاجت سے بولیں۔ ''زلفی! میری ایک بچی تھی، وہ کیا ہوئی؟''
''تمہاری بچی.......وہ تو تمہارے ہڑکے میں مرگئی تھی عافیہ!''
بیگم عافیہ کو لگا، ان کی زندگی نے آخری امید بھی کھودی تھی۔ وہ پہلی بار اتنی شدت سے روئی تھیں۔
''یہ جانانہ.......یہ کس کی اولاد ہے زلفی؟''
زلفی مائی نے انہیں دیکھا اور سر جھکا کر بولی۔ ''شکیلی نے اسے ویسے ہی حاصل کیا تھا، جیسی ہماری دنیا میں عموماً لڑکیاں پہنچتی ہیں۔ پر اس نے رجو کی تصویر دکھا کر اسے بچپن سے یہی سمجھایا ہے کہ وہ اس کی مرحومہ بہن کی اولاد ہے۔''
عافیہ بیگم کافی دیر تک پرانے دنوں کو یاد کرتی رہی تھیں، پھر سلام دعا کے بعد اٹھ گئی تھیں اور پشت موڑ کر چلتی چلی گئی تھیں۔ ان کے منظر سے چلے جانے پر زلفی مائی نے تکیے پر سر رکھ کر رونا شروع کردیا تھا اور اسی وقت جانانہ ان کے پاس چلی آئی تھیں۔
''تم نے میم عافیہ سے کیا کہا، میں ماں کی سگی بہن کی اولاد نہیں ہوں؟''
زلفی مائی کا رنگ فق ہوگیا تھا۔
''بتاؤ زلفی مائی! کیا واقعی مجھے اغواء کرکے وہاں لایا گیا تھا؟''
زلفی مائی پھر بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے چپکے سے تکیے کے نیچے سے ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی تھی، پھر تاسف سے بولی تھی۔
''اپنی ماں سے کہنا، جھوٹ بولنا آج بھی میرے لئے اتنا ہی مشکل ہے۔''

”تم کہنا چاہتی ہو، میری ماں وہی رجو بیگم ہیں؟“
رلّی مائی نے اس کا سوال سنا اور اس نے بالکل الگ سوال کیا۔
”جانے، تُو نے کبھی شیرازی کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟ کبھی تیرا دل نہیں چاہا، وہ اچانک کہیں سے تیرے سامنے آ جائے اور تُو بھلے نفرت سے ہی سہی، اُس کا گریبان پکڑ کر پوچھے ضرور کہ وہ تجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ وہ تو تجھ سے بڑی دھماکے کی محبت کرتا تھا۔“
”میں نے تم سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا ہے رلّی! تم شیرازی کو کیوں درمیان میں گھسیٹ لائی ہو؟“
رلّی مائی نے تیز تیز سانسوں میں اسے دیکھا اور بولی۔ ”جو تیرے دل میں سوال ہیں، ان کے جواب تُو کہیں باہر سے کیوں پوچھتی ہے؟ خود ڈھونڈ۔ خود سوال میں اُترے گی تو بہت سے راز کھلیں گے۔ کبھی کبھی سوال سے بھی زیادہ دھماکے دار ہوتے ہیں جواب۔ تُو شیرازی کو ڈھونڈ، چلڈرن ہوم میں کھوئے اپنے بچے کو ڈھونڈ۔ جانے! پگلی تجھے پہلی دفعہ میں کبھی سچ نہیں کہے گی، پر تُو سچ کو تلاش کر، کرتی رہ جانے! پاتال میں اُتر جانے کے لئے خود کو کھونا پڑتا ہے، خود کو......“ وہ پھر سے کھانسنے لگی تھی۔



”زرش! تم نے مجھے بتایا نہیں ہے کہ شافی اتنے دن سے کیوں نہیں آ رہی ہے؟“ ثانیہ نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں پوچھا۔
زرش پہلے تو خود کو مصروف ظاہر کرتی رہی، پھر یکدم اس نے آہستگی سے کہا۔ ”شافی کا ایک ڈیڑھ ہفتے پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ثانی!“
”مگر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زرش؟“ ثانیہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہراسگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ اس کا سانس بہت تیز تیز چل رہا تھا، جب زرش نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان سے کہا تھا۔
”وہ بالکل ٹھیک ہے ثانیہ! میں خود اس سے ڈیڑھ ہفتے سے ملتی رہی ہوں۔ وہ تو اب گھر بھی شفٹ ہو گئی ہے۔“ چند ساعتوں کو رکی، پھر نرمی سے بولی۔ ”تم نے مجھ سے شہریار کا نمبر لیا ثانی! اس کا کیا ہوا؟“
ثانیہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر بہت بے بسی سے بولی۔ ”نہیں، میں اس سے بات ہی نہیں کر سکی۔ میرے اندر اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ میں اس سے مخاطب ہوتی، کچھ کہتی اس سے۔ خاموشی سے سنتی

رہی۔ زرش! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ اتنی نفرت کہ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں اپنی زندگی اپنے آپ ختم کر لیتی۔"

"ثانی، پلیز! ایسے مت کہو۔ سنو! تم کیوں نہ جانا نہ سے بات کرو۔ وہ تو تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھے گی۔"

"جانا نہ...... ہاں، مجھے جانا نہ سے بات کرنی چاہئے۔" اُسے جیسے زرش کی بات سے نئی بات ملی۔ وہ کچھ دیر کے لئے سوچوں میں غرق ہوئی، پھر سر اٹھا کر بولی۔

"زرش! تم نے مجھ سے ابھی تک حمزہ عابد کو نہیں ملوایا۔ میں بھی تو دیکھوں، وہ بندہ ہمارے باپ کی کس حد تک کاپی ہے؟"

زرش نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بہت بے چارگی سے بولی۔ "ثانی! جب تم نے مجھے علی کے متعلق بتایا تھا، میں نے علی کو دیکھا تھا تو میرا دل کہتا تھا، وہ تمہاری محبت کے آگے ٹھہر ہی نہیں سکے گا۔ اور پھر اس کا دل محبت کی سمت مڑنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ مگر ثانی! تم نے اس کے ساتھ چار سال بتا دیئے، لیکن وہ پھر بھی تمہاری محبت تمہارے حُسن کے آگے نہیں جھکا۔ پھر تم مجھے ملیں بہت بری حالت میں۔ تم اس وقت کچھ نہیں بولی تھیں۔ تمہاری زبان کو علی کی نفرت نے تالے ڈال دیئے تھے، جیسے دل کا کوئی اُجاڑ گھر جس پر بلوائیوں نے حملہ کیا ہو، سب کچھ لوٹ مار کر لے گئے ہوں۔ اور گھر میں بچا ہو تو صرف آرزوؤں کا خون، تنہیر اور کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار گلے سے لگایا، تب میں نے دیکھا، سناٹے کی بھی ایک وائبریشن ہوتی ہے۔ اس دن پہلی بار میں نے سناٹے کو روتے دیکھا۔ تمہارا دل، تمہاری آنکھوں میں کسی پہلی رات کی دلہن کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلی رات کی دلہن، جس کا دولہا اُس کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر اسے مسترد کر گیا ہو۔ تم نے اس دن جس طرح تڑپ کر کہا۔ "علی...... علی نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی، وہ صرف محبت سے نفرت کرتا تھا، صرف نفرت......" "تو ثانی! آج میں تمہارا ہاتھ تھام کر تم سے بھی زیادہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم خوش قسمت تھیں کہ علی نے تم سے محبت نہ سہی، نفرت تو نبھائی۔ مگر میرے پاس تو اپنا یا ایک اکیلا دُکھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ حمزہ نے نہ مجھ سے محبت کی، نہ نفرت۔ ثانی! وہ تو مجھے ایکس وائی زیڈ بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے میری سادگی سے خوب کھیلا ہے۔ میں اس کی وجہ سے سوسائٹی پراپرٹی بن گئی، لیکن اب وہ میری اسی شہرت سے چڑتا ہے۔ اُس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے ثانی!...... تم نے سنا، اُس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔" زرش کہتے کہتے ثانی کے سینے سے لگ کر سمندروں رونے لگی تھی۔

ثانیہ اُس کی پشت تھپتھپانے لگی تھی۔ پھر شام کے وقت ثانیہ نے اسے کسی اچھی جگہ گھومنے کے لئے تیار کیا تھا۔ وہ حمزہ اور اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کی طرف نکل آئی تھی۔ مگر گلاس ڈور پش کرتے ہی اس کی نظر جس پر پڑی، وہ حیران کن تھی۔

جانا نہ گم صم بیٹھی تھی اور حمزہ عابد اُس کے سامنے ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر جا کر فاسٹ فوڈ کے لنچ باکسز کا آرڈر پلیس کروا کر میز کی طرف اشارہ کر کے وہیں بیٹھ گئی تھی اور اُس کے کانوں نے حیرت سے سنا تھا۔

''میں کامیاب ہوگیا ہوں جانانہ! میں نے پھر سے گیم میں واپس آ کر ثابت کر دیا ہے کہ میں شطرنج کا کتنا ماہر کھلاڑی ہوں۔ جانانہ! تم سن رہی ہو ناں؟''

''ہاں، میں سن رہی ہوں۔'' بہت مدھم آواز سنائی دی اور اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پہلے سے کچھ مخمور لہجے میں بولا۔

''تم اب جیسا چاہو گی، شہریار اور عبدالرحمٰن کو ذلیل وخوار کر سکتی ہو۔ تم نے جس تکلیف کے لئے اتنی محنت کی، اس محنت کا پھل کھانے کا وقت آ گیا ہے۔ جانانہ! تمہیں میری یہ بات خوشی نہیں دے رہی کہ تم نے جس لمحے کے لئے اتنا ہوم ورک کیا، وہ اب چند قدم کے فاصلے پر ہے؟''

جانانہ نے پہلی دفعہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر کھردرے لہجے میں بولی۔ ''تم اس کام کو رہنے دو۔ مجھے اب معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری دوستی برقرار رہے تو تم مجھے کسی بھی طرح اس شخص کے متعلق معلومات لا کر دو کہ وہ زندہ ہے یا......'' جانانہ کی آواز ڈوب گئی۔ زرش اتنی دور تھی کہ تصویر نہیں دیکھ سکی اور حمزہ عابد حیرت سے بولا۔

''تم...... تمہیں کیا ہوگیا ہے بے بی؟ تم اچانک اتنی اُداس، اتنی تھکی ہوئی کیوں لگنے لگی ہو؟''

جانانہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''جب تک تم مجھے یہ پتہ کر کے نہیں بتاؤ گے کہ شیرازی زندہ ہے یا مر گیا، تب تک میرا موڈ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور سنو، یہ وارننگ ہے تمہیں۔ بہتر ہے، تم اب دانیا کا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے کسی بھی قسم کا انتقام نہیں لینا ہے۔''

''مگر جانانہ! تم جانتی ہو، میں جہاں تک آ گیا ہوں، وہاں سے مڑ نہیں سکتا۔''

''تم یہ سمجھتے ہو، وگرنہ اگر تم نہیں مڑے تو تم نہیں جانتے میں کیا کر گزروں گی؟''

اُس نے وینٹی بیگ اُٹھایا اور عین اسی وقت ویٹر نے اس کے لنچ باکسز تیار ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ زرش کاؤنٹر کی طرف چلی گئی تھی اور جانانہ گلاس ڈور پش کرتی باہر نکل گئی تھی۔

زرش نے حمزہ عابد کو دیکھا، وہ اپنے موبائل پر کسی کا نمبر پریس کر رہا تھا۔ پھر وہ اس سے دو قدم آگے چل رہا تھا، جب اس نے سنا، وہ بہت کوفت زدہ مخاطب تھا۔

”سطوت جہاں! تمہاری چھٹی حس ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ اب تمہارے اختیار میں نہیں رہی ہے۔ اسے کسی نے پھر سے شیرازی کی یاد کی طرف گھسیٹ لیا ہے۔ وہ عبدالرحمٰن کے لئے پھر سے نرم گوشہ رکھنے لگی ہے۔ وہ کہتی ہے، میں دنیا کو بھول جاؤں۔ تم بتاؤ، کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ پانچ سال سے میں جس سونے کے پہاڑ میں سے سرنگ نکال رہا تھا اب وہ کہتی ہے، اس پہاڑ کو میں ڈائنامائٹ سے اُڑا دوں۔ تمہیں پتہ ہے ناں سطوت جہاں! میں دولت کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے، اپنے گھر آنے والی دولت کو ٹھکرانے کا کفر کروں؟ تم اگر سنبھالنا چاہتی ہو تو سنبھال لو اپنی سونے کی چڑیا کو......“

لمحہ بھر کو رک کر اس کی بات سننے لگا، پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے، میں وہی بولوں گا جو تم کہہ رہی ہوں۔ گواہیاں لانا، دلوانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

اُس نے موبائل آف کردیا تھا اور رزرش نے کار میں بیٹھتے ہوئے ثانیہ سے کہا تھا۔

”تم جو کہنا چاہتی ہو، جانانہ سے کہہ گزرو۔ وہ اس وقت بالکل تپے ہوئے لوہے کی طرح ہے۔ تم جیسی چوٹ مارو گی، اسی طرح مولڈ ہوجائے گی۔“

ثانیہ نے پُرخیال انداز میں اسے دیکھا پھر نرمی سے بولی۔ ”تم عینی کے بورڈنگ ہاؤس گئی تھیں، وہاں کیا ہوا؟“

”کیا ہونا ہے، بورڈنگ ہاؤس کے قوانین کے تحت مجھے اس سے ملنے نہیں دیا گیا۔ مگر نانی اس بورڈنگ ہاؤس کی سپریئر کہہ رہی تھی، مجھ سے پہلے بھی کوئی اس بچی کے مطابق پوچھ گچھ کرچکا ہے۔ وہ حیران ہو رہی تھیں کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ وہ بچی اچانک ہائی لائٹ کیونکر ہوگئی؟ تمہیں پتہ ہے، وہ تو بروقت میری بچت ہوگئی وہاں کی دو تین ٹیچرز میری جان پہچان کی نکل آئیں۔ ورنہ خصوصی سکیورٹی آفیسر کے سامنے انکوائری بھگتنے میں دانتوں پسینہ آجاتا۔

”خصوصی انکوائری آفیسر......؟“ ثانیہ نے فش بہ گر کھاتے ہوئے تحیر سے دیکھا اور رزرش مسکرا کر بولی۔

”ہاں خصوصی انکوائری آفیسر تھا بڑا ڈیشنگ۔ شہریار کی سسٹر دانیا کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں آیا ہے۔ خصوصی سکیورٹی اسی کی طرف سے تھی۔“

”سکیورٹی کے لئے تو عدیل عبدالرحمٰن بھی کم نہیں تھے۔ میں نے سنا ہے، وہ لاہور میں ڈی ایس پی سٹی رہ چکے ہیں اور آج کل وہ یہاں واپس ٹرانسفر ہوکر آچکے ہیں۔“

ثانیہ کے جملے پر اس نے ثانیہ کو ایک نئے سرے سے غور سے دیکھا۔ ”ثانیہ! تمہارے پاس کچھ معلومات تھیں شیرازی کے بارے میں؟ اگر یہ معلومات تم عدیل عبدالرحمٰن کو ٹرانسفر کردو تو جانانہ کو سطوت جہاں کے متعلق زیادہ اچھے سے سچائی جاننے کو ملے گی۔ سطوت جہاں پر تمہارا ابھی تو ادھار رہتا ہے ناں۔ علی کی نظروں میں اس نے بارہا تمہیں غلط ثابت کرنے کے لئے حربے استعمال کئے تھے۔ کتنی مرتبہ

تمہارے نام کے ٹیگ سے علی کی منسٹری کے تحت غیر ملکی معاملات میں اپنے ملک کی ایک بھیانک شکل پیش کی۔ ڈرگس کا معاملہ ہو یا حکومتی رازوں کی ترسیل، ہر معاملہ ایسا ہے کہ اسے سزائے موت سے خود کو بچانا مشکل ہوگا۔ اس نے علی کے نام پر تمہیں جتنا بلیک میل کر کے اذیت دی تھی، وہ اذیت تم آسانی سے اس کی طرف پارسل کر سکتی ہو۔" ثانیہ نے زیرک فہمی سے اسے دیکھا تھا۔

اور دوسری صبح ایک لفافہ تھا جو زرش نے عدیل عبدالرحمٰن کے دفتر کے پتے پر ڈسپیچ کیا تھا....... سطوت جہاں کے گرد وقت گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔



سطوت جہاں نے زلفی مائی کو ہاسپٹل سے اُٹھوا کر ڈی پی سینٹر بھیج دیا تھا۔ انہیں لگتا تھا، اگر وہ یہاں رہی تو بہت سے راز کھلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بیگم عافیہ کے زلفی مائی سے ملنے کے بعد مسلسل ان کے اندر جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں سے انہیں لگ رہا تھا، ان کی بہت خفیہ قسم کی سرگرمیاں چیک کی جا رہی تھیں۔ ایک دو لڑکیاں بھی اُٹھوائی گئی تھیں۔ مگر دو دن بعد وہ آزاد ہو کر واپس آ گئی تھیں۔ معلومات کرنے پر پتہ چلا، انہیں اغواء کے بعد کہاں رکھا گیا، کس طرح رکھا گیا، انہیں علم نہیں تھا۔ ایک بے ہوشی تھی جو کھلی تو وہ سفید مارٹل کی عمارت کے سامنے کھڑی تھیں۔ سطوت جہاں نے اوپر سے نیچے تک ایوان ہلا دیئے تھے مگر ہر طرف سے جواب ندارد آیا تھا۔ کہیں پر کسی بھی طرح کی انویسٹی گیشن ہو کہ اس سیل کے متعلق سرگرمیوں کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔

وہ اس وقت ایزی چیئر پر جھول رہی تھیں اور خیالات کے تانے بانے سے اس لایعنی کہانی کی بُنت کر رہی تھیں مگر حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔

جانانہ کہاں ہے؟ اُن کے ذہن پر نئے سوال نے ڈنک مارا۔ وہ تیزی سے سیدھی ہوئیں۔ انہوں نے فون اپنی طرف کھسکایا، پھر جانانہ کا نمبر ملایا مگر وہ آف تھا۔

یہ آج کل جانانہ کہاں رہنے لگی؟ اس کی سوشل گیدرنگ بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اتنے پیام آتے ہیں مگر اب یہ کہیں بھی، کسی بھی کونسٹ کی ڈیٹ پر نہیں جاتی۔ اندر کا زور بھی جیسے ختم ہو گیا ہے اس کا۔ اپنے کمرے میں جس کروٹ لیٹتی ہے، اسی کروٹ لیٹی رہتی ہے۔ نہ ضد کرتی ہے نہ شور کرتی ہے نہ اپنے رسوخ نچوائے کرتی ہے نہ اب مجھ سے زیادہ کھل کر بات کرتی ہے۔ کہیں زلفی نے اسے سب کچھ بتا تو نہیں دیا؟

سطوت جہاں کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں اور ان کے قریب کہیں آواز گونجی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو، محبت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ چند سال دور رہے تو اپنا نشان، اپنا نام تک گنوا دے؟ تم نہیں جانتیں سطوت جہاں! محبت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ ایک بار دل کو اپنی لپیٹ میں لے لے، تو اس امر بیل سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ بھلے جانانہ مجھے بھولنے کی کوشش کرے، بھول ہی جائے، مگر اس کے دل میں یہ میری محبت کی امر بیل ہے ناں، یہ اندر ہی اندر میرا نام کبھی بھولنے نہیں دے گی، بھلے میرا

نام اس کی دل کی گہرائیوں میں دفن کردو تم، مگر پھر بھی کسی دن ایک دم سے دل کی زمین تہہ بالا ہوئی ناں تو میرا نام سب سے پہلے نکل کر باہر آگرے گا...... پھر تمہاری ہزار کوشش کے باوجود اس کے دل کو میرے لئے پھر سے دھڑکنے سے تم روک نہیں سکتی ہو۔ تم سن رہی ہوناں؟ جانانہ صرف میری ہے، صرف میری۔"

وہ گھبرا کر اٹھیں، اپنے کمرے سے باہر نکلیں اور اس وقت جانانہ سینڈلیں ہاتھ میں پکڑے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی ہوئی نظر آئی۔

"کہاں گئی تھی ماں کی جان......؟"

جانانہ نے چونک کر، پلٹ کر دیکھا مگر آج دیکھنے میں الگ تاثر تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے؟"

جانانہ نے سینڈلیں ماربل کے فرش پر پھینکیں، پھر سرسرائے لہجے میں بولی۔ "میرا بچہ تم نے کس چلڈرن ہوم میں پھنکوایا تھا ماں؟"

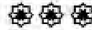
سطوت جہاں، جانانہ کو دیکھنے لگیں، پھر نرمی سے بولیں۔ "ماں کی جان! آج کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہے، ادھر آ، کتنے دنوں سے ماں نے تجھے سینے سے نہیں لگایا۔"

سطوت جہاں نے جانانہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا، مگر آج جانانہ کے ہاتھوں میں گرفت کا وہ لوچ نہیں تھا، جو ممتا کی مہک میں سطوت جہاں کی کمر کے گرد اس کے بازو حمائل ہو کر لمس دیتے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے جانے! تو چند دن میں کتنی کمزور ہو گئی ہے۔"

"چند دن میں نہیں ماں! پورے بارہ سال ہو گئے ہیں مجھے میرے شیرازی سے بچھڑے ہوئے اور تو نے کہیں محبت میں بچھڑے ہوؤں کے چہرے پر روپ دیکھا ہے؟ جدائی کی آگ ان کا ماس، ان کا رنگ سب جلا ڈالتی ہے۔ پر ماں! یہ تم کیوں سمجھو گی؟ تم نے کبھی محبت کی ہی کب ہے؟ تمہیں کیا پتہ، شیرازی کی محبت میں آنچ آنچ جل کر میں صبح تمہاری محبت کی ٹھنڈک سے کیسے اپنا روپ سنوارا کرتی تھی۔ مجھے خوب صورتی نہیں، صرف شیرازی کی بے وفائی کی یاد قائل اور کر دیتی تھی۔ پر کچھ مہینوں سے مجھے لگنے لگا ہے، جیسے میرا شیرازی آج بھی کہیں چپکے چپکے میرا نام لئے جا رہا ہے، وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر ماں! تمہاری محبت میں، میں اب سوچتی ہوں، اگر کہیں سے وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑا ہوا تو؟ اگر اس نے مجھ سے آ کر پوچھ لیا، میں بے وفا نہیں تھا، بس وقت نے ہمیں یونہی جدا کر دیا تھا، اب میں لوٹ آیا ہوں، بتاؤں کیا تم میری پہلے جیسی جانے ہو؟ تو...... ماں! میں کیا جواب دوں گی؟ میں تو اُس کی جانے رہ ہی نہیں گئی۔ مجھے تو تمہاری دولت نے کرنسی نوٹ بنا دیا ماں! تم

نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ میں تمہاری بیٹی نہیں تھی مگر میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنی ماں سمجھا تھا۔ پھر...... پھر بھی تم نے...... ماں! میرا بچہ کہاں ہے؟ کون سے یتیم خانے میں ڈالا تھا؟''
سطوت جہاں کے اردگرد سوالوں کی اتنی مضبوط باڑ بندھ گئی تھی کہ وہ بھاگ نکلنے کا راستہ بھی کھو چکی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ بالکل ہاتھ سے گنوانے سے بہتر تھا، وہ آدھا اسے سمیٹ لیتیں۔ انہوں نے یتیم خانے کا نام اور نمبر لکھوایا تھا۔ جانانہ اپنے کمرے میں گئی تھی اور اسی وقت اس کے نمبر پہ بیپ ہوئی تھی۔
نمبر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ یہ شخص اُسے خود فون کر رہا ہے اُسے، جس نے اس کی زندگی کو تلخ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
''کیا تم مجھ سے کل کسی وقت مل سکتی ہو؟''
اس نے سوال سن کر گہرا سانس کھینچا، پھر بہت تھکے ہوئے انداز میں بولی۔
''سوری شہریار! میں اب تمہیں بھول جانا چاہتی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ تم برے ہو، بلکہ اس لئے کہ مجھے لگتا ہے، میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ میں تم سے ملوں گی تو مجھے میرا احساسِ جرم اور مار ڈالے گا۔''
''جانے......!'' جانانہ کے اندر ایک ہلچل مچی۔ اسے لگا اسے کہیں سے شیرازی نے پکارا ہے۔ مگر یہ آواز شیرازی کی تو نہیں تھی۔
''شہریار......!'' اس نے نام لے کر سانس لی اور دوسری طرف سے ترحم آمیز آواز گونجی۔
''تم نے مجھے جتنا تباہ کرنا تھا، کر لیا۔ مگر جانانہ! ایک اطلاع ہے میرے پاس تمہارے لئے۔ ہو سکتا ہے تمہارے کسی کام آئے۔''
''کہاں آنا ہے؟''
''وہیں، جہاں ہم آخری بار ملے تھے۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔



شہریار، شافعہ کی خیریت دریافت کرنے کی نیت سے نکلا تھا مگر مامون کا فون ملتے ہی اس نے اپنا روٹ چینج کر لیا تھا۔ وہ اس کا 'کافی ان' میں انتظار کر رہا تھا۔ عاطف پنڈی واپس چلا گیا تھا مگر اگلے ہفتے

زکریا بھائی اور اماں کے ساتھ آنے کا عندیہ دے گیا تھا۔ شہریار حالات سے کسی حد تک مطمئن تھا کہ مامون کا کافی پُرجوش فون آ گیا تھا۔ وہ کافی اِن پہنچا تو وہ پہلے سے منتظر تھا۔

''خیریت، تم نے اتنی ایمرجنسی میں فون کیا تھا؟''

''تیرے لئے ایک گڈ نیوز ہے۔''

''میرے لئے، اور گڈ نیوز؟'' حیرت اس کے ہر لفظ سے چھلک رہی تھی۔ تب اس نے ایک فائل اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' میرا سوال۔

مامون عبدالکریم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے بہت ترحم سے کہا۔

''تو اس انفارمیشن کو میرے لئے گڈ نیوز کہہ رہا تھا۔ حالانکہ جانتا ہے، یہ نیوز کسی کے لئے بھی دل والے کے لئے قطعی گڈ نیوز نہیں ہو سکتی۔''

مامون عبدالکریم نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا، پھر لفظ چبا چبا کر بولا۔ ''یقیناً یہ گڈ نیوز کسی دوست سے متعلق ہوتی تو شاید میں اسے بیڈ نیوز کہتا۔ مگر یہ نیوز جس سے متعلق ہے، وہ تمہاری دشمن ہے، اس نے تمہیں تھکا تھکا کے اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ تم اب ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پاتے۔ اور تمہیں اس کی ہمدردی کا بھوت سوار ہو رہا ہے۔''

شہریار کافی پیتا رہا، کچھ نہیں بولا۔ پھر کتنی دیر اس کے اور مامون کے درمیان خاموشی کھڑی رہی، تب اس نے اسے سوالیہ دیکھا۔

''شاہ فیاض کا کیا ہوا ہے؟''

''اسے مکمل طور پر ٹریپ سمجھو۔ اور اب تو حسن ابراہیم کے بھی چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ بظاہر انہوں نے تیرے بچنے اُدھیڑنے کی بڑی کوشش کی مگر وار خالی گیا ہے۔ رہا زوار حسن، تو ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام دیئے جانے کے بعد وہ ملک سے تو فرار نہیں ہو سکتا، بہت جلد ہم اسے پا لیں گے۔ اور ہاں، سطوت جہاں کا کچا چٹھا بھی اسٹرینجر نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ بڑے بڑے سیاست دان، بیورو کریٹ کی پروفائل لائن حاضر ہو گئی ہیں۔ بس سمجھ، یہ آخری معرکہ بھی مار ہی لیں گے ہم۔''

''دھیان سے......'' شہریار نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت دکھائی اور مامون عبدالکریم کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔

”تیری یہ محبت مجھے حیران کرو یتی ہے۔ کیا آج کے دور میں بھی ایسی محبت ہوا کرتی ہے کہیں؟“

”تجھے نہیں پتہ، ہوا کرتی ہے یا نہیں؟“ شہریار کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور مامون عبدالکریم نے مسکرا کرا سے دیکھا اور کہا۔

”تجھ سے ملنے سے پہلے یقین نہیں تھا، مگر اب لگتا ہے، دنیا میں تجھ جیسے لوگ بہت کم، بہت ہی کم سہی مگر دنیا تم لوگوں ہی کے وجود سے قائم ہے۔“

”بس، بس...... زیادہ ہیٹرنگ نہیں۔ یہ بتا، حمزہ عابد کا کیا ہوا؟“ شہریار اس طرح بول رہا تھا، جیسے اس کا ذہن کہیں اور تھا اور وہ صرف اس وقت کو باتوں سے بھرنا چاہتا تھا۔

”تم کچھ پریشان ہو۔ اپنی تھنک رانگ؟“

شہریار نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”کچھ خاص نہیں۔ آج کل ڈریس کلیکشن کے سلسلے میں ایک کیٹلاگ بن رہی ہے، اسی سلسلے میں کچھ مصروفیت زیادہ ہے۔“

”کیٹلاگ کا سارا کام سالار بھائی نہیں سنبھال سکتے؟“ اس نے چڑ کر کہا اور شہریار مسکرایا، پھر نرمی سے بولا۔

”عموماً زیادہ تر کام تو وہی کرتے ہیں۔ میں تو زیادہ تر بزنس مارکیٹنگ میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ ان کا ہاتھ بٹانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ اسٹاک کا الگ بکھیڑا ہے۔ سچ پوچھو تو میں کہاں ان کا ساتھ دے پاتا ہوں؟“

”بکواس مت کرو۔ جو تمہارے شب و روز سے واقف نہ ہو، اسے دینا یہ پٹیاں۔“

شہریار پھر کچھ نہیں بولا تھا۔ دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ پھر وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل پہ بیپ ہوئی۔ اس نے فون ریسیو کیا، پھر دوسری طرف کی بات سن کر وہ یکدم تیزی سے اٹھا تھا۔

”مامون! تمہیں میرے ساتھ ہاسپٹل چلنا پڑے گا۔“

”تو کیا یہ ہاسپٹل کا سفر قسمت میں لکھوا کر لایا تھا؟“

شہریار سنجیدہ ہی رہا تھا۔ پھر دونوں کی کاریں آگے پیچھے ہی نکلی تھیں۔ ہاسپٹل پہنچ کر مامون کو سنجیدگی کا احساس ہوا تھا۔

شہریار کے دفتر کی ورکر انیلہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مامون عبدالکریم نے اپنا کارڈ دکھا کر اسے فوری طبی امداد کی سہولت دلوائی تھی۔ شہریار ایمرجنسی روم کے باہر کھڑا تھا اور اس کے ساتھ کھڑی ورکر روتے

روتے بتانے لگی تھی۔

"بس میں بہت رش تھا سر! اگر ہم یہ بس مس کر دیتے تو ایک گھنٹے تک ہماری اگلی بس نہیں آتی۔ میں نے انیلہ کو کہا تھا، رہنے دیتے ہیں یہ بس مگر وہ کہنے لگی، سالار صاحب کی جھاڑ کھانے سے بہتر ہے، یہ تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لی جائے۔ اس نے مجھے جگہ دے دی تھی، مگر اس کے لئے فٹ بورڈ پر بھی جگہ نہیں تھی۔ بس بہت تیز چل رہی تھی۔ جگہ جگہ اسپیڈ بریکرز سے جھٹکے لگ رہے تھے اور بس ایسے ہی جھٹکے سے اُس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ...... سر! انیلہ بچ تو جائے گی؟" وہ پھر سے رونے لگی۔

شہریار اس سے بھی زیادہ خاموش بیٹھا تھا۔ پھر دو گھنٹے بعد انیلہ کے بچ جانے کی خبر سن کر وہ اس کے ماں باپ کے آنے کے بعد وہاں سے نکلا تھا۔ ڈاکٹرز سے اس نے ساری ٹریٹمنٹ کی ذمے داری کمپنی کے بی ہاف پر کرنے کی سفارش کی تھی، اس لئے اس کے ماں باپ نے اسے بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا تھا۔ مگر دفتر پہنچا ہی تھا کہ اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ پاپا دفتر میں موجود تھے اور جازی عبدالرحمٰن اور سالار عبدالرحمٰن ان کے سامنے بیٹھے تھے اور لگ رہا تھا، وہ تینوں اسی کے منتظر تھے۔

"لیجئے، آگئے آپ کے لاڈلے صاحب زادے، جو کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے اپروول لینا ضروری نہیں سمجھتے۔"

اُس نے گلا کھنکھارا اور پاپا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "اگر آج تم یہ فیصلہ نہیں لیتے تو مجھے اپنی تربیت پر افسوس رہ جاتا۔"

جازی عبدالرحمٰن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور سالار عبدالرحمٰن کی بھناہٹ...... وہ بدتمیزی سے کانفرنس روم سے اٹھ کر چل دیئے تھے۔

"جاؤ، تم بھی جاؤ۔ آج کل تم اُس کے نقشِ قدم پر جو چل رہے ہو۔" پاپا نے طنزیہ کہا اور جازی عبدالرحمٰن جو واقعی اُٹھنے کو پر تول رہا تھا، بے بسی سے کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔

پاپا، شہریار سے سلام دعا کرتے دفتر سے اٹھتے چلے گئے تھے۔ پاپا کے نکلتے ہی جازی نے بھی اُٹھنے میں تیزی دکھائی تھی مگر شہریار نے بہت مضبوطی سے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ جازی عبدالرحمٰن نے حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا مگر شہریار کے چہرے پر پہلے ہی جیسی محبت چمک رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا، درمیان میں خفگی یا ہجر آیا ہے۔

"میرا ہاتھ چھوڑیئے، مجھے بہت سے کام ہیں بھائی!"

شہریار ہنس پڑا، پھر شرارت سے بولا۔ "مشرقی منڈا ہوں۔ ایک بار ہاتھ پکڑ لوں تو پھر چھوڑنا اپنا شیوہ نہیں۔"

''پلیز شہریار صاحب! میرے پاس آپ کی اس قسم کی لایعنی باتوں کو سننے کا وقت نہیں۔''

''شہریار صاحب؟...... اچھی بات ہے، بڑے بھائی کو عزت دے رہے ہو، برا نہیں ہے، لیکن میرے بچے! آج مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے، اس لئے تمہاری ساری کوشش کے باوجود میں نے موڈ آف نہیں کرنا۔'' لمحے بھر کو رُکا، پھر نرمی سے بولا۔ ''ہمیں آج ڈیڑھ بجے تک مسٹر رفیقی کے لائر چیمبر تک جانا ہے۔''

''مگر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، اس میں آپ مجھے کیوں گھسیٹنا چاہتے ہیں؟''

''بس کچھ ضروری کام ہی ہے، ورنہ تمہیں معلوم ہے، میں بہت کم اپنی ذات کے لئے دوسروں کو تکلیف دیا کرتا ہوں۔''

''حالانکہ آپ کا کریکٹر پروفائل تو کچھ اور کہتا ہے۔'' خود بخود جازی کے لہجے کو پھر سے تلخی نے چھوا اور وہ پیشانی پر آئے بالوں کو سنوارتا ہوا بولا۔

''کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے ناں، سارے پروفائل بائیو ڈیٹا سب دھرے رہ جاتے ہیں اور کوئی بہت چپکے سے آپ کے حصے کی نیکیاں بھی کما کر چلا جاتا ہے، کوئی چپکے سے جل جاتا ہے، تبھی تو پیچھے آنے والوں کے لئے منزل کو تلاش کرنا آسان رہتا ہے۔ مگر تم یہ ابھی نہیں سمجھو گے۔ وہ کیا کہا ہے، منیر نیازی نے۔

محبت اب نہیں ہو گی ، یہ کچھ دن بعد ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن ، یہ ان کی یاد میں ہو گی

سویری جان! یہ محبت بعد میں ہوگی۔ اتنا مجھے یقین ہے، محبت میری قسمت میں ہے، مگر ملے گی جب شاید میں اس احساس کو چھو بھی نہیں پاؤں گا۔ مجھے شروع سے ہر خواہش، تمنا ختم ہونے کے بعد ہی ملتی ہے۔ یہ میری قسمت کا فالٹ ہے۔''

جازی عبدالرحمن اس کے لہجے میں ڈوب گیا تھا۔ مگر بہت تیزی سے وہ اس کی آواز کے سحر سے نکلا تھا۔ شہریار اس کی پشت کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پھر ایک بجے سے بھی پہلے وہ اس کے کیبن میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں نے سوچا، تم عادت کے مطابق مجھے ڈاج دے جاؤ، اس لئے دیکھو، پورے آدھے گھنٹے پہلے یہاں چلا آیا ہوں۔ لنچ کیا ہے تم نے؟''

”میں لنچ نہیں کرتا۔“
شہریار کے ہونٹوں کو پیاری مسکراہٹ نے چھوا۔وہ کرسی سے اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا،پھر اس کے گلے میں پہلے جیسے انداز میں بازو حمائل کر کے بولا۔
”لنچ واقعی نہیں کرتے یا میرے ساتھ لنچ کرنے کے خیال نے تمہیں انکار کرنے پر مجبور کیا؟“
”جو آپ سمجھ لیں۔“
”ٹھیک ہے،میں نے سمجھ لیا،لیکن آج میرا دل چاہ رہا ہے،میں تمہارے ساتھ لنچ کروں۔کتنا عرصہ ہو گیا ناں،ہمیں ایک ساتھ بیٹھ کر کچھ کھائے پیئے۔“
”کیوں،ہم روز تو ڈائننگ ٹیبل پر ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں؟“
اس نے اثر نہیں لیا اور آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے نکال پھینکے۔شہریار بھی مسکرا دیا۔تھوڑی دیر خاموش رہا،پھر دوبارہ بولا۔”آج میں نے تمہارے لئے چکن جیز پزا منگوایا ہے،ساتھ میں پستا شیو آئس کریم بھی ہے۔“
”ہو گی۔مگر میں نے یہ چٹ پٹی چیزیں کھانا چھوڑ دی ہیں۔“
اس بار شہریار کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔”اچھا تم یہ سمجھو،یہ آرڈر سنی بھائی نے بُک کروایا ہے،تب تو کھا لو گے ناں؟“
جازی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اسی دوران پیون پزا اور آئس کریم دے کر چلا گیا تھا۔جازی نے بہت تیزی سے کیبن سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔شہریار نے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
”کیا آج کی دوپہر میرے نام نہیں کر سکتے؟ حالانکہ میں نے زندگی کی کتنی ہی شامیں تمہارے نام کی تھیں کبھی؟“
”پلیز،مجھے جذباتی بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں آپ کے ساتھ کھانا تو کیا،آپ کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں چاہتا۔اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس فضا میں سانس بھی نہ لوں،جس میں آپ سانس لیتے ہیں۔“
شہریار کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا۔ایک تیز درد کی لہر نے اس کی جان کھینچ لی تھی مگر جازی کہہ کر رکا نہیں تھا۔اس نے گہرے گہرے سانس لئے تھے اور اسی وقت عدیل بھائی کی کال آ گئی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟"

"کیا بات ہوئی، آپ کو الہام اُترتے ہیں کیا؟" اس نے سانس بہت وقت سے لی تھی اور عدیل بھائی گھبرا گئے تھے۔

"درد ہو رہا ہے تمھیں، تمہاری طبیعت خراب ہے؟ میں دفتر آتا ہوں۔"

اُس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "چھوٹے صاحب کو منانے کی کوشش کر رہا تھا مگر بہادر نے اتنا زبردست تنقیدی مقالہ پڑھ دیا مجھ پر کہ دلِ ناداں نے احتجاج کر ڈالا لیکن خیر ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دفتر مت آیئے گا، کیونکہ مجھے ابھی ایک بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے، میری میٹنگ ہے کچھ دیر بعد۔"

وہ پزا کا ڈبا اور آئس کریم لئے باہر آ گیا، پھر امانہ کی طرف بڑھا کر بولا۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو یہ لنچ کھا لیجئے۔ میں نے جس فرینڈ کے لئے منگوایا تھا، اس نے اچانک آنے سے انکار کر دیا لیکن دیکھئے، اگر آپ کو برا نہ لگے تب۔ اگر ٹھیک نہ لگے تو جبر نہیں ہے۔"

امانہ نے مسکرا کر اس سے ڈبہ لے لیا تھا۔ دفتر میں رہتے ہوئے جازی اور اس کا کلیش کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا، سو جازی کے کمرے سے غصے میں نکلنے ہی سے اسے سب کہانی سمجھ آ گئی تھی۔

شہریار اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر نئی طرح کے دکھ سے آشنا ہو گیا تھا۔ پہلے جو بات بہت چھپی ہوئی تھی، اب وہ بات گھر سے باہر آ گئی تھی اور گھر سے باہر آنے والی باتیں ایسے ہی تماشا بنایا کرتی ہیں۔

اس نے بہت آہستگی سے پوچھا تھا۔ "جازی عبدالرحمٰن کہاں ہیں، کچھ معلوم ہے؟"

"وہ شاید لنچ کے لئے باہر گئے ہیں، عموماً وہ لنچ تھری اسٹار میں کرتے ہیں۔"

"اوکے، تھینکس۔"

وہ واپس اپنے روم تک گیا تھا، پھر فائل لے کر لفٹ کے ذریعے نیچے پارکنگ ایریا میں پہنچا تھا، پھر پانچ منٹ بعد وہ تھری اسٹار کے سامنے کھڑا تھا۔ بظاہر یہاں کسی بھی طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہو سکتا تھا، لیکن وہ ہمت مجتمع کر کے اندر داخل ہوا۔ جازی عبدالرحمٰن اسے پہلی ہی نظر میں نظر آ گیا تھا۔

"آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟" اس نے فش پیس پلیٹ میں رکھ کر غصے سے کہا اور وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''مجھے اس وقت تم سے کام نہیں ہوتا تو میں تمہیں بتاتا، غصہ کرنا کس چڑیا کا نام ہے؟''
جازی عبدالرحمٰن نے کھانا روک کر ویٹر کو اشارہ کیا تھا۔ بل پے کیا گیا تھا، پھر اُٹھنے لگا تھا کہ شہریار نے پھر سے اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''تم میرے ساتھ جا رہے ہو، اپنی بائیک یہیں چھوڑ دو، دفتر سے پیون آ کر لے جائے گا۔''
''مگر میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا......''
آرام سے نہیں چلے تو اغواء کرنا بھی آتا ہے مجھے۔'' جازی عبدالرحمٰن نے گھور کے دیکھا مگر ایک نہ چلی۔ شہریار نے اُسے کار میں زبردستی دھکیلا، پھر کار کا ڈور لاک کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔
''یہ آپ اچھا نہیں کر رہے، میں پاپا سے آپ کی شکایت کروں گا۔''
''مگر بقول سنی بھائی کے پاپا میرے خلاف کوئی ایکشن لیں گے ہی نہیں، اس لئے دھمکی بےکار ہے تمہاری۔''
''آپ اس لئے ہی تو بگڑتے جا رہے ہیں کہ پاپا آپ کو سپورٹ کرتے رہتے ہیں۔''
وہ پھر سے مسکرانے لگا۔ حالانکہ درد کی لہر معدوم تو ہو گئی تھی، مگر تکلیف اب بھی برقرار تھی۔ وہ لائرز چیمبر میں اُس کے ساتھ داخل ہوا تھا، پھر کچھ قانونی موشگافیوں پر بات چیت کے بعد مسٹر رفیق نے فائل دراز سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔
''آپ تینوں پیپرز پر مسٹر جازی کے دستخط لے لیجیے، پھر ہم باقی کی فارمیلٹی پوری کر لیں گے۔ آپ کے ہاؤس کو انعام کرنا اور ان کے کمنٹ کے ساتھ یہ فیصلہ امپرو کروانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''
''جازی! سائن کرو۔'' شہریار نے پاکٹ سے پین نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور وہ بہت بےاعتباری سے اُسے دیکھنے لگا۔
''میں سنی بھائی سے پوچھے بغیر کہیں دستخط نہیں کر سکتا۔''
رفیق صاحب نے ان دونوں کو اکیلے بیٹھنے کا موقع دیا تھا اور جازی نے پہلا ہی جملہ تپانے والا بولا تھا۔
''تم کاغذات پڑھ سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

"مگر میں یہ کاغذات سالار بھائی کے ساتھ ہی اسٹڈی کرنا چاہوں گا۔"

"جازی! وقت مت برباد کرو۔" اس نے اس بار خفگی سے اسے دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "تم جاننا چاہتے ہو، اس میں کیا لکھا ہے؟ تو سنو، اس میں میری سٹاک مارکیٹ میں لگی ہوئی رقم کے پرافٹ اینڈ لاس لکھے ہیں اور اسٹاک ممبر شپ کارڈ کو تمہارے نام منتقل کروانے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں، میرے بعد تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب کرو گے سائن؟"

جازی عبدالرحمن نے مسمریز ہو کر دستخط کر دیئے تھے۔ شہریار فائل سمیٹ کر اُٹھ گیا تھا۔ سارے راستے جازی عبدالرحمن نے کچھ نہیں کہا تھا، مگر شہریار کی بات سے اُس کا دل ہل سا گیا تھا۔ نفرت، خفگی کے باوجود پتہ نہیں اس جملے سے یکدم اس کی آنکھوں میں نمی کیوں اُتر آئی تھی؟ شہریار بہت سیفلی ڈرائیو کر رہا تھا اور جازی نے چور نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟"

شہریار نے چونک کر اُسے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ اتنی خاص نہیں مگر دل وا معاملہ ہے بھائی! کب اچانک دھڑکنے سے انکار کر دے، اس کی مرضی ہے، سو اپنی زندگی میں معاملات سدھار لینے کا مارجن لے رہا ہوں اور بس۔"

جازی پھر کچھ نہیں بولا تھا، مگر کار سے اُترتے وقت اُس کے انداز میں بہت بے یقینی سی تھی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا، شہریار ہاتھ ہلاتے ہوئے کار دوبارہ باہر بڑھا لے گیا تھا۔

جازی عبدالرحمن بالکل گم صم کھڑا تھا، پھر ایک گھنٹے بعد کی بات تھی، وہ دوبارہ سے اس کے کمرے میں موجود تھا۔

"آپ، اس وقت......؟" اس بار شہریار کو دیکھ کر اس کا لہجہ کچھ نرم تھا۔

شہریار نے دلچسپی سے اُسے دیکھا تھا، پھر مسکرا کر بولا۔ "میری بیماری اگر اتنی پیاری ہے کہ آپ جیسا ہارڈ اسٹون نرم پڑ گیا تو مجھے لگتا ہے، میری زندگی سے زیادہ میری موت دلکش ہوگی۔ آئی تھنک، تم روؤ گے تو بہت مجھے، بھئی، کبھی کی محبت کا اُدھار سمجھ کر ہی سہی۔ اور وہ کیا کہا ہے یوسف کامران نے، انسان جس کے ساتھ قربت کا ایک لمحہ بھی گزار لے، اسے قبر میں اُتارتے وقت ہاتھ ایک بار تو ضرور کپکپاتے ہی ہیں۔ تمہارے ہاتھ کپکپائیں گے یا......؟" وہ اُس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

جازی عبدالرحمن کا دل چاہ رہا تھا، وہ اسے جس خوف کی طرف کھینچ رہا ہے، وہ اس خوف سے کہیں دور بھاگ جائے، بھلے وہ اب اس کے دل کا کتنا ہی ناپسندیدہ سہی، لیکن آج بھی اس کی موت کا سوچ کر

سانس میں بھنور پڑنے لگتے تھے، دم رُکنے لگتا تھا، اُسے خود سے گلہ تھا کہ جس سے اُس کا دماغ نفرت کرتا تھا، اس سے اس کا دل کیوں محبت کرنے، محبت نبھانے پر تلا ہوا تھا۔
''کیا بہت عمیق جائزہ لیا جارہا ہے۔ کہیں آج میں اپالو کی طرح خوب صورت تو نہیں لگ رہا؟'' اس نے جھینپ کر نظریں موڑ لیں اور وہ اسی مزاج سے اس کے قریب آگیا۔
''تھوڑی دیر کے لئے اپنی سیٹ اور اپنا لیپ ٹاپ دو گے؟ کچھ ضروری کام ہے۔''
وہ سختی سے انکار کردینا چاہتا تھا، مگر بہت غیر متوقع وہ کرسی سے کھڑا ہوگیا تھا۔
شہریار اُس کی سیٹ پر بیٹھ کر اُس سے اُس کے لیپ ٹاپ کو کھولنے کا پاس ورڈ پوچھ رہا تھا۔ اُس نے یہاں فرماں برداری نہیں دکھائی تھی اور دوسری کرسی پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ اپنی طرف سرکا کر اسے آن کردیا تھا۔
''تھینکس...... یہ انتہائی ذہانت کی بات ہے، اگر اس وقت تم بنا چوں چرا پاس ورڈ بتا دیتے تو میں اچھی طرح تمہاری عاقبت نااندیشی پر تمہارے کان کھینچ دیتا۔''
اب اُس کی انگلیاں keys پر تھرک رہی تھیں۔ وہ ویب سائٹ پر وگرامنگ کررہا تھا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر اس نے اُسے آواز دی تھی۔
''جازی! ادھر آؤ۔ میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔''
جازی عبدالرحمٰن کرسی سے اٹھ کر اس کے کندھے سے لیپ ٹاپ پر فیڈ معلومات دیکھنے لگا تھا۔
''یہ ہمارے ہاؤس کی ویب سائٹ ہے۔ میرے ہاؤس آف چیمبر میں میرے علاوہ مسٹر ناصر اور مسٹر حماد شامل ہیں۔ ہمارے چیمبر کے قریباً تیس افراد ہیں جو سٹاک انڈیکس اور دیگر معاملات دیکھتے ہیں، ان پر ہوم ورک کمپلیٹ ہوتا ہے، صرف انہیں دستخط کرنے ہوتے ہیں، سو بہت ساری فائلز میں، میں نے یہ فائل بھی رکھ دی تھی اور رزلٹ حب توقع نکلا تھا۔ ویسے تم نے دستخط کرتے وقت سالار بھائی کا نام نہیں دیکھا؟ حیرت ہے۔''
جازی عبدالرحمٰن خاموشی سے سر جھکا گیا کہ وہ اس کے لہجے سے ایسا مسمریز ہوا تھا کہ پھر کچھ بھی دھیان میں رکھنے جیسا نہیں لگا تھا اور اب یہ ویب سائٹ......''
شہریار اُس کی کرسی سے اُٹھ گیا تھا۔ پھر اُس نے اُسے کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھایا تھا۔ ''اب یہ سنبھالو۔ ویب سائٹ کا پاس ورڈ جالیس رحمٰن ہے۔''
''جالیس رحمٰن؟'' اُس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور وہ مسکرایا۔

''ہاں، جے فار جازی، ایس فار سالار۔'' وہ مکمل تفصیل دے کر رکا نہیں تھا اور اس کے کمرے سے جانے پر یکدم جازی عبدالرحمٰن نے اُسے روکنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا، کیا اسے بخار ہو رہا ہے؟ ابھی تک اسے شہریار کے گرم ہاتھوں کا لمس بانٹ کر رہا تھا مگر وہ جا چکا تھا۔

یہ ہمیشہ جانے کے بعد روکنے کا خیال کیوں آتا ہے؟ زندگی سے وقت نے سوال کیا اور وقت ہنسنے لگا، ہنستا چلا گیا۔ مگر اُس کی ہنسی کی نمی، اس سے ساری زندگی کا پلو گیلا تھا۔



شافعہ بستر پر لیٹی تھی۔ ابھی ابھی سلامہ اس کے پاس سے اُٹھ کر گیا تھا کہ اچانک ارسلان راشدی نے اُس کی کسی دوست کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

'کون ہو سکتی ہے؟' اُس نے بہت سے نام دہرائے، مگر جسے سامنے دیکھا اسے دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

''تم تو عید کا چاند ہو گئیں......آج کل کہاں ہوتی ہو؟''

مومنہ مسکرا کر اسے اپنی دفاتر کی تفصیل بتانے لگی۔ انوشے کی شادی کا حال بتانے لگی۔ پھر گھوم پھر کر بات شہریار پر آ کر رک گئی۔ مومنہ اس کے لئے رطب اللسان تھی مگر تھمی تو اُسے لگا، آج تو شافعہ لازمی اس کی کلاس لے گی مگر اس نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

پھر اُس نے بھرائے لہجے میں کہا تھا۔ ''تم ٹھیک کہتی تھیں، شہریار عبدالرحمٰن کو سمجھنا واقعی بہت مشکل کام ہے۔'' لمحہ بھر کو رکی پھر سونیا تفصیل دے کر بولی۔ ''سچ پوچھو تو اس معاملے میں شہریار واقعی فرشتہ بن کر آئے تھے۔ روز سونیا کو نئے سرے سے بریف کرنا، زندگی کی طرف لوٹانا، یہ بہت مشکل کام تھا۔ مگر شہریار صاحب نے یہ کام کیا، نہ صرف سونیا کو نئے سرے سے زندگی دی بلکہ اپنے ایک دوست عاطف کے لئے سونیا کا ہاتھ بھی مانگ لیا۔ پاپا کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، مگر میرے سمجھانے پر انہوں نے تعرض نہیں کیا تھا۔ عاطف واقعی ایک ویل میز ڈڑ کا ہے۔''

''مگر سونیا نے یہ سب کچھ کیا کیوں؟ اور پھر اچانک اتنا بڑا چینج کیونکر آیا؟'' مومنہ نے اگلا سوال کیا اور اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''سیدھی سی بات ہے، حالات مومنہ! بُرے حالات کو یکدم جادو کی چھڑی گھما کر سدھارنے کی کوشش ہمیشہ ایسے ہی گڑھوں میں گراتی ہے۔ وہ تو شکر تھا، اس نے آسائشات پر اپنا سودا نہیں کیا، ورنہ تو ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتے۔ جو لوگ اسے ایلیا کے نام سے جانتے ہیں، وہ صرف گنتی کے لوگ ہیں۔ سوائے زوار حسن شاہ کے کوئی ایسا رسوخ والا نہیں ہے کہ ہمیں خوف زدہ ہونا پڑے۔ پھر عاطف

بیگ اُس کی اس بڑی شہرت کے باوجود اُس کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہے تو زندگی کا ایک مارجن لینے میں کیا حرج ہے؟ مومنہ! مجھے تو لگتا ہے، ہمارے بزرگوں کی کوئی نیکی ہے، جو ہمارے کام آ گئی ہے آج۔"
مومنہ کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔ اُسے وہ دن یاد آ گئے تھے، جب وہ تین دن کی بھوک کے لئے اپنی عزت داؤ پر لگانے کے لئے مسمریز ہو کر چل پڑی تھی اور اُسے اچانک شافعہ نے برائی سے اچک لیا تھا۔
"یہ تمہاری اپنی نیکی ہے شافی! تم اتنی اچھی ہو کہ تمہارے ساتھ اس خدا نے برا ہونے ہی نہیں دیا۔"
"کیا واقعی میرے ساتھ برا نہیں ہوا؟" شافعہ کی آنکھ میں دُکھ نمکین پانی میں غوطے لگانے لگا اور مومنہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
"نہیں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں ہوا۔ دیکھو، اگر عارف تمہیں زندگی کی کسی دوپہر میں اچانک اس طرح چھوڑ دیتا تو؟ تم تو صبح کی کرنوں بھرے دن میں اس سے بچھڑی ہو۔ زندگی نے نارسائی کا سم ضرور پیا ہے، لیکن دیکھو! محبت نے کیسے سلامہ ارسلان کے دل میں تمہارے لئے محبت کی نرمی بھر دی ہے۔"
شافعہ نے اسے خاموشی سے دیکھا، کچھ نہیں بولی اور مومنہ نے ادھورے جواب سے نیا سوال کیا۔
"تم نے سونیا کی اچانک اس تبدیلی کی وجہ نہیں بتائی؟"
شافعہ نے اُسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "سونیا کہتی تھی، مجھے میری منزل سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور میں اس سے کہتی تھی، ایک طاقت ہے، جو سب کچھ بدل سکتی ہے اور بس وہ طاقت جیت گئی۔ شاید کوئی اور یہ سب سنتا تو اسے اس بات میں یقین کرنے میں وقت ہو، لیکن جو اس سپر پاور کی طاقت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں معلوم ہے، نیکی ایک سرسراہٹ بھری آواز کی طرح ہوتی ہے، ایک سنسنی بھرا احساس ہے جو خود بخود دل کے اندر بیدار ہوتا ہے اور پورے وجود پر چھا جاتا ہے۔ ناممکنات کا ممکن ہونا ہی خدا کے وجود کا دوسرا نام ہے۔"
سونیا چائے اور بسکٹ کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی اور زیر لب مسکرانے لگی۔ مگر اس مسکراہٹ میں زہر گھلا ہوا تھا کیونکہ جو نیکی کسی برائی کے بطن سے جنم لے، وہ اپنے ہونے پر بہت دنوں تک خود پر ایسے ہی طنز سے ہنستی ہے۔ لوگ بھی اس نیکی کو ایک اعلیٰ درجے کی برائی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ مگر نیکی کا احساس دھیرے دھیرے ایسے پھیلتا ہے، جیسے سمندر کا ہلکا بھاری بہاؤ۔ مگر پانی کے مسلسل ٹکرانے سے یہی بہاؤ پتھروں کو کاٹ دیتا ہے، ان کی نئی طرح سے صورت گری کرتا ہے۔ کبھی کبھی انہیں بالکل بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی ماں کی ایک برائی نے اسے بھی بدل دیا تھا، ایک ہی لمحے میں وہ جی تھی اور اس ایک لمحے ہی میں صدیوں کے برابر اذیت سہہ کر مر گئی تھی۔ لوگ تو قعرِ مذلت میں سر تک ڈوبے ہو کر ایک لحظہ توفیق پر سدھر جاتے ہیں، پھر وہ کیوں سمت نہیں ٹھیک کر سکتی

تھی۔ایک لمحہ توفیق تو ہر ایک کی زندگی میں آتا ہے۔ کچھ لوگ اس لمحہ توفیق میں رنگریز کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور کچھ لوگ اس لمحہ توفیق کو قہقہے میں اُڑا دیتے ہیں۔ لیکن سونیا جانتی تھی کہ وہ، جو زندگی پر موت کو ترجیح دینے والی تھی، اگر اس لمحے آ کر شہریار کے لفظ، اس کی ڈھارس اُسے سنبھال نہ لیتے تو شاید وہ حرام زندگی کی طرح ایک طویل حرام موت جیتی رہتی۔ اُس نے شافعہ کو ماں کے سچ کا نہیں بتایا تھا اور نہ ہی شافعہ نے اُسے کریدا تھا۔ حقیقت میں بھی شافعہ ان لوگوں میں شامل تھی، جو صرف اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ پھر انہیں کبھی کبھی اپنے دل کی آواز سننے کے لئے بھی کسی دوسرے انسان کی اٹینشن کی ضرورت رہتی ہے۔ کوئی اور انہیں بتائے تمہاری احتیاجات کیا ہیں تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟ تب وہ ٹھہر کر، رُک کر اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو سمجھے بغیر ہی زندگی کے پنڈال سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

سونیا نے ٹرے رکھ دی تھی۔ وہ دونوں چائے سے لطف لے رہی تھیں اور سونیا باہر آ گئی تھی، پھر کچن میں وہ برتن دھو رہی تھی، جب بہت اچانک کسی نے پوچھا تھا۔

"ہاں بھئی، ہمارے ونڈر فل گریٹ فرینڈ کا کیا حال ہے؟ آج کل تو وہ ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتا ہے۔"

سونیا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اُس کے پورے چہرے پر پھیلتی چلی گئی تھی۔ "شہریار بھائی! آپ؟ آپ بجو کے کمرے میں چل کر بیٹھئے، میں ابھی دو منٹ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لائی۔"

"ارے تکلف کی ضرورت نہیں ہے بہنا!" شہریار نے انکار کرنا چاہا، مگر وہ زبردستی اُسے شافعہ کے کمرے میں دھکیل کر ہی باز آئی۔ دونوں اُسے دیکھ کر چپ ہو گئی تھیں۔

شہریار نے مسکرا کر دیکھا، پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "سوری ڈیئرز! یہ مجھے سونیا نے یہاں دھکیلا ہے، ورنہ میں ان مینرڈ نہیں ہوں۔"

"ارے بس، اب فارمیلیٹی مت دکھایئے۔ آ جایئے، یہ خانہ بے تکلف ہے۔"

مومنہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُس کے چہرے پر جذبات کا ایک رنگ آ کر واپس لوٹ گیا اور وہ سوچنے لگا، کیا وہ کبھی کہہ سکے گا کہ مومنہ، میں تمہارا بھائی ہوں؟ کبھی پورے حق اور اختیار کے ساتھ کیا وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر اُس کے لئے ڈھارس بن سکے گا؟

"کیا سوچنے لگے؟ میں نے کہا ناں، یہ خانہ بے تکلف ہے۔"

شہریار نے شافعہ کے چہرے پر نظریں ڈال کر شوخی سے کہا۔ "یہ خانہ بے تکلف ہے، آپ نے اس خاتونِ خانہ سے پوچھ لیا ہے۔ مومنہ یا مجھے خوامخواہ پٹوائیں گی۔"

”اب فضول تو مت بولیں شہریار بھائی! یہاں آپ کے خلاف ہے ہی کون؟ بابا آپ کے معترف ہیں، میں آپ کی پارٹی میں ہوں۔ اور شافعہ بجو......“

”ہاں، ہاں۔ شافعہ بجو کیا؟“ وہ ہنسا۔ اچانک دل نے ضد کی کہ مومنہ، شافعہ کا نام بھی اس کے ساتھ نتھی کر دے تو زندگی پہ بے اختیار پیار آ جائے۔ مگر سونیا ایک شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو گئی تھی۔ شہریار نے کبھی ضد نہیں کی تھی، پھر باتیں چل ہی رہی تھیں کہ سونیا نے مومنہ کو بائی فیس دیکھنے کی ضد کی تھی۔

مومنہ نے ہنستے ہوئے حجاب ہٹایا تھا اور عین اسی وقت ارسلان راشدی، آصفہ کا پیغام سونیا کے لئے لے کر کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ سے شیشے کا جگ چھوٹ گیا تھا۔ شہریار ان کی کیفیت جان رہا تھا اس لئے مطمئن بیٹھا رہا اور سونیا تیزی سے اٹھی تھی۔

”بابا! کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“ آصفہ ارسلان راشدی کے بیچ کے بعد سے سونیا کا دل اپنے بابا کے لئے ترحم سے بھر گیا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اپنے اسی بابا میں کیڑے نکالتے نہیں تھکتی تھی مگر اب اسے ان سے ہی اُنس ہو گیا تھا۔ وہ اس کی نظر میں ایک عظیم انسان تھے، جنہوں نے اس کی غلطی پر اسے معاف کر دیا تھا اور اسے لگتا تھا، اگر بابا اس کی ماں کی یہ غلطی بھی جان جائیں تو شاید وہ انہیں بھی معاف کر دیں گے۔

ارسلان راشدی بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ”تم......تم کون ہو؟“

”یہ مومنہ ہے بابا! جس کے متعلق میں نے اکثر آپ سے کہا تھا کہ تسلی ملی تو اسے آپ سے ملواؤں گی۔“

ارسلان راشدی مردہ قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور شہریار کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ صحیح رخ تک آتے آتے کہاں پلٹ گئے تھے اور سونیا بھی بہت ایکسائیٹڈ ہو کر بولی تھی۔ ”شافی بجو! آپ کو کیا لگتا ہے، یہ آنکھیں آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں؟“

شافعہ، سونیا کے کہنے سے پشت کے بل لیٹے لیٹے ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ارسلان راشدی کا ردِعمل بھی اس سوال کو وضاحت دے رہا تھا۔

”تمہاری مما کا کیا نام ہے؟“

”عطیہ بانو۔“

”کیا......عطیہ بانو......تمہارے بابا کا نام؟“

"سنا ہے، جو آپ سے محبت کریں، وہ دکھ دیں تو ان کا بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ سارا وقت نکل جاتا ہے کرچیاں چننے میں۔"

عطیہ بانو کے لفظ ایک ایک قدم کرتے سیڑھیاں چڑھتے ان کے دل کی سب سے اوپری سطح پر آ گئے تھے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر مومنہ کے قریب آئے تھے۔ بہت ڈرتے ڈرتے انہوں نے مومنہ کو چھوا تھا، یوں جیسے وہ کوئی عکس تھی، جسے چھونے کے ساتھ ہی بکھر جانا تھا۔

"تم مومنہ؟...... میری عطیہ کی بیٹی؟" کتنی مشکل سے پہلا مربوط جملہ نکلا تھا۔ بازو وا ہوئے تھے اور مومنہ ان کے سینے سے لپٹ گئی تھی۔

شہریار نے مٹھیاں بھینچ کر اس جذباتی لمحے سے خود کو بچایا تھا اور ارسلان راشدی کے لب ہلے تھے۔

"تمہاری ماں کیسی ہے مومنہ؟"

مومنہ نے بھیگی پلکوں سے انہیں دیکھا اور بہت بے بسی سے بولی۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں، ماں کیسی ہوتی ہے۔ میں تو بچپن سے یتیم خانے میں پلی تھی۔ بابا اور عافیہ خالہ سے پتہ چلا، میری ماں تو تیس سال پہلے مر چکی ہیں۔"

ارسلان راشدی کے ہاتھ بے جان ہو کر گر گئے تھے۔ وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"عطیہ مر گئی تھی؟...... میری عطیہ مر چکی ہے، پھر بھی...... میرا دل پھر بھی دھڑک رہا ہے، پھر بھی زندہ ہے؟ نہیں تم جھوٹ کہہ رہی ہو...... بالکل جھوٹ۔"

مومنہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تصدیق کی تھی اور پھر جیسے پہاڑ رو پڑا تھا۔ سخت سنگلاخ پہاڑ کیسے روپڑتے ہیں شہریار نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"میں...... میں عبدالرحمن کو اس کے لئے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیا وہ اتنا مصروف تھا کہ یہ خبر دینے کے لئے بھی اسے فرصت نہیں ملی؟ میں کبھی معاف نہیں کروں گا اسے۔"

مومنہ نے ان کا مشتعل لہجہ سن کر شہریار کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا اور اسے تب پتہ چلا، وہ اس ملن کے دوران چپکے سے ان کے حرمت سے نکل گیا تھا۔

"یہ شہریار بھائی کہاں گئے؟ میں نے تو ان کے لئے چائے بنائی تھی؟" سونیا نے حیرت سے کہا مگر ارسلان راشدی اور مومنہ کے اچانک ملن پر سب کی توجہ اس طرف اتنی تھی کہ کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔



"ہیلو کون بول رہا ہے؟" سالار عبدالرحمن نے مسلسل بجنے والے فون کو یکدم اُٹھا لیا تھا۔ یہ لائن ان کے کمرے میں تھی اور جازی کے کمرے میں تھی۔ نمبری ایل آئی پر انجانا تھا اس لئے وہ کافی دیر سے اس کی بیلز کو اگنور کر رہے تھے مگر جب جازی نے فون نہیں اُٹھایا تو انہیں ہی فون ریسیو کرنا پڑا۔

"ہیلو جی، جازی سے بات ہو سکتی ہے؟"

"جی، آپ کون؟ میں ان کا بڑا بھائی سالار عبدالرحمن بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ، السلام علیکم! میں ندیم بات کر رہا ہوں، اسلام آباد سے۔"

"او کے ندیم! کوئی ضروری بات کرنی ہے تو آپ مجھے بھی بتا سکتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی کم، دوست زیادہ ہیں۔"

ندیم ہنسنے لگا، پھر اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر جس بات میں ٹال مٹول شروع ہو جاتی تھی، سالار کو خواہ مخواہ اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، سو اُن کا اصرار بڑھتا گیا، تب ندیم نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"آپ جازی سے کہیے گا، اس کا شک ٹھیک نکلا، بورڈنگ ہاؤس میں پڑھنے والی لڑکی شہریار بھائی کی بیٹی ہی ہے، میں نے بہت سورسز لگائی ہیں، تب یہ راز کھلا ہے۔ آپ کو نہیں پتہ، کوئی مامون عبدالکریم ہوتے ہیں، اُن کی ان معاملات میں گہری نظر تھی، مگر جازی کے لئے میں نے کسی نہ کسی طرح آنکھ سے سرمہ چرا ہی لیا۔ اب آگے کیا کرنا ہے، یہ پوچھنا تھا جازی سے۔"

"جازی کو چھوڑو، میں جو کہہ رہا ہوں، اس پہ عمل کرو۔" وہ اُسے سمجھانے لگے، پھر ریسیور رکھ کر انہوں نے سر اُٹھایا تو ان کے چہرے پہ بہت طویل عرصے بعد ایک شرارت بھری مسکراہٹ تیرتی نظر آئی تھی۔

"اب دیکھوں گا بابا کیسے اسے سپورٹ کرتے ہیں۔ ماما کیسے اس کی محبت کا دم بھرتی ہیں اور نانو کو اچانک اس کی ذات سے دلچسپی لیتے ہی میری ذات میں کیوں خرابیاں نظر آتی ہیں؟"

اُن کی شرارت بھری مسکراہٹ شیطانیت بھری مسکان میں بدل گئی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر پر جھول رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کا شہریار کا قصہ اُن کی سماعتوں میں پگھلتے سیسے کی طرح تپک پیدا کر رہا تھا۔

"تمہیں کیا پتہ، میں بالکل ڈفر ہو گیا۔ زیرو زیرو سیون کا کزن ہوتا ہوں میں اور......"

جملہ بار بار ان کے اندر دہرایا جا رہا تھا اور بار بار ان کا غصہ سوا ہو رہا تھا۔

"مامون عبدالکریم...... یہ شخص بھی شہریار سے کم نہیں ہے۔ پتہ نہیں، شہریار سے متعلق ہر انسان، ہر چیز سے مجھے نفرت کیوں ہو جاتی ہے؟" انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اپنے بلڈ پریشر کو پھر سے

نارمل کیا تھا۔
دوسری صبح شہریار کے لئے کچھ اچھے پیغام نہیں لائی تھی۔ وہ ناشتے میں مصروف تھا کہ سالار عبدالرحمٰن نے ناشتے کی ٹیبل کو گھمسان کا رن بنا دیا۔
"سالار! کبھی تو سکون سے ناشتہ کرلیا کرو۔ جہاں ساتھ بیٹھتے ہو، وہیں ہنگامہ شروع کردیتے ہو۔" مام نے غصے سے کہا اور وہ چڑ کر کھڑے ہوگئے۔
"میں ہنگامہ کرتا ہوں یا آپ کا یہ لاڈلا بیٹا ہنگاموں کو آواز دیتا ہے؟"
"اب کیا کردیا اس نے؟" مام نے پوچھا۔ دانیا نے چائے کا کپ نیچے رکھ دیا تھا۔ ایک نیا معاملہ عقدہ کشائی کے لئے سامنے آنے والا تھا اور یہ کیا معاملہ تھا، وہ جاننا چاہتی تھی۔
"پاپا! اس نے میرے دستخط بغیر میری اجازت سے دھوکے سے کروائے ہیں۔"
شہریار نے خفگی سے جازی عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا مگر اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔
"شہریار! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کن کاغذات پر سائن کروائے ہیں سالار سے؟"
"وہ...... پاپا! وہ کانفیڈنشل پیپرز تھے، جن پر ان کے سائن ضروری تھے مگر عام حالات میں ان کی طرف سے انکار لازمی آتا، سو میں نے تھوڑی سی چالاکی سے کام لے لیا۔"
"پاپا! آپ کو پتہ ہے، کل اس نے انیلہ کے علاج کے سارے اخراجات کے ساتھ ساتھ کیا نوٹیفکیشن جاری کروایا ہے؟" پاپا اس سے آگاہ تھے مگر جازی نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔
"کیا آرڈر پاس ہوا ہے؟" جازی نے سوال کیا اور وہ غصے سے بولے۔
"حضرت نے نئی بادشاہ ہونے کا ایکٹ شروع کردیا ہے، کمپنی کے پیسوں سے نئی بائی ایس بک کروائی گئی ہے۔ کئی سالوں کا لون پے کرنا پڑے گا۔ ہمارے اخراجات پر ایک اضافی بوجھ ہے اس کا یہ فیصلہ۔"
"آخر شہریار بھائی نے یہ فیصلہ کیوں لیا ہے؟" دانیا نے سالار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں جھانک کر شہریار سے سوال کیا اور سالار عبدالرحمٰن بھنا کر بولے۔
"فرماتے ہیں جناب کہ کمپنی کی لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملنی ہی چاہئے۔ آخر کمپنی کس کس کھاتے کو بھرتی رہے؟ کمپنی اپنے ایمپلائز کا اتنا اچھا خیال رکھتی ہے، اتنی ہینڈسم سیلری دیتی ہے تو یہ اضافی نوعیت کے خرچے کا پیٹ کون بھرے گا؟ ہم لوگ راجا مہاراجا کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا شہریار اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں؟ آپ بتائیے، اس میں کیا سمجھداری ہے؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے خفگی سے پلیٹ آگے سرکا دی تھی، پھر سالار عبدالرحمٰن کو مخاطب کرکے بولے تھے۔ ”مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی سالار! حالانکہ تم میرے ساتھ آئے ہو، مگر تمہاری اور میری سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ رُک کے، پھر سے کر بولے۔ ”انیلہ کا جس طرح ایکسیڈنٹ ہوا ہے، اگر وہ ایکسیڈنٹ میرا یا دانیا کا ہوتا تو بھی تم اتنے بڑے بڑے ڈائیلاگ بول رہے ہوتے؟ وہ بچی مرتے مرتے بچی ہے۔ میں جب اس سے پہلی بار ملا ہوں تو اس کی آنکھوں میں کتنے آنسو تھے، تمہیں کیا پتہ؟ تمہیں کیا پتہ اس نے کتنی حسرت سے شہریار سے کہا تھا کہ کاش وہ مومنہ ہوتی۔ مومنہ کو دفتر کی گاڑی پک اینڈ ڈراپ کر دیتی تھی اور وہ لڑکی جس طرح بسوں کے دھکے کھا کر دفتر پہنچتی تھی، ایک فطری بات ہے، اُس کے دل میں بھی حسرت سر اُٹھاتی تھی۔ کیا بُرا کیا ہے شہریار نے یہ فیصلہ کر کے کہ کمپنی کی ساری لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملے گی؟“

سالار عبدالرحمٰن، عدیل عبدالرحمٰن کو گھورتے رہے اور شہریار نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اگر آپ یہ فیصلہ غلط سمجھتے ہیں تو پلیز! اسے بدل لیجئے گا، مگر میری زندگی تک اسے اسی طرح جاری رہنے دیجئے۔“ مام کی سانس رکنے لگی تھی اس لہجے پر مگر سالار عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”میرے سامنے یا جھے بننے کے ناٹک مت کیا کرو، میں جانتا ہوں تمہارے اندر کتنا شر بھرا ہوا ہے۔“

شہریار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتا بچّی ڈرائیور کے ساتھ ناشتے کی میز پر آموجود ہوئی تھی۔

”یہ بچی کون ہے؟“ شہریار کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

مامون عبدالکریم کی ڈیوٹیز چینج ہونے سے اس معاملے پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کر کے مام کے سوال کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”وہ مام!...... یہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے، جسے میں نے......“

”جھوٹ کہہ رہا ہے مام! یہ...... یہ لڑکی اس کی بیٹی ہے۔ اب یہ جانے کہ اولاد ہے یا کسی اور ایک وائی قسم کی لڑکی کی، لیکن دیکھ لینے اور سمجھ لینے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس انسان پر جو شخص اپنی محبت لٹاتا ہے، اس کے لئے اس محبت کی ذرا بھی قیمت نہیں ہے۔“

عدیل عبدالرحمٰن اور پاپا کی آنکھوں میں بھی اس لمحے سوالات تھے۔ یہ وہ راز تھا، جو اس نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا تھا۔

"بابا! آپ بتاتے کیوں نہیں، آپ ہی میرے بابا ہیں؟" عینی کا لہجہ سوالیہ تھا۔

جازی عبدالرحمن کے چہرے پر استہزاء آگیا

کل سے جو اُس کے رویے میں نرمی آئی تھی، اس نے اس لمحے پھر سے سختی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عائشہ بھابی اور رابعہ بھابی تک اسے اس معاملے میں گلہ کرتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ کسی نے کوئی لفظ نہیں کہا تھا اور وہ خاموشی سے عینی کا بیگ اُٹھا کر آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔

"آپ کو یہاں کس نے بلایا تھا؟" اس نے نرمی سے سوال کیا اور عینی بھی نرمی لیے بولی۔

"مجھے تو سالار انکل نے فون کر کے کہا تھا کہ آپ مجھے گھر بلوا رہے ہیں۔ میری ان سے فون پر بات بھی ہوئی تھی، بہت محبت سے انہوں نے مجھ سے بات کی تھی اور بہت محبت سے کہا تھا کہ آپ نے، اپنے گھر میں میرے لئے جگہ بنائی ہے، اس لئے اس بار گرمیوں کی چھٹیاں میں کراچی آ کر مناؤں۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا، اُس نے آؤٹ ہاؤس کے دوسرے کمرے کے سامنے اسے لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

"آپ اپنا سامان یہاں سیٹ کر سکتی ہو۔ ڈونٹ وری، میں سب سنبھال لوں گا۔" وہ کہہ کر رُکا نہیں تھا مگر مسلسل اُس کا دماغ اُلجھ گیا تھا۔ کل کی بابا اور مومنہ کی جذباتی ملاقات سے وہ پہلے سے ہی ہلا ہوا تھا اور یہ نیا معرکہ......"

"مجھے لگتا ہے، میری ساری عمر وضاحتیں دیتے گزر جائے گی، مگر پھر بھی میں کسی ایک کے دل کو بھی اپنا گھر نہیں کر سکوں گا۔" وہ خود سے بڑبڑایا تھا، پھر وہ نکلنے ہی والا تھا کہ عدیل بھائی نے چھاپہ مار دیا تھا۔ وہ زبردستی اسے اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔

"یہ فائل کا کیا چکر ہے؟ تم نے کس سلسلے میں سالار جیسے بندے کو حیث کیا ہے؟"

وہ سمجھ رہا تھا، وہ عینی کے سلسلے میں وضاحت مانگیں گے، مگر انہوں نے بالکل الگ سوال کیا تھا۔

"کوئی خاص نہیں، اسٹاک مارکیٹ کا ممبر شپ کارڈ ان کے نام ٹرانسفر کروانے کا قانونی معاملہ تھا۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" عدیل بھائی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔
اس نے عدیل بھائی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر مدھم لہجے میں کہا تھا۔ "آپ جانتے تو ہیں وجہ، پھر بار بار دہرانے سے کیا فائدہ ہے بڑے بھیا؟"
"شہریار! آخر آپریشن کروا لینے میں حرج ہی کیا ہے؟" وہ اس کے قریب آئے اور وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اسی لہجے میں بولا۔
"شاید چار سال پہلے یہ آپریشن کامیاب ہو سکتا تھا، لیکن اب...... اب اس کی کامیابی کا صرف ایک فیصد چانس ہے بھیا! اور ننانوے فیصد کو صرف ایک فیصد پر قربان کر دینا کوئی عقلمندی تو نہیں۔" وہ کچھ تھما پھر اسی لہجے میں بولا۔ "آپ میرے لئے ہراساں مت ہوا کریں بھائی! کچھ چیزیں پہلے سے طے ہیں، انہیں اسی طرح سکرپٹ کے مطابق ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"
عدیل بھائی کافی دیر کے لئے سناٹے میں رہ گئے تھے، پھر ماحول کو چینج کرنے کو بولے۔ "ماموں تمہاری محبت میں کچھ زیادہ نہیں، اپنی حکومتی ذمہ داریوں سے روگردانی کرنے لگا؟ مجھے لگتا ہے، اس کے کان کھینچنے ہی پڑیں گے مجھے۔"
شہریار جو سنجیدگی میں اتر گیا تھا فوراً مسکرانے لگا، پھر نرمی و لجاجت سے بولا۔
"پلیز بڑے بھیا! اس طرح تو مت کریں اور پھر یہ بھی تو دیکھیں، وہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے ذہین دماغ ہے، ہمیشہ جان ہتھیلی پر لئے گھومتا ہے، ایسے میں ایک آدھ بینیفٹ وہ اپنی ذات کے لئے ڈیپارٹمنٹ کے مارجن سے لے لیتا ہے تو یہ آسانی سے درگزر کیا جا سکتا ہے۔"
"آہاں...... آپ کی طرح میں سوچنے لگا ناں، تو پھر تو چل گیا میرا ڈیپارٹمنٹ۔" وہ ہنسے، پھر یکدم اچانک بولے۔ "یہ عینی کون ہے؟"
"میری بیٹی ہے بڑے بھیا!" اس نے ترنت جواب دیا۔
عدیل بھائی نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو یہ بات۔"
وہ نظریں چرا گیا۔ عدیل بھائی کا اصرار بڑھتا گیا، تب اس نے عینی کے ملنے کی پوری داستان کہہ سنائی۔
"تمہیں کیا لگتا ہے، یہ سچ ہو سکتا ہے؟" عدیل بھائی نے پوچھا۔

وہ آہستگی سے بولا۔ ”آپ کو کیا لگتا ہے، کوئی لڑکی اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولے گی؟“

”تم نے کبھی اس سچ کے اندر اترنے کی کوشش کی؟“

اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ”میں نے یہ سوچے بغیر کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ ہے، اسے صرف نبھانے کی کوشش ہے۔“

عدیل بھائی نے ایک لمحے تک اسے دیکھا، پھر یکدم بازو پھیلا کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ”پتہ نہیں، میں تمہیں کبھی سمجھ بھی سکوں گا یا نہیں، لیکن شہریار! یہ طے ہے، تم ہم سب بھائیوں میں سب سے الگ، سب سے پیارے انسان ہو۔“ شہریار کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی پھیلی، مگر وہ پھر سے مسکرانے لگا تھا۔

”عینی کے لئے اس گھر میں گنجائش نکلوا سکتے ہیں بھیا؟“

”بے فکر رہو اس طرف سے۔ اب تم سے کوئی اس سلسلے میں سوال نہیں اُٹھائے گا۔ سالار نے اگر زیادہ ہنگامہ کیا تو پھر مجھے نمٹنا آتا ہے ایسے حالات سے۔“

اُس نے ہلکے سے عدیل بھائی کے کندھے پر مکا مارا۔ ”آپ بہت زیادہ چیٹر ہو بھائی!....... میں تو آپ کا عشر عشیر بھی نہیں ہوں۔“

”کیا بکتا ہے؟“ عدیل بھائی کا قہقہہ فلک شگاف تھا اور دروازے کا ہینڈل تھامے کھڑی ماما کا دل کب سے ہولے ہولے سے لرز رہا تھا۔

کس کس کے آپریشن کی بات چل رہی تھی اور کس چیز کا آپریشن....... بہت سے سوالات اُبھر رہے تھے، مگر ہلکے سے کھلے ہوئے دروازے سے آواز بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ ماما نے پشت موڑ لی تھی، پھر وہ ڈرائنگ روم سے ہو کر گزر رہی تھیں، جب ان کے کانوں میں سالار عبدالرحمٰن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوئی شہر بائی لائٹ کروانے کے لئے ڈکٹیٹ کروا رہے تھے، مگر ماما پوچھنے کے لئے رُکی نہیں تھیں۔ اُن کا دل تیز آندھیوں کی زد میں تھا۔ شہریار کا مایوس کن لہجہ اُن کے اندر ہزار طرح کے سوال اُٹھا رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب کسی سے حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔



پاپا ابھی دفتر میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ انٹر کام پر انہیں گیسٹ کے آنے کی اطلاع ملی۔

”کون ہیں رجاء؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا اور رجاء مؤدبانہ نام دہرانے لگی۔

"ارسلان راشدی۔"

ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ارسلان راشدی ان پر نظر ٹکائے کھڑے تھے۔

"کیسے ہو تم؟" مسز عبدالرحمٰن نے انہیں تحیر سے چھو کر یوں دیکھا، جیسے وہ کوئی خواب تھے۔ شاید اتنے برسوں بعد تو حقیقت بھی خواب سا لگنے لگتی ہے اور یہ حقیقت تو تلخی کا سم پی کر جدا ہوئی تھی، پھر کسی کو کیا پتہ، یہ حقیقت زندہ بھی تھی یا واہمہ سا اُن کے اور ارسلان راشدی کے بیچ کھڑا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، مجھے کیسا ہونا چاہیے؟ مجھے، جس نے اپنی محبت کھودی، اپنا دوست کھو دیا۔"

"کھونے کی ضد تو تمہاری تھی۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی کہ......"

"اب اس میں کیا رکھا ہے کہ غلطی کس کی طرف سے تھی۔ دکھ تو یہ ہے کہ میں نے ہجر جھیلا ہے۔ میں نے عمر قید کاٹی ہے۔"

"جو عمر قید تم نے کاٹی ہے، اگر میرے چہرے کو دیکھو تو تمہیں لگے گا تم نے تو صرف عمر قید کاٹی ہے، اپنی زمین، اپنی مٹی ملنے مٹنے کا آسرا تو تھا تمہیں، میں تو ایک لمحے میں زندگی میں جلاوطنی کی سزا میں ہزار بار جیا ہوں، ہزار بار مرا ہوں۔ کتنا دل کرتا تھا، کبھی پھر سے پلٹ کر تمہیں دیکھوں، تمہیں بتاؤں کہ تم نے عطیہ کو سمجھنے میں بہت جلد بازی کا ثبوت دیا۔"

"عطیہ......کاش وہ تم سے زیادہ مجھ سے دل کا حال کہنے کی عادت ڈال لیتی تو ہماری پیار کہانی کا انجام بہت مختلف ہوتا۔"

مسز عبدالرحمٰن تھک کر بیٹھ گئے تھے، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "وہ تو جتنے برس تمہارے ساتھ رہی، ہمیشہ تمہارے پیچھے دوڑتی ہی رہی۔ کتنی باتیں تھیں، کتنے سچ جو وہ تم سے شیئر کرنا چاہتی تھی، مگر تمہارے پاس اسے دینے کے لئے سوائے آنسوؤں، سوائے نظرانداز کیے جانے کے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اپنے بچے کے بارے میں تمہارے حوالے سے کتنے خواب تھے اس کی آنکھوں میں، کتنے خواب۔ ارسل! اگر تم دیکھ لیتے تو اس کی مرجانے والی آنکھوں سے پہلے مرجاتے۔ مگر تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہی تو نہیں سیکھا تھا، ورنہ واقعی تمہاری پیار کی کہانی بہت مختلف ہوتی۔"

"مجھے تم بتا نہیں سکتے تھے کہ میں نے عطیہ کو کھو دیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے، پورے تیس سال سے میں اسے ہر دکھ کی بات میں یاد کر کے دکھ کو سوا کرتا رہا ہوں۔ اتنا زیادہ کہ میرا دل اس کے بوجھ سے بالکل خالی ہو گیا۔ کون سا بد اللفظ تھا، جو میں اسے دینے سے نہیں چوکا اور وہ......وہ منوں مٹی تلے منادی گئی تھی۔ یہ سارے خزانے مٹی کے نیچے کیوں دفن کرنے کی روایت ہے، کس نے ڈالی ہے یہ روایت؟" وجاہت

کرتے کرتے تھک گئے تھے۔

مسٹر عبدالرحمٰن نے ان کا شانہ تھاما تھا، پھر بے چارگی سے بولے تھے۔ ''میں تو تمہارے گھر کئی بار آیا ہوں۔ میں نے تو کئی بار کہا بھائی! مجھے ارسلان سے ایک بار ملنے دیجئے، ایک بار وہ عطیہ کی اولاد کو اپنی گود میں لے لے تو شاید عطیہ کی روح کو سکون آجائے۔''

ارسلان راشدی نے ان کے چہرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا، پھر آنکھوں کے ہم رنگ رویے سے بولے۔ ''آصفہ ایسا کیوں کریں گی؟ انہیں میرے بچے سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟''

مسٹر عبدالرحمٰن کو یکدم شہریار کا جھوٹ یاد آگیا تھا۔ وہ کیا کہہ گئے تھے جذباتیت میں۔

ارسلان راشدی نے چونک کر پوچھا۔ ''عطیہ کی تو صرف بیٹی تھی ناں اور وہ بھی یتیم خانے میں پلی تھی، پھر یہ کس بچے کا تذکرہ ہے؟''

پاپا کو شہریار اس لمحے میں بہت شدت سے یاد آیا تھا اور عین اسی وقت ان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ شہریار کو ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کا احساس بہت شدت سے ہوا تھا اور اسی وقت مسٹر ارسلان راشدی نے اسے نظروں سے ہٹا کر نئے سرے سے سوال کیا تھا۔ ''تم کس بچے کا ذکر کر رہے ہو عبدالرحمٰن؟ میری تو صرف بیٹی تھی ناں؟''

شہریار نے ایک ساعت میں سوچا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔ ''یہ میرا ذکر کر رہے تھے انکل! انہیں پتہ چلا تھا کہ آپ عطیہ میم کے زندگی سے نکل جانے سے بالکل ٹوٹ گئے ہیں، زندگی سے ہار گئے ہیں تو پاپا نے اپنی گود کی محبت آپ کی گود میں ڈالنی چاہی تھی، تاکہ آپ کا وجود پھر سے جڑ سکے۔ میم عطیہ کی بیٹی کی بابت کاغذات میں مردہ بچی درج تھا اور یہی پاپا کے پاس بھی سچ تھا لیکن اگر وہ یہ کہتے تو شاید آپ اسی پل مر جاتے، اس لئے انہوں نے یہ قربانی دینی چاہی تھی، مگر آصفہ میم نے انہیں آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔''

''عبدالرحمٰن! تم...... تم اتنے گہرے ہو، اپنی جھولی کی خوشی کوئی کسی کو کب دیتا ہے؟ تم اتنی محبت کرتے تھے مجھ سے اور میں تم سے کتنی نفرت کرتا تھا، کتنی شدید نفرت عبدالرحمٰن!'' ارسلان راشدی نے مسٹر عبدالرحمٰن کے کندھوں کو تھاما اور پاپا نے شہریار کی طرح جذباتیت سے ان کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

شہریار کا دل ایک بار پھر سے ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا تھا، مگر اُسے پاپا کے دل کا خیال رکھنا تھا، ضبط کرتا تھا۔

ارسلان راشدی بہت دیر بعد پاپا سے الگ ہوئے تھے اور اب ان کی پوری توجہ شہریار کی طرف تھی۔

”عبدالرحمٰن! تمہارے بچے بالکل تم پر گئے ہیں۔ ان کی تربیت میں ہلکا سا بھی جھول نہیں ہے۔ مجھے اب لگتا ہے، شاید تمہارا یہ بچہ پہلے سے مجھے جانتا تھا، تبھی اس کا رویہ میرے ساتھ احترام والا تھا۔ اس نے شافعہ کی بہت مدد کی ہے۔ سونیا کے معاملے میں میرے جھکے کندھوں کو تھام کر ڈھارس دی ہے۔ تمہارا بڑا بیٹا عدیل عبدالرحمٰن، وہ بھی بہت اچھا انسان ہے۔“

پاپا کی آنکھوں میں فخر سا آگیا تھا، مگر شہریار کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ان کا دل چھننے لگا تھا۔

کیا اس بچے کی قسمت میں صرف ضبط لکھا ہے؟...... ان کا دل بھر آیا تھا اور اسی وقت ارسلان راشدی نے محبت سے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

”تم جیسے بچے قسمت والوں کو ملتے ہیں عبدالرحمٰن! یہ یہاں مجھ سے جیت گیا، ورنہ ہر معاملے میں یہ مجھ سے ایک اسٹینڈ پیچھے رہتا تھا۔ میں اس سے زیادہ اچھا حساب داں تھا۔“

پاپا، دراصل دل اور محبت میں پڑ کر پیچھے رہ جاتے ہوں گے۔ دراصل یہ اپنی اس کمزوری پر آج تک قابو نہیں پا سکے ہیں۔“

مسٹر ارسلان راشدی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، مگر وہ بات سنبھال کر رکا نہیں تھا، پھر دفتر سے نکل ہی رہا تھا کہ رجاء کے ٹیبل پر پھیلے ہوئے اخبار کے اندرونی صفحات پر اس کی نظر جا کر ٹھہر گئی تھی۔ اس نے تیزی سے خارجی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے اور کار پارکنگ ایریا سے نکالتا چلا گیا تھا، پھر ایک بک اسٹال سے ”دی ایج“ کا نیوز پیپر خریدا تھا۔ خبر پر اس کی اور عینی کی تصویر تھی اور جو خبر تفصیل سے لکھی تھی، اس نے اسے جھنجھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے گاڑی سائیڈ پر روک کر ”دی ایج“ کے ایڈیٹر ان چیف کا نمبر ملایا تھا، پھر وہ سخت لہجے میں اسٹارٹ ہی ہوا تھا کہ اچانک سلامہ کی آواز سنائی دی تھی۔

”جب خبریں لگوانے کا کام کرتے ہو تو برا کیوں لگتا ہے شہرت ملنے پر؟ لوگ تو خبروں میں ان رہنے کے لئے جھوٹ اسکینڈل بنواتے ہیں۔ ہم تو تمہاری طرف سے بغیر کسی اضافی چارج کے تمہیں خود بخود فرسٹ پرائیرٹی دیتے ہیں۔ تمہیں تو ہمارا احسان ماننا چاہئے کہ ہم تمہیں خبروں میں مرنے نہیں دیتے۔“

”چاہے زندگی موت جیسی کر دو؟ آخر میں نے دنیا کا بگاڑا کیا ہے، تم لوگ مجھے جینے کیوں نہیں دیتے ہو؟...... سلامہ! تمہیں اب تک نہیں پتہ چلا میرا کردار کیسا ہے؟“

سلامہ طنز سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ”تم صرف مجھ سے یہ کیوں گلہ کرتے ہو کہ میں تمہیں نہیں سمجھا؟ تمہیں تو تمہارے اپنے گھر والے نہیں سمجھے۔ سنو، یہ خبر میری سورس کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ تمہارے اپنے گھر سے ڈکٹیٹ کروائی گئی خبر ہے۔“

"میرے اپنے گھر سے؟......کون ہے وہ؟"
"تم بہت اچھے سے جانتے ہو۔" وجاہت گول کر گیا اور شہریار نے سرسرائے لہجے میں کہا۔
"سالار بھائی......کیا سالار بھائی؟"
مگر سلامہ فون بند کر چکا تھا۔ وہ جیسے تیسے گھر پہنچا تھا۔ آج سالار بھائی دفتر نہیں آئے تھے۔ اس کا خیال تھا، وہ گھر میں ہوں گے اور واقعی وہ گھر ہی میں تھے۔
عائشہ بھابی کی تیز آواز کمرے سے باہر آرہی تھی۔
"آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ جانتے ہیں، ہمارا شہریار ایسا نہیں ہے، پھر آپ خبروں کو چٹخارے کیوں دیتے رہتے ہیں؟ جانا نہ کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ، جہاں شہریار کا نام آتا ہے، آپ کو آگ لگ جاتی ہے۔"
"بکواس مت کرو تم......تم نہیں جانتیں، مجھے اس شخص سے کتنی نفرت ہے۔ اتنی نفرت ہے مجھے اس سے کہ میں اسے زندہ دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے، میں اسے گولی سے اڑا دوں، وہ مر جائے۔"
"سالار!......آپ کو پتہ ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ میرا بھائی ہے، میں دن رات اس کی زندگی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتی اور آپ ہیں کہ......"
عائشہ بھابی کے رونے کی آواز پر وہ قدم موڑ گیا۔ نئے سرے سے عائشہ بھابی کو دکھی کرنا وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کا خیال تھا، وہ کچھ وقت مام کے ساتھ گزار کر اس تکلیف سے چھٹکارہ حاصل کر لے گا، مگر ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرتے ہوئے دانیا کی آواز پر وہ رک گیا تھا۔
"آپ صرف اس لئے چاہتی ہیں ناں یہ کہ اس شادی کے لئے شہریار بھائی نے منع کیا تھا۔ مام! آپ آخر ان کی زبان کیوں بولنے لگی ہیں؟ آخر برائی کیا ہے حمزہ عابد میں؟"
"وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ وہ اچھا انسان نہیں ہے۔"
"وہ اچھا انسان نہیں ہے، شیری بھائی نے کہاں ہے ناں یہ؟ مام! میرا دل چاہتا ہے، میں شہریار بھائی سے ایک بار پوچھوں تو وہ آخر ہوتے کون ہیں کسی پر اچھا یا برا ہونے کا ٹیگ لگانے والے؟ کبھی انہوں نے اپنے کردار کی پستی دیکھی ہے؟ آخر انہیں غرور کس بات کا ہے؟ پوری سوسائٹی میں انہوں نے ہماری عزت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔"

شہریار نے دیوار کو بے وقت تھاما تھا۔

"شہریار......!" نانو کی آواز پر وہ چونک کر مڑا تھا۔

"کیا میں واقعی بہت برا ہوں نانو؟" انتہائی بے چارگی سے اس نے پوچھا۔ کتنا عجیب وقت پڑا تھا اس پر کہ وہ اپنے کردار کی برأت کے لئے کسی اور سے گواہی چاہتا تھا۔ وہ خود اپنی ذات پر تشکیک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ نانو نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"ناسمجھ ہیں یہ سب۔ میں خود بھی اس دور سے گزر چکی ہوں، اس لئے کہہ رہی ہوں، جب ان کی آنکھوں سے پٹی اترے گی تو یہ خود تم سے اپنے کیے پر معافی مانگیں گے۔"

"نانو! مجھے یہ حسرت کبھی نہیں رہی کہ کوئی مجھے جج کرنے میں غلطی کرنے پر معافی مانگے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں، مجھے سانس لینے، جینے کی تھوڑی سی آزادی ملے۔ ہر دم وضاحتیں دینے میں میرا وقت جو گزر رہا ہے، اس وقت کو میں محبت کشید کرنے میں گزار سکوں۔"

"آئے گا، وہ وقت ضرور آئے گا۔"

نانو کی تسلی کا سرا تھامے وہ جس طرح چپکے سے آیا تھا، اسی طرح چپکے سے اپنے روم کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ ماما نے عینی کی آمد پر کوئی خاص ردِعمل نہیں دیا تھا اور اس کے لئے خود یہ بات حیرت انگیز تھی۔ نانو کی وہ آنے کے ساتھ ہی لاڈلی کی طرح پیاری بن گئی تھی۔ اس نے یہیں کے بیکن ہاؤس میں داخل کروا دیا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن کو عینی کا سیکنڈ گارجین مقرر کیا تھا۔ عدیل بھائی اس بات پر بھی اس سے خوب جھگڑے تھے، پھر جھگڑ کر تھک گئے تھے تو اسے خود سے بھینچ کر رونے لگے تھے۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود اسے آپریشن کے لئے تیار نہیں کر سکے تھے۔

وہ چپکے سے روم میں آ کر لیٹ گیا تھا اور اسی وقت اس کے سیل پہ بیپ ہوئی تھی۔

"شہریار......" اس نے آلکسی سے جمائی لیتے ہوئے کہا اور دوسری طرف سے جانا نہ کی ٹوٹی بکھری آواز آئی تھی۔

"کیا دو دن پہلے تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا شہریار؟ کیا واقعی تم اتنے کٹھور ہو سکتے ہو کہ بدلہ لینے کے لئے میری محبت کو بھی درمیان میں گھسیٹ لائے تھے؟"

شہریار کرنٹ لگنے کی سی کیفیت سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ "سوری جانانہ! میں کچھ معاملات میں اتنا اُلجھا رہا تھا کہ میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی لیکن کل پکا ہے۔ میں تم سے شائن ڈے میں ضرور ملوں گا۔"

جاناتہ نے کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا اور وہ تکیے پر سر ڈالے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ ایک پُرسکون اور مطمئن نیند...... لیکن کیا واقعی ایسی نیند اُس کی قسمت میں تھی؟



انوشے بہت غیر مطمئن سی بیٹھی تھی۔ بیگم عافیہ نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے بولی تھیں۔
''آخر تمہارے اور عارف کے درمیان کس بات کی دوئی ہے؟''
انوشے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، پھر اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔ ''وہ غلطی عارف کی نہیں ہے مام! غلطی میری ہے۔ میں نے اسے زبردستی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو صرف میری طرف میری دولت کی وجہ سے اٹریکٹ کر گیا تھا۔ اسے لگتا تھا، میں اسے ایک پُرآسائش زندگی دے سکتی ہوں۔ شاید اس سوچ میں ہی وہ ہمنا رہتا تو بھی ساری عمر مجھے محبت کا دھوکا دیتا رہتا اور میں خوش رہتی۔ لیکن بس اچانک اس کی زندگی میں حادثاتی طور پر شافعہ آئی تو اسے لگا، دولت اہم سہی مگر محبت کے اندر قدرت نے ایک خاص کشش رکھی ہے۔ وہ میری طرف سے مڑ گیا تھا۔ جب انکل نے اسے دباؤ میں لے کر کہا کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے اور دولت حاصل کرنے کے حصول میں کامیاب ہو گیا تو شافعہ سے وہ خود اس کی خفیہ شادی کروا دیں گے۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتا رہے گا۔ آخر کو مرد دو، دو شادیاں کرتے ہی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے میں نے اسے جج کرنے میں غلطی کی اور اس نے شافعہ کو سمجھنے میں بھول کی۔ مام! وہ اور طرح کی لڑکی نکلی۔ اس نے اسے ٹھکرا دیا، تب سے اب تک یہ حالت ہے اس کی کہ وہ رہتا میرے ساتھ ہے، مگر میرے چہرے میں شافعہ کو تلاش کرتا ہے، میرے لمس سے بھاگتا ہے، جیسے میں...... میں اسے قید کرنے والی بری چڑیل ہوں۔''
وہ بیگم عافیہ کے سینے سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ بیگم عافیہ نے اس کے آنسو پونچھے تھے، پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔
''اسے وقت دو۔ ابھی تمہاری شادی کو صرف دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔ آنکھ بند کر کے اس کے حکم پر چلو، جو وہ کہتا ہے، ویسی بن جاؤ۔ کسی کے دل میں جگہ بنانا بہت مشکل ہے انوشے! اور ایسا دل، جہاں پہلے سے کسی کا قیام ہو......'' لمحہ بھر کو رکیں، پھر اسی لہجے میں بولیں۔ ''مجھے دیکھو، میں نے بھی ایسی ہی سخت جانی سے یہ معرکہ لڑا تھا۔ تمہارے بابا کے دل میں ثانیہ تھی مگر میری محبت، خلوص اور پروا نے انہیں ثانیہ کو بھلا دیا۔ وہ شروع شروع میں مجھ میں بھی ثانیہ کو کھوجتے تھے۔ میری آنکھوں میں اس کے رنگ دیکھتے۔ کبھی کبھی مجھے جھڑک بھی دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ دیکھ لینا، ایک دن تم بھی مجھے ثانیہ کی طرح چھوڑ جاؤ گی۔ اس نے بھی شروع میں اپنی عادت ڈالنے کے لئے ایسی ہی محبت لنڈھائی تھی، مگر اب دیکھو، اسے تو شاید میرا نام بھی یاد نہیں ہوگا۔ میں یہ سب سنتی تھی، پی لیتی

تھی کیونکہ جانتی تھی ٹوٹے ہوئے دل سے آہ و بکا کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔ ستار کا ایک تار بھی ڈھیلا ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو، لے میں فرق آ جاتا ہے۔ پھر یہ تو دل تھا، اس میں بجھے اس بات کو ماننے میں کہ وہ محبت کھو چکے ہیں، کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ مگر مجھے یقین تھا، میری پُرحرارت محبت کبھی نہ کبھی آدھے آدھے بٹے ہوئے سلیم کو یکجا ضرور کرے گی۔ محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی انوشے! اور دیکھ لو، میرے اس یقین نے مجھے بے اعتبار ہونے نہیں دیا، سو تمہیں بھی اسی ریاضت کے لئے خود کو تیار کرنا پڑے گا۔ محبت کرنا آسان ہے، مگر محبت پالینا اور اسے نبھانا، یہ مشکل کام ہے، اس لئے تمہیں پہلے اپنے دل میں جھانکنا پڑے گا کہ آیا تمہیں واقعی عارف سے محبت ہے یا یہ صرف تمہارے دل کا دھوکا تھا؟ اگر دل اس محبت کو مان لے تو پھر انگاروں تک پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ محبت یونہی ملتی ہے، آگ کا دریا ہے یہ، اسے پار کرنا محبت خود سکھاتی ہے، اگر وہ تمہارے دل کو اس کے قابل سمجھتی ہے!“



جازی عبدالرحمٰن عموماً پرائیویٹ پارٹیز میں جانے سے کتراتا۔ کالج جانے تک کے لئے اس کے پاس فرصت کا وقت کم بچتا تھا۔ اس کے فرینڈ کہتے، تجھے اتنی جلدی بزنس میں گھسنے کی کیا ضرورت تھی؟ بزنس ٹائیکون کا بیٹا تھا، مزے کرتا، پڑھتا یا نہ پڑھتا، تب بھی چل جاتا مگر وہ ان باتوں کو اہمیت دیئے بغیر اپنی ذمے داریوں میں جتا ہوا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن نے نامحسوس طور پر واقعی اسے اپنی زندگی خود جینے کی عادت چھڑا دی تھی، اب وہ کام کے بغیر بور ہو جاتا تھا۔ بس غنیمت تھا کہ بزنس اور تعلیم ایک ساتھ چل رہے تھے، لیکن اس سب کے باوجود پرائیویٹ پارٹیز...... وہ ایسے دعوت نامے ڈسٹ بن کی نذر کر دیتا تھا، لیکن اس بار یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا کیونکہ یہ دعوت نامہ اس کے سب سے کلوز فرینڈ ندیم کی طرف سے تھا۔ وہ اسلام آباد سے ایک ہفتے کے قیام کے سلسلے میں آیا تھا اور اس ایک ہفتے کے لئے اس نے ایک بنگلہ رینٹ پر لے لیا تھا۔ یہ بنگلہ عموماً اسی قسم کی سرگرمیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لئے کسی بھی معاملے پر اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔

’جاؤں یا نہ جاؤں؟‘ وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا کہ یکدم اس نے فیصلہ کر لیا، اُسے جانا چاہئے۔ آخر کو موج مستی کرنے کا اس کا بھی کوئی حق ہے۔ شہریار بھائی مزے کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟

وہ کمرے سے نکلا تھا۔ اس وقت شہریار، انیلہ کی ٹیبل کے پاس کھڑا ہوا اپنے نام آنے والی ڈاک میں سے ایک خط کے متن پر ڈکٹیشن دے رہا تھا۔

’یہ کام کمرے میں نہیں ہو سکتا تھا؟‘ اس نے چڑ کر سوچا، پھر تنفر سے بولا۔ ”اگر یہ کام اپنے روم میں کر لیا جائے تو دفتر کی باقی لڑکیوں کو دیکھ کر آنکھوں کو جو سیرابی ملتی ہے، وہ کہاں سے ملے گی؟“

شہریار نے اس کا انداز دیکھا تھا اور مسکرا کر پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ کیا تھا۔ دراصل وہ دفتر سے انوشے کی فون کال سن کر نکل رہا تھا، جب اچانک اس خط پر نظر پڑی۔ کچھ پرانے حسابات کلیئر ہونے کی بابت اطلاع تھی جو خود شہریار کی معلومات کے مطابق قطعی بے بنیاد کلیئرنس تھی۔ ان کے اکاؤنٹ میں یہ رقم جمع ہی نہیں کروائی گئی تھی، اس لئے وہ خط کا جواب فوراً سے پیشتر فیکس کروانے کے لئے جواب ڈکٹیٹ کروا رہا تھا۔

جازی نگاہ غلط ڈال کر آگے بڑھ گیا تھا، پھر شام آٹھ بجے وہ تیار ہو کر باہر نکل رہا تھا، جب اچانک عینی نے کہا تھا۔

''واؤ...... چاچو......! آپ آج تو بڑے پیارے لگ رہے ہیں۔''

جازی نے ہونٹ سکوڑ کر اسے دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ دو مہینوں سے وہ اس کی اس طرح کی ہر خیر سگالی تحریک کو اپنے آپ موت کے گھاٹ اتارے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی عینی کے لئے نرم گوشہ پیدا ہونے بھی لگتا تو وہ خود سے کہتا، یہ شہریار بھائی کی بیٹی ہے، اس لئے ان کی طرح تکلیف کے سوائے اس لڑکی سے کچھ نہیں مل سکتا۔ یا شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ جس طرح شہریار عبدالرحمٰن نے اس گھر کے سکون کو غارت کیا ہے، وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ بھی ان کی بیٹی سے ایسی ہی بے مروتی برتے۔ عینی ٹھٹھک کر رک گئی تھی مگر یہ حالت بہت دیر تک نہیں رہی تھی، کیونکہ رابعہ بھابی نے اسے لائبہ کے ساتھ باہر لے جانے کے لئے آواز دے ڈالی تھی۔ جازی عبدالرحمٰن بائیک نکال کر باہر نکلتا چلا گیا۔

پرائیویٹ پارٹی کیسی ہوتی ہے، آج پہلی بار اُسے اس کا تجربہ ہوا تھا۔

''تم اپنی پارٹنر نہیں لائے؟'' ندیم نے خمار آلود لہجے میں کہا اور وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

''میں نے آج تک نیٹ چیٹنگ سے زیادہ دوستی آگے بڑھائی ہی نہیں۔''

''کراچی میں رہ کر اتنے پاک باز ہو تم؟'' ندیم ہنسا، پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے کسی کو بلایا۔ جازی نے صرف پہلی نظر ڈالی تھی، دوسری نظر ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اس لئے اس کا پورا چہرہ بلش کر گیا تھا۔

ندیم اُس کی فیلنگ سے بے پرواہ سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ کر بولا۔

''یہ میرا خاص مہمان ہے ببب! اسے تم نے کمپنی دینی ہے ورنہ میں سمجھوں گا تمہیں مجھ سے قطعی محبت نہیں ہے۔''

محبت.......یہ کیسی محبت ہے؟ اُس نے اپنے گھر میں ایک صاف ستھری محبت دیکھی تھی۔ ایسی محبت کہاں برتی تھی اس نے۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے کرنٹ لگنے کی کیفیت میں اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا مگر آخر کب تک شوریدہ سمندر کے آگے رُکتا۔ ایک سیکنڈ میں بہہ گیا تھا اور ڈرنک نے اس کا دماغ اُڑا دیا تھا۔ وہ دو پیگ ہی میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

''یہ تو بہت ہی بودا ہے ندیم!'' لڑکی نے مایوسی سے کہا اور ندیم ہنسا۔ ''تمہارے کافر حسن کے آگے ہم جیسے گھاگ پانی بھرتے ہیں، یہ تو پھر اس کا پہلا موقع تھا، لیکن جلد ٹرینڈ ہو جائے گا۔''

''تم اسے اپنی طرح کیوں بنانا چاہتے ہو؟'' لڑکی کی ادا آمیز آواز گونجی۔

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ہاہاہا......اپنے جیسا کروں گا تو اپنی عیاشی کے لئے اس کا پیسہ اڑا سکوں گا ناں۔ ایڈیکٹ کسی بھی طرح کا ہو، قابلِ رحم تو ہوتا ہے، مگر بہت آسان شکار ثابت ہوتا ہے۔''

لڑکی ہنسنے لگی تھی اور وقت اس سے زیادہ تیز ہنس رہا تھا۔



''خیریت انوشے؟'' شہریار داخل ہوا اور گیٹ پر ہی سوال پوچھنے لگا تھا۔

انوشے اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گئی تھی، پھر سب کچھ کہہ چکی تو بولی۔

''میں اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی شیری! امام کے کہنے پر میں جتنا عمل کرتی ہوں، وہ اتنا ہی مجھ سے مس بی ہیو کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، چلی جاؤ تم میری زندگی سے نکل جاؤ، مجھے اکیلا کر دو، مجھے شافی نہیں ملی تو میں بھی زندہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔''

''تمہیں معلوم ہے شافی کیسی ہے؟'' شہریار کی سماعت آنکھیں بن کر انوشے کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ وہ جانتا تھا، شافعہ کیسی ہے لیکن انوشے سے سننا چاہتا تھا اور وہ تھی کہ شہریار کے جذبات سے پرے کہہ رہی تھی۔

''اسے دیکھو تو نہیں لگتا کوئی دل اس کے لئے دھڑک سکتا ہے۔ مگر عارف پورا کا پورا اس کے نام پر دل بن کر دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں ایسی نہیں ہیں کہ کوئی ان پر غزل لکھے مگر عارف نے چپکے سے

''یہ میرا خاص مہمان ہے بب! اسے تم نے کمپنی دینی ہے ورنہ میں سمجھوں گا تمہیں مجھ سے قطعی محبت نہیں ہے۔''
محبت...... یہ کیسی محبت ہے؟ اس نے اپنے گھر میں ایک صاف ستھری محبت دیکھی تھی۔ ایسی محبت کہاں برتی تھی اس نے۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے کرنٹ لگنے کی کیفیت میں اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا مگر آخر کب تک شوریدہ سمندر کے آگے رُکتا۔ ایک سیکنڈ میں بہہ گیا تھا اور ڈرنک نے اس کا دماغ اُڑا دیا تھا۔ وہ دو پیگ ہی میں بے ہوش ہو چکا تھا۔
''یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے ندیم!'' لڑکی نے مایوسی سے کہا اور ندیم ہنسا۔ ''تمہارے کافر حسن کے آگے ہم جیسے گھاگ پانی بھرتے ہیں، یہ تو پھر اس کا پہلا موقع تھا، لیکن جلد ٹرینڈ ہو جائے گا۔''
''تم اسے اپنی طرح کیوں بنانا چاہتے ہو؟'' لڑکی کی ادا آمیز آواز گونجی۔
وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ہاہا ہا...... اپنے جیسا کروں گا تو اپنی عیاشی کے لئے اس کا پیسہ اڑا سکوں گا ناں۔ ایڈیکٹ کسی بھی طرح کا ہو، قابلِ رحم تو ہوتا ہے، مگر بہت آسان شکار ثابت ہوتا ہے۔''
لڑکی ہنسنے لگی تھی اور وقت اس سے زیادہ تیز ہنس رہا تھا۔



''خیریت انوشے؟'' شہریار داخل ہوا اور گیٹ پر ہی سوال پوچھنے لگا تھا۔
انوشہ اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گئی تھی، پھر سب کچھ کہہ چکی تو بولی۔
''میں اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتی شیری! امام کے کہنے پر میں جتنا عمل کرتی ہوں، وہ اتنا ہی مجھ سے مس بی ہیو کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، چلی جاؤ تم میری زندگی سے نکل جاؤ، مجھے اکیلا کر دو، مجھے شافی نہیں ملی تو میں بھی زندہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔''
''تمہیں معلوم ہے شافی کیسی ہے؟'' شہریار کی سماعت آنکھیں بن کر انوشے کے چہرے پر آ کر رک گئیں۔ وہ جانتا تھا، شافعہ کیسی ہے لیکن انوشے سے سننا چاہتا تھا اور وہ تھی کہ شہریار کے جذبات سے پرے کہہ رہی تھی۔
''اسے دیکھو تو نہیں لگتا کوئی دل اس کے لئے دھڑک سکتا ہے۔ مگر عارف پورا کا پورا اس کے نام پر دل بن کر دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں ایسی نہیں ہیں کہ کوئی ان پر غزل لکھے مگر عارف نے چپکے سے

ان آنکھوں کے نام اپنی ساری عمر لکھ دی ہے، وہ ایسی نہیں ہے کہ کسی کی آنکھ میں خواب بن کر چمکنے لگے مگر عارف کے لئے وہ خواب کا سب سے قیمتی گھر ہے، وہ اس گھر میں رہتا ہے، جیتا ہے اور اس نے گھر سے مجھے باہر نکال دیا ہے۔ شیری! تمہیں معلوم ہے، شافی کیسی ہے؟

شہریار نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اسی خواب کے گھر میں رہتا تھا، سانس لیتا تھا۔ اُسے دیکھ کر جی اُٹھتا تھا اور اُس کی بے توجہی سے چپکے چپکے مرجاتا تھا۔

"تم میرے لئے کچھ کرسکتے ہو شہریار؟"

شہریار عبدالرحمٰن نے انوشے علی کی طرف دیکھا اور بے بسی سے ہنسا۔ "محبت جب آپ کو باندھ لیتی ہے تو پھر ہر راستے پر بیٹی کھڑی ہوتی ہے۔ آپ اس سے دامن بچا ہی نہیں سکتے۔ یہ چپکے سے کہتی ہے، تم آزاد ہو، سب کچھ کرسکتے ہو، مگر قدم اُٹھنے کی ہوک بھریں تو مسکرا کر ایری سے کہتی ہے، کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر جاسکتے ہو؟ جو دل صرف محبت کرنا جانتے ہوں، وہ محبت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ محبت مسافت ہے اور لوگ اس میں کھو کر منزل کی تمنا میں جل مرتے ہیں۔ محبت خاک ہے، مگر لوگ خواہ مخواہ اس میں مبتلا ہو کر اپنے وجود پر اتراتے ہیں۔" "عارف کا زیادہ تر وقت کہاں گزرتا ہے؟"

"وہ اکثر ہوٹل مینجمنٹ میں مصروف رہتے ہیں اور اکثر شام گئے کلب چلے جاتے ہیں۔ کبھی ہر طرح کا شوق تھا انہیں، لیکن اب اکثر وقت وہ کافی اور اسموکنگ میں وقت گزارتے گزارتے بہت رات کو گھر لوٹتے ہیں۔ بہت چڑچڑے ہوگئے ہیں، اکثر چپ رہتے ہیں۔ میں بات کرنے پر اکساتی ہوں تو وہ ایسی بات کرتے ہیں کہ میری آواز سنائے میں گم ہوجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، کوئی مجھ سے بات کرے تو صرف شافی کی بات کرے، ورنہ خاموشی بہت بہترین رفیق ہے ان کی۔"

شہریار نے سر ہلایا، پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

"آپ جانا نہیں، میں کھانا لگوا رہی ہوں۔"

"پلیز انوشے! تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تکلف کی کیا بات ہے شیری! بہنوں کے گھر کھانا کھانا کچھ اتنا بھی معیوب نہیں۔"

"تاریخ تو کچھ اور کہتی ہے سس!" وہ مسکرایا مگر انوشے نے ایک نہ سنی۔ پھر کھانے کے بعد کافی پی کر اُٹھتے اُٹھتے بھی ایک بج گیا تھا آج انوشے سے اس نے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ مومنہ کے شوہر رفیق

الزماں کے متعلق بھی تفصیل سے بات کی تھی۔ پھر سلام دعا کے بعد اٹھا تو گھر کے لئے ہی نکلا تھا مگر گھر کے راستے میں جازی کی گاڑی پر نظر پڑی تو حیران رہ گیا۔ رسٹ واچ پر نظر ڈالی، ڈیڑھ بج رہا تھا۔ جازی عبدالرحمن اتنی رات گئے باہر تو نہیں رہتا تھا۔ پھر اس نے گاڑی جازی کی گاڑی کا تعاقب کرنے میں لگادی۔ پھر وہ جان سکا۔ گاڑی جازی نہیں چلا رہا تھا۔ اس نے کار اوورٹیک کی اور جازی کی گاڑی سامنے ترچھی کھڑی کردی۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی نے بہت زور سے جمپ لی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے سر......؟" ایک لڑکا باہر نکلا۔

دوسرے نے مدھم لہجے میں کہا۔ "یہ جازی کے بھائی ہیں، ڈفر!"

پہلے لڑکے کا لہجہ بدل گیا۔ "سر! وہ، ہم ایک پارٹی سے آرہے تھے۔"

شہریار تو لنے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جازی کی آنکھیں بند تھیں۔

شہریار نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا ہکلانے لگا۔

"یہ اوورڈرنک کی وجہ سے غنودگی میں ہے سر!......ویسے سب ٹھیک ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ؟" شہریار نے تیزی سے دروازہ کھولا تھا۔

"جازی!......جازی!" بہت بے قراری سے جھنجھوڑا تھا، نبض دیکھی تھی۔ پھر یکدم اس کے اعصاب اعتدال پر آتے چلے گئے۔ جازی کو کھینچ کھانچ کر اس نے اپنی گاڑی میں بٹھا کر سیٹ بیلٹ باندھ دیا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔

"تم لوگ گھر کیسے جاؤ گے؟"

"ہمارے دوست ہمیں مین روڈ سے پک کرنے والے ہیں سر!"

اُس نے سر ہلایا۔ وہ دونوں لڑکے قدم موڑ گئے اور شہریار، واچ مین کو فون کر کے جازی کی گاڑی کے متعلق حکم دے کر واپس آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر واچ مین کے ہاتھ میں کار کی چابی دے کر وہ

گھر کے لئے گاڑی آگے بڑھا سکا تھا۔ مین گیٹ کے بجائے اس نے آؤٹ ہاؤس کے دروازے سے جازی کو عینی والے کمرے میں پہنچانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ عدیل بھائی کی وجہ سے عینی اب لائبہ کے ساتھ رُوم شیئر کرتی تھی، اس لئے اس کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ کوئی سوال نہیں پوچھے گی۔ جازی کو لٹانے سے پہلے وہ اس کے جوتے، کوٹ اور ٹائی اتارنا نہیں بھولا تھا۔ حالانکہ اتنی محنت پر وہ کافی تھک گیا تھا۔ مگر بستر پر لیٹا تو یہ سوال بھی بھول گیا تھا کہ وہ تھک گیا ہے۔ نیند جانے کب آئی تھی۔



شافعہ پورے ایک ماہ بعد آج ثانیہ کے فلیٹ آئی تھی۔ زرش نے عارضی طور پر رکھی ہوئی ملازمہ کو پورے مہینے کی تنخواہ دے کر برخاست کردیا تھا اور ثانیہ بھی اسے دیکھ کر نہال ہوگئی تھی۔

تم لڑکی!...... تم نے تو میری جان نکال دی تھی۔ زرش حالانکہ روزانہ کی پروگریس لیا کرتی تھی تمہاری، مگر مجھے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ تمہیں دیکھنا نہیں سکتی تھی۔ میری مجبوری سے تو تم واقف ہو ناں؟"

شافعہ نے مسکرا کر اس کا عذر مان لیا تھا۔ پھر وہ اس کے کمرے کی صفائی کررہی تھی، جب اچانک سائیڈ ٹیبل پر اوندھی رکھی تصویر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ ثانیہ کچھ بھی نہیں کہہ پائی تھی کہ شافعہ تصویر دیکھ کر حیران کھڑی رہ گئی۔

"یہ...... یہ مسٹر شہریار آپ کے ساتھ؟"

شافعہ کی کوروں نے پرانی نمی کا نئی طرح سے ذائقہ لیا، پھر بہت خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں، یہ میں اور شہریار ہیں۔ ہم کسی زمانے میں بہت اچھے دوست تھے۔ شاید وہ مجھے کبھی اپنی زندگی میں کوئی مقام نہ دے پائے، مگر میرے لئے وہ زندگی میں زندہ رہنے کا سب سے خوب صورت احساس ہے۔"

شافعہ کی آنکھوں میں ایک نامحسوس احساس لپکا تھا۔ یہ خفگی تھی یا شہریار کی شخصیت کے کاتھلے ہونے پر افسوس، کچھ واضح نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ ثانیہ کچھ پوچھ پاتی، شافعہ نے بہت اچانک سوال کیا۔

"میم! آپ کا دل چاہتا ہے، آپ علی صاحب سے پھر کبھی ملیں؟"

ثانیہ کی آنکھوں میں حسرت نے آنکھ کھولی۔ وہ شافعہ کو دیکھنے لگی، پھر سانس سے ایک سسکی اُبھری۔ "کاش، ایسا ہوسکتا۔ کاش ایسا ہوسکتا۔ شافی! میرا ابھی دل چاہتا ہے، میں زندگی کی شام میں کبھی علی کو ایک بار دیکھ پاؤں۔ وہ بھلے مجھ سے ایک لفظ نہ چاہے، چاہے تو دنیا کے سارے خفا لفظ ایک ساتھ مجھ پر بوجھ کی طرح لاد دے۔ مگر وہ ایک بار پھر سے مجھے کبھی دکھائی دے۔ قریب نہ ہو تو ایسا تو ہو کہ میں اسے دور

سے ہی دیکھ سکوں۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ اور پتہ نہیں شافی! یہ مرنے سے پہلے دل میں ناممکنات سی باتیں کیوں سر اٹھاتی ہیں؟ لگتا ہے، دل کو...... یوں لگتا ہے دل کو، جیسے موت کی آسانی میں ساری مشکلیں ایک سبک روندی کے پانی کی طرح بہہ جائیں گی، مگر زندگی کا لطف اور خود زندگی ڈوب مرتی ہے، مگر دل کی حسرتیں...... وہ دل کے اندر ہی کہیں چکراتی پھرتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، دھڑکنے والا دل بند ہو گیا تو حسرتیں، محبت کی چاہ، محبوب کو دیکھنے کی تڑپ سب مر گئی، مگر کوئی بند دل میں جا کر چپکے سے کان لگائے تو جان لے کہ مرنے کے بعد بھی دل مردہ، ڈار سے بچھڑی کونج کی طرح ابھی تک پھڑ پھڑا رہا ہے۔ اپنے محبوب کے گرد گھیرے ڈال کر گردش کر رہا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ کیونکہ موت دائی اسرار بھری چپ کا نام ہے۔"

شافعہ نے ثانیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دل میں عہد کیا، وہ علی کو ثانیہ کے لئے ایک بار ضرور لے کر آئے گی۔ وہ اب اس کے لئے کپڑے نکال رہی تھی۔ ثانیہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، پھر نرمی سے بولی۔

"وہ جو ایک دکھ تھا، اسے تم نے مار دیا یا گلے کا ہار بنا لیا؟"

شافعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔

"ہمیں جب کوئی دکھ ملتا ہے میم! تو ہم سمجھتے ہیں، جو دکھ ہمیں ملا ہے، وہ دنیا کا سب سے بڑا آزار ہے۔ اس رب کو ہم سے محبت نہیں ہے، جبھی دل میں رہ کر دل کو تکلیف سے آشنا کیا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب اس کے بدلے کوئی اور خوشی ہماری زندگی کا راستہ مڑتی ہے تو ہمیں اپنے رب کی مہربانی پہ پیار آ جاتا ہے۔"

"آں، ہاں...... یعنی کوئی گڈ نیوز؟" ثانیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں اور شافعہ نے ہنس کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں میم! میری زندگی نے محبت کو پھر سے چھوا ہے۔ بس اس کے اظہار کے لئے موقع اور لفظ موزوں نہیں، مگر ایک ان کہی سی جو دل میں ہے، وہ ہم دونوں جانتے ہیں بہت اچھی طرح سے۔"

"کب ملوا رہی ہو اس سے؟" ثانیہ نے اس کے ہاتھوں کو محبت سے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا اور وہ مسکرانے لگی۔

"بہت جلد میم! میں آپ کو بہت جلد ملواؤں گی ان سے۔"



آج وہ بے وقت عارف کو میل کرتا کلب تک آیا تھا۔ اس وقت اس کی گھڑی نو بجا رہی تھی۔ دفتر سے نکلتے وقت بھی سالار بھائی نے کسی اور پر رکھ کر اسے بہت اچھے سے ڈانٹ دیا تھا، مگر اب وہ کوشش کرتا تھا

شہریار خاموشی سے سنتا رہا۔
پھر وہ اکثر ملنے لگے۔ یہاں تک کہ تین ماہ بعد وہ اس سے کہہ رہا تھا۔
"زندگی رک جانے کا نام نہیں۔ بے وفائی تم نے نہیں کی، بے وفائی اس نے نہیں کی تو بس سمجھو تم اس کے لئے بنے ہی نہیں تھے۔ محبت اپنے لئے جگہ خود بناتی ہے، دل خود منتخب کرتی ہے۔ اور پھر جتنا اہل سمجھتی ہے، اتنی محبت، اتنا جینے کا اجر دے دیتی ہے۔ اس اجر کو آگے پھیلاؤ، پتھر اور انسان میں کچھ تو فرق رکھو۔" رکا، پھر ہولے سے ٹھہر کر بولا۔ "تم میتھس میں ماسٹرز ہو، تمہیں معلوم ہوگا، مائنس مائنس ہمیشہ پلس ہو جاتا ہے۔ وہ کمزور لوگ کبھی کبھی بہت مضبوط گھر بنا ہی لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کمزوریوں سے خود آگاہ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بدل دینے اور بدل جانے کی ہمک انہیں ہمیشہ نئے راستوں پر چلنے پر اکساتی رہتی ہے اور نئے راستے ہمیشہ نئی منزلیں کھوجتے ہیں۔ ایسی منزلیں جو دوسروں کے لئے بھی آگہی کا نیا در ثابت ہوتی ہیں۔ جبران کہتا ہے، "محبت صنوبر کی شاخ کی مانند ہوتی ہے، درخت سے ایک شاخ الگ کر دی جائے تو درخت کچھ عرصے کے لئے ملول اور دکھی ہوتا ہے۔ مگر نئی بہار کے ساتھ اسی جگہ ایک نئی کونپل پھوٹتی ہے اور ایک دن درخت کو چھتنار کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر سایہ بن جاتی ہے۔ جو شاخ ٹوٹی، یہ وہ شاخ نہیں ہوتی مگر درخت اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اس نئے عہد وفا میں ایسا جکڑ جاتا ہے کہ پھر پرانی محبت کی کسک بہت دھیمی رہ جاتی ہے، بہت ہی دھیمی۔ عارف! محبت ایک برقی لہر کی طرح ہے، جس کا رابطہ دل اور روح سے مرتے دم تک ختم نہیں ہوتا۔ ہم بس سمجھنے لگتے ہیں، ہمارے اندر زندگی کا، محبت کا کوئی خواب مر گیا ہے تو دل بھی مر گیا ہے لیکن دل ہر نئے خواب، ہر خوش کن خواب پر یکبارگی ایک لمحے کے لئے سانس ضرور بھرتا ہے۔ کبھی ہم یہ آواز رد کر دیتے ہیں، کبھی سن کر بھی اس سمت نہیں چلنا چاہتے اور محبت...... محبت اپنی سمت خود طے کرتی ہے، منزل خود تجویز کرتی ہے۔ تمہیں بھی اپنا آپ محبت کے ہاتھ میں چکنی مٹی کی طرح دے دینا چاہئے۔ وہ جیسے چاہے، تمہارے نقش ابھارے، بنائے، بگاڑے، کچھ بھی ہو، پھر بھی خود محبت کرتے رہنے کا یہ ہنر کم تر نہیں۔ اپنے اندر جھانکو، انوشے کی آنکھوں میں جھانکو، کیا وہاں تمہیں تم سے محبت کم دکھائی دیتی ہے؟ کیا وہ لڑکی محبت دیئے جانے کے قابل نہیں؟"
عارف اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس کے لب ہلے۔

"تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے، کیوں عمر گنوا دی ہم نے

شہریار بے چارگی سے ہنسا۔ ”میں جانتا ہوں، وہ آنکھیں ایسی ہیں کہ کسی کا بھی دل قید کرسکتی ہیں مگران آنکھوں کے آگے ان آنکھوں کو بھی روک کر چھوڑ دو جن کے لئے تمہارے آگے کچھ ہے، نہ تمہارے بعد کچھ ہے۔ محبت کرنا دل کے لئے سزا مت کرو عارف! یوں بھی بہت کم دل یہ ریاضت کرپاتے ہیں اور جو اس جذبے کو نبھانے کی تمنا رکھتے ہیں، انہیں ستانا اچھی بات نہیں۔ جو دل خود دکھی ہوں، وہ دوسروں کے دکھ کو بہتر سمجھ سکتے ہیں، بلکہ زیادہ بہتر دل رکھنا جانتے ہیں۔“

عارف نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی، پھر آہستگی سے سر ہلایا۔ ”تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ محبت بہتی آب جو کی طرح ہے۔ یہ بھلے آپ کو پیاسا رکھے مگر اس آب جو سے پیاسے دلوں کو سیراب کرنے کا ہنر کبھی کھونا نہیں چاہئے۔“

عارف نے سگریٹ کیس، لائٹر اُٹھایا، کار کی چابی لی اور شہریار کی طرف دیکھ کر بولا۔

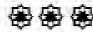
”جس طرح تم نے اتنے دنوں تک محبت سے میرا تعارف مٹنے نہیں دیا، یہ ہنر ہر ایک کے بس کا نہیں۔ شہریار! کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے دل نے اس مدھ کو چکھ رکھا ہے؟“

شہریار مسکرانے لگا۔ یکدم اُس کی بینائی میں شافعہ کا چہرہ مسکرانے لگا اور اس کے ہونٹوں نے عارف کا لہجہ چرایا۔

”تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے، کیوں عمر گنوا دی ہم نے“

عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک ان کہی سی مسکراہٹ کوندی اور وہ ہوٹل سے نکلتا چلا گیا۔

خالی میز پر بھاپ اُڑاتا کافی کا کپ دھرا تھا یا شہریار عبدالرحمٰن بیٹھا تھا۔ بالکل اکیلا، تنہا، یا وہ ساحر آنکھیں تھیں جو محبت کا رنگ اوڑھ لیتی ہیں تو پھر عمر گنوانے کا احساس بھی کہیں مدھم پڑ جاتا ہے۔ شہریار نے بل پے کیا تھا اور ہوٹل سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔



نائمہ نے اخبار اُٹھایا تھا اور اندرونی صفحات پر لگی پہلی خبر پر ہی اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ ”وی ایچ“ نام پڑھ کر اس کا منہ کڑوا ہو گیا تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے عبایا پہنا تھا اور حجاب لگا کر وہ فلیٹ کا دروازہ بند

کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔پھر وہ بہت متوازن قدم رکھتی ہوئی "دی ایج" کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"ہیلو میم! آپ کو کس سے ملنا ہے؟" یکدم آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

"مجھے چیف ایڈیٹر مسٹر سلامہ ارسلان سے ملنا ہے سر!" شائستہ لہجہ۔

سامنے والا متاثر کن انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"میم! ویسے تو سر سلامہ کسی سے ملتے نہیں ہیں، لیکن آپ جیسی آنریبل لیڈیز کے لئے انہیں وقت نکالنے میں کچھ وقت لگے گا۔دراصل اس وقت وہ میٹنگ میں ہیں۔آپ پلیز، ویٹنگ روم میں ان کا انتظار کیجئے۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔پھر آدھے گھنٹے بعد کہیں وہ سلامہ ارسلان کے سامنے پیش ہو سکی تھی۔اتنے سالوں بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر دل یک بارگی بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔دل نے ہمک بھری تھی، بھاگ کر اس کی ناراضگی کی پروا کئے بغیر اس کے سینے سے لگ جائے۔اپنی غلطی پر سو سو دفعہ معافی مانگے۔اسے کہے، وہ اتنا وسیع ظرف رکھتا ہے کہ اس کی غلطی کو چاہے تو معاف کر سکتا ہے۔اس سے پوچھے کہ زندگی میں کسی تنہائی کے گوشے میں بیٹھ کر اسے کبھی اپنی یہ فیورٹ سسٹر یاد آئی؟ کبھی اس کی یاد سے اس کی آنکھیں بھیگیں کہ اس کی آنکھیں تو ان سب کے لئے سمندروں روئی تھیں۔

"جی فرمائیے میم! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" وہی کھنک دار لہجہ...... اس کی فرینڈز اس کے بھائی کی آواز پر کتنا مرتی تھیں۔

"آپ نے آج کے "دی ایج" کا تھرڈ پیج پڑھا ہے؟"

سلامہ ہنس پڑا، پھر یکدم سنجیدگی سے بولا۔"کیا آپ میرے ساتھ کوئی جوک کرنے آئی ہیں میم؟"

"جس کے ساتھ زندگی نے جوک کیا ہو، کیا وہ ایسی ہمت کر سکتی ہے؟"

"اوہ...... سوری میم! اگر آپ کو میری بات بری لگی ہو۔لیکن آپ خود دیکھئے ناں، میں چیف ایڈیٹر ہوں، میری مرضی کے بغیر کوئی خبر اخبار کی زینت نہیں بن سکتی، پھر آپ کا سوال...... سو مجھے خوامخواہ ہنسی آ گئی۔ویسے آپ کا اشارہ کس خبر کی طرف تھا؟"

نائمہ ارسلان نے اخبار سامنے رکھا اور دو مختلف خبروں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ خبریں شہریار کے متعلق تھیں، جن میں سے ایک خبر اس کے فلیٹ کی رنگینی سے متعلق تھی اور دوسری خبر عینی کے متعلق تھی کہ آخر شہریار کا اس بچی سے کیا تعلق ہے؟ کیا واقعی وہ مسٹر عبدالرحمٰن فیملی کا سب سے مانجا ربیٹا ہے جس کی وجہ سے ان کا پورا خاندان ہر وقت اپ سیٹ ڈاؤن کا شکار رہتا ہے؟

''آپ مسٹر شہریار کو کتنا جانتے ہیں سر؟''

سلامہ ارسلان نے چونک کر دیکھا۔ ''میرے خیال میں میرے لئے مسٹر شہریار ایک خبر کی سنگینی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے میم! لیکن آپ؟''

''کیا واقعی آپ مسٹر شہریار کو اتنا ہی جانتے ہیں؟ کیا یونیورسٹی، کالج کی ساری یادیں آپ کے دل سے محو ہو گئیں؟ کیا آپ یہ بھی بھول گئے کہ ایک وقت تھا، آپ خود ان کے کردار کی سو سو قسمیں کھایا کرتے تھے، کوئی ان کے خلاف کچھ کہتا تھا تو آپ اس سے لڑ جاتے تھے، آپ کہتے تھے اگر شہریار جیسا شخص بھی برا ہو سکتا ہے تو دنیا میں کوئی انسان اچھا نہیں ہے۔''

سلامہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''آپ...... آپ کون ہیں میم؟'' اس نے سامنے رکھے آرٹیکل کو روک دیا تھا۔

اور اس نے گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ ''میں وہی ہوں، جس کی عزت کے لئے شہریار بھائی نے آپ سے کہیں زیادہ خاک چھانی تھی۔ میں وہ ہوں، جسے بازیاب کروانے کے شہرہ میں آپ نے اس عظیم شخص کی پیٹھ نہیں تھپتھپائی بلکہ اس کے کردار کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں کہ اب وہ پسند و ناپسند میں اتنا حریص ہو گیا ہے کہ دوسروں کی پسند ہتھیانے کے لئے لڑکیاں تک اغواء کر لیتا ہے۔ آپ نے اس معاملے میں زوار حسن کا ساتھ دیا اور اسے چھوڑ دیا، جسے آپ بچپن سے جانتے تھے، جس پر آنکھ بند کر کے یقین کرتے تھے۔ میں وہ ہوں، جسے شہریار بھائی نے ظلم سے نجات دے کر اپنے فلیٹ میں عزت سے رہنے کی عنایت بخشی۔ مگر آپ نے ان کے اخلاق کی اس شائستگی کو بھی چند روپوں کے لئے کیچڑ میں لت پت کر دیا، مگر جو نیکی سب سے بڑے گناہ کی طرح شہرت پائے، کیا ضروری ہے وہ اجر دینے والا بھی اس میں دو رائے کا شکار ہو؟ آپ جاننا چاہتے ہیں ناں، وہ لڑکی کون ہے؟ وہ فلیٹ کی رنگینیوں کی کیا کہانی ہے تو مجھے دیکھئے، آپ اپنے قلم سے اپنی بہن کی بچی کھچی عزت کو ملیامیٹ کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھیں، شاید آپ کی پہچان کا سفر ابھی رُکا نہیں ہو۔''

اُس نے حجاب اتار دیا اور سلامہ ارسلان اسے بت کی طرح ایسے دیکھنے لگا، جیسے اس سچ نے اس کی جان بند کر لی تھی۔ اس سے ایک لفظ نہیں بولا جا رہا تھا اور وہ جو کہتا تھا، ایسی لڑکیوں کو جو اپنی ادنیٰ سی خواہش کے لئے گھر چھوڑ دیتی ہیں، انہیں گولی سے اُڑا دینا چاہئے بلکہ شاید انہیں گولی بھی مارنے کی ضرورت نہیں، ان کے لئے تو ایک سرد مہر بے نیاز نظر ہی کافی ہے۔ محبت کرنے والوں کے لئے اس

سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ آج سامنے کھڑی تھی مگر وہ بے نیاز نہیں بن پا رہا تھا۔
یکدم اُس کی کوروں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تھا اور وہ پھر سے سسک پڑی تھی۔ "آپ کو پتہ ہے، میں سات سال سے زوار حسن کی حویلی میں کنیز تھی...... ایک کنیز۔ آپ جانتے ہیں ناں اس کا مطلب؟"
سلامہ ارسلان کی گردن جھک گئی تھی اور وہ پھر سے رونکھے لہجے میں بولی تھی۔ "لیکن پھر بھی آپ نے اسی زوار حسن کو وائٹ کالر ثابت کرنے کے لئے شہریار پر الزامات لگائے۔ یہ دیکھئے، یہ رہے آپ کے اور زہرہ پھپھو کے گھر اور فلیٹ کے کاغذات۔ یہ لون سیشن کے لئے پیش ہی نہیں کیے گئے تھے۔ کیونکہ زہرہ پھپھو کے لئے شہریار بھائی نے اپنے دو فلیٹ پراپرٹی میں رکھوائے تھے۔ آپ اب بھی یہی سمجھتے ہیں، شہریار بھائی برے ہیں، ان سو کالڈ امراء میں شامل ہیں، جنہیں صرف اپنی دولت پر ناز کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا، جن کے پاس اپنی شخصیت کا پلس پوائنٹ صرف دولت ہے اور کچھ نہیں۔"
سلامہ ارسلان اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر جیسے کوئی سخت چٹان کے رخنے سے کوئی تیز دھار آبشار رستہ بنا کر بہتا ہے، اس کے اندر سے بھی اسی طرح سے کوئی جذبہ ابھرا تھا۔
"نائمہ......!" بالکل غیر متوقع اُس کی زبان نے نام پکارا تھا اور بہت غیر متوقع اُس کی بانہیں وا ہوئی تھیں اور نائمہ، وہ کفرانِ نعمت کیوں کرتی؟
"بڑے بھیا......!" وہ اس کے سینے سے لگ کر زمین و آسمان ایک کر کے روئی تھی۔ خود اس کی آنکھیں بھی پھر خشک کب رہی تھیں۔
"آئی ایم سوری بھیا! میں آپ کی موسٹ فیورٹ تھی، مگر میں اچھی بہن نہیں بن سکی۔"
اُس نے اُس کے آنسو ٹشو سے صاف کیے تھے، پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔ "اگر تمہاری غلطی تھی تو بری الذمہ تو میں بھی نہیں تھا۔ میں نے کون سی اپنے بھائی ہونے کی ذمہ داری نبھائی؟ صرف شہریار تھا جو ہمیشہ کی طرح ہم سب سے آگے نکل گیا۔ مگر خیر، اب تم سے وعدہ ہے میرا، میری ذات سے شیری کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اُس نے انٹرکام اُٹھایا تھا۔ اپنی ساری میٹنگز کینسل کر دی تھیں، پھر نائمہ کے ساتھ باہر نکلا تھا۔
"ہم گھر جا رہے ہیں، تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"
"گھر کو مجھ پر کوئی اعتراض نہ ہو تو میری خوش نصیبی ہوگی بڑے بھیا! ان سات سالوں میں میرے اندر کی ضد، غصہ، ہٹ دھرمی سب اپنی موت آپ مر گئی ہے۔ پرانی نائمہ مر چکی ہے بھیا!"

”مگر مجھے پرانی نائمہ ہی عزیز ہے۔“ اس نے اس کے ساتھ چلتے چلتے بھرائے لہجے میں کہا اور اس نے حیرت سے دیکھا تو کہا۔

”اتنی بدنامی کے باوجود سلامہ بھائی! مجھے لگتا تھا، آپ مجھے کہیں دیکھ پاتے تو شاید پہلی فرصت میں قتل کر دیتے۔“

سلامہ ارسلان نے ان کے لئے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا، پھر اگنیشن میں چابی گھما کر کار بیک کرتے ہوئے گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مجھے بھی یہی لگتا ہے، ایک وقت تک مجھے تمہارے نام سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے گھر سے تمہاری یاد کی ہر چیز اسٹور روم میں بند کر دی تھی۔ میرا خیال تھا تم زندگی میں کبھی مجھے ملیں تو میں تمہیں دھتکار دوں گا، تمہیں اگنور کر کے گزر جاؤں گا۔ لیکن آج اتنے سال بعد تم میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں تو مجھے لگا، میں سلامہ ارسلان نہیں رہا۔ میں بھائی ہوتا تو شاید اتنی ہی سختی سے رد عمل دیتا، مگر مجھے اس لمحے لگا تھا، اچانک میرے اندر بابا کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ مجھے لگا تھا، اگر میری جگہ بابا ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ میرے سامنے تم نہ ہوتیں، خود میری بیٹی کھڑی ہوتی تو کیا میں پھر بھی اتنی سفاکی، اتنی سختی سے اسے جھٹک سکتا تھا؟ میرے دل نے کہا، میں اگر باپ ہوتا تو شاید اتنا جذباتی ہوتا کہ مجھ سے میری بیٹی کی آنکھ میں آئے آنسو برداشت نہیں ہوتے۔ بس اسی وقت میں نے تمہیں باپ کی نظر سے دیکھا اور تمہیں محبت سے گلے سے لگائے بنا نہیں رہ سکا۔“

”بھیا! آپ...... آپ بہت عظیم انسان ہیں۔“

سلامہ ارسلان کچھ نہیں بولا تھا۔ گاڑی سبک رفتاری سے چکنی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور راستہ بہت واضح ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں کی گرد جو منزل پر جم کر منزل کا احساس تک مٹا چکی تھی، ایک بار پھر سے نمایاں ہو گئی تھی۔



”آخر یہ اسٹرینجر کیا کرنا چاہتا ہے؟“ یوسفی صاحب نے اخبار زور سے پٹخا تھا۔ انہوں نے جو ایک ماہ میں مسٹر حسن ابراہیم کے لئے نئے سرے سے ساکھ بنائی تھی، اس نے منٹوں میں وہ ساکھ برباد کر کے رکھ دی تھی۔ مسٹر حسن ابراہیم ان کے دفتر میں بیٹھے تھے۔

”تمہارا اخبار اور تم ٹوٹلی فیل ہو چکے ہو یوسفی! یہ جو کوئی ہے، تمہیں بہت اچھے سے جانتا ہے، اسے تمہارے ایک ایک قدم، ایک ایک فیصلے کا پہلے سے علم ہے۔ کوئی اندر کا آدمی ہے یوسفی! کوئی تمہارے اندر کا آدمی ہے، جو تمہیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔ آخر کون ہے ایسا، جسے تم نے اپنے اتنے قریب آنے دیا؟“

یوسفی صاحب نے مسٹر حسن ابراہیم کو کچھ پُرسوچ نظروں سے دیکھا، پھر انٹر کام پر انہوں نے اسسٹنٹ سے سلامہ کے متعلق پوچھا۔

"سر! وہ ابھی ابھی دفتر سے نکلے ہیں۔ کوئی خاتون آئی تھیں۔ جی نہیں، ہم میں سے کسی نے بھی ان کی صورت نہیں دیکھی، وہ حجاب میں تھیں...... نہیں سر! وہ بتا کر نہیں گئے، بلکہ آج کی ساری میٹنگز بھی کینسل کر دی ہیں۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا، پھر مسٹر حسن ابراہیم کی طرف دیکھ کر بولے۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، کوئی واقعی میں ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے، لیکن میں بہت جلد اس مڈل مین کے قریب جا پہنچوں گا، جو اس اسٹرینجر کا داہنا ہاتھ بنا ہوا ہے۔"

"داہنا ہاتھ؟...... تم اب بھی غلط سوچ رہے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں، کوئی تمہیں فیک نام سے وہ وہ آئیڈینٹٹی سے بے وقوف بنا رہا ہو۔"

مسٹر یوسفی نے پُرخیال انداز میں دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ "میں بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا، آپ بے فکر رہیں۔"

مسٹر حسن ابراہیم چائے پی کر اٹھ گئے تھے اور مسٹر یوسفی نے سلامہ ارسلان پر کڑی نظر رکھنے کا حکم جاری کیا تھا۔ انہوں نے جو اتنی محنت سے مقام بنایا تھا، وہ اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے اور اس کے لئے وہ کسی حد تک بھی جا سکتے تھے۔



شہریار نے مامون کے سامنے بیٹھے بیٹھے دوسرا سگریٹ ختم کیا تھا کہ مامون عبدالکریم نے سگریٹ کا پیکٹ اور ایش ٹرے اپنے قبضے میں کر لیا تھا، پھر تنتنا کر بولا تھا۔

"اگر اس عادت کو ترک نہیں کیا تو اس سگریٹ کے پیکٹ کی طرح تمہیں بھی ضبط کر لوں گا۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "وہ ایک کام کہا تھا تجھے، رفیق الزماں کی آئیڈینٹٹی چیک کرنے کے لئے......" لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ "تجھے معلوم ہے ناں، وہ میری کیا لگتی ہے؟"

"جانتا ہوں۔" مامون عبدالکریم نے سنجیدگی سے کہا۔

شہریار مکر ربولا۔ "تو جانتا ہے تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ میں اس کے لئے زندگی کو مہربان دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، یہ رفیق الزماں آخر ہے کون؟ کیا مومنہ کے قابل ہے بھی یا واقعی مومنہ کی سادگی

بھری کوئی غلطی ہے؟"
مامون عبدالکریم نے اس کی طرف دیکھا پھر اس نے ایک دس صفحوں کی لسٹ سامنے رکھ دی۔ "یہ سب رفیق الزماں ہیں، جن کا بائیو ڈیٹا میں نے اپنی سورس سے حاصل کیا ہے۔ وہ افراد ہیں جن کی عمریں پچیس سے پینتیس سال تک کے درمیان ہیں۔ باقی رفیق الزماں نامی افراد چالیس سے ساٹھ کے درمیان تھے، جنہیں میں نے لسٹ آؤٹ کر دیا۔"
شہریار نے پیپر اپنے سامنے کیے، کمپیوٹر سے رفیق الزماں نامی ہر شخص کی تصویر سمیت اس کے سامنے ڈیٹا موجود تھا۔
مگر پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی، وہ مامون کے دفتر میں بیٹھا تھا۔
"ان میں سے کوئی رفیق الزماں، مومنہ کا شوہر نہیں ہے۔" ایک جملہ کہہ کر وہ گہری سنجیدگی میں ڈوب گیا، تب مامون نے ایک نیا راستہ دکھایا۔
"تو مومنہ کو میرے سینٹر بلوا سکتا ہے۔ میرا کمپیوٹر سیکشن اب نام کی جگہ صرف تصویروں کے ذریعے اس سے پہچان کا مرحلہ طے کرے گا۔"
شہریار نے حیرت سے دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "یہ بہت لمبا کام ہے مامون! ہمیں کیا پتہ وہ کراچی کا بندہ ہی تھا یا کہیں اور سے آیا تھا۔ اور اگر کراچی کا بندہ ہے، تب بھی آدھے پاکستان کے برابر ہے یہاں کی آبادی۔ کئی دن لگ جائیں گے، کئی دن...... اور یہاں دنوں، شاموں ہی کا کال پڑ گیا ہے۔" اس نے ایک سیکنڈ کا وقفہ لیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "تمہارے کمپیوٹر سیکشن کے تصویر ایکسپرٹ ہماری اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں۔ ہم کیوں نہ مومنہ کی بتائی گئی سکیچ فوٹو کو کمپیوٹر سے اسکین کر کے تصویر حاصل کرنے کی کوشش کریں؟ یہ زیادہ قابلِ عمل اور آسان حل ہے۔"
مامون عبدالکریم نے اس کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اس کے لئے تمہیں مومنہ کو میرے دفتر لانا ہوگا۔ ہم ڈائریکٹ کمپیوٹر پر فوٹو اسکیچ کر لیتے ہیں۔"
"اوکے، میں کل لاؤں گا اسے؟" وہ پھر سے چپ ہو گیا۔
مامون عبدالکریم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر پھر ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گیا۔
شہریار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "جو تو کہنا چاہتا ہے، وہ کام میں دانیا کی شادی سے پہلے نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کی ایک ہی تو خوشی ہے یار!"

"ایک ہی خوشی......وہ......وہ جو شافی ہے، کس کھاتے میں ڈالے گا؟"

"وہ......" اس نے "وہ" کو لمبا کیا، پھر ہنس کر بولا۔ "وہ نری محبت ہے یار۔ اور محبت کو وجہ کی ضرورت ہے، نہ کسی ملن کی حاجت۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں، یہ میرا ہیڈک ہے۔ میں ساری عمر بھی اسی خاموشی سے اسے چاہ سکتا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے، کیوں پچاس کی دہائی کا ہیرو بننے پر تلا ہے؟" مامون نے خفگی سے کہا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے بات ختم کرنے کا اشارہ کیا، پھر بولا۔

"وہ مائی زلفی کا کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہونا تھا، ہم نے اسے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے، بیان ریکارڈ کروا لیا گیا ہے۔ مجسٹریٹ کے سامنے بند کمرے میں کارروائی ہوئی ہے۔ سطوت جہاں آج کل بہت ڈپریس ہے کہ مائی زلفی خود سے اچانک کہاں چلی گئی؟ یہ کارروائی قطعی غیر سرکاری رنگ میں تھی۔ پھر اسٹرینجر نے بھی ہمیں اس سلسلے میں کافی مددگار قسم کا مواد مہیا کیا ہے۔ سی ڈیز ہیں، تصویریں ہیں، بڑے بڑے نام ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، سطوت جہاں اس دفعہ چاروں طرف سے پھنس چکی ہے؟ قتل کے کیس میں، غداری کا مقدمہ درج کیا جانے والا ہے، اس کی دو تین لڑکیاں حلفیہ بیان دینے پر آمادہ ہیں کہ وہ کیسے حکومتی راز حاصل کرنے کے لئے ان لڑکیوں کا استعمال کیا کرتی تھی۔ اور پھر ساری عمر انہیں کیسے بلیک میل کرنے میں مہارت کا استعمال کرتی تھی۔ وہ ایک کیس سے نکلے تو دوسرے کیس میں داخل۔ جیل ہونے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"لیکن جب بڑے بڑے نام آتے ہیں تو کارروائی سرد خانے میں خود بخود چلی جاتی ہے۔" اس نے پوائنٹ اٹھایا۔

مامون ہنس کر بولا۔ "تم اپنے بھائی کو کیا سمجھتے ہو، ہم کم بڑے لوگ نہیں ہیں کیا؟ اماں یار! سر عدیل اور میرے ذہن میں یہ پہلے سے ہے کہ ہم پر کس گراف کا دباؤ پڑ سکتا ہے اور کہاں جا کر کیس فائل بند کرنے کا حکم مل سکتا ہے۔ لیکن میری جان! ایک تڑپ کا پتا ہے ناں، اسٹرینجر، وہ آج تک مخفی رکھا گیا ہے۔ اس میں میری اور سر عدیل کی رائے یہی تھی کہ وہ ایک تو ہر طرح سے محفوظ رہے اور دوسرے جب ہم پر کلاس کا پریشر پڑے تو وہ اپنی مخصوص ویب سائٹ سے کوئی بھی رپورٹ ایشو کر دے۔ اور تم تو جانتے ہو، اس کی ویب سائٹ پر تفصیل کے بعد نئے سرے سے پروگرامنگ کر کے کا پتا حت بدل لیتی ہے، اس لئے اوپر سے نیچے تک کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ آخر یہ اسٹرینجر اسی دنیا کا انسان ہے یا مریخ سے پیغام آتے ہیں یا غیب سے اترتے ہیں مضامیں خیال کے۔"

"تم بہت چھپے رستم ہو، شکل سے تو اتنے خبیث نہیں لگتے؟" وہ ہنسا اور مامون عبدالکریم نے اترا کر کالر کو ہاتھ لگا کر مزے سے کہا۔

"تم اپنے بھائی کی تو رہنے دو، مجھے کب ہو میری جان! اوپر سے لے کر نیچے تک بہت سے لوگوں کے حلق میں اٹکا ہوا ہوں۔ کچھ اپنی سنیارٹی کی مٹی پلید ہونے پر روتے ہیں، کچھ میری ایمانداری سے چڑتے ہیں اور کچھ کو میری آبائی امارت سے کسی انقلابی شاعر کی طرح کا شکوہ ہے۔ رہے سرعدیل، تو وہ ان ساری خصوصیات میں مجھ سے کئی گنا ہائی فائی ہیں، جان ہتھیلی پر لئے گھومتے ہیں۔ میری جان! ایمانداری کا خناس پالنا اتنا آسان نہیں۔"

"مگر ہر کام کو احتیاط سے کیا کرو۔ تم دونوں میرے لئے بہت ضروری ہو۔"

"یہی بات ہم دونوں تمہارے لئے کہتے ہیں، مگر تم ماننے کو تیار نہیں ہو۔"

"اوں ہوں، اب ہٹاؤ، اس میں کیا رکھا ہے، میں کہاں ضروری تھا، کہاں پہنچا اور کہاں پہنچنے کی حسرت میں جیا، یہ بتاؤ، "جانا" کی کوئی خیر خبر؟ مجھ سے ملنے کا کہا تھا، مگر ایسی منظر عام سے ہٹی ہے کہ میں تو ڈھونڈ ڈھونڈ ہارا......" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "جو اطلاع میں اسے دینے والا تھا، کہیں وہ خبر اس تک پہلے ہی تو نہیں پہنچ گئی؟"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ خبر صرف مجسٹریٹ صاحب، میں، سرعدیل اور مائی زلفی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، مگر تجھے کیا پرواہ ہے، تو عیش کر، اچھا ہے، تیری زندگی ہمیشہ دنگل کا میدان بنانے والی کے ہاتھوں میں سکون ہے تو تجھے اس سکون کا شکر کرنا چاہئے۔" وہ رکا، پھر شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولا۔ "ایک منٹ...... ایک منٹ...... کہیں یہ پرانی فلموں والی لو اسٹوری تو نہیں کہ نہ نہ کرتے پیار میں تو کر گیا، کر گیا...... کر......" شہریار نے اس کے بہکنے پر اسے چٹکی کاٹی اور وہ بے مزہ ہو گیا۔ "کچھ تو میری عزت کا خیال کر، اس وقت میں فل یونیفارم میں ہوں، لوگ کیا سوچیں گے؟ ویسے سچ بتا، کیا کبھی جانا نے تیرے دل کو شافی کی طرح چھوا تھا؟ کبھی تو کوئی ایسا لمحہ آیا ہوگا، جب تو نے سوچا ہوگا، کوئی کمی نہیں ہے اس میں۔ اگر چاہا جائے تو اس بگڑے ہوئے حسن کے مجسمے کو سنوارا جا سکتا ہے۔ کبھی تو کوئی قرب کا ایسا لمحہ آیا ہوگا ناں......؟"

شہریار نے آنکھیں بند کر لیں، پھر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہاں گہرا سکوت تھا۔

"ڈفر، اوسیون ہے ناں، پتہ کر کیا واقعی مجھے کبھی اس سے محبت ہوئی تھی؟ لیکن ایسا سوچنے سے پہلے ایک بار میری شافی کو دیکھ لینا، پھر کہنا کیا واقعی اس کے ہوتے ہوئے میرا دل کسی کا ہو سکتا تھا؟"

''شافی جب نہیں تھی، تب کیا تھا؟'' مامون نے پھر چھیڑا اور شہریار نے ضد کر کے نیا سگریٹ سلگایا اور مخمور لہجے میں بولا۔

''شافی کب نہیں تھی میری زندگی میں، یہ بتا؟ شافی جیسی لڑکی سے میں کب سے محبت کرتا رہا ہوں، بس وہ مجھے ملی دیر سے ورنہ اس کی محبت سے میرا دل خالی کبھی نہیں تھا۔ وہ جب نہیں تھی تو دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں سے اچانک آئے اور میرے بگڑے ہوئے نقش کو سنوار دے۔ اب وہ ہے تو میرا دل کرتا ہے، وہ مجھے ہمیشہ ایسے دیکھتی رہے جیسے کوئی مرنے والا زندگی کو حسرت سے تکتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے، وہ مجھے یاد کرے۔ کبھی کبھی اتنا...... اتنا زیادہ کہ خود کو بھول جائے، وہ مجھے چاہے تو ایسے کہ پھر میرے اندر کی ساری تشنگی، ساری حسرت محبت بن جائے۔ میرا وجود اس محبت سے بقاء کا روپ بھرے، پھر فنا مجھ سے کوسوں دور کی دوری پر کھڑی میری خوش قسمتی پر ناز کرتی رہے۔ وہ مجھے اپنا یاد کرے کہ میں اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا، کبھی مجھے بھولے تو ایسے جیسے میں کبھی اسے یاد نہیں آیا تھا۔ میرا دل... مامون! پتہ نہیں، میرا دل کیا چاہتا ہے، کیسے کیسے خواب ہیں ان آنکھوں میں، مگر یہ زندگی...... اسے ہمارے خوابوں سے سروکار ہی کتنا ہے؟''

مامون عبدالکریم دم سادھے اسے سنے گیا اور وہ خود بخود خاموش ہو کر شیشے کے پار بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھنے لگا۔ اسی زندگی کو، جو آہستہ آہستہ اس کے اندر مرتی جا رہی تھی۔



شافعہ سہیل راشدی آج بہت دقتوں کے بعد علی کا پتہ حاصل کر سکی تھی۔ وہ پاکستان ایکسپورٹ پروموشن بیورو میں سیکنڈ چیف تھا۔ اس تک پہنچنا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ سارے راستے سوچتی رہی تھی کہ ارسلان راشدی کے خصوصی خط اور فون کے باوجود کیا واقعی وہ اس کی بات اتنی ہی آسانی سے سنے گا، جس طرح اس نے کہنے کا سوچا تھا؟ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے دفتر کے باہر اپنی باری آنے کا انتظار کر رہی تھی، یہاں تک کہ تقریباً تین گھنٹے بعد جب اسے اپنے دفتر سے آف کرنا تھا، تب اس کی باری آئی تھی۔

وہ کپکپاتے قدموں سے اس کے دفتر میں آئی تھی اور سامنے بڑی سی ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھے مرد کو دیکھ کر اسے لگا، وہ شافعہ نہیں، ثانیہ کی آنکھیں بن کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی فرمایئے میم! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' انداز بہت مہذبانہ تھا مگر کیا اس کا مدعا سن کر بھی اس کا یہی انداز رہتا؟

''وہ...... مجھے مسٹر ارسلان راشدی کے تھرو آپ سے ملنا تھا۔''

''او ہاں، میں جانتا ہوں، ایک زمانے میں وہ میرے آئیڈیل رہ چکے ہیں۔ ویسے دیکھئے، آپ ان کے نام کے ساتھ آئی ہیں، تبھی میں آپ سے مل پا رہا ہوں، ورنہ بہت عدیم الفرصت رہتا ہوں۔''

شافعہ نے غور کیا، تصویر کے برخلاف آج اس لمحے کے علی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بہت حد تک وجیہہ تھا اور واقعی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس کو پلٹ کر ضرور دیکھتی ہوں گی۔ پھر خالص اور بیوروکریٹ ایٹی ٹیوٹ۔

”کیا میں جان سکتا ہوں، آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ اس بار لہجے میں قدرے ترشی تھی اور اس نے بے دھڑک پوچھا تھا۔

”کیا آپ کو کبھی ثانیہ میم کی یاد آئی مسٹر علی؟“

علی کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی، پھر اس نے تلخی سے کہا۔ ”انسان اچھے دن بھول سکتا ہے، مگر برے دن اور بری یادیں اور ان اچھے دنوں کو برباد کرنے والوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ پورے چھ بدذائقہ سال گزارے ہیں میں نے اس کے ساتھ۔ کیا میں وہ سال بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں۔“

”آپ کو پتہ ہے، میم ثانیہ بہت تھوڑے دن دنیا کی باسی ہیں۔“

علی کے چہرے سے کوئی تاثر نہیں اُبھرا مگر اس کے ہاتھوں نے جتنی تیزی سے سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا، یہ اس کے اندر کی بے چینی کا کھلا ثبوت تھا۔

”کیا واقعی کبھی آپ کو میم ثانیہ کی موت کا ذرا سا بھی دکھ نہیں ہوگا؟“

”شاید نہیں، ہرگز نہیں۔“ اب وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ کو تلخی میں رکھ کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔

تبھی اس نے کہا تھا۔ ”ہم اپنے کمرے میں کہیں شوپیس رکھ دیں اور بہت عرصے تک اس کی جگہ نہ بدلیں اور کوئی اچانک آ کر اس شوپیس کو اٹھا کر کسی اور جگہ رکھ دے تو ایک لمحے کے لئے ہی ہمیں اس ترتیب پر وحشت ہونے لگتی ہے، ہمیں اس کی عادت ہانٹ کرتی ہے۔ کیا کبھی آپ نے میم ثانیہ کے لئے اتنی سی بے چینی بھری چبھن بھی محسوس نہیں کی؟“

”نہیں، اُس کی یاد سے میری بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہیں، اس لئے میں اسے یاد کر کے پھر سے اس اذیت ناک فیز میں نہیں جانا چاہتا۔ رہی محبت تو میں محبت میں اعتدال کا قائل ہوں۔“

”لیکن جو لوگ صرف محبت ہی میں جیتے، محبت ہی میں مرتے ہیں، ان کا کیا؟“

”آپ آخر کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ وہ اس بار کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے رسٹ واچ پر یوں نظر کی تھی، جیسے اپنی عدیم الفرصتی پر خاموش مکالمہ کہہ رہا ہو۔

شافعہ بھی اُٹھ گئی تھی، پھر نرمی سے بولی تھی۔ ”ہم جن سے محبت کرتے ہیں، ان کے لئے مر جانے سے بھی نہیں چوکتے۔ مگر ہم جن سے نفرت کرتے ہیں، چاہے جانے کی تمنا رکھنا تو ان کے دل کی بھی

مجبوری ہے ناں؟ کچھ لوگ ساری زندگی کچھ نہیں پاتے۔ لیکن کیا واقعی کچھ لوگوں کو ہمیشہ خالی ہاتھ رکھنا ہی زندگی جینے کی سزا ہے؟ مسٹر علی! آپ اگر ان سے ایک بار مل لیں تو شاید ان کی زندگی نہیں بڑھے گی، مگر ہاں، مرتے وقت ان کی روح میں حسرت نہیں اٹکی رہے گی۔ اس سے وہ آسانی سے نکل سکتی ہیں۔ ایک بار آپ آ جائیے۔ مجھے معلوم ہے، آپ ایک خوش گوار زندگی جی رہے ہیں۔ لیکن کچھ دلوں کو صرف سزا ہی ملے، یہ بھی تو دستور محبت سے بعید بات ہے ناں......"

علی کچھ نہیں بولا تھا اور وہ اس کے روم سے باہر آ گئی تھی۔ پھر سیڑھیاں اُتر رہی تھی کہ کوئی اس کے قریب سے گزرا تھا۔

بروٹ کی خوشبو۔ "شہریار!" اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اس سے تین سیڑھی نیچے تھا۔ وہ اس سے چھ زینے اوپر کھڑی تھی۔ بے ساختہ نام نے شہریار کو روک لیا تھا۔ شام نارنجی ہو کر شافعہ کے چہرے پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بے ساختہ ایک گہرا سانس سینے سے نکلا تھا۔ شافعہ اور اس کے بیچ تین زینوں اور چھ سیڑھیوں کا فرق تھا۔

"کیا وہ کبھی اس دوری کو پھلانگ سکے گا؟"

وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی اس کے قریب آن رکی۔ "مسٹر شہریار! آپ اور یہاں؟"

وہ ہنس پڑا، کچھ بولا نہیں تھا۔ اب دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔

کاش یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو، وہ اس کے ساتھ یونہی چلتی رہے اور ایسی ہی ایک نارنجی شام اسے آ کر ڈھانپ لے۔

"آپ آج بہت چپ چپ سے ہیں، خیریت؟"

شہریار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "جو محبت کے متعلق کچھ نہیں جانتے، وہ ہمیشہ شور کرتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں۔ مگر جو محبت کو گہرے راز کی طرح جان لیں، وہ اندر سے بھلے خوش نہ رہیں مگر باہر مہر بہ لب رہتے ہیں۔ محبت خاموشی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔"

"جبران...... ہے ناں؟"

"ہاں، جبران میرے ذاتی لفظوں میں خود بخود جانے کیسے اُتر آتا ہے؟ ویسے آپ نے نہیں پوچھا، محبت کا ذکر کہاں سے چلا آیا؟"

وہ مسکرانے لگی۔ایک اسرار بھری مسکراہٹ......ہمیشہ محبت کے تذکرے پر اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹ ایسے ہی چھولیا کرتی تھی۔آنکھوں میں ایسے ہی شفق پھوٹنے لگتی تھی،مگر محبت خاموشی کے رازوں میں سے ایک راز کی طرح اس کے ہونٹوں پر بھی چپ چاپ خاموشی سے آن ٹھہرتی تھی۔

''آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟''شہریار نے اس کی مسکراہٹ سے اپنا ہی فکر نکالا اور وہ مسکرانے لگی۔

''ایک لڑکی ہے، بہت محبت سے بھری ہوئی زندگی جس سے دامن بچانا چاہتی ہے،وقت ہاتھوں سے نکل گیا ہے اس کے اور وہ آخری ساعت اسے دیکھنا چاہتی ہے،اسے ایک بار سننا چاہتی ہے،جس سے کبھی وہ ٹوٹ کر محبت کیا کرتی تھی۔''

شہریار کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔کتنی ساعتیں وہ کچھ نہیں بولا،پھر آہستگی سے پوچھنے لگا۔''اس محبت نے کیا جواب دیا؟ کیا وہ مرتی ہوئی محبت کی آنکھ میں آخری بار زندگی جینے کی حسرت کرے گی یا تشنہ مار دے گی؟''

''پتہ نہیں،کوشش تو کی ہے،دیکھئے کیا فیصلہ کرتی ہے زندگی۔''

شہریار نے یکدم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جسارت کی،پھر گڑبڑا کر اپنی نگاہ کا زاویہ بدلا،پھر ہوکے سے بولا۔''آپ یہاں کس طرح آئی ہیں؟''

''رکشہ لیا تھا،اب اسی کے ذریعے واپس جاؤں گی۔''

''میرے خیال میں،میرے ہوتے ہوئے یہ ٹھیک نہیں ہے۔پلیز!آپ جہاں کہیں گی،میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔''

شافعہ نے پہلے تو رد و کد کی،پھر مان گئی۔شہریار نے فرنٹ ڈور کھولا،پھر کار اسٹارٹ کر ہی رہا تھا جب شافعہ نے سوال کیا تھا کہ وہ آج یہاں کیا کر رہا تھا۔

اس نے گاڑی کو بیک کیا،پھر نرمی سے بولا۔''آپ تو جانتی ہیں،بزنس مین ہوں،کچھ ڈیلیوریز پر خوامخواہ کے آبجیکشن لگا دیئے گئے تھے،انہی کے معاملات طے کرنے مجھے آنا پڑا۔معاملات صاف ہوئے تو کھلا،یہ صرف اندرونِ خانہ رشوت ستانی کی ایک بہت ہی گھٹیا حرکت تھی۔مسٹر علی سے مل کر معاملہ حل کر لیا ہے۔ایک دو بندے معطل بھی کئے گئے ہیں،اس لئے اب میں پُرسکون ہوں۔''

''کسی کو معطل کئے جانے پر آپ پُرسکون ہوتے ہیں؟''

شہریار مسکرایا۔ "آپ غلط سمجھیں مس شافی! میں تو اس ذمہ داری کے کما حقہ ادا کیے جانے پر پُرسکون ہوا ہوں۔ دیکھیے ناں، کوئی ذمہ داری دی جائے اور آپ اسے نبھا جائیں، یہ کم خوشی تو نہیں۔"
شافعہ نے اسے کار چلاتے ہوئے چور نظر سے دیکھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، وہ بہت عام باتیں کرتا تب بھی شافعہ کو لگتا وہ کچھ بہت خاص کہنے جا رہا ہے۔ سلامہ اور اس کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اکثر وہ شہریار کو زیادہ نمبر دیتے دیتے سلامہ کی محبت سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹ جاتی تھی، مگر اس شخص کو اس سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ کوئی اسے سراہے یا کوئی اس کی ذات پر اپنی زندگی متا دے۔ اسے تو خود مٹنے کا اتنا شوق تھا کہ بھربھری ریت کی دیوار کے باوجود حصار بنے رہنے کی سرخوشی میں لپٹا پہروں خاموش کھڑے رہنے پر خوش تھا۔
"کیا دیکھ رہی ہیں مس شافی؟"
شافعہ اُسے دیکھ کر نرمی سے بولی۔ "دیکھ رہی ہوں، پہلے سے بہت کمزور ہوتے جا رہے ہیں آپ۔ اے سی کولنگ میں بھی آپ کو اتنا پسینہ آ رہا ہے۔ رنگ بھی مرجھا گیا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"
شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ آپ جسے چاہیں، اگر وہ آپ کو اتنی پروا، اتنی توجہ سے دیکھے تو دل کی سرخوشی........ وہ چھپائے نہیں چھپتی۔
"کچھ خاص نہیں ہے مس شافی! پچھلے دنوں کچھ ٹمپریچر ہو گیا تھا، اسی کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔"
"اوہ، اچھا، اچھا........ میں سمجھی، جانے کیا بات ہے؟"
"جانے کیا بات ہو سکتی ہے مس شافی؟" اُس نے حظ لیا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ کسی انہونی بات کو کہتے کہتے دل نے اسے یکدم روک لیا تھا۔
وہ بہت سبک رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کے کہنے کے مطابق وہ اسے ثانیہ کے فلیٹ کے سامنے ڈراپ کر کے آگے بڑھ گیا۔
یہاں سے اس نے مومنہ کو پک کرنے کے لئے دفتر کا قصد کیا تھا، مگر سالار عبدالرحمٰن کے ایک خصوصی پیکج پروگرام کے تحت وہ آئیڈیا ڈپارٹمنٹ میں ایسی کھپی ہوئی تھی کہ ایک گھنٹے تک اس کا نکلنا محال تھا اور اپنی من مرضی کا مطلب تھا، سالار عبدالرحمٰن کا مزید غصہ برداشت کرنا، سو وہ اپنے کیبن میں مصروف ہو گیا۔ کچھ کام پینڈنگ میں پڑے ہوئے تھے، انہیں کرتے کرتے دو گھنٹے گزر گئے۔ مگر مومنہ کے آف کرنے کا کہیں دور دور تک شبہ نہیں ہوا۔ پھر کام کرتے کرتے یکدم اسے طبیعت میں اپ ڈاؤن محسوس ہوا تو وہ اُٹھ کر اپنے کیبن سے ملحقہ ریٹائرنگ روم میں آ گیا۔ کاؤچ پر لیٹ کر اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے ریلیکس کرنے کی کوشش کی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن بھی کھول دیئے تھے، مگر چہرے پر آنے والی تھکن اور اپنے اندر مچنے والی ہلچل، وہ گہرے گہرے سانس لے کر اندر کی گھٹن پر قابو

پا رہا تھا، جب بہت اچانک جازی کی آواز سنائی تھی۔
''شہریار بھائی! یہ کچھ فائلز پر آپ کے دستخط چاہئیں۔''
شہریار نے گہرا سانس لے کر ہانک لگائی۔''میں ادھر ہوں جازی! فائل لے کر تم یہیں آجاؤ۔''
اُس کا ہلنے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا، مگر جازی کے لئے اس نے خود کو پھر سے کمپوز کیا تھا۔ جازی اس دن کی عنایت پر کچھ نرم پڑ گیا تھا، وگرنہ مین گیٹ سے اگر وہ گھر داخل ہوتا تو اوپر سے نیچے تک کھلبلی مچ جاتی۔ ڈرنک کرنے پر پاپا سے اور باقی لوگوں سے کافی سننے پر مجبور ہونا پڑتا، سو اس احسان کو فی الحال وہ بھلانے کے موڈ میں نہیں تھا۔
''آپ ٹھیک تو ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ظفر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ کام کر رہے ہیں؟''
وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔''ہاں، کام کر رہا تھا۔ مگر کچھ تھوڑی سی پرابلم محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ریلیکس کرنے یہاں آگیا۔ مگر خیر، بتاؤ کہاں سائن کرنے ہیں؟''
اس نے پاکٹ سے پین نکالا۔ جازی صفحے اُلٹتا رہا اور وہ دستخط کرتا چلا گیا۔
جازی نے اتنی لاپروائی دیکھی تو حیرت سے بولا۔''مجھے حیرت ہے بھائی! آپ اُس دن مجھے محتاط رہنے اور ہر پیپر پڑھ کر سائن کرنے کا کہہ رہے تھے اور آج آپ نے خود اتنی لاپروائی دکھائی ہے؟''
شہریار نے اس کی طرف فائل بڑھائی، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔''فائل تمہارے ہاتھ میں تھی جازی! اور میں اپنوں پر آنکھ بند کر کے یقین کرتا ہوں۔ رہے دستخط تو ساری وِل تمہارے نام کر دی ہے۔ دستخط کرنے نہ کرنے کا سوال کیا رہ جاتا ہے؟''
''شہریار بھائی......!''مدتوں بعد وہ پہلی ٹون میں بولا تھا۔ شہریار کو اس کو اپنے لئے پریشان ہوتے دیکھنا اچھا لگا تھا۔''آپ نے وِل کیوں بنوائی ہے؟''وہ اُس سے لڑنے والے لہجے میں مخاطب ہوا تھا اور شہریار نے لیٹ کر پھر سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
''میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں بھائی!''
اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، پھر اپنے اوپر جھکے ہوئے جازی کے نقش کو ہولے سے چھوا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔

"وہ ملتا نہیں ہے ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارہ نہیں"

جازی کی آنکھوں میں پہلی بار اتنی جلدی آنسو آگئے تھے۔ "آپ ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں؟"

"بس، کبھی کبھی ڈائیلاگ مارنے کو دل کرتا ہے تو یونہی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔ ویسے کچھ ایسی خاص بات نہیں ہے۔" اس نے جازی کا گال تھپتھپایا۔

جازی نکل رہا تھا، جب اچانک سالار عبدالرحمٰن نے پردہ سرکایا تھا۔

"آہا تو اب شوق دفتر میں بھی پورے ہو رہے ہیں۔"

جازی رک گیا تھا اور شہریاران کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں سنی بھائی؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو، کیا مومنہ کو بار بار اس لئے ہی مس بیل دے رہے تھے؟"

"سنی بھائی......!" وہ یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ "وہ میری دانیا کی طرح ہے اور آپ.... آخر آپ اتنا کیسے سوچ لیتے ہیں؟"

"جس طرح تم برا کر کے بھی نہیں تھکتے، اسی طرح......"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتے مگر وہ کاؤچ سے اُٹھ کر کوٹ پہن رہا تھا۔ اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن اسے دیکھتے رہے، پھر تن فن کرتے باہر نکل گئے۔ شہریار نے جازی کو اس طرح آدھا دروازے کے اندر، آدھا دروازے سے باہر کھڑے دیکھا تو مسکرایا۔ وہی ازلی تلخ ہنسی۔

"کیا دیکھ رہے تھے؟ کیا یہی کہ ہر بار بے عزت ہونے سے پہلی بار کی طرح تکلیف کیسی ہوتی ہے؟"

جازی سے کچھ نہیں بولا گیا اور وہ اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ فون کھسکا کر اس نے ماموں عبدالکریم کا نمبر ملایا، پھر بولا۔

”سوری یار! میں مومنہ کے ساتھ تیرے دفتر نہیں آسکوں گا۔ اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ہاں، بس کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے......نہیں، اپائنٹمنٹ نہیں ہے، مگر مجھے لگتا ہے، جائے بغیر گزارہ نہیں ہو گا......اوہو، تجھے تو بس گھبرانے کی عادت ہے۔ نہیں ہو رہا کچھ۔ اچھا کل ملیں گے۔“

وہ فون رکھ کر مڑا تو جازی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”آج اتنی التفات کی نظر، خیریت تو ہے؟ میرے بھائی! کہیں یادداشت تو نہیں بھول گئے؟ میں شہریار ہوں سر! اور اس نظر سے دیکھا جانا قطعی نہ افورڈ کر سکتا ہوں نہ ڈیزرو کرتا ہوں۔“ شہریار نے کہتے کہتے ہونٹ بھینچ لیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے، آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“ وہ یکدم قریب آ گیا تھا۔ جازی نے ہولے سے شہریار کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ بڑبڑایا۔

”مجھے آج اتنی محبت نہ دو دوستو......!
کہ مرے کل کے لئے کچھ بچے ہی نہیں
کل جو گمنام ہے، کل جو سنسان ہے
کل جو انجان ہے، کل جو ویران ہے“

”شیری بھائی!“ اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور شہریار نے بہت متوازن لہجے میں کہا تھا۔

”اپنی گاڑی کی چابی دو گے؟ میں ڈرائیور کے ساتھ مومنہ کو مامون کے دفتر بھیجنا چاہتا ہوں، اس کا ایک ذاتی کام تھا۔“

جازی عبدالرحمن نے کچھ کہے بغیر کوٹ کی جیب سے کار کی چابی نکال کر اس کی ٹیبل پر ڈال دی تھی۔

”تھینکس!“ اس نے چابی اٹھائی تھی۔ مومنہ کو بات کلیئر کر کے وہ صمدانی انکل کے کلینک کی طرف اڑا جا رہا تھا۔



مومنہ ڈرائیور کے ذریعے مامون عبدالکریم کے دفتر میں داخل ہوئی تھی۔ یہ اور بات کہ اس کے ساتھ داخل ہوتے ہی عدیل عبدالرحمٰن نے بھی انٹری دی تھی۔
''ہیلو! کام ہو رہا ہے؟'' وہ اندر داخل ہوئے اور حجاب والی لڑکی کو سوالیہ دیکھنے لگے۔
''مومنہ ہیں، سر! شہریار عبدالرحمٰن کے بی ہاف پر آئی ہیں۔''
''اوہ! اچھا...... اچھا...... مگر شہریار سے ان کا رشتہ؟''
''سر! اُن کے دفتر میں جاب کرتی ہیں، میڈم عافیہ کی بھانجی اور مسٹر ارسلان راشدی کی بیٹی ہیں۔ شہریار انہیں اپنی بہن مانتے ہیں۔''
''اس کا مطلب ہے ہماری بھی پھر بہن ہی ہوئی ناں۔ اوکے، آپ ان کی جس قدر مدد کر سکتے ہیں، کریں۔ مسٹر شہریار ویسے بھی ہمارے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔''
مامون عبدالکریم مسکراتا ہوا مومنہ کو کمپیوٹر سیکشن کی طرف لے گیا۔
مومنہ متاثر لہجے میں بولی۔ ''آپ کے باس تو بہت پولائٹ بولتے ہیں۔ اور یہ شیری بھائی، ان کی تو جانے کہاں کہاں سے دوستیاں نکل آتی ہیں۔''
''دوستیاں؟'' مامون عبدالکریم قہقہہ لگا کر ہنسا، پھر تھم کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ شہریار کے بڑے بھائی ہیں۔ وہاں لائیڈ لی اس لئے بول رہے تھے کیونکہ وہ اور میں ذاتی افیئر کو پروفیشنل افیئر میں گڈمڈ کرنے سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ یہ تگ لگ جائے ناں تو آپ کی اچھی بھلی کارکردگی بھی اسی کھاتے میں ڈال کر نظر انداز کر دی جاتی ہے۔''
مومنہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلا کر چپ ہو گئی اور پھر وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور رفیق الزماں کے خال وخد دہرا رہی تھی۔ کتنی بار مسٹیک ہوئی، تصویر اسکین ہو کر اس نے نفی میں سر ہلایا، تب کہیں ایک گھنٹے بعد وہ ٹھیک خال وخد دہرا سکی۔ رفیق الزماں نے اس کے پاس اپنی کوئی یاد نہیں رہنے دی تھی، جو کچھ بھی تھا، دماغ کے اسٹور روم سے زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالا گیا تھا اور ایسا ہوتا ہے، جب آپ کوئی چیز بہت احتیاط سے سنبھال کر رکھ دیں اور دوبارہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو اس سے پہلے کی چیزیں کونے کھدروں سے برآمد ہوتی ہیں اور پھر بہت محنت کے بعد ڈھونڈی جانے والی چیز برآمد ہو گی۔
یہی وجہ تھی کہ تصویر اندر سے باہر بہت دیر میں دریافت ہوئی تھی۔
اسکرین پر تصویر اسکین ہو کر زیادہ واضح ہو رہی تھی اور جب تصویر مکمل ہو گئی تو مامون عبدالکریم کی آنکھیں تحیر سے مومنہ پر آ کر رک گئیں۔

”یہ........یہ رفیق الزماں ہیں؟“

”جی، سو فیصد یہی میرے رفیق الزماں ہیں۔“

عدیل عبدالرحمٰن نے دروازہ پیش کیا تھا۔ان کی آنکھیں بھی حیرت سے تصویر پر جم کر رہ گئی تھیں۔مامون عبدالکریم کچھ کہنے والا تھا، جب بہت اچانک عدیل عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔مامون نے اس دباؤ سے سنبھالا لیا اور بہت خوشگواری سے بولا۔

”او کے سسٹر! ہم رفیق الزماں کو ڈھونڈنے میں آپ کی جتنی مدد کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔لیکن آپ انہیں ڈھونڈنے میں انٹرسٹ رکھتی ہیں؟“

مومنہ نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔”پتہ نہیں، مجھے انہیں کھونے کا دکھ زیادہ ہے یا نہ پانے کی حسرت شدت رکھتی ہے۔لیکن ایک بات میں ضرور سوچتی ہوں اگر وہ مجھے ملے اور ایسی حالت میں ملے کہ میرا دل ان سے نفرت کرنے کی جسارت پر بھی دس بار سوچے اور خود سے شرمندہ ہوتا رہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ مجھے ملیں ہی نہیں؟“

مامون کچھ نہیں بولا تھا۔مومنہ کو ڈرائیور کے ساتھ واپس گھر بھیج کر وہ شہریار کا نمبر ٹرائی کرنے لگا تھا مگر اس کا موبائل پاور آف آ رہا تھا۔وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے سامنے ٹھنڈا ٹھار سوفٹ ڈرنک کا ٹن لا رکھا۔

”بے کار ہے، ایک بجے سے میں خود بھی ٹرائی کر رہا ہوں، مگر اس کا سیل پاور آف آنسر دے رہا ہے۔“

مامون عبدالکریم نے پُرخیال انداز میں عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔”شیری نے مومنہ کے متعلق کس شخص کا نام لیا تھا؟“

عدیل عبدالرحمٰن کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ بکھرنے لگی اور وہ کرسی کھسکا کر بولے۔”میرے خیال میں رشتے میچنگ میں شہریار سے بہتر کوئی اچھا فیصلہ نہیں لے سکتا۔ہاں، یہ اور بات کہ مومنہ کے لئے ہمارے اسٹرینجر نے خود پرپوزل بھیجا ہے، خود مومنہ بھی اسے لائیک کرنے لگی ہے اسے شہریار کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔مگر بات وہی کہ پہلا معاملہ سمیٹے بغیر دوسرا گھر کیسے بسایا جا سکتا ہے؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے، مومنہ واقعی خوش ہے؟“

عدیل عبدالرحمٰن نے پُرخیال انداز میں انہیں دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔”مومنہ تلخی کی حد تک حقیقت پسند لڑکی ہے، وہ ایک محفوظ گھر چاہتی ہے، سو جب اسٹرینجر نے اسے یہ پیشکش کی تو اس نے سوچنے کا

وقت لے کر اس پرپوزل کو حرفِ غلط کی طرح مٹنے نہیں دیا۔ وہ ایک اُمید زندہ رکھنا چاہتی تھی، رہی خوشی کی بات تو اپنے کھونے والے بچے کو ڈھونڈنے کے چکر میں وہ ایسی بے حال ہوگئی ہے کہ پوری طرح خوشی بھی نہیں ہو پا رہی۔ شہریار اس سلسلے میں پوری طرح اس کی مدد کر رہا ہے کافی چلڈرن ہومز کی خاک چھان چکا ہے مگر کچھ ابھی لسٹ پر ہیں، دیکھو کیا رزلٹ نکلتا ہے۔" وہ کہتے کہتے پھر موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ شہریار کا نمبر ملانے لگے۔

ماموں نے اس کی وجہ پوچھی تو ہنس کر بولے۔ "وہ کسی پرابلم میں ہو ناں تو میرا نمبر دیکھ کر لازمی اگنور کرے گا، لیکن تم اس کے دوست ہو اس لیے تم سے اپنی پرابلم وہ ضرور شیئر کرے گا۔"

"آپ کو یہ کیوں لگتا ہے وہ کسی پرابلم میں ہے؟" ماموں عبدالکریم کے ذہن میں دوپہر کی کال گونجنے لگی اور انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"پتہ نہیں، یہ کہاں تک ٹھیک ہے لیکن وہ کسی پرابلم کا شکار ہوتا ہے تو میرے اندر عجیب طرح کی بے چینی در آتی ہے۔ کوئی بات نامحسوس طور پر کاٹنے لگتی ہے۔ تم اسے چھٹی حس بھی کہہ سکتے ہو۔" انہوں نے قریباً ساتویں بار نمبر ملاتے ہوئے بات کی اور آٹھویں بار خود بخود رابطہ ہوگیا۔

"کیا ہے؟ کیا ایک پل بھی میرے بغیر سانس نہیں لی جاتی؟"

عدیل عبدالرحمن نے تنہائی کا فائدہ اٹھا کر لاؤڈ آن کر دیا تھا۔ اس کی تھکی ہوئی آواز گونجی تھی اور ماموں نے اس کی آواز کی تھکاوٹ سے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"خیریت! یہ تیری آواز کو کیا ہوگیا ہے؟ تو ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ہوں......ٹھیک ہوں۔"

"مگر مجھے ٹھیک لگتا تو نہیں ہے۔ کہاں پایا جاتا ہے؟"

"میں وہاں ہوں، جہاں سے اپنی بھی خبر نہیں آتی۔ ویسے شہر سے باہر ہوں۔"

"مگر دوپہر تک تو دفتر میں تھا، پھر یہ اچانک......"

"کام اچانک ہی نکل آتے ہیں میری جان! تو فکر مت کیا کر۔" پھر اس نے سلام دعا کے بعد لائن ڈس کنکٹ کی۔

"اب کیا کہتے ہیں آپ، وہ تو ٹھیک ہے۔"
عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔"وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ یقیناً انکل صمدانی کے کلینک میں ہے۔"
"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"
"اس کا لہجہ بات کرتے کرتے تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے مارک کر لیا تھا۔ وہ میری موجودگی جانچ چکا ہے، آخر کو ڈفر ہے تو میرا بھائی ناں۔"
وہ دونوں پھر ایک ساتھ نکلے تھے مگر جب تک وہ کلینک پہنچے تب تک وہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ انکل صمدانی اس کے ہونے سے انکاری تھے اور عدیل عبدالرحمٰن کی یہی رٹ تھی کہ انکل صمدانی نے اسے انڈر گراؤنڈ کر دیا ہے۔
"خدا کا خوف کرو عدیل! میں کوئی گینگسٹر ہوں یا شہریار مجرم، جو انڈر گراؤنڈ کی توجیہہ دے رہے ہو مجرموں کے ساتھ رہ رہ کر بالکل انکل کھرے ہو گئے ہو۔" انکل صمدانی کا لہجہ ملامت والا تھا۔
عدیل عبدالرحمٰن کچھ بولے بغیر باہر نکل آئے مگر ان کا اب بھی یہی خیال تھا کہ شہریار یہیں ہے۔ مگر کہاں، یہ وہ نہیں جان پائے تھے۔



جازی عبدالرحمٰن آج بے انتہا انکار کے باوجود دوستوں کی ضد پر پرائیویٹ پارٹی کے لئے نکلا تھا۔ پہلے کا تجربہ اتنا ثر ابت تھا کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ آج وہ قطعاً ہارڈ ڈرنک نہیں لے گا۔ کسی کولا وغیرہ سے کام چلا لے گا۔ مگر پرائیویٹ پارٹی کا ہیجان انگیز اثر! وہ آدھے گھنٹے بعد ہی ہارڈ ڈرنک کا گلاس لئے بیٹھا پارٹی کی آئٹم گرل کے بالوں سے اُلجھ رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس طرح اس کو دیکھنے کی گنجائش اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔
"یہ نیا پینٹر کون ہے؟" اس نے اشارہ کیا اور ایک نشے میں وحشت شخص آنکھیں جھپک جھپک کر اس کی اشارہ کرتی انگلی کی طرف دیکھتا رہا، پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔
"یہ شخص......؟ یہ تو پرائیویٹ پارٹیوں کا روح رواں ہے۔ لوگ اسے اپنی پارٹیوں میں اس لئے بھی بلواتے ہیں کیونکہ یہ پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے اور شوقین مزاج ایسا ہے کہ ہر جگہ کا ٹیسٹ اس کے کلیکشن میں موجود ہے۔"

جازی عبدالرحمن نے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا تھا، پھر یکدم اس کے سامنے آ کر بولا۔ "آپ سے مجھے ایسی توقع نہیں تھی سر!"

اس نے مڑ کر دیکھا، پھر طنزیہ بنا شرمندگی کے بولا۔ "کیا خود تم کسی وعظ میں شریک ہو جو صرف مجھ پر طعنہ زن ہو؟ دیکھو ہم سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں، دو دو چہرے رکھتے ہیں، ہمیں سوسائٹی میں مووو کرنے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے میری جان!"

جازی نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

وہ گھر آیا تو سیدھا شہریار عبدالرحمن کے آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا آؤٹ ہاؤس بند پڑا تھا، مگر ایک وقت میں شہریار کی جاسوسی کے لئے اس نے ماسٹر کی بنوائی تھی، وہ آج کام آئی تھی۔ اس نے بہت آرام سے دروازہ کھولا تھا، پھر اس کی الماری ٹٹول رہا تھا کہ اسے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اگر یہ شہریار بھائی تھے تو وہ بہت برا پھنسا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رخ موڑا مگر سامنے بہت غیر متوقع ماما کھڑی تھیں۔

"کیا ڈھونڈ رہے تھے؟"

"شاید کچھ فوٹوگراف! مجھے لگتا ہے ہمیں حمزہ عابد کو نئے سرے سے ڈسکور کرنا چاہئے۔"

ماما نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ "میں سمجھی تھی، شہریار آیا ہے، لیکن یہ تم ہو۔" لمحہ بھر کو رکیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ "جو چیز تمہیں چاہئے شاید وہ تمہاری نانو کے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ اچانک شہریار کے لئے سوفٹ کارنر کیوں؟"

جازی سے کتنی ہی دیر تک کچھ نہیں بولا گیا، پھر بولا۔ "شہریار بھائی کے لئے تو آپ کی آئس گلیشیئر قسم کی خفگی پگھل گئی مام! میں تو پھر بھی ان کے دوستوں میں شامل تھا۔ اس لئے دوست کو واپس پلٹنے میں زیادہ وقت تو نہیں ہوتی۔" لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ "کیا نانو کے پاس جو سچائیاں ہیں وہ آپ نے خود دیکھی ہیں؟"

مام شہریار کے بیڈ پر بیٹھ گئیں، پھر اس کے بیڈ کے کارنر پر رکھی اس کے کسی اچھے موڈ کی یادگار مسکراتی تصویر ہاتھ میں لے کر بولیں۔ "پہلے کبھی مجھے لگتا تھا، کسی انسان کو جانچنے کے لئے سچائیاں، کچھ بہت پختہ سچائیاں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ مگر جب سے شہریار کی آنکھوں میں دیکھا ہے، مجھے لگا ہے اپنے بچے کو جانچنے کے لئے صرف اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھ لینا کافی ہوتا ہے۔ ماں کبھی اپنے بچے کو

غلط جج نہیں کر سکتی۔"

جازی عبدالرحمن کچھ نہیں بولا۔ مام کے ساتھ خاموشی سے ان کے کمرے سے نکل آیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "بھائی نے آپ کو گھر نہ آنے کی کوئی وجہ بتائی تھی مام؟"

"نہیں، کہہ رہا تھا رات کو ذرا دیر سے آئے گا اور بس۔ میں دس بجے سے اس کا انتظار کر رہی ہوں، لیکن ابھی تک تو آیا نہیں ہے۔" مام نے کہتے کہتے رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

جازی نے خاموشی سے کھانا کھایا تھا اور چپ کر کے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ لیکن اس کی نظر میں وہ سارے مناظر گھوم گئے تھے، جب جب اس نے شہریار کو طنز کا نشانہ بنایا تھا۔

"میں شاید آپ کو کبھی سمجھ نہیں سکوں گا بھائی!" اس کی خود کلامی بے ساختہ تھی۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ دراز سے شہریار کی تصویر کا فریم باہر نکالا، جھاڑ پونچھ کر کارنر پر واپس لگا دیا۔

دوسرے دن وہ ناشتے کے بعد ما نو کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اپنی بات واضح کر چکا تو ما نو نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا چلا گیا۔ حمزہ عابد ہر تصویر میں کسی نئی لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ جازی نے تصویریں اکٹھی کر کے ایک خیال سوچا ہی تھا کہ ما نو نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ تم یہ تصویریں دکھا کر اس وقت دانیا کا دل حمزہ عابد سے موڑ سکتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ اگرچہ آنکھ سے دیکھی سچائی ہے۔ پہلے یہ تصویریں تمہارے سامنے بھی رکھی جاتیں تو تم بھی ان تصویروں کو شہریار کی کوئی سازش سمجھتے، جیسے ایک وقت میں حالات نے ہمیں ٹریپ کر رکھا تھا۔ جازی! جسے ہم برا سمجھنے لگتے ہیں ناں تو پھر فطری طور پر وہ بہت زیادہ سخت نا دیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اس کی بڑی غلطیوں کو تو کیا، چھوٹی چھوٹی بشری کمزوریوں تک کو معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتے۔"

جازی مجھ کر تصویریں ما نو کو واپس کر کے شہریار کے روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کے قدم رک گئے تھے۔

"تم نے اب تک یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی، سالار ابھی تک جانا نہ سے انگیج ہیں۔ پھر فائدہ کیا ہوا شیری کا رسوائی اپنے سر لینے کا؟ مجھے تو لگتا ہے، عائشہ! تمہیں خود اپنے جیون ساتھی کو اپنی طرف موڑنا نہیں آتا۔ ورنہ جس طرح شہریار نے سالار بھائی کو الٹی میٹم دیا تھا، جس طرح اپنی طرف اس نے جانا نہ کو راغب کر کے تمہارے لئے میدان چھوڑا تھا، کوئی اور لڑکی ہوتی، اپنا حق مانگنے اور اپنے حق سے خود آگاہ ہوتی تو کب کی اس کی زندگی خوشیوں سے بھر جاتی۔ لیکن تم نے......تم نے......"

وہ دبے قدموں کچن کے سامنے سے گزرتا چلا گیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری سچائی نے اس کے اندر توڑ پھوڑ مچا کر رکھ دی تھی۔

”شہر یار بھائی!“ وہ اپنے کمرے کی ٹیرس پر آ کر کین کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے موبائل نمبر ملایا تھا مگر دوسری طرف کال ریسیو نہیں کی گئی تھی۔ وہ بار بار ملاتا رہا مگر ہنوز خاموشی تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے اعصاب ڈھیلے ڈال دیئے تھے اور اب وہ انداز سوچ رہا تھا، جس سے وہ شہر یار کو پھر سے منا سکتا۔



فون بجل پر سونیا تیزی سے فون کی طرف بڑھی تھی۔ وہ ابھی ابھی عاطف سے ہی باتیں کر رہی تھی کہ اچانک رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ عاطف پندرہ دن کراچی میں رہ کر سونیا کو اچھی طرح سے زندگی کی طرف لوٹا کر واپس گیا تھا اور کم و بیش وہ جا کر بھی مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ ارسلان راشدی کو عاطف بہت عظیم لڑکا لگا تھا، جس نے ان کی بیٹی کو جو ہے، جیسی ہے کی بنیاد پر قبول کر لیا تھا۔ جس طرح سے اس نے سوسائٹی کے مخالف قدم اٹھایا تھا، یہ وہی جانتے تھے کہ ایک مرد کی حیثیت سے اس کا یہ کام کس قدر قابل تعریف تھا۔ شافعہ بھی اس نئے رشتے پر خوش تھی۔ آصفہ ارسلان راشدی نے بھی ٹھنڈا گہرا سانس بھرا تھا، مگر پھر بھی کوئی بات تھی جوان کے اندر گہری گھٹن بن کر اترتی جا رہی تھی اور خود سونیا بھی، وہ عاطف کی شکر گزار تو تھی لیکن شہر یار عبدالرحمٰن کی شخصیت کی بہت زیادہ قائل تھی۔ وہ اس کی نظر میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اُس نے سوچوں کو بریک لگا کر فون اٹھا لیا تھا، پھر شوخی سے بولی تھی۔ ”کیا ہے جی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو بات ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ......“

”کون...... سونیا بول رہی ہو؟“

اُس کا دل اُس کے دماغ میں دھڑکنے لگا۔ اس شخص کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اب وہ اس آواز کو اپنی زندگی میں سننا نہیں چاہتی تھی۔

”کون بول رہا ہے؟“ وہ جان کر انجان بنی اور دوسری طرف سے کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

”کس کا انتظار تھا تمہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرز تخاطب میں کسی اور سے بات کرنے کی، جس انداز پر اولاً صرف میرا حق ہے۔“

”آپ بول کون رہے ہیں؟“

”کیا مجھے تمہیں بھی بتانا پڑے گا کہ میں کون ہوں؟“

''میں آپ کو نہیں جانتی۔'' اس نے گھبرا کر فون رکھ دیا، مبادا جیسے وہ فون سے ہی کوئی کارروائی کرنے پر اختیار رکھتا ہو۔ اس کے ریسیور رکھتے ہی بیل پھر بجنے لگی۔ اس نے رات کی خاموشی میں بیل کی آواز گونجنے سے گھبرا کر فون پھر اٹھا لیا۔

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟''

دوسری طرف گہرے مخمور سانسوں کی آواز آتی رہی، پھر کوئی بہت بھرائے لہجے میں بولا۔ ''کیا مجھے تمہیں بھی بتانا پڑے گا کہ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔''

''جھوٹ مت بولیں۔ یہ جملہ آپ نے ہزاروں لڑکیوں سے کہا تھا۔''

''ہاں، کہا تھا۔ مجھے اس پر کوئی انکار نہیں۔ لیکن اب میرا دل تمہاری طرف کھنچتا ہے تو میں کیا کروں؟''

''آپ کچھ کرنے کے قائل رہے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے آپ کی فیملی کے متعلق اخبارات کیا حاشیے لگا رہے ہیں؟''

''اخبارات اور ان کی خبریں...... سوواٹ، بڑے لوگوں پر یونہی قلم کار یہ اور ی حاشیے لگاتی ہی ہے۔ ہم اگر نہ ہوں تو ان کے اخبارات کا پیٹ کیسے بھرے گا؟'' لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ ''آ جاؤں ناں۔ آج بہت دل چاہ رہا ہے تم سے ملنے کے لئے۔''

''آپ غلط نمبر ڈائل کر رہے ہیں۔ میری پچھلے ہفتے ہی منگنی ہوئی ہے۔''

''منگنی اور تمہاری؟ ہاہاہا...... تو سوچو بے کھا کر بلی حج پر جا رہی ہے۔ پور گرل! کچھ تو شرم کرو۔ کیوں کسی عزت دار گھرانے کی عزت سے کھیل رہی ہو؟ تم جیسی لڑکیاں، وہ شادیاں کب کرتی ہیں؟''

سونیا کی آنکھوں میں اس تذلیل سے آنسو آ گئے تھے۔ وہ، جو اتنے دنوں سے مورال بلند ہوا تھا اس کا گراف ایک ہی جھٹکے میں نیچے آ گیا تھا۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی کو بے یقینی سے دیکھا تھا اور تبھی بہت اچانک کسی کے نرم ہاتھوں نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔ اس نے صوفے سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور شافعہ کی تیز آواز گونجی تھی۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس سے سونیا کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ کیونکہ جس سے اس کی منگنی ہوئی ہے وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والے اپنے محبوب کو خامیوں، خطاؤں کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں، ان کا محبوب آسمان سے اتری ہوئی مخلوق نہیں، ایک عام بشری تقاضوں سے مجبور عام انسان ہے۔ رہے تم...... تو بہت جلد تم وہاں ہو گے جہاں کے صحیح

حق دار ہو۔میری بہن کو دھمکانے کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔"

سونیا نے بہت تشکر سے شافعہ کو دیکھا تھا۔شافعہ نے فون رکھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر بولی تھی۔

"واقعی بجو!عاطف ایسے ہی ہیں ناں کہ وہ کبھی مجھ پر طنز و طعنہ کا زور نہیں آزمائیں گے،وہ واقعی سوفٹ ہارٹ ہیں ناں؟"

شافعہ نے اُس کے بال سہلائے تھے،پھر بھرائے لہجے میں بولی تھی۔"وہ جیسے بھی ہیں تم بس یہ یاد رکھا کرو،وہ شہریار صاحب کے دوست ہیں اور شہریار کا دوست بننا آسان کام نہیں ہے۔"

سونیا نے شافعہ کے چہرے پر کوئی عکس ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے عقیدت کے رنگ کے کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

"پتہ نہیں یہ عقیدت کب محبت بنتی ہے۔"سونیا نے دل میں سوچا اور ملامت سے بہن کی گود میں سر رکھ کر اپنے اور عاطف کے ساتھ ترتیب پانے والے خواب دہرانے لگی۔شافعہ کے ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ تھی،جیسے یہ مسکراہٹ اس کے ہر خواب کے لئے دعا بنتے جا رہی تھی مگر خود دعا ہی تھی جو سونیا کی زندگی کو لگ گئی تھی۔



جانانہ خالی آنکھیں لیے صوفے پر بیٹھی تھی اور سطوت جہاں پریشان سی ٹہل رہی تھیں۔

"آخر تمہیں پریشانی کیا ہے ماں؟"جانانہ نے تھکے تھکے لہجے میں سطوت جہاں کو دیکھ کر کہا مگر لہجے میں زندگی مفقود تھی۔

سطوت جہاں نے جانانہ کو دیکھا،پھر خفگی سے بولیں۔"جس کی ایک بیٹی ہو،جو ہزاروں پر بھاری ہو،وہ ایک دم خشک پتے کی طرح جھڑ جائے تو اس ماں کا کلیجہ کیوں منہ کو نہ آئے گا؟"

"ماں!یوں نہ کہو۔بس میرا کچھ دل تھک گیا ہے۔میں اب بھی تمہاری وہی بیٹی ہوں،جس پر تمہیں ناز ہوا کرتا تھا۔"جانانہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر سطوت جہاں نے ہاتھ خفگی سے جھٹک دیا۔

"رہنے دے یہ چاپلوسی،یہ محبت کے ناٹک۔مجھے تو لگتا ہے تجھے اب اپنی ماں سے پہلی والی محبت ہی نہیں رہی ہے۔"وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"ماں!یوں تو نہ کہو۔میرا تمہارے سوا ہے ہی کون؟آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری پہلی والی بیٹی نہیں رہی؟"اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوال کیا اور سطوت جہاں کے لفظوں کی اُٹھان بھری،گہرا سانس لے کر بولیں۔

”اگر تُو میری پہلی والی بیٹی ہوتی تو فنکشن اٹینڈ کرنا کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ کتنی ہائی فائی تقریبات کے انوی ٹیشن آتے ہیں، مگر تجھے تو پھر سے شیرازی کا روگ لگ گیا ہے۔ وہ بے وفا تھا، تجھے یہ بھی بھول گیا اور وہ ذلتی، اس نے تجھے جانے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ تُو شیرازی کا بچہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں، کیا دے گا تجھے شیرازی کا بیٹا؟ کم نسل کی اولاد کم نسل ہی ہوگا ناں؟ کیا نشانی بتائی ہے اس نے، چاندی جیا تعویذ ہزار بچوں کے گلے میں ہوسکتا ہے۔ مگر تیری تو لگتا ہے عقل ہی سٹ گئی ہے۔ کیا کرے گی شیرازی کا بیٹا دیکھ کر؟“

جانانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، خواب آگئے مگر وہ خواب بھی شبنمی تھے اور اس کا لہجہ کرلایا تھا۔

”شیرازی کیسا بھی تھا، مگر وہ میرا بچہ اور شیرازی کی محبت تھا، میں دیکھنا چاہتی ہوں صرف ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں کس پر گیا ہے، مجھ پر یا بالکل میرے شیرازی پر؟“

”تیرا شیرازی کہاں سے ہوگیا وہ؟ تجھے معلوم ہے ناں، وہ ایک نمبر کا......“

”ماں پلیز! اسے کچھ مت بولو۔ وہ کیسا بھی تھا میرا شیرازی تھا۔ اس نے مجھ سے محبت نہیں کی، لیکن میں نے تو اس سے محبت کی تھی ماں۔ اسے گالیاں مت دیا کرو وہ جہاں بھی ہے، جیسے بھی ہے، بس تو......“

سطوت جہاں نے اثر ہوتے نہ دیکھا تو پھر سے اس کو نئی باتوں میں گھسیٹ لیا۔

”حمزہ عابد کہہ رہا ہے تم نے شہریار والے معاملے میں بھی توجہ دینی چھوڑ دی ہے؟“

”یہ حمزہ عابد تم سے کیسا اتنا گھل مل گیا ہے ماں؟ تم تو کہہ رہی تھیں، حمزہ عابد سے بچ کر رہو، یہ اچھا آدمی ہے اور اچھے آدمی اچھے نہیں ہوتے، پشتی رئیس الگ ہوتے ہیں اور وقتی دولت کما کر امیر ہونے والے الگ۔ ماں! یہی کہا تھا ناں تم نے؟“

”ہاں، ہاں...... یہی کہا تھا۔ مگر ضروری نہیں جو ایک رائے قائم کرلی جائے، اس پر دوسری نظر نہ ڈالی جائے۔ کبھی کبھی لوگ جیسے دکھتے ہیں، ویسے ہوں بھی، یہ ضروری تو نہیں۔“

”ہاں ماں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کبھی کبھی لوگ واقعی ایسے نہیں ہوتے، جیسے دکھتے ہیں۔ تمام عمر، کبھی کبھی تو پرتیں ہی اُتارتے رہ جاؤ، ہاتھ کچھ نہیں آتا۔“

سطوت جہاں اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتی رہیں کہ یہ جملہ یونہی سرسامی کیفیت کا پیش خیمہ ہے یا واقعی اس جملے میں کوئی حقیقت ہے۔ یہی جاننے کے لئے انہوں نے التفات سے پیش قدمی کی تھی۔ ”ماں واری! یہ تو بتا شہریار اور عبدالرحمٰن کے بارے میں کوئی نئی پیش رفت کی تُو نے؟“

حق دار ہو۔میری بہن کو دھمکانے کی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔"

سونیا نے بہت تشکر سے شافعہ کو دیکھا تھا۔شافعہ نے فون رکھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر بولی تھی۔

"واقعی بجو! عاطف ایسے ہی ہیں ناں کہ وہ کبھی مجھ پر طنز وطعنہ کا زور نہیں آزمائیں گے، وہ واقعی سوفٹ ہارٹ ہیں ناں؟"

شافعہ نے اُس کے بال سہلائے تھے، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھی۔"وہ جیسے بھی ہیں تم بس یہ یاد رکھا کرو، وہ شہریار صاحب کے دوست ہیں اور شہریار کا دوست بننا آسان کام نہیں ہے۔"

سونیا نے شافعہ کے چہرے پر کوئی عکس ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے عقیدت کے رنگ کے کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

"پتہ نہیں یہ عقیدت کب محبت بنتی ہے۔" سونیا نے دل میں سوچا اور ملامت سے بہن کی گود میں سر رکھ کر اپنے اور عاطف کے ساتھ ترتیب پانے والے خواب دہرانے لگی۔شافعہ کے ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ تھی، جیسے یہ مسکراہٹ اس کے ہر خواب کے لئے دعا بنتے جا رہی تھی مگر خود دعا ہی تھی جو سونیا کی زندگی کو لگ گئی تھی۔



جانانہ خالی آنکھیں لیے صوفے پر بیٹھی تھی اور سطوت جہاں پریشان سی ٹہل رہی تھیں۔

"آخر تمہیں پریشانی کیا ہے ماں؟" جانانہ نے تھکے تھکے لہجے میں سطوت جہاں کو دیکھ کر کہا مگر لہجے میں زندگی مفقود تھی۔

سطوت جہاں نے جانانہ کو دیکھا، پھر خفگی سے بولیں۔"جس کی ایک بیٹی ہو، جو ہزاروں پر بھاری ہو، وہ ایک دم خشک پتے کی طرح چرمرا جائے تو اس ماں کا کلیجہ کیوں منہ کو نہ آئے گا؟"

"ماں! یوں نہ کہو۔بس میرا کچھ دل تھک گیا ہے۔میں اب بھی تمہاری وہی بیٹی ہوں، جس پر تمہیں ناز ہوا کرتا تھا۔" جانانہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر سطوت جہاں نے ہاتھ خفگی سے جھٹک دیا۔

"رہنے دے یہ چاپلوسی، یہ محبت کے ناٹک۔مجھے تو لگتا ہے تجھے اب اپنی ماں سے پہلی والی محبت ہی نہیں رہی ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"ماں! یوں تو نہ کہو۔میرا تمہارے سوا ہے ہی کون؟ آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری پہلی والی بیٹی نہیں رہی؟" اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوال کیا اور سطوت جہاں کے لفظوں کی اُٹھان بھری، گہرا سانس لے کر بولیں۔

’’اگر تُو میری پہلی والی بیٹی ہوتی تو فنکشن اٹینڈ کرنا کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ کتنی ہائی فائی تقریبات کے انوی ٹیشن آتے ہیں، مگر تجھے تو پھر سے شیرازی کا روگ لگ گیا ہے۔ وہ بے وفا تھا، تجھے یہ بھی بھول گیا اور وہ زلفی، اس نے تجھے جانے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ تُو شیرازی کا بچہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں، کیا دے گا تجھے شیرازی کا بیٹا؟ کم نسل کی اولاد کم نسل ہی ہوگا ناں؟ کیا نشانی بتائی ہے اس نے، چاندی جیا تعویذ ہزار بچوں کے گلے میں ہوسکتا ہے۔ مگر تیری تو لگتا ہے عقل ہی سٹ گئی ہے۔ کیا کرے گی شیرازی کا بیٹا دیکھ کر؟‘‘

جانانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، خواب آگئے مگر وہ خواب بھی شبنمی تھے اور اس کا لہجہ کرلایا تھا۔

’’شیرازی کیسا بھی تھا، مگر وہ میرا بچہ اور شیرازی کی محبت تھا، میں دیکھنا چاہتی ہوں، صرف ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں کس پر گیا ہے، مجھ پر یا بالکل میرے شیرازی پر؟‘‘

’’تیرا شیرازی کہاں سے ہوگیا وہ؟ تجھے معلوم ہے ناں، وہ ایک نمبر کا......‘‘

’’ماں پلیز! اسے کچھ مت بولو۔ وہ کیسا بھی تھا میرا شیرازی تھا۔ اس نے مجھ سے محبت نہیں کی، لیکن میں نے تو اس سے محبت کی تھی ماں۔ اسے گالیاں مت دیا کرو وہ جہاں بھی ہے، جیسے بھی ہے، بس تو......‘‘

سطوت جہاں نے اثر ہوتے نہ دیکھا تو پھر سے اس کو نئی باتوں میں گھسیٹ لیا۔

’’حمزہ عابد کہہ رہا ہے تم نے شہریار والے معاملے میں بھی توجہ دینی چھوڑ دی ہے؟‘‘

’’یہ حمزہ عابد تم سے کیسے اتنا گھل مل گیا ہے ماں؟ تم تو کہہ رہی تھیں، حمزہ عابد سے بچ کر رہو، یہ اچھا آدمی ہے اور اچھے آدمی اچھے نہیں ہوتے، پشتی رئیس الگ ہوتے ہیں اور وقتی دولت کما کر امیر ہونے والے الگ۔ ماں! یہی کہا تھا ناں تم نے؟‘‘

’’ہاں، ہاں...... یہی کہا تھا۔ مگر ضروری نہیں جو ایک رائے قائم کرلی جائے، اس پر دوسری نظر نہ ڈالی جائے۔ کبھی کبھی لوگ جیسے دِکھتے ہیں، ویسے ہوں بھی، یہ ضروری تو نہیں۔‘‘

’’ہاں ماں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کبھی کبھی لوگ واقعی ایسے نہیں ہوتے، جیسے دِکھتے ہیں۔ تمام عمر، کبھی کبھی تو پرتیں ہی اُتارتے رہ جاؤ، ہاتھ کچھ نہیں آتا۔‘‘

سطوت جہاں اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتی رہیں کہ یہ جملہ یونہی سرسامی کیفیت کا پیش خیمہ ہے یا واقعی اس جملے میں کوئی حقیقت ہے۔ یہی جاننے کے لئے انہوں نے التفات سے پیش قدمی کی تھی۔ ’’ماں واری! یہ تو بتا شہریار اور عبدالرحمٰن کے بارے میں کوئی نئی پیش رفت کی تُو نے؟‘‘

جانانہ نے صوفے سے پشت ٹکادی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ”سچ پوچھو تو ماں! مجھے اب اس معاملے میں تو کیا، کسی بھی معاملے میں دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے لگتا ہے، جیسے کوئی ہے اور چپکے سے کہہ رہا ہے۔ ”جانے! آؤ...... جانے! آؤ۔“ ماں! یہ آواز اندر باہر ہر طرف سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے، یہ آواز نہیں، میں خود ہوں۔ پھر میں اس آواز سے آگے دوڑوں تو وہ مجھ سے پہلے دوڑ رہی ہوتی ہے۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں کرتا، کسی کو ان انگلیوں پر نچانے کو من نہیں کرتا۔ رہا شہریار، تو مجھے تو کبھی کبھی وہ اتنا معصوم لگتا ہے ماں! مجھے اپنی شاطر چالوں سے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ عجب انسان ہے، اسے جتنا دکھ دو، اتنا ہی سہہ لیتا ہے۔ پر اس کے گھر پر کوئی بات کرو تو جان پر کھیل جانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ماں! کیا واقعی گھر ایسی ہی مقدس جگہ ہوتی ہے، جہاں کی عزت کے لئے لوگ خاموشی سے اپنی جان پر کھیل جائیں؟ مجھے تو پتہ ہی نہیں ہے، گھر کیا ہوتا ہے؟ بنایا تھا ضرور ایک گھر، میرا اور شیرازی کا گھر۔ مگر وہ گھر تو بہت کمزور نکلا۔ ماں! تمہیں نہیں لگتا، ہم سزا صرف سے ملنی چاہئے، جس کا جرم ہو؟“ لمحہ بھر کو سطوت جہاں کو دیکھا پھر بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے ماں! ہمیں عبدالرحمٰن کی سزا پورے گھر کو نہیں دینی چاہئے۔ تمہیں پتہ ہے، وہ شہریار میری وجہ سے زندگی سے کتنا دور ہو گیا ہے؟ ماں! کبھی کبھی مجھ میں یہ احساسِ جرم مارے ڈال دیتا ہے۔“
”او میری جانے! تو بھی ناں...... آج کل کن سوچوں میں رہنے لگی ہے؟ ادھر دیکھ، یہ احساسِ جرم یہ سزا جزا ہمارے لئے نہیں ہوتی۔ ہمارے لئے صرف زندگی ہوتی ہے۔ بے حد و حساب جینے کے لئے زندگی۔ یہ سمجھ۔ چل اُٹھ، آج میں تجھے خود پارلر لے کر چلتی ہوں۔ چل اُٹھ۔ دیکھ کتنے دنوں سے میری طرف دھیان نہیں دیا تو نے۔“
جانانہ منع کرتی رہی، مگر سطوت جہاں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا کر باہر کی طرف بڑھتی چلی گئی تھیں۔



وہ اس وقت ایمرجنسی روم میں لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صدانی، ڈاکٹر نواز کے ہاسپٹل میں ابھی ابھی آئے تھے اور بہت زیادہ ہراساں تھے۔ اُس کی صورت نظر آئی تو بولے۔ ”تم اتنے اسٹرونگ ہو نہیں جتنے بنتے ہو۔ اگر اتنی تکلیف میں تمہیں راستے میں اٹیک آجاتا تو؟...... تمہیں معلوم ہے ناں، نواز کے ہاسپٹل سے زیادہ میرا کلینک قریب پڑتا ہے؟“
اُس نے پھیکے سے انداز میں ہنس کر انہیں دیکھا اور پھر آہستگی سے بولا۔ ”جب میں نکل رہا تھا، جازی کو یہ بات کچھ نہ کچھ کنفرم ہو گئی تھی کہ میں کہاں جا سکتا ہوں، اس لئے عدیل بھائی کی پریشانی سے بچنے کے لئے میں نے یہ چانس لیا۔ ویسے کنڈیشن بیڈ رہا ؤ!“

ڈاکٹر صمدانی نے نفی میں سر ہلایا۔"فی الحال تمہاری ہارٹ بیٹ اسٹیبل نہیں ہیں۔ہم دونوں مل کر تمہاری کنڈیشن سنبھال رہے ہیں۔اگر ہمیں خاطر خواہ رزلٹ نہیں ملا تو میں آج تمہارا آپریشن کرنے سے قطعاً نہیں چوکوں گا۔"

"آپ تو باندھ کر مارنے والی بات کررہے ہیں انکل!" وہ ذرا سا ٹینس ہوا تھا اور ڈاکٹر صمدانی اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ کر مدھم بولے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے، ہم جسے چین اٹیک کہہ رہے ہیں، وہ ہماری میڈیکل لینگویج میں مائنر ہارٹ اٹیک کہلاتا ہے اور ایسا بار بار ہونے لگے تو اس کا مطلب ہے رکاوٹ شدید سے شدید ترین ہوتی جارہی ہے۔تمہاری تازہ ترین انجیو گرافی کا ارادہ ہے۔کیونکہ چار ماہ پہلے والی انجیو گرافی اس وقت صورتِ حال ٹھیک طرح سے نہیں بتا پارہی۔"

"انجیو گرافی! اُووے......وہ تو آپریشن سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔آپریشن میں بندہ بے ہوش تو ہوتا ہے۔انکل! اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے فرار نہ ہو جاؤں تو یہ ارادہ بلکہ ارادے بدل دیجئے۔"

"ارادہ بدل دیجئے۔" ڈاکٹر صمدانی نے اس کا لہجہ بنا کر بولنے کی کوشش کی، پھر مدھم لہجے میں بولے۔"شہریار! کیا واقعی ہماری محبت تمہارا دامن نہیں پکڑتی؟ اگر ہاں تو یار! دنیا میں کوئی تو ایسا ہوگا، جس کے لئے تم جینا چاہتے ہوگے؟"

اس پر اُس کی آنکھوں میں ایک چمک کوندی تھی اور ڈاکٹر نواز نے مسکرا کر کہا تھا۔

"یہ چمک بتاتی ہے،کوئی ہے واقعی، سر! آپ نہیں پوچھیں گے، آخر کس کی پردہ داری ہے؟"

ڈاکٹر صمدانی کی آنکھیں اس پر آ جمیں اور وہ منمنایا۔"بہت جلد ملواؤں گا۔انکل! آپ سب سے پہلے امپرول لئے بغیر پروانہ راہداری، دل تھوڑی دوں گا۔"

"ہاں، آ...... اتنے تو فرماں بردار رہتے ہو تم۔" انہوں نے چھیڑا اور شہریار نے مصنوعی خفگی سے دیکھ کر کہا۔"کیوں انکل! کوئی شک ہے میری فرمانبرداری پر؟"

"نہیں، لیکن زیادہ ہیٹرنگ کی ضرورت نہیں۔ہم اپنا فیصلہ پوری ایمانداری سے لیں گے۔"

"پلیز انکل! یوں نہ کریں، ابھی بہت سے کام پڑے ہیں۔ابھی دیکھئے، ایڈورٹائزنگ کی ایک ورکشاپ ہورہی ہے لندن میں۔ایڈورٹائزنگ کے ایوارڈ کے لئے کیمپین چلائی ہے۔کچھ اشتہارات ہیں، دانیا کی شادی ہے اور بہت سے کام ہیں۔"

ڈاکٹر صمدانی کچھ کہے بغیر اس کی ڈرپ میں دوا کی مقدار بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ شام کو مامون کا اسے میسج آ گیا۔ دوپہر کے فون کی طرح وہ اسے بھی ٹریپ کرنے کی ادا سمجھا تھا مگر اس بار مامون نے خود ہی بات کی تھی۔ دوپہر کا سارا حال انکل صمدانی تو سنا ہی چکے تھے کہ وہ کیسے معاملے کی جڑ تک پہنچا اور کلینک سے ڈاکٹر نواز کے ہاسپٹل آئے۔ سو اس کی تفصیل سے وہ نئے سرے سے حظ لیتا رہا، یہاں تک کہ رات گئے مامون اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"اب بتا، کیا پرابلم ہے؟"

"کوئی پرابلم نہیں ہے، یہ بتا مومنہ کے کام کا کیا ہوا؟"

شہریار نے اسکیچ کا پرنٹ آؤٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

شہریار نے تصویر دیکھی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ...... یہ رفیق الزماں ہے؟"

"ہاں، یہ اس کے بہت سے فیک ناموں میں سے ایک نام ہے۔ لیکن تم بے فکر رہو مومنہ سسٹر کو اس کی قید سے بہت جلد آزادی ملنے والی ہے۔"

"مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے شوخ مسکراہٹ سے کہا۔ "اسٹریجر نے ایک دھما کا تیار کیا ہے۔ حسن ابراہیم اور اس جیسے بڑے بڑے نام ایک دھماکے کی طرح اُڑنے والے ہیں۔ سیاسی میدان میں ان کی حیثیت صفر ہونے والی ہے۔ پھر کوئی سیاسی جماعت ان کی بدنامی کو اپنے گلے کا ہار نہیں بنانے پر تیار ہوگی۔ سو حسن ابراہیم کی گرفتاری سے زوار حسن خود بخود ہمارے شکنجے میں ہوگا۔ پھر مومنہ کے لئے ڈائیورس لینا کچھ اتنا مشکل کام نہیں ہوگا۔"

شہریار تفصیل سن کر پھر سے لیٹ گیا تھا، پھر دوسرے دن ڈاکٹر نواز نے اس کی طبیعت کے مطابق سوال کیا تو وہ ترنگ میں بولا۔ "یہ سچ ہے، محبت زندگی بڑھاتی ہے لیکن ڈاکٹر نواز، یہ ہمارے انکل صمدانی ہیں ناں، ان کے ہاتھوں میں تو مسیحائی ہے مسیحائی۔ مجھے تو لگتا ہے، کسی دن میں مر بھی گیا ناں تو یہ ایسے ڈانٹ کر جھاڑ پلائیں گے کہ ڈر کر مجھے لامحالہ پھر سے زندہ ہونا پڑے گا۔"

"کر لی بکواس؟" ڈاکٹر صمدانی جو اچانک اندر آئے تھے اس کے اس جملے پر خفگی سے بولے اور وہ خاموشی سے ٹیسٹ کے لئے بلڈ دینے کے لئے مٹھی بند کر کے بیٹھ گیا۔

”اب مٹھی کھول دو۔“ ڈاکٹر صمدانی نے آہستگی سے کہا اور ان کی سرنج اس کے تازہ بلڈ سے بھرتی چلی گئی۔ وہ سرنج لے کر سائیڈ کارنر کی طرف چلے گئے اور وہ ڈاکٹر نواز سے شوخی سے بولا۔
”یہ انکل صمدانی بہت چالاک ہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے خون چرا رہے ہیں تاکہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔“
ڈاکٹر نواز ہنسنے لگے اور ڈاکٹر صمدانی اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔
اس نے ماموں کے جانے کے بعد اب اعصاب ڈھیلے ڈال دیئے تھے اور تین دن بعد وہ گھر میں تھا۔ ڈاکٹر صمدانی ایک بار پھر اس کی ضد کے آگے ہار گئے تھے۔



ڈور بیل بجنے پر عارفہ نے کچن میں سے نکل کر دروازہ کھولا تھا۔ اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ سلامہ ارسلان کو غیر متوقع دیکھ کر وہ ہراساں ہوگئی اور آج کل وہ یونہی ذرا ذرا سی باتوں پر ہراساں ہو جاتی تھی۔
”خیریت تو ہے بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ، اماں کہاں ہیں؟“ اس نے متوازن لہجہ اپنایا مگر عارفہ جانتی تھی، اس کے بھائی کے لہجے میں ہلکی ہلکی خفگی ابھی تک نمایاں تھی کیونکہ اس دن کی دھواں دھار کی گئی بحث کے بعد سے اماں نے قطعی اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اور اس بائیکاٹ کی وجہ سے وہ جان بوجھ کر شہریار کو اور خبروں میں رگید رہا تھا، لیکن آج کے بعد کیا وہ کبھی شہریار کے سامنے اسی طرح سر اٹھا کر دیکھ سکے گا۔ کیا شہریار اسے پورے دل سے کبھی معاف کر سکے گا؟“
”آپ کیا سوچ رہے ہیں بھائی؟“ عارفہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلداری سے سوال پوچھا اور وہ آگے آ کر اماں کے تخت پر بیٹھ گیا۔
”اگر میں تم سے کہوں، نائمہ ہماری زندگی میں واپس لوٹ آئی ہے تو.......؟“
عارفہ کی آنکھیں پوری طرح کھلیں اور وہ کپکپاتے ہاتھ کو اس کے کندھے پر رکھ کر روکھے لہجے میں بولے۔ ”اگر آپ اس کی غلطی معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو میں کہوں گی، نائمہ کو واپس لے آیئے۔ اگر آپ عمومی بھائیوں کی طرح اسے جان سے مارنے یا موت سے بدتر زندگی دینے کے خواہاں ہیں تو میں کہوں گی، وہ جہاں ہے، جس حال میں ہے، اسے وہیں رہنے دیجئے۔ کم از کم اس طرح میری بہن زندگی کے خانے میں تو برقرار رہے گی۔ میں سوچ تو سکوں گی کہ وہ زندہ ہے۔ خواہ ہم اسے پھر زندگی میں کبھی دیکھ نہ سکیں۔“ اس کی آنکھ آنسو رونے لگی تھی اور سلامہ نے بہن کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''کیا میں واقعی بہت برا بھائی ثابت ہوا ہوں عارفہ؟ کیا واقعی میں بہت ظالم انسان ہوں؟''

عارفہ کھڑے سے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی، پھر نرمی سے بولی تھی۔ ''آپ دنیا کے سب سے بہترین بھائی تھے، مگر نائمہ آپ کی محبت نہیں سمجھ سکی۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے بھائی! لیکن غلطی معاف کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر کوئی معاف کرنے میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں رکھتا کہ گھر سے نکلی ہوئی لڑکی کو واپس گھر آنے کی عام معافی دے سکے۔''

کسی کے ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ اُس کی پشت پر گونجی۔ وہ پلٹی بھی نہیں تھی کہ کسی کے نحیف ہاتھوں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ اس نے ایک خوش فہم سی بات سوچی اور وہ انہونی اس کے سامنے موجود تھی۔

''نائمہ بجو!......تم......نائمہ بجو! یہ تم ہو ناں؟''

وہ منہ کھولے بغیر صرف سر ہلا کر اپنے ہونے کا یقین کراتی رہی، عارفہ نے اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور نائمہ نے کہا۔

''ہمارے بھائی دنیا کے سب سے اچھے بھائی تھے مگر میں نے انہیں سمجھنے میں جتنی غلطی کی، زندگی نے اس کی بہت بڑی سزا دی ہے مجھے۔''

عارفہ کچھ نہیں بولی۔ وہ اسے بھینچ کر اس کے شانے سے سر لگائے ساون بھادوں روتی رہی۔

سلامہ نے دونوں کے سر پر ہولے سے ہاتھ رکھا اور خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کا ارادہ تھا، وہ شہریار سے ملے گا، پھر اگلے تین دن وہ شہریار کے دفتر کے چکر لگاتا رہا مگر شہریار سے اُس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور پھر یہ چوتھا دن تھا، جب اس نے اپنی گاڑی اس کے دفتر کے باہر کھڑی کر دی تھی۔ اس کا خیال تھا شاید شہریار اس سے اتنا خفا ہے کہ اب ملنا ہی نہیں چاہتا، وگرنہ یہ کیسے ممکن ہے۔ دفتر کا کوئی ایک بندہ بھی اس کی آمد اور برخاستگی کا ٹھیک ٹائم مینوئل نہ رکھ سکے اور بہت جلد گیارہ بجے اس نے شہریار کی گاڑی کمپنی گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھی تھی۔ اس کے اندر جاتے ہی اس نے بھی گاڑی کو اندر کی سمت کا راستہ دیا تھا اور بہت غیر متوقع وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ بے حد تھکا ہوا، مرجھایا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نامحسوس سی حسرت تھی۔ کوئی ان کہا سا دکھ تھا۔

''شہریار!'' اُس نے تیزی سے اسے پکارا، مبادا کہیں وہ اس سے کھو نہ جائے۔ آج پتہ نہیں یہ شہریار کے کھونے کا دھڑکا کیوں اُمڈ آیا تھا۔ کیا محبت دھڑکے کے سوا بھی کچھ اور نہیں؟ کبھی نہ ملنے کا دھڑکا، کبھی مل کر بچھڑ جانے کا دھڑکا۔

شہریار بہت حیرت سمیٹے پلٹا تھا۔ ''تم نے مجھے ہی پکارا ہے ناں؟''

"یہ کیا بات ہوئی، تمہارا ہی نام شہریار ہے۔اور کون ہے اس نام کا؟" سلامہ نے لائیڈلی کہا اور شہریار جھٹکے سے انداز میں بولا۔

"ہاں واقعی یہاں اور اتنا خوش نام۔" کون ہوگا جتنا میں ہوں لیکن تمہارے لہجے میں کوئی طنز کوئی دل جلانے والا جملہ نہیں تھا ہاں تو حیرت ہوئی کہ مجھے کوئی اتنی بے قراری سے بھی پکار سکتا ہے۔اتنی بے قراری سے کہ جیسے وہ میرے بغیر تنہا ہو جائے گا۔"

سلامہ اب اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔"تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو؟"

شہریار نے ایک خالی نظر اس پر ڈالی اور پھر ہنس کے بولا۔"میری زندگی سے واقف ہو، پھر کہتے ہو میں اتنا دل گرفتہ کیوں ہوں۔نفرتیں ختم نہیں ہوتیں، زندگی ختم ہو جاتی ہے سلامہ! زندگی ختم ہونے کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟ کام کرنے ہیں بہت سے، بہت کچھ کرنا ہے۔مگر کوئی ہے، جو کہتا ہے سب ادھورا چھوڑو اور چلو میرے ساتھ۔"

سلامہ کا دل بہت تیز تیز دھڑکا تھا۔آنکھ میں پانی بھی آیا تھا تو کیا یہ آنسو تھے جو اتنی تیزی سے اس کے بچھڑنے کے خیال سے تڑپ اُٹھے تھے؟

"شہریار! آئی......آئی ایم سوری!"

سلامہ نے لفظ کہنے میں اتنی جلدی نہیں کی تھی، جتنی جلدی اس نے اسے کھینچ کر خود سے لپٹانے میں کی تھی۔شہریار بالکل گم کیفیت میں تھا۔

"کیا واقعی تم نے مجھے محبت سے پکارا ہے ناں؟ یا پھر یہ بھی دل کو تکلیف دینے کی نئی ادا ہے تمہاری؟ تم جانتے ہو، عورت کے لئے میں کتنا حساس ہوں۔اگر ہاتھ کھینچا تو جان بھی ساتھ کھنچ جائے گی۔"

"خدا نہ کرے۔چلو تمہارے دفتر میں بیٹھتے ہیں چل کر۔"

"دفتر نہیں، کیفے ان چلتے ہیں۔"

پہلی بار شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھری تھی۔وہ سلامہ کی گاڑی میں آن بیٹھا تھا اور گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔



عدیل عبدالرحمٰن دو دن سے گھر نہیں گئے تھے۔گرین فائل کے تحت اُن کی ساری توجہ پہلے سے زیادہ معلومات کو بہتر فارم میں لانے میں خرچ ہو رہی تھی۔سطوت جہاں کی وجہ سے ان پر بہت پریشر بھی

تھا۔ اسٹرینجر بھی بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا کیونکہ لامحالہ چانس تھا کہ بات نہ مانی جائے پر عدیل عبدالرحمٰن کے ہر سورس پر چیک رکھا جانا لازمی امر تھا۔ مامون عبدالکریم بھی اسی حوالے سے مصروف تھا۔ لیکن شہریار کے کہنے پر وہ مومنہ کے معاملے سے بھی صرف نظر نہیں کر رہا تھا، پھر وہ آج مومنہ کے کہنے پر جس چائلڈ ہوم میں معلومات لے رہا تھا اس نے بہت نے راز اس پر آشکار کر کے رکھ دیئے تھے۔ وہ پوری معلومات ثبوت کے ساتھ لے کر دفتر پہنچا ہی تھا کہ عدیل عبدالرحمٰن کی گھبرائی ہوئی شکل دکھائی دی۔

''ہمیں فوراً کہیں جانا ہے قریب ترین کوئی جیپ پیٹرولنگ پر نہیں ہے، سو اس معاملے کو ہمیں خود ہینڈل کرنا پڑے گا۔'' انہوں نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے گھبراہٹ کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا۔

مامون کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ انتہائی غیر معمولی ہے ورنہ انتہائی کریٹیکل سچویشن میں بھی جب زندگی کا ایک فیصد بھی مارجن نہیں ہوتا تھا سر عدیل عبدالرحمٰن ان معاملات کو بھی ہنس کر ڈیٹ کرتے تھے۔ پھر آج نیا کیا ہوا تھا۔

اس نے سوال کیے بغیر اپنے بغلی ہولسٹر میں ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ ''اینی تھنگ رانگ سر؟''

''اسٹرینجر کا میسج آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، گرین فائل کی وجہ سے یوسفی احمد کو کسی اپنے پر شک ہو گیا ہے اور اس اپنے کے لیے اس نے شاہ فیاض اور حسن ابراہیم کے کہنے پر معاملات کو کریٹیکل کیا ہے اور اس کا خیال ہے، وہ کوئی اندر کا آدمی سلامہ ارسلان ہے اور آج سلامہ ارسلان پر اٹیکنگ پروگرام ہے اس کا۔ صبح سے اس کی کار کو فالو کیا جا رہا ہے، مگر اسے پرواہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں، آج اس کا کرائم رپورٹر والا دماغ کہاں گم ہے، ورنہ وہ فالو کیے جانے کو مارک نہیں کرتا۔''

''آپ سلامہ کے لیے اتنا پریشان ہیں؟'' مامون عبدالکریم کو حیرت ہوئی۔

عدیل عبدالرحمٰن نے ہنکارا بھر کر کہا۔ ''نو، میں سلامہ کے لیے پریشان نہیں ہو رہا، بلکہ شہریار کے لیے پریشان ہو رہا ہوں کیونکہ اسٹرینجر کی آخری اطلاع تک سلامہ، شہریار کو دفتر سے لے کر کہیں جانے کے لیے نکلا تھا۔''

مامون عبدالکریم نے اگلا کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا اسٹرینجر تک اتنی فریش نیوز کیسے فارورڈ ہوئی تھیں۔ مامون کے جسم میں سنسنی کے سوا کوئی احساس نہیں تھا۔

''آپ آج بہت سلو چلا رہے ہیں سر!''

"اس سے زیادہ اور کتنی تیز چلا سکتے ہو تم؟ جیپ اُلٹ بھی سکتی ہے۔"
مامون نے کچھ کہنے کے بجائے راستوں کی سمت نظر کی۔ وائرلیس سے کیفے اِن کا نام لیا جا رہا تھا۔
عدیل عبدالرحمٰن کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ کیفے اِن اب ان کے بالکل سامنے تھا۔ شوٹنگ پوائنٹ ہاتھ بھر کے فاصلے سے دور تھا۔ قریب ترین پٹرولنگ جیپ بھی پانچ سیکنڈ پہلے ان کی جیپ کو کور کرنے ان کے بعد پہنچی تھی اسٹرینجر نے کافی ان کا نام وائرلیس پر ڈکٹیٹ کروایا تھا، سو اب معاملہ بالکل صاف تھا۔
شہریار کافی اِن میں داخل ہوا تھا اور خالی میز کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سلامہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"آج کہیں اور نہیں، اپنی یونیورسٹی والی میز پہ چلتے ہیں۔ میں نے آج تک اس میز پر کسی غیر کو کبھی بیٹھنے نہیں دیا۔"
شہریار نے اسے شکوے سے دیکھا تو سلامہ ارسلان ہنس پڑا۔ "اس دن میں نے جان کر تمہیں اور عاطف کو دیکھ کر یوسٹی احمد کو اس میز پر کافی کی دعوت دی تھی۔ پتہ نہیں تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا یا اپنی جگہ عاطف کو دیکھ کر جیلسی فیل کی تھی۔ مگر دل نے کہا تھا، مجھے بھی کچھ ایسا کرنا چاہیے، جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، تمہارا دل تڑپ جائے۔"
شہریار نے پوری توجہ سے اسے دیکھا، پھر مدھم بولا۔ "تم نے یہ سوچا میرا دل تڑپ جائے۔ بھلے پھر میرا دل دوبارہ دھڑکے یا نہ دھڑکے۔ تم نہیں جانتے، اپنی میز پر یوسٹی کو دیکھ کر مجھے کتنی اذیت ہوئی تھی۔"
"میں محسوس کر سکتا ہوں تمہاری اس اذیت کو، کیونکہ میں خود بہت عرصے سے تمہارے دل کی اذیت سہہ رہا ہوں۔" لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "تم سناؤ، تمہاری ڈاکٹر نواز سے کیسی میٹنگ چل رہی ہے؟ کیا کہتے ہیں وہ؟"
شہریار نے اس کے سامنے رکھے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سلامہ نے فوراً پیکٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔ "میں نے سنا ہے تم اسموکنگ چھوڑ چکے ہو۔"
شہریار ہنس دیا، پھر مسکرا کر بولا۔ "جو اسموکنگ سے چڑتے تھے، وہ سگریٹ پینے لگیں تو ان پر تو یہ واجب ہو جاتی ہے، جو پہلے اسموکنگ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔" اب کی بار اس نے زبردستی سگریٹ نکال لیا تھا۔
"تمہیں ڈاکٹر نے اسموکنگ سے منع کیا ہے ناں؟"
"یہ خبر بھی رکھتے ہو، پھر مجھ سے میرے متعلق کیا فریش جاننا چاہ رہے ہو؟ تمہاری نیوز اپ ڈیٹ لینے کی مہارت پر تو مجھے پہلے بھی کبھی شک نہیں رہا تھا۔"

سلامہ کتنی دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ ”پھر دیر کیوں کر رہے ہو؟ آپریشن کروا کیوں نہیں لیتے؟ تمہیں معلوم ہے ناں، اس آپریشن میں ہونے والی دیر تمہاری زندگی کے چانس کو اور کم کر رہی ہے۔ مائل ٹیکو آ رہے ہیں تمہیں، پھر بھی تم ہو کہ اپنی ضد نہیں چھوڑ رہے۔“
شہریار نے سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنائے مگر یوں تاثر دیا، جیسے اس نے کچھ سنا نہیں اور بہت غیر متوقع بولا۔ ”بہت دنوں بعد سگریٹ پینے کا مزہ ہی الگ ہے سلامہ!“ اب کی بار شہریار نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا بھی مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔
”تم یہاں؟“ شہریار نے ڈوبتے لہجے میں سامنے کھڑے جازی عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔
”آپ سے گھر پر ملاقات نہیں ہو رہی تھی، اس لئے میں نے سوچا کہ میں یہاں کافی ان میں آپ کا انتظار کرلوں۔“ جازی کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔
شہریار نے اُس کا ہاتھ تھام کر تیسری کرسی پر بٹھا لیا تھا، وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ سلامہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اور جازی کی نظریں شہریار پر ٹکی ہوئی تھیں۔
”آپ نے اتنی بڑی بات ہم سب سے چھپا کر اچھا نہیں کیا، خاص کر دانی بجو سے۔ وہ آپ سے خوامخواہ خفا ہیں اور آپ بھی اس خفگی کو دور کرنے کے بجائے نبھائے جا رہے ہیں۔“
شہریار نے گہرا کش لیا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ ”محبت نبھانے کی اتنی بری عادت ہے مجھے کہ پھر محبت نفرت میں بدل جائے، تب میں اس نفرت کو بھی نبھانے لگتا ہوں۔“
”شیری بھائی! آپ...... کیا ہیں آپ؟“
پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتا، باہر گولیوں کی تیز آواز سے کافی ان کے ماحول میں ہراسگی پھیل گئی۔
”پلیز! باہر مت نکلئے گا۔“ سلامہ نے کھڑے ہو کر اس وقت کی ذمہ داری نبھائی اور شہریار نے کسی قیمتی متاع کی طرح جازی کا ہاتھ تھاما تھا۔
”تم اس کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نہیں نکلو گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے کہا ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“
جازی نے فق چہرے سے اُس کی طرف دیکھا اور شہریار کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر بوٹ سے مسلا اور کال ریسیو کی۔
”شہریار! کافی ان کے پچھلے دروازے سے نکلنے کی کرو۔ ہم انہیں سامنے سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سلامہ کے لئے ٹرننگ پوائنٹ تھا یہ۔“

”عدیل بھائی! کافی ان کا پچھلا دروازہ لاک ہے۔ عموماً وہ لاک ہی رہتا ہے۔“

”ہینڈل کرو۔ اس سچویشن کو جیسے چاہو ہینڈل کرو۔“ انہوں نے چیخ کر کہا۔

سلامہ لاک دروازہ کھلوا کر سب کو باری باری نکلوانے لگا۔ پھر وہ دونوں رہ گئے تھے۔ جازی سب سے آگے تھا، جب بہت اچانک سلامہ نے شہریار کو کھینچ کر اپنے آگے سے دھکا دیا تھا۔ شہریار پوری قوت سے گرا تھا۔ دوسری گولی سلامہ کے پہلو میں پیوست ہوئی تھی۔ شہریار کھڑا ہوا تھا اور اسی وقت دوسری گولی نے اس کا شانہ مضروب کر دیا تھا۔

جازی چیخا تھا۔ ”شیری بھائی......!“

مگر گاڑی فائرنگ کے بعد رکی نہیں تھی۔

”سلامہ!“ شہریار اپنی تکلیف بھول کر سلامہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور جازی فون پر چیخا تھا۔

”ڈاج دیا گیا ہے آپ کو عدیل بھائی! پلیز مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“

تھوڑی دیر گزری تھی، مامون عبدالکریم اور عدیل عبدالرحمٰن پچھلی طرف آئے تھے اور جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا، اتنے مضبوط اعصاب کے باوجود وہ ہل کر رہ گئے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن نے کسی بھی نوع کی بری سچویشن کے تحت ایمبولینس پہلے ہی کال کر لی تھی اور اب ان کا یہی عمل ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ کافی ان میں موجود دو افراد کو اس شوٹنگ میں مضروب ہونے کے بعد سلامہ ارسلان کے ساتھ ایمبولینس کے ذریعے پولیس ہسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن کے کہنے پر آپریشن کی ایمرجنسی تیاریاں پیشنٹ کے پہنچنے سے پہلے ہی کر لی گئی تھیں۔ عدیل عبدالرحمٰن نے شہریار کو سنبھالا تھا۔ گرنے کی وجہ سے اس کے سینے میں تکلیف ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عدیل عبدالرحمٰن کی جیپ بہت تیزی سے ہسپتال کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ جازی بار بار شہریار کی طرف دیکھتا اور پوچھتا۔

”آپ ٹھیک ہو ناں شیری بھائی؟“

شہریار صرف سر ہلا کر چپ تھا۔

ہسپتال میں سلامہ کا فوراً آپریشن شروع کر دیا گیا تھا۔ شہریار کو بینڈیج کے بعد نارمل ٹریٹمنٹ کے بعد صرف ریسٹ کا کہہ کر ڈاکٹر باہر آ گئے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن نے سلامہ کے گھر اس حادثے کی اطلاع

بھیج دی تھی۔
پھر شہریار شام کو نیند سے جاگا تو پہلا خیال سلامہ ہی کا آیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے اُٹھا تھا۔ ویٹنگ روم میں سب سے پہلے جس سے اس کا ٹکراؤ ہوا، وہ شافعہ تھی۔

''شہریار! وہ سلامہ...... ڈاکٹر اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں معاملہ کریٹیکل ہے، چوبیس گھنٹے تک وہ سلامہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم جانتے ہو ناں شہریار! چوبیس گھنٹے میں کتنے گھنٹے، ان گھنٹوں میں کتنے منٹ اور ان منٹوں میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں۔ میں اتنی دیر تک سولی پر لٹکتی رہوں گی؟ شہریار! اگر میرے سلامہ کو کچھ ہوگیا تو میں...... میں کیا کروں گی؟''

شہریار کو لگا ابھی کے ابھی شوٹنگ پوائنٹ پر سلامہ کی جگہ وہ گر گیا تھا۔ اردگرد تمام آرزوؤں کا خون بکھر گیا تھا اور اُس کے دلِ مُردہ کے زندہ بچ جانے کے لئے خوش فہم سا دھوکا بھی نہیں تھا۔

''شہریار! آر یُو آل رائٹ؟'' عدیل عبدالرحمن نے اس کا شانہ ہلایا۔ وہ ابھی ابھی ویٹنگ روم کی دہلیز پر آ کر رکے تھے۔ مگر شہریار کچھ کہے بغیر ہاسپٹل سے نکلتا چلا گیا تھا۔ شام گئے تک اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ پھر دوسرا دن تھا، جب بہت اچانک اس کے فلیٹ پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا، سامنے عدیل بھائی کھڑے تھے۔

''سلامہ کیسا ہے؟'' اس نے سوال کیا اور عدیل بھائی گھورتے ہوئے خاموشی سے اس کے بیڈروم میں آ گئے۔ بیڈروم کی ہر چیز تلپٹ تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ، واز سب زمین بوس تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' عدیل عبدالرحمن نے تیز نظری اور سخت لہجے میں پوچھا اور وہ جواب دیئے بغیر بولا۔

''سلامہ ٹھیک ہوگیا ہے بھائی؟''

''تمہیں اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ ٹھیک ہوگیا یا نہیں؟''

شہریار خاموش دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اُس کے کپڑوں میں سگریٹ کی بُو رچی بسی تھی۔

''تم ودن سے اسموکنگ کر رہے تھے شیری؟''

''وہ...... بس ویسے ہی......'' وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے کھڑکی کا پردہ ہٹانے لگا اور عدیل عبدالرحمن نے اس کی پشت ہوتے دیکھ کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''تم رونا چاہتے ہو؟''

شہریار نے پلٹ کر ان کا چہرہ دیکھا مگر ان کے بازوؤں سے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تم شافی کے لئے افسردہ ہو؟"

شہریار کی پلکوں میں نمی اٹکنے لگی۔

"شافی دنیا کی آخری لڑکی تو نہیں ہے یار!"

شہریار کی پلکوں میں اٹکی نمی رخسار پر پھیلنے لگی۔اُس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"رونا چاہتے ہو تو رو لو، ورنہ دل پھٹ جائے گا تمہارا۔" عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں اور لگا کوئی پہاڑ تھا جو غم سے پھٹ گیا تھا۔وہ ان کے سینے سے لگا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن اس کی پشت تھپک رہے تھے اور وہ ہراتگی سے چیخا تھا۔

"میں اس کے سامنے کھڑا تھا بڑے بھیا! مگر اسے میں نظر نہیں آیا...... وہ میرے کندھے سے لگ کر سلامہ کے لئے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔میرا دل چاہ رہا تھا، کاش، سلامہ کی جگہ میں ہوتا۔مجھے دو نہیں، دس گولیاں لگ جاتیں۔کوئی گولی ہوتی، جو میرے دل کے پار بھی ہو جاتی۔مگر شافی اگر اس طرح میرے لئے تڑپ تڑپ کر روتی تو مجھے اپنی موت پر افسوس ہوتا۔مگر اسے میں نظر نہیں آیا عدیل بھائی! اسے میں نظر نہیں آیا اور وہ میرے کندھے سے لگ کر سلامہ کے لئے روتی رہی۔سلامہ کے لئے۔کیا واقعی میری محبت اور میں اتنا بے اثر ہوں؟...... اتنا ہی بے اثر؟" وہ اُن کے بازوؤں میں مچلے جا رہا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے بہ وقت اُسے سنبھالا دیا تھا، پھر سلیپنگ پلز دے کر وہ اس کے کمرے میں ہی رک گئے تھے۔



مامون عبدالکریم، عدیل عبدالرحمٰن کے سامنے بیٹھا تھا۔مومنہ کی بیٹی کے متعلق وہ معلومات دے رہا تھا مگر اس کی ماں کون تھی، اس کا سوال ہنوز جواب طلب تھا کیونکہ کسی نے اسے بچی کو جھولے میں ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لئے آدھا معاملہ حل ہوا تھا، آدھا ابھی لاینحل تھا کہ دوپہر تک چلڈرن ہوم سے میٹرن کا فون آیا۔ایک ورکر نے اس عورت کو دیکھنے کی ہامی بھری تھی۔بات بہت پرانی تھی لیکن اگر وہ عورت اس کے سامنے ہوتی تو وہ ورکر اسے پہچان سکتی تھی۔

عدیل عبدالرحمن نے دراز سے تصویر نکالی تھی۔ "یہ دو تصویریں لے جاؤ۔ دیکھو دونوں میں سے کون ہے اس بچی کی ماں؟"

مامون نے تصویریں لفافے میں ڈالی تھیں مگر وہ اٹھا نہیں تھا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر خاموش تھا۔

"تم شہریار کے متعلق جاننا چاہتے ہو؟"

مامون نے تشکر آمیز انداز میں عدیل عبدالرحمن کی طرف دیکھا عدیل عبدالرحمن نے سکوت سے اس کی طرف دیکھا، پھر گہرا سانس لے کر بولے۔

"وہ بہت برے طریقے سے ڈس ہارٹ ہوا ہے۔ شافی نے جس طرح سلامہ کے لئے اپنی جذباتیت کوڈ کی ہے، اس بات نے اسے بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔" لمحہ بھر کو رُک کے، پھر بے بسی سے بولے۔ "مجھے سمجھ نہیں آتی ایک انسان جو ساری زندگی صرف دیتا رہتا ہے، جو کبھی اپنے لئے کسی چیز کی ضرورت پر ضد نہیں کرتا۔ قسمت جو دینا چاہتی ہے، خاموشی سے رکھ لیتا ہے۔ نہ آہ کرتا ہے، نہ شور۔ صرف وہی شخص زندگی کی ہر خوشی سے کیوں خارج رکھا جاتا ہے؟ آخر کیا قصور ہے میرے بھائی کا، اگر وہ پرستش کی حد تک اچھا ہے۔ کیوں زندگی اُس کے ہاتھ سے سب کچھ چھین لینا چاہتی ہے؟ خوشیاں، محبت، کیا اس کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے؟ مامون! ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

مامون عبدالکریم نے ان کی طرف دیکھا، پھر دل گرفتگی سے بولے۔

"جو لوگ ایثار کرتے ہیں، زندگی دیکھنا چاہتی ہے وہ کس حد تک ایثار کر سکتے ہیں۔ انسان سب کچھ قربان کر سکتا ہے، لیکن اپنی محبت کسی کے لئے قربان کر دینا بہت آسان ہے۔ اور ہماری شیری، اسے مشکل کام کرنے کی اتنی عادت ہے کہ پھر قسمت ہار سکتی ہے، وہ نہیں۔ سر! شہریار کے دل کی محبت کبھی نہ کبھی اسے ضرور ملے گی۔ محبت اتنی بے اثر نہیں ہو سکتی کہ دوسرے دل پر اثر چھوڑے بغیر گزر جائے۔"

"لیکن اگر یہ اثر وقت کے کسی فیصلے میں بہت دیر تک روک لیا گیا۔ اگر یہ فیصلہ بحق قسمت سربمہر محفوظ کر لیا گیا اور فیصلے کو اناؤنس نہیں کیا گیا تو...... تو میرے شہریار کے دلِ دریدہ کا مرہم کون سا لفظ کون سا لمحہ بن پائے گا۔ تم نہیں جانتے مگر میں نے دیکھے ہیں اس کے آنسو تڑپ تڑپ کر اس کا رونا۔ اگر شافی نے اس سے یہ نہیں کہا کہ وہ سلامہ سے نہیں، اس سے محبت کرتی ہے تو وہ جی نہیں پائے گا اور اپنے بھائی کو میں اپنے سامنے...... مامون! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کاش کوئی حل ہوتا، کاش اس سچویشن کو میں اپنے حساب سے ہینڈل کر سکتا۔"

"سر! ہم جب اتنے مجبور ہو جاتے ہیں، تبھی تو ہمیں خدا یاد آتا ہے۔"

"مامون! کیا میرے خدا کو بھی میرے بھائی پر رحم نہیں آتا؟ کیا وہ اسے زندگی کے سارے دکھوں کے ازالے کے لئے شافی نہیں دان کر سکتا؟ ایک صرف شافی؟"
مامون عبدالکریم نے پہلی بار باس سے ہٹ کر چھوٹے بھائی کی طرح انہیں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔ "میں آپ کے جذبات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں عدیل بھائی! لیکن کہتے ہیں ناں اگر وہ کسی سے کوئی چیز چھینتا ہے تو اس کے بدلے کوئی اور نعم البدل بھی دے سکتا ہے۔ اور چھین لی جانے والی خوشی یا چیز کے بدلے اس کے نامہ اعمال میں بہت ڈھیر سارا اجر اور نیکی لکھ دیتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کون سی نیکی ہمیں کہاں، کس مقام، کس گہری کھائی میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔"
عدیل عبدالرحمن نے خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "نیکی...... میرے شہریار نے ساری عمر نیکی کا اجر کمانے کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ پھر بھی اس کا دامن...... اس کا خالی دامن دیکھ کر میرا دل رُکنے لگتا ہے۔"
مامون عبدالکریم کچھ نہیں بولا۔ ان کی پشت تھپکتا رہا۔ عدیل عبدالرحمن کا موڈ معمول پر آیا تو وہ باہر نکل آیا۔
چلڈرن ہوم پہنچ کر معمول کے مطابق کارروائی میں کہیں آدھے گھنٹے بعد وہ اس پرانی ملازمہ سے مل سکا تھا۔ یہ تصویر بیگم عافیہ کے گھر میں پارٹی میں کھینچی گئی تصویر تھی۔ ملازمہ تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی، پھر اس کے لب ہلے تھے۔
"وہ یہ لڑکی تھی، حالانکہ یہ بہت سال پہلے کی بات ہے لیکن وہ یہ عورت تھی۔ یہ لڑکی تھی، بہت فرق آیا ہے اس لڑکی میں مگر چہرے کے خدوخال وہی ہیں۔"
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے خاص ایلیٹ فورس کے دفتر چلا گیا۔ عدیل عبدالرحمن یہاں زلفی مائی کی طبیعت سنبھلنے اور بے ہوشی کے ٹوٹ جانے کی اطلاع پر آئے تھے۔
"سر! وہ بچی مومنہ سسٹر کی ہی ہے۔ زلفی مائی کو اس ملازمہ نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔"
عدیل عبدالرحمن سر ہلا کر روم کے باہر کھڑے رہے تھے، یہاں تک کہ ڈاکٹرز کی ٹیم باہر آ کر حوصلہ افزا معلومات شیئر کرنے لگی۔
"اب وہ بہت بہتر ہیں، بہت مربوط گفتگو کرنے کے قابل۔ آپ جو کچھ جاننا چاہتے ہیں، جان سکتے ہیں۔"
عدیل عبدالرحمن، مامون عبدالکریم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ زلفی مائی نے انہیں دیکھا تو دکھ سے کہا۔

”میں نے سنا ہے تم ابھی تک میری بہن کے قاتل کو گرفتار نہیں کر سکے......“ لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ ”میں پہلے جانتی تھی، اسے گرفتار کرنے کے لئے دس قتل کے بھی گواہ ہوں، تم تب بھی اسے گرفتار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے اتنے گہرے تعلقات ہیں کہ کوئی اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ وہ سرعام بھی قتل کر دے، تب بھی تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب میں نے سچ بولا ہے، تب بھی تم مجبور ہو۔“

عدیل عبدالرحمن نے زلفی مائی کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ صرف جھوٹ ہے، ورنہ میں کسی بھی لمحے اسے ایک مجبور کیڑے مکوڑے کی طرح گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“ لمحے بھر کو رکے، پھر آہستگی سے بولے۔ ”جو میں نے آپ کی زبان سے بیان ریکارڈ کیا تھا، وہ حرف بہ حرف درست ہے تو پلیز اس پر دستخط کر دیجئے۔“ انہوں نے دو بیان کی کاپیاں یکے بعد دیگرے ان کے سامنے رکھیں اور زلفی مائی نے بنا چوں چرا اس پر دستخط کر دیئے۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”میں نے چلڈرن ہوم کا پتہ غلط بتایا تھا۔ پتہ نہیں، مجھے یہ کیوں لگا تھا کہ اگر میں نے صحیح پتہ بتا دیا تو میں آپ کے لئے غیر ضروری ہو جاؤں گی اور آپ اس نشلی کی طاقت کے آگے میری مظلوم بہن اور مظلوم انسان کے قتل کا کیس داخل دفتر کر دیں گے۔ اگر میں آپ کے لئے معلومات دینے کے لحاظ سے کارگر رہی تو ہی آپ مجھ سے رابطہ رکھیں گے اور تبھی میں آپ سے التجا کر سکوں گی کہ بے گناہوں کا قتل معاف کر دینے والے بھی قاتل سے کم نہیں ہوتے۔“

عدیل عبدالرحمن نے ایک لفظ نہیں کہا، ترحم سے ان کا کندھا تھپتھپاتے رہے۔ ”آپ بے فکر رہیں، آپ میرے لئے بہت قابل احترام ہیں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تو آپ کا بندوبست بیگم عافیہ نے اپنے گھر میں کر رکھا ہے، بلکہ آپ کے سارے علاج کی ذمہ داری بھی انہوں نے ہی اُٹھا رکھی ہے۔“

”عافیہ......وہ جنتی عورت ہے۔ میں ساری عمر اس لڑکی کا احسان نہیں اُتار سکتی۔“ زلفی مائی نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولی۔ ”جانے، کا شیرازی سے ایک بیٹا تھا۔“ چلڈرن ہوم کا پتہ بتا چکی تو پھر سے دکھ سے بولی۔ ”شیرازی......وہ بھی ایک وکھرا بچہ تھا۔ ہمارے ہی محلے کا تھا، لیکن بہت نیک خصلت، ہر ایک کا مددگار۔ کوشش کے باوجود اس کے اندر ہمارے محلے کی ایک بھی خصلت نہیں آ سکی تھی۔ وہ عورت کی عزت کرتا تھا۔ یہی بات مجھے اس کو عزیز رکھنے کے لئے کافی تھی۔ وہ مجھے مائی کہتا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ کچھ کچھ دنیا سے سیکھ گیا تھا۔ ایک بار میں بہت بیمار پڑ گئی تھی، تب اس نے ایک تعویذ میرے گلے میں ڈالا تھا، کہتا تھا یہ تعویذ جانے نے اسے بڑے پیر صاحب کے ڈیرے سے لا کر دیا تھا، کہتی تھی، جب تک یہ تیرے گلے میں رہے گا، تیری حفاظت ہوتی رہے گی۔ پر میں ابھاگی اُس کی اس بات کو

کبھی نہیں اور وہی ہوا، تعویذ کا دینا تھا کہ........'' مائی زلفی رونے لگی اور عدیل عبدالرحمٰن نے جان لیا کہ مائی زلفی اس وقت عقل سے ماورا صرف اندر کے جذبات میں بہنے لگی ہیں، وگرنہ ایک غیر ضروری معاملہ بیچ میں نہ لے آتیں۔ ایک لمحے کو انہوں نے ترحم سے دیکھا پھر نرمی سے بولے۔

''مائی زلفی! کیا جانا نہ کے بیٹے کے گلے میں وہ تعویذ ڈالا تھا تم نے، جو اچانک اس کے ذکر پر تمہیں یاد آیا؟''

وہ نفی میں سر ہلانے لگی، پھر آہستگی سے بولی۔ ''پتہ نہیں کیوں، مجھے شیرازی نہیں بھولتا۔ جب جانا نہ شیرازی کا نام لے کر روتی ہے تو میرے اندر اس سے زیادہ دکھ آن بیٹھتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، کاش میں وہ تعویذ بچے کے گلے میں ڈال دیتی تو اس کی حفاظت ہوتی رہتی۔ لیکن اللہ پتہ نہیں، وہ بچہ کہاں ہوگا۔ اور یہ تعویذ...... یہ میرے گلے میں پڑا ہے۔ عجیب طرح کی خود غرضی آ گئی تھی اس لمحے مجھ میں۔ میں نے بچے کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کا سوچا اور بس وہیں مار کھا گئی ایک عام عورت ہے زلفی۔''

عدیل عبدالرحمٰن نے پھر سے اسے ترحم سے دیکھا اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھا، پھر نرمی سے بولے۔ ''مائی زلفی! یہ صرف تمہاری سوچ تھی۔ وگرنہ یہ طے ہے، زندگی، عمر، موت یہ سب پہلے سے لکھی ہوئی ہیں۔ جس نے جب، جیسے جانا ہے، سب طے ہے۔ کوئی حیلہ بہانہ، دم درود اس وقت تک ہی کام آ سکتا ہے، جب تک حکم لگا فیصلہ نہ آ جائے۔ اور جب بڑی سرکار سے فیصلہ آ جائے تو پھر کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ یہ تمہاری معصومیت تھی کہ تم نے اس تعویذ کو اتنی اہمیت دی، اس کے بارے میں ایسا سوچا۔''

مامون عبدالکریم کو جانے ان جملوں سے اچانک کیا ہوا تھا، وہ بہت تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے جانے کو حیرت سے دیکھا تھا، پھر مزید تسلیاں دینے وہ باہر آ گئے اور وہ بہت غیر متوقع کوریڈور میں کھڑا آن ڈیوٹی اسموکنگ کر رہا تھا۔

''یہ کیا ہے مسٹر مامون! ڈیوٹی کے خلاف اور وہ بھی اسموکنگ۔ آپ اسموکنگ کب سے کرنے لگے؟''

''کبھی کبھی سر! جب بہت شدید ترین ٹینس ہو جاتا ہوں تو........''

''میں پوچھ سکتا ہوں آپ اس وقت کس بات سے ٹینس ہو گئے تھے؟'' عدیل عبدالرحمٰن کا لہجہ سخت اور ترش تھا۔

مامون عبدالکریم نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر بہت ٹینس لہجے میں بولا۔ ''سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا ہے سر! لیکن اگر کوئی چاہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے، وہ تمام عمر اس کو ایسے

بندھن میں جکڑ کر رکھے کہ کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دے اس کے بچھڑنے کی، تو سر! یہ لازمی حصہ سہی، لیکن اگر میرا دل چاہے، وہ منظر کبھی بھی آئے لیکن وہ منظر......... بچھڑنے کا وہ منظر میری زندگی کے کنارے سے سمٹ کر میری پتلی کے دائرۂ اختیار میں نہ آئے تو سر! کوئی دل گرفتہ کیا کرے؟ کسی کو صبر کی تاکید کرنا آسان ہے سر! لیکن وہ صبر کا مقام ہماری زندگی میں بھی رائٹ ٹائم پر آئے تو ہمیں وقت سے شکوہ ہو جاتا ہے سر! اور......... اور بس میں اس احساس سے دل گرفتہ ہو گیا تھا سر! کیا ہم آن ڈیوٹی کسی انہونی کا سوگ بھی نہیں کر سکتے؟"

"مامون! کوئی خاص بات؟" عدیل عبدالرحمٰن نے اس بار نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا تو اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"میری مما کی طبیعت آج کل خراب ہے سر! اُن کے نئے ٹیسٹ کی رپورٹ آ گئی ہے اور ڈاکٹر ان کے بائی پاس کی بات کر رہے ہیں۔ اور آپریشن دل کا ہو تو سر! سو فیصد گڈ چانس پر بھی دل کانپ ہی جاتا ہے سر! اور میں بھی آج کل ایسے ہی ذہنی کرب سے گزر رہا ہوں۔ میں ذہنی طور پر اچھی یا بری کسی بھی نوع کی خبر کے لئے خود کو تیار نہیں پاتا سر! خود مر جانا کتنا آسان لگتا ہے ناں، لیکن ہم جن سے محبت کریں، ان کے بارے میں خواب میں بھی کچھ غلط دیکھ لیں تو پھر کئی ہفتوں تک ہمیں نیند اور خواب سے چڑ سی ہونے لگتی ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے چلڈرن ہوم کا پتہ لے کر باہر نکل گئے تھے مگر سارے ریکارڈ کھنگال لینے پر بھی انہیں جاناں کے بیٹے کے بارے میں کوئی کلیو نہیں ملا تھا۔ جو بچے ایڈاپٹ کئے گئے تھے، ان بچوں کے متعلق بھی یقین سے یہ کہنا کہ ان میں سے کوئی بچہ جاناں کا بیٹا ہو سکتا ہے، ناممکن تھا۔ پرانا اسٹاف اکثر جا چکا تھا، زیادہ تر سالانہ پیری کی وجہ سے اپنی یادداشت پر بھروسہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اور جو تھے، وہ اپنے کام سے اتنے بددل تھے کہ ان کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ایک ہی جواب تھا۔ "ہم نہیں جانتے۔ دن بھر میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں اور ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بچے چلڈرن ہوم میں آتے تھے، پھر کسی خاص یا مخصوص نشانی کے بناء معلوم کرنا کہ وہ بچہ کون ہے، یہ احمقانہ سوال ہے۔" عدیل عبدالرحمٰن بھی اس جواب کی صحت پر یقین رکھتے تھے، سو بالآخر ناکام ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔



شہریار کی آنکھ کھلی تو کمرے میں لیمپ کی ہلکی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی، رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ نو بجے کا سویا ہوا آٹھ بجے جاگا تھا۔ پھر اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ لائٹ ایک دم سے آن ہو گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن دو کپ لئے کھڑے تھے۔

''کافی۔ میرے خیال میں، میں نے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا، ہے ناں؟''
وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھا، پھر پھیکے سے لہجے میں بولا۔
''بڑے بھیا! آپ بھی ناں، اتنی محبتیں دیتے ہیں اور پھر اس بات پر بھی مُصر رہتے ہیں کہ کوئی آپ کی شان میں قصیدہ بھی نہ پڑھے۔''
عدیل عبدالرحمٰن ہنستے ہوئے اُس کے بیڈ پر بیٹھ گئے، پھر شرارت سے بولے۔ ''بیٹا! یہ بھی حفظ ماتقدم ہے۔ وگرنہ تم نے شاہی دربار میں قصیدے کی پذیرائی پر کوئی بڑی چیز مانگ لی تو؟ بندہ تو دینے سے قاصر رہے گا ناں۔ ویسے تم موقع ملنے پر کیا مانگتے؟''
اس نے کافی کے بھاپ اُڑاتے کپ کو ہونٹوں سے لگایا، پھر گہرے لہجے میں بولا۔ ''شافی اور زندگی۔ مگر آپ واقعی دونوں چیزیں دینے میں ناکام رہتے۔''
عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے کپ تپائی پر رکھ دیا، پھر اُسے کندھوں سے تھام کر بولے۔ ''تم اسے بھول نہیں سکتے شیری؟ محبت کا ایک اور چانس دو گے ناں خود کو۔''
وہ ہنسنے لگا۔ بے ساختہ ہنسی رُکی تو اُس کی آنکھیں پانی سے لب لب کر رہی تھیں۔
''محبت کا ایک چانس اور دوں زندگی کو، مگر کس زندگی کو؟ کیا واقعی اس ہتھیلی میں یہ لکیر لکھی ہے؟ بڑے بھیا! خوش گمانی سے باہر نکلئے۔ یہاں زندگی نہیں ہے اور آپ ایک محبت کا چانس اور لینے کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ''اچھا ہی ہوا بڑے بھیا! شافی کی زندگی میں، میں پلس پوائنٹ نہیں۔ اگر واقعی وہ میری محبت میں مبتلا ہو جاتی تو خوامخواہ جاتے جاتے جی بھاری رہتا کہ میں کیا ہوں جو ساتھ لے جا سکتا ہوں اور کیا ہے جو میں نہیں لے جا پا رہا۔ بڑے بھیا! محبت بہت ظالم ہے۔ یہ جب ہمیں کوئی دلربا لمحہ دے رہی ہوتی ہے ناں تو چپکے سے ہمارا دل لے لیتی ہے۔ ہمارے دل کو ہوسٹیج کر لیتی ہے، پھر اپنی مانگوں سے ہمیں ستاتی رہتی ہے، ہر فرمائش پر کہتی ہے کہ اس سے محبت زیادہ پاورفل ہو جائے گی، مگر اچانک کھلتا ہے، محبت خود طاقت ور ہو جاتی ہے اور ہمیں کمزور کر دیتی ہے۔ اور میں خوش ہوں، میری محبت نے صرف میرا دل ہوسٹیج کیا، شافی کو محبت دی اور یہ سچی چاہت رکھنے والے جانتے ہیں، محبوب کو خوش دیکھ کر دل کتنی الوہی خوشی محسوس کرتا ہے۔''
عدیل عبدالرحمٰن گم صم بیٹھے تھے۔ انہوں نے اچھا یا برا کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا اور بہت دیر بعد بولے تھے۔ ''کافی پی لو تو ہم سلامہ سے ملنے ہاسپٹل چلیں گے۔ تمہارے زخم کی نئی بینڈیج بھی کروانی ہے۔''
وہ خاموشی سے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ان کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا اور عدیل عبدالرحمٰن بھرائے لہجے میں بولے تھے۔

"مومنہ کی بیٹی کلیکٹ کر لی ہے ہم نے۔ تمہیں پتہ ہے، وہ بچی کہاں ہے؟"
شہریار نے سوالیہ دیکھا اور جب جواب ملا تو حیران رہ گیا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو........" اس نے ادھورا جملہ کہا اور عدیل عبدالرحمٰن نئے سرے سے بولے۔ "تمہیں پتہ ہے، جانانہ کس کی بیٹی ہے؟" لمحہ بھر کو رُکے، پھر مسکرا کر بولے۔ "میں نے پرانے ریکارڈ کھنگالے ہیں، سو تیشم عافیہ کی بیٹی کہاں ہے، یہ سوال اب لایعنی سوال نہیں ہے۔" عدیل عبدالرحمٰن تفصیل بتانے لگے اور وہ تحسین آمیز انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔
"آپ نے تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آپ وہاں اپلائی کیوں نہیں کرتے؟"
عدیل عبدالرحمٰن مسکرائے، پھر ہولے سے بولے۔ "میں اتنی دور چلا گیا تو رابعہ کا کیا ہوگا جانِ من؟"
"بڑے بھیا! قریب کی نظر چیک کروائیے، میں اور جانِ من؟ کیوں مذاق کرتے ہیں بے چاروں سے؟"
"بکومت۔ تمہیں کیا پتہ، تم کتنے عزیز ہو مجھے۔ اگر اختیار ہوتا تو تمہیں گود لے لیتا۔"
"اب بھی تو ایسا ہی ہے بڑے بھیا!" اس نے ان کے کندھے سے سر ٹکایا، پھر اندر اٹھتی ٹیس سے مکر کر بولا۔ "سچ پوچھیں تو آپ کی محبت میرے لئے طاقت کی طرح ہے۔ آپ میرے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے لگتا ہے، میں کچھ نہیں ہار سکتا۔"
عدیل بھائی اس کو دیکھنے لگے اور وہ ایک بات یاد آنے پر شریر ہو کر بولا۔ "دو ہفتے پہلے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا شوز کے تسمے باندھ رہا تھا تو میں نے مما کو ایک بات کرتے سنا تھا۔ کیا وہ بات سچی ہے بڑے بھیا؟"
عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کون سی بات؟" وہ واقعی نہیں سمجھے تھے اور وہ ان کے کندھے سے مزید سر ٹکا کر بولا۔
"کچھ گھر کی آبادی میں اضافے کا تذکرہ تھا۔ نانو بڑی خوش تھیں۔ مما ان سے بڑھ کر خوشی کی سلور جوبلی کر رہی تھیں اور میں........ میں تو خوشی سے پاگل ہی ہو گیا تھا۔ ویسے وہ دونوں خواتین میری طرف سے قطعی بے خبر تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں، ہم جہاں جاتے ہیں، بڑی خاموشی سے جاتے ہیں، سو بڑے بھیا! پوچھنے کی بات یہ ہے عدیل جونیئر کا معاملہ بہت لیٹ نہیں لیا آپ نے؟ لائبہ دیکھئے، کتنی بڑی ہو گئی ہے۔"

عدیل عبدالرحمن بلش کر گئے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ ”واؤ...... آپ تو مشرقی ماہی کی طرح شرماتے بھی ہیں۔ ویسے دیر سے ہی سہی، آپ کو سمجھ تو آئی۔“

”شہریار اپنو گے اب تم۔ میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم زخمی ہو۔“

”آپ سورس میں ہیں بھئی۔ آپ تو یہ بھی بھول سکتے ہیں کہ میں شہریار ہوں، آپ کا سب سے لاڈلا بھائی۔“

عدیل نے مسکرا کر ترچھی نظروں سے اسے دیکھا، پھر مصنوعی خفگی سے بولے۔ ”اگر تم سمجھتے ہو تم جولی موڈ بنا کر رات بھر کی، کی گئی سموکنگ سے میری نظر ہٹا سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔“

”بھول ہی سہی، مگر بے فکر رہئے۔ اسٹار پلس کی طرح میری ایسی کوئی بھول گھر تک نہیں آئے گی۔“

”شہریار!...... آج تم کچھ اکھڑے موڈ میں نہیں ہو؟“

”میں تو شروع سے ہی اکھڑا ہوں، بس کوئی اس بات کو اون نہیں کرتا۔“ اس نے کالر اکڑانے کی ناکام کوشش کی کیونکہ تکلیف کی وجہ سے بازو اس نے فوراً ہی نیچے گرا دیئے تھے۔

”بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟“ عدیل بھائی کے چہرے پر ترحم آ گیا اور وہ منہ بسور کے بولا۔

”بہت کچھ ہو رہا ہے اندر۔ صبح سے بھوکا ہوں اور آپ نے صرف کافی پر ٹرخا دیا ہے۔ مجھے اسی بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔“

عدیل بھائی نے مسکرا کر، جیپ روک کر اس کے لئے چکن برگر کا آرڈر پلیس کروایا تھا، پھر سارے راستے وہ برگر سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ پھر ہاسپٹل میں داخل ہوا تھا تو سب سے پہلے عاطف بیگ پر اس کی نظر ٹھہر گئی تھی۔

”تم...... ابھی تو گئے تھے؟“

عاطف بیگ، سونیا کے ساتھ کھڑا تھا مگر اس کے چہرے کے اندر کوئی لفظ تھا، کوئی انہونا جذبہ تھا، جو بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا لیکن وہ اصولِ دوستی پر خاموش کھڑا تھا۔

”کیا ہو گیا بھئی، شادی سے پہلے ہی سونیا نے بولتی پہ صدمہ ڈال دیا ہے کیا؟“

”پلیز شیری بھائی! ایسا تو نہ کہیں۔“

''تو پھر کیا کہوں، Sis؟'' وہ شوخ ہوا۔ عاطف بیگ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر بند کرلیا۔ ''کتنے دن کے لئے آیا ہے؟''
''ہمیشہ کے لئے۔''
''کیا مطلب؟'' شہریار واقعی حیران رہ گیا تھا۔ تب اس نے کہا۔
''تم دونوں کو لئے سید ھے معرکے مارنے سے فرصت کب ملتی ہے؟ میں نے سوچا، میں تو بھاگ دوڑ ہی میں تھک جاؤں گا، سو کراچی ہی سیٹل ہونا بہتر رہے گا۔ یہاں زکریا بھائی کے کراچی کے بزنس کو لک آفٹر کروں گا۔ امی میرے ساتھ رہیں گی۔ بہنوں کی تو شادیاں ہوگئی ہیں، اس لئے امی ہم دونوں بھائیوں میں تھوڑی تھوڑی بہت ساری محبت کے ساتھ تقسیم ہوگئی ہیں۔''
''سونیا کا بتا دیا تو نے انہیں؟'' شہریار نے سوال کیا اور وہ ہنس کر بولا۔
''تجھے کیا لگتا ہے، امی کے بغیر میں کوئی فیصلہ لے سکتا ہوں؟ ہاں، بس ان کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے لئے تھوڑی بہت بلیک میلنگ کرنی پڑی تھی۔''
''خبیث...... تھوڑی یا بہت؟'' شہریار نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر جکڑے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس کر بولا۔
''بہت زیادہ بلیک میلنگ کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو زکریا بھائی بھی نہیں مان رہے تھے۔ لیکن جب نیند کی گولیاں کھائیں، کبھی نہ شادی کرنے کی دھواں دھار قسم کی دھمکی دی تو امی اور زکریا بھائی مان گئے۔''
''حالانکہ اگر وہ میری جگہ ہوتے تو سمجھ جاتے کہ سلیپنگ پلز کھا کر اگر خودکشی کی کوشش کامیاب ہوجاتی تو عمر بھر شادی نہ کرنے کی قسم کی حیثیت صفر سے زیادہ نہیں تھی۔''
''خبیث...... تو تو لگتا ہے، میری فاتحہ کے چاول کھانے کے لئے تیار ہی بیٹھا ہے۔'' اس نے غلطی سے اس کے کندھے پر مکا جڑ دیا، جس پر زخم تھا۔ سو شہریار ''افوہ!'' کی آواز کے ساتھ دوہرا ہو گیا تھا۔
''شہریار!...... سوری یار! مجھے نہیں معلوم تھا۔''
شہریار نے تکلیف سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''ویسے یہ معلوم کرنے کا کون سا اعلیٰ ترین طریقہ تھا؟''
سونیا، عاطف کو بری طرح سے ڈانٹ رہی تھی اور شہریار سے بے قراری سے پوچھ رہی تھی کہ اسے تکلیف زیادہ تو نہیں ہے؟
وہ صاف مکر گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر کے کہنے پر عاطف کے قریب سے گزرا تو شرارت سے بولا۔ ''دیکھی ہے اپنی ٹور؟ ہونے والی فیانسی تیری ہے، مگر......''

''بہنیں ایسی ہی ڈفر ہوتی ہیں۔''

شہریار نے زور سے قہقہہ لگایا تھا، مگر یکدم سنجیدہ ہونا پڑا تھا کیونکہ بہت زبردست ٹیس اٹھی تھی۔ پھر عاطف اور سونیا اس کے سر پر کھڑے تھے، جب اس کی شرٹ اتاری گئی۔ سونیا کے ساتھ خود عاطف کی بھی اس کی تکلیف سے آہ نکل گئی تھی۔ اس کی بینڈیج خون سے تر ہوگئی تھی اور یہ عاطف کے مردانہ ہاتھ کی طاقت کی وجہ سے تھا۔ اسٹچز پھر سے رسنے لگے تھے۔

''ٹانکے دوبارہ لگانے پڑیں گے۔'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا یہ خون کیوں نکلا؟'' ڈاکٹر نے پھر سوال کیا اور شہریار، عاطف کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

''بس، بھائی نے محبت کا مظاہرہ کیا تھا سر! اس لئے۔''

''مسٹر عاطف! اتنے کیئرلیس ہیں آپ؟''

شہریار نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔ اسٹچز کا دھاگا نکالا گیا تھا۔ زخم کی صفائی نئے سرے سے کی گئی تھی۔ پھر سے نئے ٹانکے لگے تھے۔ شہریار کا چہرہ تکلیف سے سرخ ہوگیا تھا مگر اس نے ہلکی سی کراہ بھی نہیں نکالی تھی۔ عاطف اس کی طرف سے پشت کرکے کھڑا تھا۔ سونیا روم سے ہی باہر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر کام ختم کرچکا تو شہریار کو شرٹ پہننے میں عاطف نے پوری ایمانداری سے محبت نبھائی۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا تو شہریار نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''سلامہ کیسا ہے؟''

''پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اب تو اسے ہوش بھی آگیا ہے۔''

شہریار نے کچھ اور پوچھنے کے لئے ہونٹ کھولے اور بند کرلئے مگر عاطف ایک کائیاں تھا، جو بات اس کے اندر اتنی دیر سے رکی ہوئی سناٹے میں بیٹھی خاموش پڑی تھی، وہ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔

''سلامہ تک ٹھیک ہے، مگر یہ شافی، اس کی اتنی کیئر کیوں ہو رہی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' شہریار نے انجان بن کر اسے دیکھا، پھر مطمئن لہجے میں بولا۔ ''بھئی، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں میرے بھائی! بس اس لئے۔''

''بس اس لئے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟'' عاطف بیگ نے اسے اپنے قریب سے گزرتے دیکھ کر کلائی تھام لی، اس نے چونک کر عاطف کو دیکھا۔

''خیریت؟ رومینس کا موڈ ہو رہا ہے تو کلائی میری نہیں ہونی چاہئے، سونیا کی کلائی کو چانس دو یار!''

"تم نے بھی "کافی ان" میں ایک دفعہ شافی کا ذکر بہت دل سے کیا تھا۔"
"میں تو ہر ایک کا ذکر بہت دل سے کرتا ہوں۔ ویسے اس دن یہ بات کلیئر ہوتو گئی تھی کہ میں نے اُس کا ذکر جسٹ فار جوکنگ کیا تھا یار.......!"
"یہ صرف مذاق ہے تو تمہارے والٹ میں اس کی تصویر کیا کر رہی ہے؟ میں نے خود تمہارے والٹ میں یہ تصویر دیکھی ہے۔"
شہریار کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پین اٹیک والا منظر پھر سے اُسے یاد آ گیا تھا، سو اس نے پہلی فرصت میں تصویر والٹ سے نکال کر رکھنے کا عندیہ دیا تھا خود کو۔ یہ کیا کہ مرنے کے بعد آپ یکدم ہی ایکسپوز ہو جائیں۔"
عاطف بیگ اُس کی سوچتی آنکھوں کے حصار میں اس کے قریب آ گیا تھا، پھر نرمی سے بولا۔ "کیا والٹ سے تصویر نکال دینے سے وہ تمہارے دل سے بھی کہیں نکل جائے گی؟"
شہریار کھڑے سے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "تم کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔
عاطف بیگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "تم وہی کیوں نہیں کہتے کہ جو سچ ہے... اور سچ یہی ہے کہ تم شافی سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔"
شہریار نے گہرا سانس لیا، پھر خالی لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے کمزور دیکھ کر، رنجیدہ دیکھ کر کہانی میں کوئی ٹوئسٹ آ سکتا ہے تو میں بہت ڈس ہارٹ ہو گیا ہوں۔"
"پھر تم فلمی اسٹوری کی طرح ایثار پسندی کا مظاہرہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟"
"کیسی ایثار پسندی؟ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، پھر میں خوامخواہ ولن انٹری کیوں دوں؟"
عاطف نے پھر کچھ نہیں کہا تھا اور وہ دونوں باہر آ گئے تھے۔ پھر سلامہ کے کمرے میں وہ دونوں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔
"کیسے ہو شیر جوان؟" عاطف نے مسکرا کر شوخ لہجے میں پوچھا اور سلامہ نے شہریار کی طرف دیکھا۔
"تم کیسے ہو شیری؟ بے ہوش ہوتے وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، پتہ نہیں میں تمہیں سیکیور کر سکا ہوں یا نہیں؟ مگر شکر ہے، میں ناکام نہیں رہا۔"
شہریار اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "اگر تمہیں میری وجہ سے کچھ ہو جاتا ناں تو شاید میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاتا۔"

”بکومت۔ جتنی محبت کے تم قائل ہو، اتنا تو میں ابھی تمہارے کام بھی نہیں آیا۔“

عاطف دونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر شافی کو داخل ہوتے دیکھا تو شرارت سے بولا۔ ”چھوڑیئے مس شافی! اندر آنے کا خیال ترک کر دیجئے۔ یہاں لیلیٰ مجنوں کا سوپ اوپیرا چل رہا ہے۔ ہم دونوں شاید کمرے میں اضافی کردار کی طرح لگ رہے ہیں۔“

شہریار نے عاطف کو جھینپ کر ہاتھ جڑ دیا تھا اور شافی، سلامہ کے لئے سوپ نکالنے لگی تھی۔ شہریار کچھ دیر تک بیٹھا، پھر عاطف کو چھوڑ کر وہ باہر آگیا۔ اپنی کار کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور تیز تیز سانسوں کی آواز اس کے دل میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ آواز خاموش تھی مگر اس میں جذبہ بولتا تھا۔ یہ کال اسے کافی دفعہ جھنجھوڑ چکی تھی۔

”کون ہیں آپ؟ اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”شہریار! کیا تم مجھ سے مل سکتے ہو؟“ پہلی بار خالی سانسیں لفظوں سے پُر ہوئی تھیں۔

”کون......کون ہیں آپ؟“ اس کی دھڑکن تبدیل ہوئی۔ کیا یہ وہی آواز ہے جو وہ سمجھتا تھا؟ لیکن اس آواز پر تو کتنی ہی گرد چڑھ گئی تھی، پھر یہ اچانک......

”کہاں ملنے آؤں؟“ دو ٹوک لہجہ اپنا کر پوچھا اور آواز اسے ملنے کا راستہ سمجھانے لگی۔

وہ آندھی طوفان بنا اس سے ملنے پارک میں پہنچا تھا۔ بہت کمزوری وہ لڑکی...... یکدم اُسے بہت سارے تاسف نے گھیر لیا۔

”تم......تم زندہ ہو؟“ حیرت ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

سامنے بینچ پر بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں سیلاب آگیا تھا۔ ”میں نے دنیا میں کوئی کام اچھا نہیں کیا، لیکن سب سے برا کام جو میرے نامہ اعمال میں لکھا جا چکا ہے، وہ تمہاری سادگی سے کھیلنا تھا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے جو میں آج......“

”پلیز ثانیہ! یوں نہ کہیں، میں آپ کی آج بھی اتنی عزت کرتا ہوں، جتنی پہلے کرتا تھا۔“

”تم اب بھی میری عزت کرو گے، اگر میں کہوں، میں نے تم سے جو کہا وہ محض اداکاری تھی؟“

”ہاں، میں پھر بھی آپ کی اتنی ہی عزت کروں گا۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی مجبوری تو آپ کی بھی رہی ہوگی، جو آپ نے اس کردار کو اس ڈرامے میں کرنے کی ہامی بھری۔“

”ہاں، مجبوری...... میری بہت بڑی مجبوری تھی شہریار!“ وہ جیسے گم ہوگئی، پھر دکھ سے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ ”محبت...... یہ محبت بھی کتنی بڑی مجبوری ہے ناں۔ تخت و تاج، عزت، دولت، ہر چیز کو ٹھکرانے پر مجبور کردیتی ہے۔“ لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی۔ ”ہاں، یہی محبت، اسے ہی پانے کے لئے تمہاری سادگی، تمہارے دل سے کھیلی تھی، کسی نے مجھ سے کہا تھا، اگر تم اس سوالوں کے ریشم میں اُلجھا دیئے جاؤ تو وہ مجھے میری محبت حاصل کر کے دے گی اور پھر میں نے سوچا...... اس لمحے میں نے سوچا، اگر محبت مجھے چھین کر بھی لینی پڑی تو میں کرلوں گی، مگر بعد کو کھلا، محبت چھیننے سے ملتی نہیں ہے، صرف مانگنے سے ملتی ہے۔ صرف خدا کی طرف سے کی گئی بخشش کے عوض ملتی ہے۔ مگر جب میں یہ سمجھی، بہت دیر ہوچکی تھی۔“

شہریار بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک بوجھ تھا، جو سینے سے اُتر گیا تھا اور وہ اپنی گود میں رکھی ہوئی فائل اُس کی طرف بڑھا کر بولی۔

”یہ تمہاری سادگی سے کھیلنے کا کفارہ ہے۔ اس فائل میں میری ساری جائیداد کے ڈاکومنٹس ہیں، جو اس معصوم کے لئے تحفہ ہے۔ میں نے اتھارٹی کے طور پر تمہیں اس کا گارجین مقرر کیا ہے۔“

”میں، اور گارجین؟“ وہ خالی انداز میں ہنسا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”زندگی کی ریت بہت تیزی سے پھسل رہی ہے ثانیہ جی! اور آپ مجھے ایک زندگی سے بھرپور جیون کا نگہبان مقرر کرنا چاہتی ہیں؟“ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ ”آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیجئے مس ثانیہ! جو واقعی اس کا اہل ہو۔“

”میں زرش کو کہتی ہوں لیکن وہ اس کے لئے راضی نہیں۔ تم بتاؤ، پھر میں کسے اس کام کا حق سونپوں؟“

”ایک منٹ، آپ نے کیا نام لیا؟“ وہ یکدم چونک گیا تھا۔

”زرش۔ مشہور ماڈل گرل زرش۔ وہ میری بہن ہے۔“

”اوہ اچھا، تبھی وہ آف دی اسپاٹ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرتی تھیں اور میں اس کو غلط معنی دیتا تھا۔ سوری ثانیہ! آپ زرش سے پھر ملیں تو میری طرف سے معذرت کر دیجئے گا کہ میں ان جیسی اچھی لڑکی کو سی کیٹگری دیا کرتا تھا۔ میں نے سنا ہے، ہم اگر کسی کے متعلق برا سوچیں یا کہیں، تب ہمیں اس وقت تک معافی نہیں ملتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کردے، جس کے لئے ہم نے بری رائے، بدگمان رکھا اور لمبے سفر پر جانے سے پہلے آپ کو تو معلوم ہے ناں، بوجھ جتنا کم ہو اتنا ہی آسانی سے راستہ کٹتا ہے۔“

ثانیہ کچھ نہیں بولی۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر شہریار چلنے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اس نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ "شہریار میرے گناہ بھی آج ہی معاف کردو۔ مجھے بھی بہت لمبے سفر پر جانا ہے۔"
اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، پھر بھیگے لہجے میں بولا۔ "آپ مجھے قتل کر دیتیں، میں تب بھی معاف کر دیتا مس ثانیہ! میرا دل بہت نرم ہے، میں کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ کوشش کرتا ہوں، تب بھی اندر سے محبت کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ یہ پھول کتنے پاگل ہوتے ہیں ناں، قاتل ہاتھوں کو بھی دعا دیتے ہیں۔ اتنے اذیت کوش کہ دل دُکھاؤ تو جزا کی دعا کرتے ہیں، ٹھکراتے نہیں ہیں۔ کچھ بھی ہو، چاہے الزام ہو، آلام ہو، دکھ ہو، نفرت ہو، سب کچھ دامن میں بھرتے چلے جاتے ہیں، بھرتے چلے جاتے ہیں۔"
ثانیہ کچھ نہیں بولی۔ اُس نے شہریار کا ہاتھ آہستگی سے چھوڑ دیا تھا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا کار کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر راستے میں تھا، جب اُس کے موبائل پر ایک ناپسندیدہ نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ تمام ناپسندیدگی کے باوجود اس نمبر کو ریسیو کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر یوں لگا، کسی نے اسے خاص جلانے کے لئے یہ نمبر پریس کرنے پر اُکسایا تھا۔ وہ غصے میں تلملا کر رہ گیا تھا، سو گھر پہنچا تو ماما کو جھوٹی سچی وضاحتیں دیتا وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر دھنس گیا تھا کیونکہ جس کال سے انتظار تھا، وہ اس کمرے سے ہو کر گزرے بغیر اپنے روم کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر دروازے میں آن جما تھا۔ وانیا شرمگیں مسکراہٹ لئے اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔
"وانیا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"
وانیا نے چونک کر ناپسندیدگی سے اُسے دیکھا، پھر نخوت سے بولی۔ "کیا میں نے آپ سے کچھ کہنے کے لئے التجا کی ہے؟ دیکھئے بھائی! میں بہت عدیم الفرصت رہا کرتی ہوں۔"
شہریار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر بہت ملتجی لہجے میں بولا تھا۔ "تم بہت غلط لائنوں پر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ حتی المقدور لفظوں کو سختی سے بچانا چاہتا تھا اور وانیا نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔
"آج کل میرا موڈ بہت اچھا ہے بھائی! اس لئے میں نہیں چاہتی، آپ میرا موڈ برباد کریں۔"
"وانیا! وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔" اُس نے بے بسی سے کہا اور وہ استہزاء سے ہنسی، پھر بہت برے لہجے میں بولی۔
"اچھائی کا پیمانہ اب آپ مقرر کریں گے؟ آپ؟ جو شاید اچھائی کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ پلیز بھائی! ہنسنے والی باتیں مت کیا کرو۔"

شہریار کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ اس نے دانیا کی طرف دیکھا، پھر سختی سے بولا۔ ''تم جانتی ہو اس گھر میں حمزہ عابد کے لئے کوئی راضی نہیں ہے؟''

''خواہ کوئی راضی نہ ہو لیکن میرا دل تو راضی ہے۔ اور سالار بھائی میرے ساتھ ہیں، جازی میرے ساتھ ہے۔''

''جازی کا خیال بدل چکا ہے۔ رہے سالار بھائی، تو انہیں آج تک اچھے اور برے میں تمیز کرنی کب آئی ہے؟ اگر ان کے اندر ٹھیک فیصلہ کرنے کی قوت ہوتی تو ان کی زندگی بہت بہتر ہوتی۔''

''تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے؟''

وہ پشت موڑے بولے جا رہا تھا کہ سالار عبدالرحمٰن کی تلخ آواز اسے اپنے جملوں کا پیچھا کرتی قریب محسوس ہوئی۔ وہ مڑ کر کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اس کے سر پر پہنچ گئے۔

''تم آخر ہوتے کون ہو میری ذات پر اعتراض اُٹھانے والے؟ تم اپنی زندگی دیکھو کیا ہے اس میں سوائے غلطیوں کے، برائیوں کے۔ اور رہا دانیا کی شادی کا معاملہ، تو اس میں، میں کسی اور کو دخل اندازی کرنے نہیں دوں گا۔ چاہے وہ عدیل ہو، پاپا ہوں یا ماما، پھر تم..... تمہاری وقات ہی کیا ہے تم ہو ہی کون اس کے؟''

''میں بھائی ہوں اس کا۔''

''آپ کچھ نہیں لگتے میرے۔ سن لیا آپ نے؟''

شہریار سکتے میں رہ گیا تھا۔

''دانیا!...... میں شہریار ہوں تمہارا سب سے فیورٹ بھائی۔'' وہ اتنے ملتجی لہجے میں بولا کہ کسی کا دل بھی پگھل جاتا، مگر دانیا نے پشت موڑ لی تھی اور سالار عبدالرحمٰن نے اس کے زخمی بازو کو مٹھی میں بھینچ کر کہا تھا۔

''سن لیا تم نے؟ تم کچھ نہیں لگتے دانیا کے۔ نہ دانیا کے، نہ میرے، نہ اس گھر کے۔ تم صرف ایک بوجھ ہو، ایک غلط فیصلہ جو پاپا نے اپنی زندگی میں لیا اور جسے ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔''

وہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا تھا۔ مگر سالار عبدالرحمٰن رُکے نہیں تھے۔ چوٹ بار بار زخم پر ہی لگتی ہے تاکہ زخم گہرا رہے، بھرے نہیں اور جب زخم بھر جائے، تب بھی نشان دیکھ کر بتایا جاسکے کہ یہ زخم کتنا گہرا تھا، بعد میں بھی ٹیس اُٹھتی رہے۔ وہ صوفے پر ساکت بیٹھ گیا تھا۔ قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ تبھی زندگی سے بھرپور ایک آواز سنائی دی تھی۔

''شیری بھائی! آپ یہاں ہیں؟ میں آپ کو آپ کے روم میں ڈھونڈ رہا تھا۔ شیری بھائی! یہ کیا ہوا؟'' اس نے وائٹ کوٹ پر سرخ رنگ پھیلتے دیکھ کر بے قراری سے اُسے پکارا۔ ''آپ کا زخم پھر کھل گیا۔''

"میرے زخم بھرتے کب ہیں، بس دھوکا دیتے ہیں کہ بھر گئے ہیں۔"
وہ اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ "شیری بھائی! آر یو آل رائٹ؟"
اُس کی پلکوں میں اٹکی نمی رخسار پر پھیلتی گئی۔ "کیا واقعی مجھے زندہ رہنا چاہئے جازی؟"
"کسی نے کچھ کہا تھا؟ اوہ، کہیں سالار بھائی نے تو......؟"
وہ کچھ نہیں بولا تھا اور جازی تیزی سے اُٹھ کر باہر کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ماما اس کے ساتھ آئی تھیں۔
"کیا ہوا شیری؟" ماما بھی ہونق ہوگئی تھیں۔ جازی اُس کا کوٹ اُتار کر زبردستی اُس کی شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا، مگر وہ بت کی طرح ایستادہ تھا۔
"اوہ مائی گاڈ! یہ سالار بھائی بھی ناں۔" وہ فرسٹ ایڈ باکس کھول کر کاٹن سے اس کے زخم کے اردگرد کا خون صاف کر رہا تھا۔ ماما نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا مگر اس میں پھر بھی زندگی نہیں ہمکی تھی۔ دانیا کے جملے جیسے اس کے اندر زندگی کو مار گئے تھے۔
"ماما! میں واقعی اچھا بیٹا یا اچھا بھائی نہیں بن سکا ہوں۔ آخر میں کس طرح ثابت کروں کہ میں آپ سب سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں۔ کس طرح کہوں یہ کہ آپ سب کو یقین آجائے؟"
ماما نے کچھ کہنے کے بجائے اسے کھینچ کر خود سے بھینچ لیا تھا، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ "تمہیں کسی کو یقین دلانے یا یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم کتنی محبت کرتے ہو۔ جو دل والے ہوتے ہیں ناں، وہ آنکھوں میں جھانک کر جان جاتے ہیں، محبت کتنی ہے اور کیسی ہے۔"
"پھر مام! ممی، بھائی اور یہ دانیا، یہ لوگ مجھے اتنا غلط کیوں سمجھتے ہیں؟"
"ان کے غلط سمجھنے سے تم غلط نہیں ہوجاتے۔ تم خود کو ٹیز مت کیا کرو شیری!"
اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ جازی نے اسے شرٹ پہننے میں مدد دی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے روم کی طرف جانا چاہتا تھا، مگر مام نے اسے روک لیا تھا۔
"تم آج میرے روم میں سوؤ گے۔ مجھے لگتا ہے، تمہیں ٹمپریچر ہو رہا ہے۔ وہاں کون دھیان رکھے گا؟"

''مام! رہنے دیں ناں۔کوئی زیادہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔''
مام نے اس کے چہرے پر نظر گاڑی اور پھر رونکھے لہجے میں بولیں۔
''تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی ہوں، تم کتنا ٹھیک ہو۔'' پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر ممتا سے چور لہجے میں بولیں۔''میرے اختیار میں ہوتا تو دنیا کی ساری خوشیاں ایک تمہارے دامن میں لا ڈالتی، پھر چاہے اس کے لئے مجھے کوئی بھی قیمت چکانی پڑتی۔مگر افسوس! میں بے حد مجبور ہوں۔''
شہریار نے ماما کے چہرے کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر اس کے دل کا دُکھ صاف پڑھا جا سکتا تھا۔شاید عدیل بھائی نے شافی کے معاملے میں ماما کو بریف کر دیا تھا، سوائے ان کا موڈ بدلنے کے لئے نئی ٹون بنانی پڑی۔
''کہاں مجبور ہیں آپ؟ آپ کے پاس تو کھلا آپشن ہے۔آپ مجھ پر جتنا لاڈ، جتنی ممتا نچھاور کر سکتی ہیں، کرنے میں قطعی آزاد ہیں۔اور یہاں بھی کون کم بخت کافر ہے، جو آپ کی محبت سے دامن بچانا چاہے گا۔سچ مام! آپ کی محبت ہی تو میرا زادِ راہ ہے۔''
''پھر کی وہی فضول بات؟'' مام نے اُس کا کان کھینچ لیا اور وہ مسکراتا ہوا ان کے ساتھ اٹھ کر ان کے روم کی طرف بڑھ گیا۔
جازی دونوں کو بنا جیلسی کے اتنی محبت سے ساتھ جاتا دیکھ کر مسکراتا رہا اور دل تھا کہ تہیہ کر رہا تھا کہ سالار نہ سہی، وانیا جو کچھ ہے شہریار کی زندگی میں واپس لا کر چھوڑے گا۔



آج وہ بہت اُداس بیٹھی تھی۔کچھ عرصہ سے اس کی طبیعت سے ساری شوخی، طراری نکلتی چلی گئی تھی۔اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔بھڑکیلے لباس، بھڑکیلا انداز، سب ایک بکس کے سامنے جا کر موم کے پروں کی طرح بکھر کر رہ جاتے تھے۔محبت سورج تھی تو وہ اتنے برسوں بعد آپ ہی آپ اس میں جلنے لگی تھی۔اتنے عرصے بعد پتہ نہیں کیوں اس محبت نے اس کا پیچھا لے لیا تھا۔اب وہ اس سے دامن چھڑانے کو کوئی جھوٹا محبت نامہ گھڑنے کی کوشش بھی کرتی تو اچانک سے شیرازی اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔پھر وہ اسے دیکھتی رہتی، دیکھتی رہتی، یہاں تک کہ شیرازی کا عکس دھندلا ہو جاتا اور ایک گل گوتھنا سا بچہ دہلیز پر پڑا بلکنے لگتا۔ہمک ہمک کر اس کے پاس دوڑنے لگتا۔وہ بھاگ کر دروازہ کھولتی اور سب منظر ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتا۔وہ سائیکو کیس نہیں تھی، مگر اب بن گئی تھی۔بس ایک

ہی لگن لگ گئی تھی۔

'میرا بچہ کیسا ہوگا؟ ہمارا بچہ، شیرازی کا بچہ؟'

وہ جانا نہیں تھی، ایک ماں ہوگئی تھی اور ماں کو عشوے غمزوں سے کیا کام، اُس کی بانہیں اولاد کے لمس کو چھونے کی آس میں سلگ رہی تھیں۔ سطوت جہاں اپنی ہی کچھ پریشانیوں میں مبتلا تھیں۔ صبح سے جو نکلتیں تو رات گئے لوٹتیں اور ساری رات ان کے گھر میں حکومتی اداروں کے بڑے بڑے سرکردہ افراد کی محفل جمتی۔ مگر جب بھی جانا نہ اُٹھ کر دیکھتی، سطوت جہاں کا چہرہ تاریک ہی رہتا۔

''کم بخت موجیں کرنے آجاتے ہیں، ایک چھوٹا سا کام نہیں ہوسکتا ان سے۔ ان کی تو.....'' وہ مغلظات بکنے لگتیں اور جانا نہ انہیں بت کی طرح ایسا کرتے دیکھتی رہتی کہ پھر اچانک کوئی اُس کا آنچل کھینچ کر چلاتا۔

''ڈھونڈ وماں! ماں!'' دہلیز پر پڑا بچہ پاؤں پاؤں چلنے لگتا اور وہ اس کے پیچھے دوڑتی چلی جاتی۔ اس نے اپنا موبائل تک آف کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج بہت غیر متوقع باہر نکلی تھی تو موبائل آن کرلیا تھا۔

اُس کا زیادہ تر وقت گھر میں رہ کر گزرتا تھا یا وہ چلڈرن ہوم کے بچوں میں اپنے بچے کو کھوجنے کی دُھن میں نکل آتی۔ آج بھی وہ بہت سے گفٹ لے کر چلڈرن ہوم کے گیٹ سے گاڑی اندر لے کر آئی تھی کہ اچانک کار سے اترتے ہی اُسے بیگم عافیہ کے ساتھ مراد دکھائی دے گیا تھا۔

''میم! آپ یہاں؟''

''جانا نہ! یہ تم نے اپنی کیا حالت کرلی ہے؟ کہاں تھیں تم اتنے دنوں سے؟ میں نے کتنے تمہارے گھر کے پھیرے لگائے، تمہارا فون ٹرائی کیا، لیکن سطوت جہاں نے مجھے تم سے ملنے نہیں دیا۔ وہ کہتی تھی کہ تم نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔''

جانا نہ خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ ''سوری میم! میں اپنے آپ میں ہی نہیں تھی، مجھے کسی چیز سے رغبت نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ دنوں سے پتہ نہیں، مجھے شیرازی اتنا کیوں یاد آنے لگا ہے کہ پھر کچھ بھی یاد رکھے جانے والا نہیں لگتا یا درکھے جانے کے قابل نہیں لگتا۔ میم! یہ دل ان لوگوں کے لئے کیوں دھڑکے جاتا ہے، جو آپ کے نہیں ہوتے، جو کبھی آپ کے نہیں ہوسکتے، جنہیں آپ سے محبت نہیں ہوتی۔ مگر دل پھر بھی ان کی بے وفائی کو، کج ادائی کو وقت کی کسی مجبوری کی تاویل میں سمیٹ کر اس محبت کو بچالینا چاہتا ہے؟ اس محبت کو، جو کبھی ہماری ہتھیلیوں کا نصیب نہیں بن سکتی۔''

بیگم عافیہ نے کچھ کہے بغیر اس کو خود سے لپٹا لیا تھا، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ ''تم نے کبھی سوچا کہ کیا پتہ تمہارا شیرازی بے وفا نہ ہو، مجبور ہو، صرف مجبور! وہ تم سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہو، جتنی پہلے

دن کیا کرتا تھا، مگر تمہیں بتانے سے قاصر ہو۔"

"میم! آخر وہ اتنا مجبور کیسے ہو سکتا ہے؟ دنیا کے کسی بھی کونے سے چاہے تو محبت کا پیغام بھیج سکتا تھا۔ پھر اگر میں اس کی آواز پر لبیک نہ کہتی تو محبت جتنی بار چاہے مجھے پھانسی لٹکاتی، اُتارتی پھرتی، پھر سزائے موت دیتی، میں اُف تک نہیں کرتی۔"

بیگم عافیہ نے دل سے اس کی محبت کے ملنے کی التجا کی تھی۔

وہ مراد کے پاس جا کر رُک گئی تھی۔ "تم کیسے ہو بیٹا؟"

"ٹھیک ہوں میم! لیکن آپ کو پتہ ہے، آپ پر اُداسی بالکل سوٹ نہیں کرتی میم! آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔" مراد اندر سے گفٹ بانٹ کر ابھی باہر آیا تھا، اس لئے ساری باتوں سے لاعلم تھا۔ وہ اُس کے سوگوار حُسن پر کمنٹ دے رہا تھا اور جانا نہ کو لگ رہا تھا، ان لفظوں نے اسے کسی ڈور سے باندھ کر ماضی کے کسی پاتال میں کھینچ لیا تھا۔

"او جانے! ہنسا کر۔ تیرے چہرے پر مسکراہٹ نہ ہو تو لگتا ہے، زندگی مر گئی ہے۔ ہنسا کر، تجھ پر ہنسی بڑی جچتی ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی آ گیا۔ وہ مراد کے نقوش کو ایسے چھونے لگی، جیسے بنا آنکھوں کے کوئی تحریر پڑھنے کی حسرت کرتا ہو۔

"تم میرے بہت پیارے بچے ہو مراد!"

"آپ مجھ سے زیادہ پیاری ہیں میم!" مراد نے اُس کے مخملیں ہاتھ کی پشت کو عقیدت سے چوم کر زم خوئی و دلداری سے کہا اور جانانہ سے ٹھہرنا دشوار لگنے لگا۔

مراد کے ہر ہر انداز میں اُسے شیرازی کیوں یاد آتا تھا؟ کیوں؟

وہ اندر بڑھ گئی۔ شوفر گفٹ کے پیکٹ لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا اور اُس کے ساتھ تھا، اُس کے دل کا بڑا سا 'کیوں؟' جس کا جواب لینا، حاصل کرنا وقت کے اختیار کی بات تھی۔



وہ اُداس سی بیٹھی تھیں کہ شافعہ نے ان کے سامنے شام کی چائے لا رکھی تھی۔

"تمہارے بابا کیا کر رہے ہیں؟"
شافعہ نے ماں کو ایک نظر دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ "جب سے مومنہ ملی ہے، اُن کا زیادہ وقت سونیا اور مومنہ کے ساتھ گزرنے لگا ہے۔ ایک دم سے لگنے لگا ہے، جیسے بابا پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ وہی چہکنا، وہی شاعری، وہی زندگی۔ ہاں، بس کبھی کبھی عطیہ چچی کی یاد آجاتی ہے تو پھر سے اُداس ہو جاتے ہیں۔"
"عطیہ، عطیہ عطیہ...... آخر یہ تم سب کو عطیہ فوبیا کیوں ہو گیا ہے؟ آخر کیا ہے اس عطیہ میں؟ جب وہ دنیا میں تھی، تب بھی جینے نہیں دیتی تھی اور اب مر گئی ہے، تب بھی قرض خواہ کی طرح میرا سب کچھ چھین لے گئی ہے۔ تیرے پاپا بھی اس کی حمایت کرتے تھے، ارسلان کی بھی زندگی اس سے شروع ہو کر اس پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ مجھے لگتا تھا، میں نے کوئی زہر پی لیا ہے عطیہ نام کا۔ میری زندگی، ایکٹی ویٹی، تحریک سب مر گئی تھی۔ میں جس گھر پہ حکمرانی کرتی تھی، اسی گھر میں دوسرے درجے کی شہری بن گئی تھی۔ پھر میں نے اُسے اتنا ستایا، اتنا ستایا کہ وہ گھر سے نکال دی گئی۔ مگر اب پھر سے یہ اس حرافہ لڑکی کے روپ میں میرے گھر میں چلی آئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ ہے کون عطیہ؟" آصفہ نے چائے کا کپ دیوار سے مار دیا۔ کف اُڑاتا لہجہ، جنون بھرا انداز۔ وہ شافعہ سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں مگر وہ پھر بھی اتنے تلخ سچ کو سن کر اندر ہی اندر کچھ اور شرمندگی سے دھنس گئی تھی۔ سونیا کی بات ابھی تک اس کے دل میں پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ اسے اپنی ماں سے غیریت محسوس ہوتی تھی کہ اب یہ نیا پینڈ ورا بکس کھل گیا تھا۔
آصفہ چیختی چلاتی یکدم خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگی تھیں۔ شافعہ کپ کی کرچیاں اُٹھا رہی تھی۔ آصفہ کے کمرے سے باہر آئی تو بابا کا کمرہ اسی طرح میوزک کے ردھم میں ڈول رہا تھا اور مومنہ، سونیا، بابا کے ساتھ کیرم کی بازی جمائے بیٹھی تھیں۔
اگر کبھی جو بابا کو پتہ چل گیا، وہ کرپشن سے جتنا چڑتے تھے، وہاں کے ہاتھوں اتنے ہی بڑے کرپشن کا حصہ بنا دیئے گئے ہیں تو؟...... جو لوگ کسی خاص زندگی سے چڑتے ہیں، کسی خاص بات سے، حالت سے نفرت کرتے ہیں تو پھر وقت انہیں اسی مقام پر لا کر کیوں جھونک دیتا ہے؟ تلخی کی ایسی بھٹی میں کہ جہاں سے شناخت لے کر واپس لوٹ آنا ناممکن سا ہوتا ہے۔ شاید غرور، شاید خدا کے آگے خدائی بھرے زعم کا دعویٰ انہیں اس طرح منہ کے بل گراتا ہے تاکہ جب وہ زمین کی خاک کا مزہ اپنے تالو میں محسوس کریں تو وہ کہیں ان کے دل کے قریب آ کر کہے۔
"کون ہے، جو میرے آگے دم مار سکتا ہے؟ کون ہے، جو اگر میں برا کرنا چاہوں تو تمہارے لئے خیر حاصل کر سکے؟ اور اگر میں تمہیں خیر دینا چاہوں تو تمہارے لئے برا کر سکے؟ کون ہے...... کون ہے جو

اوّل ہے، آخر ہے؟ کون ہے جو مجھ سے بہتر ہے؟''
مگر عطیہ چچی! ان کا کیا قصور تھا؟
اس نے کرچیاں ڈسٹ بن کی نذر کیں اور محسوس کیا، اس نے جیسے عطیہ چچی کے دکھ کو کسی ڈسٹ بن کی طرف اچھالنے کی عارضی سعی کی تھی۔ کیونکہ وہ پھر سے اس کے اندر بول رہی تھیں۔
''میرا قصور کیا تھا؟ محبت کرنا، بے حد و حساب محبت کرنا، صلے کی تمنا نہ کرنا کوئی جرم ہے؟ یہ محبت کے ماروں کی زندگی میں کامیابی کے سورج ان کی آنکھ بند ہونے پر بھی کیوں طلوع ہوتے ہیں۔''
وہ نئے سرے سے چائے کا پانی رکھ رہی تھی اور قریب رکھے موبائل پر میسج بیپ ہوئی تھی۔ ''کب آؤ گی؟''
اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ کوئی اتنی بے قراری سے آپ کا انتظار کر رہا ہو تو انتظار کرنے والے اور خود انتظار پر بے ساختہ پیار آ ہی جاتا ہے۔ اس نے جلدی جلدی چائے کو دم دیا تھا اور پھر چائے اور سینڈوچ بابا کے کمرے میں دے کر وہ اسپتال جانے کا کہہ کر تیار ہونے چل دی تھی۔



وہ بہت مزے سے شام کا اخبار پڑھ رہی تھی، جب اچانک جازی نے اس کی کلائی تھامی تھی۔ ''وانی بجو! میں آپ کو کہیں لے کر جانا چاہتا ہوں۔''
''لیکن اس وقت مجھے کہیں اور جانا ہے۔'' وانیا نے کلائی چھڑائی۔
تھوڑی دیر پہلے حمزہ عابد کا فون آیا تھا، اس لئے دل میں ایک ترنگ سی تھی۔ مگر جازی نے اُس کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔
''آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔'' وہ اسے زبردستی لے کر کھڑا ہوا تھا۔
''میں مام کو کہوں گی تم مجھ سے بدتمیزی کر رہے ہو جازی!''
''یہ اس بدتمیزی سے بہت کم ہے بجو! جو آپ نے شیری بھائی سے اب تک روا رکھی ہے۔''
''شیری بھائی؟........ آخر یہ شیری بھائی کا بھوت تمہیں کیونکر چڑھ گیا ہے؟ تم تو اس کیمپ کو خیر باد کہہ چکے تھے نا؟''

''ہاں،شاید میں بھی سالار بھائی کی برین واشنگ کا شکار ہوگیا تھا۔کچھ مہینوں کے لئے سہی، میں نے شیری بھائی کو برا سمجھا، لیکن اب میں چاہتا ہوں، جو غلطی میں کر چکا ہوں، آپ نہیں کریں۔''اُس نے اُسے کار میں بٹھا کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔

وانیا نے غصے سے اُسے دیکھا تھا اور وہ جو کچھ جانتا تھا، وانیا کے سامنے کہہ گزرا تھا۔اس نے ایک لمحے کے لئے بھی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔وانیا کا غصہ خاموشی کے گھپ سناٹے میں کھو گیا تھا۔اس نے ڈیش بورڈ پر سے تصویریں اس کی گود میں اچھال دی تھیں۔

''یہ ہے حمزہ عابد۔یہی ہے اس کی اوقات۔''

''جازی!ایٹ ہیو یور سیلف۔''اُس نے چیخنا چاہا،مگر اس کی آواز خود اسے اجنبی لگی تھی۔اس نے اسے ایک ہوٹل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

''بائیسویں میز پر وہ آپ کو ابھی بھی جانا نہ کے ساتھ مل سکتا ہے۔''

وانیا کل کے کھلونے کی طرح چلتی ہوئی بائیسویں میز کی پشت والی میز پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔اس کے اندر زلزلہ آ گیا تھا اور حمزہ عابد کی مخمور آواز گونج رہی تھی۔

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے؟ میں تمہیں اس حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل رُکنے لگتا ہے۔پلیز نیلم ایسا مت کرو،یہ ابھی خود کو تیاگنے کا وقت نہیں۔ابھی تو تم وقت سے جو کچھ چاہو، حاصل کر سکتی ہو،پا سکتی ہو۔پھر یہ سب کچھ کیوں چھوڑ رہی ہو؟ سطوت میم تمہاری اس حالت سے بہت ہراساں ہیں۔''

''سطوت میم......ہاہاہا......''بہت مُردہ قہقہہ اُس کے سینے سے برآمد ہوا مگر وہ کچھ نہیں بولی اور حمزہ عابد نے خود سے وانیا کا ٹاپک چھیڑ دیا۔

''اب جب کہ میں اس موڑ پر ہوں کہ تمہاری ضد منوا سکتا ہوں تو تم گیم اُلٹ رہی ہو۔یہ غلط ہے نیلم اتم......تم نے ہی تو چاہا تھا کہ تم اس لڑکی کو گھٹنوں کے بل اپنے سامنے سر جھکائے دیکھ سکو۔تم چاہتی ہو کہ تم کسی سے پوچھ سکو کہ اعلیٰ تربیت،اعلیٰ خون کے باوجود ایک لڑکی اپنی پاکیزگی کے معیار سے نیچے آئی تو کھوٹ صرف خون کے فرق کا کیونکر ہو۔تم ہی تو چاہتی تھیں کہ وہ میرے لئے گڑگڑائے، میں اس میں اتنا بس جاؤں کہ پھر میں اسے ساری دنیا چھوڑنے کا بھی کہوں تو وہ انکار نہ کرے۔میں جو کہوں، وہ آنکھ بند کر کے عمل کرے،اپنے گھر والوں تک کو میرے لئے ٹھکرا دے تو پھر اب وہ لمحہ، وہ موڑ زندگی لینے والی ہے تو تم کہتی ہو،تمہیں اب کسی گیم میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے؟ تمہیں شہریار کو تل تل کر کے مارنے کی جو حسرت تھی، وہ بھی اب پوری ہونے والی ہے،پھر بھی تمہارے اندر کوئی تحریک جنم کیوں نہیں

لیتی؟ آخر تم یہاں نہیں ہو تو کہاں ہو؟"

"شیرازی.......تم نے میرے شیرازی کے متعلق کیا پوچھا؟"

"وہ بے وفا تھا۔سطوت میم نے کہا تو تھا۔"

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم نے شیرازی کو ڈھونڈا؟" وہ جنون سے چیخی اور حمزہ عابد نے پزل ہو کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"نیلم! یہ پبلک پلیس ہے۔تم مجھے کیوں تماشا بنانا چاہتی ہو؟" نخوت سے اُسے دیکھا، پھر بولا۔"سطوت میم ٹھیک کہہ رہی ہیں تم اپنا دماغی توازن کھو چکی ہو۔رہا شیرازی تو مجھے صرف زندگی سے پیار ہے، صرف زندگی سے۔مرے ہوئے لوگوں کو تلاش کرنے کا کام کسی گورکن سے کراؤ وہی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔میرا شیرازی زندہ ہے۔تم نے سنا، میرا شیرازی زندہ ہے۔" وہ اس بار پہلی دفعہ سے بھی زور سے چیخی تھی۔

حمزہ عابد یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔

"تمہیں تماشا بننے کا شوق ہے تو بنو، مگر مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔رہی وانیا تو وہ میرے دام میں ایسی اُلجھی ہوئی ہے کہ نکلنے کی کوئی راہ ملے گی، تب بھی وہ نکلنا نہیں چاہے گی۔وہ احمق مجھ سے محبت جو کرتی ہے۔رہا میں تو تم جانتی ہو، میں گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا۔" وہ کھڑا ہو کر ٹرن ہوا، مگر وانیا کو سامنے کھڑے دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"وانیا.......!" اُس نے ہاتھ تھامنا چاہا، مگر وہ روتے ہوئے باہر کی طرف بھاگتی چلی گئی تھی۔باہر جازی نے اس کے لئے فرنٹ ڈور کھولا تھا۔پھر جتنی دیر میں حمزہ عابد باہر تک آتا، جازی عبدالرحمٰن گاڑی گیٹ سے نکالتا چلا گیا تھا۔وانیا کچھ نہیں بولی تھی، بس مسلسل روئے جا رہی تھی۔اور جازی جانتا تھا، یہ رونا اس کے لئے کتنا ضروری ہے۔موسم اور آسمان بارش کے بعد بہت شفاف، بہت چمکیلے ہو جاتے ہیں۔ایک دلکش مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھی۔



ارسلان راشدی، مومنہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے باتوں میں مگن تھے کہ اچانک آصفان کے سروں پر پہنچ گئی تھیں۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں؟"

ارسلان راشدی ان کا آنا بھی نہیں سمجھے تھے کہ اچانک سوال نے انہیں ہراساں کر دیا۔

"یہ میری بیٹی ہے آصفہ! اسے یہاں آنے کے لئے وجہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

مگر آصفہ جیسے اپنے سوال کے اندر بند تھیں، سو مومنہ کا بازو کھینچ کر بولی تھیں۔ "عطیہ! تم کیوں مجھے جینے نہیں دیتی ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے، ارسلان اب بھی تمہارا ہو سکتا ہے؟ ارسلان تمہارا نہیں ہے، یہ صرف اب میرا ہے۔ وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے، تم پھر بھی یہاں چلی آئی ہو؟ عطیہ!...... تم مر چکی ہو اور مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو انہیں پھر سے مار دینا چاہئے۔ ایک ہی قتل کی سزا دوبارہ نہیں مل سکتی۔"

ارسلان راشدی لفظوں کی ساخت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آصفہ نے مومنہ کے گلے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دبانا شروع کر دیا تھا۔

"آصفہ! تم پاگل ہو گئی ہو؟...... سونیا! سونیا!" ارسلان راشدی نے بہ دقت آصفہ کو قابو کیا تھا۔ سونیا دوڑ کر ان تک آئی تھی اور آصفہ پہلے جیسے انداز میں چیخی تھیں۔

"تو بھی اس سے مل گئی...... اس عطیہ سے، جس نے ہمیشہ مجھے دکھی رکھا، کبھی خوشی سے جینے نہیں دیا...... تو بھی سونیا!...... تو تو میری بیٹی ہے نا، پھر تو عطیہ اور ارسلان کا ساتھ کیوں دے رہی ہے؟"

"ماں! چپ کر جاؤ...... تم چپ رہتی ہو تو عافیت میں رہتی ہو۔ چپ کر جاؤ پلیز!"

"کیوں...... میں کیوں چپ کر جاؤں؟ میں بولوں گی۔ ہاں، میں بولوں گی، مجھے نفرت ہے عطیہ سے، عطیہ کے بچوں سے۔ کیونکہ اس طرح میری اولاد کا حق مارا جاتا ہے۔ ارسلان صرف عطیہ اور بچوں پر پیسے لٹانے لگا تو میری دونوں بیٹیوں کا کیا ہو گا؟"

"اماں!...... چپ، بس چپ......"

ارسلان راشدی سکتے کی کیفیت میں آصفہ کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ باتیں انہوں نے پہلے بھی کبھی سنی تھیں۔

"آصفہ بھابی خوف زدہ ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں، ہم ان کے اور سہیل بھائی کے حق کو نظر انداز کر دیں گے۔"

''بکواس مت کرو عطیہ! مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی کہ تم میری آصفہ بھابی کے متعلق اتنی چھوٹی بات کرو گی۔ تمہیں کیا معلوم، انہوں نے میرے لئے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ میرے اخراجات، میری ضرورتیں...... بھیا میرے لئے اتنے حساس تھے کہ میری زندگی کو ایک ٹھیک رُخ دینے کے لئے انہوں نے اپنی اولاد نہیں ہونے دی۔ تم نہیں جانتیں، پورے دس سال بعد اب ان کے ہاں خوشی نے رخ کیا ہے اور تم ان کے خلوص، ان کی محبت پر الزام دھر رہی ہو۔''

ارسلان راشدی ابھی تک سکتے کی کیفیت میں کھڑے تھے اور آصفہ کو سونیا ان کے کمرے تک لے گئی تھی۔

''آصفہ نے یہ کیوں کہا کہ سونیا صرف ان کی بیٹی ہے؟'' زیرک ذہن نے ایک بات کا سرا تھام لیا تو وہ مومنہ سے بھی بے پروا ہو گئے اور کسی روبوٹ کی طرح آصفہ کے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ آصفہ خود سے جو چیخ چیخ کر مسلسل بول رہی تھیں، تڑپ کر بولی تھیں۔

''مجھے زندگی بھر صحیح فیصلہ کرنا نہیں آیا۔ پہلے پہل سے شادی کا غلط فیصلہ کیا، اپنی محبت سے دستبرداری اختیار کرنی پڑی۔ بھلے جبر سے ہی سہی، مگر جب مجھے ٹھیک فیصلہ لینا پڑا، تب بھی ارسلان راشدی کا غلط فیصلہ لے لیا۔ وہ پھر رہ گیا، وہ شخص جو اس دنیا میں مجھ سے سچا پیار کرتا تھا۔ سونیا! تو بالکل اُس کی طرح خوب صورت ہے۔ تیری آنکھیں بالکل تیرے باپ پر گئی ہیں۔''

''ماں! چپ کر جاؤ۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' سونیا، ارسلان راشدی کو دیکھ کر پھر سے انہیں چپ کرانے لگی تھی مگر بات سینے سے نکل گئی تھی اور حلق نے سن لی تھی۔

ارسلان راشدی کے دل میں درد کی ایک لہر اُٹھی تھی۔

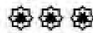
''میں صرف آپ کی بیٹی ہوں بابا! پلیز، مجھ سے ہاتھ مت چھڑائیے گا۔ میری ماں کی سزا مجھے......'' سونیا نے بلکتے ہوئے ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

ارسلان راشدی نے اس کی طرف سے پشت کر لی۔

''مجھے وقت دو۔ میں کوئی بہت عظیم انسان نہیں ہوں، بشر ہوں، صرف ایک عام سا بشر۔'' انہوں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، پھر کرلائے۔ ''آپ نے میرے ساتھ یہ داؤ گھات کیوں کیا آصفہ؟ آپ تو جانتی تھیں، مجھے کرپشن سے، بے وفائی سے کتنی نفرت تھی، کتنی زیادہ کہ صرف شک پر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی گنوا دی۔ میں نے اپنی عطیہ کو کھو دیا۔ آپ نے سنا، میں نے اپنی محبت کو کھو دیا۔ لیکن آپ کیا جانیں، یہ کھونا کیا ہوتا ہے۔ آپ کیا جانیں؟''

وہ مومنہ اور سونیا کے پکارے جانے پر بھی نہیں رکے تھے اور آصفہ آنکھیں کھولے خاموش بیٹھی تھیں۔ لگتا تھا، کسی چابی کے کھلونے کی چابی ختم ہوگئی تھی۔ وہ بالکل بت کی طرح بیٹھی تھیں۔ شام کی نارنجی کرنیں کمرے میں در آئی تھیں۔ ان کا چہرہ ان نارنجی شعاعوں سے دھندلا گیا تھا۔

سونیا مومنہ سے لگ کر رو رہی تھی۔ مومنہ اسے چپ کرا رہی تھی۔ وہ سونیا کے دکھ سے واقف تھی۔ اسے اپنے بابا کا دکھ ہراساں کر رہا تھا۔ اس لمحے اسے شہریار عبدالرحمٰن کی یاد بے ساختہ آ رہی تھی۔ شہریار اس کی زندگی میں بہت اچانک آیا تھا اور بہت انہونے موڑ سے اس کی زندگی کو بھر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اپنے موبائل پر اس کا نمبر پریس کرنے لگی تھی۔



یہ ممکن تو نہیں لیکن
چلو یونہی ذرا ہم سوچ کر دیکھیں
سمندر کا کنارہ ہو
صبا نے رات کے ماتھے پہ چپکے سے
کسی کا نام لکھا ہو
تو اٹھتی موج وہ اک نام پڑھ کے
مسکرائی ہو
ہمارے ہاتھ میں وہ ہاتھ ہو
جس کی لکیروں میں
کوئی تارہ ہمارے نام کا روشن نہیں ہوتا

وہ آنکھیں
جن میں جلتے آرزو کے
ہر دیے کی لو میں اک چہرہ ابھرتا ہے
(کسی خوش بخت ہستی کا)
وہ آنکھیں صرف اک چہرے کو دیکھیں
اور وہ چہرہ ہمارا ہو
یہ ممکن تو نہیں لیکن
چلو یونہی ذرا ہم سوچ کر دیکھیں
طلب کی آرزو
حرفِ دُعا بن کر
ہمارے لب سے نکلے
اور پوری ہو
ہمارے دامنِ دل میں
پڑے ناکامیوں کے سارے سکے
کھنکھنا اُٹھیں

یہ ممکن تو نہیں لیکن
چلو یونہی.......
دانیا نے آج کئی مہینوں بعد اس کے کمرے کی صفائی کی تھی اور اس کی الماری میں رکھی ڈائری کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نظم نے اس کی توجہ خود بخود کھینچ لی تھی۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی نظم پڑھ کر ڈائری بند کر رہی تھی کہ ایک تصویر اس میں سے پھسل کر اس کے قدموں میں گر گئی تھی۔ تصویر میں شہریار سامنے کے رخ پر کھڑا تھا اور شافعہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی کہیں اور متوجہ تھی، مگر شہریار کی آنکھوں کی توجہ اس کے گرد ہی بکھری پڑی تھی۔
''بھائی، شافی سے پیار کرتے ہیں، مگر شافی تو.......'' دانیا کے دل کو ایک نئے دُکھ نے جکڑا تھا۔
''یہ بھائی بھی کیا ہیں، جس سے محبت کرتے ہیں، وہی ان کے ہاتھ سے صبر کے دامن کی طرح پھسل کیوں جاتا ہے؟ میں نے بھی تو بھائی کا کتنا دل دُکھایا ہے۔ کیا بھائی پھر مجھ سے پہلے کی طرح بات کر سکیں گے؟ شاید عادات کے طور پر ضرور، مگر دل سے تو اب وہ مجھے پہلی والی دانیا کی طرح ٹریٹ تو نہیں کریں گے، جی بھر کے مجھ سے ناراض ہوں گے۔ میں نے ان کا دل بھی تو بہت دکھایا ہے۔'' یکدم کچھ دن پہلے کا جملہ اس کے دل میں گونجا۔
''کچھ نہیں لگتے آپ میرے۔ سن لیا آپ نے؟''
ایک اتھاہ شرمندگی! اُس نے یونہی ڈائری کے صفحے پلٹے۔ لکھا تھا۔
''آج دانیا نے بھی مجھے موت دے دی ہے۔ میں ایک انسان ہوں۔ موت ایک ہی ملنی چاہئے، لیکن محسوس کرتا ہوں کہ زندگی میں جتنا جینے کا سزاوار نہیں ہوا، اس سے کہیں زیادہ موت کی تلخی کا مزہ چکھا ہے۔ آپ ایک بار مر جائیں، کسی دل میں صبر آ جاتا ہے۔ مگر آپ بار بار موت کی سزا کے لئے تجویز کئے جائیں تو قرار کھوتا جاتا ہے۔ آج میرے دل کا رہا سہا قرار بھی کھو گیا ہے۔ میرے پاس جینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو لوگ اب میری محبت میں مبتلا ہیں، کیا واقعی وہ یہ سمجھتے ہیں، شہریار زندہ رہ گیا ہے؟.....'' پھر ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔
دانیا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے آنچل سے آنکھیں صاف کیں۔ پھر پڑھا لکھا تھا۔

"پتہ نہیں، محبت کی قسمت میں یہ سزا کیوں لکھی ہے کہ آپ جب اس کے پیچھے بھاگتے ہیں، یہ آپ کو نہیں ملتی۔ جب آپ اس کا ذائقہ تک بھلا چکے ہوتے ہیں تو یہ آپ کے رگ و پے میں شیریں تر ذائقے کی طرح گھلنے کو مچلنے لگتی ہے۔ میں نے بھی اس کی بہت طلب رکھی مگر اب جبکہ میرے پاس وقت نہیں بچا تو یہ ساری محبت روپ بھر کر سامنے آتی ہے اور کہتی ہے، مت جاؤ، زندگی جیو، مجھے جیو۔ مگر زندگی کتنی کم رہ گئی ہے۔ زندگی بہت کم رہ گئی ہے اور وانیا کی نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا میں اس کی نفرت لے کر سکون سے مر سکوں گا؟ ایک طرف وانیا ہے اور ایک طرف شافی، مگر دونوں میں سے کسی کے دل میں میرے لئے میری طلب نہیں ہے۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں، کسی کے دل میں میرے لئے ہوک نہیں اُٹھے گی۔ میں بھی کیا زندہ آدمی تھا، جسے محبت نے نہ جینے دیا نہ چین سے مرنے دے گی۔ مگر کاش! ایسا ممکن ہو کہ جب میں اس زندگی سے منہ موڑوں تو وانیا اور شافی کا دل میرے لئے دکھ سے بھر جائے۔ وہ مجھے تڑپ تڑپ کر رو ڈالیں۔ تب مجھے لگے گا، میری محبت رائیگاں نہیں گئی۔ مگر یہ ممکن کہاں ہے؟ یہ تو خواب ہے۔ خواب بھی دیوانے کا...... میں خود سے کہتا ہوں تم تو زندگی میں ہی مر چکے ہو۔ بس سمجھتے ہو کہ زندہ ہو۔ حالانکہ اب تو صرف مٹی کو مٹی کے سپرد کرنے کی رسم رہ چکی ہے۔ ورنہ اندر ہی اندر تم کب کے خاک ہو چکے ہو۔ لیکن کیا یہ خاک کبھی محبت کی مدھ چکھے گی؟"

وانیا سے آگے نہیں پڑھا گیا۔ اس نے ڈائری جگہ پر رکھی، پھر اُٹھنے لگی تھی کہ سائیڈ ٹیبل پر لگی کیلنڈر کی تاریخ پر اس کی نظر جا کر ٹِک گئی۔ آج دس نومبر تھی، مگر تاریخ پچیس ستمبر پر رُکی ہوئی تھی۔

وہ تاریخ بدلنے والی تھی، جب اچانک وہ اندر سے ہل گئی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پچیس ستمبر کو بھول گئی۔ کتنے سالوں سال سے اس تاریخ کو سیلیبریٹ کرتے کرتے صرف چند مہینوں کی جدائی نے اس کے اندر میموری فالٹ کر دیا تھا۔

"شہریار بھائی کا برتھ ڈے میں بھول گئی...... میں کیسے بھول گئی؟" ایک نئے دکھ نے دل کا دامن پکڑا اور کہیں قریب وہ پکارا۔

"اتنا دھیان مت رکھا کرو وانی ڈیئر! کبھی یہ برتھ ڈے وِش بھول گئیں تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا، مگر یہاں اس دل میں کوئی اُمید مر جائے گی، بلکہ زندگی مر جائے گی۔ اور یہ بھلا دیا جانا، میں اور میرا دل برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"واہ، یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے آپ کا برتھ ڈے بھول جائے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" وانیا نے زعم سے کہا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا، اگر ایسا کبھی ہو ہی گیا تو پھر بتاؤ، کیا سزا دی جائے؟"

''آپ بتائیے، پھر کیا سزا دیں گے یا دینا چاہیں گے؟'' شوخی سے پوچھا۔
اور اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بہت جذب سے کہا۔ ''ایسا ہوتا تو اگر چہ ناممکن ہے، لیکن کبھی ایسا ہوا ناں تو پھر تمہیں دوبارہ کا موقع نہیں دوں گا۔''
''کیا مطلب؟ یہ کیا بات ہوئی؟''
اُس نے اسی انداز میں دیکھا، پھر کہا۔ ''مطلب یہ کہ پھر تمہیں دوبارہ سالگرہ منانے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم تو جانتی ہو، ہم اور ہماری سزائیں بھی وکھری ہوتی ہیں۔''
وہ کچھ نہیں سمجھی اور وہ کرسی پر بیٹھ کر مدھم لہجے میں وضاحت کو بولا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے تم میرا برتھ ڈے وِش بھولو گی تو تمہارا بھائی یہ اگنورنس برداشت کر سکے گا؟ سو جب ہم ہی نہ ہوئے تو کس کا برتھ ڈے مناؤ گی؟''
''شیری بھائی! خدا کے لئے، ایسی خوف ناک باتیں مت کریں۔ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔''
''ناراض ہو کر دیکھو۔ نہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کیا تو کہنا کس بھائی سے پالا پڑا تھا۔''
اور اب وہ یہ غلطی کر چکی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی، خاموشی سے اس کی پسندیدہ کتاب، کیسٹ اور پرفیوم پیک کروا کر واپس لوٹی اور چپکے سے سرپرائز دینے کے لئے ماما کے کمرے کی سمت چل پڑی تھی۔
کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک دل آیا، وہ اسے جگا دے، مگر دوسرے ہی پل اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ گفٹ اور پھول اُس کے سرہانے رکھ کر اُس نے ایک نظر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر پشت موڑ کر چلنے لگی تھی کہ بہت تھکے ہوئے، مدھم لہجے میں اُسے پکار لیا گیا۔
''جا رہی ہو؟...... ابھی تک غصہ ختم نہیں ہوا مجھ پر؟''
اُس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ سرخ انگارہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ نیند کا خمار تھا، کچھ بلڈ پریشر کا اثر۔ وہ آدھے وجود سے اس کے بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔
''کچھ بولو گی نہیں؟'' اس نے لگاؤ سے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ روٹھی لہجے میں ہو کر بولی۔ ''میں جب جانتی ہوں، میری غلطی اتنی بڑی ہے کہ معاف نہیں کی جا سکتی تو میں آپ کو کسی امتحان میں کیوں ڈالوں؟''
''اچھا! اتنا سا سمجھی ہو اپنے بھائی کو اب تک؟'' شہریار نے گہرا سانس لیا۔ جذباتیت ہمیشہ اس کے سینے کا درد ایسے ہی بڑھا دیا کرتی تھی۔ دانیا اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی، کچھ بولی نہیں تھی اور اس نے پہلے کے سے انداز میں اس کے بالوں کی لٹ کھینچی تھی، پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔

''میرا خیال تھا، میں جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں، اس کی غلطی شاید کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ مگر آج مجھے پتہ چلا، ہم جس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، اس کی غلطی چاہے کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو، اسے غلطی کا مارجن بھی سب سے زیادہ دیتے ہیں۔ اس کی غلطی پر خود ہی تاویلیں دیتے ہیں۔ اور معاف کرنے کا وقت آئے تو محبت، ہمیں ہماری محبت خفا رہنے ہی نہیں دیتی۔ پہلی فرصت میں معاف کرنے کی سعی کرتی ہے۔''

''مگر میں چاہتی ہوں، آپ مجھے کبھی معاف نہ کریں۔''

''واہ........ یہ بھی اچھی ضد ٹھہری تمہاری۔'' لمحہ بھر کو اسپیس لیا، پھر دلار سے بولا۔ ''تم لوٹ آئی ہو، میرے لئے یہی بہت ہے۔ شکر ہے، اب چین سے مر تو سکوں گا۔''

''پھر کیں مرنے کی باتیں؟ آپ میرے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے کسی دن۔''

شہریار کا بے ساختہ قہقہہ اس کے معصوم غصے پر چھٹنے لگا تھا۔ شہریار نے گیلی آنکھوں سے اُسے دیکھا، پھر سے وانیا کو مخاطب کیا۔

''یہی انداز تو مس کر رہا تھا بہنا! اب تم آ گئی ہو تو سچ بتاؤ، کون کافر ہوگا، جو مرنا چاہے گا؟ ابھی تو بہت جینا ہے، مائی لعل ڈول! تمہارے لئے بہت سارے خواب دیکھے ہیں، جب تک وہ پورے نہ ہوں، آنے جانے کا پروگرام کینسل۔''

''میرے لئے خواب؟ آپ کے اپنے خواب، ان کا کیا ہوگا؟'' وہ شافی کے متعلق جاننا چاہ رہی تھی۔

شہریار نے پشت کے نیچے تکیہ رکھ کر خود کو اونچا کیا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''وانیا بیٹا! بات یہ ہے کہ میری آنکھوں کے خواب کسی اور کی آنکھوں نے اُدھار لے لئے۔ میں پہلے بہت تڑپا اس بات پر، مگر پھر ان چمکیلی آنکھوں میں ان خوابوں کو زیادہ خوش رنگ ہو کر جیتے دیکھا تو پھر دستبرداری اختیار کرلی۔ اور پھر یہ بھی تو ہے، تمہارے خواب، تم سب کے خواب بھی اتنے سارے ہیں کہ کئی سال کہیں نہیں گئے۔''

''یہ ہوئی نا بات۔ یہی اسپرٹ چاہئے بیماری سے لڑنے کے لئے۔'' وانیا کا چہرہ کھل گیا اور شہریار اس کے چہرے کی خوشی کو دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہا کہ اگر یہ لمحہ جو بہت جلد یا بدیر آنے والا ہے، ان آنکھوں سے ٹکرایا تو ان آنکھوں کے آنسو اسے کتنا تڑپائیں گے۔

''آپ میرے ساتھ ہیں، پھر میں کیوں رونے لگی؟ آپ مجھے روتے دیکھ کر برداشت کرسکیں گے؟''

وہ چھیکے سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ نہیں بولا اور سائیڈ پر رکھے ہوئے موبائل کے وائبریٹ ہونے پر چونکا۔ ''یہ یقیناً ماما کی محبت تھی۔ انہوں نے موبائل آف نہیں کیا تھا، لیکن ٹون بند کردی تھی تاکہ وہ پُرسکون سو سکے۔ اُس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی گھبرائی آواز......

''مومنہ! کیا ہوا بھئی؟ کیوں پریشان ہو؟...... کیا انکل کہیں چلے گئے ہیں؟...... اچھا، تم بہت دیر سے کال کر رہی تھیں۔ سوری بہنا! میں سو رہا تھا۔ نہیں، کوئی ڈسٹرب نہیں ہوا...... ارے میں وزیراعظم نہیں ہوں، تمہارا نکما سا بھائی ہوں صرف...... تم کبھی بھی کسی بھی وقت مجھے رنگ کرسکتی ہو...... اوکے، پانچ منٹ، میں انکل کے ساتھ گھر آتا ہوں۔ پھر پوچھوں گا، یہ نوبت کیوں آئی۔'' اس نے موبائل آف کیا، پھر دانیا کی طرف دیکھا تو ناراضگی اس کے لہجے پر آکر ٹک گئی تھی۔

''یہ مومنہ آپ کی بہن کب سے ہوگئی؟''

وہ ہنس دیا۔ ''وہ جیلسی۔ بھئی پاپا کے دوست کی بیٹی ہے۔ وہ بہت عرصے بعد گم ہوئے ہوئے ملی ہے۔ مجھے بھائی کہتی ہے، اس لئے کہ ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تم ذرا نرمی سے سوچو۔''

''ان کا بھائی نہیں ہے کی وضاحت؟'' وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

موڈ آف تھا اور وہ پھر جان کنی میں مبتلا ہوگیا تھا۔

''نعلینہ بجو ہیں، انوشے بجو ہیں، دائمہ، مومنہ اور سونیا ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آپ کے پاس تو ایک لمبی لسٹ ہے۔ دانیا تو اب کہیں آئے گی ہی نہیں۔''

''واہ، دانیا گئی کہاں ہے جو آئے گی؟ بابا! تم جو ہو میرے لئے، وہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔''

''بس رہنے دیں آپ۔'' اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

''پھر ناراض ہونے کی کر رہی ہو۔ دیکھ لو، کھو دو گی مجھے۔''

''رہنے دیں آپ۔'' اس نے چھڑایا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر والہانہ پن سے رکھ دیا اور وہ شوخی سے مسکرا دیا۔

''بہت اچھامہرہ ملا ہے بھئی، جہاں ہاتھ سے نکلنے لگیں، وہیں زندگی اور موت کی منظر کشی کروں گا۔اس طرح پارٹی نہیں بدل سکوگی۔''
وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔ ''آئی ایم سوری بھیا! میں واقعی بہت تھکی ہوں۔''
''پٹو گی اگر میری کیوٹ Sis کو کچھ کہا تو۔'' وہ اٹھا، پھر یکدم بیٹھ گیا۔
''کیا ہوا؟'' اُس نے پسینے سے تر پیشانی دیکھ کر پوچھا اور وہ بے وقت مسکرا کر بولا۔
''کچھ خاص نہیں۔تمہارے واپس آنے کی خوشی برداشت نہیں کر پا رہا، کم بخت۔''
''آپ کی طبیعت خراب ہے ناں، مت جائیں۔'' اُس نے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ مسکرانے لگا۔
''تم ساتھ ہو ناں، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔تم نے سات ماہ ناراض رہ کر جو سات سال کم کئے تھے، وہ ایک دن کی خوشی سے یکدم ایک صدی جتنا بڑھا دیئے ہیں۔ڈونٹ وری ڈانی! میں ابھی آتا ہوں۔ پھر مل کر آئس کریم کھائیں گے۔''
دانیا نے ڈرتے ہوئے دل کے ساتھ اسے جانے دیا تھا۔ماما نے اسے شام گئے نکلتے دیکھا تو برملا پوچھا۔
''کہاں جا رہے ہو شیری! تمہیں تو ٹمپریچر تھا ناں؟''
''اوہ، مام! کچھ خاص نہیں۔ایک ضروری کام آگیا ہے، ایک گھنٹے تک واپس آتا ہوں۔''
دانیا نے ماما کے کہنے پر سوچا، واقعی اس کے ہاتھ کتنے گرم تھے مگر وہ یہ بات بھی مس کر گئی۔دوبارہ سے اس کے قریب ہونے میں کچھ پھر سے محنت کرنی پڑے گی۔مگر وہ یہ محنت کرنے پر تیار تھی۔



انوشے آج عارف کے ساتھ گھر آئی تھی۔عارف نے اپنے پاپا کا قطعاً بائیکاٹ کر دیا تھا۔مسٹر عابد سے مسٹر جواد احسن کی بہت گاڑھی چھن رہی تھی۔مسٹر عابد ساری چال بازیوں کے باوجود مزے میں تھے۔ ہاں، بس عارف باپ سے الگ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر کی جاب کر رہا تھا۔اس کی زندگی بالکل بدل گئی تھی اور انوشے، وہ عارف کے ساتھ ساتھ خود بھی ایسی ہی بدل گئی تھی کہ اسے حیرت

ہوتی تھی۔ حُسن کا غرور، دولت کا نشہ، ضد، ہٹ دھرمی، غصہ، چھین لینا، کوئی بھی تو عادت اس میں زندہ نہیں بچی تھی۔ محبت نے جب سے اس کے اندر سانس لی تھی، باقی ساری باتیں، جیسے اسے خوابوں کی بات لگتی تھیں۔ عارف جواد کا وہ ایسے خیال رکھنے لگی تھی، جیسے وہ اس کا جیون ساتھی نہیں، اس کی اولاد ہو۔ اور شاید ہر مرد، عورت کے اندر ممتا کو مس کرتا ہے اور چاہتا ہے، وہ محبوبہ بھی ہو اور کلفت میں بالکل ماں بن کر اس کے درد کو چرا لے۔ اور وہ یہ نقطہ سمجھ گئی تھی۔ عارف اب اس کی پروا کرنے لگا تھا۔ اس کے خلوص نے اسے آہستہ آہستہ جیت لیا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا، وہ عارف کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں اُترے اور پتہ لگائے، کیا وہ اب بھی چپکے چپکے شافی سے ملتا رہتا ہے؟ جب وہ خاموش ہوتا ہے تو کیا وہ شافی کی آنکھوں کے گھر میں رہنے، جینے لگتا ہے؟

مگر شہریار نے ایک بار اس کا یہ خیال سنا تو بہت دلداری سے کہا تھا۔

"مت کرنا مسز! یہ کبھی مت کرنا۔ تم جو اس کی آنکھ میں ہو، اگر وہ تمہارے سوال سے اپنے دل میں اُتر گیا، ہمیشہ ہی ان آنکھوں کے گھر میں جینے لگا تو تمہاری چاہت کا کیا ہوگا؟! اسے اپنی آنکھوں اور شافی کی چپکے چپکے کی جانے والی محبت کے گھر میں کبھی کبھی جانے دیا کرو۔ راستہ روکو گی تو وہ ہاتھ جھٹک کر اسی سمت چل پڑے گا، جس سمت سے تم اسے دھیرے دھیرے واپس لائی ہو۔"

اور اس نے یہ مشورہ مان لیا تھا اور اب ایک خوشی کا رستہ تھا، جو اس کا منتظر تھا۔ ایک نئی زندگی اس کے دل میں سمٹ آئی تھی اور عارف غیر متوقع دن گن رہا تھا اور وہ خود، جو بچوں کو جی کا جنجال سمجھتی تھی، وہ خود بھی اس خوشی کے استقبال کی تیاریاں کرنے میں پیچھے نہیں تھی۔ ثانیہ ماما کو ڈاکٹرز نے مینٹل ہسپتال بھیج دیا تھا اور اسے اس کا دکھ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے پاس عافیہ میم جیسی ماں موجود تھیں، جنہوں نے اس کی ہر سخت اور نازیبا بات سن کر بھی اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ وہ عافیہ مام کی گود میں سر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے پروا ہو جاتی تھی۔ علینہ کا اس کی خیریت پوچھنے کے لئے روز فون آ جاتا تھا۔

اس وقت مزے سے عافیہ مام کی گود میں سر رکھ کر اچھے دنوں کے خواب بُن رہی تھی۔ عافیہ مام نے آج آف کیا تھا اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں ڈسکس کر رہی تھیں۔ عارف، مراد اور دائمہ کے ساتھ کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا تھا۔ ہر طرف بہت آسودگی تھی۔ وہ بہت مزے میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک شہریار کھنکھارتا ہوا، روم ناک کرتا اندر آ گیا۔

انوشے نے سائیڈ پر پڑا دوپٹہ تیزی سے سنبھال کر لیا تھا اور شہریار، بیگم عافیہ سے سلام دعا کرتا صوفے پر بیٹھ کر انوشے کی خیریت دریافت کرنے لگا تھا۔ عارف نے اسے خوش خبری دے ہی دی تھی، اس لئے وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

”بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ خیریت؟“ بیگم عافیہ نے روم فریج سے اس کے لئے جوس کا ٹن نکال کر دیتے ہوئے ممتا سے سوال کیا اور وہ مسکرا کر جوس لیتے ہوئے اپنے آج کے دن کی روٹین بتانے لگا۔ اس نے جوس کے ٹن کی ٹھنڈک سے اپنے اندر کی تھکن کو ریلیز کیا، جو اسے مسٹر ارسلان راشدی کو ڈھونڈنے میں لگانی پڑی تھی۔ وہ بہ وقت انہیں سمجھا بجھا کر شافعہ، مومنہ اور سونیا کے لئے واپس ان کے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ مسٹر ارسلان راشدی صرف شافعہ، مومنہ اور سونیا کی خاطر واپس لوٹے تھے لیکن انہوں نے آمنہ کا قطعاً بائیکاٹ کر دیا تھا لیکن کیا اس سزا سے اس کی ماں کی تکلیف میں کمی آسکتی تھی، جو زندہ ہوتے ہوئے انہوں نے جھیلی اور مرنے کے بعد سے اب تک جھیلتی آرہی تھیں۔ مسٹر ارسلان راشدی نے مومنہ کو اپنے پاس رکھنے کی درخواست کی تھی، تمام تر ان کے اختیار اور فیصلے کو ماننے کی آرزو کے ساتھ۔ بیگم عافیہ نے اس سے مشورہ مانگا تھا اور اس نے یہی کہا تھا مومنہ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ جو باپ کی محبت کو ترسی ہے، وہ کچھ اس کا ازالہ کر سکے۔ مسٹر ارسلان راشدی، عطیہ بانو کے حصے میں کی جانے والی کوتاہی کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے دینا چاہئے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کر پائے تو جو اندر سے مر چکے ہیں، اپنی محبت کے بچھڑنے پر وہ باہر سے بھی مر جائیں گے اور جدوجہد کرنے کے لئے زندگی میں اُمید کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میم عافیہ کو یہ بات سمجھ آگئی تھی اور اگلے ماہ سے مومنہ وہیں جا کر رہنے والی تھی۔

”کیا بات ہے، آج بہت چپ لگ رہے ہو شیری؟“

شہریار نے نیم وا آنکھیں کھول کر انوشے کو دیکھا اور آہستگی سے بولا۔ ”میم! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔“

بیگم عافیہ نے چونک کر اسے دیکھا، پھر آہستگی سے اٹھ کر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم کی سمت بڑھتی چلی گئیں۔ بیٹھ چکیں تو نرمی سے بولیں۔

”کہو، کیا کہنا چاہتے تھے شیری؟“

”میم! آپ کو مائی زلفی نے آپ کی بیٹی کے متعلق کیا بتایا تھا؟“

”اس نے کہا تھا، میری بیٹی مر گئی تھی۔“

”آپ کو معلوم ہے میم! انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ وہ اور مدھم ہو گیا تھا۔

”نہیں۔ میں نے اس پر صبر کر لیا تھا۔ سطوت سے بھی میری دو بدو بات ہوئی تھی، مگر اس نے بھی یہی کہا میری بیٹی مر گئی تھی۔“

''آپ نے پوچھا، جانا نہ کس کی بیٹی ہے؟'' اس نے اگلا سوال کیا اور بیگم عافیہ کے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' وہ ایک لمحے کو رکیں، پھر نرمی سے بولیں۔ ''وہاں سب کا کہنا تھا، وہ مائی زلفی کی اس بہن کی اولاد ہے، جس نے خودکشی کرلی تھی اور اس کی وجہ.......''

''ایک منٹ، آپ پاپا کو غلط جج کر رہی ہیں۔ یہ وہ کہانی ہے، جو جانا نہ کو پاپا کے سامنے لانے کے لئے ترتیب دی گئی تھی۔ آپ تو ایسا مت کہیں۔ کیا آپ جانتی ہیں، پاپا جیسے انسان نے کس سے سچی محبت کی تھی؟''

بیگم عافیہ اس کی طرف مسمرائز ہو کر دیکھے جا رہی تھیں۔ تب شہریار کے لب ہلے تھے۔ ''وہ میم عطیہ سے محبت کرتے تھے۔ ٹوٹ کر محبت۔ آپ جانتی ہیں ناں میم! کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت اسے کتنا الگ، کتنا مخلص کر دیتی ہے۔ یہ سچی محبت ہو تو دان بن جاتی ہے، جھوٹی ہو تو پھر محبت سمیت ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہے۔ پاپا نے بھی اسی محبت کو سر جھکا کر عزت و اعزاز کی طرح ارسلان کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ میم عطیہ ان سے نہیں، سر ارسلان سے محبت کرتی تھیں۔ میرے پاپا بہت قابلِ عزت ہی نہیں، قابلِ پرستش ہیں میم! اور آپ سمجھتی ہیں، وہ کسی کی جان لینے کا سبب ہو سکتے ہیں۔''

بیگم عطیہ خالی آنکھوں سے اُسے دیکھے گئیں اور وہ بے بسی سے ہنس کر مزید بولا۔ ''یہ محبت بھی ناں...... میم! یہ محبت بہت خوار کراتی ہے، اپنی راہوں میں رول دیتی ہے۔ پھر کون پتھر تھا، کون ہیرا، سب ایک ہی آصف میں آن کھڑے ہوں تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ باقی رہے نام محبت کا۔''

''تم نے محبت کی ہے کیا؟'' بہت الگ سوال۔ وہ اپنی بیٹی کا سوال بھول کر اس کے لہجے میں گم ہو گئیں۔ اسی لہجے میں تو یونہی پہلے کسی نے جذب سے کہا تھا۔

''مجھے ارسلان راشدی سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ محبت بھی ناں، انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ شاہ کو فقیر کر دیتی ہے۔ فقیر...... ایک نظر کا فقیر، اپنے محبوب کی ایک جھلک کا فقیر۔ دیدار یار ہو، دل ہو اور بس وقت تھم جائے۔ عافیہ! تم نہیں جانتی، یہ محبت کیا ہے؟''

اور آج بالکل کسی اور موسم، کسی اور وقت میں کوئی اور اسی محبت کا دم بھر رہا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں تم نے کبھی کی ہے محبت؟''

شہریار نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولا۔ ''محبت...... شاید محبت سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی، لیکن اس کافر محبت کو مجھ سے محبت نہیں ہو سکی۔ ہوتا ہے ناں میم! کچھ لوگ محبت سے محبت کرتے ہیں

لیکن محبت کا دل ان کی طرف نہیں مڑتا۔ اور کچھ لوگ محبت کو اپنی احتیاجات میں سب سے آخر میں رکھتے ہیں، لیکن محبت ان کی جھولی بھرتی جاتی ہے۔ خیر بیٹا یئے، یہ بتایئے آپ اب میرے پاپا کو مورد الزام تو نہیں ٹھہرائیں گی ناں؟"

"لیکن مائی زلفی نے جو کہا، سطوت جہاں نے جو کہا، وہ سب بھی تو نہیں بھولتا ناں۔"

"میم! زلفی میم نے جو کچھ کہا، وہ اس سے دستبردار ہو چکی ہیں کیونکہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ صرف مجبوری کے تحت کہا تھا۔ وہ سطوت جہاں کے رحم و کرم پر تھیں اس لئے انہوں نے وہی کیا، جو کہا گیا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے آپ کو کچھ نہ کچھ ابہام میں رکھ کر بتانے کی کوشش تو کی ہی تھی۔"

بیگم عافیہ نے پُرسوچ آنکھوں سے دیکھ کر کچھ سوچ کر سر ہلایا اور شہریار نے مزید کہا۔

"رہیں سطوت بیگم تو وہ آپ کی اور میم عافیہ کی کتنی بڑی مخالف تھیں، آپ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ پھر پاپا جب میم عافیہ کے پاس سر ارسلان راشدی کے پیغامات لے کر جاتے تھے تو سطوت جہاں ان کی اس پذیرائی پر جل جل جاتی تھیں۔ وہ اتنی خوب صورت تھیں کہ ایک بار نظر اُٹھ کر گرنا بھول جاتی تھی مگر پاپا نے انہیں کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ سطوت جہاں، پاپا کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھیں، بس یہ تھا کہ ان کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی، سو وہ کوئی بھی نظر میں آنے کا موقع گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر میم عافیہ کا جوان سے سامنے سر ارسلان راشدی کی محبت کے زعم میں وہ وجود آنے لگی تھیں تو انہیں لگتا تھا، یہ پاپا کی محبت کا زعم ہے۔ سو اوران کی مخالف ہوتی چلی گئیں۔ جنگ بڑھتی گئی۔ پھر میم! آپ کے فرار ہونے اور مسز سلیم سے شادی کے بعد منظر عام پر آنے پر سطوت جہاں غم و غصے میں پاگل ہو گئیں۔ اس کام میں میم زلفی کی جس بہن نے آپ کا ساتھ دیا تھا، سطوت جہاں نے انہیں بھی مار دیا۔ وہ سفاک عورت ہیں میم! اپنے مطلب کے لئے، اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں، کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں ناں؟"

بیگم عافیہ اسے دیکھتی رہیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ "تمہاری باتیں سب مان لوں، مگر مائی زلفی نے کہا تھا کہ......"

"میم پلیز! قرائن اور صرف گواہی کو اپنے ضمیر اور ذہن سے پرکھے بنا مان لینے سے مجرم معاف کر دیئے جانے کے قابل ہی لگتا ہے اور مظلوم ظالم سے نیچے پائیدان پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ میم عافیہ! یہ تو دنیا ہے۔ یہاں کے ضابطے، کہانیاں، ان پر یقین کرنے لگ جائیں ناں تو زندگی جینے کے قابل نہیں لگتی۔ خود وہاں موجود تھیں آپ۔ لیکن آپ بھی انہیں اچھی طرح نہیں سمجھ سکیں۔ آپ کے جانے کے بعد

سطوت جہاں نے مائی زلفی کی بہن کا قتل کرایا، جسے خودکشی کا رنگ دیا گیا، سامنے کی بات ہے۔ رہی مائی زلفی کی باتیں تو میں نے ابھی بتایا، وہ محض مجبوری کے تحت کی گئی تھیں۔ مگر جب سے میم زلفی کو دوبارہ ہوش آیا ہے، بہت سی سچائیوں پر سے پردہ ہٹا ہے۔ مائی زلفی کی بہن کو سطوت جہاں نے اپنی بہن شو کیا اور جانا نہ کو شروع سے جتایا کہ ان کی نام نہاد بہن جو کہ خود اس کی ماں تھیں، کی خودکشی کی وجہ میرے پاپا تھے، جس کا بدلہ اسے ان سے لینا تھا۔ کیونکہ میرے پاپا نے پہلے ان کو سبز باغ دکھائے، اپنا بنایا، لیکن تسلیم کرنے کے وقت وہ ان کو اندھیری گلیوں کا طعنہ دے کر چلتے بنے۔ جانا نہ کا انہوں نے برین واش کر رکھا ہے میم! وہ ان کے اشاروں پر اس طرح چلتی ہے، جیسے کوئی کل کا کھلونا ہو۔ وہ اپنا ذہن بالکل استعمال نہیں کرتی، اسے اپنے خسارے کا کچھ پتہ نہیں ہے میم! اور میں جان گیا ہوں۔ کیا آپ وہ جانتی ہیں، جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں؟"

بیگم عافیہ کے ذہن میں یکدم جھماکا ہوا۔ وہ واقعی اب تک اس کی بات نہیں سمجھی تھیں لیکن ساری باتیں ایک دم سے ان کے اندر دبے قدموں گزریں تو انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے کہا تھا۔

"تم...... تم کہنا چاہتے ہو کہ جانا نہ میری بیٹی ہے۔" ان کی آواز بہت تیز ہو گئی تھی۔ اسی وقت کرسٹل واز گرنے کی آواز آئی تھی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ بہت غیر متوقع جانا نہ زرد رنگت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میم! میں...... میں تو...... میرا دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو۔" بے ربط جملے، بے ترتیب سانسیں......

بیگم عافیہ نے دوڑ کر جانا نہ کو اپنی باہوں میں بھر لیا تھا۔

"مجھے لگتا تھا، جب جب تم مجھ سے ٹکراتی تھیں، میرے اندر میری ممتا ابال ڈالتی تھی کہ تم سے کوئی رشتہ ہے میرا، لیکن تم نے سطوت کے سکھائے گئے انداز اور رشتے پر زلفی کی بہن کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر جب یہ کہا تمہاری ماں ہے یہ تو میرا دل اندر سے بجھ گیا تھا۔ مگر دیکھ لو میرا دل کتنا سچا تھا۔"

جانا نہ اُن کی باہوں میں بالکل سکتے کی کیفیت میں تھی اور شہریار چپکے سے اس منظر سے نکل آیا تھا۔

پھر وہ گھر چلا آیا تھا اور اُس کی گاڑی رکتے ہی دانیہ بہت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اُس تک پہنچی تھی۔

"یہ ہے آپ کا ایک گھنٹہ؟" وہ غصے سے بھنائی ہوئی تھیں اور اس نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"پلیز وانی! میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ تمہاری خفگی کا بار تک نہیں سہہ سکتا۔"

وانیا نے بے قراری سے اس کا چہرہ تکا۔ واقعی حد سے زیادہ زرد ہو رہا تھا۔

"آپ انکل صمدانی سے نئے سرے سے چیک اپ کیوں نہیں کروا لیتے؟ آخر مسئلہ کیا ہے، جو میڈیسن مسلسل لینے کے باوجود آپ کی طبیعت سدھر نہیں رہی؟" اس نے شہریار کے ہاتھ سے اس کا کوٹ لیا، جو ایئر کولنگ کے باوجود آ جانے والے پسینے کی وجہ سے اس نے اتار لیا تھا۔ وانیا آگے چل رہی تھی اور شہریار کا دل چاہ رہا تھا، وہ اس دھڑکے، اسی خوف سے یکدم سے غائب ہو جائے۔

"آج کل آپ بہت چپ چپ رہنے لگے ہیں۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس کچھ بزنس کے معاملات ہیں۔"

"بزنس سے یاد آیا، ایڈورٹائزنگ ایوارڈ بھی تو ہو رہے ہیں ناں۔ آپ کا کون سا ایڈ نومینیٹ ہوا ہے؟"

شہریار نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹنے کے انداز میں اس کا سوال سنا، پھر آہستگی سے بولا۔ "چائے کا اشتہار ہے۔ وہ رشتوں کی مہک، گھرداری کا ہنر۔"

وانیا ہنسنے لگی، پھر آہستگی سے بولی۔ "یہ اشتہار واقعی مجھے بھی پسند تھا۔ آپ نے اس کے لئے نومینیٹ کس کو کیا ہے؟ اشتہار کے کرو کے ساتھ کمپنی میں پرکس کا نام گیا ہے؟"

شہریار نے ہولے سے آنکھیں بند کر کے کھولیں اور شرارت سے بولا۔ "اپنے ڈائریکٹر تو ہیں ناں، ان کا نام چپکے سے دے دیا ہے۔ پاپا نے اعتراض کیا تھا، تمہاری محنت ہے۔ مگر میں نے کہا، بھائی کو بھی تھوڑی شہرت مل جائے تو کیا برا ہے۔"

وہ تقریباً لیٹا ہوا تھا۔ وانیا نے جواب میں اسے آنکھیں دکھائیں مگر وہ اس وقت سمجھا جب دھما کا سر پر پہنچ گیا تھا۔ وانیا کس سے مخاطب ہے، یہ لازمی تھا سالار عبدالرحمٰن ضرور دیکھنے آتے کیونکہ اتنی محبت سے وہ صرف شہریار کو دیکھا کرتی تھی اور آج کل شہریار سے اس کا بائیکاٹ چل رہا تھا۔ لیکن جملہ اور چہرہ نظر سے گزرا تو وہ پاگل ہی ہو گئے۔

"تم اس انسان سے مخاطب ہو...... اور وہ بھی اس لہجے میں؟ وانیا! یہ تمہاری بے نیازی کے بھی قابل نہیں ہے اور تم اس پر اپنی خالص محبت لٹا رہی ہو۔"

دانیا کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر سالار عبدالرحمٰن نے اُسے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ "تم خود کو سمجھتے کیا ہو، لوگ تمہارا دیا کھا رہے ہیں، تمہاری دی گئی عزت پر جی رہے ہیں؟ ادھر دیکھو، میں مسٹر عبدالرحمٰن کا بیٹا ہوں۔ سالار عبدالرحمٰن۔ آج بھی اپنے پاپا کے نام سے نہیں، اپنے نام سے بزنس کمیونٹی میں اپنے کام کی وجہ سے جانا جاتا ہوں۔ لیکن تم کیا ہو؟ اگر پاپا تمہاری پشت پر نہ ہوں تو لوگ تم سے یہ ادھار کا نام بھی لے لیں۔ شہریار عبدالرحمٰن! یہ نام بھی پاپا کی محبت کی بھیک کی طرح تمہاری جھولی میں ڈالا گیا ہے۔" انہوں نے اسے جھٹکے سے صوفے پر دھکیل دیا تھا۔ کہاں وہ صرف خفگی کا بار رہنے کی بات کر رہا تھا، کہاں اسے اندر سے ہلا دیا گیا تھا۔ مگر وہ بت کی طرح صوفے پر دھنسا رہ گیا تھا۔ ماما کی کوریڈور میں تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

"تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟ بڑے غرور ہو گئے ہو، لیکن ابھی بھی میں تمہاری ماں ہونے کا حق برقرار رکھتی ہوں۔"

"مگر آپ آج کل اس حق کو کسی اور پر بے جا لٹا رہی ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی محبتوں کے قابل نہیں ہے۔"

دانیا تیزی سے باہر دوڑی تھی اور ماما آج اگنور کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں، سو سالار عبدالرحمٰن کو انہوں نے کندھے سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا تھا، پھر غصے سے پھنکاری تھیں۔

"تو اب تم ہمیں بتاؤ گے، کون ہمارے قابل ہے یا نہیں؟...... تم مجھے بتاؤ گے، شہریار کس قابل ہے۔ اگر میں کہہ دوں کہ مجھے آج کل تمہاری حرکتوں اور کم ترین دماغ سے سوچی ہوئی باتوں کو سن کر تم سے گھن آنے لگتی ہے تو تم کیا کہو گے؟ تم نے کون سا الزام ہے، جو شہریار پر نہیں لگایا۔ مگر اس نے آج تک پلٹ کر تمہیں کوئی جواب نہیں دیا تو کیا یہ اس کی کمزوری ہے؟ نہیں، یہ اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ تم ہمیشہ چیخ چلا کر جو خوف کری ایٹ کرتے رہتے ہو تو یہ تمہارا مان ہے کہ لوگ تمہارے آگے چپ رہتے ہیں۔ نہیں سالار! یہ صرف تمہارا ڈر ہے، تمہارے ہاتھوں اپنی عزت کی دھجیاں اُڑ جانے کا ڈر۔ لوگ تمہاری عزت نہیں کرتے، تم سے ڈرتے ہیں۔ ہمیشہ غصہ آپ کی طاقت کا اظہار نہیں ہوتا، آپ کی کمزوری کی دلیل ہوتا ہے کبھی کبھی...... اور یہ تمہارے ساتھ اکثر رہتا ہے۔ تم شہریار سے خود کو ہر لحاظ سے کم تر پاتے ہو، اس لئے اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے تم نے۔"

"مام! آپ...... آپ میری خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔" سالار عبدالرحمٰن بھنا کر بولے۔ مگر اس لمحان کے لہجے میں زور نہیں تھا اور مام نے اسی لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں، میں تمہاری خاموشی کی محتاج نہیں۔ تم جتنی چاہے طاقت سے چلانا چاہتے ہو، چلا سکتے ہو۔ لیکن میرا ایک ہی جواب ہوگا، شہریار میری ساری اولاد میں سب سے اچھا انسان ہے، مجھے اس کی ماں ہونے پر فخر ہے۔"

''شیری بھائی!'' دانیا جو واپس لوٹی تھی، سکتے کی کیفیت میں دہلیز کا سہارا لئے کھڑے شہریار کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں شیری بھائی؟''
شہریار کی نم آلود آنکھیں اس پر آن جمی تھیں، پھر اس کے لب کانپے تھے۔
''اس لمحے...... دانیا! اگر اس لمحے میں مر بھی جاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ واقعی محبت رائیگاں نہیں جاتی، آج مجھے یقین آ گیا ہے۔''
''ہاں۔ مگر محبت صرف جدائی نہیں ہے۔'' دانیا نے اس کو خوش گمانی کا سرا تھمایا تھا اور وہ مام کے پیچھے پیچھے اس ڈوئل کے اختتام پر کچن میں چلا گیا تھا۔ مام اس کے لئے چکن سوپ میں دلیہ بنا رہی تھیں۔ وہ چپکے سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ملازمین نے حیرت سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔ اس نے کسی کی طرف نظر نہیں کی تھی، خاموشی سے مام کے گرد بانہیں حمائل کر دی تھیں۔
''خیریت، یہ آج اتنا لاڈ کیوں آ رہا ہے مجھ پر؟''
وہ ہنس دیا تھا۔ ''مام! آپ پر لاڈ کب نہیں آتا تھا۔ بس موقع اب مل رہا ہے۔ ورنہ تو آپ نے تو دنیا تج دی تھی شہریار کے لئے۔''
''پاگل!'' مام نے گردن موڑ کر اس کی بانہوں کا حصار برقرار رکھتے ہوئے اس کے گال کو تھپکا تھا اور وہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر ایک لمحے کے لئے ہر طرف سے غافل ہو گیا تھا کہ بس اچانک ہی بجتی ہوئی آواز نے اسے دوسرے لمحے بے کل کر دیا تھا۔
''سب کچھ چھوڑ دوں، دنیا، دولت، عشرت، سب کچھ لیکن کیا اس کے لئے مام کو چھوڑ کے جانا آسان ہوگا؟ اس کی جان تو ان ہی میں اٹکی رہے گی، میرے بعد میری مام کا کیا ہوگا؟ مجھے اتنی زیادہ شدت نہیں رکھنی اپنی محبت میں کہ ان کا سانس لینا دشوار ہو جائے۔'' یکدم دل نے کہا اور اس نے بانہوں کا حصار توڑ دیا۔
''خیریت، اچانک کیا ہوا تمہیں؟'' مام نے اس کے آہستگی سے خود سے الگ ہونے پر حیرت کا اظہار کیا کیونکہ اس لمحے نا آشنائی کا سا تاثر اور بے نیازی سی در آئی تھی اس کے لمس میں اور وہ ''کچھ نہیں مام!'' کہتا اپنے روم کی طرف بڑھتا چلا آیا تھا۔ پھر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ جاناں کا فون آ گیا۔
''تم بہت الگ انسان ہو، سب سے ہٹ کر۔ میں نے تمہارے ساتھ اتنا برا کیا اور تم......'' شہریار کچھ نہیں بولا تھا اور وہ پھر سے بولی تھی۔ ''تم اگر اتنے اچھے انسان ہو، جتنا تاثر دے رہے ہو تو تم نے ثانیہ کے ساتھ مس بی ہیو کیوں کیا؟''

”میں نے ثانیہ کے ساتھ کیا مس بی ہیو کیا جاناں؟“ وہ اسی حیرت میں آ گیا تھا اور جاناں اسی ٹون میں بولی تھی۔

”اگر تمہارے پاپا اتنے بلند کردار انسان تھے تو تم نے اس کی تربیت میں رہتے ہوئے ثانیہ کی زندگی کیوں برباد کی؟ وہ لڑکی تم سے محبت کرتی رہی، تم نے اس سے رشتہ جوڑا، بیٹی کا تحفہ بھی ملا اسے تم سے لیکن جب بات اس رشتے کو رجسٹرڈ کرنے کی آئی تو تم مکر گئے۔ تم نے اسے ذلیل کیا، اتنا زیادہ، اتنا زیادہ کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ میں بروقت پہنچی، مگر وہ اتنا ٹوٹ چکی تھی کہ اس صدمے سے باہر نہ آ سکی اور ایک روز ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہوگئی۔ تم اور میں ایک ساتھ پہنچے تھے ناں اس موت پر نوحہ گری کرنے، لیکن اس وقت بھی میں نے تمہارے چہرے پر کوئی احساس نہیں دیکھا تھا اور تب میرا دل چاہتا تھا، میں تمہیں بھی ایسے ہی مسخ شدہ لاش کی طرح کہیں دیکھوں، تمہیں مار دوں۔ پھر میرے دل نے کہا، نہیں، یہ تو بہت آسان موت ہے۔ اس کے لئے تو یہ بہتر ہے تمہیں جس جس سے محبت ہے، میں تمہیں ہر اس شخص سے دور کر دوں، تم اپنی ہر محبت کھو دو، تم جن سے محبت کرتے ہو، وہی تم سے نفرت کرنے لگیں۔ پھر کہیں ثانیہ کے قتل کی سزا پوری ہوگی۔ میں صرف تمہارے پاپا سے اپنی خالہ کا بدلہ لینا چاہتی تھی، لیکن اس میں وقت کے ساتھ ساتھ گرو پڑ گئی تھی۔ شاید میں گزری بات بھول جاتی، مگر ثانیہ جیسی دوست کی بھیانک موت میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اور تب میں نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ میں شہریار کو سانس سانس وار پر چڑھاؤں گی۔ میں کامیاب بھی تھی، مگر یہ تم...... تم نے راستہ کیوں بدل لیا؟“

شہریار بے بسی سے ہنسا تھا، پھر نرمی سے بولا تھا۔ ”تم نے کبھی یہ نہیں سوچا جانے! جو ماں اتنا بڑا جھوٹ کہہ سکتی ہے، وہ دوسرا جھوٹ کیوں نہیں کہہ سکتی۔ جھوٹ بولتے ہوئے صرف زبان ایک بار لڑکھڑاتی ہے ناں، پھر اسے عادت ہو جاتی ہے۔ کیا سمجھیں؟“

”تم...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

شہریار نے گہرا سانس لیا تھا اور آہستگی سے بولا تھا۔ ”صرف اتنا ہی کہ ثانیہ مری نہیں ہے، وہ زندہ ہے۔ اگر ملنا چاہو تو میں تمہیں اس کا پتہ دے سکتا ہوں۔“

”تم...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم جاناں کو ٹوٹلی فیلڈ ثابت کرنے کے لئے جھوٹ بول رہے ہو ناں؟ میں نے تمہارے ساتھ اتنا برا کیا، اس لئے تم مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کرنا چاہتے ہو، ہے ناں؟ کیونکہ میں نے...... میں نے خود اپنی ثانی کی لاش دیکھی تھی، دفنائی تھی۔ نہیں تم سچ نہیں کہہ رہے، یہ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے، جیسا تم نے ایک بار کہا تھا، تم جانتے ہو میرا شیرازی کہاں ہے؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں تمہارا شیرازی کہاں ہے۔“

"تم پاگل ہو۔ کوئی لال بجھکڑ ہو، جو سب جانتے ہو۔ آج تک میں نہیں جان سکی، میرا شیرازی کہاں ہے اور تم جانتے ہو۔ ڈفر! جھوٹ بولتے ہو۔" وہ ہذیانی ہوگئی اور اس نے پہلے سے بھی آہستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں سب جانتا ہوں۔ کیونکہ میں آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔ میں سچ جاننے کی اسٹرگل کرتا ہوں، کسی کے کہے ہوئے سچ کو حرفِ آخر نہیں مانتا۔ تم دیکھو، اپنے گرد تمہیں خبر ہونے جائے گی تم کتنی سادگی سے اب تک لٹتی آرہی ہو۔ جانا نہ! مجھے تم پر ترس آتا ہے، رحم آتا ہے۔"

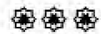
جانا نہ کچھ نہیں بولی تھی۔ ریسیور تھامے خاموش کھڑی تھی اور عین اسی وقت سطوت جہاں کی تیز آواز سنائی دی تھی۔

"تیری ماں یہاں سولی پر لٹک رہی ہے اور تجھے عشق بازی سوجھ رہی ہے۔ ادھر رکھ فون، یہ فارن منسٹر کو فون لگا۔ اس سے کہہ کہ اس کی رعایا پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔"

"کون کر رہا ہے تم پر ظلم؟"

"کون کرے گا؟ ایک ہے ناں، کم بخت ڈی ایس پی عدیل عبدالرحمٰن۔ میرا دل چاہتا ہے میں عبدالرحمٰن کی ساری فیملی کو شوٹ آؤٹ میں مروا دوں، مگر آج کل کہیں نہیں چل رہی۔ پتہ نہیں، کیا اسمِ اعظم پڑھا ہے اس خبیث نے، ہر کوئی اس کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ اندر سے سب رو رہے ہیں، مگر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ چل رکھ ناں، تجھے سنائی نہیں دے رہا کیا؟" کریڈل پر ریسیور زور سے پٹخا گیا۔

شہریار کے لبوں کو زہریلی ہنسی نے چھوا اور وہ آہستگی سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آج وہ واقعی بہت تھک گیا تھا۔



"تم کہنا کیا چاہتے ہو مامون؟ کیا وہی کہنا چاہتے ہو، جو میں سمجھا ہوں؟" ڈی ایس پی عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر ساری حیرت نا کی ثبت تھی اور مامون عبدالکریم نے سر ہلا کر کہا تھا۔

"آپ درست سمجھے ہیں سر! ہمیں اس معاملے میں قدم پیچھے ہٹا لینے چاہئیں۔ یہی اسٹریٹجی اس وقت بیسٹ ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو؟ شاید آنٹی کی پریشانی نے تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں رہنے دیا۔ ورنہ تم یہ نہیں کہہ رہے ہوتے کہ ہمیں بہت آسانی سے ٹریپ کر لیے جانے والے یوسفی احمد، شاہ فیاض اور حسن ابراہیم سے بیک ڈور ڈیل کر لینی چاہیے اور نہ صرف ڈیل بلکہ زوار حسن، جو چوہے کی طرح گرفتاری کے ڈر سے اپنے بل میں چھپا ہوا ہے، اسے بھی تمغہ لگا کر اگیزٹ کنٹرول لسٹ سے نکال کر ملک چھوڑنے میں مدد دینی چاہیے۔ اسٹرینجر! آپ دیکھ رہے ہیں، مامون عبدالکریم کی سوچ۔ حالانکہ پہلے مجھے اس کی دماغی صلاحیتوں پر آنکھ بند کر کے یقین تھا، لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ مجھے نئے سرے

سے سوچنا پڑے گا کہ انہیں اپنا نمبر تو بنا کر میں نے کوئی بھول تو نہیں کی؟"
آپ مامون کو غلط سمجھ رہے ہیں سر! دیکھئے، مومنہ کی بہتر زندگی کے لئے ہمیں یہ بیک ڈور ڈیل کرنی پڑے گی۔ زوار حسن نے طلاق کی یہی شرط رکھی ہے۔"
"آپ....... مسٹر اسٹریجر! آپ بھی ایسا سوچنے لگے ہیں؟ کیا آپ کو لگتا ہے، کسی ایک کی زندگی کے لئے ہمیں ملک کی سلامتی داؤ پر لگانی چاہئے؟"
"نہیں سر! یہ جائز نہیں۔ مگر ماضی میں بھی بیک ڈور ڈپلومیسی ہوتی رہی ہے۔ یہ کوئی برائی نہیں اگر ہم بھی بیک ڈور ڈیل سے کام لے لیں۔ آپ ہمارا پلان سمجھنے کی کوشش تو کریں۔" وہ دونوں رہ جانے والے نکات سمجھانے لگے اور جب تھمے تو عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر بہت پیاری مسکراہٹ تھی۔
"تم دونوں....... میرے بس میں ہوتا تو تمہیں افلاطونی ایوارڈ ضرور دے دیتا۔ ویری فائن۔ پلان اتنا برا نہیں۔ پھر ٹھیک ہے، معاملات طے کرلیں مامون! آپ۔" اختیار کل دے کر انہوں نے بات ختم کر دی اور تینوں ممبر چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔



"تمہیں کیا لگتا ہے تم نے ساری دنیا ڈسکور کر لی ہے؟" نئے جام میں آئس کیوب ڈالتے ہوئے آرتھر نے مسٹر عمرانی کو دیکھ کر ترنگ سے پوچھا اور وہ ہنس دیئے اور خمار آلود لہجے میں بولے۔
"ساری عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ اور مجھے لگتا ہے، میں کبھی ناکام نہیں رہا۔"
"لیکن ایک نئی زندگی، جسے جیے بغیر تمہیں لگے گا کہ تم نے اب تک دنیا میں کوئی لمس نہیں چکھا۔"
"تم....... تم جانتے ہو، مجھے استعمال شدہ چیزیں استعمال کرنے کی عادت نہیں۔ نئی، وکھری چیزیں مجھے اٹریکٹ کرتی ہیں۔ کیا وہ ایسی ہی دنیا ہے؟"
"شاید نہیں، لیکن وہ ایسی ہے کہ ہم اس کی قربت میں جنت کا مزہ بھول سکتے ہیں۔" ہر بار نئی اور چٹ پٹی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے عمرانی کی طرف دیکھا اور پھر سے مکر ربولا۔ "ایک بار تم چلو تو سہی تم بھول جاؤ گے کہ غم بھی دنیا کا حصہ ہیں۔ وہ ایک مکمل عورت ہے۔ اس پر خرچ کی ہوئی رقم تمہیں بہت کم لگے گی۔ پلیز، کم آن۔" آرتھر نے مسٹر عمرانی کا ہاتھ تھام کر اٹھایا اور مارے بندھے انداز میں اس پرائیویٹ پارٹی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر پارٹی اپنے پیک پر تھی، جب وہ اس محفل میں داخل ہوئے۔

”حُسن کا یا انداز، امیزنگ۔“ وہ بکھرے لہاتے حُسن پر مر مٹے تھے اور آرتھر نے جھک کر ان کے کان میں کہا تھا۔

”یہ حُسن...... یہ حُسن تو اُس قتالۂ عالم کا پاسنگ بھی نہیں۔ تم اُسے دیکھو گے تو تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اس حُسن کی بارگاہ میں تم گونگے ہو جاؤ گے۔“

”دیکھیں گے، تمہارے اس حُسن کو بھی دیکھیں گے۔“ وہ اوور ڈرنک کے باوجود نیا گلاس ویٹر سے لیتے ہوئے ترنگ میں بولے۔ ایک قتالۂ عالم ان کے قریب تھی اور زندگی اتنی ہی قریب تر۔ وہ بہت ڈوب چکے تھے، جب آرتھر نے ان کا شانہ ہلایا تھا۔

”چلو عمرانی! رات کے اس پہر اس حُسن کے ماہِ کامل کو دیکھنے کا بھی الگ مزہ ہے۔“

”تو کیا تم میرے ساتھ رہو گے؟“ عمرانی نے بہت بوریت سے پوچھا۔

آرتھر کا قہقہہ بہت طوفانی تھا۔ اس نے شوخ نظروں سے انہیں دیکھا اور کہا۔ ”پاگل ہو گئے ہو؟ آج کی رات صرف تمہاری...... میں تو صرف تمہارا اس سے تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ چلو ناں۔“ گیسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے بات مکمل کی۔ ایک دروازہ وا ک ہوا۔

آرتھر اندر چلا گیا۔ مسٹر عمرانی نے انتظار نہیں کیا تھا۔ آرتھر کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھے لگاوٹ سے بول رہا تھا۔ ”یہ میرے خاص دوست ہیں اسپائسی! پلیز ان کا خاص دھیان رکھنا۔ رقم جو تم چاہو۔“ آرتھر نے مڑ کر عمرانی کو دیکھا، پھر شرارت سے ہنس کے بولا۔

”میں نے تم سے زیادہ بے صبرا انسان آج تک نہیں دیکھا عمران! اوکے، اوکے...... گھورو مت۔ آج کی خوب صورت ترین رات صرف تمہارے نام۔“

بک اپ کر کے وہ ان کے قریب سے نکلتا چلا گیا اور مسٹر عمرانی نے بہت اشتہاء سے اس لڑکی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

”اسپائسی! تمہارا نام تو بہت خوب صورت ہے۔ کیا تم واقعی میں بھی اتنی ہی خوب صورت ہو، ڈول؟“

لڑکی کرنٹ لگنے کی کیفیت میں مڑی تھی اور مسٹر عمرانی......

”تم اس حُسن کی بارگاہ میں گونگے ہو جاؤ گے۔ تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔“ آرتھر کی آواز اب بھی ان کے اطراف ناچ رہی تھی۔

ان کے ہاتھ کا دباؤ لڑکی کے کندھوں پر بڑھ گیا تھا۔ ''زرش! یہ تم ہو؟''

''پاپا! چھوڑیں مجھے۔ پلیز پاپا! چھوڑ دیں مجھے۔'' زرش پاگلوں کی طرح چیخی تھی۔ پھر وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے۔ کمرے کی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی تھی اور زرش کا وجود گیسٹ ہاؤس کی تیسری منزل سے ہوتا ہوا مرمر کے فرش پر جا گرا تھا۔

''زرش......!'' وہ سکتے میں سے نکل کر چیخے تھے۔ پھر پاگلوں کی طرح نیچے کی طرف دوڑے تھے۔ زرش کا سر اپنی گود میں رکھ کر وہ دیوانوں کی طرح چیخے جا رہے تھے۔ کوئی لفظ، کوئی مربوط جملہ، کچھ بھی نہیں تھا ان کی زبان پر۔ اور کوئی تھا، جو پوری قوت سے اب بھی ان کی سماعتوں میں گونج رہا تھا۔

''چھوڑیں مجھے...... پلیز چھوڑ دیں مجھے۔'' مگر اس لمحے ان کا فرعونی رویہ اور آج...... آج وہ کتنی غلط راہ سے لوٹے گئے تھے۔

''وہ مر چکی ہے عمرانی! ہوش کرو۔ آخر تم نے ایسا کیا کہہ دیا کہ اس نے خودکشی کر لی؟ عمرانی! کون ہے یہ لڑکی؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''یہ میری بیٹی ہے ڈاکٹر آرتھر! یہ میری بیٹی ہے۔ تم سمجھ گئے ہو ناں؟''

آرتھر کا چہرہ ایک لمحے میں حیران ہوا تھا اور پھر اس کے چہرے پر شرمندگی، مایوسی سب ثبت تھے۔ اور خود عمرانی صاحب، وہ اس جملے کے بعد کچھ نہیں بولے تھے۔

پولیس آ چکی تھی۔ تفصیل دی جا رہی تھی۔ لاش کے پرنٹ زاویئے لکھے جا رہے تھے۔ آرتھر تفصیل بتا رہا تھا۔ ''لڑکی نشے میں تھی، اس لئے کھلی ہوئی کھڑکی سے توازن برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے گر گئی۔''

پرائیویٹ پارٹی کے ارکان پولیس کے آنے سے پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ مسٹر عمرانی سکتے کی کیفیت میں اب بھی وہیں بیٹھے تھے۔

''یہ عمرانی ہیں، اس لڑکی کے باپ۔ بیٹی کی موت سے انہیں ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ یہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہیں اس وقت۔''

آرتھر نے ڈیڈ باڈی ایمبولینس میں رکھے جانے پر مسٹر عمرانی کو کھینچ کھانچ کر اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا۔

مسٹر عمرانی پر یہ اطلاع بم کی طرح پھٹی تھی۔ بیٹی مر چکی تھی اور باپ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

''تمہاری بیٹی مر چکی ہے عمرانی! تم نے سنا، وہ مر چکی ہے۔ اور کس جگہ مری ہے، تم جانتے ہو۔''

مسٹر عمرانی نے پہلی بار بیگم عمرانی کو دیکھا، منظر پھر سے ری پلے ہوا اور وہ ہذیانی انداز میں چیخے۔ ''اس نے مجھ سے بدلہ لیا ہے...... وہ کہتی تھی زندگی میں، میں نے جس طرح اسے ستایا ہے، اسے عزت سے جینے نہیں دیا، قدرت اس کا انتقام لے گی۔ وہ مجبور رہی، مگر اس کا خدا مجبور نہیں ہے۔ تم نے سنا، وہ خدا اس کا اتنا زیادہ دوست تھا۔ اس نے اتنے سالوں تک میری سزا کو روکے رکھا اور آج...... آج اس نے اس عورت کا بدلہ لے لیا۔ وہ مرگئی ہے۔ مگر اب میں بھی مرگیا ہوں۔ زرش بھی مرگئی ہے۔ ثانیہ بھی مرگئی ہے۔ پھر تم زندہ کیوں ہو؟ تم بھی مرجاؤ...... تم بھی مرجاؤ۔'' انہوں نے بیگم عمرانی کو جھنجھوڑ دیا تھا اور بیگم عمرانی قالین پر بیٹھ کر بین ڈالنے لگی تھیں۔

''ہم سب مرگئے ہیں...... تمہیں کیوں لگتا ہے، میں زندہ ہوں۔ دیکھو، میں اسی دن مرگئی تھی جب میں نے اپنے گھر کی دہلیز پھلانگی تھی۔ تمہارے لئے اپنے باپ کو ٹھکرایا تھا، ان کی دعاؤں سے منہ موڑا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، تو کبھی سکھ سے نہیں رہے گی اور واقعی میں کبھی سکھ میں نہیں رہی عمرانی! کیا میں زندہ ہوں؟ تمہیں لگتا ہے، کیا میں زندہ ہوں؟'' وہ ان سے زیادہ ہذیانی ہوگئی تھیں۔

شام تک خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ثانیہ، شافعہ کی منتیں کرکے گھر آئی تھی اور اب دونوں ماں باپ اپنی اس بیٹی کو دیکھ رہے تھے، جو برسوں پہلے مرچکی تھی۔

''ثانیہ! تم...... تم زندہ ہو؟''

''نہیں پاپا! میں مرچکی ہوں۔''

''ہاں، میں بھی یہی کہہ رہا تھا، ثانیہ مرچکی ہے، پھر سے زندہ کیسے ہوسکتی ہے؟'' ان کی دماغی رو پھر بہک گئی تھی اور زرش کی تدفین کے کام ہو رہے تھے۔ سارے کام ملازمین نے آپس میں بانٹ لئے تھے۔ مسٹر عمرانی کو خواب آور دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کا آخری دیدار بھی نہیں کرسکے تھے۔



مامون عبدالکریم نے اپنے اہلکار بھیج کر سطوت جہاں کو گرفتار کروا کر اپنے خصوصی دفتر میں بلوا لیا تھا۔ جانانہ، سطوت جہاں کے ساتھ تھی مگر ایسے جیسے کوئی کند ذہن بچہ۔

''مجھے کسی بھی طرح جیل سے نکلوایا جائے۔ مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔''

''یہ جگہ کسی کو پسند نہیں ہوتی میڈم! لیکن کئے گئے گناہ ہمیشہ مخفی نہیں رہتے۔'' مسٹر عدیل عبدالرحمٰن نے کرخت لہجے میں کہا اور بیگم سطوت جہاں انہیں گھورنے لگیں۔

چہرہ، چال ڈھال، سب کچھ وہی تھا، بس اس چہرے پر عمر نہیں گزری تھی۔
"عبدالرحمٰن! تم........تم کب تک میری زندگی اجیرن کرتے رہو گے؟"
"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں عدیل عبدالرحمٰن ہوں۔" عدیل عبدالرحمٰن نے لہجہ برقرار رکھا اور جانانہ کرسی پر بت کی طرح بیٹھی رہی۔
ثانیہ کا زندہ ہونا، عافیہ بیگم کا بطور رمال ہو کر ملنا، شیرازی کی گمشدگی، شیرازی کی اولاد کی طرف سے مایوسی، سب چیزوں نے مل کر تیز طرار زیرک جانانہ کو یکدم سے ذہنی مریض کی طرح چپ کروا دیا تھا۔ وہ جو زور سے چیخ چیخ کر عدیل عبدالرحمٰن پر کوئی قانونی برتری جھاڑ رہی تھی اور نہ بیگم سطوت جہاں کی آزادی کی چیخ پکار کے لئے فون استعمال کر رہی تھی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی، جب عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے سامنے دو تصویریں رکھیں۔
"یہ دونوں کون ہیں، آپ جانتی ہیں؟"
جانانہ نے خالی آنکھوں سے عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا اور آہستگی سے سر اثبات میں ہلانے لگی۔
"آپ ان کے نام بتا سکتی ہیں؟" مامون عبدالکریم نے اگلا سوال کیا۔
اور وہ سطوت جہاں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔
"یہ کہتی تھیں، یہ ان کی بہن اور میری ماں ہیں۔ مگر کل مجھے پتہ چلا، یہ ان کی کوئی نہیں لگتی۔ انہوں نے خودکشی کر لی تھی کسی وجہ سے۔"
"آپ کو پتہ ہے، وہ خودکشی نہیں، قتل تھا؟" عدیل عبدالرحمٰن نے سوال کیا اور جانانہ کچھ اور ساکت ہو گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن اس کی کیفیت سے بے خبر بولے۔
"جس طرح یہ آپ کی ماں نہیں ہیں، اسی طرح یہ بھی جھوٹ ہے کہ اس عورت نے خودکشی کی تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی سطوت جہاں کے کہنے پر۔ کیونکہ انہوں نے میم عافیہ کی بھاگنے میں مدد کی تھی۔"
جانانہ کی آنکھیں سطوت جہاں پر ٹک گئیں اور وہ غصے سے چیخیں۔
"کیا دیکھتی ہے ایسے ٹکر ٹکر........ میں کہہ رہی ہوں ناں، کسی پرائم منسٹر، منسٹر کو فون لگا، تجھے سمجھ نہیں آتی؟"

”مس جانانہ! یہ دوسری تصویر کس کی ہے؟“ جانانہ چیخ پکار سے نکل کر عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھنے لگی۔
”شیرازی........ یہ شیرازی ہے۔“ آنکھیں یکدم لب لب کر کے بھر آئیں۔
”آپ کو پتہ ہے، سطوت جہاں، جنہوں نے آپ کو لاڈ سے پالنے کا دعویٰ کیا ہے، انہوں نے آپ کے شیرازی کو قتل کروایا تھا؟“
”نہیں۔ شیرازی........ شیرازی کیسے مر سکتا ہے؟ ماں کہتی ہیں، وہ بے وفا تھا۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔“
”یہ تصویریں دیکھئے۔ یہ بیان زلفی مائی نے دیا ہے کہ ان کے سامنے یہ قتل ہوا تھا اور یہ تصویریں وہ ہیں کو قاتل نے بیگم سطوت کو بلیک میل کرنے کے لئے کھنچوا کر محفوظ رکھی تھیں، مگر بیگم سطوت نے اثر و رسوخ سے اس قاتل کو مٹا کر یہ تصویریں حاصل کر لیں اور یہ کسی طرح میم ثانیہ تک پہنچ گئیں۔ ایک وقت میں ثانیہ اور سطوت جہاں کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ تصویریں اوریجنل نہیں ہیں۔ میم ثانیہ نے بھی یہ کسی برے وقت کے لئے اسٹف کے طور پر پرنٹ آؤٹ کروائی تھیں۔ لیکن اب جبکہ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی ہیں تو انہوں نے قانون کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔“
جانانہ کسی بت کی طرح اٹھی اور سطوت جہاں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔
”کیوں؟“
”کیا کیوں؟“ سطوت جہاں نے چڑ کر پوچھا۔ یہ گفتگو بہت دھیمے انداز میں ہوئی تھی، اس لئے سطوت جہاں کسی بھی قسم کے معاملے میں زیر و تھیں۔
”میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟ تم نے میرے شیرازی کو کیوں مارا؟“
بیگم سطوت جہاں کا ایک لمحے میں رنگ پھیکا پڑا، پھر ابھی تک کی خجالت، ہراسگی پر وہ پن ہو گئیں۔
”کیا بگاڑا تھا؟ شیرازی...... اس نے میرا جینا دشوار کر دیا تھا۔ میں نے تجھے دولت کمانے کے لئے پالا تھا۔ نفرت کا حساب پورا کرنے کے لئے پالا تھا، مگر اس نے تیرے اندر گھر گرہستی کے خواب جگا دیئے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مار دیا اس لئے اس ذلیل انسان کو۔“
”وہ ذلیل انسان نہیں تھا، وہ میرا شیرازی تھا۔ میرا شیرازی۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی گھٹنوں کے بل سلاخوں کے پاس بیٹھ گئی۔ مامون نے اشارے سے اسے اپنے اہلکار کے ذریعے بیگم عافیہ کے گھر

بھجوادیا تھا اور بیگم سطوت جہاں اپنا موبائل ابھی تک دھڑا دھڑ استعمال کررہی تھیں، مگر کوئی رسوخ آج کام نہیں آرہا تھا۔

''آج کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ کیونکہ آج مکافاتِ عمل ہے بیگم سطوت جہاں!''

عدیل عبدالرحمن نے کرخت لہجے میں کہہ کر سطوت جہاں کی طرف سے پشت موڑ لی تھی، مگر سطوت جہاں اس حقیقت کو ابھی ماننے سے انکاری تھیں۔



آج شہریار دفتر نہیں گیا تھا۔ کچھ طبیعت اچھی نہیں تھی اور کچھ اس کا دانیا کے ساتھ وقت گزارنے کا من تھا۔ آج دانیا نے مسٹر عبدالکریم کی لنچ پر آمد کی وجہ سے یونیورسٹی سے آف کیا تھا۔

آج وہ صبح سے مصروف تھی اور نہیں جانتی تھی کہ شہریار نے بھی اس کے لئے وقت چرایا تھا۔ سو جب وہ لنچ کے لئے چیزوں کی لسٹ بنا کر ملازم کے حوالے کررہی تھی تو شہریار چپکے سے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

''شوفر! آپ نے سنا نہیں، میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔''

''کہیے ناں میم! میں آپ کو ہی سننے کے لئے کھڑا ہوں۔''

دانیا تیزی سے مڑی تھی۔ ''شیری بھائی! آپ...... توبہ ہے، میں بھلا آپ سے کام کرواؤں گی؟''

''کیوں، میں کام کے معاملے میں ڈنڈی مارتا ہوں یا حساب کتاب میں چار سو بیسی، جو آپ یہ عنایت مجھ سے چھین رہی ہیں؟'' دانیا نے اس کی شوخی کو ایک الگ طریقے سے دیکھا۔ سامنے کی بات تھی، دانیا کے ننانوے فیصد کام شروع سے شہریار ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے لگ رہا تھا، وہ شہریار پہ بے جا بوجھ لاد دیا کرتی تھی۔ فیکٹری پرابلمز اور خود اس کے کام، وہ کتنا تھک جاتا ہوگا۔ مگر آج تک اس نے کبھی اُف تک نہیں کی۔ کبھی اس کے کسی کام کو نہیں ٹالا کہ آج نہیں، پھر کبھی کردوں گا۔

''کیا سوچنے لگیں ڈیئر سسٹر؟'' وہ آگے بڑھ کر لسٹ لے چکا تھا۔

''پلیز شیری بھائی! رہنے دیں ناں آپ۔ ویسے ہی آپ کی کل سے طبیعت زیادہ خراب ہے۔''

''اب ایسی بھی زیادہ خراب نہیں ہے۔ بستر مرگ پہ نہیں پڑا ہوا، نارمل پین ہے، جو ہوتا رہتا ہے، اس کے لئے کام تھوڑے ہی رکتے ہیں۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے، میں نے چھٹی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے

نہیں کی، بلکہ ماموں کے پاپا سے ملاقات کے شوق میں کی ہے۔ایک دو دفعہ ملا ہوں اُن کی جاگیر پر، مگر اس وقت بات اور نظریہ دوسرا تھا اب بات ذرا دوسری ہے۔“

دانیا کے چہرے پر گلابی کھلی۔شہریار نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور لسٹ لے کر باہر نکل گیا۔پھر لنچ کے لئے مطلوبہ سامان کے شاپر گاڑی میں رکھ کر وہ یونہی ونڈو شاپنگ کرنے لگا۔ابھی صبح کے دس ہی تو بجے تھے، کچھ دکانیں کھلی تھیں، کچھ بند۔پھر یونہی چلتے چلتے اُس کی نظر ایک ویڈنگ ڈریس پر جا کر اٹک گئی۔ریڈ کلر کا خوب صورت کام والا سوٹ اُسے آگے بڑھنے سے روک نہ سکا۔

’دانیا اس ڈریس میں کیسی لگے گی؟‘ اُس نے سوچا اور بنا سوچے شاپ میں داخل ہو گیا۔پھر مکمل خریداری کر کے نکلا تو بے سبب مسکراہٹ چہرے سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھی۔بارہ بجے وہ گھر پہنچا تو دانیا کو بے چینی سے اپنا انتظار کرتے پایا۔

”شیری بھائی! آپ بھی ناں......آپ نے تو لیٹ ہونے کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔“ وہ سامان لے کر تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔اس کی طرف دیکھے بغیر۔شہریار ڈریس کا شاپر لے کر نانو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

نانو نے اسے بہت دل سے خوش آمدید کہا تھا اور وہ کھلنڈرے انداز میں ان کے بیڈ پر چھلانگ لگا کر بالکل ان کے قریب جا گھسا، پھر ان کی گود میں سر رکھ کر بولا۔

”نانو! آپ کو میرا دانیا کے لئے لیا ہوا فیصلہ ٹھیک لگتا ہے ناں؟“

نانو نے مسکرا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، پھر دلار سے بولیں۔ ”تمہیں یہ اچانک اس فیصلے پر کسی اور کی رائے لینا ضروری کیوں لگا؟ ڈرتے ہو کسی بات سے؟“

اس نے بند آنکھیں کھول کر نانو کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”ساری بات یہ ہے نانو! یہ فیصلہ دانیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور دانیا کے لئے میں بہت کانشس ہوں۔مجھے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے، اگر اس فیصلے سے دانیا کو وہ خوشیاں نہ مل سکیں جو میں نے اپنے احاطہ فکر میں سوچ رکھی ہیں تو پھر......پھر کیا ہوگا؟“

نانو مسکرانے لگی تھیں، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

”جہاں ہماری سوچ ڈانواں ڈول ہونے لگے شیری! وہاں سے ہمیں وہ کام یا وہ بات خالص اللہ پر چھوڑ دینی چاہئے۔بلکہ ٹھیک تو یہ ہوگا کہ جو کام ہم اپنی محنت سے کر گزرتے ہیں، پھل پاتے ہیں اور جس میں کامیاب رہتے ہیں، وہ کام اور وہ کام جن میں تمام تر محنت کے باوجود اتنا اچھا رزلٹ نہیں حاصل کر پاتے یا بالکل ناکام ہو جاتے ہیں، وہ سارے فیصلے پہلے سے ضابطہ تحریر میں آ چکے ہوتے ہیں۔سو اللہ

کا حوالہ مضبوط ہو ناں تو انسان خوشی میں تو اسے یاد رکھتا ہی ہے، مگر تکلیف میں بھی اُس کی رضا کے آگے جھکانے والا بن جاتا ہے اور سر جھکانے والے لوگ ناکام دکھائی دیں، تب بھی ناکام نہیں ہوتے۔
کوئی نہ کوئی خاص کی چیز ان کے لئے کسی نہ کسی طاق پر ضرور دھری جاتی ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی، جزا دنیا میں پانے کی ہمک کرو یا آخرت میں پانے کی جستجو۔"
"نانو یار! آپ تو بہت اچھی باتیں نہیں کرنے لگی ہیں؟ سچ بتایئے، یہ میری صحبت کا اثر ہے ناں؟ وگرنہ آپ پر کب اُترتے تھے یہ مضامیں خیال میں۔"
"چل ہٹ شریر! بہت پٹر پٹر بولنا آ گیا ہے۔ پہلے جتنا خاموش رہتے تھے، اب اتنا ہی نان اسٹاپ بولنے لگے ہو۔"
وہ کچھ نہیں بولا۔ مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر نانو کی طرف شاپر بڑھا کر بولا۔
"نانو! یہ ڈریس دیکھ کر بتایئے، اگر دانیا اسے پہنے گی تو کیسی لگے گی؟"
نانو لباس، ہم رنگ چوڑیاں اور سینڈل دیکھنے لگی تھیں۔
"تمہاری چوائس تو بہت اچھی ہو گئی ہے۔ شاید میری صحبت کا اثر ہے۔"
وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا مگر درد۔ وہ ایک دم سے سیدھے لیٹے لیٹے کروٹ کر گیا تھا، مبادا نانو اُس کے چہرے کی رنگت سے گھبرا نہ جائیں۔
"کیا ہوا! اب یہ کمر کیوں کر لی مجھ سے؟ سچ پوچھو تو ہنستے ہوئے کچھ اتنے زیادہ بُرے بھی نہیں لگتے ہو کہ منہ چھپانا پڑے۔" نانو نے دلار سے زبردستی اسے سیدھا کیا اور یکدم گھبرا گئیں۔ "کیا ہو گیا؟........
یہ تم ایک دم سے اتنے زرد کیوں ہو گئے ہو؟"
اس نے ہونٹ دانتوں میں اب بھی بھینچ رکھا تھا۔
"شہریار! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ناں۔ آخر کیا ہوا ہے؟"
یکدم اس لمحے دروازہ کھلا تھا۔
مام کو اس موقع پر انٹری نہیں دینی چاہئے تھی۔ اس نے بوریت سے سوچا۔

”عالیہ! اسے دیکھو، ایک دم ہنستے ہنستے بالکل نڈھال سا ہوگیا ہے آخر مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ؟“ نانو ابھی تک اس کی بیماری سے آگاہ نہیں تھیں۔ اس نے ابھی تک انہیں کوئی ڈھنگ سے جواب ہی نہیں دیا تھا۔ ہاسپٹلائز ہونے کی وجہ میں بھی تھکن اور آرام کرنے کی خواہش کو ٹِک مارک کیا تھا۔ مگر اس لمحے.......

مام بہت تیزی سے اس تک آئی تھیں۔ ”شہریار تم ٹھیک ہو ناں؟“

”میں آپ کو خراب کب سے لگنے لگا مام؟ اتنا بھی بابچہ ہوں کہ.......“ زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ پھر سے لیٹ کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

”مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ مام جتنی تیزی سے کمرے میں آئی تھیں، اتنی تیزی سے واپس پلٹی تھیں۔ مگر شہریار نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”خوامخواہ دنیا ہراساں ہو جائے گی مام! میں ابھی ٹھیک ہو جاتا ہوں ناں۔“ اس نے زبان کے نیچے گولی رکھ کر پشت کے نیچے تکیے رکھ کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی تھی اور نانو کی آنکھیں، ان میں ساون آن بیٹھا تھا۔

”یہ کوئی عمر ہے ایسی تکلیف لینے کی۔“

اُس نے تسلی آمیز انداز میں نانو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ مام اُس کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ جو کام کہنے آئی تھیں، وہ قطعی بھول چکی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ٹھیک ہو سکا تھا اور اٹھ کر پھر سے باتوں کا وہی طومار تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود نانو کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نہیں چھو سکی تھی۔

وہ کافی دیر تک تو انہیں دیکھتا رہا، پھر نرمی سے بولا۔ ”بی بی نانو! کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ آپ تو ایسا لک دے رہی ہیں، جیسے میں ابھی چلا جانے والا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔ خدا نہ کرے میں وہ دن دیکھنے کو زندہ بیٹھی رہوں۔“

”اچھا تو آپ وہاں جنت میں مجھ سے پہلے جا کر انٹیریئر ڈیکوریشن میں کمال دکھانا چاہتی ہیں۔“ وہ ہنسا، پھر قطعی کر بولا۔ ”مگر نانو! یہ طے ہے، میں آپ سے بہترین ڈیکوریٹر ہوں۔ اس لئے میری خدمات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

نانو سے ایک لفظ نہیں بولا گیا تھا۔ مام جو کہنے آئی تھیں، وہ شہریار سے ہی کہنے کا ارادہ تھا۔ مہمانوں کے لئے پھولوں کا ارینج منٹ کروانا تھا، جو شہریار سے بہتر کوئی نہیں کروا سکتا تھا لیکن اب اس کی طبیعت.......

مام واپس لوٹ گئی تھیں اور موبائل پر جازی کو ٹریس کرنے کی کوشش میں تھیں۔ شہریار ایک گھنٹے بعد اُٹھ کر ان کے پاس آیا تو وہ ہنوز جازی کو ٹریس نہیں کر پائی تھیں۔

"کوئی کام ہے تو مجھ سے کہہ دیجئے ناں۔ جازی آج ایک ضروری میٹنگ میں ہوگا۔ موبائل آف کر دیتا ہے وہ میٹنگ کے وقت۔"

مام نہ کہنے کا سوچ رہی تھیں کہ اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے، پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "آپ کے لئے شہریار بستر مرگ سے بھی اُٹھ کر آ سکتا ہے مام! سو اس وقت اتنی بیڈ کنڈیشن نہیں۔ بتائیے ناں، دیکھئے جازی سے بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔

مام کچھ نہیں بولی تھیں۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھا تھا، پھر مدعا کہہ سنایا تو وہ ہنس پڑا۔

"اوہ مام! اتنا سا کام؟ یہ کام تو میں گھر بیٹھے چٹکی بجاتے کروا سکتا ہوں۔ آپ کے بیٹے کی بہت ٹور ہے مارکیٹ میں ہے۔" اس نے کوٹ کی سائیڈ جیب سے موبائل نکالا اور اپنے بیسٹ ڈیکوریٹر کو ارینج منٹ سمجھانے لگا تھا۔

ساڑھے تین بجے تک ہر کام کمپلیٹ ہو چکا تھا۔ وہ دانیا کو ڈھونڈتا ہوا کمرے میں آیا تھا۔ رابعہ بھابی اور عائشہ بھابی اسے تیار کر رہی تھیں۔

"بر دکھوے میں اتنی تیاری...... بھابی! شادی کے لئے بھی کچھ نیا رہنے دیجئے ناں؟"

"شیری بھائی! تنگ مت کریں آپ ہمیں۔ پہلا موقع ہے یہ مسز عبدالکریم اور مسٹر عبدالکریم کے سامنے جانے کا اور فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن۔ آپ سمجھتے ہیں ناں یہ بات؟" عائشہ نے مسکارا لگاتے ہوئے تیزی سے کہا۔ رابعہ اسے چوڑیاں پہنا رہی تھیں اور وہ دروازے سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بہت پیاری لگ رہی ہوں میں شیری بھائی؟" اس نے شوخی سے اسے دیکھا اور وہ گہرا سانس لے کر بھرائے لہجے میں بولا۔

"تم دانیا ہو، میری بہن۔ اور میری بہن عام حلیہ میں ہو یا خاص حلیے میں، ہمیشہ خاص الخاص دکھائی دیتی ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر عائشہ بھابی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ویسے مجھے آپ کی اس بات پر اعتراض ہے کہ مسز عبدالکریم اور مسٹر عبدالکریم کو فرسٹ اینڈ لاسٹ امپریشن کا راگ دینا کچھا تنا ضروری بھی نہیں۔ کیونکہ مامون دی گریٹ کو یہ گڈی ڈول ویسے ہی بہت پسند آئی ہے۔"

دانیا کا چہرہ بلش کر گیا تھا اور وہ ہنستے ہوئے قدم قدم رکھتا اس کے قریب آ گیا۔ کوٹ سے والٹ نکال کر اس نے کچھ روپے نکال کر اس پر سے وارے تھے، پھر مسکرا کر رابعہ بھابی کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔ "وہ

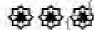
آپ کے ڈمیٹیز تو کیا کر رہے ہیں؟ آج تو ان کا غصہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہو گا۔ یعنی دفتر کی بے چاری مخلوق کچھ اور بے چاری ہو گئی ہو گی......" وہ آگے بھی کچھ کہتا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ کل سے اس نے موبائل قطعی آف کر رکھا تھا، لیکن آن کرتے ہی جو بات سنی تھی، اس نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ فون رکھ کر وہ دانیا کی طرف شکوے سے دیکھنے لگا تھا۔

"تم نے صبح کا اخبار جان بوجھ کر ڈائننگ ٹیبل پر نہیں رہنے دیا ناں۔ تم نے ثانیہ کا فون بھی مجھ سے کنکٹ نہیں ہونے دیا تھا؟"

عائشہ بھابی اور رابعہ بھابی اُس کے لہجے کی سختی سے گھبرا گئی تھیں اور دانیا منمنائی تھی۔

"آپ کی طبیعت خراب تھی۔ اس لئے میں نے سوچا، زرش کے متعلق آپ کو پتہ چلا تو آپ بہت ہرٹ ہوں گے۔"

شہریار کچھ کہے بغیر تیزی سے نکلتا چلا گیا تھا۔



"تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں یہاں اپنے کسی مصرف کے لئے لایا ہوں؟" وہ نخوت سے بولے اور سامنے بیٹھی عورت کی آنکھوں میں خوف پہلے سے کچھ اور بڑھ گیا۔ جو لوگ نرم لہجے میں سزا کی بات کرتے ہیں، وہ لوگ عموماً سزائیں کڑی دیا کرتے ہیں اور اس لمحے وہ اپنی سزا کی منتظر تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے تک یہی چار گھنٹے تیس منٹ دس سیکنڈ تک سب کچھ کتنا ٹھیک تھا۔ وہ اپنے گھر آنے والے مہمان کی چھوٹی چھوٹی خریداری کرنے نکلی تھیں۔ ساتھ میں آصفہ بھی تھیں۔ ان کی جیٹھانی، جنہیں ہمیشہ اپنی بڑی بہن سمجھا تھا۔ لیکن اب وہ یہاں بالکل اکیلی تھیں اور سامنے کھڑا شخص فرعون صفت ہو گیا تھا۔ اس نے اکڑ اور زعم سے قدم ان کی طرف بڑھائے تھے۔ تب وہ چیخی تھیں۔

"مت آؤ میرے قریب...... میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔"

قہقہہ پہلے سے بلند تھا۔ "لیکن جان سے میں تمہیں ماروں گا۔ مگر میرے قتل کا انداز ذرا اوکھا ہے۔" اس نے ان کا چہرہ چھوا اور انہوں نے سر جھٹک کر اس لمس سے بچنے کی کوشش کی۔

"چھوڑو مجھے...... تمہیں خدا کا واسطہ ہے عمرانی! میں ایک عزت دار عورت ہوں۔ میرا گھر ہے، شوہر ہے۔ کیوں تم مجھے برباد کرنے پر تلے ہو؟"

مسٹر عمرانی نے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں انہیں جکڑا تھا، پھر غور سے کہا تھا۔

”میری بہت شروع کی عادت ہے عطیہ! میں نئی اور وکھری چیزوں کو استعمال کرنے کا عادی ہوں۔ میں نے تمہیں بھی یہ آفر کی تھی، مگر تم میری بات نہیں سمجھ سکیں۔ تمہیں میرے محل کی رانی بننے سے زیادہ اُس چند ہزار کمانے والے بیوروکریٹ کی چاکری کا شوق تھا۔ تب میں نے قسم کھائی تھی، میں اگر تمہیں نہیں پاسکا تو تمہیں بھی خوش نہیں رہنے دوں گا۔ اور دیکھ لو، آج میں نے یہ موقع پا لیا۔ وہ کون تھی؟ ہاں، تمہاری جیٹھانی، وہ کوئی اچھی عورت نہیں۔ دولت کے لئے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے اور میں نے اس مقام پر اسے اپنے قدموں پر گرا لیا ہے۔ تم یہاں ایک ہفتہ بند رہو گی اور پھر میرے خاص ملازم تمہیں خود تمہارے گھر کے سامنے چھوڑ آئیں گے۔ لیکن کیا تم دوبارہ اس گھر میں، اس شوہر کے دل میں جگہ بنا پاؤ گی؟“

”عمرانی!.......تم.......تم چھوڑو مجھے، چھوڑو۔ تم کمینے انسان ہو۔ لیکن میرا خدا!.......وہ مجبور نہیں۔ وہ تم سے بدلہ لے گا۔ ایسے کہ تم گنگ رہ جاؤ گے۔ اس بدلے پر چیخ بھی نہیں پاؤ گے۔ میرا خدا.......“

”ہاں، تمہارا خدا۔ وہ لوگ مجبور ہوتے ہیں، وہ ایسے ہی عذر تراش لیتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو مشیت ایزدی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن دیکھو، آج میں.......میں کتنا با اختیار ہوں۔ کتنا با اختیار.......“ مسٹر عمرانی کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے گئے تھے کہ عطیہ بانو زور سے چیخی تھیں۔

”چپ ہو جاؤ۔ کفر مت بکو۔ ڈرو خدا سے، اس کے انصاف سے۔ چپ ہو جاؤ۔“

یہ چیخ پھر سے بلند ہوئی تھی اور وہ یکدم ہل کر رہ گئے تھے۔

یہاں وہ کمرہ تھا، نہ عطیہ بانو، نہ ہی غرور.......مگر انصاف.......انصاف چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ ایک تیز روشنی تھی، جس سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

”مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ وہ زور سے چیخے۔

”صاحب پاگل ہوگیا ہے۔ کبھی کہتا ہے کچھ نظر نہیں آ رہا، کبھی کہتا ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ کبھی ایک دم چپ ہو جاتا ہے، فل اسٹاپ کے مانند۔“ ایک ملازم نے دوسرے ملازم سے کہہ کر ہنسنے کی کوشش کی مگر ثانیہ میم کو دیکھ کر دونوں اِدھر اُدھر کھسک گئے تھے۔ پھر ثانیہ کچھ پوچھنے والی تھی کہ ایک ملازم نے ایک وزیٹنگ کارڈ دیا۔

”شہریار.......بھیج دو اندر۔“ وہ وہیل چیئر کھسکاتی ہوئی ڈرائنگ روم میں در آئی۔ پھر باتیں کرتے تعزیت کرتے ہوئے وجاہت سے بات نکال رہا تھا کہ مسٹر عمرانی دوڑتے ہوئے ثانیہ کی وہیل چیئر سے آ کر ٹکرا گئے۔

”ثانی! دیکھو، میرے کمرے میں جا کر دیکھو۔ وہاں کوئی عورت ہے، جو مسلسل کہہ رہی ہے کہ اس کے خدا کی پکڑ نے مجھے جکڑ لیا ہے...... ثانیہ! مجھ سے ٹھیک سے چلا بھی نہیں جا رہا، ایسا لگتا ہے، جیسے کسی نے میرے ہاتھ پیر کسی مضبوط رسّی سے باندھ دیئے ہوں۔“

ثانیہ نے مسز عمرانی کو تاسف سے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ ”آپ کے کمرے میں کوئی عورت نہیں ہے پاپا! میں نے صبح آپ کے ساتھ مل کر تلاشی لی تھی ناں، کہیں کوئی تھا کیا؟“

”نہیں، لیکن اس وقت وہ چھپ گئی ہوگی۔ روحیں تو کہیں بھی آجا سکتی ہیں ناں ثانیہ! وہ تمہیں دیکھ کر چھپ جاتی ہے، مگر مجھے دیکھتے ہی سامنے آجاتی ہے، کہتی ہے عمرانی! میں عطیہ ہوں...... عطیہ بانو...... میرے خدا کا انصاف...... ثانیہ! کیا خدا صرف عطیہ بانو کا ہے؟“

”نہیں پاپا! خدا سب کا ہوتا ہے، لیکن ہم نے اسے اپنا سمجھا کب ہے۔ ہم اسے اپنا نہیں سمجھتے ہیں۔“

شہریار بے چینی سے دونوں کی باتیں سننے لگا۔ پھر ملازمین عمرانی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ جب شہریار کے کہنے پر ثانیہ نے مسز عمرانی کی کہانی کے اس موڑ سے آگاہ کیا۔

شہریار اسے دیکھنے لگا۔ ”یہ سب کچھ گلٹ کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیں تو ان کی حالت سنبھل سکتی ہے۔ ماہر نفسیات کیا کہتے ہیں؟“

ثانیہ نے اس کی بات کو سن کر تاسف سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی، پھر بولی تھی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پاپا کا یہ سوانگ راہِ فرار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن شہریار! وہ عورت کون تھی؟ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا کہ پاپا کی غلطی کا کفارہ ادا ہو۔ پتہ نہیں وہ عورت زندہ بھی ہے یا مر گئی۔“

”وہ عورت مر چکی ہے ثانیہ!“ اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔

”تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اس لئے کہہ سکتا ہوں میں اتنے وثوق سے کہ وہ عورت میری ماں تھی۔ مسٹر ارسلان راشدی کی بیوی، میری اور مومنہ کی ماں۔ اور مسٹر عمرانی کی اس چال سے انہیں دربدر کر دیا گیا۔ انہیں پاپا نے طلاق دے دی تھی اور وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں کیونکہ وہ بہت ٹوٹ کر میرے پاپا سے محبت کرتی تھیں۔ لیکن ثانیہ! اگر مسٹر عمرانی اس حقیقت کو مسٹر ارسلان راشدی کے سامنے کہہ گزرتے ہیں تو مرنے کے بعد ہی سہی، ان کی ذات پر لگا ہوا بدنامی کا داغ تو مٹ جائے گا۔ پاپا ان کی طرف پوری طرح لوٹ آئے ہیں۔ اپنے کیے پر نادم ہیں۔ لیکن جب ماما کی گمشدگی کا ایک ہفتہ ان کے دماغ میں کسی ہزار پا کی طرح

سر سرانے لگتا ہے تو وہ میری ماں کی محبت سے پشت کر لیتے ہیں۔"
"لیکن تم تو مسٹر عبدالرحمٰن کے بیٹے مشہور ہو۔" اس نے سکتے میں سے نکل کر سوال کیا اور وہ بھرائے لہجے میں بولا۔
"ہاں! اور مجھے یہی حوالہ عزیز تر ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں، میری ماں کی برأت ثابت ہو۔ ثانیہ! جو آج آپ سے کہہ گزرا ہوں، وہ میں نے آج تک کسی سے نہیں کہا، اس لئے مجھے یہ یقین ہونا چاہئے، یہ سچ صرف آپ کے دل تک محدود رہے گا۔"
ثانیہ نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ شام ساڑھے سات بجے گھر پہنچا تھا۔
مسٹر عبدالکریم، دانیا کو پسند کر کے جا چکے تھے اور شادی کی بات ماموں کی والدہ کے آپریشن کے بعد صحت یابی تک موقوف ہو گئی تھی۔ ہاں، منگنی ہفتے کے دن طے پائی تھی۔ ساری اطلاعات اسے شام کی چائے پر رابعہ بھابی سے مل رہی تھیں۔ وہ چائے کے ساتھ شوگر فری بسکٹ لے رہا تھا، جب اچانک اس نے سوال کیا۔
"سالار بھائی کا کچھ اتا پتہ؟"
رابعہ بھابی نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئیں اور وہ اٹھ کر دانیا کے کمرے میں آ گیا۔ دانیا ڈریس بدل چکی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہو کر ہاتھ میں تھامے ہوئے شاپر اس کے بیڈ پر رکھے تھے۔
"منگنی والے دن تم یہی کپڑے پہنو گی؟"
"لیکن منگنی کے دن تو کپڑے لڑکے والوں کے گھر سے آتے ہیں ناں شیری بھائی!" عائشہ بھابی چپکے سے جانے کب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں، سو اس کا حکم سنتے ہی وضاحت کرنے لگیں۔
اس نے مسکرا کر انہیں پلٹ کر دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "لڑکا کون ہے؟ ماموں ہے ناں! اور ماموں میرے کسی حکم سے سرتابی کر ہی نہیں سکتا، اس لئے آپ بے فکر رہئے، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"
دانیا کچھ نہیں بولی، مسکراتی رہی اور یہی مسکراہٹ اب اس کے دل کا موسم تھی۔ شہریار اس کی مسکراہٹ کو دعا دیتا ہوا اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ عائشہ بھابی کے ساتھ چل رہا تھا۔
"آج کل سنی بھائی کی کیا سرگرمیاں ہیں بھابی جی؟"
عائشہ بھابی نے دھیمی مسکراہٹ سے اسے دیکھا، پھر نرمی سے بولیں۔ "عینی کے بارے میں آج کل وہ کافی سرگرم ہیں، جاننا چاہتے ہیں، عینی کس کی بیٹی ہے؟"

”حالانکہ جھگڑے کے دوران وہ کہہ چکے ہیں، عینی میری بیٹی ہے، پھر کیا اُلجھن ہے؟“

عائشہ بھابی نے شرمندگی سے اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولیں۔ ”وہ تو غصے میں پوائنٹ آؤٹ کر گئے تھے، لیکن میں جانتی ہوں، آپ کردار کے کتنے مضبوط انسان ہیں۔“

اس نے سنا مگر رائے ظاہر کرنے کے بجائے بولا۔ ”اُفوہ، وہ یہ نہیں سوچ رہے کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے۔ وہ میری گرل فرینڈز کی لمبی سی لسٹ کو اپ ڈیٹ کر کے پتہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ اس کی والدہ ماجدہ کون ہے؟“

”شیری بھائی! آپ جانتے تو ہیں اپنے بھیا کی عادت، پھر دل کیوں چھوٹا کرتے ہیں؟“

”ارے کہاں، میں تو مزے میں ہوں اور مطمئن ہوں کہ بڑے بھیا کسی نہ کسی طرح مصروف تو نہیں۔ سوچیے، اگر میں ان کی زندگی سے نکل گیا تو ان کی تھرل زندگی کتنی ڈل ہو جائے گی ناں۔“

”اللہ نہ کرے، آپ کہیں اِدھر اُدھر ہوں۔“

وہ ہنسنے لگا، پھر آہستگی سے بولا۔ ”اتنی جلدی میں آپ کے مجازی خدا کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ گن گن کے بدلے چکانے ہیں۔“

”وہ آپ کے بدلے کہاں اُتار سکیں گے؟“ عائشہ بھابی نے قطعاً معذوری ظاہر کی اور وہ شرارت سے بولا۔

”اسے کہتے ہیں مشرقی بیوی۔ یہ ہماری بیٹی ہے کہاں۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے اسے سرکیمپ سے واپس آئے ہوئے، لیکن میں نے ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔“

”وہ لائبہ کے ساتھ ہو گی یا پھر نانو کے کمرے میں۔ اس کا زیادہ تر وقت ایسے ہی کاموں میں گزرتا ہے۔ سچ پوچھیں تو وہ بالکل آپ کی طرح سوفٹ اور کیئرنگ بچی ہے۔“

”اتنی پذیرائی...... پھر کیا خیال ہے، آپ ہی نہ رکھ لیں اسے؟“

”رکھ لوں کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو ہے ہی ہم سب کے دلوں میں۔ محبت کرنا اور محبت کروانا خوب آتا ہے آپ کی بیٹی کو۔“

”ظاہر ہے، میری بیٹی ہے۔“ اس نے کالر اکڑائے۔

عائشہ بھابی کچن کی طرف مسکراتی ہوئی مڑ گئیں اور وہ عینی کو ڈھونڈتا ہوا تھک کر ماما کے کمرے میں آ گیا۔ ماما بہت غیر متوقع طور پر جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں۔

"خیریت مام! کچھ خاص چیز مانگ رہی ہیں کیا؟"

مام نے اس کا چہرہ دیکھا اور کچھ ہی کمرے کے باہر کھڑی سنی جانے والی ادھوری باتیں ان کے اندر شور مچانے لگیں۔

"کیا ہوا، آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں، سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں، سب ٹھیک لگ رہا ہے، مگر پتہ نہیں، مجھے کیوں لگنے لگا ہے، جیسے سب کچھ خراب ہوتا جارہا ہے؟"

"کیا خراب ہوتا جارہا ہے مام؟" اس نے چونک کر مام کو دیکھا۔

مام نے جائے نماز کا کونا موڑا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "دعا سے سب کچھ مل جاتا ہے ناں شیری؟"

"آف کورس مام! سنا میں نے بھی یہی ہے کہ دعا سے سب کچھ مل جاتا ہے، اور جو نہیں ملتا، اس کا نہ ملنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ویسے میں اس سے زیادہ دعا کے متعلق آپ کو بتا نہیں سکوں گا، کیونکہ میں خود بھی ابھی بالکل ریسنٹ دعا اور نماز کی سمت مڑا ہوں۔ دفتر کے کاموں میں کبھی فرصت ہی نہیں ملتی تھی، لیکن اب سوچتا ہوں کہ غلط کرتا تھا۔ فرصت ملتی نہیں فرصت تو نکالنی پڑتی ہے۔"

"تم نماز پڑھنے لگے ہو؟"

"جی مام! دو ماہ سے باقاعدگی سے نماز شروع کی ہے۔ دعا کریں، پچھلی نمازوں کی کوتاہی معاف ہو جائے۔"

"وہ معاف کرنے والا ہے، بہت معاف کرنے والا۔ تم نے تو پھر بہت جلدی اس کا دامن پکڑ لیا، میں نے تو بہت دیر کر دی، اس کی بارگاہ میں جانے میں۔"

وہ اُٹھ کر مام کے قریب آ گیا، پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "موت سے پہلے جو نیکی ہو جائے، معافی مانگنے کی توفیق مل جائے، اسے دیر ہونا نہیں کہتے، وہ لڑکھڑاتے قدموں کو بہت محبت سے سہارا دینے والا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر سنجیدگی کو دور کرتے ہوئے بولا۔ "ویسے آپ مانگ کیا رہی ہیں؟" اس نے سوچنے کا پوز دیا، پھر ہنس کر مکر ربولا۔ "یقیناً عائشہ بھابی کی زندگی میں بہار کی دعا مانگ رہی تھیں ہے ناں؟"

مام نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر ممتا سے بولیں۔ "آج میں نے صرف اپنے لئے کچھ مانگا ہے۔ اپنی سب سے پیاری اولاد کے لئے کچھ مانگا ہے۔ آج میں نے تمہارے

لئے دعا مانگی ہے، صرف تمہاری خوشیوں کے لئے سجدہ کیا ہے۔"

"مام......!" وہ یکدم سنجیدہ ہوگیا تھا۔ "میں آپ کے لئے اتنا پیارا ہوگیا ہوں؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

مام نے اس کے سنورے ہوئے بال بکھیر دیئے تھے، پھر لاڈ سے بولی تھیں۔ "جب میری تم سے بات چیت نہیں تھی، میں تمہیں اگنور کرتی تھی، تب بھی...... تب بھی میرا دل تمہارے لئے نرمی محسوس کرتا تھا۔ جب دانیا نے تمہارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کی اطلاع دی تو میں نے بے مروتی سے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا، پوری طرح تمہیں رد کرنے کی کوشش کی، مگر شیری! میں اُس دن دوبارہ سو نہیں پائی تھی۔ میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا تھا کہ تمہاری وجہ سے میری نیند خراب ہوئی تھی، لیکن در حقیقت یہ میرے اندر کی ممتا تھی، جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بہت برا کیا جو تم سے اتنے سالوں ناراض رہی، تمہیں اگنور کیا۔"

"مام! چھوڑ یئے بھی۔ گزری باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ؟ یہ دیکھئے کہ آج آپ میرے ساتھ ہیں، اور سچ پوچھئے تو مجھے کل کے مقابلے میں آج آپ کی محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔" وہ اب مام کی گود میں سر رکھ کر وہیں لیٹ گیا تھا۔ مام اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں اور وہ ان کے آنچل کو چہرے پر ڈھک کر سونے کی کوشش میں تھا۔

"بہت تھکن ہو رہی ہے؟"

"ہاں مام! آج کل بہت زیادہ تھکن ہونے لگی ہے۔ سوچتا ہوں، لمبی چھٹیاں لے لوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں، سنی بھائی اور جازی پر بہت بوجھ آپڑے گا تو رک جاتا ہوں۔"

"تم نے صمدانی بھائی کو جوائن کیا تھا؟"

اس نے چہرے سے آنچل ہٹا کر مام کا چہرہ دیکھا۔ "ڈاکٹر ان سے مل لیتا ہوں، وہ کہتے ہیں، سب کچھ پرفیکٹ ہے۔"

"لیکن تمہاری گرتی ہوئی صحت تو کہتی ہے، چپکے چپکے کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "نو مام! آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ بس سمجھئے، نکما پن آتا جا رہا ہے آپ کے بیٹے میں۔"

"بکو مت۔ نکما بیٹا تم جیسا ہوتا ہے تو کامی بچہ کیسا ہوگا؟"

”سنی بھائی جیسا۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔ مام نے اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور عین اسی وقت عینی نے کمرے میں انٹری دی۔

”واہ بابا! اکیلے اکیلے محبت کمیٹی جا رہی ہے۔“

”تو پھر فلاسفر اعظم، آپ کو دن بھر کا وقت دیا تو جاتا ہے دادو کے ساتھ رہنے کا۔ شام تو صرف ہماری ہے۔ کیا سمجھیں؟“

”یہی کہ آپ بہت چالاک ہو گئے ہیں۔“

”اچھا جی! کیوں اپنے بابا کو الزام دے رہی ہو؟ ہم جیسے شریف بابا اور کہیں ملیں گے آپ کو؟“

”نہیں، آپ جیسے بابا واقعی کہیں نہیں ملیں گے۔“ اس نے یقین سے کہا اور ماما اس کا سر کشن پر رکھ کر اس کے لئے کافی لانے کا کہہ کر اُٹھ گئیں۔

عینی اپنے پہلے جملے کے بعد خاموش بیٹھی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں بچے؟“

”آپ دنیا کے بیسٹ بابا ہو، بابا!“

”یہ کوئی مقابلہ ہو رہا ہے کیا؟ ابھی مام بھی سب سے بیسٹ بیٹا کہہ کر تمغہ دے رہی تھیں اور ابھی آپ پھول لگا کر کریڈٹ جتا رہی ہو۔“

عینی اس کے قریب بیٹھ گئی، پھر آہستگی سے بولی۔ ”بابا! آپ نے کبھی سوچا، میں نے جو آپ سے کہا، وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔“

شہریار چونکا، ابھی صبح ہی تو عدیل بھائی نے اسے گڈ نیوز دی تھی، تو کیا یہاں وہ گڈ نیوز سیاق و سباق سے ظاہر ہونے والی تھی۔

”بابا! آپ سن رہے ہیں ناں، میں کچھ کہہ رہی ہوں؟“

”میں سن رہا ہوں لیکن سمجھ نہیں پا رہا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اس نے جان کر طرح دی اور وہ روٹھی ہو کر بولی۔

”میں نے اب تک جو آپ کو کہانی سنائی، وہ جھوٹی تھی بابا!“

شہریار نے اسے دیکھا اور کچھ نہیں بولا۔ ابھی کچھ مہینے پہلے ہی تو اس نے کچھ سالوں پہلے کی لی گئی ذمے داری کو سمیٹ لئے جانے کے بعد اچانک سالار عبدالرحمٰن کے سامنے ایک فوٹو گراف رکھا تھا۔
"یہ لڑکی...... اسے آپ جانتے ہیں؟"
سالار عبدالرحمٰن نے تصویر دیکھی اور نخوت سے بولے۔ "میری سیکرٹری تھی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"
"کیا آپ بہت فرینک تھے اس سے؟"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ رکے، پھر بھنائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "اگر تم کسی سلسلے میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم سب کے سامنے میری پرسنالٹی کو سبوتاژ کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمہیں پاپا کی گڈ بک میں آنے کا بہت شوق ہے ناں تو سنو، ہاں! وہ میری بہت اچھی دوست تھی اب کہو، کیا ہے تمہارے پاس؟ کون سا بلیک میلنگ اسٹف ہے؟ بولو!"
اور شہریار کچھ کہے بغیر وہاں سے پلٹ آیا تھا اور آج اچانک عینی کچھ اور کہہ رہی تھی۔
"آپ مجھے اچھی بچی نہیں سمجھیں گے اگر میں نے سچ کہہ دیا تو۔"
"سچ کہنے پر سزا نہیں دی جانی چاہئے، یہ میرا طرزِ فکر ہے۔ تم کہو تم نے کیا جھوٹ کہا تھا؟"
"بابا! جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو مجھے دل نے کہا، آپ سے زیادہ اچھا انسان دنیا میں نہیں ہو سکتا، میں آپ کو نہیں جانتی تھی مگر بس میرا دل کہنے لگا تھا کہ مجھے آپ کو کبھی سچ نہیں بتانا۔ میم ثانیہ نے کہا، میں اگر ان کے جھوٹ میں ان کا ساتھ دوں اور یہ کہہ دوں کہ میرے پاپا سالار انکل ہیں تو مجھے جلد رن ہوم کے گھٹے ہوئے ماحول سے نجات مل سکتی ہے۔ میں ایک بہترین زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے بھی اس وقت یہی سوچا، میں پانچ سال کی تو تھی بابا! لیکن آہستہ آہستہ آپ کی اچھائی، آپ کی محبت نے مجھے بتایا کہ عیش و عشرت سے زیادہ محبت ضروری ہوتی ہے۔ پھر میں میم ثانیہ کے غائب ہونے کے بعد بھی آپ سے جھوٹ بولتی رہی، آپ نے ہاسٹل آ کر کہا، میم ثانیہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے تو مجھے لگا، میرا سچ بھی ان کے ساتھ مر گیا۔ لیکن جب جب گھر میں میری وجہ سے آپ کو سنی انکل نے برا بھلا کہا تو مجھے لگا، میں بہت گندی بچی ہوں، جو اپنے بابا کو اپنا سچ بتا کر اس شرمندگی سے بچا نہیں سکتی، میں بہت گندی بچی ہوں بابا! لیکن اب میرا دل بہت زیادہ تھک گیا ہے اس سچ کو چھپاتے چھپاتے۔"

شہریار اس کا چہرہ دیکھتا رہا، کچھ نہیں بولا۔

”بابا! آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟“

وہ ہولے سے مسکرایا۔

”میں تم سے ناراض ہی نہیں بیٹا! پھر معافی کس بات کی؟“ اس نے اس کی پونی ٹیل ہلائی، پھر نرمی سے بولا۔ ”جو کچھ آپ نے مجھے ابھی بتایا، یہ میں جانتا ہوں، بہت پہلے سے جانتا ہوں، میں نے آپ کو اپنی بیٹی بنایا تھا تو اس رشتے کو سمجھا بھی نہیں۔ سچ مجھ پر ظاہر ہوا، تب بھی میری نظر میں تمہاری قدر میں کمی نہیں آئی کیونکہ تم نے مجھے تنہائی کے ان لمحات میں سہارا دیا، محبت سے تھاما تھا، جب مجھے صرف مر جانے کے سوا اپنی پرابلم کا کوئی حل نہیں دکھائی دیتا تھا، سو اب جب کہ زندگی مجھ پر مہربان ہوگئی ہے تو میں تم سے نامہربانوں سا سلوک کیوں کروں؟ ویسے میرے پاس تمہارے لئے ایک گڈ نیوز بھی ہے۔“

”گڈ نیوز؟...... بتایئے ناں بابا! جلدی سے، میں بہت بے چین ہوگئی ہوں۔“

وہ اُٹھ کر بیٹھا اور اسی وقت مام اس کے لئے کافی لے کر اندر داخل ہوئیں اور اس نے عینی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”گڈ نیوز سننے کی نہیں، دیکھنے کی چیز ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو کر آؤ تو میں تمہیں اس گڈ نیوز سے ملوا لاتا ہوں۔“

عینی نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی اور اس نے مام کے ہاتھ سے کپ لے کر مسکرا کر کہا۔ ”اپنے بابا پر یقین ہے ناں تو بس جلدی سے ریڈی ہو کر آؤ۔ میں جب تک اپنی پیاری سی مام کے ساتھ کافی پی کر آتا ہوں۔“

عینی اُٹھ گئی اور مام نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ولار سے کہا۔ ”ابھی تو اتنا تھک کر آئے ہو، پھر یہ کہاں جانے کا پروگرام بنا بیٹھے ہو؟“

اس نے گرم گرم کافی کا گھونٹ بھرا اور مام کو دیکھا۔ ”عینی کی ماں کا پتہ چل گیا ہے مام! اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں اسے۔“

”کون ہے عینی کی ماں؟“ مام کے لہجے میں خوف آ گیا اور شہریار ہنسنے لگا۔

”اوہ مام! آپ بے فکر رہئے، آپ سے عینی کو کوئی دور نہیں کرے گا۔ عینی کو میں ایڈاپٹ کر چکا ہوں اس لئے اس کی ماں بھی چاہے تو عینی کو مجھ سے نہیں لے سکتی۔ اور پھر وہ لڑکی مجھے اچھی طرح جانتی ہے،

مجھے بھائی کہتی ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں مام!"مومنہ" آپ ملی بھی ہیں اس سے، اس لئے بے فکر رہئے، نہ میری زندگی میں، نہ میرے بعد، عینی کو آپ سے کوئی دور نہیں کرسکتا۔ ہاں، صرف وہ ملنے یا رہنے مومنہ کے پاس جاسکتی ہے، اس کا شیڈول ہم مل کر طے کرلیں گے۔" وہ کہتے ہوئے رکا، نظر اٹھا کر مام کو دیکھا تو ان کا موڈ سخت خراب پایا۔ "کیا ہوا آپ کو؟"

مام نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، پھر خفگی سے بولیں۔ "یہ تم مرنے جینے کی باتوں کے علاوہ بھی کوئی بات ڈھنگ سے کرسکتے ہو یا میں تمہارا بائیکاٹ کروں پھر سے؟"

اس نے کپ زمین پر رکھ دیا، پھر ولار سے مام کو دونوں بانہوں میں سمیٹ کر بولا۔ "اُفوہ مام! وہ تو میں نے حفظ ماتقدم کے تحت کہا تھا، وگرنہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"شہریار!........ میں کہہ رہی ہوں کہ........"

"مام........!" اس نے اُن کے کندھے سے سر ٹکا دیا، پھر بے بسی سے بولا۔ "سوری مام! زبان بار بار پھسل جاتی ہے، کوشش کروں گا، آئندہ ایسا کم سے کم ہو۔ مام پلیز! اب مان بھی جائیں۔" اس نے مام کی ٹھوڑی اوپر کی۔ مام کی آنکھوں میں ابھی بھی خفگی تھی لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

"رات کے کھانے پر ملتے ہیں پھر۔" وہ اُٹھ گیا تھا۔ باہر سے عینی اسے آواز دے رہی تھی۔ پھر وہ عافیہ میم کے گھر میں عینی کے ساتھ داخل ہوا تو مومنہ، وائمہ، مراد سب نے بہت احترام دیا اسے۔ مومنہ بار بار عینی کو دیکھے جا رہی تھی، جب شہریار نے کہا۔

"تم دونوں چاہو تو دو بچھڑے ہوئے دلوں کی طرح رج کے مل بھی سکتے ہو۔ مومنہ! تم سے ایک وعدہ کیا تھا میں نے، وہ وعدہ آج پورا کیا۔"

مومنہ نے چونک کر اسے دیکھا اور شہریار نے عینی کو کندھوں سے تھام کر مومنہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا۔

"ان سے ملو، یہ عینی ہیں، میری بیٹی۔ مگر آپ کی گمشدہ محبت کا استعارہ بھی ہے ان کی ذات۔"

"یعنی شیری بھائی؟"

"یعنی وہی جو تم سمجھی ہو۔ شی از یور ڈاٹر!"

مومنہ نے یہ سنتے ہی عینی کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ عافیہ میم اس کے ملنے کی تفصیل جاننے لگیں اور وہ دھیرے دھیرے انہیں اصل کہانی حذف کرکے صرف چلڈرن ہوم سے ایڈاپٹ کرنے کی داستان سنانے لگا۔

”امیزنگ...... اسے ہم اتفاق کہیں گے۔“

”بہت حسین اتفاق عافیہ!“ مسٹر سلیم افسر جو بھی ابھی دفتر سے آئے تھے، باتوں میں حصہ لیتے ہوئے بولے۔

سب بہت خوش تھے اور اسی خوشی میں اسے زبردستی کھانے کی میز جوائن کرنی پڑی تھی۔ مگر مام کے لئے اس نے پیٹ میں ایک کونہ بچا کر رکھا تھا، سو وہ جلد ہی اٹھا اور مومنہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جان بھیا! یہ میری امانت ہے۔ اب چاہے یہ تمہاری بیٹی ہے مگر اسے تم سے زیادہ پیار دے کر پالا ہے میں نے۔ سو میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کبھی کبھی کا ملنا ملانا رہے گا تو دل کو قرار رہے گا۔“

”بے فکر رہو شہریار بھائی! آپ مجھے احسان فراموش نہیں پائیں گے۔“

”ارے واہ، بہن بھائی میں یہ احسان کہاں سے آ گیا؟ بابا یہ تو تمہارا حق ہے۔ رہا یہ اتفاق تو یہ قطعی خدا کا فیصلہ تھا اور اس سے پتہ لگتا ہے، وہ ہم سے کتنی محبت رکھتا ہے۔ رہا ایڈاپٹیشن تو مومنہ! یہ صرف اس لئے کہا کہ مام اور پاپا کو عینی سے بہت لگاؤ ہو گیا ہے۔ نو، لائبہ سے زیادہ عینی کو چاہنے لگی ہیں، اس لئے ان میں سے کوئی بھی عینی سے دستبردار نہیں ہونا چاہے گا۔“

”تو یہاں کون اس پوائنٹ کو اٹھانے والا ہے شیری بھائی! ہم عینی کو محبت سے آپس میں بانٹ لیں گے۔ یہ میری بیٹی سہی، لیکن پہلا حق اس پر آپ کا ہے، انکل آنٹی کا ہے۔“ مومنہ نے محبت سے اس کی بات سمجھ لی تھی، سو وہ رات دس بجے گھر میں داخل ہوا تھا۔

”کھانا کھانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی ناں تمہیں؟“ وہ مام کے خفگی بھرے لہجے کو انجوائے کرتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

”آپ کے لئے بھوک بچا کر لایا ہوں۔ جلدی سے جو پکایا ہے، لے آیئے، مل کر کھانا کھائیں گے۔“

مام نے تشکیک سے دیکھا تو اس نے ولار سے مام کے کندھوں پر دباؤ ڈالا۔ ”پرامس مام! آپ کے ساتھ کھانا کھانے کا چانس مس نہیں کرنا چاہتا میں۔ اس لئے وہاں صرف کھانا کھانے کی ایکٹنگ کر کے آیا ہوں۔ اب آپ جلدی سے ریئل میں کھانا کھلا دیجئے۔ بندہ بہت دعائیں دے گا۔“

مام نے کھانا ٹیبل پر سرو کیا۔ دونوں نے بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا۔ دانیا کا ذکر آیا تو وہ بولا۔ ”دانیا خوش تو ہے ناں مام؟“

”ہاں! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

"سنی بھائی کا ردِعمل آیا؟"

"کل سے ہنگامہ کھڑا کرر کھا ہے۔ عائشہ کی زندگی اجیرن کرر کھی ہے اس نے۔ لیکن خود ہی بک جھک کر چپ ہو جائے گا۔"

"مام! ایسے تو نہ کہیں، دراصل سنی بھائی، دانیا سے مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں، اس لئے ان کا غصہ کرنا فطری عمل ہے۔ یہ اور بات ہے، وہ ایک غلط بات پر انرجی ویسٹ کر رہے ہیں۔" شہریار نے سالار کا خود ہی دفاع کیا۔

مام کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ محبت کے یہ بندھن اور اتنے مضبوط بندھن۔ کے تمام تر ناراضگی کے باوجود دفاع کرنے کی رواداری برقرار رہے۔



مامون عبدالکریم نے ڈیل فائنل کر دی تھی۔ کوریئر سے مومنہ کے طلاق کے کاغذات پہنچ گئے تھے۔ زوار حسن شاہ فیک پرسنالٹی سے باہر جا رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن اور مامون دونوں اسے ایئر پورٹ پر کلیئرنس دینے کے لئے آئے تھے۔ طیارے نے رن وے چھوڑا تھا اور مامون نے ہنس کر کہا تھا۔

"ایک دم پروگرام کے مطابق کام ہوا ہے۔ بظاہر بہت بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا لیکن میں نے بھی اس کی شخصیت مارک کر لی تھی۔ میک اپ اب اتنا بھی بہترین نہیں تھا کہ پہچان نہیں پاتا میں۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا، پھر شرارت سے بولے تھے۔ "وہ سمجھ رہا تھا، ہم اسے نہیں پہچانیں گے۔ کتنے مزے سے اس نے تمہارے سگریٹ کو شعلہ دکھایا تھا۔ ساری توجہ اس کی طرف تھی، ہم اسے آشنائی سے دیکھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن باس کو ہی آف کرنے والے معاملے نے اس ڈرامے میں ہمارا بھرم رکھ لیا۔ اب زوار حسن ہوگا اور انٹرپول کی پولیس۔"

بہت زور سے قہقہہ لگایا تھا دونوں نے مل کر اور مامون نے شرارت سے دیکھ کر عدیل عبدالرحمٰن کی طرف نیا شگوفہ چھوڑا تھا۔ "اگر میں ایک اور ہاتھ کی صفائی بتا دوں تو آپ تو داد دینے کے لئے مچل ہی جائیں گے۔"

"مزید ہاتھ کی صفائی یعنی......" عدیل عبدالرحمٰن نے دلچسپی سے دیکھا اور اس نے کہا۔ "کچھ شواہد کے مل پر ہم نے جو انٹرپول سے رابطہ کر کے زوار حسن شاہ کو دو تین قتل کیسوں میں پھنسایا ہے، اس کی وجہ سے وہ ایئر پورٹ پر ہی دھر لیا جائے گا کیونکہ ہم نے حلیہ بتا دیا ہے۔ سو جناب! جب وہ گرفتار ہوگا تو اس کے سامان کی تلاشی بھی ضرور لی جائے گی اور سامان کی تلاشی میں آخری وقت میں رکھی ہوئی سی ڈیز اور

کچھ بلیک میلنگ اسٹف برآمد ہوگا۔ یہ وہ سب اسٹف ہے، جو ہمیں اسٹرینجر نے دیا تھا۔ اس کی پائیریسی کاپی سمجھئے، سو جب وجا قاعدہ اخبارات میں لگے گی، انٹرنیٹ پر جاری ہوگی تو ہماری اکثریت سیاست دان حمام میں...... اب آپ سمجھ رہے ہیں ناں۔ دوسرا دردناک پہلو یہ ہوگا کہ یہاں حسن ابراہیم بیٹے کی اس حرکت کی وجہ سے لعن طعن کا شکار ہو کر اکیلے پڑ جائیں گے۔ اس حرکت پر کوئی انہیں یہاں سپورٹ کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ مسٹر افضل بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گے کیونکہ ان کے بخیے ادھیڑنے کے لئے کافی سے زیادہ مواد ان سی ڈیز میں شامل ہے۔ گرین فائل، یو نو۔ سو سمجھئے، حکومتی پریشر کے تحت بھی کوشش کی گئی تب بھی آزاد میڈیا اس مواد کو لے اڑے گا۔ اگر ملکی مفاد کے تحت درخواست پر یہ معلومات باہر آنے سے رہ گئیں تو بھی آپ جانتے ہیں، ہمارا اسٹرینجر کا مہرہ زندہ ہے اور اسی لئے میڈیا کے سامنے نہیں آیا ابھی تک کہ اس سے اس طرح کے کام نکلوائے جاسکیں۔ کسی بھی میڈیا کو یہ خبر باہر ہی سے بالا ہی بالا بیچ دی گئی تو؟ آپ تو جانتے ہیں، یورپی پاپارازی اخبارات ایسی خبروں کی اچھی خاصی رقم ڈونیٹ کر دیتے ہیں۔ اور رہی رقم کی سیونگ، تو جناب! سوئس بینک زندہ باد۔ یہ روپیہ ہم اپنی کارکردگی کو زیادہ جدید کرنے میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ایلیٹ فورس تو ایک بہانہ ہے، ایک سلوگن۔''

عدیل عبدالرحمٰن نے مامون عبدالکریم کو کھینچ کر خود سے لپٹا لیا تھا۔ ''تم بہت ذہین ہو۔ مجھے اب سکون ہے کہ اگر میں کسی معرکے میں کام آ بھی گیا تو میری فورس کو تم بہتر انداز میں ڈیل کر سکتے ہو۔''

مامون نے خفگی سے انہیں دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے بولا تھا۔ ''میری ساری ہمت، ساری کارکردگی صرف آپ کی پشت پناہی پر منحصر ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں ہوں سر!''

''تمہارے بغیر میں بھی اکیلا کچھ نہیں ہوں مامون!'' عدیل عبدالرحمٰن نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور دونوں میں اگلے ہفتے ہونے والی منگنی کے معاملات ڈسکس ہونے لگے۔

''شہریار بھی ناں، بہت ڈفر ہے۔ آپ کو پتہ ہے، مجھے اس کی وجہ سے گھر والوں کے سامنے کتنی بونگیاں مارنی پڑتی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' عدیل عبدالرحمٰن نے جیپ بیک کرتے مڑ کر پوچھا اور اس کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔

''کہنے لگا، تم دانیا کے لئے شگن کا جوڑا مت لانا۔ اس کے لئے میں نے ایک بہت خوب صورت سوٹ پسند کر لیا ہے۔ دانیا اپنی منگنی پر وہی پہننے والی ہے۔ میں نے کہا، مما پاپا کو کون سمجھائے گا؟ کہنے لگا، تم ہو ناں، سمجھ لو، نا کام رہے تو آئندہ اپنی شکل مت دکھانا۔ بس جناب! پھر جو میری دوڑیں لگی ہیں ممی پاپا کے سامنے تو مزہ ہی آ گیا۔ کبھی ماما انکار کی وجہ بتاتیں، کبھی پاپا اعتراض اٹھاتے، کبھی میں نقطہ اعتراض پر رولنگ دیتا، بس میں پارلیمنٹ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ سمجھئے، میرے سر پر کرسیاں ٹوٹنا باقی رہ گئی تھیں۔ پاپا کے جاگیردارانہ خوف اور ما سب نے مل کر بڑا تھکا مارا ہے مجھے۔''

عدیل عبدالرحمٰن مسلسل ہنسے جا رہے تھے اور مامون کی ذرا سی شکل نکل آئی تھی۔

''آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا بھیا؟''

''نہیں...... کیونکہ تم یہ حق شہریار کو اپنا دوست بنا کر کھو چکے ہو۔''

وہ اور زور سے ہنسے۔ مامون نے اس بار ان کی ہنسی کا بڑے دل سے ساتھ دیا، پھر مامون کو دفتر اُتار کر وہ آج ایک ماہ دس دن بعد چند گھنٹوں کے بجائے بہت سارا وقت گزارنے کے خیال سے جیپ کو یو ٹرن دینے لگے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہیں شہریار کی طلب ہی ہوئی تھی۔

''وہ آج بہت صبح دفتر چلے گئے تھے، کسی ایڈ کا کام تھا۔''

عدیل عبدالرحمن شوز کے تسمے کھولنے لگے تھے، پھر سر اٹھا کر زمی سے عائشہ سے بولے۔ ''طبیعت کیسی ہے آج کل شہریار کی؟ مصروفیت اتنی تھی کہ فون پر بھی اس سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔''

عائشہ بھابی گومگو سے انہیں دیکھنے لگیں، پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ ''تین دن پہلے کافی طبیعت خراب تھی ان کی۔ جازی دفتر سے انہیں گھر لے کر آئے تھے میں پوچھتی رہی، کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے کیا؟ مگر شہریار بھائی تکلیف چھپا کر ہنستے رہے، پھر بولے۔ ''آج گورنمنٹ ملازم ہونے کا موڈ ہو رہا ہے، اس لئے صرف حاضری لگائی ہے اور چھٹی، کیا سمجھیں بھابی آپ؟'' میں نے بہت کوشش کی، پتہ لگاؤں، لیکن جازی بابا بھی آج کل بہت بڑے بڑے ہو گئے ہیں، پہلے تو فٹ سے جو پوچھو، بتا دیتے تھے، مگر اب بڑوں کی طرح باتیں چھپانے لگے ہیں۔''

''باتیں چھپانے لگے ہیں، کیا مطلب؟'' کھلتے تسمے پھر سے بند ہونے لگے تھے۔

''پتہ نہیں، لیکن شہریار بھائی کو جب میں دیکھتی ہوں تو دل کانپ جاتا ہے۔ پتہ نہیں، کیا ہوتا جا رہا ہے انہیں؟ میڈیسن لیتے ہیں لیکن پھر بھی معمولی سا چلنے سے بھی ان کا سانس پھول جاتا ہے۔ لائبہ کے ساتھ پہلے کی طرح کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دس منٹ بعد بالکل بے سدھ ہو کر لیٹ جاتے ہیں۔ لائبہ انہیں اٹھاتی رہتی ہے مگر وہ آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھتے۔ رابعہ کتنی بار ایسے موقع پر ان کا بی پی چیک کر چکی ہیں، ایک دم سے بی پی لو ہو جاتا ہے، کبھی شوٹ کر جاتا ہے۔''

عدیل عبدالرحمن یکدم کھڑے ہو گئے۔ ''اتنا کچھ آپ محسوس کر رہی تھیں لیکن آپ اور رابعہ سے اتنا نہ ہوا، مجھے فون ہی کر دیتیں؟''

''کیا تھا فون۔ کئی بار کوشش کی تھی، لیکن آپ دفتر ہی میں نہیں ملتے تھے۔''

وہ کچھ کہے بغیر پھر سے چابی اٹھا کر جیپ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ چوکیدار پھر سے گیٹ پاٹوں پاٹ کھول رہا تھا۔



وہ اس وقت ایلیٹ فورس کی کسٹڈی میں جلے پیر کی بلی بنے گھوم رہے تھے۔ انہیں اس وقت اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنی خراب پوزیشن میں تھے، نہ ہی اس کی فکر تھی کہ ان کا کوئی بھی نمبر ٹھیک نہیں لگ رہا تھا، نہ اس کی فکر تھی کہ اگلے پچھلے سارے حسابوں میں انہیں اپنی باقی زندگی جیل کی کال کوٹھڑی میں گزارنی پڑے گی، نہ ہی انہیں اپنی سیاسی ساکھ کے مٹی ہونے کا غم تھا، نہ سارے اثاثے ضبط ہونے، بنک اکاؤنٹ سیل ہونے کا دکھ۔ وہ صرف اس وقت کچھ سوچ رہے تھے تو صرف اتنا کہ ایسا ایماندار آدمی کون تھا، جوان سے حسن ابراہیم کی طاقت سے اور مسٹر افضل کی جاگیرداری سے تنہا ٹکرا گیا تھا؟ وہ کون تھا، جو تنی اندر کی خبر لینے کے باوجود میڈیا کی نظر اوران کی پہنچ سے دور رہ گیا تھا؟

سلامہ ارسلان پر انہیں اس اندر کے بھیدی کا شبہ ہوا تھا۔ انہوں نے کارروائی بھی کروائی تھی، مگر سلامہ کی قسمت اچھی تھی اوران کی ججمنٹ غلط نکلی تھی کہ اس حادثے کے بعد وہ دوسرے حوالوں سے اخبار کی زینت بن گئے تھے۔ عاشق مزاج شروع سے تھے، سیاست میں آکر بھی ان کے اطوار نہیں بدلے تھے۔ پھر حسن ابراہیم، مسٹر افضل کا ساتھ ملا تو کچھ اور نکھر گئے۔ مگر یہ ساری داستانیں ابھی منظر عام پر آئی تھیں۔ اخبار سے ہی انہیں زوار حسن کی گرفتاری اور انٹرپول کے ذریعے ملک میں ڈی پورٹ کیے جانے کی اطلاع بھی ملی تھی اوران کا دل چاہا تھا، وہ اس اسٹرینجر کو بس ایک بار اپنی زندگی میں دیکھ لیں، آخر یہ اسٹرینجر تھا کون؟ کوئی بھوت، کوئی لال بجھکڑ یا لوزن؟

”سر! آپ کی ملاقات آئی ہے۔“

مسٹر یوسفی نے برا سامنہ بنایا۔ دنیا میں اس کے صرف دو حوالے تھے، ایک حوالہ بہت عرصہ ہوا انہیں طلاق دے کر ان کی زندگی سے جا چکا تھا، ان کی بیوی امریکی نژاد تھی مگر یہ شادی صرف دو سال سے زیادہ نہیں چلی تھی۔ وہ ان دنوں امریکہ میں ہی مقیم تھے، پھر واپس لوٹنے لگے تو امریکی بیوی نے بچہ بھی ساتھ کر دیا۔ ”اسے تم سنبھالو، یہ تمہاری ذمہ داری رہے تو بہتر ہے۔“ اور یوں وہ اکیلے زندگی میں بہت ساری رونق لگا کر جی رہے تھے۔ اپنے بیٹے کے مطابق وہ صرف اتنا ہی توجہ دیتے تھے جتنی توجہ ان جیسے مصروف شخص کو دینے کا اختیار تھا۔ یہی وجہ تھی، ملاقات میں ان کے ذہن میں بیٹے ہی کا خیال آیا تھا۔ وہ ملاقاتی کمرے میں آئے تھے اوران کا سوچنا غلط نہیں تھا۔ ان کے سامنے راحم یوسفی ہی کھڑا تھا۔ مگر اس کے ساتھ اس شخص کو کھڑے ہونے کا کیا حق تھا اس شخص کو، جس نے انہیں اس حال تک پہنچایا تھا؟

''میں صرف اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔'' عدیل عبدالرحمٰن، راحم یوسفی کا کندھا تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اب وہ دونوں تنہا تھے اور تنہا ہوتے ہی پہلا سوال ان کا ضمانت کے متعلق تھا۔ ''تم نے کوئی اچھا وکیل کیا میرے لئے؟''

''نہیں پاپا!'' راحم یوسفی کا سرد انداز انہیں حیران کر گیا۔

''کیوں، کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کتنے برے طریقے سے اتنے سارے معاملوں میں انوالو ہو گیا ہوں کہ ہر ایک سزا'' لگ بھی ملی تو وہ سزائے موت یا عمر قید ہوگی؟''

''میں جانتا ہوں پاپا! اور میں نے اپنی ساری صلاحیتیں اسی لئے خرچ کی تھیں کہ میں اپنے ملک کو آپ جیسے لوگوں سے بچانا چاہتا تھا۔ آپ کی سیاست ہو، صحافت ہو، سب صرف اپنے لئے تھی اور آج میں نے آپ کے اسی زخم پر ضرب لگائی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو تم ہوتے کون ہو یہ سب کہنے والے؟''

''آپ سب کا ورد سر، اسٹرینجر سے آپ سب ہی تنگ تھے ناں تو وہ میں ہی تھا۔ اتنے اندر کے راز جن میں سے بعض تو صرف آپ ہی جانتے تھے، ان رازوں کو طشت ازبام کرنا کسی اندر کے بھیدی کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے، کبھی آپ کے ذہن میں اس حوالے سے میرا نام کیوں نہیں آیا؟''

مسٹر یوسفی کھڑے سے بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ ''تم...... مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا تم جیسا بے عمل شخص اپنی دنیا میں مگن، سونا جاگنا اور کھانا کھا لینے کو زندگی سمجھنے والا انسان اتنا تھرلر کسی طور نہیں نبھا سکتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ ناکام انسان سمجھتا تھا میں تمہیں، جس کے پاس میرے مضبوط حوالوں اور میرے دیئے گئے عیاشی کے پیسوں کے سوا کوئی ذریعہ نہیں تھا شناخت کا۔''

راحم یوسفی ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے چیک بک نکالی تھی اور ان کے سامنے ڈال دی تھی۔

''یہ وہ اکاؤنٹ ہے جو بچپن سے لے کر آپ میرے لئے اکٹھا کرتے رہے۔ کم سنی میں جو اس میں سے خرچ کیا، صرف اس کا دین دار ہوں۔ لیکن شعور آنے کے بعد میں نے پیرا سائٹ زندگی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ میں نے کبھی آپ کی دی گئی گاڑی استعمال کی نہ روپیہ۔ میں نے نائٹ شفٹ میں تعلیم حاصل کی، نوکریاں کر کر کے اپنا گزارہ کیا۔ لوگ کہتے تھے، اتنے دولت مند یوسفی صاحب کا بیٹا جینز اور شرٹ میں گھومتا ہے، رف حلیے میں نظر آتا ہے تو یہ بھی لڑکیوں کو امپریس کرنے کی کوشش ہے، مگر پاپا! میں جتنا کماتا تھا، ان دنوں اس میں صرف شرٹ اور جینز ہی آ سکتی تھی۔ میں نے ایک ایک سوٹ تین تین دن

تک بھی پہنا ہے۔ میں نے کبھی ہوٹلنگ نہیں کی، میں نے کبھی کسی بڑے بوتیک سے شاپنگ نہیں کی، اس لئے نہیں کہ میں ایسا نہیں کرسکتا تھا، بلکہ اس لئے کہ میں ایک اور یوسفی سے ملک کو بچانا چاہتا تھا۔ میرا نفس مجھے بار بار کہتا تھا، اس عیش و آرام پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا کسی سو کالڈ امیر باپ کی اولاد کا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے نفس کو اس احتیاج سے روکے رکھا۔ میں کوئی ولی نہیں تھا، لیکن میں نے پھر بھی زندگی جینے کے لئے کٹھن راستے کا انتخاب کیا تھا۔ میں بہت مخصوص رفتار سے چلنے والا انسان تھا کہ اچانک مجھے شہریار صاحب کی کمپنی میں منیجر کی پوسٹ آفر ہوئی، وہیں سے میرے راستے کی صحیح سمت ملی قدرت خود بخود میرے لئے راستے بناتی چلی گئی، پھر میں کب راحم یوسفی سے اسٹر منیجر بن گیا، مجھے پتہ نہیں چلا، مگر مجھے خوشی ہے میری محبت رائیگاں نہیں گئی۔"

مسٹر یوسفی اُسے دیکھتے رہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر انہوں نے کہنے سے پہلے ہونٹ بند کر لئے تھے۔

"کیا آپ میڈیا کو بتانا چاہیں گے کہ اسٹر منیجر دراصل آپ کا ہی بیٹا ہے؟"

مسٹر یوسفی نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر نخوت سے بولے تھے۔ "مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس طرح بحیثیت باپ کے، تمہیں بچانا چاہتا ہوں، بلکہ میں یہ سچ میڈیا کو اس لئے نہیں دوں گا کہ میڈیا کے لوگ ہوں، سیاسی لیڈر یا بیوروکریٹ، کسی نے میرا ساتھ دیا نہ مجھے بچانے کی کوشش کی۔ وہ سب اپنی اقتداری کرسیاں بچانے کے لئے مجھے داؤ پر کھیل گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے اور تم جانتے ہو، میں کتنا منتقم پرور انسان ہوں، بدلہ لئے بغیر خاموشی اختیار کرنا میرا مسلک نہیں، معاف کر دینا میرا شیوہ نہیں۔ سو جو کچھ میرے ساتھ ہوا، میں چاہتا ہوں، ان کے ساتھ بھی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسٹر منیجر مخفی رہ کر کام جاری رکھے، سو راحم یوسفی! میں اپنے انتقام کے لئے تمہیں آزاد رہنے دینا چاہتا ہوں۔"

راحم یوسفی کے ہونٹوں کو پھیکی سی ہنسی نے چھوا اور وہ سر ہلاتا ہوا ملاقاتی کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج کو جانتا تھا اس لئے بے فکری سے وہ باہر آ گیا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے ہاتھ کے اشارے سے میٹنگ کا ایجنڈا پوچھا اور وہ فائن کہتا ہوا اپنی بائیک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ صبر اور ضبط جو باپ کے سامنے برقرار رکھا تھا، اب وہ ٹوٹ گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی آتے ہی اس نے سن گلاسز لگا لئے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ دل کی بھڑاس نکال لے۔



بیگم عافیہ بہت خاموشی سے بیٹھیں سامنے والے کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر بات کی تہہ تک پہنچیں تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور جانانہ کے دکھ کے بعد یہ پہلی مسکراہٹ تھی، جوان

کے چہرے پر پھیلی تھی۔
''آپ مومنہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں راحم؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں، مومنہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے؟ وہ شہریار کی ذمہ داری ہے، لیکن اس کے ساتھ عینی کا ذکر آنا لازمی امر ہے۔''
راحم یوسفی نے مسکرا کر بیگم عافیہ کو دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ''مسٹر شہریار نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی، لیکن اس کے باوجود میری زندگی گزارنے کے حوالے سے پہلی چوائس مومنہ ہی ہیں۔ میں مومنہ کا برس ہا برس انتظار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن بس، سمجھ لیجیے گا کہ مومنہ اب آپ کے پاس میری امانت ہے۔''
بیگم عافیہ نے خوش دلی سے اس کے سامنے چائے رکھی اور عینی کو آواز دینے لگیں۔ ابھی کچھ دنوں کے لئے وہ ان ہی کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ مومنہ اس ملن پر بہت خوش تھی، مگر جانانہ ہر طرح کی خوشی سے بے بہرہ، کبھی اپنے کمرے میں پڑی ہوتی، کبھی گارڈن میں بینچ پر جا بیٹھتی۔ اسے شیرازی کے بعد کی ہر بات بھول چکی تھی۔ مراد جانانہ کے اردگرد پھرتا تھا لیکن آج کل وہ مراد سے بھی بے بہرہ تھی۔ بیگم عافیہ، عینی اور راحم یوسفی کو باتیں کرتے چھوڑ کر ڈرائنگ روم سے نکلیں تو انہیں جانانہ کوریڈور میں گم صم کھڑی نظر آئی۔
''جانانہ! کیا حالت بنائی ہے؟ خود کو سنبھالو جان!''
جانانہ نے خالی الذہنی سے ان کی طرف دیکھا اور اسی وقت کسی نے انہیں اپنی طرف موڑ لیا۔
''جانانہ کے مسئلے کا حل ہے میرے پاس۔''
وہ تیزی سے آواز کی سمت مڑی تھیں۔ ''شہریار!.......تم.......آخر تم کب تک مسائل کا حل نکالتے رہو گے؟''
''جب تک ہوں، تب تک میم! مجھے اداس اور دکھی لوگ قطعاً اچھے نہیں لگتے۔ ادھر آئیے، میں آپ کو سمجھاتا ہوں، جانانہ کو کس طرح واپس لایا جا سکتا ہے؟''
بیگم عافیہ اس کے ساتھ ساتھ آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتی چلی گئی تھیں اور اس نے تنہائی ملنے پر کہا۔
''میں نے بہت کوشش کی مگر جانانہ کے بیٹے کے متعلق کچھ نہیں جان سکا ہوں۔ لیکن میم! اگر ہم تھوڑا سا جھوٹ بول دیں تو۔ اگر مراد کو ہم شیرازی کا بیٹا کہہ کر کسی طرح یہ بات ثابت کر دیں تو جانانہ پھر سے

زندگی کی طرف لوٹ آئے گی۔ دیکھئے میم! یتیم خانے میں پلنے والے بچے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ یا تو عزتِ نفس کی پامالی سے بالکل بے حس یا اندر کی خفگی، دنیا کی طرف سے شکوے کے ساتھ عزتِ نفس کا غرور انہیں سب میں ممتاز کر دیتا ہے۔ مراد کا شمار ان ہی بچوں میں ہوتا ہے، اس کا انداز بھی شیرازی جیسا ہی ہے، اس لئے یہ بات نبھ جائے گی۔"

بیگم عافیہ یہ بات سمجھ کر مائی زلفی کے کمرے کی طرف آئی تھیں، پھر کردار تخلیق ہو رہے تھے، جب اچانک جانا نہ، مائی زلفی کے کمرے کی دہلیز پر آ کر ٹھہر گئی۔

"زلفی! تمہیں معلوم ہے ناں، میرے شیرازی کا بیٹا کہاں ہے؟"

جانے ایک دم سے اُس کے اندر یہ ہوک کیوں بلند ہوئی تھی؟ وہ خالی ڈھنڈار گھر کی طرح کھڑی تھی، بس ایک دیے کی ضرورت تھی۔

"زلفی! بتاؤ، میرا بیٹا کہاں ہے؟ کیسا تھا؟" زلفی مائی نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور خود کو ایک جھوٹ بولنے کے لئے راضی کیا۔ یہ کوئی ناول یا فلم نہیں تھی کہ سب بچھڑے ہوئے کردار اچانک کسی اتفاق سے آن ملیں، ہمیشہ کوئی کرشمہ ہو، یہ ضروری نہیں اور یہی مائی زلفی کو بھلا کر ایک جھوٹ گھڑ رہا تھا۔ بیگم عافیہ نے مراد کو اس نئی کہانی میں اپنا کردار رٹا دیا تھا، سو مائی زلفی نے نرمی سے کہا تھا۔

"تیرے بچے کے گلے میں بڑے پیر صاحب کا تعویذ ڈالا تھا میں نے، شاید اب بھی ہو اس کے گلے میں۔"

"تعویذ؟" بیگم عافیہ نے حیرت سے کہا۔

اور زلفی تعویذ کی ٹھیک ٹھیک شکل بتانے لگی۔ بیگم عافیہ کے چہرے پر جذبات کا اُبال اُبھرا اور انہوں نے مراد کو آواز دی۔ "مراد بیٹا! ادھر تو آنا۔"

مراد اندر آیا۔ بیگم عافیہ نے مراد کے گلے میں پڑے تعویذ کو ٹی شرٹ سے باہر نکالا۔ جانا نہ کی آنکھوں میں ایک شناسائی کی جھلک چمکی۔ وہ تیزی سے مراد کی طرف آئی تھی۔

"یہ...... یہ وہی تعویذ ہے، جو میں نے شیرازی کو دیا تھا۔" وہ کرلائی، بانہیں کھول کر پورے مراد کو اپنے اندر انڈیل لینے کی سعی کرنے لگی۔ بیگم عافیہ اسے روتے دیکھتی رہیں۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جی بھر کر رو چکیں تو مراد کو ساتھ لگائے باہر آ گئی۔ بیگم عافیہ نے اسے جانے دیا اور اس کے جاتے ہی بیگم عافیہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"شہریار واقعی عبدالرحمٰن کی سب اولادوں میں سے سب سے بہترین بچہ ہے۔"

مائی زلفی نے ٹھنڈا سانس بھرا، پھر جواباً بولی۔ "نہیں عبدالرحمٰن کی ساری اولاد اتنی ہی اچھی ہے۔ بہت دل سے پالا ہے اس نے اپنے بچوں کو۔ بہت خوش قسمت انسان ہے عبدالرحمٰن۔"

بیگم جافیہ نے کھڑکی سے باہر شام کے سائے میں مراد کے ساتھ باتیں کرتی جانا نہ کو دیکھ کر شہریار کو ایک بار پھر سے یاد کیا اور پھر سے شہریار کا تاسف ان کے اندر گونجنے لگا۔ ”شاید محبت سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی، لیکن اس کافر محبت کو مجھ سے محبت نہیں ہو سکی۔ ہوتا ہے ناں میم! کچھ لوگ محبت سے محبت کرتے چلے جاتے ہیں لیکن محبت کا دل ان کی طرف نہیں مڑتا اور کچھ لوگ محبت کو اپنی احتیاجات میں سب سے آخر میں رکھتے ہیں لیکن محبت ان کی جھولی بھر جاتی ہے میم! یہ محبت بہت خوار کراتی ہے، اپنی راہوں میں رول دیتی ہے یہ محبت۔“

بیگم جافیہ نے دکھ سے مسٹر عبدالرحمٰن کے دل کو سبز موسموں کی دعا دی۔ عطیہ بانو کے دل پر نوحہ پڑھا اور شہریار کے لئے ان کے دل میں کچھ محبت اور بڑھ گئی۔

”واقعی عبدالرحمٰن کے دل کو، زندگی کو ان کے ایثار کرنے کی جزا دعا کی طرح لگ گئی ہے۔“ وہ سوچتی ہوئیں اور سائی زلفی کو تشکر بھری آنکھوں سے دیکھتی باہر آ گئیں۔



ثانیہ نے شہریار کی دی گئی تصویر مسٹر عمرانی کے سامنے رکھی تو ان پر ردعمل متوقع ہوا تھا۔

”یہی ہے وہ عورت، یہی تو ہے وہ بھوت ہے جو ہر وقت میرے اردگرد قہقہے لگاتا رہتا ہے۔ میں اس سے معافی مانگتی ہوں، مگر یہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ ثانی! اس سے کہو، مجھے معاف کر دے۔ وہ زرش...... اسے بھی کہو، وہ مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے؟ پہلے تو میری آوازوں کو اتنا نظر انداز نہیں کرتی تھی۔ پتہ نہیں اب کیوں نہیں سنتی۔“

”پاپا! آپ چاہتے ہیں، زرش آپ کو معاف کر دے؟“ ثانیہ نے مہرہ چلا۔ مسٹر عمرانی معصومیت سے اثبات میں سر ہلانے لگے اور ثانیہ انہیں کار میں بٹھا کر ایک جانے پہچانے راستے پر چلنے لگی۔ اس راستے کا پتہ اسے شہریار سے ملا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ اس گھر کے سامنے تھی۔ دروازہ سونیا نے کھولا تھا۔ وہ مسٹر ارسلان راشدی سے ملنے کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں آن بیٹھی تھی۔ ڈرائیور ساتھ ہی تھا، جس نے اسے وہیل چیئر پر منتقل کر کے گھر تک آنے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ کافی دیر بعد مسٹر ارسلان راشدی اندر آئے تھے، تب ثانیہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ ”سر! آج میں آپ سے ایک بہت بڑا سچ شیئر کرنے آئی ہوں۔“

”سچ؟...... اب مزید کیا سچ رہ گیا ہے؟“ ان کے دل نے سوچا اور انہوں نے تفصیل سے ثانیہ کا جائزہ لینے کے بعد مسٹر عمرانی کی طرف دیکھا جو فرماں بردار بچے کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”سر! میں اپنے پاپا کی طرف سے ہونے والی ایک غلطی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔“

”لیکن بیٹا! میں آپ کے پاپا کو نہیں جانتا۔“

”مگر میرے پاپا، میم عطیہ کو جانتے تھے سر! بیگم آصفہ بھی میرے پاپا سے واقف ہیں۔“

ثانیہ اپنے پاپا کی ڈائری وارڈ روب میں رکھی گئی تصویر کے حوالے کی پوری کہانی بتانے لگی اور عین اسی وقت مومنہ، سونیا کے ساتھ چائے کے لوازمات لئے داخل ہوئی۔ وہ آج ملنے کے خیال سے گھر آئی تھی۔ چائے بنانے میں اس نے سونیا کا ساتھ دیا تھا۔ مگر مسز عمرانی، جعفر ماہبروا ری سے بیٹھے تھے، ان پر مومنہ کو دیکھ کر ردِعمل بہت اچانک ہوا تھا۔

”عطیہ!...... پلیز عطیہ! مجھے معاف کردو۔ تم بہت عظیم عورت ہو۔ میں اس وقت بہت پاگل ہورہا تھا۔ تم نے مجھے ٹھکرایا تھا اس بیوروکریٹ کے لئے اور مجھ سے یہی بات برداشت نہیں ہوئی۔ میری جاگیر، دولت سب کچھ تمہیں اس ایک بیوروکریٹ کے آگے کمتر لگا اور میں نے سوچا تم میری نہیں ہوسکیں تو میں تمہیں اس کا بھی نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے اغواء میں یہی خیال پنہاں تھا، مگر عطیہ بانو، اتنی پرانی بات پر تم نے اتنا بڑا بدلہ لیا؟ محبت کرنے والے لوگ اتنے ظالم تو نہیں ہوتے؟ تم نے، تمہاری بددعا نے مجھے کھالیا ہے، میری بیٹی مرگئی بالکل ایسے ہی، جیسے میں نے کہا تھا۔ تم گل گل کر مروگی تم نے میرا غرور مجھے ہی واپس لوٹا دیا۔ تم اتنی کٹھور تو نہیں تھیں عطیہ! مجھے معاف کردو...... ثانی کہتی ہے، تم مجھے معاف کردوگی تو زرش مجھے معاف کردے گی۔ وہ پھر سے میری آواز پر پلٹ آئے گی۔ مجھے میری زرش چاہئے عطیہ! مجھے میری زرش لادو۔ وہ میری بچی پتہ نہیں کہاں کھوگئی؟ مجھے مل نہیں رہی۔ ہمارے گھر میں سب مرگئے ہیں عطیہ! سب مرگئے ہیں۔ پلیز عطیہ! مجھے ایک بار کہہ دو تم نے مجھے معاف کردیا۔“

مومنہ کے ہاتھ سے ٹرے بار بار لڑکھڑا جاتی تھی۔ مسز عمرانی نے اس کے پیر پکڑ رکھے تھے۔ ثانیہ دکھ اور تاسف سے باپ کو دیکھ رہی تھی اور ارسلان راشدی کا چہرہ بالکل زرد ہوگیا تھا۔

”مجھے اغواء کیا تھا، بھابی وہیں تھیں، ان سے پوچھئے، میں ان میں سے ایک کو نہیں جانتی، انہوں نے مجھے زبردستی وین میں ڈالا تھا۔ ارسلان! میری بات کا یقین کریں، بھابی میری جرأت ثابت کریں، آمنہ بھابی......!“

ماضی کا سین پھر سے ری پلے ہونے لگا۔ عطیہ بانو کیسے بلک بلک کراپنی بےگناہی ثابت کررہی تھیں اور وہ کیسے فرعون بن گئے تھے۔ ”تم کہاں تھیں، کہیں نہیں، میں کیا جانوں۔ گئی ہوگی دولت کے پیچھے۔ تم جیسی عورتیں گھر کب بساتی ہیں؟“ ان کا طنز عطیہ بانو کے اطراف بکھر گیا تھا اور وہ عبدالرحمٰن اور ان کے متعلق نازیبا گفتگو کررہے تھے اور آج اتنے برسوں بعد ایک ایسا شخص آیا تھا، جسے وہ نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ عطیہ بانو کو جانتا تھا اور وہ مومنہ کے پیر پکڑ کے کہہ رہا تھا۔ ”عطیہ بانو! مجھے معاف کردو، تم بہت عظیم عورت ہو۔“ وہ کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سمندر آن بیٹھا تھا۔ ”تم جیسی عورتیں گھر نہیں بساتیں۔ تم نکل جاؤ میرے گھر سے۔ وہیں چلی جاؤ، اسی شخص کے پاس، جس کی دولت، خوب صورتی تمہیں اٹریکٹ کرتی ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق۔“ کوئی وجود تھا ہاتھ پکڑ

کر اسے گھر سے باہر گلی میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس رات کا عذاب؟ اس رات کا عذاب اب دہرا ہو گیا تھا۔

''عطیہ!...... میری عطیہ! میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا؟ میں نے آصفہ کو کیا سمجھا اور وہ کیا نکلیں اور تم کیا تھیں، میں نے اپنی خوش قسمتی کو ٹھوکر ماری ہے۔ میں بھی ظالم ہوں، اس شخص سے بڑا ظالم۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو۔ میں نے تو آج تک عطیہ کو...... اپنی عطیہ کو کیا کیا نہیں کہا، اور عطیہ...... کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟ انہیں لگا، وہ ڈرائنگ روم میں بالکل اکیلے کھڑے تھے۔ سونیا نے مسز عمرانی کو اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا تھا اور مومنہ کو ان کے اصرار پر زبردستی انہیں معاف کرنا پڑا تھا۔ ثانیہ نے اجازت چاہی تھی۔ ڈرائیور ثانیہ کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا باہر لے گیا تھا اور ارسلان راشدی خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ آج وہ عطیہ بانو کے سامنے بالکل ماضی کے ارسلان راشدی بن کر جانے کے لئے نکلے تھے، لیکن کیا وہاں سے وہ دلربائی انداز میں ان کی راہ دیکھ رہا تھا؟ منوں مٹی تلے دبا ہوا وہ وجود، جو کبھی ان کی زندگی تھا تو آج وہ نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھے۔ کیا یہ اظہار وارفتگی تھا؟ وہ محبت کا دعویٰ کرتے تھے، جینے مرنے کی قسمیں کھاتے تھے مگر ان کی قسمیں کسی اور نے نبھا ڈالی تھیں، ساری کی ساری قسمیں۔ اور وہ کتنے زینے نیچے آن کھڑے ہوئے تھے۔

''عطیہ! مجھے تم سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور میری بدقسمتی کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ پتہ نہیں، یہ محبت ایک روح میں کیسے اتر جاتی ہے اور ایک وجود کی اس پہلی پرت تک کو نہیں چھو پاتا؟ ایک طالب رہتا ہے اور ایک مطلوب؟ عطیہ! میں ہار گیا، تم جیت گئیں عطیہ! تم نے مجھ سے سچی محبت کی اور میں...... میں تو شاید محبت کے م سے بھی ناواقف نکلا...... وہ دل ہی دل میں کرلاتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے تھے، مگر عطیہ بانو کی قبر کے قریب پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ کریم کلر کے کوٹ پینٹ پہنے سر پر رومال باندھے کوئی بہت مدھم انداز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ لفظ تو انہوں نے بھی سیکھے تھے مگر زندگی میں بہت کم ان لفظوں سے انہوں نے کچھ مانگا تھا، شاید ان کے لئے کوئی پہلے ہی اتنے دل سے مانگ لیتا تھا کہ ان کو کبھی اس در کا راستہ پکڑنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

''نماز پڑھا کریں ارسلان! قرآن پڑھا کریں۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کی آنے والی اولاد بھی اسی راہ پر چلے گی۔ اچھی اولاد صدقۂ جاریہ ہوتی ہے۔''

وہ اس بات کو ہمیشہ ٹال جاتے تھے، لیکن آج وہ اس وجود کے کچھ اور قریب ہوئے اور انہوں نے جان لیا، وہ کوئی اور نہیں شہریار عبدالرحمٰن تھا۔

''شیری! تم یہاں؟'' انہوں نے ہولے سے پکارا مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ قرأت کی آواز، اگربتیوں کی مہک سب ایک ساتھ ان کی روح کو چھو رہی تھی۔

'عبدالرحمٰن خوش نصیب ہے، اس کی ساری اولاد کتنی نیک، پاکباز ہے' انہوں نے مسٹر عبدالرحمٰن کو رشک سے دیکھا اور اسی وقت شہریار عبدالرحمٰن نے سر موڑ کر مسٹر ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

کر اسے گھر سے باہر گلی میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس رات کا عذاب؟ اس رات کا عذاب اب دوہرا ہو گیا تھا۔

''عطیہ!...... میری عطیہ! میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا؟ میں نے آصفہ کو کیا سمجھا اور وہ کیا نکلیں اور تم کیا تمیں، میں نے اپنی خوش قسمتی کو ٹھوکر ماری ہے۔ میں بھی ظالم ہوں، اس شخص سے بڑا ظالم۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو۔ میں نے تو آج تک عطیہ کو...... اپنی عطیہ کو کیا کیا نہیں کہا، اور عطیہ...... کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟ انہیں لگا، وہ ڈرائنگ روم میں بالکل اکیلے کھڑے تھے۔ سونیا نے مسز عمرانی کو اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا تھا اور مومنہ کو ان کے اصرار پر زبردستی انہیں معاف کرنا پڑا تھا۔ ثانیہ نے اجازت چاہی تھی۔ ڈرائیور ثانیہ کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا باہر لے گیا تھا اور ارسلان راشدی خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ آج وہ عطیہ بانو کے سامنے بالکل ماضی کے ارسلان راشدی بن کر جانے کے لئے نکلے تھے، لیکن کیا وہاں سے وہ دلربائی انداز میں ان کی راہ دیکھ رہا تھا؟ منوں مٹی تلے دبا ہوا وہ وجود، جو کبھی ان کی زندگی تھا تو آج وہ نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھے۔ کیا یہ اظہار وارفتگی تھا؟ وہ محبت کا دعویٰ کرتے تھے، جینے مرنے کی قسمیں کھاتے تھے مگر ان کی قسمیں کسی اور نے نبھا ڈالی تھیں، ساری کی ساری قسمیں۔ اور وہ کتنے زینے نیچے آن کھڑے ہوئے تھے۔

''عطیہ! مجھے تم سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور میری بدقسمتی کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ پتہ نہیں، یہ محبت ایک روح میں کیسے اتر جاتی ہے اور ایک وجود کی اس پہلی پرت تک کو نہیں چھو پاتا؟ ایک طالب رہتا ہے اور ایک مطلوب؟ عطیہ! میں ہار گیا، تم جیت گئیں عطیہ! تم نے مجھ سے سچی محبت کی اور میں...... میں تو شاید محبت کے م سے بھی ناواقف نکلا...... وہ دل ہی دل میں کرلاتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے تھے، مگر عطیہ بانو کی قبر کے قریب پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ کریم کلر کے کوٹ پینٹ پہنے سر پر رومال باندھے کوئی بہت مدھم انداز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ لفظ تو انہوں نے بھی سیکھے تھے مگر زندگی میں بہت کم ان لفظوں سے انہوں نے کچھ مانگا تھا، شاید ان کے لئے کوئی پہلے ہی اتنے دل سے مانگ لیتا تھا کہ ان کو کبھی اس در کا راستہ پکڑنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

''نماز پڑھا کریں ارسلان! قرآن پڑھا کریں۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کی آنے والی اولاد بھی اسی راہ پر چلے گی۔ اچھی اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔''

وہ اس بات کو ہمیشہ ٹال جاتے تھے، لیکن آج وہ اس وجود کے کچھ اور قریب ہوئے اور انہوں نے جان لیا، وہ کوئی اور نہیں شہریار عبدالرحمٰن تھا۔

''شیری! تم یہاں؟'' انہوں نے ہولے سے پکارا مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ قراءت کی آواز، اگربتیوں کی مہک سب ایک ساتھ ان کی روح کو چھو رہی تھی۔

'عبدالرحمٰن خوش نصیب ہے، اس کی ساری اولاد کتنی نیک، پاکباز ہے' انہوں نے مسٹر عبدالرحمٰن کو رشک سے دیکھا اور اسی وقت شہریار عبدالرحمٰن نے سر موڑ کر مسٹر ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

”تم یہاں شیری؟“ انہوں نے نئے سرے سے سوال ترتیب دیا اور شہریار عبدالرحمٰن یکدم کھڑا ہوگیا۔

”بس ویسے ہی، پاپا سے میم عطیہ کے بارے میں اتنا سنا ہے کہ مجھے وہ قطعی اجنبی خاتون نہیں لگتیں، بالکل میری ماما جیسی ہی۔ پھر یہ تو ان کا حق ہے ناں کہ انہیں یاد رکھا جائے۔ وہ جتنی اچھی تھیں، ہم تو اتنے اچھے طریقے سے ان کو یاد کرنے کا حق ادا بھی نہیں کر پا رہے انکل!“ اس نے گہرا سانس لیا اور مسٹر ارسلان راشدی نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”عبدالرحمٰن بہت خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسی نیکوکار اولاد ملی۔“

شہریار کے ہونٹوں کو ایک اُداس مسکراہٹ نے چھوا اور اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”محبت خود خوش نصیبی ہے، لیکن اکثر لوگ اسے دروازے سے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے، وہ زیادہ بہتر چیز کی تمنا رکھتے ہیں۔ پھر محبت انہیں ساری بہتر چیزیں جھولی بھر بھر کے دے ڈالتی ہے، صرف اپنا آپ نہیں بخشتی اور بہت بعد میں کھلتا ہے، وہ کتنا خسارے کا سودا کیے جا رہے تھے۔ انکل! پاپا بہت نیک انسان ہیں، ان کی ساری اولاد بھی بہت نیک انسان ہے۔ لیکن میں........ میں تو ابھی بھی نیکی کو چھونے کی کوشش کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں بہت برا انسان تھا۔ ہاں، میں اب اچھا بننے کی کوشش کر رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید وہ میری کسی نیکی سے پگھل کر مجھے بخش ہی دے روزِ محشر۔“

مسٹر ارسلان راشدی کی آنکھ میں نمی پھیلی اور انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔ شہریار کو لگا، آج انہوں نے پہلی بار کسی طرح اس کی ماں کی محبت کے احساس کو چوما تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی، مگر سنبھل گئی اور مسٹر ارسلان راشدی بولے۔

”جو لوگ نیک ہونے کا پرچار کرتے ہیں، وہی خسارے میں ہیں۔ تم جیسے لوگ جو ہر نیکی کو پہلی نیکی سمجھ کر سمیٹ لینا چاہتے ہو تو جان لو تم ہی تو وہ لوگ ہوتے ہو، جنہیں وہ معاف کر دیا کرتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔“

شہریار کچھ نہیں بولا تھا، آہستگی سے قدم موڑ گیا تھا۔ پھر آہستگی سے چلتے چلتے اس نے مڑ کے دیکھا، ارسلان راشدی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”مام! معاف کر دیں پاپا کو۔ یہ بہت دل گیر ہیں۔ آج بہت آپ کے ہو کر لوٹے ہیں۔ سادہ دل لوگ جو ہوتے ہیں، ہر ایک کی بات میں آ جاتے ہیں، پھر وہ بات مٹ جاتی ہے، گھات یاد رہ جاتی ہے، زخم نہیں بھولتے۔ لیکن مام! بھولنے کی کوشش کریں اپنے زخم کہ آج کوئی آپ کو بہت دل سے یاد کر رہا ہے۔“ اس نے عطیہ بانو سے دل کو مخاطب ہونے سے نہیں روکا۔ پھر دفتر پہنچا ہی تھا کہ سالار عبدالرحمٰن

اس کے روم میں پہلے سے ہی موجود پائے گئے تھے۔ اس کا کمرہ پورا اُلٹ پلٹ تھا، جیسے کسی نے بہت جان مار کر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔

''خیریت سنی بھائی؟ کچھ ڈھونڈ رہے تھے کیا؟''

سالار عبدالرحمٰن نے اسے قاتل نظروں سے دیکھا۔ اس دن کی مام کی ڈانٹ کا غصہ اتنا زیادہ تھا کہ اب وہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں کرتے تھے اور آج اس کے روم میں تھے تو کوئی خاص ہی بات تھی۔

''تم نے جس فائل پر میرے دستخط لئے تھے، وہ کہاں ہے؟''

''آخر آپ کو پریشانی کیا ہے؟ میں آپ کا بھائی ہوں، کسی غلط ڈاکومنٹ پر آپ کے سائن کیوں لینے لگا؟''

''تم میرے بھائی نہیں ہو، مائنڈ اِٹ۔'' وہ تیزی سے اُس کی طرف بڑھ آئے، پھر اُس کا کالر غصے سے پکڑ کر بولے۔ ''گھر والے یا مام اور پاپا تمہارے لئے جتنا بھی اچھا سوچیں، میں تمہارے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچ سکتا۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں شوٹ کر دیتا۔ پتہ نہیں تم میری زندگی میں آئے ہی کیوں ہو؟'' نفرت ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ شہریار نے بہت آرام سے ان کے کمنٹس سنے تھے اور وہ اپنی لایعنی بات کہہ کر پھر سے اپنی بات پر واپس آ گئے تھے۔ ''گھر میں ہر شخص یہی سمجھتا ہے، تمہیں دولت سے لو نہیں ہے، تم کوئی فرشتہ ہو شاید؟ لیکن میں جانتا ہوں، تم جیسے بچے جن کی نسل کا پتہ نہ ہو، گندگی سے اُٹھائے جائیں، ان میں خاندانی نجابت رکھنے والوں کے مقابلے میں دولت کی بھوک زیادہ ہوتی ہے۔ تم جیسے بچے دولت ہتھیانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں، کچھ بھی۔''

شہریار نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا تھا اور وہ پھر سے چیخے تھے۔ ''کہاں ہے وہ فائل؟ میں نے تمہارا پورا کمرہ چھان مارا، لیکن تمہاری صرف ایک دراز نہیں کھول سکا۔ تم نے اسے کوڈ سے لاک کیا ہے ناں۔ کھولو اسے میرے سامنے۔ آخر ایسا کیا چھپا رکھا ہے تم نے اس میں جو اتنی پردے داری کی ضرورت پڑی؟''

شہریار کو ہنسی آ گئی۔ اس دراز میں صرف اس کی میڈیکل رپورٹس اور کچھ آفیشلی ڈاکومنٹس کے سوا کچھ نہیں تھا اور سالار عبدالرحمٰن سمجھ رہے تھے، اس میں کوئی خاص چیز چھپی ہوئی ہے۔

''اگر میں وہ دراز نہیں کھولوں تو؟ آپ کیا کر لیں گے؟ یہ میرا کمرہ ہے، میں یہاں کوئی چیز بھی کسی بھی حالت میں رکھ سکتا ہوں۔''

''تم اتنے با اختیار نہیں ہو، میں پاپا سے بات کروں گا، انہوں نے تمہیں زیادہ ہی سر چڑھا لیا ہے۔''

”یہ بات آپ کئی سالوں سے کہہ رہے ہیں اور جانتے ہیں، آپ میرے متعلق کوئی ایکشن نہیں لے سکیں گے۔ میں کچھ بھی کرسکتا ہوں، آپ جانتے ہیں۔“ آج وہ بھی ان سے ان کے ہی لہجے میں بول رہا تھا۔ درحقیقت وہ انہیں انجوائے کر رہا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن تلملا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے ٹیبل کا کرسٹل گلدان اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کی تھی اور غیر متوقع آج اس نے ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”یہ گفٹ ہے بڑے بھیا! دانی نے دیا ہے۔ پلیز! اسے مت توڑیئے۔“

سالار بھائی نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا اور کرسٹل گلدان ماربل کے فرش پہ گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور جازی کی ہونق شکل نظر آئی تھی۔

”بڑے بھیا! اٹ از ٹو مچ...... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ شہریار بہت لاؤڈلی چیخا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اتنا غصہ آیا تھا۔ اس نے سالار عبدالرحمٰن کو بہت غصے سے دیکھا تھا اور سالار عبدالرحمٰن فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولے تھے۔

”صرف ایک گلدان...... تمہارا دل صرف ایک گلدان کے ٹوٹنے سے بکھر جاتا ہے؟ مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہاری ہر پسند کی چیز کو اتنے ہی ذروں میں بانٹ دیتا۔ شہریار! تمہارا دل اس گلدان کے ٹوٹنے سے دُکھ گیا اور تم نے کسی کا دل ریزہ ریزہ کر دیا، پھر بھی تمہیں کبھی احساسِ جرم نہیں ہوا؟“

”میں نے کبھی کسی کا دل ریزہ ریزہ نہیں کیا۔ ایک غلطی کو سدھارنے کی کوشش کی تھی، جس کی آپ تمام عمر مجھے سزا دیتے آ رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہوتا کہ میرا دل صرف ایک گلدان کے ٹوٹنے سے بکھر جاتا تو آپ میری ہر پسند کی چیز کو اتنے ہی ذروں میں بانٹ دیتے تو سنی بھائی! آپ نے بچپن سے لے کر ابھی تک میرے ساتھ سوائے اس سلوک کے اور روا ہی کیا رکھا ہے؟ میری بدنامی کی خبریں اخباروں میں دی ہوں یا مجھ سے محبت کرنے والے دل مجھ سے جدا کرنے ہوں، آپ نے اسی کام کو ساری زندگی کیا ہے۔ پھر بھی آپ کو افسوس ہے، آپ مجھ سے نفرت کرنے کا حق ادا نہیں کر سکے؟ آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں بڑے بھیا؟ میں نے آخر آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے جینے دیجئے، پلیز! جتنا بھی وقت بچا ہے، وہ تو خوشی سے جینے دیجئے۔ چلا جاؤں گا میں آپ کی زندگی سے۔ بہت دور چلا جاؤں گا۔ آپ کیا تھوڑا سا بھی انتظار نہیں کر سکتے میری جدائی کی گھڑی آنے کا؟...... دیکھئے، چھوڑ کے جانا اتنا آسان تو نہیں۔ دل کو راضی کرتے کرتے بھی وقت لگتا ہے نا سنی بھائی!“

جازی نے کانپ کر اس کا شانہ تھاما تھا۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس بند دروازے کو کھولنے لگا۔ ڈاکومنٹس اور رپورٹس اس نے ٹیبل پر پٹخی تھیں، پھر دل گیری سے بولا تھا۔ ''یہ رپورٹس ہیں میری، جو کہتی ہیں، میں کبھی بھی مر سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ کیا آپ اس کبھی کے درمیان کا وقت مجھے چین سے، محبت سے، جی بھر کے جینے دیں گے؟'' سالار عبدالرحمٰن کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ بہت سے لفظ ان کے اندر چکراتے پھر رہے تھے۔ ''آپ یہ سہولت واپس لینا چاہتے ہیں تو لے لیجئے گا میرے بعد۔ میری زندگی میں کمپنی کی لڑکیوں کو آنے جانے کی سہولت ملنی چاہئے۔''

اس فائل کا کیا تھا جس پر اس نے ان کے دستخط لئے؟ ایک سوال اُٹھا اور شہریار ان کے بالکل قریب آ گیا، پھر ہولے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''مائل اٹیکس آ رہے ہیں مجھے۔ کبھی بھی میرا دل بند ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے آپ کے دستخط اس فائل پر لئے تھے تاکہ میں نے شیئرز مارکیٹ میں جو انوسٹمنٹ کی تھی کمپنی کی طرف سے، اس کے تمام تر اختیارات میرے بعد آپ کو مل سکیں۔ اتھارٹی آپ کو اور جازی کو دے دی ہے میں نے۔ سنی بھائی! مرنے والا انسان دولت ہاتھوں میں بھر کر کیا کرے گا؟ آپ بتائیے، مرنے کے بعد خالی ہاتھ جانے والا کیا کرے گا دنیا میں؟''

سالار عبدالرحمٰن ایک دم زلزلے کی زد میں آ گئے تھے۔ اس کی رپورٹس ان کے شک پر تحقیر بھرا قہقہہ بن گئی تھیں۔ آج تک وہ اس سے صرف لڑتے آئے تھے۔ انہیں لگتا تھا، وہ ساری زندگی ایسے ہی لڑ لڑ کر گزار دیں گے، لیکن آج ایک دم سے انہیں لگنے لگا تھا کہ جیسے زندگی نے یوٹرن لیا تھا۔ یہ شخص جس سے وہ ہمیشہ نفرت کرتے تھے، یہ شخص مرنے والا تھا کسی بھی لمحے۔ کیا ان کا دل اس کی موت کے لئے تیار تھا؟ وہ، جو ان بھرا سے مر جانے کی بددعائیں دیا کرتے تھے تو کیا وہ ساری بددعائیں ایک دم سے قبول ہو گئی تھیں؟ اس شخص کے بغیر ان کی زندگی کتنی خالی خالی ہو جائے گی۔ بچپن سے لے کر آج تک ساری توجہ انہوں نے ایک شخص پر ہی تو ضائع کی تھی، وہ کیا کر رہا ہے، کہاں غلطی کرتا ہے کہ اس کی غلطی طشت ازبام کی جائے، وہ ہمیشہ انہی باتوں میں تو گھرے رہتے تھے تو وہ اس کے چلے جانے کے بعد کیا کریں گے؟ اتنی توجہ جو اس نے سمیٹی تو کیا یہ نفرت تھی؟ کیا نفرت میں انسان اتنا متوجہ رہتا ہے؟ کہیں یہ محبت ہی کا کوئی داؤ تو نہیں تھا ان کے ساتھ؟'' وہ یکدم بھونچال میں آ گئے تھے۔ سو جس تیزی سے آئے تھے، اسی تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ پھر اپنے کمرے میں سکون سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ پاپا کا فون چلا آیا۔

''زرش کے کنڈولینس کے لئے آپ کو جانا چاہئے سالار! وہ ہماری کمپنی کی بیسٹ ماڈل تھیں۔'' پاپا کہہ رہے تھے۔ مگر وہ سن کب رہے تھے۔ پاپا بات ختم کر چکے تھے لیکن وہ پھر بھی ہاتھ میں ریسیور تھامے کتنی دیر تک یونہی بیٹھے رہے۔

”میں مرنے والا ہوں، میرا دل کسی بھی وقت بند ہو سکتا ہے سنی بھائی!“ لفظ بار بار ان تک لوٹ آرہے تھے۔ وہ بہت تیزی سے اپنے کمرے سے بھی نکل آئے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا، یہ آوازیں انہیں مار دیں گی۔ وہ تو کسی اجنبی کے مرنے کی خبر پر بھی افسردہ ہو جاتے تھے تو کیا وہ شہریار کی موت برداشت کر سکیں گے؟ وہ دفتر سے باہر نکل رہے تھے۔ پھر ان کے کمرے کے سامنے سے گزر رہے تھے، جب انہوں نے جازی کی آواز سنی تھی۔

”آپ کو پھر درد ہو رہا ہے ناں شیری بھائی؟ کیوں آپ اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ سنی بھائی پتھر دل ہیں۔ انہیں آپ کے جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا، پھر آپ ان کو چھوڑ کر ہمارے لئے کچھ نہیں سوچتے؟ ہم تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں ناں۔“

”محبت.......“ ایک گہرا سانس، ایک لمبا شکوہ۔ وہ جم گئے تھے۔

”یہ محبت، اسے مجھ سے کبھی محبت نہیں ہو سکی۔ تمام عمر میں اس کے لئے تڑپتا رہا تو یہ مجھے نہیں ملی اور اب جبکہ میں جانے والا ہوں تو یہ محبت میری ہو گئی ہے۔“

”کوئی نہیں جانے والے آپ۔ میں پاپا سے بات کرتا ہوں، آپ کا آپریشن اسی مہینے فکس کرواتا ہوں صمدانی انکل سے۔“

”آپریشن، اور میرا؟ جازی ڈیئر! بات بہت بڑھ گئی ہے۔ اب زیادہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ صمدانی انکل بھی جانتے ہیں یہ بات۔ اس لئے زور نہیں دیتے۔“

”فضول مت بولیں۔ یہ لیں، دوا کھائیں اپنی۔“ روٹھی روٹھی آواز۔ سالار عبدالرحمن کا دل چاہا، وہ دروازہ کھول کے پوچھیں یونہی کسی اچھے اجنبی کی طرح ہی کہ تمہیں درد زیادہ تو نہیں؟ مگر جانا نہ یکدم ان کے بیچ آن کھڑی ہوئی تو وہ تیزی سے باہر نکلتے ہی چلے گئے۔ پاپا کی بات بھی انہوں نے اس لمحے رد کر دی تھی مگر گھر آکر بھی دل کو ایک عجب بے چینی سی تھی۔ عائشہ کچن میں مصروف تھیں اور وہ بہت خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئے تھے اور پھر نہیں چاہتے ہوئے بھی ایک الماری کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ لاک کھولا تو کتنے سارے موسم ایک دم سے ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ شیری بھی ناں، آپ کا جنم دن نہیں بھولتا۔ اتنا ڈانٹتے ہیں آپ اسے، اتنا لڑتے ہیں آپ اس سے، لیکن 22 اکتوبر کو فٹ سے سامنے کھڑا ہوتا ہے ’ہیپی برتھ ڈے ٹو سنی بھائی‘ کہتا ہوا۔“ پوری الماری اس کے تحفوں سے، اس کے کارڈوں سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے آج تک اس کا کوئی گفٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ عائشہ شروع سے انہیں جتاتی تھیں کہ ان کا رویہ بہت غلط ہے، چھوٹے بھائی کی طرف تو وہ نانو کا کہا گیا جملہ ’شہریار تمہارا بھائی نہیں ہے۔‘ کوری نوٹ کر کے کہتے۔ ”وہ میرا بھائی نہیں ہے۔“ اور آج وہ اسی کے گفٹ نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ گھڑیاں، کتابیں، پرفیومز، شرٹس، جینز، کبھی کچھ۔ وہ دیکھ

دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ اسے ان کے دل کی باتیں کیسے معلوم تھیں، انہیں کون سے رنگ پسند ہیں، کون سے رائٹر پسند ہیں، کون سی خوشبو پسند ہے، اسے کیسے معلوم تھا۔ کیا محبت کرنے والے دلوں پر الہام اترا کرتے ہیں؟

وہ پرفیوم اسپرے کر رہے تھے جب عائشہ نے گفٹ پیپرز کے درمیان بیٹھے سالار عبدالرحمٰن کو حیرت سے دیکھا تھا۔

''خدا کا شکر ہے، ان تحفوں کی بھی قسمت جاگی۔ کتنے سال پرانے گفٹ اب کھولے جا رہے ہیں۔ ویسے یہ کفر ٹوٹا کس طرح؟''

سالار عبدالرحمٰن نے عائشہ کی طرف دیکھا، دل میں آیا پوچھیں۔

''کیا وہ جانتی ہیں، شہریار کتنی کریٹیکل کنڈیشن کا شکار ہے؟'' مگر انہوں نے ارادہ بدل دیا کیونکہ عائشہ کی شوخی بتاتی تھی، وہ اس بات سے بے خبر ہیں۔ ورنہ جتنا وہ شہریار سے ممتا رکھتی تھیں، ان کے تو دوپٹے بھیگ رہے ہوتے اب تک۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا اور سالار عبدالرحمٰن نے پہلی بار اس جانی دشمن کا ذکر نرمی سے کیا۔

''شہریار کی چوائس گفٹس کے معاملے میں تو بہت اچھی ہے عائشہ!''

عائشہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں، پھر محبت سے بولیں۔ ''غور سے دیکھیں تو آپ کو لگے گا شہریار کی ذات خود اس کی چوائس سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ بس آپ نے کبھی غور ہی نہیں کیا اس پہلو پر اور اسے اگنور کرتے رہے۔ ویسے آج بھائی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے آپ کو؟''

''وہ میرا بھائی......''

یکدم ان کی زبان پہلی بار خود بخود رک گئی تھی۔ عائشہ ان کے جملے کے مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہیں مگر وہ ادھورا جملہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ عائشہ تیزی سے گفٹ الماری میں واپس رکھنے اور گفٹ پیپرز کو اٹھا کر ڈسٹ بن کی نذر کر رہی تھیں۔ ابھی آدھے تحفے کھولے گئے تھے، آدھے باقی تھے۔ یعنی آدھے سالار عبدالرحمٰن شہریار کی طرف کھڑے تھے اور آدھے مڑنا باقی تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر شہریار کی طرف مڑنے والے تھے۔ یہ عائشہ کا دل کہتا تھا۔ سو وہ گنگناتے ہوئے باقی کا کام کرنے کچن کی سمت مڑ گئیں۔



سالار عبدالرحمٰن کو ایک ہفتہ ہوگیا تھا، اسی کیفیت میں۔ آج کل عائشہ سے بھی ان کا رویہ سرد مہری سے ہٹا ہوا تھا۔ محبت نہیں تھی، مگر دل جوئی کا سا انداز تھا۔ آج کل وہ شہریار کی ایک ایک بات یاد کر رہے تھے۔ جہاں جہاں انہوں نے اسے لیٹ ڈاؤن کرنے کے لئے سخت تادیبی انداز اپنایا تھا، جہاں جہاں ان کے لئے آسانیاں پیدا کی تھیں، سب ایک کے بعد ایک یاد آتی جا رہی تھیں۔ وہ دفتر میں بیٹھے تھے کہ یکدم رات کو بہت چپکے سے دیکھی جانے والی البم انہوں نے دراز میں سے پھر نکالی تھی۔
عائشہ کے سونے کے بعد بہت ساری البمز میں سے یہ البم انہوں نے چوروں کی طرح اٹھائی تھی۔ پہلی تصویر میں شہریار پوری جان سے قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا اور ان کی توجہ سے اٹی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔
کیا یہ نفرت تھی؟...... انہوں نے دوسری تصویر کی طرف دیکھا اور ایک یاد ان کے اندر کلبلائی۔ یہ تصویر جازی کی پندرھویں سالگرہ کی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی یہ سالگرہ۔ جازی ویک اینڈ پر آیا تھا اور شہریار نے چار دن بعد آنے والی سالگرہ کا چار دن پہلے سے مینوئل پروگرام سیٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔
”تمہیں چھٹی نہیں ملے گی، مگر یہ سالگرہ زبردست مناؤں گا میں۔“ اس دن اس نے دفتر سے چھٹی کی تھی اور اپنے کمپنی کے آئیڈیا ڈائریکٹر کو پارٹی کا تھیم بنانے کا کہا تھا۔ ڈیزائن، خوب صورت سجاوٹ...... اور وہ اس کی کارکردگی پر ٹل کھائے جا رہے تھے۔
”پاپا! وہ پیسے کا ضیاع کر رہا ہے۔ آپ اسے روکتے کیوں نہیں؟“
پاپا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تھا، پھر نرمی سے بولے تھے۔ ”تم نہیں سمجھو گے سالار! یہ پیسے کا ضیاع نہیں، محبت کا ایک انداز ہے۔ جازی ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ سو اتنی محبت تو ڈیزرو کرتا ہی ہے۔“
وہ چڑ گئے تھے۔ مگر شام گئے پارٹی میں پہنچے تو ہال کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر اس کی صلاحیتوں کو انہوں نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور وہ کیمرہ گلے میں ڈالے ہر زاویے سے تصویر کھینچ رہا تھا۔ پھر وہ کیک کھا رہے تھے، جب اچانک اس نے ان کے گلے میں پشت سے بانہیں حمائل کر دی تھیں، سامنے ہی کمپنی کے سیکنڈ ڈائریکٹر کھڑے تھے، اس لئے انہوں نے کسمسانے پر اکتفا کیا تھا اور اس نے جازی کو اشارہ کیا تھا۔ ”ایک تصویر ہو جائے جازی! ہٹلر ثانی ویسے ہاتھ کہاں آتے ہیں؟“
جازی نے موقع سے دو تین تصویریں اتار لی تھیں۔ پھر ایک تصویر پر وہ جو پہلے چلبلائے تھے، آج ہنس پڑے تھے۔ عائشان کی اور اپنی ایئی ورسری کا کیک پیس انہیں کھلانے والی تھیں۔ انہوں نے بھی

آگے بڑھ کر منہ کھولا ہی تھا کہ آخر کے چند سیکنڈ میں اس نے انٹری ڈال دی تھی اور کیک ہڑپ کر گیا تھا۔

''سوائس بھابی! آج کے کیک کا ذائقہ کچھ زیادہ ہی لذیذ ہے ناں؟'' پھر عائشہ بھابی نے کتنی منتوں کے بعد انہیں کیک کھلایا تھا۔ فارغ ہوئیں تو مصنوعی خفگی سے بولیں۔

''شہریار بھائی! آپ نے بھی ناں، اچھا خاصا مروا دینے کا پروگرام بنا دیا تھا آپ اپنے بھیا کی عادت تو جانتے ہیں ناں۔ پھر بھی شرارتیں ختم نہیں ہوتیں آپ کی؟''

اور وہ جو اس کے اریب قریب رہنے کے چکر میں مہمانوں میں گھرے ہونے کے باوجود اس کی طرف متوجہ تھے، اس کے جواب پر بھناہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ عائشہ کے کندھوں پر لاڈ سے ہاتھ دھر کر جذب سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ نہیں جانتیں بھابھو! یا اپنے ہٹلر ثانی بھی ناں، دراصل انہیں اپنی محبت ظاہر کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ سو جب یہ مجھ پر غصے سے چلا رہے ہوتے ہیں ناں تو میں ان کی آنکھوں میں محبت کھوج رہا ہوتا ہوں۔ ڈانٹتے وقت بھی اتنی توجہ سے دیکھتے ہیں مجھے کہ میں تو اس توجہ پر سو سو بار مرجاتا ہوں، کہ غصے میں ہی سہی، انہیں میری طرف دیکھنا تو یاد آیا۔''

عائشہ کی اس وقت کی دبی دبی ہنسی پر اس لمحے انہیں لگا تھا وہ شہریار کے ساتھ مل کر ان کا مذاق اڑا رہی ہیں، اس لئے ان کا رویہ عموماً ان سے برا ہی ہوتا تھا۔ مگر آج.......

''یہ ہٹلر ثانی بھی ناں، انہیں اپنی محبت کا ڈھنگ سے اظہار نہیں آتا۔'' شہریار کی آواز پھر سے گونجی اور وہ شام گئے گھر لوٹ آئے۔ گھر میں کل کی منگنی کی تیاریوں کی وجہ سے کافی افراتفری مچی ہوئی تھی مگر شہریار ان سب تیاریوں میں شامل نہیں تھا۔



''ہاں مجید صاحب! آپ ٹھیک سمجھے۔ میں ڈیکوریشن بالکل ایسی ہی چاہتا ہوں۔ بس لگے موسم بہار اس کے پلو سے باندھ دیا ہو موسم نے...... میری بہن کی منگنی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں، کہیں کمی نہ رہے۔ بس ایک مکمل تقریب ہو۔''

وہ فون پر مصروف تھا۔ باتیں جاری تھیں اور عدیل عبدالرحمٰن اس کی پشت پر چپکے سے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ڈیمانڈ نوٹ کروا رہا تھا، آئیڈیا دے رہا تھا۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے موبائل آف کیا ہی تھا کہ دفتری فون بجنے لگا۔ وہ، جو پشت موڑے کھڑا تھا، یکدم پلٹا اور سرپرائز رہ گیا۔

''ارے بڑے بھیا! آپ؟...... آپ کب آئے؟''

عدیل عبدالرحمن اسے جانچتے والی نظروں سے دیکھنے لگے، پھر آہستگی سے بولے۔ ''یہی آدھے گھنٹے پہلے، جب تم کسی مجید صاحب سے محو گفتگو تھے۔''

''اُفوہ......ان سے میں دانیا کی منگنی کی تقریب ارینج کرنے کی بابت بات کر رہا تھا۔''

''میں نے سنی وہ بات۔'' وہ خاموش ہو گئے کیونکہ اسی وقت اس کی سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔ ''سر ایک لائن پر مسٹر علی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، ایڈ کے سلسلے میں۔''

اس نے چونک کر سیکرٹری کو دیکھا، پھر نرمی سے سر ہلا کر ریسیور اٹھا کر محو گفتگو ہو گیا۔ ''جی بالکل، مجھے آپ کے لئے کام کر کے خوشی ہو گی۔ لیکن پلیز، آپ اس نمبر پر مسٹر جازی سے رابطہ کیجئے۔ آج کل وہی نئے کام کو دیکھ رہے ہیں۔'' وہ نئے نمبر لکھوانے لگا۔ ریسیور رکھ کر مڑا تو عدیل بھائی نے بہت بے قراری سے اسے دیکھا تھا۔

''اتنی سی گفتگو سے تمہاری اتنی سانس چڑھ گئی ہے۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے شیری!''

''میری زندگی میں اچھی باتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ویسے ایک گڈ نیوز ہے۔''

''کیا؟'' انہوں نے ناراضگی سے اسے دیکھ کر پوچھا اور وہ دراز سے کارڈ نکالنے لگا۔

عدیل عبدالرحمن نے کارڈ دیکھا اور تیزی سے کارڈ ٹیبل پر پٹخ دیا۔ ''یہ گڈ نیوز ہے تمہاری نظر میں؟'' وہ باقاعدہ خفگی سے پکارے اور وہ انتہائی معصومیت سے بولا۔

''بحیثیت دوست کے دیکھا جائے تو یہ ایک گڈ نیوز ہی ہے میری نظر میں۔ بڑے بھیا! عاطف بیگ کی طرح سلامہ بھی باقاعدہ سے نکاح کر رہا ہے اسی ہفتے۔ عاطف بیگ کا نکاح سلامہ کے نکاح کے ایک ماہ بعد طے پایا ہے۔ میرے دونوں دوست ایک خوشگوار زندگی جینے جا رہے ہیں تو بتائیے، یہ گڈ نیوز نہیں ہوئی میرے لئے؟''

عدیل عبدالرحمن کچھ نہیں بولے اور وہ انہیں خاموشی سے دیکھنے لگا۔ کافی لمحوں تک جب انہوں نے شہریار کو مخاطب نہیں کیا تو وہ ان کے قریب آ گیا۔

''پلیز بڑے بھیا! ناراضگی تو نہیں ہو رہی۔ آپ جانتے ہیں، میں جن لوگوں کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا، ان میں آپ سب سے پہلے نمبر پر ہیں۔''

عدیل عبدالرحمن نے کوئی تاثر نہیں دیا تو وہ ان کے سامنے چیئر گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''اب آپ کیا یہ چاہتے ہیں، مجھے ڈینجر زون میں لے آئیں؟''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام تم بخوبی کرتے آ رہے ہو۔'' انہوں نے طنزیہ سگریٹ کیس کی طرف اشارہ کیا اور وہ کان پکڑ کر پھر سے معصومیت سے بولا۔

"خدا گواہ ہے بھیا! یہ صرف مہمانوں کے لئے رکھا ہے۔ دن بھر میں ایک سگریٹ کے علاوہ نہیں پیتا اب۔" اس نے ہاتھ تھام کر یقین دلانا چاہا اور عدیل عبدالرحمٰن کو کرنٹ سا لگ گیا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے۔"

اس نے تیزی سے ہاتھ کھینچ لئے۔ "نہیں تو........ بس ویسے ہی ٹمپریچر ہو گیا ہو گا۔ عموماً نہیں ہوتا۔" جھوٹ صاف اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

"تم نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"روز دیکھتا ہوں بھیا! کافی گڈ لکنگ ہوں، آئی نو۔"

"میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تمہاری شکل اتنی مرجھا کیوں گئی ہے؟ ایک مہینے پہلے تو ایسی کنڈیشن نہیں تھی۔ پھر اچانک......."

"کیا بھیا! آپ تو مجھ پر بھی اپنی سیکرٹ سروس کی صلاحیتیں آزمانے لگے۔ میں پہلے سے ایسا ہی ہوں۔"

"بکومت۔ کیا میں تم سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں یا کئی سال بعد کہیں سے لوٹا ہوں کہ تم مجھ سے صفائی سے جھوٹ بولنے پر تلے ہوئے ہو؟ کیا ہو رہا ہے اندر ہی اندر، تم بتا رہے ہو یا انکل صمدانی سے رجوع کروں؟" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے خود سے قریب کر لیا تھا اور اس نے لمبا سانس کھینچ کر ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا۔

کتنی نا آسودہ سانسیں فضا میں بکھری تھیں مگر لفظ.......لفظ مفقود تھے۔

"شہریار! کیا ہو گیا ہے اس ایک مہینے میں؟"

"کچھ نہیں۔ کریٹیکل پوزیشن سے اب نکل آیا ہوں بڑے بھیا!"

"بغیر کسی علاج کے تم کریٹیکل پوزیشن سے کیسے نکل آئے ہو؟" اچنبھے سے عدیل عبدالرحمٰن نے اسے دیکھا اور شہریار کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

"اب علاج کی کوئی گنجائش نہیں بچی ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے بڑے بھیا!"

"یعنی؟" انہوں نے بے قراری سے اسے دیکھا اور اس نے ان کے وجود میں سمانے کی کوشش کی، پھر بہت مدھم لہجے میں ان کی سماعتوں میں انڈیلا۔

"جو لمحہ آپ کے ساتھ جی لیا، بس وہی لمحہ میرا ہے۔ کسی اضافی لمحے کو جینے کا اختیار کھو دیا ہے میں نے۔ میں کبھی بھی، کسی بھی لمحے آپ کو چھوڑ کے جا سکتا ہوں، بڑے بھیا!"

عدیل عبدالرحمٰن کو لگا کسی نے ان کا دل مٹھی میں پکڑ کر بھینچ لیا ہو۔ انہوں نے سینے سے لگا اس کے وجود کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا تھا، پھر غصے سے بولے تھے۔

"تم جانتے ہو ناں، مجھے سنجیدہ مذاق کرنے والے بہت برے لگتے ہیں۔"

شہریار ہنسا۔ "مذاق...... زندگی نے بہت بڑا مذاق کیا ہے بھیا! اس کی خفگی مجھ پر مت نکالئے۔ زندگی سے جا کر لڑیئے کہ کیا چھین کر کیا دے رہی ہے آپ کے بھائی کو۔ محبت، آرزوئیں، امیدیں، چاہے جانے کی تمنا، سب کچھ عمر بھر اس نے اپنی مٹھی میں دبائے رکھا اور اب جانے کے لئے کوئی لمحہ جاتا ہے تو کہتی ہے ہم کہاں چلے؟ ابھی تو بہت کچھ ہے یہاں۔ اتنے پیار کرنے والے دل، اتنی ساری محبتیں...... کیا ان سب سے دامن چھڑا سکتے ہو؟...... عدیل بھائی! میں مام کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا، میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا، میں آپ کے جونیئر کو اپنی بانہوں میں تھام کر پیار کرنا چاہتا ہوں، دانیا کی شادی میں شرکت کی حسرت ہے۔ مگر ایک ہی سانس میں زندگی سارا کا سارا وقت پی گئی ہے۔ کچھ نہیں چھوڑا میرے پیالے میں۔ خالی پیالہ لئے خالی ہاتھوں میں لے دھر دیکھئے، کیا میں جانا چاہتا ہوں؟"

عدیل بھائی کچھ نہیں بولے تھے۔ خاموشی سے اسے کھینچ کر ڈاکٹر صمدانی کے کلینک لے گئے تھے۔

وہی سارے ٹیسٹ دوبارہ سے ہو رہے تھے۔ پھر نتیجہ نیا کیا نکلتا؟

"آپ دیکھئے انکل! کوئی راہ بچی تو ہوگی۔"

ڈاکٹر صمدانی نے مایوسی سے ان کی طرف دیکھا۔ "اس کا آپریشن پہلے بھی بہت کریٹیکل تھا۔ کامیابی کا صرف ایک فیصد چانس تھا، مگر اب تو یہ چانس اس نے بالکل گنوا دیا ہے۔ اس کا دل مکمل طور پر ہار مان چکا ہے۔ دل کے دو والو بند ہو جانے کی وجہ سے دل نے اضافی محنت کی ہے، جس کی وجہ سے وہ ٹھیک آکسیجن نہیں حاصل کر سکا اور اب بالکل جواب دے گیا ہے۔"

"پیس میکر...... انکل! پیس میکر بھی تو ہوتا ہے۔ آپ کوشش کریں ناں۔"

ڈاکٹر صمدانی نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ "اس کا سارا نظام Collapse کر چکا ہے عدیل! یہ جو چل رہا ہے، یہ صرف دل پاور ہے۔ جس دن اس کے اندر کی آخری تمنا بھی پوری ہوگئی، اس دن یہ ایک دم سے ختم ہو جائے گا۔ گردے، جگر، لنگز ہر چیز اندر سے تباہ کر چکا ہے یہ اسموکنگ اور ماضی میں کی جانے والی جی بھر کے ڈرنکس نے اسے مکمل تباہ کر دیا ہے۔ ہم اسے آپریشن ٹیبل پر لٹا بھی دیں تو

زندہ واپس آنے کا زیرو پرسینٹ چانس بھی نہیں ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن کھڑے سے بیٹھ گئے تھے اور وہ دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ بلڈ ٹیسٹ کے بعد وہ کف نیچے کر کے بند کر رہا تھا۔

"کیا کہا انکل نے؟" اس نے یوں پوچھا، جیسے وہ خود بھی کسی امید کو شگن لینا چاہتا تھا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عدیل عبدالرحمٰن کے لب کانپے اور وہ نا اُمیدی سے انہیں دیکھ کر ان کی طرف سے پشت موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایمرجنسی ڈور سامنے نظر آ رہا تھا اور ابھی کے ابھی ایک گاڑی سے ایک وجود اتارا گیا تھا۔

"ڈاکٹر...... آکسیجن......" مختلف آوازیں۔ شہریار کو لگا، اس اسٹریچر پر وہ لیٹا ہوا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" عدیل بھائی نے جان کر پردہ سرکا دیا اور وہ چھیکے سے انداز میں ہنسنے لگا۔ "کچھ نہیں۔ مستقبل کے سین کا ایکشن ری پلے دیکھ رہا تھا۔"

"بکومت۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔" انہوں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ کتنی ٹھنڈی سانسیں ان کی گردن سے ٹکرائیں اور وہ آہستگی سے بولا۔

"میں مرنے سے نہیں ڈرتا بڑے بھیا! لیکن جب میں سوچتا ہوں، مجھے آپ سے، مام سے، ڈانیا سے، آپ سب سے الگ ہو کر ایک نئی زندگی جینی پڑے گی، جس کا سلیبس بھی مجھے ازبر نہیں تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اپنے اعمال سوچتا ہوں تو ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ بخشے ہوئے لوگوں میں نہ کھڑا ہوا تو...... کیا ہوگا؟...... یہ دنیا بھی میری نہیں تھی، اگر اُس دنیا میں بھی خالی ہاتھ رہ گیا تو؟"

"شیری! فار گاڈ سیک، بند کرو یہ احمقانہ بات۔ میں کہہ رہا ہوں ناں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا تو واقعی کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ انگلینڈ میں میرا ایک دوست بہت بہترین ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ میں تمہاری رپورٹس اُسے بھیجوں گا۔ دیکھ لینا، ہم کوئی راہ نکال لیں گے۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ اور وہ شام گئے گھر لوٹ آئے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن ایک سکتے کی کیفیت میں چپ بیٹھے تھے، جب بہت اچانک رابعہ نے پوچھا تھا۔

"آخر کیا بات ہوگئی ہے، دفتر سے جب سے سالار بھائی آئے ہیں، وہ بھی سناٹے میں گم ہیں اور آپ بھی بہت چپ چپ ہیں۔ کوئی پرابلم ہے کیا؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے رابعہ کو دیکھا اور مصنوعی مسکراہٹ دے کر بولے۔ "کیا مطلب، سالار اور سناٹے میں گم؟ اسے ناراضگی اور غصے کے علاوہ بھی کسی موڈ کی خبر ہے کیا؟ میں نے تو ہمیشہ اسے غصے ہی میں دیکھا ہے آج تک۔"

"ہاں......مگر آج ان کا موڈ کچھ اُکھڑا سا ہے۔آتے ہی لائبہ سے شہریار کا پوچھ رہے تھے۔گھر نہیں ہے تو کہاں گیا ہوا ہے؟"

عدیل عبدالرحمن نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔"یہ تو اکھڑا ترین موڈ تھا۔سالار عبدالرحمن اور شہریار کو پوچھ رہے تھے؟"

وہ اُٹھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکلے اور بے ساختہ ان کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔شہریار کارپٹ پر بیٹھا تھا اور مما اس کے سر میں تیل ڈال کر مالش کر رہی تھیں۔ساتھ ساتھ اس پر کمنٹ بھی پاس کر رہی تھیں کہ اسے اپنی بالکل بھی پروا نہیں ہے۔بال دیکھو کس تیزی سے جھڑ رہے ہیں۔اور وہ کان دبائے مسکرائے جارہا تھا۔

"فرصت نہیں ملتی مام! ورنہ اپنا خیال رکھنے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔"

"ہاں ہاں، ساری دنیا تمہارے کندھوں پر ہی تو دھری ہے۔" اب کے نانو نے لقمہ دیا تھا اور وہ شرارت سے نانو کو دیکھے جارہا تھا۔

"نانو! آج تو آپ بہت ماپوناپ خوب صورت لگ رہی ہیں۔کوئی خاص بات؟"

نانو ہنسنے لگی تھیں۔"بکو مت۔اپنی غلطی کو آئیں بائیں شائیں میں مت چھپایا کرو۔ماں جو کہہ رہی ہے، اس کا جواب دو۔کیوں خود پر توجہ نہیں دیتے؟"

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔آپ ہیں ناں توجہ دینے کے لئے، پھر مجھے اپنی انرجی ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ہنسا اور ہنستے ہوئے اس نے مام کی گود میں سر رکھا تھا اور مام چیخی تھیں۔

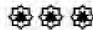
"شیری کے بچے! میرے کپڑے سارے تیل میں کرنے ہیں کیا؟"

اس نے ایک نہیں سنی۔مام کا دوپٹہ لے کر اپنے چہرے کا تیل صاف کرنے لگا۔کنپٹیوں سے بھی تیل بہہ کر آگیا تھا۔مام کسمسائی تھیں۔پھر انہوں نے احتجاج روک دیا تھا اور وہ اسی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ملتا ہے اس طرح میری گود میں سر رکھنے سے تمہیں؟" مام نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں اور وہ چہرہ اٹھا کر بولا۔

"یہ وہ بخشش ہے میری زندگی کی مام! کہ اگر اس کے بدلے جنت ملے تو میں وہ نہ لوں گا۔آپ کی گود میرے لئے ہفت اقلیم دولت ہے، ساری دنیا ہے یہ میری۔اور "جلاوطن" زمین کی قدر و قیمت خوب جانتا ہے کہ پاؤں بھر زمین اور مٹھی بھر آسمان کتنا قیمتی ہوتا ہے۔"

مام سے کچھ نہ بولا گیا تھا۔انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا تھا اور عدیل عبدالرحمٰن نم سمیٹی آنکھوں سے اس منظر سے آگے بڑھ گئے تھے۔وہ سالار عبدالرحمٰن کو ڈھونڈ رہے تھے۔مگر وہ انہیں گھر میں کہیں نہیں ملے تھے اور ایک شام اور اُداس چلی گئی تھی۔



دانیا کی منگنی کی تقریب ایک ہوٹل میں ہونا قرار پائی تھی۔شہریار اس وقت سب سے آگے آگے تھا۔عاطف، سونیا، سلامہ، شافعہ، مائمہ کی امی، زہرہ جنید، دائمہ، عارف سب اس تقریب میں اس کے ساتھ تھے۔سلامہ اتنا اس کی طرف متوجہ نہیں تھا لیکن عاطف کام کرتے ہوئے بھی شہریار کو نظروں میں اس طرح رکھے ہوئے تھا کہ بالآخر اس نے اس کی طرف مڑ کر پوچھا تھا۔

''کیا نیا دریافت ہو رہا ہے میرے بھائی! میں وہی پرانا والا شہریار ہی ہوں۔'' عاطف نے ارینج منٹ کے لئے پھولوں کا زاویہ دیا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔''

''بم اسکواڈ کو بلانا ہے یا........'' شہریار نے بات شرارت میں رکھ کر برامد کرنا چاہی اور عاطف بیگ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''تمہاری طبیعت........'' وہ تھما اور شہریار نے ہنس کر بات مکمل کی۔

''بچپن سے عاشقانہ ہے۔اور کچھ؟''

''شیری! تم ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر پا رہے۔تمہاری سانس کتنی پھول رہی ہے، تمہیں اندازہ ہے؟''

''پلیز کوئی اور بات کرو۔'' وہ پہلو بچا گیا اور عاطف نے اس کی پیشانی پر آنے والے پسینے کو رومال میں جذب کیا۔

''تمہیں پسینہ کتنا آ رہا ہے۔اور رنگت دیکھی ہے اپنی؟''

''کیوں نہیں، یہ سب فیئر اینڈ لولی کا کمال ہے میرے بھائی!''

''شہریار! میں سنجیدہ ہوں۔'' اس نے اب کی بار شہریار کو کندھوں سے تھام کر روک لیا تھا۔''ایسی تھنک رانگ؟''

شہریار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ ”جو محسوس کر رہے ہو ضروری ہے اس پر کوئی ٹاک شو ٹائپ کا پروگرام بھی ہو؟“
وہی پرانا کھردرا لہجہ۔ اور یہ لہجہ وہ اس وقت اپناتا تھا، جب وہ کسی طرف سے پہلو تہی کرنا چاہتا تھا۔
”تم اس لہجے سے مجھے ڈرا نہیں سکتے ہو۔ تم جانتے ہو، میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“
”شاید ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو بہت اچھے طریقے سے جانتا ہے۔ لیکن بعد میں کھلتا ہے، ہم نے تو ابھی پہلی پرت ہی الگ نہیں کی تھی۔“
”ڈاکٹر صمدانی کیا کہتے ہیں؟“ وہ اصل بات پر آ گیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔
”کیا کہیں گے، کہہ رہے تھے، جتنی جلدی ہو سکے، دوسری شادی کر لو۔“
”دوسری شادی؟ پہلی کب کرلی تھی؟“ عاطف بیگ نے اچنبھے سے دیکھا اور وہ مسکرانے لگا۔
”اس لئے ہی تو کہہ رہے تھے، دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی کی باری آئے گی ناں۔ یو نو، الٹی منتق اور دھماکہ۔“
”یہ دھماکہ کہاں ہونے والا ہے؟“ عاطف بیگ نے اسے پھر طرح دی۔
اور اب کی بار شہریار نے اس کی طرف خفگی سے دیکھا۔ ”ہم بہت اچھے موڈ میں ایک کام کر رہے ہیں تو کیا تم مجھے میرا اچھا موڈ برقرار رکھنے دو گے، یا ضروری ہے ہنسی میں نمی کی آمیزش بھی ہو، تبھی خوشی کو کاملیت ملے گی؟“
لہجہ اتنا برا تھا کہ عاطف بیگ، جو بہت ٹھنڈے مزاج سے اسے طرح دے رہا تھا، یکدم واک آؤٹ کر گیا۔
شہریار نے سکون کا سانس لیا تھا اور کام ہوتے چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ شام کے سات بجے تقریب کا آغاز ہوا تھا۔ عاطف بیگ روٹھا روٹھا پھر رہا تھا۔ ”مجھے مناؤ“ کی تفسیر بنا۔ عدیل عبدالرحمٰن کی نظر بار بار شہریار پر جا کر اٹک جاتی تھی اور سالار عبدالرحمٰن جو نظروں سے ان نظروں کا تعاقب کر رہے تھے۔
اسٹیج پر دانیا اور مامون عبدالکریم قریب قریب بیٹھے بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔ جازی مووی کیمرے سے ذاتی کلیکشن کے لئے ویوز لے رہا تھا۔ سلامہ ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں کھینچ رہا تھا۔

جازی کے مووی کیمرے کا رخ زیادہ تر شہریار کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ اسے کہنا پڑا تھا۔ ”میں تقریب کا مہمانِ خصوصی سہی، لیکن باقی لوگ بھی آپ کی نظرِ عنایت کے منتظر ہیں۔“
جازی پزل ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک پروفیشنل مووی میکر کی طرح تقریب کو کور کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اچانک شہریار نے سالار عبدالرحمٰن پر دھاوا بول دیا تھا۔
”سلامہ! ایک تصویر تو لینا۔ آج بڑے بھائی بہت خوب صورت لگ رہے ہیں۔ میں نے سوچا، تھوڑی سی ان کی خوب صورتی میں بھی چرا ہی لوں۔“
دونوں بانہیں ان کے گلے میں حمائل کیں اور سالار عبدالرحمٰن نے کوئی سخت ردِعمل نہیں دیا۔ شہریار ایک تصویر کے بعد ان کے کان میں گنگنایا تھا۔ ”اس رویے سے میں یہ نہ سمجھ لوں کہ آپ کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔“
سالار عبدالرحمٰن نے گھور کے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شہریار آدھا ان کے کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ جازی اور سلامہ دونوں نے تصویر لینے میں دیر نہیں کی تھی۔
”شہریار! اپنی حد میں رہو۔“ اب کی بار وہ اس ٹرانس سے نکل آئے تھے، سو انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے اور شہریار ہنستا ہوا ایک گروپ فوٹو کے لئے تیاری کر رہا تھا۔
”سارے دوست اکٹھے ہیں، ایک تصویر ہو جائے۔“ اس نے مومنہ، اسٹریچر، سلامہ، شافعہ، عاطف بیگ اور سونیا کو اکٹھا کیا۔ اسٹیج سے دانیا اور ماموں کو بھی بلوا لیا گیا۔ مگر عاطف پہلے ہی موڈ میں کٹا کٹا پھر رہا تھا۔ یہاں تک کہ شہریار خود اس کے پاس گیا تھا۔ شہریار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ اپنے یونیورسٹی فیلو جمال سے گھٹ کر باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شہریار نے اسے پشت پر سے جا کر تھام لیا تھا۔ بازو اس کی کمر کے گرد کس کر زمی سے بولا۔
”جانے والوں سے ناراضگی اچھی نہیں ہوتی یار! جب تک میں ہوں، تب تک تو میری بدلحاظیاں برداشت کر لے۔ میں جانتا ہوں، میں بہت برا ہوں، لیکن ہوں تو دوست ناں۔ دوست اچھے ہوں یا برے، دوستی نبھانا کمال کا ہنر ہوتا ہے۔“
عاطف بیگ کی سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ ”تم ہمیشہ ایسے ہی ڈراوے دے کر لائن کلیئر کیا کرتے ہو۔“ اب کی بار اس نے خفگی سے کہا مگر زمیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی اور شہریار نے اب اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا، پھر بہت جذب سے بولا تھا۔
”یہ ڈر نہیں، ایک حقیقت ہے عاطف! میں کسی بھی لمحے تمہاری محبت کے باوجود دنیا چھوڑنے پر مجبور کیا جانے والا ہوں۔ سو مجھے لگتا ہے، سزائے موت کی قیدی کو اتنی تو چھوٹ ملنی ہی چاہئے۔“
عاطف بیگ کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ پھر سے بولا۔ ”مجھے دنیا میں دانیا سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں۔ شاید اتنی محبت میں نے کبھی خود سے بھی نہیں کی۔ لیکن انکل عبدالکریم نے جو دو سال کا شادی کا ٹائم

بیڑا مانگا ہے، اس کی وجہ سے میں دانیا کو رخصت ہوتے دیکھوں، یہ ناممکن سی بات ہے۔" لمبا سانس لے کر اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا کر بولا۔ "لیکن مجھے یقین ہے، میرے نہ ہونے کے باوجود تم اور سلامہ بڑے بھیا سب کی محبتوں میں، میں اسے یاد بھی آؤں گا۔ ہاں، مگر جب وہ رخصت ہونے لگے تو اس کے آنچل سے میرے دل کی دعا ضرور باندھنا۔ اس کی آنکھوں کو پوری توجہ سے دیکھ کر کہنا ضرور شہریار عبدالرحمٰن دنیا میں سب سے زیادہ جس سے پیار کرتا تھا وہ اس کی جان سے پیاری اس کی بہن تھی۔ شہریار اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا اور اس سے قطع نظر کہ اس سے وہ اتنی ہی محبت کرتی بھی ہے یا نہیں، عاطف! یہ تم کہنا اس سے لفظ تمہاری دسترس میں سب سے زیادہ رہتے ہیں اور تمہاری یادداشت بھی کمال ہے۔"

عاطف بیگ سناٹے میں کھڑا رہ گیا۔

"چلو، ایک تصویر کھنچوالو۔ میں اپنی دوستی کو ایک بار پھر سے پوری شدت سے جینا چاہتا ہوں۔"

عاطف بیگ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہولیا تھا اور جاری ان کی مختلف ویوز سے تصویریں اتار رہا تھا۔ پاپا، ماما سب بے حد خوش تھے اور شہریار کرسی پر بیٹھا محبتیں سمیٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

"بہت خوش ہو آج۔"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

"بہت سے بھی بہت زیادہ بڑے بھیا!" اس نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

عدیل عبدالرحمٰن برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "یہ تم نے ہٹلر ثانی کو کیسے قابو کر لیا ہے؟ اب پلٹ کر کسی بھی بات پر دوبدو ہی نہیں کرتے۔"

شہریار نے ہنس کر انہیں دیکھا، پھر شرارت سے بولا۔ "دنیا چھوڑ جانے کا نقشہ کھینچا تھا ان کے سامنے فوراً ہی قابو میں آگئے۔ ورنہ تو فائل پر دستخط والی بات پڑھتے سے ہی اُکھڑ گئے تھے۔ انہیں کیا سمجھاتا۔ سو فوراً ہی جو ڈرامہ سوجھا، وہ کر گزرا۔" عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر اسے دیکھا اور عین اسی وقت شہریار کا کندھا کسی کے شکنجے میں تھا۔

"تم ڈفر!....... تم خود کو سمجھتے کیا ہو، میں تمہیں بے وقوف نظر آتا ہوں؟....... تم سمجھتے ہو تم جب چاہو مجھے اُلو بنا سکتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں تمہیں۔ سارے حسابات چیک کراؤں گا۔ مجھے اب اس پر ہی شک

ہے کہ تم نے پاپا کی دی گئی مراعات سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔"
شہریار پہلے کے مقابلے میں اور ہنسا، پھر آہستگی سے بولا۔ "مجھے ممکنات معاملات میں دخل در معقولات کرنے کا بڑا شوق ہے سنی بھائی!"
سالار عبدالرحمٰن تن فن کرتے واپس مڑ گئے اور عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "تم نے بات کو یہ رخ کیوں دیا؟"
شہریار کے چہرے پر نقاہت پھیل گئی، مگر اس نے جذب سے کہا۔ "شروع میں سنی بھائی کو جس موڈ میں دیکھا ہے، اس موڈ سے ایک انچ ہلے ہوئے بھی ہوں تو چیختے نہیں ہیں۔ اور بس مجھے آخری لمحے تک...... دوبدو کرنے والے سنی بھیا چاہئیں۔ مجھے وہی لڑتے جھگڑتے انداز میں اچھے لگتے ہیں، بڑے بھیا! اس لئے بات کو یوٹرن دیا ہے۔"
عدیل بھائی نے کھینچ کر اسے خود سے لپٹا لیا، کچھ نہیں بولے۔ مگر اس کا پورا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔



بیگم عافیہ نے اسٹریچر کو مومنہ کے لئے اوکے کر دیا تھا اور شہریار کا اگلا ہفتہ بہت زیادہ مصروفیت بھرا تھا۔ سلامہ، شافعہ اور عاطف بیگ اور سونیا کا نکاح قریب تھا۔ آج ارسلان راشدی نے گیٹ ٹو گیدر دی تھی۔ سارا گھر شامل تھا۔ شہریار بہت خاموشی سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ اچانک شافعہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔
شہریار کو لگا، شافعہ کو دیکھتے ہی چپکے سے اس کا دل بھی آنکھوں میں آن بیٹھا تھا۔ وہ سج کر قدم اُٹھاتی اس کے بالکل پاس آن کھڑی ہوئی...... اتنا پاس کہ وہ چاہتا تو اسے چھو سکتا تھا۔
اس نے ناقدانہ نظر ڈالی۔ کریم کلر پر میرون ایمبرائیڈری کے کام والا سوٹ اس پر بہت کھل رہا تھا۔ یہ ڈیزائن بہت دیکھا ہوا سا تھا۔
"کیوں...... پسند نہیں آیا یہ کلر مجھ پر؟...... میں کہہ رہی تھی سلامہ سے، مجھ پر یہ کلر سوٹ نہیں کرتا، مگر وہ زبردستی مجھے "کلاسی" لے گیا۔"
شہریار نے گہرا سانس لیا۔ "کلاسی" اُن کے بوتیک ہی کی ایک چین تھی۔
اس نے گلا کھنکھارا، پھر نرمی سے بولا۔ "تم اس لباس میں اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ مجھے تمہاری تعریف میں لفظ تلاش کرنے مشکل لگ رہے ہیں۔"
"بکومت شہریار!" شافعہ نے بہت دوستانہ انداز میں پزل ہو کر اس کے شانے پر مکا مارا اور ایک تیز خیال اندر ہی اندر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے دوستانہ انداز میں کب پکارا جانا ممکن تھا۔ صرف سلامہ کے حوالے

سے وہ اس سے اب فرینک تھی۔ کاش! یہ حوالہ اُس کا ہوتا۔
اُس نے آنکھ بند کرتے پھر سے اُسے دیکھا اور کوئی اندر گرلایا۔

اِک شخص سے ملنا ہے مجھ کو
دو چار صدی یا اب کے برس
اے عمرِ رواں، آ پاس میرے
رفتار کو اپنی دھیما رکھ
رفتار کو اپنی دھیما رکھ........

''کیا ہو گیا، اتنے چپ چپ کیوں ہو؟'' وہ قریب بیٹھ گئی اور وہ نظر چرا گیا۔ دل، جو آنکھوں میں آن بیٹھا تھا اگر دھڑکنے بھی لگا تو........''
''کچھ نہیں........ بس کچھ دفتری پرابلمز ہیں، جن کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے حل کیے جائیں۔''
''اب اتنی اچھی تقریب کو اس طرح ضائع مت کرو شہریار کے بچے!'' یکدم کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ آواز سلامہ ارسلان کے سوا کس کی ہو سکتی تھی۔''
وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا اور سلامہ نے دوبارہ ٹہوکا دیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ صحیح کہہ رہا ہوں۔ دفتری معمولات دفتر تک ہی رہنے چاہئیں۔ ادھر دیکھو، مجھے ایکس کلوز رپورٹ دینی ہے مگر میں نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا۔ ڈیڈ لائن دو دن کی ہے، مگر تم نے میرے چہرے پر سوچوں کے جال دیکھے؟''
شہریار ہنسنے لگا اور یکدم اس کی نظر عاطف بیگ پر گئی۔ وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو، وہ اس لمحے کیا سوچ رہا تھا۔
''عاطف! کم آن یار! سارے دوست یہاں ہیں تم وہاں اکیلے کھڑے کیا کر رہے ہو؟'' اس نے آواز دی۔ وہ رُوٹھا رُوٹھا قریب آیا اور شہریار نے ادا سے اس کا ہاتھ تھام کر لگاوٹ سے نظم شروع کر دی۔
''مستقل اس جہاں میں تم بھی نہیں

مستقل اس جہاں میں ہم بھی نہیں
نہ مسرت ہی مستقل ہے یہاں
مستقل اس جہاں میں غم بھی نہیں
پھر عداوت ہی مستقل کیوں ہو
آؤ کچھ اس طرح نہ کر دیکھیں
ان اندھیروں میں روشنی کرلیں
آؤ دوستی کرلیں، آؤ دوستی کرلیں"
عاطف بیگ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور سلامہ نے شافعہ کو دیکھ کر کہا۔
"دل تھا، خوش خیال تجھے دیکھ کر ہوا
یہ شہر بے مثال تجھے دیکھ کر ہوا
آئی نہ تھی کبھی میرے لفظوں میں روشنی
اور مجھ سے یہ کمال تجھے دیکھ کر ہوا"
شافعہ کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سلامہ کے ہاتھ میں تھا اور سونیا نے شہریار کا کندھا ہلایا تھا۔
"کوئی اور نظم ہو جائے شیری بھائی!"
شہریار نے منہ کھولا اور دانیا کو دیکھ کر چپ کا چپ رہ گیا۔

وہ اُس کے دل کا سچ جانتی تھی اور سچ جاننے والے دل کو اندر تک کرید دیتے ہیں۔ بھلے وہ آپ سے کچھ بھی نہ کہیں، لیکن ان کی خاموش آنکھیں آپ کے دل کو چبھتی رہتی ہیں۔

''سنا یئے ناں کوئی نظم۔'' سونیا نے پھر سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ وہ غنس کر سنانے لگا۔

''اے محبت! تری قسمت کہ تجھے مفت ملے

ہم سے دانا جو کمالات کیا کرتے تھے

خشک مٹی کو بھی عمارات کہا کرتے تھے

اے محبت! یہ ترا بخت کہ بن مول ملے

ہم سے انمول جو ہیروں میں تلا کرتے تھے

ہم سے منہ زور جو بھونچال اُٹھا رکھتے تھے

اے محبت مری! ہم ترے مجرم ٹھہرے

ہم جیسے، جو لوگوں سے سوالات کیا کرتے تھے

ہم جو سو بات کی اک بات کیا کرتے تھے

تری تحویل میں آنے سے ذرا پہلے تک

ہم بھی اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے

ہم بگڑتے تو کئی کام بنا کرتے تھے

اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں

خلقتِ شہر کو زندہ تماشا ٹھہرے

اے محبت! ذرا انداز بدل لے اپنا

تجھ کو آئندہ بھی عشاق کا خوں پینا ہے

ہم تو مر جائیں گے، تجھ کو تو مگر جینا ہے"

"اللہ نہ کرے، شیری بھائی!" سونیا نے بے ساختہ کہا۔ وانیا نے اسی انداز میں گھورا۔ سب نے تیز نظری سے دیکھا اور عاطف بیگ نے خالی آنکھوں سے اس کے چہرے کا طواف کیا۔

"کیا کر دیا ہے سونیا بی بی! میرے دوست کو تو چپ ہی لگا دی ہے۔ کہیں فرمائشوں کی لسٹ تو نہیں ڈال دی ہے اس کی جیب میں؟" شہریار نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی حسرت کی مگر وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

"میں اندر دیکھتا ہوں، ڈنر کے انتظامات کیسے چل رہے ہیں۔"

شہریار نے اسے جانے دیا تھا۔ پھر باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ سب بیٹھے مستقبل کی پلاننگ کر رہے تھے۔ آئندہ دس سال میں کون کیا کرنے والا ہے۔

اور مامون عبدالکریم ہنس پڑا تھا اور سلامہ نے کہا تھا۔ "دس سال میں...... میں نے فیملی پلاننگ کے اشتہار کو ایک نظر بھی نہیں دیکھنا۔"

شہریار، مامون کی ہنسی اب سمجھا تھا۔ شاید دونوں کے درمیان بہت اچھی طرح اس ٹاپک پر گفتگو ہو چکی تھی۔ مامون، سلامہ کے درمیان اس نئے طے رشتے پر شہریار نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مامون حد درجہ جذباتی تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ کوئی اور بھی ہوتا جو اس کی طرح اس سے فرینک ہوتا تا کہ اس کا حادثاتاً تکلیف دہ نہ ہو۔

"کیا سوچنے لگے؟ تم بتاؤ تم آئندہ دس سال میں کیا کرنے والے ہو؟"

شہریار کو ہنسی آنے لگی۔ "آئندہ دس سال......" ایک لمبا سوالیہ نشان۔

"بھائی اتنے نیک ہیں کہ آئندہ دس سال میں بھی نیکیاں ہی کما رہے ہوں گے، مجھے یقین ہے۔" سلامہ نے مامون کے سوال پر جواب نہ دیئے جانے پر جواب گھڑا اور عاطف بیگ جو واش روم میں جا کر

اندر کا ابال نکال کر سرخ انگارہ آنکھوں سمیت واپس آیا تھا، پھر ایک نئی ٹیس سے بکھرنے لگا تھا۔

"تم کیا کرو گے آئندہ دس سال میں؟"

"کتابیں چھاپوں گا۔" رٹا رٹایا جملہ۔

اور مامون نے کہا۔ "اس پر بھی کوئی کتاب چھاپ دینا۔ بہت فیمس ہوگیا ہے اپنا شہریار۔ کوئی بائیوگرافی آنی چاہئے اس کی۔ کل بھی انکل کہہ رہے تھے، میرے شہریار نے بہت چھوٹی سی عمر میں ذمہ داریاں سنبھالنا یوں سیکھ لیا ہے کہ اب مجھے اپنے کندھوں پر کسی ذمہ داری کا بوجھ سوچنا بھی خیال وخواب کی بات لگتی ہے۔"

شہریار کو چائے پیتے پیتے پھندا لگ گیا۔ "پاپا کیا سوچنے لگے تھے؟" سب اپنی باتیں بھول گئے تھے۔ ہڑ بڑا کر اس کا پھندا کھولنے کے جتن کرنے لگے تھے۔

"اوپر دیکھو...... گہرا سانس لو۔"

الگ الگ انفارمیشن۔ وہ بہ دقت سنبھالا لے کر بیٹھ گیا اور مامون نے غصے سے دیکھا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے، چائے کہیں بھاگی جارہی ہے کیا؟ ایک نمبر کے حریص ہو، چائے اور کافی کے معاملے میں۔"

وہ مسکرادیا۔ اور بات وہیں سے شروع ہوگئی جہاں سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی شروع ہو۔

"کیا کرنے والے ہو آئندہ آنے والے دس سالوں میں؟" ولارے پوچھا اور وہ کھردرے لہجے میں بولا۔ "جب آئندہ دس سال ملنے آئیں گے مجھ سے تو دیکھی جائے گی۔ پوچھ لوں گا، جی بتائیے آئندہ آپ نے میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھنا ہے۔"

مامون نے بیٹھتے ہوئے شہریار کے گلے میں بانہیں حمائل کر ڈالی تھیں، پھر لاڈ سے بولا تھا۔ "اتنا پیارا ہے تو، آئندہ کے دس کیا بیس سال بھی ملنے کو آئے تو تجھے بانہوں میں سمیٹ لینے کو مچل جائیں گے۔"

"ہم سے اچھے تو یہ سال ہوئے۔" سلامہ نے شرارت دکھائی اور شہریار نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہا نہیں۔

بات پھر شاعری پر آکر رک گئی تھی اور شافعہ نے اپنی پسند کی نظم سنانے کی اجازت اس اجازت کے ساتھ لی تھی کہ تھوڑی ٹریجڈی ہے، مگر اسے پسند ہے۔

شہریار نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ اس کی آواز کو دیکھنا ہی نہیں، دل سے سننا بھی چاہتا تھا۔ اندر اتار کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس چرا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ارد گرد خاموشی تھی اور شافعہ سنانے لگی تھی۔

”ہو نہ دنیا میں کوئی ہم سا بھی پیاسا لوگو!
جی میں آتی ہے کہ پی جائیں یہ دریا لوگو!
کتنی اس شہر کے گلیوں کی سنی تھیں باتیں
ہم جو آئے تو کسی نے بھی نہ پوچھا لوگو!
اتفاقاً ہی کبھی پر کوئی در تو کھلتا
جھلملاتا پسِ چلمن کوئی سایہ لوگو!
سب کے سب مست رہے اپنے نہاں خانوں میں
کوئی کچھ بات مسافر کی بھی سنتا لوگو!
کسی دامن، کسی آنچل کی ہوا تو ملتی؟
جب سر راہ یہ درماندہ گرا تھا لوگو!
اک تصویر تھی، کیا جانیے کس کی تصویر
نقش موہوم سے اور رنگ اُڑا سا لوگو!
اک آواز تھی، کیا جانیے کس کی آواز
اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا لوگو!

پھر وہی وشت ہے، وحشت کی تنہائی ہے
وحشتِ دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا لوگو!

اس میں ہمت ہے تو در آئے، اُٹھادے یہ حصار"

شہریار نے پہلی بار آنکھ کھول کر شافعہ کو دیکھا اور شافعہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شہریار نے گھبرا کر پھر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کا دل شاید پھر اس کی آنکھوں میں آن بیٹھا تھا اور شافعہ اس کی آنکھوں کی گہرائی سے باقی نظم بھول گئی تھی۔

"یہ تو ادھوری ہے۔"

"مجھے یاد نہیں آ رہی۔" شافعہ نے معذوری ظاہر کی اور شہریار نے کرسی سے ٹیک لگا کر اعصاب ڈھیلے ڈال کر اس نظم کے ادھورے لمحے کو محبت سے تھام لیا۔ آگے سے شہریار نے سرا تھاما تھا۔

"اس میں ہمت ہے تو در آئے، اُٹھادے یہ حصار
اپنے گنبد میں تو در ہے، نہ دریچہ لوگو!
جی کی جی ہی میں رہیں حسرتیں طوفانوں کی
یہ سفینہ تو کنارے ہی پہ ڈوبا لوگو!
آج کی ڈاک سے کیا کوئی لفافہ آیا
کیسی سرگوشیاں کرتے ہو، ارے کیا لوگو!
کوئی پیغام زبانی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا لوگو!

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں، پسارے پاؤں
نیند سی نیند، ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!
ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل، اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو!
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جانا لوگو؟
راہ تکتے ہوئے پھرا سی گئی تھیں آنکھیں
آہ بھرتے ہوئے چھلنی ہوا سینہ لوگو!
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!"
سب مسمرائز ہو گئے تھے۔ یکدم ماموں عبدالکریم کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ تو وہ سب جھوٹ تھا کہ وہ شافعہ کو صرف دوست سمجھتا ہے، محبت نہیں کرتا۔ بس یونہی تصویر مذاق میں والٹ میں رکھی تھی۔ ایک دو دن بعد نکال کر ایشوریہ کی رکھ لی تھی۔
"ہر ہفتے تصویر بدلتا ہوں میری جان!"
"نئے ایڈ پر فنانسر کا پیسہ لگوا کر اپنا کام نکلوا لوں گا۔"
کتنی ہنسی ہنسی میں اس نے یہ سب کہا تھا کہ وہ عدیل بھائی کے سامنے بہت وثوق سے کہہ بیٹھا تھا۔ "اپنا شہریار، شافعہ کے ٹرانس سے نکل آیا ہے۔ پسند کرتا تھا، بہت شدید محبت نہیں تھی یہ۔ اچھا ہے، بھائی

نے خود کو سنبھال لیا ہے۔" اور عدیل بھائی تھے، اس کے خیال پر طنز سے ہنس پڑے تھے۔ طنز کا انداز تھا اس نے اب لگایا تھا ورنہ پہلے سے ان کی ہنسی کچھ عجیب لگی تھی۔ مگر وہ عدیل بھائی کی ہنسی کو کیٹگری نہیں دے سکا تھا اور آج بالکل اچانک وہ ایک لمحے میں اس جھوٹ میں سے سچ نکال لایا تھا۔ اس کے ہاتھ کے دباؤ سے شہریار نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"کہاں کھو گئے تھے؟" سلامہ نے بے یقینی سے سوال کیا اور وہ پزل ہو گیا۔ "بس، ویسے، ہی یہ نظم مجھے ہمیشہ ہی ٹرانس میں لے لیتی ہے۔ پتہ نہیں، یہ نظم ہے یا افسانہ یا افسانے میں چھپا سچ۔ مگر ابن انشاء مجھے اس نظم میں اس طرح مسمرائز کر لیتے ہیں کہ میں اُن کے دل کا درد بھی اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

"جھوٹ......ایک اور جھوٹ۔" مامون عبدالکریم پشت سے ہوتے ہوئے سامنے آن بیٹھا۔

"پلیز، مجھے ایکسپوز مت کرنا۔" جانے یہ شہریار نے کہا بھی تھا یا اس کے اندر کی ہوک اس میں آن بیٹھی تھی کہ مامون نے فوراً باتوں کا رخ اسٹر یجبر اور مومنہ کی شادی کی طرف موڑ دیا۔

"دو ماہ بعد وہ ہماری محفل انجوائے کر سکے گی۔ سلامہ اور شافعہ کی شادی میں شامل نہیں ہو سکے گی۔" سلامہ نے اس کی باتوں کا ساتھ دیا، اس کی عدت کی مدت انگلیوں پر گنی اور پھر بڑی پارٹی کے آ جانے پر باتوں کا رخ مدبرانہ ہو گیا۔

عاطف بیگ اپنے اندر گم تھا۔

اور شافعہ اس منظر میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

یہاں تک کہ اس نے عاطف پر چھاپہ مارا تھا۔ "کون ہے وہ، جسے شہریار صاحب چاہتے ہیں اور وہ انہیں نہیں پسند کرتی؟"

"پتہ نہیں۔ دل کی واردات تو دل میں رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر، وہ کون ہے؟"

"آپ تو ان کے اتنے اچھے دوست ہیں۔"

عاطف نے ویٹر سے لے کر پلیٹ میں چکن ڈالا تھا اور نرمی سے بولا تھا۔ "اس میں کیا رکھا ہے مس شافعہ! کہ وہ لڑکی کون تھی۔ رہی دوستی کی بات تو میں کبھی اچھا دوست نہیں رہا۔ ہاں، بس شہریار شروع سے ہمارا دوست رہا ہے۔ جو دوستی کا تعلق ہے وہ صرف شیری نے مضبوطی سے باندھ رکھا ہے۔ ہم لوگ تو کبھی کبھی اس کے حق میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔ مگر وہ ہمیں کبھی نہیں بھولتا۔"

شافعہ نے اسی سلسلے میں سلامہ سے بھی بات کی مگر کوئی جواب نہیں ملا تھا۔
اور کھانے کا دور یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ عدیل عبدالرحمٰن نے اسے جالیا تھا۔
"بہت خوش لگ رہے ہو۔"
"لگ رہا ہوں؟...... جناب! میں واقعی بہت خوش ہوں۔ نہ صرف ان دونوں کے لئے، بلکہ راحم یوسفی اور مومنہ کے تعلق پر بھی دل گارڈن گارڈن ہے۔"
عدیل عبدالرحمٰن نے محبت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر باتوں کا دور چلا تو عدیل عبدالرحمٰن نے برسبیل تذکرہ کہا۔ "یوسفی احمر اس شادی سے بہت ناخوش ہیں، لیکن بہرحال وہ اب خوش ہوں یا ناخوش، آج کل جیل کی ہوا کھا رہے ہیں، اس لئے ان کا احتجاج اپنی موت آپ مر چکا ہے۔"
شہریار ہنس پڑا تھا، پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "صدمہ تو بہت برا ہوا ہوگا، اسٹریجر کا اتنے قریب ہونے کا راز جان کر۔"
عدیل عبدالرحمٰن جواباً مسکرانے لگے، پھر نرمی سے بولے۔ "یہ بات صرف باپ بیٹے کے درمیان ہے کہ کون اندر کا بھیدی تھا، جو انہیں لوٹتا رہا۔ مامون کی کارکردگی کی وجہ سے زوار حسن، حسن امداد ایم، افضال سب اپنے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے جیل کی ہوا کھا رہے ہیں اور انٹرنیٹ پر جاری رپورٹ کی وجہ سے بہت سے اوپر کے لوگ بھی اب ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس وقت جو ان کی مدد کو آئے گا، وہ اس ہاٹ اسکینڈل کا حصہ بن جائے گا۔"
"ویری گڈ آپ لوگ تو کافی عقلمند نہیں ہو گئے ہیں؟" شہریار نے طرح دی اور عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے کندھے پر ہلکا سا مکا مارا۔ یہ اور بات کہ وہ پوری جان سے ہل گیا تھا۔
"تم ٹھیک ہو ناں؟...... آئی ایم سوری، میں بھول گیا تھا کہ......"
شہریار نے خفگی سے ان کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "اب آپ تو مجھے پلیز بور مت کریں بڑے بھیا! آپ پر دلیری والا رول سوٹ کرتا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں، کوئی بھی حادثہ ہو، میں آپ کو باہمت دیکھنا چاہتا ہوں۔"
عدیل عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولے اور وہ ان سے باتیں کرتا آگے بڑھ گیا۔ پھر کار میں بیٹھنے والا تھا کہ مامون نے خطرناکی سے اس کے کوٹ کی جیب پر ہلہ بولا تھا۔

”کیا ہے ڈاکو!“ وہ خفا ہو کر مڑا مگر اس کی کارروائی کی وجہ اس وقت سمجھا، جب اس نے اس کا والٹ کھول لیا تھا۔

”تو یہ تصویر ابھی تک تیرے والٹ میں ہے۔ سچ بتا، کیا حقیقت ہے؟“

اس نے نظر نہیں چرائی تھی۔ جھوٹ بہت صفائی سے بولتا تھا۔ اس نے کار سے ٹیک لگائی تھی۔ ”ایویں کسی غلط فہمی میں مت پڑنا۔ تجھے تو پتہ ہے میں کتنا وکھرا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، تُو کتنا وکھرا ہے۔ مگر اب میں تیرے داؤ گھات میں نہیں آؤں گا۔ خوامخواہ سائیڈ ہیرو بننے کی کوشش مت کر۔“

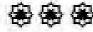
وہ کچھ کہنے والا تھا کہ اسے پشت پر شافعہ کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”شہریار صاحب! یہ فائل آپ اندر بھول گئے تھے۔“

وہ مڑا اور نرمی سے اس کے ہاتھ سے فائل تھام لی۔ یہ فائل وہ دفتر سے آنے کی وجہ سے سیدھا ساتھ ہی لیتا آرہا تھا۔ کچھ باتوں پر اسے سلامہ کے کمنٹ چاہئیں تھے کیونکہ جس کمپنی سے وہ بزنس کرنے کی بابت سوچ رہا تھا، وہ گروپ آف کمپنیز آج کل سلامہ کے ہوم ورک کی زد میں تھی اور وہ یہاں یہ فائل اس لئے ہی لایا تھا کہ سلامہ سے اس پر رائے لی جا سکے۔ سلامہ نے ابتدائی معلومات کے تحت اس بزنس ڈیل کو پوسٹ پونڈ کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ شافعہ وہی فائل لے کر آئی تھی۔ شہریار فائل لے کر اختتامی جملے سوچ رہا تھا۔ رخصت ہونے کے بالکل اچانک شافعہ نے اسے ٹریپ کر لیا۔

”آپ اتنی شدت سے کس سے محبت کرتے ہیں کہ جب وہ آپ کے سامنے نہیں ہوتی تو آپ کی آنکھ میں آن بیٹھتی ہے، آپ کے دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔ اور جب آپ کے اندر ہوتی ہوگی تو آپ اس کو اپنے اندر جینے کے لئے فری ہینڈ دے دیتے ہیں کہ وہ جیسے چاہے، آپ کے اندر سانس لے، آپ کے اندر جیے۔ کون ہے وہ لڑکی؟......وہ خوش قسمت لڑکی، جسے آپ جیسا ڈیشنگ مین محبت کرتا ہے۔“

”محبت......“ شہریار ہنسا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ”عشق کرتا ہوں میں اس لڑکی سے، مگر وہ بھی مجھے میری طرح چاہے، میں نے یہ کبھی آس نہیں لگائی۔ محبت اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ مگر وہ ایسی لڑکی ہے کہ دل خود بخود اس کی محبت کے گھر میں دیے کی طرح جل اُٹھتا ہے اور دیے کا کام تو جلنا ہوتا ہے ناں مس شافی! اندھیرا دور کرنے کی ہلکی سی سعی کا کام ہے محبت اور بس میں اسی محبت کا دم بھرتا ہوں۔ رہا سوال وہ کون ہے تو اسے جانے دیجئے ناں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں وہ اس سے آشنا بھی نہیں ہے کہ کوئی محبت سے بھی زیادہ ٹوٹ کر اسے چاہتا ہے۔ اور یہ چپ کی زبان میں کسی کو پکارنا، خاموشی کے سمندر میں اُتر کر ڈوب جانا، یہ ذراہم جیسے وکھرے لوگوں ہی کا کام ہے۔“

مامون خاموشی سے اسے دیکھے گیا اور پھر سارے راستے اس نے شہریار سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شہریار خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔



آج اس نے عافیہ بیگم کے سامنے، بہت اچانک اپنی ایک دوست کے گھر جانے کی ضد کی تھی۔

"کون ہے وہ دوست؟ کیا میں اسے جانتی ہوں؟"

"نہیں مام! آپ اسے نہیں جانتیں۔ بس اسے صرف میں جانتی ہوں یا پھر میرے سینے میں نُولی دیا گیا میرا دل۔ کچھ دکھ ہیں، جو مجھے اس سے کہنے ہیں مام! کچھ باتیں ہیں، جو صرف وہ ہی میرے اندر اتری ہوئی خاموشی سے مل کر رازدار سہیلی کی طرح کہہ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تم اکیلی جاؤ گی؟" بیگم عافیہ نے نیا سوال داغا اور وہ پھیکی ہنسی ہنس کے چپ ہوگئی۔

"میں اکیلی نہیں ہوں مام! میرے شیرازی کی محبت میرے ساتھ ہے۔ سچ پوچھئے تو ابھی ہی جان پائی ہوں کہ شیرازی کی محبت میرے لئے کیسا دائرہ تھی۔ امان و عافیت کا گہرا دائرہ، جس سے زندگی کی کٹھنائیاں ٹکرا کر چور چور ہو جاتی تھیں۔"

"میں کہہ رہی تھی، اگر میں تمہارے ساتھ چلوں تو؟"

"سوری مام! میں آج خود سے اور اس سے بالکل تنہا ملنا چاہوں گی۔ پتہ نہیں مام! یہ تنہا ہونے سے غم زیادہ بڑھنے لگتے ہیں یا غموں کی وجہ سے انسان تنہا دکھائی دینے لگتا ہے، آپ کو کیا لگتا ہے مام؟"

بیگم عافیہ نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"تم تنہا نہیں ہو میری جان! ہر موڑ، ہر دکھ پر ہم مل کر اکٹھے اس دکھ سے لڑیں گے۔ مگر میں یہ کیوں کہہ رہی ہوں۔ جانے! میری تو دعا ہے اب کوئی دکھ تیرے دل کی زمین کو چھو کر بھی نہ گزرے۔"

"میرا دل ماں؟" وہ بے یقینی سے بولی، پھر بھرائے لہجے میں بولی۔ "پتہ نہیں اس سینے میں اب کہیں دل کا واہمہ بچا بھی ہے یا محض خلا ہی خلا ہے میرے اندر...... میرے پیر زمین پر ہیں یا کسی منزل کی طلب میں سفر کا ذائقہ چکھ رہے ہیں۔ مگر ایک عجیب سی تھکن ہے، جو پورے وجود میں پھیلتی چلی جا رہی ہے۔"

بیگم عافیہ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ سبک قدموں سے چلتی ہوئی باہر کی سمت بڑھ گئی۔



سالار عبدالرحمٰن ابھی ابھی دفتر میں آکر بیٹھے تھے۔ایک عجیب طرح کی خاموشی ان کے اندر چپکے سے آن بیٹھی تھی۔پتہ نہیں کون سی بات تھی، جو دھیرے دھیرے ان کے خون میں یہاں سے وہاں تیرتی پھر رہی تھی۔آج بہت غیر متوقع انہوں نے مام کو شہریار کے لئے ناشتہ سرو کرتے دیکھا تھا اور بہت غیر متوقع ان کی نظر اس کے چہرے پر آکر اٹک گئی تھی۔بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسے نظر انداز کر دیں، مگر نظر اس سے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔اُداسی، تھکن کیا تھا، جو اس کے چہرے پر اس وقت ثبت نہ تھا۔وہ ڈائننگ روم کے بالکل سامنے والی کھڑکی سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئے تھے۔

مام نے اسے پیار کیا تھا۔وہ کچھ کہہ رہا تھا ان سے۔مام اس کے لئے چائے انڈیل رہی تھیں مگر وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہونے کی ضد کر رہا تھا۔مام نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر رکھ دیا تھا اور بس، یہی وہ لمحہ تھا، جسے وہ بھول نہیں پا رہے تھے۔کچھ دن پہلے والی بات ان کے اندر او دھم مچا رہی تھی۔

انہوں نے عائشہ سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی یہ جانے کہ اچانک انہیں شہریار کی اُداسی ہانٹ کرنے لگی ہے۔چپ اس کی ہے مگر شور ان میں مچ رہا تھا۔وہ بالکل ساکت بیٹھے اپنی کرسی پر جھول رہے تھے کہ ٹیلی فون کی بیل سے ان کی توجہ مرکز سے ہٹ کر کمرے کے اندر ٹھہر گئی تھی۔

”ٹھیک ہے بلوائیے۔“انہوں نے خاموشی کو مربوط انداز میں توڑا تھا، پھر چند سیکنڈ بعد سر عبدالرحمٰن کی آواز سماعت میں پھیل رہی تھی۔

”مسٹر سالار! کیا آپ مس زرش کے گھر تعزیت کے لئے گئے ہیں؟ وہ ہماری ایک بہترین ماڈل تھیں۔“

”سوری پاپا! مجھے موقع نہیں ملا تھا۔کچھ بہت ضروری کام تھے، جن کی وجہ سے میں ابھی تک تعزیت کے لئے نہیں جا سکا۔“

”تو اس وقت سارے کام چھوڑ دیئے اور مس زرش کے گھر جا کر تعزیت کیجئے۔“

”جی ٹھیک ہے پاپا! میں جاتا ہوں ابھی۔“انہوں نے آتے ہی کافی کا آرڈر پاس کیا تھا اس لئے وہ کافی کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔

پیون کافی رکھ کر جا چکا تھا۔انہوں نے کپ اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تھا کہ اچانک شہریار نے آکر ان کے سامنے رکھا ہوا کپ اُٹھا لیا تھا۔

”کافی اکیلے پینے میں مزہ نہیں آتا سنی بھائی! کافی میں محبت اور دوستی کا ایوری ڈے ملاؤ تو ہی مزہ آتا ہے۔“

"بکومت۔ میرا کپ واپس کرو۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔
وہ ہنسا۔ پھر شرارت سے بولا۔ "آپ پیدا ہی بدمزاج ہوئے تھے یا یہ دنیا میں آنے کے بعد اتنی خوش مزاجی آئی ہے آپ میں؟"
انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے کافی سے دو گھونٹ بھر لئے تھے۔
"اب یہ کافی تم خود ہی پیو۔ تم جانتے ہو، مجھے جھوٹا کھانے پینے کی عادت نہیں۔"
"یہی تو غلطی ہے آپ کی۔ اگر آپ یہ کافی پی لیتے تو محبت کا تجربہ ہو جاتے۔"
"بکواس مت کرو۔" وہ زور سے چیخے۔ اور بس اچانک انہیں لگا، جیسے ان کے اس طرح چیخنے سے سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ کافی سامنے پڑی تھی۔ شہریار کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے کپ آگے سرکایا۔ کپ اسی مقدار سے لبریز تھا۔
'یہ میں اتنا کیوں حساس ہوتا جا رہا ہوں؟ وہ بھی اُس کے لئے، شہریار کے لئے، جس سے میں دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں، جس کے لئے میں نے سب سے زیادہ مرنے کی دعائیں مانگی ہیں۔'
وہ کافی پیے بغیر اُٹھ گئے تھے۔ پھر ان کا رخ زرش کے گھر کی طرف تھا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا، ایسا کوئی ذی شعور نہیں، جس سے وہ تعزیت کے دو لفظ کہہ سکتے۔
"آپ ثانیہ میم سے مل لیجیے سر! اس گھر میں بڑے صاحب بھی اپنے حواسوں میں نہیں ہیں، اور بیگم صاحبہ بھی اپنا رابطہ دنیا سے توڑ چکی ہیں۔ ہر وقت ٹنکو لائزر کے زیر اثر سوتی رہتی ہیں۔ پلیز، آپ میم ثانیہ سے مل لیں۔" انہوں نے رابطہ کا ذریعہ پوچھا تو ملازم اس کا موبائل نمبر اور اس کے فلیٹ کا پتہ لکھوانے لگا تھا۔
"آج ہی میم ثانیہ اپنے پرانے فلیٹ گئی ہیں، اپنا کچھ ضروری سامان لانے کے لئے۔"
وہ ثانیہ کا نمبر لے کر موبائل میں سیو کرنے لگے تھے۔ پھر اُٹھ کر باہر نکلے تھے کہ اچانک ان کے وجود نے کسی کے ہونے کا احساس چاہا تھا۔
انہوں نے سامنے نظر ڈالی تھی اور ساکت رہ گئے تھے۔ جانا نداج مین سے سوال جواب کر رہی تھی۔ وہ یک ٹک اُسے دیکھے جا رہے تھے۔
پھر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تھی اور سالار عبدالرحمن نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گاڑی کا تعاقب کرنے لگے تھے۔ کیا اتنے برس بعد بھی جانا نہ کی ذات ان پر اتنی حاوی تھی کہ وہ اپنا اصل کام چھوڑ کر اس

کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے؟

پھر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا تھا، جب ملازم کے بتائے ہوئے فلیٹ کے سامنے پارکنگ ایریا میں جانانہ نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ وہ جانانہ کے جانے کے دس منٹ بعد گاڑی سے باہر نکلے تھے۔ پھر ان کو سمجھ نہیں آرہی تھی، وہ یہاں تعزیت کرنے کے لئے آئے تھے یا جانانہ کو پھر سے اپنے قریب دیکھنے کے لئے، مگر وہ کیسے اندر داخل ہوسکتے تھے۔ انہوں نے یکبارگی سوچا اور دستک کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ مگر دروازے کو ہاتھ لگایا تھا کہ وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہوگئے تھے۔ مگر راہداری سے گزر کر وہ ڈرائنگ روم میں آئے مگر وہ دونوں وہاں نہیں تھیں۔ انہوں نے قدم آگے بڑھائے اور ایک کمرے سے آتی آوازوں نے ان کے قدم روک لئے تھے۔



جانانہ فلیٹ کی بیل بجا کر خاموش کھڑی تھی جب اچانک ثانیہ کے ساتھ آئے ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔ جانانہ اس کے اندر آنے کا عندیہ ملے بغیر اندر داخل ہوگئی تھی۔ ثانیہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔

"جانے!تو یہاں؟....... تجھے کس نے بتایا میری بربادی کا پتہ؟"

"کسی نے نہیں۔ میں تو اپنی بربادی کے نقش قدم پر پیر رکھتی تجھ تک آئی ہوں۔ ہم دو دل جو محبت تلاش کرنے نکلے تھے، اس محبت نے ہمیں کیسا گمنام کرکے تشنہ کام مارا ہے۔"

ثانیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے ملازم کو باہر بھجیا تھا اور ثانیہ کو لے کر اپنے روم میں چلی آئی تھی۔ جانانہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی شہریار کی تصویر دیکھ کر اسے پُرشکوہ انداز سے دیکھا تھا۔ "تمہاری اور میری زندگی ہم دونوں کے گرد شہریار کی ذات دائرے کی طرح کھینچ رکھی تھی وقت نے۔ اور آج بھی ہم اسی کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ پتہ نہیں، شہریار نے ہمیں برباد کیا، یا ہم نے شہریار کو۔"

ثانیہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی مگر جانانہ اس کی نمی سے بے پروا اپنا کتھارسس کرنے لگی تھی۔ "جب سے میں نے شعور کی آنکھ سے دیکھنا شروع کیا، مجھے میری ماں نے سرعدیل عبدالرحمٰن سے نفرت کا سبق دیا۔ انہوں نے کہا یہ وہ آدمی ہے، جس نے میری ماں کی سادگی سے کھیلا تھا، جو مجھے دنیا میں لایا تھا مگر اپنا نام نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا، تمہیں اسے دکھ دینا ہے۔ ایسا دکھ کہ لفظ دکھ بھی چھوٹا لگے اس اذیت کے مقابلے میں جو اس شخص کی روح کو ملے۔ میں نے ماں کی کہی کو ان سنی کیا کیونکہ میں ان لمحوں میں محبت جی رہی تھی۔ شیرازی کے ساتھ محبت تو چھلک رہی تھی۔ شیرازی میرے لئے زندگی کی علامت

تھا۔تب میری ماں نے پھر مجھے شیرازی سے نامحسوس طور پر سر عبدالرحمٰن کی نفرت کی طرف گھسیٹا۔ میں نے شیرازی سے کہا تو وہ مجھے سمجھانے لگا تھا۔اس نے کہا اگر جو تمہاری ماں کہتی ہے کہ وہ سچ ہے تو وہ تمہارا باپ ہے اور تم باپ سے کیسے بدلہ چکاؤ گی؟ کیا تمہاری روح گوارا کرے گی؟ میں نے سوچا اور دل سے کہا، میں کتنی بھی بری ہوں، کتنی بھی...... اپنے باپ کو کیسے چیٹ کروں؟ ماں نے جو شہریار کا نام دیا ہے، اس رشتے کو کیسے مٹی میں ملواؤں؟ نفرت بجا سہی، مگر ایک تقدس کا رشتہ تو تھا میرے اور شہریار کے بیچ۔ پھر یوں ہوا، شیرازی مجھ سے کھو گیا۔ مجھے ٹھیک اور غلط کا صحیح فرق بتانے والا کھو گیا۔

میں اذیت کی اس چٹان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو رہی تھی، جب مجھے تمہاری یاد آئی تھی۔ میں تم سے ملنے گئی تھی، مگر تم نے خواب آور گولیاں کھا کر مرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے تمہیں بچانے کی بہت کوشش کی مگر تم اندر سے مرگئی تھیں اور میں تمہارے ظاہری وجود کو سمیٹ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا، مجھے تمہارے مرنے کی اطلاع ملی اور میں تمہاری لاش سے جب پہلی بار ملی تو مجھے لگا، میں نے پہلی بار موت کو اتنے بھیانک انداز میں دیکھا تھا۔ شہریار اسٹریچر کی دوسری طرف کھڑا تھا اور میں نے سوچا تھا، جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔

کوئی رشتہ بھی ہو، وہ میری نفرت کے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اوور ڈرنکس ہو گئی تھی کیونکہ میں ایک غلط کام کر رہی تھی اور ہوشمندی سوال اٹھاتی تھی مجھ سے۔ میں نے سالار عبدالرحمٰن کو ٹریپ کیا۔ وہ معصوم انسان میری چال کو محبت سمجھا اور میں نے بھی یہی چاہا، وہ اسے محبت سمجھے۔ کیونکہ میں شہریار کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ اور وہی ہوا۔ وہ عائشہ کے لئے مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ سمجھتا تھا، وہ مجھے ٹریپ کر رہا ہے اور میں اس پر چالیں چلتی رہی۔ مگر اب اچانک کہانی بدل گئی ہے۔

میں نے جیسے دل کا سارا زہر نکال دیا۔ وہ اب بھی کہتا ہے، میں نے تمہیں معاف کیا۔ اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ کہانی کیوں بدل گئی؟ سر عبدالرحمٰن۔ وہ تو عزت کے اعلیٰ مقام پر کھڑے ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں تھی، مگر سمجھتی تھی میری انگلیوں پر زندگی کے سارے دھاگے ٹھیک لپٹے ہیں، میں بہت اچھا تماشا دکھا سکتی ہوں۔ مگر زندگی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے سب کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور کہا، تماشہ یہ ہے۔ اور اب زندگی مجھ پر ہنس رہی ہے ثانی! وہ شہریار، اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ وہ اگر اتنا ہی اچھا تھا تو اس نے تمہارے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا تھا؟ تمہیں دھوکا کیوں دیا تھا؟"

ثانیہ نے شہریار کی تصویر کو ہاتھ میں لیا تھا اور عینی کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"مجھے علی سے محبت تھی۔ میں اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور تمہاری ماں نے میری اس کمزوری سے خوب کھیلا تھا۔ اس عورت نے کہا، میں تمہیں علی دلا سکتی ہوں، ساری عمر کے لئے۔ اور بس میں خواب کی حالت میں نیند میں چلنے لگی۔ میں نے سالار کے ہاں نوکری کی، بہت سے مواقع پر اپنی اور ان کی تصویریں کھنچوائیں اور تم جب مجھ سے ملتی تھیں، میں تم سے شہریار کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ میں ایک تیر

سے دوشکار کر رہی تھی۔ میں سالار کے معاملے کو شہریار کے سامنے رکھتی چلی گئی تھی اور تمہارے سامنے شہریار کو اپنے ساتھ کئی مواقع پر جان کر پوائنٹ آؤٹ کیا تھا۔ میں نے یتیم خانے بچی لی تھی اور سالار کے نام پر شہریار سے اس بچی کی ذمہ داری کا معاملہ اُٹھایا تھا۔ وہ سادگی سے میرے ٹریپ میں آ گیا تھا۔ اور میں اصل میں علی کے لئے پاگل پن میں آگے سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور پھر میں نے سطوت جہاں کے کہنے پر سالار کے ڈرامے کا ڈراپ سین کیا اور تم جو پہلے سے شیرازی کی بے وفائی سے تڑپ رہی تھیں، میری اس ناکام محبت پر تن کر سامنے آ گئیں اور ان لمحوں میں مجھے نہ تم سے کوئی مطلب تھا، نہ سالار سے، نہ شہریار سے۔ مجھے میرا علی چھوڑ کر جا چکا تھا اور تنہائی اور خیرات کی طرح کی گئی محبت میری جھولی سے کوئی اُڑا کے لے گیا تھا۔

دنیا میرے لئے ختم ہو گئی تھی۔ قیامت سے پہلے اِک قیامت تھی جو میری زندگی میں در آئی تھی۔ نہ مجھے جنت کا دھیان تھا، نہ جہنم کا خوف۔ میرے دونوں ہاتھ خالی تھے اور ان خالی ہاتھوں میں علی کے نام کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ اس کی محبت تو کیا اس کی نفرت بھی نہیں تھی میرے حصے میں۔ اور آج برسوں بعد جب کہ میں خاک میں خاک ہونے جا رہی ہوں تو وہ شہریار کہتا ہے، میں نے آپ کو معاف کیا، بس ثانیہ! میرا دل تو اتنا ظالم ہے کہ اگر کوئی مجھ سے محبت چھوڑ کر نفرت کرنے لگتا ہے تو میرا دل محبت سے اس نفرت سے بھی محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میرا کوئی خون بہا نہیں آپ پر...... جانے! اُس کی یہ عام معافی، اس نے مجھے کانچ پر چلنے جیسی اذیت بخشی ہے، جیسے کوئی جنگ پر نکلے اور فتح کرنے کے بعد مفتوح شہر اور اس کے باسیوں کے لئے عام معافی کا حکم دے دے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے، وہ مجھے معاف نہ کرے بلکہ سُولی چڑھائے۔ بار بار سزائے موت دے، پھر دار پر کھینچے، پھر لٹکائے۔ اور اس سزا کا کوئی انت نہ ہو۔''

جانانہ کے چہرے پر دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ ثانیہ کے وجود کو بھی ندامت کے آنسوؤں نے بھگو دیا تھا اور دروازے کے دوسری طرف سالار عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ بالکل ساکت و جامد۔

''آپ کون ہیں؟ اندر کیسے آئے؟''

سالار عبدالرحمٰن مڑے اور ملازم کا انداز مؤدبانہ ہو گیا۔

''اوہ، آپ ہیں سر! میں اندر اطلاع بھیج دوں کہ آپ آئے ہیں؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بہت خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔ پھر گاڑی میں بیٹھتے تو بار بار نمی آنکھ میں پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کی گاڑی تیز رفتاری سے اُڑی جا رہی تھی۔ پھر گاڑی پورٹیکو میں رکی تھی اور وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ شہریار نے نانو کے کمرے میں جاتے ہوئے سالار عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔

اور سالار عبدالرحمٰن.......انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔
وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھے تھے، پھر عائشہ سے کچھ پوچھنے کے بجائے انہوں نے الماری کھولی تھی اور عائشہ کی الماری میں پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہے تھے۔
''کیا چاہیے؟ مجھے بتائیے، کیا تلاش کر رہے ہیں؟''
انہوں نے بولے بغیر الماری کھنگال لی تھی اور پھر ان کی انگلیوں کی پوروں کو کسی چیز نے چھوا تھا۔ انہوں نے ہاتھ باہر نکالا تھا اور جانانہ کا فوٹوگراف ان کی پوروں میں اٹکا ہوا تھا۔
''تم جانانہ کو کب سے جانتی ہو؟'' عائشہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں تم جانانہ کو کب سے جانتی ہو؟''
''جب سے وہ آپ کی زندگی میں در آئی تھی۔'' انہوں نے تیکھے ابرو سے دیکھا، مگر جواب عائشہ نے نہیں، رابعہ بھابی نے دیا تھا۔
''تم نے شیری کو کہا تھا کہ وہ......'' وہ چپ ہو گئے اور رابعہ بھابی مدھم لہجے میں بولیں۔
''ہم دونوں میں سے کسی نے شہریار کو نہیں کہا تھا۔ عائشہ کے آنسوؤں اور عدیل کی محبت کے چھینے سے بچانے کے لئے شہریار نے یہ داؤ کھیلا۔ اس نے وہ دیکھ لیا، جو آپ نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ اس نے اپنی ذات، اپنے بھرم کو میرے اور عائشہ کی دل کی خوشی پر وار دیا اور سنی بھائی! یہ آپ نہیں سمجھ سکے۔ آپ ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکے تھے، نہ ہی شاید سمجھیں گے۔''
عائشہ نے خوف سے رابعہ کو دیکھا تھا مگر وہ اپنی بات کہہ کر ہی چپ ہوئی تھیں۔
سالار عبدالرحمٰن نے یہ ڈن لیا تھا۔ مگر دہلیز پر شہریار کو دیکھ کر سالار عبدالرحمٰن کے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔
''مجھے ثانیہ کا فون آیا تھا۔ خیریت تو ہے سنی بھائی؟ آپ اتنے اچانک گھر کیوں آئے ہیں؟''
سالار عبدالرحمٰن کچھ کہے بغیر اسے راستے سے ہٹاتے باہر نکل گئے تھے۔ گھر میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس کی گاڑی دانیا کو یونیورسٹی لے کر گئی تھی۔ مگر وہ گھبرا کر پھر بھی ان کے پیچھے دوڑا تھا۔
''سنی بھائی! پلیز، مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ اس ساری چویشن میں میرا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ پاپا کے سارے بچے خوش رہیں۔ سنی بھائی......!'' وہ ان کی گاڑی تک بھاگ کر گیا تھا مگر چوکیدار نے پھاٹک کھول دیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ تھک کر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ کیا کرے، کہ یکدم اسے عدیل بھائی کا خیال آیا تھا۔
اس نے ان کا نمبر ملایا تھا۔ بیس منٹ میں وہ گھر میں تھے۔ رابعہ پوری واقعاتی تفصیل بتا رہی تھیں اور مامون ان کے ٹِک مارک کیے نمبرز پر ان کے متعلق تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ شہریار کو دانیا، مام اور جازی سب مطمئن رہنے کو کہہ رہے تھے۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ سالار بھائی بہت جذباتی انسان ہیں، کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔
پھر یہ تیسرا دن تھا، جب دانیا کے فون پر کال آئی تھی۔
"ہیلو!" گہرے گہرے سانس سن کر وہ یکدم تیزی سے بولی تھی۔ "سنی بھائی!"
عدیل بھائی قریب آ گئے تھے اور اشارہ کر رہے تھے کہ وہ رکے نہیں۔
"آپ...... آپ کہاں ہیں سنی بھائی؟"
"پتہ نہیں میں کہاں ہوں، کہاں نہیں۔ مگر دانی! میرا دل چاہتا ہے میں ایک دم سے سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ وہ ساری بددعائیں جو میں نے شیری کو دی ہیں، وہ ساری بددعائیں ایک دم سے مجھے آ کر لگ جائیں۔ شیری نے میرے لئے، تمہارے لئے، عدیل کے لئے سب کے لئے کیسے کیسے نہیں خود کو مٹا دیا اور میں...... میں اُس کی محبت کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ مامون واقعی ایسا انسان ہے جو تمہیں وہ خوشیاں دے سکتا ہے، جو میرے حاشیہ سوچ میں تھیں دانیا! مگر میں...... میں کیا کروں؟"
"سنی بھائی! آپ...... آپ گھر آ جائیں۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ شہریار کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی تھی اور اسپیکر سے آواز کی جگہ اب گہری ہلکی سانسیں گونج رہی تھیں۔ "سنی بھائی! آپ...... آپ ٹھیک تو ہیں؟"
وہ کچھ نہیں بولے تھے اور عدیل بھائی نے شہریار کو اشارہ کیا تھا۔
ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جا رہی تھی۔ انہوں نے موبائل کمپنی کو خاص احکامات کے ذریعے لوکیشن جانچنے کا کہا تھا اور پندرہ منٹ میں کمپیوٹر سے لوکیشن علم میں آ چکی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک فلیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

شہریار کا سانس بہت تیز تیز چل رہا تھا۔

''پہلے آپ اندر جائیں۔ مجھے دیکھ کر پتہ نہیں ان کا کیا ردعمل ہو۔''

عدیل بھائی نے دستک دی تھی، مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔

عدیل عبدالرحمن نے جیب سے ماسٹر کی نکالی تھی۔ اور دو منٹ بعد وہ اندر تھے۔ پھر جو منظر انہوں نے دیکھا، وہ مضبوط اعصاب کے باوجود ہل گئے تھے۔

''ڈونٹ شوٹ سنی!''

سالار عبدالرحمن نے بہت بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

''بزدل...... بہت بزدل ہوں میں۔ آج اس وقت اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے ہیں مجھے، مگر میں ابھی تک خود کو شوٹ نہیں کر پایا ہوں۔ میں مرجانا چاہتا ہوں مگر مر نہیں پا رہا۔ میرا دل بھی ٹھیک ہے اور میرے دماغ کی رگ بھی نہیں پھٹی۔ عدیل! موت...... موت بھی مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ مجھ جیسے انسان سے وہ بھی دور بھاگتی ہے اور...... اور یہ اس کا حق ہے۔ مجھ سے سب کو نفرت کرنی چاہیے کیونکہ میں خود بھی اپنے آپ سے نفرت کرتا ہوں اب۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں شیری کا سامنا کر سکوں۔'' ان کا سر جھکا ہوا تھا کہ یکدم ان کے کندھوں پر کسی نے ہاتھ رکھے تھے۔

سالار عبدالرحمن نے سر اٹھایا تھا اور شہریار کو اپنے قدموں میں بیٹھے پایا تھا۔

''سنی بھائی! مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ جو کچھ بھی تھا، وہ سب پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ ادھر دیکھیے، میری طرف۔ ان آنکھوں میں کہیں آپ کو اپنے لئے محبت کم نظر آتی ہے؟''

سالار عبدالرحمن کی نظر اس کے چہرے پر ٹک گئی تھی۔ اور اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''جو کچھ ہوا، اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ خود سے نفرت کرنے لگیں۔ آپ سے زیادہ میں نے کسی کو اتنا محبت کے لئے جذباتی نہیں دیکھا۔ آپ دانیا کے لئے جب مجھ سے لڑتے تھے تو مجھے دانیا کی قسمت پر رشک آتا تھا کہ اسے آپ جیسا محبت کرنے والا بھائی ملا ہے، جو ساری دنیا سے اس کے لئے لڑ سکتا ہے۔ مجھے خود سے محبت ہونے لگتی تھی کہ آپ کے لڑنے جھگڑنے میں، خفا ہونے میں اتنی توجہ ہوتی تھی کہ اتنی توجہ تو کبھی عدیل بھائی سے نہیں ملی مجھے۔'' وہ لفظوں سے دل بنا رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمن اس کی ذہانت پر خاموش کھڑے تھے اور سالار عبدالرحمن، وہ یک ٹک

بس اسے دیکھے جا رہے تھے اور وہ تھوڑا سا اور مدھم ہو کر بولا۔

”جتنا لڑے جھگڑے ہیں، اتنی محبت بھی اپنے حصے کی چاہوں گا۔ دیں گے اپنی محبت؟ جزا کے لئے ہی سہی، مجھ سے محبت کرنے کا رسک لیں گے؟“

سالار عبدالرحمٰن کی آنکھ میں نم پھیلنے لگا تھا۔

”دیکھئے، اتنا برا بھی نہیں ہوں۔ آپ کی محبت کو بہت جینٹل مین، سنبھال کر رکھوں گا۔“ اس نے ان کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دی تھیں، کھینچ کر خود سے چمٹا لیا تھا اور سالار عبدالرحمٰن جو ضبط کیے بیٹھے تھے، وہ نم یکدم شہریار کے کندھے کو گیلا کرنے لگا تھا۔ وہ زمین آسمان ایک کر کے رو رہے تھے۔ شہریار اور عدیل عبدالرحمٰن نے انہیں رونے دیا تھا۔ پھر سالار عبدالرحمٰن خود چپ ہوئے تھے۔

”اب چلیں گھر۔ سب پریشان ہوں گے۔ عائشہ بھابی، مام، پاپا، دانیا کوئی بھی دو راتوں سے سویا نہیں ہے اور اس وقت بھی شام کے چھ بج رہے ہیں۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر سالار عبدالرحمٰن کو کھڑا کیا تھا۔ پھر تینوں ایک ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے اور شہریار شوخی سے بولا تھا۔

”میں سنی بھائی کے ساتھ بیٹھوں گا۔ آج جی بھر کر محبت سمیٹنی ہے ان کی۔ عائشہ بھابی کو تو انگور تھوڑی دوں گا، تھوڑا پرانا کر کے دوں گا۔“

سالار عبدالرحمٰن کے ہونٹوں کو خوب صورت سی مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

وہ ان کے برابر بیٹھا تھا اور اس نے سالار عبدالرحمٰن کا موبائل کوٹ کی جیب سے نکالا تھا۔ پھر نمبر ملا ہی تھا کہ ایک خوب صورت سی گھبرائی آواز سنائی دی تھی۔

”سالار!......کہاں ہیں آپ؟......آپ ٹھیک تو ہیں؟“

اور اس نے گلا کھنکھارا تھا۔ ”عائشہ بھابی! یہ سالار بھائی نہیں، میں ہوں۔ آپ کا چہیتا، لاڈلا دیور، شہریار۔“

”اوہ، شیری بھائی! آپ......وہاں سب ٹھیک تو ہے؟“

”جی ہاں۔ وہاں کیا، یہاں وہاں سب ٹھیک ہے۔ لا رہا ہوں آپ کے شوہر نامدار کو۔ میں نے تو عام معافی دے دی، مگر عائشہ بھابی! آپ نے اتنے آرام سے نہیں معاف کرنا ہے سنی بھائی کو۔ اتنے سالوں کی بے توجہی، خفگی، لاپروائی کا گن گن کر بدلہ لینا ہے، پھر کہیں این او سی دیجئے گا اپنی زندگی میں واپسی کا۔ آخر کو آپ شیری کی بہن ہو، کوئی مذاق تو نہیں۔“ عائشہ بھابی ہنسنے لگی تھیں۔

سالار عبدالرحمٰن نے موبائل چھین لیا تھا۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ گاڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔



ماں کو پاپا نے تین دن پہلے ایک خاص فائل ڈھونڈنے کے لئے کہا تھا۔ وہ کل سے ڈھونڈ رہی تھیں، مگر انہیں مل نہیں رہی تھی۔ سو اب آخری کوشش کے طور پر وہ اپنی وارڈروب کھنگال رہی تھیں۔ دانیا نے سالار عبدالرحمٰن کے گھر آنے کی نوید دے دی تھی، وہ وہ اب مکمل مطمئن تھیں۔ کل سے بھی انہوں نے جو اور جس طرح تلاش کی تھی، وہ قطعی کہنے جیسی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی آنکھیں تو فائل کو تلاش کر رہی تھیں مگر دماغ سالار عبدالرحمٰن میں اٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے فائلوں کے کیبنٹ میں سے ایک فائل نکالی تھی۔ بڑا سا ایک خاکی لفافہ ان کے قدموں میں آن گرا تھا۔

وہ جھکی تھیں اور چھ ماہ پہلے کی ایک یاد ان میں کلبلائی تھی۔ یہ لفافہ شہریار نے انہیں دیا تھا۔ ''کیا ہے اس میں؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

''کچھ خاص نہیں، کچھ ضروری ڈاکومنٹس ہیں۔ مگر اس لفافے کو صرف اس وقت کھولیے گا، جب اس کی ضرورت ہو۔''

انہوں نے سر ہلا کر لفافہ رکھ دیا تھا۔ اور آج یہ لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ''کیا ہے اس میں؟'' دل میں تجسس تھا اور انہوں نے لفافہ کھول لیا تھا۔ یہ ایک فائل تھی۔

انہوں نے کاغذات پر نظر دوڑائی اور جی جان سے ہل کر رہ گئی تھیں۔ یہ وِل کے کاغذات تھے۔ اپنے حصے کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد و پراپرٹی شہریار نے ماں کے نام کی تھی۔ ان کے ہاتھ سے فائل چھوٹ گئی تھی۔

''یہ فائل...... یہ فائل میں نے آج کیوں کھولی؟...... میرے اللہ!'' اُن کا دل پوری شدت سے دھڑکا تھا۔ ''میرا شیری...... وہ کیسا ہے؟''

وہ اُٹھی تھیں اور جازی کو دیکھ کر گم صم کھڑی رہ گئی تھیں۔

''وہ فائل پاپا کی اسٹڈی روم میں تھی ماں! پاپا کو مل گئی ہے۔'' وہ قریب آ گیا تھا۔ ''ماں! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟''

وہ کچھ نہیں بولی تھیں اور شہریار کا نمبر ملانے لگی تھیں۔

شہریار، سالار عبدالرحمٰن کے بہت قریب بیٹھا تھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں عائشہ سے محو گفتگو تھے۔ مگر شہریار پھر بھی ٹکڑے لگانے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ ابھی کچھ دیر اور اُن کی معصوم محبت سے شوخیاں کرتا کہ اُس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

اُس نے عاطف کی کال ریسیو کی تھی اور چھوٹتے ہی بولا تھا۔ "اب تو میری جان چھوڑ دے خبیث! سونیا کو فون کیا کر۔"

"اسے کر لیتا ہوں فون جب دل چاہتا ہے۔ مگر تیری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

شہریار ہنس پڑا تھا۔ "اچھا، کتنے میں الاٹ ہوا یہ پلاٹ تیری سرزمینِ دل میں؟"

"بے مول۔ انمول شخص ہے تُو۔ تیرے لئے کوئی ٹیکس نہیں فری ہے سب کچھ۔"

وہ تھوڑا سا اور کھلکھلایا۔ "پہلے اپنی سے تو پوچھ لے۔ اسے کوئی اعتراض ہو گیا تو؟"

"نہیں ہو گا کوئی اعتراض شیری بھائی!" عاطف نے موبائل سونیا کو دے دیا تھا۔ "میری طرف سے فری ہینڈ ہے آپ کی محبت کے لئے۔"

"واہ، کیا بات ہے۔" وہ دل سے ہنستا تھا مگر دوسرے ہی لمحے یکدم آگے کو جھک آیا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک ہو شیری؟" ان کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ سالار عبدالرحمٰن نے ان کی گھبراہٹ پر چونک کر موبائل کٹ کر دیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ کم فہمی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شہریار نے سالار بھائی کا کندھا بھینچ لیا تھا۔ موبائل چھوٹ کے اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔

"عدیل بھائی!" اس کے جسم نے بہت بے قراری سے تناؤ بھرا تھا۔ سالار بھائی نے اسے سنبھالا دیا مگر وہ ان کے بازوؤں میں جل بن مچھلی بن کر تڑپا تھا۔

"مجھے سانس نہیں آ رہی بڑے بھیا! بہت درد...... درد ہے سینے میں۔"

عدیل عبدالرحمٰن فوراً ہی چیخے تھے۔ "سنی! اس کی کوٹ کی جیب میں اس کی دوا ڈھونڈ و۔ اس کی زبان کے نیچے رکھو۔ یہاں سے کون سا ہاسپٹل قریب ہے؟" وہ بڑبڑائے تھے۔ "صمدانی ہاسپٹل...... شیری! سنبھالو بیٹا! خود کو۔ بس دس منٹ کا فاصلہ ہے ہاسپٹل کا۔"

"دس منٹ...... یہاں لگتا ہے، دس سیکنڈ نہیں بچے۔ عدیل بھائی! مجھے خوشی راس نہیں آئی۔" شہریار نے بے قراری سے سالار عبدالرحمٰن کے کندھے سے سر گرا تھا اور بہت دقت سے سانس کھینچی تھی۔

سالار عبدالرحمٰن بے قراری سے بولے تھے۔ "تم نے...... تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا ناں کہ تم ٹھیک ہو۔ تمہاری وہ رپورٹس......؟" ان سے مزید کچھ نہیں کہا گیا تھا کیونکہ شہریار سانس لینے کے لئے

بری طرح تڑپا تھا۔
"اس کی جیب میں دوا نہیں ہے اس کی؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔اس کے ساتھ ہی شہریار نے ان کی بانہوں میں بے قراری سے ایک بار مچلنے کی کوشش کی تھی اور وہ بے قراری سے پکارا تھا۔
"یہ انصاف نہیں ہے......آہ، اگر......اگر مجھے موت کے ایک دن معین ہونے پر یقین نہ ہوتا تو میں کہتا سنی بھائی! پلیز مجھے بچا لیجئے، میں ابھی......ابھی نہیں مرنا چاہتا۔ابھی تو بالکل نہیں کہ ابھی تو صرف میں نے آپ کے محبت کے شہر میں قدم رکھا تھا۔" بہت مدھم لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ایک اور گہرا سانس لیا۔
سالار عبدالرحمٰن چیخے تھے۔"تم گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہے ہو؟ شیری کی سانس بہت تیز تیز چل رہی ہے۔"
عدیل عبدالرحمٰن نے ساری احتیاط چھوڑ کے رفتار بڑھا دی تھی۔اب ان کی گاڑی ہواؤں سے باتیں کر رہی تھی۔
اسی وقت سالار عبدالرحمٰن کا موبائل بجا تھا۔وہ شہریار کو سنبھالے بیٹھے تھے،سو انہوں نے کال ریسیو کی تھی۔تبھی عدیل عبدالرحمٰن کے موبائل کی بیپ ہوئی تھی۔
"ہیلو!"
"عدیل! میرا شیری......وہ......وہ ٹھیک تو ہے؟" انہوں نے مام کی آواز پہچان لی تھی۔
"مام! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تھوڑی سی۔" اور جب وہ یہ کہہ رہے تھے،شہریار کے جسم نے سالار عبدالرحمٰن کو بہت شدت سے بھینچا تھا۔
"عدیل! یہ......یہ بے ہوشی کی طرف جا رہا ہے۔کب آئے گا صمدانی انکل کا ہاسپٹل؟ تمہارے دس منٹ کب پورے ہوں گے؟"
"شہریار! ہوش سنبھالو یار! تم......تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" عدیل عبدالرحمٰن نے بے قراری سے چیخ کر کہا تھا مگر اس نے کوئی ردعمل نہیں دیا تھا۔
"اس کی نبضیں......وہ......وہ بہت مدھم ہو رہی ہیں۔شہریار!......آنکھیں کھولو بیٹا! ادھر دیکھو، میں تمہارا سنی بھائی......"
"کوئی ایسی خواہش ہے،جس کے پورا ہونے کی جستجو میں اس کی جان بند ہے۔جس دن وہ تمنا پوری ہوئی، یہ اپنی بقاء کی جنگ ہار جائے گا۔" ڈاکٹر صمدانی کی آواز عدیل عبدالرحمٰن کے اندر گونجی تھی اور اس وقت وہ آندھی اور طوفان کی طرح صمدانی انکل کے ہاسپٹل میں داخل ہوئے تھے۔

سالار عبدالرحمٰن نے ٹھیک طرح سے گاڑی رکنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور گاڑی آہستہ ہوتے ہی باہر آ گئے۔ بازوؤں میں اٹھائے دوڑے تھے۔ وارڈ بوائے نے اسٹریچر مہیا کیا تھا اور نرس اسے فوری طبی امداد کے طور پر آکسیجن دے رہی تھی۔

عدیل عبدالرحمٰن ڈاکٹر صمدانی کے کمرے کی طرف دوڑے تھے۔ وہ دستک کے بغیر اندر داخل ہوئے تھے اور بے قراری سے چیخے تھے۔

''صمدانی انکل! وہ شہریار...... پلیز! اسے دیکھئے۔''

صمدانی انکل کے کمرے میں مہمان بیٹھے تھے۔ ان کی آواز پر ایک مہمان نے مڑ کر دیکھا تھا اور یکدم گھبرا گیا تھا۔

''شہریار...... آپ میرے شہریار کی بات کر رہے ہیں؟''

صمدانی انکل باہر لپکے تھے اور مہمان، جو بلاشبہ سلاسہ ارسلان اور شافعہ تھے، اتنی ہی بے قراری سے ان کے پیچھے دوڑے تھے۔ صمدانی انکل نے ایمرجنسی کال کی تھی۔

ڈاکٹر اسٹریچر کے ساتھ تیز قدمی سے چل رہے تھے، جب شافی بہت بے قراری سے چیخی تھی۔ ''شہریار صاحب!...... شہریار صاحب!''

اُس کی آواز پر جیسے ڈوبتی زندگی نے ایک تیز سانس بھری تھی، اُس کی آنکھیں ہلی تھیں، مگر پورے وجود کا تناؤ سنبھالا لینے سے پہلے ہی ڈوب گیا تھا۔

شافی دیوار سے لگی کھڑی رہ گئی تھی اور ایک بہت پرانی یاد اس کے گرد چکرانے لگی تھی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے، انسان مر جائے تو دل بھی مر جاتا ہے؟ نہیں شافی! اگر دھڑکنے والا دل رک جائے تو بھی دل کے اندر چکراتی محبت دل کے گرد ہی پھیرے لیتی رہتی ہے۔ کان لگا کر سنو تو روح کی آواز ہر طرف گونجتی ہے۔ محبوب سے ملنے کی تمنا کی ہوک سنائی دیتی ہے۔''

''سلاسہ......!'' یکدم عاطف بیگ اور سونیا ہاسپٹل میں در آئے تھے۔ موبائل جو شہریار کے قدموں میں گرا پڑا تھا اس نے ساری صورتِ حال واضح کر دی تھی۔ وہ ہوٹل سے اُٹھ کر سیدھے ہاسپٹل آئے تھے۔

''تم یہاں......'' عاطف نے سوال کیا اور سلاسہ کر لایا۔

''میں سر صمدانی کو اپنی شادی کا کارڈ دینے آیا تھا اور اچانک یہ سب...... عاطف! شیری...... شیری ٹھیک ہے ناں ہمارا؟''

عاطف بیگ نے شیشے کے پار دیکھا تھا۔ڈاکٹر صمدانی طبی امداد میں جان توڑ کر محنت کر رہے تھے۔اُس کی دل کی دھڑکن بہت مدھم تھی۔
''سر! کنڈیشن اسٹیبل نہیں ہے۔کبھی ایک دم دھڑکن بڑھ جاتی ہے،کبھی مدھم ہونے لگتی ہے۔''
ڈاکٹر صمدانی نے ڈاکٹر سہیل کو نیا انجیکشن دیا تھا مگر ابھی ان کی کارکردگی کا رزلٹ نہیں نکلا تھا کہ شہریار کی دھڑکن پھر غیر متوازن ہوئی تھی۔ڈاکٹر صمدانی نے شاک کا حکم دیا تھا۔ڈاکٹرز شاک کا انتظام کر رہے تھے۔پھر چند سیکنڈ بعد اسے شاک دیئے جا رہے تھے۔اور پھر تیسرے جھٹکے میں سیدھی لکیر میں زندگی واپس لوٹی تھی۔اُس نے یکدم بہت غیر متوقع آنکھیں کھولی تھیں۔اُس کی نظر دروازے کے باہر جا کر رُک گئی تھی۔
''مام......!''اُس کے ہلکا سا کانپے تھے۔مام جو ابھی ابھی ہاسپٹل پہنچی تھیں،یکدم بےقراری سے باہر چیخی تھیں۔اسے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی،مگر اس کے اندر ماما کا چہرہ اور آنسو ٹھہر گئے تھے۔
ڈاکٹر صمدانی سب نارمل ہونے پر گہرا سانس لے رہے تھے کہ یکدم شہریار کے جسم نے شدید جھٹکا لیا تھا۔اس نے ہولے سے ہاتھ اُٹھایا تھا،جیسے اتنی دور سے وہ مام کو چھونا چاہتا تھا۔پھر یکدم ڈاکٹر سہیل چیخے تھے۔''ڈاکٹر صمدانی......!''
ڈاکٹر صمدانی چونک کر مڑے تھے۔مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتے،اُس کے جسم میں زندگی خاموش ہوتی چلی گئی تھی۔
ڈاکٹر صمدانی اس کے دل کو جمپ کر رہے تھے۔بار بار وہ اُسے سانس دیتے،دل کو پمپ کرتے۔اُن کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا،جب ڈاکٹر سہیل نے یکدم انہیں دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔
''ہی از گو آف سر!......ہی از نو مور۔''
''نہیں شہریار......وہ میرا شہریار ہے......وہ کیسے مر سکتا ہے؟''
''وہ مر چکے ہیں سر!ادھر دیکھئے،وہ لکیر بالکل سیدھی ہے سر!''
ڈاکٹر صمدانی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا تھا۔وہ بالکل ساکت و جامد ہو گئے تھے۔ان کے اندر وقت سے پہلے یکدم بہت ساری تھکن اُتر آئی تھی۔ڈاکٹر سہیل ایمرجنسی روم کا دروازہ کھول چکے تھے۔مام دیوانوں کی طرح چیخی تھیں۔

"شہریار!"

عدیل عبدالرحمٰن سکتے کی کیفیت میں کھڑے رہ گئے تھے۔ مام نے اس کی پیشانی چومی تھی۔ "آپ کو دیکھے بغیر مر گیا تو آپ کو دیکھنے کے لئے ایک بار جاگوں گا ضرور۔ پلیز، آنسو نہیں، میرے ہوتے ہوئے تو بالکل نہیں اور میرے بعد بھی نہیں۔ آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیں گے۔" شہریار کی آواز مام کے اندر گونجی تھی۔

ڈاکٹر سہیل نے شہریار کے کوٹ سے نکلنے والا والٹ عاطف بیگ کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک کونے میں ساکت کھڑا تھا اور سالار عبدالرحمٰن بے یقینی سے اس کے وجود کو دیکھ رہے تھے کہ یکدم ان کے جسم نے ان کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں؟"

"ہاں...... میں چاہتا ہوں کہ تم مر جاؤ۔ مجھے تمہاری شکل پھر کبھی دکھائی نہ دے۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں نہ دیکھ سکوں۔ دن بھر میں ہزاروں لوگ مرتے ہیں، پھر تم کیوں زندہ ہو؟ جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" ان کی آنکھوں کے آگے ماضی کے منظر ناچ رہے تھے۔

"میں کیسے شہریار کا سامنا کروں گا عدیل؟" چند لمحوں کی بات ان میں پھر گونجی تھی۔

"آپ کہتے ہیں ناں، آپ میرا سامنا کیسے کریں گے۔ دیکھئے، جا رہا ہوں میں آپ کی زندگی سے، بہت دور۔ مگر پلیز! جب یاد کیجئے گا، محبت سے یاد کیجئے گا سنی بھائی!...... آہ......" انہوں نے اپنے اس ہاتھ کو غور سے دیکھا، جو شہریار نے تکلیف میں بھینچ رکھا تھا۔ اس کا لمس ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھا۔

"سالار!" عدیل عبدالرحمٰن اس کیفیت سے سنبھالا لے چکے تھے، سو پہلی دفعہ میں انہیں سالار عبدالرحمٰن یاد آئے تھے۔

"سالار!" وہ پھر سے پکار رہے تھے۔ سالار عبدالرحمٰن نے خالی آنکھوں سے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔ "یہ کوئی خواب ہے، کوئی بہت بھیانک خواب۔ شہریار نہیں مر سکتا...... میرا شہریار نہیں مر سکتا۔"

عدیل عبدالرحمٰن ان کے سامنے بیٹھ گئے تھے اور سالار عبدالرحمٰن بے بسی سے پھر سے بولے تھے۔ "میری محبت...... اس نے اسے مار دیا ناں۔ اگر میں...... میں یہ کہہ دوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے تو وہ پھر سے جاگ جائے گا ناں؟"

عدیل عبدالرحمن کی آنکھ کا غم چہرے پر پھیل گیا تھا اور سالار عبدالرحمن یکدم کھڑے ہو کر شہریار پر جھک گئے تھے۔
"آنکھیں کھولو شیری! ادھر دیکھو، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا مجھے تم سے محبت ہے۔ سن رہے ہو، مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔" تیز لہجہ پھر یکدم بے چارگی سے بھر گیا تھا۔ "اب تو اُٹھ جاؤ......
دیکھو، میں نے کہہ تو دیا ہے، مجھے تم سے محبت نہیں ہے شہریار!"
عدیل عبدالرحمن نے خاموشی سے انہیں بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ جازی بے یقینی سے اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا مگر اس ایک لمحے میں وہ یکدم بڑا ہو گیا تھا۔

وہ لوٹتا نہیں اک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارہ نہیں

جازی کو لگا شہریار کا ہاتھ ہولے سے اس لمحے میں بھی اس کا چہرہ چھو رہا تھا مگر اس کے ہاتھ اس کے پہلو میں پڑے تھے۔
"شیری بھائی! وہ آپ کی بیٹی...... وہ آپ کے بغیر کیسے رہے گی؟ پاپا، وہ جی پائیں گے؟ نانو، دادی، بجو۔ لائبہ کسی کے بارے میں تو سوچ لیتے۔ میرے...... میرے بارے میں بھی نہیں سوچا آپ نے،
آپ کے ساتھ چلنے کی کتنی عادت ہے مجھے۔" وہ دل کے گنبد میں کھڑا ہو کر چیخا تھا۔
عدیل عبدالرحمن فون کر رہے تھے۔ دوسری طرف مامون تھا اور دھیرے سے بولے تھے۔ "تم کہاں ہو؟"
"گھر پر سر!...... خیریت ہے؟"
انہوں نے نہیں کہا اور پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "تم گھر جاؤ پلیز!"
"میں گھر جاؤں؟ مگر کیوں سر؟" لمحہ بھر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "ابھی دانیا کا فون آیا تھا۔ وہ تو کہہ رہی تھی، سب ٹھیک ہے۔ پھر اچانک؟"
"مامون! تمہارا شہریار چلا گیا ہے...... ہی اِز نو مور۔" دوسری طرف ایک مکمل سناٹا چھا گیا تھا اور وہ مزید بولے تھے۔ "مامون! گھر میں سب تم نے سنبھالنا ہے۔ ہم ڈیڈ باڈی لا رہے ہیں۔" وہ کچھ کہے بغیر فون بند کر چکا تھا۔

پھر مامون گھر پہنچا تو دانیا اسے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''اچھا ہوا مامون! آپ گھر آ گئے۔ میں ریلیکس ہوتے ہی ٹاؤن لائبریری گئی تھی۔ واپس آئی ہوں تو نانو کہہ رہی ہیں، ماما بہت پریشانی میں کہیں گئی ہیں۔ وہ رو بھی رہی تھیں۔ مامون! میں نے عدیل بھائی کو فون کیا، نگران کا فون بزی آ رہا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے؟''

وہ دانیا کو جواب دینے کے بجائے نانو کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر رونکھے لہجے میں بولا تھا۔ ''آپ کا چہیتا، دھوکا دے گیا ہے نانو! آپ کا شہریار نہیں رہا...... بہت ساری محبت، بہت ساری خوشی سے نہیں پایا اس کا دل۔''

دانیا کھڑے کھڑے صوفے پر گر گئی تھی۔ عائشہ بھابی چیخنے لگی تھیں۔ رابعہ بھابی سکتے کی کیفیت میں مامون کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ یکدم سٹڈی روم سے پاپا در آئے تھے۔

''کیا ہوا؟ پھر کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیا سالار نے؟ آخر سالار کب عقل پکڑیں گے؟''

دانیا انہیں شہریار کی بات آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں کھڑے سن رہے تھے۔ پھر دس منٹ اور گزر رہے تھے کہ ایمبولینس پورٹیکو میں آ کر رکی تھی۔ عدیل بھائی اسٹریچر اندر لائے تھے اور دانیا خالی آنکھوں سے سب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ شہریار اس کے سامنے تھا مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''میں ایک انسان تھا تو موت بھی تو ملنی چاہیے تھی۔ مگر دیکھتا ہوں، جتنا زندگی جینے کا سزاوار نہیں ہوں، اتنی ہی بار موت کا مزہ چکھا ہے۔''

وہ شہریار کے قریب آئی تھی۔ ''اب تو مٹی میں مٹی کے ملنے کا فیصلہ رہ گیا ہے۔'' اس نے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ ''ابھی تو بہت سارا جینا ہے، تمہاری شادی کرنی ہے، بزنس ہے اور بہت سارے کام ہیں۔ ابھی مرنے کی فرصت نہیں ہے۔''

''آپ جھوٹ نہیں بولتے تھے، مگر آپ پھر بھی جھوٹ بولتے رہے۔ آپ تو کہتے تھے، ابھی مرنے کی ضرورت نہیں، پھر...... پھر کیوں چلے گئے شیری بھائی؟'' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔

عدیل عبدالرحمن نے اسے رونے دیا تھا۔

عاطف بیگ نے یونہی اس کا والٹ کھولا تھا۔ شافعہ کی تصویر ابھی تک والٹ میں لگی تھی۔ عاطف بیگ نے دیوار کو پکڑا تھا۔

”کل میں نے سب سے پہلے یہ خبر شہریار کو دی تھی، ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ میں نے اڑتالیس گھنٹے کے مختصر نوٹس پر شادی کا پروگرام بنایا ہے۔ تم نے ضرور آنا ہے عاطف!“

سلامہ ارسلان اس میں کونج رہا تھا۔ عاطف بیگ نے نم آنکھوں کو بند کیا تھا۔

”تم نے ”کافی ان“ میں ایک دفعہ شافی کا ذکر بہت دل سے کیا تھا۔“

”میں تو ہر ایک کا ذکر بہت دل سے کرتا ہوں۔ ویسے یہ بات اس دن کلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک مذاق تھا۔“

”یہ صرف مذاق ہے تو تمہارے والٹ میں اس کی تصویر کیا کر رہی ہے؟“

”کیا تصویر والٹ سے نکال دینے سے وہ تمہارے دل سے بھی نکل جائے گی؟“

مگر وہ اتنا مجبور تھا اپنے دل کے ہاتھوں کہ اس نے دل سے تو کیا، اپنے والٹ سے بھی نہیں نکالا تھا شافی کو۔ عاطف بیگ محو تھا جب یکدم کسی نے اس کے ہاتھ سے والٹ لے لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا تھا۔ والٹ شافعہ کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ”سچ“ جو وہ چاروں طرف کھوجتی پھر رہی تھی، اس کے سامنے تھا۔

”آپ اتنی شدت سے کس سے محبت کرتے ہیں کہ جب وہ آپ کے سامنے نہیں ہوتی تو آپ کی آنکھ میں آن بیٹھتی ہے، آپ کے دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔ اور جب آپ کے اندر رہتی ہو گی تو آپ اس کو اپنے اندر جینے کے لئے فری ہینڈ دے دیتے ہوں گے کہ وہ جیسے چاہے آپ کے اندر سانس لے، آپ کے اندر جیئے۔ کون ہے وہ لڑکی؟ وہ خوش قسمت لڑکی، جسے آپ جیسا ڈیشنگ مین محبت کرتا ہے؟“

”محبت........“ وہ ہنسا تھا۔ ”صرف محبت نہیں، عشق کرتا ہوں میں اس لڑکی سے۔ مگر وہ بھی میری طرح چاہے مجھے، میں نے یہ آس بھی نہیں لگائی۔“

”شہریار صاحب!“ وہ بے قراری سے کرلائی تھی۔ اپنی تصویر اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔

ہو نہ ہو دنیا میں کوئی ہم سا بھی پیاسا لوگو!

جی میں آتی ہے کہ پی جائیں یہ دریا لوگو!

کتنی اس شہر کے خیموں کی سنی تھیں باتیں

ہم جو آئے تو کسی نے بھی نہ پوچھا لوگو!
پھر وہی وحشت ہے، وحشت کی تنہائی ہے
وحشتِ دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا لوگو!
کسی کی آنکھیں اس پر آن جمی تھیں۔ وہ نظم بھول گئی تھی اور کسی نے یکدم اس کے چہرے سے نظریں چرا کے پھر بند کرلی تھیں۔
اس میں ہمت ہے تو در آئے، اٹھا دے یہ حصار
اپنے گنبد میں تو در ہے نہ دریچہ لوگو!
جی کی جی ہی میں رہیں حسرتیں طوفانوں کی
یہ سفینہ تو کنارے ہی پہ ڈوبا لوگو!
کوئی پیغام زبانی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا لوگو!
بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں، بھاری پاؤں
نیند سی نیند! ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!
ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل، اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو!
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا

یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاتا لوگو؟
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!

نظم اور اس کی آواز چاروں اور چکرا رہی تھی کہ یکدم سلامہ ارسلان نے اسے بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ اس کی مٹھی میں ابھی بھی اپنی تصویر بھنچی ہوئی تھی۔ عاطف بیگ نے فق چہرے سے اسے دیکھا تھا، مگر اس نے سلامہ کی نظر بچا کر اپنی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا برد کر دیئے تھے۔ مگر والٹ سے شافعہ کی تصویر غائب تھی تو کیا واقعی وہ شہریار کے دل سے بھی نکل گئی تھی؟

شافعہ کی آنکھیں سمندروں رونے لگی تھیں۔ اس کا سینہ، وہ تو ابھی تک شافعہ کی محبت سے مہک رہا تھا۔ شاید اب بھی اس کے نام پر دھڑک رہا تھا۔ دل کی دھڑکن تو دنیا کے لئے رُکی تھی، مگر کیا پتہ وہ اپنے اندر باہر کی خاموشی سے زیادہ اپنے اندر دھڑک رہا ہو۔ شافعہ کے نام پر، اس کے آخری لمس پر، سرخوشی سے جھوم رہا ہو۔ جاتے سمے اُس کی آخری پکار پر ٹھہر کر ابھی تک اسی لمحے کو جی رہا ہو۔

اس نے اپنے اندر جھانکا تھا، جہاں کبھی شہریار کے لئے ایک اچھے دوست جیسی پسندیدگی تھی۔ کیا واقعی اب وہاں وہی جذبہ تھا؟

سلامہ ارسلان نے اگر کبھی تنہائی میں پوچھا کہ ”ساری دنیا میں اس نے کس سے شدید محبت کی ہے؟“ تو کیا وہ بلا سلامہ کا نام لے سکے گی؟ اسے آج عارف بھی بھول گیا تھا، سلامہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا...... خاموشی میں لپٹا ہوا شہریار تھا، جو اس کے دل میں گنگناتا پھر رہا تھا۔ یہ دل...... واقعی یہ دل سودائی تھا، کہاں سے چلا تھا، جہاں آ کر ٹھہرا تھا۔ کس کے آگے ہارا تھا اور کس کی حکومت کا علم بلند کر کے جینے کا ذمہ دار تھا۔ یہ محبت...... یہ ہمیشہ اک نامحسوس ان کہی، ایک کسک دے کر زندگی کو آگے بڑھاتی ہے۔ مگر اس کی زندگی آگے بڑھی تھی یا ٹھہر کر ایک اس مقام پر دائرہ میں قید ہو گئی تھی؟

”شافعہ! حوصلہ کرو پلیز۔ اتنا مت روؤ۔“ سلامہ ارسلان نے اسے بہت پیار سے پکارا تھا تو وہ اپنے حال سے اتنی بے پروا ہو گئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا، وہ ہچکیوں سسکیوں سے روئے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس کو رو رہی تھی۔ یہاں ہر کمرے میں ہر شخص رو رہا تھا۔ انکل عبدالرحمٰن، اُس کے پاپا مومن، بیگم عافیہ، جازی، اُس کے دفتر کے ورکرز، سب کے رونے کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی۔ اور اُس کے رونے کی وجہ تو...... اُس کی پوری زندگی تھی۔

وہ سلامہ کے کہنے پر خاموش ہونے کے بجائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ پتہ نہیں آج وہ کس کس کو رو رہی تھی۔ اپنے دل کو، شہریار کی موت کو یا محبت کے اس انجام کو؟...... کچھ واضح نہیں تھا۔ سب

دُھند لا گیا تھا......اور دُھند ایک نئے دن کی جنت کے لئے پھیلتی چلی جا رہی تھی۔جانے وہ نیا دن کیا لانے والا تھا مگر زندگی کا سب سے بھرپور دن سو گیا تھا۔
اب وہ کوئی بھی وعدہ، کوئی بھی خواب کچھ بھی لاتا، یہاں بیٹھے ہر شخص کو معلوم تھا کہ ان کا دل کتنا ملول، کتنا رنجیدہ تھا کہ مدتوں ہنسنے کے آداب نہیں سیکھ پائے گا......اور محبت تھی، کمرے کے وسط میں لیٹے شخص کے اطراف پھیرے لے رہی تھی بے تکان......بے تحاشا۔مگر خاموش لیٹے ہوئے شخص کا دل تھا کہ محبت کی اس عنایت پر طنز سے ہنس پڑا تھا۔قہقہہ طویل تھا، ہنسی سے بھرپور، مگر آنسوؤں سے بھیگا ہوا۔اور آنسوؤں کے بھیگے موسم کب تک اس گھر، اس در کا مقدر رہتے......اس پر وقت چپ تھا۔کب تک یہ موسم اس گھر کا مقدر رہنے تھے، وقت اس پر بھی چپ تھا......اور خاموشی سے زندگی تلاش کرنا کار دارد۔
کب ہوتا، کب نہیں، سب نے زندگی پر چھوڑ دیا تھا......
اور زندگی سے موت کا یہی بندھن طے تھا......

(تمت بالخیر)

یہ ناول کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے

مکتبہ القریش ☆ سرکلر روڈ اردو بازار لاہور۔ فون نمبر 0423-7668958

Email: al_quraish@hotmail.com

"ارسلان راشدی۔" مومنہ سے بھی پہلے شہریار نے جواب دیا تھا اور شافعہ نے کپکپاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور زور سے چیخی تھی۔

"بابا! بابا! ادھر آئیے۔"

ارسلان راشدی نے اس کی آواز پر لبیک نہیں کہا تو اس نے مومنہ کا ہاتھ پکڑا تھا اور لنگڑاتے ہوئے ارسلان راشدی کے کمرے کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ ایزل پر اب بھی وہی تصویر آویزاں تھی اور ارسلان راشدی بت کی طرح اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"بابا! یہ دیکھئے، یہ آپ کی بیٹی، بابا! عطیہ چچی کی بیٹی۔" اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ کمرے سے آصفہ ارسلان راشدی بھی اُٹھ کر آ گئی تھیں۔

مومنہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ دیوار سے ٹیک لگا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا، عطیہ بانو نے اپنا بدلہ لینے کے لئے پھر سے جنم لیا تھا۔

"بھابی! آپ تو میری برائت ثابت کریں، آپ کو تو پتہ ہے ناں، میں ایسی نہیں ہوں بھابی!" انہیں لگا، عطیہ بانو نے اب بھی ان کا آنچل مٹھی میں بھینچ رکھا ہے۔

"چھوڑو میرا آنچل۔ مجھے نہیں معلوم، مجھے نہیں معلوم۔" وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑا کر اپنا آنچل جھٹکنے لگیں۔

ارسلان راشدی نے حیرت سے دیکھا، مومنہ بھی اسی حیرت کا حصہ تھی اور شافعہ، اس نے انہیں کندھے سے تھام لیا تھا۔

"اماں! کیا ہوا؟ آپ کو خوشی نہیں ہوئی، بابا کی بیٹی ملی ہے؟"

"کون بیٹی؟........ کیسی بیٹی؟........ جو عطیہ! جو۔"

انہوں نے شافعہ کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے اور شہریار طنز سے انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ وقت کی اُلٹی گنتی اور مکافات ایک ساتھ شروع ہو گئے تھے۔ شافعہ، آصفہ ارسلان راشدی کو اندر لے گئی تھی اور ارسلان راشدی، مومنہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

"کتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"اتنی کہ شمار نہیں ہے۔"